R. No. 2186/57

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone 29
Annual Rs
per Copy-1

جلد ۲۷ شمارہ ۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

نیا سال

(دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے)

ہماری زبان کے [illegible] والوں کو ہم نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں۔ [illegible] ہے کہ یہ سال [illegible] ترقیاں لائے گا۔ [illegible] ملک کے لیے نئی نئی مشکلات، نئے نئے امتحان اور نئے نئے خطرے [illegible] مشکلات، امتحانات اور خطرات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے ان کا مقابلہ نئے اعتماد اور نئے جوش سے کرنا چاہیے

ہندوستان نے سب سے پہلے جو راستہ انتخاب کیا ہے وہ اچھا اور سچا راستہ ہے جمہوریت کا راستہ ہی [illegible] وہ سے زیادہ انسانوں کی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے، یہی سب کے [illegible] کی ضمانت ہے۔ اسی پر چل کر وہ اقتصادی فلاح ذہنی بلندی اور [illegible] آسودگی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ [illegible] ہم سے کچھ مطالبے بھی کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے جمہوریت کے دیئے ہوئے حقوق پر ہی دھیان رکھا ہے۔ اس کے عاید کیے ہوئے فرائض پر ہماری نظر نہیں گئی۔ ہماری مشکلات کی وجہ یہی ہے۔ اگر ہم صرف اپنی ذات کو خدا اللہ کا سا سمجھتے رہیں گے، اگر صرف اپنی خوشحالی اور ترقی ہمیں عزیز ہوگی، اگر صرف دنیوی کامیابی کو ہم سب کچھ سمجھیں گے اور اگر ہم ابن الوقتی کو اپنا شعار بنالیں گے تو دوسرے بھی ہماری دیکھا دیکھی یہی کریں گے۔ اس ذاتیات کی دوڑ میں سماج کا کیا حال ہوگا۔ ملک کہاں جائے گا۔ قوم پر کیا بنے گی، تہذیب پر کیا گزرے گی، انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ اس لیے ہمیں ذرا اپنے گریباں میں سر ڈالنا چاہیے، ہر دانشور کو سوچنا چاہیے کہ اس نے علم و تہذیب کی روشنی پھیلائی ہے یا اسے اپنے کمرے میں اس طرح بند کر لیا ہے کہ اس کی ایک کرن بھی باہر نہ جائے ہر ادیب کو غور کرنا چاہیے کہ کیا ادب کے ذریعہ سے اس نے اپنے سچے تجربات پیش کیے ہیں یا کسی کی دلالی کی ہے، اس نے زندگی کے حسن اور بدصورتی میں حسن کو دیکھا اور دکھایا ہے یا نہیں، اس نے اپنے

آپ سے سچ [illegible] ہے یا جھوٹ، اس نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے یا کسی لکیر بارنگ کا فارمولا ایک [illegible] ہو گیا ہے ہر معلم کو دھیان دینا چاہیے کہ وہ اپنے پیشے سے محبت رکھتا ہے، بس اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے یا نہیں اس علم کو اور علم کی قدروں کو اپنے طالب علموں تک [illegible] یا نہیں، یا وہ صرف ایک سیڑھی اور [illegible] کی فکر میں لگا رہتا [illegible] [illegible] کراتا ہے۔ [illegible] طالب علم کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس سنہرے دور میں [illegible] سے آنکھیں لڑانے اور پہاڑ [illegible] ٹالنے کی عمر ہے وہ جلسے میں [illegible] سرمائے کو برباد کرنے میں اپنی شان [illegible] سمجھتا ہے، مانا کہ اس کے بزرگوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اور اس کے لیے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی، مگر اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ وہ اپنے آپ سے، اپنے مستقبل سے، [illegible] انسانیت سے مایوس ہو جائے اور کسی بہانے کے ملنے پر ہنگامہ آرائی، توڑ پھوڑ کو اپنا شعار بنالے۔

ہندوستان کا راستہ اچھا اور سچا راستہ ہے، مگر ہم اس سیدھے راستہ کو چھوڑ کر راستوں سے الجھنے لگے ہیں کوئی ہندی کی خدمت اس میں سمجھتا ہے کہ انگریزی کے سائن بورڈ جلادے اور انگریزی کی ہر تحریر پر مٹا دے۔ کوئی انڈین کے نام پر ہندی سے نفرت کرتا ہے کوئی اپنی ریاست کی حدوں کی خاطر ملک کے امن وامان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ کوئی صرف اپنی تجوری بھرنے کی فکر میں ہے۔ اسے اس کی فکر نہیں کہ لوگ غذا کی کمی کی وجہ سے بھوکے مرنے لگے ہیں سیاسی پارٹیاں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر ترکیب برتنے کو تیار ہیں سرکاری افسر اپنے کو خدا نہیں تو مجازی سمجھنے لگے ہیں۔ گاندھی جی کا نام لینے والے ان کے اخلاقی پیغام کو بھولتے جاتے ہیں۔ جواہر لال کی اٹھارہ سال کی حکومت پر کتنے ہی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کی ملک کے عوام سے محبت، ان کے خیالات کی رفعت، ان کے ذہن کی وسعت، ان کی ان تھک محنت کی کوئی تقلید نہیں کرتا نتیجہ یہ ہے کہ آج آدرش، اخلاق، خدمت، محبت، تہذیب اور انسانیت کو خالی خولی الفاظ سمجھنے والے بہت ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ آدمی جو جانور تھا اور انسان بننے کی کوشش کر رہا ہے اس کا سارا سرمایہ یہی تھوڑے

ترجمہ : اصغر عباس

کارل سینڈبرگ

کارل سینڈبرگ کی پرزور شاعرانہ قلمی زندگی گزارنے کے بعد ۲۲ جولائی کو انتقال کر گیا۔ اس نے امریکہ کے گوشے گوشے میں گھوم کر اپنے ملک کی جمہوری زندگی کی قوت کا مشاہدہ کیا تھا چنانچہ اس کی آزاد نظمیں اسی قوت کی مظہر ہیں اور نہ صرف عوام نے بلکہ علما، دانشوروں اور مدبروں نے بھی اسے قدر و مسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ صدر جانسن نے ۸۹ سالہ شاعر کو امریکہ کا مغنی کے لقب سے یاد کیا اور کہا کہ زندگی میں راستہ کارل سینڈبرگ کے لیے جو امید و دست [illegible] اور ان [illegible] انسانوں کا رفیق دلکشا رہا جس کے سفر زندگی کو اپنی شاعری کے ذریعہ اس نے روشنی، گرمی اور وسعت عطا کی، اب ختم ہو چکا ہے لیکن وہ سرمایہ جو وہ چھوڑ گیا ہے لافانی ہے۔ کارل سینڈبرگ صرف امریکہ کی آواز ہی نہ تھا اور نہ ہی صرف وہ امریکہ کی قوت، ذہانت اور فطانت کا شاعر تھا بلکہ وہ ذاتِ امریکہ تھا۔ آج ہم اسے شاعرِ جمہور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور اسے عوام کی صدا اور ان کے ضمیر کا عکاس اور حسن تعمیر عمل کے صحیفہ کا راقم سمجھتے ہیں۔

کارل سینڈبرگ کے درجہ اور [illegible] کو کسی [illegible] کی ضرورت نہیں کیونکہ ان شہروں، میدانوں کے چپے چپے کی [illegible] سے جس سے اس نے پیار کیا، اور ان عام انسانوں کے جن کا یہ زمرہ ہے جن کا ذکر اس نے اپنی نظموں میں کیا، شخص اس نے زندگی کی حرارت کی پوری دنیا کے ساتھ [illegible] کے اتصال کا نام [illegible]۔ بحیثیت امریکی ہونے کے ہمارے لیے خصوصی طور اور روشن قسمتی کی بات ہے کہ ہم ہمیشہ کارل سینڈبرگ کے گائے ہوئے اپنی عظمت کے غیر فانی ترانے سنتے رہیں گے۔

کارل سینڈبرگ نے امریکہ کا سب سے بڑا ادبی اعزاز PULITZER PRIZE دو بار حاصل کیا۔ پہلی مرتبہ ابراہم لنکن کی سوانح حیات کے لیے جو چھ جلدوں میں شائع ہوئی اور دوسری بار اپنی شعری تخلیقات پر۔ کارل سینڈبرگ گیلسبرگ میں، جو الینوئے میں بسا ہوا ایک شہر ہے، ایک سویڈش مہاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم مستقل طور پر نہ ہو سکی کیونکہ اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے اسے بہت سے کام کرنے پڑے۔ اس نے دودھ کی گاڑی کھینچی، ایک حجام کی دکان پر ملازمت کی اور اینٹوں کے بھٹہ پر بحیثیت ٹرک آپریٹر کام کرتا رہا۔

جب وہ سترہ سال کا ہوا تو اس نے صوبہ ہائے متحدہ کے مختلف علاقوں میں مزدور کی حیثیت سے گھومنا شروع کیا۔ اس نے گندم کے کھیتوں میں کام کیا اور ایک ہوٹل میں طشتریاں صاف کیں۔ اسی زمانے میں اسے لوک گیتوں کے سننے اور جمع کرنے کا موقع ملا جن کی وہ آگے چل کر ترتیب و تدوین کرنے والا تھا۔ اور یہی وہ صنف سخن ہے جس میں اس نے خود طبع آزمائی کی۔

جب اسپین اور امریکہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو وہ فوج میں داخل ہو گیا اور محاذ جنگ کی سمت روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے اپنے شہر کے لومبارڈ کالج میں داخلہ لیا اور مختلف مشاغل سے کسب معاش کرتا رہا۔ کبھی کبھی تو اسے پاسبانی بھی کرنی پڑی۔ کالج سے نکلنے کے بعد اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ملواکی کے میئر کا سکریٹری ہوا۔ اب اس نے مختلف رسالوں اور جریدوں میں اپنی نظمیں چھپنی شروع کیں۔ CORN HUSKERS (۱۹۱۸) GOOD MORNING AMARICA (۱۹۲۸) و SLABS OF THE SUNBURNT WEST (۱۹۲۲) و SMOKE AND STEEL (۱۹۲۰) THE PEOPLE YES (۱۹۳۶) اور EARLY MOON (۱۹۳۰) اس کے چند شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ ان شعری تصنیفات کا موضوع امریکہ کے محنت کش عوام ہیں۔ اس کی نظموں میں خطابت کی گرمی یا بیان کی دلکشی نہیں بلکہ اس زندگی کے مکمل ذاتی تجربہ کی جھلک ملتی ہے جس کی وہ ترجمان ہیں چنانچہ ان میں ان محاوروں کا بھی پاس رکھا گیا ہے جو اس طبقہ میں مروج ہیں۔ سیدھے سادھے مشاہدات میں کثرت سے ظرافت اور طنز کا پہلو نکال لیتا ہے۔ تشریح اور وضاحت اس کا شعار نہیں کیونکہ وہ اپنے سامعین کی سخن فہمی اور ادراک پر بھروسہ کرتا ہے۔ یہ اعتماد اس لیے بھی ہے کہ اپنی شاعری میں اس نے جابجا عوام کی کہاوتوں اور استعارات کا بہت بے ساختگی سے استعمال کیا ہے۔ اس کی تصنیف 'THE PEOPLE, YES' حیرت انگیز کتاب ہے اور حیات افزا بھی۔ اسے کسی خاص صنف سخن سے منسلک کرنا محال ہے۔ کارل سینڈبرگ نے اس کتاب میں بے شمار کہاوتوں اور بصیرت افروز لطائف کے ایک حسین اور دلکش امتزاج سے ہر شخص کی صلاحیتوں اور قوتوں میں اپنے ایقان و ایمان کا اظہار کیا ہے۔

سینڈبرگ نے مروج بحریں کبھی اختیار نہ کیں۔ پھر بھی باوجود اس حقیقت کے اس کی آزاد نظمیں شاعری کے مقابلہ میں مترنم نثر سے زیادہ قربت رکھتی ہیں۔ اس کی تمام نظموں میں ایک گہری نغمگی پائی جاتی ہے ان میں موسیقی کے آہنگ کا بھی اہتمام نظر آتا ہے جو نفس مطلب سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

لیکن سینڈبرگ کی شہرت کی اصل ضامن اس کی تصنیف ابراہم لنکن کی سوانح حیات ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئیں جو صاحب سوانح کے ایام طفلی سے متعلق ہیں۔ ان جلدوں کو اس کتاب کی بقیہ چار جلدوں کا جو THE WAR YEARS کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں پیش لفظ سمجھنا چاہیے۔ THE WAR YEARS کا موضوع وہ عظیم انسانی اور تاریخی المیہ ہے جو زمانہ خانہ جنگی میں امریکہ میں واقع ہوا۔ سینڈبرگ نے خانہ جنگی کا نقشہ واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ عام انسان کی ابتری کے ذکر کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس کی اس تصنیف نے ثابت کر دیا ہے کہ لنکن کے سوانح نگاروں میں سینڈبرگ سب سے زیادہ حساس اور ہمدرد سوانح نگار ہے۔

امریکہ کے اس مشہور شاعر نے، جو امریکہ کا AMERICAN MINSTREL [illegible]

انیس انور

مکتوب لندن

بریڈفورڈ میں ہر ہفتہ چالیس ہندستانی اور پاکستانی بچے اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں

بریڈفورڈ کے اسکولوں میں سے داخلہ لینے والے تارکین وطن کی روز افزوں تعداد نے کارپوریشن اور محکمہ تعلیم کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ تعلیم مسٹر یارکر نے کہا کہ گذشتہ سال نئے داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد ایک ہزار تھی جبکہ اس سال اب تک ایک ہزار چھ سو طلبہ داخلہ لے چکے ہیں۔ اوسطاً چالیس تارکین وطن بچے ہر ہفتہ داخلہ لے رہے ہیں۔ حساب لگا کر بتایا ہے کہ نئے داخل ہونے والے طلبہ کے لیے دس پرائمری اور ایک سکنڈری اسکول کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تعلیمی کمیٹی نے مزید گرانٹ حاصل کرنے کی درخواست دی ہے اسی طرح کی صورت حال لیسسٹر کے محکمہ تعلیم کو بھی درپیش ہے۔ تارکین وطن بچوں نے لیسسٹر میں بھی یہ مسئلہ پیدا کر دیا ہے کہ ان کی تعداد یک لخت دگنی ہو گئی ہے۔ جولائی سے پہلے تک نئے داخل ہونے والے طلبہ کی ماہانہ اوسط چالیس تھی اور اس کے بعد یہ اوسط بڑھ کر اسّی ہو گئی ہے ان بچوں کی روز افزوں تعداد کی بنا پر ۲۴۰ مقامی بچوں کو نزدیک کے اسکولوں میں داخلہ نہیں مل سکا تعلیمی کمیٹی کے مطابق مرکزی حکومت کی گرانٹ کا ۶ فیصد حصہ صرف رنگدار بچوں کی تعلیم پر خرچ ہوگا۔ اس کے علاوہ اساتذہ کو بھی بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں کیونکہ نئے داخل ہونے والے رنگدار بچوں میں آدھے سے زیادہ انگریزی سے بالکل نامانوس ہیں۔ اور باقی ماندہ ۵۰ فیصد میں سے ۳۰ فیصد "عجیب و غریب" انگریزی بولتے ہیں۔ محکمہ تعلیم ایسے انگریز اساتذہ کی تلاش میں ہے جو اردو ہندی اور پنجابی سے واقفیت رکھتے ہوں۔

اردو میں صنعتی تربیت کا اہتمام

برمنگھم کے ہیں کارخانوں کے تربیتی افسر بی۔ اے۔ والٹر نے ہند پاکستانی باشندوں کو اردو اور بنگالی میں صنعتی امور کی تربیت دینے کے لیے مسٹر این۔ اے۔ قادری کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ تا حال یہاں سیکڑوں افراد محض انگریزی سے عدم واقفیت کی بنا پر صنعتی ہنرمندی حاصل کرنے سے محروم تھے اور بنا بریں ترقی کے منازل طے کرنا ان کے لیے بہت دشوار تھا جبکہ انگریز مختصر مدت میں اعلیٰ مناصب حاصل کر سکتے تھے۔ مسٹر قادری نے توقع ظاہر کی ہے کہ اگر ہمارے بھائیوں نے مجوزہ جماعتوں میں دلچسپی لے کر ضروری تربیت حاصل کر لی تو ان کے لیے کارخانوں میں ترقی کرنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ انھیں یقین ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس بیش بہا سہولت سے فائدہ اٹھائیں گے۔

"آفاق"۔ خاتون کارکنان کے لیے اطلاع

ایک کارخانہ میں خاتون کارکنان کے لیے "اطلاع" کے عنوان سے یہ تختی دیکھنے میں آئی۔ اگر آپ ڈھیلا لباس پہنتی ہیں تو مشینوں سے بچیے اور چست لباس زیب تن فرماتی ہوں تو کاریگروں سے"۔

بزم تفریح لندن کی ماہانہ ادبی نشست

عبدالعلیم صدیقی جنرل سکریٹری بزم تفریح لندن اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۶ دسمبر بروز جمعہ شام چھ بجے ماہانہ ادبی نشست لائنس ہال متصل سینٹ جونز پارک لندن ایس۔ ڈبلیو میں منعقد ہو رہی ہے نشست کی صدارت کے فرائض چودھری اکبر خاں صاحب انجام دیں گے اس نشست میں ممتاز شعرا، مزاح نگار اور موسیقار حصہ لیں گے پروگرام حسب ذیل ہوگا۔

۶ تا ½۶ بجے شام چائے و تعارف ½۶ تا ۸ بجے شام مشاعرہ

۸ تا ۹ بجے شام بزم موسیقی

اردو میں قانون کی کلاسیں

مانچسٹر مقامی ویلفیئر سنٹر کے زیر اہتمام اردو میں قانون کی کلاسوں کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ گذشتہ منگل کو بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ اس موقع پر جو اختتامی تقریب ہوئی اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر علام صابر خاں نے مانچسٹر یونیورسٹی کے سٹاف ممبر اور ویلفیئر سنٹر کے مسٹر بدرالدین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمارے تارکین وطن کے یہاں کے قوانین سے ناواقف ہیں اور ان سے آگاہ کرنے کے لیے اس طرح کی مزید کلاسوں کی ضرورت ہے

اپنی زبان میں بات کیجیے

ڈیوزبری کے محمد تاج نے ان انگریزی داں ہند و پاکستانی "ورمیوں" سے درخواست کی ہے کہ وہ کارخانوں میں کام کرنے والے اپنے ہم وطنوں سے اردو اور ہندی میں گفتگو کریں تاکہ ان کی ترجمانی اور نمائندگی کے وقت گورے عہدہ داروں سے ان کی گفتگو یہ حضرات بخوبی سمجھ سکیں اس طرح اپنی زبان سے غداری بھی نہ ہوگی اور گوروں پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا اور ان کی عزت میں بھی اضافہ ہوگا۔ امید ہے یہ فورمین حضرات اپنے ہم وطنوں پر انگریزی دانی کا رعب جمانا ترک کر دیں گے۔

بی بی سی کے ریڈیو پروگرام میں زہرہ نگاہ کی شرکت

گذشتہ اتوار کو بی بی سی کے ریڈیو پروگرام میں پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کا انٹرویو اور ان کا تازہ کلام خاصا دلچسپ تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ منی اسکرٹ کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے تو زہرہ نگاہ نے جواب دیا کہ "منی اسکرٹ تو برطانوی باشندے بھی زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس لیے یہ لباس عورتوں کے لیے کوئی مناسب پہناوا نہیں"

زہرہ نگاہ جو اس سے پیشتر بھی برطانیہ کا دورہ کر چکی ہیں اس بات کی بہت قائل نظر آتی تھیں کہ یہاں کے ہوٹلوں میں نہ صرف صفائی بہت ہے بلکہ کھانا بھی اب پہلے سے اچھا ملتا ہے۔

وقت کی کمی کے باعث اس پروگرام میں اپنے دلنواز ترنم سے صرف ایک غزل سنا سکیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

جو لوگ زمانۂ حال کے ادبی رجحانات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ غالباً میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ گذشتہ چند برسوں سے ہندستان کے اردو رسالوں میں بڑی جان سی پڑ گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ دلچسپ اور گرما گرم بحثیں ہیں جو نئی شاعری کے بارے میں ہو رہی ہیں یہ بحثیں مضامین و مقالات کے علاوہ ان مکاتیب و مراسلات کی صورت میں بھی سامنے آ رہی ہیں جن میں نیا اور پرانا ناقد، نیا اور پرانا شاعر اور نئے اور پرانے قاری سبھی حصہ لے رہے ہیں۔ ان ادبی بحثوں نے کبھی کبھی مناظرے اور مجادلے کی صورت اختیار کر لی ہے یہ فیصلہ کرنا کہ کون صحیح راستے پر ہے اور کس کی طرف سے ہٹ دھرمی کا اظہار ہو رہا ہے ابھی قبل از وقت ہے۔ ادب میں عصری تقاضوں اور اس سے پیدا شدہ تبدیلیوں کے عمل کو نہ پہلے کوئی روک سکا ہے اور نہ اب روک سکتا ہے طرزِ احساس ذہنی رویّہ اور اسلوبِ اظہار کا جامد اور اٹل ہونا تو تشویشناک ہو سکتا ہے، ان کی تبدیلی اور شکست و ریخت سے اس قدر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زبان میں اس سے پہلے نئی شاعری کی دو منزلیں آ چکی ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ آزاد اور حالی نے جس نئی شاعری کا پرچم بلند کیا اس کی مخالفت میں سینہ سپر ہونے والے اس زمانے کے قدامت پسند شعراء (مع اودھ پنچ گروپ) اپنی جگہ پر مخلص رہے ہوں گے اور انھیں واقعی اس وقت کی نئی شاعری اردو زبان اور اس کی دیرینہ روایات کے حق میں ایک خطرہ معلوم ہوتی ہوگی۔ نئی شاعری کی دوسری منزل وہ تھی جب ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ نئے رویّوں نے جنم لیا اس وقت اسے جن مخلصین ادب سے سابقہ پڑا (ظفر علی خاں، آثر، اختر علی تلہری، ماہر القادری اور مذاق گروپ کے لوگ تھے۔ اب جبکہ نئی شاعری اپنی تیسری منزل میں قدم رکھ رہی ہے اور بعض "تازہ ترین میلانات" کے ساتھ سامنے آ رہی ہے اسے پھر اپنے بزرگوں کی تلخ و ترش باتیں سننی پڑ رہی ہیں میری ان باتوں کا ہرگز یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ نئی شاعری کے معترضین میں اور ظفر علی خاں، آثر، اختر علی تلہری یا ماہر القادری وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ نئی شاعری کے معترضین ان سے مختلف ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کی ذہنی سطح بلند ہے بلکہ ان کے اعتراضات کی نوعیت بھی بدلی ہوئی ہے۔ یہ حضرات اصولی طور پر شعر و ادب میں تبدیلی کے عمل کو جائز اور فطری سمجھتے ہیں، یہ اس بات کا کبھی دبی زبان سے اور کبھی صاف صاف اقرار بھی کرتے ہیں کہ نئی شاعری سب کی سب بری نہیں ہے بلکہ نئے شعراء میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے کلام کو [illegible] کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے یہاں قابلِ قدر عناصر پاتے ہیں [illegible] شاعری کے معترضین کی اس لحاظ سے بھی قدر کرتا ہوں کہ انھیں [illegible] رسالے کے ادب اور ادیب اور ادبی رویّوں سے دلچسپی ہے اور [illegible] میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی شمولیت کو بھی وہ ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اُن گوشہ نشین بزرگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ تعریف ہیں جو زندگی اور زمانے سے بے تعلق ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنے قلم کی روشنائی خشک کر چکے ہیں بلکہ اب انھیں دوسروں کے لکھے ہوئے الفاظ اور حروف کے پڑھنے میں عار محسوس ہوتا ہے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ نئی شاعری سے متعلق گفتگو عام طور پر عمومی اور مبہم ہوتی ہے۔ ابہام کا اعتراض نئے شاعروں پر ہے لیکن اس کا شکار در اصل ہماری تنقیدیں اور ہماری بحثیں ہیں۔ ہم تعریف بھی کرنے سے جھجکتے ہیں اور اعتراض کرتے ہوئے بھی ان لوگوں کا نام لینے سے گریز کرتے ہیں جن پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ نئی شاعری میں کھرا کیا ہے اور کھوٹا کیا ہے؟ نئی شاعری نئی ہے بھی یا نہیں؟ کیا اس نے تمام پچھلی روایتوں کو منسوخ کر دیا ہے؟ کیا نئی شاعری میں رویّے کی تبدیلی اور طرزِ احساس اور پیرایۂ اظہار کی تازگی تمام تر مسترد کر دینے کے قابل ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر کتنا حصہ قابلِ قبول ہے؟ کیا نئی شاعری کسی ایسے فرد کی تخلیق ہے جو سماج سے کٹ کر ایک علیحدہ اکائی بن چکا ہے اور سماج سے اس کا کسی قسم کا تعلق باقی نہیں ہے؟ یا اس شاعری میں سماج سے متعلق فرد کی بے اطمینانی اور اس بے اطمینانی کے نتیجے میں کرب و اضطراب کا اظہار ہے؟ کیا یہ بات نہیں ہے کہ نیا شاعر عقائد، اقدار اور خوابوں کی شکست کا المیہ اسی لیے پیش کر رہا ہے کہ اسے کچھ عقائد، اقدار اور خوابوں کی ضرورت ہے؟ کیا پرانے عقائد، اقدار اور خوابوں کی شکست فرضی باتیں ہیں اور ان کا آج کے سماجی نظام میں کوئی وجود نہیں ہے؟ کیا موجودہ اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی زاویوں

غزل

شہریار

صدائے دل کا یہ احساں مجھ پہ تھوڑا ہے
میں سو رہا تھا مجھے نیند سے جھنجوڑا ہے
خفا ہے ایک جہاں اہلِ شوق سے یارو
رُخِ حیات نئی سمت کو جو موڑا ہے
اضافہ روز ہی آبادیوں میں ہوتا ہے
جہاں میں اہلِ تمنا کا پھر بھی توڑا ہے
کسی افق پہ نہ جب روشنی نظر آئی
مری نگاہ نے رشتہ خلا سے جوڑا ہے
ابھی سے مجھ کو رقیبوں میں اب ہے گننے لگے
ابھی تو میں نے خموشی کا سحر توڑا ہے

مراسلات

جاسوسی ادب ایک ناسور

کچھ دنوں قبل 'ہماری زبان' بابت ۸ اکتوبر ۶۷ء میں ایک مراسلہ بعنوان "جاسوسی ادب اور نقاد" شائع ہوا تھا جس میں مراسلہ نگار نے جاسوسی ادب کی خوبیوں کو گناتے ہوئے اور اس کی افادیت پر زور دیتے ہوئے اس ادب کو نقاد صاحبان کی توجہ کا مستحق قرار دینے کی سعی فرمائی ہے اور بطور ثبوت مثالیں بھی پیش کی ہیں ممکن ہے ان کا خیال درست ہو مگر مجھے اس باب میں ان سے اختلاف ہے لہذا اس اختلاف کو قارئین ہماری زبان تک پہنچانے کے لیے 'ہماری زبان' کا سہارا لے رہا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ جاسوسی ادب نے مختصر عرصہ میں بہت زیادہ ترقی کی ہے اور سطحی ذہن رکھنے والوں میں کافی مقبول ہوا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز کا کم مدت میں رائج ہو جانا کیا اس کی افادیت کی ضامن ہے؟ ہمعصر اور ریگن جیسی سستی موٹی اور مہلک سیریز آناً فاناً پھیلتی چلی جا رہی ہیں مگر کیا ہم ان میں افادہ مانتے ہیں؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ناول میں طرح طرح کے مجرمانہ ہتھکنڈوں سے محظوظ رہا جا سکتا ہے مگر کیا مجرم کا کردار کچی عمر کے بچوں پر ناگوار اثر نہیں چھوڑتا ہے؟ اس میں کیا شک کی گنجائش ہے کہ مصنف کا جاسوس یا مجرم کی زبان سے ادا کرایا ہوا فقرہ یا کرائی گئی حرکت پڑھنے والوں پر ایسا اثر چھوڑ جاتی ہے نتیجے کے طور پر وہ لوگ گھروں میں ان حربوں کو آزماتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں یہ باتیں رچ بس جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ جرائم کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ ناول کے انجام میں مجرم کی گرفتاری نفرت کے جذبہ کو ابھارتی ہے اور پڑھنے والا اس پیشہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ایک حد تک صحیح ہے مگر اس بات سے تو کوئی منکر نہیں ہو سکتا کہ اچھی باتوں کا جو اثر پڑتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے جبکہ بری عادتوں کا اثر دیرپا ہوتا ہے مثال کے طور پر آپ سماج کو دیکھئے شاید ہی کچھ لوگ ایسے ملیں جو تصویر (PICTURE) دیکھ کر اس سے نصیحت حاصل کرتے ہوں ورنہ لوگ فیشن پرستی اور دیگر لغویات کو سیکھتے ہیں۔ لہذا ایسی تصویریں، فلم یا جاسوسی ناول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جاسوسی ناول ہمیں سستی تفریح مہیا کرتا ہے جو جرائم کے ساتھ ہلکی پھلکی تفریح سے پر ہوتا ہے اور ہمیں وقتی سرور مہیا کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ گھسی پٹی کہانیوں اور اوچھے مکالموں کے ذریعہ ہمارے ذہن کو سطحی بنا دیتا ہے جو صرف سطحی طور پر سوچنے سمجھنے کے لائق رہ جاتا ہے۔ ہمارا ذہن کسی بات کی گہرائی میں جانے سے گھبراتا ہے نتیجے کے طور پر باریک بینی رخصت ہو جاتی ہے اور ادب کی معیاری کتابیں خشک معلوم ہونے لگتی ہیں۔

کسی کتاب کی اہمیت کا انحصار مصنف کی تحریر پر ہوتا ہے نہ کہ کسی اور کے گھسے پٹے کردار پر۔ اگر کسی جاسوسی ناول کے مصنف کا تخلیق کردار قبول عام ہو جاتا ہے تو ہر مصنف اس کردار کو اپنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا بھرم کھو بیٹھتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی جاسوسی ناول کو ایک بار پڑھنے کے بعد اس کی وقعت پڑھنے والے کی نظر میں یکسر ختم ہو جاتی ہے؟ کسی مصنف کا وہ کردار جو قبول عام ہو چکا ہے ہر مصنف کا اس کو تختۂ مشق بنانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

المختصر ہمارے نوجوانوں میں مجرمانہ حرکت کی داغ بیل ڈالنے میں جاسوسی ناول نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادب نہیں، ادب کے نام پر ایک ناسور ہے جسے سستی شہرت کے متمنی پیشہ ور ادیب اور پیسہ کمانے والے ملک بشور نے والے سیٹھ، ساہوکاروں نے ادب کا نام دے کر عوام کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ ایک دن وہ آنے والا ہے جب پٹی کھلے گی، وہ دن دور نہیں جب جاسوسی ادب کی قلعی کھلے گی، تو عوام دیکھیں گے کہ جاسوسی ادب، ادب کے نام پر کلنک کا ٹیکہ تھا جسے نہ جانے وہ کیا کیا سمجھے ہوئے تھے۔

یوں تو اس پر برائیاں اور خامیاں ہی ہیں کہ صفحہ کا صفحہ سیاہ کیا جا سکتا ہے مگر میں نے مختصر طور پر مندرجہ بالا سطور میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اور صاحبان بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

(محمد یوسف)

ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادف کیا ہیں؟

(۱)

RESURRECTION کا اردو ترجمہ کیا ہے؟ اصطلاحی معنوں میں ریسرکشن یوم حشر کو کہتے ہیں۔ وہ دن جب تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا ہے لیکن میں نے انگریزی میں اس لفظ کو اکثر جگہ کسی بھی چیز کے دوبارہ زندہ کرنے کے معنوں میں دیکھا ہے

میرے خیال میں اس کے لیے "احیا" کا لفظ موزوں ہے "تجدید" کا لفظ عموماً تجدید کے معنوں میں مستعمل ہے لیکن دونوں میں کافی فرق ہے احیا، حیات دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ تجدید، ایک کہنہ کے جدید کو جواب بن گیا ہے، پھر سے رواج دینے کے معنوں میں آتا ہے تجدید میں ارتقا کا عنصر برقرار رہتا ہے خواہ وہ کمی ارتقا ہی کیوں نہ ہو یعنی اس کا سلسلہ بدستور رہتا ہے کوئی کڑی ٹوٹتی نہیں لیکن احیا میں ایک عمل یک لخت رک جاتا ہے یہی عمل دوبارہ جاری ہو تو گویا اسے حیات نو ملی ہے

میری گزارش ہے کہ ارباب زبان اس پر روشنی ڈالیں۔

(ن۔م سعید)

(۲)

HOME-SICK کے لیے اردو میں کون سا مترادف لفظ لائیں گے؟ ... ہماری زبان کے ذریعہ اس کی اطلاع دیں۔ (سید عبد الخالق)

(۳)

قارئین ہماری زبان سے گزارش ہے کہ HONEYMOON کا اردو میں صحیح ترجمہ کیا ہوگا جب کہ بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس کا ترجمہ اس طرح سے ہوتا ہے۔ ۱۔ "لیلۃ العسل" ۲۔ ماہ عسل ۳۔ شب عروسی۔ ۴۔ شب زفاف۔ ۵۔ شب دوشیزہ

اگر "شبنم" کا ترجمہ "شبہ شبنم" کیا جائے تو اہلِ زبان کی رائے کیا ہے۔

(مبین احمد خاں)

ڈاکٹر مسعود عالم کے استفسار کے جواب میں

ہماری زبان ۱۵ نومبر ۶۷ء میں ڈاکٹر مسعود عالم کا ایک استفسار شایع ہوا ہے۔ ڈاکٹر مسعود عالم کی خدمت میں عرض ہے کہ حیدرآباد دکن میں ناکتخدا لڑکی کے صاحبزادی۔ استعمال ہوتا ہے ڈنکن فوربس کی ڈکشنری مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں بھی مِس موجود ہے۔ اردو زبان میں مِس یا کماری کے بجائے یہی استعمال مناسب ہے۔ مِس کے ایک سے زیادہ معنی ہیں۔ (سجاد مرزا)

علمی مسئلے کے بارے میں مزید تحقیق

میں نے ہماری زبان مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء میں حروف ٹ، ڈ، ڑ کی نسبت چار نقطوں کی بجائے ط لکھنے کے تعلق سے مولوی محمد حسین آزاد کو ان کا مصلح اور موجد قرار دیا تھا۔ میرا یہ ادّعا بلحاظ کتابت مشرقی ہند اور جنوبی ہند کی حد تک صحیح ہے۔ چنانچہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں، جو کئی ہزار قلمی کتابوں کے علاوہ پندرہ ہزار مطبوعات پر مشتمل ہے، تین اردو کتابیں انیسویں صدی کے اوائل کی ایسی ملیں، جن میں مذکورۂ بالا حروف کی کتابت میں (ط) کا وجود نہیں ہے۔ ان میں (۱) تپ اور اس کے علاج کا رسالہ مترجمہ حکیم مولوی عبد المجید مطبوعہ ۱۸۳۱ء، (۲) منہاج العابدین (ترجمۂ کیمیائے سعادت) مترجمہ محمد مہدی مطبوعہ ۱۸۵۸ء مطبع مظہر العجائب مدراس (۳) اصول جر ثقیل مترجمہ ... جہاں مطبوعہ ۱۸۶۵ء مطبع انوار اعظم مدراس ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کتاب مصادر الافعال مولفہ سید عبد الفتاح مدرس عربی فارسی ایلفنسٹن مطبوعہ ۱۸۷۰ء مطبع حیدری بمبئی ہے، جو میرے پاس موجود ہے۔ اسی بنا پر میں نے مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کو مصلح و موجد بیان کیا لیکن شمالی ہند کی مطبوعات کی مزید چھان بین کرنے پر موصوف کی بابت میرا خیال غلط ثابت ہوا، کیونکہ شمالی ہند اور جنوبی ہند میں ٹ، ڈ، ڑ کی کتابت میں فرق پایا گیا، وہاں ان کی جگہ (ط) ہی لکھی جاتی اور یہاں ابتدا میں چار نقطے دئے جاتے رہے بعد میں (ط) کا استعمال ہوا۔

واضح ہو کہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج اور ۱۸۰۱ء میں اس کا ٹائپ پریس قائم ہوا اور ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۲۹ء تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر فارسی خط کے ٹائپ پریس نجی طور پر قائم ہوئے جن میں کتابیں اور اخبارات چھپتے رہے۔ فارسی خط کے ٹائپ پریس کا موجد چارلس ولکنس تھا، جو مشرقی علوم کا ماہر تھا۔ اس نے پہلے بنگلہ اور فارسی خط کے ٹائپ تیار کئے ۱۸۳۰ء میں ہندوستان کی سرکاری زبان اردو قرار پائی اور اسی سال کلکتہ میں مسٹر آرچر نے سب سے پہلا لیتھو پریس قائم کیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان میں لیتھو پریسوں کی ابتدا ہوئی اور کتابوں اور اخبارات کی طباعت و اشاعت انہی کے ذریعے ہونے لگی۔

میرا خیال ہے کہ فارسی خط کا ٹائپ تیار کرتے وقت ہی فورٹ ولیم کالج کلکتہ ہی میں اہلِ علم کے مشورے سے اوپر کے حروف کی لکھاوٹ میں اصلاح کی گئی۔ رفتہ رفتہ اس میں اور بھی اصلاحیں ہوئیں۔ چنانچہ کالج مذکور کی ۱۸۰۱ء کی مطبوعات میں ان حرفوں کا ٹائپ یوں تھا۔ مثلاً: ٹ = تؔ، ڈ = دؔ، ڑ = رؔ۔ مجھے ادارے کے کتب خانے میں مترجم انجیلِ مقدس کا ایک نسخہ ملا، جو مشین پریس سری رام پور کا ۱۸۰۹ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ ہنری مارٹن نے کیا ہے اور یہ مرزا فطرت منشی فورٹ ولیم کالج اور دیگر صاحبان کا اصلاح شدہ ہے اس ٹائپ میں پہلے کی نسبت زیادہ اصلاح ہوئی ہے۔ اس میں اوپر کے حروف اس طرح ٹائپ ہیں مثلاً: ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔

جیسے جیسے شمالی ہند میں لیتھو کا چلن شروع ہوا، ساتھ ہی ساتھ اس پر ٹائپ کا بھی اثر پڑا۔ لیتھو کی کتابوں اور اخبارات میں ان حروف کی کتابت میں ٹائپ کی تقلید کی جانے لگی۔ اس کا ثبوت ادارے کے کتب خانے کی مندرجہ ذیل کتابوں اور اخبارات کی کتابت سے ملتا ہے۔

(الف) کتب (۱) رسالۂ ہیئت مترجمہ سید کمال الدین حیدر ۱۸۴۷ء مطبع سلطانی لکھنؤ۔ ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔

(۲) کھیت کرم مولفہ کالی رائے۔ ۱۸۴۹ء۔ دہلی اردو اخبار پریس

ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔

(۳) قیامت نامہ مترجمہ محمد رضا ۱۸۵۹ء۔ مطبع مصطفائی کانپور

ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔

(ب) اخبارات۔ (۱) فوائد الناظرین، ایڈیٹر ماسٹر رام چندر ۱۸۴۶ء چھاپہ خانہ اردو دہلی اخبار۔

ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ

(۲) دہلی اردو اخبار، ایڈیٹر محمد باقر۔ ۱۸۵۰ء دہلی اردو اخبار پریس۔

ٹ = تؕ، ڈ = دؕ، ڑ = رؕ۔

اوپر کے مذکورہ خاکے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹ، ڈ اور ڑ کی کتابت میں (ط) کا استعمال ۱۸۰۹ء (قیامِ مشین پریس سری رام پور) کے بعد سے آغاز ہوا۔ اس کا عمل پہلے ٹائپ میں ہوا اور آخر میں لیتھو میں۔ (غلام رسول مصلحِ اردو رسمِ خط)

سہ لسانی فارمولا اور اردو

اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام سمپوزیم

اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام سہ لسانی فارمولا اور اردو کے موضوع پر ایک سمپوزیم ہوا۔ سید عالم خوندمیری صاحب نے تقریر کرتے ہوئے بعض اہم مسائل پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں نے جو عتیق داری رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے بڑا نقصان پہونچ رہا ہے اس لیے یہ رویہ ختم ہو جانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی بہ یک وقت علاقائی اور رابطہ کی زبان نہیں بن سکی۔ اگر ہندی کو یہ درجہ دے دیا گیا تو نہ صرف تمام علاقائی زبانوں کا موقف کمزور ہو جائے گا بلکہ ہندی والوں کو ہمیشہ کے لیے غیر ہندی علاقوں پر برتری اور بالادستی حاصل ہو جائے گی جس کو کوئی جمہوریت پسند برداشت نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ جس علاقے کو ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے وہ دراصل کئی زبانوں کے علاقوں پر مشتمل ہے، وہ دن دور نہیں جب کہ ان علاقوں کی زبانیں اپنا حق مانگیں گی اور نام نہاد ہندی علاقہ سمٹ کر رہ جائے گا۔ عالم صاحب نے انگریزی زبان کی مخالفت کرنے والوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ ہم پر بیرونی دنیا کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی تو ایک طرف ملک کی وحدت کو سخت نقصان پہونچے گا اور ملک مختلف حصوں میں بٹ جائے گا۔ اور دوسری طرف ہم بین الاقوامی رابطے کی ایک ایسی زبان سے محروم ہو جائیں گے جس نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ کو ترقی دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں دو ہی زبانیں ایسی ہیں جو رابطے کی زبان بن سکتی ہیں، ایک انگریزی اور دوسرے اردو بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی دو زبانیں آج رابطہ کی زبان کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ اس عقیدت اردو کے مقدمے کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ عالم صاحب نے دستور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی مقدس کتاب نہیں جس میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر دستور میں اردو کے جائز حق کی تعمیل کی گنجائش نہیں ہے تو اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین نے اپنی تقریر میں دو لسانی اور سہ لسانی فارمولوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو دو لسانی فارمولا پیش کیا تھا وہ انتہائی حقیقت پسندانہ تھا۔ اگر اس فارمولے کو قبول کر لیا جائے اور اس پر دیانت داری کے ساتھ عمل کیا جائے تو ہندوستان کا لسانی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مخدوم صاحب نے کہا کہ اردو کا مسئلہ فرقہ واریت، فسطائیت اور لسانی سامراج کے خلاف جہاد بن گیا ہے۔ اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، پنجاب، راجستھان اور بعض دوسری ریاستوں میں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ ملنا چاہئے۔ ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۴ کروڑ سے زیادہ ہے اس لیے اس کو نظرانداز کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مخدوم نے سوویٹ یونین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہاں چھوٹی چھوٹی زبانوں کو ترقی دی گئی اور ایسی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا جن کا اپنا کوئی رسم خط نہیں تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سوویٹ یونین میں روسی زبان کو دوسری زبان بولنے والوں پر مسلط نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک روسی زبان سیکھتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی کسی زبان کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہئے۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے مخدوم نے کہا کہ اردو والوں کو تحتانی درجوں سے لیکر یونیورسٹی سطح تک اردو میں تعلیم پانے کے مواقع دیئے جانے چاہئیں اور اردو والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس علاقے میں بستے ہیں اس علاقے کی زبان کے سیکھنے میں کوتاہی نہ کریں۔ پروفیسر حبیب الرحمن نے ہندی والوں کی عصبیت پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اردو ہی کو نہیں خود ہندی زبان کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے جنوبی ہند میں ہندی کے خلاف جو جذبات ابھر رہے ہیں اس کے ذمہ دار خود ہندی والے ہیں اگر اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو رابطے کی زبان کی حیثیت سے ہندی کے رواج کے امکانات محدود بلکہ معدوم ہو جائیں گے۔ سہ لسانی فارمولے اور اردو کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ جہاں تک آندھرا پردیش کے اردو والوں کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں ہر سطح پر اپنی مادری زبان میں تعلیم کا موقع حاصل رہنا چاہئے انھوں نے حسینی شاہد کی پیش کی ہوئی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے طالب علم کی تعلیم کا آغاز اردو سے ہوگا دوسرے مرحلے پر اس کو تلگو پڑھنی چاہئے تیسرے مرحلے پر اس کو اختیار دیا جانا چاہئے کہ وہ ہندی اور انگریزی میں سے کسی ایک زبان کو منتخب کرے۔ انھوں نے کہا جہاں تک افادیت کا تعلق ہے ہندی کے مقابلے میں انگریزی زیادہ کارآمد ہوگی۔ اس لیے وہ شخصی طور پر اردو والوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اسٹیج پر انگریزی زبان سیکھیں انھوں نے کہا کہ ہندی سے عدم واقفیت کا کوئی نقصان اس لیے نہیں ہو سکتا کہ فی الحال انگریزی ہی رابطہ کی زبان کی حیثیت سے برقرار ہے اور جب ہندی انگریزی کی جگہ لے گی تو ہمارا طالب علم انگریزی کی بجائے ہندی پڑھ سکتا ہے۔ ہندی اور اردو کے فرق کے تعلق سے حبیب الرحمن صاحب نے کہا کہ ان کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

اس لیے ہمارے طالب علم اگر دیوناگری رسم خط سیکھ لیں تو آسان ہندی میں اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ یہی دراصل مستقبل کی ہندی ہوگی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اگر ہم وسعت نظر سے کام لیں تو لسانی مناقشے آسانی کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں۔ اگر سہ لسانی فارمولے کو کسی ذہنی تحفظ کے بغیر رائج کیا جائے تو ملک کی تمام زبانوں کی ترقی کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اترپردیش میں محض اردو دشمنی کی وجہ سے سہ لسانی فارمولے کو مسخ کیا گیا اور اردو کی جگہ سنسکرت کو ٹھونسا گیا انگریزی کے تعلق سے انھوں نے کہا یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزی زیادہ دنوں تک ہندوستان میں رائج نہیں رہ سکتی ہے علاقائی زبانیں اس کی جگہ لے کر رہیں گی انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی میں کوئی بیر نہیں ہے ہندوستان کی یہی دو زبانیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ترین ہیں ہندی کے انتہاپسند اس ایک بات کو سمجھ لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سہ لسانی فارمولا اور اردو کے تعلق سے جو تجویز اس سمپوزیم میں رکھی گئی ہے وہی اردو والوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی اور اس کو آندھرا پردیش میں آسانی کے ساتھ روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔

R. No. 2186/57 — Regd. No. L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-t5-22

Phone—20
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

جلد ۲۷ - شمارہ ۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

زبان کے معاملے میں ہوش مندی کی ضرورت

سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں زبان کے مسئلے پر اتنے ہنگامے کیوں ہوتے ہیں۔ زبان کا سوال بہت اہم ہے، خصوصاً ملک کے لیے ایک سرکاری زبان کا، مگر انگریزی کے خلاف شمالی ہند میں اور ہندی کے خلاف جنوبی ہند میں جو ہنگامے ہوئے ہیں، ان کا کسی طرح کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک میں ایک زبان کو مرکزی زبان مان لینا آسان نہیں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ برسوں کے بنے بنائے نقشے کو چند دن میں بگاڑ کر رکھ دینا کسی طرح عقلمندی نہیں ہے۔ مگر اس معاملے میں سیاسی پارٹیاں، ماہرین تعلیم ماہرین لسانیات بھی مل کر سر جوڑ کر بیٹھتے اور ایک متفقہ حل تجویز کرتے تو بہتر ہوتا۔ مگر یہاں تو معاملہ سڑکوں پر طے ہو رہا ہے اور کچھ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بسوں اور ریلوں کو جلا کر یا تار کاٹ کر یا ناموں کی تختیاں توڑ کر وہ اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ دراصل جیسا کہ کرشنا مینن نے کہا ہے زبان کے مسئلے کو اس قدر ہوا دینا، ایک طرح ملک کے دوسرے زیادہ اہم مسائل، مثلاً غذا کا معاملہ یا بے روزگاری کا معاملہ یا جہالت کا معاملہ یا معیار زندگی بڑھانے کا معاملہ جیسے مسائل کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہے۔ بات یہ ہے کہ موجودہ حالات پر نوجوانوں کو غصہ ہے۔ ان کے سامنے کوئی روشن مستقبل نہیں۔ ان کے بزرگوں نے خدمت اور محنت کا کوئی معیار ان کے سامنے نہیں رکھا۔ ان کی تخلیقی صلاحیت بروئے کار نہیں آئی۔ انھیں ایک جامد نظام تعلیم کے سائے میں زندگی بسر کرنا پڑ رہی ہے۔ سماج میں اخلاقی قدروں کا زوال دیکھ رہے ہیں۔ خلوص، محبت، سچائی، نیکی کی پامالی ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ رشوت، چور بازاری، دھوکا دھڑی، گروہ بندی، اقربا پروری، ذات پات رکھنے کی پاسداری، تنگ نظری عام ہے۔ مشترک خاندان کا زور ٹوٹ چکا، صنعتی زندگی نے خود کی قدریں بدل دیں۔ سستی سیاست نے دھوکے اور فریب اور اشتہار بازی کے چلتے پھرتے نمونے دکھا دیے۔ اس عالم میں جذبات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور جو سیاسی پارٹیاں جذبات سے کھیلتی ہیں ان کی چاندی ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی آج ہمارے ملک کے نوجوانوں کے جذبات سے کچھ سیاسی پارٹیاں کھیل رہی ہیں۔ اس لیے تمام دانشوروں، معلموں، قومی کارکنوں اور دیش بھگتوں کا فرض ہے کہ زبان کے مسئلے کو سستی سیاست سے ہٹا لیں۔ پر زور اور ہر طرح کے ہنگاموں کی پر زور مذمت کریں۔ ان ہنگاموں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ہاں پورے ملک میں بدامنی اور تشدد کا دور دورہ ہو رہا ہے اور ملک کی وحدت اور سالمیت خطرے میں ہے۔ اس وقت ہم سب کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ انتہاپسندی سے بچیں۔ اپنی زبان کی ترقی کے لیے دوسری زبانوں کو بے دخل کرنے کی کوشش نہ کریں، ملک کی کسی زبان سے نفرت نہ کریں، جب تک مرکز کے لیے کسی ایک زبان پر سب کا اتفاق نہ ہو جائے اس وقت تک انگریزی کو مرکز میں استعمال کرنے میں شرم یا ذلت محسوس نہ کریں۔ یوں بھی انگریزی کا ایک اچھا معیار اعلیٰ تعلیم کے لیے پھر بھی ضروری رہے گا کیونکہ اس کے بغیر ہم جدید دور کے علمی معیاروں تک نہ پہنچ سکیں گے۔ ہمیں اپنی تمام قومی زبانوں کو ترقی دینا ہے اور اس کے لیے ہمیں ابھی بہت کام کرنا ہے۔ ان زبانوں کو رفتہ رفتہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ضرور بننا چاہیے اور اس کے لیے مناسب انتظامات جلد شروع کر دینے چاہئیں مگر پہلے ابتدائی و ثانوی منزل پر اچھی کتابوں اور تربیت یافتہ اساتذہ اور مناسب معیار کی طرف سے اطمینان ہو جانا چاہیے۔ زبان کے معاملہ میں جوش کی کم اور ہوش کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہندوستان کی وحدت اور سالمیت اگر ہمیں عزیز ہے تو ہمیں بڑی ہوش مندی کا ثبوت دینا ہوگا۔

سی ڈے لیوس کو اعزاز

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ انگلستان کے نئے سال کے خطابات میں مشہور شاعر اور نقاد سیسل ڈے لیوس کو جان میسفیلڈ کے انتقال پر ملک الشعرا بنایا گیا ہے۔ بظاہر اس خطاب کی کوئی ادبی اہمیت اب نہیں رہی، مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ خطاب محض سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ ادبی شہرت اور منصب کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ سیسل ڈے لیوس کا نام بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں آڈن، اسپنڈر اور میک نیس کے ساتھ چمکا اور جدید انگریزی شاعری میں ان کی ایک قابل قدر جگہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو مشہور کتابیں THE POETIC IMAGE اور A HOPE FOR POETRY انگریزی تنقید میں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں شاعری کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ڈے لیوس نے اس خبر کو سن کر جو بات کہی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بناوٹ یا دکھاوا نہیں ہے۔ [illegible]

[illegible]

ہندہ رہے گا اگر انگریزی حکومت کا یہ اعتراف اس حکومت اور اس سماج کی نظر کی صحت کی دلیل ضرور ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

بڑی خوشی کی بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم مقرر ہوئے ہیں۔ اب تک ڈاکٹر علیم عربی کے شعبہ کے صدر اور ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر تھے۔ وہ ایک ممتاز معلم اور ایک قابل قدر مصنف ہیں۔ وہ اردو میں سماجی تنقید کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے متعدد تنقیدی مضامین ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ایک زمانہ میں وہ رسالہ جامعہ کی ادارت میں بھی شریک رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اُردو ہند سے ان کا تعلق بہت گہرا ہے اور وہ انجمن کی مجلس عام، مجلس عاملہ اور مالی مجلس کے ممبر ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے خاصی مدت تک ٹریژرر رہ چکے ہیں۔ تعلیمی مسائل سے انھیں گہری دلچسپی ہے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں نیا سمسٹر کورس شروع کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی قیادت میں یونی ورسٹی ترقی کرے گی اس کا علمی وقار بڑھے گا، اور وہ ملک میں اپنے تہذیبی اور ادبی رول کو اور نمایاں کرے گی یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ان کے تقرر کو عام علمی و تعلیمی حلقوں میں سراہا گیا ہے۔

تاجکستان میں فارسی زبان و ادب پر سمپوزیم ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی شرکت

علی گڑھ۔ علمی اور ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ فارسی کے اسکالر اور اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر منیب الرحمٰن ہم عصر فارسی زبان و ادب پر ایک خاص سمپوزیم میں شرکت کے لیے تاجکستان گئے ہوئے تھے۔ یہ سمپوزیم دوشنبہ میں ہوا اور اس میں ایران، افغانستان، ہندوستان، ازبکستان اور تاجکستان کے نمائندے شریک ہوئے۔ سمپوزیم ۱۲ دسمبر سے شروع ہو کر ۱۶ دسمبر تک جاری رہا (نامہ نگار)

جسٹس محمود کا اردو میں فیصلہ

الہ آباد۔ یہاں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کیلاش ناتھ وانچو نے الہ آباد ہائی کورٹ میں پرانے قانونی کاغذات اور ریکارڈ کے میوزیم (عجائب گھر) کا افتتاح کیا۔

شمالی ہند میں عدلیہ کی ارتقائی کہانی بیان کرنے والے ان دستاویزات میں اردو میں لکھا ہوا ایک فیصلہ بھی ہے جو جسٹس سید محمود نے تحریر کیا تھا۔

جسٹس سید محمود سرسید احمد خاں کے فرزند تھے اور الہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے۔ وہ ۱۸۸۰ء میں جج مقرر ہوئے تھے۔ (قومی آواز)

شاہد کبیر

غزل

تھک کے بیٹھو گا جس گھڑی جوگی
رات اس لمحے سے شروع ہو گی

حرج کیا ہے یہیں برس جاؤ
اے گھٹاؤ! کہیں تو برسو گی

یہ امنگیں ہیں تیرے آنے تک
پھر کوئی آرزو کہاں ہو گی

زیست کے فلسفوں سے کچھ نہ ہوا
مر گیا کل حیات کا روگی

سب سے کرتی ہو تذکرہ میرا
مجھ سے کب میرا حال پوچھو گی

نوجوان ادیب انور سدید یونیورسٹی میں اول آئے

پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے اردو کے امتحان منعقدہ جون، ۱۹۶۷ء میں اردو کے معروف ادیب انور سدید اول آئے۔ انور سدید سرگودھا پاکستان سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں شریک امتحان ہوئے۔ وہ مغربی پاکستان کے محکمۂ آبپاشی میں انجینیر ہیں۔ ایم۔ اے اردو کے اس اعزاز پر انھیں پنجاب یونیورسٹی کے طلائی تمغے کے علاوہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا بابائے اردو گولڈ میڈل بھی عطا ہو گا۔

انور سدید کے مضامین اور افسانے وقیع ادبی پرچوں مثلاً اوراق، فنون، سیپ، افکار، ماہ نو اور اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ (ایک نامہ نگار)

پشتو زبان کے قواعد کا نایاب نسخہ

لینن گراڈ۔ ۲۳ دسمبر۔ لینن گراڈ کے سائنس دانوں کو ادارہ ایشیائی اقوام کے عجائب گھر میں محبت خاں کی تصنیف "ریاض المحبت" کا ایک نایاب قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ پشتو زبان کے قواعد سے متعلق اولین تصنیف ہے سویت سائنس دانوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب گزشتہ صدی کے اوائل میں کلکتہ میں لکھی گئی تھی یہ قلمی نسخہ کلکتہ کے اصل نسخہ کی نقل ہے۔ اصل نسخہ خود مصنف نے مرتب کیا تھا۔ ریاض المحبت ایک ایسا خزانہ ہے جس سے پشتو زبان کے تقابلی مطالعے میں مدد ملتی ہے پشتو زبان کے الفاظ کے تلفظ کی وضاحت کی پہلی کوشش اس کتاب میں کی گئی ہے۔

شاہکار کا احتشام حسین نمبر

الہ آباد۔ ہندوستان کا مشہور ادبی ڈائجسٹ "شاہکار" اُردو کے چوٹی کے نقاد پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت اور کارناموں پر ایک خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔ شاہکار کا حال ہی میں ایک ناولٹ نمبر بھی شائع ہوا ہے۔ جو حضرات ۳۰ جنوری تک گیارہ روپے منی آرڈر سے بھیج دیں گے انھیں یہ دونوں خاص نمبر رجسٹری سے اور باقی ۹ عام شمارے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں گے۔ وی پی نہیں کی جائیگی۔

منیجر شاہکار۔ ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

طیب انصاری

دورِ آصفی کے اردو رسائل

دکن ریویو

"دکن ریویو" حیدرآباد کے قدیم رسائل میں اپنے ترجموں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور یہی بات اس کی شہرت کی وجہ بھی بن گئی۔ ظفر علی خاں خود بھی صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ وہ بہ حیثیت شاعر کوئی اونچا مقام رکھتے ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی تحریر کی شوخی اور ترجمہ کی سلاست اور سادگی بہ حیثیت ادیب ناموری کے لیے کافی ہے۔ ان کے مشہور ترجموں میں مین دی ماسٹریس (مصنفہ کنلاک)، دی جنگل بک (مصنفہ رڈیارڈ کپلنگ) الفاروق (مصنفہ شبلی نعمانیؒ) اور پرشیا (مصنفہ لارڈ کرزن) بے حد مقبول ہوئے۔ ان ناولوں اور کتابوں کو انھوں نے اشرف المخلوقات، جنگل میں منگل، الفاروق اور خیاباں کے نام سے اردو میں منتقل کر کے سرمایۂ ادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔ ترجمہ کا کام یوں بھی جاں لیوا ہوتا ہے لیکن ظفر علی خاں کی انگریزی زبان سے واقفیت اور اردو زبان پر قدرت نے اس کام کو ان کے لیے سہل اور آسان بنا دیا۔ اردو زبان و ادب میں ترجمہ کی ہمیشہ ہی سے کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ آج بھی جبکہ انگریزی عام ہو چکی ہے ایسے ناولوں اور کتابوں کے ترجمے نایاب ہیں۔ دکن ریویو اس حیثیت سے بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ترجمہ شدہ ناولوں اور کتابوں کو شائع کیا گیا۔ خصوصاً انگلستان کے نامور ناول نگار و افسانہ نویس مسٹر رینالڈ کی مشہور و مقبول اور معرکۃ الآرا تصنیف "مسٹریز آف لندن" کا ترجمہ بنام "فسانۂ لندن" "دکن ریویو" کے ذریعہ اردو ادب میں منتقل کیا گیا۔ گو ابتدا میں اس فسانہ کو کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی لیکن جب علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ خریدا۔

ظفر علی خاں نے مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے مڈل کا امتحان پاس کیا پھر پٹیالہ گئے۔ علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے کیا۔ محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری رہے اور وہاں سے حیدرآباد پہنچے۔ فوج میں ملازم ہوئے پھر دارالترجمہ میں جگہ ملی۔ حضور نظام مرحوم نے انھیں "خیابان فارس" کے ترجمہ پر تین ہزار کی رقم عطا کی۔ لارڈ کرزن نے طلائی دستہ کی چھڑی پیش کی۔ فسانۂ لندن، سیر ظلمات اور معرکہ مذہب و سائنس اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ "جنگ روس و جاپان" کے نام سے ڈرامہ لکھا اور اسی دور میں "دکن ریویو" کے نام سے ۱۹۰۴ء میں ایک علمی رسالہ نکالا۔ حیدرآباد میں سازش کی وجہ سے اس کی ادارت چھوڑنی پڑی اور آخر انگریزوں کے خلاف سازش کے الزام میں ریاست سے نکل جانا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۶ء کا ہے۔ حیدرآباد چھوڑ کر وہ سالی لینڈ چلے گئے اور اسی سال بمبئی ٹائمس پہنچکر ٹائمس آف انڈیا بلڈنگ سے اس کا پہلا نمبر نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع کیا اور جب ۱۹۰۷ء میں سرکار حضور نظام نے شہر بدری کے احکامات کو منسوخ کر دیا تو موصوف نے حیدرآباد پہنچ کر پھر ایک بار پھر ایک بار دکن ریویو کو جاری کیا۔ چنانچہ شبیر الحق دسنوی کے بموجب "عدیم الفرصتی کے باعث مارچ و اپریل ۱۹۰۹ء (نمبر ۵ و ۶) کے مشترکہ پرچے کی اشاعت کے بعد ظفر علی خاں صاحب نے دکن ریویو کی ملکیت کا حق اور ایڈیٹری سید محمود احمد قادری تشنہ باغ صالک رام حیدرآباد کے نام منتقل کر دی جن کی ادارت میں مئی ۱۹۰۹ء سے پرچہ نکلنا شروع ہوا[1]

ہماری زبان نے اردو رسائل پر ۶۲ء اور ۶۳ء کے دوران مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا چنانچہ یکم فروری ۱۹۶۲ء ہی کے شمارے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اور شبیر الحق دسنوی نے "دکن ریویو" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ "رسالہ دکن ریویو" جو حیدرآباد سے مولوی ظفر علی خاں صاحب مرحوم ماہوار شائع کرتے تھے رسالہ نمبر ۹۔ جلد دوم ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے ٹائٹل پیج پر چار مینار کا نقش ہے اور اس کے اوپر "بہ سرپرستی مہاراجہ یمین السلطنت کے سی۔ آئی۔ ای دام اقبالہ وزیر اعظم دولت آصفیہ" درج ہے۔ چارمینار کے نیچے جلی حروف میں "افسانہ" اس کے نیچے یہ عبارت ہے:-

"اعلیٰ درجہ کے انگریزی ناولوں کے تراجم کا ماہوار رسالہ"

شبیر الحق دسنوی نے قدرے تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے اس مضمون کے بعد مستقل بحث کا آغاز ہو گیا چنانچہ بعد کو ابن علی بدایونی کا مضمون اسی سال یکم اگست کے شمارے میں شائع ہوا۔ ان دونوں مضامین کے اقتباسات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔ شبیر الحق نے لکھا ہے کہ "اس رسالے کی جلدیں پٹنہ کے ایک کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے الاصلاح لائبریری میں سنہ ہذا کی پانچ جلدیں محفوظ پائی جاتی ہیں۔ ان جلدوں کے بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن ریویو کی اشاعت جنوری ۱۹۰۴ء سے پہلے کی نہیں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد سے یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد۔۔۔ کی سرپرستی میں جولائی ۱۹۰۲ء سے افسانہ کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس میں موصوف "مسٹریز آف لندن" کا ترجمہ بنام فسانۂ لندن شائع کرتے تھے۔ اس افسانہ کی پہلی جلد ۱۹۰۳ء کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔

جنوری ۱۹۰۴ء سے صاحب موصوف نے دکن ریویو نکالنا شروع کیا اور رسالہ افسانہ کو دکن ریویو کے ساتھ ضم کر دیا۔ تیسری جلد کی تکمیل کے بعد ایڈیٹر مولوی ظفر علی خاں صاحب کی طبیعت بری طرح ناساز ہو گئی اور ان کی شدید علالت کے باعث اکتوبر ۱۹۰۵ء تک دکن ریویو بند رہا۔ اور نومبر ۱۹۰۶ء میں دکن ریویو سلسلۂ جدید جلد ۱ شمارہ ۱ ٹائمز آف انڈیا بلڈنگ بمبئی سے نکلنا شروع ہوا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کا رسالہ جلد ۱ نمبر ۲ بھی بمبئی ہی سے شائع ہوا۔ جنوری فروری ۱۹۰۷ء کے پرچے (۳-۴) بمبئی میں تیار رکھے تھے مگر ایڈیٹر ظفر علی خاں کے دفعتہً حیدرآباد چلے آنے کی وجہ سے ان کی اشاعت معرض التوا میں آ گئی اور یہ دونوں مشترکہ نمبر ناظرین کی خدمت میں حیدرآباد سے

---

[1] ہماری زبان یکم فروری ۶۲ء

پہنچ گئے۔ پھر مارچ ۱۹۰۷ء سے سلسلۂ جدید کے پرچے حیدرآباد سے نکلنے لگے مگر وقت کی پابندی ان پرچوں کی اشاعت میں کبھی ملحوظ نہیں رہی۔ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۱۹۰۷ء کا مشترکہ نمبر اسلام نمبر سلک اول کے نام سے نکلا اور ستمبر، اکتوبر ۱۹۰۷ء نمبر (۱۱-۱۲) کا مشترکہ نمبر جس پر اس سلسلۂ جدید جلد اول کا خاتمہ ہوا اسلام نمبر سلک دوم قرار پایا۔ اس جلد میں جسٹس بدرالدین طیب جی، مسٹر کریم بھائی ابراہیم، امیر حبیب اللہ خاں فرماں روائے افغانستان، سلطان ٹرکی شاہ آف پرشیا کے فوٹو شائع ہوئے ہیں۔ رسالہ کی پہلی دو جلدیں کتابی سائز پر نکلی تھیں۔

ایڈیٹر کے عرض مدعا، ماہ گزشتہ، مرقع مشاہیر، اردو فارسی غزلیں اور نظمیں۔ کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ریویو کے عنوان سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

دکن ریویو کے بمبئی سے شائع ہونے اور ظفر علی خاں کے شہر بدر ہونے کے بعد سمالی لینڈ پہنچ جانے کی داستان کو ابن علی بدایونی نے عجیب انداز میں لکھا ہے کہ کس طرح ظفر علی خاں پہلے پہل حیدرآباد پہنچے، رسالہ "افسانہ" کی اشاعت کا اصل سبب کیا ہے؟ اس مضمون سے ان ساری باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"واقعہ تو یہ ہے کہ ۱۸۹۵ء میں مولوی ظفر علی خاں صاحب مرحوم اور میرے والد مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی طالب شرافت نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایک ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ اول الذکر نے حیدرآباد (دکن) پہنچ کر ملازمت اختیار کی اور حضرت قبلہ گاہی صاحب مرحوم ریاست خیرپور سندھ میں نائب وزیر مقرر ہوگئے۔

۱۸۹۸ء کے اوائل میں حضرت قبلہ خیرپور سے مستعفی ہوکر بدایوں اپنے وطن تشریف لائے۔ کچھ دنوں بعد اپنے ہم سبق اور عزیز دوست مولوی عبدالحق صاحب مرحوم (بابائے اردو) اور مولوی ظفر علی خاں صاحب کے اصرار پر حیدرآباد (دکن) پہنچے اور ملازم ہوگئے۔ ان تینوں دوستوں کے رسالے "افسانہ" نے ایک ایسی ہی نشست میں جنم لیا۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کو رسالہ "افسانہ" اور "مسٹریز آف لندن" ناپسند تھے۔ کچھ دن بعد افسانہ بند کر دیا گیا اور جنوری ۱۹۰۴ء سے دکن ریویو نکلنا شروع ہوا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قبلہ وکعبہ مولوی سید محفوظ علی صاحب نے اپنے نام سے لکھنے کے بجائے اکثر فرضی ناموں سے مضامین لکھے۔ چنانچہ دکن ریویو میں کمتر مضامین اپنے نام سے اور بیشتر مضامین نقاش اور دوسرے ناموں سے لکھتے رہے۔ ۱۹۰۴ء کے دوران سر تھیوڈر ماریسن پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ کی سفارش پر برٹش ہائی کمشنر لندن کے دفتر سے میرے والد صاحب مرحوم کو سمالی لینڈ افریقہ کے شہر بربرہ میں مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔ "افریقہ کا مسافر" وہ خط ہے جو انھوں نے جہاز پر سے مولوی ظفر علی خاں صاحب کو لکھا تھا اور جو دکن ریویو میں شائع ہوا۔ [illegible] ایک نظم "واکوتامہ" لکھنے کے سلسلے میں مولوی ظفر علی خاں [illegible] حیدرآباد کی ملازمت سے برطرف اور شہر بدر کر دیے گئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء میں وہ قبلہ گاہی مرحوم کے پاس سمالی لینڈ پہنچ گئے اور دکن ریویو بند ہوگیا۔ دوستی کے تعلقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ والد مرحوم نے اولاً چھ ماہ کی رخصت حاصل کی اور پھر ملازمت کو خیرباد کہہ کر حق دوستی کی خاطر اپنے دس ہزار روپے کے سرمائے سے بمبئی میں کاروبار شروع کر دیا۔ کالبا دیوی روڈ بمبئی میں ایم اے بشیر اینڈ کو کے نام سے دوکان کھولی گئی۔ ظفر علی خاں صاحب شریک کاروبار تھے لیکن ظفر علی خاں کو دکن ریویو کی یاد بے چین کیے رہتی تھی چنانچہ انھوں نے بمبئی سے اس کا احیا کیا (آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بمبئی سے دکن ریویو کیوں نکلا)

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم اور ظفر علی خاں صاحب ایک دوسرے ہمدرد شہر بدری کے احکام کے منسوخ کرانے اور ان کے بازماموری حیدرآباد کے لیے دو سال سے کوشاں تھے۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور ظفر علی خاں صاحب حیدرآباد پہنچ گئے۔ دکن ریویو ایک بار پھر حیدرآباد سے نکلنے لگا۔[1]

ابن علی بدایونی نے ممکن ہو ظفر علی خاں اور اپنے والد بزرگوار کے تعلقات کے بارے میں کسی قدر مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہو لیکن بات صد فی صد غلط نہیں ہے۔ خود ظفر علی خاں مرحوم نے "دور دراز دریائی سفر" کا ذکر بمبئی سے شائع ہونے والے دکن ریویو کے پہلے شمارہ میں کیا ہے۔ بمبئی سے دکن ریویو کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا اس شمارہ کے اداریہ میں "عرض مدعا" کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:-

"کچھ عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دکن ریویو ناظرین کی خدمت میں بار یاب ہونے کا شرف پھر حاصل کرتا ہے۔ ہم نے جب جنوری سنہ رواں میں اپنے ناظرین کو اطلاع دی تھی کہ بوجہ علالت ہم مجبور ہیں کہ رسالہ کی اشاعت برائے چندے ملتوی کریں تو ہمیں خیال نہ تھا کہ سلسلۂ علالت اس قدر طول کھینچے گا اور ہمیں بغرض تبدیل آب و ہوا ایک دور دراز دریائی سفر پر جانا پڑے گا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب ہم صحت یاب ہوکر ناظرین کی خدمت گزاری کے لیے تیار ہیں۔"

"دکن ریویو کا مولود و وطن مملکت ابد مدت آصفیہ کا دارالحکومت ہے۔ ہماری دلی خواہش تو یہ تھی کہ یہ مولود نشوونما پاکر سن رشد و شباب کی منزلیں یہیں طے کرتا لیکن دکن ریویو کے بعض پرستوں کے اصرار اور ان بہت سی آسانیوں کے خیال نے جو ہندوستان کے لندن اور دنیا کے تجارت کے ایشیائی مرکز یعنی بمبئی میں ہر قسم کے کاروبار والے کو حاصل ہیں آمادہ کیا کہ دکن ریویو کے سلسلہ جدید کی اشاعت یہیں سے ہو۔"[2]

اس اداریہ کو پڑھنے کے بعد ابن علی بدایونی کے بہت سے

---

[1] ہماری زبان (علی گڑھ) یکم اگست ۱۹۶۲ء [2] دکن ریویو نومبر ۱۹۰۶ء

دعووں کی تصدیق ہوتی ہے کہ ظفر علی خاں شہر بدر کئے گئے کے بعد حیدرآباد سے بمبئی گئے تھے وہاں سے واپس آنے کے بعد بمبئی کو اس وجہ سے منتخب کیا کہ بعض سرپرستوں کا اصرار تھا کہ رسالہ بمبئی سے شائع ہو۔ بہرحال بمبئی سے تقریباً دوبارہ حیدرآباد واپس ہونے تک شائع ہوتا رہا اور جب وہ حیدرآباد آئے تو انھوں نے چند دنوں تک دکن ریویو کو نکالنے کے بعد اس رسالہ کو سید محمود احمد قادری کے حوالے کیا اور خود پنجاب سے "زمیندار" کو جاری کیا جو ہندوستان کے چند گنے چنے سیاسی رسالوں میں شمار ہوتا ہے، جو عوامی شعور کو بیدار کرنے اور آزادی کے نعرہ کو عام کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا۔

"دکن ریویو" دکن کے ان ماہناموں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے دنیائے ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ اس رسالہ کی عمر کوئی طویل نہیں ہے اور جب بھی نکلا ہے تو ہمیشہ غیر یقینی حالات اس کی وجہ خود ایڈیٹر کی زندگی کے مدوجزر ہیں۔ ظفر علی خاں ہندوستان کی قومی تحریک سے وابستہ ان معنوں میں نہیں رہے جیسے محمد علی جوہر اور شوکت علی رہے ہیں اس وجہ سے دکن ریویو "کامریڈ" نہیں بن سکا۔ خود دکن میں مضبوط شخصی حکومت قائم تھی اور اس زمانہ میں بادشاہت سے بغاوت کا کوئی تصور بھی نہیں تھا بلکہ بادشاہ ظل سبحانی سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ظفر علی خاں نیم سیاسی آدمی ہونے کے باوجود دکن ریویو محض ادبی، سماجی اور مذہبی رسالہ تھا، ہاں کبھی کبھی ملک کے سیاسی حالات پر ایک آدھ مضمون ضرور شائع ہوتا رہا ہے۔ بلکہ بعد کو پنجاب سے شائع ہونے والے "زمیندار" اور دکن ریویو میں خود فرق موجود ہے یہ فرق درحقیقت ان سیاسی حالات کا ہے جو شمال اور دکن میں موجود تھے۔ دکن کی گود میں آباد خوابوں کی بستی — حیدرآباد ۱۹۴۸ء سے پہلے تک طوفان خیز تبدیلیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے ہمیشہ محفوظ رہی اس وجہ سے یہاں سے نکلنے والے اخبارات اور رسائل میں سنسنی اور تہلکہ خیزی کا کوئی شائبہ بھی موجود نہیں تھا بلکہ ان رسائل و اخبارات کی توجہ اصلاح و تہذیب اور اصلاح معاشرہ پر لگی رہی۔ دکن ریویو بھی اپنے پیش رو رسائل کی طرح تہذیبی، سماجی، مذہبی اور ادبی مضامین کو پیش کرتا رہا ہے۔

ظفر علی خاں خود شاعر اور خود ادیب بھی تھے اس وجہ سے دکن ریویو کے معنوی حسن میں اضافہ کرنے کے لیے انھوں نے ہمہ گیر شہرت رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کیا۔ ظفر علی خاں خود بھی لکھتے تھے۔ ان کے علاوہ محفوظ علی، سلطان احمد خاں، مظہر حسن خاں، عزیز الدین (منشی کانت)، راحت حسین، اشرف شمسی اور سید [illegible] حسین بیرسٹر ایٹ لا آلہ آباد وغیرہ کے علاوہ دیگر ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شامل ہوا کرتی تھیں۔

جب دکن ریویو کا سلسلہ جدید شروع ہوا تو ملک بھر کے تمام روزناموں اور رسائل نے اس کا خیر مقدم کیا۔ نیر اعظم (مرادآباد) رسالہ ید بیضا (سکندرآباد۔ بلند شہر) اور مخزن دکن (مدراس) نے اس پر تبصرے کیے۔ چنانچہ "مخزن دکن" لکھتا ہے۔

"پھر علم دوست اہل دکن کی آرزوئیں نکلنے کو ہیں کیونکہ پھر دکن ریویو بڑے ہی انتظار کے بعد بہ ہزاراں آب و تاب کے ساتھ اپنے مولد یعنی حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے لگا ہے ہم نے اس کے سلسلہ جدید کے اسلام نمبر سلک دوم کی ایک ایک سطر کو پوری توجہ کے ساتھ ملاحظہ کیا اور اختتام پر یہ رائے قائم کرنے کی مسرت حاصل کی کہ دکن کے اس روح پرور جریدے کے اپنے معاصرین سے فائق ہونے میں اگر کسی کو کچھ کلام ہو بھی تو یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ کسی سے کم پایہ بھی نہیں۔ ہمارے مکرم دوست مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے جیسے فاضل انشاء پرداز اور جامع مذاق نو و کہن ناظم نے اس کو غایت درجہ دلآویز اور قابل قدر بنانے میں جہد بلیغ کی ہے اور لطف یہ کہ معزز ایڈیٹر کی نقاد نگاہوں نے چوٹی کے انشاء پردازوں کو اپنے رسالہ کی رونق دوبالا کرنے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ بس جب یہ ساز و سامان ہیں تو پھر ریویو جیسے کہ وہ ہے نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ۔ ؟! غرض ان سطور سے یہ دکھلانا مدنظر ہے کہ دکن ریویو ایک اعلیٰ درجہ کا علمی رسالہ ہے اور اس کے معاونین بڑے بڑے فاضل اور قلم کے دھنی ہیں ... قدردانان علم کو ایسے انمول جواہر کی قدر کرنی چاہیے۔"[1]

مولوی مرزا ہادی عزیز لکھنوی کی رائے میں "ہندوستان کے تمام اردو رسائل میں بہ اعتبار مذاق علمی اگر کوئی رسالہ ہے تو یہی ہے میں اس رسالہ کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ ایسے بہی خواہوں کی تعداد

سید فضل المتین

نیا سال

پھر مسافر چلے، اک نئی راہ پر
پھر نئی منزلوں کی ہوئی جستجو
پھر ہوئی رہنما، ایک فکر رسا!
پھر بعنوانِ نو چھڑ گئی گفتگو

پھر کوئی شمع احساس روشن ہوئی
محفل آگہی جگمگانے لگی
پھر نئے خواب ذہنوں میں پلنے لگے
اک حقیقت نئی مسکرانے لگی

پھر نیا سال آیا جلو میں لیے
کچھ نئی الجھنیں، کچھ نئے مسئلے
پھر ہوئی زندگی سرگراں دوستو!
پھر ہیں پیشِ نظر کچھ نئے مرحلے

---

[1] دکن ریویو جنوری ۱۹۰۸ء

چونکہ بحر میں چھپے ہوئے تھے کم نہ تھی۔ سلسلہ جدیدہ کے لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر، لعل نگم، دلگیر اکبر آبادی، رضا علی وحشت، معشوق حسین جواد علی عالی، مولوی عبدالحق اور شبلی نعمانی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ حالی کی قدیم غزلیں (رضا علی وحشت)، دیوان حافظ کی تالیف (اسلم جیراج پوری) ہندی قوم اور قومی زبان (ڈپٹی لال نگم) فارسی شاعری کا چوتھا دور (شبلی نعمانی)، شبلی اور ڈارون (سید اکبر حسین) سرسید احمد کی بینی برکتیں (عبدالحلیم شرر) اور منوچہری (شبلی) ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اہم مضامین ہیں۔

ہندی زبان کو بدلتے ہوئے حالات میں قومی زبان کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے لیکن اردو زبان کے ساتھ کی گئی ناانصافی قوم اور ملک دونوں کے لیے پے در پے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ ملک و قوم کی سالمیت اور بقا کے لیے لسانی مسئلہ بھوت بن گیا ہے اور اسی لسانی تعصب کی وجہ سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا تعلق اور رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اردو زبان سے ہمارے معماران دستورِ ہند نے کوئی انصاف نہیں کیا اس سے اردو زبان کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے ہمیں فکر بھی نہ ہوتی لیکن یہ بات پوری قوم کے لیے خطرناک بن گئی۔ اردو زبان کی مشترکہ اہمیت آج سے نہیں قدم سے ہے۔ قومی تاریخ [illegible] ہر سال کا ہر حصہ کوئی معنوی تو نہیں ہوتا، زمانہ بدل جاتا ہے نسلیں بگڑ جاتی ہیں [illegible] زندگی کا آغاز ہوتا ہے [illegible] ڈھلتے ہوئے لمحوں میں بھی [illegible] کہنگی کا لباس اوڑھتی ہے [illegible] "لباس واحد" اٹھا دیا جاتا ہے لیکن سچائی جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے زیادہ مضبوط اور [illegible] ہوتی جاتی ہے۔ ڈپٹی لال نگم نے ایسی ہی ٹھوس اور مضبوط سچائی کو اپنے مضمون ہندی قوم اور قومی زبان میں منکشف کیا تھا۔[1]

"چونکہ آج کل مشترکہ زبان بنانے کا چرچا بہت زوروں پر ہے اس لیے اگر جلد ہی کوئی زبان اس غرض کے لیے تجویز کی گئی تو بہتر ہوگا ورنہ عرصۂ دراز گزرنے کے بعد ممکن ہے کہ یہ جوش اور گرما گرمی سرد پڑ جائے۔ سنسکرت یا عربی زبان کو مشترکہ زبان بنانے کے وقت تک اس جوش و خروش کا ٹھنڈا پڑ جانا ممکنات سے ہے اور پھر یہی مثل صادق آئے گی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ پس ایک قوم کے ممبر ہونے کے لیے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو ہی کو قومی و ملکی مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کریں۔"

ستمبر ۱۹۰۸ء میں شہر آرزو رود موسیٰ کی طغیانی کی لپیٹ میں آ گیا۔ خوابوں کی بستی حیدرآباد آبِ موسیٰ میں گھر گئی۔ جو جانی و مالی نقصانات ہوئے اس کا اندازہ امرِ محال ہے۔ اس تعلق سے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے واقعات و حادثات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کے شمارے میں دکن ریویو نے تفصیلی مضمون شائع کیا۔ اداریہ لکھا۔ اس طغیانی میں خود دکن ریویو کا اکتوبر کا شمارہ نذرِ آب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بادشاہ وقت میر محبوب علی خاں اور ولیعہد میر عثمان علی خاں نے جو امدادی کام کیا تھا اس کو بھی مستحسن نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس سلسلہ میں اکتوبر کا یہ شمارہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔

دکن ریویو کے شمارہ فروری ۱۹۰۵ء میں ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس مقابلہ میں اول آنے والے مضمون نگار کو مبلغ [illegible] روپیہ انعام دیا گیا۔ اس سلسلہ میں نظام الدین احمد ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا اینڈ سکریٹری مجلس وضع آئین و قوانین کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اور اراکین میں شبلی نعمانی، بشیر الدین احمد ناظم نظم جمعیت، سید نور الضیا الدین صاحب مفتی عدالت العالیہ، مولوی حبیب الدین اسسٹنٹ فنانس سکریٹری اور ملا عبدالقیوم صاحب معتمد حجاز ریلوے شامل تھے۔ سید جلال اور سید ابراہیم کے مضامین کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ چنانچہ دونوں مضمون نگاروں میں مبلغ [illegible] روپیہ تقسیم کیے گئے اور مضامین "مصنوعات دکن" کے عنوان سے اگلے شماروں میں شائع کیے گئے۔

مختصر یہ کہ دکن کے ادبی رسائل کی تاریخ میں "دکن ریویو" اہم ترین رسالہ ہے اور اس کے تذکرے کے بغیر تاریخ صحافت دکن مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔

[1] دکن ریویو اگست ۱۹۰۰ء

مُراسلات

علامہ سیماب داغ کے شاگرد تھے

۸ نومبر ۱۹۶۷ء کے "ہماری زبان" میں ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے اپنے مضمون "پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "پروفیسر نفیس سندیلوی نے "نگار" داغ نمبر ۱۹۵۳ء میں "داغ کے مشہور تلامذہ" پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں ان کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس مقالہ میں بعض ایسے حضرات کا ذکر کیا ہے جو داغ کے شاگرد نہیں تھے جیسے جگر مرادآبادی اور سیماب اکبرآبادی"

مجھے حیرت اور سخت حیرت ہے کہ سکسینہ صاحب نے روزِ روشن کو شب دیجور کہا ہے۔ خود علامہ سیماب نے دسیوں جگہ لکھا ہے کہ وہ داغ دہلوی کے تلامذہ میں سے ہیں۔ عام تذکرہ کی کتابوں کو جانے دیجیے، علامہ سیماب کی کتاب "حیات داغ" سے بعض اقتباس پیش کیے دیتا ہوں، تاکہ سکسینہ صاحب اپنی غلطی پر نظرِ ثانی کرلیں۔

"حیات داغ" میں دبیرالدولہ، فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان، ناظم یار جنگ، استادالسلطان، جہان استاد نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب کے مرتب ابوالفخر حضرت سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۱۴۱ صفحہ ہے اور اسے دارالاشاعت رسالہ صوفی پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات پنجاب کے لیے اسلامیہ سٹیم پریس کی دروازہ لاہور نے باہتمام حافظ مظفرالدین چھاپا ہے۔

دیباچہ میں علامہ سیماب اکبرآبادی لکھتے ہیں "آج ہندوستان میں مرزا صاحب کی سینکڑوں سوانح عمریاں موجود ہیں اور ہر مولف نے بخیال خود ان کی لائف اور ان کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ ہم بھی مرزا صاحب کے ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کی حیثیت سے ان کی مقدس زندگی پر آج کچھ لکھنے بیٹھے ہیں"

"جب کہ مرزا صاحب مرحوم و مغفور حیدرآباد دکن میں سلطنتِ سخن کے بادشاہ بنے بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک خادم اور غاشیہ بردار کی حیثیت سے اسی دربار کا ایک خوشہ چیں تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک استاد مرحوم کی محبت بھری نگاہیں مجھے "آگرہ" اور "کانپور" میں نوازتی رہیں اور میں نے جو فیوض اس مرحوم ذات کے تعلق سے اٹھائے وہ کچھ میرا ہی دل خوب جانتا ہے"

صفحہ ۲۴ پر علامہ سیماب رقمطراز ہیں: "ایک مرتبہ میری غزلیں دو مہینے تک بعد اصلاح واپس نہ آئیں تو میں نے تنگ آکر ایک شکایت نامہ ذرا سخت لہجے میں لکھ دیا۔ جس کے جواب میں مرزا صاحب نے مندرجہ ذیل خط مجھے لکھا: "بھائی، حضور شکار میں مصروف ہیں۔ گرمی بلا کی پڑ رہی ہے۔ جب شیر سے فرصت ملتی ہے تو شعر سوجھتا ہے۔ تم خفا ہوئے، خیر، مرحبا دوست [illegible]

تمہارا داغ دہلوی"

صفحہ ۴۲ سے ہی ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے: "ایک مرتبہ میں نے چند لکھنؤ اور دہلی کے محاورات کے متعلق کچھ دریافت کیا تو اس کے جواب میں لکھا "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے لیکن ہمارے یہاں حضور پیر و مرشد اور بادشاہ کو کہتے ہیں معشوق کو نہیں کہتے۔ لکھنؤ والے کچھ بھی کہیں۔ ہم تو اپنی وضع نہیں چھوڑ سکتے۔ تمہاری غزل کے کیا کہنے۔ لیکن کیا میری محنت کی داد نہ دو گے"

اب بھی اگر سکسینہ صاحب کی تشفی نہیں ہوتی ہے تو مزید ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔

(مناظر عاشق ہرگانوی)

نشور واحدی کی غزل اور بحر و وزن

(۱)

"ہماری زبان" یکم دسمبر ۶۷ء میں جناب ثاقب صدیقی نے جناب نشور واحدی کی ایک غزل کی بحر و وزن دریافت فرمایا ہے۔ غزل کے ۴ شعر بھی درج ہیں جس کا مطلع یہ ہے:-

میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں

یہ بحر کوئی غیر معروف یا الجھی ہوئی نہیں ہے بیسوں شعراء کی غزلیں اس بحر میں موجود ہیں۔ پچھلے ماہ بھوپال میں بھی ایک مشاعرہ اسی بحر میں ہوا جس کا مصرع طرح یہ تھا:-

گلستاں میں آئے جب گلستاں نکھر گیا

اس مشاعرے میں ۲۵ شعراء نے غزلیں کہیں۔ میں بھی شریک تھا۔

بہرحال اس بحر کا نام "ہزج مثمن مقبوض اشتر" ہے۔ اور اس کی تقطیع اس طرح ہوگی ؎

میں ابھی،	سس کس طرح۔	ان کو بے،	وفا کہوں
فاعلن	مفاعلن	فاعلن	مفاعلن

نشور صاحب کی پوری غزل کے اشعار اسی بحر و وزن میں ہیں۔

(شفا گوالیاری۔ بھوپال)

(۲)

"ہماری زبان" بابت یکم دسمبر ۶۷ء کے صفحہ ۹ پر ثاقب صاحب کا استفسار نظر سے گذرا۔ جناب نشور واحدی اردو کے ایک باخبر واہل نظر ہنرمند شاعر ہیں۔ ان سے یہ توقع کہ وہ بے وزن اور بے بحر غزلیں لکھنے لگیں گے۔ غلط ہوگی۔ موصوف محترم کے پیش نظر اشعار کی تقطیع کرنے سے جو وزن برآمد ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

مے آبی :	سِ کِس طرح	اُن کُ بے	وفا کہو(ں)
فاعلن	مفاعلن	فاعلن	مفاعلن
من: لو ،	کِ بات ہے	راستے	م کیا کہو(ں)
فاعلن	مفاعلن	فاعلن	مفاعلن

علی [illegible] اقتباس دلی آخرم

یہ وزن اگرچہ مروج نہیں ہے، پھر بھی میں ایسے جس بحر سے واقف اور قریب تر پاتا ہوں وہ ہے "بحر ہزج مثمن اشتر" یعنی فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن دوبار

محترمی نشور صاحب نے اگر کوئی جدت کی ہے تو بس یہ کہ اس وزن میں رکن مفاعیلن کو بھی مقبوض کر دیا اگرچہ اساتذہ کے یہاں میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گذری ہے۔ بہرکیف اگر بصورت کے اس وزن کو ہم کوئی نام دیں گے تو وہ ہوگا

"بحر ہزج مثمن اشتر مقبوض"

"اشتر" کا زحاف بذات خود اجتماع خرم وقبض ہے جو مخصوص ہے رکن مفاعیلن کے لیے۔

بھائی میرے، آج جبکہ اردو شاعری کے آسمان پر جدیدیت کا علم لہرا رہا ہے اور ہر بے بہرہ نثر کے چند منتشر ٹکڑوں کو الٹ پلٹ کر نظم کہہ رہا ہے اور شاعر بنا بیٹھا ہے (مثلاً احمد ہمیش، افتخار جالب وغیرہم) تو بے چارے نشور صاحب نے اگر غنائیت کو مد نظر رکھ کر ایک تبدیلی کرلی تو کیا گناہ کیا؟ غنائیت سے نشور صاحب کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور کیا اردو یا فارسی میں کوئی "خاتم العروضیین" پیدا ہو چکا؟ (طلحہ رضوی برق)

(۳)

"ہماری زبان" کے یکم دسمبر ۶۷ء کے شمارے میں جناب ثاقب صدیقی نے حضرت نشور واحدی کی ایک غزل کی بحر اور وزن کے بارے میں استفسار فرمایا ہے۔ مذکورہ غزل کا مطلع یہ ہے:-

ہم ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں

جواباً عرض ہے کہ اس غزل کی بحر کا نام "بحر ہزج اشتر مقبوض مثمن" ہے اور اس کا وزن "فاعلن مفاعلن فاعلن مفاعلن" ہے۔ نیز یہ بحر مروج اور مستعمل ہے۔ فانی بدایونی کی ایک غزل بھی اس بحر میں ہے جس کے دو شعر درج ذیل ہیں:-

بے خودی کدھر گیا وہ حجاب اضطراب
کیا ہوا جو فرق تھا ہجر اور وصال میں
آدمی میں کچھ نہیں آپ نے سمو دیا
عالم غبار کو عالم خیال میں

مجھے امید ہے کہ اب جناب ثاقب صدیقی کی تشفی ہو جائے گی اور اگر انھیں نشور صاحب کی غزل کے متعلق کوئی شبہ رہا ہوگا تو وہ دور ہو گیا ہوگا۔

(نامی انصاری)

(۴)

نشور کانپوری کے جو اشعار ثاقب صاحب نے مراسلے میں دیے ہیں وہ "بحر ہزج" میں ہیں اور باعتبار زحافات کے وزن کا نام اشتر ومقبوض ہے۔ حسب ذیل تقطیع ذہن نشیں فرمالیں:-

فاعلن	مفاعلن	فاعلن	مفاعلن
ے ابھی	ہیں کس طرح	اُن کُ بے	وفا کہوں
منزلو	کِ بات ہے	راستے	یں کا کہو
اے حری	صِ میکدہ	خون زن	دگی نہ پی
تو شرا	ب گر پیے	تجھ کُ پا	رسا کہو
حسن ہے	نقاب پر	کوئِ جبر	دڈال لو
تم اسے	صنم کہو	مے اسے	خدا کہو
غبر مے	رِ حالِ غم	پوچھتے	رہے مگر
دوستو	کِ بات ہے	دشمنو	کُ کا کہو

(رئیس نعمانی)

کچھ ایک شعر کے سلسلے میں

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اس شعر سے متعلق یکم مئی ۶۷ء کے "ہماری زبان" میں جناب سید صفدر حسین صاحب نے لکھا ہے کہ یہ شعر مومن کے شاگرد میر حسین تسکین کا ہے۔ دراصل یہ شعر مومن ہی کے ایک اور شاگرد خیر الدین یاس کا ہے۔

اس شعر کی تخلیق کے سلسلے میں یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ "ایک دن صبح صبح مومن کے پاس یاس صاحب نے آکر کہا کہ استاد ایک مصرع کہا ہے ع

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

رات بھر پہلا مصرع لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مومن نے اسی وقت شعر اس طرح مکمل کر دیا ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی"

(نور الحسن انور ادیب)

ایک گذارش

مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں گونڈہ سے شائع ہونے والے ایک ماہنامہ "گلدستۂ کیف" کا فروری ۱۹۰۸ء کا شمارہ چند دنوں کے لیے عاریتاً درکار ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس "گلدستۂ کیف" کا مذکورہ شمارہ ہو تو براہ کرم عنایت فرمائیں۔ اس کا ڈاک خرچ میرے ذمے ہوگا۔

پریم پال اشک، ۱۸۶۵۰، وزیر سنگھ سٹریٹ
چونہ منڈی، پہاڑ گنج
نئی دہلی ۵۵

جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا اخباری بیان

سال گزشتہ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی ضلاعی شاخوں کے صدر و معتمدین اور دوسرے اردو کے کارکنوں اور ہمدردوں کا ایک اجتماع عمل میں آیا تھا۔ اس اجتماع کے جو مفید نتائج برآمد ہوئے اس کے پیش نظر ۶ اور ۷ جنوری ۷۸ء کو حیدرآباد میں انجمن کی جانب سے ایک اور اجتماع بلایا گیا۔ پہلے روز یعنی ۶ر جنوری کو انجمن کی شاخوں کے صدر، نائب صدر اور معتمدین کا سہ پہر میں تین بجے اردو ہال میں خصوصی اجلاس ہوگا جس میں زیادہ تر تنظیمی امور پر غور کیا گیا۔ دوسرے دن یعنی ۷ر جنوری کو صبح ۹ بجے سے جو جلسہ ہوگا اس میں اضلاعی شاخوں کے صدر اور معتمدین کے علاوہ نہ صرف شہر حیدرآباد کے بلکہ اضلاع سے آنے والے ہمدرد اور دوسرے کارکن بھی شریک ہوسکے اور آندھرا پردیش میں اردو کو جو مسائل درپیش ہیں ان پر غور کیا جاسکے گا مثلاً سرکاری زبان کے قانون کی عمل آوری کو موثر بنانے کے لیے انجمن نے حکومت کو حال میں ایک یادداشت پیش کی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ واضح قانونی تحفظات کے ذریعہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے مگر جب تک انجمن کے اس مطالبے کو منوانے کے لیے موثر رائے عامہ ہموار نہ کی جائے مسئلہ جوں کا توں باقی رہ سکتا ہے۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کیا جاکر جامع لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا تاکہ اس کی روشنی میں انجمن کی جانب سے کوئی موثر قدم اٹھایا جاسکے۔ اس کے علاوہ اردو کے تعلق سے حکومت کی متعلقہ پالیسی پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے اردو کارکنوں کو آئے دن جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر غور کیا جائیگا اس لیے میں انجمن کی شاخوں کے عہدہ داروں اور اردو کے دوسرے کارکنوں اور ہمدردوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اردو کی بقا و تحفظ کے لیے جو جدوجہد جاری ہے اس کو تقویت پہنچائیں۔

(مرسلہ سری نواس لاہوٹی)

انجمن ترقی اردو ریاستی شاخ پنجاب کی مجلس عاملہ کے اجلاس کی روداد

ریاستی انجمن ترقی اردو پنجاب کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۱۹ر نومبر کو پٹیالہ میں منعقد ہوا۔ صدارت پورن سنگھ ہنر صاحب نے کی۔ مندرجہ ذیل اراکین حاضر تھے۔

۱۔ سردار پورن سنگھ ہنر   ۲۔ جناب نوبہار صابر
۳۔ محمد کفایت اللہ   ۴۔ جناب موہن لال سنگھی
۵۔ سورج تنویر۔

ان کے علاوہ انجمن کے رکن جناب نور محمد فاروقی، پٹیالہ ضلع کے آرگنائزر جناب کنور رچپال، مسلم وقف بورڈ کے ممبر جناب غلام صابر اور مقامی شاخ کے اراکین سرو شری کا فرشتانی، مہیش پٹیالوی اور جوہر بھارتی خاص دعوت پر شریک ہوئے عہدیداروں کے علاوہ انجمن کے اراکین جناب کرپال سنگھ بیدار، جناب [illegible] صاحب اعظمی اور جناب مہر چند کوثر کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اپنی مصروفیات کے باعث شریک اجلاس نہ ہوسکے۔

ایجنڈا میں (۱) سرگرمیوں کی رپورٹ (۲) سالانہ کانفرنس کا انعقاد (۳) اردو درسگاہوں کا قیام (۴) انتخابات [illegible] (۵) متفرقات وغیرہ مدات شامل تھیں۔

جنرل سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پیش کی اور صوبائی شاخ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا "انجمن ریاست میں اپنی تنظیم اور اردو کی خدمت کے لیے امکان بھر کوششیں مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ اسے ضروری کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں لیکن انجمن ان کامیابیوں سے پوری طرح مطمئن نہیں۔ انجمن اپنے کام کو نیز دائرہ عمل کو وسیع اور سرگرمیوں کو موثر بنانے میں لگاتار مصروف ہے۔ تاہم حالات کی ناسازگاری اور ان ناگزیر مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو انجمن کی راہ میں حائل ہیں۔ اس کے بعد انجمن کی تنظیم کے کام کا پہلی بار جائزہ لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا۔ "ضلع آرگنائزروں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے ضلع کے تمام شہروں اور قصبوں میں جہاں ابھی انجمن کی شاخ نہیں ہے قائم کریں۔ اور انجمن کے صوبائی دفتر کو ۳۱ر دسمبر تک اپنی سرگرمیوں کی تفصیل سے آگاہ کریں۔"

ریاستی اردو کانفرنس

انجمن کی سالانہ ریاستی کانفرنس کے انعقاد پر غور کیا گیا۔ جنرل سکریٹری نے بتایا کہ اب تک ریاستی دفتر کو سمرالہ، پٹیالہ، کھنہ، مالیرکوٹلہ اور لدھیانہ شاخوں کی جانب سے پیشکش موصول ہوچکی ہے۔ ان شاخوں میں سے ہر ایک نے دعوت دی ہے کہ اگر انجمن اپنی سالانہ ریاستی اردو کانفرنس ان کے شہر میں منعقد کرے تو مقامی شاخ کانفرنس کے تمام اخراجات کا بار برداشت کرنے پر آمادہ ہے۔ غور کے بعد انعقاد کانفرنس کے لیے مقام کے انتخاب کا فیصلہ آئندہ میٹنگ پر ملتوی کر دیا گیا۔

اردو درس گاہوں کا قیام

اردو درسگاہوں کی اہمیت اور ضرورت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ ہاؤس کی متفقہ رائے تھی کہ اردو کی ابتدائی درسگاہوں کا قیام ہر صورت عمل میں لایا جائے۔ اس کار خیر کے لیے جہاں سے جتنا تعاون حاصل ہوسکے حاصل کیا جائے۔ درسگاہوں کے قیام کی ایک جامع اور قابل عمل تجویز پر غور پیش کی گئی جس کی روشنی میں فیصلہ ہوا کہ انجمن کی ہر مقامی شاخ اردو کی ابتدائی تعلیم کا مدرسہ قائم کرے۔ مدرسہ چلانے کے لیے پنجاب سرکار، وقف بورڈ اور مقامی مخیر اردو دوستوں سے مالی امداد اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مدرسہ چلانے کے لیے مقامی طور پر ایک انتظامیہ کمیٹی قائم کی جائے۔ یہ کمیٹی انجمن وقف بورڈ، سرکار اور مدرسہ کے لیے مقررہ سالانہ مالی امداد مہیا کرنے والے اردو دوستوں پر مشتمل ہو۔ اجلاس میں شریک وقف بورڈ کے ممبر جناب غلام صابر سے اپیل کی گئی کہ وہ اس سلسلہ

ممبروں کی ایک تیاری کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے صدر ڈاکٹر گیان چند اور کنوینر شری امرت ملہوترہ ہوں گے۔ سید فتح حسین شاہ کاظمی کمیٹی کے خازن ہوں گے۔ تیاری کمیٹی غالب کی اگلی برسی ۱۵ فروری کو غالب کمیٹی کے سو ممبروں کی پہلی میٹنگ بلائے گی۔ جب سے ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء تک ملک بھر میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے گی۔

جموں کی غالب کمیٹی ریاستی سطح پر اسی مقصد کے لیے بنی کمیٹی سے ملحق ہو گئی ہے اور جموں میں جشن غالب کے سلسلہ میں سب تقریبات کا اہتمام کرے گی۔ ریاستی کمیٹی کے صدر گورنر بھگوان سہائے ہیں۔ اور چیرمین وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق ہیں۔ جبکہ پروفیسر عبد القادر سروری اس کے سکریٹری ہیں۔

تیاری کمیٹی کے ممبران حسب ذیل ہیں:-

(۱) ڈاکٹر گیان چند صدر (۲) شری جیت رام جوپڑہ نائب صدر (۳) راؤ رتن سنگھ (خزانچی) (۴) سید فتح حسین شاہ کاظمی (۵) کیپٹن عزیز (۶) جناب نرسنگھ داس نرگس (۷) ظفر حسین (۸) پروفیسر رام ناتھ شاستری (۹) سردار رنگیل سنگھ (۱۰) شری ڈی سی پرشانت (۱۱) شیخ فیروز دین (۱۲) لالہ گردھاری لعل آنند (۱۳) قاضی فیروز دین (۱۴) پروفیسر روپ سومناتھ (۱۵) شری نیلا بر دیو شرما (۱۶) شری سریندر چوپڑہ (۱۷) پرنسپل بی۔ ڈی ل شرما (۱۸) پروفیسر منظر عاظمی (۱۹) سردار عبد الحمید خاں (۲۰) پنڈت دیوراج ڈوگرہ (۲۱) شری اوم پرکاش صراف (۲۲) شری موہن یاور (۲۳) پروفیسر غلام رسول آزاد (۲۴) حسرت کشمیری (۲۵) عرش جہلانی (۲۶) شری امرت ملہوترہ کنوینر (۲۷) فادر عزیز ولیم (۲۸) شری وید بھسین (۲۹) شری ملراج پوری (۳۰) شری جنگ لعل سہگل

(سکریٹری غالب صدسالہ کمیٹی، جموں)

خواجہ احمد عباس کی سیفیہ کالج بھوپال میں آمد

اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی خواجہ احمد عباس ۲۰ دسمبر ۶۷ء کو بھوپال تشریف لائے۔ بھوپال میں یک روزہ مختصر قیام کے دوران انھوں نے مختلف پروگراموں میں شرکت فرمائی۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں بھی تشریف لائے۔ یہاں انھوں نے کہا کہ ہمیں حکومت کی سرپرستی کی امید ختم کرکے اردو کو اپنی کوششوں سے آگے بڑھانا ہے اس لیے ہمیں اپنی کوتاہیوں پر نظر کرکے انھیں دور کرنا چاہیے۔ انھوں نے اس بات پر بے اطمینانی کا اظہار فرمایا کہ اردو کی حمایت میں گرمجوشی کا اظہار کرنے والے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خود اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے محروم کیے ہوئے ہیں۔ جب تک قول و فعل میں آہنگ و توازن پیدا نہ ہو اردو کی ترقی کے امکانات روشن نہیں ہیں۔

انھوں نے شعبۂ اردو کی کارکردگی پر اظہار مسرت کیا کہ باوجود محدود وسائل کے شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے بہتر اور تعمیری کاموں کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ (ایک نامہ نگار)

جشن نریش کمار شاد

۱۱ دسمبر ۶۷ء کو اردو کے مقبول و ممتاز شاعر نریش کمار شاد کی چالیسویں سالگرہ زیر صدارت حضرت عرش ملسیانی میوتی محل ہوٹل دہلی میں منائی گئی۔ متعدد ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ افتتاح کنور مہندر سنگھ بیدی نے کیا۔

"شاد اور ان کی شاعری" کے نام سے ایک کتاب شاد صاحب کو پیش کی گئی۔ (ایک نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو ہند شاخ مرداس (سرونج) کا انتخاب

انجمن ترقی اردو ہند شاخ سرونج کے تمام ممبران کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اور ممبروں کی اتفاق رائے سے انجمن ترقی اردو ہند شاخ مرداس کا انتخاب عہدیداران عمل میں آیا۔ اس جلسہ کی صدارت حاجی عبد الحمید صاحب نے کی۔ عہدیداران کا انتخاب مندرجۂ ذیل ہے:-

(۱) جناب حاجی عبد الحمید خاں صاحب — صدر
(۲) جناب خان محمد صاحب — نائب صدر
(۳) جناب محمد اسحاق صاحب امرائی — نائب صدر
(۴) جناب گل حسن خاں صاحب یعقوبی — جنرل سکریٹری
(۵) جناب وزیر محمد صاحب احمدی — سکریٹری
(۶) جناب محمد اسحاق صاحب رستمی — نائب سکریٹری

اس کے علاوہ مجلس منتظمہ کے لیے ۱۵ ممبران منتخب ہوئے

(گل حسن خاں یعقوبی، جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو، سورجپورہ کا انتخاب

ڈاکٹر عبد الحی صاحب کی صدارت میں موصوف ہی کی قیام گاہ پر انجمن کے عہدہ داروں کا انتخاب اتفاق رائے سے ہوا۔

(۱) جناب ڈاکٹر عبد الحی صاحب — صدر
(۲) جناب الحاج عبد الحمید صاحب و جناب عبد الستار صاحب — نائب صدر
(۳) جناب مولانا ناظم سواتی سہسرامی صاحب — جنرل سکریٹری
(۴) جناب سلیم الدین خاں صاحب — نائب سکریٹری

اس کے علاوہ درج ذیل اصحاب کو ضلعی شاخ کے لیے اس مقامی شاخ کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔

(۱) جناب مولانا ناظم سواتی سہسرامی (۲) جناب سلیم الدین خاں صاحب (۳) جناب غلام غوث صاحب (۴) جناب محمد شمیم صاحب (۵) جناب سری کرشن سنگھ صاحب۔

جملہ عہدیداروں اور ضلعی شاخ کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔ (سلیم الدین خاں، نائب سکریٹری)

تبصرہ

عتیق احمد صدیقی

ببلوگرافیا اردو ڈراما

مرتب : ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

صفحات : ۷۰ + ۲۰۸

قیمت : ۷ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی دہلی

ہندوستانی ڈراما کی تاریخ اگرچہ بہت قدیم ہے کہ اس کا رشتہ شکنتلا جیسے قدیم الایام ڈراموں سے ملتا ہے لیکن اردو ڈرامہ کی عمر سوا سو سال سے زائد نہیں۔ (نامی صاحب ہی کے قیاس کے مطابق اردو ڈرامہ کا نقطۂ آغاز پندرھویں صدی عیسوی کو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ابھی تک ایسے نمونے دستیاب نہیں ہوئے جنھیں اس دعوے کی تصدیق میں پیش کیا جاسکے) ڈرامہ کا خاص تعلق اسٹیج سے ہے، جس کی ہندستان میں فنی طور پر زیادہ ترقی نہ ہوسکی اس لیے اردو میں ڈرامہ نگاری کا بھی بہت زیادہ رواج نہیں ہوپایا۔ انیسویں صدی میں اس کا آغاز ہوا اور تھیئٹریکل کمپنیوں خاص طور پر پارسی تھیئٹریکل کمپنیوں کی بدولت ہندستان کے گوشے گوشے میں اردو ڈرامہ عوام و خواص کی تفریح طبع کا سامان بن گیا۔ لیکن سنیما کے سامنے ڈرامہ اور غیر ترقی یافتہ تھیئٹریکل کمپنیوں کا چراغ نہ جل سکا۔ نتیجۃً ڈرامہ نگاری کی طرف بھی توجہ کم ہوگئی۔

تاہم اس قدر کم مدت میں ہی اہل قلم نے اردو ڈرامہ کے دامن کو مالا مال کردیا۔ آج ڈرامہ کی عدم مقبولیت کے باعث اپنے اس ادبی ورثے سے ہماری واقفیت بھی بہت کم ہے۔ اس صورت میں ببلوگرافیا اردو ڈراما ایک اہم ضرورت تھی۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ اس میں نامی صاحب نے اردو ڈرامہ نگاروں اور ڈراموں کی فہرست پیش کی ہے جس بڑے پیمانے پر نامی صاحب نے اس کام کو تن تنہا سرانجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

اس پہلی جلد میں الف سے ی تک ۹۶۲ ڈرامہ نویسوں کے نام شامل ہیں۔ ان کے ڈراموں کی فہرست دی گئی ہے تاکہ جو لوگ اپنی عدم واقفیت کے باعث اردو ڈرامہ کے متعلق تنگ نظری کا شکار ہیں ان کو یہ بتلایا جائے کہ ہند و پاک کی ہر زبان سے زیادہ اردو میں ڈرامے، اوپیرا اور سنگیت موجود ہیں اور ایسے ڈراموں کی وافر تعداد ہے جو یورپ کے بہترین ڈراموں کے مقابلہ میں پیش کیے جاسکیں۔ سید مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار قرار دیا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس فہرست سے واجد علی شاہ کا نام یکسر غائب ہے۔

کتاب میں جملہ ڈرامہ نویسوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں اور پھر ہر نام کے ڈراموں کے ناموں کی فہرست دی گئی ہے۔ کہیں کہیں مقابل میں سن اشاعت بھی درج کیا گیا ہے شاید تمام ڈراموں کے سن اشاعت کا تعین ممکن نہیں ہوسکا حقیقتاً اصل افادیت وضاحتی فہرست کی ہوتی ہے جس سے ادبی کارناموں کا تعارف ہوسکے اور ساتھ ہی قاری کی ضروری مواد کی طرف رہنمائی ہوسکے۔

اس فہرست کو وضاحتی فہرست نہیں کہا جاسکتا کہ مصنف اور ڈرامہ کے نام کے علاوہ اور کوئی تفصیل اس میں نہیں دی گئی۔ اردو کے وقیع ڈراموں کی ایک خاص تعداد ترجموں پر مشتمل ہے، اس میں اس بات کی نشاندہی بھی نہیں کی گئی کہ کون سے ڈرامے ترجمہ ہیں اور کون سے طبع زاد۔ فہرست کو زیادہ مفید بنانے کے لیے اسی طرح کی اور بہت سی تفصیلات کا ذکر کیا جاسکتا تھا۔

اسی جلد کے ساتھ یہ اطلاع بھی شامل ہے کہ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک آٹھ جلدوں میں پورا ہوگا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ ان آٹھوں جلدوں میں کیا کیا ہوگا۔ شاید ڈراموں کے بارے میں مزید تفصیلات آئندہ جلدوں میں پیش کی جائیں۔

کتاب کا نام چونکا دینے والا ضرور ہے۔ سن کر خیال نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اردو کتاب ہوگی۔ بلکہ کسی جرمن یا انگریزی کتاب کا گمان گزرتا ہے۔ لیکن یقین کیجیے یہ اردو میں ہی لکھی گئی ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. L-922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-t5-22

Phone—20
Annual Rs 4/-
per Copy-12

جلد ۱۔ شمارہ ۳ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۱۵ر جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

سہ لسانی فارمولا اور اردو

سہ لسانی فارمولے کا تصور اچھا تھا، مگر اب تک اس پر جس طرح عمل ہوا ہے
ں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فارمولے میں بھی لسانی اقلیتوں کے طلبہ خصوصاً
دو کے طلبہ کے لیے دشواریاں موجود ہیں۔ اس فارمولے کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ
وہ اپنی علاقائی زبان اور انگریزی کے، ایک جدید ہندوستانی زبان بھی
ھیں، مگر ہوا یہ کہ تعلیم کے وزیروں کی کانفرنس نے ۱۹۶۱ء میں اس میں کچھ
لی پیدا کر دی اور جدید ہندوستانی زبانوں کی جگہ دستور کے آٹھویں
یڈول میں درج زبانوں کو تیسری زبان کے طور پر پڑھانے کی گنجائش نکالی
ں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتر پردیش میں زیادہ تر تیسری زبان کے طور پر سنسکرت کا
نظام کیا گیا، اردو وہ طلبہ بھی بہت ہی کم پڑھ سکے جن کی مادری زبان اردو
ی۔ جب تمام ماہرین تعلیم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی جگہ مادری زبان کی تعلیم کو ملنی چاہیے
ر علاقائی، مرکز کی سرکاری زبان کو دوسری، تو پھر یہ بات اور بھی قابل
عتراض ہو جاتی ہے کہ لسانی اقلیتوں کو اپنی مادری زبان، تیسری زبان
ے طور پر پڑھنے کا بھی موقع نہ مل سکے۔ اس مسئلے پر کوٹھاری کمیشن نے خاصی
جہ کی ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ سہ لسانی فارمولا کے نفاذ میں تعلیمی مقاصد
سے زیادہ سیاسی مصالح برتے گئے۔ اس لئے اس نے ایک ترمیم شدہ لسانی
ارمولا پیش کیا ہے جس کے مطابق دوسری اور تیسری زبانیں ساتھ ساتھ شروع
ہوں گی نیا فارمولا یہ ہے:۔

۱) مادری زبان یا علاقائی زبان

۲) مرکزی سرکاری زبان یا مرکز کی دوسری سرکاری زبان جب تک یہ صورت رہے۔

۳) ایک جدید ہندوستانی یا بیرونی زبان جو (۱) اور (۲) کے ذیل میں نہ آتی ہو اور وہ زبان نہ ہو جو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہو۔

کمیشن نے اس فارمولے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ لوئر پرائمری درجے پر صرف ایک زبان پڑھائی جائے۔ جو یا تو طالب علم کی مادری زبان ہو یا علاقائی زبان یعنی انتخاب کا طالب علم کو اختیار ہو۔ عام طور پر مادری زبان علاقائی زبان ہو گی مگر لسانی اقلیتوں کے بچوں کے لیے ان کی مادری زبان لازمی ہو اور ان کے ذریعہ سے ہی تعلیم بھی دی جائے۔ ہاں تیسرے درجے سے اگر اختیاری طور پر یہ بچے علاقائی زبان بھی سیکھ لیں تو اچھا ہے مگر اس سلسلے میں کسی طرح کا جبر مناسب نہ ہو گا۔ کمیشن نے صاف کہا ہے کہ لسانی اقلیت کے بچوں کے لیے اس منزل پر علاقائی زبان کی تعلیم لازمی کر دینا کسی طرح مناسب نہ ہو گا اور نہ دوسری زبان کے طور پر انگریزی پڑھانا اس منزل پر کسی طرح مفید ہو گا۔

اعلیٰ پرائمری منزل پر دو زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جاہئیں۔ (۱) مادری زبان یا علاقائی زبان اور (۲) مرکز کی سرکاری زبان یا مرکز کی دوسری زبان یہاں اختیاری طور پر ایک تیسری زبان لینے کی بھی سہولت ہونی چاہئے اور سکنڈری منزل (آٹھویں سے دسویں تک) یہاں تین زبانوں کا پڑھنا لازمی ہو گا اور جس طالب علم نے مرکز کی سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہے وہ اس منزل پر لازمی طور پر ان میں سے ایک زبان پڑھے گا۔

کمیشن کی سفارش کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ مادری زبان کی تعلیم کو مقدم رکھا جائے اور لسانی اقلیتوں کے بچے ابتدائی منزل پر مادری زبان ضرور پڑھیں خواہ وہ علاقائی زبان نہ پڑھیں۔ دوسرا یہ ہے کہ دوسری اور تیسری زبانیں ساتھ ساتھ شروع نہ ہوں تیسری زبان آٹھویں درجے سے شروع کی جائے جبکہ دوسری زبان اعلیٰ پرائمری منزل یعنی پانچویں درجے سے شروع کی جا چکی ہو۔ طلبہ اگر اختیاری طور پر کسی منزل پر کوئی اور زبان پڑھنا چاہیں تو اس کی سہولت ہو مگر کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

کمیشن کے سامنے چونکہ تعلیمی مقاصد ہیں اس لیے اس کی تجاویز بہت اہم ہیں اور اصولی طور پر برتنے کے قابل ہیں۔ مگر عملی دشواریاں یہاں بھی باقی رہتی ہیں۔ جن ریاستوں میں ہندی علاقائی زبان اور سرکاری زبان ہے وہاں لسانی اقلیتوں کے بچوں کے لیے اردو میں ابتدائی تعلیم کا انتظام

صرف سے قابل اطمینان نہیں ہے یعنی عمل میں یہ ہوتا ہے کہ شروع سے طالب علم ہندی لازمی طور پر پڑھتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی لازمی طور پر اور چھٹے درجے سے تیسری زبان کے طور پر سنسکرت کی پڑھائی کا عام طور پر انتظام ہوتا ہے۔ اردو کا بہت کم۔ غیر ہندی ریاستوں میں وہ اردو پڑھ لیتا ہے، مگر اسے اس علاقے کی زبان اور سرکاری زبان بھی سیکھنی ہوتی ہے اور انگریزی بھی۔ اس کے علاوہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ ہندی بھی سیکھ لے۔ اس طرح سہ لسانی فارمولا عملاً اس کے لیے چہار لسانی فارمولا ہو جاتا ہے، ہاں اگر وہ اردو نہ پڑھے تو پھر تین زبانوں کا پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔ ہندی ریاستوں میں اگر کہیں کہیں اردو کو تیسری زبان کے طور پر پڑھایا بھی جاتا ہے تو شاید آئندہ چونکہ کسی جنوبی ہند کی زبان کے پڑھانے پر ملک کی یکجہتی کی خاطر اصرار ہوگا تو پھر یا تو دو ہی زبانیں پڑھے یا اردو کو مجبوراً چھوڑے اس لیے ہماری رائے میں پہلا کام تو یہ کرنا چاہئے کہ پرائمری سطح پر [illegible] بالکل نہ پڑھائی جائے، انگریزی آٹھویں درجے سے شروع اور لازمی ہو ان لوگوں کے لیے جن کی مادری زبان علاقائی زبان ہے دوسری زبان کے طور پر پانچویں درجے سے کسی دوسری جدید ہندوستانی زبان کا پڑھنا لازمی ہو جن کی مادری زبان علاقائی زبان نہیں ہے مثلاً اردو جن کی مادری زبان ہے وہ علاقائی زبان پانچویں درجے سے پڑھیں اور نویں سے اس کے علاوہ انگریزی بھی پڑھیں۔ جو لوگ اردو کسی وجہ سے چوتھے درجے تک نہیں پڑھ سکے ہیں اور علاقائی زبان یا سرکاری زبان پڑھ چکے ہیں وہ پانچویں درجے سے اردو پڑھیں جنوبی ہند میں اردو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے، پانچویں درجے سے علاقائی زبان پڑھیں، آٹھویں درجے سے سب کے ساتھ انگریزی پڑھیں ہندی اختیاری طور پر چاہیں تو اس کے علاوہ پڑھ سکتے ہیں۔

مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہر حال میں تمام بچوں کو سب سے پہلے مادری زبان پڑھنے کا موقع ملے۔ اس کے بعد اگر علاقائی زبان مادری زبان کے علاوہ ہے تو اس کے پڑھنے کا اور آخر میں مرکز کی دوسری سرکاری زبان انگریزی کا۔ اس معاملے میں اگر تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے اور مالی دشواریوں یا فرضی دقتوں کا حوالہ نہ دیا جائے تو لسانی اقلیتوں کے بنیادی مطالبات کا تحفظ بھی ہو سکتا ہے، تعلیمی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں اور قومی یکجہتی کے مقاصد بھی۔ ہاں اگر ریاستی زبان یا مرکز کی سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان یا سنسکرت سب پر اس طرح لادی گئی کہ خواہ مادری زبان پڑھائی جائے یا نہ پڑھائی جائے، یہ زبانیں ضرور پڑھا دی جائیں تو ظاہر ہے کہ لسانی اقلیتوں کو بجا طور پر شکایت ہوگی۔ بہرحال کوٹھاری کمیشن کی سفارشات پر ایمانداری سے عمل کیا جائے اور اس کے سہ لسانی فارمولے میں مخصوص مقاصد کے تحت لچک نہ پیدا کی جائے تو اب بھی تین زبانیں اس طرح پڑھائی جا سکتی ہیں کہ ابتدا سے مادری زبان پانچویں درجے سے اس کے ساتھ دوسری زبان اور آٹھویں درجے سے اس کے ساتھ تیسری زبان اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ارباب اختیار جو لچک پیدا کرنے اور ہر فارمولے کو توڑ مروڑ کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، اس فارمولے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

امیر چند بہار

رباعی

یہ کینہ، یہ رنجشیں، یہ پیکار، یہ جھوٹ
یہ بیر، یہ تفرقے، یہ فساد، یہ پھوٹ
کب جانئے کب تک رہے یہ صورت حال
اس ملک میں ہو رہی ہے کیا لوٹ کھسوٹ

غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے عہدیداروں کا اعلان

لکھنؤ، مسٹر اگرسین، صدر غالب صد سالہ جشن کمیٹی نے حسب ذیل عہدیداروں کو نامزد کیا ہے۔ صدر جناب اگرسین ایم ایل اے (ریڈر [illegible]) نائب صدر، پروفیسر احتشام حسین (الہ آباد)، ڈاکٹر امرت لال عشرت (بنارس)، جناب بھگوتی چرن ورما (لکھنؤ)، میکش اکبرآبادی (آگرہ) اور جناب ایم اے رضوی (کانپور)، جنرل سکریٹری جناب پی ایس سیٹھی (کانپور) جوائنٹ سکریٹری [illegible] بنارس ڈاکٹر راجندر اوستھی [illegible] لکھنؤ [illegible] واحدی خزانچی۔ دو سکریٹریوں اور پانچ ممبران [illegible] عاملہ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

پروگرام کے مطابق غالب پر اردو ہندی میں کتابیں مرتب کی جائیں گی اردو کمیٹی میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر [illegible] حسن، جناب پی ایس سیٹھی اور ڈاکٹر امرت لال عشرت (کنوینر) ہوں گے جب کہ ہندی کمیٹی میں ڈاکٹر بھگوت شرن اپادھیا، جناب بھگوتی چرن ورما، ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور ڈاکٹر راجندر اوستھی (کنوینر) ہوں گے

غالب صد سالہ جشن کے سلسلے میں کلچرل کمیٹی اور مشاعرہ کمیٹی کے بالترتیب کرنل موہن اور [illegible] کنوینر بنائے گئے ہیں اس موقع پر ایک سیمینار بھی ہوگا جس کے انتظام کے لیے حسب ذیل حضرات پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ، ڈاکٹر راجندر اوستھی، جناب مقبول احمد لاری، مظفر سلیم اور پی ایس سیٹھی (کنوینر)، غالب صد سالہ کمیٹی طلبہ کے لیے ایک انعامی مقابلہ بھی کرائے گی اور طلبہ سے غالب کے کلام پر خاص مضامین لکھائے جائیں گے۔

(قومی آواز)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

جدید عربی ادب میں آزاد شاعری کا ارتقا

جدید عربی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں ایک اجتماعی فکر کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ شعراء نے قومی حوادث و واقعات سے مواد اخذ کر کے اپنی شاعری کو حسن و رعنائی بخشی ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کی تحریکوں سے طرز بیان اور طرز فکر دونوں میں کسب فیض کیا ہے مثلاً پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران لبنانی شعراء نے جو اشعار کہے ان پر تحریک رمزیت کے اثرات بڑی وضاحت سے ملتے ہیں اسی طرح سرائیلزم کی علامتیں بھی بعض عرب شعراء کے کلام میں نظر آتی ہیں نفسیات اور لاشعور کے نظریات کے زیر اثر سرئیلزم کی تحریک شروع ہوئی۔ انگریزی کے اس لفظ کا مطلب ہے فوق الواقعہ یا حقائق سے آگے کی بات۔ عرب شعراء کے ایک محدود طبقہ نے اس طرز فکر سے تاثر قبول کیا مگر یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عربی شاعری ہمیشہ سے حقیقت پسند رہی ہے یہ تحریک بنیادی طور پر اس کی فطرت کے خلاف ہے اس لیے اس کو عربوں میں کبھی قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان جدید تحریکوں کا ذکر اس بنا پر ضروری ہے کہ انھوں نے نتیجۃً عربی شاعری کی ہیئت و شکل پر بھی اثر ڈالا ہے اور خیالات کو تو بالکل ہی تبدیل کر دیا ہے۔

جدید عربی شاعری میں دو طرز کے شعرا نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ تو نظم کی قدیم تقسیمات اوزان اور بحور پر سختی سے عامل ہے مگر دوسرا طبقہ مغربی شاعری کی اشکال پر فریفتہ ہے جس انداز کے قوافی یورپی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرز کا تتبع یہ لوگ عربی میں بھی کرتے ہیں، بلکہ خاصے لوگ ایسے بھی ہیں جو آزاد اور مصری شاعری کے دلدادہ ہیں۔ البتہ یہاں ایک امر اور قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تجدد کی بعض شکلیں عربی ذوق سے بڑی ہم آہنگی رکھتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ قافیے کی پابندی میں بعض شعراء ذرا آزادی سے کام لیتے ہیں مثال کے طور پر پہلے شعر اور تیسرے شعر کا قافیہ یکساں ہوتا ہے اور دوسرے شعر و چوتھے شعر کا قافیہ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن وہ شکل جس میں قافیہ بالکل متروک کر دیا جاتا ہے وہ عربی مذاق کے قطعاً خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرز شاعری میں عربوں کی صدیوں کی روایت سے بغاوت ہے اس میں مغرب کی نقالی کے سوا کچھ نہیں اسی بنا پر اس کو قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ دور جدید کی ابتدا سے لے کر اب تک بہت سے شعراء نے اس جانب دعوت دی مگر تمام کوششوں کا نتیجہ ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ سید توفیق البکری اپنے قصیدہ "ذات القوافی" میں آزاد وغیرہ مقفیٰ شاعری کی دعوت دیتے ہیں۔ عبدالرحمٰن شکری، جمیل صدقی زہاوی اور احمد ذکی ابوشادی جیسے اہم شعرا تک عربوں کو اس طرف بلاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور نہ وہ عوام کے مذاق کو بدل سکے۔

آزاد شاعری میں محض یہ نہیں کہ قافیہ نہیں ہوتا بلکہ عروض کی تمام پابندیوں سے وہ آزاد ہوتی ہے۔ ایک شعر میں صرف ایک وزن مثلاً مفاعیلن ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں تین بار مفاعیلن آسکتا ہے یا اس سے بھی زیادہ بار یعنی بلا کسی قید کے مختلف اوزان پر مختلف تعداد سے مصرعے آ سکتے ہیں[1]

مصطفیٰ صادق الرافعی آزاد شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہمارے دور میں ایک طرز شاعری ایسا نکلا ہے جس کا نام شعر منثور رکھا جاتا ہے۔ یہ نام خود اس کے نام رکھنے والے کی جہالت کا اعلان کرتا ہے۔ شعر منثور سے یہ بہت بہتر ہے کہ جس کا دل چاہے اپنی باتیں یا اپنا ما فی الضمیر نثر میں پیش کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی شاعری بڑی نزاکت کی حامل ہے۔ موسیقی کے ہوتے ہوئے بھی اگر ادنیٰ سی کمزوری کسی پہلو سے رہ جائے تو اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس نثر ہر قسم کے عیب کو برداشت کر لیتی ہے۔ اگر کوئی شعر منثور کا نام لے تو سمجھ جاؤ کہ اگرچہ وہ شاعری کرنے سے عاجز ہے مگر پھر بھی ایک دوسرے انداز سے دعوائے شاعری کر رہا ہے[2]

بیسویں صدی میں جب عربوں پر مغربی ادب کے بھرپور اثرات مرتب ہوئے تو انھوں نے قصائد کو بھی مختلف قطعات میں نظم کیا جس میں کبھی اشعار باہم مختلف ہوتے اور کبھی متفق۔ ہر ٹکڑے کے قوافی دوسرے جدا ہوتے۔ بعضوں نے مغربی اصول کے طرز پر دوہرے قافیے استعمال کیے۔ ان کے ٹکڑے بھی اسی انداز پر پیش کیے اور ایسی بحروں کو ترجیح دی جو ہلکی و دلکش ہوں۔ بعضوں نے وزن اور قافیوں کو خیرباد کہا اور بعض شعراء نے وزن کو تو قائم رکھا مگر قافیہ کو اڑا دیا۔ جن اشعار میں قوافی باقی رہے اور وزن غائب ہو گیا ان کا نام شعر منثور رکھا گیا اور جن اشعار میں وزن قائم رہا مگر قوافی غائب ہو گئے ان کو شعر مرسل کہا گیا۔ ایسے اشعار میں کسی مخصوص بحر، وزن اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ ہاں وزن کسی نہ کسی شکل میں ضرور باقی رہتا ہے۔ شکری کے مجموعۂ کلام "ضوء الفجر" میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں:۔

ولولا خدعة الامل المرجّى　　لاسلمنا النفوس الى الحمام

اگر امید کا دھوکا نہ ہوتا تو ہم اپنے نفسوں کو موت کے سپرد کر دیتے

بكائى انى اعدّ وغريبًا　　وحولى معشرى وبنو ودادى

میرا رونا یہ ہے کہ میں اجنبی ہوں حالانکہ میرے گرد میرے کنبہ والے اور محبت والے ہیں

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الادب العاصر فی مصر مصنفہ شوقی ضیف

[2] فی الادب الحدیث ج ۱ مصنفہ عمر الدسوقی ص ۲۲۹

کانّی ان فی الدنیا امورا　　یضیق بمثلها الصدر الرحیب

میرا دونا یہ ہے کہ دنیا میں ایسے معاملات ہیں جن سے وسیع سینہ رکھنے والا بھی تنگی محسوس کرتا ہے[1]

"الشعر الحر" یعنی آزاد شاعری بھی اسی قسم کی چیز ہے جس میں بحر کا اہتمام نہیں ہوتا بلکہ وزن میں "تفعلہ" پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحر کے مقررہ وزن سے قطع نظر شاعر حسب مرضی کوئی وزن اختیار کر لیتا ہے اور قوافی بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ مقبولیت اس طرز کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام طرز ہائے شاعری کو کسی عظیم شاعر کا دامن نہ مل سکا، حافظ و شوقی ان کے قریب نہ گئے۔ مطران و شکری نے اس طرز کو کہیں کہیں اختیار کیا ہے مگر ان کے بعد اس درجہ کے شعراء بھی اس جانب متوجہ نہ ہوئے۔ اس طرز شاعری میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ جمالیاتی عنصر کی کمی، [اور] ترنم و موسیقی کی کیفیت کا فقدان ہے۔ کبھی تو آزاد شاعری بالکل مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر ایک گہرے اور اعلیٰ شعور سے ایک بالکل سطحی تخیل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور کبھی الفاظ کی تکرار شعر کو [بے مزہ] کر دیتی ہے۔ آزاد شاعری کا بڑا عیب ناہمواری ہے۔

آزاد نظم میں ایک طریقہ اور رائج ہے یعنی شاعر نہ وزن استعمال کرتا ہے اور نہ قافیہ۔ یہ سب سے ناکارہ شاعری کی بدترین شکل ہے خصوصاً فقدان وزن تو شعر کی موت ہے۔ اگر اس کو شاعری کہا جا سکتا ہے تو پھر ابن عمید اور صاحب بن عباد وغیرہ کا پورا نثری سرمایہ سب شاعری تھا جس میں حسین تشبیہات اور دلکش استعارے موجود ہیں اور روانی کا یہ عالم محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ندی چڑھتی اور اترتی ہو۔ جدید شعراء بھی استعاروں اور تشبیہات سے اپنے کلام کو پُر کر دیتے ہیں لیکن ان کے استعاروں میں کچا ذہن اور ناپختہ شعور ملتا ہے۔ اس قسم کی شاعری میں کشش، جذبہ اور اثر کی کمی محسوس ہوتی ہے حالانکہ یہی عناصر شاعری کو زندگی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔

امریکہ میں رہنے والے عرب مہاجر شعراء نے سب سے پہلے اس طرز کی آزاد شاعری کا آغاز کیا۔ ابو شادی نے اپنے بعض اشعار بلکہ نظموں میں ان شعراء سے تاثر قبول کیا۔ بالکل جدید زمانہ میں تو بہت سے شعراء اس راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح حشو، قافیہ کی غرابت اور تکرار سے شاعری کا دامن پاک ہو جاتا ہے مگر ان کی تمام دلیلیں باطل ثابت ہوتی ہیں اس لیے کہ اولاً تو عوام اب تک آزاد نظم کو پسند نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی شاعری ایک غنائی شاعری ہے لیکن آزاد شاعری میں غنائیت کی واضح طور پر کمی محسوس ہوتی ہے۔ عربی شاعری خود اتنی قدیم اور ترقی یافتہ ہے کہ اس کو مغرب کی راہ پر لے جانا اس کا گلا گھونٹنا ہے۔ مغربی طرز کی شاعری میں صرف ایک فائدہ ہے یعنی آسانی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ممتاز شعراء فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے لیے عروض و قافیہ کی مشکلات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ قوافی وغیرہ تو ان کے لیے پانی سے زیادہ نرم اور نسیم سحر سے زیادہ خوش خرام بن جاتے ہیں۔ وزن، بحر اور فن عروض کی پابندیوں کے اثرات سے اشعار میں نزاکت، حس میں تیزی، نظم میں روانی، طبیعت میں جلا اور ذوق میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وزن، قافیہ اور بحر کے باعث اشعار کے حفظ کرنے میں آسانی ہوتی ہے[1]

یہ خیال سرے سے باطل ہے کہ عربی شاعری میں قافیہ کا استعمال ثقل کا باعث ہے اور بے کار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان الفاظ کا عظیم ذخیرہ اپنے جلو میں رکھتی ہے۔ شاعر کا اولین فرض ہے کہ وہ اس ذخیرہ تک رسائی حاصل کرے۔ پھر اس کے بعد قوافی کا انتخاب کوئی مسئلہ بن کر اس کے سامنے نہیں آتا۔ عربی شاعری کی طویل [تاریخ] میں کبھی کسی شاعر پر قافیہ کے وجود نے گرانی نہیں کی حتیٰ کہ عصر "نہضہ" کے شعرائے محافظین نے بعض طویل ترین [قصیدے] قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ [لکھے] مثلاً سلیمان بستانی نے [ہومر] کی ["الیاڈ"] کا ترجمہ کیا اور شوقی نے طویل ڈرامے نظم کیے۔ سب [سے بڑی] حق [بات] یہ ہے کہ قلب انسانی پر موزوں و مقفیٰ اشعار کا اثر بہ نسبت آزاد شاعری کے زیادہ ہوتا ہے۔

بہرحال قصص شاعری میں یا تمام جدید مضامین کے لیے اگر آزاد نظم کو ذریعہ اظہار بنایا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں مگر عربی قصائد و تشبیب میں اس طرز شاعری کا استعمال نہایت قبیح و نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

[1] فی الادب الحدیث ج ۱ صفحہ ۳۰۰-۳۰۲

[1] ملاحظہ ہو الادب العربی المعاصر مصنفہ شوقی ضیف مطبوعہ قاہرہ مصر

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

پاکستان کے ممتاز شاعر سلیم احمد کی غزلوں کا مجموعہ "بیاض" ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ان معدودے چند مجموعوں میں سے ہے جن کے دیکھنے اور پڑھنے کی طلب ہر وہ شخص محسوس کرے گا جسے موجودہ دور کے ادبی رجحانات سے دلچسپی ہے اور پھر سلیم احمد ان لوگوں میں نہیں ہیں جو "شاعر محض" کی حیثیت رکھتے ہوں، جن کے بارے میں ہمت افزائی کے طور پر ایک کلمۂ خیر کہنے یا بین بین قسم کی رائے دینے سے ہی کام چل جائے اس لیے کہ ان کے کچھ مضامین مثلاً "نئی نظم اور پورا آدمی" یا "غزل، مغل اور ہندوستان" ابھی کچھ ہی دنوں پہلے ادبی حلقوں میں فتنہ و فساد کا سبب بن چکے ہیں ویسے ان مضامین کی بعض لوگوں نے بے حد تعریف کی ہے اور اردو کی نئی تنقید میں سلیم احمد کی ان تحریروں کو ایک نئے امکان سے تعبیر کیا ہے مثلاً ن۔م راشد نے اپنے ایک مضمون نما طویل خط کے ذریعہ ان مضامین کی کھل کر داد دی ہے (یہ خط نیا دور کراچی میں شائع ہو چکا ہے) اور پاکستان کے مشہور نقاد و انشائیہ نگار نظیر صدیقی کا کہنا ہے کہ "یہ انداز نظر مغربی تنقید کے کسی اصول یا نظریے کو مشرقی ادب پر چپکا دینے کا نتیجہ نہیں بلکہ ذاتی غور و فکر کا ایک ایسا انعام ہے جو سلیم احمد ہی کے لیے مقدر تھا۔

لیکن ان چند مخصوص رایوں سے قطع نظر سلیم احمد کے مضامین ادیبوں اور شاعروں کے حلقے میں خاصے دنوں تک زیر بحث رہ چکے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر اور اسلوب تحریر دونوں سے بڑی حد تک اختلاف کیا گیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سلیم احمد کے خیالات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی ذہانت وطباعی، ان کی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور ان کے وسیع مطالعے کی داد دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے حالی سے لے کر حال تک کی اردو نظم کے متعلق بعض ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن پر غور کیے بغیر ہم اپنی شاعری میں کوئی نتیجہ خیز تبدیلی نہیں لا سکتے۔ مثلاً ان کا یہ خیال کہ غدر کے بعد ہمارے معاشرے کا پورا آدمی ٹوٹ پھوٹ کر سیاسی، اخلاقی، اصلاحی اور رومانی آدمی بن گیا جس کے نتیجے میں ہماری شاعری چند مفروضوں اور فارمولوں کی اسیر ہو کر زندگی کی نامیاتی وحدت سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھی۔ ان کا دوسرا اہم نکتہ غزل کے متعلق ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں "نزلہ عضو ضعیف پر گرتا ہے لیکن اردو شاعری کی پچھلی سو سالہ تاریخ میں عضو رئیس پر گرا ہے یعنی غزل پر۔ غدر کے ہنگامے میں انگریزوں سے مار کھانے کے بعد روشن خیال مسلمانوں کو اپنی جو چیز سب سے بری لگی وہ یہی بدنام صنف سخن تھی۔"

سلیم احمد کے ان دونوں مضامین میں انتہا پسندی کے اور بعض ایسی بیتے کی باتیں ہیں جن سے واقف ہونا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جسے اپنی زبان اور اپنے ادب کی اصناف سے دلچسپی اور انھیں آگے بڑھانے کی تمنا ہے۔

سلیم احمد کا سب سے اہم کارنامہ میرے نزدیک غزل کی اہمیت اور معنویت کو از سر نو دریافت کرنا اور اسے نئے ذہن سے قریب لانے کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس غزل کی بھی قلعی کھولی ہے جس پر "رومانی آدمی" کی چھاپ ہے۔ سلیم احمد کے نزدیک یہ غزل زندگی کی صداقتوں سے گریز کر کے ایک مصنوعی اور فرضی دنیا میں پناہ لیتی ہے۔ ہماری تنقید نے عام طور پر صرف اس غزل کو مطعون کیا تھا جو زبان اور محاورے کے بل پر اور ردیف و قافیہ کی الٹ پلٹ سے تیار ہوتی ہے اور جسے ہمارے یہاں "استادانہ غزل" کہتے ہیں پچھلے دنوں نوح ناروی اس طرز کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ لیکن سلیم احمد نے اس غزل کو بھی جھوٹی اور بناوٹی قرار دیا ہے جس میں بظاہر "جذبات" نظر آتے ہیں لیکن یہ "جذبات" بھی رسمی ہوتے ہیں یہ "جذبات" زندگی کے حقیقی تجربے سے برآمد نہیں ہوتے بلکہ محض شاعری کرنے کے لیے اوپر سے اوڑھ لیے جاتے ہیں کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ شاعری کے لیے "سوز و گداز" ضروری ہے عشق و

اشفاق احمد اعظمی

غزل

اے یار اب کدھر ہے تری فکر کا بہاؤ
ڈھلوان ہی کی سمت کہ جس سمت ہے چڑھاؤ

ڈوبی ہوئی ہے قلزم خوں میں نئی سڑک
جی چاہتا ہے خود بھی اسی طرح ڈوب جاؤ

آتی ہے ہر طرف سے وہی موت کی صدا
باجا بجاؤ جنگ کا یا ساز دل اٹھاؤ

بیٹھی ہے سر جھکائے ہوئے شام ہی سے زیست
تاروں کی انجمن میں اسے بھی کوئی بلاؤ

طوفان کی لپیٹ میں تلوار توڑ کر
خود آگئی بھنور میں مری زندگی کی ناؤ

یہ ریت کا مکان نہیں قصر فکر ہے
اے سر پھری ہواؤ! کناروں پہ لوٹ جاؤ

بیٹھو ہمارے پاس ابھی سرد ہے فضا
کچھ کم نہیں ہے "رات کے کوڑے" کا یہ الاؤ

اشفاق کی جوان امنگوں کا مرثیہ
لکھیں گے کل کے لوگ، مرے ہمصفیر جاؤ

محبت کی بہت کھلا ہوا شعر کہنے کے لیے لازمی ہے" وغیرہ وغیرہ
نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے غزل گویوں نے برائے شعر گفتن سوز و گداز پیدا
کرنے کی کوشش کی یا عاشقی کا سوانگ رچایا۔ چنانچہ ان کی غزل
کو اندر سے کریدا جائے تو چھلکے کی طرح اس کی حقیقت سامنے
آجاتی ہے۔

اس لمبی چوڑی تمہید کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس
ہوئی کہ سلیم احمد کے ان خیالات سے واقف ہوئے بغیر خود ان کی
غزلوں کے ذائقے سے ہم پورے طور پر لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔
غیر رومانی غزل کا یہ نظریہ اور غزل کا وہ کھردرا لہجہ جسے سلیم احمد نے
برتنے کی کوشش کی ہے اس سے پہلے یگانہ اور شاد عارفی کے
توسط سے ہمارے سامنے آچکا تھا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یگانہ
اور شاد نے اپنے شعری رویّے کے لیے کوئی مستحکم تنقیدی نظریہ بنانے
یا منوانے کی کوشش نہیں کی۔ سلیم احمد نہ صرف اپنے مضامین کے
ذریعہ بلکہ بعض اشعار کے ذریعہ بھی اسے ایک ادبی نظریہ کی صورت
دینا چاہتے ہیں۔

سلیم احمد نے جن اشعار کے ذریعہ رومانی غزل پر تنقید اور
اپنی غزل کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کی مثالیں یہ ہیں:۔

بوسیدہ ہو چکی ہے جذبات کی قبا حسن غزل کا ساتھ ہو گوٹا لگا ہوا

لباس درد بھی ہم نے اتارا یہ کپڑے اب پرانے ہو چلے ہیں

دل ہے شاید درد سے خالی سلیم آپ کا لہجہ بہت غمناک ہے

تاج کانٹوں کا پہن کر سنگ و آہن جھیل کر
حضرت دل آئے ہیں الفت کا ناٹک کھیل کر

تنگ آگیا ہوں جھوٹے نگینوں کے کام سے
حسن بیاں وہ دے کہ حقیقت کہیں جسے

اُترن پرانی فکر کی بکتی ہے شہر میں
سونی پڑی ہے تازہ خیالات کی دکاں

وہ دن گئے جب خیر سے تھا شوق نگارش
اب اپنی غزل گوئی ہے جذبات کی غارش

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات ہو گئے سید بنے سلیم چمار

عشق میں اور تو کیا ہونا تھا ایک مجموعہ کی تالیف ہوئی

آخری شعر پڑھ کر بے اختیار حسرت موہانی کا یہ شعر یاد آیا۔

حسرت جو کاروبار محبت یونہی رہا
سُن لو گے ہم بھی صاحب دیوان ہو گئے

حسرت نے جو بات فخر کے طور پر کہی تھی سلیم احمد کے یہاں اس پر
طنز اور حقارت کا رویّہ ہے۔ سلیم احمد کے غیر رومانی اور حسرت کے
رومانی تصور شعر کا فرق اس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

اب کچھ شعر ایسے بھی دیکھ لیں جن سے اندازہ ہو کہ سلیم احمد
خود اپنی شاعری کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں:۔

حقیقت کو مکمل دیکھنا ہے نظر کے رُخ بدلتا جا رہا ہوں

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت میں اس کو زبان دے رہا ہوں

الفاظ پہ نہ جا کہ بیاں گو نیا نہیں یہ ماجرا وہ ہے جو کسی نے سنا نہیں

ان تمام دعووں کو جب ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں تو سلیم احمد
کے مجموعے سے فطری طور پر ہم بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لیتے
ہیں۔ جو حقیقت ازل سے اب تک گونگی ہے اس کو [illegible]
واقعی بہت بڑا کام ہے اور اگر کوئی اس کام میں [illegible] کر لے اور [illegible]
میں ناکام ہو جائے تو اس کی ناکامی بھی [illegible]
ہے کہ اس اعتبار سے سلیم احمد کا یہ مجموعہ [illegible] مایوس کن ہے۔
کیونکہ سلیم احمد نے اپنے گنے چنے چند اشعار میں جنس کو موضوع
بنایا ہے لیکن وہ اس باب میں ہمارے پرانے رنگین گو شعراء
سے آگے نہ جا سکے۔ مثلاً ان کی ایک غزل یوں شروع ہوتی ہے

دھر کیا ہے زبانی پیار کے رنگیں فسانوں میں
کھرے کھوٹے کا سب احوال کھل جائے گا رانوں میں

تو ہم سوچنے لگتے ہیں کہ شاید پہلی بار کھلے انداز میں شاعر ہمارے
سامنے آ رہا ہے لیکن اگلے ہی شعر سے سلیم احمد پھر رمز و ایما کا سہارا
لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور وہی غزلیت سامنے آتی ہے:۔

جواں بدمست راتیں سانس بھی آہستہ لیتی ہیں
لہو سرگوشیاں کرتا ہے سرشاری کے کانوں میں
سمٹ آتی ہے روح بے قراری ایک نقطے پر
وہ نقطہ مثل ساعت پھیلتا جاتا ہے جانوں میں
سحر ہوتے یہ گونگا تجربہ محسوس کرتا ہے
کہ رچ کر رہ گیا ہے ذائقہ خوں کا زبانوں میں

یہ اشعار بہت خوبصورت اور جاندار ہیں لیکن سلیم احمد
نے جو سر اٹھایا تھا اسے آگے نہ لے جا سکے۔ اسی طرح اس
مجموعے میں مشکل سے چھ سات غزلیں ایسی ہیں جن میں سلیم احمد
نے اپنی دانست میں اپنے قاری کے ذہن کو دھکا پہنچانے کی کوشش
کی ہے لیکن دو ایک شعر کے بعد وہ پھر سنجیدہ ہو جاتے ہیں یا پھر جرأت
و رنگین کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم احمد نے اس شعری مزاج کو

اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے اور غزل میں اجتہاد کی خاطر باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیا ہے اس لیے وہ اس میدان میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے اور ان کی جنسیت محض منھ کا مزا بدلنے کی ایک کوشش بن کر رہ گئی۔ جب قاری ان کی کتاب کے فلیپ پر یہ تحریر پڑھتا ہے کہ

"شعر و ادب کے پڑھنے والے کو بالغ اور نڈر ہونا چاہیے
۔ میں نے جو کچھ کہا ہے بے خوفی سے کہا ہے۔ میں
اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید رکھتا
ہوں۔"

تو خیال گزرتا ہے کہ یہ بے حد خوفناک مجموعہ ہوگا لیکن اس پر کچھ ہی دیر کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہ اندیشہ بے بنیاد تھا۔ یہ مجموعہ تو بہت ہی بے ضرر قسم کا ہے۔ جن دس پانچ اشعار میں بے خوفی اختیار کی گئی ہے اس میں بھی ہمارا شاعر بے خوفی کی اس روایت سے کوسوں پیچھے رہ گیا ہے جو انشاء، نظیر، میر، سودا اور دوسرے بہت سے شعرا کے یہاں واشگاف انداز میں موجود ہے۔ اور فراق کے یہاں خاصی رچی ہوئی صورت میں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سلیم احمد نے اس تجربے سے پہلے جو غزلیں لکھی ہیں وہی ان کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں۔ ان غزلوں میں یگانہ اور فراق کے لہجوں کی ملی جلی سی کیفیت ہے، کچھ غزل کی دیرینہ رمزیت ہے اور کچھ نئے ذہنی رویے کا عکس۔ ان غزلوں میں ہمیں غزل کا ایک مانوس لہجہ اور معیار بھی ملتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ان کے چند اچھے شعر یہ ہیں:-

شاید کوئی بندۂ خدا آئے — صحرا میں اذان دے رہا ہوں

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ — سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں
یہ جی چاہا تھا پتھر بن کے جی لوں — سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

سلیم ہم بھی سفینے کے بادباں کھولیں
اٹھے جو موج کوئی دل ابھارنے والی

بین کرتی ہے دریچوں میں ہوا — رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں

غرور تشنہ لبی نے سراب ہی سمجھا — نظر کے سامنے دریا رہے رواں کیا کیا

سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا سب نے
یہ بھی دیکھو کہ تمھیں ہم نے بھلایا کیسا

آسماں صد ہزار آنکھوں سے — کس کی جانب ازل سے ہے نگراں

میں کر رہا ہوں ترے چشم نم سے اندازہ — کہ آنے والے زمانے بہت حسیں ہوں گے

ریاکاری لبوں نے سیکھ لی ہے — کوئی حالت ہو یہ ہنستے رہیں گے

غرور کم ہنراں دیکھ کر یہ راز کھلا — غرور سایۂ معکوس ہے ندامت کا

سلیم احمد کی غزل کا یہ لہجہ دراصل جدید غزل کا لہجہ ہے۔ یہ وہ غزل ہے جو یگانہ اور فراق کی روایت کو اپناتے ہوئے بھی اس سے آگے کی چیز ہے لیکن سلیم احمد نے اپنے اس رنگ کو زیادہ ابھارنے اور چمکانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی بہت سی روایتی لہجے کی غزلوں میں اکا دکا اس قسم کے اشعار دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش سلیم احمد اسی راستے سے اپنی منزل کو پانے کی کوشش کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی پوری کی پوری غزلیں اسی لہجے میں ڈوبی ہوئیں اور ان کے مجموعے پر اسی رنگ کی چھاپ ہوتی۔ غزل کے اس نئے لہجے کو موجودہ دور میں ظفر اقبال، شکیب جلالی، احمد مشتاق، اطہر نفیس، ساقی فاروقی، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، تسنیم حسمی، پرکاش فکری، مظفر حنفی، بشیر بدر، بمل کرشن اشک اور دوسرے بہت سے شعرا نے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور یہی دراصل اس دور کی غزل کا حقیقی لہجہ ہے۔ سلیم احمد کے لیے اب ضروری ہے کہ وہ تعصبات اور مفروضوں کی فضا سے نکل کر اپنی اصل آواز کو پہچانیں۔ وہ ان ذہین و طباع نوجوانوں میں ہیں جن کے اندر بے پناہ صلاحیت ہے اور وہ ہماری شاعری کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔

مکتوب لندن

اپنا ہی گھر سمجھئے

۲۳ر دسمبر کے 'مشرق' میں اس عنوان سے برمنگھم کے محمد بشیر صاحب ایک مراسلہ میں رقمطراز ہیں :-

"برطانیہ میں اردو سمجھنے اور بولنے والے تارکین وطن کی تعداد کم از کم ڈیڑھ لاکھ ہوگی بی بی سی ٹیلیویژن پروگرام 'اپنا ہی گھر سمجھئے' "MAKE YOURSELF AT HOME" اردو والے اسے نہ جانے کیوں ہندوستانی کہتے ہیں) تارکین وطن کے لئے شروع کیا گیا تھا یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے تھے اور برطانیہ کے شب و روز کے متعلق جان سکتے تھے لیکن 'اپنا گھر سمجھئے' میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو ہونا چاہئے تھی۔ کافی عرصہ سے اس پروگرام میں تارکین وطن کو انگریزی سکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس پروگرام میں چھوٹی چھوٹی اور عام باتیں سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جو تارکین وطن کی اکثریت روزمرہ کی زندگی میں پہلے ہی سے جانتی ہے ہم برطانیہ میں رہتے ہیں ہمیں کم از کم یہاں کے متعلق ہر ہفتہ کچھ معلوم ہونا چاہئے لیکن ہفتہ کے بعد 'اپنا ہی گھر سمجھئے' کو دیکھا جائے تو سوائے وقت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ دو میں ریکارڈ ... عمیانہ ... انگریزی کا سبق یا کوئی ناچ گانا۔

سچ پوچھیں تو آج تک یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ پروگرام کس طبقہ کے لئے شروع کیا گیا ہے آخر اسے مفید پروگرام کو اتنا محدود کر دینے میں کیا مصلحت ہے۔ کیا اس کو زیادہ مفید اور دلچسپ نہیں بنایا جا سکتا'

امید ہے کہ بی بی سی کے مہدر گول اور سیم شاہد اس طرف توجہ دیں گے

۱۹۶۷ء کا برطانیہ میں اردو کا شعری سرمایہ

مشہور ہیئت دان اور ادیب امیر بشیر

اس عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون مرتب کر رہے ہیں اور انھوں نے تمام ارباب سخن سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنا ایسا کلام (یا اس کے نمونے) ارسال کریں جو ان حضرات نے گزشتہ سال موزوں کیا ہو مضمون میں یہ خیال رکھا جائے گا کہ مختلف مقامات میں رہنے والے شعرا کا معیاری کلام تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ اگر کلام کے ساتھ ایسے خاص اشعار یا نظموں کا پس منظر یا محرک اثرات کا بھی ذکر کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ فوٹو اور کلام لندن کے پتہ پر طلب کئے گئے ہیں۔

انتخاب سخن: ہم لوگ از محمد شریف بقا لندن

بے بسی کا مزار ہیں ہم لوگ	جانے کتنے مزار ہیں ہم لوگ
... سر گراں ہیں ہم ...	ورنہ یاروں کے یار ہیں ہم لوگ
... فکر مند نہیں	ایک دم بیقرار ہیں ہم لوگ
مرنے جینے پہ اختیار کہاں؟	حیف بے اختیار ہیں ہم لوگ
ہر طرف چل رہی ہے باد سموم	پھر بھی صبح بہار ہیں ہم لوگ
ہم ہنوز آزما رہے ہیں، گرچہ	کشتۂ روزگار ہیں ہم لوگ
اک جگہ، ایک پل نہیں آرام	وہ غریب الدیار ہیں ہم لوگ
آرزوؤں کا خون ہوتا ہے	حسرتوں کا مزار ہیں ہم لوگ
اس طرب گاہِ دہر میں اے بقا	دیکھ سینہ فگار ہیں ہم لوگ

انجمن کی زیر طبع کتابیں

۱۔ نئے ڈرامے جدید ایڈیشن، ڈاکٹر محمد حسن
۲۔ انتخاب جدید ( ) مرتبہ آل احمد سرور و عزیز احمد
۳۔ خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ڈاکٹر وحید اختر
۴۔ انگریزی ادب کی مختصر تاریخ ڈاکٹر سیمین صدیقی
۵ اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین
۶ تلمیحات و اشارات اقبال ڈاکٹر اکبر حسین قریشی
۷۔ یادگار لطر دت رائے لطر
۸۔ میکبتھ (اردو ترجمہ) مترجم، ڈاکٹر محمد اشرف
۹۔ تین معرکی ڈرامے مجنوں گورکھپوری
۱۰۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی
۱۱ خواب شیریں جے کرشن چودھری

انجمن کی انعامی کتابیں

انجمن کی وہ کتابیں جن پر ساہتیہ اکیڈمی اور حکومت اتر پردیش نے مصنفین کو انعامات دیے ہیں حسب ذیل ہیں :

۱۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	۵/۵
۲ دیوان غالب	امتیاز علی عرشی	۲۰/۰
۳ تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۵/۴
۴ ذکر حافظ	سجاد ظہیر	۲/۲۵
۵ غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۲/۰
۶ قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶/۰
۷ کچھ ذرے کچھ تارے	آنند نرائن ملا	۲/۵۰
۸۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۷/
۹۔ میر تقی میر اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۲/
۱۰۔ ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

مراسلات

میسور میں سلطان ٹیپو کے عہد حکومت کے قبل کی دو اردو کتابیں

جناب محمد سعید عبدالخالق صاحب (عثمانیہ) نے اپنی تصنیف "میسور میں اردو" (شایع کردہ درس گاہ اردو دار المطالعہ عام معظم بلڈنگ حیدرآباد دکن) کے پہلے باب ماقبل دولت خداداد میں دو کتابوں سے متعلق یوں لکھا ہے

"ترجمہ تنبیہ الغافلین (۱)

ہم نے میسور میں مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں ایک کتاب دیکھی جو "تنبیہ الغافلین" نامی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی اردو نثر کا نمونہ ہے اور ۱۰۹۹ھ میں ترجمہ ہونی کا علم ہوتا ہے۔ لیکن کاتب خراب، گمان غالب ہے کہ یہ ریاست میسور کے کسی علاقہ میں لکھی گئی ہے مترجم نے کتاب کی ابتدا اس طرح کی ہے

میں ایمان لایا ساتھ اوپر خدای تعالیٰ یو خدای تعالیٰ ایسا ہی تمام
عالم کو پیدا کیا ہے ایسے حیوسوں کسی کی سطلای سوں نہیں ہوا
حملہ عالم کوں رزق دینہارا ہو ایمان سوں ایمانی کوں مارینہا
سو ادھی تمام عالم کو پیدا کرنہارا۔ . . . الخ"

"ہزار مسائل" (۲)

ہم نے ایک قلمی مخطوطہ مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں دیکھا جس کا نام "ہزار مسائل" ہے مصنف کا نام محمد علی ابن مخدوم صدیقی ہے اس کے اجداد کی قضائت قلعہ کوپل میں تھی۔ اس نے قلعہ کوپل میں اس کا کسی فارسی کتاب سے ۱۱۰۵ھ میں دکھنی منظوم ترجمہ کیا چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

یہی ہجرتی تھی سالہ سنہ یو قرار | ہزار ایک سو پر تھی پنچاہ شمار
کیا اس رسالہ کو جوش انصرام | محمد علی ابن محمد رہ نام
یعنی نسل صدیق کی ذات کا | کہیں شیخ پیچے قریبے سمجھا
لکھا ترجمہ کر اس کا بھائی | جو ہے قلعہ کوپل گنگر جس کا ناؤں

اگر اس کتاب اور قلمی مخطوطہ سے متعلق کچھ سعید صاحب یا فرزندان مولوی شاہ ابوالحسن ادیب صاحب "ہماری زبان" میں تحریر فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا

(سید رشید ر)

ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے بارے میں

۱۵ر دسمبر کے شمارے میں رائجہ عروض اور میرے متعلق ڈاکٹر گیان چند کا جو طویل مضمون شائع ہوا ہے اس کا مکمل جواب "ہماری زبان" میں دینا ناممکن ہے۔ لہذا مختصر سے مختصر الفاظ میں صرف کچھ ضروری باتیں عرض کر رہا ہوں۔

اپنے مضمون میں میں نے ڈاکٹر گیان چند کی فضیلت کی جو تعریف کی تھی اسے موصوف عالی اپنی ہجو قرار دیتے ہیں میں ان کے اس سوءِ ظن کو اپنی ہجو سمجھتا ہوں۔ میری نظر ڈاکٹر گیان چند کے علمی کارناموں کا بیحد احترام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے ایک جرنلسٹ قسم کا مضمون دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین میرے بیحد محترم عنایت فرما ہیں۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے متعلق ان کے خیال سے مجھے بالکل اتفاق نہیں۔ اعجاز صاحب بڑے رنگ مزاج آدمی ہیں ہو سکتا ہے ان کی نجی تحریر اپنے عزیز شاگرد کی حوصلہ افزائی ہو۔

ہندی بحروں سے اردو بحروں کا اشتقاق بنیادی طور پر ایک غلط خیال ہے۔ اردو بحروں میں ایک آفاقی موزونیت ہے۔ لہذا وہ ہندی تو کیا بعض جگہ انگریزی بحروں سے مماثل نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن آگے بڑھتے ہی پھر دونوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔ اردو میں نہ کوئی ہندی بحر ہے اور نہ اصولاً ہو سکتی ہے۔ سنسکرت بحروں کا خاصا حصہ اسی طرح اردو مزاج کے لیے ناموزوں ہے جیسے عربی کی خارج شدہ اور متروک بحریں۔

امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں جو توسیعات کی ہیں وہ ہندوستانی موسیقی کے حدود کے اندر ہیں ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں امیر خسرو کی مثال قطعاً بے محل ہے۔

شاعری میں وہ جامات ترک کر دئے جاتے ہیں جو خود شاعر کے ذوق کو مطبوع نہیں ہوتے۔ یہی ڈاکٹر گیان چند کو بھی کرنا چاہئے محقق طوسی جیسا عالی باحرمت ان کے زبان ایسا ہی انکا بالکل زیب نہیں دیتا

میں نے جس جگہ اتباعِ اصول کی ضرورت پر زور دیا ہے وہیں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ توسیع اصول کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ بشرطیکہ ثقات فن بھی ان توسیعات کو تسلیم کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے بیان کو توڑ مروڑ کر میرے غیر اصولوں کے سامنے ایک بیان کی نمائش کرنا چاہی ہے مجھے ان کی اس روش پر سخت اعتراض ہے۔ میں ترقی پسند تھا ہوں اور رہوں گا ترقی تو میرا ایمان ہے میں مخالف ہوں بے راہ روی اور عذر باری کا جو زبان اور شاعری کو تباہ کر دے گی۔

ماترے گن کر اردو بحروں کے متعلق جو خیال ڈاکٹر گیان چند نے پیش کیا ہے وہ بھی عجیب ہے۔ اردو بحور کو ماترے سے کیا واسطہ! رباعی میں بیس اور اکیس ماترے صرف افہام کے لیے ہیں۔ رباعی کی موزونیت ماترے گن کر نہیں جانچی جاتی۔ رباعی کے حساب کے مطابق بیس یا اکیس ماتروں کے باوجود بھی مصرع خارج از رباعی ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند ہماری زبان کے ایک مستند محقق ہیں اور ہمیں ان سے بہت توقعات ہیں۔ میری بیحد ناچیز گذارش یہ ہے کہ اس قسم کی عروض بیانی نہ ان کا میدان ہے اور نہ اس میں انھیں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا چاہئے۔

(صفدر آہ)

یہ شعر کس کا ہے

مشہور ہے کہ یہ شعر

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی | جبتی نہیں ہے رات کسی شہسوار کی

انیس یا دبیر کا ہے۔ ہماری زبان کا مطالعہ کرنے والے اگر کوئی تحقیق سے بتا سکے کہ یہ کس کا ہے تو باعث ممنونیت ہوگا۔

(رشید مرزا)

دلی ایڈمنسٹریشن کی اردو کش پالیسی کے خلاف احتجاج

دلی۔ دلی ایڈمنسٹریشن نے دلی میں اردو کے ساتھ جو ناانصافی روا رکھی ہوئی ہے اور سرکاری کاموں میں اس کو وہ مقام نہیں دیا جارہا ہے جو اس کا حق ہے اس پر دلی کے سابق چیف اگزیکٹو کونسلر میر مشتاق احمد نے احتجاج کیا ہے حکومت ہند کی وزارت دفاع نے سال ہائے ماسبق کی طرح اسال بھی جشن جمہوریت کے مشاعرے کے لیے ایک کمیٹی دلی کے موجودہ چیف اگزیکٹو کونسلر کی صدارت میں بنائی ہے اس میں میر مشتاق احمد صاحب کو بھی ممبر بنایا تھا مگر میر صاحب نے آج اس سے استعفا دے دیا ہے۔ میر صاحب نے اس سلسلہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی جشن جمہوریت کے موقع پر مشاعرہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور مجھے بھی اس کا ممبر نامزد کیا گیا مگر میں نے دلی کے جن سنگھی ایڈمنسٹریشن کی "اینٹی اردو" پالیسی کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے استعفا دے دیا ہے۔ میر صاحب نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہوم منسٹری نے ۱۹۵۸ء میں اردو کو مراعات دینے کے لیے جو سرکلر دلی ایڈمنسٹریشن کو بھیجا تھا اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔

اردو اور پنجابی کو دہلی میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے

نئی دہلی۔ دہلی میٹرو پالٹن کونسل کی کانگرس پارٹی کے لیڈر شیو چرن گپت نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور پنجابی کو دہلی میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔

انھوں نے یہ مطالبہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا کہ وہ ۱۵ر اگست سے اپنا کام ہندی میں کرنے لگے گا۔ گپتا نے ایڈمنسٹریشن سے یہ اعلان کرنے کا مطالبہ کیا کہ وہ ہندی اختیار کرنے کی راہ کو ہموار بنانے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور کہا کہ دوسری زبان کا سوال کچھ عرصے سے لوگوں کے ذہن میں ہیجان پیدا کیے ہوئے ہے۔ پچھلی مردم شماری کے بموجب دلی کی ۸ فی صد آبادی اردو اور گیارہ فی صد پنجابی بولتی ہے۔ دوسری زبان کے تعین میں پنجابی کو ترجیح حاصل ہے لیکن بہت سے پنجابی بولنے والے لوگ اردو بھی جانتے ہیں۔ تنازعہ سے بچنے کے لیے پنجابی اور اردو دونوں کو دوسری زبان کا درجہ دے دیا جائے۔ اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین کیدارناتھ ساہنی نے بتایا کہ آئین کے گوشوارہ میں درج ۱۴ زبانوں میں سے کسی زبان میں آنے والے خط کارپوریشن کے دفتر میں قبول کیے جائیں گے لیکن ان کے جواب صرف ہندی میں دیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی سے متعلق کانگرس کے ریزولیوشن کو اب عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے کارپوریشن کا تقریباً ۸۰ فیصد کام اس وقت ہندی میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ تمام خطوں کے لوگ راجدھانی میں رہتے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ کارپوریشن تمام ہندوستانی زبانوں میں لکھے ہوئے خط قبول کرے [illegible] ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے الگ مرکز کیوں نہ قائم کرنا پڑے [illegible]

بنگالی عوام اور بنگالی کے ادیب اور شاعر اردو والوں کے ساتھ ہیں

حیدرآباد۔ سری جوتش چندر گھوش نے جوبلی ہال میں کل بھارتیہ بنگلہ ساہتیہ سمیلن کے اردو اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے اردو زبان اور اس کے ادب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ بنگال میں بنگالی کے بعد یہ زبان عوام کے ایک بڑے طبقے میں رائج ہے۔ اور اس زبان نے ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے۔ یہ ایک شیریں اور وسیع زبان ہے جس کے شیدائیوں میں راجہ رام موہن رائے سے گورو دیو ٹیگور تک ہزاروں نام لیے جا سکتے ہیں۔

انھوں نے اردو اور ہندی کے سوال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح ہندی بھی قومی زبان کہلائی جا سکتی ہے لیکن وہ ایک کامیاب رابطہ کی زبان نہیں بن سکتی۔

سری انل برن گنگوپادھیائے ایڈیٹر پبلیکیشن ڈویژن دلی نے اردو اور بنگالی کی مشترک قدروں کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ بنگالی میں بیسیوں الفاظ، استعارے اور محاورے اردو کے موجود ہیں اور ان سے ہم اپنی زبان اور ادب کے حسن کو نکھارنے کا کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنگالی شاعر غالب، ظفر اور واجد علی شاہ سے بہت متاثر ہیں انھوں نے ٹیگور اور بعض دوسرے بنگالی شاعروں کا کلام اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا۔

انھوں نے دلی اور بنگال کے درباروں کے ذریعہ پیدا ہونے والے تہذیبی اور سماجی روابط کی تفصیل بیان کی اور کہا کہ اس کے گہرے اثرات ہماری تہذیب، معاشرت اور زبان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے قاضی نذرالاسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کے ذریعہ بھی اردو اور فارسی کی روایات بنگلہ ادب میں داخل ہوئی ہیں۔

آخر میں انھوں نے بتایا کہ ہمارا سرچشمۂ فیضان ہمارے عوام ہیں اور ہمارے عوام کا ایک حصہ اردو تہذیب کا علمبردار ہے، اس لیے ہم کو یہ زبان اور اس کی تہذیب بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی بنگالی زبان اور اس کی تہذیب عزیز ہے۔

شری وکھنا رنجن بوس نے مغربی بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے اردو زبان اور اس کے ادب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بنگلہ اور اردو اس دیس کی دو میٹھی، ترقی یافتہ اور وسیع زبانیں ہیں۔

شری دبیس داس نے اردو زبان کی وسعت اور اس کی اثرانگیزی اور اثرپذیری کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ ایک زندہ اور بیدار زبان ہے اور اس کی جڑیں ہندستانی سماج میں پیوست ہیں۔ اس زبان نے ایک تاریخی فریضہ انجام دیا ہے اور ہماری رہنمائی کی ہے جس کو کوئی دیسی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی وہ زبان ہے جو پہلی بار اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی۔ جب بھی جامعہ عثمانیہ کا نام کسی کی زبان پر آتا ہے

تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

انھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ زبان ہے جو لشکروں اور بازاروں سے درباروں میں پہونچی اور ہمارے دلوں میں سما گئی جس طرح یہ زبان ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں میں رائج ہے ویسے ہی بنگال میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان ہم کو عزیز ہے اس لیے کہ بنگالی زبان کے ذخیرے میں اس سے اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں اس نے ہم کو نئے محاورے نئے اسلوب، نئی تشبیہات، نئے استعارے، نئے محاکات دیئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بنگالی زبان دوسری زبانوں سے بھی متاثر ہوئی ہے لیکن اردو سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو حب الوطنی کی زبان ہے اس زبان کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے اس اجلاس کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور زینت ساجدہ نے بھی مخاطب کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر حبیب الرحمٰن نے کی۔

اردو کو تمام سہولتیں دی جا چکی ہیں

لکھنؤ۔ ریاستی وزیر جناب ادت رائن شرما نے کل دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے لیے گزشتہ بیس برسوں سے جو وعدے اور مطالبے کئے جاتے رہے ہیں وہ سب کے سب موجودہ حکومت نے پورے کر دئے ہیں یا پورے کر رہی ہے۔ انھوں نے بہر حال اس مطالبہ کو رد کر دیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے انھوں نے کہا کہ دوسری سرکاری زبان ملک میں انتشار پیدا کر دے گا۔ اس لیے اردو کو وہ تمام سہولتیں دی جا سکتی ہیں جو دوسری زبان پانے کی مستحق ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں سے لفظ "سرکاری" نکال دیا جائے۔

انھوں نے ہندوستان کی رنگا رنگی ہی کو ملک کی تہذیب کا اصل حسن قرار دیا۔ اردو کو سہولتیں دینے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ اگر کوئی سہولت نہیں ملی ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے تاکہ وہ مل سکے۔ (قومی آواز)

تامل ایک دن ملک کی رابطہ اور سرکاری زبان ہو کر رہے گی

تامل عالمی کانفرنس میں وزیر اعلیٰ مدراس کی تقریر

مدراس:۔ وزیر اعظم مدراس جناب سی این انا درائی نے کل یہاں کہا کہ انھیں یقین ہے کہ تامل ایک دن ملک کی رابطہ زبان ہو کر رہے گی۔

دوسری عالمی تامل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ انادرائی نے کہا کہ تامل جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے سیکھنے کے لیے دنیا بھر سے طلبہ آتے ہیں اور اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کے اندر ملک کی رابطہ اور سرکاری زبان بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک دن ہو کر رہے گا لیکن اس دن کا ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

کانفرنس کے سلسلہ میں ریاستی حکومت کی جانب سے تیار کردہ کتابچہ جاری کرتے ہوئے گورنر سردار اجل سنگھ نے امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس کی بنا پر تامل زبان میں تحقیقات کا کام اور تیز رفتاری سے شروع کر دیا جائے گا۔

زبان سے متعلق پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے سوال پر اعلیٰ سطح پر مشورہ

مدراس وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کل رات اپنی کابینہ کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ زبان پالیسی پر عمدگی کے ساتھ نفاذ کے سوال پر صلاح و مشورہ کیا حال ہی میں پارلیمنٹ اس پالیسی کو منظور کر چکی ہے اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ زبان سے متعلق قانون میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی کل کے اس صلاح و مشورہ میں جو لیڈر شریک تھے ان میں مرکزی وزیر داخلہ جناب چوہان وزیر تعلیم ڈاکٹر تری گنا سین اور وزیر قانون جناب گووند امینن شریک تھے۔ جن مسائل پر تبادلہ خیال ہوا ان میں غیر ہندی عوام پر سے بوجھ کو کم کرنے کا خاص طور پر آل انڈیا سروس کے مقابلوں کی روشنی میں غور کیا گیا اس سلسلہ میں تجاویز تیار کر لی گئی ہیں۔ زیادہ تر بات چیت سہ لسانی فارمولہ پر ٹھیک طور پر عمل درآمد کرنے کی اہمیت کے بارے میں ہوئی عام رائے یہ تھی کہ جن سنگھ کی زبان پالیسی میں تبدیلی اور ایس ایس پی کی صفوں میں اختلافات کے سبب ہندی ریجن میں سہ لسانی فارمولہ پر عمل درآمد آسان ہو گیا ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر تری گنا سین نے مزید روپیہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ تعلیمی اداروں کو سہ لسانی فارمولہ پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مزید روپیہ چاہیے میٹنگ میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ فارمولہ کی کامیابی کا انحصار ریاستی حکومتوں کے رویہ پر ہے خیال ہے کہ اسی سلسلہ میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے مشورہ کیا جائے گا تاہم ابھی اس کانفرنس کی کوئی تاریخ طے نہیں ہے (الجمعیۃ دہلی)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

تو وہی مثل ہوگی کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا۔ یہاں اس پھیر میں نہ پڑیے کہ کوا کون ہے اور ہنس کون چونکہ ادب کوئی جامد اور متعررہ چیز نہیں ہے کیونکہ زندگی کی طرح یہ بھی بدلتا ہے، اس لیے ادبی اظہار بھی متعررہ اور جامد نہیں ہے اس میں بھی تبدیلی ہوتی ہے اور اگر آپ ادب کی مخصوص بصیرت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو ادبی اظہار کے تمام امکانات سے آشنا ہونے کے لیے اور اس سے پوری کیفیت حاصل کرنے کے لیے آپ کو اظہار کے تمام سانچوں سے ہمدردی پیدا کرنی پڑے گی۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کلاسیکل موسیقی کے آداب کو نہ جانتے ہوں اور رائے دیدیں کہ یہ محض شور و غل ہے، تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جدید شاعری کی پیچیدہ اور جذبے اور نفسیات کی زیادہ پیچیدہ ترجمان زبان سے مانوس ہونے کی کوشش نہ کریں اور محض اسے خرافات کہہ کر ٹال دیں کوئی رنگ محل اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک آپ اس کے دروازے پر دستک نہ دیں۔ (باقی آئندہ)

میرا صفحہ

ہمارے ادب میں صحت نظر کی خاصی کمی رہی ہے۔ بھینگا پن عام رہا [illegible]س کا ثبوت یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز تک ادب کو اس کی مخصوص بصیرت [illegible] کے تخیلی تجربے کو، اس کی صداقت کو، ہم نے وہ اہمیت نہیں دی جو دی جانی چاہیے تھی۔ ہم نے یا تو اسے تصوف کے اسرار و رموز کے لیے استعمال کیا، یا مذہب کے احکام کی تفسیر کے لیے، یا اخلاق کے اوامر و نواہی کی وضاحت کے لیے، یا پھر سیاست کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے۔ ہم نے یہاں تک غلط بحث کیا کہ اچھے اچھے شاعروں کو اس وجہ سے بڑا سمجھا کہ وہ ہمارے نزدیک فلسفی تھے۔ اقبال اور غالب کی شاعرانہ عظمت ہم نے بعض افکار کی وجہ سے جانی، ان کی شاعرانہ صلاحیت کو نہیں دیکھا۔ جب مغربی اثر سے حقیقت نگاری عام ہوئی تو میکانکی جزئیات نگاری کی خاطر ہم نے ان داستانوں کی تمثیلی تصویروں کو نظرانداز کر دیا جو اب بھی جادو رکھتی ہیں۔ اس طرح جذبے کی اڑان، داخلی کیفیات کی مستی اور افسوں، انسانہ کی اپنی حقیقت کو جھولوں میں اٹھایا۔ بیسویں صدی میں جب سیاست کی لے بڑھی تو شاعر کا کام سیاسی مطالبات کو پورا کرنا ٹھیرا۔ اسے شاعری سے زیادہ پیغمبری کرنی پڑی زندگی کے حقائق کے نام پر ادب کو صحافت بنا دیا گیا۔ سماجی شعور کے نام پر اس پر رندا چلایا گیا۔ ادب اپنی جگہ کوئی چیز نہیں رہا۔ اس کا کام سائنس، سیاست، فلسفہ، اخلاق کے نکتوں کو اپنی مبہم اور سائنسی نقطۂ نظر سے ناقص اور ناقابلِ اعتبار زبان میں بیان کرنا ہی رہ گیا۔ وہ اس عورت کی طرح جس کے کئی شوہر ہوں، بار بار اپنے سارے شوہروں کی تابعداری میں لگا رہا۔ اس کا اپنا کوئی وجود، کوئی مزاج، کوئی شخصیت مانی ہی نہیں گئی۔

حال میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ میں ایک خاص ضمیمہ دو قسطوں میں نکلا ہے جس کا عنوان ہے CROSS CURRENTS۔ پہلی قسط میں انگلستان کے ادیبوں نے ادب اور سائنس، ادب اور فلسفہ، سوشیالوجی ناول اور شاعری کی زبان جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے، دوسری قسط میں یورپ کے ادیبوں نے یورپ کے ادبی سین کا انھیں عنوانوں کے تحت جائزہ لیا ہے۔ مجموعی طور پر لکھنے والوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ناول میں سوشیالوجی سے بھی مدد مل سکتی ہے، مگر سوشیالوجی جس طرح مواد جمع کر سکتی ہے اس طرح ناول نہیں کر سکتی۔ پھر بھی ناول میں چونکہ افراد کے تجربے ہوتے ہیں اس لیے ان تجربوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی اور سوشیالوجی کی تمام ترقی کے باوجود اس کی اپنی بصیرت سے انکار نہ کیا جا سکے گا۔ اس طرح فلسفہ یا سائنس جو حقائق دیتے ہیں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مگر ان حقائق کے باوجود ادب جس طرح زندگی سے وفاداری سکھاتا ہے یعنی اس کے ہر رنگ اور ہر لے کو دیکھتا اور دکھاتا ہے، جس طرح انسان کی بلندی اور پستی، اس کی ملکوتیت اور شیطنت، اس کی عقلیت اور غیر عقلیت سب کو مانتا اور سب کو دل میں جگہ دیتا ہے۔ اور اس کے ذریعے سے ہمیں جو مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی اپنی اور مستقل جگہ ہے یعنی ادیبوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زیادہ معلومات دیں، نہ ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نئے افکار کی تلاش میں سرگرداں رہیں یا کسی فلسفی یا سائنس داں کی خوشہ چینی کرنے لگیں۔ ان کا یہ بھی کام نہیں ہے کہ وہ علوم کے ماہرین کی تفسیر و تشریح کرنے لگیں۔ علوم جو حقائق یا تصورات دیتے ہیں وہ کبھی کبھار تجربے کے سرچشموں سے کٹ بھی جاتے ہیں اور ادیب کا کام دراصل یہی ہے کہ وہ تجربے کے سرچشمے سے اپنا رشتہ کبھی ٹوٹنے نہ دے بلکہ علوم کے بخشے ہوئے حقائق اور تصورات کو نئی ترتیب دے کر اپنے حق میں ان کے انسانی اور تخیلی نتائج کو پرکھے۔ اگر اس امر کو سمجھا جائے تو یہ نکتہ بھی سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ ادب ہی افکار و معلومات کو صحیح معنی میں حقیقی یعنی انسانوں کے لیے جاندار بناتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کے تمثیلی تجربے ان کے جذبے، ان کی نفسیاتی دنیا اور ان کے احساس کی رنگارنگی کے ذریعے ہی لوگوں کے لیے معنی خیز حقائق بنتے ہیں۔ اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو یہی ہے یعنی اُن فن کاروں کی مدد سے جو ایک خاص منظم احساس رکھتے ہیں، احساس کی دولت کو عام کرنا۔ ادیب کا کام دوسروں کے خیالات کو یا عام خیالات کو دہرانا نہیں ہے، اس کا کام محض تماشائی بننا بھی نہیں ہے، وہ ذاتی طور پر زندگی سے الجھتا ہے۔ اس میں شخصی طور پر (INVOLVE) ہوتا ہے۔ ایک فن کار یا ادیب کو حقیقت کا ایک شخصی اور ذاتی روپ نظر آتا ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ شخصی اور ذاتی روپ خارجی حقیقت کی اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکے۔ ادب میں جان ذاتی اور شخصی نظر سے آتی ہے۔ ادب کی وفاداری اسی ذاتی اور شخصی نظر سے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اس کی وفاداری اپنے میڈیم یعنی الفاظ سے ہونی چاہیے کیونکہ وہ اپنے میڈیم کو اگر جانتا یا برتتا نہیں تو وہ یا تو رسمی الفاظ کا غلام ہو جائے گا یا علوم کی دنیا میں دست درازی کرنے لگے گا۔

اردو ادب میں آزادی کے بعد ہی دراصل ادب کی اپنی اہمیت کا احساس پیدا ہوا ہے اور اس کے مخصوص دائرۂ اثر کی اہمیت کا کچھ اعتراف شروع ہوا ہے، مگر چونکہ ہم مجموعی طور پر ابھی تک قدامت پرست یا روایت پرست ہیں اس لیے اس نئے احساس یا اعتراف کو بہت سے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ ادیب کی وفاداری سب سے پہلے ادب سے ہونی چاہیے تو پھر یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے گی کہ اس میں سیاست، اخلاق، فلسفہ، سائنس، سب کی جگہ ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ ادب بن کر آئیں، اپنے الگ وجود پر ادب کے ایوان میں اصرار نہ کریں۔ اس کے ساتھ پھر یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ اگر ادب نے سائنس یا سیاست کی جگہ لینی چاہی

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

[illegible] قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا یا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. D-L 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-t5-22

Phone—20
Annual Rs 4/-
per Copy-12

جلد ۲۷۔ شمارہ ۴ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

یوم جمہوریت

ہماری جمہوریت ۲۶ جنوری کو اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ ادھر چند سال سے ملک جن مشکلات میں مبتلا ہے اور خصوصاً گذشتہ سال جو واقعات ہوئے ہیں ان کی وجہ سے کچھ لوگوں میں خاصی بد دلی ہے اور وہ جمہوریت کی موجودہ پارلیمانی شکل سے کچھ مایوس ہونے لگے ہیں لیکن غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جمہوریت کو زبان سے مان لینے کے باوجود ابھی تک ہم نے جمہوریت کی روح کو نہیں سمجھا ہے اور اس نظام کی سہولتوں کو ہی پیش نظر رکھا ہے اس کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی پچاس کروڑ سے اوپر ہی ہے اس کے مختلف خطوں میں آب و ہوا اور معاشرت کا بڑا فرق ہے۔ اس میں چودہ بڑی قومی زبانیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں بولی جاتی ہیں ہمارے دستور میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کے سب باشندوں کو برابر کے حقوق ملیں۔ چھوت چھات ختم ہو۔ ہر شخص کو تحریر و تقریر کی آزادی ہو، ہر ایک کے مذہب زبان، رسم خط کا تحفظ ہو وہ اپنے پیشے کو آزادی سے چلا سکے۔ پھر بھی ذاتی ملکیت کے تحفظ اور سوشلزم پر نظر، دونوں پہلوؤں میں توازن کی کوشش نے یہ مسئلہ ضرور پیدا کر دیا ہے کہ صنعتوں کو قومیانے میں کچھ دشواریاں ہیں اور بڑی پونجی رکھنے والوں کے اثر کو کم کرنا آسان نہیں۔ پھر ہمارا نظام وفاقی یا فیڈرل ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ریاستوں کو بہت سے معاملات میں مکمل آزادی ہے، صرف ان معاملات میں جن سے پورے ملک کا تعلق ہے، یعنی بچاؤ، مالیات، رسل و رسائل اور بیرونی امور، ان میں مرکز تمام ریاستوں پر اپنی پالیسی نافذ کر سکتا ہے۔ یہیں سے ہماری مشکلات کا آغاز ہوتا ہے یعنی جہاں ریاستوں کو بیشتر معاملات میں آزادی ہے۔ وہاں کچھ پابندی بھی ہے۔ جب ایک پارٹی کی حکومت مرکز اور ریاستوں میں تھی تو مسئلہ آسان تھا۔ اب جبکہ کئی ریاستوں میں مخالف پارٹیوں کی مخلوط وزارتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان تناؤ ہے۔ پھر لسانی ریاستوں کے قیام نے قدرتی طور پر محدود وفاداریوں کو جنم دیا ہے اور مرکز میں ایک زبان کا مسئلہ اختلاف کا سبب بن گیا ہے۔ ادھر لسانی اقلیتوں کے حقوق کی جو حفاظت دستور میں سوچی گئی تھی اس کا عملی دنیا میں لحاظ نہیں رکھا گیا اور قول اور عمل میں خاصا فرق رونما ہو گیا ہے اس لیے ملک میں تشدد بڑھ رہا ہے۔ لوگ غذائی مشکلات اور بے روزگاری کے آسیب سے پریشان ہو کر توڑ پھوڑ پر اتر آئے ہیں۔ کچھ سیاست دانوں نے لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر ایسے ایسے کھیل کھیلے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو کسی چیز پر اعتبار نہیں رہا۔ ان حالات میں یوم جمہوریت کے موقع پر ہم سب کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی اٹھارہ سالہ جمہوریت کے سارے تجربے کو ذہن میں رکھیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم نے جمہوریت اور سیکولرزم کو اپنانے میں غلطی تو نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ ہر طرح درست تھا کیونکہ غلطیاں جمہوریت کی وجہ سے نہیں ہوئیں۔ جمہوریت کی روح کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اور من مانی کرنے کی وجہ سے ہوئیں اس لیے جمہوریت کی روح کو عام کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے اختلافات کو تشدد کے ذریعہ سے نہیں۔ بلکہ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ سے، ایک دوسرے کی سننے کے ذریعے سے اور ایک مجموعی رائے بنانے سے کریں گے۔ اگر یہ بات سب کے دل میں اتر جائے اور تشدد کو ہر حال میں روکا جائے، بلکہ تشدد کے ذریعہ سے فیصلہ سخت ناپسند کیا جائے تو ہم یقیناً اپنی جمہوریت کو ایک قدم آگے لے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا فرض یہ ہوگا کہ ہم مرکز کو ان امور کے لیے تو مستحکم بنائیں جن کا تعلق سب سے ہے لیکن ریاستوں میں بڑی حد تک اندرونی خود مختاری کے اصول کو تسلیم کریں۔ اس طرح ریاستوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مرکز ریاستوں کے اپنے معاملے میں دخل نہ دے گا اور وہاں مختلف سیاسی پارٹیوں کے وجود کو گوارا کرے گا۔ اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد ہمیں اس مسئلے کو لینا پڑے گا کہ کیا ہم عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور پس ماندہ طبقوں کو اوپر لانے کے راستے میں رکاوٹیں گوارا کریں گے۔ پھر یہ سوچنا ہوگا کہ کیا سیکولرازم کا نام لینا ہی کافی ہے اور ہم عملی زندگی میں اسے نافذ کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیوں نہیں کرتے۔ اس پر غور کے دوران یہ بات واضح ہوگی کہ ہمارے ملک میں ذرا سی بات پر فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیوں ہم اس علاقے

...فسادات کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کر پاتے، کیوں کچھ جماعتیں فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور کیوں ہنگامہ اور کشت و خون کرنے والوں کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی۔ یعنی ہم کو نہ صرف سیکولرازم کو بچانے کے لیے بلکہ امن عامہ کو استحکام دینے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کو سختی سے روکنا ہے خواہ اس میں کیسی ہی تادیبی کارروائی کیوں نہ کرنی پڑے۔ فرقہ وارانہ فسادات سے نہ صرف اقلیتوں میں ہراس پھیلتا ہے نہ صرف امن عامہ مجروح ہوتا ہے۔ بلکہ قومی دولت برباد ہوتی ہے۔ قومی ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور ہمارا ذہن بڑے مسائل کے حل کی طرف سے ہٹ کر ان چیزوں میں پڑ جاتا ہے جو بہت پہلے ختم ہو جانی چاہئیں تھیں۔ اس کے ساتھ زبانوں کے متعلق ایسے رویہ پر کڑی تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی جب ہم نے سب زبانوں کو قومی مان لیا تو پھر سب کی یکساں ترقی کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے۔ حسب دستور کی دفعہ ۳۴۵ اور ۳۴۷ میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ایک ریاست میں ایک سے زیادہ زبان سرکاری طور پر تسلیم کی جا سکتی ہے اور اس کا مطالبہ صاف اور واضح الفاظ میں عرصہ سے کیا جا رہا ہے تو کون وجہ نہیں کہ اردو کو ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والے معقول تعداد میں ہیں سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ کہنا کہ اس سے علیحدگی پسندی کو تقویت ہوگی درست نہیں ہے کیونکہ جب لسانی اقلیتیں مطمئن ہوں گی تو وہ قومی یکجہتی میں اور بھی سرگرم ہوں گی آخر میں حکومت کو حکومت کرنے کے لیے اور ملک کو متحد اور مضبوط رکھنے کے لیے خود بھی ایک مضبوط پالیسی اختیار کرنا پڑے گی تاکہ لوگ اس مضبوطی کا احترام کرنا سیکھیں اور یہ نہ سمجھنے لگیں کہ کچھ مظاہروں سے حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جمہوریت پر عقیدہ اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا، پھر اس کی روح پر ہر حال میں عمل کرنا ہوگا، پھر مرکز کے اختیار اور ریاستوں کی اندرونی آزادی کے حدود متعین کرنے ہوں گے، پھر اقلیتوں کو مطمئن کرنا ہوگا اور ان کے لیے قومی زندگی میں باعزت جگہ نکالنی ہوگی۔ پھر تمام زبانوں کو ترقی کے مواقع دینے ہوں گے پھر قانون کی حکومت کو مضبوط کرنا ہوگا۔ پھر عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور تعلیم کو معنی خیز اور کارآمد بنانے کے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے تب جا کر ہمارا ملک موجودہ مشکلات سے نکل سکے گا اور اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکے گا۔ ہمارا کام بڑا ہے لیکن ہم میں اس کی صلاحیت ہے کہ اس بڑے کام کو خوش اسلوبی سے پورا کر سکیں۔ ہاں اس کے لیے ہم کو ذہنی اور جذباتی طور پر بلند ہونا پڑے گا اور تمام چھوٹی چھوٹی رسادار یوں کو چھوڑ کر پورے ملک کے مفاد کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے اندر یہ بڑائی پیدا کر سکے تو وقت کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا اگر ہم اپنے آپس کے جھگڑوں اور چھوٹے چھوٹے مسائل سے نکل کر پورے ملک کے مفاد کو ملحوظ رکھ سکے تو ہم اپنے وطن کو بام ترقی پر ضرور پہنچا سکتے ہیں۔ ضرورت صرف یقین محکم اور عمل پیہم کی ہے اور اس محبت کی جو فاتح عالم ہے ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو ہم یوم جمہوریت کی مبارکباد دیتے ہیں۔

سطوت رسول

سرِ شام

شام سے بجھ گئے تارے
ہیں کسی گنبدِ اماں میں گم
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے شام
زرد کے مرمریں جھروکوں سے
شب کی تیرہ سیاہ وادی میں
اور چپ چاپ رکھ رہی ہے قدم
گھنگروؤں کی صدائیں مدھم ہیں
جلسے کتنے سروں کے سرگم ہیں

اک حسینہ اٹھی ہے لہرائی
پائلوں کی صدا ہے چونکاتی
اس کی زلفوں کی بھینی بھینی ہوا
آرہی ہے گداز جسم سے پیار
چھو رہی ہے کہ یہ ہوش و جنوں
ڈھل رہی شراب لالہ گوں
درد کا چاند جگنے والا ہے!؟

لکھنؤ میں یوم منشی نولکشور منایا گیا

لکھنؤ۔ یوپی کے گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نے جو منشی نولکشور کی صدسالہ تقریب میں منشی نولکشور کی تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہا کہ بڑے آدمی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ منشی نولکشور ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا انہوں نے لکھنؤ سے ۱۸۵۸ء میں اردو اخبار شائع کیا تھا اور ایک اردو چھاپہ خانہ معیاری کتب عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے قائم کیا تھا انگریزی حکومت کی جانب سے انہیں سی آئی ای کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ ملا تھا ان کا شمار انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

ادیبوں اور اخبار نویسوں کے لیے پنجاب میں کالونی

گورداسپور۔ سردار گیان سنگھ نے بیان کہا ہے کہ پنجاب میں ادیبوں اخبار نویسوں اور مصوروں اور شاعروں کے لیے رہائشی کالونیاں بنائی جائیں گی ان کے بچوں کو ہائی اسکول تک مفت تعلیم دی جائیگی اور طبی امداد دی جائیگی۔

طیب انصاری

دورِ آصفی کے اردو رسائل

ماہنامہ "صحیفہ" حیدرآباد کی صحافت پر جب بھی قلم اٹھایا جائے گا صحیفہ کے کارناموں پر روشنی ڈالنا مورخ کے لیے ضروری ہے صحیفہ خادم ادب بھی تھا اور دورِ آصفی کا سب سے پہلا خادم ملک و ملت بھی صحیفہ عرصہ دراز تک ماہنامہ کی حیثیت سے ادب اور ادبی مسائل کو پیش کرتا رہا ہے ادبی نقطۂ نظر سے صحیفہ نے اپنے پیش رو ماہ ناموں سے کہیں زیادہ سلجھا ہوا طریقِ عمل اختیار کیا اور زیادہ مدلل بحثیں کرتا رہا یہی بات اسے اپنے ہمعصر ماہ ناموں میں امتیازی مقام دلاتی ہے ۱۹۰۵ء میں موسوم بہ اسم تاریخی "صحیفہ" کے نام سے جاری ہوا لیکن قلیل مدت کے لیے ہوا اس وقت ملک حسی الدین حسن کیفی اس رسالے کے مالک مہتمم اور مدیر تھے لیکن جب انجمن معارف کے زیرِ اہتمام اس کی دوبارہ اشاعت ۱۹۰۶ء میں عمل میں لائی گئی تو اس کی ادارت کی ذمہ داری اکبر علی کو سونپی گئی ۱۹۱۲ء تک یہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا اور اس کے بعد روزنامہ میں بدل دیا گیا اب صحیفہ ہر روز شام میں شائع ہونے والا خادم ملک و ملت بن گیا تھا۔ اور اکبر علی کے انتقال ۱۳۶۱ھ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہنے کے بعد پھر بند ہوگیا۔

کیفی روایت پسند شاعر تھے اور جن موضوعات پر انھوں نے نظمیں کہی ہیں[1] ان کے پیشِ نظر نصیر الدین ہاشمی نے انھیں دکن کا حالی قرار دیا ہے ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۸ھ میں بمقام اجمیر شریف انتقال کر گئے کیفی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان پاس کیا اور کم عمری سے شعر کہنے لگے انھیں حضرت داغ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا چنانچہ داغ کے بعد کیفی ہی استاد دکن کہلائے داغ کے جلائے ہوئے چراغ کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے روشن رکھا کیفی کے شاگردوں میں صفی اورنگ آبادی کے شمار استادانِ دکن میں شمار ہوتے تھے لہٰذا کیفی کے یہاں استاد کا رنگ نمایاں تھا۔ وہی شوخیِ بیان، وہی لطفِ زبان، وہی خیال کی رنگینی اور عاشقانہ مضمون آفرینی لیکن انھوں نے بہت جلد فرسودہ ڈھب کو چھوڑ کر نیا آہنگ اختیار کیا موضوعاتی نظمیں کہنے لگے چنانچہ شکرِ نعمت، نزندہ حسن، تعلیم، جامِ حیدری، ثمرہ اور خدا حافظ وغیرہ ہی وہ نظمیں تھیں جو شہر کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں

کیفی صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی تھے چنانچہ انھوں نے اپنے رسالہ صحیفہ میں "اصولِ تنقید" پر خود قلم اٹھایا اور دوسروں کو بھی تنقیدی مضامین لکھنے پر اکسایا ہے چنانچہ عجیب و غریب توارد کے عنوان سے تسلی کا آمد اور آورد پر قولِ فیصل کے زیرِ عنوان لمعہ کا مضمون جو جلیل اور باذع کے کلام میں توارد اور سید جلال کے مضمون کا جواب تھے شائع ہوئے۔ ان علمی اور تنقیدی بحثوں سے فن اور ادب کے کئی گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔

۱۹۰۵ء سے صحیفہ جاری تو ہوا تھا لیکن "جشنِ عشرت" کی مسرت میں شائع ہونے والا یہ ماہ نامہ بہت جلد بند ہوگیا۔ بعد کو انجمن معارف کی جانب سے ۱۳۲۸ھ کو پھر جاری ہوا اس بار اکبر علی بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک کار ہوگئے اور دفتر صحیفہ پریس بیرون دروازہ چار کمان منتقل ہوگیا۔

محمد اکبر علی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے مدرسہ تعلیم المعلمین سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور دارالعلوم میں شریک ہوگئے جہاں سے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحان پاس کر کے صدر محاسبی میں ملازم ہوگئے لیکن بہت جلد غلامی کا جوا اتار پھینکا اور اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا صحیفہ سے منسلک ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء میں صحیفہ کو ماہ نامہ سے روزنامہ میں بدل دیا۔

"صحیفہ" ادبی اور تنقیدی مضامین کے لیے مشہور تھا صحیفہ کی اشاعت تک ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسے مسائل پر بحثیں شروع ہو چکی تھیں کیفی ادبی نقاد تھے لیکن انھوں نے ادب کے باہر زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی جرأت رندانہ بھی فرمائی ہے چنانچہ یہ بات خود کیفی کے کلام سے عیاں ہے کہ انھوں نے ادب اور شاعری کو رنگ روپ کا نہیں تہذیب زندگی کا فن بنایا سماجی موضوعات پر قلم اٹھایا اور زندگی کے مسائل کو رہائی شعر میں کہنے کی سعیِ جمیل کی۔ صحیفہ پر بھی اس فکر جمیل کی پرچھائیں نظر آتی ہے رسالہ صحیفہ کو محمد مرتضیٰ، محمد مظہر، ظفر حسن، عبدالرزاق بسمل، عبدالوہاب عندلیب، محمد مصطفیٰ، لمعہ حیدرآبادی، بسمل حیدرآبادی، اللہ بخش، ملا عبدالباسط، مولوی عبدالقدیر اور اکبر علی کا علمی تعاون حاصل تھا۔ اس رسالہ میں جہاں ادبی مضامین شائع ہوتے رہے وہیں مذہبی، سیاسی اور تاریخی مضامین کو بھی جگہ ملتی رہی ۱۹۱۲ء کو جب صحیفہ روزنامہ میں بدل گیا بحیثیت رسالہ اس کی زندگی کے دن پورے ہوئے لیکن روزنامہ صحیفہ میں بھی تاریخی اور ادبی مضامین کو جگہ ملتی رہی۔ صحیفہ حیدرآباد کا قدیم اخبار ہونے کی وجہ سے اکبر علی مرحوم کو اس کی قدامت پر بڑا ناز تھا چنانچہ اس کے سرنامہ پر تحریر تھا ...."سب سے قدیم خادمِ ملک و ملت" اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ ربیع الثانی ۱۳۲۳ کو شائع ہوا تھا۔

ماہنامہ "دبدبۂ آصفی" "فسانۂ آزاد" کا مصنف تلاشِ روزگار میں اپنے ہمعصروں کی طرح حیدرآباد پہنچا تو قدر دانوں نے ہمت افزائی کی، دلاسہ دیا اور مہاراجہ کشن پرشاد کی امداد و اعانت سے صحیفہ نگار بن گیا۔ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو یہ ناول نگار ایک ماہ نامہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں داخل ہوا وہ "اودھ پنچ" بطور آزاد اپنے ساتھ لایا تھا اور یہی آزاد تھا وہ "دبدبۂ آصفی" کی مدد سے شہر بھر میں تقسیم کرتا پھرنے لگا۔ دبدبۂ آصفی کی جلد اول شمارہ (۱) کے سرورق پر لکھا ہے:

> "اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ میر محبوب علی خاں بہادر کی تقریب سالگرہ مبارک کی تہنیت میں یہ ماہوار رسالہ جس میں نظم و نثر کے اخلاقی علمی، سوشل ظریفانہ مضامین ہوں گے اور جس کے بانی مبانی عالی جناب راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد المتخلص بہ شاد دام اقبالہ پیشکار و مدارالمہام افواج سرکار عالی حسب الارشاد حشمتہم اللہ زیرِ نگراں ٹھاکر پرشاد صاحب شوق"

> اداریہ میں دبدبۂ آصفی کی پالیسی کے بارے میں درج ہے۔
> "کئی سال ہوئے راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد مہاراجہ بہادر وزیرِ فوج آصفی دام اقبالہ کی آرزو تھی کہ ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ ماہواری اردو زبان میں اس طرح شائع ہو جس طرح انگریزی رسالے

---

[1] دکن میں اردو (بارسوم) ص ۴۴۹

[2] حیدرآباد کے ادیب ص ۳۴۹ مرتبہ زینت ساجدہ

نکلتے ہیں کیونکہ اردو میں گو اخباروں کی اشاعت بالفعل کثرت سے ہے اور ماہانہ اور ہفتے میں دو بار ہفتہ وار ہفتہ میں دو مرتبہ روزانہ طبع ہوتے ہیں اور مسلسل جام جہاں نما میں ہم لوگ گھر بیٹھے تمام دنیا کے حال سے واقفیت حاصل کرتے ہیں مگر اس قسم کے رسالے کی اشد ضرورت تھی جیسے (ورٹ نائٹلی ریویو یا اینسل میگزین، یا کواٹرلی ریویو) وغیرہ وغیرہ"

چنانچہ دبدبہ کو اسی نہج پر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ پالٹکس سے بحث نہیں کی گئی، مذہبی جھگڑوں سے دامن بچایا گیا اور کل مضامین میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیا گیا۔ ہاں ظریفانہ خیالات البتہ بعنوان الملح کالطعام شائع ہوا کرتے تھے کیونکہ بقول سرشار ہم آدمی محرم کی پیدائش نہیں ہیں لیکن ظرافت میں کوئی مضمون نگار دائرہ اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا جہاں تک سرشار کی پردرش کا معاملہ تھا نہ رہا شادیانے "لطیف خاطر" اس کا منافع سرشار کے نام مخصوص کر دیا تھا

جہاں تک اس رسالہ کے ادبی معیار کا تعلق ہے مختلف موضوعات پر ادبی قدیم انداز میں بحث ہوا کرتی تھی شعر شاعری کے زیر عنوان صحیح شعراء رزبان بیان کی غلطیوں کا جائزہ لیا جاتا تھا طویل مضامین سے اجتناب برتا جاتا تھا چنانچہ دبدبہ آصفی کے شمارہ صفر المظفر ۱۳۱۰ھ میں سرشار نے ایک مضمون نگار کے بارے میں لکھا ہے "بعض مضامین نامہ نگاران ذی شان نے ایسے بھیجے جن کی بابت عنوان مندرجہ بالا (طول امل) کی مثل ٹھیک صادق ہوتی ہے مضمون کیا ہیں کہ طول امل سے بھی کہیں زیادہ بڑھے چڑھے طبیعت اکتا جائے اور ناظرین کو اس کڑی منزل میں چلتے چلتے تھک کے زبان حال و قال دونوں سے حضرت تیر الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا یہ مصرع پڑھنا پڑے ؎

ہیں سست قدم دل کوئی دو چار گھڑی ہے

مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین میں بہترین مضمون پر اشرفی دی جاتی تھی چنانچہ حکیم برہم کے جس مضمون پر اشرفی دی گئی وہ تھا "اردو ہندوستان کی عام زبان ہے"۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے تصنیف کردہ ناول "جیل بار" اور "بحر امواج" اسی ماہ نامہ کے صفحات پر پہلی بار شائع ہوئے اس کے علاوہ خود سرشار کے تیر معانی کے علاوہ نسیطان کی آمد اس ماہ نامہ کی زینت کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ "دبدبہ" میں دلچسپ اقتباسات شائع ہوا کرتے تھے مثلاً صفر المظفر ۱۹۰۶ء کے رسالہ میں چند اقتباسات دئے گئے ہیں:-

"ولایت میں ایک ارب پتی سوداگر مسٹر ہولی کا دیوالیہ نکلا یہ شخص بڑے بڑے تجارتی کارخانوں کا بانی تھا اور اتنا مالدار کہ ۲/۱ ۴ کروڑ روپیہ کا ایک چک خیراتی کاموں کے لیے دیا تھا یہ معلوم نہیں کہ گھاٹا کیونکر ہوا۔ (رہبر)

مہاراجہ فرید کوٹ نے راج کیا کی شادی کے جہیز میں چار لاکھ روپیہ نقد زیورات قیمتی ۲ لاکھ روپیہ دو ہاتھی معہ ہودہ نقرئی، ۳۰۰ گھوڑے، گائیں اور بھینسیں علاوہ بہت سی چیزیں دی ہیں اور گیارہ لاکھ برائے خرید جائداد کل ستر لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ (انیس ہند)

"نو ایجاد کشتی، حال میں ایک کشتی امر گو بادٹ نامی مسٹر سیمن لیک مقام ٹیلور (امریکہ) نے تیار کی ہے۔ یہ سب سے عمدہ ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ دس کے لوگ پانی کے اندر تحت ہو کر داں کی کشتی کے رہ سکتے ہیں بلکہ وہ اس کشتی سے اتر کر سمندر کے اندر پھر سکتے ہیں اور سرنگ لگی ہوئی دیکھ کر توڑ سکتے ہیں اور حد بد سرنگ لگا سکتے ہیں اور بقول کسی کے دریائی حسینوں سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں پس زمانہ حال کے آہنی جنگی جہاز آئندہ بالکل بیکار ہو جاویں گے کیونکہ آئندہ سے سمندر کے اندر سے جنگ ہوگی۔" (نجم الاخبار)

جہاں تک زندگی کے سنجیدہ مسائل کا تعلق ہے دبدبہ نے ایسے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے چنانچہ "اردو ہندوستان کی زبان ہے" ایسا مضمون ہے جبکہ ہندوستان میں ہندی اور اردو کا تنازعہ زوروں پر تھا اور اس لسانی مسئلہ کی وجہ سے عام طور پر ہندو مسلم تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا اس تعلق سے حکیم برہم نے لکھا ہے:

"ہر ایک شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اگر اس کے مزاج میں حقیقتاً ہو بالطبع ایسے امور کو ناپسند کرنے کا حق ہے جس سے درحقیقت برادرانہ اور دوستانہ تعلقات پر ناگوار اثر پڑتا ہے ہو بالخصوص عام ملکی زبان کی نسبت کسی قسم کا اظہار اختلاف ہو جس نے اردو اور ہندی کے نام سے ایک مکروہ سوال کی صورت اختیار کی ہے ہندوستان کی وہ دو خاص قومیں جنھیں سرسید مرحوم نے دلہن کی دو آنکھوں سے ایک موقع پر تشبیہ دی تھی جہاں اور خود غرضی کی لعنتوں میں مبتلا ہیں اس میں بڑی ہی بے اس ناگوار سوال نے نہایت منحوس اضافہ کر دیا ہے" (دبدبہ ربیع الثانی ۲۲ صفحہ ۹)

دبدبہ کے لکھنے والوں میں مہاراجہ کشن پرشاد اور سرشار کے علاوہ عزیز الدین خاں عزیز، ساغر لکھنوی، حیدر لکھنوی، مرزا اکرم علی، رنگ راؤ، منوہر لال زتشی لکھنوی، سید محمد سعید الزماں، رفیع الدین رفعت، وغیرہ شامل ہیں ہیرالال ماتب مدیر اور سوتی مہتمم رسالہ کی حیثیت سے دبدبہ سے وابستہ رہے ہیں ۱۹۰۲ء میں سرشار کثرت شراب نوشی کی وجہ سے تقریباً دو ماہ علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے جس کی وجہ سے دبدبہ کی اشاعت بھی موقوف ہو گئی

ماہ نامہ تاج ماہ نامہ تاج "اپنے وقت کا مقبول رسالہ تھا اور دیگر ہم عصر رسائل میں سب سے زیادہ معیاری اور دیدہ زیب سمجھا جاتا تھا جنوری ۱۹۱۴ء کو اس کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور انگریزی مہینے کے آخری ہفتے میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اس کا مستقل حجم ۴۲ صفحہ تھا اور اپنے محدود وسائل کے باوجود معیاری مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا غلام احمد انصاری دولت "تاج" کی پالیسی پر پہلے ہی شمارہ میں اظہار خیال کیا ہے: "ہم نے بقصد مصمم کر لیا کہ "تاج" جاری کر کے اخبارات و رسائل کی قلیل تعداد میں ایک ماہوار رسالہ کا اضافہ کریں اور ریاست سے الگ رہ کر گورنمنٹ سے محض اشاعت تعلیم کا مطالبہ کریں جو ملک و قوم کی سرسبزی و ترقی کی ذمہ دار ہے ... ہم حیدرآباد کی موجودہ معاشرت میں جو محض کورانہ تقلید کا بہترین نمونہ ہے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش

کریں گے۔ ہم ملک میں بہترین خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ زبان اردو کے خزانے کو عمدہ زبان کی دولت سے مالامال کریں۔" وفا کے اس دعوی پر مجبوب حسین جگر کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انھوں نے حیدرآبادی رسائل و اخبارات کے متعلق کہا تھا ان کے خیال میں "قدیم جاگیردارانہ ریاست حیدرآباد کے سیاسی و سماجی شعور کے ارتقا میں نہ صرف یہ کہ یہاں کے اخباروں کا اہم حصہ رہا ہے بلکہ یہ کہ اخبارات ہی نے اس ملسوکی اور آمرانہ ماحول کو ختم کرنے میں پہل اور قیادت کی ہے[1]" دراصل قدامت پرستی اور دنیا کے الفاظ میں حیدرآباد کی عام شہرت اس کورانہ تقلید رو تھی اس کے خلاف سب سے پہلے جو آواز بلند ہوئی وہ "تاج" ہی کی تھی معاشرہ کی فرسودہ قدریں اور مذہب کے غلط تصور نے سماج کو خرافات اور الحاد یا غیر روایت پرستی عام تھی تاج کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ اس روایت کو توڑا جائے اور مذہب اسلام کا صحیح تصور عام ہو چنانچہ عام شماروں میں اخلاقیات اور اسلامیات پر مضامین کے علاوہ جنوری ۱۹۱۶ کا شمارہ میلاد نمبر نکالا گیا۔ اس سے دنیائے اسلام سے وابستگی اور وفاداری کا ثبوت ملتا ہے۔

"تاج" مذہبی اور تمدنی اعتبار سے روایت شکن ماہ نامہ تھا اس وجہ سے بہت جلد ہمہ گیر شہرت کا مالک بن گیا۔ مذہبی تمدنی اور سماجی پالیسی کے علاوہ اردو زبان و ادب کی خدمت بھی اس کے فرائض میں داخل تھی چنانچہ علمی و ادبی مضامین جگہ پاتے رہے ہیں تاثیر اردو علم و ادب (رضی الدین کیفی) اکبر اور اس کا مرتبہ (خواجہ احمد) قومی تعلیم (محمود حسن)، اور رسالہ نیک ترجمہ از نظم لارڈ الفریڈ ٹینیسن (احسن صدیقی) تاج کے ادبی اور علمی مضامین میں خاص اہمیت رکھتے ہیں جہاں تک تاریخ زبان اردو کا تعلق ہے تاج ہی میں سب سے پہلی بار "اردو کے متعلق" کے عنوان سے سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے مضمون لکھا[2]۔ اس مضمون میں ہوش بلگرامی نے اردو زبان کی تاریخ سے بحث کی ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ "ہند میں اردو زبان کی بنیاد اس وقت پڑی جبکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے جنگی و تمدنی فتوحات کے سیلاب عظیم کا رخ افغانستان کے سر بفلک کشیدہ پہاڑوں کی بلندیوں سے ہندوستان کے میدانوں کی طرف پھرا۔" گو یہ نظریہ جدید تحقیق سے باطل قرار پاتا ہے لیکن اس مضمون کی اس سے اہمیت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی تک اردو زبان کی تاریخ تاریکی میں تھی۔ اس قسم کے مضامین کا لکھنا اور مباحث کا چھیڑا جائے خود اہم بات ہے۔

"تاج" مسلسل چار سال تک جاری رہا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ البتہ پھر ۱۹۲۳ء میں اس کے سلسلہ جدید کا آغاز ہوا چنانچہ وفا اس کے اداریہ میں لکھتے ہیں۔ "دور قدیم بہت ہی مایوس کن ثابت ہوا باوجود تین چار سال کی انتھک کوششوں کے ہم نے دیکھ لیا کہ نہ صرف علم دوست اصحاب نے ہی اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ ملک کے بہی خواہ حضرات نے بھی توسیع اشاعت میں حصہ نہیں لیا جس سے ایڈیٹر نے ساڑھے چار ہزار روپیہ کی کثیر نقصان برداشت کر کے ناخواستہ تاج کو الوداع کہا[1]۔" لیکن دور جدید بھی زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا اور چند ماہ کے بعد رسالہ پھر بند ہو گیا

تاج کے مضمون نگاروں میں رضی الدین کیفی، سید ہاشمی، حامد حسین قادری، ذہین، رعد، محمد حسین آزاد حیدرآبادی، لمعہ، محمد اسد، شمس اللہ قادری اور معین الدین ہاشمی، سلطان احمد، آغا حیدر حسن دہلوی، عماد الملک اور ہوش بلگرامی شامل تھے۔ رسالہ "معارف" کی رائے میں یہ رسالہ ہندوستان کے بعض مشہور پرچوں سے کم نہیں تھا اور رسالہ اردو کی رائے تھی کہ حیدرآباد سے نکلنے والے پرچوں میں بہترین رسالہ تھا۔ سید شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" دراصل "تاج" ہی کا ایک خاص شمارہ تھی۔

غزل

علیم صبا نویدی

گلوں سے نکلی نہ صحنِ چمن سے نکلی ہے
یہ بوئے مست ترے پیرہن سے نکلی ہے
خیال و خواب کی شرمائی مست نئی دلہن
جدید ذہن کے اقلیمِ فن سے نکلی ہے
شفق میں گونجی، ستاروں میں، چاندنی گونجی
صدا جو ذہنِ رسا کے دہن سے نکلی ہے
ہے آج جس سے معطر یہ صحنِ آفاق
وہ بوئے عہدِ وفا کوہ کن سے نکلی ہے
غزل کی زلف میں جدت کی تابناک کرن
ہمیں لگن سے، انوکھے بانکپن سے نکلی ہے
تلاش جس کی زمانے کو تھی زمانہ بھر
وہ صبح شب کے اندھیرے کفن سے نکلی ہے
نہیں ہیں وہ متاعِ بہار کو بھی نصیب
صبا وہ بو جو کسی گلبدن سے نکلی ہے

ماہ نامہ ذخیرہ

ماہ نامہ "ذخیرہ" کی اشاعت ذخیرہ پریس اندرون دروازہ چادرگھاٹ سے ماہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے عمل میں آئی۔ حیدرآباد کے قدیم و جدید رسائل کی طرح یہ بیک وقت علمی، ادبی، اور مذہبی مضامین پیش کرتا رہا۔ قیمت فی پرچہ ۶ر ہوا کرتی تھی اور کوئی ۴۰ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ تین سال تک شائع ہونے کے بعد صاحب بوستان آصفی کے بیان کے مطابق ۱۹۱۸ء میں اس کی اشاعت موقوف ہو گئی[1]۔ اس ماہ نامہ کے مرتب سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) تھے۔

ہوش بلگرامی ادب میں بحیثیت ادیب، شاعروں میں بحیثیت شاعر اور سیاستدانوں میں بحیثیت سیاستدان اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ذہین آدمی تھے اور مزاج داں بھی اس وجہ سے سیاست کے میدان میں اپنا سکہ خوب چلایا اور کنگ کوٹھی کی فضا میں بہت جلد ان کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن بقول محترمہ زینت ساجدہ درباداری کے اس فن نے انھیں بنایا بھی اور بگاڑا بھی[2]

---

۱ مجلہ عثمانیہ (جامعہ عثمانیہ نمبر) صفحہ
۲ تاج۔ جولائی اگست ۱۹۱۵ صفحہ ۳۶

۱ بستان آصفی (جلد سوم) مولفہ مانک راو وٹھل راو
۲ حیدرآباد کے ادیب جلد دوم صفحہ ۱۹۹ مرتبہ زینت ساجدہ

ہے۔ ویسے تاریخ تنقید ادب کی تدوین اس پرچے کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔

"ذخیرہ" کی افادیت تنقیدی نہ سہی افسانوی ضرور ہے۔ افسانہ کا فن نیا ہوتے ہوئے بھی اس رسالہ کے ذریعہ عام ہوا۔ ذخیرہ کے افسانہ نگاروں میں ملک کے مشہور ادیب شامل ہیں۔ اردو افسانہ کا ارتقا بڑی حد تک پریم چند کا مرہون منت ہے۔ گو اس کی ابتدا سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم سے ہوتی ہے لیکن پریم چند سے اردو کے پہلے افسانہ نگاروں کا تشکیل بنتا ہے۔ سلطان حیدر جوش، یلدرم اور نیاز فتح پوری کا روایت لیے ہند کہانی نگار ہیں جن پر حسن ورپری کا اثر نمایاں ہے۔ پریم چند وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے کہانی میں انسانی زندگی کو پیش کیا۔ اور اردو افسانہ کو اس طرح حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ پریم چند کا مشہور افسانہ درگاہ کا مندر (ذخیرہ جلد ۱ ملا) ذخیرہ کی صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ ذخیرہ کو تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جو افسانہ اس کے مختلف شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں پیکر وفا (مفتی انوار الحق) مساوات (سلطان حیدر جوش)، جنون ترقی (سلطان حیدر جوش)، لغزش دل (عبدالرزاق بسمل) امتحان وفا (خنجر لکھنوی) نیرنگی دہر (ہوش بلگرامی)، جدائی (سلطان احمد) فلسفہ زندہ دلی (ضمیر نقوی)، پرستش کا ہیرو (مفتی انوار الحق)، تیر اور سیل کا معرکہ (خدیجہ بیگم)، دو شریف زادے (خواجہ حسن نظامی)، درگاہ کا مندر (پریم چند)، حسن تلافی (مفتی انوار الحق اور لاڈو بیگم (خنجر لکھنوی) قابل ذکر افسانے ہیں۔ گو ان افسانوں میں سے بعض کا انداز داستانوں کا سا ہے اور بعض کا بچوں کی کہانیوں کا تاہم یہ دور بہرحال اردو افسانہ کا ابتدائی دور ہے اس وجہ سے بڑی حد تک ناقابل نظر انداز ہے۔

درحقیقت افسانہ کی ترقی کا زمانہ بھی اردو تنقید کی طرح ۱۹۳۵ء کے بعد کا ہے جبکہ اردو ادیب، شاعر اور افسانہ نگار حالی شبلی اور سر سید کی کوششوں کی وجہ سے انگریزی علم و ادب سے مانوس اور پھر بعد کو اچھی طرح واقف ہو چلے تھے ۱۹۳۵ء سے پہلے پریم چند کی افسانہ نگاری نقش اولین کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے حیدر آباد کے رسائل میں "مکتبہ" بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا اس کی تقریباً پوری جلدیں ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں پہلا اور درمیان کے چند ایک شمارے غائب ہیں۔ مختصر سی مدت میں "ذخیرہ" نے اردو ادب و زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

مراسلات

زار دہلوی سے بے اعتنائی!

ہماری زبان کی اشاعت مورخہ ۸ نومبر ۱۹۶۷ء میں جناب دیرندر پرشاد سکسینہ، حضرت زار دہلوی پر اپنے مضمون میں فرماتے ہیں کہ پروفیسر نفیس سندیلوی نے نگار داغ نمبر ۱۹۵۳ء میں داغ کے مشہور تلامذہ پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں اُن کا (زار دہلوی کا) ذکر نہیں کیا حالانکہ اس مقالہ میں بعض ایسے حضرات کا ذکر کیا ہے جو داغ کے شاگرد نہیں تھے، جیسے جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی۔"

پروفیسر نفیس کے مقالے کا پورا عنوان ہے داغ کے بعض مشہور تلامذہ" عنوان میں لفظ "بعض" کی موجودگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ مضمون داغ کے تمام نہیں بلکہ [illegible] تلامذہ کا [illegible] اس لفظ کے ہوتے ہوئے سکسینہ صاحب کو [illegible] شکایت [illegible] پر نظر ثانی کرلی جائے [illegible] کہ داغ ہی کے صفحہ ۲۸ پر [illegible] زار [illegible] نے داغ کے شمار شاگردوں میں زار دہلوی کو فراموش نہیں کیا ہے [illegible] دیکھا جائے تو جوش [illegible] بھی اپنے مضمون "[illegible] کے نامور شاگرد" (آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء) میں زار دہلوی کے حالات نہیں دیتے ہیں لیکن حالات [illegible] حاصل نہ ہوسکے پر جوش ملیانی [illegible] کے حالات نہیں لکھ سکے ہیں ان کی فہرست میں زار دہلوی کا نام سب سے پہلا ہے اور رسالے نے وسطی صفحات پر مضمون سے متعلق نقاد [illegible] زار صاحب کی تصویر موجود ہے۔

سیماب و جگر

سیماب اکبر آبادی کو سکسینہ صاحب داغ کا شاگرد نہیں مانتے لیکن نہ کوئی حوالہ دیا ہے اور نہ کوئی دلیل پیش کی ہے۔ جہاں تک ایک عام مگر محتاط قاری کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے سیماب بلاشبہ داغ کے شاگرد تھے۔ خود سیماب کے رسالے شاعر آگرہ کے سالنامہ ۱۹۳۰ء میں احسن مارہروی کے مضمون "مرزا داغ اور ان کے ورثہ" کے تحت صفحہ ۴۵ کے مقابل آرٹ پیپر پر بیضوی دائرے میں داغ کے وسطی تصویر کے گرد [illegible] تصویریں ہیں جس میں ایک تصویر سیماب کی بھی ہے۔ صفحہ ۶۰ پر سیماب اکبر آبادی کے حالات میں احسن صاحب لکھتے ہیں: "۱۸۹۸ء میں آپ کو جہاں استاد سے بذریعہ خط وکتابت شرف تلمذ حاصل ہوا۔" اس اقتباس کے باوجود بھی اگر سکسینہ صاحب کو اس میں کلام ہے کہ سیماب داغ کے شاگرد تھے تو انھیں چاہیے کہ ہماری تشفی فرمائیں۔

جہاں تک جگر کے شاگرد داغ ہونے کا مسئلہ ہے بعض حضرات کو شک ضرور ہے لیکن سکسینہ صاحب نے تو فیصلہ کن انداز میں لکھ دیا ہے کہ جگر داغ کے شاگرد نہیں تھے محمود علی خاں جامعی نے تذکرہ جگر کے صفحہ ۱۰۰ پر اور شارب ردولوی نے "جگر، فن اور شخصیت" کے صفحہ ۱۸ پر جگر صاحب کی ذاتی توثیق اور بیان کے مطابق لکھا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے داغ سے اصلاح لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت پر شک صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ جگر کا سنہ پیدائش ۱۸۹۰ء مان لیا گیا ہے ڈاکٹر محمد اسلام نے بھی "جگر مراد آبادی، حیات اور شاعری" میں یہی سنہ ماننے کی سفارش کی ہے۔ لیکن صفحہ ۵۲ پر ڈاکٹر ہی صاحب کے دیئے ہوئے حوالے کے مطابق سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے کہ" ان کے (جگر کے) بعض ملنے والوں کا خیال ہے کہ ان کا سنہ پیدائش ۱۸۹۰ء سے پہلے رہا ہوگا کیونکہ جب وہ ۱۹۲۰ء میں اعظم گڑھ آتے ہوتے تھے تو اپنے ۳۶ سال کا بتاتے تھے۔"

ضرورت اس بات کی ہے کہ ۱۸۹۰ء کے مفروضے پر یہ ثابت کرنے کی کوشش سے دست برداری کرلی جائے کہ جگر داغ کے شاگرد نہیں تھے کوشش اس بات کی ہو کہ جگر کا حتی الامکان اور بھی صحیح سنہ پیدائش متعین کیا جائے۔ یہ کام مشکل تو ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں (ظفر الاسلام ظفر)

اردو میں خواتین کا اولین ناول

[illegible] مورخہ ۲۲ [illegible] ۱۹۶۷ء [illegible] ناول نگار [illegible] بیگم سید اقتدار [illegible] اصلاح النساء [illegible] (۱۸۹۴ء) کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے جو کسی خاتون نے تحریر کیا [illegible] پہلا ناول ہے جو کسی خاتون [illegible] اردو [illegible] دیا جاسکتا کیونکہ [illegible] ہماری بیگم رشید النساء اہلیہ مولوی [illegible] ایک سماجی و اصلاحی ناول "اصلاح النساء" کے نام سے [illegible] کی موجودگی میں [illegible] ناول کو خواتین کا اولین [illegible] درست نہیں۔

(سید سلیمان حسینی [illegible] لکھنؤ)

بیجاپور کی اردو مثنویاں

[illegible] انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے "بیجاپور کی اردو مثنویاں" پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں جہاں تک میری رسائی ہوسکی ہے تمام بیجاپوری مثنویاں (عادل شاہی عہد) سے استفادہ کرچکا ہوں۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی کتنی مثنویاں ایسے گوشوں میں رہ گئی ہیں جہاں میری رسائی نہیں ہوسکی۔ میں ان تمام حضرات سے جنھیں دکنی ادب سے دلچسپی ہے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ان کے پاس بیجاپور کی کوئی مثنوی ہو یا وہ کسی اور مثنوی سے واقف ہوں تو پتہ ذیل پر مجھے مطلع فرمائیں۔

(قیوم صادق احمد پوری ایم۔ اے
لکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ مہارانی کالج میسور۔ ۱)

ریاستی شاخ آندھرا کے کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں

حبیب الرحمٰن صاحب کی تقریر

حیدرآباد ، ۷ جنوری۔ ریاستی شاخ آندھرا پردیش کے کارکنوں کے چوتھے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب حبیب الرحمٰن معتمد شاخ آندھرا نے کہا کہ ریاست آندھرا پردیش میں انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا یہ چوتھا سالانہ اجتماع ہے جس میں شرکت کے لیے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں میں ریاستی انجمن اور اس کی مجلس انتظامی کی طرف سے آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور خاص کر ہمارے ان ساتھیوں کا شکرگزار رہوں جو بڑی تکلیف اٹھا کر اور مالی بار برداشت کرکے ریاست کے مختلف اضلاع اور تعلقات سے اس اجتماع میں حصہ لینے کے لیے تشریف لائے ہیں اور یہ ان کے دلی لگاؤ کا بین ثبوت ہے

حضرات! آج جن حالات میں ہم یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ہمارے وطن عزیز کے لئے کئی اعتبار سے پریشان کن ہیں کرنسی کی دبا اوتی یعنی روپیہ کی قدر گھٹا دینے کے بعد جو معاشی صورت حال پیدا ہوئی تو اس سے ابتری، قحط کے حالات گذر جانے اور اچھی فصلیں ہونے کے باوجود ضروریات زندگی کی قیمتوں میں اضافہ، زبانوں کے بارے میں انتشار کی کیفیت، ریاستوں کے درمیان پانی کی تقسیم اور حد بندی کے جھگڑے، فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت، عوام میں تشدد کی روز افزوں میلان، ملکی قوانین کی بے حرمتی ریاستوں میں سیاسی پارٹیوں کے مابین اقتدار کے لیے رسہ کشی اور مسلمہ جمہوری روایات کی پامالی۔ ایسے رجحانات ہیں جو خیر خواہان وطن کے لیے دل خوش کن نہیں ہو سکتے ضرورت ہے کہ ملک کے سمجھدار افراد کچھ دنوں کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی دھاد اریوں کو چھوڑ کر اتحاد رسیجے اشارہ وسیع نظری سے کام لے کر ان رجحانات کو پھیلنے سے روکیں تاکہ ملک مضبوط اور عام خوشحالی کے لیے راستہ ہموار ہو

زبان کے تعلق سے آج کل ملک میں جو ہڑبونگ مچی ہوئی ہے اس سے ہر وطن دوست اپنے دل میں ایک خلش محسوس کر رہا ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار، سیاست داں جس تعصب تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہا جائے۔ ہندی پریمیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ بھی اس سلسلے میں کر رہے ہیں وہ سراسر قومی یکجہتی کی خاطر ہے لیکن ان کی حرکتوں سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں ان سے ملک کی رہی سہی یکجہتی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندی ریاستوں میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اور ہندی کے بعض سیاسی سرپرست اردو کا واجبی حق طلب کرنے والوں پر جو طرح طرح کے الزام لگا رہے ہیں، غیر ہندی ریاستوں کو خوف زدہ کرنے میں اس کا بھی کافی حصہ ہے۔ گزشتہ عام انتخابات کے بعد سے خاص کر یوپی اور بہار میں بعض فرقہ پرست تنظیموں کی اردو دشمنی بہت کھل کر سامنے آگئی ہے اور وہاں کے سیاسی بازی گروں نے اردو کو اپنا کھلونا بنا لیا ہے ان ریاستوں میں متحدہ محاذ کی حکومتوں کا اردو کے ساتھ طرز عمل اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اب اردو بولنے والوں میں بھی ان حرکتوں کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ اردو کی تحفظ دستہ کی تحریک ان ہی حالات کا نتیجہ ہے اردو کے حقوق کی خاطر اب لوگ کھلے بندوں عملی جدوجہد کے میدان میں آگئے ہیں۔ جلسوں، جلوسوں، بھوک ہڑتالوں کا سلسلہ جاری ہے اور ہمارے دو سورماؤں نے حال میں اردو کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اس تحریک میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اس میں حصہ لینے والے کسی ایک ہی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ چنانچہ شہیدان اردو کی فہرست کا آغاز جن دو ناموں سے ہوا ہے ان میں سے ایک کانپور کے پنڈت دیو نرائن پانڈے ہیں اور دوسرے اعظم گڑھ کے جے بہادر سنگھ ایم پی ہیں مختصر یہ کہ ملک میں زبانوں کے تعلق سے جو انتشار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس سے اردو بولنے والوں کا متاثر ہونا بالکل قدرتی بات ہے خاص کر ایسی صورت میں جب کہ گزشتہ بیس سال سے اردو کو کچلنے کی برابر کوششیں جاری ہیں۔

خوش قسمتی سے ہماری ریاست میں حالات ابھی اتنے نازک نہیں ہوئے ہیں اس لیے ہمیں ایسے ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہو رہا ہے اور اردو کی حالت یہاں بھی کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی لہذا ضرورت ہے کہ موجودہ صورت حالات کا جائزہ لے کر ایک ایسی راہ عمل متعین کی جائے جسے اختیار کرکے ہم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کا بھی سامان کر سکیں اور ساتھ ہی دوسری زبانیں بولنے والے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر ملک کی عام ترقی میں بھی برابر کا حصہ لے سکیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اب یہ طے شدہ بات ہے کہ آئندہ سے ریاستوں میں تمام سرکاری کاروبار خواہ ان کا تعلق دفتروں سے ہو یا عدالتوں سے یا قانون ساز مجلسوں سے، عام طور پر وہاں کی علاقائی زبانوں میں انجام پانے لگے گا۔ نیز مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیادہ تر علاقائی زبانوں ہی کے ذریعہ تعلیم دی جانے لگے گی۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو بولنے والی اقلیتیں جو کم و بیش ہر ریاست میں لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں کیا پالیسی اختیار کریں ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کی اکثریتی زبان کو اس طرح اپنا لیں کہ چند سال بعد وہی ان کی مادری زبان بن جائے۔ ایسا مطالبہ نہ تو انصاف پر مبنی ہے اور نہ وہ قانون قدرت ہی کے مطابق ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے چند نادان اور متعصب افراد کو چھوڑ کر کوئی سمجھ دار آدمی ایسا مطالبہ نہیں کرتا۔ لیکن دوسری طرف موجودہ زمانے میں کسی طبقۂ آبادی کے لیے یہ بات بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے علاقہ کی اکثریتی زبان سے بالکل لاپرواہ ہو کر معاشرے میں اپنا واجبی مقام حاصل کر سکے مثال کے طور پر آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے لیے ناگ

ہے کہ وہ تلگو سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کریں تاکہ عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ بھی اپنا حصہ ادا کرسکیں۔ اس کے لیے یہ بات قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بے بہرہ رہیں کیوں کہ وہ اپنی تعلیم ہر سطح پر اردو ہی کے ذریعہ حاصل کریں گے۔ اب رہا تیسری زبان کا سوال۔ اول تو ہر شخص کے لیے تین زبانیں جاننا اگر نہیں ہے۔ اردو بولنے والے اپنی مادری زبان کے علاوہ اگر تلگو بول چال اور تلگو لکھنا پڑھنا سیکھ لیں تو وہ بلا کسی دشواری کے یہاں کی معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں بھرپور حصہ لے سکتے ہیں۔ تیسری زبان کی ضرورت صرف ان مٹھی بھر افراد کو محسوس ہوگی جو ریاست سے باہر کل ہند سطح پر یا اس سے بھی آگے عالمی میدان میں قسمت آزمائی کرنا چاہیں گے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد قدرتی طور پر بہت کم ہوگی۔ ان لوگوں کو اختیار ہے کہ [illegible] ہندی یا انگریزی ان میں سے کوئی ایک یا اگر ہمت ہو تو دونوں زبانیں سیکھ لیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اردو بولنے والے صرف دیوناگری رسم خط سیکھ لیں تو کافی ہے کیونکہ وہ اپنی بول چال کی زبان کو دیوناگری رسم خط میں لکھ دیں تو یقیناً وہ عام ہندی سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔

یہی وہ اہم اصول ہیں جن پر انجمن ترقی اردو کی لسانی پالیسی کی بنیاد ہے اور انھی کو سامنے رکھ کر انجمن نے وہ مطالبات مرتب کئے ہیں جو بار بار ریاستی حکومت کی خدمت میں پیش کئے جاتے رہے ہیں مجھے بڑا دکھ ہے کہ اب تک حکومت نے ہمارے مطالبات کی طرف مناسب توجہ نہیں کی ہمیں توقع تھی کہ سرکاری زبان کے قانون میں ان مطالبات کو جگہ دی جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ پوری نہیں ہوئی۔ صرف اشک شوئی کے طور پر قانون میں ایک دفعہ شامل کر دی گئی ہے جو انتہائی ناقص اور سراسر ناکافی ہے اور لطف یہ کہ تقریباً دو سال گزر گئے اور اس ناقص دفعہ پر بھی عمل آوری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اسی بنا پر انجمن کا ایک وفد گذشتہ ستمبر میں چیف منسٹر صاحب سے ملا اور ایک یادداشت ان کی خدمت میں پیش کی جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ چیف منسٹر صاحب نے اس موقع پر وزیر متعلقہ کو بھی بلا لیا تھا اور گفتگو کے بعد ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ وزیر صاحب جلد ہی انجمن کے نمائندوں سے مشورے کے بعد ہماری شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے ضروری قدم اٹھائیں گے ڈیڑھ مہینہ ہوا میں نے وزیر صاحب کی خدمت میں یاد دہی کے طور پر ایک چٹھی بھی روانہ کی لیکن موصوف نے اس کے وصول ہونے کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ شاید جمہوری اخلاق کا یہی تقاضا ہو۔

بہرحال ہمیں کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنی جدوجہد کو اور زیادہ تیز کر دینا چاہیے اپنی کوششوں میں باقاعدگی اور تنظیم پیدا کرنی چاہیے اپنے مطالبات کی واجبیت سے تلگو بولنے والے بھائیوں کو واقف کراتے ہوئے ان کی ہمدردی حاصل کرنی چاہیے اور ہم کو تشدد اور ہنگامہ آرائی سے ہٹ کر ایک پرامن [illegible] پیدا کرنی چاہیے تاکہ ارباب اقتدار ہمارے مطالبات [illegible] کو ہماری سوشل زندگی میں اس

کی واجبی جگہ حاصل ہو جائے۔ امید ہے کہ ہمارا یہ اجتماع اس مسئلے پر خصوصی غور و بحث کے بعد آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کی ضرور رہنمائی کرے گا۔

اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے اردو تعلیم کی جیسی کچھ اہمیت ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے اسی بنا پر ہم اردو تعلیم کے راستے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر ہر سال غور کرتے اور محکمہ تعلیمات کو ان کی طرف متوجہ کراتے ہیں اس سال بھی ہمیں اپنے تعلیمی مسائل کا جائزہ لینا ہوگا ہمارے اضلاعی اور مقامی شاخوں کے کارکن جانتے ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں کھلوانے، اردو اساتذہ کا تقرر کرانے اور اردو کی کتابیں [illegible] میں [illegible] انھیں کیسی کیسی رکاوٹوں سے سابقہ پڑتا ہے [illegible] ہمیں اس وقت پیش آتی ہے [illegible] سوال متعلقہ کی [illegible] اردو جماعت کے کھولنے پر یہ شرط لگائی جاتی ہے [illegible] ایک معینہ رقم فراہم کریں کلاس کے لیے [illegible] فرنیچر کا انتظام کریں اور کھیل کے میدان مہیا کریں غور فرمائیے کہ دیہات کے غریب باشندے کیسے ان مطالبات کی تکمیل کر سکتے ہیں اور [illegible] قائم رہ کر ہم کب اپنے ملک سے عام جہالت کا خاتمہ کر سکتے ہیں توقع تھی کہ پنچایت راج کے قائم ہونے سے اصلاع و دیہات کے عوام کو حصول تعلیم میں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی لیکن یہاں بھی ہمیں مایوسی ہی کا سامنا ہے بلکہ بعض مقامات پر تو ضلع پریشدیں اور پنچایت سمیتیاں، اشاعت تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں

اسی سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ اعلیٰ تعلیم کا ہے یہ اعلان ہو چکا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں شروع ہونے والے سال تعلیمی سے دوسری ریاستوں کی طرح آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں میں بھی یہاں کی علاقائی زبان تلگو ذریعہ تعلیم بن جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت اردو مادری زبان والے طلبا کے لیے کیا انتظام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہر یونیورسٹی میں تلگو کے ساتھ حسب ضرورت اردو میڈیم کے کالج بھی کھولے جائیں۔ اسکولوں کی طرح کالجوں میں بھی اردو مادری زبان والے طلبہ تمام مضامین کی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کریں گے اور تلگو بطور دوسری لازمی زبان کے سیکھیں گے۔ اس طرح آٹھ دس سال تک تلگو سیکھنے کے بعد وہ یقیناً اس قابل ہو جائیں گے کہ خود کو معاشرے میں اجنبی نہ محسوس کریں اور معاشی میدان میں بھی دوسروں سے پیچھے نہ رہیں

حضرات اب میں آپ کی خدمت میں ایک گزارش پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ موجودہ زمانے میں کسی زبان کی ترقی کے لیے حکومت کا تعاون بہت ضروری ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس سے کہیں زیادہ ضروری خود اس زبان کے بولنے والوں کا شعور اور اس کی خاطر ان کا جذبہ ایثار ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اردو بولنے والے اس بارے میں خود اپنا فرض کما حقہ انجام دے رہے ہیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں بڑی کوتاہیاں ہوئیں اور اب بھی ہو رہی

ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہمارے تعلیم یافتہ خاندانوں میں ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں اردو لکھنے پڑھنے سے محروم نظر نہ آتیں، ہمارے اکثر اخبارات و علمی رسائل خریدار نہ ملنے کے باعث دم توڑتے دکھائی نہ دیتے، ہمارے اچھے لکھنے والے عدم سرپرستی کے ڈر سے اپنی تخلیقات کو پیش کرنے سے نہ ہچکچاتے، ہمارے کتب خانے اور دارالمطالعے اکثر و بیشتر بند پڑے ہوئے نہ ملتے اور جو ادارے کچھ نہ کچھ اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں وہ وسائل کی کمی کے سبب ٹھٹھرے ہوئے نہ ہوتے۔ اردو بولنے والوں سے میری یہ استدعا ہے کہ وہ مسئلے کے اس پہلو پر بھی ذرا غور فرمالیا کریں اور اپنے ضمیر سے کبھی کبھی یہ پوچھ لیا کریں کہ اردو کے ساتھ ان کی ہمدردیاں کہیں صرف زبانی جمع و خرچ تک تو محدود نہیں ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو آندھرا کی اضلاعی شاخوں کے صدر و معتمدین کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی اضلاعی شاخوں کے صدور و معتمدین کے چوتھے سالانہ دو روزہ اجتماع کا آج سے پہر اردو ہال حمایت نگر میں افتتاح ہوا۔ (۲) کے مجملہ (۱۵) ریاستی اضلاع میں واقع (۵۲) شاخوں کے (۱۸۱) مندوبین اس اجتماع میں شرکت کر رہے ہیں۔ نواب میر احمد علی خان صاحب صدر انجمن ترقی اردو شاخ آندھرا پردیش نے اس اجتماع کی صدارت کی۔ ملکاپور سے سب سے زیادہ ضلع میدک سے (۲۶) اور آندھرا سے سب سے زیادہ اننت پور سے (۵) مندوبین نے شرکت کی۔ نواب میر احمد علی خان صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ در اصل ہندوستانی رابطہ کی زبان صرف اردو ہی ہے اس زبان کی ترقی اور فروغ سے رابطہ کی زبان کے موجودہ تمام جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ملک کے بعض تنگ نظر اور کوتاہ فہم افراد نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں کی ترویج و اشاعت کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں جس کی وجہ دیگر زبان والوں میں ہندی والوں سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب نے محبان اردو سے کہا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کے جمود کو حرکت میں بدل دیں اور اردو کے کام کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے لیے ساز گار ماحول ہے۔ جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کہا کہ مختلف سرکاری محکموں سے جو شکایات وصول ہوئی ہیں اور اردو کو نافذ کرنے میں جو موانعات پیدا ہو رہی ہیں ان اجلاسوں میں اس کا جائزہ لینا ضروری ہے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اردو کی شاخیں قاعدے اور ضابطے کے تحت جا بجا قائم کر لی جائیں اردو کے بہی خواہوں کو چاہئے کہ اس کے نفاذ میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اس کا جائزہ لیں اور اس کا حل معلوم کریں۔ جناب حبیب الرحمٰن نے مشورہ دیا کہ ضلعی سطح پر سال میں کم از کم ایک مرتبہ اس قسم کے اجتماعات منعقد کئے جائیں اجلاس میں جناب سرینواس لاہوٹی، حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس ایوننگ کالج کے علاوہ اضلاعی مندوبین میں جناب نصرت فاروقی و محبوب نگر، سید پیران نظامی (اننت پور) جناب رشید احمد صاحب (کڑپہ) رفیق احمد (شکر نگر) مشیر احمد (سری پیٹ) ابوالمکارم غازی، الدین کمال (کریم نگر) سید مظفر (کاماریڈی) ایم۔ اے لطیف (سنگاریڈی) محمد ہاشمی (وقار آباد) غلام احمد مصطفےٰ (پودھن) محمد حفیظ الدین (یالکنڈہ) اور خواجہ معین الدین (کاماریڈی) نے بھی خطاب کیا۔ جناب یونس سلیم صاحب مرکزی نائب وزیر قانون نے شام کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے یونس سلیم صاحب نے کہا کہ سیاسی جماعتوں نے اردو کے متعلق جو رویہ اختیار کیا ہے وہ منصفانہ نہیں ہے ہندوستان میں اردو کے کارکنوں نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جس سے حکومت کو شکایت کا موقع ملے اور نہ ہی دستور اور قانون سے ہٹ کر کوئی کام کیا گیا۔ نائب وزیر قانون نے کہا کہ اس وقت ملک میں زبان کے مسئلہ پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سارے ملک کے لیے تشویشناک ہے ہندی اور انگریزی کے تعلق سے جو بددلی پیدا کی جا رہی ہے اس سے مسائل حل نہ ہوں گے بلکہ مسائل اور الجھ جائیں گے یہ کوئی صحت مند پہلو نہیں ہے اس سے پارلیمانی جمہوریت کو فائدہ نہیں پہونچے گا۔ حکومت آندھرا پردیش نے زبان کے مسئلہ پر توازن اور ہم آہنگی قائم کی ہے اور اس نے اس خصوص میں جو راہ اختیار کی ہے وہ دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ جناب یونس سلیم نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے بے مثال کام ہو رہا ہے اردو کے بہی خواہ جو یہاں جمع ہوئے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر تعمیری کام انجام دیں۔ جناب یونس سلیم نے یقین دلایا کہ اس وقت تک انھوں نے اپنی عوامی زندگی میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر آخر وقت تک قائم رہیں گے وہ مصلحت بینی سے کام نہیں لیں گے اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں حقائق کے اظہار میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ابتدا میں جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے انجمن کے نمائندوں کی طرف سے جناب یونس سلیم کا خیر مقدم کیا۔

افتتاحی جلسے کے بعد، ربوری کو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا چوتھا سالانہ دو روزہ اجتماع اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا جس میں ریاست میں اردو کے موجودہ موقف پر روشنی ڈالی گئی اور ریاست میں اردو کے موقف کو مضبوط اور مستحکم بنانے پر زور دیا گیا۔ ڈاکٹر عباس عابف نصر نمائندہ اعلیٰ عرب لیگ متعینہ ہندوستان نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر میں اردو کو بین الاقوامی زبان قرار دیا اور کہا کہ عربوں کو بھی اردو سے انس اور محبت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور عربی کا رسم الخط ایک ہی ہے۔ اردو زبان میں ہمہ گیریت اور جاذبیت ہے اردو بڑی خوبصورت ہے دلکش زبان ہے جو فارسی اور عربی سمجھتا ہے وہ اردو بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر عباس نے کہا عرب ممالک کل سے زیادہ آج متحد ہیں ہندوستانی بھی متحدہ قومیت کے نتیجہ سامنے آئیں گے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے "لسانی اقلیت کے مسائل" کے زیر عنوان اپنی تقریر میں کہا کہ اردو اقلیتی زبان تاریخی باقیات کی شکل میں ہے اتر پردیش اور بہار میں اردو اور ہندی کا وہ ربط نہیں ہے جس طرح ہمارے یہاں تلگو اور اردو کا ہے انھوں نے بتایا کہ دکن میں اردو کا موقف شمال کے مقابلے میں بہت مضبوط ہے بول چال اور دیگر

[illegible] ختم نہیں کیا جاسکتا دکن میں اردو اور ہندی کے [illegible] جا رہا ہے اس کا موقع نہ دیا جائے ہماری یہ خواہش ہونی چاہیے کہ اردو ہندی کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ یو پی میں [illegible] ظلم ہو رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو والے عوام تلگو پر عبور حاصل کریں۔ بیرسٹر اکبر علی خاں ایم پی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب آندھرا پردیش میں ذریعہ تعلیم تلگو ہو گی تو اس وقت اردو کالج کا قیام کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ اردو بولنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس جانب رجوع ہوں ہم تو اردو یونیورسٹی کا قیام چاہتے ہیں لیکن یہ خیال بھی آتا ہے کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے کہاں سے آئیں گے اردو کی خدمت کے لیے نئی نسل کو اردو ہی میں تعلیم دی جانی چاہیے یہی بہتر خدمت ہے۔ پروفیسر علی اکبر نے کہا کہ ہندی کے بجائے اگر ہندوستانی زبان کو قومی زبان کی حیثیت دی جاتی تو آج ہندی کا جو حشر ہو رہا ہے وہ نہ ہوتا۔ انھوں نے اردو وال طلبہ کو تلگو سیکھنے پر زور دیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ نے عدالتوں میں اردو کے چلن کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اہل غرض عوام کی پسند کی زبانوں میں عدالتوں میں کام کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب تک لسانی گتھیوں کو نہیں سلجھایا جائے گا اس وقت تک ملک کی زبانوں کو ترقی کے مواقع فراہم نہیں ہو سکتے دستور میں ہندی کو رابطہ کی زبان تسلیم کیا تھا، ہندی والوں کی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بعض علاقوں میں اردو والوں کو بھی زحمت برداشت کرنی پڑ رہی ہے انھوں نے کہا کہ ہندی والوں کو سمجھنا چاہیے کہ زبانوں کو کسی جبر یا دباؤ سے نہیں مٹایا جاسکتا جہاں تک زبان کا تعلق ہے اردو ہندی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اجلاس میں اضلاع سے جناب اسمٰعیل قریشی ایڈوکیٹ (عادل آباد) عبدالمنان قمر (کوڑنگل) ایڈوکیٹ راؤ (تلگنڈہ) محمد حنیف اسلامیہ ناصر الدین انصاری (تلگنڈہ)، شیخ احمد ( ) احمد حسین (میدک) اور سردار جیل (جوگی پیٹ) نے بھی تقریریں کیں دو روزہ چوتھے سالانہ اجلاس کے دوسرے دن کی پہلی نشست جناب سرینواس لاہوٹی کے شکریہ پر اختتام کو پہونچی۔

حلقۂ ادب رانچی کی تشکیل نو

رانچی: مقامی بہی خواہانِ اردو ادب کی ایک نشست "قلعہ نما" پر اسلول رانچی میں منعقد ہوئی جس میں "بزم فکر" و "حلقۂ ادب" رانچی کے انضمام کا فیصلہ کیا گیا دونوں ہی ادبی انجمنوں کے ارکان نے اردو ادب و زبان کی ترقی و ترویج کے لیے مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نئی مجلس عاملہ و سرپرست کا انتخاب عمل [illegible] نئی انجمن "حلقۂ ادب" رانچی کے نام سے ہی موسوم ہوگی۔

آل انڈیا پنجابی کانفرنس کے نام صدر اردو کمیٹی بمبئی کا پیغام

پنجابی ساہتیہ اکیڈمی لدھیانہ کے نویں آل انڈیا پنجابی ادبی کانفرنس کے انعقاد پر اردو کمیٹی کے اراکین، بمبئی کے اردو دوستوں اردو ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے صدر اردو کمیٹی بمبئی جناب کرشن چندر نے ایک پیغام بھیجا ہے جس میں انھوں نے اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک تمناؤں کے اظہار کے ساتھ کہا کہ پنجابی یہاں پہلے بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی، لیکن آزادی کے بعد تو بمبئی پنجابی کا ایک بڑا مرکز بن گئی ہے اور پنجابی کانفرنس کا اس شہر میں منعقد ہونا اس بات کی دلیل ہے۔

بمبئی کی اس پنچ میل کلچرل زندگی میں اردو زبان، اردو ادب اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک خاص اہمیت ہے، مختلف تاریخی وجوہ سے، جن میں علمی دنیا کی کشش بھی ایک وجہ ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد بمبئی میں اکٹھا ہو گئی ہے۔ اس وقت اگر بمبئی ہی کو اردو ادب کا سب سے بڑا مرکز کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو کو ملک کے جس علاقے نے پناہ دی تھی وہ پنجاب ہی تھا، اس وقت اردو کا پودا تقریباً سوکھ چکا تھا اور آج اگر یہ ہرا بھرا نظر آتا ہے تو محض اس لیے کہ اسے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خونِ جگر سے سرسبز و شاداب بنایا ہے، انھوں نے ہی اردو زبان کو، اردو ادب کو پنجابی کی شگفتگی اور توانائی بخشی ہے، اور یہ حقیقت ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ آبِ زر سے لکھی جائے گی ایسی حالت میں مجھے یہ کہنے دیجیے کہ جہاں پنجابی آپ کی میراث ہے، وہیں اردو بھی آپ کا ورثہ ہے، اور آپ جہاں اس پر ناز کر سکتے ہیں کہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں نے پنجابی کو مالا مال کیا ہے، وہیں اس کا بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اردو کی تعمیر میں بھی آپ کے لہو اور آپ کے آنسوؤں کا بڑا حصہ ہے۔

آج بھی کتنے ہی ایسے ادیب ہیں جو پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، ان کی سب سے ممتاز اور روشن مثال آپ کے یہاں بمبئی کے پنجابی ساہتیہ کیندر کے صدر اور میرے دوست راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت ہے۔

(ایک نامہ نگار)

ہماری زبان
کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

[illegible] مدیر قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. [illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date —
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۵ | ایڈیٹر آل احمد سرور | یکم فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

مرکزی زبان کے سلسلے میں کشمکش

مرکزی زبان کے سلسلے میں جو مناقشہ اور تشدد ہوا ہے وہ کسی طرح ملک کے لیے فال نیک نہیں ہے چونکہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور اس میں کئی ترقی یافتہ زبانیں ہیں جن کی ایک شاندار تاریخ ہے اور جن کے پیچھے صدیوں کا چلن ہے اور جن کا ادبی خزانہ بھی بہت سے موتیوں سے بھرا ہوا ہے، اس لیے یہ مانتے ہوئے کہ بالآخر ایک ہندوستانی زبان کو انگریزی کی جگہ لینا ہے، ہمیں ہندی یا کسی اور زبان کو کسی نہ کسی طرح سب پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس معاملے میں سب کی سہولت اور رضامندی کے اصول کو مقدم رکھنا چاہیے خواہ ہندی یا کسی اور زبان کے مرکزی زبان ہونے میں کچھ دیر ہی کیوں نہ لگے۔ افسوس ہے کہ یہ نقطۂ نظر عام نہیں ہے اور ایک طرف کچھ ہندی ریاستوں والے انگریزی کو خارج کرنے میں جلدی سے کام لے رہے ہیں اور یہاں تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ تشدد آمیز مظاہرے کرکے، انگریزی کے سائن بورڈ ہٹانے اور انگریزی ناموں کی تختیاں توڑنے میں پس و پیش نہیں کرتے تو دوسری طرف جنوب میں اسکولوں سے ہندی کو خارج کیا جا رہا ہے صرف تامل اور انگریزی پڑھانے کو کافی سمجھا گیا ہے اور ریلوں پر ہندی کے خلاف نعرے لکھنے اور ہنگامے برپا کرنے کا میلان خاصے زوروں پر ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان مظاہروں میں بنیادی چیز زبان نہیں سیاست ہے جو زبان کے ساتھ جذباتی وابستگی کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس قسم کے ہنگاموں سے ہندی یا تامل کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، ہاں قومی دولت برباد ہوتی ہے۔ ملک میں تشدد بڑھتا ہے اور ملک کے ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں سے ذہنی اعتبار سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی نقصان قومیت اور یک جہتی کے تصور کو پہنچتا ہے اور پورا ملک کمزور ہوتا ہے۔ اس وقت جب غذا کا مسئلہ، روزگار کا مسئلہ اور اشیا کی گرانی تینوں سنگین مسئلے ہیں، زبان کے نام پر ہنگامے کرنا اور پورے ملک کی ترقی کو روکنا ہی نہیں، بلکہ اس ترقی کو اور مشکل بنا دینا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ پھر سے اس بات کی کوشش کی جائے کہ تمام سیاسی پارٹیاں، ماہرین لسانیات، معلم اور قومی کارکن مل کر بیٹھیں اور زبان کے مسئلے کا ایک ایسا حل نکالیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ آج کچھ لوگوں کے انگریزی پر اصرار کے معنی یہ نہ لینا چاہییں کہ وہ انگریزی کو ہمیشہ کے لیے مرکز کی سرکاری زبان کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ [illegible] مدت [illegible] انگریزی کو [illegible] زبان کی حیثیت سے رکھنا مفید ہوگا جس میں صوبے ہندی اپنی زبان کے علاوہ کسی دوسری ہندوستانی زبان مثلاً ہندی میں اس حد تک صلاحیت حاصل کرلیں کہ انھیں ہندی والوں سے مقابلہ کرنے میں پس و پیش نہ ہو۔ مرکزی زبان کا مسئلہ بلاشبہ اہم ہے مگر ہندوستان کی تمام زبانوں کا اپنے اپنے علاقے میں ترقی کرنا اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے قابل بنانا زیادہ اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام دو ایک سال میں نہ ہو سکے گا، مگر اس کا آغاز تو ہو جانا چاہیے تاکہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ساری اعلیٰ تعلیم جدید ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ سے دی جا سکے۔ اس طرح اپنے اپنے علاقے میں وہاں کے مستقل باسیوں کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، مگر اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے ایسے طلبہ کے لیے جو یونیورسٹیوں میں اور مرکز کی ملازمتوں میں کام کرنے کے اہل ہیں، اپنی علاقائی یا مادری زبان کے علاوہ ایک ہندوستانی زبان اور انگریزی کا جاننا پھر بھی ہمارے نزدیک لازمی ہونا چاہیے۔ ہر طالب علم پر تین یا چار زبانوں کا بار ڈالنا گو مناسب نہ ہو، مگر اچھے اور ذہین طلبہ کے لیے چار زبانیں جاننا مشکل نہ ہونا چاہیے اور اس لیے ہمارے نزدیک یونیورسٹی کے طالب علم کو اپنی ریاستی یا مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور ایک ہندوستانی زبان ضرور جاننا چاہیے۔ اگر اس بات پر ہر حال میں نظر رہے کہ ایسے مسائل میں مجموعی فکر اور مجموعی رائے کو زیادہ اہمیت دی جائے گی اور کوئی گروہ اپنا نقطۂ نظر منوانے کی کوشش نہ کرے گا تو یہ لسانی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ یہ ملک کی سالمیت کو سخت نقصان پہنچائیں گے اور ہمارا قومی یک جہتی اور امن و اتحاد کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ آج وسیع النظری اور وسیع القلبی اور ذہنی رواداری کی جتنی ضرورت ہے اتنی کبھی [illegible]

خاندان کے تمام افراد کی مرضی اور سہولت کے مطابق چلتا ہے ایک فرد یا ایک گروہ کی سہولت کے مطابق نہیں۔ کاش یہ احساس عام ہو سکے۔

فراق اور دوسرے شاعروں اور فنکاروں کا اعزاز

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کے یوم جمہوریت کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے اردو کے چوٹی کے شاعر حضرت فراق گورکھپوری کو پدم بھوشن کا اعزاز دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملیالی کے مشہور شاعر شنکر کروپ کو بھی یہ اعزاز ملا ہے۔ مرہٹی کے ممتاز شاعر مسٹر میڈرے اور مشہور فنکارہ بیگم اختر کو پدم شری کا اعزاز ملا ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی گرانقدر خدمات کا یہ اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت سماج میں ان کی اہمیت سے واقف ہے اور ادب و فن کی قدر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعزاز سے یہ ادیب اور فنکار بڑے نہیں ہو گئے۔ ہاں حکومت کے اعزاز سے حکومت کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ ادارہ ہماری زبان حضرت فراق کو خصوصاً اور دوسروں کو عموماً ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔

ہماری زبان کے چندے میں ایک روپیہ کا اضافہ

ہم نے کچھ دن ہوئے ہماری زبان کے چندے میں ایک روپیہ کا اضافہ تجویز کیا تھا اور پڑھنے والوں سے رائے مانگی تھی۔ اس سلسلے میں جو خطوط ہمارے پاس آئے ہیں ان میں اس اضافے کی پرجوش حمایت کی گئی ہے ادھر ہماری زبان میں جو اضافے کئے گئے ہیں وہ بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں چنانچہ یکم فروری ۶۸ء سے ہماری زبان کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہوگا اور خریداروں کا حساب اس کے مطابق رکھا جائے گا خریداروں کو دفتر سے اس کی اطلاع بھی مل جائے گی۔

ممتاز غزل گو سراج لکھنوی کا انتقال

لکھنؤ۔ اردو کے ممتاز شاعر دبستان لکھنؤ کے آخری نمائندے قابل قدر ادبی انجمنوں کے معمار اور شعراء کی خاصی تعداد کے استاد حضرت سراج الحسن سراج لکھنوی کا ۲۳ جنوری کو صبح ۸ بجے اپنے مکان واقع گولہ گنج بوتراب خاں میں اچانک انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۵۰ سال تھی۔

مرحوم ۲۰ سال قبل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے خون کے دباؤ میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا دورہ رہ رہ کر پڑا کرتا تھا وفات سے کچھ دنوں قبل مرحوم اسی دورے کی وجہ سے فریش ہو گئے تھے۔ سراج صاحب نے ۱۹۱۶ء سے شاعری شروع کی اور اس وقت مشہور استاد مرحوم پیارے صاحب رشید لکھنوی کے شاگردوں میں شامل ہو گئے شروع کچھ دنوں پیارے صاحب کے بھائی ناظر صاحب حمید لکھنوی کو بھی کلام دکھایا مگر جلد ہی اپنے اساتذہ کی رائے سے وہ اصلاح سے مستغنی ہو گئے لکھنؤ کی تاریخی ادبی انجمنوں میں الادب بہار ادب معراج ادب اور فردوس ادب کی تشکیل میں مرحوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا معراج ادب کے مرحوم جنرل سکریٹری اور حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی مرحوم صدر تھے بہار ادب میں اگرچہ مرحوم نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا لیکن اس کے سب سے سرگرم ممبر رہے ادارہ ہماری زبان مرحوم کی وفات پر رنج و غم اور پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

ہندوستانی کتابیں پاکستان میں ناجائز طور پر نہ چھپ سکیں گی

لاہور میں ایک سرکاری ترجمان نے اعلان کیا ہے کہ ایک قانون کے تحت جو لوگ بھی غیر ملکی کتاب چھاپنا چاہیں گے ان کو اس کے لئے حکومت سے پہلے اجازت لینی ہوگی اور جو کتابیں چھاپی جا چکی ہیں ان کے لئے ۲ ماہ کے اندر سرکاری اجازت حاصل کرنا ہوگی۔ سرکاری ترجمان نے کہا کہ اس آرڈیننس کا مقصد کتابوں کے جعلی اڈیشن کے ذریعہ پبلشر منافع خوری نہ کر سکیں اور ادبی چوری نہ کر سکیں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اب کوئی بھی کتاب مصنف کی اجازت کے بغیر نہ چھپ سکے گی۔

مدیع الزماں خاور

جگنو کی روشنی

جب چاند تھک گیا
اور
آسماں بادلوں سے ڈھک گیا
جنگل کے بیچ
اندھیرے میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو
دفعتاً
احساس ہوا
کہ تیتیوں میں چمکنے والے ایک حقیر کیڑے کی
روشنی ——
کتنی عظیم ہوتی ہے !!

لکھنؤ میں شاعروں اور ادیبوں کی کانفرنس

لکھنؤ۔ یہاں ۳ اپریل سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک کانفرنس شروع ہو رہی ہے جو چار دن تک جاری رہے گی۔ اس میں اس بات پر غور کیا جائے گا کہ جمہوریت میں ادیبوں اور شاعروں کا رول کیا ہونا چاہئے۔ اس میں ادب کے نئے رجحانات پر بھی تبادلہ خیالات کیا جائے گا۔

------×·×·×------

پریم پال اشک

تقریظِ قندیلِ حرم

پچھلے سال انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رام پور کے زیر اہتمام پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ایک تقریظ بعنوان "تقریظِ قندیل حرم" شائع کی گئی تھی اور اسے سرشار کی اوّلین تصنیف بھی قرار دیا گیا ہے۔ اسے عابد رضا بیدار اور مسرت حسین آزاد نے مرتب کیا ہے۔ اس میں متن کے علاوہ "تقریب" کے زیر عنوان پیش لفظ یا دیباچے کے لیے دو صفحات وقف کیے گئے ہیں۔

بقول مرتبین قندیل حرم نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی فارسی تصنیف ہے جو $\frac{20 \times 26}{4}$ سائز پر ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے ۱۳ صفحات ہیں۔ اسے مطبعِ حسنی ملقب بہ "رئیس المطابع رامپور" نے شائع کیا تھا۔

سرشار کے علاوہ اس پر امیر مینائی نے فارسی میں ۷ صفحات کی ایک تقریظ لکھی تھی۔

یہ تصنیف حج بیت اللہ کی تقریب پر لکھی گئی۔ یہ تقریب فروری ۱۸۷۳ء کو ادا ہوئی۔

"تقریظ قندیل حرم" کسی بھی اعتبار سے اہمیت کی حامل نہیں اور تقریب کے زیر عنوان مرتبین نے جو دیباچہ یا پیش لفظ لکھا ہے اس میں ایسی بھلاوے میں ڈال دینے والی باتیں لکھی گئی ہیں جنھیں پڑھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔

دراصل اس سے محض "زعم تحقیق" کے سوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ کام نہ تو تحقیق کے تقاضے پورا کرتا ہے اور نہ ہی اس سے سرشار کے انداز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ محض خوباں سے چھیڑ کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہی نہیں بلکہ اس کے مطالعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو مرتبین میں سے کسی نے بھی نہ تو سرشار کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی ان کی تصانیف کا غائر مطالعہ کیا۔

تقریب میں یہ عبارت درج ہے :-

"یہ نثر رنگین (قندیل حرم) حج بیت اللہ کی تقریب پر لکھی گئی جو فروری ۱۸۷۳ء کو ادا ہوا۔ سرشار نے اسی نثر پر تقریظ لکھی جس کا واحد نسخہ (غالباً بخط مصنف) رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ سرشار نے اردو میں اس فارسی کتاب پر تقریظ لکھی ہے جو بہ نظر ظاہر کتاب کے سال اشاعت ۱۸۷۳ء کے قریب کی تصنیف ہونی چاہیے۔"

ایک سوال اٹھتا ہے کہ آیا ۱۶ صفحات کی ایک تقریظ کو تصنیف قرار بھی دیا جا سکتا ہے یا نہیں اس کا جواب یقینی طور پر نفی میں ملے گا۔ کیونکہ عام طور پر تصنیف سے مراد کتابی صورت میں منظر عام پر آنے والے کام سے لی جاتی ہے۔ تقاریظ یا دیباچوں کو تصانیف کی ذیل میں قطعاً شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اگر یہ کیفیت ہو تو ہر تصنیف میں مندرج تقاریظ اور دیباچوں یا پیش لفظوں کو تصانیف کی ذیل میں شامل کیا جائے۔ مثلاً غالب نے بھی تو کئی تقاریظ لکھی تھیں انھیں بھی تصانیف کیوں نہیں قرار دیا جاتا۔ عین یہی کیفیت دیگر شعرا اور ادبا کی ہے۔

لہٰذا "تقریظ قندیل حرم" کو سرشار کی تصنیف تو نہیں البتہ ایک تحریر ضرور کہا جا سکتا ہے۔

اب جہاں تک اس کے اولین ہونے کی بات ہے وہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں، سرشار کی تحریریں ۱۸۷۳ء سے بہت پہلے مضامین کی شکل میں اس عہد کے موقر جرائد میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔ ان میں کشمیر درپن، مراسلۂ کشمیری، ریاض الاخبار اور مراۃ الہند وغیرہ ہیں۔

ان کا پہلا مضمون مراسلۂ کشمیر میں ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا جبکہ وہ ضلع کھیری کے ایک اسکول میں مدرس تھے لہٰذا مذکورہ تقریظ کو سرشار کی اولین تحریر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مرتبین نے لکھا ہے کہ اس تقریظ کا واحد نسخہ (غالباً بخط مصنف) رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔ فاضل مرتبین نے لفظ "غالباً" کا سہارا لے کر حق تحقیق کا حق جس خوبی سے ادا کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ جب تک محقق کو اپنی تحقیق پر پورا یقین نہ ہو اسے اس قسم کے مشکوک بیانات دے کر اپنا الّو سیدھا کرنے اور زبان و ادب کے شیدائیوں کو بھلاوے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جب انھیں یقین ہی نہیں تھا کہ مذکورہ نسخہ مصنف کی اپنی تحریر اور خط میں موجود ہے تو ایسی مبہم اور مشکوک عبارت لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ صاحب! اگر محقق خود اپنے کام کی اہمیت سے منکر ہو اور اس کی افادیت تسلیم نہ کرے تو باقی اسے کاہے کو گردانیں گے۔

اگر مذکورہ "تصنیف" کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی تو اتنا آڈمبر رچانے کی کیا ضرورت تھی!

مرتبین نے مزید لکھا ہے :-

"اس میں آپ کو بول چال کی زبان، سلیس اور رواں بنیادی نثر لکھنے والے سرشار کے بجائے بالکل دوسرا مصنف نظر آئے گا جس پر رجب علی بیگ سرور صاحب "فسانۂ عجائب" کا دھوکا ہوتا ہے۔ اسے "فسانۂ عجائب" کا فیضان کہیے یا اس عہد کا عام رنگ یا پھر اس کتاب کے انداز کی پیروی جس کی تقریظ لکھی جا رہی تھی۔ بہرصورت اتنا تو طے ہے کہ یہ سرشار کے عام رنگ سے

بالکل بہ خلاف مسجع و مقفیٰ نثرِ رنگین کا نمونہ ہے جو سرشار کے اپنے خاص رنگ کی بین ضد ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ مرتبین سرورؔ کو بھی نہیں سمجھ سکے۔ سرورؔ، سرشار کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ سرورؔ نے ہمیشہ چیزوں کی عکاسی کی اور سرشار نے انسانوں کی ترجمانی کی۔ در اصل مغالطہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ سرشار نے سرورؔ کا تتبع کیا اور مسجع اور مقفیٰ انداز میں رنگین نثر لکھی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی اور حقیقت سے بعید نہیں کہ سرشار نے اپنے ابتدائی مضامین مقفیٰ اور مسجع نثر ہی میں لکھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے فسانۂ آزاد کی جلد اول میں مسجع مقفیٰ اور مسجع رنگین نثر بھی لکھی اور فسانۂ آزاد میں منظر نگاری کرتے وقت بھی مقفیٰ اور مسجع نثر ہی کا سہارا لیا ہے مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کا خاص رنگ انسانوں کی ترجمانی اور زندہ جاوید، چلتے جاگتے اور ہنستے کھیلتے ماحول کی عکاسی میں نہاں ہے۔ مردہ ماحول کی ... اور منظر کشی ان ... نہیں بھی کیفیت تقریظ قندیل حرم کی ہے۔ ... تقریظ قندیل حرم کا رنگ سرشار کے عام رنگ کے بالکل برعکس اور ان کے ... رنگ کی ضد ہے درست نہیں۔

یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے لہٰذا اپنی صفائی اور ثبوت کے طور پر سرورؔ اور سرشار کی تصانیف کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے رجب علی بیگ سرورؔ کے فسانۂ عجائب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

"سبحان اللہ الحمد اللہ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی وکوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر باوضع قطع دار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے ہر دوکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلے میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔ یہ اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکے پل تک کیا صراط مستقیم ہے۔ کیا جلسہ ہے نانبائی خوش سلیقہ۔ شیرمال کباب نان نہاری جہان کی نعمت اس آب داری کے ساتھ جس کی بو سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گذرے تو سونگھے! کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیکھے دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار۔ ... جھنکار ... شنگرف کے رنگ کی خستہ بھری! ایک بار کھائے نانِ نعمت کا مزہ پائے۔ تمام شہر ہونٹ چاٹتا پھرے ہمارے کباب اس آب و تاب کے کہ مرغ و ماہی کا دل سیخ اور پرحسرت محرومی سے کباب؛ ادرک کو لچھا میاں خیراللہ کی دوکان کا بال سے باریک کترا، اسم تایاب ہے"

(فسانۂ عجائب ص ۱۶)

اب سرشار کی شہرۂ آفاق تصنیف "فسانۂ آزاد" کا ایک اقتباس دیکھیے :-

"لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بسنت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر سمت طبلے پر تھاپ سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے۔ مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں زیادہ زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ اللہ اکبر گرد مزار میں نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔ غٹ کے غٹ جوق کے جوق چلے جاتے ہیں غول کے غول امڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھاڑ وہ دھکم دھکا، وہ ریل پیل، وہ شور و شر کہ الامان الحذر"

(فسانۂ آزاد جلد اول ص ۳۱)

آخر میں تقریظ قندیل حرم کا ایک اقتباس توجہ طلب ہے :-

"غرض مدہ حیات گونا گوں نے دل میں مگر پائی تھی اور یہی ... تھی کہ ... سلطنت میں کس نے کیا ... اور ... سلطنت ... کس نے کیا متعلقہ ... احکام ... جب کبھی ... بہ صفت ... کسی حاکم ... کے بار گلسار کا عدل یاد آتا خار ہوستۂ دل نسیم مسرت کے اہتزاز اور باد طرب انگیز کے اور سے کھل جاتا تھا اور جب کسی ظالم اظلم کے جور و ستم کی طرف خیال جاتا تھا کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ وقت تمام ہوا، دن قریب اختتام ہوا۔ آفتاب لب بام ہوا۔ مولیشی مرغزار ... سے آہستہ آہستہ بستی کی طرف جانے لگے کسان بے چارے دن بھر کے تھکے ماندے مرے مٹے اپنی اپنی جھونپڑیوں کو آنے لگے"

(تقریظ قندیل حرم۔ ص ۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سرشار نے سرورؔ کی تقلید کس حد تک کی اور "تقریظ قندیل حرم" سرشار کے عام اور خاص رنگ کی ضد ہے یا نمائندگی کرتی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

اردو زبان اس وقت جس نازک ترین دور سے گزر رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اردو کے نام لیوا محض ماتم اور واویلا یا مرثیہ خوانی اور حدی خوانی کے بجائے اس کی بقا اور ترقی کے لیے سنجیدگی سے غور کریں اور کچھ ٹھوس عملی اقدام کی طرف متوجہ ہوں۔ اس سلسلے میں جو مسائل بار بار ہمارے ذہن میں آتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ہمارے بچوں کے لیے اردو کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ آئینی طور پر اردو کی جو بھی حیثیت ہو لیکن مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس کی تعلیم کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ کیا اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ اگر واقعی اس زبان کو وہ اپنی زبان سمجھتے ہیں اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا اپنے طور پر کوئی انتظام نہیں کرسکتے؟

(۲) ہم اس بات پر تھوڑی دیر کے لیے خوش ہولیتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کے اعداد و شمار کی فہرست جب شائع ہوتی ہے تو اس میں اردو کا نمبر دوسرا بتایا جاتا ہے لیکن ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ان اخبارات کی حیثیت اور نوعیت کیا ہے؟ اردو میں وہ کون سا روزنامہ اخبار ہے جو کتابت و طباعت، مضامین اور خبروں کی فراہمی، ایڈیٹروں، نامہ نگاروں اور اخبار کے عملے میں کام کرنے والوں کی فن صحافت سے واقفیت اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے انگریزی میں نکلنے والے روزنامہ اخباروں سے تو بڑی بات ہے ہندی، گجراتی یا بنگالی میں نکلنے والے اخباروں کا بھی مقابلہ کرسکے؟

(۳) اردو زبان میں جو رسالے ہندوستان سے نکلتے ہیں ان کی صورت حال کے بارے میں ہم نے کبھی غور کیا ہے؟ ہمارے یہاں سے ہفتہ وار اخبار کس معیار کے نکلتے ہیں اور اگر وہ اپنے معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض حضرات شوقیہ طور پر اردو کا ادبی رسالہ نکالتے ہیں تو وہ کچھ ہی دنوں بعد دم توڑنے لگتا ہے اور آخر سسک سسک کر بند ہوجاتا ہے؟ کیا یہ بات درست نہیں کہ اردو کا ہر رسالہ تقریباً ایک ہی انداز کا ہوتا ہے، ہر پرچے میں گھوم پھر کر ایک ہی قسم کے مضامین اور ایک ہی نوعیت کا مواد ہوتا ہے؟ لکھنے والوں کی ایک بندھی ٹکی فہرست ہے جو اپنے افسانوں، غزلوں اور نظموں کے ساتھ ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ ہم اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ نہیں دے سکتے اور نہ ان سے سنجیدہ مباحث پر مضامین لکھوا سکتے ہیں۔ ہمارے رسالوں کو اشتہار نہیں ملتے۔ ہمارے یہاں رسالے خرید کر پڑھنے کی عادت لوگوں کو کم ہے، عموماً لکھنے والے ہی ان کو اعزازی طور پر وصول کرتے ہیں اور وہ لوگ جن کے پاس اعزازی طور پر رسالہ نہیں آتا وہ بھی اسے مفت حاصل کرکے پڑھنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر رسالے کے ایڈیٹر کو شکایت رہتی ہے کہ اسے خریدار نہیں ملتے کچھ دن تک رسالہ خسارے میں نکلتا ہے آخر مرحوم ہوجاتا ہے۔ کیا یہ بات ہمیں نہیں معلوم ہے کہ شمع، بیسویں صدی اور جاسوسی دنیا جیسے سستے رسالے ہمارے یہاں زیادہ مقبول ہیں اور علمی و تحقیقی اور اعلیٰ درجے کے ادبی پرچوں کے خریدار اتنے بھی نہیں جتنے ہمارے یہاں ادیب و شاعر ہیں؟

(۴) اردو زبان میں فحش اور مبتذل قسم کے ناولوں اور افسانوں کو شائع کرنے کے لیے ناشر اور انھیں فروخت کرنے کے لیے کتب فروش مل جاتے ہیں لیکن سنجیدہ کتابیں اپنے ناشر کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ بالآخر لکھنے والے کسی نہ کسی طور پر انھیں خود ہی شائع کرتے ہیں لیکن شائع کرنے کے بعد انھیں پشیمان ہونا پڑتا ہے کیونکہ اردو میں اچھی اور معیاری کتاب کا ایک ایڈیشن بھی مصنف کی زندگی میں ختم نہیں ہوتا۔ اس ایک ایڈیشن کی جس کی تعداد ایک ہزار سے زائد کبھی نہیں ہوتی) خاصی تعداد مصنفین کو اپنے حلقہ احباب میں تحفے کے طور پر پیش کرنی ہوتی ہے کیونکہ ہر لکھنے والے کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کو بہرحال کچھ لوگ پڑھیں۔

(۵) اردو زبان میں لغت، انسائیکلوپیڈیا، تاریخ ادب اور

مدحت الاختر

غزل

رس بھرا ہے جہاں گھٹاؤں میں
جل کے رہیے اب ایسے گاؤں میں

دیکھتے رہ گیے جدھر دیکھا
تیری تصویر تھی فضاؤں میں

وہ بھلا میرے پاس کیوں آتے
پھول کھلتے نہیں چتاؤں میں

کتنے بادل برس گئے لیکن
آگ پھیلی رہی دشاؤں میں

اپنی آواز کھو کے آئے ہیں
وہ جو ہیں تیرے ہم نواؤں میں

کون سورج سے بچ کے رہتا ہے
دھوپ میں بیٹھیے کہ چھاؤں میں

ہم ابھی تک زمیں پہ ہیں مدحت
لوگ اڑنے لگے ہواؤں میں

اس نوعیت کی کتابیں جن کو لکھنے اور لکھوانے اور انھیں شائع کرنے کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے ان کی اسکیم اور ان سے متعلق منصوبے تو ہر جگہ تیار ہوتے ہیں لیکن کامیابی کہیں نہیں ہوتی۔

یہ تمام مسائل ایسے ہیں جن پر بعض لوگ سنجیدگی سے غور بھی کرتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد بھی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ عموماً رونا یہی رویا جاتا ہے کہ ہمارے پاس وسائل نہیں، حکومت اور ریاست ہمارے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ کرتی ہے۔ دوسری زبانوں میں اخبارات کے مالک اور کتابوں کے ناشر بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں اور وہ اس کام پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن اردو والے غریب ہیں، ان کے پاس خلوص اور محبت تو ہے لیکن ان کی جیب خالی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے یہ باتیں ایک حد تک صحیح ہوں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ ہر سال ہمارے ملک میں لاکھوں روپیے صرف مشاعروں پر صرف ہوتے ہیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ [illegible] میں صدری اور ہماسوہی دنیا لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں [illegible] حیثیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ فحش اور گھٹیا ناول لکھنے والوں کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوتی [illegible] انھیں [illegible] نہیں ملتے [illegible] اپنی تحریر کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مشاعرے اردو زبان کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، وہ اس خوش خیالی میں مبتلا ہیں کہ اردو شاعری اب بھی عوام میں بے حد مقبول ہے اور شاید یہی مقبولیت اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے، لیکن ان مشاعروں میں جس قسم کی شاعری ہمارے سامنے آتی ہے اور ان میں جس نوع کے شعرا کی کثرت ہوتی ہے یا بقول ستاد عارفی یہاں اردو شاعری کی جو دُرگت بنتی ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ ابھی حال ہی میں دہلی کے لال قلعے میں اردو کا آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس کی صدارت وانچو صاحب (چیف جسٹس آف انڈیا) فرما رہے تھے انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ انھوں نے ایسے مشاعرے بہت "دیکھے" ہیں۔ معلوم نہیں موصوف نے مشاعروں کے سلسلے میں "دیکھنے" کا لفظ شعوری طور پر استعمال کیا یا غیر شعوری طور پر مگر واقعہ یہ ہے کہ اب مشاعرے "دیکھنے" ہی کی چیز رہ گئے ہیں غالباً اسی لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں آج کے مشاعرے کو سرکس سے مشابہ بتایا ہے عام طور پر جب یہ مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں تو ان کے انتظام و انصرام کے لیے ایک کمیٹی بھی مقرر کی جاتی ہے۔ اس کمیٹی میں بظاہر شہر کے معزز اور سنجیدہ حضرات ہوتے ہیں لیکن نہ جانے کون سی ایسی مصلحت کارفرما ہوتی ہے کہ زیادہ تر ایسے شاعروں کو پورے ملک سے [illegible] آئے جو شعر و ادب کی دنیا میں کسی اہم یا نمایاں حیثیت

کے حامل نہیں ہوتے، فراق جیسے چند شاعر بطور تبرک رکھ لیے جاتے ہیں لیکن پورا طائفہ ایسا ہوتا ہے جسے دیکھ کر نوٹنکی یا سرکس کے مسخرے یاد آئیں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ کچھ حضرات اپنی وضع قطع، حلیہ اور ہیئت کذائی، قوالی اور فلمی انداز کے ترنم، تاؤ بھاؤ اور اپنے کلام کی سطحیت اور کم مائگی ہر اعتبار سے شاید عام طور پر سنجیدہ محفلوں میں بار نہ پاتے لیکن صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ان کے ناز منتظمین مشاعرہ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ شاید عرسوں اور میلوں ٹھیلوں میں بھانڈوں اور قوالوں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر کسبیوں کی بھی وہ آؤ بھگت نہ ہوتی ہوگی مشاعرے کی صدارت اور اس کے افتتاحی مراسم کے لیے کسی عالم و فاضل کے بجائے کسی منسٹر یا گورنر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اردو سے محض واجبی واقفیت رکھتا ہو۔ یہ صدر محض تھوڑی دیر کے لیے کرسی صدارت پر رونق افروز رہتا۔ پھر اسے کوئی "ضروری" کام پڑ جاتا ہے اور وہ رخصت ہو جاتا ہے [illegible] میں اپنا کلام [illegible] شاعر [illegible] مشکل ہی بھی ہوتی [illegible] منسٹر یا گورنر صاحب اس [illegible] ان شاعروں [illegible] شاعرات اور مزاحیہ شاعروں کا استعمال [illegible] میں شاید ہی کوئی ایسی زبانیں ہوں جن کے بارے میں [illegible] جو اشعار [illegible] ہیں وہ خود ان کی اپنی طبیعت ہیں [illegible] صحیح نہیں ہوتا، تلفظ صحیح ہوتا ہے تو ادائگی سے پتہ چل جاتا ہے کہ شعر کی ساخت ان کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس چیز سے لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں وہ ان کی شاعری نہیں چیزے دگر ہوتی ہے۔ ان کا کلام جس طرح لوگ سنتے ہیں اور داد دے کر ہلڑ مچاتے ہیں وہ ہماری تہذیب اور شائستگی پر ایک بدنما داغ ہے۔ پھر مزاحیہ شاعروں کی باری آتی ہے تو یہ مشاعرہ واقعی دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے معلوم نہیں ہمارے یہاں کا مزاحیہ شاعر کیوں یہ سمجھتا ہے کہ اس کے کلام پر اسی وقت لوگ ہنسیں گے جب وہ کوئی گھٹیا اور سستا مزاح پیدا کرے گا یا کوئی عجیب آواز منہ سے نکالے گا۔ ان شعرا کے کلام پر مشاعرے کی رہی سہی فضا بھی بگڑ جاتی ہے اور وہ ہڑلونگ ہوتا ہے اور مجمع سے ایسی ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جنھیں سن کر شرافت آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔

مشاعرے کی یہ فضا کم و بیش اب ہر جگہ نظر آتی ہے یہی تمام بدتمیزیاں اور یہی تمام مناظر اب مشاعرے کے ایسا جز بن گئے ہیں جن سے کسی صورت مفر نہیں۔ سنجیدہ شعرا کے ساتھ ان مشاعروں میں جو سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی جس طرح ہٹی پلید ہوتی ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ غالباً اسی لیے آہستہ آہستہ سنجیدہ شاعر مشاعرے سے سہا ہوتے جاتے ہیں دو چار اگر رہ گئے ہیں تو محض اس لیے کہ شاید ان کی کچھ مجبوریاں ہوں۔

جو لوگ اردو زبان سمجھ لیتے ہیں لیکن اس کے رسم خط سے واقف نہیں وہ اردو شاعری کے بارے میں انھیں مشاعروں سے رائے قائم کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اردو میں بہت پوچ اور ادنیٰ قسم

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مُراسلات

کچھ "ہماری زبان" کے سلسلے میں

ہماری زبان کی حالیہ اشاعتوں میں 'میر اصفحہ' کے عنوان سے ایک نئے سلسلے کا آغاز اور 'رفتار' کا احیا دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی میرا خیال ہے کہ اس اقدام سے ان لوگوں کو بھی مداح بنا دیا ہوگا جو کسی نہ کسی وجہ سے انجمن ترقی اردو کے اس ترجمان کو پسند نہیں کرتے تھے واقعہ یہ ہے کہ سرزمین علی گڑھ سے نکلنے اور سرور صاحب کی ادارت دونوں کا تقاضا تھا کہ 'ہماری زبان' عصر حاضر کے مسائل سے چشم پوشی نہ کرے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر حقیقت پسندانہ انداز سے ان کا جائزہ لے کر قارئین کی رہنمائی کرے۔ زندگی کے کسی بھی مسئلے کو صرف ماضی کے تصورات کی ریت میں منہ چھپا کر تو حل نہیں کیا جا سکتا آج سے کم و بیش نصف صدی قبل اگر سرسیدؒ اور ان کے رفقاء اپنے قلم کو مصلحتوں اور روایتوں کی بیڑیاں پہنا دیتے تو (تہذیبی، سماجی اور سیاسی ترقیوں سے قطع نظر) اردو زبان و ادب کا شجر بھی اتنا تناور اور سایہ دار نہ ہوتا اور نہ ہی ماضی قریب میں وقت کے تقاضوں کے تحت کچھ نئی شاخیں نکل پاتیں۔ آج تب کہ پھر کچھ نئی شاخیں نکل رہی ہیں، نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ کھلی آنکھوں سے ان کا جائزہ لینا ضروری ہی تھا۔

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت تحریروں میں ایک بات خوشی سے زیادہ اطمینان کی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ ان کا انداز مولوی صاحب یا پولیس والے کا سا نہیں بلکہ ہمدردانہ اور افہام و تفہیم کا ہے اور یہی چیز ان تحریروں کو انفرادیت بخشنے کے علاوہ توجہ کے قابل بھی بناتی ہے۔

سرور صاحب کا 'میرا صفحہ' دراصل بڑی خوشگوار تبدیلیوں کا مظہر ہے ان کا نئی کتابوں، رسائل اور مسائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ و تجزیہ، اور پھر صاف ستھری، خوبصورت نثر اور جچا تُلا دلنشیں انداز بس "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" والی بات یاد آجاتی ہے۔ تازہ شمارے میں بعض نسبتاً پرانے اور سبھی قابل ذکر نئے رسالوں کا جس انداز سے تعارف کرایا گیا ہے ان کی خوبیوں اور خامیوں پر جس سلیقہ سے روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کو 'سادگی و پرکاری' اور دیانت اور خلوص کا بہت اچھا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ قند مکرر کے طور پر کچھ جملے یہاں نقل کر دوں مگر محسوس ہوا کہ تقریباً پورا مضمون ہی لکھنا پڑے گا اور یہ مراسلہ بہرحال اس طوالت کا متحمل نہ ہوگا۔

'رفتار' کا احیا بھی قابل مبارکباد اقدام ہے۔ دراصل عصری ادب اور اس کے مسائل پر خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگاہ بہت اچھی ہے اور APPROACH ہر طرح کے افراط و تفریط سے پاک۔ یکم جنوری کے شمارے میں اس عنوان کے تحت ان کا فکر انگیز مضمون بہتوں کو کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دے گا۔ ان کی اس بات میں کتنی صداقت ہے:

> "ادب میں عصری تقاضوں اور اس سے پیدا شدہ تبدیلیوں کے عمل کو نہ پہلے کوئی روک سکا ہے اور نہ اب روک سکتا ہے طرز احساس، ذہنی رویہ اور اسلوب اظہار کا جامد اور اٹل ہونا تو تشویشناک ہو سکتا ہے ان کی تبدیلی اور شکست و ریخت سے اس قدر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہماری زبان میں اس سے پہلے نئی شاعری کی دو منزلیں آچکی ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں ..."

نئی شاعری کے بارے میں عام طور سے ہمارے بزرگوں کا جو رویہ ہے اس کے بارے میں بھی ان کا یہ کہنا بھی کتنا برمحل ہے۔۔

> "۔۔ نئی شاعری سے متعلق گفتگو عام طور پر عمومی اور مبہم ہوتی ہے۔ ہم تعریف بھی کرنے سے جھجکتے ہیں اور اعتراض کرتے ہوئے بھی ان لوگوں کے نام لینے سے گریز کرتے ہیں جن پر اعتراض کیا جا رہا ہے ..."

خلیل صاحب کے اٹھائے ہوئے ۱۷-۱۸ سوالات بھی ہر صاحب شعور اور بالغ نظر شخص کے لئے لمحۂ فکریہ ثابت ہوں گے۔ ضرورت ہے کہ ان سوالات کی روشنی میں نئی شاعری کا سنجیدگی سے اور تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور بجائے عمومی انداز میں بات کرنے کے، واضح اور قطعی قسم کی گفتگو کی جائے۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ خلیل صاحب خود بعض مسائل پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح دوسرے قارئین بھی ان مضامین کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

براہ کرم ان سلسلوں کو جاری رکھیے۔ بہتوں کا بھلا ہوگا۔

آخر میں ایک بات "انگریزی الفاظ کے اردو مترادف" کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

چند سال قبل READERS DIGEST کے ایک MY HUSBEND - HONGRY BOOK-SUPPLIMENT کا ترجمہ کرتے وقت میں نے HONEY MOON کا ترجمہ "ماہ شیریں" کیا تھا۔ اشاعت کے بعد کئی لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا تھا۔ اب اہل نظر کی جو رائے ہو۔

RESURRECTION کو میرے خیال میں اصطلاحاً قیامت، حشر یوم حشر ہی کہیں گے۔ بہت کچھ انحصار محل استعمال پر ہوگا۔ بیداری عام طور سے REVIVAL کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور تجدید عموماً RENEWAL کے معنوں میں۔ ویسے محل استعمال کی بات یہاں بھی پیش نظر رہے گی۔

(ابرار اعظمی)

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں

مجھے گمان تھا لفظی تحقیق کا خبط صرف آغا خلش کاشمیری تک محدود ہے لیکن ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ "ہماری زبان" میں کسی اختر انصاری صاحب "کو بھی مخبوط دیکھ کر "خوب گزرے گی" والی مثل سامنے آگئی۔ میں اختر صاحب انصاری کے حدود اربعہ سے آگاہ نہیں ہوں اس لئے ان کے مبلغ علم یا زبان دانی پر حرف رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں ایک سے زیادہ بار کہہ چکا ہوں کہ اردو میری لسانی زبان ہے اور دیوانگی کی حد تک اس کا گرویدہ ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جو اچھی بات مل جاتی ہے گرہ میں باندھ لیتا ہوں۔ اختر صاحب انصاری نے جہاں میری ہم نوائی سے مجھے افتخار بخشا ہے وہاں میری عبارت میں کیڑے ڈالنے کی بھی سعادت حاصل کی ہے۔ اختر صاحب انصاری نے معرکہ آرائی کے لیے ہماری زبان کے صفحات کا سہارا لے کر اپنے لیے اچھا میدان تیار نہیں کیا۔ ہماری زبان کے قارئین میں با مذاق ہی نہیں فن آشنا لوگ بھی ہیں۔ مجھے حیرت ہے سہام مطاعن بنانے میں تعجیل سے کام لے کر اختر صاحب انصاری نے "انظر الی ما قال و لا تنظر الی من قال" کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اختر صاحب انصاری نے ایک پتے کی بات یہ بھی کہی ہے کہ "میرے خیال میں تحریر کا یہ انداز موجودہ دور میں ہندی کے اثر سے اردو میں داخل ہوا ہے" ع "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا" اختر صاحب انصاری پر شاید یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ اردو زبان ہندوستان کی پیداوار ہے۔ ایران یا عرب کی نہیں ہے جس "ہندی" پر حرف رکھا گیا ہے وہ خود اردو زبان کا لفظ ہے اور اردو ترکیب کا مرہونِ احسان ہے۔ اردو کی اساس ہندوستانی بھاشاؤں پر ہے اس لیے اس پر ہندی کے اثر کا اعتراض عبث ہوائی ہے۔

اختر صاحب انصاری نے میری عبارت پر دو درجن اعتراضات جڑ دیئے ہیں اور ہر بار کسی دلیل کے بغیر یہ تحریر کر دیا ہے کہ یوں چاہیے تھا۔ اگر اختر صاحب انصاری کے فرمودات وزنی ہوتے تو بحیثیت طالب علم میرا فرض تھا کہ "خذ ما صفا دع ما کدر" کی روشنی میں اختر صاحب انصاری سے استفادہ کرتا لیکن بادِ ہوا اعتراضات پر ایمان لانا میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ میں اختر صاحب انصاری کے اعتراضات کو بصورت مکالمہ رکھتا ہوں کہ قارئین ہماری زبان پر "تھوتھا چنا" کی اصلیت واضح ہو جائے میں اپنے جملے کو خلش اور اختر صاحب انصاری کے اعتراض کو اختر سے سپردِ قلم کرتا ہوں۔

(۱) خلش: "کشمیر کانفرنس میں پڑھا گیا مضمون"۔ اختر: "کشمیر کانفرنس میں پڑھا جانے والا مضمون یا وہ مضمون جو کشمیر کانفرنس میں پڑھا گیا" لکھنا چاہیے تھا۔ جواب: "خلق الانسان" ترجمہ پیدا کیا گیا انسان۔ (۲) خلش: "میں سو فی صد اتفاق نہ کر سکا"۔ اختر: صحیح روز مرہ سو فیصدی ہے۔ جواب: صدی بمعنی سنچری ہے CENT PERCENT سے مراد صد فی صد ہے۔

(۳) خلش: "اتفاق نہ کر سکا"۔ اختر: "اتفاق نہیں کر سکا"۔ جواب: یہیں ہندی بھاشا کا شبہ ہے۔ اختر صاحب اپنے ہی نظریے سے انحراف کر رہے ہیں۔ (۴) خلش: "میری نانی مرحومہ اکثر کشمیری زبان میں گفتگو کرتی تھی"۔ اختر: یہاں کوئی غلطی نہیں ہے لیکن مروجہ آداب کی رو سے نانی مرحومہ کے لیے "گفتگو کرتی تھیں" استعمال ہونا چاہیے۔ جواب: مجھے تسلیم ہے اور اختر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (۵) خلش: "میری والدہ اردو زبان کی ٹانگ توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں"۔ اختر: اگر یوں سے کام لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ "ناکام" کا لفظ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مخلِ فصاحت ہے۔ جواب: اختر صاحب پر واضح ہو کہ ناکام بمعنی بے مراد ہے۔ (۶) خلش: "میرے والد گھر پر پنجابی زبان میں معاملت کرتے تھے"۔ اختر: اردو میں "معاملت" کا لفظ اپنے اصلی و لغوی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی کسی کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا اس کو گفتگو کے معنی میں استعمال کرنا محض زبردستی یا غیر ضروری جدت۔ جواب: جہاں گھر اور والد کا تذکرہ ہے وہاں گفتگو نہیں معاملہ کا محل ہے۔ گھریلو زندگی کا انحصار عمل پر گفتگو سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ (۷) خلش: "پڑوس میں کشمیری گھرانے"۔ اختر: "پڑوس میں رہنے والے کشمیری گھرانے لکھنا چاہیے تھا"۔ جواب: پڑوس بمعنی ہمسائگی ہے۔ (۸) خلش: "رگِ غیرت کو جھنجھوڑتے ہیں"۔ اختر: جذبۂ غیرت کو جھنجھوڑا جاتا ہے رگِ غیرت کو نہیں۔ جواب: جھنجھوڑنا بمعنی کسی کو پکڑ کر ہلانا ہے اختر صاحب انصاری کے جذبہ کو کس کے ہاتھ اور کون سے ہاتھ پکڑتے ہیں۔ (۹) خلش: "اللہ بس باقی ہوس"۔ اختر: یہاں اس کہاوت کا محل نہیں تھا۔ جواب: محل تھا۔ (۱۰) خلش: "حسین پورہ میں بود و باش"۔ اختر: حسین پورہ کی بود و باش۔ جواب: حسین پورہ کی نہیں آغا خلش کاشمیری کی بود و باش تھی اور حسین پورہ میں تھی۔ (۱۱) خلش: "کاتب الحروف"۔ اختر: راقم الحروف۔ جواب: کاتب تقدیر کو راقم تقدیر نہیں کہتے۔ رقم رقوم کی واحد بھی ہے جبکہ کتب صرف لکھنے کا مفہوم دیتا ہے۔ (۱۲) خلش: "اپنی فوقیت جتانے کی ٹر ہانکے"۔ اختر: اپنی فوقیت جتائے اور بے وجہ ٹر ہانکے۔ جواب: ٹر ہانکنا بمعنی بے تکی باتیں کرنا ہے۔ (۱۳) خلش: "بھلا معلوم نہیں دیتا"۔ اختر: بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ جواب: کیوں؟ (۱۴) خلش: "جہاں تک میرے علم کا علاقہ ہے"۔ اختر: یہاں لفظ علاقہ اس طرح استعمال ہوا ہے جس طرح تھانے دار یا تحصیلدار کے علاقے کے ذکر میں استعمال ہوتا ہے۔ جواب: علق سے باب تفعل تعلق ہے اور علاقہ بمعنی تعلق ہے اور اسی طرح سے بے سر و پا اعتراض اختر صاحب انصاری نے کیے ہیں جن کے لیے ہماری زبان کے قیمتی صفحات کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا اگر تفصیل سے جواب درکار ہوں تو اختر صاحب انصاری مجھے اپنے ایڈریس سے باخبر کر دیں۔ انشاء اللہ شافی جوابات روانہ بخدمت کر دوں گا۔ "ہماری زبان" میں اپنے آپ کو اصغر کر دکھائیں۔ انجام کا

میرے استعمال کئے گئے الفاظ طمانینت اور صدی کو مورد عتاب بنایا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے صدی کو صدیٰ لکھا گیا ہے جو اگر غلط الکاتب نہیں تو سنگین غلطی ہے (اختر انصاری)

جواب: میں خود ہمیشہ طمانینت لکھتا ہوں سہو کتابت سے خوش نویس نے طمانیت لکھ دیا ہے جس پر میں نے اس لیے جیب کی سادھ لی کہ جہاں فصول اکبری منتخب اور مریل میں طمانیت بدو نون ہے وہاں صراح میں ایک نون حذف کرکے بھی موجود ہے۔ لیکن جہاں تک صدی کا تعلق ہے صاحب غیاث نے تحریر کیا ہے

صدی۔ بضم اول وفتح دال مہملہ وبعدہٗ الف بصورت یا سرودے کہ در عرب شتر بانان می سرایند وشتر بداں مست شدہ جالاک می گردد از مدار منتخب صراح)

صدا۔ بضم اول بمعنی راندن شتر بنغمہ

کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ اختر صاحب انصاری کی فارسی عبارت کا ترجمہ کرکے سمجھایا جائے　　(آغا حلش کاشمیری)

بقیہ صفحہ ۶ سے آگے

کی شاعری ہو رہی ہے اور شاید اس کے [illegible] حدات الحمد وث [illegible] سے گزر رہی ہیں ان کی اس رائے کو ہم کیسے غلط کہیں جب کہ مشاعروں کے ذریعہ اردو شاعری کے جو نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ قطعاً اس شاعری سے مختلف ہیں جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے لیکن کتابوں اور رسالوں کی سرپرستی کے بجائے کیوں ہم مشاعروں کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں اور کس لیے قوم و ملک کا لاکھوں روپیہ ہر سال ایسے شعراء پر صرف کیا جاتا ہے جو اردو شاعری اور اردو زبان کو جی بھر کر رسوا کر رہے ہیں ان مسائل پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئیے۔

انیس افر

مکتوب لندن

نائب مدیر مشرق افضل حق انتقال کرگئے

جناب افضل حق نائب مدیر مشرق، ایک طویل علالت کے بعد گزشتہ ہفتہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ گزشتہ دو سال سے لندن کے ہالووے اسپتال اور لندن یونی ورسٹی کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ انھیں آنتوں کا مرض تھا جس کی وجہ سے غذا ہضم نہ ہوتی تھی اور جسم میں خون دن بدن کم ہو رہا تھا۔ لندن یونی ورسٹی اسپتال میں ان کے پیٹ کا آپریشن بھی کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ گزشتہ ماہ انھیں تبدیل آب و ہوا کے لیے لاہور بھیج دیا گیا تھا اور یہی سفر سفر آخری ثابت ہوا۔ افضل حق مرحوم گذشتہ چھ برس سے ادارہ مشرق سے منسلک تھے اور مشرق کی تعمیر و ترقی میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔

آسٹن یونی ورسٹی میں ادبی و تفریحی تقریب

آسٹن یونیورسٹی کے بڑے ہال میں [illegible] کونسل اور ایشین طلبہ کی جانب سے ایک مشترکہ ادبی و تفریحی تقریب کا اہتمام گزشتہ ہفتہ کیا گیا حاضرین میں بھارت اور پاکستان کے شہریوں کے علاوہ انگریز [illegible] [illegible] شرکت کی [illegible] [illegible] آنیسر [illegible] کاسن ولچید اسیگر [illegible] مہمان خصوصی تھے مسٹر جینس نے اپنی تقریر میں اس تقریب کو سراہتے ہوئے بھارتی پاکستانی تارکین وطن پر زور دیا کہ وہ انگریزوں کو اپنے مذہب، ادب، تہذیب اور معاشرت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتے رہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن کریم اور بھگوت گیتا سے چند اقتباسات انگریزی میں پڑھ کر سنائے جسے حاضرین نے کافی سراہا اس کے بعد مختلف فنکاروں نے اردو و بنگلہ گیت اور رقص پیش کئے۔ مسٹر [illegible] اللہ [illegible] کی ایک اردو غزل اور ایک بنگالی فنکارہ کے گیت کی دھن کو انگریز حاضرین نے خاص طور سے پسند کیا۔

عبداللہ ملک کا عزم کیوبا

لندن میں مقیم ایک اردو و انگریزی صحافی عبداللہ ملک کیوبا کی کلچرل کانگریس کی دعوت پر کیوبا جا رہے ہیں تاکہ [illegible] جنوری شروع ہونے والی انٹرنیشنل کلچرل کانگریس کی سالانہ تقریبات میں شرکت کر سکیں۔ توقع ہے کہ مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض بھی ان تقریبات میں شامل ہوں گے۔

انتخاب مشرق عید لندن کی عید اور لیتیم　　ماخوذ از شاکر لدھیانوی، نیوکاسل

عید پر [illegible] ہے آرزوؤں کی بہار　　یہ بھی سچ ہے،

عید حسن تمنا کی مست آنکھوں کا خمار　　وہ بھی سچ ہے،

عید دل کی ان کہی ہر آرزو کا ماحصل　　سب کچھ سچ ہے سال نو!

عید تیرے لارنگوں ہونٹوں کا شانہ کھار　　لیکن تم کو الیٰ غربت والی نظروں سے دیکھا!

عید میں تیرے تصور کا حسیں دربار ہے　　میں [illegible] ہے پہلے سال [illegible] دیکھا!

عید ر[illegible] میں تمہاری یاد سے سرشار ہے

شاخ آندھرا پردیش کے سالانہ اجتماع کی اہم قراردادیں

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کے سالانہ اجتماع میں حسب ذیل قراردادیں پاس کی گئیں۔

قرارداد نمبر ۱۔

ریاست آندھرا پردیش کے سرکاری زبان کے قانون میں اردو کے غیر اطمینان بخش موقف پر توجہ دلانے اور قانونی ضمانت کے ذریعہ اس کی پوزیشن مستحکم کیے جانے کے مطالبہ کو پیش کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا ایک وفد چیف منسٹر سے ملا تھا اور ایک یادداشت ان کے حوالے کی تھی لیکن افسوس ہے کہ یقین دہانی کے باوجود اس سلسلے میں حکومت نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع گورنمنٹ کے اس رویہ پر تشویش کا اظہار کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ سرکاری زبان کے قانون کی دفعہ (۷) سے مبہم الفاظ حذف کر کے اردو زبان کے مستقبل کی ضمانت دے اور ... مطابق ایک اعلامیے کے ذریعہ آندھرا پردیش میں اردو کے موقف اس کے عمل اور اس کے استعمال واعتراض کی وضاحت کرے۔

یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے حسب ذیل مطالبات کو تسلیم کر کے اس تشویش اور بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش کرے جو اپنی زبان کے مستقبل کے تعلق سے پیدا ہو گئی ہے

۱۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ آندھرا پردیش میں اردو بولنے والوں کی بھاری تعداد ہے اور اردو آبادی کے ایک ... حصے کی مادری زبان ہے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

۲۔ تمام دیہات، قصبات اور شہروں میں جہاں آبادی کا کم سے کم دس فیصد حصہ اردو بولتا ہے حسب ذیل سہولتیں فراہم کی جائیں

(الف) اہم قوانین۔ قاعدے، ضابطے اور اعلامیے بشمول ... دہندگان، برقی اور آب رسانی کے بل راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی جاری کیے جائیں۔

(ب) وکلاء کو عدالتوں میں اردو کے استعمال کی اجازت ہو ... دعوے، درخواستیں، مرافعے، حلف نامے وغیرہ اردو میں بھی قبول کی جائیں اگر فریقین فیصلے اور احکام کے اردو ترجموں کا مطالبہ کریں تو انہیں دیے جائیں۔

(ج) ضلع پریشدوں، پنچایت سمیتیوں اور دوسرے لوکل باڈیز میں ... انتظام کیا جائے کہ اگر کوئی رکن اردو میں تقریر کرے تو اس کارروائی کا ... اردو میں بھی رکھا جائے۔

(د) تعلقہ اور ضلع کے دفتروں میں اردو بولنے والے اہل معاملہ ... پوری پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں

(ہ) تمام سرکاری عمارتوں کے سائن بورڈ پر اردو میں بھی ان ... نام لکھے جائیں۔

۳۔ داخلے کے موقع پر اس طلبہ کی وقت واحد میں موجودگی پر اصرار کرنے ... ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔ تحتانی اور ثانوی مدارس میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا انتظام کیا جائے اور اساتذہ کی ٹریننگ اور نصابی کتابوں کی طباعت کا بھی انتظام کیا جائے۔

۴۔ مختلف سرکاری ملازمتوں میں تقرر کے امتحانوں کے لیے اردو کا بھی استعمال کیا جائے۔

۵۔ ایوان مقننہ میں پیش ہونے والے مسودہ قانون منظور کردہ قوانین اور گورنر کے آرڈیننس کے لیے اردو بھی استعمال کی جائے۔ ریاستی سرکار کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکام، قوانین، ضابطے اور ذیلی قواعد وغیرہ اردو میں بھی ہوں مقننہ کے ارکان کو اردو میں تقریر اور سوالات کرنے کی آزادی حاصل رہے اور ان کے جوابات بھی اردو میں دیے جائیں۔ مقننہ کی کارروائی کی روداد اور حکومت کے گزٹ اردو میں بھی شائع ہوں۔

انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع اور مطالبات کی تشہیر اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے طے کرتا ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں آندھرا پردیش میں ہفتہ اردو منایا جائے۔

قرارداد نمبر ۲۔

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش اردو تعلیم کے مسائل سے حکومت اور محکمہ تعلیم کو وقتاً فوقتاً واقف کراتی اور ان دشواریوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتی رہی ہے جن کی وجہ سے اردو بولنے والوں پر تعلیم کے دروازے بند ہونے جا رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ حکومت اور محکمہ تعلیم نے بنیادی مسائل کو حل کرنے اور واجبی شکایات کے سدباب کی طرف ضروری کوشش نہیں کی بلکہ ٹال مٹول کی پالیسی سے کام لیتی رہی ہے۔

انجمن کے کارکنوں کا یہ اجتماع حکومت اور محکمہ تعلیم کے اس رویے پر سخت احتجاج کرتا ہے اور پھر ایک بار اپنے مطالبات کو دہراتے ہوئے ان کے عاجلانہ تصفیہ پر زور دیتا ہے۔

(الف) اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کے لیے جگہ مہیا کرنے اور غیر متوازی اخراجات کی پابجائی اور عطیات کی شرط فوراً برخواست کی جائے اردو والے بعض مخصوص اسباب کی وجہ سے انتہائی معاشی پستی کا شکار ہیں اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ متذکرہ بالا شرائط کی تکمیل کریں گے بہت ہی گمراہ کن ہے

محکمۂ تعلیم نے اپنے مراسلے نمبر مورخہ کے ذریعہ جو وضاحت کی ہے وہ سراسر غیر تشفی بخش ہے اگر لوکل باڈیز غیر متوازی اخراجات برداشت کرنے کے موقف میں نہیں ہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ یا تو ان اداروں کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے عملی اقدام کرے یا لسانی اقلیت کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کی مالی ذمہ داری براہ راست خود قبول کرے۔ یہ جلسہ متذکرہ شرائط کو لسانی اقلیت کے بنیادی حقوق اور دستوری تحفظات کے مغائر تصور کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان کو فوراً برخواست کر دیا جائے۔

(ب) اردو تعلیم کے مسائل کچھ اس طرح الجھ گئے ہیں اور شکایتوں کی نوعیت اور ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ان کے حقیقت پسندانہ جائزے پر وقت اور مناسب تصفیوں کے لیے ایک اسپیشل افسر کا تقرر

ناگزیر ہو گیا ہے جو مختلف مقامات کا دورہ کر کے اردو تعلیم کی حقیقی مشکلات اور اردو والوں کی ضروریات سے محکمہ کو باخبر رکھے اور واجبی شکایتوں کو رفع کرنے کا فوری بندوبست کر سکے۔ اس لئے یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ناظم تعلیمات کے تحت ایک اسپیشل افسر کے تقرر کے فوری احکام جاری کرے۔ عمومی نوعیت کے اسپیشل افسروں کی جائدادوں کی بحالی کے سوال کو اردو اسپیشل افسر کے تقرر کے مسئلہ سے جوڑ کر اصل مطالبہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش پر یہ جلسہ احتجاج کرتا ہے اور حکومت اور محکمہ پر زور دیتا ہے کہ ہمارے مطالبہ پر خصوصی توجہ دے۔

(۴) اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کے معائنہ کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے معیار تعلیم برابر گرتا جا رہا ہے شمالی سرکار اور رائل سیما میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول مقرر ہیں لیکن ان کی تعداد ناکافی اور ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے فرائض کما حقہ پورے نہیں کر سکتے اس لیے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کی تعداد میں اضافہ کرے اور ہر ڈپٹی انسپکٹر کے تحت پچاس سے زائد اسکول نہ رکھے جائیں شمالی سرکار اور رائل سیما کے برخلاف اردو مدارس کے معائنہ کے لئے تلنگانہ میں ڈپٹی انسپکٹروں کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کی وجہ سے یہاں کے مدارس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی ہے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ شمالی سرکار اور رائل سیما کے خطوط پر تلنگانہ میں بھی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے مقرر کئے جائیں

(۵) اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی سے تعلیم کا معیار بری طرح گرتا جا رہا ہے، اس لیے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ حیدرآباد کے علاوہ ان اضلاع کے مستقروں کے ٹریننگ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے متوازی انتظام کیا جائے جہاں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس موجود ہیں۔

(۵) ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکولوں میں اردو کی تدریس کے لیے بالعموم جن اساتذہ کو مقرر کیا جاتا ہے وہ ضروری قابلیت کے حامل نہیں ہوتے جس کی وجہ سے اردو کی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح دوسرے مضامین کے لیے پوسٹ گریجویٹ اساتذہ مقرر کئے جاتے ہیں اسی طرح اردو کے لیے بھی صرف پوسٹ گریجویٹ اساتذہ ہی کا تقرر کیا جائے۔

(۶) نصابی کتب کے معیار اور ان کی فراہمی کے مسائل کے پیش نظر یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ اردو کی تمام نصابی کتابوں کو قومیا یا جائے اور محکمہ تعلیم معیاری نقشوں اور اٹلس کی تیاری اور فراہمی کا بھی انتظام کرے

قرارداد نمبر ۳:۔ آغاز سال تعلیمی ۱۹۶۹ء سے آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی کی بجائے یہاں کی علاقائی زبان تلگو قرار دی جائے گی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں اور ہمدردوں کا یہ اجتماع اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ساتھ ہی یہاں کی دوسری علاقائی زبان اردو ذریعہ تعلیم کے کالج بھی حسب ضرورت حکومت اور یونیورسٹی کے تحت قائم کئے جائیں۔

قرارداد ۱۴:۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ اجتماع سری وینکٹیشور یونیورسٹی سے پھر ایک بار مطالبہ کرتا ہے کہ ادر نٹیل ٹائٹلز کے امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ اور طالبات کے لئے انٹرنس کے امتحان کے انعقاد کا فوری انتظام کرے

قرارداد ۱۵:۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا یہ اجتماع سری وینکٹیشور یونی ورسٹی سے پھر ایک بار مطالبہ کرتا ہے کہ وہ میٹرکولیشن کا امتحان اردو میڈیم میں بھی منعقد کرنے کا فوری انتظام کرے تاکہ وہ طلبہ اور طالبات جو اردو کے ذریعہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے خواہشمند ہوں دوسری یونیورسٹیوں کے امتحان میں شرکت کرنے کی زحمت سے بچ سکیں

باقی صفحہ ۲ سے آگے

سے پہلے ریاض کیا جائے ورنہ زمین میں رفتہ رفتہ لالہ و گل کے بجائے گھر گھر گھاس اگنے لگے گی۔

چھٹی بات یہ ہے کہ طلبہ کی زندگی ایک مصروف زندگی ہونی چاہئے اپنے درسی فرائض کے علاوہ شوق کے کاموں کی بھی مصروفیت جس سے شخصیت میں رنگینی پیدا ہوتی ہے اور جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی شعور بڑھتا ہے اس طرح اساتذہ کے یہاں بھی علمی کاموں میں عبادت کا انداز ہونا چاہئے اور اس عبادت میں فراغت اور راحت کا احساس ہونا چاہئے

آخری بات یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں صرف دو چیز اہم ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ اساتذہ ہی یونی ورسٹیوں کی بہتر قیادت کر سکتے ہیں اور طلبہ کی مناسب نگرانی یونی ورسٹیوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ غریب کی بھابی بن کر رہ گئی ہیں حکومت یا سیاسی پارٹیاں سب اپنی اپنی چودھراہٹ چاہتی ہیں۔ یونی ورسٹیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہونی چاہئے ان کے چلانے والے دیکھ بھال کر مقرر کرنے چاہئیں اور انھیں مناسب وسائل مہیا کرنے چاہئیں۔ پھر انھیں دکھاوے کے کاموں یا شعبدہ بازی میں نہیں الجھانا چاہئے بلکہ خاموشی سے کام کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ سب سے اچھا راستہ ہمیشہ دور کا راستہ ہوتا ہے۔

آج ملک میں صرف اقتصادی مشکلات ہی نہیں ہیں۔ اچھی قدروں کی پامالی نے بھی ہماری مشکلات بڑھا دی ہیں۔ جبھی تو کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں، نہ کسی چیز پر اعتماد ہے اچھی قدروں کی اشاعت اور زندگی کی اور سماج کی ذہنی قیادت یونی ورسٹیاں کر سکتی ہیں، بشرطیکہ ان کی عنان ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو آشنائے راز ہیں جن کے دل کو لگی ہے جو رانا ہٹ اور بال ہٹ دونوں کو سمجھتے ہیں اور دونوں سے بچ کر علم و آگہی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

میرا صفحہ

ہندوستان کی یونی ورسٹیوں میں کیا خرابی ہے؟ وہ اپنا فرض کیوں پورا نہیں کر رہی ہیں۔ یہ دانش کدے کیوں نہیں ان سے انسان کیوں نہیں نکلتے، چیختے چلاتے، ہجوم کیوں برآمد ہوتے ہیں ان میں آگہی کی روشنی اور تہذیب کی جگمگاہٹ کیوں نہیں، ایک بے سمتی ہیجان، ایک تشنگی کیفیت کیوں ملتی ہے ان میں لوگ ہر چیز کے خلاف کیوں ہیں، کسی چیز کے موافق کیوں نہیں۔ یہاں ہر چیز سے نفرت کیوں ملتی ہے محبت کیوں نہیں ملتی۔

اس سوال کے بہت سے جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک سیاست داں سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ ساری یونی ورسٹیاں اس کے سیاسی پروگرام پر چلنے لگیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک سرکاری افسر سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ ان لوگوں کو آزادی بہت دی گئی ہے، کچھ سختی کی ضرورت ہے۔ ایک اوسط طالب علم سے پوچھئے تو وہ جواب دے گا کہ جب تک روزگار نہ ملے ان یونیورسٹیوں کا کیا جواز ہے۔ ایک پرانے استاد سے پوچھئے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا کہ ہماری جوانی کے زمانے میں حالات بہت اچھے تھے۔ اب نہ وہ طالب علم نہ وہ استاد۔ ایک نئے استاد سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ صاحب، مجھے اگلے زینے پر چڑھنا ہے، مجھے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ صرف یونی ورسٹیوں ہی میں خرابی نہیں ہے پورے ملک میں اور سماج میں بہت سی خرابیاں ہیں اور ان کا اثر یونیورسٹیوں میں بھی محسوس ہو رہا ہے۔ مگر چونکہ یونیورسٹیوں سے تو توقع کی جاتی ہے کہ وہ صرف ملک اور سماج کی خرابیوں کو ہی قبول نہ کریں گی، بلکہ اس ملک اور سماج میں جو اچھائیاں ہیں انھیں بھی اجاگر کریں گی اور اپنی قدروں کے ذریعہ سے ملک اور سماج کی برائیوں کو کچھ کم کرنے کی کوشش بھی کریں گی، اس لیے صرف ملک اور سماج کو الزام دینے سے کام نہ چلے گا، یونیورسٹیوں کی اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالنا پڑے گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیاں اپنے اساتذہ کے اور اپنے طلبہ کے انتخاب میں ضروری احتیاط سے کام نہیں لے رہی ہیں۔ ملک اور سماج کا یہ فرض ہے کہ ہر شہری کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم دے لیکن ملک اور سماج کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اسے یونی ورسٹی کی تعلیم بھی دلائے۔ یونیورسٹی کی تعلیم انھیں کے لیے ہے جو اس کے لیے اپنی صلاحیت کا ثبوت دے سکیں۔ اس طرح یونی ورسٹی کے اساتذہ بھی ایسے ہونے چاہئیں جو اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جسے کاروبار نے ٹھکرا دیا یا جو سرکاری ملازمت حاصل نہ کر سکا وہ کسی نہ کسی طرح یونی ورسٹی میں آ گیا اور یونی ورسٹی کے اساتذہ کو پھر ایسا مشاہرہ ملنا چاہیے جو سرکاری ملازمتوں اور کاروبار کی آمدنی سے کسی طرح کم نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کا وہ طریقہ جس میں آخری امتحان سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جلد سے جلد بدل دیا جانا چاہئے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تدریس کا طریقہ بدل دیا جائے یا نصاب میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سطحی بات ہے اصلی چیز امتحان کا طریقہ ہے طلبہ کی کامیابی اور تحریری کام اور ان کے زبانی امتحان پر ہونا چاہئے نہ کہ سال بھر کے بعد تین گھنٹے کے پرچے میں سے کورس کے ایک حصے پر کچھ رٹے ہوئے موضوعات پر مضامین لکھنے پر۔ یہ امتحان انھیں اساتذہ کو لینا چاہیے جو طلبہ کو پڑھاتے ہوں، ہاں ان اساتذہ کی ایمانداری، غیر جانبداری اور دیانت داری مسلم ہونی چاہئے

تیسری بات یہ ہے کہ اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت ان کی علمی صلاحیت کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ استاد ہونے کی کس حد تک صلاحیت رکھتے ہیں۔ استاد ہونے کی صلاحیت کی پہچان یہ ہے کہ وہ تدریس کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اس کے لیے کتنی تیاری کر سکتے ہیں ان کا ذہن کس قدر کشادہ ہے۔ وہ نوجوانوں پر اپنی شخصیت کا کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کے پاس قدریں کیسی ہیں وہ اپنی ذات کے خول میں بند تو نہیں ہیں وہ یونیورسٹی کی جگہ کو صرف اپنی ذاتی ترقی کا زینہ تو نہیں سمجھتے ہیں انھیں علوم اور ادبیات تہذیبی سرگرمیوں، سیاسی اور سماجی مسائل سے کتنی دلچسپی اور کتنی واقفیت ہے، وہ عمومی نظر کے علاوہ کسی تخصیص دائرے میں گہری نظر رکھتے ہیں یا نہیں ان میں رہنمائی کی، رفاقت کی، مل کر کچھ کرنے کی امنگ ہے یا نہیں

چوتھی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں کی تعلیم مادری یا علاقائی زبان میں ہونی چاہئے، مگر انگریزی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانا چاہئے اور اس کے ایک اچھے معیار پر اصرار کرنا چاہئے۔ یونی ورسٹیوں میں معلومات تو بیرونی زبانوں میں دی جا سکتی ہیں، مگر علم دینا ہے تو اپنی زبان میں دینا پڑے گا۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کا مقصد معلومات کا بوجھ لادنا نہیں ہے۔ ذہن کو بیدار کرنا ہے، تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنا ہے۔ خود سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ طالب علم کو اس راستے پر چلانا ہے جو اس کی فطرت کے مطابق ہے ایسا ذہن غیر زبانوں کے ذریعہ سے نہیں پیدا ہوگا ہاں انگریزی جیسی زبانوں کا علم اس ذہن کو کشادہ رکھے گا، اسے سکڑنے نہ دے گا۔ کاش یہ صاف اور سیدھا نکتہ ہمارے ارباب حل و عقد کی سمجھ میں آ سکے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں میں کوتوالی یا ہر ہنگامے کے آگے سپر ڈال دینا، پولیس کی پہرہ داری یا سیاسی پارٹیوں کی ایجنسی، دونوں باتیں غلط ہیں۔ طلبہ میں سیاسی شعور ہونا چاہئے۔ طلبہ اس سیاسی شعور کا مظاہرہ اپنے مباحثوں میں اور مہذب احتجاج کے ذریعہ سے بھی کر سکتے ہیں اساتذہ کے لیے بھی یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کر سکیں مگر اساتذہ کو سیاسی کارکن بننے کے بجائے اثر (INFLUENCE) ہونا چاہئے اور طلبہ کو سیاسی مداریوں کی کٹھ پتلی کے بجائے ایسی فصل جس پر کاٹنے

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱ پر)

... مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57
Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone-29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم اور اردو

پہلی اور دوسری فروری کو بنارس میں ہندی کے علاقوں کے وائس چانسلروں کی کانفرنس ہوئی جس میں اترپردیش کی یونی ورسٹیوں کے علاوہ بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ اور مرکزی وزارت تعلیم کے نمائندے شامل تھے۔ اس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ پانچ سے دس سال کے اندر علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کی تمام منزلوں تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور انجینئرنگ، میڈیسن، قانون اور زراعت میں بھی پہلی ڈگری کے لیے ہندی ۱۹۷۳ تک استعمال کی جائے۔ اس کانفرنس نے تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو مجموعی طور پر سراہا اور اس پر زور دیا کہ علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے تعلیم کے معیار کو اور بہتر بنایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے پروگرام کی سفارش کی جس کے ذریعہ سے اساتذہ کی تربیت، معیاری ادب کی تیاری، حوالے کی کتابوں کی تیاری اور ایسے ہی اہم کام ضرورت کے مطابق ہو سکیں

اس وقت صورت یہ ہے کہ علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دینے کے اصول سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہے۔ اوّل تو ماہرین یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے کو خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور مناسب تیاری اور معیار کی نگرانی کے بعد تبدیلی کرنی چاہیے، خواہ مخواہ سیاسی فائدے حاصل کرنے کے لیے جلدی نہیں کرنی چاہیے دوسرے اس کے معنی ہرگز یہ نہ ہونے چاہئیں کہ یونی ورسٹی کی منزل پر انگریزی کی تعلیم کا ایک اچھا معیار نہ ہو۔ اگر ان دونوں باتوں کی طرف سے اطمینان ہو جائے یعنی اول تو تبدیلی مناسب تیاری کے بعد اور تیاری کے لیے نہ خواہ مخواہ دیر لگائی جائے نہ بلا وجہ جلدی کی جائے اور دوسرے ایک عالمی زبان یعنی انگریزی کو ترک کرنے کے بجائے اس میں بھی اچھی خاصی صلاحیت پر اصرار کیا جائے، تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ لوگ جو نیک نیتی سے اس تبدیلی میں بہت سے خطرے دیکھتے ہیں اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی رائے میں تبدیلی کرلیں گے۔ اس وقت دو حقائق ایسے ہیں جنھیں ہم کسی حال میں فراموش نہیں کرسکتے۔ اول تو ستر میں سے پینتیس یونی ورسٹیوں میں علاقائی زبانیں ذریعہ تعلیم ہیں اور پہلی ڈگری کے لیے علاقائی زبانوں کو ذریعہ بنانے کا کام بڑی حد تک عمل میں آگیا ہے۔ دوسرے مجموعی طور پر انگریزی کا معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ عام طور پر یونی ورسٹیوں کے گریجویٹ انگریزی میں لٹریچر سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے جس طرح اٹھانا چاہیے۔ اس لیے محض معیار دوں کا نام لے کر یا ملک کی یک جہتی کی دہائی دے کر، انگریزی کے ذریعہ سے موجودہ حالات کو چلانا کسی طرح ملک کی خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک طرف مناسب تیاری کے بعد علاقائی زبانوں میں اچھی، معنی خیز اور ذہن کو بیدار کرنے والی تعلیم دینا اور ساتھ ہی ساتھ یونی ورسٹیوں کے طلبہ کے لیے انگریزی کے ایک اچھے معیار پر اصرار کرنا ہر طرح موزوں اور مناسب ہوگا۔ پھر طلبہ اور اساتذہ میں جو خلیج حائل ہوتی جارہی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تدریس اس زبان میں ہوتی ہے جو طلبہ اور اساتذہ میں پورا ذہنی اشتراک نہیں ہونے دیتی، استاد طالب علم کی تمام تر توجہ حاصل نہیں کرسکتا اور طالب علم کو معلومات حاصل کرتا ہے مگر یہ معلومات اس کے لیے کوئی کیفیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے طلبہ کی فکر کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ ان کی تدریس کا کام علاقائی زبانوں میں ہو

اس سلسلے میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بھی اہمیت اختیار کرلیتا ہے اردو میں اعلیٰ تعلیم کا تجربہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے ذریعہ سے کامیاب ہو چکا ہے آج بھی ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دی جارہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ عثمانیہ یونی ورسٹی اور جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد کو جلد سے جلد اس سلسلے میں مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ تعلیمی کمیشن نے اردو کے لیے دو ایسے اعلیٰ تعلیم کے مراکز کی سفارش کی ہے جو اساتذہ کی تربیت اور کتابوں کی تیاری کا کام کریں اور یہ بھی کہا ہے کہ ایک مرکز شمالی ہند میں اور ایک جنوبی ہند میں ہونا چاہیے۔ مرکزی وزیر تعلیم نے کچھ عرصہ ہوا اعلان کیا تھا کہ ہر زبان میں کتابیں تیار کرنے اور اساتذہ کی

[illegible] ایک کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اب اردو کے لیے دو مرکز قائم کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ علمی اصطلاحات کا مسئلہ، کتابوں کی تیاری، پھر ان کتابوں کی طباعت، اساتذہ کی تیاری۔ یہ کام خاصی محنت اور وقت چاہتے ہیں اس لیے مرکزی وزارت کو چاہیے کہ وہ اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے جلد سے جلد علی گڑھ یا کسی اور موزوں جگہ ایک مرکز شمال میں اور دوسرا مرکز حیدرآباد میں قائم کرنے کی تجویز پر غور کرے۔ ریاستی حکومتیں اپنی اپنی ریاستی زبان کے لیے خود مناسب تیاری کریں گی مگر اردو کے لیے اقدامات مرکزی حکومت کو کرنے ہوں گے۔ اس لئے اب اس کام میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ، جموں و کشمیر یونی ورسٹی اور عثمانیہ یونی ورسٹی کو بھی سوچنا چاہیے کہ وہ اردو میں اپنی پہلی ڈگری دینے کے لیے کب سے قدم اٹھا سکتی ہیں اور اس کے لیے انھیں کتنی تیاری اور کتنے وسائل کی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ادارے اگر پہل کریں تو مرکزی حکومت بھی جلد قدم اٹھا سکے گی اس وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں اپنی منزل متعین کر لینی چاہیے اور اس کے بعد اس منزل تک پہنچنے کے لیے مناسب انتظامات شروع کر دینے چاہئیں۔

گورکھپور یونی ورسٹی میں جشنِ غالب کی تقریبات کے لیے کمیٹی کا قیام

گورکھپور۔ گورکھپور یونیورسٹی کے تمام شعبوں کے سربراہوں کا ایک جلسہ حال ہی میں وائس چانسلر جناب مدن موہن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جشن غالب منانے کے لیے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر آر۔ بی۔ بہادر ڈین فیکلٹی آف اگریکلچر ہوں گے کمیٹی کے دیگر ممبران کے نام یہ ہیں

۱۔ پروفیسر ایس۔ پی میسرا ڈین فیکلٹی آف آرٹس
۲۔ ڈاکٹر ہری شنکر سریواستوا۔ صدر شعبۂ تاریخ۔
۳۔ جناب جتیندر کمار، صدر شعبۂ فائن آرٹس۔
۴۔ ڈاکٹر محمود الٰہی، صدر شعبۂ اردو۔

کمیٹی میں یہ طے کیا گیا ہے کہ غالب کی صد سالہ تقریبات شایانِ شان طور پر منائی جائیں گی۔

اخترؔ نعلی

"موج"

ایک آنچل ہوا میں لہرا کر
آرزوؤں کے پھول بکھرا کر
دل کو چھوتا ہوا گزر بھی گیا
نکہتیں جاگ اٹھیں جدھر بھی گیا
جھوم کر اک ادا سے لہرا کر
جانے جانے مرے قریب آ کر
رک گئی ایک موج خوشبو کی
اتنی سرکش کہ راہ روک ہی لی
شوخ ایسی کہ ساتھ ساتھ اپنے
لے گئی دور تک اڑا کے مجھے
کیف زا وادیوں میں چھوڑ آئی
میں انھیں وادیوں میں گم ہوں ابھی!

"مخدوم ایک مطالعہ" کی اشاعت

اردو کے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی حیات، شخصیت اور شاعری پر جناب داؤد اشرف ایم اے (اردو) جامعہ عثمانیہ کی کتاب "مخدوم ایک مطالعہ" شائع ہو چکی ہے جناب داؤد اشرف نے ایم۔ اے (اردو) کے امتحان کے لیے مخدوم صاحب کی شخصیت، سیرت اور فکر و فن پر جو مقالہ تیار کیا تھا اسے نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے اس کتاب سے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے اشاعتی پروگرام کا بھی آغاز ہو رہا ہے۔

مغربی بنگال میں جشن غالب کی تیاری

کل اورینٹل چیمبر آف کامرس کے صدر جناب جی ایم طاہر کے ایما پر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی مغربی بنگال میں تیاریوں کے سلسلے میں غور کرنے کے لیے کلکتہ کے نمائندہ ادیبوں، شاعروں اور دیگر مقتدر ہستیوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ضروری امور کی انجام دہی کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی کی ضرورت پر غور کیا گیا جس میں غالب کی صد سالہ برسی کے جشن کی تیاریوں سے متعلق مرکزی کمیٹی کی جو ہدایات تھیں ان کے بعض گوشوں پر اعتراضات کی وجہ سے فیصلہ کیا گیا کہ پہلے ان باتوں کی مرکز سے وضاحت طلب کی جائے۔ اس سلسلے میں تمام معاملات طے کرنے کی غرض سے پانچ افراد جی ایم طاہر، سالک لکھنوی، عبدالمجید [illegible] کلکتہ کارپوریشن [illegible] صاحبان پر مشتمل [illegible]۔

مشہور صحافی پریم چند ورما کی اپیل

مشہور صحافی جناب پریم چند ورما جو ہماچل پردیش سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں انھوں نے ایک خط کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ وہ ملک بھر میں صحافت کے سلسلہ میں جو دشواریاں ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل باتوں کے بارے میں لوگوں کی تجاویز مانگی ہیں۔ ۱۔ گورنمنٹ کی اشتہار دینے کی پالیسی کے بارے میں۔ ۲۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف شعبوں کی پالیسی پر تجاویز۔ ۳۔ صحافت، صحافیوں اور ٹاٹا کمیشن کے بارے میں تجاویز۔ تجاویز اس پتہ پر بھیجی جائیں۔

جناب پریم چند ورما ایم پی ۸ [illegible] نئی دہلی

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہونے کے ساتھ ساتھ نظم کی سب سے جامع قسم بھی ہے اس میں شاعری کے تمام اصناف اپنی پوری خوبیوں اور محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں بقول جلال الدین جعفری "اس میں غزل کا سوز و گداز، معاملہ بندی، لگاوٹ اور گھلاوٹ قصیدے کی تشبیب کی رنگارنگی، شان و شوکت اور دھوم دھام، نظم کا تسلسل بیان، مرثیے کا غم و الم، رزم کی ہنگامہ آرائی اور ساقی نامہ کی سرمستی ان سب کے اوصاف کا اجتماع پایا جاتا ہے" نظم کی ان خصوصیات کے علاوہ ہند کی محبوب طرز داستان گوئی کا انداز بھی ملتا ہے یعنی مثنوی میں نظم کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک کہانی کا پورا پلاٹ اپنے جملہ خصائص کے لحاظ سے ہونا ضروری ہے

اردو میں پہلی بار مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے مثنوی کی قدر و قیمت جانچنے اور پرکھنے کے لیے کچھ اصول مرتب کئے، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے مثنویوں کا جائزہ لینے کے لیے ان خصوصیات کو پیش نظر رکھا جو شاہنامہ فردوسی میں پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں مثنوی کے لیے ضروری خصائص انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

زبان

مثنوی کے لیے زبان میں سادگی، بے ساختگی اور روانی ہونا انتہائی ضروری ہے پھر زبان میں جس قدر فصاحت، بلاغت، شیرینی، اور برجستگی ہوگی اسی قدر مثنوی پاکیزہ اور معروف ہوگی ساتھ ہی ساتھ زبان کو روزمرہ اور محاورات سے بھی مزین ہونا لازمی ہے

تسلسل اور انداز بیان

مثنوی چونکہ ایک مسلسل اور توصیفی صنف سخن ہے اس لیے بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی ہونا چاہئے کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے، نہ تو درمیان میں جھول پیدا ہو اور نہ کلام بے ربط ہونے پائے۔ اگر کسی مثنوی میں تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا تو اس کا درجہ گر جائے گا۔ انداز بیان میں گھلاوٹ اور نرمی، رسیلاپن، آمد اور سوز و گداز کا ہونا لازمی ہے جہاں موقع محل ہو وہاں طنز و مزاح شوخی و شرارت، متانت اور سنجیدگی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔

موضوع اور پلاٹ

شاعر کے ذہن میں موضوع واضح ہونا چاہئے تاکہ اس کی مدد سے جو پلاٹ تیار کیا جائے وہ شاندار اور ہر طرح سے مکمل ہو۔ بنیادی خیال میں پیچیدگی اور ابہام نہ پیدا ہو اگر خامی پیدا ہوگئی تو مثنوی کبھی اپنی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتی

مشاہدہ

پلاٹ کی تیاری کے لیے شاعر کا مشاہدہ وسیع ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اہم جزئیات پر آسانی سے نظر کر سکے۔

واقعہ نگاری

مثنوی میں واقعہ نگاری سے یہ مراد ہے کہ جس واقعہ کا بیان ہو اس کی اصل اور صحیح تصویر ذہن میں ابھر آئے۔ واقعہ نگاری میں جزئیات پر بھی متوجہ ہونا ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات معمولی اور جزوی بات سے بھی واقعہ کی تصویر اس طرح کھنچ جاتی ہے کہ بڑے سے بڑے واقعات کے ادا کرنے سے بھی نہیں کھنچ سکتی پھر یہ بھی لازمی ہے کہ مثنوی میں جو واقعہ بیان کیا جائے وہ دوسرے واقعہ کی تکذیب نہ کرے اور ایک بیان دوسرے بیان کے منافی نہ ہو۔

جس طرح یہ ضروری ہے کہ جن باتوں کو بنیاد بنا کر قصہ ترتیب دیا گیا ہے وہ صفائی اور صراحت کے ساتھ بیان کر دی جائیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ باتیں جو کھل کر نہیں کہی جا سکتیں وہ رمز و کنایہ میں بیان کی جائیں مثلاً شرم و حجاب اور اختلاط وغیرہ کے ذکر میں یہ احتیاط لازم ہے۔

منظر نگاری

مثنوی میں مختلف قسم کے واقعات کی رو سے متعدد قسم کے مناظر رسوم اور تقریبات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی منظر کشی کی جائے وہ بیّن اور فطری ہو، جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ صحیح اور نیچر اور عادت کے موافق ہو

کردار نگاری

مثنوی میں متعدد قسم کے کردار آتے ہیں اور بہت سے طبقوں کے لوگوں کا ذکر ہوتا ہے مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، عالم و جاہل عابد اور پارسا وغیرہم چنانچہ شاعر کا ایک اہم اور معیاری فرض ہے کہ وہ ان سب کے اخلاق و عادات، حرکات و سکنات کو اس کی امتیازی شان اور خصوصیات کے ساتھ بیان کرے اگر ایک کردار شاہانہ دکھایا گیا ہے تو اس کی گفتگو کبھی ایسی نہ ہو جو عادت ہوں گے رتبہ اور مرتبہ سے گری ہوئی ہو اس کے اطوار سے ہمیشہ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شریف عادل، عقلمند، مردم شناس اور علم دوست ہے شجاع اور اس کا دھنی ہے اگر ملازم کا کردار ہو تو اسے آداب ملازمت سے آگاہ ہونا چاہیے۔ حفظ مراتب کا لحاظ ضروری ہے جس کردار کی سیرت کی تہوں کو کرید کرید کر کام کی چیز باہر لے آنا کرداروں کے مدارج کا خیال رکھنا اور ان کو سلیقے کے ساتھ برتنا اور آخر تک نبھانا شاعر کا کمال ہے

جناب عبدالقادر صاحب سروری نے اپنی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقاء" میں مثنوی کی بڑی جامع اور مکمل تعریف کی ہے اس مضمون کو موصوف ہی کے بیان پر ختم کیا جاتا ہے

"مثنوی آرٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھی جائے تو ایک نہایت بسیط مرکب اور کسی قدر پیچیدہ صنف ہے جس کے تمام فنی زاویوں پر روشنی ڈالنے کے۔ خود لطف دہلی کا ایک بڑا حصہ تجربہ اور تشریح سے ملتا ہے۔ شاعر کا ذاتی جزو ہوتا ہے اور یہی آرٹ ہے اس لیے ایک ترقی یافتہ تمدن اور معاشرہ کے لازمی اجزا اور کے طور پر مربوط خیالی واقعات کے ارتقاء اور ایک معین مقصد پر ان کے اختتام کی حد تک قدر و منزلت رہے گی مثنوی کے طرز کی شاعری کی اہمیت گھٹ نہیں سکتی"

علی کاظمی

قاضی عبدالغفار ـ عمر اور سنِ پیدائش

قاضی صاحب کی پیدائش کے ماہ وسال کا صحیح صحیح تعیین نہیں کیا جا سکا
سلسلے میں کافی چھان بین کی گئی لیکن حرفِ آخر کی صورت میں کسی نتیجے پر نہیں
پہنچا جا سکا۔

قاضی صاحب کی بیگم اور ان کی حقیقی بہن کے بیان کے مطابق قاضی صاحب
انتقال کے وقت چھیاسٹھ سال تھی۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء
ہوا۔ اس حساب سے ان کا زمانہ پیدائش ۱۸۹۰ء کے ابتدائی ایام یا پھر
۱۸ء کا آخری زمانہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنے سفرنامے "نقشِ فرنگ" کے مقدمے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

"...... عمر کے تقریباً ۳۰ سال اسی بدنصیب ملک
میں گزارے۔ . . ."

نقشِ فرنگ کا یہ مقدمہ اپریل
۱۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے
جائے تو قاضی صاحب کا سالِ
پیدائش ۱۸۸۵ء ہو سکتا ہے۔ اپنی
دوسری تصنیف "عجیب" کے ایک
میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ
۱۹ء میں میری عمر ۳۴ سال تھی اس
حساب سے بھی سالِ پیدائش ۱۸۸۵ء
ہے۔

مولانا محمد علی پر قاضی عبدالغفار
مضمون دسمبر ۱۹۴۴ء کے اخبار
"...یت" دہلی میں شائع ہوا تھا اس
قاضی صاحب نے لکھا ہے:

"........ اب دسمبر ۱۹۱۲ء کی اس صبح کو...... یہ
وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔"

اس عبارت پر بھروسہ کیا جائے تو قاضی صاحب کا سنِ پیدائش ۱۸۹۰ء
بالکل آخری یا پھر ۱۸۹۱ء کا بالکل ابتدائی زمانہ ہو سکتا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پندرہ روزہ ترجمان "ہماری زبان" مورخہ
جنوری ۱۹۵۶ء کے مطابق قاضی صاحب کی عمر انتقال کے وقت اڑسٹھ سال
مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ مورخہ ۸ فروری ۱۹۵۶ء میں قاضی صاحب کی وفات
جو خبر شائع ہوئی اس میں بھی ان کی عمر یہی اڑسٹھ سال بتائی گئی ہے۔ اس لحاظ
قاضی صاحب کا سال پیدائش ۱۸۸۷ء کا آخر یا ۱۸۸۸ء کا ابتدائی زمانہ
قرار دیا جا سکتا ہے۔

عمر کے سلسلے میں کیونکہ خود قاضی صاحب کے اپنے بیانات میں کافی اختلاف
اور تضاد موجود ہے اس وجہ سے ان بیانات میں سے کسی بیان کو بھی حرفِ آخر
کے طور پر نہیں مانا جا سکتا۔ ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب کا "نقشِ فرنگ"
کا بیان زیادہ صحیح ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ وہ بیان خود ان کی نوعمری کے زمانے
سے زیادہ قریب ہے۔ اور پھر اس بیان کی تائید خود قاضی صاحب ہی کے ایک
مضمون مشمولہ "عجیب" سے بھی ہوتی ہے جس کی بنا پر ان کا سنِ پیدائش ۱۸۸۵ء
ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ نتیجہ نکالنے کے ساتھ ہی ساتھ خود ان کے اپنے مختلف اور متضاد
بیانات ہونے کی وجہ سے اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ہے کہ قاضی صاحب اپنی
نوعمری کے زمانے میں ہی سیاسی دنیا میں داخل ہو گئے تھے لیڈری کا ذوق وشوق
نمایاں تھا لیکن اپنے گرد وہ اپنے سے بہت زیادہ معمر اور تجربہ کار لوگوں کو دیکھتے
تھے۔ اور اپنی نوعمری کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ میدانِ سیاست میں انھیں اپنی
نوعمری کا احساس ستاتا رہا ہو۔ کیونکہ عام طور سے ہندوستانی سماج میں زندگی
کے کسی بھی شعبے میں نوعمر دہن اور نوجوان طبقے کو اکثر اہلیت ہونے کے باوجود وہ درجہ
اور مقام نہیں دیا جاتا جو اس کے مقابلے میں قابلیت یا اہلیت میں کمتر لیکن معمر
اور تجربہ کار حضرات کو دیا جا رہا ہے۔

اس روسی میں یہ بات بعید از قیاس
نہیں ہے کہ قاضی صاحب نے اس
وقت تک جانے کی حد تک اپنی عمر
کچھ بڑھا کر بتائی ہو۔

لیکن اس چیز سے قطع نظر اگر ہم "نقشِ
فرنگ" اور "عجیب" کے بیان کو صحیح مان
بھی لیں تو پھر بعد والے بیانات سے
پیدا ہونے والے تضاد کی وجہ معلوم
کرنا ہوگی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ قاضی صاحب
کے بعد والے بیانات سے ان کی عمر
میں تقریباً پانچ سال کا عرصہ کم ہو جاتا
ہے۔ یہاں نفسیات کے اس پہلو کو نظر میں
رکھنا ہوگا کہ انسان جیسے جیسے اپنی عمر کی آخری منازل طے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے
اسے اپنی بڑھتی یا گذرتی ہوئی عمر کا احساس ستانے لگتا ہے۔ اس احساس کے ردِ عمل
کے طور پر وہ خود اپنی ذہنی و قلبی تسکین کی خاطر اپنے دوست احباب میں اپنی عمر کم
سے کم کر کے بتانے کی کوشش کرتا ہے اس طرح وقتی طور پر وہ حقیقت سے فرار
و گریز اختیار کر کے اپنے لیے کچھ سکونِ قلب کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں بھی بعد والے بیانات میں یہی نفسیاتی جذبہ کارفرما
رہا ہو اس لیے ان میں سے کسی بھی بیان کو بنیاد مان کر قاضی صاحب کے سنِ
پیدائش کے تعین کے سلسلے میں حقیقتِ حال کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔

اس صورت کے پیشِ نظر اب لے دے کے صرف ایک ذریعہ اور باقی رہ
جاتا ہے۔ اور وہ ہے قاضی صاحب کا مڈل اسکول کا سارٹیفکٹ یہ سارٹیفکٹ
مذکورہ بالا بیانات میں سے کسی کی بھی تائید نہیں کرتا۔ اس سارٹیفکٹ کے مطابق
جنوری ۱۹۰۲ء میں یعنی مڈل کا امتحان دینے کے وقت قاضی عبدالغفار
کی عمر بارہ سال گیارہ ماہ تھی۔ تاریخ پیدائش اس میں بھی درج نہیں ہے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

رضی الدین احمد آباد

غزل

مزاجِ زندگی بدل، مزاجِ شاعری بدل
جنوں کا ہاتھ تھام کر خرد کے ساتھ ساتھ چل
نہ ذکرِ ساز و نغمہ کر، نہ شغلِ دورِ جام کر
فقط یہ سوچ کیوں ہے رقصِ قتلِ عام آج کل
صنم کدوں کو بھول جا، حرم کا نام بھی بدل
نئی فضا تلاش کر، نئی ہواؤں میں مچل
جدید حسِ آگہی، جدید طرزِ زندگی
یہی ہے یادگار تھا، اسی ادا کے ساتھ چل

سیماب۔ اور۔ داغ کی شاگردی

ہماری زبان مورخہ ۸ر جنوری ۶۸ء میں جناب مناظر عاشق صاحب نے جناب دیرینہ پرتاد سکینہ کے اس شک کو رفع کیا ہے کہ علامہ سیماب داغ کے شاگرد نہیں تھے

اس سلسلے میں حضرت سیماب کی لکھی ہوئی کتابوں اور تذکروں کے حوالے دیتے ہوئے بتایا ہے کہ علامہ مرحوم نے متعدد جگہ خود تحریر فرمایا ہے جن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ داغ کے شاگرد تھے۔

میں مناظر عاشق صاحب کی تمام تصدیقوں کی تائید کرتے ہوئے یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ علاوہ علامہ سیماب کے دوسرے ممتاز تلامذۂ داغ نے بھی متعدد مقامات پر اس کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ داغ کا ممتاز اور نمایاں شاگرد تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے میں صرف دو بزرگوں کے مضامین کے اقتباسات حوالوں کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

مولانا حضرت احسن مارہروی مرحوم نے کارواں ۳۷ء میں جو شاعر آگرہ کا خاص نمبر ہے ایک مضمون لکھا ہے بعنوان "داغ کے درین"

اس میں سیماب صاحب کو داغ کے وارثوں میں شمار کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے ؎

" ۱۸۹۸ء میں آپ کو جناب استاد سے بذریعہ خط وکتابت شرف تلمذ حاصل ہوا آپ تمام تلامذۂ فصیح الملک میں ایسے فرد وحید ہیں کہ عارف مدت سے شعر وسخن میں اپنا پورا وقت صرف کرتے ہیں؛

اسی کارواں میں مذکور ابوالمعظم نواب حضرت سائل دہلوی مرحوم (داماد حضرت داغ) اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ؎

"مسند نشین قصر الادب دار الخلافہ اکبرآباد عاشق حسین سیماب تخلص بہترین تلامذہ دیادگار رہبان استاد نواب فصیح الملک داغ دہلوی ہے؛

" بہت سی تعریفوں کے بعد خاتمے پر فرماتے ہیں ؎

"اس کی ذات سے مجھے استوار علاقہ ہے وہ میرا قوت بازو ہے ہنرمند ہے محاسن ادب میں بے مثل ہے جدت بلند طبیعت فطرت سے لے کر پیدا ہوا ہے اپنے استاد بھائیوں کے لیے مایۂ نازش وافتخار ہے ہم سب کا اعتبار۔ اقتدار بڑھانے کے لیے ہمارا ہم مسلک خدمت نے اسے کر دیا ہے میں سیماب بھائی کو معزز خطاب جانشین داغ دیتا ہوں جس کا حق مجھے حاصل ہے کہ میں جہاں استاد فصیح الملک کے سلسلۂ تلامذہ میں وہ منصب رکھتا ہوں جو ان کے کسی شاگرد کو میسر نہیں (یعنی وہ داماد بھی تھے)۔"

یہ دونوں ہستیاں کس پایہ کی تھیں اور ان کی تحقیق و اسناد کیا مرتبہ [illegible] اس پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا البتہ مزید تائید یا ضیافت [illegible] ایک [illegible] غزل کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

شعر سیماب ؎

قیامت خیز نالوں میں عجب عالم نکلتا ہے کہ وہ بے تاب ہو جاتا ہے جس پر دم نکلتا ہے

اصلاح داغ ؎

قیامت خیز نالوں میں مرے عالم نکلتا ہے الٰہی اس کے دم کی خیر جس پر دم نکلتا ہے

شعر سیماب ؎

گرفتاری ہیں اب بہاری موسم گل میں شہیدوں کا نزے کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

اصلاح داغ

گرفتاری ہیں ابر بہاری موسم گل میں شہید ناز کا کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(شفا گوالیاری)

یک نگاہے

ہماری زبان مورخہ یکم جنوری ۶۸ء کے دوسرے صفحہ پر بشیر انور کی نظم "نیا سال" شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم ہیئتی اعتبار سے آزاد ہے۔ اس میں کسی بحر کی پابندی تو نہیں کی گئی ہے تاہم وزن کی پابندی پورے طور سے نمایاں ہے اس کے مصرعے بحر متقارب کے رکن "فعولن" کے رشتہ میں پروئے گئے ہیں۔

زیر نظر نظم کا یہ مصرع۔ قحط، بھوک، بیماری، جنگ، حادثے، غلامی نزاع، اور افلاس کے۔ وزن کی پابندی نہ کر سکا اگر لفظ "قحط" کو بہ حرکت "ح" پڑھا جائے تو موزوں ہو جائے گا لیکن قحط (بحرکت حائے حطی) صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قحط میں "ح" ساکن ہے متحرک نہیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ اسے بشیر انور نے غلط کیوں نظم کیا جب کہ عام طور پر ہر پڑھا لکھا انسان اپنی بول چال میں قحط کو "ح" کے سکون کے ساتھ استعمال کرتا ہے علاوہ اس کے کوئی دوسری بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بشیر انور صاحب اس لفظ کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی نظم کو ہماری زبان کے اڈیٹر صاحب نے اپنے موقر اخبار میں جگہ کیوں دی؟

اس قسم کی لغزشیں شعرائے ماسلف کے یہاں پائی جاتی ہیں لیکن شاذ و نادر مگر موجودہ عہد کا ادب اس کاری طرح شکار ہو گیا ہے اس بہتات کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ہمارے صاحب نظر شعرا کی بے توجہی اور دوسرے یہ کہ ایسے شعرا کی ادبی خدمت جنھیں در اصل ادب کی خدمت نہیں کرنی چاہیے۔

(شبیب علی حسین)

جواب استفسار

ہماری زبان یکم دسمبر ۱۹۶۷ء میں حضرت ثاقب صدیقی کا استفسار کہ شور واحدی کی غزل کس وزن پر ہے اور وہ وزن کس بحر کا ہے؟ ایک سوچی سمجھی مصلحت کی بنا پر ہے۔ ثاقب صاحب کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غزل بحر سے خارج ہے جیسا کہ برق صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ میرے خیال میں ان کا منشا یہ ہے کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے ضرور۔ وہ اس قسم کی چٹکیاں جو فن کے نقدان دیکھ کر لیتے ہیں جو فن سے بیگانگی کا یہ عالم دیکھ کر [illegible]

کے شمارے میں چار حضرات نے نشور صاحب کی غزل کا وزن بحر ہزج مثمن مقبوض اشتر تجویز فرمایا ہے اور یہ نہ سوچا کہ رکن اشتر حشو میں کس طرح دخیل ہو سکتا ہے۔ زحاف خرم مختص بصدر و ابتدا ہے اور زحاف شتر مرکب ہے خرم اور قبض سے۔

ابوالحسن اخفش بطال نے خرم کو زحافات عامہ میں داخل کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی کافی تخریبیں اس نے کی ہیں جنہیں اہل فن قبول نہیں کرتے جن نیم عروضیوں نے اس کی باتیں قبول کیں وہ انھیں مبارک ہم اس کی کوئی اختراع ماننے کے لیے تیار نہیں۔

وزن حقیقی اور غیر حقیقی کا فرق جاننے والے نشور واحدی کی غزل کو بحر ہزج میں ہرگز غوطہ نہیں دے سکتے۔

اگر ہم حضرات اربع کے وزن فاعلن مفاعلن کو بحر رجز (مستفعلن ۴) سے بذریعہ زحافات رفع و خبن اخذ کرتے ہیں تو قانون عروض ہرگز مانع نہیں کیونکہ یہ دونوں زحاف عام ہیں۔

اور اگر بحر مقتضب (معولات مستفعلن × ۲) سے بذریعہ زحافات طے و رفع فاعلات فاعلن مانے ہیں تو آئین عروض سے بالکل موزوں ہے کیونکہ یہ زحاف بھی عام ہیں۔

بحر رجز اور بحر مقتضب سے ہمیں وزن غزل دو دو زحافات سے حاصل ہوتا ہے لیکن بحر مدید (فاعلاتن فاعلن × ۲) سے جو وزن فاعلات فاعلن فاعلات فاعلن حاصل ہوتا ہے وہ صرف ایک زحاف "کف" سے ملتا ہے۔ لہذا یہی وزن اصح ہے یعنی نشور صاحب کی غزل بحر مدید مکفوف میں ہے اور کوئی حکم عروض اس کا مخالف نہیں۔

(عظیم صدیقی)

ایک دعوت فکر

مجھ سے مندرجہ ذیل غزل کے متعلق جناب شوکت عظیم صاحب نے سوال کیا کہ یہ غزل غالب کی ہے یا نہیں۔؟ اور یہ غزل الحاقی و الحاق تو نہیں۔؟ میں نے اس کے متعلق کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار کی لیکن میرے دل و دماغ میں یہ خیال گردش کرتا رہا کہ یہ غزل کس کی ہے؟ اور چند دنوں بعد میں نے اس غزل کے متعلق محققین سے دریافت کیا لیکن صد حیف کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ کچھ لوگوں نے دعویٰ بھی کیا کہ یہ غزل غالب کی ہے۔؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس غزل کو غالب سے منسوب کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا دلائل ہیں اور یہ غزل اب تک غالب کے دیوان میں کیوں شامل نہیں کی گئی۔؟

میں غالب کے نقاد اور محققین و اہل تحقیق کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ اس غزل کے متعلق جو بھی معلومات ہوں انہیں "ہماری زبان" کے ذریعہ ہم سب تک پہنچائیں۔!

"غزل"

ہر جستجو عجیب جنوں میں جستجو نہ ہو   دل تنگ وحشت ہے جو تیری آرزو نہ ہو

وہ آہ وا گئیگاں ہے نہ تم جائے جس تلک   وہ آنسو وں پہ خاک کہ جن میں لہو نہ ہو

ممکن نہیں ہے حسن حقیقت کا دیکھنا   آئینہ مجاز اگر روبرو نہ ہو

ہے کیف بادہ بیچ ہے بے رنگ گل فضول   وہ حسن کیا کہ جس میں حقیقت کی بو نہ ہو

جی بھر کے خوب حسرت و ارماں کو رو چکا   اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

غالب نماز عشق کی مقبولیت محال

جب تک کہ اپنے خون جگر سے وضو نہ ہو   (شاہد احمد صدیقی)

(یہ غزل مراسلہ نگار کو کہاں سے ملی ہے اس کا خط میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس غزل کو غالب سے کن لوگوں نے منسوب کیا ہے اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے یہ باتیں واضح ہونی چاہئیں (ادارہ)

کچھ 'میرا صفحہ' کے بارے میں

'میرا صفحہ' کے اضافہ سے ہماری زبان کی افادیت چمک اٹھی ہے اور دلچسپی دو آتشہ ہو گئی ہے یہ صفحات کو صحیفہ کا رنگ و نور عطا اور شگفتگی دلکشی عطا کرتا ہے ایسے میں اس صفحے کا کبھی کبھار بھی گم ہو جانا ذوق سلیم پر گراں گزرنے لگتا ہے۔ بڑا جالب، بڑا اجاذب، بڑا ظالم یہ صفحہ ثابت ہوا ہے۔ خدارا کسی بھی حال میں یہ صفحۂ درخشاں کو غائب نہ فرمائیے۔ للہ اس کا شمارے پر ہونا ضروری قرار دیجئے۔ علاج تشنگی داماں کے لیے۔۔۔ گو شاں رہیے۔ مگر اس صفحہ کو حیات نو بخشتے رہیے!

HONEY MOON سے متعلق جناب سید احمد خاں صاحب سے استفسار پر عرض ہے کہ شوکت تھانوی نے اس کے لیے ماہ عسل کا استعمال کیا ہے اپنے ناولوں میں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سب سے پہلے مہدی افادی نے اس کے لیے 'شب زفاف یا عہد زفاف' کا تعین کیا تھا!

اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ "ماہ عسل" زیادہ تر مدلل معلوم ہوتا ہے ہنی مون کا!! اس میں لفظی حسن بھی ہے اور معنوی حسن بھی۔ ترجمے کا ترجمہ بھی اور معنویت کی معنویت بھی سمٹ کر آگئی ہے اس طرح ایجاز کا ایجاز بھی اور اعجاز کا اعجاز بھی۔ اپنی اپنی بہار دکھا رہا ہے یہاں!!

SNOW' شو کیسے اردو میں کیا بدل لائیں گے؟ مثلاً "بجلی گھر" کا کیا ترجمہ کریں گے؟ احباب زبان سے گزارش ہے کہ اس پر روشنی ڈالیں!!

(عبد الخالق)

انجمن ترقی اردو شاخ اکولہ (مہاراشٹر) کا جلسہ

۱۰ جنوری ۱۹۶۸ کو عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اکولہ میں انجمن ترقی اردو اکولہ کی جنرل باڈی کا جلسہ چار بجے سہ پہر زیر صدارت جناب خاں محمد اصغر حسین ایڈوکیٹ ممبر پارلیمنٹ منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل تجاویز بہ اتفاق آرا پاس ہوئیں۔

تجویز نمبر ۱:- چونکہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم بذریعہ علاقائی زبان ہوگی اس لیے یہ جلسہ درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کو مڈل اور ہائی اسکولوں میں انگریزی اور اردو کے علاوہ سہ لسانی فارمولے کے مطابق مراٹھی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلے بھی ضلع پریشد کے حکام سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے اس پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن ابھی تک کسی ہائی اسکول اور مڈل اسکولوں میں مراٹھی کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوا خصوصاً گورنمنٹ ملٹی پرپز ہائی اسکول اکولہ اور گورنمنٹ آر۔ یو۔ ای۔ ایم اسکول اکولہ میں ابھی مراٹھی کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ یہ جلسہ ضلع پریشد اکولہ کے حکام سے دوبارہ درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کے لیے کم از کم پانچویں جماعت سے ثانوی اسکولوں میں مراٹھی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

تجویز نمبر ۲:- گذشتہ سال ناگپور یونیورسٹی سے الحاق کرنے پر کالجوں میں اردو کی تعلیم کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اندیشہ ہے کہ آئندہ ناگپور یونیورسٹی کالجوں میں اردو کی تعلیم کو جاری نہ رکھے اس قسم کا اندیشہ پریس میں بھی ظاہر کیا گیا ہے لہٰذا یہ جلسہ ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کو بی۔ اے اور ایم۔ اے تک اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی جائے اور آئندہ ایسے حالات نہ پیدا کیے جائیں جیسے گذشتہ سال علاقائی انجمن ترقی اردو ودربھ کو ایجی ٹیشن کرنے پر مجبور کیا۔

بعد ازاں علاقائی انجمن ترقی اردو ودربھ کی ہدایت کے مطابق عہدہ داران کا انتخاب کیا گیا تمام عہدیدار تحریک و تائید کے بعد بہ اتفاق آرا منتخب ہوئے۔

(۱) صدر:- جناب خان محمد اصغر حسین ایڈوکیٹ و ممبر پارلیمنٹ اکولہ
(۲) نائب صدر:- جناب قاضی محمد علی صاحب ایڈوکیٹ۔ اکولہ
(۳) " :- جناب رام رنگ صاحب آمر مالک پنجاب کشمیر ہوٹل اکولہ
(۴) سکریٹری:- جناب شبیر احمد صاحب شہید ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اکولہ
(۵) نائب سکریٹری:- جناب سید علی حسن شہید حسینی پروپرائٹر ناولٹی اسٹورس محمد علی روڈ۔ اکولہ
(۶) نائب سکریٹری:- جناب مان خان صاحب آرزو۔ اکولہ
(۷) خازن:- جناب خواجہ ابراہیم صاحب عثمان آزاد اردو ہائی اسکول۔ اکولہ
(۸) رکن مجلس منتظمہ:- جناب محمد اسمٰعیل صاحب ٹیلر ماسٹر اکولہ
(۹) " :- جناب محبوب خاں صاحب رونق اکولہ
(۱۰) " :- جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب اکولہ
(۱۱) " :- جناب حکیم ڈاکٹر ٹھاکر پرتاب سنگھ صاحب اکولہ
(۱۲) " :- جناب محمد ابراہیم صاحب نسیل وکیل اکولہ
(۱۳) " :- جناب عبدالرحمٰن صاحب سیاز اکولہ
(۱۴) " :- جناب سید مظفر علی صاحب میونسپل ممبر اکولہ
(۱۵) " :- جناب محسن انصاری صاحب ٹیچر اکولہ

(شبیر احمد شہید سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ اکولہ)

"نئے نام" کے فنکاروں کے ساتھ ایک شام

موجودہ ادبی میلانات پروفیسر آل احمد سرور کی نظر میں

حیدرآباد ۱۶ جنوری پروفیسر آل احمد سرور نے لیگ آف ڈیموکریٹک یوتھ اعظم پورہ کے زیر اہتمام "نئے نام کے فنکاروں کے ساتھ ایک شام" میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان اس اعتبار سے فال نیک ہے کہ اس نے اردو کے ادیبوں کو اپنی ذات اور اپنے اندر کے آدمی کو ٹٹولنے کا سلیقہ عطا کیا۔ اب وہ ملنگے تلنگے کی عینک سے زندگی کے خدوخال کو دیکھنے کی بجائے اپنی نظر پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کر رہا ہے۔ ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک جامع ادبی تحریک ازحد مناسب نہیں ہوتا پروفیسر سرور نے جدید ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ صرف بندھے ٹکے معیارِ حسن سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ اس بات کی تلاش کر لی چاہیے کہ شاعر یا ادیب کا معیارِ حسن کیا ہے؟ پکاسو کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بدصورتی میں بھی حسن کی تلاش ممکن ہے لیکن اس کے لیے بڑی ہی باریک بیں نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فنکار قدیم روایات میں عصرِ حاضر کی وسعتوں کو سمونے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں تو انھیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ نئی روایات اور اقدار وضع کریں کسی بھی نئے تجربے کی حوصلہ شکنی نقادوں کو زیب نہیں دیتی۔

اس ادبی اجتماع کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی۔ "نئے نام" کے فنکاروں میں شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، تاج مہجور، احمد ہمیش، رؤف خلش، احسن زبیر، اکمل حیدرآبادی اور دلاور جلیل اس اجتماع میں شریک تھے۔ ابتدا میں یوتھ لیگ کے معتمد عمومی باسط شریف نے خیرمقدمی تقریر میں "نئے نام" کی اشاعت اور اس کے جموں و کشمیر یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیے جانے پر اس میں شامل تمام شاعروں اور اس کتاب کے ترتیب کار شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد کو مبارکباد پیش کی۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے جدید شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جدیدیت کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک مخصوص لب و لہجہ کا نام ہے "نئے نام"

اعروں میں یہی تیکھا لب ولہجہ ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے
نے الفاظ کے صحیح استعمال سے ان کے مطالب ومعانی کو وسعت
ہے۔ سطحی طور سے اس شاعری پر ابہام یا اہمال کا الزام لگا دینا
ی بات ہے۔ معنی صاحب نے کہا کہ "نئے نام" کے تمام شاعروں میں
ایک شاعر اقتدار حالب کی شاعری پر اگر مبہم یا مہمل ہونے کا شبہ ظاہر
ہے تو وہ اس بات کو کسی حد تک مان لینے کو تیار ہیں۔

محترمہ صفیہ اریب نے اپنے مضمون میں اس بات پر تشویش کا اظہار
رمدیت کے حامی اپنی ہی ذات میں کچھ اس طرح کھو گئے ہیں کہ انھیں
زہی نظر نہیں آ رہی ہے۔ یہ رویہ یک طرفہ ہے۔ ترقی پسند ادیبوں
ں ایک ہی سیاسی نقطہ نظر کی نمائندگی کی تھی اور اس طرح زندگی
کھ درد کی بھرپور عکاسی کے لیے ان کے فن میں کوئی گنجائش نہیں
ں تھی۔ جدیدیت کا رجحان اس رویہ کا شدید رد عمل ہے۔ ڈاکٹر
مین خاں نے "نئے نام" کے بارے میں کہا کہ ان ناموں میں بعض متشاعروں
م بھی شامل ہیں۔ انھوں نے جدیدیت میں کہیں کہیں روایات سے مکمل
کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے "نئے نام" کے شاعروں
ہ دیا کہ وہ تجربات کی دوڑ میں اپنی شہرت ومقبولیت کی حدود جلد سے
کریں۔ اور زمانہ کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ افکار ۔
کو سمجھ سکے۔

اس ادبی اجتماع کا اختتام ایک مسلسل نظم "کوئی رہوار" سلیمان اریب
ت میں ترتیب دی گئی۔ اس مسلسل نظم میں "نئے نام" کے موجود شاعروں کے
سلیمان اریب، حکیم یوسف حسین خاں، معنی تبسم، انور معظم، حیات متین
عابد، برق توسی، رحمان جامی، علی اصغر، علی الدین نوید اور محترمہ
مدیرے اپنی نظمیں سنائیں۔

ی ودیا پیٹھ وارانسی میں اردو تعلیم کی اجازت

انجمن ترقی اردو بنارس کا ایک وفد مالو کرشن موہن صاحب
ٹ، مولوی حبیب اللہ صاحب ایڈوکیٹ، مولوی محمد ادریس
، ایڈوکیٹ، بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب لکچرار، مولانا احمد مکرم اعظمی
، ڈاکٹر رمضان علی صاحب، منشی داتا رسول صاحب پر مشتمل بتاریخ
ری ۱۹۷۰ء عالی جناب بابو راجا رام شاستری صاحب وائس چانسلر
ودیا پیٹھ وارانسی سے ملا اور ان کی خدمت میں ایک یادداشت
اجرائے تعلیم اردو پیش کی۔

صاحب ممدوح نے نہایت خندہ پیشانی وہمدردی کے ساتھ یادداشت
ں باتوں کو سنا اور وفد کے خیال وتجویز کو سراہا اور فرمایا کہ اردو
ملک کی قومی زبان ہے۔ وائس چانسلر صاحب موصوف نے وفد کو
ہ کاشی ودیا پیٹھ میں فارسی کی تعلیم کی اجازت دی جا چکی ہے اور
نے وفد کو یقین دلایا کہ اردو کی تعلیم کے لیے نوٹس فوراً لگا دی
جائے گی۔ کہ جو طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں وہ اردو پڑھ سکتے ہیں۔
اراکین وفد نے اس کے لیے جناب وائس چانسلر موصوف

کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

(داتا رسول سکریٹری شعبۂ تعلیم انجمن ترقی اردو بنارس)

انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی میں
یوم جمہوریت پر خصوصی شعری نشست

علی گڑھ ۲۶ جنوری۔ سالہائے ماسبق کی طرح امسال بھی یوم جمہوریت
کے موقع پر انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ایک
شعری نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور
نے کی۔

یوم جمہوریت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر جلسہ پروفیسر
آل احمد سرور نے فرمایا کہ ہم ہر سال شعر وسخن کی اس خصوصی نشست کے
ذریعہ جمہوریت سیکولرازم اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر اپنے ایمان کو
تازہ کرتے ہیں اور جمہوری قدروں کے استحکام کے لیے نئے سرے سے
اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔

اردو کے بڑے شاعر فراق گورکھپوری کو پدم بھوشن کے اعزاز
پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سرور صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑی خوشی
کی بات ہے کہ حکومت ادیبوں دانشوروں اور فنکاروں کی طرف توجہ
دے رہی ہے اور ان کی قدر کر رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ فراق صاحب
کے علاوہ اس سال جن دوسری زبانوں کے فنکاروں اور ادیبوں کو
اعزازات ملے ہیں میں ان سب کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اس نشست میں جناب پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی،
خواجہ مسعود علی ذوقی، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر وارث کرمانی، شہریار، زاہدہ
زیدی صاحبہ، ساجدہ زیدی صاحبہ، ڈاکٹر رشید رہبر، مسز زیتون عمر،
ڈاکٹر عشرت حسن انور، سید بدر صبا جائسی، ذکاء الدین شایاں، امیر
عارف، نجمہ محمود، شمسی طہرانی، انور جلال پوری اور باقر زیدی نے اپنا
منتخب کلام سنایا۔

انجمن ترقی اردو ہوشیار پور میں بزم مشاعرہ

ہوشیار پور۔ ۱۵ جنوری۔ انجمن ترقی اردو پنجاب "ہوشیار پور" کے
اہتمام سے ایک مشاعرہ جناب ڈی۔ ایل گیا تمس پی۔ سی۔ ایس۔ مجسٹریٹ
درجہ اوّل کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض اردو کے
نامور شاعر جناب امیر چند قیس جالندھری نے ادا کیے۔

مقامی شعرا میں پرنسپل سالک، پروفیسر ہری میتر برق، جناب مہر گرگ،
جناب اوناش چند رشید، جناب سمن کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔
شملہ سے ارمان صاحب پٹھان کوٹ سے اسید صاحب اور جموں
سے سرکش صاحب نے شرکت کی۔

پنجابی زبان کے مشہور ترقی پسند شاعر جناب جوگندر اور ہندی کے شعرا
پروفیسر بھارد واج اور ڈاکٹر اوم پرکاش شرما نے بھی اپنا کلام سنایا۔

منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ اکیس جنوری ۶۸ء کو منایا گیا۔ اس مشاعرہ میں تقریباً تمام مقامی شعرا موجود تھے۔ شعرا حضرات اور سامعین میں شاعر ملک کی ایک کتاب تقسیم کی گئی۔ مشاعرہ کی کامیابی میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب، پروفیسر نیاز احمد خاں صاحب، پروفیسر فخر الدین اثر صدیقی، پروفیسر مجیب الرحمٰن عرفی، پروفیسر محمد امین صاحب اور پروفیسر منظر حسن صاحب کی کوششیں قابل ستائش ہے انچارج مشاعرہ پروفیسر ستار شاہدی صاحب اور پروفیسر ایم۔ ان ہاشمی صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اردو لٹریری سوسائٹی جنرل سکریٹری انیس الرحمٰن صاحب کا مشاعرہ کی کامیابی میں بڑا حصہ ہے۔

(ایم۔ اے نصر کلکتہ)

صدر انجمن ترقی اردو شاخ بہار کی اپیل

پٹنہ:۔ غلام سرور صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اپنی انجمن کی تمام شاخوں نیز بہار کے تمام محبانِ اردو کے نام اپنی ایک پرزور اپیل میں کہا ہے کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ جنوری کا مہینہ ہے تعلیمی اداروں کا نیا سیشن اب شروع ہونے والا ہے۔ اسکولوں میں داخلے ہو رہے ہیں۔ اس ملک میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے، اردو بچوں کا مستقبل سنوارنے کے نقطۂ نظر سے، لسانی اقلیتی اسکولوں کی بنیاد مستحکم کرنے کے مقصد سے اور ان تمام اسکولوں کو تقویت پہونچانے کی غرض سے جہاں اردو تعلیم کا معقول بندوبست ہے میں بہار بھر میں پھیلی ہوئی اپنی تمام مقامی شاخوں سے خاص طور پر اور لاکھوں اردو دوستوں سے عام طور پر یہ درخواست کرتا ہوں کہ پورے مہینے میں بچوں کے اسکولوں سے لے کر ہائر سکنڈری اسکولوں تک اپنے بچوں اور بچیوں کا زیادہ سے زیادہ داخلہ کرائیں اور اس کی مہم چلائیں نیز اردو پیدر ہو اڑہ منا کر اس مہم کو کامیاب بنائیں۔

کوکن اردو رائٹرز گلڈ کا قیام

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء بروز پیر کوکن کے چار اردو فنکاروں کے اشتراک سے ایک اشاعتی ادارہ "کوکن اردو رائٹرز گلڈ" کا قیام عمل میں آیا جس کے ٹرسٹیز میں ساحر شیوی، نور پرکار، بدیع الزماں خاور اور یعقوب راہی کے نام شامل ہیں۔ اس گلڈ کے ذریعہ کوکن کے ادیبوں اور شاعروں کی معیاری تصانیف شائع کی جائیں گی۔ اور اردو اور مراٹھی کے ادیبوں کو قریب لانے اور ان کے منتخب ادب کو دونوں زبانوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا۔

گلڈ کی طرف سے جو پہلی کتاب شائع ہو رہی ہے وہ داؤد غازی مرحوم کا مجموعۂ کلام "دشت کی صدیاں" ہے۔ (سکریٹری یعقوب راہی)

کملا راجہ گرلز کالج، گوالیار میں مشاعرہ

انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کی قیادت میں گوالیار کے عوام گذشتہ کئی سال سے یہاں کے کملا راجہ گرلز کالج اور ایم۔ ایل۔ بی (آرٹس اینڈ کامرس) کالج میں شعبۂ اردو کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں سال گذشتہ کملا راجہ گرلز کالج میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے مسز پر دین حق کا تقرر عمل میں آیا۔

۱۵ جنوری کو شعبۂ اردو کی جانب سے اس کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں کئی بیرونی شعرا نے شرکت فرمائی اور اپنے پرلطف اور دلچسپ کلام سے جملہ طالبات اور اساتذۂ کالج کو مسرور و محظوظ فرمایا۔ جن شعرا نے اس مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جناب بسمل بلرام پوری، جناب بشیر جھنجھانوی، جناب ذکار صدیقی، جناب ماہر الحمیدی، جناب دل لکھنوی، جناب مظفر رزمی، جناب ممتاز انجم، جناب آفتاب لکھنوی، جناب ہلال رام پوری۔ اس کے علاوہ مینا قاضی صاحبہ (بمبئی) اور جمیلہ بانو صاحبہ (دہلی) سے تشریف لائی تھیں۔

اس مشاعرہ کی صدارت کے فرائض جناب پریم چند کتیب سوز سابق ایم۔ ایل۔ اے نے ادا کئے اور تعارف شعرا جناب بسمل صاحب نے فرمایا۔ یہ دلچسپ محفل مشاعرہ گیارہ بجے دن سے ڈھائی بجے تک قائم رہی۔ اختتام محفل پر مسز پروین حق لیکچرار اردو نے جملہ شرکا، سامعین اور شعرا حضرات کا شکریہ ان کی ادب نوازی اور زحمت فرمائی کے لیے ادا کیا۔ (پروین صدیقی کملا راجہ گرلز کالج۔ گوالیار)

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا جلسہ

شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک جلسہ ۲۲ جنوری ۶۸ء ٹیوٹوریل بلڈنگ کے کمرہ نمبر ۴۳ میں منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض جناب تنویر احمد خاں غوری استاذ دہلی یونیورسٹی شعبۂ ہذا نے ادا کئے۔ جلسے میں اردو مخطوطات شناسی کے طالب علم امیر اللہ صاحب شاہین نے پرتھی راج راسا کی تاریخی حیثیت پر ایک مقالہ پڑھا۔

امیر اللہ صاحب شاہین نے اپنے مقالے میں چند بردائی کی شخصیت کے بارے میں مورخین اور محققین کے مختلف شکوک و شبہات کا جائزہ لیا اس کے بعد صاحب مقالہ نے پرتھوی راج راسا کے مختلف مخطوطات کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ بعض مخطوطے ضخیم ہیں بعض بہت مختصر اور بعض درمیانی ضخامت کے ہیں ایسی صورت میں یہ طے کرنا بہت دشوار ہے کہ اصل مخطوطہ کون سا ہے اور جعلی اور الحاقی حصے کون سے ہیں البتہ مختلف اسلحہ، مقامات اور الفاظ اور تاریخی شواہد کی مدد سے صاحب مقالہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ شکل میں پائی جانے والی پرتھی راج راسا مستند نہیں کہی جا سکتی اس کے علاوہ راسا کے بیانات کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد مقالہ نگار نے واضح کیا کہ راسا کے بیانات کو تاریخی واقعات کے اعتبار سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جلسہ کے آخر میں ابو الحسنات فیاض محمد خان، ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بحث میں حصہ لیا۔

(قاضی سید ظہیر الحسن سکریٹری سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی)

لسانی اقلیتوں سے متعلق مدھیہ پردیش گورنمنٹ ٹیچرس ایسوسی ایشن گوالیار کی تجاویز

حال ہی میں مدھیہ پردیش سرکار نے ضابطۂ تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل کی ہے جس کے صدر جناب چندر پرتاپ تواری ایم۔ایل۔اے ہیں۔ اس کمیٹی نے مدھیہ پردیش کے تمام اہم مقامات مثلاً اندور، بھوپال، اجین، رائے پور، جبلپور اور گوالیار کا دورہ کیا اور ٹیچرس ماہرین تعلیم، اساتذہ کی انجمنوں کے عہدیداروں اور ممبروں سے تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جب یہ کمیٹی گوالیار پہونچی تو مورخہ ۱۱ر جنوری کو مدھیہ پردیش گورنمنٹ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا ایک وفد ایسوسی ایشن کے صدر جناب نتومل شرما کی قیادت میں ملا اور ایک میمورنڈم پیش کیا۔ وفد کے دیگر ممبران کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب وقار صدیقی جناب گھنشام کشیپ اور جنابہ نیلا بھرڈ کر میمورنڈم میں لسانی اقلیتوں سے متعلق مندرجہ ذیل اہم تجاویز پیش کی گئیں

(۱) پرائمری اور مڈل درجات کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو، چھٹی جماعت سے راج بھاشا ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے

(۲) جن محلوں اور بستیوں میں لسانی اقلیت کی قابل لحاظ تعداد رہتی ہو وہاں اس زبان کا ایک پرائمری اسکول لازمی طور پر کھولا جائے، چاہے ابتدا میں بچوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ باقی بستیوں کے اسکولوں میں کسی ایک اقلیتی زبان کے کم سے کم پانچ طلبہ ہونے پر علیحدہ سے اس زبان کے ٹیچر کا انتظام کیا جائے۔

(۳) ہائر سکنڈری اسکولوں میں جہاں اردو، مراٹھی اور سندھی وغیرہ زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، ایسے اسکولوں میں ان زبانوں کے لیکچرار کی پوسٹ قائم کی جائیں اب تک مدھیہ پردیش کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں ہندی اور انگریزی کے لیکچرار ہوتے ہیں باقی زبانوں کے لیکچرار کا تقرر نہیں کیا جاتا۔ (نامہ نگار)

اردو شاعری میں تاج محل کی رسم اجرا

اردو پبلکیشنز دہلی کی پہلی کتاب "اردو شاعری میں تاج محل" کی رسم اجرا کا جلسہ جناب گوپی ناتھ امن کی صدارت میں ۲۰ر جنوری کو ساڑھے پانچ بجے مقام دہلی کلاتھ [illegible] میں ہوا۔ صاحب صدر اور مالکانِ اردو پبلکیشنز کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صدر شعبۂ [illegible] دہلی یونیورسٹی، پروفیسر جاوید وشسشٹ صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر یوسف حسین [illegible] جناب [illegible] شعبۂ [illegible] جناب عبد اللطیف اعظمی [illegible] (دہلی کالج) [illegible] ادیب، انور نازش، گوپال متل، [illegible] وغیرہ جلسہ [illegible]

(مظفر ادیب)

صفحہ ۵ سے آگے

صفحہ ۵ سے آگے

جنوری ۱۹۰۲ء میں سے بارہ سال گیارہ ماہ منہا کرنے کے بعد فروری ۱۸۸۹ء آتا ہے۔ اس طرح فروری ۱۸۸۹ء قاضی صاحب کی پیدائش کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرے بیانات کے مقابلے میں اس بیان اور ذریعہ پر نسبتاً زیادہ اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ زمانہ قاضی صاحب کی حقیقی بہن اور ان کی موجودہ بیگم کے بیان سے دوسرے بیانات کے مقابلے میں بہت زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا قاضی صاحب کی ہمشیرہ اور ان کی بیگم کا بیان یہ ہے کہ انتقال کے وقت قاضی صاحب کی عمر چھیاسٹھ سال تھی اس عمر کے حساب سے قاضی صاحب کا زمانہ پیدائش ۱۸۹۰ء کے ابتدائی ایام یا پھر ۱۸۸۹ء کا آخری زمانہ رہا ہوگا۔ اور قاضی صاحب کے مڈل اسکول سارٹیفکٹ میں لکھی ہوئی عمر کے حساب سے ان کا زمانہ پیدائش فروری ۱۸۸۹ء نکلتا ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس فرق کو نظر میں رکھتے ہوئے ان دونوں زمانوں میں سے کس زمانے کو ترجیح اور اولیت دیں۔

گو عقل سلیم کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ۱۹۷۶ء کے زبانی بیان کے مقابلہ میں احتیاط کے طور پر ۱۹۰۲ء کے اس تحریری حوالے کو اولیت اور ترجیح دی جائے۔ اور مڈل اسکول سارٹیفکٹ پر تحریر شدہ عمر کے حساب سے نکالے ہوئے زمانہ پیدائش یعنی فروری ۱۸۸۹ء کو ہی قاضی عبد الغفار کا زمانہ پیدائش سمجھا جائے لیکن میرے خیال میں حرف آخر اسے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ اسکول میں عمر درج کرانے کے متعلق مختلف رجحان رہے ہیں۔ کبھی بڑھا کر لکھائی جاتی رہی ہے اور کبھی گھٹا کر۔ پہلی صورت جب ہوتی ہے جب کہ بچہ بہت کم عمری میں ہو اور ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھنے کی مقررہ عمر سے زیادہ فاصلہ ہو جانے کا ڈر ہو آخری صورت یعنی گھٹا کر عمر لکھانے والی صورت تب پیدا ہوتی ہے جب کہ بچے کی عمر کافی ہو اور تعلیمی منازل دھیمے سے طے کرنے کا عادی ہو۔ اس طرح تعلیم سے فارغ ہونے تک سرکاری نوکری سے محروم ہونے کا خوف رہتا ہے اس صورتِ حال میں سرپرست یا خود طالب علم اپنی عمر کم لکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کونسی صورت رہی ہوگی یا ان دونوں صورتوں میں سے ایک بھی نہ ہو بلکہ صحیح عمر ہی درج کرائی گئی ہو۔

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

[illegible] اردو ہند علی گڑھ پرنٹر پبلشر [illegible] قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone

Annual Rs. 5/-

per Copy-15 P.

Date

-8-15-22

جلد ۲۷ - شمارہ ۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ فروری ۱۹۶۸ء

یہ

کچھ غالب کی صد سالہ برسی کے بارے میں

غالب کے انتقال کو سو سال ہو گئے۔ اگلے سال ان کی صد سالہ
…منائی جائے گی۔ صد سالہ برسی کی تیاریاں خاصے بڑے پیمانے پر مختلف
…ں کی طرف سے شروع ہو گئی ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق ہندوستان میں
…ی غالب کمیٹی جس کی صدر وزیر اعظم اندرا گاندھی اور جس کے سکریٹری
…رقیات جناب فخر الدین علی احمد ہیں، تقریبات کا خاصا بڑا پروگرام
…ی ہے، نیز یہ بھی کوشش کر رہی ہے کہ مختلف اداروں کے کام کو
…ط کیا جائے۔ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، عثمانیہ یونی ورسٹی
یونی ورسٹی، بمبئی غالب کمیٹی، اترپردیش غالب کمیٹی، جموں و کشمیر غالب
نے اپنے اپنے پروگرام کا اعلان کر دیا ہے ہماری زبان میں اس کا ذکر
…با ہے۔ یہ پروگرام زیادہ تر غالب کی تصانیف کے بہتر ایڈیشنوں اور
…ت کے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سیمناروں اور
…ارسی جلسوں کا بھی پروگرام ہے۔ مرکزی کمیٹی غالب میموریل ہال بھی
…ا چاہتی ہے۔ سوویٹ یونین کی طرف سے علاوہ دوسری تقریبات
ایک کتاب بھی غالب پر شائع ہو گی جس میں روس کے ہندوستانی
…وں کے عالموں اور ہندوستان کے کچھ ممتاز اردو ادیبوں کے
…امین ہوں گے۔ تاشقند یونی ورسٹی غالب کے فارسی کلام کا انتخاب
روسی زبان میں ترجمے کے ساتھ شائع کرنے والی ہے۔ امریکہ میں چودھری
…یم کی کوشش سے کئی امریکن یونی ورسٹیوں نے ایک کمیٹی بنائی ہے
غالب پر انگریزی میں مضامین لکھوائے گی اور ان مضامین کو معہ غالب
…غزلوں کے انگریزی ترجمے کے شائع کرے گی۔ ساہتیہ اکاڈمی رالف رسل
…خورشید الاسلام کی انگریزی میں غالب کی زندگی اور خطوط پر کتاب اور
…پروفیسر مجیب کا غالب پر انگریزی میں کتابچہ شائع کرے گی، نیز سولہ زبانوں
…غالب کے اردو کلام اور اردو خطوط کے انتخاب کا ترجمہ معہ ایک
مقدمے کے شائع کرے گی۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں پاکستان
میں مجلس یادگار غالب اردو دیوان غالب کا مستند اول نسخہ، کلیات
نظم فارسی کی حصوں میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے نئے ایڈیشن،
نسخۂ حمیدیہ کا نیا ایڈیشن تنقید غالب کے سو سال اور غالب میری نظر
میں شائع کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں بھی غالب پر ایک کتاب
لکھنے کا فیاض محمود صاحب کا پروگرام ہے۔ پاکستان میں بعض دوسرے ادارے
بھی ایسا پروگرام بنا رہے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب
یونی ورسٹی اس سلسلے میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ
۱۹۶۹ میں کتابیں تو کم شائع ہو پائیں گی، ہاں جلسے اور مشاعرے بہت سے
ہو جائیں گے، وہ ہمارے نزدیک قنوطی یا کلبی ہیں۔ بہر حال امید یہ ہے کہ
نہ صرف غالب کی ساری تصانیف کے بہتر اور زیادہ مستند ایڈیشن اس
موقع پر سامنے آ جائیں گے، بلکہ غالب پر نئی کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ "رفتار"
کے کالم میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ غالب کی نئی سوانح عمری اور
غالب پر نئی تنقید کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت مسلّم
ہے لیکن ہمارے خیال میں اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ غالب کے
منتخب کلام کا ترجمہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں ضرور شائع ہو اور
اس کے علاوہ انگریزی، جرمن، روسی، فرانسیسی اور دوسری عالمی زبانوں
میں بھی شائع ہو۔ اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کی صد سالہ برسی بہر حال
اس طرح منائی جائے کہ اردو شاعری کے جواہر پاروں کا دنیا کو اور علم ہو
اور اس زبان کی قدر و منزلت بڑھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ
ہم اس زبان کی فضا اور ترقی کے لیے اور زیادہ کوشش کریں جس نے غالب
جیسا شاعر پیدا کیا۔ ہمارے ملک میں تقریروں، جلسوں، مشاعروں اور
دھوم دھام پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ ان باتوں میں کوئی حرج نہیں مگر شرط
یہ ہے کہ ان کے ساتھ غالب کی تصانیف کے بہتر ایڈیشنوں اور غالب پر
بہتر کتابوں کے شائع کرنے کا پروگرام بہر حال پورا ہو۔ یعنی ایک طرف علمی
ضرورت رفع ہو، دوسری طرف عوامی پہلو کا بھی لحاظ رہے۔ وقت کم ہے
اس لیے دونوں باتوں کا لحاظ رکھ کر کام کرنا چاہیے اور مرکزی کمیٹی کے ذریعے
سارے کام کو مربوط بھی کرنا چاہیے تاکہ تکرار سے بچا جا سکے۔

تاج گنج آگرہ میں نظیر اکبرآبادی کی برسی منائی گئی

آگرہ :۔ آگرہ کے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کا ان کے مقبرہ واقع تاج گنج میں ایک "عرس" ہوا اور ہر شعبہ زندگی کے لوگوں نے مزار نذر عقیدت پیش کیا۔ بزم نظیر کے صدر سکش اکبرآبادی نے صدارتی خطبہ پڑھا۔ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے یوپی کے محکمہ تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہری شنکر شرما نے کہا کہ آگرہ نے کئی شاعر اور سماجی مصلح پیدا کئے ہیں لیکن نظیر اکبرآبادی کو ان میں انوکھا مقام حاصل تھا اپنی زندگی نہایت غربت میں گذارتے ہوئے انھوں نے فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لئے کام کیا ان کی زندگی اس میل ملاپ کا شاندار نمونہ تھی انھوں نے تجویز پیش کی کہ نظیر کے لئے بہترین نذر عقیدت یہ ہوسکتی ہے کہ ان کی ایک موزوں یادگار تعمیر کی جائے (سیاست)

جشن غالب کے سلسلے میں بین الاقوامی سیمنار

نارمن :۔ اترپردیش میں جشن غالب کے پروگراموں کے سلسلے میں جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہے گا سب سے اہم پروگرام غالب پر ایک بین الاقوامی سیمنار ہوگا جس میں عراق، ایران، پاکستان، برطانیہ، روس اور امریکہ کی ممتاز ادبی شخصیتوں کی شرکت بھی متوقع ہے۔ (قومی آواز لکھنؤ)

امریکی یونیورسٹیوں میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے گی

امریکی یونیورسٹیاں برعظیم پاک و ہند کے مشہور اردو اور فارسی کے شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی سوویں برسی کے موقع پر ایک وسیع پروگرام تیار کر رہی ہیں جس کے مطابق نہ صرف امریکی دانشور اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کریں گے بلکہ برصغیر کے ماہر نقاد اور دانشور بھی امریکی یونیورسٹیوں میں مرزا غالب کے افکار پر روشنی ڈالیں گے۔ (حالات)

نئے پڑھنے والوں کے لیے مسودے

نئی دہلی :۔ مرکزی وزارت تعلیم نے نئے پڑھنے والوں کے لیے مسودوں کی فراہمی کے لیے ایک قومی مقابلہ کا اہتمام کیا ہے اور اس سلسلے میں ۱۵ راپریل ۱۹۶۹ء تک مسودے طلب کئے ہیں۔

یہ مقابلہ یونیسکو کے زیر اہتمام منعقد کیا جا رہا ہے اور مختلف ہندستانی زبانوں کے بہترین مسودے کے مصنف کو ۱۶۵۰ روپے کا انعام دیا جائے گا ہر زبان کے لیے اتنی ہی رقم کے کل ۱۶ انعامات مقرر کئے گئے ہیں تین انعامات ہندی اور ایک ایک انعام آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی کے بہترین مسودوں کے مصنف کو دیا جائے گا۔

یہ مسودے ۱۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئیں کسی ایسے مسودے کو مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا جسے پہلے کسی مقابلے میں انعام حاصل ہو چکا ہے۔ سندھی، تامل، تلگو اور اردو زبانوں کے مسودے پانچ روپے کی فیس کے ساتھ ہدایات تعلیم کے اسسٹنٹ تعلیمی مشیر کو (۲۔ای۔ ایس) نئی دہلی کے پتہ پر بھیجا جاسکتا ہے۔ (سیاست)

جگن ناتھ آزاد پریس انفارمیشن بیورو میں

اردو کے ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد جو سرحدی حفاظت فورس میں پبلک ریلیشن افسر ہوگئے تھے اب پھر پریس انفارمیشن بیورو میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن افسر ہوکر واپس آگئے ہیں

ادب اور جدید ذہن

دیویندر اسر نے اس کتاب میں موجودہ عرانی تہذیب، اقدار کے ملتا، ہم عصر ادبی رجحانات وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر بحث کی ہے یہ کتاب مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی سے مل سکتی ہے۔

اختر بستوی

قطعہ

ان کے اقرار محبت سے دل ویراں میں
آج یوں چھیڑ دئے پھر سے تمناؤں کے سار
جیسے مدت یہ اچانک کسی راہی کے طفیل
گونج اٹھی ہو کسی خشک کنوئیں میں آواز

جموں و کشمیر کے ادیبوں کا کیمپ

جموں :۔ یہاں سے ۳۰ میل دور کٹرا میں ۲۲ رفروری سے ۲۴ رفروری تک جموں اور کشمیر کے ادیبوں کا پہلا کیمپ ہوگا اس کا افتتاح ریاست کے وزیر اعلیٰ جناب جی۔ ایم صادق کریں گے۔ اس کیمپ میں علاقائی زبانوں اور ادب کے بارے میں غور کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ بچوں کی کتابیں چھاپنے کے مسئلہ پر بھی سوچ بچار کیا جائے گا۔ (قومی آواز)

مصحفی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری

دہلی :۔ دہلی یونیورسٹی کے کانووکیشن میں جناب نورالحسن نقوی کو ان کے تحقیقی مقالے "مصحفی، سوانح اور کلام" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وی۔ وی۔ گری نے پیش کی۔

نئی غزل نیا لہجہ

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ جناب دلکش ساگری مدھیہ پردیش کے صف اول کے صاحب طرز جدید شعرا کی غزلوں کا ایک انتخاب نئی غزل نیا لہجہ کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں شعرا سے درخواست ہے کہ وہ اپنی پانچ منتخب غزلیں اس پتہ پر ارسال فرمائیں۔ دلکش ساگری۔ سنٹرل بینک مارواڑی روڈ بھوپال

غلام رسول

اردو کا اصلاحی رسم خط جامع ہے

بھارت میں ہندی سرکاری زبان قرار پانے اور اس کے بعض سنسکرت کے خالص حرفوں کا بدل ہماری زبان میں نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اردو خط کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی خاطر نہایت سنجیدگی کے ساتھ ۱۹۵۶ء سے اپنی کدوکاوش جاری رکھی۔ عملی طور پر ۱۹۵۸ء سے وقتاً فوقتاً ہند و پاک کی صحافت کے ذریعے اپنی تجویزیں اہل علم و نظر کے سامنے پیش کیں۔ کسی نے بھی ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر دو ممالک کے ارباب اردو نے انھیں قبول و منظور کیا۔

میں نے اپنی سوچ بچار اور سوجھ بوجھ سے نیمہ، زائے ممدودہ، تشدید ثقیلہ، نونِ ثقیلہ اور یائے قصیر یا پانچ جدید اعرابوں کا اردو زبان میں اضافہ کیا۔ نیمہ، یہ بہت کار آمد اعراب ہے اور ادھوری آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اپنی اور پرائی زبانوں یعنی سنسکرت اور انگریزی کے بیسیوں مخصوص الفاظ کی لکھاوٹ آسانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ نیمے کی علامت (٘) ہے۔ اس کی مثالیں یہ ہیں (اردو) کیّا، کیوں، نیولا (سنسکرت) نیاگ، تلیھ، تنان (انگریزی) سکول، سٹامپ، ٹرام، پلاٹ۔ زائے ممدودہ ہندی رِی (ऋ) کا بدل ہے اس کی علامت (ر) ہے۔ مثلاً رِتو، کرپا، ہرِیہ۔ تشدید ثقیلہ ہندی ستّ (त्त) کا بدل ہے۔ اس کی علامت (سّ) ہے مثلاً ودسّن، پرسّن، ودسّن۔ نونِ ثقیلہ ہندی انشر (ज्ञ) کا بدل ہے۔ اس کی علامت (نٓ) ہے مثلاً مرنٓ، شرنٓ، رانٓ۔ یائے قصیر ہندی اِی ماترا (ि) کا بدل ہے۔ اس کی علامت (یٖ) ہے مثلاً اگنی، آدی، کوی۔

جہاں میں نے جدید اعراب وضع کیے ہیں، وہاں ہندی کی طرح اردو بارہ کھڑی بھی بنائی ہے۔ یہاں اس کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ اردو میں زبر، زیر، پیش، الف، واوِ معروف، واوِ مجہول، یائے معروف، یائے مجہول، واو لین، یائے لین، سکون اور تشدید یہ بارہ اعراب مبادی اور اہم ہیں جن کو حروف تہجی کے ساتھ تختی کی صورت میں لکھا جائے، تو اس مجموعے کو اردو بارہ کھڑی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کی اعرابی مشق ہے، جس سے لکھاوٹ میں نوسکھیے کو بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

(ب کی بارہ کھڑی) بَ، بِ، بُ، با، بو، بُو، بی، بے، بَو، بَے، بْ، بّ۔

اس میں اوّل کے دس متحرک حروف اردو کے اعرابی حروف (حروف علت) کو ظاہر کرتے ہیں، جن میں الف، واو اور ی تین حروف اور سات حرکات شامل ہیں۔ سب مل کر اعرابی حروف کہلاتے ہیں۔ آخر کے دو متحرک حروف میں سکون اور تشدید اساسی اعراب ہیں۔

ناگری خط اپنی ذات سے اعراب دار ہے، اس لیے اس میں جو لکھا جاتا ہے وہ صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو خط بے اعراب ہے اس لیے یہ کسی لفظ کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں اعراب کا محتاج ہے۔ اعراب ہی اردو خط کے اہم جز ہیں، لہٰذا اردو والوں کو چاہیے کہ وہ غیر فہم و ادق الفاظ خصوصاً غیر زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں اعرابوں کا ضرور خیال رکھیں۔

تقابلی مطالعے کے لیے اردو اصلاحی خط کے ساتھ ناگری خط کا حال جاننا ضروری ہے۔ ہندی والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ناگری خط سائنٹیفک ہے اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہی پڑھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اردو اور انگریزی میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ جاتا ہے۔ اس کی تمثیل اردو میں "بالکل" اور انگریزی میں "ہاف" سے دی جاتی ہے۔ "بالکل" کو "بال کل" لکھا اور "بِل کُل" پڑھا جاتا ہے اور "ہاف" کو "ہالف" لکھا اور "ہاف" پڑھا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ "بالکل" اردو کا خالص لفظ ہے۔ اس کی یہ لکھاوٹ عربی طرز کی ہے، جو قابل ترک ہے اس کا املا "بلکل" ہونا چاہیے۔

ناگری خط کے مکمل اور جامع ہونے کا ادعا کہاں تک درست ہو سکتا ہے جبکہ اردو کے حروف ح، ذ، ز، ع، غ، ف، اور ق کے اظہار میں ناگری خط میں تین حروف پر نقطے لگا کر کام لیا جاتا ہے، حالانکہ یہ عمل صحت کے خلاف ہے، لیکن ث، ح، ز، ص، ض، ط، اور ظ کی آوازوں کا کوئی صحیح بدل اس خط میں موجود نہیں ہے۔ اس باب میں وہ سراسر ناقص ہے اس کے علاوہ ناگری خط میں پیچ کی خرابیاں ہیں

(۱) ناگری خط میں حرفوں کی ملاوٹ میں اوپر تلے یا اگل بغل حرفوں کو لکھا جاتا ہے جس سے بڑی پیچیدگی اور دشواری پیدا ہوتی ہے۔

مثلاً (۱) क्लास (کلاس) (۲) उड्डा (اڈّا) (۳) बट्टा (بٹّا) (۴) विद्या (وِدیا) (۵) पद्म (پدم) (۶) विघ्न (وِگھن)

(۲) ناگری خط میں حرفوں کی ملاوٹ میں تلفظ کے خلاف لکھاوٹ ہوتی ہے جو اس کے سقم کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً चिह्न (چِنھ) शान्ति (شانتی) मुक्ति (مُکتی)۔ پہلی مثال میں ह پہلے اور न بعد میں بولا جاتا ہے۔ دوسری مثال میں न پہلے اور ति بعد میں بولا جاتا ہے اور تیسری مثال میں क पہلے اور ति بعد میں بولا جاتا ہے۔ اوپر کے لفظوں میں تلفظ سے ہٹ کر لکھاوٹ ہوتی ہے۔ اس سے جیسا بولا جاتا، ویسا لکھا جاتا کے قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

(۳) ناگری خط میں (र) کی لکھاوٹ میں بڑی جھنجھٹ ہے، جو مبتدی کے لیے پریشان کن ہے۔

مثلاً کر (کر) برف (برف) प्रकाश (پرکاش) ड्रामा (ڈراما) ان میں (र) کی آواز سب جگہ یکساں ہے پھر (र) کی لکھاوٹ میں ماترائی چینز بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۴) ناگری خط میں نون غنہ کی جگہ نون ظاہر کی علامت لکھی جاتی ہے، جو اصولاً غلط ہے۔ مثلاً में (میں) हैं (ہیں) क्यों (کیوں) ان سب میں نون غنہ ہے۔ ناگری خط میں نونِ غنہ کی علامت (ँ) ہے اور نونِ ظاہر کی علامت فقط نقطہ ہے۔

جس خط میں اس قدر اسقام پائے جاتے ہوں، وہ کیوں کر جامع ہو سکتا ہے؟

رومن خط میں حسب ذیل اہم خامیاں ہیں:۔

(۱) رومن خط میں بخلاف اردو خط کے مفرد حرف ایک سے زیادہ آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ C سے س، ک کا اظہار ہوتا ہے مثلاً: CENTRE (سنٹر) CRAFT (کرافٹ)۔ D سے د، ڈ کا اظہار ہوتا ہے مثلاً DAL (دال) DATE (ڈیٹ)۔ G سے ج، گ کا اظہار ہوتا ہے مثلاً: GINGER (جنجر) GULF (گلف)

(۲) رومن خط میں اردو خط کے مقابلے میں مخلوط حرف سے ایک سے زیادہ آوازوں کا کام لیا جاتا ہے۔ C-H سے چ، ش، ک کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً: CHAMBER (چیمبر) CHIVALRY (شی ول ری) CHRIST (کرائسٹ) GH سے گھ، غ کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً: PHAL (پھل) PHARMACY (فارمیسی) TH سے تھ، ٹھ، ث، د کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً: BOOTH (بوتھ) THAT (ٹھاٹ) HADITH (حدیث) THERE (دیر)

(۳) رومن خط میں لکھاوٹ کچھ ہوتی ہے اور تلفظ کچھ ہوتا ہے۔ مثلاً KNIT (نٹ) WRITE (رائٹ) PSYCHOLOGY (سائیکالوجی) اردو اصلاحی خط، سنسکرت کے علاوہ انگریزی کے خاص الفاظ تحریر کرنے میں کارآمد اور سہولت بخش ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے

(۱) ایسے انگریزی الفاظ جن کے درمیان (A) ہو۔ اُن کو اردو اصلاحی خط میں ہمزہ یا ضمہ اور سکون سے لکھا جاتا ہے۔
مثلاً (۱) CAP: کیاپ، MAP: میاپ، BAT: بیاٹ (شمالی ہند کے لہجے میں)
(۲) CAP: کَیپ، MAP: مَیپ، BAT: بَیٹ (شمالی ہند کے لہجے میں)

(۳) ایسے انگریزی الفاظ، جن کے درمیان (E) ہو۔ اِن کو اردو اصلاحی خط میں زیر اور یائے ساکن کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔
مثلاً: RED: ریڈ، SET: سیٹ، BELL: بیل

(۴) ایسے انگریزی الفاظ، جن کے درمیان (O) ہو۔ اِن کو اردو اصلاحی خط میں ہمزے سے لکھا جاتا ہے
مثلاً: GOD: گاڈ، LORD: لارڈ، HAT: ہاٹ

(۵) ایسے انگریزی الفاظ جن کے آخر میں (V) ہو۔ ان کو اردو اصلاحی خط میں واو ساکن کے ساتھ لکھا جاتا ہے
مثلاً: LOVE: لوو، DOVE: ڈوو، CLONE: کلوو

(۶) ایسے انگریزی الفاظ جن کے درمیان (AU) ہو ان کو اردو اصلاحی خط میں نیچے سے لکھا جاتا ہے۔
مثلاً: HAUL: ہال، PAUL: پال

(۷) مندرجہ ذیل انگریزی الفاظ کو اردو اصلاحی خط میں ضمہ اور یائے ساکن سے لکھا جاتا ہے۔
مثلاً: BALE: بیل، TALE: ٹیل۔

اردو خط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ ابتدائی اور درمیانی حرفوں کو ان کے سروں سے اور آخری حرف کو سالم صورت میں لکھا جاتا ہے۔ ناگری خط میں عموماً سب حرفوں کو الگ الگ لکھا جاتا ہے، البتہ حرفوں کی ملاوٹ میں منقطع حروف سے کام لیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس رومن خط میں تمام حروف جدا جدا اور سالم صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو خط، ناگری اور رومن سے منفرد ہے اور نیز اس کو مختصر نویسی میں دونوں خطوں پر تفوق حاصل ہے اس کی لکھاوٹ میں کاغذ کی کمی اور وقت کی بچت ہے۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو اصلاحی خط، ناگری اور رومن دونوں کے مذکورہ نقائص سے عاری ہے اس لیے یہ مکمل اور جامع ہے۔ ارباب اردو کا فرض ہے کہ اس کی ترویج و اشاعت میں بے دریغ کوشش کریں۔ اِس کے لیے سب سے پہلے اردو قاعدوں اور ریڈروں میں اعرابوں کا نقشہ دیا جائے جس میں قدیم کے ساتھ جدید اعراب شامل ہوں جیسا کہ اس سے پہلے برطانوی دور میں صوبہ پنجاب کی اردو درسی کتابوں میں عمل در آمد تھا۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

اب سے ایک سال بعد یعنی فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے۔ اس تقریب کو ایک یادگار جشن بنانے کے لیے ہمارے ملک کی مختلف علمی و ادبی انجمنیں اور ادارے نیز یونیورسٹیاں اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہیں۔ "ہماری زبان" اور بعض دوسرے اخبارات کے ذریعہ اس سلسلے میں جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں وہ خاصی حوصلہ افزا ہیں اور یہ اندازہ لگانے میں ہم بالکل حق بجانب ہیں کہ اس موقع پر غالب سے متعلق جو تحقیقی و تنقیدی مواد سامنے آئے گا وہ بعض دور رس اثرات کا حامل ہوگا۔

غالب ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کی شخصیت اور جن کا فن سب سے زیادہ ہماری توجہ کا مرکز رہا ہے اور گزشتہ نصف صدی میں اردو کے معتبر نقادوں اور محققوں نے غالب سے جتنی دلچسپی لی ہے شاید کسی اور ادیب یا شاعر سے اتنی دلچسپی نہیں لی گئی۔ "غالبیات" اب ہماری تنقید و تحقیق کا اہم ترین شعبہ کہا جا سکتا ہے۔

غالب پرستی یا غالب پسندی کے اس خوش آئند پہلو کا اعتراف کرنے کے بعد اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے جس کی طرف توجہ اس وقت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ سہل پسندی، تقلید، تکرار اور یکسانیت شاید ہمارے قومی مزاج کا خاصہ ہے جس سے غالبیات کا شعبہ بھی خالی نہیں ہے۔ غالب کے متعلق سب سے پہلی بات یہی کہی جاتی ہے کہ جدت اور انفرادیت ان کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے، وہ پامال روش پر چلنا پسند نہیں کرتے تھے، در دیائے عام میں مرنا انھیں منظور نہ تھا، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب سے دلچسپی لینے والوں کی بھی سب سے اہم خصوصیت یہی ہونی چاہیے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ سب سے زیادہ اسی ایک بات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

غالب پر سب سے پہلی اور بنیادی کتاب حالی کی "یادگار غالب" ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے اب بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حالی نے مبالغہ آرائی اور مدح سرائی سے دامن بچا کر غالب کو [illegible] کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اس کا سوانحی [illegible] ہے اور غالب کی پیچیدہ، بھرپور اور رنگارنگ شخصیت کو پیش کرنے سے حالی قاصر رہے ہیں۔ حالی کے بعد خاصے زمانے تک یا تو غالب کی شرحیں لکھی گئیں جن کا انداز مکتبی اور تدریسی ہے یا پھر غالب پرستی اور غالب شکنی کی دو انتہائیں ملتی ہیں۔ عبدالرحمن بجنوری، عبداللطیف اور یگانہ کی تحریریں اسی افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ان تحریروں سے غالب کا تجزیہ کرنے میں اتنی مدد نہیں ملتی جس قدر معترضین کی [illegible] کشمکش اور نفسیاتی بیچارگی کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ شیخ محمد اکرام نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور ان کی تصنیف "غالب نامہ" اب بھی معتدل تنقید و تجزیہ کا ایک معیار پیش کرتی ہے۔

شیخ اکرام کے بعد غلام رسول مہر کی "غالب" اور مالک رام کی "ذکر غالب" اہم کتابیں ہیں۔ مہر نے غالب کی زندگی سے متعلق اہم اور مستند مواد جمع کر دیا ہے لیکن یہ کتاب غالب کی سوانح عمری نہ بن پائی بلکہ سوانح سے متعلق خام مواد کا مجموعہ یا تذکرہ قسم کی چیز ہو کر رہ گئی۔ البتہ مالک رام نے غالب کو ایک جیتے جاگتے کردار کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے یہاں شخصیت نگاری کی کوشش ملتی ہے لیکن غالب کی ایک ایسی سوانح یا بیوگرافی کی کمی اب بھی محسوس ہوتی ہے جو معاصر سوانح عمریوں کے نمونے پر غالب کو بحیثیت انسان پیش کرے۔

غالب کا غیر مطبوعہ کلام، خطوط یا نایاب تحریروں کی دریافت بھی غالبیات کے سلسلے کی اہم کڑی ہے سب سے [illegible] کا نسخہ "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت سے ہمارے سامنے آیا [illegible] کتاب اکرام، مہر اور مالک رام کے تحقیقی و تنقیدی [illegible] سے بہت پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد غالب کی نظم و نثر [illegible] نایاب ذخیرے کو سامنے لانے والوں میں امتیاز علی عرشی، [illegible] پرشاد، مالک رام، قاضی عبد الودود، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، عبد الرحمن [illegible]، مختار الدین آرزو، مسعود حسن رضوی ادیب [illegible] حضرات کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ ان محققوں کی بدولت غالب [illegible]

اطہر عزیز

غزل

بات تو کچھ بھی نہیں تھی جانے آخر کیا ہوا
ایک شخص آیا [illegible] سے روٹھا ہوا

اس [illegible]
جیسے ہو بے شہرت سے [illegible]

کنکروں کی سیج پر رقصاں ہیں کچھ سہمے سے [illegible]
جانے اس پتھر پہ کس کا نام تھا لکھا ہوا

گنگنائے تارے تو یاد آگئی تیری ہنسی
چاند پر اکثر ترے رخسار کا دھوکا ہوا

جانے کیا کانوں میں کہہ کے چل دی چپکے سے ہوا
دیر سے ہے اک شجر کچھ سوچ میں الجھا ہوا

کیوں نہ اطہر فکر میں آئے نیا اک بانکپن
آجکل ہے ذوق کا معیار جب بدلا ہوا

انگریزی الفاظ کے اردو مترادف

ہماری زبان کی یکم جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں صفحہ ۷ پر جناب م۔ن۔ سعید صاحب کا استفسار " ان انگریزی الفاظ کے مترادف کیا ہیں" نظر نواز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جناب سید عبدالخالق اور جناب مبین احمد خاں صاحب کے استفسارات بھی نظر نواز ہوئے۔

اس سلسلہ میں کچھ التماس کرنا چاہتا ہوں۔

لفظ RESURRECTION دراصل مقدس بائبل کے نئے عہدنامے سے متعلق ہے۔ نئے عہدنامے کی پہلی چار کتب یعنی مقدس اناجیل میں خداوند یسوع مسیح کی تصلیب اور تین دن کے بعد ان کا دوبارہ جی اٹھنا مرقوم ہے۔ خداوند مسیح کو یہی لفظ سے صلیب دیا گیا تھا اور وہ مار دیئے گئے تھے مگر اپنے مقدس قول کے مطابق تین دن بعد مردوں سے زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے ان کا اس دوبارہ زندگی پانے کو مسیحی اصطلاح میں RESURRECTION کہا جاتا ہے۔

میں نے خود برنارڈ شا کی ایک تصنیف کے ترجمے کے وقت اس کا ترجمہ نشاۃ الثانیہ کے لفظ سے کیا تھا۔

دو مسیحی ہم عصر علماء ایک لغت نام CHRISTI N TERM-NOL [illegible] میں اس لفظ [illegible]SURRECTION کے اردو مترادف " قیامت، جی اٹھنا، حشر، حشر میں اٹھنا " بتائے ہیں

مصنف ریورنڈ فادر لائبریس پیٹرسن LIBER US PETERSO کراچی سے ۱۹۶۰ میں شائع کی تھی

ایک اور لغت NEW POPULOR DICTIONARY میں اس کے مترادف " زندہ ہونا، جی اٹھنا، تازہ دم کرنا دیئے گئے ہیں۔

بابائے اردو عبدالحق نے STANDARD ENGLISH URDU DICTIONARY میں اس کے یہ مترادف لکھے ہیں " عیسیٰ علیہ السلام کا قبر سے اٹھنا یا اس کا جشن۔ رستخیز قیامت۔ حشر۔ (عامیانہ) مردے قبر سے نکالنا۔ کسی چیز کو کھود کر نکالنا۔ مشکل سے ڈھونڈ نکالنا"

اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف کرنٹ انگلش میں اس کا انگریزی مترادف REVIVAL FROM DISEASE بھی دیا ہے جبکہ واکر نے اپنی CRITICAL PRONOUNCING DICTIONARY میں اس کا انگریزی مترادف RETURN FROM THE GRAVE بھی دیا ہے۔

اس سبب اعتبار سے میں نے لفظ نشاۃ الثانیہ کو اپنے ترجمہ میں [illegible] حقیقتاً RESURRECTION خالص مسیحی تخیل [illegible] خداوند مسیح کی تجدید حیات کے معنوں میں مستعمل ہو رہا ہے۔

HOME SICK کے معنی مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی انگریزی اردو لغت میں " افسردہ یاد وطن میں، ملول، دیس کی لگن یا وطن کا ملال دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس لفظ سے ایک خاص تاثر ادا ہوتا ہے۔ ایک ایسی ضرب کا مفہوم سا جاتا ہے جو وطن سے دور افتادگی کے وقت انسان کے دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ نیو ورلڈ ڈکشنری نے اس کا مترادف رنجیدہ بھی لکھا ہے۔ یاد رہے کہ اگر کوئی انگریز مراجعت وطن کر رہا ہو تو وہ پوچھنے پر ہرگز نہیں کہے گا کہ وہ لندن یا انگلینڈ جا رہا ہے بلکہ وہ ہمیشہ یہی کہے گا I AM GOING TO HOME یہ انگریزی مزاج کی ایک خصوصیت ہے۔ لہٰذا HOME بمعنی وطن لینا درست ہے اور مہجوری وطن کو HOMESICKNESS اور مہجور وطن کو HOME SICK کہا جائے گا۔

HONEY MOON بھی خالص مغربی فضا کا لفظ ہے یہ ایک ایسی رسم ہے جس پر بسیط مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دولہا اور دلہن جب کسی نئی جگہ جا کر بسر کرتے ہیں اسے ہنی مون کی تقریب کہا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق اپنی لغت میں اسی خیال کے زیر اثر " ماہ عروسی گزارنا " اس کا مترادف لکھتے ہیں

نیو ورلڈ ڈکشنری کے مطابق بھی شادی کے بعد پہلا عرصہ گزارنے کو ہنی مون کہا جاتا ہے۔ " ماہ عروسی " اس اعتبار سے صحیح مترادف کہا جا سکتا ہے " شب عروسی " میں وہ وسعت نہیں ہے جو لفظ " ماہ عروسی " میں ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق HOLIDAY OF NEWLY MARRIED COUPLE اس کا انگریزی ترجمہ ہے لہٰذا تعطیل ماہ عروسی بھی اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ میری حقیری رائے ہے۔ اصلی فیصلہ تو " ارباب زبان " ہی صادر فرما سکتے ہیں جنہیں م۔ن سعید نے متوجہ فرمایا ہے یہاں یہ لکھنا بھی غلط نہ ہو گا کہ مولوی عبدالحق کی لغت کے باوجود ابھی کسی مزید لغت کی ضرورت باقی ہے جو انگریزی الفاظ کے صحیح مترادف دے سکے چونکہ مجھے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا کام پڑتا رہتا ہے۔

لہٰذا میں مولوی عبدالحق صاحب کی لغت سے استفادہ اٹھاتے ہوئے بھی کہیں کہیں اس سے قطعی طور پر مطمئن نہیں ہوں اور مجھے اردو کے نئے مرکب الفاظ تراشنے پڑ جاتے ہیں۔

(ہما میرٹھی)

(۲)

۱۔ (i) ریزرکشن وہ دن جب حضرت عیسیٰ کو دنیا میں لا کر دوبارہ موت کے آغوش میں سلا دیا جائے گا۔

(ii) قیامت۔ رستخیز

۲۔ ہوم سِک دیس کی لگن یا نڈھال۔ ملول

۳۔ ہنی مون، ماہ عروسی، شبہائے طلائی، پریم کے دن
(طاہر محسن علوی)

(۳)

ہماری زبان کے جنوری کے شمارے میں مس صاحب نے "ہنی مون" کے اردو ترجمہ کے بارے میں پوچھا ہے جو بھی انھوں نے الفاظ دیے ہیں مگر میرے خیال میں "ہنی مون" کا ترجمہ "ماہِ نکاس" درست رہے گا ماہ سے دونوں معنی ظاہر ہیں۔
(دلیپ بادل)

(۴)

ری سرکشن RESURECTION، ہوم سک HOME SICK
ہنی مون HONEY MOON مولوی عبدالحق کی اسٹانڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ان کا ترجمہ موجود ہے
ری سرکشن کے کئی معنی ہیں۔ یہ لاطینی سے نکلا ہے۔ ری (RE) معنی دوبارہ، پھر۔ سورکٹم SURRECTUM ... ابھارا ... اٹھ
(عالمیانہ) مردے قبر سے نکالنا، ٹکل سے ڈھونڈ نکالنا، ری داؤ REVIVE احیا کرنا، تجدید کرنا وغیرہ
ری سرجنس RESURGENCE۔ پھر سے زندہ ہونا۔ دوبارہ زندہ ہونا۔
ہوم سِک HOME SICK ملال (مادرِ وطن) (دیس کی یاد) ٹکس۔ افسردہ دلبھاری، دکھی۔
ماہِ عروسی ہنی مون HONEY MOON۔ مغرب یا یورپی ممالک میں دولہا دلہن کسی نئی جگہ ماں باپ اور دوست احباب سے دور ایک مہینہ گزارتے ہیں۔ یہ رسم ہمارے ملک کے برخلاف ہے جہاں دولہا دولہن اپنا ابتدائی دور میکے یا سسرال میں بسر کرتے ہیں۔
مکھی پر مکھی مارنا ترجمہ نہیں ہوتا۔ اصل لفظ کا صحیح مطلب اپنی زبان میں اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ پڑھنے یا سننے والا مطلب سمجھ جائے اور لطف اندوز ہو۔
(سجاد مرزا)

(۵)

۱۔ RESURRECTION کا اردو ترجمہ "قیامت ہوگا"
ملاحظہ فرمائیے یوحنا کی انجیل باب ۱۱۔ آیت ۲۴۔
اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔
مرتھا نے اس سے کہا کہ میں جانتی ہوں کہ قیامت میں آخری دن وہ جی اٹھے گا۔
دوبارہ زندہ کرنے کے لیے انجیل میں RISE یا RAISE استعمال کیا گیا ہے
HOME SICK کا ترجمہ یہ ہوگا "اس کو گھر کی یاد ستا رہی ہے" کوئی ایک لفظ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی نہ ہوگا۔
HONEY MOON۔ شبِ عروسی، شبِ زفاف تو صرف ایک رات کی بات ہے ہنی مون تو کئی دن اور رات چلتا ہے۔ اس لیے "ہنی مون" کے لیے "ہنی مون" ہی رہنے دیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہم "گونا" یا "مکلاوا" کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔
(برہم مانند دت)

(۶)

میرے خیال میں "شبِ عروسی" زیادہ موزوں رہے گا اس میں عروس کے لیے شہد سے لطف (دلذیذ) تشبیہ بھی پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ ہنی مون پہلی شب کے بعد ہی منایا جا سکتا ہے اس لیے یہی ترجمہ مناسب رہے گا۔ ہاں پہلی شب کے لیے شبِ زفاف ٹھیک رہے گا۔ دوسرے شبِ زفاف میں تکلف پایا جاتا ہے اور وہ مقبولِ عام بھی نہیں ہے
(انس غوری دکنی)

(۷)

۱۔ کیا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے الفاظ کا ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے؟ یا یہ جائز ہے۔؟ اگر نہیں تو میرے خیال میں HONEY MOON کا صحیح ترین اردو مترادف "ہنی مون" ہے (شہدِ شبنم HONEY DEW کا ترجمہ تو نہیں کر لیا؟)
۲۔ HOME SICK کا اردو مترادف میری رائے میں "گھر کا جلا" یا "گھر جلا" ہو سکتا ہے جیسے دودھ کا جلا۔ گو دونوں میں جلا کے معنے مختلف ہیں لیکن میرے خیال میں "گھر کا جلا" ہوم سک کے مفہوم کو پورا کر سکتا ہے۔ "گھر جلا" زیادہ مناسب ہے کیوں کہ اس سے "گھر جلے"، "گھر جلی" یا SEA SICK وغیرہ ترکیبیں بنانے میں آسانی رہتی ہے۔ ویسے تلفظ کے لحاظ سے اردو کے مزاج شناس اس کے تعلق سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔
۳۔ شعر یا محاورے کا ترجمہ ممکن تو نہیں لیکن
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کو انگریزی کو مؤثر پیرائے میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟
(م۔ ن سعید)

انیس احمد

مکتوب لندن

اردو بھارتی اور پاکستانی عوام کی مشترک زبان ہے

لندن۔ انگلستان کے معروف ادارہ صحت ہمدرد اینڈ گنیز کے پروپرائٹر جناب دھرم پال بے بس دہلوی نے ایک مجمع کے اعزاز میں ڈنر دیا جس میں بھارت اور پاکستان کے سرکردہ افراد اور صحافیوں نے شرکت کی۔ اس تقریب میں میوزک ڈائرکٹر ایس۔ ڈی بالتش نے ترنم سے غالب کی غزل اور چند گیت سنائے۔ بعد ازاں جناب دھرم پال بے ایک مختصر تقریر کے ذریعہ اردو زبان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ اردو بھارتی اور پاکستانی عوام کی مشترک زبان ہے۔ یہ زبان ہمارے اتحاد و یکجہتی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور ہم اپنے تہذیبی ورثہ کو اسی زبان کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو کی آبیاری کا کام جاری رکھیں۔ مسٹر دھرم پال نے ہمدرد دواخانہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے حاضرین کو یاد دہانی کرائی کہ یہ ادارہ انگلستان میں مقیم بھارتی اور پاکستانی باشندوں کی جسمانی اور ذہنی اصلاح و بہبود کی خاطر قائم کیا گیا تھا اور اب تک ہزاروں محب وطن اس سے مستفید ہو چکے ہیں۔

بریڈفورڈ میں عیدالفطر پر ادبی تقریب

بریڈفورڈ۔ گذشتہ ہفتہ بریڈفورڈ کے لاہور ہوٹل میں عیدالفطر کے سلسلہ میں ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ مسٹر مقصود الٰہی شیخ نے اپنی افتتاحی تقریر میں تقریب و دعوت کا مقصد واضح کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی تقریبات ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ عیدالفطر کے سلسلہ میں موج درازی نے ایک مضمون پیش کیا۔ انجم ضیائی نے ایک خوبصورت غزل سنائی۔ [illegible] عزیز نے اپنی پرسوز آواز میں نعتیہ کلام گوش گذار کیا اور [illegible] نے اپنی سریلی آواز سے ایک غزل سنائی۔ دوسرے دور میں کچھ حضرات نے لطائف بیان کئے اور حاضرین کافی محظوظ ہوئے۔

بزم تفریح لندن کا ماہانہ اجتماع

عبدالعلیم صدیقی کی اطلاع کے مطابق بزم تفریح لندن کا ماہانہ اجتماع ۱۰ر جنوری ۶ بجے شام سینٹ الائنس ہال میں منعقد ہوا جس میں لندن کے مشہور شعرائے کرام اور موسیقار حضرات [illegible]۔

ماہنامہ آفاق لندن سے ماخوذ

مجلبات از استاد ڈھنگی مدیر آفاق

شام وعدہ وہ گر نہیں آتی / کوئی امید بر نہیں آتی
ماہ کا ایک دن مقرر ہے / عید کیوں رات بھر نہیں آتی
خواب لانے کو گولیاں کھائیں / خواب میں بھی مگر نہیں آتی
جو بھی گزرا ہے چار شادی میں / کوئی اس کی خبر نہیں آتی

میر بستیہ

دل میں صدیوں کا اک اندھیرا ہے / گرچہ آئی نہیں ہے شام ابھی
میر صاحب بہک گئے ہوں گے / لے رہے ہیں خدا کا نام ابھی

جمیل ملک

خوشنما سرابوں سے تشنگی نہیں بجھتی
اس کی سمت کیا دیکھیں جو نظر کا دھوکا ہے
واہمے ہزار آنکھیں پھر بھی بے بصیرت ہیں
کچھ نظر نہیں آتا عجیب اجالا ہے

عبدالحمید عدم

ایک دلکش زہر سے لبریز پیمانے کا نام
زندگی کیا ہے جو تھک کے جل کے مرجانے کا نام
عقل ہے بالمصلحت بے اعتمادی کی روش
عشق ہے بے ساختہ ایمان لے آنے کا نام
آگہی کیا ہے مسلسل خود فریبی کا حیلہ
دوستی کیا ہے فریب مستقل کھانے کا نام
وضعداری کا یہ پیرایہ بھی کیا دلچسپ ہے
لے رہے ہیں سامنے میرے وہ بیگانے کا نام
ہیں عدم کے ذکر پر کیوں آپ اتنے پرغضب
شمع کے ہمراہ آ جاتا ہے پروانے کا نام

شرارت کرمانی

عاشق ہوئے تو عشق میں ہشیار کیوں نہ تھے
ہم ان کے مدح خواں سر بازار کیوں رہے
ہاں ہم کو عیش کوش کہہ رہے تھے لوگ
ہم بھی شریک گرمیٔ گفتار کیوں رہے
اب کیا شہید ناز بنے پھر رہے ہیں لوگ
مرنے کا شوق تھا تو سردار کیوں نہ تھے
وارث یہ شاعری ہم قاتل سے کم نہیں
آپ اس بلائے جاں سے خبردار کیوں نہ تھے

بشیر بدر

پھول برسے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے
پیار کا گیت اندھیروں پہ اجالوں کی پھوار
اور نفرت کی صدا شیشے پہ پتھر برسے

لندن مورخہ ۳۰ جنوری

مریضوں کے لیے اردو کتابیں

صدیقہ حبیب شبنم، رکن اعزازی اردو لائبریری کمیٹی ناٹنگھم اطلاع دیتی ہیں کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے بھائی، بہن اگر انگلستان کے کسی اسپتال میں زیر علاج ہوں تو انھیں اردو لائبریری کی جانب سے کتابیں فراہم کی جائیں گی اور ڈاک کا تمام خرچ بھی لائبریری برداشت کرے گی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ریڈر اس کے کارکردگان کافی تعداد میں کتابیں ایسے مریضوں کے لیے لے جاتے ہیں جو مختلف اسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔ اس طرح کسی حد تک ان کی دلجوئی کا سامان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا صاحب ذوق مریضوں کو چاہیے کہ وہ اپنے نام اور پتہ سے کمیٹی کو آگاہ کریں۔

بریڈفورڈ میں محفل شعر و ادب

احمد سعید انور کی اطلاع کے مطابق ۲۷ جنوری کو ساڑھے سات بجے شام بمقام کارلٹن پلیس، عقب ایسٹرن بیکنسفیلڈ [illegible] ایک محفل شعر و ادب منعقد ہوگی جس میں عبد الماجد ستار، محمد اشرف ایم۔ اے مقصود الٰہی شیخ۔ احمد سعید انور۔ معراج فرازی اور عبد الباری مقالات، نظمیں، غزلیں اور افسانے پیش کریں گے۔

ٹیلیویژن پر اردو فیچر پروگرام

بی بی سی ٹیلیویژن کے ہفتہ وار پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھئے" میں سلیم شاہد اور مہندر کول نے ایک اردو فیچر پروگرام پیش کیا جس میں مشہور اداکار ضیا محی الدین اور سلمان پیرزادہ نے حصہ لیا گو مسودہ کچھ کمزور تھا مگر عمدہ اداکاری نے فیچر میں جان ڈال دی۔ ضیا محی الدین کا کردار خصوصاً بہت اچھا تھا آغا حشر کاشمیری کے ایک مشہور ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" کا ایک سین بھی بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا۔

بہر حال منظر نامہ کی چند خامیوں کے باوجود سلیم شاہد مہندر کول اور ان کے رفقائے کار کی یہ کوشش مبارکباد کی مستحق ہے امید ہے آئندہ وہ اس سے بہتر پروگرام پیش کریں گے۔

اردو اسکول کے قیام کے لیے چیریٹی شو

بریڈفورڈ سے موج فرازی رقمطراز ہیں کہ ۲ فروری کو بریڈفورڈ کے [illegible] سنیما میں علم عادل کا ایک امدادی شو ہوگا جس کی تمام آمدنی سے ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی جس میں تارکین وطن بچوں کی اردو تعلیم کا بندوبست ہوگا۔

مشاعرہ ۳ فروری کو ہو رہا ہے

عبد العلیم صدیقی سکریٹری بزم تفریح لندن کی اطلاع کے مطابق بزم تفریح لندن کا ماہانہ مشاعرہ بروز ہفتہ ۳ فروری کو چھ بجے شام الائنس ہال میں منعقد ہو رہا ہے۔ جس کی صدارت چودھری اکبر حالی کریں گے اور لندن کے ممتاز شعرا، ادیب، مزاح نگار، لطیفہ گو اور موسیقار شرکت کریں گے۔

صفحہ ۵ سے آگے

سے متعلق مختلف مسائل اور امور پر بہت قیمتی مواد فراہم ہوا ہے۔ اس تحقیق سے فائدہ اٹھا کر غالب کے فن سے متعلق نئے تنقیدی تجزیاتی مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو سابق تبصروں اور اکرام وغیرہ کی تنقیدوں سے آگے کی چیز ہیں۔ ان میں آل احمد سرور، احتشام حسین، شوکت سبزواری، ڈاکٹر سید عبد اللہ، وحید قریشی، ممتاز حسین، سردار جعفری، آفتاب احمد، اختر اورینوی، اسلوب احمد انصاری، عطا محمد شعلہ، وزیر آغا اور بعض دوسرے لکھنے والوں کے مضامین شامل ہیں۔ غالب کے ابتدائی کلام کا تجزیہ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنی کتاب غالب ابتدائی دور میں نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالبیات سے متعلق ان تمام تحقیقی و تنقیدی کارناموں کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے بعد یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہمارے یہاں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے مضامین گذشتہ پچیس تیس سال کے رسالوں میں ملیں گے جن میں اسی تحقیقی و تنقیدی مواد کو بار بار الٹ پلٹ کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے بجائے سب مواد کو سمیٹ کر غالب کی حیات اور ان کے فن پر بھرپور کتابیں نئے زاویوں سے لکھی جاتیں تو یہ بڑی اچھی بات ہوتی لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب کی سوانح عمری اب بھی نہیں لکھی گئی ہے اور غالب پر ایک ایسی بھرپور کتاب جس میں جدید تنقیدی اصولوں سے غالب کی شخصیت اور ان کے فن کے رشتے کا ایک جامع تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو اب تک ہمارے تنقیدی ذخیرے میں نہیں ملتی تو بہت تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو کتابیں شائع ہوں گی ان میں بھی یہی رویہ کار فرما نہ ہو۔ اگر متفرق مضامین کے ایسے مجموعے جو رسائل کے خاص نمبروں سے زیادہ مختلف نہ ہوں اور ان میں بھی تکرار یکسانیت اور ہزار مرتبہ کی دہرائی ہوئی باتیں پھر سے بدل بدل کر بیان کی گئیں تو یہ اچھا نہ ہوگا۔ غالب کی صد سالہ برسی کو ابھی ایک سال اور ہے اگر اس مسئلے پر اب بھی غور کر لیا جائے تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

--- [illegible] ---

بیچ مدھیہ پردیش میں انجمن ترقی اردو کا قیام

بھوپال - بیچ چھاؤنی میں اردو دوستوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کی رکنیت ساری ... مندرجہ ذیل عہدیداران اور اراکین مجلس عاملہ منتخب کئے گئے۔

صدر:۔ جناب جی پی ھگڈ ھاری (ایڈوکیٹ)

نائب صدر:۔ جناب محمد صادق

سکریٹری وخازن جناب محمد عشوق علی خاں صاحب ہلال صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ، جامع مسجد، چھاؤنی بیچ

نائب سکریٹری:۔ محمد حنیف صاحب

ناظم نشر و اشاعت:۔ جناب محمد عبدالحمید صاحب ذاکر

کنوینرز:۔ محسن علی صاحب طوطی، عبدالسلیم صاحب تمنا

اراکین مجلس عاملہ:۔

صاحبزادہ خان ولی الدین خاں دانش، عبدالکریم صاحب عاصی غلام حسین خادم احمدی، عبدالحمید صاحب چیدن والے، احمد بیں صاحب برقی، عبدالحمید صاحب گوہر، صابر حسینی صابر، خاہد امین غوری، احمد حسن کامل، معقول حسن رتنک، جو صاحب چودھری امیر در علی خاں راجا، محمد عزیز، یامین بجائی۔

(آفس سکریٹری مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو)

دو ہزار اردو ٹیچروں کی ضرورت، تقرری صرف ایک سو کی ہوئی

لکھنؤ۔ اطلاعات کے مطابق ریاست کے پرائمری یا سکنڈری اور ... کے ایسے دو ہزار ادارے ہیں جن میں ہر ایک میں ایک ایک ... ٹیچر کی ضرورت ہے لیکن پچھلے دو ماہ میں ریاستی محکمہ تعلیم نے یوپی میں ... ایک سو ۴۰ اردو ٹیچروں کے تقرر کئے ہیں اور بقیہ اداروں میں ... ٹیچر مقرر نہیں ہوئے۔ ریاستی محکمہ تعلیم کے ایک ذمہ دار نے بتایا ... کہ یہ تقرریاں اس وجہ سے نہیں کی گئیں ہیں کہ متعلقہ اضلاع سے ... انسپکٹر آف اسکول کی رپورٹ حکومت کو موصول نہیں ہو رہی ہے لیکن ... سرکاری ذمہ دار نے بتایا کہ اضلاع کے انسپکٹر آف اسکول کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی رپورٹ جلد از جلد بھیجیں۔ ذمہ دار نے یہ بھی بتایا کہ حکومت نے ریاست کی پندرہ اردو انجمنوں کے نام بھی ایک گشتی بھیجی تھی کہ وہ بتائیں کہ کن اسکولوں میں اردو ٹیچر کی ضرورت ہے لیکن ان میں سے ایک بھی انجمن نے ابھی تک سرکار کو کوئی فہرست نہیں بھیجی ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کس ضلع میں اردو ٹیچروں کی کمی ہے۔ (قومی آواز)

انجمن ترقی اردو دلی شہر کی جنرل کونسل کی میٹنگ

دلی - انجمن ترقی اردو دلی شہر کی جنرل کونسل کی ایک اہم میٹنگ ۲۲ جنوری کی شام کو دفتر اتحاد دارشیہ میں ہوئی۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے صدارت کی میٹنگ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک اردو اسکولوں کے مسائل نصاب کی اردو کتابوں اور دوسرے متعلقہ امور پر سیر حاصل بحث کی گئی جس میں بہار برقی جنرل سکریٹری کے علاوہ جناب مقیم الدین فاروقی، جناب معز الدین احمد اردو اکیڈمی ناظم صاحب اور کئی دوسرے حضرات نے حصہ لیا طے پایا کہ نصاب کی اردو کتابوں کے حصول کے سوال پر غور کرنے کے لیے ایک خاص میٹنگ ہونی چاہئے جس میں انجمن کے کچھ ذمہ داروں محکمہ تعلیم کی اردو کمیٹی اور اردو اکیڈمی کے ممبروں کو شرکت کی دعوت دی جائے تاکہ اس بارے میں کوئی جامع پروگرام تیار کیا جائے انجمن نے مختلف علاقوں میں رائے عامہ بیدار کرنے کے لئے نشستیں کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ (المعتہ)

حلقۂ ادب بھاگلپور کی خصوصی نشست

تاریخ ۴ فروری ۱۹۶۸ء بوقت ساڑھے چھ بجے شام 'ایوان ارشاد' میں 'حلقۂ ادب' بھاگلپور کی ماہانہ نشست زیر صدارت جناب پروفیسر مظہر اقبال صاحب، صدر 'حلقۂ ادب' بھاگلپور منعقد ہوئی۔ جس میں مندرجہ ذیل تجویزیں بہ اتفاق رائے منظور کی گئیں۔

(۱) دستور ساز کمیٹی کی میٹنگ جلد از جلد بلائی جائے۔ اور دستور مرتب کرنے کے بعد اسے حلقہ کی آئندہ نشست میں پیش کیا جائے۔

(۲) اراکین سے ماہانہ چندہ کی وصولی کے لیے دس فیصد کمیشن پر ایک محصل مقرر کیا جائے۔

(۳) حلقہ کے بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر نائب معتمد کے عہدے میں مزید ایک آدمی کا اضافہ کیا جائے۔ اور حلقہ کے نئے رکن رفیق الزماں صاحب متعلم ٹی۔ان۔بی کالج بھاگلپور سے گزارش کی جائے کہ وہ اس عہدہ کو قبول کریں۔ (محی الدین جمی سکریٹری حلقہ ادب بھاگلپور)

اردو ادب اور جدیدیت پر سیمینار منعقد ہوگا

لکھنؤ۔ اردو ادب اور جدیدیت پر سیمینار کرنے کے سلسلے میں ایک جلسہ ڈاکٹر ہرش نرائن کے مکان پر بیگم سلطانہ حیات کی صدارت میں ہوا جس میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے کنوینر رام لعل اور ڈاکٹر ہرش نرائن منتخب کئے گئے اور حسب ذیل ممبران کا قیام عمل میں آیا۔ حیات اللہ انصاری، شہاب سرمدی، عابد سہیل، منظر سلیم، احمد جمال پاشا سریندر پرکاش، افتخار اعظمی، علی شاہد صدیقی، اختر الملک، کرشن کانت اگن ہوتری، عرفان آفاقی اور خلیق نگرامی، اسی جلسے میں اردو ادب اور جدیدیت پر سیمینار کے سوالنامہ اور منشور تیار کرنے کے لیے دو اور سب کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سوالنامہ تیار کرنے والی کمیٹی میں عابد سہیل

اختر اعظمی، شہاب سرمدی، سریندر پرکاش اعلیٰ ڈاکٹر عزیز مسعود ہیں منشور تیار کرنے والی سب کمیٹی میں منظر سلیم، ڈاکٹر ہرش نرائن اور رام لعل ہیں۔ سوالنامہ کمیٹی کا آئندہ جلسہ مورخہ ۱۰ فروری کو بوقت ۲ بجے شام ڈاکٹر ہرش نرائن کے مکان پر ہوگا۔

سیمینار کرنے کا مرکزی دفتر ڈاکٹر ہرش نرائن کے مکان واقع سی ۱۲۵ رام رتن واجپئی مارگ امراؤ سنگھ پارک لکھنؤ میں قائم کیا گیا

۴- رحلیق نگرامی معاون سکریٹری اردو ادب اور وحدت (سیما پارک لکھنؤ)

انجمن ترقی اردو آندھرا کے جلسہ میں

آنند نرائن ملا اور پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر

حیدرآباد۔ موجودہ حالات میں ضروری ہو گیا ہے کہ اردو کے بہی خواہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور لسانی بل کی منظوری اور اس کے ردعمل کے طور پر جو صورت حال سامنے آئی ہے اس کے پس منظر میں اپنے مسائل کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو طریقے ہم نے اختیار کیے تھے وہ کہاں تک کامیاب رہے؟ کہیں ان میں تبدیلی کی ضرورت تو نہیں۔ ان خیالات کا اظہار پنڈت آنند نرائن ملا نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند نے ایک جلسہ عام کو مخاطب کرتے ہوئے کیا جو ان کے خیر مقدم کے لیے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے اردو ہال میں منعقد کیا گیا تھا جلسہ کی صدارت نواب میر احمد علی خاں نے کی۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی مخاطب کیا۔

ابتدا میں پروفیسر حبیب الرحمٰن نے ملا صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کے بڑے شاعر ہی نہیں بڑے سپاہی بھی ہیں اور آج اردو کو شاعروں سے زیادہ سپاہیوں کی ضرورت ہے۔

ملا صاحب نے اردو کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں آج نئے حالات میں اردو تحریک کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے ہمیں اپنے غور و فکر کا انداز بھی بدلنا ہوگا۔ طریق کار اور لائحہ عمل بھی۔

ملا صاحب نے سرکاری زبان اور علاقائی زبان کی اصطلاحوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی پارٹیوں کے فریب میں آکر ہمیں سرکاری زبان کی اصطلاح پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے ہمارا مقدمہ کمزور ہو جائے گا۔

اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے ملا صاحب نے کہا کہ اردو کے مسائل کو حل کرنے میں سست گامی انتہائی خطرناک ہوگی۔ سیار کمزور ہوتا جارہا ہے۔ تاب و تواں جواب دے چکے ہیں، اس لیے جیالے گردوں کو فوراً اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر ہم اپنے ملک کے نظام اور اس کی پالیسیوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ اصول اور عمل میں تضاد ہے۔ زبان کا مسئلہ بھی اسی تضاد کا شکار ہے انھوں نے انجمن ترقی اردو کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک قومی نقطۂ نظر رکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اردو باقی رہے اور ترقی کرے۔ وہ کسی زبان کے خلاف نہیں اور نہ وہ کسی زبان کے ساتھ مل کر کسی دوسری زبان کو مٹانا چاہتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سنتی کمار چٹرجی نے کہا تھا کہ انجمن ہندی کے خلاف آواز اٹھائے تو بنگال ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے خواہش کی تھی کہ اگر انجمن ان کے مطالبے کی تائید کرے تو وہ اردو والوں کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔

پروفیسر سرور نے کہا کہ سیاست کی بساط پر ہر ایک مہرہ چل رہا ہے لیکن ہم کسی کا مہرہ بننا نہیں چاہتے۔ ہم وہی چاہتے ہیں جو لسانی، قومی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے درست ہے ہمارے سامنے صرف قدیم ہندوستان ہی نہیں ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستان بھی اور جدید ہندوستان بھی ہم اپنے ملک کی تاریخ اور تہذیب کے کسی حصہ کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے دوسرے الفاظ میں ہم ماضی، حال اور مستقبل کا نقشہ چاہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ دستور ہند میں ہندی کو راشٹر بھاشا کہا گیا ہے، لیکن یہ ہندی کیسی ہوگی اس کی صراحت دفعہ ۳۵۱ میں کر دی گئی ہے۔ جدید ہندی اس صراحت پر پوری نہیں اترتی۔

سرور صاحب نے کہا کہ ہمارا ملک ایک مشترک خاندان ہے جہاں ہر فرد کو دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہ مشترک خاندان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

انھوں نے اپنے مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مرکز اور ریاستی حکومتیں دونوں اس کی تکمیل کر سکتے ہیں اور ہم نے دونوں سے درخواست کی تھی لیکن یہ بات ہنوز روز اول ہے۔ لسانی کمشنر کی سات رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں اور ہر ایک میں ہماری تائید کی گئی ہے اس کے باوجود ہمارے مسائل کی یکسوئی کی کوئی صورت نہیں نکالی جاتی۔

انھوں نے کہا ان حالات میں ہمیں اپنے عقیدے پر مضبوطی کے ساتھ جما رہنا چاہیے اور کسی قیمت پر کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیے۔ بعض گوشوں سے رسم خط بدلنے کا مشورہ دیا جارہا ہے ہم اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتے ہمیں اصرار کرنا چاہیے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام ہو، اعلیٰ تعلیم کے بہتر مواقع ملیں، اردو کالج قائم کیے جائیں بلکہ اردو یونیورسٹی کا قیام بھی ممکن ہے۔

سرور صاحب نے متنبہ کیا کہ احتجاج برائے احتجاج سے کام نہیں چلتا۔ ہر شخص کو اپنی جگہ اردو کی خدمت کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے قومی یکجہتی کو نقصان پہنچے ہم شعلہ کی لپک اور خون کی دھار سے محبت کا پسینہ ملتے ہیں۔

آخر میں جناب حبیب الرحمٰن نے انجمن کی کارکردگی کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔

"ہماری زبان"
سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔

[illegible]

تصرفاتِ اردو مصنف: میر احمد علی خاں ادیب، قیمت ۲۵ روپے ۳

ملنے کا پتہ: مکتبہ عزیزیہ، پرانی حویلی حیدرآباد

اردو نے دوسری زندہ زبانوں کی طرح اور شاید کہیں زیادہ متعدد زبانوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ خاص طور پر عربی فارسی کے بہت الفاظ اس میں شامل ہیں لیکن اردو نے انھیں اپنی خراد پر چڑھایا ہے۔ امتدادِ زمانہ و کثرتِ استعمال سے ان عناصر میں صوتی و معنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اور کسی حد تک آج بھی بعض لوگ ان تبدیلیوں پر ناک بھوں چڑھاتے رہے ہیں۔ الفاظ کا رشتہ ان کی اصل سے جوڑنا چاہتے ہیں، ان میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ تبدیلیوں پر اتنی لے دے نہیں ہوئی جتنی صوتی (تلفظ کی) تبدیلیوں پر ہوتی ہے۔ یہ تبدیلیاں کسی کی پسند و ناپسند کی تابع نہیں ہوتیں بعض یا معدودے چند اشخاص کی رائے ان کو متاثر کرتی ہے۔ ہر زندہ زبان میں اس طرح کی تبدیلیاں ناگزیر ہوتی ہیں درآمد شدہ الفاظ ہی ان سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ خود زبان کے اپنے عناصر بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کی ابتدا انفرادی طور پر ہوتی ہے، آزاد ان کو قبول کرلیتے ہیں اور پھر کسی طبقے سے گزر کر تبدیلی عام ہو جاتی ہے۔ یہ عمل بالکل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ اہلِ علم اور پڑھا لکھا طبقہ شروع میں اس سے اجتناب کرتا ہے اور اسے بگڑی ہوئی شکل قرار دیتا ہے لیکن بالآخر اسے بھی استعمالِ عام کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور یہی بگڑی ہوئی شکل ہی معیاری شکل قرار پاتی ہے۔

"تصرفاتِ اردو" ان صوتی اور معنوی تبدیلیوں کا جائزہ ہے جو عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کے الفاظ میں اردو استعمال میں پیدا ہو گئی ہیں۔ مستند لغات کی مدد سے لغت تیار کرنا نسبتاً سہل ہے لیکن بول چال کی زبان کا مطالعہ اور وہ بھی اس گہرائی کے ساتھ کہ اس کے اندراجات کو منضبط کرلیا جائے جس سے لغت اور بول چال کی زبان کے اختلافات کی نشاندہی کی جاسکے، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بالخصوص انفرادی طور پر ایسا کام کرنا سخت مشکل ہے۔ حضرت ادیب حیدرآبادی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ایک طرح پوری کر دی۔

اس کتاب کو پہلی کوشش تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کی چھوٹی موٹی کتابیں اور بھی لکھی جاچکی ہیں، لیکن ان کا مقصد غلطیوں کی اصلاح کرنا یعنی تبدیلیوں کو غلط قرار دے کر اصل کے استقرار کی کوشش کرنا تھا۔ "تصرفات" کا انداز اس کے برعکس ہے۔ یہاں تبدیلیوں کو قبول کرنے کی راہ نکالی گئی ہے۔ چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اردو میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ کا بیشتر حصہ فارسی کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ فارسی نے ان میں جو تبدیلیاں کی تھیں ہم نے ان کو من و عن قبول کرلیا۔ مثلاً عربی الفاظ سکون پر بھی ختم ہوتے ہیں اور حرکت پر بھی۔ فارسی میں تمام الفاظ سکون پر ختم ہوتے ہیں اور اس لیے عربی الفاظ کی آخر حرکت ساقط ہوکر سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے اردو میں بھی یہی صورت ہے اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورتوں میں عربی کا حوالہ دے کر ایسے استعمال اردو تصرفات میں شمار کریں۔ دراصل یہ فارسی تصرفات ہیں۔ یہ بات عربی ۃ کے بارے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ۃ عربی میں بحالتِ سکون ہ میں اور حرکت کی حالت میں ت میں بدل جاتی ہے۔ فارسی اور پھر اردو میں دوسری حالت ممکن نہیں تھی چنانچہ عربی ۃ پر ختم ہونے والے تمام الفاظ ہ پر ختم ہوتے ہیں۔ اسے اردو کا تصرف کہنا فارسی کے اثر کو نظرانداز کر دینا ہے۔

الفاظ کی توضیح و تصریح اور زیادہ توجہ چاہتی تھی کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصنف نے تساہل سے کام لے کر اندراجات کر دیے ہیں مثلاً لفظ "امرت" کا اردو تلفظ آمرت اور تلفظ از روئے لغت اِمرت بتایا ہے۔ یہ لفظ سنسکرت اصل ہے اور سنسکرت میں اس کا تلفظ اَمرت ہی ہے۔ لفظ "الست" کے ذیل میں ہے فارسی اور اردو میں الست بمعنی روزِ میثاق رائج ہے حالانکہ اردو میں الست علیحدہ کبھی استعمال نہیں ہوتا بلکہ صرف صبحِ الست، یومِ الست، بزمِ الست وغیرہ ترکیبوں میں رائج ہے، جو معنی دیے گئے ہیں وہ پوری ترکیب کے ہیں۔ استعارۃً کی جگہ "استعاری" کا استعمال مروج نہیں ہے۔ تسلیم نے ضرورتِ شعری کی وجہ سے استعمال کیا سو غلط ہے۔ ایسی شاذ مثالیں سند نہیں ہو سکیں۔ اس طرح کے الفاظ کی طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ صرف "الف" کے ذیل میں کم از کم ۳ لفظ ہیں جن کی توضیح مشکوک ہے۔

لغت کے اندراجات بہت احتیاط چاہتے ہیں جس سے شاید صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلا اندراج کہیں اردو تلفظ کے مطابق دیا گیا ہے، کہیں لغت کے مطابق۔ اکثر اعراب نہیں دیے گئے جو ایسی لغت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ وغیرہ علاوہ ازیں اس میں "تصرفاتِ اردو" کے ساتھ "تصرفاتِ کاتب" بھی شامل ہیں۔

تاہم پروفیسر مسعود حسین کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "اگر تالیف ہذا کسی دوسرے علمی سرچشمے کو اس دشت کی سیاحی کے لیے برانگیختہ کرسکی تو میں یقیناً کہوں گا کہ میر صاحب! کارے کردی!"

[illegible] انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے لیے پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57 Regd. No L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone-29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ر فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کی عمارت کیلئے فنڈ کی اپیل

انجمن ترقی اردو کا آغاز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت سے ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ اس کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ ایک آزاد ادارہ ہوگئی۔ مولوی عبدالحق کی ان تھک کوششوں سے اس نے بڑی ترقی کی ۱۹۳۸ء میں مولوی عبدالحق اس کا دفتر دہلی لے آئے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دریاگنج میں اس کا دفتر لٹا تو مولانا آزاد نے اس کی حفاظت کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اسے علی گڑھ لے آئے لیکن یہ برابر خیال رہا کہ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہی ہونا چاہئے۔ چنانچہ حکومت ہند سے رعایتی قیمت پر زمین کے لیے درخواست کی گئی۔ حکومت نے راؤز ایونیو میں جو مٹھورا روڈ کے قریب ہے چوتھائی ایکڑ زمین رعایتی قیمت پر دے دی ہے۔ عمارت کے لیے نقشہ ایک اچھے آرکیٹکٹ مسٹر بھرداج نے تیار کیا ہے۔ یہ عمارت پانچ منزل کی ہوگی اور اس کی لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ انجمن کے پاس عمارت کے لیے ڈیڑھ لاکھ کے قریب روپیہ محفوظ ہے۔ حکومت ہند سے بھی گرانٹ کی درخواست کی گئی ہے، لیکن ہم کو پانچ لاکھ روپیہ اردو دوستوں سے جمع کرنا ہے۔ چندے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم شروع ہونے والی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ کے قریب اردو بولنے والے ہیں۔ اردو کے ان ہمدردوں کی تعداد اس کے علاوہ تین کروڑ سے کم نہ ہوگی جن کی زبان اگرچہ اردو نہیں ہے مگر جو اردو زبان کی ترقی چاہتے ہیں اور اس کے ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے پانچ لاکھ کی رقم کوئی ایسی رقم نہیں ہے جو چھ مہینے میں جمع نہ ہوسکے۔ عمارت کا سنگ بنیاد عنقریب وزیر اعظم کے ہاتھوں رکھا جائے گا اور عمارت کی تکمیل ہمیں سال بھر کے اندر کرنا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ عمارت کا نام اردو بھون رکھا جائے۔

چندے کی فراہمی کے لیے ہم کے دو طریقے ہوں گے۔ اول تو ہزار روپے، سو روپے، دس روپے، اور ایک روپیہ کے عطیات کے لیے علیحدہ علیحدہ رسید کی کتابیں چھپوائی جائیں گی، دوسرے بمبئی، دہلی، حیدرآباد اور دوسرے بڑے شہروں میں خاص خاص کمیٹیوں کے زیر اہتمام تہذیبی پروگرام ہوں گے جن کے لیے ٹکٹ رکھا جائے گا عمارت کے نقشے ایک فولڈر کے ذریعہ سے اردو دوستوں کو بھیجے جائیں گے انجمن دراصل ایک عوامی ادارہ ہے قریب قریب تمام ریاستوں میں اس کی ریاستی شاخیں ہیں۔ مقامی شاخوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے۔ [illegible] تنظیم کے ذریعے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرلینا ہمارے نزدیک مشکل نہیں ہے بشرطیکہ شاخوں اور اردو کے ہمدردوں کا پورا تعاون ہمیں حاصل ہو۔ انجمن کی مجلس عاملہ کا جلسہ عنقریب دہلی میں ہونے والا ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہماری زبان میں ضروری اطلاعات جلد شایع ہوں گی۔

دہلی ہندوستان کا صدر مقام ہے اور اردو کی جنم بھومی بھی ہے۔ انجمن کے صدر دفتر کو دہلی ہی میں ہونا چاہئے تاکہ حکومت، دہلی کے تہذیبی اداروں اور عوام سب سے گہرا رابطہ قائم ہوسکے۔ ہمیں موجودہ اقتصادی مشکلات کا احساس ہے، مگر انجمن کو آئندہ اور فعال بنانے کے لیے اور اردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی کی جدوجہد کو اور قوی اور بااثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جلد سے جلد اپنی عمارت میں منتقل ہوکر یکسوئی کے ساتھ کام کرسکیں۔ اس کام میں ہمیں سارے اردو دوستوں کی مالی امداد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انجمن کے کام بڑھیں اور [illegible] اس کی مطبوعات کی تعداد بڑھے ان کی نکاسی زیادہ ہو۔ مطبوعات کا دائرہ وسیع ہو اور ان میں علمی، ادبی، قدیم اور جدید ہر قسم کا لٹریچر شامل ہو ہماری تمنا ہے کہ انجمن خود کفیل ہوسکے اور وہ اپنے کاموں کے لیے صرف عوام کی محتاج ہو، حکومت کی امداد پر تکیہ نہ کرے ہمیں یقین ہے کہ سب اردو دوستوں کی بھی یہی خواہش ہوگی آئندہ ہماری زبان کی ہر اشاعت میں اس [illegible] کی ضروری اطلاعات شایع [illegible]

مولانا آزاد کی دسویں برسی

مولانا آزاد کے انتقال کو دس سال ہوگئے [illegible]
[illegible]

...مولانا کی شخصیت اور کارناموں کا اعتراف ہونا چاہیے۔ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا نے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ قیادت کی اور آزادی کے بعد ملک کو جمہوریت اور سیکولرزم کے راستے پر چلایا۔ آج جمہوریت اور سیکولرزم دونوں کو نئے خطرے درپیش ہیں۔ مولانا نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی الہلال، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مولانا کی کوششوں سے انجمن ترقی اردو کو نئی زندگی ملی۔ اس موقع پر ہمیں ایک طرف جمہوریت اور سیکولرزم کے استحکام کی اور کوشش کرنی چاہیے اور دوسری طرف اردو زبان کو ملک میں اس کا حق دلانے کے لیے اور زیادہ آئینی اور تعمیری کوششیں کرنی چاہئیں۔ ایک طرف خود اردو کے اسکول کھولنے چاہئیں اور اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے راستے نکالنے چاہئیں اور دوسری طرف عوام اور حکومت کو اردو کا حق دینے کے لیے آمادہ کرنا چاہیے مولانا کی یاد کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے۔

ان میں سے ایک کتاب مختلف حضرات کے نام مولانا کے تقریباً پونے دو سو خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بیشتر خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ دوسری کتاب مولانا آزاد پر پاک و ہند کے متعدد اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر مضمون مولانا کی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر ہو۔ یہ دونوں کتابیں ابوالسلمان شاہجہانپوری نے مرتب کی ہیں مجموعہ مکاتیب اردو اکیڈیمی سندھ کراچی سے اور مجموعہ مضامین سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سے شائع ہو رہے ہیں۔

اندھا خواب

ایم کو ٹھیاوی راہی

کتنی اچھی نظر آتی ہے وہ سیلی دنیا
اور یوں روحیں ہوئیں آباد مگر پھر بھی خموش
سرحدیں ہیں نہ ممالک نہ کوئی نام کا شہر
چل مری جان تجھے بھی وہیں لے جاؤں کہ تو
خون ٹپکاتی ہے ہنگامہ آب و گل میں
اور مری آنکھ سے بہتے نہیں دیکھی جاتی

سہم جاتا ہے لہو ماہ پرور ان تارا
تیرے بچے یہ بھی ہو گا ہی اب اور نہ جل
تیری ہر سانس دھواں بن کے نکلتی ہے یہاں
پھول کی آس عبث ہے کہ فضا ہے بیمار
آگ باقی ہوا میں کی پرانی دنیا
ہے مگر سارے عناصر میں یہاں شعلہ نفس
آگ کے پیڑ شراروں کی زمیں راکھ کے گھر
برف کے خول نے ہر چیز چھپا رکھی ہے
لیکن اس خول سے ہر روح نکل آئے گی
وقت کی بات نہ کر وقت سے پہلے ہی نکل
خواب اندھا ہے مری جان مری آنکھ سے دیکھ
کتنی اچھی نظر آتی ہے وہ نئی دنیا!

پریم چند کا ناول "رنگ بھومی" کی روسی زبان میں اشاعت

ماسکو سوویت قارئین ہندستانی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں حال میں پریم چند کا ناول "رنگ بھومی" کا روسی زبان میں ترجمہ ملا ہے۔ یہ ترجمہ لینن گراڈ میں اول اشاعت گھر کی مقامی شاخ سے شائع کیا ہے۔ سوویت یونین کے ممتاز ماہرین علم الہند ای۔ یورودک، ای مخوتن اور دی۔ کراسنس سیکوف نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ سوویت یونین میں پریم چند کی کئی کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں گئو دان، کرم بھومی، غبن اور نرملا شامل ہیں۔

صدر جمہوریہ نے غالب میموریل کا سنگ بنیاد رکھا

نئی دہلی: صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے آج خواجہ حسن نظامی کی پیشکش پر دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے تعمیر کئے جانے والے غالب میموریل کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس عمارت پر ۵ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ (قومی آواز)

مصنف نیا لسانی فارمولا تلاش کریں گے

کانپور ۱۸ فروری۔ اگلے مہینے یہاں مصنفوں کی ایک آل انڈیا لسانی کانفرنس ہوگی جس میں قومی زبان کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے گا جو سب کو قابل قبول ہو اور قومی یک جہتی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی

دلی: امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی دس سالہ برسی امسال ۲۲ فروری کو منائی جارہی ہے۔ صبح کو اس سلسلہ میں حضرت مولانا آزاد کے مزار پر ایک مختصر سی تقریب ہوگی جس میں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ (سیاست)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری

علی گڑھ۔ امسال جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مسلم یونیورسٹی سے اردو میں چار طلبہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ان کے نام اور موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ جمال شریف: دلّی سے پہلے اردو شاعری کی دکن میں نشوونما۔
۲۔ ساجدہ سیدی: حسرت عظیم آبادی زندگی اور شاعری
۳۔ نیر اقبال: اردو قواعد نویسی
۴۔ اسلم رضوی: PHONETICS AND PHONOLOGICAL STRUCTURE OF URDU

مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی پر دو نئی کتابیں

کراچی ۔۔ فروری ۱۹۶۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی پر دو نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

طیب انصاری

عہد آصفی کے اردو اخبارات

اخبارات کا کام صرف "مخبری" نہیں ہوتا بلکہ یہ سماج اور تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں ترقی پسند اقدار اور اصولوں کے تحفظ کے ذریعہ اہم ذریعہ بھی انجام دیتے ہیں یہ کہیے کہ وہ "خبر رسانی" کا کام کرتے ہیں لیکن خبر رسانی کا یہ فرض کچھ اس انداز میں پورا کیا جاتا ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں چونک پڑتی ہیں۔ قومی تحریکیں ہوں کہ انفرادی کوششیں سبھی ان ہی اخبارات کے ذریعہ ... ہیں ... کے خوابوں کی تکمیل میں ان روزناموں کا اہم رول رہا ہے۔ اخبار درحقیقت صحیفہ ہوتا ہے اعلیٰ ترین اقدار اور اعلیٰ ترین اصولوں کا۔ انسانیت کے ارتقا میں ان اخبارات نے جو رول ادا کیا ہے اور آج کے اس جمہوری ... دور میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان میں ان ہی اخبارات کا اہم حصہ ہے جدید تہذیب ان ہی اخبارات کی زندگی سے عبارت ہے دنیا میں جتنے بڑے انقلاب آئے ہیں ادھر بیسویں صدی میں اور اس سے ایک صدی قبل بھی، یہ تمام کے تمام ثمرات اخبارات ہی کا حاصل ہیں چنانچہ خود حیدرآباد کی تہذیب کی تشکیل و ترتیب میں حیدرآباد کے اردو اخبارات نے گراں قدر فرض انجام دیا ہے حیدرآباد کی تہذیب کو سمجھنے یہاں کے احوال سے قریب ہونے اور حیدرآباد کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر رکھنے کے لیے حیدرآباد کے اخبارات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے بلکہ ان اخبارات کے مطالعہ کے بغیر حیدرآباد کی تہذیبی، معاشرتی، تمدنی، ادبی اور سیاسی زندگی کی تاریخ لکھی نہیں جا سکتی۔

ویسے تو حیدرآباد ... سے اخبارات کی اشاعت کا آغاز حاجی کرتا ز کے روزنامہ "شوکت الاسلام" سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا تھا لیکن رسائل کی زندگی کا آغاز تو طبی اسکول کے "رسالہ طبابت" سے ہوتا ہے جو سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مختلف ... سہ ماہی، دو ماہی، پندرہ روزہ اور ہفتہ وار رسائل شائع ہونے لگے۔ "شوکت الاسلام" بھی درحقیقت ۱۸۷۶ء سے ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا جو بعد کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ سلطان محمد عاقل نے "ہزار داستان" کے نام سے ۱۸۸۵ء میں روزنامہ جاری کیا جو چار سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا امجد علی اشہری نے ۱۸۸۵ء میں "سفیر دکن" اور ۱۸۸۷ء میں "اخبار آصفی" جاری کیا۔ افسر الملک تو فوجی عہدہ دار لیکن انھیں سماجی قدروں اور ادبی سرگرمیوں سے انس سا تھا وہ ادب کے شیدائی تھے اس وجہ سے وہ حیدرآباد کی سماجی زندگی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ "افسر الاخبار" کا اجرا ان کے ادبی ذوق اور حیدرآبادی زندگی کے لیل و نہار سے دلچسپی کا مظہر ہے۔ بعد کو یہ اخبار بند ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک ماہنامہ "افسر" (۱۸۹۰ء) جاری کیا۔ جس سے مولوی ... اور محب حسین بھی منسلک رہے ہیں "مشیر دکن" کا اجرا ۱۸۹۷ء ... ہوا۔ اس کے ایڈیٹر کشن راؤ تھے۔ یہ اخبار آج بھی جیسا تیسا شائع ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں صادق حسین نے "علم و عمل" کے نام سے روزنامہ جاری کیا تھا لیکن محب حسین درحقیقت حیدرآباد میں اردو صحافت کے بانی ہیں جنھوں نے ۱۹۰۴ء میں اسی نام سے دوسرا روزنامہ جاری کیا اور صحافت کی صحت مند قدروں کی بنا بھی ڈالی۔ پروفیسر زینت ساجدہ کے الفاظ میں یہ "دکن کے نیچری" ہیں اور اردو صحافت کے "معمار اولین" کہ جنھوں نے اپنے زور قلم سے حیدرآبادی تہذیب میں انقلاب تازہ کیا۔ اپنے افکار و خیالات کے ذریعہ سماجی قدروں کو بدلنے اور فرسودہ روایات کو مٹانے کی پیہم جد و جہد کی۔ نسوانی زندگی میں نئی تبدیلیوں کو لانے کی جو جد و جہد محب حسین نے کی ہے اس کی مثال حیدرآباد کی سماجی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ محب حسین کے حیدرآبادی خواتین پر بڑے احسان ہیں کہ انھوں نے خاتون دکن کو انگلدانی تہذیب سے کچھ باہر لانے اور جہالت کے پردوں سے اجالوں کی دنیا میں پہنچانے کا اہم اور مشکل ترین کام انجام دیا ہے۔

"صحیفہ" اسی دور میں ... نامہ تھا جو ۱۹۰۵ء میں "موسوم بہ اسم تاریخی" جاری ہوا۔ رضی الدین کیفی اس کے ایڈیٹر تھے لیکن دوسری بار ۱۹۱۰ء میں ادارہ معارف کی طرف سے جاری ہوا اور ادارت کی ذمہ داری اکبر علی کو سونپی گئی۔ "صحیفہ" "خادم ادب" تو تھا ہی یہ دور اس کا سب سے پہلا "خادم ملک و ملت" ہونے کا دعویدار بھی بن گیا اور ۱۹۱۲ء میں محمد مظہر کے زیر ادارت روزانہ شائع ہونے لگا اس سے قبل ۱۹۱۱ء میں "معارف" نامی ایک روزنامہ بھی جاری ہوا تھا لیکن تفصیلات ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ "صحیفہ" کے بعد جس اخبار نے حیدرآبادی معاشرہ کو زیادہ متاثر کیا ہے وہ "رہبر دکن" ہے "رہبر دکن" کو مولوی احمد محی الدین نے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا اور حیدرآباد کا یہ ممتاز اخبار حیدرآباد کی سیاسی تبدیلیوں تک زندہ رہنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں بند کر دیا گیا۔ "رہبر دکن" کا آخری دور حیدرآباد کی سیاسی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے مسلم سیاست پہلی بار قومی سیاست سے دست و گریباں ہوئی۔ شب و روز کے بدلتے ہوئے حالات میں "رہبر دکن" نے مسلم نواز حکمت عملی اختیار کی اور اس وجہ سے "اتحاد المسلمین" طبقہ میں بے حد مقبول رہا۔ ۱۹۱۲ء میں حیدر رضا شاہ نے "عثمان گزٹ" جاری کیا جو ایک عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ احمد عارف اور علی اشرف صحافت کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے "صبح دکن" کے ذریعہ صحافت کو نئی قدروں سے روشناس کرایا۔ ۱۹۲۷ء میں بابائے صحافت وقار احمد نے "نظام گزٹ" جاری کیا جو ان کے انتقال کے بعد بھی سال گزشتہ تک دیکھتا رہا۔ "نظام گزٹ" حضور نظام حضرت آصف سابع مرحوم کا آرگن بن گیا تھا۔ اس میں ان کے کلام کے علاوہ "فرمان" بھی شائع ہوتے تھے۔ "رعیت" حیدرآباد کے قوم پرست اخبارات میں کافی اہم جگہ رکھتا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹... تک نرسنگ راؤ کے زیر ادارت جاری رہا نرسنگ راؤ ... بھی تھے ... سیاسی آدمی بھی ... "رعیت" ... [illegible]

[illegible] الاسلام، صدق جدید "تک پہنچتے پہنچتے بلد کے اخبارات سیاسی انقلابات کے نقیب بن چکے تھے۔ اب وہ سادہ لوحی باقی نہ رہی تھی جو محبِ حسین کے اخبارات کا طرہ امتیاز تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہندوستان مختلف سیاسی و سماجی تحریکات کی جولان گاہ بن گیا تھا۔ اس کا لازمی اثر دکن پر بھی پڑا۔ حیدرآباد میں قومی تحریکوں میں حصہ لینے کا آغاز ہوا۔ ریاست کی دساس جو انقلابات آئے ہیں ان کی تاریخ جاننے کے لیے "رہبرِ دکن" اور "رعیت" کے ساتھ ساتھ "وقت" اور "منشور" کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان اخبارات کو ایک کے بعد دیگرے عبدالرحمٰن رئیس نے ۱۹۳۰ء میں جاری کیا۔ "پیام" کی شہرت قاضی عبدالغفار کے قلمی کاوشوں کا رہینِ منت ہے یا پھر یہ کہنا مشکل ہے کہ قاضی صاحب کی صحافی شہرت "پیام" کی وجہ سے رہی ہے "پیام" حیدرآباد کے ان اخباروں میں سے ایک تھا جس نے یہاں کی تہذیب کو بھی اور سیاست کو، دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ادب میں نئے رجحانات کی ترویج میں "پیام" نے گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ اپنے "عصر" پر محیط تھا اس وجہ سے اردو ادب میں بھی عصری" رجحانات دخیل ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۰ء تک قاضی صاحب مرحوم کے زیر ادارت جاری رہا بعد کو ۱۹۵۴ء تک اختر حسن صاحب کی نگرانی میں شائع ہونے کے بعد بند ہوگیا۔ اختر حسن صاحب کو "پیام" کی "باقیات الصالحات" میں سے سمجھنا چاہیے

"میزان" (۱۹۴۳ء) حبیب اللہ اوج کے زیر ادارت اور "تنظیم" علی اشرف کی نگرانی میں اور "امروز" (شعیب اللہ) ۱۹۴۷ء سے شائع ہوئے۔ "میزان" صحت مند اقدار کا علمبردار اخبار تھا۔ حیدرآباد کی سیاسی کشمکش کی پرچھائیاں یہاں بھی نمایاں ہیں ۱۹۴۸ء میں اور اس کے بعد حیدرآباد سے کئی اخبارات شائع ہوئے لیکن اس زمانہ میں حیدرآباد کا انضمام مکمل ہو چکا تھا۔ سیاست کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک "طوفان بلا" اٹھنے کے بعد چاروں طرف خاموشی اور سکوت کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ البتہ سسکیوں کی آوازیں زمانہ دراز تک سنائی دیتی رہیں۔ ان سسکیوں کو بعد کے اخبارات میں آپ سن سکتے ہیں۔ انقلاب (مرتضیٰ مجتہدی)، محب وطن (ایما ریڈی)، آواز (احمد عبدالقادر)، منزل (اطہر حسین رضوی)، ملاپ (یدھ ویر)، اقدام (مرتضیٰ مجتہدی)، نئی زندگی (رجے ابن شرما)، نقیب (رئیس الرحمٰن)، ہمدرد (نقش عالمی)، ہمدم (جمال الدین)، نازمانہ (سعادت جہاں)، ہمارا اقدام (زین العابدین)، نیا زمانہ (احمد اسد)، انگارے (مرتضیٰ مجتہدی)، انگارے (محسن فاروقی)، اپنا اقدام (شریف اسلم عابد آفاقی)، وطن (راشد بیگ)، امر بھارت (ستیہ کرپا چند)، اور صداقت (محمود الحسن)

"رہنمائے دکن" "حقیقت" "رہبرِ دکن" کے منصوبہ کے جبکہ جاری [illegible]
[illegible]

میں سیاست، رہنمائے دکن، ملاپ، انگارے اور مشیرِ دکن زندہ اخبارات ہیں آزادی سے قبل شائع ہونے والے اخبارات میں "سلطنت" (اسعد اللہ قادری) کافی اہمیت رکھتا تھا۔ "پیسہ اخبار" بھی جاری ہوا تھا جو عرصہ ہوا بند ہو گیا۔ کبھی کبھی شام کے وقت "رہبرِ وطن" کی آواز بھی سنائی دیتی ہے

۱۹۴۸ء کے نامساعد حالات میں اردو اخبارات نے حیدرآباد کی زندگی کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ذہنی انتشار، سماجی بحران اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنے میں "سیاست" اور "رہنمائے دکن" نے اہم حصہ ادا کیا ہے۔ "رہنمائے دکن" کا مزاج مسلم ہے لیکن اس خودی کو باقی رکھتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا اور حالات سے نمٹنے کی قوت و صلاحیت پیدا کرنا بھی کوئی غیر اسلامی جذبہ نہیں ہے۔ حالات سے مصالحت بڑی حکمتِ عملی ہے۔ "سیاست" نے اجرا ہی سے تہذیب کو متاثر کیا ہے لیکن ترقی پسند رجحانات کو عام کرنے اور مرحوم جاگیردارانہ مزاج کی جگہ نئی قدریں اور نئے رجحانات کو پھیلانے میں پیش پیش رہا ہے۔ عابد علی صاحب جامعہ عثمانیہ کے ترجمان ماہنامہ میں انھوں نے اپنی روش حالی سے روزنامہ "سیاست" کو صحت مند اقدار اور ترقی پسند خیالات کا علمبردار بنا دیا۔ اس اخبار کو حیدرآباد کے ممتاز صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کا تعاون حاصل ہے۔ جدید اخبارات کے بارے میں اس سے بھی کھل کر کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ "زندہ" ہیں صرف "تمہید" ہیں

ڈاکٹر ریاض الحسن

نواب احمد حسن خاں جوش لکھنوی

نواب احمد حسن خاں جوش[۱] متبنی سید مظفر علی خاں اسیر الملقب بہ مدبر الدولہ مدبر الملک، امیٹھوی کے ایک صاحب دیوان شاگرد تھے۔ نواب سمیع خاں کے بیٹے اور نواب محبت خاں محبت کے پوتے تھے۔ حافظ رحمت خاں کے پرپوتے تھے۔ جوش کی عرفیت "لچھے" تھی ۱۲۴۳ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۳ ہجری میں انتقال کیا لکھنؤ کے رہنے والے تھے ابتدا میں نواب عاشق علی خاں عاشور اور راسخ مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر اسیر کی شاگردی اختیار کی۔

جوش کے دو دیوان مسمی بہ "بہارستان جوش" و "چمنستان جوش" اور نثر میں ایک قصہ "فسانۂ جوش" شایع ہو چکے ہیں "چمنستان جوش" کا دوسرا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ۱۲۹۰ ہجری میں شایع ہوا جو راقم کے پیش نظر ہے اس میں ۲۲۸ صفحات ہیں ۱۹۷ صفحہ تک غزلیات کا سلسلہ ہے اس کے بعد قطعات تاریخ جو مختلف حضرات کی تصانیف ذکر ولادت، ذکر وفات اور سنین طباعت پر مشتمل ہیں اس دیوان میں درج ہیں اسیر کے بڑے صاحبزادے سید خصوص علی خاں حکیم نے اس دیوان پر ایک منثور تقریظ لکھی ہے جو صفحہ ۲۲۵ پر درج ہے۔ اس میں چند فارسی غزلیں بھی شامل ہیں۔ غزلیات کے خاتمہ پر مختلف شعرائے اردو کی غزلوں پر مخمس درج ہیں۔ ہر غزل کا نمبر اور اس کے اشعار کی تعداد غزل کے شروع میں لکھی ہے۔ دیوان کی اہمیت کا اندازہ اسیر کے اس قطعہ سے کیا جا سکتا ہے ؎

ہوا جو بار دگر طبع یہ کلام فصیح | کہ جس کا حسن ہے ارباب فہم پر ظاہر
لکھا اسیر نے تاریخ طبع کا مصرع | کلام جوش ہے قند مکرر و نادر

(سنہ ۱۲۹۰ھ)

جوش کے کلام میں آپ کو مختلف اثرات نظر آئیں گے۔ کہیں دبستان لکھنؤ کا عام اور مبتذل رنگ ہے تو کہیں سنجیدہ شوخی اور متانت، اکثر تصوف اور فلسفہ کے رموز بیان کر جاتے ہیں تو کبھی خاص تغزل کے بھی نمونے پیش کرتے ہیں۔ ابتدا میں اسیر کا رنگ بہت ہلکا ہے اور عام رنگ سخن صاف نمایاں ہے۔

جب استاد اسیر کا رنگ غالب آتا ہے تو اس طرح کے اشعار اچھے اشعار کے سامنے خس و خاشاک کی طرح دب جاتے ہیں۔ اس وقت جوش کے قلم فکر سے ایسے اشعار نظم ہوتے ہیں ؎

بتا بتا[۲] کے ہر بت اپنی زلف کا عاشق | گنا ہگار مرا بال بال کرتے ہیں

کس[۳] طرح کوچۂ قاتل سے کروں عزم سفر
میں یہاں خود نہیں آیا ہوں قضا لائی ہے

تجھ[۴] کو اس سلسلۂ زلف مسلسل کی قسم
اے شب ہجر نہ آ روز تماشے۔

ہم کو انداز بیان اور طرز ادا سے ان فرسودہ اور بیش پا افتادہ مضامین میں جوش نے کتنی جان ڈال دی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار جابجا ملتے ہیں جن میں غزل کی روایتی شان باقی رکھتے ہوئے اپنے مخصوص طرز فکر اور طریقۂ اظہار سے جوش نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ سادہ اور سلیس زبان میں سہل ممتنع اشعار کہنے پر ان کو بڑا ملکہ حاصل ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آہ[۵] سوزاں سے دل جگر نہ پھنکیں | آگ کا کام ہے جلا دینا
بحث گریہ میں آج ہاں اے چشم | ابر کی آبرو گھٹا دینا
و کریم و رحیم ہے اے رب | حوصلے سے مرے سوا دینا

رمزؔ رامپوری

غزل

جب سے دل میں ترے بخشے ہوئے غم ٹھہرے ہیں
محترم اور بھی اپنے لیے ہم ٹھہرے ہیں
دیکھتا یہ ہوں کہ شاید ترا کوچہ، ترا در
سوچتا یہ ہوں کہاں آ کے قدم ٹھہرے ہیں
ہم تری راہ میں اٹھے ہیں بڑے عزم کے ساتھ
گردش دہر بھی ٹھہری ہے جو ہم ٹھہرے ہیں
غم کو ہر دور میں ٹھہرایا گیا حاصل زیست
اور اس دور میں ہم صاحب غم ٹھہرے ہیں
صرف آنکھوں ہی میں کم رک نہ سکے میری رمزؔ
میرے آنسو کسی دامن پہ بھی کم ٹھہرے ہیں

۱؎ تذکرۂ اسیر سخن از کیفی جلد سوم مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد طبع اول صفحہ ۶۶۲ و "سخن شعرا" از عبد الغفور خاں نساخ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء صفحہ ۱۱۷ و "خمخانۂ جاوید" جلد دوم صفحہ ۲۸۶ از لالہ سری رام مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء

۲؎ "چمنستان جوش" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۰ھ صفحہ ۲۲۳۔

۳؎ "چمنستان جوش" صفحہ ۹۶

۴؎ " " " ۱۴۵

۵؎ " " " ۱۰۰

۶؎ " " " ۲۶

وہ بے ثباتیِ حیات کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ اس کو تفریحِ طبع کا سامان قرار دے کر کیا کیا مزے لیتے ہیں مثلاً ؎

ہوا ثابت مآل دولتِ دنیا فقیری ہے[1]
الٹ کر دیکھئے اقبال کو تو لا بقا ٹھہرا

یعنی لفظ اقبال کے ہجے اگر الٹی طرف سے کیے جائیں تو یہی ل اب ق ا (لا بقا) بن جاتا ہے۔

جوش کے اکثر اشعار میں رومانویت (جو غزل کی جان ہے) بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایسے اشعار لکھتے وقت ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسی عالم میں وہ بعض مزے دار اشعار لکھ ڈالتے ہیں مثلاً ؎

ہم تو کہتے تھے زیادہ نہ بڑھاؤ گیسو[2] اب تمہیں دیکھو کہ یہ بار کمر کس کا ہے

بڑھا کے زلف الجھتے ہو ہم نہ کہتے تھے[3] تمہیں کہو یہ بلا اب وبال ہے کہ نہیں

بگڑی زلفوں کو میں بناتا ہوں[4] عیب اپنا مرا ہنر دیکھو

اڑ گئے ہجر میں آہوں سے دھوئیں کی مانند[5]
پانی پانی ہے خیالِ سیہ کا رگھٹا

زبان اور محاورہ کی چاشنی مندرجہ ذیل اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے ؎

آ کے بیٹھو گے تو ہو جائے گا محشر برپا[6]
اٹھ کے جاؤ گے جو محفل سے قیامت ہوگی
ان سے آنے کو جو کہتے ہیں تو فرماتے ہیں
خیر آئیں گے کسی روز جو فرصت ہوگی

لطیف شوخی میں بھی جوش کو بڑا دخل ہے مثلاً ؎

تیری دعوت کے لیے اے غمِ جاناں ہم نے[7]
دلِ بیتاب کو پہلو میں لگا رکھا ہے
کشتۂ زلف کے لٹکائے ہیں دو چلاتے
اپنے گھر کا یہ ستمگر نے پتا رکھا ہے

دیوان[8] "گلدستۂ شعراء" مطبوعہ ۱۸۶۰ء کے ایک شمارہ میں جوش کی مختصر ایک مثنوی "نامۂ عشق بہ معشوق شعر بتیابیٔ دل پرخروش" شایع ہوئی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

قاصدا تو ہی جانِ عاشق ہے قاصدا تو ہی دمِ ناطق ہے

پھر ۲۳ اشعار کے بعد ایک غزل درج ہے جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے ؎

اس میں ہندو ہے یا مسلماں ہے بہ صدا دل سے تیرا خواہاں ہے

اور مثنوی کا آخری شعر یہ ہے ؎

مال و زر تجھ کو دوں گا اے قاصد تیرا ممنوں رہوں گا اے قاصد

اس مختصر مثنوی میں کل ۱۰۹ اشعار ہیں مثنوی کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے پیشِ نظر گلدستہ میں اس مثنوی کے علاوہ متعدد غزلیات، مخمسات، تضمینات اور قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ ایک نعت سرورِ کائنات، ایک قصیدہ درمنقبت حضرت امام حسنؑ و حضرت امام حسینؑ اور ایک فارسی تضمین بھی موجود ہے نعت ۹ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع درج ذیل ہے ؎

فخرِ آدم، رحمتُ اللعالمیں ہیں مصطفیٰؐ رہبرِ راہِ خدا، سلطانِ دیں ہیں مصطفیٰؐ

نعت میں وہی روایتی انداز ہے جو محسن کاکوروی سے پہلے عام طور پر اردو شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ قصیدۂ منقبت بھی نامکمل شایع ہوا ہے اور صرف ۱۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ عنوان میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے

"چند اشعار از العصر بطور قصیدہ درمنقبت سرورِ دارین حضرت امام حسنؑ و حضرت امام حسینؑ رضی اللہ تعالیٰ عنہما از تصنیف نواب محمد روح الصدور"

قصیدۂ منقبت سے قبل مذکورہ نعت درج ہے۔ قصیدہ کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں ؎

مہ و خورشید سے مشہور سوا دونوں ہیں شمعِ عرفاں کی ضیا، نورِ خدا دونوں ہیں
منہ اٹھائے نکو ہے، یہ حرم ہیں اس کی شرط ہے لطف و کرم، اس کی جزا دونوں ہیں
اپنے سائل کو طلب سے بھی سوا دیتے ہیں واہ کیا نامِ خدا اہلِ سخا دونوں ہیں
صدقۂ فقر سے اے جوش پریشاں کیوں ہو تیری امداد کو بہ عقدہ کشا دونوں ہیں

جوش کا کلام اپنے عہد کا مخصوص ترجمان ہے۔ لکھنوی رنگِ سخن کی اصلاح اسیر، امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، انیس، دبیر اور محسن کاکوروی نے جس طرح اپنے رفقت، استعداد اور مذاق کے مطابق کی اسی کو مکمل سے مکمل تر بنانے کا کام ان حضرات کے سلسلہ کے دوسرے شعراء نے جاری رکھا۔ جوش کا نام بھی اس زمرہ میں ایک ممتاز جگہ کا حامل ہے، مگر یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ کافی تلاش و جستجو کے باوجود جوش کا مزید سرمایۂ کلام اور ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں۔ قارئین کرام اور اربابِ علم سے گذارش ہے کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈال کر مقالہ کی تشنگی دور کرنے کی سعی بلیغ کریں گے۔

---

[1] "چمنستانِ جوش" صفحہ ۱۴
[2] " " ۱۴۱
[3] " " ۸۲
[4] " " ۱۰۱
[5] " " ۲۵
[6] " " ۱۱۵
[7] " " ۱۲۳
[8] جلد (۱) نمبر ۱۲ کالم ۱ و ۲ صفحہ ۱۰ تا ۱۳

مراسلات

بسلسلۂ داغ دہلوی

"ہماری زبان" بابت ۸ نومبر ۱۹۶۷ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء پیش نظر ہیں جن میں جناب دیریندر پرشاد سکسینہ اور جناب ظفر الاسلام ظفر صاحب نے داغ کے شاگردوں کے سلسلے میں سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی کے نام لیے ہیں۔ ایک نے اقرار شاگردی کے ساتھ دوسرے نے انکار کے ساتھ۔

جہاں تک سیماب کا تعلق ہے وہ یقیناً داغ کے شاگرد تھے اور شاگرد خاص تھے ظفر الاسلام ظفر صاحب نے اس سلسلے میں مولانا احسن مارہروی کا ایک حوالہ نقل کیا ہے جو قابل سند ہے، دوسرے حضرات نے بھی یہی لکھا ہے، لیکن اس سلسلے میں دور جانے کی ضرورت نہیں خود سیماب اکبرآبادی صاحب نے اس کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے چنانچہ نگار ۱۹۳۵ء (اردو شاعری نمبر) کے صفحہ ۲ پر "آگرہ اور دلی کا شاعرانہ تعلق" کے تحت لکھتے ہیں

> "آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۹ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کر کے آگرے اور دلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا۔"

اس بیان سے صرف یہی نہیں کہ سیماب کا داغ کا شاگرد ہونا ثابت ہو جاتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کب اور کس عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے۔

جگر کے سلسلے میں البتہ کچھ وثوق سے کہنا مشکل ہے، ہرچند کہ راقم الحروف نے بھی فروری ۱۹۶۶ء نگار میں (صفحہ ۳۳) پر جگر کو داغ کا شاگرد ظاہر کیا ہے، لیکن یہ یاد نہیں کہ کہاں دیکھا تھا اور کس بنا پر ایسا لکھ دیا۔ بہر حال یہ بات قابل توجہ ہے کہ نگار کے داغ نمبر میں پروفیسر نفیس سندیلوی نے "بقول نوح ناروی" لکھ کر جگر کو داغ کا شاگرد بتایا ہے۔

اگر نوح کا یہ قول کہیں تحریری صورت مل جاتا تو بات بن جاتی مشکل یہ ہے اسی داغ نمبر میں "فصیح الملک حضرت داغ دہلوی" کے عنوان سے نوح ناروی کا مضمون بھی صفحہ ۲۵ پر موجود ہے اس میں نوح صاحب نے صفحہ ۲۸ پر داغ کے ممتاز شاگردوں کے نام گنوائے ہیں۔ اس میں جگر مرادآبادی کا نام نہیں ہے۔ پھر کونسا ماخذ ہے جس کی بنا پر نفیس سندیلوی نے نوح کے حوالے سے جگر کو داغ کا شاگرد قرار دیدیا۔ ظفر الاسلام صاحب نے اپنے بیان کے لیے جو حوالے درج کئے ہیں وہ بھی قابل توجہ تھا، محض یہ بات کہ جگر چونکہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اس لیے داغ کے شاگرد نہیں ہو سکے چنداں قابل اعتماد نہیں اس لیے کہ تاریخ ادب میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ ۱۲-۱۳-۱۰ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے ہیں اور علوم مروجہ سے فارغ التحصیل ہو گئے ہیں اس لیے ۱۹۰۵ء میں داغ کی وفات اور ۱۸۹۰ء میں جگر کی پیدائش حتمی طور پر استادی شاگردی میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اس پر مزید غور و خوض اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔

(فرمان فتحپوری)

کچھ ہماری زبان کے بارے میں

"ہماری زبان" مورخہ یکم فروری ۱۹۶۷ء کے صفحہ گیارہ پر یونیورسٹیوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "یونیورسٹیاں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ غریب کی بھابی بن کر رہ گئی ہیں" اس علاوہ مثل مشہور ہے کہ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ اردو لغت میں تشریح یہ کی جاتی ہے کہ غریب کی بیوی کو سب لوگ بھابی کہتے ہیں لیکن اپنی بیوی وہ اپنا کہتے ہیں، غریب کی بیوی کے مدے غریب کی بھابی نہیں ہوتے۔ اگر یہ وضاحت صحیح اور قابل قبول ہے تو غالباً راقم نے کہاوت کا صحیح استعمال نہیں کیا یا کاتب سے غلطی سرزد ہوئی۔

ہماری زبان میں "یہ اصغر" اور "مکتوب لندن" دونوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ ان عنوانات کے تحت بہت مفید مضامین تحریر کئے جاتے ہیں اور قارئین کی معلومات میں نہایت مفید اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری زبان کی ترتیب میں بھی خوشگوار تبدیلی کی گئی ہے۔ البتہ نئی ترتیب کی وجہ سے ہماری زبان میں نظمیں، غزلیں، قطعات وغیرہ بہت کم کر دئے گئے ہیں جو پہلے ہی سے کافی کم تھے اور ایک صفحہ سے زائد جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ غالباً ایک دو غزلیں اور ایک دو نظمیں وہ بھی آزاد و معرا شائع کی جا رہی ہیں۔ اور ان کے لکھنے والے بھی مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔

(بشیر احمد شہید اکولہ)

لفظ اردو کے ماخذ کے سلسلے میں

قومی زبان (کراچی) جلد ۲ شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۸ء صفحہ ۱۷ کے حاشیہ میں درج ہے "۱۵ جنوری ۱۹۵۸ء کو دلی میں جو کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی اس کی سبجکٹ میٹنگ میں ڈاکٹر محمود صاحب نے یہ تحقیقی نکتہ ظاہر فرمایا تھا کہ اردو "سنسکرت کے لفظ اردو سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں مکسچر (یعنی زبانوں کا مکسچر) براہ کرم اس پر کسی اشاعت میں تبصرہ فرمایا جائے۔ اور سنسکرت لفظ کو اصلی لپی (دیوناگری) میں لکھا جائے۔

(سجاد مرزا)

نوٹ:۔ یہ کانفرنس ۱۵ فروری کو ہوئی تھی ڈاکٹر محمود صاحب صرف افتتاحیہ اجلاس میں شریک تھے مجلس مضامین میں وہ موجود تھے نہ یہ مسئلہ وہاں آیا تھا۔ اردو ترکی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ (ادارہ)

مکتوب لندن

ہفت روزہ ایشیا کی کتابت اور طباعت کے معیار میں اضافہ

تین فروری کے ہفت روزہ ایشیا کے معیار کتابت اور طباعت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے امید ہے یہ جریدہ اپنے معیار کو قائم رکھتے ہوئے اسے اور دلچسپ بنانے کی کوشش جاری رکھے گا اس ہفتہ جو با انعامی مضامین کے سلسلے کا عنوان ہے "آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے" اس پر پہلا انعام دو گنی اور ایک سال کے لئے "ایشیا" کا اجرا ہوگا چونکہ یہ مقابلہ برطانیہ میں مقیم اہل قلم حضرات کے لئے مخصوص ہے اس لئے بیرونی ممالک کے اصحاب اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد کا عنوان ہے "برطانیہ کے مالی بحران میں ہمارے فرائض کیا ہیں"

اردو میں قلمی دوستی

ہفت روزہ "مشرق" میں شائع شدہ ایک خط کا اقتباس۔

"میرا نام صلاح الدین اور لقب حسین ایوبی ہے مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر برطانیہ کے مختلف اسکولوں میں پڑھنے والے طالب علم مجھے اردو میں خط لکھا کریں۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ اس کی اردو میں مشق جاری رہے تاکہ اس پردیس میں آنے کے بعد وہ اسے بھول نہ سکے لیکن اس کے باوجود یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمیں اردو میں لکھنے پڑھنے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں اردو زبان سے محبت ہونے کے باوجود ہم آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں؛

ہمیں یقین ہے کہ برطانیہ کے علاوہ ہند و پاکستان کے طلبہ بھی صلاح الدین ایوبی سے سلسلۂ مراسلت شروع کریں گے پتہ یہ ہے۔

SALAHUDDIN AYYUBI'
64, COLNE ROAD, BRIERFIELD,
NELSON, (LANCS), U.K

برطانیہ میں ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ

اپنے تازہ اداریہ کے ذریعہ "مشرق" نے برطانوی حکومت سے احتجاج کیا ہے کہ اس ملک میں ہند و پاکستان سے واؤچر پر آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو ان کی تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ تجربہ کے مطابق کام مہیا نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی انگریزی زبان کی قابلیت کو مشکوک قرار دے کر ان سے نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ "تعجب ہے کہ دو سو سال تک ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینے کے باوجود یہاں کے متعصب لوگ انگریزی زبان کے معیار کو مشکوک قرار دیتے ہیں حالانکہ اس زبان کو وہ پچھلی تین یا چار پشتوں سے پڑھتے آئے ہیں۔ انگریز یہاں بگلا بھگت HYPOCRITES واقع ہوئے ہیں اس لیے اس غیر ضروری بہانہ سازی کا بھرم یہاں اس وقت کھلتا ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں یہ انگریز انگریزی سے قطعاً نابلد ہندوستانیوں کی انگریزی خوب سمجھ لیتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی انگریزی کے معیار کی تعریف کرنا بھی نہیں بھولتے لیکن نسلی امتیاز برتتے ہوئے ملازمت نہ دینے کا بہانہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ "تمہاری انگریزی معیاری نہیں" یہ علیحدہ بات ہے کہ جس معیار کی انگریزی یہاں انگریزوں سے سننے میں آتی ہے اس پر جانے کسی کا جی ماتم کرنے کو کیوں نہ چاہے"

مشرق نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے معیار کا اندازہ برطانوی حکام اگر ہند و پاکستان میں ہی لگا لیں تو بہتر ہے اور یہ کہ واؤچر صرف انہی لوگوں کو دیا جائے جنھیں موزوں کام مل سکتا ہے ورنہ یہاں مزدوروں کی آبادی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس عاملہ کا انتخاب

جودھپور بتاریخ ۲۸ جنوری بروز اتوار شام کو چار بجے حویلی خانجی واقع محلہ ببہ میں زیر صدارت جناب ہیتو دان صاحب اُجوّل، انجمن ترقی اردو، جودھپور کا عام جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل کارروائی عمل میں آئی۔

(۱) جنرل سکریٹری جناب وحید اللہ خاں صاحب نے سال گزشتہ ۱۹۶۷ء کے اجلاس کی میٹنگ کی روئداد پڑھ کر سنائی جس کی تصدیق باتفاق رائے کی گئی۔

(۲) جنرل سکریٹری نے ۱۹۶۷ء کا حساب آمد و خرچ پیش کیا جو باتفاق رائے منظور کیا گیا۔

(۳) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ حسب دفعہ ۲ (ب)، انجمن کی شاخوں کے قواعد کے مطابق انجمن ہٰذا کی شاخ ضلعی شاخ شمار کی جائے۔

(۴) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ حسب ذیل حضرات نے بڑی کاوش سے ممبر سازی کی ہے لہٰذا ان کا انجمن ہٰذا کی جانب سے شکریہ ادا کیا گیا اور آئندہ کے لیے انجمن کو امید ہے کہ یہ صاحب اپنے تعاون سے نوازتے رہیں گے۔

(۱) جناب ظہور احمد صاحب (۲) توقیم الظفر صاحب وقار رحمانی کوٹوی (۳) جناب محمد انعام صاحب (۴) جناب شیخ عبدالستار صاحب (۵) جناب محمد عثمان صاحب عثمان جودھپوری (۶) جناب غیور احمد صاحب ایڈوکیٹ۔

(۵) جنرل سکریٹری نے ظاہر کیا کہ سال گذشتہ ۱۹۶۷ء میں میں سو دس ممبر ہوئے اور ان سے مبلغ ایک سو چون روپیہ اور پچیس پیسے فیس ممبری کے وصول ہوئے لہٰذا باتفاق رائے یہ طے پایا کہ زیر دفعہ ۷ (ساٹ) انجمن کی شاخوں کے قواعد آمدنی کا دسواں حصہ یعنی مبلغ سولہ روپے ریاستی شاخ کو ادا کر دیا جائے۔

(۶) جنرل سکریٹری نے کل راجستھان اردو سمپوزیم منعقدہ نومبر ۱۹۶۴ء کی روئداد کا حساب آمد و خرچ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء تک کا پیش کیا۔

(۷) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ ممبران انجمن ترقی اردو جودھپور سے زیر دفعہ ۶ (ج) انجمن کی شاخوں کے قواعد کی سالانہ فیس صرف چار آنہ لی جائے۔

(۸) انجمن ترقی اردو، جودھپور کی منتظمہ کمیٹی کے عہدے داران و اراکین کی سالانہ فیس ایک روپیہ لی جائے جس کو باتفاق رائے طے کر لیا گیا۔

(۹) باتفاق رائے طے کیا گیا کہ جتنے نمائندگان انجمن ہٰذا سے ریاستی شاخ کے لیے منتخب کئے جائیں ان کو زیر دفعہ ۶ انجمن کی شاخوں کے قواعد تین روپیہ سالانہ جمع کرنا ہوگا۔

(۱۰) باتفاق رائے جناب وحید اللہ خاں صاحب کو اور جناب شیام لال جی صاحب شرما کو ریاستی شاخ کی منتظمہ کمیٹی کے لیے حسب دفعہ ۳ (ب)، انجمن کی شاخوں کے قواعد کے مطابق نامزد کیا گیا۔

(۱۱) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ جامعۂ اردو علی گڑھ سنٹر جودھپور کو بطور امداد مبلغ ایک سو پچاس روپیہ ادا کیا جائے۔

(۱۲) جامعہ اردو، علی گڑھ سنٹر جودھپور سے سال گزشتہ میں جن طلبہ و طالبات نے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ان کو اسناد صاحب صدر جناب ہیتو دان صاحب اُجوّل نے اپنے دست مبارک سے پیش کیں اور صاحب صدر و تمام اراکین نے اظہار مسرت و اطمینان کیا اور الحاج مولانا مولوی مفتی اشفاق حسین صاحب نعیمی و دیگر اراکین مرکز کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی کاوش سے مرکز میں طلبہ و طالبات کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور ان کی تعلیم کا بھی مکمل انتظام ہے۔

(۱۳) باتفاق رائے حسب ذیل حضرات پر مشتمل سال رواں کے لیے منتظمہ کمیٹی کا انتخاب ہوا۔

(۱) جناب ہیتو دان صاحب اُجوّل سابق کمشنر و چیرمین راجستھان بورڈ آف ریونیو (صدر)

(۲) جناب الحاج قاضی عبد الجلیل صاحب سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (نائب صدر)

(۳) جناب شیام لال جی صاحب شرما سابق سب ڈویژنل آفیسر (نائب صدر)

(۴) جناب وحید اللہ خاں صاحب وحید جودھپوری سابق ڈائرکٹر آف ٹرانسپورٹ راجستھان (جنرل سکریٹری)

(۵) جناب ماسٹر عبد القیوم صاحب اطہر جودھپوری (جوائنٹ سکریٹری)

(۶) جناب توقیم الظفر صاحب وقار رحمانی کوٹوی ادیب کامل (اسسٹنٹ سکریٹری)

ممبران :-

جناب پروفیسر پرکاش نرائن صاحب نیری داستو ڈپٹی رجسٹرار جودھپور یونیورسٹی۔ پروفیسر محمد ہاشم صاحب قریشی ہسٹری ڈپارٹمنٹ جودھپور یونیورسٹی۔ جناب لالہ جونت نارائن صاحب ایم۔ اے اردو، سابق جج راجستھان جناب سوہن جی سن سکریٹری ریلوے انسٹی ٹیوٹ جودھپور

جناب جگت نارائن صاحب ماتھر
جناب دین دیال صاحب شرما سابق ڈویژنل کمرشیل آفیسر ناردرن ریلوے جودھپور
جناب سنتوش سنگھ جی صاحب کچھا دا سابق ایم۔ ایل۔ اے
جناب خان مرزا صاحب جاگیردار محمد ابراہیم صاحب
الحاج امداد علی صاحب۔ الحاج محمد حاجی صاحب ٹھیکیدار
جناب محمد عالم عثمان صاحب عثمان جودھپوری۔ جناب محمد حسین صاحب مبشر جودھپوری۔ الحاج بابو رحمت اللہ صاحب۔ جناب ایس۔ ایم۔ یوسف حسین صاحب جناب شیخ عبد الستار صاحب۔ جناب ڈاکٹر کشن سنگھ جی صاحب دیوڑا سابق میڈیکل آفیسر جودھپور۔

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی ہیت کی مجلس عاملہ کا انتخاب

بیتی ۔ ۔ ۱۱ ۔ سال من انجمن ترقی اردو دہلی ہیت کی مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ بصدارت جناب عبد الحفیظ نعیمی صاحب وکیل صدر انجمن برمکان صدر موصوف منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق رائے مندرجہ ذیل صاحبان آئندہ تین سال کے لیے انجمن کے عہدے ۔ ۔ ۔ منتخب ہوئے۔

۱۔ جناب عبد الحفیظ نعیمی صاحب وکیل ۔ صدر (۲) جناب سید عبد الجلیل حسنی صاحب پرنسپل ۔ نائب صدر (۳) جناب حاجی محمد ظہیر صاحب۔ نائب صدر (۴) جناب محمد بدر الحسن قادری صاحب جنرل سکریٹری (۵) جناب مرتضیٰ علی قادری صاحب ۔ جوائنٹ سکریٹری (۶) جناب محمد عمر صاحب نہال۔ سکریٹری نشر واشاعت (۷) جناب امان اللہ خان صاحب وکیل خازن۔

اس کے علاوہ انیس ممبران مجلس عاملہ کے لیے منتخب ہوئے۔
(محمد بدر الحسن صاحب قادری جنرل سکریٹری)

جشن غالب کے موقع پر انجمن ترقی اردو گوالیار کا پروگرام

گوالیار۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۶۸ء کے تاریخی دن اور مبارک موقع پر عظیم شاعر اور نثار مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء میں منانے کے سلسلے میں، ساہتیہ سدن، گوالیار میں شب کے سات بجے شہر کے معزز علم دوست حضرات، فن کار، ادیب، مصور اور مخلص حضرات کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں "غالب صد سالہ برسی انتظامیہ کمیٹی" کی تشکیل ہوئی۔

میٹنگ میں یہ طے پایا کہ کمیٹی ایسے گوناگوں پروگرام مرتب کرے جو مرزا غالب کی حیات کے سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں نیز میٹنگ میں متعدد تجاویز غالب کی یادگار منانے کے لیے پاس کی گئیں۔ دیگر تجاویز کے علاوہ کمیٹی غالب کے بارے میں دستور اساسی کی ۱۶ زبانوں میں ایک کتاب شائع کرے گی جس میں غالب پر ببلوگرافی (BIBLIOGRAPHY) بھی شامل ہے۔ غالب کے متعلق شہر کے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے تحریری۔ تقریری، مصوری اور موسیقی کے مقابلے بھی کرائے جائیں گے۔ جناب کاشی ناتھ گیا نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ جناب اسلام الدین اس کمیٹی کے کنوینر مقرر ہوئے انتظامیہ کمیٹی کے ۲۲ ممبران چنے گئے۔
(اسلام الدین کنوینر غالب صد سالہ انتظامیہ کمیٹی جے اندر گنج گوالیار آندھرا پردیش)

انجمن ترقی اردو گورکھپور کی جانب سے جشن غالب منانے کا فیصلہ

گورکھپور ۴ رفروری کو دفتر "اشتراک" میں سہ پہر تین بجے انجمن ترقی اردو شاخ گورکھپور کی ایک میٹنگ ہوئی۔ جس کی صدارت عالی جناب برج موہن سہائے ملک جی صدر انجمن ترقی اردو گورکھپور نے کی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ بدیع الزماں اعظمی ایم کوٹھیا دی راہی۔ اشفاق احمد اعظمی۔ عبد الحنان مظاہری۔ جوہر وارثی۔ پیام گورکھپوری جالب نعمانی۔ پروفیسر اعجاز احمد اور دیگر ممبران انجمن کی متفقہ رائے پر طے پایا کہ گورکھپور میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے اعلیٰ پیمانہ پر جشن غالب منایا جائے۔ اس سلسلہ میں گورکھپور کی ہندی اردو کی ادبی انجمنوں اور اہم ادبی اداروں کے عہدہ داروں کو بھی مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک استقبالیہ کمیٹی بھی بنائی گئی۔ (سکریٹری انجمن ترقی اردو گورکھپور)

انجمن ترقی اردو ودیشہ میں شعری نشست

بھوپال۔ انجمن ترقی اردو ودیشہ نے جنگ آزادی کے مجاہد شاعر نشاں علی سرور مرحوم کا دن منایا۔ انجمن کے صوبائی دفتر میں یہاں جو اطلاع موصول ہوئی ہے اُس کے مطابق اس جلسہ کی صدارت علامہ محوی صدیقی نے کی۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں علامہ محوی صدیقی، مولانا صدر الدین صدر، چودھری وارث علی، عاشق علی، محمد اسمٰعیل ناشاد، گوہر جلالی، منیر محوی، سردار مہندر سنگھ آتر، منظور کوثر، عزیز، نثار، ریاض، رشید، مشتاق، اختر فاروق علی صاحبان نے اپنا کلام سنایا۔
(حسنات صدیقی آفس سکریٹری مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو)

سے نہ دیکھتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں ابلاغ کا عمل ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ریڈیو کے ٹرانسمیٹر (TRANS MITTER) اس کی میڈیم اور اس کے رسیور کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ٹرانسمیٹر کتنا ہی زوردار ہو، اگر رسیور اس موج کو نہیں پا سکتا تو اسے کچھ حاصل نہ ہوگا اور اگر میڈیم میں خامی ہوگی تو بھی رسیور کچھ نہ کر سکے گا۔ آج ابلاغ کے سلسلے میں جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں۔ ہر دور میں انفرادیت رکھنے والے شعرا کی بات سمجھنے والے کم ہوئے ہیں، مانوس سانچوں کے عادی اور دیکھے بھالے حسن کے خوگر زیادہ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ شاعری صرف جذباتی اظہار نہیں، علامتی اظہار بھی ہے۔ ہر فرد اور ہر دور کے مخصوص علامات ہوتے ہیں۔ یہ علامات کبھی کبھار ماضی قریب کے بجائے ماضی بعید کے سرمائے سے یعنی بھولی بسری روایت سے لیے جاتے ہیں یا دیومالا سے یا جدید دور کے علوم سے۔ عام پڑھنے والا ان سے آشنا ہونے کی زحمت نہیں کرتا اور شاعری اور ادب کو بھی چاشنی، چٹخارے، مستے، نجات، تفریح کچھ محرومیوں کی تلافی، کچھ نظریات کی علمبرداری کے معیار سے پرکھتا ہے۔ غالب کی شان سے یہ واضح ہو جائے گا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو عام طور پر زمانے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور زمانے کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب شاعر کی آنکھیں بند ہو چکی ہوتی ہیں۔ جو لوگ کلاسیکل موسیقی یا بھارت ناٹیم رقص سے واقف نہیں انھیں یہ موسیقی ایک شور اور یہ رقص بلا وجہ اعضا کا توڑنا مروڑنا معلوم ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ شاعری کے معنی مقررہ بحر میں قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں وہ آزاد نظم یا شعر منثور کی شعریت اور شاعری میں لفظ کے تخلیقی استعمال کو کیسے پا سکیں گے۔ چونکہ اب تک ہماری شاعری پبلک وزن زیادہ رہی ہے وہ انفرادی، پرائیوٹ وزن کم، اس لیے آج کی شاعری سے جو پرائیوٹ وزن رکھتی ہے، لوگ ابھی مانوس نہیں ہوئے ہیں۔ پبلک وزن کے لیے نثر زیادہ موزوں ہے ہم ابھی تک اس میں کچھ مانوس شاعرانہ ادائیں ڈھونڈتے ہیں، نثر کے اپنے حسن کو نہیں پہچان پاتے۔ غرض جیسے جیسے ادب کا اپنا رول، اس کا اپنا منصب، اس کی اپنی اہمیت واضح ہوتی جائے گی، ادبی اظہار کے ابلاغ بننے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ اس لیے آج کے تجربات کو ہمدردی سے دیکھنا چاہیے بشرطیکہ یہ تجربے محض نقال نہ ہوں، انفرادیت رکھتے ہوں۔ تجربے کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر تجربہ کسی نہ کسی بھولی ہوئی روایت کی توسیع یا بازیافت ہوتا ہے۔ جمیل مظہری نے اس جلسے کی بھی صدارت کی آخر میں حاضرین کے اصرار پر انھوں نے اور میں نے کچھ شعر بھی سنائے۔ جمیل مظہری خاصے جذباتی آدمی ہیں۔ کہنے لگے کہ سرور صاحب کے خیالات سے مجھے پچھتر فی صدی اتفاق ہے، پچیس فی صدی اختلاف ہے جس کے اظہار کا یہ موقع نہیں مگر حاضرین کو یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ خیالات ایک ایسے ادیب کے ہیں جس نے برسوں ان مسائل پر غور کیا ہے اور اس لیے آج کا اجتماع ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

میرا بھتیجا اقبال جو رانچی میں انجینیر ہے مصر تھا کہ میں دو ایک دن رانچی میں قیام کروں۔ مگر جمیل مظہری جلسے کے بعد گیا سے گیا جانے والے تھے انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ ساتھ چلو اور ان کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے خیال سے، میں پانچ بجے مہمان خانہ سے سامان لے کر ان کے دوست اور حسین کے مکان پر پہنچا جو رانچی کے چوٹی کے وکیلوں میں ہیں اور جنھوں نے فسادات میں مظلوموں کی بڑی مدد کی اور بڑی ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا ہم لوگ چھ بجے شام کو روانہ ہوئے۔ خیال تھا کہ چار ساڑھے چار گھنٹے میں گیا پہنچ جائیں گے اور میں وہاں سے کالکا میل پکڑ سکوں گا۔ مگر کار کی روشنی کم تھی۔ راستے میں ٹریفک بہت تھا اور انور صاحب بھی محتاط آدمی ہیں غرض ہزاری باغ پہنچتے پہنچتے نو بج گئے۔ وہاں سرراہ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ یہاں قیمہ بڑے مزے کا تھا دس بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہوئے جمیل مظہری نے فرمائش کی کہ ادھر دو تین سال میں جو کچھ کہا ہے سب سنا دو۔ غرض ایک ایک قطعے کا حساب دینا پڑا۔ جمیل مظہری کو شعر سنانے میں لطف آتا ہے وہ اچھا شعر سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بجلی کا تار انھیں چھو گیا ہے انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو یہاں لکھ دینا ضروری ہے۔ فرمانے لگے کہ سرور صاحب آپ کی تنقید کی وجہ سے آپ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ خدا جانے وہ صحیح کہتے ہیں یا دوسرے لوگ جو مجھے صرف نقاد کے قائل ہیں۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں غلط کہتے ہوں جمیل مظہری نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ ایک اعصابی ہیجان، ایک سیمابی کیفیت، ہمیشہ ان پر طاری ملے گی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے جلتے ہوئے سگرٹ سے اپنا دامن یا پاس بیٹھے ہوئے شخص کا ہاتھ جلا دیا۔ میرے اصرار پر انھوں نے اپنے شعر بھی سنائے۔ ایک مطلع ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے

ہم پھول نہ شبنم ہیں نہ کھیتوں پہ گھٹا ہیں
جلتے ہوئے تپتے ہوئے صحرا کی دعا ہیں

جب اشعار کا اسٹاک ختم ہو گیا تو میر، غالب، اصغر، اقبال، وحشت، ثاقب، جگر، شاد کے اشعار اور ان کی خصوصیات پر باتیں ہونے لگیں۔ رات کا سناٹا، کچھ دھندلی اور لطیف چاندنی۔ کار جنگلوں اور میدانوں سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے سائے بھوتوں کی طرح ابھرتے تھے اور روشنی میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ ہم دونوں زندگی کے مسائل اور مصائب سے بے نیاز شاعری اور شاعروں کی دنیا میں تھے۔

غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے تھے

یہ رات اور یہ سفر یاد رہے گا۔

ایک بجے کے قریب پہنچے۔ جمیل مظہری کے اصرار پر رات انور صاحب کے داماد علی امام کے یہاں گزاری۔ صبح سات بجے مظہری اور انور پٹنے کے لیے روانہ ہوئے اور میں علی گڑھ کے لیے مغل سرائے سے دہلی یا ڈن ایکسپریس پکڑی اور ۱۹ فروری کو ساڑھے تین بجے صبح علی گڑھ آ گیا۔ اور اب

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

[illegible]

میرا صفحہ

مجھے سفر میں بہت لطف آتا تھا۔ اب سفر کی زحمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ مزا ہی نہیں رہا۔ پہلے سے جگہ محفوظ کرانے کے باوجود بعض اوقات نہیں ملتی، گاڑیوں کے وقت کا کچھ ٹھیک نہیں، چوری کا خطرہ بڑھ گیا ہے اور اب تو ریل میں قتل بھی ہونے لگے ہیں۔ اس لیے جب بالکل مجبور ہو جاتا ہوں تبھی لمبا سفر کرتا ہوں۔

رانچی یونی ورسٹی کے پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے سلسلے میں رانچی جانا تھا کالکا میل سے جگہ پہلے سے محفوظ کرالی تھی مگر گاڑی آئی تو معلوم ہوا میرا نام ہی نہیں۔ خیر ایک برتھ مل گئی۔ تیز رفتار گاڑی تھی، موسم معتدل اور خوشگوار، ریل کی پٹری کے دونوں طرف گیہوں کے سبز کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پھول حد نظر تک پھیلے ہوئے، آنکھوں کی تراوٹ اور روح کی بالیدگی کا باعث۔ میں نے کوسلر کی نئی کتاب "مشین میں بھوت" (THE GHOST IN THE MACHINE) پڑھنی شروع کی، خاصی ضخیم کتاب ہے اور جدید نفسیات، حیاتیات اور سماجیات کا نچوڑ۔ کوسلر کہتا ہے کہ انسان کے دماغ نے بڑی ترقی کی ہے، مگر کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے اس میں تعمیری صلاحیت کے ساتھ ایک تخریبی میلان بھی ہے۔ کوسلر BEHAVIORIST کے خلاف ہے اور GESTALT والوں سے متاثر ہوتے ہوئے، ان سے الگ راہ نکالتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی دماغ کے تخریبی میلان کو کیمیاوی اجزا کے ذریعہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ صبح تین بجے گومو پر مجھے گاڑی بدلنی تھی وہاں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرا نام رانچی ایکسپریس میں انتظار کرنے والوں کی فہرست میں ہے۔ گاڑی آنے پر ایک خالی کوپے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو میاں بیوی آ گئے جن کے نام یہ ریزرو تھا۔ میں نے جب ساری گاڑی میں کہیں جگہ نہ پائی تو اس جوڑے سے درخواست کی کہ مجھے کوپے کے فرش پر سونے کی اجازت دیدیں۔ وہ بڑے شریف آدمی تھے۔ انھوں نے اوپر کی برتھ مجھے دیدی اور خود بیوی بچوں کو لیے نیچے کی برتھ پر بیٹھے رہے۔ مجھے خیال آیا کہ بعض منافرت، شرافت اور انسانیت کا ہمارے ملک میں کال نہیں ہوا۔ جب ذرا حالات کی وجہ سے کچھ عقیدہ ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے تو کچھ اچھے آدمی مل ہی جاتے ہیں۔

آٹھ بجے کے بعد سو کر اٹھا تو رانچی کے قرب وجوار کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ علاقہ زیادہ بلندی پر نہیں ہے غالباً دو ہزار فٹ ہوگا۔ پہاڑیاں گھنے چھوٹے چھوٹے پیڑوں سے لدی ہوئی ہیں۔ آدی واسیوں کی عورتوں کے غول کے غول ریل میں سے نظر آئے۔ سیاہ فام، جوش کی کوہستان دکن کی عورتوں پر نظم یاد آ گئی۔ رانچی میں اگست میں خاصا بڑا فساد ہوا۔ اردو کا حق مانگنے والوں کو تنگ نظر اور متعصب عناصر نے اس کی سزا دینی چاہی۔ بڑی تعداد میں جانیں ضائع ہوئیں، مالی نقصان علیحدہ۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اپنی زبان کا حق مانگو تو کچھ لوگ جان ومال کے درپے ہو جاتے ہیں گو حالات اب نارمل ہو گئے ہیں مگر کون جانے کس وقت پھر کوئی اور فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔

ساڑھے نو بجے رانچی پہنچا۔ اسٹیشن پر شین مظفر پوری، علی سجاد اور کچھ اور لوگ موجود تھے۔ یونی ورسٹی کے مہمان خانے گیا۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور پھر جمیل مظہری کو ان کی قیام گاہ سے لیتا ہوا یونی ورسٹی کے دفتر پہنچا۔ جمیل مظہری اس دور کے چوٹی کے شعرا میں ہیں اور جوش اور فراق کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ صرف بڑے اچھے شاعر ہیں بلکہ بڑے اچھے دوست اور بڑے مخلص انسان ہیں۔ مجھ سے آزردہ تھے۔ میرا قصور یہ تھا کہ ان کے کئی خطوں کا جواب نہ دے سکا تھا۔ ملے تو کہنے لگے آپ سے بڑی شکایت ہے میں نے کہا کہ شکایت ہے تو غنیمت ہے۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ابھی محبت باقی ہے ورنہ شکایت بھی نہ ہوتی۔ ہنسے اور اس گرمجوشی سے لپٹ گئے گویا خفا ہی نہ تھے۔

زبانی امتحان ختم کرنے کے بعد انجمن ترقی اردو رانچی کے کارکنوں کے اصرار پر ان کے ایک جلسے کو خطاب کیا۔ یہ جلسہ مولانا آزاد اسکول میں رکھا گیا تھا۔ اسکول اس جگہ قائم کیا گیا ہے جہاں مولانا آزاد پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں نظربند ہوئے تھے۔ حالیہ فسادات میں اسکول پر حملہ ہوا اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ مگر رانچی کے اردو دوستوں نے بڑے استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ اسکول کی نئی عمارت تیار ہو گئی ہے انجمن کے کارکن بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ ان میں ہمت بھی ہے اور سوجھ بوجھ بھی۔ میں نے احتجاجی کارروائیوں کے بجائے تعمیری کاموں پر زور دیا تاکہ اردو دوستوں کی طاقت بڑھے اور ہمارے مطالبات کے تسلیم کیے جانے کے لیے فضا سازگار ہو۔ کچھ سوالات بھی کیے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ رسم خط کے متعلق ایک سوال سے اندازہ ہوا کہ رسم خط کی تبدیلی کی تحریک کا وہاں بھی اثر ہوا ہے۔ میں نے صاف کہا کہ اردو رسم خط کو چھوڑنے کا کوئی سوال نہیں ہے، ہاں جدید تعلیمی اور طباعتی ضروریات کے لیے اس کی اصلاح پر ضرور غور ہو سکتا ہے مگر اردو کی کچھ کتابیں دیوناگری یا رومن رسم خط میں بھی چھپیں تو اچھا ہی ہے کیونکہ اس طرح اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

جمیل مظہری نے جلسے کی صدارت کی۔ دو بجے شین مظفر پوری کے یہاں لنچ تھا اور تین بجے رانچی سائنس کالج میں "ادب میں ابلاغ کے مسئلے" پر میری تقریر رکھی گئی تھی۔ وائس چانسلر مارکھم جو غالباً ایک پادری ہیں پرنسپل یوسس اور دوسرے اساتذہ بھی موجود تھے۔ وائس چانسلر نے جلسے کا افتتاح کیا۔ طلبہ بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ عثمانی نے میرا تعارف جس طرح کرایا اس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے میری تحریروں کا حرف حرف پڑھا ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ادب بنیادی طور پر جمالیاتی اظہار ہے گو اس میں سماجی اور اخلاقی پہلو بھی موجود رہتے ہیں۔ ہر اظہار ایک حد تک ابلاغ ہوتا ہے کیونکہ مکمل ابلاغ کے لیے ذہنوں کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ فنکار زیادہ مرتب ذہن رکھتا ہے عام پڑھنے والے اتنا مرتب ذہن نہیں رکھتے۔ ان کے احساسات بھی محدود ہوتے ہیں اور وہ رسمی ردعمل زیادہ رکھتے ہیں۔ فن کار اپنے مخصوص شعور اور بصیرت کو اسی وقت عام کر سکتا ہے جب پڑھنے والا اس کے ساتھ ذہنی سفر کے لیے آمادہ ہو اور ادب کو کسی نفعی یا [illegible]

(باقی صفحہ [illegible])

[illegible] پبلشر منیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس میں چھپوا [illegible] سے شائع کیا

R. No. 2186/57　　1 2 8 1969　　Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کی شاخوں کے انتخابات اور بعض عملی کام

انجمن کی کئی ریاستی شاخوں نے نئے قواعد کے مطابق اپنے انتخابات مکمل کر لیے ہیں، مگر ابھی تک ایسی شاخوں کی تعداد خاصی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکیں۔ مجلس عاملہ نے اپنے ۲۷ فروری ۱۹۶۸ء کے جلسے میں ان شاخوں کو آخر مارچ تک اپنے انتخابات مکمل کر لینے کی ہدایت کی ہے۔

انجمن کے نئے قواعد شاخوں کے نمائندوں کے مشورے سے بنائے گئے تھے ہو سکتا ہے کہ کچھ ریاستی شاخوں کو ان پر عمل کرنے میں دقت محسوس ہوئی ہو، مگر چونکہ یہ اب دستور کا جز بن گئے ہیں اس لیے دستور میں ترمیم کے بغیر ان سے انحراف نہیں ہو سکتا چونکہ انجمن کو عوامی بنیاد دینا ان قواعد کا مقصد تھا اس لیے ممبری کی فیس پچیس پیسے رکھی گئی تھی۔ ممبری کے لیے چونکہ صرف اردو کا ہمدرد ہونا کافی ہے اس لیے خیال تھا کہ اس طرح ایک بڑی تعداد ممبر ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ کوشش کی جاتی تو ناکامی کا کوئی سوال نہ ہوتا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے شہروں میں مقامی شاخیں بنانا مشکل تھا وہاں بڑے ضلعوں میں کم سے کم دو سو ممبروں کی شاخیں بن جانا کسی طرح دشوار نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح پانچ ضلعی شاخوں پر مشتمل ریاستی شاخ وجود میں آسکتی تھی جس کے پیچھے کم سے کم ایک ہزار ممبروں کی طاقت ہو۔ چونکہ بعض ریاستی شاخوں میں اس سے زیادہ ممبر ہیں اس لیے یہاں بھی دشواری نہیں ہے، ہاں اپنے پرانے طریقۂ کار کو تھوڑا سا بدلنے کی ضرورت ہے امید ہے کہ ریاستی شاخیں ۳۱ مارچ تک یہ مرحلہ طے کر لیں گی کیونکہ اس کے بغیر انجمن کی شاخوں کی تنظیم کا نقشہ مکمل نہ ہو سکے گا۔

شاخوں کی تنظیم کا مسئلہ کئی وجوہ سے اہم ہے۔ اگر اردو زبان کی حفاظت کرنی ہے، اگر اس کی تعلیم کا ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ منزل پر انتظام کرنا ہے، اگر سرکاری کاموں اور عوام کی ضرورت کے کاموں میں اس کے چلن کا تحفظ کرنا ہے تو مقامی اور ضلعی اور ریاستی شاخوں کے ایک جال کے بغیر یہ کام ناممکن ہے۔ مقامی سطح پر اچھی تنظیم کے بغیر کوئی مہم نہیں چلائی جا سکتی۔ اس وقت اردو دوستوں کو ہنگامہ پسندی یا سستی سیاست سے بچ کر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ انھیں سب سے پہلے اپنے پر اور اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اپنی ریاست کے دوسرے باشندوں کو ساتھ لے کر حکومت سے اپنے مطالبات منوانے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مطالبات کے منوانے کے لیے اخلاقی طاقت اور تعداد کی طاقت دونوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی کشش کی وجہ سے لوگ تعمیری کاموں کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے اردو والوں میں خلوص کی کمی نہیں ہے۔ ان میں احتجاج کی طاقت بھی ہے مگر خلوص اور احتجاج کافی نہیں عمل کی بھی ضرورت ہے عمل کے معنی صرف بڑے پیمانے پر مظاہرے کرنے، بھوک ہڑتال کرنے یا کاروبار بند کرانے کے نہیں۔ عمل، اداروں کی تعمیر، مرکزوں کے قیام، کاروباری جلسوں کے انعقاد، اعداد و شمار کی فراہمی، دوسرے لوگوں کو ہم خیال بنانے سے بھی عبارت ہے۔ اس لیے اردو دوستوں کو ایسے بڑے جلسوں اور کانفرنسوں کی چنداں ضرورت نہیں جن میں جوشیلی تقریریں ہوں اور شاندار قرار دادیں پاس کی جائیں۔ انھیں ایسے کاروباری جلسوں کی ضرورت ہے جن میں کارکن اپنے تجربے کی روشنی میں قابلِ حصول اور پروگرام بنائیں اردو دوستوں کو احتجاجی یا ہنگامہ پسند یا اقتدار پرست سیاست سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا اپنے اپنے حلقے میں خود ادارے قائم کرنے، انھیں چلانے اور اپنے جمہوری حقوق کے لیے اپنے علاقے کے معقول اور انصاف پسند اشخاص کا تعاون حاصل کرنے سے فائدہ ہوگا۔ ایسے کاموں کے لیے تنظیم کی بہت ضرورت ہے۔ ہماری بیشتر انجمنیں ادبی انجمنیں ہیں۔ وہ مشاعرے کرنے، مقالے پڑھنے اور ادیبوں کی یادگار منانے میں زیادہ وقت صرف کرتی ہیں اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے کام بھی مفید ہیں مگر یہ نہ ہونا چاہیے کہ اردو کی خدمت کے معنی صرف اس قسم کے ادبی کام کرنے کے سمجھے جائیں۔ یہ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں، مگر ان سے زیادہ ضروری کام اس وقت ایسے کارکنوں کی [illegible]

[illegible] آسانی سے پہنچانے والوں کے ساتھ حکومت اور عوام تک پہنچا سکیں، اردو کے کتب خانے اور ریڈنگ روم قائم کر سکیں، اردو کے اچھے اخبار، اچھے رسالے نکال سکیں اور اچھی کتابوں کی اشاعت کے لیے وسائل مہیا کر سکیں۔ ہم لوگ حکومت کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو ہم خود کر سکتے ہیں اور کوئی ہمیں ان سے نہیں روک سکتا۔

حکومت سے اپنی بات پرزور طریقے سے ضرور کہنی چاہیے کیونکہ حکومت پر ہمارا حق ہے اور وہ ہمارے ٹیکسوں کے ذریعہ سے چلتی ہے۔ مگر حکومت پر بہت زیادہ تکیہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ حکومت کے اپنے کام جس طرح چل رہے ہیں ان سے اس کی صلاحیت کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ دراصل آج بھی حکومت کے تعلیمی اداروں سے بہت سے پرائیویٹ ادارے بہتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے پیچھے حکومت کی طاقت نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم کارکنوں کا خلوص، ان کی محنت اور ان کی صلاحیت ہے۔ ایسے پرائیویٹ ادارے ہم بھی قائم کر سکتے ہیں۔ اردو اسکول اس معیار کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں جو پبلک اداروں یا کرسچین اداروں کا ہے۔ اور ان کے برابر نہ سہی مگر اپنے حلقے میں چندے سے اچھا خاصا مالی سرمایہ بھی جمع کر سکتے ہیں۔ دینی تعلیمی بورڈ والوں نے یو۔ پی میں اور انجمن اسلام نے بمبئی میں ایسا کیا بھی ہے۔ یہی کام اردو دوستوں کو بڑے پیمانے پر سارے ہندوستان میں کرنا ہے۔ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تجربے سے اردو دوست ہر طرح نفع میں رہیں گے۔

مرکزی انجمن کی مجلس عاملہ کے فیصلے

مجلس عاملہ نے ۱۱ فروری کے جلسے میں جو چند اہم فیصلے کئے وہ [illegible]

[illegible] کا نام اردو گھر ہوگا۔

(۲) جناب سری نواس لاہوٹی کو خزانچی انجمن [illegible] مجلس [illegible] کے ممبر منتخب کئے گئے۔

(۳) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو صدر انجمن نے مجلس عام کا ممبر نامزد کیا ہے۔

(۴) اپریل میں مجلس عام کے سالانہ جلسے کے موقع پر ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک مشاورتی جلسہ ہوگا جس میں انجمن کی آئندہ کانفرنس اور انجمن کے لائحہ عمل پر غور ہوگا۔

(۵) ریاستی شاخوں کو نئے قواعد کے مطابق انتخابات مکمل کرنے کے لیے ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء تک کی توسیع دی گئی ہے۔

(۶) انجمن کی عمارت کا سنگ بنیاد شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہندوستان نے رکھنا منظور کر لیا ہے۔ تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

(آل احمد سرور جنرل سکریٹری)

خونِ معصوم

عفی احمد فاروقی

جسم آزاد ہے، پر ذہن تو اب بھی ہے غلام
نفرتیں آج بھی ہیں دل کے سیہ خانوں میں
مٹ گیا ہند سے تہذیب و تمدن کا نشاں
بستیاں ڈھل گئیں سنسان بیابانوں میں

لے کے نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا اثر
ذہن پہ چھائی ہوئی فرقہ پرستی ہے آج
گوتم و گاندھی و نہرو کی مقدس دھرتی
امن و انصاف کی صورت کو ترستی ہے آج

فرقہ وارانہ فضا، ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ
یعنی کم نہ دو، یوں ملک کی بربادی کو
رقص کرتی ہوئی مذہب کی سنہری ناگن
پھر کہیں چھین نہ لے ہند کی آزادی کو

خونِ ناحق میں رنگے ہاتھ چھپاؤ گے کہاں؟
شرم آتی نہیں کیسے ہوئے انسان ہیں ہم!
لوٹ لی رنگ چمن، بوئے چمن، جوشِ بہار
پھر بھی کہتے ہو کہ گلشن کے نگہبان ہیں ہم

خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اردو کی صدا
اب کبھی ظلم کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی
قتل و خوں جور و ستم، جبر و تشدد سے کبھی
حق پرستوں کی یہ تحریک نہیں رک سکتی

اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوگی

دلّی ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس امسال اکتوبر میں علی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس میں اردو کے تحقیقی اور ان تعلیمی کاموں سے متعلق اہم مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جائے گا جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے اساتذہ کو پیش آتے ہیں۔ (الجمعیۃ)

ایک تردید

الٰہ آباد۔ کچھ دن پہلے ہم نے ہماری رسالہ میں یہ خبر اشاعت کے لیے بھیجی تھی کہ رنئے نام جموں و کشمیر یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہوگی۔ ہمیں یہ خبر شعبۂ اردو سری نگر کے استاد نے بھیجی تھی۔ لیکن اب ہمیں انہیں استاد کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ امسال نصاب میں شامل نہیں ہو سکی ہے۔

(مدیر ماہنامہ شب خون)

سید فضل المتین

بسمل خیرآبادی تلمیذ امیر مینائی

حالات ملک الشعرا لسان الملک[1] حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی میر منشی ریاست ٹونک[2]، منشی امیر احمد، امیر مینائی کے تلمیذ رشید، مولینا عبدالحق خیرآبادی کے حقیقی بھانجے، مولینا حافظ سید احمد حسین رسوا کے بیٹے اور مضطر خیرآبادی[3] کے بڑے بھائی تھے۔

ترک وطن کے بعد بسمل، ایک عرصہ تک اجمیر میں مقیم رہے، پھر ٹونک اور ہاں سے آبو چلے گئے۔ قیام ٹونک اور آبو کے وقت بھی اجمیر آمد و رفت کا سلسلہ برقرار رہا۔ اور آخری ایام اجمیر ہی میں گزار کر ۶۰ برس کی عمر میں بعارضہ ہیضہ اجمیر ہی میں انتقال فرمایا۔ اور اجمیر کے ایک قدیم مسلم محلہ اندرکوٹ میں مدفون ہوئے[4]۔

عمر کے آخری ایام میں ان کی ذات اجمیر میں مرجع خلائق ہی رہی اور یہ صاحب کشف و کرامات مشہور ہوئے۔ ان کی وفات کے ایک زمانہ بعد تک (آزادی سے پہلے) ان کی قیام گاہ ایک خاص اہمیت حاصل کئے رہی۔ جس مکان میں مقیم رہے لوگ تپ کرکے پراس مکان کے ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اچھے ہو جاتے[5]۔

بقول عبدالقدوس ہاشمی، ان کا شمار امیر مینائی کے بہترین تلامذہ میں ہوتا تھا۔ بڑے سنجیدہ اور باوقار آدمی تھے۔ غزل تحت اللفظ پڑھتے تھے اور ایک ایک لفظ نہایت وضاحت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبق پڑھا رہے ہوں[6]۔

عقیدت خواجہ اور وفات بسمل کو حضرت خواجہ اجمیریؒ سے ایک خاص لگاؤ اور عقیدت تھی کہتے ہیں۔

کوئی کچھ بھی کہے لیکن۔ غلام خاص ہوں بسمل
معین الدین چشتیؒ کا معین الدین چشتیؒ کا

آستانہ خواجہ اجمیریؒ کی حاضری کو ذریعہ نجات تصور کرتے تھے اور صاحبزادگانِ آستانہ عالیہ کے ساتھ بڑے خلوص و ادب کے ساتھ پیش آتے تھے[7]۔

وفات سے ایک دن پہلے شام کو مزارِ خواجہؒ کے روبرو ایک غزل پڑھی اور صبح کو انتقال فرمایا۔ غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:-

کٹے گی رو رو کے رات ساری، تڑپ کے سب دن تمام ہوگا
لگا کے دل یہ خبر کسے تھی کہ ہائے جینا حرام ہوگا
جناب خواجہ کا آستانہ ہے میکشوں کے لئے ٹھکانہ
جو بسمل اپنا ہے آب و دانہ تو چل کے واں پر قیام ہوگا

(راوی، میر امداد حسین ولد میر شفیع حسین برادر خواجہ اکبر حسین اکبر اجمیریؒ)

نمونۂ کلام

یاد نے پھر ان کا قد بالا کیا   حشر پھر دل نے مرے برپا کیا
کیا بتائیں، ہجر میں کیا کیا کیا   آہ کی، فریاد کی، نالہ کیا
منہ چھپانا تھا ہمیں پہلے ہی روز   اب کیا پردہ تو کیا پردا کیا
کس کو تھی تابِ تجلی - برملا   آپ نے اچھا کیا - پردا کیا
مسند شاہی بھی بسمل خاک ہے   جس گھڑی اللہ پہ تکیہ کیا

فشارِ گور میں سختی بڑی ہے   مری تربت کا ہر تختہ کڑی ہے
کہاں مرقد پہ خاکِ کوئے جاناں   جو کھودی تھی وہی مٹی پڑی ہے
دھڑکتے دل کو رکھو جیب میں تم   کوئی پوچھے تو کہہ دینا گھڑی ہے

مرا دل کھو گیا اس بزم میں اے ہم نشیں دیکھو
اِدھر دیکھو، اُدھر دیکھو، یہاں دیکھو، یہیں دیکھو
انہی کے پاس ہے جو چپکے چپکے مسکراتے ہیں
انہی کا ہاتھ دیکھو، جیب دیکھو، آستیں دیکھو

ہیں بدن میں زخم ہزارہا وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں
مرے درد کو تو نہ پوچھئے کہ کہاں ہے اور کہاں نہیں
(از۔ بیاض یادداشت۔ مولینا خواجہ معنیؒ اجمیری)

وہ جلاتے ہیں اب تو گھی کے چراغ
میری تربت پہ روشنی کے لیے
اٹھ گئی دہر سے خوشی بسمل
زخم روتے ہیں اب ہنسی کے لیے

---

[1] تا [2] از مضمون عبدالقدوس ہاشمی: "بزم خلیل ٹونک (۱۸۹۶ء)" مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۴۵ء۔

[2] نادم سیتاپوری، بسمل خیرآبادی کو غالب کا شاگرد کہتے ہیں۔ " .... جناب مالک رام نے محققانہ احتیاط کے خیال سے بعض ایسے لوگوں کو "تلامذۂ غالب" میں شامل نہیں کیا ہے جن کے متعلق وہ پوری طرح پر مطمئن نہ ہو سکے۔ مثلاً حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی وغیرہ"۔

[3] مضطر، مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کے والد ہیں (ف۔م)

از مضمون "مرمان علی خاں رعنا۔ تلمیذ غالب" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

[4] تا [6] از بیاض یادداشت۔ مولینا خواجہ معنیؒ اجمیری برائے "تذکرہ شعرائے اجمیر"۔

[5] اس کے راوی اجمیر کے بہت سے ایسے حضرات ہیں جو بفضلہ آج بقید حیات ہیں۔ (ف۔م)

[7] از۔ بیاض یادداشت مولینا خواجہ معنیؒ اجمیری۔

(از: ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۵۵ء)
مضمون: عبدالقدوس ہاشمی

انتخاب کلام

سکھاتا ہے ہمیں تو ناصحا کیا — جو دل آیا تو پھر اچھا برا کیا
تمہارے عشق میں سب ہے گوارا — اذیت کیا، مصیبت کیا، بلا کیا
مسیحا تو جلا دیتے ہیں مردے — ہمارے درد کی جانیں دوا کیا
نمک پاشی جراحت ہو جو قاتل — تو پھر اس سے زیادہ ہے مزا کیا
نہ بسمل جان دو ہجر صنم میں — ابھی دیکھو تو کرتا ہے خدا کیا

گزر دال عشق گیسوئے رسا ہونے لگے
دل سے میرے شمع طول مدعا ہونے لگے
پھر نگاہیں دل کو تلے سے ہدف کرنے لگیں
پھر تراز و تیر میرے سے جدا ہونے لگے
رتبے رنگیں کا تصور ہے طرح جسے لگا
تم نگیں دل کے نقش مدعا ہونے لگے
کیا تعجب ہے جو عکس روئے سرو رنگ سے
اس پری کے کان کا پتا ہرا ہونے لگے
دیکھ کی وآرزو نکلی ہے بسمل بعد مرگ
وہ جو زخموں پر نمک چھڑکیں مزا ہونے لگے
(گلدستہ "پیام یار" لکھنؤ۔ جون ۱۸۸۶ء)

مضطرب جاں ہے تب غم میں نکلنے کے لیے
یہ ملا سر پہ نہیں آئی ہے ٹلنے کے لیے
شمع کی محفل دشمن میں ضرورت کیا ہے
دل غم دیدہ مرا کم نہیں جلنے کے لیے
عوض بوسہ ملا کرتی ہیں دشنام ہمیں
لب شیریں ہیں زرے زہر اگلنے کے لیے
دل پروردہ ہے پاس کا اس درجہ ہجوم
راہ ملتی نہیں ارمان نکلنے کے لیے
داغ حسرت کے سوا کچھ نہ ملے گا بسمل
شمع رویوں سے محبت ملتے ہو جلنے کے لیے
(گلدستہ "پیام یار"۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۸۸۶ء)

اے چرخ تو نے ہم کو زمانے میں کیا دیا
نالہ دیا جو ایک تو وہ نارسا دیا
اے عشق یار زخم جگر ہو کہ داغ دل
جو درد تو نے ہم کو دیا لا دوا دیا
مرغ سحر جو ہجر کی شب بولتے نہیں
بخت سیاہ نے مرے سرمہ کھلا دیا
(گلدستہ "پیام یار" لکھنؤ۔ دسمبر ۱۸۸۶ء)

دل بیتاب کی یارب ہو تسلی کیونکر
وعدۂ وصل پہ کرتا ہی نہیں "ہاں" کوئی
حل اسرار عقائد ترے زلف و رخ ہیں
نہ تو کافر ہی کوئی ہے نہ مسلماں کوئی
سب اسی بت کے طرفدار ہیں مجھ تو والے
نہیں اصنام میں ہے اللہ مسلماں کوئی
کیوں مری جامہ دری سے ہیں عصا کی حضور
چاک کرتا تو نہیں آپ کا داماں کوئی
کھیل لڑکوں نے سا مارے دیوانے کو
کوئی دامن لیے جاتا ہے گریباں کوئی

(از: انتخاب مشاعرہ اجمیر ۱۸۸۸ء از حکیم جگر سوانی مصنف ۱۸۸۸ء از ۱۹۳۴ء مطبوعہ "عالمگیر" لاہور۔ سالنامہ ۱۹۳۴ء)

ایک نامکمل غزل

دلا کسی سے جائے گو وہی با عزو شاں ہو کر
کرے نام رستاں حاصل جو بے نام ونشاں ہو کر
دکھا تا جلوۂ وحدت کو کثرت میں سیاں ہو کر
احد ظاہر ہوا ہے میم احمد میں نہاں ہو کر
نہ تیرا ساتھ بعد از مرگ بھی چھوڑوں گا اے قاتل
ترے دامن سے لپٹوں گا غبار ناتواں ہو کر
تماشا گاہ طفلاں وہ نہیں کیونکر بن جائے
نکل جائے ترا دیوانہ از ظالم جہاں ہو کر
نہیں گر سائباں ترے پہ مجھ مسکیں کی کیا غم ہے
مرا درد جگر سایہ کئے ہے آسماں ہو کر
بہا باہے شبو مٹی کا میری بادہ نوشوں نے
ملا یہ مرتبہ خاک رہ پیر مغاں ہو کر
جفا و جور کرنے سے کبھی الفت نہ جائے گی
محبت تیری آئی ہے مرے قالب میں جاں ہو کر
نہیں کرتے ٹلک بھی تجھ سے بیجا ہی ہے اے بسمل
ضعیفی از رہِ ناطاقتی ایسے جواں ہو کر
(از ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۵۵ء)
مضمون عبدالقدوس ہاشمی

تلامذہ۔
بسمل کے تلامذہ میں منشی عبدالرحیم اخگر اجمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان پر میں جلد ہی علیحدہ مضمون لکھوں گا۔

سید فضل المتین

بسمل خیرآبادی تلمیذ امیر مینائی

حالات ملک الشعراء لسان الملک[1] حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی میر منشی ریاست ٹونک[2]، مفتی امیر احمد، امیر مینائی کے تلمیذ رشید[3]، مولینا عبدالحق خیرآبادی کے حقیقی بھانجے، مولینا حافظ سید احمد حسین رسوا کے بیٹے اور مضطر خیرآبادی[4] کے بڑے بھائی تھے۔

ترک وطن کے بعد بسمل، ایک عرصہ تک اجمیر میں مقیم رہے، پھر ٹونک اور وہاں سے آبو چلے گئے۔ قیام ٹونک اور آبو کے وقت بھی اجمیر آمد و رفت کا سلسلہ برقرار رہا۔ اور آخری ایام اجمیر ہی میں گزار کر ۶۰ برس کی عمر میں عارضہ ہیضہ اجمیر ہی میں انتقال فرمایا۔ اور اجمیر کے ایک قدیم مسلم محلہ اندرکوٹ میں مدفون ہوئے[5]۔

عمر کے آخری ایام میں ان کی ذات اجمیر میں مرجع خلائق بنی رہی اور بہ صاحب کشف و کرامات مشہور ہوئے۔ ان کی وفات کے ایک زمانہ بعد تک (آزادی سے پہلے) ان کی قیام گاہ ایک خاص اہمیت حاصل کئے رہی۔ یہ جس مکان میں مقیم رہے۔ لوگ کہتے کہ وہ پر اس مکان کے ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اچھے ہو جاتے[6]۔

بقول عبدالقدوس ہاشمی، ان کا شمار امیر مینائی کے بہترین تلامذہ میں ہوتا تھا۔ بڑے سنجیدہ اور باوقار آدمی تھے۔ غزل تحت اللفظ پڑھتے تھے اور ایک ایک لفظ نہایت وضاحت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبق پڑھا رہے ہوں[7]۔

عقیدت خواجہ اور وفات بسمل کو حضرت خواجہ اجمیری سے ایک خاص لگاؤ اور عقیدت تھی کہتے ہیں:

کوئی کچھ بھی کہے لیکن۔ غلام خاص ہوں بسمل
معین الدین چشتی کا معین الدین چشتی کا

آستانہ خواجہ اجمیری کی حاضری کو ذریعہ نجات تصور کرتے تھے اور صاحبزادگان آستانہ عالیہ کے ساتھ بڑے خلوص و ادب کے ساتھ پیش آتے تھے[8]

وفات سے ایک دن پہلے شام کو مزار خواجہ کے روبرو ایک غزل پڑھی اور صبح کو انتقال فرمایا۔ غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:

کٹے گی رو رو کے رات ساری، تڑپ کے سب ان تمام ہوگا
لگا کے دل یہ خبر کسے تھی کہ ہائے جینا حرام ہوگا
جناب خواجہ کا آستانہ ہے بیکسوں کے لیے ٹھکانہ
جو بسمل اپنا ہے آب و دانہ تو چل کے واں پر قیام ہوگا

(راوی، میر امداد حسن ولد میر شفیع حسین برادر خواجہ اکبر حسین اکبر اجمیری[9])

نمونہ کلام

یاد نے پھر ان کا قد بالا کیا — حشر پھر دل نے مرے برپا کیا
کیا بتائیں، ہجر میں کیا کیا کیا — آہ کی، فریاد کی، نالہ کیا
منہ چھپانا تھا انہیں پہلے ہی رو در — اب کیا پردہ تو کیا پردا کیا
کس کو تھی تاب تجلی۔ برملا — آپ نے اچھا کیا۔ پردا کیا
مسند شاہی بھی بسمل خاک ہے — جس گھڑی اللہ پہ تکیہ کیا

فشار گور میں سختی بڑی ہے — مری تربت کا ہر تختہ کڑی ہے
کہاں مرقد یہ خاک کوئے جاناں — جو کھودی تھی وہی مٹی پڑی ہے
دھڑکتے دل کو رکھو جیب میں تم — کوئی پوچھے تو کہہ دینا گھڑی ہے

مرا دل کھو گیا اس بزم میں اے ہم نشیں دیکھو
ادھر دیکھو، ادھر دیکھو، یہاں دیکھو، یہیں دیکھو
انہی کے پاس ہے جو چپکے چپکے مسکراتے ہیں
انہی کا ہاتھ دیکھو، جیب دیکھو، آستیں دیکھو

ہیں بدن میں زخم ہزارہا وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں
مرے درد کو تو نہ پوچھیے کہ کہاں ہے اور کہاں نہیں
(از۔ بیاض یادداشت۔ مولینا خواجہ معنی اجمیری)

وہ جلاتے ہیں اب تو گھی کے چراغ
میری تربت پہ روشنی کے لیے
اٹھ گئی دہر سے خوشی بسمل
زخم روتے ہیں اب ہنسی کے لیے

[1-2] از مضمون عبدالقدوس ہاشمی "بزم خلیل ٹونک (۱۸۹۶ء)" مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۴۵ء۔

[3] نادم سیتاپوری۔ بسمل خیرآبادی کو غالب کا شاگرد کہتے ہیں۔
" .... جناب مالک رام نے محققانہ احتیاط کے خیال سے بعض ایسے لوگوں کو "تلامذۂ غالب" میں شامل نہیں کیا ہے جن کے متعلق وہ پوری طرح پر مطمئن نہ ہو سکے۔ مثلاً حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی وغیرہ۔"

[4] مضطر۔ مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کے والد ہیں (ف۔م)
از مضمون: "مرمان علی خاں رعنا۔ (تلمیذ غالب؟)" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء

[5-6] از بیاض یادداشت۔ مولینا خواجہ معنی اجمیری برائے "تذکرہ شعرائے اجمیر"۔

[8] اس کے راوی اجمیر کے بہت سے ایسے حضرات ہیں جو بفضلہ آج بقید حیات ہیں۔ (ف۔م)

[11] از۔ بیاض یادداشت مولینا خواجہ معنی اجمیری۔

(از۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ جون ۱۹۴۵ء)

مضمون۔ عبدالقدوس ہاشمی

انتخاب کلام

سکھاتا ہے ہمیں تو ناصحا کیا — جو دل آیا تو پھر اچھا برا کیا
تمہارے عشق میں سب ہے گوارا — اذیت کیا، مصیبت کیا، بلا کیا
مسیحا تو جلا دیتے ہیں مردے — ہمارے درد کی جانیں دوا کیا
نمک پاشِ جراحت ہو جو قاتل — تو پھر اس سے زیادہ ہے مزا کیا
نہ بسمل جان دو ہجر صنم میں — ابھی دیکھو تو کرتا ہے خدا کیا

گرد دالِ عشق گیسوئے رسا ہونے لگے
دل سے میرے سطحِ طولِ مدعا ہونے لگے
پھر نگاہیں دل کو پلے سے ہدف کرنے لگیں
پھر ترا زو تیر میرے سے خطا ہونے لگے
روئے رنگیں کا تصور بے طرح جمنے لگا
تم نگیں دل کے نقشِ مدعا ہونے لگے
کیا تعجب ہے جو عکسِ سبزہ رنگ سے
اوس پری کے کان کا پتا ہرا ہونے لگے
ذبح کی تو آرزو نکلی ہے بسمل بعد عمر
وہ جو زخموں پر نمک چھڑکیں مزا ہونے لگے
(گلدستہ پیام یار۔ لکھنؤ۔ جون ۱۸۸۶ء)

مضطرب جاں ہے تب غم میں نکلنے کے لیے
یہ بلا سر پہ نہیں آئی ہے ٹلنے کے لیے
شمع کی محفل دشمن میں ضرورت کیا ہے
دل غم دیدہ مرا کم نہیں جلنے کے لیے
عوضِ بوسہ ملا کرتی ہیں دشنام ہمیں
لب شیریں ہیں ترے زہر اگلنے کے لیے
دل پر درد میں ہے یاس کا اس درجہ ہجوم
راہ ملتی نہیں ارمان نکلنے کے لیے
داغِ حسرت کے سوا کچھ نہ ملے گا بسمل
شمع ردیوں سے عبث ملتے ہو جلنے کے لیے
(گلدستہ پیام یار۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۸۸۶ء)

اے چرخ تو نے ہم کو زمانے میں کیا دیا
نالہ دیا جو ایک تو وہ نارسا دیا
اے عشقِ یار زخمِ جگر، ہو کہ داغِ دل
جو درد تو نے ہم کو دیا لا دوا دیا
مرغِ سحر جو ہجر کی شب بولتے نہیں
بختِ سیاہ نے مرے سر سر کھلا دیا
(گلدستہ پیام یار۔ لکھنؤ۔ دسمبر ۱۸۸۶ء)

دلِ بیتاب کی یارب ہو تسلی کیونکر
وعدۂ وصل پہ کرتا ہی نہیں "ہاں" کوئی
حل اسرار عقائد ترے زلف و رخ ہیں
نہ تو کافر ہی کوئی ہے نہ مسلماں کوئی
سب اسی ست کے طرفدار ہیں مختر دالے
نہیں اسلام میں ہے اللہ مسلماں کوئی
کیوں مری جامہ دری سے ہیں خفا آپ حضور
چاک کرتا تو نہیں آپ کا داماں کوئی
کھیل لڑکوں نے بنا یا رے دیوانے کو
کوئی دامن لیے جاتا ہے گریباں کوئی

(از۔ انتخاب مشاعرہ اجمیر ۱۸۸۸ء از حکیم جگر بسوانی مضمون ۱۸۸۸ء از ۱۹۳۴ء مطبوعہ عالمگیر لاہور۔ سالنامہ ۱۹۳۴ء)

ایک نامکمل غزل

دلا ہستی سے جب گا وہی با عز و شاں ہو کر
کرے نام و نشاں حاصل جو بے نام و نشاں ہو کر
دکھایا جلوۂ وحدت کو کثرت میں عیاں ہو کر
احد ظاہر ہوا ہے میم احمد میں نہاں ہو کر
نہ تیرا ساتھ بعد از مرگ بھی چھوڑوں گا اے قاتل
ترے دامن سے لپٹوں گا غبار ناتواں ہو کر
تماشا گاہِ طفلاں وہ زمیں کیونکر نہ بن جائے
نکل جائے ترا دیوانہ اے ظالم جہاں ہو کر
نہیں گر سائباں تربت پہ مجھ بیکس کی کیا غم ہے
مرا دود جگر سایہ کئے ہے آسماں ہو کر
بنایا ہے سبوئے مٹی کا میری بادہ نوشوں نے
ملا یہ مرتبہ خاکِ رہِ پیر مغاں ہو کر
جفا و جور کرنے سے کبھی الفت نہ جائے گی
محبت تیری آئی ہے مرے قالب میں جاں ہو کر
نہیں کرنے کی کٹ ملک بھی تجھ سے بیجا لی ہے اے بسمل
نصیحت اور یہ ناطاقتی ایسے جواں ہو کر
(از۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۴۵ء)
مضمون عبدالقدوس ہاشمی

تلامذہ۔

بسمل کے تلامذہ میں منشی عبدالرحیم اخگر اجمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان پر میں جلد ہی علیحدہ مضمون لکھوں گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

"ایک تھا شاعر" کے عنوان سے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر ساڑھے آٹھ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کے مرتب مظفر حنفی ہیں اور ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔

یہ کتاب دراصل رنگا رنگ تحریروں کا ایک مجموعہ ہے جس میں تاثراتی مضامین، شخصی خاکے، تنقیدی و تجزیاتی مطالعے، تعزیتی شذرے، منظوم خراج عقیدت اور دو سطروں سے لے کر دس بارہ سطروں تک کی مختصر اور عمومی رائیں سبھی شامل ہیں۔ شاد صاحب کی خودنوشت، ان سے لئے گئے بعض انٹرویو اور ڈھائی سو صفحوں کے لگ بھگ مکاتیب شاد ان پر مستزاد ہیں۔

غالباً یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ شاد عارفی اردو کے ایک صاحب طرز شاعر اور ایک منفرد و بے مثل طنز نگار تھے اور ان کے شعری اکتسابات اردو زبان و ادب کی بیش قیمت متاع ہیں لیکن انھوں نے جس کس مپرسی کے عالم میں اپنی زندگی گزاری وہ ہمارے لیے حد درجہ عبرت انگیز ہے گزشتہ پچاس سال کی شعری اور ادبی سرگرمیوں پر جن کی نظر ہے وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ اس دور میں ادنیٰ اور اوسط درجے کے لوگوں نے محض شاعری کا سوانگ رچا کر کیسی کیسی منفعت حاصل کی ہے، مشاعرے، فلم، ریڈیو، انجمنیں اور تحریکیں، حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے، ناشرین، سکہ بند نقاد اور زبان و ادب کی سرپرستی کا دم بھرنے والے کرسی نشین حضرات نے جن شاعروں کو اعزاز و اکرام سے نوازا ان میں سے کتنے حقیقی معنوں میں شاعر تھے اور کتنے متشاعر اس کا فیصلہ کچھ تو زمانے نے کر دیا ہے اور اگر نہیں کیا ہے تو مستقبل قریب میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو کر رہے گی لیکن افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم صداقت کو عام طور پر بہت دیر میں دریافت کرتے ہیں۔ ہم اپنے بہترین شاعروں کو ان کے جیتے جی پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے لیکن وہ عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزار کر جب مر جاتے ہیں تو ہمیں خبر ہوتی ہے کہ ع

ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

شاد عارفی کو میں اس اعتبار سے خوش نصیب شاعر سمجھتا ہوں کہ ان کے انتقال کے صرف چار سال بعد ان کی ادبی خدمات کا اتنا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے

اس کتاب میں شاد صاحب کی شخصیت پر جو مضامین ہیں ان میں اکبر علی خاں کا "ایک اور گنجا فرشتہ" مسعود اشعر کا "کٹی پتنگ" طاہرہ اختر کا "شاد عارفی میرے ماموں" اور مظفر حنفی کا "استاد محترم" اور عابد رضا بیدار کی تحریریں خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام طور پر یک طرفہ مدح سرائی اور مبالغے سے پرہیز کیا گیا ہے اور شاد صاحب کی بشری کمزوریوں کو قبول کرنے کے بعد ان کی شخصی تصویر کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاد صاحب کی خودنوشت تحریروں، سلطان اشرف ردعی اقبال کی یادداشتوں اور شاد صاحب کے مکاتیب سے مل کر یہ حصہ شاد صاحب کی سوانح کو سمجھنے کے لیے ایک معتبر دستاویز کا کام کرتا ہے

شاد صاحب کی شاعری پر جو تنقیدی و تجزیاتی مطالعے ہیں ان میں سب سے پہلے ہمیں کتاب کے مقدمہ نگار مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریر متوجہ کرتی ہے۔ عرشی صاحب نے بہت اختصار کے ساتھ شاد صاحب کے فن کی نمایاں خصوصیت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے ان کی طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"طنز نگار کا کام سماج کی خامیوں کی گرفت ہے یہ گرفت ایسے ہاتھ کی ہونی ہے جو کسی عضو کے فاسد مادے کو نکالنے کی طاقت رکھتا ہو۔ یہی ہاتھ زخم پر پھاہا بھی رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پھاہا کافوری مرہم کا نہ ہو ٹنکچر آیوڈین کا ہو جو زخم میں جلن پیدا کرے مگر اس کا نتیجہ بہرحال زخم کا اندمال ہی ہوتا ہے شاد عارفی نے جس جگہ نشتر زنی ضروری جانی، اپنی اس مضبوط گرفت سے کام لیا۔ وہ کافوری مرہم کے قائل نہ تھے ٹنکچر آیوڈین کا استعمال کرتے تھے۔ تیکھا طنز، لہجے کی تیزی اور نوکیلا پن ان کا مزاج بن گیا تھا۔ ان کی آواز میں رام پور کا مردانہ لہجہ اور پٹھانوں کا بانکپن الگ پہچانے جاتے ہیں۔"

شاد صاحب کے فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں جو مضامین ہمیں مدد دیتے ہیں ان کی تعداد خاصی ہے اور لکھنے والوں میں مختلف طرح کے لوگ ہیں۔ جن حضرات کی مختصر رائیں شامل کی گئی ہیں ان میں نیاز فتحپوری

عرشؔ صہبائی

غزل

کتنے سنگین مراحل ہمیں درپیش رہے
ہم وفا کیش بہرحال وفا کیش رہے

زندگی میں نہ رہے کوئی توازن قائم
زندگی میں نہ اگر فکر کم و بیش رہے

دل نے سو بار کہا تھا کہ بغاوت کر دو
ہم روایات زدہ محوِ پس و پیش رہے

زندگی! ہم نے ترے ناز اٹھائے کیا کیا
تجھ کو کیا علم کہ کس حال میں درویش رہے

لذتِ دار و رسن لوٹ گئے اہلِ جنوں
اک تذبذب میں مگر عاقبت اندیش رہے

لازماً ان کی زمانے میں پرستش ہوگی
عرشؔ اس دور میں جو لوگ جفا کیش رہے

آل احمد سرور، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری اور گوپال متل کی تحریریں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ کاش کہ یہ حضرات اور کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے یا نسبتاً تفصیل سے لکھنے کا موقع نکال سکتے۔

اس کتاب میں ایسے لوگوں کے مضامین بھی شامل ہیں جن سے بقول مرتبؔ شاد صاحب کی عمر بھر چپقلش رہی "غیر جانبدار اور انصاف پسند حضرات بھی ہیں اور نئی نسل کے وہ ادیب بھی جن کا خیال ہے کہ یگانہ کے بعد شاد عارفی ہی دوسرے شاعر ہیں جن کی شاعری آج کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے اور اس کی معنویت و ندرت جدید شعراء کے لیے ایک اہم ورثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چند مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند، ظ انصاری، کوثر چاند پوری، ماہر القادری، نشور واحدی، عرفت کاکوروی، عروج زیدی، بدر تسلیمی، ابر احسنی، شفا گوالیاری، منیان صابر رامپوری، مسیحا نظامی، ظفر ادیب، راہی معصوم رضا، اسلام مچھلی شہری، منظر امام، حرمت الاکرام، احمد جمال پاشا، شہرت بخاری، ناصر کاظمی، شبیر بدر، عتیق حنفی، فضل تابش، ندا فاضلی، شمیم حنفی، مسرت حسین آزاد وغیرہ۔

تنقیدی و تجزیاتی مضامین کی بھی یہ خصوصیت قابل غور ہے کہ یہ مضامین یک طرفہ اور تعریفی نہیں ہیں بعض حضرات نے شاد صاحب کی فنی کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی رائے سے متفق نہ ہوں) ایک صاحب نے ان کو یگانہ کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور شاد صاحب کی شاعری کے دائرۂ اثر کو محدود قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ "وہ جزو میں جزو کا تماشا کرتے رہے۔" اس تنقید کا جواب ایک دوسرے مضمون میں مل جاتا ہے۔ ایک صاحب نے شاد صاحب کو ظفر علی خاں کی قبیل کا شاعر قرار دیا ہے۔ (یہ اکیلی رائے ہے۔ اس کا جواب بھی مضامین کے مجموعی مطالعے سے پڑھنے والے کو مل جاتا ہے) غرض کہ یہ بات خاص طور پر قابل قدر ہے کہ مرتب نے لکھنے والوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، صرف ایک گروہ کے لوگوں کو لکھنے کے لیے مدعو نہیں کیا صرف مدّاحوں اور طرفداروں کو اکٹھا نہیں کیا اور کسی رائے کو دبانے یا کسی بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طور پر یہ کتاب شاد صاحب کا ایک بے لاگ اور معروضی جائزہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

مظفر حنفی نے اتنی مکمل اور بھرپور کتاب شائع کرکے اردو کے ایک اہم اور قابل قدر شاعر کے متعلق اتنا اچھا اور قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے کہ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ خدا کرے کہ ان کی مرتب کی ہوئی دوسری کتاب "نثر اور غزل دستہ" بھی جلد ہی شائع ہو جائے۔ اس کتاب میں شاد عارفی کے مضامین اور ان کی غزلوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔

شاد عارفی نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس دور میں صاحب دیوان اور صاحب مجموعہ بننا سب سے زیادہ سہل ہو گیا ہو اور چھٹ بھیّوں کے مجموعے اور دواوین مجلّا اور مطلّا ہو کر بازاروں میں دکھائی دیں اس دور میں ایسے منفرد اور صاحب طرز شاعر کا مجموعہ شائع کرنے کے لیے کوئی پبلشر آمادہ نہ ہو۔ ان کا شعری سرمایہ کچھ نہیں تو دس بارہ مجموعوں میں سمٹ سکتا ہے لیکن ان کی زندگی میں ایک مجموعہ بھی ڈھنگ سے شائع نہ ہو سکا۔ نیا ادارہ لاہور والوں نے ان کا مجموعہ چھاپنے پر آمادگی ظاہر کی تھی لیکن وہ برابر ٹالتے رہے ابھی کچھ دنوں پہلے ایک رسالے میں اشتہار دیکھا کہ نیا ادارہ سے شاد صاحب کی نظموں کا مجموعہ "اندھیر نگری" شائع ہو گیا ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو اگرچہ اس اشتہار کو دیکھتے ہی بے اختیار کسی کا مصرع یاد آ گیا ؎

یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گل صحرا۔ (شعری مجموعہ)

مصنف: طالب چے پوری
ناشر۔ طالب چے پوری ۱۸ ہیسٹنگز روڈ الہ آباد
صفحات:۔ ۱۰۰
قیمت:۔ دو روپے

رگ ساز۔ (مجموعہ کلام)

مصنف:۔ شاہین غازی پوری
ملنے کا پتہ:۔ پاک کتاب گھر۔ ۳۹ پٹواٹولی۔ ڈھاکہ
صفحات:۔ ۱۹۴
قیمت:۔ پانچ روپے

سخنہائے گفتنی۔ (جدید و اضافہ شدہ ایڈیشن)

مصنف:۔ کلیم الدین احمد
ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ
صفحات:۔ ۵۳۲
قیمت:۔ آٹھ روپے

---

۲۵ نظمیں ایک نظریہ ایک تجربہ

مصنف: ڈاکٹر سید محمد صدر الدین فضا شمسی
ناشر:۔ کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ
صفحات:۔ ۱۹۴ / قیمت:۔ تین روپے پچاس پیسے

انیس انور

مکتوب لندن

لندن میں مشاعرہ

لندن کے سینٹ اینڈ ریوز ہال میں ۱۷ فروری کو ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس مشاعرہ میں جو شعرا شریک ہو رہے ہیں ان میں میر مشیر حکیم غلام نبی۔ ایس۔ ایچ شمسی بخش لائلپوری۔ ایشور سنگھ خدیجہ بانو۔ گرشن گولا۔ ایم۔ ایس۔ جامی۔ عبدالقیوم بہار کاشمیری۔ احسان جاوید۔ جمیل احمد مدنی۔ ڈاکٹر برلاس اور ایم۔ ایس بقا کے نام قابل ذکر ہیں اس مشاعرہ کا اہتمام ہندوستان کے مشہور گلوکار ایس ڈی باتش نے کیا ہے۔ مہمان خصوصی بی بی سی ٹیلیویژن کے حیدر رکول از رسلیم تمہ ہوں گے اور داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا۔

ریڈیو ٹائمز میں اردو پروگراموں کی تفصیلات شائع کی جائیں

'مشرق' نے بی بی سی ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ارباب اقتدار سے مطالبہ کیا ہے کہ آئندہ 'ریڈیو ٹائمز' میں بی بی سی کے اردو پروگرام 'ایسا ہی گھر سمجھئے' کی مکمل تفصیلات کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے بی بی سی کے دوسرے پروگراموں کی تفصیلات اور نشر کئے پروگرام کی تصاویر باقاعدہ 'ریڈیو ٹائمز' میں شائع ہوتی ہیں مگر کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اردو پروگرام کی تفصیلات اور تصاویر کی اشاعت سے گریز کیا جاتا ہے اس امتیازی بدسلوکی پر احتجاج کرتے ہوئے 'مشرق' نے مطالبہ کیا ہے کہ بی بی سی اردو پروگراموں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک ترک کر دے۔

لائبریری عوامی امانت ہے

عبدالقیوم خواجہ صاحب نے ہم وطنوں کے طرز عمل کی شکایت کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ انھیں پچھلے دنوں برڈ فورڈ کی سٹی لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اردو۔ ہندی۔ پنجابی اور بنگالی کتب کا ذخیرہ کافی موجود ہے لیکن انھیں ان کتابوں کی خستہ حالی پر بڑا دکھ ہوا کیونکہ بعض حضرات نے انھیں مشق ستم بنایا تھا۔ کتابوں پر مختلف حضرات نے اپنے قلم کی جولانی دکھائی تھی اور اس طرح کتابوں کو گندہ کر دیا تھا۔ چونکہ کتب خانے قومی اور عوامی امانت ہیں اس لیے انھوں نے مطالعہ کرنے والے حضرات سے درخواست کی ہے کہ وہ کتابوں کو

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

نمونہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔

انتخاب مشرق۔ غزل از بہار کاشمیری

صبا تھی رقص کناں پھول نغمہ خواں یارو
غضب کی آگ برستی ہے اب یہاں یارو
شکن ابھرتی رہی ہے کسی کے ماتھے پر
کوئی سناتا رہا دل کی داستاں یارو
زمیں سے رشتہ ہے کچھ ایسا استوار اپنا
نظر میں جچتا نہیں کوئی آسماں یارو
یہ گرد باد یہ طوفاں یہ موسموں کا مزاج
اجاڑ دے نہ کہیں اپنی بستیاں یارو
ادھر حیات کی تلخی ادھر نشاط کا رم
وہ میری بزم میں آئیں گے اب کہاں یارو

فارم ۱۷

دیکھو رول ۸

اخبار ہماری زبان

علی گڑھ

۱۔	مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل علی گڑھ
۲۔	نوعیت اشاعت	ہفتہ وار
۳۔	نام پرنٹر	ضمیر الدین قریشی
	قومیت	ہندوستانی
	پتہ۔	مسلم ایجوکیشنل پریس محلہ نبی اسرائیلان علی گڑھ
۴۔	نام پبلشر	نذیر حسن
	قومیت	ہندوستانی
	پتہ۔	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۵۔	نام ایڈیٹر	پروفیسر آل احمد سرور
	قومیت	ہندوستانی
	پتہ۔	شبلی روڈ علی گڑھ
۶۔	نام مالک اخبار	انجمن ترقی اردو ہند۔ سلطان جہاں منزل علی گڑھ

میں نذیر حسن تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ سنہ ۱۹۶۸ء نذیر حسن

غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات

ادھر دو ایک سال کے اندر غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات کسی رسالے میں شایع ہوا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے

غالب جو مرگیا ہے تو دلی اداس ہے

اگر کوئی صاحب ذوق اس قطعہ کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں کہ یہ کہاں شایع ہوا ہے مکمل قطعہ کیا ہے اور کس کا ہے تو شکر گزار ہوں گا۔

(اکبر علی خاں رضا لائبریری رامپور)

ایک دعوت فکر کے بارے میں

۸ فروری ۶۸ کے شمارہ میں "ایک دعوت فکر" کے عنوان سے مراسلہ شائع ہوا تھا۔ جس میں ادارہ کی جانب سے مندرجہ ذیل نوٹ تھے

"یہ غزل مراسلہ نگار کو کہاں سے ملی ہے اس کا منبع میں کوئی تذکرہ نہیں ہے اس غزل کو غالب سے کن لوگوں نے منسوب کیا ہے۔ اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے یہ باتیں واضح ہونی چاہئے۔" (ادارہ)

ادارہ ہماری زبان و قارئین کے معلومات میں اضافہ کے لیے جو کچھ مجھے معلوم ہے اُسے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ جناب شوکت عظیم صاحب آج سے تقریباً پانچ چھ برس قبل ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک ادبی اجتماع کیا گیا تھا جس میں ایک مغنی شریک تھا اس نے ترنم سے غزل پڑھی تھی اس کا نام محمد ایوب خاں عرف بتن دیوانہ تھا محلہ شور گران اجمیر شریف کا رہنے والا تھا ہندوستان کے مشہور موسیقار چاند خاں جو شاعر تھے اور چاند پیا تخلص کرتے تھے ان کے خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر نے اس مغنی سے اس غزل کے متعلق دریافت کیا اس نے کہا کہ "اپنے پرانے بکس سے ایک قدیم بیاض کے منتشر اوراق میں یہ غزل درج ملی تھی۔ حکم چند نیّر اور دوسرے لوگوں نے بہت سے سوالات کئے لیکن مغنی پوری تفصیل سے جواب نہیں دے سکا اور اس نے کہا کہ میرے خاندان کے کچھ بوڑھے افراد تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے ہیں ان سے دریافت کرنے کے بعد جواب تشفی بخش دوں گا۔

حکم چند نیّر اپنے مضمون "غالب کی ایک غزل" جو "صبا" حیدرآباد میں شائع ہوا تھا میں تحریر کیا ہے کہ اس مغنی سے بہت دنوں تک خط و کتابت کی لیکن عدم جواب کی صورت میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ غالباً اسی سلسلے میں جناب شوکت عظیم صاحب نے بھی ایک مختصر مضمون لکھا تھا جو جنوری ۶۸ کے "عارض" دہلی میں شایع ہوا ہے۔

(شارہ محمد صدیقی)

ڈاکٹر صفدر آہ کا شکریہ

۱۵ جنوری کے ہماری زبان میں ڈاکٹر صفدر آہ کا مختصر نوٹ نظر سے گزرا۔ اس کے بے حد سنجیدہ اور سنبھلے ہوئے لہجے کے لیے تہ دل سے مشکور ہوں۔ عروض کے بارے میں ان کا اور میرا موقف بالکل واضح ہو چکا ہے اس لیے اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہنا۔ انھوں نے مراسلے کے آخری حصے میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر گیان چند ہماری زبان کے ایک مستند محقق ہیں" میں یہ جملہ پڑھ کر لرز گیا۔ میں نمائشی کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا صدق دل اور خلوص کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ میں اس منصب بلند کے آس پاس بھی نہیں پہنچا۔ کاش مجھے کبھی اس مقام پر پہنچنے کی توفیق ہو سکے۔

آخر میں ایک دلچسپ انکشاف کیا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سیاہ بالوں کی نمائش کرنا چاہی ہے۔ عرض ہے کہ ولادت سے آج تک میرا سر کبھی سیاہ بالوں سے آشنا ہی نہیں ہوا۔

(گیان چند)

کرناٹک کے اردو شعرا متوجہ ہوں

راقم ماتایہ کاتس ہبلی کی جانب سے کرناٹک کے ابھرتے ہوئے طنز و مزاح نگار اور "ہم کہاں کے دانا ہیں" کے مصنف پروفیسر محبوب رطافی ہبلوی (ڈبل) ایم۔ اے "نوائے کرناٹک" کے عنوان سے شمالی کرناٹک (یعنی دھارواڑ۔ بیلگام۔ کاروار اور بیجاپور اضلاع) کے تمام اردو شعرا و ادبا کا ایک تعارفی دستاویز مرتب کر رہے ہیں جس میں ہر شاعر کا مختصر تعارف، کلام اور فوٹو شائع ہوگا۔

لہذا کرناٹک کے تمام اردو شاعروں اور ادیبوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے اور اپنے شاعر و ادیب دوستوں کے پتے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ فرمائیں۔

پتہ:۔ پروفیسر ایم اے۔ پڑائی بھار بار اگلی ولڈ ہبلی

ہبلی (ریاست میسور)

اردو میں خواتین کا اولین ناول

اردو میں خواتین کا اولین ناول "مطبوعہ اخبار" ہماری زبان "بابت ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء (از سید سلیمان حسینی شہنشاہ بلڈنگ نخاس لکھنؤ) کے سلسلے میں مزید تائید کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ناول "اصلاح النساء" مصنفہ رشیدۃ النساء کا زمانہ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے ناول زیر بحث کی بابت تفصیلات میں نے اپنی کتاب "چند ادبی مسائل" اور ڈاکٹر احتر اورینوی نے اپنی کتاب "قدر و نظر" میں درج کر دی ہیں۔

(شاہ مقبول احمد صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج کلکتہ)

...کو ہیت سے متعلق غالب کے ہمعصر شاعروں کے متعلق غالب کے ...متعلق مکمل سے مکمل سرمایہ یہاں جمع کرایا جائے گا مشاعرے بھی اور ...بھی یہاں ہوا کریں گے اور ذوق شعری کی تربیت کے حلقے بھی کئے ...یں گے خود اس عمارت کی اندرونی سج دھج ایسی بنائی جا سکے گی کہ غالب ...زمانہ آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ میں آخر میں ...صاحب ...فخر الدین علی ...احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس موقع پر مجھے یاد فرمایا ...ر زیادہ شکرگزار اس وقت ہوں گا جب یہ یادگار قائم ہو جائے ...اور وہ کام انجام دے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے (سیاست)

غالب نے آنے والی نسلوں کو نیا انداز فکر جدید رجحان اور ترقی پسند شعور بخشا

...ردیش غالب صد سالہ جشن کمیٹی میں منعقدہ جلسہ کا خیال

لکھنؤ۔ غالب کی عظمت اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بڑی وجہ صرف اس ...نہیں ہے کہ اس نے ہمارے لیے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں ...تخیل کی بلند پروازی، جذبات کی شدت، نظر کی گہرائی، مشاہدے کی ...بدت، طرز ادا کی ندرت اور حسن بیان کی لطافت کے شاہکار ہیں کہ ...بلکہ اس کے جاوداں ہونے کا راز یہ ہے کہ اس نے آنے والی نسلوں کو ...ایک نیا انداز فکر، ایک جدید رجحان اور ایک ترقی پسند شعور بخشا ہے۔ ان ...خیالات کا اظہار یہاں غالب صد سالہ جشن کمیٹی اتر پردیش کی طرف سے ...بزم غالب کے موقع پر مقررین نے کیا۔ یہ تقریب ریاستی گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی ...کی صدارت میں میونسپل کارپوریشن کے ترلوک ناتھ ہال میں ہوئی۔ مقررین نے ...کہا کہ غالب دانشمندی کا ایک مینارہ ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے مختلف راستوں ...کو اس طرح منور کرتا ہے کہ اس کے معتقد جو راہ چاہیں اپنے لیے منتخب کریں ...غالب نے روایت سے بغاوت کا راستہ اور سطحیت سے ہٹ کر ایک جداگانہ ...ادبی نگاہ سے دیکھنے کی بھی دعوت دی ہے۔ گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی ...نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ جشن غالب آج کی تاریخ سے آئندہ سال کی ...۱۵ فروری تک منایا جائے گا جیسا کہ ٹیگور کی صد سالہ تقریب منائی ...گئی تھیں۔ انھوں نے کہا میری آرزو ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی ...اردو داں موجود ہوں یہ تقریب منائی جائے۔ امریکا اور روس کے ...لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے ...بہترین کلام میں دنیائے محبت کے نئے گوشے نظر آتے ہیں اور اس میں کوئی ...شک نہیں کہ غالب اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب کے کلام ...کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ غالب نے ہمیں ایک حسین چمن کا پھول دیا ہے ...جس کا اثر کبھی رنگ کم نہ ہوگا اس کی خوشبو ہمیشہ رہے گی۔ حضرت ...جناب الگ سین ایم ایل اے (صدر جشن کمیٹی) اور جناب پی ایس سیٹھی (جنرل ...سکریٹری) نے بھی اپنی مختصر تقریروں میں غالب کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

انجمن ترقی اردو آندھرا کا وزیر اعلیٰ کی خدمت میں میمورنڈم

...آندھرا کے معتمد جناب حبیب الرحمن صاحب نے آندھرا کے وزیر اعلیٰ کی خدمت ... [illegible] ...آپ کی خدمت میں حسب ذیل حقائق پیش کرنے کی اجازت

چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

اخبارات کی اطلاع کی بموجب آپ کی رہنمائی میں حکومت آندھرا پردیش سہ لسانی فارمولے کی توثیق کر کے اپنی لسانی پالیسی کا اعلان کرنے والی ہے۔ جہاں تک ہماری ریاست کا تعلق ہے اس فارمولے میں جو تین زبانیں شامل کی جائیں گی وہ تلگو، ہندی، اور انگریزی بتائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسکیم میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس صورت حال سے آندھرا پردیش کے اردو داں میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے یقیناً آپ یہ توقع نہیں رکھتے کہ اردو بولنے والے بچے متذکرہ بالا تینوں زبانوں کی خاطر اپنی مادری زبان کو ترک کر دیں۔ دوسری طرف اگر وہ اپنی مادری زبان بھی سیکھیں جیسا کہ انھیں سیکھنا چاہئے تو سہ لسانی فارمولا ان کے لیے چہار لسانی فارمولا بن جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی زبانوں کے اتنے بھاری بوجھ کے عائد کرنے کو پسند نہیں کرے گا۔ اس دشواری پر قابو پانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیسری زبان کا سیکھنا لازمی نہ ہو لزوم صرف دو زبانوں کی حد تک رہنا چاہئے، جن میں سے ایک مادری زبان ہوگی اور دوسری کوئی اور زبان۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں تلگو بولنے والے بچے ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں جب کہ اردو بولنے والے بچے تلگو یا ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آندھرا پردیش کے اردو داں والے اپنی مادری زبان کے بعد تلگو کی تحصیل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ میں اردو داں کی بہت بڑی اکثریت کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ تلگو دیس میں رہتے ہوئے وہ تلگو زبان پر قدرت حاصل کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کی بہت بڑی اکثریت کے لیے تلگو اور اردو کی واقفیت زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے کافی ہے تیسری زبان کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آئے گی جو آندھرا پردیش کے باہر قسمت آزمائی کرنا چاہیں گے اور ان کی تعداد یقیناً بہت کم ہوگی ان کے لیے ہندی یا انگریزی سیکھنے کے مواقع رہیں گے اور انھیں ریاست سے باہر قسمت آزمائی کی خاطر تیسری زبان کے سیکھنے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ بنا بریں آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آندھرا پردیش کے اردو داں بچوں کے لیے اپنی مادری زبان اور علاقائی زبان تلگو کی لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ تیسری زبان سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ ان میں سے جو تیسری زبان سیکھنا چاہیں گے وہ ہندی یا انگریزی میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا اس سے اردو والے یا تو وہ اپنی مادری زبان سے محروم ہو جائیں گے یا پھر ان پر چار زبانوں کے سیکھنے کا بھاری بوجھ عاید ہوگا جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے۔

غالب شناسی ... سے متعلق غالب کے ... غزلوں کے متعلق غالب کے عہد سے متعلق مکمل سے مکمل سرمایہ یہاں جمع کر دیا جائے گا شاعری اور شائقین بھی یہاں ہوا کریں گے اور ذوق شعری کی تربیت کے جتن بھی کئے جائیں گے خود اس عمارت کی اندرونی سج دھج ایسی بنائی جاسکے گی کہ غالب کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ میں آخر میں جناب صاحب فخر الدین علی احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس موقع پر مجھے یاد فرمایا اور زیادہ شکرگزار اس وقت ہوں گا جب یہ یادگار قائم ہو جائے گی اور وہ کام انجام دے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے (ریاست)

غالب نے آنے والی نسلوں کو نیا انداز فکر جدید رجحان اور ترقی پسند شعور بخشا

اترپردیش غالب صد سالہ جشن کمیٹی میں مقررین کا اظہار خیال

لکھنؤ - غالب کی عظمت اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بنیاد صرف اس پر نہیں ہے کہ اس نے ہمارے لیے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں یا تخیل کی بلند پروازی، جذبات کی شدت، نظر کی گہرائی، مشاہدے کی جدت، طرز ادا کی ندرت اور حسن بیان کی لطافت کے شاہکار پیش کئے ہیں بلکہ اس کے جاوداں ہونے کا راز یہ ہے کہ اس نے آنے والی نسلوں کو ایک نیا انداز فکر، ایک جدید رجحان اور ایک ترقی پسند شعور بخشا ہے ان خیالات کا اظہار یہاں غالب صد سالہ جشن کمیٹی اترپردیش کی طرف سے یوم غالب کے موقع پر مقررین نے کیا۔ یہ تقریب ریاستی گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی کی صدارت میں میونسپل کارپوریشن کے ترلوک ناتھ ہال میں ہوئی مقررین نے کہا کہ غالب دوستی کا ایک معیار ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے مختلف راستوں کو اس طرح منور کرتا ہے کہ اس کے معتقد جو راہ چاہیں اپنے لیے متعین کرلیں غالب نے روایت سے بغاوت کا راستہ اور سطحیت سے ہٹ کر ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بھی دعوت دی ہے۔ گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ جشن غالب آج کی تاریخ سے آئندہ سال کی ۱۵ فروری تک منایا جائے گا جیسا کہ ٹیگور کی صد سالہ تقریبات منائی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا میری آرزو ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی محبان اردو موجود ہوں یہ تقریب منائی جائے امریکا اور روس کے ادارے بھی اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے بہترین کلام میں دنیائے محبت کے نئے گوشے نظر آتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ غالب نے ہمیں ایک حسین چمن کا پھول دیا ہے جس کا انوکھا رنگ کم نہ ہوگا اس کی خوشبو ہمیشہ رہے گی۔ حضرت فراق گورکھپوری جناب اکبر حسین ایم ایل اے صدر جشن کمیٹی، اور جناب بی ایس سیٹھی (جنرل سکریٹری) نے بھی اپنی مختصر تقریروں میں غالب کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

انجمن ترقی اردو آندھرا کا وزیر اعلیٰ کی خدمت میں میمورنڈم

انجمن ترقی اردو آندھرا کے معتمد جناب حبیب الرحمن صاحب ... کے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں ... پیش کیا جس میں آپ کی خدمت میں حسب ذیل حقائق پیش کرنے کی اجازت

چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

اخبارات کی اطلاع کی بموجب آپ کی رہنمائی میں حکومت آندھرا پردیش سہ لسانی فارمولے کی توثیق کرکے اپنی لسانی پالیسی کا اعلان کرنے والی ہے۔ جہاں تک ہماری ریاست کا تعلق ہے اس فارمولے میں جو تین زبانیں شامل کی جائیں گی وہ تلگو، ہندی، اور انگریزی بتائی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ اسکیم میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس صورت حال سے آندھرا پردیش کے اردو داںوں میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے یقیناً آپ یہ توقع نہیں رکھتے کہ اردو بولنے والے بچے متذکرہ بالا تینوں زبانوں کی خاطر اپنی مادری زبان کو ترک کردیں۔ دوسری طرف اگر وہ اپنی مادری زبان بھی سیکھیں جیسا کہ انھیں سیکھنا چاہئے تو سہ لسانی فارمولا ان کے لیے چہار لسانی فارمولا بن جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی زبانوں کے اتنے بھاری بوجھ کے عائد کرنے کو پسند نہیں کرے گا۔ اس دشواری پر قابو پانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیسری زبان کا سیکھنا لازمی نہ ہو۔ لزوم صرف دو زبانوں کی حد تک رہنا چاہئے، جن میں سے ایک مادری زبان ہوگی اور دوسری کوئی اور زبان مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں تلگو بولنے والے بچے ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں جب کہ اردو بولنے والے بچے تلگو یا ہندی یا انگریزی سیکھ سکتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آندھرا پردیش کے اردو والے اپنی مادری زبان کے بعد تلگو کی تحصیل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ میں اردو داںوں کی بہت بڑی اکثریت کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ تلگو دیس میں رہتے ہوئے وہ تلگو زبان پر قدرت حاصل کرنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان کی بہت بڑی اکثریت کے لیے تلگو اور اردو کی واقفیت زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ تیسری زبان کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آئے گی جو آندھرا پردیش کے باہر قسمت آزمائی کرنا چاہیں گے اور ان کی تعداد یقیناً بہت کم ہوگی ان کے لیے ہندی یا انگریزی سیکھنے کے مواقع رہیں گے اور انھیں ریاست سے باہر قسمت آزمائی کی خاطر تیسری زبان کے سیکھنے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ بنابریں آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آندھرا پردیش کے اردو داں بچوں کے لیے اپنی مادری زبان اور علاقائی زبان تلگو کی لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ تیسری زبان سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ ان میں سے جو تیسری زبان سیکھنا چاہیں گے وہ ہندی یا انگریزی میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا اس سے اردو والے یا تو وہ اپنی مادری زبان سے محروم ہوجائیں گے یا پھر ان پر چار زبانوں کے سیکھنے کا بھاری بوجھ عاید ہوگا جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے۔

... سے نیشنل ... ڈاکٹر ذاکر حسین خاں غالب میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھ چکے ہیں کسی نے تجویز کیا کہ جہاں یہ ہال بنایا جا رہا ہے یہیں کہیں غالب ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے زمانے میں جھاڑیوں میں آکر چھپے تھے۔ فخر الدین علی احمد صاحب نے جو مرکزی کمیٹی غالب جشن صد سالہ کے سکریٹری ہیں آگاہ کیا کہ آئندہ سال کی تقاریب کے لیے اعلیٰ پیمانے پر تیاریاں شروع ہو گئی ہیں اس لیے میری دلی والوں سے پرزور اپیل ہے کہ اس سلسلہ میں ہر شخص جو بھی امداد دے سکتا ہے دے۔ آخر میں فخر الدین صاحب نے فرمایا کہ ہم اس موقع پر ایک بین الاقوامی سیمینار بھی کر رہے ہیں تاکہ ماہر کے محققین نے غالب پر جو کام کیا ہے اس سے ہندوستان کے لوگ بھی روشناس ہو سکیں۔ میری خواہش ہے کہ ہندوستان تمام صوبوں میں بھی دلی کے علاوہ غالب کی سو سالہ برسی منائی جائے۔ بمبئی حیدرآباد اور لکھنؤ میں تیاریاں شروع ہو چکی ہیں مجھے افسوس ہے کہ اپنی خرابی صحت کی بنا پر میں سبھی ریاستوں کا دورہ نہیں کر سکا میں کوشش کروں گا کہ مدراس اور کیرالہ جیسے علاقوں میں بھی یہ تقریب ہو۔ حیدرآباد میں جس طرح سے کام ہو رہا ہے میں اس سے بہت مطمئن ہوں میموریل ہال کی تعمیر کے کام میں دلی سے باہر کے لوگوں کو بھی مدد کرنی چاہیے۔

بزم مقالات میں ڈاکٹر تارا چند صاحب نے مختصر تقریر فرمائی، ڈاکٹر محمد حسن نے غالب اور اس کا فن کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ نشست کے آغاز میں جناب جگن ناتھ آزاد نے غالب پر اپنی نظم سنائی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ غالب کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی قوت فکر ہے، غالب ایک فلسفی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں تخیل و فکر موجود ہے وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کے بارے میں ایسے تصورات پیش کیے ہیں جو ہماری سوچنے کی قوت کو فکر انگیز کرتے ہیں۔ ذوق، ناسخ اور میر زبان و بیان اور محاوروں کے استاد ہیں لیکن ان کے یہاں غالب کا تفکر نہیں ہے غالب کی ایک اور خصوصیت ان کی انفرادیت ہے جو ان کی ہر غزل میں نظر آتی ہے مزید ان کے کلام میں ایک مردانہ قسم کی انانیت ہے جو تکبر سے مبرا ہے۔ چھ بجے یہ نشست ختم ہوئی۔ ساڑھے نو بجے شام کو طرحی مشاعرے کا افتتاح مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب کے کے شاہ نے کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا غالب ایک بہت بڑے انقلابی تھے جنھوں نے اپنے دور کی ناہمواریوں پر آزادی سے اظہار خیال کیا اور عوام کو سوچنے کے نئے زاویوں اور زندگی کی نئی راہوں سے روشناس کیا۔ غالب کا موازنہ شیکسپیئر سے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ دونوں کی تخلیقات میں زندگی کے ہر موقع کے لیے اشعار ملتے ہیں اور دونوں ہی روح انسان کی ہر قلبی و ذہنی منزل میں ایک دوست اور رہنما کی طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غالب ایک بڑے ہی باہمت اور بلند نگاہ شاعر تھے زندگی بھر ان پر مفلسی طاری رہی لیکن وہ کبھی مایوس نہ ہوئے انھوں نے ہمیشہ امید سے کام لیا۔ ... صبح و شام نے انھیں مزید متاثر کیا لیکن اس کیفیت کے اظہار میں ایک حسن اور دلکشی ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران غالب کے کئی شعر پڑھے۔ نشست کا آغاز غالب کی غزلوں سے ہوا جو استاد نصیر خاں اور جلال خاں نے ایسے دلکش انداز میں پیش کیں کہ فضا پُرکیف ہو گئی۔ پھر تقریباً چالیس شعرائے کرام نے اپنا طرحی کلام پیش کیا اور ساڑھے دس بجے رات کو یہ مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

(جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بنارس میں یوم غالب

بنارس۔ جے پی مہتا انٹر کالج بنارس میں انجمن ترقی اردو بنارس کی جانب سے یوم غالب منایا گیا صدارت کے فرائض جناب ملیشور رائے صاحب پرنسپل کالج مذکور نے انجام دیے۔ جلسہ میں طلبہ اساتذہ کے علاوہ شہر کے کچھ ممتاز فنکار بھی شریک تھے ابتدا میں رئیس احمد و اوصاف احمد متعلم درجہ نہم نے ایک ساتھ استقبالیہ نظم پڑھی اور بعد میں رئیس احمد، اوصاف احمد، لیاقت علی و رضوان علی متعلم درجہ نہم و حسن منصور عباس نے غالب کی مختلف نظمیں پڑھیں۔ حسن منصور عباس نے غالب کی کہانی غالب کی زبانی سنائی۔ سردار احمد متعلم درجہ نہم نے غالب سے متعلق دو مخطوطات پیش کیے۔ غالب کی زندگی سے متعلق شہاب الدین محمد رضوان، لیاقت علی متعلم درجہ نہم و ریاض احمد، خالد نور متعلم ہفتم نے ایک ڈرامہ پیش کیا۔ کالج اسٹاف کے دو معزز رکن جناب ڈاکٹر جے شنکر، جے دیال، سوریندر کمار سنگھ صاحبان نے غالب کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق مختلف مقالے تاریخ کی روشنی میں دیتے ہوئے پرمغز تقریر کی۔ جناب سوریندر کمار سنگھ صاحب نے غالب کی خدمت میں اپنی عقیدت کا اظہار اپنی ایک نظم پیش کرتے ہوئے کیا۔ اس کے بعد جناب بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب لیکچرار ڈی اے وی کالج بنارس نے غالب کی زندگی ان کی ادبی خدمات پر باقاعدہ روشنی ڈالی۔ آخر میں مولانا احمد ... اعظمی ہیڈ مولوی کالج نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عوام سے اردو زبان سے متعلق دلچسپی لینے کی اپیل کی۔

(دانا رسول جوائنٹ سکریٹری)

... اردو ہند علی گڑھ ... پرنٹر خیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا یا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29 Annual Rs. 5/- per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۱۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر کی تعمیر کے لیے چندہ

مجلس عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ دہلی میں انجمن کی عمارت کا نام "اردو گھر" ہوگا۔ اس کا سنگ بنیاد [illegible] کو صدر جمہوریہ اور اگلا مرحلہ وزیر اعظم ہند کے ہاتھوں رکھا جائے گا۔

گزشتہ اشاعت میں ہم نے یہ اطلاع دی تھی کہ عمارت کی تکمیل کے لیے ساڑھے سات لاکھ کی لاگت کا اندازہ کیا گیا ہے۔ انجمن کے پاس اس غرض سے ڈیڑھ لاکھ کے قریب سرمایہ محفوظ ہے۔ اس طرح چھ لاکھ روپے کے لیے عوام اور حکومت کے تعاون کی ضرورت ہے۔

ہم نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ایک ایک ہزار، سو سو روپے، دس دس روپے اور ایک ایک روپے کی رسیدیں تیار ہو رہی ہیں جو عنقریب مجلس عام کے ممبران اور ریاستی شاخوں کے پاس بھیجی جائیں گی۔ تمام چندوں کا اعلان ہماری زبان میں برابر ہوتا رہے گا۔ چندے کا حساب باقاعدہ رکھنے کے لیے خاص انتظام کیا جا رہا ہے، اس لیے کسی قسم کی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں ہے۔ چندہ جمع کرنے کے لیے مجلس عام کے ممبروں کو اور ریاستی شاخوں کے ذریعہ سے مقامی شاخوں کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ کسی ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کا اختیار نہ ہوگا جسے باقاعدہ یہ کام سپرد کیا گیا ہو۔ ہر رسید پر جنرل سکریٹری کے دستخط ضرور ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس کارکن کے جس کے ذریعہ سے چندہ جمع کیا جائے گا، مرکزی دفتر سے ایک اور رسید بھی ہر چندہ دینے والے کو بھیجی جائے گی۔

چندہ جمع کرنے کے لیے دہلی، بمبئی، اور حیدرآباد میں خاص تہذیبی پروگرام ہوں گے جن کے لیے علیحدہ انتظامات ہوں گے، لیکن اس سلسلے میں سب زیادہ توقع ہمیں اپنی شاخوں سے ہے۔ اس وقت انجمن کی چھوٹی بڑی چار سو شاخیں سارے ملک میں ہیں۔ اگر بڑی شاخیں ایک ہزار اور چھوٹی پانچ سو بھی جمع کریں تو چار لاکھ آسانی سے فراہم ہو سکتے ہیں۔ ہمیں موجودہ حالات کی سختی، [illegible] تمام مشکلات کا احساس ہے۔ مگر انجمن کا دفتر روز روز تو ہے گا نہیں اور اردو زبان و ادب کی حفاظت کا کام بہرحال کرنا ہے اور عرصہ دراز تک کرنا ہے، اس لیے دفتر کی تعمیر کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اگر معاملہ صرف حکومت کی توجہ یا دوسروں کے اشارے کا ہوتا تو بلک جھپکاتے ہم آٹھ دس لاکھ آسانی سے جمع کر سکتے تھے مگر ہمیں تو سب سے زیادہ عام اردو دوستوں کی مالی امداد، ہمدردی اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو گھر سب سے زیادہ انجمن کا عطیہ ہو۔ حکومت کی امداد کو بھی ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس کے لیے پوری کوشش کریں گے۔ ان لوگوں کے پاس بھی جائیں گے جو رفاہ عام کے کاموں میں دل کھول کر امداد کرتے ہیں مگر ہمیں تو سب سے زیادہ عام اردو دوستوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس عمارت کی تعمیر میں جتنا ان کا حصہ زیادہ ہوگا اتنا ہی انجمن کا عوام سے تعلق مضبوط ہوگا اور اتنا ہی انجمن کا عوامی کردار [illegible] ہوگا۔ اردو زبان پر نہ کسی مذہبی جماعت کا اجارہ ہے نہ کسی خاص علاقے کے لسنے والوں کا۔ یہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہے اور بڑی حد تک سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے گو دہلی، اتر پردیش، پنجاب، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، آندھرا، مہاراشٹر سے اس کا تعلق زیادہ گہرا ہے مگر ہندوستان کی ہر ریاست میں اس کے بولنے والے موجود ہیں یہاں تک کہ ناگالینڈ میں بھی۔

آئیے ہم اردو گھر کی ایسی شاندار عمارت بنائیں کہ اردو کی شان دوبالا ہو اور یہ زبان رہتی دنیا تک ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کر سکے۔

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

بچوں کے ادب سے متعلق مقابلہ میں اطہر پرویز کو انعام

نئی دہلی۔ مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے ادب سے متعلق تیرھویں انعامی مقابلہ میں شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے استاد اطہر پرویز کے تصنیف کردہ قلمی نسخے بعنوان "ہمارا ہندوستان" کو ایک ہزار روپے بطور انعام دینے کے لیے منتخب کیا ہے۔ وزارت نے جدید بھارتی زبانوں کی کل پندرہ کتابیں اور قلمی نسخوں کو منتخب کیا ہے جن میں سے ہر ایک کو ایک ہزار روپے کی رقم بطور انعام دی جائے گی۔

(الجمعیۃ دہلی)

بی بی سی سے اردو پروگرام بھی نشر ہوگا

شیفیلڈ (انگلینڈ) ۱۹ / فروری خالی بی بی سی ریڈیو نے ہر ہفتے ۱۵ منٹ کا اردو پروگرام شروع کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس میں خبریں مکالمے بحث مباحثے بھی ہوں گے یہ پروگرام ہر سنیچر کی شام کو نشر ہوا کرے گا۔

ملیالم کے خط کی اصلاح

ترویندرم۔ ایک سرکاری کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ملیالم زبان کے ۵ حروف میں ۵، ی صد کی کردی جائے حکومت کیرالا نے یہ کمیٹی رسم الخط اور حروف تہجی میں آسانی کی غرض سے اصلاح کی سفارش کے لیے مقرر کی تھی، کمیٹی نے جو فارمولا بنایا ہے اس کے ذریعے بہت سے مرکب حروف ختم کر دیے جائیں گے تاکہ رسم الخط آسان ہو جائے۔ (قومی آواز)

اردو صحافی مولانا عبدالباقی کی وفات

یہ خبر انتہائی رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ مولانا عبدالباقی، مالک و مدیر ہفت روزہ "کاروان وطن" دلی ۳ / فروری کو دلی میں انتقال کر گئے، مرحوم کم و بیش ۵۰ سال سے میدان صحافت میں تھے انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے لاہور میں کی تھی، مرحوم اردو ہی کے نہیں بلکہ انگریزی کے بھی اچھے صحافی تھے ادارہ ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(ادارہ)

غیر ملکی زبانوں میں کتابوں کے تراجم کے بارے میں یونیسکو کے اعداد و شمار

ماسکو۔ ۲ / مارچ یونسکو کے اعداد و شمار کے مطابق غیر ملکی زبانوں کی تصانیف کے تراجم کی اشاعت کرنے والے ممالک میں سوویت یونین سب سے آگے ہے اس طرح ترجمہ شدہ تصانیف کی تعداد کے اعتبار سے وی۔ آئی۔ لینن کو دنیا کے مصنفین میں اول مقام حاصل ہے۔ سوویت یونین میں ۱۹۶۶ء میں سماجی، سیاسی، سائنسی اور تکنیکی ادب و داستانوں کی لگ بھگ ۴ ہزار جلدیں شایع کی گئی ہیں۔ اسی سال کے دوران دیگر ممالک میں لینن کی ۵۰ تصانیف کا ترجمہ کیا گیا۔ اعداد و شمار یونیسکو کے شایع کردہ اس کتابچہ میں شامل ہیں، جس میں تراجم کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کے مطابق ۱۹۶۶ء کے دوران سر ممالک میں شایع شدہ تراجم کی تعداد ۳۹ ہزار ۲ سو ۶۷ ہے۔ (تاس)

علمی مجلس دلی کی مطبوعات

ابھی حال میں علمی مجلس دلی کے زیر اہتمام اردو کی دو کتابیں شایع ہوئی ہیں جن میں کلیات میر (حصہ اول) اور کلیات مصحفی شامل ہیں۔ کلیات میر کے مرتب ظل عباس عباسی ہیں۔ اس پر پیش لفظ پروفیسر آل احمد سرور نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کلیات نسخہ فورٹ ولیم مطبوعہ ۱۸۱۱ء سے مقابلہ و تصحیح کے بعد تیار کیا گیا ہے۔

دوسری کتاب کلیات مصحفی (حصہ دوم) مشتمل بر دیوان دوم کو نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے اس کے علاوہ مصحفی کی تمام تصانیف نظم و نثر کا سیٹ بارہ جلدوں میں مکمل کیا جا رہا ہے۔ یہ کتابیں انجمن اردو ہند علی گڑھ سے مل سکتی ہیں۔

بسمل ۔ تلامی

حیات نو

شاخ گل پر کوئی پھول کو ہنستے دیکھا
یک بیک
جاگ اٹھا
دل میں شعور ماضی
پردۂ ذہن پہ
ابھرا دی عکس رُتیں
جگمگا اٹھی
نظر میں
وہی تنویر جمال
اور میں کھو گیا
ماضی کے شبستانوں میں
چند لمحوں کے لیے ل گئی پھر مجھ کو حیات
اور میں
ہو گیا
آسودۂ انوار نظر
جیسے
آئینہ میں
تنویر تجلی چمکے

ایک اردو دوست کا انتقال

سابق نائب وزیر مرکزی محکمہ نشریات و اطلاعات لالہ شیام ناتھ کا ۱ / مارچ کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ لالہ صاحب ہندو مسلم اتحاد کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے اور اردو کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے مرحوم ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس کے خازن بھی رہ چکے تھے۔ ادارہ اس سانحہ پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

انجمن اساتذہ اردو کی تیسری کل ہند کانفرنس

علی گڑھ۔ انجمن اساتذہ اردو کی تیسری کل ہند کانفرنس جو مئی ۱۹۶۸ آخری حصہ میں ہونے والی تھی بعض اراکین کی تجویز پر اب اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ہو گی صحیح تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

(خلیل الرحمن اعظمی آفس سکریٹری
انجمن اساتذہ اردو تیسری کل ہند کانفرنس علی گڑھ)

عنایت حسین عیدن

ماریشس میں اردو

جزیرہ مڈگاسکر کے قریب ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا نام ماریشس ہے۔ آج کل انگریزوں کے قبضے میں ہے اس مہینے میں آزاد ہو جائے گا۔ اس جزیرے کے اصل باشندے رہتے تھے یہاں اب سے کئی سو سال پہلے دوسرے ملکوں سے لوگ یہاں آکر بس گئے تھے اسی لیے اس جزیرے کے تقریباً سات لاکھ باشندوں میں یورپین، چینی، افریقی اور ہندوستانی نسل کے لوگ پائے جاتے ہیں یہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے لیکن فرانسیسی زبان کا انگریزی کے مقابلے میں زیادہ اثر ہے فرانسیسی زبان عام طور پر بولی جاتی ہے اخبار بھی اسی زبان میں چھپتے ہیں ریڈیو کا پروگرام بھی فرانسیسی میں ہوتا ہے البتہ تعلیم انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں دی جاتی ہے فرانسیسی کے ساتھ ایک علاقائی زبان بھی وجود میں آگئی ہے جسے کریول (CREOLE) کہتے ہیں یہ زبان فرانسیسی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کو عام لوگ بولتے ہیں دیہات میں بسنے والے ہندوستانی نسل کے باشندے ایک ہندوستانی بولی بولتے ہیں جو پوربی بولی سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے گو کہ اس میں فرانسیسی زبان کے بہت سے الفاظ آگئے ہیں ان لوگوں میں کم لوگ ایسے ہیں جو اردو یا ہندی پڑھ یا لکھ سکتے ہیں عام طور پر اردو یا ہندی پڑھنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو تبلیغی کام کرتے ہیں ہندوؤں کے مذہبی رہنما سنسکرت کے ساتھ کچھ کچھ ہندی کی بھی واقفیت رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے مولوی ہوتے ہیں جو عربی پڑھ تو لیتے ہیں لیکن اسے سمجھ نہیں سکتے یہ لوگ عربی کے ساتھ اردو بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ماریشس میں اردو کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو کی ترقی شروع ہوئی ہے وہاں کی مسجدوں میں امامت کے لیے ہندوستان سے مولوی لوگ بلائے جاتے تھے اور یہاں اردو کا رواج انہی کا مرہون منت ہے ان کی صحبت میں بیٹھ کر چند مقامی لوگ بھی اردو سیکھ لیتے تھے اور وہ کہیں دوسری جگہ جا کر امامت کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بچوں کو اردو بھی سکھاتے تھے آج بھی مسجدوں میں بعض اوقات اردو پڑھائی جاتی ہے حالانکہ یہ لوگ زیادہ تر عربی پڑھتے رہتے ہیں ماریشس میں بھی پہلے پہل داستان گوئی ایک بڑا دلچسپ مشغلہ تھا لیلیٰ مجنوں، داستان امیر حمزہ، قصہ حاتم طائی اور باغ و بہار یہاں اکثر گھروں میں پائی جاتی ہیں رفتہ رفتہ اردو سیکھنا اور پڑھنا مقدس کام بن گیا اور دھیرے دھیرے اردو نے ایک اچھی پوزیشن حاصل کر لی یہاں حقیقت یہ بھی کہ صحیح اردو پڑھانے والا کوئی نہ تھا [illegible] صرف اردو پڑھائی جاتی تھی لیکن وہ ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اردو صرف دیکھ سے ہی واقف نہیں ہوتے تھے بس کسی طرح اردو پڑھ لیتے تھے۔ اردو کو اس حد تک مقدس مانا جاتا تھا کہ جب کسی مسلمان کو کاغذ مل جاتا جس میں اردو لکھی ہوتی تو وہ اسے جلا دیا کرتا تھا یا اسے کسی کونے میں محفوظ کر دیتا تھا تاکہ یہ کاغذ کسی کے پیروں کے نیچے نہ آئے۔ اردو سیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ "مجلس"[1] اور "مولود"[2] پڑھی جا سکیں۔ اردو کتابیں مشکل سے ملتی تھیں اور جو کتابیں بھی تھیں وہ صرف مذہبی نوعیت کی تھیں

ماریشس میں مولانا حکیم عبداللہ رشید نواب رشدی کی آمد اردو کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ماریشس کے لوگ اردو سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں تو انھوں نے اردو پڑھانے کا بہتر طریقہ اختیار کیا مولانا رشید ماریشس کی جامع مسجد کے امام تھے بعد امامت چھوڑ کر انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف اپنی بقیہ زندگی گزاری وہ عالم تھے اور شاعر بھی۔ رشد تخلص فرماتے تھے۔ سیماب اکبرآبادی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ سیماب کے "موجد" نظم کے جواب میں مولانا رشید نے ایک نظم "شہاب ثاقب" لکھی جو اسلامی پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے اس نظم میں آدم کی تخلیق کے راز اور ابلیس کی حرکات کی حقیقت پر بہت واضح روشنی ڈالی گئی ہے ان کی دوسری نظم "فلسفۂ زندگی" بھی شائع ہوئی۔ مولانا رشید چاہتے تھے کہ اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہو۔ پہلے انھوں نے خود اردو پڑھانا شروع کیا ان کی مدد سے چند نوجوانوں نے اردو اور عربی میں کافی مہارت حاصل کر لی جن میں جناب شوکت علی امام دین بھی ہیں جو اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں آج بھی وہ مسلم ہائی اسکول میں پڑھاتے ہیں یہ وہی اسکول ہے جسے عبداللہ رشید نے قائم کیا تھا جو [illegible] مسلم ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے مولانا نے خود عربی کے لیے چند کتابیں لکھیں اور اردو کے لیے ان کتابوں کو استعمال کرنے لگے جو ان دنوں ہندوستان کے اسکولوں میں رائج تھیں اردو شاعری پر بھی انھوں نے زور دیا۔ ان کے ذریعہ ماریشس میں اقبال کی مقبولیت بڑھی۔ ان کی حسرت باقی رہ گئی کہ ماریشس میں ایک پریس قائم ہو جائے ادھر مسلم ہائی اسکول روز بروز ترقی کرتا گیا اور ادھر مولانا کی بدولت ماریشس میں جگہ جگہ مکتب کھولے جانے لگے جہاں پر عربی اردو یکساں طور پر پڑھائی جانے لگی ہندوستان اور پاکستان کے رسالے اور کتابیں آنے لگیں عوام میں اردو سیکھنے کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا جو روز بروز بڑھتا گیا مولانا صاحب کی کوششوں اور محنت کا پھل تو صحیح معنوں میں اس وقت ملا جب حکومت نے پرائمری اسکولوں میں اردو کی پڑھائی شروع کی ۱۹۵۲ء سے اردو اور ہندی کی تعلیم پرائمری اسکولوں میں شروع ہوئی۔ ہندوستان کے جناب رام پرکاش نے اردو اور ہندی دونوں کی ترقی کے لیے بہت محنت کی۔ ابتدائی دور میں انھوں نے ایسی درسی کتابیں نصاب میں شامل کیں جو ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ہندی میں خود کتابیں تیار کیں لیکن اردو کے لیے پاکستانی کتابوں کو نصاب میں شامل کر دیا۔ اردو کی پڑھائی میں ترقی ہوتی گئی اور آج ماریشس کے ہر اسکول میں اردو پڑھانے کے لیے ایک مدرس ہے۔

ریڈیو ٹیلیویژن نے بھی اردو سیکھنے کی طرف رجحان پیدا کر دیا۔ ریڈیو میں ڈیڑھ گھنٹے کا ہندوستانی پروگرام ہوتا تھا جس میں مختلف چیزیں نشر کی جاتی تھیں۔ یہ پروگرام "ہندوستانی" زبان میں ہوتا تھا یعنی بعض وقت اردو اور بعض وقت ہندی میں ہندوستانی فلمی گانے اور ہندوستانی فلموں کے ذریعہ لوگ اردو زیادہ سمجھنے لگے اور اب ریڈیو کا پروگرام چار گھنٹے کا ہو گیا ہے اور ٹیلی ویژن (TELEVISION) میں ہفتے میں دو مرتبہ ہندوستانی پروگرام ہوتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں جناب [illegible] بی اے کی مدد سے جامعہ اردو علی گڑھ کا ایک مرکز ماریشس میں قائم کیا گیا [illegible] صاحب جامعہ اردو کے سپرنٹنڈنٹ ہیں انھوں نے برنارڈین دے سیں پیئر (BERNARDIN DE ST PIERRE) کے ناول پال اے ورجینی (PAUL ET VIRGINIE) کا اردو میں ترجمہ کیا

۱؎ مجلس مختلف موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں یعنی محرم کے مہینے میں ربیع الاول اور ربیع الآخر کے مہینے میں ان مجلسوں میں شہدائے کربلا، پیغمبر اسلام اور عبدالقادر جیلانی کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں

۲؎ مولود میں حضرت محمدؐ کی شان میں نعت پڑھی جاتی ہیں۔

سیماب اکبرآبادی اور مرزا داغ دہلوی

میں مولانا سیماب مرحوم کا ہمیشہ سے احترام بہت کرتا ہوں اور ان کو اردو کے قابل ذکر اساتذۂ سخن میں شمار کرتا ہوں۔ میرا ایک مضمون پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی ۸ نومبر ۱۹۶۷ء کے ہماری زبان میں شائع ہوا ہے اس میں میں نے یہ لکھ دیا تھا کہ سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی داغ کے شاگرد نہیں تھے اس ایک معمولی فقرہ نے ملک کے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی جگر مرادآبادی کے کسی عقیدت مند نے تو کچھ نہیں کہا البتہ مولانا سیماب کے شاگردوں نے ہماری زبان میں مضامین کا ایک تانتا باندھ دیا اور یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولانا سیماب داغ ہی کے شاگرد تھے اس سلسلے میں مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر الاسلام ظفر اور شفا گوالیاری کے مضامین "ہماری زبان" میں شائع ہو چکے ہیں ممکن ہے کہ دیگر جریدوں میں بھی کچھ حضرات نے اس سلسلے میں لکھا ہو۔ کئی حضرات کے خطوط بھی میرے پاس آئے ہیں جن میں لکھا ہے کہ میں ثابت کردوں کہ سیماب داغ کے شاگرد نہیں تھے سب سے پہلے وہ حالات زیادہ کارآمد ہوتے ہیں جو کسی شاعر نے خود اپنے متعلق لکھے ہوں۔ "نگار" لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۴۱ء میں سیماب صاحب کے خود نوشت حالات شائع ہوئے ہیں اس میں ذیل کے فقرے ذہن میں رکھئے

(۱) میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نامی منڈی، ککو گلی املی والے مکان میں پیدا ہوا۔

(۲) والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نوراللہ مرقدہ) فاضل عصر اور عالم متبحر تھے اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے اپریل ۱۸۹۷ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

(۳) حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کردیا جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق والحاق کی وجہ سے برانچ اسکول کہلاتا تھا

(۴) جب میں اجمیر کالج میں پہنچا تو وہاں مولوی سعید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسن کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اس ذوق شاعری کو بے حجاب کردیا جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا

(۵) میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریک درس ہوتے ان کا ترجمہ اردو نظم میں کرکے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا اور یہ مقدس حضرات میری ان جسارات کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

(۶) ... سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا اور مجھے بہ سلسلۂ معاش کانپور جانا پڑا حکیم ازل لکھنوی احباب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعراء سے مجالست رہی

(۷) میری طبیعت فطرتاً دبستان دہلی کی طرف مائل تھی اس لیے میں ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔

(۸) ... تیسری غزل پر فصیح الملک نے لکھ دیا کہ ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصے کے لیے بند کردی ... کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا اس کے بعد مول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا "دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے" میں نے غزل کہی اور استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا آفرین ہے کیا خوب غزل کہی ہے۔

(۹) اصلاح کا یہ سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا ان کی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی

اب میں اس خاص کتاب کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس کے مصنف حضرت ابر احسنی گنوری ہیں اس کتاب کا نام "اصلاح الاصلاح" ہے جو مولانا سیماب کی کتاب "دستور الاصلاح" کے اس حصہ کی تردید میں ہے جس میں سیماب صاحب نے امیر سے لے کر داغ اور ذوق کو چھوڑ کر اردو کے قابل ذکر اساتذہ کی اصلاحوں پر اعتراضات کئے تھے اور پھر اپنی بہت سی اصلاحیں پیش کی تھیں یعنی اساتذہ کی اصلاحوں پر بھی اصلاح دی تھی اس کتاب نے ملک میں ایک ادبی ہنگامہ برپا کردیا تھا "اصلاح الاصلاح" غالباً ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک لگاتار رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور میں شائع ہوتی رہی بعد کو ۱۹۴۹ء میں اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا پہلا اڈیشن ۱۹۴۷ء دہلی میں نذر آتش ہو گیا۔ اور اشاعت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ دوسرے اڈیشن کے صفحہ ۱۶ اور ۱۷ پر حضرت ابر گنوری رقمطراز ہیں۔

"سیماب صاحب کی شاعرانہ شخصیت اور نفسیات کا تجزیہ کرنے میں جانشینیٔ داغ کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے انھوں نے مشہور کیا ہے کہ وہ داغ کے شاگرد ہیں لیکن تحقیقات سے یہ چیز غلط ثابت ہوتی ہے۔ ابھی سیماب صاحب کو عالم طفلی میں دیکھنے والے بزرگ بحمد اللہ بقید حیات ہیں خصوصاً ان کے ہم سبق تو متعدد موجود ہیں جب ان سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ حضرت حالی اکبرآبادی کے شاگرد ہیں اور حضرت حالی کی زندگی تک ان سے اصلاح لیتے رہے"

سیماب صاحب کے والد ماجد اجمیر میں وعظ وغیرہ کہا کرتے تھے سیماب صاحب بھی اس سلسلہ میں اجمیر رہتے تھے اور حضرت خاک اجمیری (جو بقید حیات ہیں اور وہاں کے مستند استاد ہیں) اصلاح لیتے تھے۔

جب سیماب صاحب ریلوے میں ملازم ہو گئے اور ان کا تبادلہ کانپور ہو گیا تو انھوں نے بہ تقاضائے وقت حضرت ازل عظیم آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نہایت وفادار شاگرد کی طرح ان کی شاگردی پر فخر کرتے رہے چنانچہ "مرقع قیصری" نام کا گلدستہ جس میں ایک مشاعرہ غالب کے اس مصرع پر چھپا ہے۔

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"

۱۹۰۴ء میں شائع ہوا اس میں سیماب صاحب کا ایک قطعۂ تاریخ بھی ہے جس کی سرخی ہے "قطعہ تاریخ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی تلمیذ حضرت ازل عظیم آبادی" بایں ہمہ سیماب صاحب خود کو داغ کا شاگرد لکھتے ہیں اور سنہ شاگردی ۱۸۹۰ء بتاتے ہیں (غالباً ابر احسنی گنوری صاحب نے سنہ شاگردی میں ۱۸۹۰ء دیکھا ہوگا ورنہ وہ ایسا نہ لکھتے کیونکہ یہ کتاب انھوں نے بڑی تحقیق سے لکھی ہے) داغ کے محبوب اور ہمراز شاگردوں میں کوئی اس بات کا پتہ نہیں دیتا کہ انھوں نے سیماب صاحب کو خود داغ کا شاگرد دیکھا یا سفر و حضر میں دونوں ساتھ رہنے والے شاگرد حضرت احسن مرحوم اور حضرت نوح مدظلہ ہیں ان حضرات سے جب سیماب صاحب کے متعلق

استفسار کیا تو انھوں نے انکار بھی کیا اور مصلحت آمیز خاموشی سے کام لیا۔

اگرچہ یہ دونوں حضرات اپنی تحریروں میں مسلسل اس امر کی تصدیق کرتے رہے کہ علامہ سیماب داغ کے شاگرد ہیں مگر غالباً یہ کام مروت کے تحت تھا۔

حضرت بیخود دہلوی اور حضرت سائل کو حقیقی قربت داغ سے حاصل ہے وہ محتاج اظہار نہیں میں نے حضرت بیخود سے سوال کیا کہ کیا سیماب مرحوم داغ کے شاگرد ہیں؟ انھوں نے صاف کہا کہ نہیں ہم نے نہ کبھی استاد کے پاس دیکھا نہ کبھی استاد سے ان کا نام سنا میں نے کہا کہ پھر آپ حضرات نے اس بات کا اعلان کیوں نہیں کیا فرمانا نہیں کیا ضرورت ہے ایک شخص ہم سے رشتہ ملاتا ہے ہمیں اس کی تالیف قلب کے لیے ہاں میں ہاں ملا دینی چاہئے ایک مرتبہ میں نے حضرت سائل مرحوم سے بھی سوال کیا فرمانے لگے میاں شاگرد ہوں نہیں اور اگر ہوں تو ایسے خطی (خط کے ذریعہ بہت لوگ شاگرد ہوتے ہیں) شاگردوں میں ہوں گے جیسے داغ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ احسن کی غزل ہو یا تمہارے استاد احسن اور نوح وغیرہ بھکم داغ اصلاح کر کے بھیج دیا کرتے تھے میں نے کہا حضرت آپ نے تو بڑے زوروں کے ساتھ اپنی تحریروں میں انھیں شاگرد داغ تسلیم کیا ہے بلکہ ان کو داغ کے بعد جانشینی کی سند بھی عطا فرمائی ہے آخر یہ کیا؟ ہنسے اور کہنے لگے ارے بھائی جب انھوں نے نام پیدا کر لیا ہے اور ہماری برادری میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمارا حرج بھی کیا ہے کہ ان کو اپنا بھائی بنا دیں اور بالیں اس طرح حضرت جوش ملسیانی اور حضرت ناطق گلاؤٹھی سے جو مرزا داغ کے مخصوص تلامذہ میں ہیں میں نے استفسار کیا تو ان حضرات نے بانگ دہل انکار قطعی کیا بہرحال کچھ بھی میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ سیماب صاحب داغ کے بھی شاگرد ہیں:

مولانا ابراحسنی گنوری کی یہ تحریر بہت سے راز کھول رہی ہے اہل دانش و ادب اس کو ملاحظہ فرمالیں اب میں وہ قطعہ تاریخ بھی دئے دیتا ہوں جو مرقع قیصری جون ۱۹۰۴ء میں مولانا سیماب کا شایع ہوا ہے اور اس میں ان کو ازل عظیم آبادی کا شاگرد لکھا ہے۔ جو حضرات اس گلدستہ کو دیکھنا چاہیں تو میری لائبریری میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ گلدستہ کانپور سے شایع ہوتا تھا۔

قطعہ تاریخ از نتیجہ فکر جناب عاشق حسین صاحب سیماب اکبرآبادی شاگرد جناب ازل عظیم آبادی

شایع شد آں مرقع تخیل شاعراں
ہر کس شدہ ز لعتِ دل خویش مشتری
افسانہ ہائے عشق و بیاں ہائے دلبری
گلہائے تازہ اش چو بہ بینیدہ یک نگاہ
ہرگز کسے بہار نہ دیدہ بہ گلستری
عز و کمال چوں نہ بود در جہاں فزوں
سایہ فگن بریں ہمہ اقبال قیصری
پیداست در مرقع عالم مثال تو
از صورتِ خیال نہ چرخ چنبری
شاداں بہ فکر مصرعہ سال اتماعش
یک بار کرد بلبل طبعم نواگری
سیماب حیرت نامہ بیار ز ہمی نویست
یہ مرقع ہست دکان سخنوری (۱۹۰۴ء)

ازل عظیم آبادی کا نام حسن فہمی تھا اور ان کی غزل بھی گلدستہ مرقع قیصری، جون ۱۹۰۴ء میں شایع ہوئی ہے لیکن سیماب صاحب اپنے خود نوشت حالات میں ان کو ازل عظیم آبادی نہیں لکھتے بلکہ ازل لکھنوی لکھتے ہیں سوال یہ ہے کہ جب بقول خود مولانا سیماب کہ ۱۸۹۸ء میں داغ کے شاگرد ہو چکے تھے تو یہ ۱۹۰۴ء میں ازل عظیم آبادی کے شاگرد کیوں بن رہے ہیں جب کہ انھوں نے بقول خود داغ کے علاوہ کسی سے بھی اصلاح نہیں لی۔ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء کو داغ کا انتقال ہو گیا۔ مولانا احسن مارہروی نے داغ کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں اپنے قابل ذکر استاد بھائیوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں کہیں سیماب صاحب کا ذکر نہیں ہے مولانا سیماب نے کانپور والی غزل کے سلسلہ میں داغ کا یہ فقرہ "آفریں ہے کیا خوب غزل کہی ہے۔ داغ کی ایسی زبان ہی نہیں تھی۔

عبدالمتین نیاز

غزل

اس ندر قریب سے ہو کے وہ گذر گیا
اک پل یوں لگا جیسے دل ٹھہر گیا

ترک جوش آرزو تو تھی بس اس خیال سے
کچھ نگار صبح کا روپ تو سنور گیا

آگہی کے ساز پر نغمہ شعور چھیڑ
مطرب جہان نو، تو بھی غم سے ڈر گیا

سرگراں ہے زندگی امن کی تلاش میں
ایٹموں کی چھاؤں میں آدمی ٹھہر گیا

ہم زمانہ گرد ہیں یار پوچھئے ہو کیا
تب کہیں سر ہوئی دل کہیں گذر گیا

اے نیاز آج بھی زندگی صلیب ہے
مجھ کو یہ خیال تھا دور وہ گذر گیا

مکتوب لندن

ریڈیو شیفیلڈ سے اردو پروگرام

ریڈیو شیفیلڈ نے اپنی ہوم سروس میں ۱۵ منٹ کا اردو پروگرام شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو برطانیہ میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہوگا۔ یہ ہر ہفتہ کی شام پابندی سے نشر ہوا کرے گا۔ اس پروگرام میں موسیقی، خبریں اور دیگر معلوماتی فیچر شامل ہوا کریں گے اگر اس میں اردو جاننے والے سامعین نے دلچسپی کا اظہار کیا تو اس کا وقت ۱۵ منٹ کے بجائے آدھ گھنٹہ کر دیا جائے گا۔ یہ پروگرام شیفیلڈ سے تقریباً ۲۰ میل اطراف کے علاوہ سنا جا سکے گا ریڈیو شیفیلڈ نے مقامی کمیونٹی ریلیشنز افسر جناب آل رسول سے کہا ہے کہ وہ پہلے پروگرام کو ترتیب دیں۔ اس پروگرام میں اسسٹنٹ کمیونٹی ریلیشنز افسر مسز ٹی ان کی شریک کار ہوں گی۔ خیال ہے کہ اردو میں نشر ہونے والا یہ پروگرام بی بی سی کے ایک اور پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھئے" کے لیے ایک صحت مندانہ مقابلہ ثابت کرے گا

انھیں صحیح تلفظ بتایئے صاحب!

مشرق کے ناظر منتظر ہیں کہ جب بھی وہ بی بی سی ٹیلیویژن پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھئے" میں انگریزی سبق کا پروگرام دیکھتے ہیں ان کی زبان پر فارسی کا یہ شعر بار بار آتا ہے

گرہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

انھیں شکایت ہے کہ اس سبق کے استاد مسٹر رابرٹ جیب میں جو انگریزی کا درس اپنی معاون مس شیلا ڈلنگا کی مدد سے دیتے ہیں "خود احمد" کا تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتے۔ مسٹر جیب مِنْ "احمد" کو جو ان کے اسباق میں ایک اہم کردار ہوتا ہے ہمیشہ "آمیڈ" کہتے ہیں۔ اب بھلا کوئی جیب مِن صاحب سے پوچھے کہ "احمد" اچھا خاصا معقول سا نام کس طرح "آمیڈ" بن گیا؟ جب کہ وہ اپنے اسباق میں انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرانے کے لیے جی جان سے کوشش کرتے ہیں۔ اردو دانوں کو صحیح انگریزی تلفظ یاد کراتے ہوئے کیا ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ خود بھی اردو الفاظ صحیح تلفظ سے ادا کریں؟ کیا بی بی سی کے سلیم شاہد اور مہندر کول مسٹر جیب مِن کی "صاحبیت" دور کرنے کے لیے انہیں لفظ "احمد" کا صحیح تلفظ نہیں بتا سکتے؟

انتخاب مشرق۔

غزل۔ میر بشیر لندن

ہجوش روشِ پیرہن کے تاجدار آئے	جنوں کے قافلے وابستۂ بہار آئے
وہ رات جس میں بڑا انتشار تھا دل کو	وہ رات درد کے پہلو میں ہم گزار آئے
واجب حرم سے نہ بتکدے سے کہیں	گلی گلی میں تیرے نام کو پکار آئے
نہ کے خونِ شفق میں ڈھلا بہاری شام	شبِ فراق بھی گئے تو زر نگار آئے
کھنک یاد کے جھونکوں کے بیکراں ہجوم	الٹ کے چاند جو ابھرا تو اشکبار آئے
خدا کرے مری راتوں میں کائنات جمال	گئی بہار کو لے کر ہزار بار آئے
ہم تیرا لطف سے ملاقات ہو تو سکتی ہے	مگر محال ہے دل کو کہیں قرار آئے

باقی صفحہ ۴ سے آگے

جامعہ اردو کے امتحانات کو حکومت ماریشس نے تسلیم کیا۔ پر جامعہ اردو کے ابتدائی پاس کرنے والوں کو سرکاری اسکولوں میں جگہ ملنے لگی۔ اسکول میں معلمی کے فرائض انجام دینے کی خواہش کے سبب لوگ جامعہ اردو کے امتحانات کی طرف متوجہ ہوئے ۱۹۵۶ء میں جامعہ اردو کے امتحان کے لیے تقریباً تیس امیدوار بیٹھے پھر ہر سال امیدواروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ابتدائی اور ادیب کے لیے کافی امیدوار ہو گئے ادھر چند برسوں سے ادیب ماہر کے لیے بھی کچھ امیدوار امتحان دے رہے ہیں ۱۹۶۷ء میں ابتدائی کے لیے ۱۶۷، ادیب کے لیے ۱۰۸، ادیب ماہر کے لیے ۲۳ اور ادیب کامل کے لیے ۳ امیدوار تھے۔

کچھ طالب علم سینئر کیمبرج SENIOR CAMBIRDGE اور GENERAL CERTIFICATE OF EDUCATION 'LONDON' کے امتحانات میں بھی اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لے رہے ہیں اور پچھلے آٹھ سال سے ان طلبہ کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ سینئر کیمبرج کے پرچوں میں تین اردو عبارتیں دی جاتی ہیں جن کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کرنا ہوتا ہے ایک چھوٹا ترجمہ انگریزی سے اردو میں بھی ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھنا پڑتا GENERAL CERTIFICAT OF EDUCATIAN LONDON ہے AT ADVANCED LEVEL میں بھی اس سال سے اردو داخل کی گئی ہے اس امتحان میں اردو سے انگریزی میں ترجمے کرنے ہوں گے اور مضمون بھی لکھنا ہوگا اس کے علاوہ نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور غالب کے خطوط بھی کورس میں ہیں ان پر جو سوال ہوں گے اسے انگریزی میں بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند کی طرف سے جناب عظیم الحق جنیدی ماریشس تشریف لے گئے جہاں پر ان کو اردو سیکشن کا نگراں بنایا گیا ماریشس کے باشندے ان کی خدمات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے جگہ جگہ اردو کی انجمنیں قائم کیں اور خود بھی اردو کے طلبہ کی مدد کرتے رہے۔ اردو سے لگاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ وہاں پر ہر مسلمان اردو سیکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اردو کو اب زیادہ تر مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اردو ادب کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے چند رسالے جاتے رہتے ہیں حالانکہ ان رسالوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور بعض اوقات پابندی سے بھی نہیں جاتے شمع، بیسویں صدی، بانو، بیل، دہار، ماہ نو کی چند کاپیاں جاتی ہیں۔ وہاں پر ایک اردو لائبریری کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انڈین ہائی کمشن کی لائبریری میں چند اردو کتابیں ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ عوامی مانگ کو پورے طور پر پورا نہیں کر سکتیں اس کے علاوہ سائنٹفک طریقہ سے اردو پڑھانے والے بھی کم ہیں اور پڑھانے والوں کی معلومات بھی معیاری نہیں ہے۔ ماریشس میں پرائمری اسکول کے لیے ایک نصاب تیار کرنا ضروری ہے جس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ان بچوں کا ماحول کیا ہے ان کی مادری زبان اور ان کی تہذیب کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعہ اردو کا فروغ ہو سکتا ہے لیکن اردو دانوں کی اب بھی کمی ہے اردو درس کی ضرورت بڑھ رہی ہے یہ چیزیں ماریشس میں اردو کے ایک خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

-----×-----

مراسلات

میر کے بہتر نشتر

میر تقی میر کے ۷۲ نشتروں کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ بعض حضرات ان نشتروں (اشعار) کو میر کے کلام کا نچوڑ کہتے ہیں ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ میر کے تمام کلام کو تلف کر دیا جائے (ماسوا نشتروں کے) پھر بھی میر کی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے گا اور وہ اپنی شہرت کو اسی طرح برقرار رکھیں گے جیسے "غالب" اپنے "خطوط" کی وجہ سے۔

کیا میر کی عظمت صرف بہتر نشتروں میں پوشیدہ ہے؟ کہیں یہ رائے اردو کے پیش نقاد [illegible] قائم کی گئی ہے؟ کیا بہتر نشتر کا وجود ہے [illegible] فرضی [illegible] گھڑت ہے؟ اگر ہے تو وہ کون سے بہتر اشعار ہیں جو نشتروں کے نام سے مشہور ہیں؟

قارئین "ہماری زبان"، میرا و باب نظر سے گزارش ہے کہ مفصل طور پر تفصیل سے بذریعہ "ہماری زبان" آگاہ فرما کر ممنون احسان کریں (ایم۔ اے نصر)

انگریزی کی ایک کتاب کے بارے میں

انگریزی کی کتاب ALICE IN WONDERLAND دنیا کی مشہور کتابوں میں شمار ہوتی ہے شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو ایک امریکی دوست اس کے تمام تراجم جمع کر رہے ہیں کیا کوئی صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس کا اردو ترجمہ ہوا ہے یا نہیں، اور بشرط اثبات یہ کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ (مالک رام)

نثار احمد صدیقی کے مراسلہ کے بارے میں

ہفتہ وار "ہماری زبان" کے ۸ر فروری ۶۸ء کے شمارہ میں حیرت کی غزل اور جناب نثار احمد صدیقی کا مراسلہ بعنوان "ایک دعوت فکر" نظر نواز ہوا۔

مذکورہ غزل کا مقطع اور غزل کے تیور دیکھ کر بلا ہچکچاہٹ یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ غزل غالب کی ہے کیونکہ دیوان غالب میں اسی قبیل کے کافی شعر مل جاتے ہیں مثلاً

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

اس کے علاوہ دل کو سنگ و خشت اور کیفیِ بادہ کو ہیچ وغیرہ کہنا بھی معمولاتِ غالب میں شامل ہے۔

مگر مقطع میں "نماز عشق" کی ترکیب غالب کا تخلص ہونے کے باوجود اس بات کی غماز ہے کہ یہ غزل غالب کی نہیں ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ دیوان غالب میں لفظ نماز کا کہیں مذکور نہیں ہے اور غالب وہ شاعر ہے جو اپنی پسندیدہ تراکیب و الفاظ کو بار بار استعمال کرتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ غزل غالب کی نہیں ہے تو پھر کس کی ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایسا شاعر ڈھونڈھنا ہوگا جس کے کلام میں ترکیب و مضامینِ غالب کو بکثرت استعمال کرنے کی سعی پائی جاتی ہو۔ ایسے شاعر اردو میں دو ہیں۔ ایک فانی اور دوسرے یوسف حسن علی خاں ناظم مگر ان دونوں کے مطبوعہ دواوین میں یہ غزل نہیں ملتی فانی کا تو خیر اسلوب و بیان ہی غالب سے مختلف ہے ہاں! ناظم کا اسلوب بیان و مضامین اکثر غالب والے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناظم کا کلام کلی غالب کی کاوش و حک و اصلاح کا مرہونِ منت ہے۔ گو ناظم کے مطبوعہ کلام میں یہ غزل شامل نہیں ہے تاہم اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ یہ غزل ناظم کی ہے۔

۱۹۶۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخوں میں ایک نسخہ بعنوان "صدر مجلی" موجود تھا اس میں "ہو نہ ہو" اور "رہ ہو" کی ردیف و قافیہ میں ایک سو غزلیں نقل ہیں غالباً یہ کسی مشاعرہ کی روداد ہے اس نسخہ میں یہی غزل ناظم کے تخلص سے موجود ہے مگر مطلع میں تھوڑا سا تفاوت ہے "ہر جستجو عبث جو نہ ہی جستجو نہ ہو" کی جگہ "وہ جستجو نہیں جو نہی جستجو نہ ہو" لکھا ہوا ہے۔ نسخہ کے آخر میں کسی غیاث الدین رامپوری کی مہر ثبت ہے اور اس کے نیچے "دوشنبہ ۱۸ رجادی الثانی ۱۲۸۰ھ بہ مطابق سی ام نومبر ۱۸۶۳ء" درج ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رام پور کے کسی طرحی مشاعرہ کے لیے یہ غزل غالب نے یوسف حسین خاں ناظم والیٔ رام پور کے لیے کہی ہوگی اور کسی طے شدہ معاملہ یا کسی مصلحت کی بنا پر مقطع میں اپنا تخلص لکھ دیا ہوگا جس کو نواب نے خود ناظم میں بدل دیا ہوگا۔ اب وہی کاغذ یا اس اصل کاغذ کی نقل جناب شوکت عظیم کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔ ([illegible])

بشیر انور کی ایک نظم کے سلسلہ میں

"ہماری زبان" (۸ر فروری ۱۹۶۸ء) کی اشاعت میں شیب علی حسین صاحب کا خط "ایک نگاہ" کے عنوان کے تحت نظر سے گزرا جس میں موصوف نے بشیر انور کی نظم "پیمانہ" کے ایک لفظ "قحط" کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مجھے یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ شاعر نے "قحط" کا بحرکت حاے حطی استعمال نہیں کیا ہے۔

شیب صاحب کا یہ کہنا کہ "یہ نظم ہیئتی اعتبار سے آزاد ہے۔ اس میں کسی بحر کی پابندی نہیں کی گئی ہے" یہ اعتراض بھی غلط ہے نظم بحر میں ہے اور آزاد نظم کو ایک مصرع سے نہیں پڑھا جاتا یہ ایک زنجیر ہوتی ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ بعض اوقات وزن کے باب میں دھوکہ ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ شیب صاحب میری اس تحریر پر غور فرمائیں گے۔

بشیر انور حیدر آباد کے ایک ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان سے یہ نظم ایک مشاعرہ میں سنی تھی یہ نئے لکھنے والے ہیں ابھی ان کا فن ارتقا اور تخلیق کی منزل میں ہے۔ شیب صاحب کا لہجہ قدرے سخت اور گراں ہے۔ اچھا ہی کہہ میں سمجھتا ہوں کہ اعتراض کی نوعیت مخلصانہ اور دوستانہ بھی ہو سکتی تھی۔ (شاہ تمکنت)

کراچی یونی ورسٹی میں پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر

کراچی۔ اردو ادب کے مشہور و معروف نقاد اور صدر شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب ١٧ فروری ٦٨ء کو کراچی یونی ورسٹی تشریف لائے۔ اس موقع پر بزم ادب، کراچی کالج کی جانب سے سرور صاحب کے اعزاز میں ایک خصوصی جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس تاریخی جلسے کی صدارت اردو کے مشہور و معروف شاعر اور سابق استاد شعبۂ اردو ڈھاکہ یونی ورسٹی جناب علامہ جمیل مظہری صاحب نے فرمائی۔ ابتدا میں جناب اے ایف مارکھم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے معزز مہمانوں کا حاضرین سے تعارف کرایا، اس کے بعد جناب ابوذر عثمانی استاد شعبۂ اردو کراچی کالج، کراچی یونیورسٹی نے پروفیسر آل احمد سرور اور علامہ جمیل مظہری کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان بزرگوں کی ادبی خدمات اور کارگزاریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ موصوف نے خصوصیت کے ساتھ آل احمد سرور صاحب کے تنقیدی نظریات اور اردو کے تنقیدی ادب پر ان کے گہرے اثرات کا ذکر فرمایا اور کہا کہ سرور صاحب اردو کے ان برگزیدہ نقادوں میں ہیں جو صحیح معنوں میں اردو تنقید کی آبرو کہے جا سکتے ہیں۔ سرور صاحب کی مخصوص خصوصیت ان کا معتدل اور متوازن انداز نقد ہے جس کی مثال اردو کے نقادوں میں بہت کم ملتی ہے۔ سرور صاحب کسی طرح کی نظریاتی کٹر پن، غلو اور انتہا پسندی کا شکار نہیں جس کے لیے اردو کے بعض نامور نقاد بدنام ہیں۔ موصوف کا یہ بھی ایک امتیازی وصف ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایسی ادبی تحریک یا نظریہ سے وابستہ نہیں کیا جو ادب کی آفاقیت اور ہمہ گیری کو محدود کرنے کا سبب بنا ہو۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ سرور صاحب نے جس طرح ترقی پسند تحریک کے زمانے میں نظریاتی عصبیت اور گروہ بندی کو ختم کرنے میں مؤثر رول ادا کیا اسی طرح آج جدیدیت کے نام پر جو گروہ بندی پیدا ہو رہی ہے اسے بھی ختم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ جناب آل احمد سرور صاحب نے اس موقع پر ادب میں اظہار و ابلاغ کے مسئلے پر ایک نہایت عالمانہ اور بصیرت افروز تقریر فرمائی، آپ نے ادب میں اظہار و ابلاغ (EXPRESSION AND COMMUNICATION) کا عمل جس طرح بروئے کار آتا ہے، اس کی وضاحت کی اور فرمایا کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی اظہار ابلاغ نہ بن سکے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر اظہار اپنے اندر کم و بیش ابلاغ کی صلاحیت رکھتا ہے، ادب میں جو بعض اوقات ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ قاری کا ذہن فنکار کے ذہن کا ساتھ نہیں دے پاتا یا پھر ادب سے بالکل غلط مطالبے کیے جاتے ہیں، ایسے مطالبے جو ادب کی حقیقت، اس کے منصب و مقصد اور اس کی کارفرمائیوں سے بے خبری کا نتیجہ ہوتے ہیں، کچھ لوگ ادب کو محض نشہ، نجات یا چٹخارا سمجھتے ہیں، کچھ لوگ اس میں سیاسی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں اور کچھ اسے محض ایک فارمولا سمجھتے ہیں۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ ادب میں اخلاقی، سماجی، سیاسی کئی طرح کے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن اس کا جمالیاتی پہلو ان تمام پہلوؤں پر مقدم ہوتا ہے ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ادب انقلاب نہیں لاتا بلکہ انقلاب کے لیے ذہن کو صرف بیدار کرتا ہے، ادب تلوار، بندوق یا گولی نہیں ہاں وہ ان چیزوں کا [illegible] سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس کے مزاج اور منصب و مقصد کو بہ خوبی سمجھ لینا چاہیے اور اس سے اتنا ہی مطالبہ کرنا چاہیے جتنا یہ دے سکتا ہے، سرور صاحب نے تسلیم کیا کہ ابلاغ کی دشواری بعض اوقات اس سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ بعض ادیب اپنے فنکارانہ عمل میں ادب کے منصب و مقصد کا خیال نہیں رکھتے اور اظہار فن کے وسیلوں پر انھیں پوری دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی وجہ سے بہرحال سارا الزام فنکار پر عائد نہیں کیا جا سکتا، آپ نے اس کی مثال ریڈیو سے دی اور کہا کہ ریڈیو میں تین چیزیں ہوتی ہیں ٹرانسمیٹر، میڈیم اور ریسیور اور یہ تینوں چیزیں مل کر ہم تک آواز پہنچانے کا سبب بنتی ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ناقص ہو اور اپنا فرض ادا کرنا چھوڑ دے تو آواز کا کامیابی سے منتقل ہونا محال ہے۔ یہی حال ادب کا ہے یہاں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ دوسرا یعنی فنکار اور قاری دونوں کا مسئلہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جہاں فنکار کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے اور پڑھنے والوں کے درمیان پردے حائل نہ کرے وہاں پڑھنے والے کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو برضا و رغبت ادب کے حوالے کر دینے کے لیے تیار رہے، آپ نے فرمایا کہ کسی فن سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے آداب جاننا ضروری ہیں، اس لیے اگر شاعر قاری سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس سے شکایت کرنے یا اس پر تنقید کرنے سے قبل شاعری کے آداب سے بھی واقف ہو اور اس کا [illegible] رکھتا ہو تو اس کا مطالبہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ ابلاغ کی دشواریاں موضوع اور انداز بیان دونوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں فنکار نہ صرف یہ کہ نئے موضوع کو جانے پہچانے استعاروں کا روپ دیتا ہے اور نئی شراب کو پرانی بوتلوں میں رکھتا ہے بلکہ وہ اپنے مفہوم کا علامتی اظہار بھی کرتا ہے اور علامتی اظہار بہرحال براہ راست اظہار سے بہتر ہوتا ہے اور دراصل یہی ادبی اظہار کی اعلیٰ ترین شکل بھی ہے۔

سرور صاحب نے آگے چل کر فرمایا کہ ہمیں اس موضوع کا مطالعہ ادب میں روایت و بغاوت کے ہمیشہ جاری رہنے والے سلسلے کے پس منظر میں کرنا چاہیے جس کی وجہ سے ادب میں نئے تجربے، نئے خیالات اور نئے اسالیب ہمیشہ سامنے آتے رہتے ہیں، ادب میں یہ مسئلہ کچھ نیا نہیں بلکہ ہمیشہ پیدا ہوتا رہتا ہے سرسید اور حالی کے ساتھ بھی یہ مسئلہ پیش آیا تھا، غالب اور اقبال کے ساتھ بھی عظمت اللہ خاں کے ساتھ بھی اور ترقی پسندوں کے ساتھ بھی اور آج نئی شاعری کے بھی ساتھ پیش آ رہا ہے، سرور صاحب نے فرمایا کہ آج جو یہ مسئلہ پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آ گیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں گذشتہ تیس برسوں میں بہت سے نئے تجربے ہوئے ابتدا میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو حسن کا مانوس تصور رکھتے ہیں یا لکیر کے فقیر ہیں اور متعین شاہراہوں پر چلنے کے عادی ہیں وہ نئے راستے پر چلنے والوں کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتے لیکن ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ادب میں ہمیشہ نئے تجربے ہوتے ہیں اور نئے راستے نکلتے ہیں اور یہ نئے تجربے خلا میں نہیں ہوتے بلکہ کسی نہ کسی روایت کی توسیع [illegible] اور باقاعدہ [illegible] ہوتے ہیں، ادیب جب کوئی نیا تجربہ کرتا ہے تو [illegible] [illegible]

کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے تجربے کو نیا حسن، نئی معنویت اور نئی توانائی عطا کرتا ہے۔ سرور صاحب نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ آج اردو ادب میں جو تجربے ہو رہے ہیں ان میں تعالی اور فیشن پرستی ہو سکتی ہے اور شاید اس کا حصہ غالب ایسا ہی ہو لیکن تعالی اور فیشن پرستی کس دور کے ادب میں نہیں ہے؟ انگلستان میں آج جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان میں نوے فیصدی ایسی ہیں جو ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے لائق ہیں لیکن جو دس فیصدی کتابیں ہیں وہ ایسی ہیں جن سے اس کی ذہنی زندگی کا بھرم بھی قائم ہے۔ اس لیے اگر جدید شاعری کا تھوڑا سا بھی حصہ ایسا ہے جس میں خلوص ہے، جس سے زندگی کا شعور اور بصیرت حاصل ہوتی ہے تو ہمیں اس کا خلوص اور ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، سرور صاحب نے مشورہ دیا کہ ہمیں شاعر کے کلام کا مطالعہ اس کی ذاتی نگاہ سے کرنا چاہیے جو اس کی سب سے بڑی متاع ہوتی ہے اور کہا کہ صرف اسی طریقہ سے اس کے تجربے کے وہ اسرار و رموز ہم پر منکشف ہو سکیں گے جو ہمارے لیے ایک نئے ایمان، نئی انجمن آرائی اور نئی آئینہ سامانی کا سبب بن سکتے ہیں

سرور صاحب نے ۴۵ منٹ کی تقریر میں اس موضوع کے اہم ترین پہلوؤں پر بڑی بھرپور روشنی ڈالی۔ جمیل مظہری صاحب نے سرور صاحب کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھیں سرور صاحب کے خیالات سے ۷۵ فیصدی اتفاق ہے اور ۲۵ فیصدی اختلاف لیکن انھیں سرور صاحب سے کن امور میں اختلاف ہے اس کی توضیح وہ وقت کی کمی کی وجہ سے نہ کر سکے تاہم انھوں نے فرمایا کہ ادب کے مطالعہ میں شخصی رجحان پر پابندی عاید کرنے کی بات کرنا ان کے خیال میں نہ تو درست ہے نہ ممکن، ادیب کا سب سے بڑا پارکھ خود زمانہ ہے اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا اس لیے ہم لوگ اس قضیہ میں نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ جمیل صاحب نے سامعین کے اصرار پر اپنی ایک تازہ غزل بھی سنائی جس میں انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کو سراہنے کی کوشش کی یعنی ترقی پسند شعرا کی انقلابیت کو بھی خوش آمدید کہا اور جدید شعرا کی ذاتی الجھنوں کے اظہار کا بھی معقول جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ملاحظہ ہوں موصوف کے دو شعر ؎

اس کو جو بہا آتا ہے تیری سے سوئے حال
ہم لوگ اسی عہد کے قدموں کی صدا ہیں
کیا آئے جو جمعیت احساس کی امید
یہ ہند کے فنکار ہیں آشفتہ نوا ہیں

علامہ جمیل مظہری کی فرمائش پر سرور صاحب نے بھی اس موقع پر اپنی ایک غزل سنائی جس میں انھوں نے کچھ اس انداز میں تازہ خیالوں اور نئی راہوں کی بات کہی جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ موصوف کا اشارہ کس طرف ہے ؎

تازہ کاری نے دیاں کر دئے عالم ایجاد
ہم ترستے ہی رہے تازہ خیالوں کے لیے
شاہراہوں سے گزرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط چند خیالوں کے لیے

سرور صاحب نے اپنی تقریر میں جدید شاعری کی جس مدلل انداز میں ترجمانی کی اس سے ان اشعار کا مفہوم چھپا نہیں رہتا اور یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جدید شاعری یا ادب ہی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ یادگار تاریخی نشست جناب احمد سجاد صاحب استاد شعبۂ اردو رانچی کالج رانچی یونی ورسٹی کے شکریہ پر ختم ہوئی۔

(عمران حسن، سکریٹری بزم ادب رانچی یونی ورسٹی)

انجمن ترقی اردو پٹیالہ کے زیر اہتمام ادبی تقریب

پٹیالہ:- انجمن ترقی اردو (ہند) ماڈل ٹاؤن پٹیالہ کے زیر اہتمام سنٹرل پبلک لائبریری ہال میں ایک ادبی تقریب کا انعقاد ہوا جس کی صدارت حکومت پنجاب کے وزیر لوکل سلف گورنمنٹ جناب نفیر چند گپتا نے فرمائی۔ یہ عظیم الشان تقریب انجمن ہذا کی جانب سے شایع کردہ رزمیہ نظموں کی کتاب "لہو ترنگ" کی پانچ سو جلدیں فوجی جوانوں کو نذر کرنے کے سلسلے میں کی گئی تھی بعد ازاں ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جناب نفیر چند گپتا وزیر لوکل سلف گورنمنٹ پنجاب نے کی اس محفل شعر و سخن کے سرپرست مشاعرہ کے فرائض پروفیسر بیدار نے انجام دئے۔ اس بزم سخن میں حصہ لینے والے شعرا کرام میں نشان الافکار سردار اودے سنگھ شائق، جناب پروفیسر کرپال سنگھ بیدار، جناب وبہار صابر، جناب آر ڈی سیال دعا، (پی۔ سی۔ ایس) جناب ہربنس سنگھ تیغ، جناب برق کاشمیری، جناب مہر چند کوثر، جناب نارائن سرحدی، جناب ساغر شغالی، جناب جگر جالندھری، جناب جسونت سنگھ ذکا، جناب ہمیش پٹیالوی، جناب سیوک تیر، جناب فیض سرحدی، جناب راج دیوانہ، جناب منیش راحت، جناب راز پٹیالوی، جناب واحد اور جناب جوہر صادق کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مشاعرہ کے اختتام پر جناب نفیر چند گپتا نے انجمن کی ادبی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے مبلغ پندرہ سو روپے کی گراں قدر رقم انجمن کو بطور امداد دینے کا اعلان فرمایا۔

(جوہر صادق۔ سکریٹری)

انجمن ترقی اردو ہیرن پور کے زیر اہتمام بزم جمال کا قیام

سنتھال پرگنہ ضلع انجمن ترقی اردو کے سابق جنرل سکریٹری بہار اردو کے مشہور شاعر و ادیب جناب جمال الدین صدیقی جمال مرحوم کی یاد میں ایک ادبی ادارہ بزم جمال کا قیام انجمن ترقی اردو ہیرن پور کے زیر اہتمام عمل میں آیا اور اتفاق رائے سے درج ذیل حضرات سال رواں کے لیے عہدہ دار منتخب ہوئے۔

صدر:- جناب ابو الخیر صاحب۔
نائب صدر:- جناب کبیر احمد و الحاج امام الدین صاحبان۔
جنرل سکریٹری:- جناب کمال الدین صدیقی۔ بی اے (آنرز)
نائب سکریٹری:- جناب ابو القیس صاحب۔
خازن:- جناب عبد الودود انصاری صاحب۔

(کمال الدین صدیقی۔ جنرل سکریٹری
انجمن ترقی اردو ہیرن پور۔ بہار)

جموں و کشمیر میں جشن غالب کمیٹی کا قیام

جموں ، جموں و کشمیر کے گورنر جناب بھگوان سہائے نے یہاں غالب صد سالہ کمیٹی کا افتتاح کیا۔ یہ کمیٹی صوبہ جموں میں غالب کی صد سالہ برسی منانے کے لیے انتظامات کرے گی جموں و کشمیر یونیورسٹی کے اردو کے سربراہ ڈاکٹر گیان چند کمیٹی کے صدر اور جناب امرت ملہوترا سکریٹری منتخب کئے گئے۔ خواجہ عبدالغنی گونی ڈپٹی ڈائرکٹر مالیات نائب صدر ، سعید فتح حسین شاہ خزانچی اور جناب وید بھسین ایڈیٹر کشمیر ٹائمز پبلسٹی سکریٹری چنے گئے۔ ان کے علاوہ ورکنگ کمیٹی میں مندرجہ ذیل حضرات کو منتخب کیا گیا۔ جناب چت رام چوپڑہ پروفیسر بی۔ ڈی۔ بل شرما ، جناب نرسنگھ داس نرگس ایم اے ، کیپٹن عبدالعزیز ، ملک راج صراف ، شلیندر شنکر ، انگیل سنگھ ، جناب بلراج پوری ، خواجہ غلام قادر باٹے جناب عبدالعزیز اور جناب گنیش داس شرما۔ دو ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

(سکریٹری)

ہیرن پور میں یوم غالب

انجمن ترقی اردو ہیرن پور (ستھال پرگنہ) کے زیر اہتمام یوم غالب کی تقریب نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ زیر صدارت جناب ابوالخیر صاحب منعقد ہوئی سب سے پہلے جناب کمال الدین صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہیرن پور نے اپنا ایک مضمون بعنوان غالب ایک جائزہ پڑھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے غالب کی رومانی شاعری پر روشنی ڈالی جناب ابوالقیس رحیم دوشیل نے اپنی تقریروں میں غالب کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور انھیں خراج عقیدت پیش کی۔

(کمال الدین صدیقی ، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ، ہیرن پور بہار)

اودے پور میں یوم غالب

۱۵ فروری ۱۹۶۸ کو یوم غالب کی جانب سے انجمن اسکول میں یوم غالب منایا گیا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ہندی ادیب جناب جناردن رائے ناگر نے کہا " ہمارے دیش کے کویوں میں مرزا غالب بہت بڑے کوی ہیں میں ذاتی طور پر مرزا غالب کا بھگت ہوں اردو دنیا کی آدھی شہرت مرزا غالب کی وجہ سے کھنچی ہے " مہمان خصوصی جناب کیف بھوپالی کی افتتاحی تقریر کے بعد خلیل تنویر نے اپنا مقالہ اردو غزل اور غالب پڑھا۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں جناب کیف بھوپالی ، جناب عابد حسین عابد ، جناب اختر قادری ، عبداللطیف لطف جناب شاہد عزیز ، جناب حفیظ الایمان اور جناب عثمان قریشی نے شرکت کی۔

(نامہ نگار)

صد سالہ جشن غالب کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا پروگرام

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صدر انجمن [illegible] صد سالہ جشن غالب کمیٹی [illegible] پروگرام مرتب کرکے عملی اقدام شروع کردیا ہے۔ سب سے اہم کام جو اس سلسلہ میں انجمن نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے وہ غالب کے کلام کا بنگلہ میں ترجمہ کرنا ہے۔ اس غرض سے بنگلہ اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ کی ترتیب دی گئی ہے جس نے غزلوں اور شعروں کا انتخاب کرکے بنگلہ میں ترجمہ کا کام شروع کردیا ہے۔ مجوزہ کتاب میں غالب کے کلام کے بنگلہ ترجمے کے علاوہ ترجمہ کئے جانے والے اشعار کا اردو متن نیز بنگلہ زبان میں اشعار کے الفاظ چھاپے جائیں گے۔ اس کے علاوہ غالب کے سوانح حیات اور ان کے کلام پر تبصرہ بھی اس میں شامل ہوں گے۔ اس کتاب کے علاوہ اردو میں بھی ایک یادگار کتاب شائع کی جائے گی جس میں بنگال کے ادیبوں ، پروفیسروں اور دیگر اہل قلم حضرات کے مضامین غالب کے کلام اور زندگی سے متعلق شامل ہوں گے۔ طلبہ کو بھی مضامین لکھنے کی دعوت دی جارہی ہے جنھیں بہتر مضامین لکھنے پر انعامات دیئے کے علاوہ ان میں سے بہترین مضمون کو بھی مجوزہ مجلہ میں شامل کیا جائے گا۔ ان بنیادی کاموں کے علاوہ ۱۹۶۹ء میں مشاعرہ ، تمثیلی مشاعرہ ، ڈرامہ وغیرہ کے پروگرام بھی زیر غور ہیں جن کا اعلان عنقریب کیا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ تمام اردو دوست حضرات اراکین انجمن کے ساتھ ہر ممکن کوشش سے تعاون فرمائیں گے تاکہ غالب کا صد سالہ جشن کلکتہ میں شایان شان اور تاریخی طور پر منایا جاسکے۔

(ایم اے جنرل سکریٹری ،)

دائرہ اردو گیا کی بارہویں نشست

دائرہ اردو گیا کی بارہویں ماہانہ نشست بروز منگل محمد حنیف لکچرر شعبۂ انگریزی گیا کالج کی قیام گاہ پر ہوئی جناب کلام حیدری نے اپنا افسانہ " عمل اور ردعمل " سنایا افسانے کے مختلف ہی پہلوؤں پر سریندر چودھری ، انجم فاطمی ، حسین مجیب ، رفیع ظفر اور دوسرے شرکا نے اظہار خیال کیا۔

اردو کو خصوصی رتبہ دیا گیا تو جن سنگھ مزاحمت کی تحریک چلائے گی

[illegible] جن سنگھ کے نئے صدر جناب اٹل بہاری باجپئی [illegible] زبانیں تسلیم شدہ عام ہیں۔ اگر اردو کو دوسری زبانوں پر ترجیح دیتے ہوئے کوئی خصوصی رتبہ دیا گیا تو ملک میں اردو نہ بولنے والے عوام جن کا شمار [illegible] ہے بھڑک اٹھیں گے۔ جن سنگھ کے رہنما تمام علاقائی زبانوں کی ترقی کے [illegible] بنیادی مواقع کی وکالت مودی کی ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر [illegible] مرکزی حکومت اردو پر خصوصی توجہ دینے پر بھی مائل ہے تو ان کی جماعت اس کے خلاف مزاحمت کی جدوجہد جاری رکھے گی۔

(سیاست کانپور)

مرکزی دفتروں میں سہ لسانی فارمولہ نافذ کیا جائے

[illegible] ۲۲ فروری کانگریس ورکنگ کمیٹی کے [illegible] اجلاس میں اس بات پر اتفاق رائے رہا کہ سہ لسانی فارمولہ کو مرکزی ملازمت کی [illegible] کا مطلب یہ ہوا کہ تمام مرکزی

لازمی کو ہندی انگریزی اور ایک تیسری زبان منطقی ہوگی۔ جنوبی ہند کے الالیڈروں نے اعلان کیا کہ لسانی مسئلہ پر کوئی ٹھوس فیصلہ ہی ملک میں امن و امان اور یکجہتی کو برقرار رکھ سکتا ہے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مرکزی حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنائے۔

انجمن ترقی اردو رانچی کے جلسہ میں غلام سرور کی تقریر

رانچی۔ جناب غلام سرور، صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو ارا کین انجمن ترقی اردو (رانچی) کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا سب سے پہلے جناب محی الدین ایم اے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو نے ایک استقبالیہ رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد مہمان خصوصی جناب غلام سرور نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کارکردگی کا تذکرہ کیا اور اردو سے متعلق چند اہم باتیں بتائیں۔ موصوف نے فرمایا کہ پچھلے برس کے تجربات کے نتیجے میں انجمن نے گزشتہ سال اردو کو الیکشن کا ایشو بنایا الیکشن ایشو کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی سوال کو الیکشن کا ایشو بنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سوال ایک ایک گاؤں، ایک ایک دیہات اور ایک ایک شخص تک پہنچ جائے اور جہاں تک اس کی کامیابی کا سوال ہے ہم اس میں سو فیصد کامیاب ہوئے ہیں۔ اردو کا سوال ایک ایک شخص اور ایک ایک ووٹر تک پہنچ گیا۔ عہدہ داران طبقہ کو جو اردو کو نہ جانتا تھا جانے لگا وہ اخبارات جو اردو کے سلسلہ کی خبریں شائع کرنے سے پرہیز کرتے تھے صرف اردو کے نام پر کالم کے کالم سیاہ کرنے لگے اور باضابطہ کچھ دنوں تک تو انگریزی اخبارات اردو پر بحث ومباحثہ بھی کرتے رہے ...... دوران تقریر انھوں نے کہا کہ بلاشبہ ہماری انجمن جہاں کل تھی آج وہاں سے بہت آگے ہے۔ آج سے میں سال پہلے لوگ اردو کا نام لینے سے ڈرتے تھے لیکن آج وہ بات نہیں ہے ہم نے دھیرے دھیرے لوگوں کو تیار کیا اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم دستخطی مہم کا اٹھایا دس لاکھ اردو دوستوں کے دستخط جمع کئے اور صدر ہند کی خدمت میں پیش کیا اگرچہ نتیجہ کچھ نہیں برآمد ہوا۔ اور حکومت سے جو مطالبہ کیا گیا تھا وہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک ایک د...... تک اردو کا پیغام پہنچا اور ۱۹۶۱ء میں جو مردم شماری ہوئی اس میں اس تحریک کو ناکام کیا گیا ...... ۱۹۶۶ء میں اردو کو الیکشن کا ایشو بنا کر ...... سرعت دی۔ موصوف نے کہا کہ ایک بات تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ ہم لوگوں کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہے ہم لوگ کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہیں جو پورے طور پر اثر انداز ہو سکیں۔ پھر بھی تھوڑی طاقت ضرور رکھتے ہیں۔ آخر میں جناب صدر نے حاضرین کے بعض سوالوں کے جواب ...... دئے جو اردو سے متعلق تھے۔

مشاعرہ بسلسلہ جشن صد سالہ غالب

بنارس۔ یہاں جشن صد سالہ غالب کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ زیر صدارت جناب ...... ضیاء الحق صاحب ڈپٹی اڈمنسٹریٹر نگر مہاپالیکا بنارس ...... بی ...... کالج بنارس میں منعقد ہوا۔ ...... فروری کو یوم غالب کالج مذکور میں منایا گیا تھا اسی سلسلہ میں مشاعرہ کرنا بھی طے ہوا تھا۔ اولاً بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب لکچرار ڈی۔ اے۔ وی کالج بنارس نے افتتاحی تقریر بسلسلہ انتخاب صدارت و یوم غالب فرمائی اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جناب برکت اللہ صاحب شبنم۔ عبد الحفیظ صاحب نظر بیکس صاحب ضیا صاحب، خلیق صاحب، جنید صاحب۔ مولانا احمد کرم صاحب عاقب، طالب علی صاحب، شیو ناتھ پرشاد صاحب شاد۔ سوریندر کمار سنگھ صاحب، خورشید صاحب گمنام۔ عزیز صاحب عزیز سراج صاحب۔ و جناب عبد القدوس صاحب نیرنگ نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

(داتا رسول جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس)

پرکاش اردو لائبریری، رانچی کا جلسہ

پرکاش اردو لائبریری رانچی کا سالانہ جلسہ بتاریخ ۲۵ فروری کو ہوا جلسہ کی صدارت ڈپٹی ...... اکاؤنٹنٹ جنرل بہار نے فرمائی۔ مشاعرہ کا افتتاح جناب دھرم سروپ ناگرا صاحب ...... سیلز ایڈوائزر ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ نے ...... فرمایا۔ جناب ڈی۔ پی۔ ورما صاحب رجسٹرار رانچی یونیورسٹی کے ہاتھوں انعامات کی تقسیم ہوئی اس جلسہ کے معزز حاضرین میں پرنسپل ...... کالج پرنسپل ...... اسکول کئی سینئر مجسٹریٹ۔ رانچی یونیورسٹی کے بہت سے مسلم و غیر مسلم پروفیسران اور ڈاکٹر بھی تھے۔ ان کے علاوہ مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔

محفل مشاعرہ میں ...... قابل ذکر مقامی شعرائے کرام نے شرکت کی جس پر نسیم جمیدی۔ نشور ڈالٹنگنجوی۔ پروفیسر صبیح الحق صدر شعبۂ اردو رانچی کالج۔ ڈاکٹر ناصر علی ناصر بھاگلپوری دھرم سروپ ناگرا۔ ضیا پرتاپ گڑھی۔ وحید رانچوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آخر میں پرکاش اردو لائبریری کے صدر جناب پروفیسر احمد سجاد صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا

(عبد ...... سکریٹری شعبۂ نشر و اشاعت رانچی)

میرا صفحہ

ساہتیہ اکاڈمی بارہ مارچ ۱۹۵۴ء کو وجود میں آئی۔ اس کا مقصد ہندوستانی ادبیات کی ترقی کے لیے سرگرم کوششیں کرنا، بلند ادبی معیار نافذ کرنا، ہندوستان کی تمام زبانوں کی ادبی سرگرمیوں کو مربوط کرنا اور انھیں ترقی دینا اور ان سب کے ذریعہ سے ملک کی تہذیبی وحدت کو تقویت پہنچانا ہے۔ یہ اکاڈمی حکومت ہند نے قائم کی ہے مگر ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے کام کر رہی ہے گو حکومت سے قریبی تعلق کی وجہ سے ابھی تک یہ اتنی آزاد نہیں ہو سکی جتنی ہونی چاہئے۔ اس کا دفتر رابندر بھون میں ہے جہاں دوسری دو اکاڈمیوں سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کا بھی دفتر ہے۔ اس کا سالانہ بجٹ ساڑھے آٹھ لاکھ کا ہے جس میں سے چھ لاکھ حکومت کی امداد ہے۔ باقی کتابوں کی نکاسی کی آمدنی ہے۔ اکاڈمی بیرونی زبانوں کے ادب عالیہ کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں کرتی ہے علاوہ ہر ہندوستانی زبان کے شاہکاروں کا ترجمہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہر ہندوستانی زبان میں کچھ نظم و نثر کے انتخابات تیار کرتی ہے۔ اردو میں اکاڈمی مولانا آزاد کی تمام تصانیف بھی شائع کر رہی ہے اب تک ترجمان القرآن کی دو جلدیں اور غبار خاطر شائع ہو چکی ہیں۔ تذکرہ پریس میں ہے۔ اکاڈمی دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج پندرہ زبانوں کے علاوہ میتھلی اور انگریزی کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ اس طرح وہ سترہ زبانوں میں کتابیں شائع کرتی ہے اور ہر سال ہر زبان میں پچھلے تین سال کی بہترین ادبی کتاب پر پانچ ہزار کا ایک انعام بھی دیتی ہے۔

اکاڈمی کی ایک جنرل کونسل ہے جس کے پچھتر ممبر ہیں۔ اس کے پہلے صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور پہلے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن تھے۔ پنڈت جی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر ہوئے۔ انھوں نے پچھلے سال استعفیٰ دے دیا اب ان کی جگہ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر اور ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نائب صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اکاڈمی کی جنرل کونسل کے ممبر پانچ سال کے لیے چنے جاتے ہیں ہر زبان کے خاص خاص ادبی اداروں سے تین تین نام مانگے جاتے ہیں اس فہرست میں سے ہر زبان کا ایک نمائندہ چنا جاتا ہے۔ ہر ریاست سے تین نام مانگے جاتے ہیں ان میں سے ایک نمائندہ چنا جاتا ہے۔ بیس نمائندے یونیورسٹیوں کے بھیجے ہوئے ناموں میں سے لیے جاتے ہیں۔ آٹھ ممبر ادب میں امتیازی درجہ رکھنے کی بنا پر کونسل خود انتخاب کرتی ہے۔ پانچ ممبر حکومت نامزد کرتی ہے۔ دو نمائندے سنگیت ناٹک اکاڈمی کے اور دو للت کلا اکاڈمی کے اور ایک نمائندہ ہندی ثقافتی کونسل کا ہوتا ہے۔ ہر زبان کے لیے ایک مشاورتی بورڈ ہوتا ہے۔ اکاڈمی کے اگزیکٹیو بورڈ میں ہر زبان کا ایک نمائندہ ہوتا ہے۔ راقم الحروف گذشتہ دس سال سے اکاڈمی کی کونسل کا اور آٹھ سال سے اگزیکٹیو بورڈ کا ممبر ہے اور بارہ سال سے مشاورتی بورڈ کا کنوینر۔ اس لیے اکاڈمی کے کام کے متعلق اسے کچھ کہنے کا حق پہنچتا ہے۔

اگرچہ حکومت سے قریبی تعلق کی وجہ سے اکاڈمی اتنی آزاد نہیں جتنی ہونی چاہئے تھی اور اس وجہ سے اس کی کتابوں کی اشاعت کی رفتار اور رفتار کی ترقی بھی سست ہے مگر مجموعی طور پر یہ ایک مفید ادارہ ہے اور اچھا کام کر رہا ہے۔ اس میں کسی زبان کو کسی دوسری زبان پر فوقیت نہیں ہے۔ سب کے ساتھ برابری کا سلوک ہے۔ اس کے ممبر عام طور پر ملک میں شہرت رکھتے ہیں، گو ریاستوں سے جو نمائندے آتے ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے ایک زبان کے ادیب دوسری زبان کے ادب سے واقف ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں یہ اچھے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتی ہے اور اگرچہ انعام کے لیے کوئی بھی طریقہ بے عیب نہیں ہے، مگر مجموعی طور پر اس کے انعامات علمی و ادبی معیاروں پر دئیے گئے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اس نے بیسویں صدی کے ہندوستانی ادب کی ایک ببلوگرافی تیار کی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہم عصر ہندوستانی ادب، ہندوستانی ادبیات کی تاریخیں، ہندوستان کون کیا ہے؟ ہندوستانی ادب کے معمار، ہندوستانی شاعری، ہندوستانی لوک گیت، مختصر افسانوں کے انتخاب بھی کچھ زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور باقی میں شائع ہونے والے ہیں کالیداس کی تصانیف کا ایک خاص اڈیشن بھی تیار ہوا ہے جس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یونیسکو سے بھی اس کا رابطہ ہے اور وہ اس کی کتابوں کی اشاعت کے لیے سہولتیں دیتی ہے۔ اس کا ایک سہ ماہی جرنل انڈین لٹریچر کے نام سے انگریزی میں شائع ہوتا ہے جس میں ہر سال کے ادب کا جائزہ بھی ہوتا ہے۔ ایک رسالہ سنسکرت میں بھی اور ایک خبرنامہ انگریزی میں بھی نکلتا ہے اس نے ٹیگور اور شیکسپیئر پر ایک بین الاقوامی سیمینار کیا تھا۔ اس کے سکریٹری کرشنا کرپلانی ایک خوش طبع اور متین آدمی ہیں اور بڑی دلنواز شخصیت رکھتے ہیں۔ ادیبوں کو متحد رکھنا آسان کام نہیں۔ یہ مینڈکوں کو تولنے کے مترادف ہے پھر ہر زبان کا ادیب اپنی زبان کے لیے سب کچھ چاہتا ہے دوسری زبان کے مفاد کا لحاظ نہیں کرتا۔ پرانے لوگ نئے میلانات کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں بعض شہرت یافتہ ادیبوں کو مانتے ہیں۔ نئے لوگ بعض اوقات پرانوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سب کو ساتھ لے کر چلنا ایک تسلسل قائم رکھنا اور نئے میلانات کے لیے گنجائش بھی باقی رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ کرپلانی اس کی کوشش کرتے ہیں گو بعض اوقات اس میں کامیابی نہیں ہوتی

اب تک کسی نہ کسی طرح اردو کے پانچ مصنف اکاڈمی کے ممبر ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر ہیں ان کے علاوہ پروفیسر مجیب، پروفیسر اختر اورینوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور راقم الحروف۔ ہندی کے ادیبوں میں ہزاری پرشاد دویدی، مہادیوی، ڈاکٹر رام بلاس شرما، پنجابی کے ادیبوں میں پروفیسر موہن سنگھ اور امرتا پریتم، بنگال کے ادیبوں میں دستو ڈے، ملیالم کے ادیبوں میں شنکر کروپ، گجراتی کے ادیبوں میں اماشنکر جوشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۲۶ فروری کو اکاڈمی کی چوتھی کونسل کا پہلا جلسہ رابندر بھون میں ہوا جس میں صدر کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے بعد ادیبوں کے ایک جلسے میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ ہندوستانی ادب میں ڈراما کی ترقی کی رفتار کیوں سست ہے۔

(باقی)

مطبوعہ ... انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے ... کمرشیل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر ... نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57
Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۷، شمارہ ۱۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ / مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

تعمیری کاموں کا طریقہ

اس وقت اردو دوستوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ تعمیری کاموں کی طرف پوری توجہ کریں حکومت سے وہ سہولتیں طلب کرنا جو دستور نے ہمیں دی ہیں اپنی جگہ اہم ہے، مگر کافی نہیں ہے۔ اول تو حکومت کے اپنے اعلان کاغذ پر زیادہ رہتے ہیں عمل میں کم آتے ہیں، دوسرے موجودہ سیاست کی فضا میں ہر سیاسی پارٹی قومی مسائل کو بھی پارٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی ہے اس لیے اردو کے سوال کو بھی جو ایک قومی سوال ہے، فٹ بال بنا لیا گیا ہے جو پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی ہے وہ ٹال مٹول کرتی ہے، جب مخالفت میں ہوتی ہے تو اپنی ساکھ بڑھانے کے لیے پرزور حمایت کے وعدے کرتی ہے۔ اس لیے اردو دوستوں کو سیاسی میدان کے علاوہ دوسرے میدانوں کی طرف بھی دیکھنا ہے۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اردو کی تعلیم کا ابتدائی اور ثانوی درجے پر قابلِ اطمینان انتظام ہو۔ اس انتظام کے بعد اعلیٰ تعلیم کا درجہ آتا ہے ابتدائی تعلیم کی ضمانت دستور میں دی گئی ہے مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ریاستی حکومتیں اور ضلع کے کرتا دھرتا اس معاملے میں بڑی سستی سے کام لیتے ہیں اور بہت چیخ پکار کے بعد ایک دو جگہ انتظام کر دیتے ہیں ہونا یہ چاہیے تھا کہ مردم شماری کے اعداد دیکھ کر حکومت خود ان علاقوں میں جہاں اردو دوستوں کی خاصی آبادی ہے، ابتدائی اور ثانوی اسکول کھول دیتی اور جہاں دس ابتدائی اسکول ہوتے وہاں ایک ثانوی اسکول بھی ہوتا۔ اس کے ساتھ اساتذہ کی تربیت اور مناسب کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ ہماری شاخوں کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اپنے حلقے میں حکومت کو اسکول کھولنے پر مجبور کریں، مگر اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی نہ رہیں کہ حکومت کب اسکول کھولتی ہے، بلکہ مقامی حضرات کی مدد سے اپنے اسکول بھی کھول لیں۔ اپنے اسکول کھولنے اور چلانے کے اخراجات مقامی وسائل سے پورے کیے جا سکتے ہیں اور دستور کی ہدایت کے مطابق ان اسکولوں کو حکومت سے امداد بھی ملے گی۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اصولی باتوں پر لوگ کم کان دھرتے ہیں، ہاں ذاتی کوشش اور اثر سے بڑے بڑے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ اس لیے اردو دوست اپنے حلقے کے اچھے اور معقول لوگوں کی مدد سے اردو کے اسکول قائم کر سکتے ہیں اور ان کے لیے وسائل بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ایوب مرحوم نے جو اس زمانے میں بہار کی ریاستی شاخ کے صدر تھے انجمن کے ایسے اسکول کھولنے کی ایک اسکیم بنائی تھی۔ اس اسکیم پر بہار کے اردو دوستوں کو جلد سے جلد عمل کرنا چاہیے۔ اسی طرح اترپردیش میں بھی ریاستی شاخ کو اپنے اسکول کھولنے چاہئیں۔ ایسے اسکول کھولنے سے کئی فائدے ہوں گے۔ طلبہ کی بنیادی ضرورت پوری ہوگی۔ تعمیری کام کا تجربہ ہوگا جس کی وجہ سے دوسرے کاموں میں مدد ملے گی۔ اردو دوستوں میں اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوگا اور وہ دوسروں کا منہ دیکھنے کی عادت ترک کر دیں گے۔ ہاں ان اسکولوں میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھنا ہوگا کہ تعلیم کا معیار ہر طرح بلند ہو۔ اردو دوستوں کو نہ صرف صحیح بنیادوں پر علم سیکھنا ہے، انھیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے مقابلہ بھی کرنا ہے تاکہ زندگی کی دوڑ میں وہ کسی طرح پیچھے نہ رہ جائیں۔ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ اردو کے علاوہ ہمارے طلبہ کو علاقائی زبان اور انگریزی اچھی طرح آتی ہو، علاقائی زبان سے بیگانہ رہنا، روزمرہ کے کاموں میں دشواری پیدا کرے گا اور انگریزی میں خامی، عالمی معیاروں سے کٹ جانے کے مترادف ہوگی۔

آج اردو دوستوں میں جو غم و غصہ ہے، وہ قدرتی ہے۔ بیس سال سے ہمارے حقوق پامال ہو رہے ہیں اور ہمیں عام طور پر وعدوں سے بہلایا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم غم و غصہ کے عالم میں کوئی غلط اقدام نہ کریں۔ ہمیں سب سے پہلے اپنے عقیدے پر قائم رہنا ہے کہ ہر حال میں ہم اردو زبان کی حفاظت کریں گے اور اس کی ترقی کے لیے راہیں نکالیں گے۔ پھر اس مقصد کے لیے روپیہ، وقت، کارکن مہیا کرنے ہیں، تاکہ ہماری مہم جاری رہ سکے پھر سب سے پہلے خود کچھ کرنا ہے، پھر دوسروں سے کرانا ہے۔ اس تعمیری نقطۂ نظر کی آج جتنی ضرورت

سے پہلے کبھی نہ تھی۔ امید ہے کہ اردو دوست اس معاملے میں اپنی نظر کی صحت اور عمل کی صلاحیت کا پورا ثبوت دیں گے۔

گوا سے ایک اردو ہفتہ وار کا اجرا

پناجی گوا سے عنقریب ایک اردو ہفتہ وار "صوت" کے نام سے جاری ہوگا یہ اخبار "پناجی" سے جناب اشرف آغا داؤد کی ادارت میں شایع ہوگا۔ یہ اخبار قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نقیب ہوگا اور اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرتا رہے گا۔

مسعود علی ذوقی کو اعزاز

علی گڑھ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ جناب مسعود علی ذوقی کو جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہو گئے ہیں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سبکدوش اساتذہ کی امداد کی اسکیم کے تحت چھ ہزار سالانہ کا اعزازیہ اپنے علمی کاموں کو جاری رکھنے کے لئے دیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک ہزار سالانہ مزید اخراجات کے لیے دیئے جائیں گے۔ یہ اعزاز اس سے قبل بھی اردو کے مشاہیر کو مل چکا ہے۔ جناب مسعود علی ذوقی شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی کام کریں گے اور تدریس میں بھی ان کی شرکت ہوگی۔ (نامہ نگار)

نوعیت کا واحد نمونہ ہے اور اس دو جلدی کتاب میں ادیبوں کے بارے میں تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ (افکار)

طلا کار کتابت

گنگٹوک ۸ر مارچ مہاتما بدھ کی کتابوں کو بھوٹان میں سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ اس مقصد سے ۶۷ کلرکوں کو ملازم رکھا گیا ۱۰ر۲۱ سو تولے سونا مہیا کیا گیا۔ اس مقصد سے تنفیو میں خاص قسم کا کاغذ تیار کیا گیا۔ یہ اس مہم کا ایک حصہ ہے جو مہاتما بدھ کی دو سو کتابوں کو سنہری حروف میں لکھنے کے لیے شروع کی گئی ہے بھوٹان کے حکمران دیلی نگا وانگ نسترنگ نے اٹھارھویں صدی میں ان کتابوں کو طلائی حروف میں لکھوایا تھا مگر جس لائبریری میں یہ کتابیں رکھی ہوئی تھیں اسے آگ لگ گئی اور سو کتابوں میں سے ۵۱ جل گئیں۔ (قومی آواز)

جشن غالب کے موقع پر
غالب کے مسودوں، کتابوں، وغیرہ کی نمائش

لکھنؤ ۱۲ر مارچ ایشیائی مطالعات کے ادبی شعبہ کے امیر اعلیٰ پروفیسر ایس جیلی تیف ۱۷ر اور ۱۸ر مارچ کو دارالسلطنت میں ہونے والے جشن غالب میں شرکت کریں گے ان کے علاوہ کچھ اور غیر ملکی ماہر غالب کے بارے میں مقالات پڑھیں گے۔ جشن غالب کا اہتمام غالب کی صد سالہ تقریبات کی کمیٹی کی طرف سے کیا جا رہا ہے اس موقع پر غالب کے مسودوں، کتابوں، تصویروں اور فوٹو گرافوں کی نمائش بھی کی جائے گی غالب کی نظموں کی بنیاد پر ایک تعریفی پروگرام کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس جشن میں مشہور ریڈیو آرٹسٹ اور فلمی اداکار شرکت کریں گے یوپی کے گورنر ڈاکٹر گوپالا ریڈی اس جشن کا افتتاح کریں گے ایک مشاعرہ بھی ہوگا جس میں ہندی اور اردو کے مشہور شاعر شرکت کریں گے اس مشاعرہ کی صدارت مرکزی وزیر فخر الدین علی احمد کریں گے

افکار کی ۲۳ویں سالگرہ

کراچی۔ گذشتہ دنوں آرٹس کونسل کراچی میں حکیم محمد سعید دہلوی (ستارۂ امتیاز) کی صدارت میں مشہور ادبی ماہنامہ "افکار" کی ۲۳ویں سالگرہ منائی گئی جس میں افکار کی ادبی خدمات پر مضامین پڑھے گئے۔ جن حضرات نے افکار کی ۲۳ سالہ ادبی جدوجہد اور کئی بے مثال خاص اشاعتوں مثلاً جوش نمبر، فیض نمبر، غالب نمبر، حفیظ نمبر، مجاز نمبر وغیرہ پر روشنی ڈالی اور مدیر افکار کو خراج عقیدت ادا کیا ان میں جوش ملیح آبادی، حکیم محمد سعید دہلوی، سبط حسن، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر ابوالخیر کشفی، سحر انصاری، قمر ہاشمی، مختار زمن، منیر احمد دہلوی اور مسز شرف احمد قابل ذکر ہیں۔ (دواحمد طاہر)

ریور مدھیس ریحانی

آج کا انساں

کس نے کہا ہے گردشِ دوراں / کس نے کہا ہے آج کا انساں
دل کی صدا ہے ابطالِ باطل / اور زباں پر تمجیدِ یزداں
گرمیٔ نمرود شعلہ شعلہ / جوشش عداوت طوفاں طوفاں
روحِ سخن ہے دل آزاری / حرفِ محبت زینتِ عنواں
ہر لب پر ہے نفسی نفسی / زیست کی محفل حشر کا میداں
اپنے قلم سے تو نے فطرت / خوب بنایا نقشِ انساں
جب تک دل ہے درد سے خالی / جینا اور مرنا ہے یکساں
قدرت کا منشا ہے محبت / کوئی زباں بھی بولے انساں
ایسا گلشن مل کے بنائیں / جھوم کے آئے فصلِ بہاراں
دیکھ کے جس کو اے ریحانی
خالق بھی ہو جائے حیراں

اردو کی کتابوں پر انعام

نئی دہلی: ۱۱ر مارچ مرکزی وزارت تعلیم نے نوخواندوں کے لیے اٹھارہ کتابوں اور مسودوں کا انتخاب کیا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا ہے چار کتابیں ہندی کی دو دو آسامی، کنڑ، تامل اور اردو کی اور ایک ایک بنگلہ، کشمیری، ملیالم، اڑیہ، پنجابی، اور تلگو کی ہیں اردو کی منتخب کتابوں اور مصنفوں کے نام یہ ہیں۔ سائنس کے راستہ پر۔ سیما۔ مور، قومی پرند ابراہیم فکری (سیاست)

ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کا لغت

پراگ، یہاں کے اوڈین اشاعت گھر نے حال ہی میں ایک کتاب شایع کی ہے جس کا عنوان ہے "ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کا لغت" یہ لغت اپنی

شمس الرحمٰن فاروقی

نئی شاعری کے بنیادی علائم

کون میرا پوچھنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں
میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے؟ میں کس عرصۂ محشر میں ہوں
دیکھتے سب ہیں مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
اگلے دنوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں

یہ اشعار پاکستان کے ایک نوجوان شاعر ریاض مجید کے ہیں کوئی بھی چار شعر چاہے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں کسی بسیط شعری صورت حال کا احاطہ نہیں کر سکتے نئی شاعری کی سب سے بڑی [illegible] یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل پر محیط ہے اور نہ ان مسائل کو محدود تر اور معاصر بنا کر ان کو غیر محدود اور کائناتی سطح میں دیکھتی ہے نئی شاعری، انفرادی مسائل سے زیادہ اس الم ناک صورت حال سے دست و گریباں ہونے کی سعی کرتی ہے جس نے ان مسائل کو جنم دیا ہے لیکن پھر بھی ان چار شعروں میں نئے شاعر کا داخلی کرب اور اس کا DILEMMA بہت خوبی سے واضح ہو گیا ہے آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان چاروں اشعار میں صیغۂ واحد متکلم مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اکیلا دیوتا ہوں میرا مندر جل رہا ہے میرے پرستار کہاں ہیں؟ میں اپنے ساتھیوں سے مختلف اور تنہا ہوں میں شرمندہ ہوں، اگرچہ میں مجرم نہیں ہوں میں سب کے سامنے ہوں، لیکن کوئی میرے درد سے واقف نہیں۔ اس طرح تمام اشعار کا "میں" ایک مرکزی علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے یہ "میں" شاعر بھی ہے اور شاعر کے عہد کا تھکا ہارا انسان بھی، جو زندگی کے مسائل کے سامنے خود کو بے چارہ اور مجبور پاتا ہے ذات کا غیر ذات سے ٹکراؤ اور نتیجے کے طور پر غیر ذات کی شکست یہ نئی شاعری کا بنیادی مسئلہ ہے نیا شاعر خود کو ایک عدیم المثال صورت حال میں پاتا ہے اور وہ صورت حال یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو کسی نہ کسی تصادم میں گرفتار ہے۔ اس تصادم میں ایک ایسی ناگزیر بے چارگی ہے جو شکست ذات کے حادثے کو پوری طرح المیہ بھی نہیں بننے دیتی المیہ کے لیے کشاکش، کشمکش اور جد و جہد کا عنصر لازمی ہے۔ لیکن نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ وہ پوری طرح المیہ کی عظمت کو بھی نہیں پہنچ پاتا۔ وہ ایک دیوتا ہے لیکن تنہا، اس کا ایک مقدس مندر ہے، لیکن جل رہا ہے۔ وہ آواز دے رہا ہے کہ میرے پوجنے والے کہاں ہیں؟ لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔ غالب نے کہا تھا ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یعنی شاعر کا وجود مے مرد افگن عشق کا حریف تھا۔ شاعر کے بعد کوئی تاب بر نہیں دکھائی دیتا۔ نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ خود وہ بھی حریف مے مرد افگن عشق نہیں ہو پاتا۔ اس موقع پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مشہور مصرعے یاد آتے ہیں

This is the way the ...
This is the ... world e...
This is the way the world ends
... not with a bang but with a whisper

یہ دنیا جو دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑنے کے بجائے ایک فوس [illegible] کے دم توڑتی ہے، ہمارا کرۂ ارض نہیں، بلکہ شاعر کی دنیا ہے جس کا ہر پیشہ طلب گار مرد ہے؟[1]، لیکن ؎

میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں، مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

یہ ایک ایسا غم ہے جس میں اپنے ساتھیوں کی نامردی سے زیادہ اپنی مردانگی کا درد ہے، کیونکہ احساس سے عاری دنیا میں حساس ہونا ایک بہت بڑی سزا ہے۔ ممکن ہے شدت احساس کی اسی کیفیت نے اس بے نام احساس جرم کو جنم دیا ہو جو دوسروں کے جرم کو بھی اپنے اوپر عائد ہوتے دیکھتا ہے۔ نئے شاعر کی ذہنی صورت حال کا سب سے نمایاں اور انانیت سے بھرپور پہلو یہ ہے کہ وہ خود کو تمام انسانوں سے الگ نہیں سمجھتا، اس لیے وہ انھیں تلقین و تبلیغ نہیں کرتا، بلکہ ان کے درد کو اپنا درد اور ان کے جرم کو اپنا جرم سمجھتا ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ نئے شاعر کو ایسی آخر کیا پریشانی ہے جو وہ دنیا میں ہر طرف تصادم اور انتشار دیکھتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اکثر نئے شاعر اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن پھر بھی انسانی صورت حال کی ابتری اور بے حالی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ کچھ نقاد نئے شاعر پر خلوص کی کمی، ریاکاری اور نقل نویسی کا الزام اس وجہ سے لگاتے ہیں کہ خود نئے شاعروں کی عام زندگی میں عموماً کوئی ایسا انتشار و اختلال نہیں دکھائی دیتا جو ان کی شاعری میں پھیلی ہوئی ابتری کی دھندلی گدلی فضا کی توجیہ کر سکے۔ یہ تنقید دراصل شاعری کے بنیادی مفاہیم سے بے خبری اور شعر کی اصلیت کے بارے میں غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ورڈز ورتھ نے بہت پہلے کہا تھا کہ شاعر عام لوگوں کی ہی طرح کا ایک انسان ہوتا ہے لیکن اس کی قوت احساس و تمیز عام لوگوں سے بلند ہوتی ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ عام لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر شاعر انسانی صورت حال میں ابتری اور افراتفری اور انتشار و اضطراب کا دور دورہ دیکھتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے اس کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ خود اس کی زندگی نسبتاً آرام سے گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ ظاہری سکون و اطمینان باطنی خلش اور الجھن کی نفی نہیں کرتے۔ دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور اکثر رہتے ہیں۔ شاعر چوں کہ قوم کا ضمیر ہوتا ہے اس لیے وہ ہر وقت خود کو امتحان گاہ میں پاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

---

[1] ورنہ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی، [illegible] کو کون آرام نصیب نہیں تھا جس کی وجہ سے انھوں نے [illegible] دیا۔ یہ نظریہ کہ شاعر اسی وقت درد و کرب کا اظہار کرنے کا مجاز ہے جب وہ خود مفلوک الحال ہو، ایک مضحکہ خیز نظریہ ہے اور خود [illegible] کے PATENT نظریے کی نفی کرتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

موجودہ دور میں ایک طرف تو شعر و ادب کے بعض نازک اور پیچیدہ مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی ہوش مندی، ذہنی توازن، مذاق سلیم، عالمی ادب سے آگاہی اور تہذیبی و سماجی عوامل سے واقفیت ضروری ہے تو دوسری طرف بعض مسائل ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے محض ہنسنے ہنسانے اور تفریح حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انھیں مسائل میں سے ایک دلچسپ مسئلہ اپنا نام کسی اخبار یا رسالے میں چھپا ہوا دیکھنے کا شوق ہے وہ لوگ جو تخلیقی کرب سے گزرتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں گزرتے مگر غزل، نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول، انشائیہ یا ادب کی کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی کی تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے ہیں انھیں تو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے اس لیے کہ ادب کا دائرہ اور اس کی مملکت اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہر درجہ اور ہر قماش کی تحریر کی کھپت اور سمائی ہے لیکن جن بے چاروں کو مصرعہ موزوں کرنا تو درکنار نثر کی چند ایسی سطریں لکھنے کی صلاحیت بھی ودیعت نہ ہوئی ہو جن پر تھوڑی دیر کے لیے بھی ادب یا ادب نما قسم کی کسی چیز کا دھوکا ہو سکے وہ کیا کریں؟ ایسے لوگوں نے بھی اپنے لیے ایک نہ ایک راستہ نکال لیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی آگاہی اور ادبی تعلقات کے بارے میں اپنے "زریں خیالات" اور "قیمتی تاثرات" کو قلم بند کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوشش کبھی تو "مکاتیب بنام مدیر" کی زنبیل میں جگہ پا جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسا رسالہ بھی نکل آتا ہے جو ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو صفحے کے ان منتشر اور بے ربط خیالات کے مجموعے کو نقد و انتقاد کا نمونہ سمجھ کر شائع کر دیتا ہے تاکہ ناظرین باتمکین کو عبرت ہو اور "گم کردہ راہ" ادیبوں اور شاعروں کو توبہ و استغفار کی راہ دکھائی جا سکے۔

اس قسم کی تحریروں سے دلچسپی لینے اور دل خوش کرنے والوں کو مژدہ ہو کہ ان شوقین حضرات نے اب اپنا ایک رسالہ نکال لیا ہے۔ رسالہ کا نام "خونِ ناب" ہے۔ ۴۲ صفحوں کا یہ سہ ماہی رسالہ انتہائی کم قیمت اور گھٹیا کاغذ پر ادنیٰ درجے کی کتابت و طباعت کے ساتھ حیدرآباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مدیرہ کی حیثیت سے عالیہ عروج کا نام ہے اور شریک مدیر (شریک مدیرہ؟) محمد غوث محی الدین عروج صاحب ہیں۔ مدیرہ اور شریک مدیر یا مدیرہ دونوں کے نام ہم نے پہلی بار چھپے ہوئے دیکھے ہیں، ممکن ہے حیدرآباد کے بعض مقامی اخبارات میں مکتوب نویس کی حیثیت سے یہ لوگ پہلے بھی اپنا نام چھپوا چکے ہوں جس کا ہمیں علم نہیں۔ بہرحال اس کا اداریہ دیکھیے جس میں مدیرہ اعلان فرما رہی ہیں کہ۔

"ہم ایسے وقت میں خونِ ناب نکال رہے ہیں جب اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں"

آگے چل کر فرماتی ہیں

"آج کے ادبی مسائل میں ایک مسئلہ قدیم ادب (ترقی یافتہ کلاسیک درجہ رکھنے والا ادب) ترقی پسند ادب (جس کی اساس لازم سیاسیات و معاشیات ہے) اور جدیدیت (جو ابہام و اہمال کا شکار ہے) کا تصادم ہے۔"

قدیم ادب، ترقی پسند ادب اور جدیدیت کی جو تعریف قوسین کے اندر مدیرہ نے فرمائی ہے اس پر سر دھننے اور پھر ان کے تصادم کو آج کا اہم مسئلہ قرار دینا اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور خونِ ناب کی اشاعت سے اس بے چاری کے علاج معالجے کا انتظام کیا جا رہا ہے، مدیرہ کے بلند عزائم کو سمجھنے کے لیے یہ چند الفاظ کافی ہیں مگر صحیح معنوں میں تو لطف اس وقت حاصل ہوگا جب اس رسالے کے مضامین پر نظر ڈالی جائے گی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی اس برادری نے رسالہ نکالنے کا حوصلہ تو کر لیا لیکن اس کے لیے مواد کہاں سے آئے، ان کے اپنے ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کے مضامین کتنی جگہ گھیرتے اس لیے ان مضامین کو جن کا کل مواد کسی پوسٹر یا اشتہار سے زیادہ نہیں کسی باقاعدہ رسالے کی زینت بنانے کے لیے بعض پرانے مضامین کے آگے پیچھے شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ جدید شاعری کا انحطاط" کے عنوان سے عبادت بریلوی کا ایک مقالہ بغیر کسی حوالے کے درج کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ موصوف کی دس سال پہلے کی ایک کتاب سے [illegible]

شفا گوالیاری

غزل

کسی کے سامنے خالی کبھی نہ پھر جام آیا
تجھے اب تک نہ اے ساقی شعورِ اہتمام آیا
جنونِ عشق کی راہوں میں ایسا بھی مقام آیا
کہ جب [illegible] ان کو تو لب پر اپنا نام آیا
نظر [illegible] دور میں ہم کو یہی رنگِ نظام آیا
قفس والوں کا خونِ دل چمن والوں کے کام آیا
کچھ اس انداز سے مجھ کو سنائی داستاں اپنی
جہاں آنا تھا نام ان کا وہاں بھی میرا نام آیا
خودی دے کے خودی سے ماورا ؟ گزری ہے اک منزل
انہی سے ان کو پوچھا ہے کبھی وہ بھی مقام آیا
شبِ غم وہ نہیں تو ان کی یادوں کا سہارا تھا
فروغِ شمع سے پہلے اجالوں کا پیام آیا
بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں غنچہ و گل کو
شفا گلشن میں مشکل سے نیا دورِ نظام آیا

...کیا گیا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کا وہ ترجمہ جو جمیل جالبی نے کیا ہے بغیر حوالے کے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے جو سات آٹھ برس پہلے "ایلیٹ کے مضامین" کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔

خیر ان پڑھے ہوئے مضامین کو دوبارہ پڑھنا ان حضرات کا مقصد بھی نہیں ہے۔ ۶۴ صفحے آخر کس طرح پر ہوتے۔ جو مضامین ہمارے مطالعے کے لیے شائع کئے گئے ہیں ان میں ایک مضمون میر احمد علی قادری کا ہے جس کا عنوان ہے "شہریار کی شاعری کا جائزہ"۔ جو کہ اس رسالے کی مدیرہ اور اس مضمون کے راقم میر احمد علی قادری صاحب کو کہیں سے پتہ چل گیا ہے کہ جدیدیت اس چیز کا نام ہے جس میں ابہام و اہمال ہو اس لیے ہر اس شاعر کے یہاں یہ صفت لازمی طور پر موجود ہوگی جس کو لوگ جدید سمجھتے ہیں، مضمون لکھنے کے شوق میں موصوف نے جدید شاعروں کے مجموعوں کی تلاش کی ہوگی تو سب سے پہلے غالباً انھیں شہریار کا مجموعہ "اسم اعظم" کہیں سے دستیاب ہو گیا ہوگا۔ اس مجموعے کو پڑھنا، شاعر کے تجربات و محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اردو شاعری کے اسالیب اور اس کے ارتقا کو سمجھنا، رمز و ایما کی زبان سے مواصلت پیدا کرنا، یہ سب شرطیں تو اس کے لیے ہیں جو سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو لیکن قادری صاحب کو تو کچھ لکھنے اور اپنے نام سے چھپوا دینے سے کام۔

شہریار کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "سائے" قادری صاحب سب سے پہلے پوری نظم نقل کرتے ہیں۔

اداس شہر کی گلیوں میں رقص کرتے ہیں
بلائیں لیتے ہیں آوارہ گرد خوابوں کی
دعائیں دیتے ہیں بچھڑے ہوؤں کو ملنے کی
سنوارتے ہیں خم گیسوئے تمنا کو
پکارتے ہیں کسی اجنبی مسیحا کو
سمیٹ لیتا ہے جب چاند اپنی کرنوں کو
تو من کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں
یونہی ہمیشہ طلوع و غروب ہوتے ہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"پوری نظم پڑھ جائیے، نہ کوئی مبتدا نہ خبر، مکردہ ابہام اور قبیح اہمال۔"

چلئے تنقید ختم ہو گئی۔ آگے لکھتے ہیں:

"ان کی نظم لازوال سکوت بھی مجذوب کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔" نظم یہ ہے:

عجیب لمبے، گھنے پیڑوں کی ہری شاخیں
کبھی کبھی کوئی اشلوک گنگناتی تھیں
کبھی کبھی کسی پتے کا دل دھڑکتا تھا
کبھی کبھی کوئی کونپل درود پڑھتی تھی
کبھی کبھی کوئی جگنو الکھ جگاتا تھا
کبھی کبھی کوئی طائر ہوا سے لڑتا تھا
کبھی کبھی کوئی پرچھائیں چیخ پڑتی تھی
اور اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی میں نے
سرہانے رکھے ہوئے تازہ روزنامے کی
ہر ایک سطر بڑے غور سے پڑھی لیکن
خبر کہیں بھی کسی ایسے حادثے کی نہ تھی
اور اس کے بعد میں دیوانہ وار ہنسنے لگا
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت۔
اور اس کے بعد ہر اک سمت لازوال سکوت

اسی طرح قادری صاحب شہریار کی نظم "خوابوں کا بھکاری" نقل کر کے لکھتے ہیں

"اس نظم کا فاعل اسکوتیائی بیماری کا شکار ہے"

اور نظم "ما حصل" نقل کر کے اس پر یہ فقرہ چسپاں کرتے ہیں

"پوری نظم پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جوہاٹی پر کھڑا ڈگڈگی بجا کر مجمع لگانے کے لئے فضا میں ہاتھ اچھال کر عوام کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں ان نظموں کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتا اس لیے کہ شہریار ان جدید شاعروں میں ہیں جن پر اب تک کسی سنجیدہ اور معقول شخص نے ابہام و اہمال کا الزام نہیں لگایا ہے۔ ان نظموں کا بہت عمدہ تجزیہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک مضمون میں کیا ہے جو نقوش (لاہور) اور مراح (بھوپال) میں شایع ہو چکا ہے۔ میں نے تو قادری صاحب کے "گراں قدر خیالات" محض اس لئے نقل کئے ہیں کہ ان سے آپ بھی محظوظ ہوں اور اس بات پر غور کریں کہ "ہوس نقد اشاعت"[1] انسان سے کیا کیا حماقتیں سرزد کراتی ہے۔ شہریار تو خیر ایک سلجھے ہوئے شاعر ہیں کسی جدید شاعر کی کوئی نظم ایسے ابہام و اشکال کے باوجود اس قدر مضحکہ خیز اور سطحی نہیں ہو سکتی جتنی کہ قادری صاحب کا یہ سرد یا مضمون۔ یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ اس رسالے میں اس سے بھی زیادہ مزے دار چیزیں ہیں جی چاہے تو پڑھئے اور اس عجیب و غریب ذہنیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کیجئے۔

---

[1] غالب پر جب تنقید و تحقیق کا بازار گرم ہوا تو ہر ایرے غیرے نے طبع آزمائی شروع کر دی۔ شاد عارفی نے اسی رجحان پر طنز کیا ہے۔

ہوس نقد اشاعت میں لگے رہتے ہیں
آپ غالب کی حجامت میں لگے رہتے ہیں

---x-x---

انیس انور

مکتوب لندن

اپریل میں آفاق کا سالنامہ شایع ہوگا

آفاق کا ماہ اپریل ۱۹۶۸ کا شمارہ سالنامہ ہوگا جس میں جدید و قدیم ارباب فکر و دانش کی قلمی کاوشوں کے نمونے شامل ہوں گے اس تاریخی نمبر میں انگلستان کے ادیبوں، شاعروں اور انشائیہ نگاروں کی نمائندگی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

فروری کے آفاق میں "ستارے ٹوٹتے ہیں" افسانہ قمر علی عباسی، خیال، نظم عبدالرؤف عروج، سجدہ سہو، افسانہ انور سدید "مکان کرایہ پر خالی ہے" انشائیہ حبیب محسن، رنگ اندھیرا زینہ، افسانہ کمار پاشی "اے دل اے نادان" افسانہ یاسمین سعید، غزل، فارغ بخاری، سرگزشت، نظم عطا خالد عمر، غزل، صداقت حسین سوز، بڈھا چکر، افسانہ تصدق سہیل "تاب انتظار نہیں" نظم عیش ناصری، لمحہ، نظم شاکر لدھیانوی اور تشخص پرستی ما ہبر زدہ شیا حلوطی کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

انتخاب ملاحظہ ہو؟

غزل۔ راشدہ حسین

شمع احساس جلانے سے نکل آتے ہیں
وہ جو آنکھوں میں چھپے بیٹھے ہیں پروانے سے
لوگ تو ناگ ہیں ڈس لیتے ہیں دل والوں کو
آپ کیوں لوٹ چلے لوگوں کے بہکانے سے

غزل۔ شاہدہ قریشی نوٹنگھم

چارسو ایک فضا ایک سی تنہائی تھی
ہم سے پہلے یہ کہاں انجمن آرائی تھی
جل بجھے شمع کی مانند ہمیں کیا معلوم
صبح دم بادِ صبا تیری خبر لائی تھی
کیا خبر راہ میں کس کس سے ملاقات ہوئی
زندگی ورنہ تمہاری ہی طرف آئی تھی
شہر در شہر پھرے قریہ بہ قریہ گھومے
اپنی فطرت کبھی تو ہر رنگ میں ہرجائی تھی

ٹنگیات۔ استاد ٹنگی

آ کر ہوا لندن میں یہ احساس ٹنگی
یورپ سے جو چلتی ہے وہ تہذیب ملی
اللہ رکھے ملک کی بوٹی کو سلامت
لندن میں بھی موجود ہیں چرسی کئی بھنگی
ہم اپنے وہاں اس کو بنا لیتے ہیں "صاحب"
منہ پھیر کے چلتا ہے یہاں ہم سے فرنگی
اس وقت کہیں ہوں گے نہ ہم اپنے وطن میں
جب یاد انہیں آئیں اگے استاد ٹنگی

حضرت ناصح بھی "پب" کا شوق فرمانے لگے
اور جام ناب پی کر وجد میں آنے لگے
مجھ سے بولے اب نہ فرسودہ رسموں کے غلام
یوں نئی تہذیب اپنانے پہ اکسانے لگے

غزل۔ فارغ بخاری

ستارے ٹوٹے ہیں شب کا بت بکھرتے ہیں
سحر کے نام سے ظلمت پرست ڈرتے ہیں
کبھی کبھی ہمیں احساس تک نہیں ہوتا
وہ دل کی راہوں سے کچھ اس طرح گذرتے ہیں
نہ جانے زیب جبیں کون سی ہے رعنائی
مدام جس کی تمنا میں لوگ مرتے ہیں
ہمیشہ جس کی نگاہوں میں ہم کھٹکتے رہے
بڑے خلوص سے اب ہم کو یاد کرتے ہیں
جہاں جہاں کبھی چھوڑے تھے ہم نے نقش قدم
وہاں سے یاروں کے اب کارواں گزرتے ہیں

لمحہ۔ شاکر لدھیانوی

ایک لمحہ،
کس قدر مصروف ہے
بات کرنے کی اسے فرصت نہیں!
اس کے آگے
ان گنت کاموں کی اک فہرست ہے!!
ایک لمحے نے جنم دی ہیں ہزاروں زندگی کی صورتیں!
زندگی کی لذتیں،
زندگی کی وحشتیں،
ایک لمحے کے کرم کا فیض ہیں!!
لمحۂ مصروف کو میں دیکھتا ہوں چارسو،
چن رہا ہے نقش ہائے دلنشیں،
اور مزیں کر رہا ہے نقش ہائے زندگی!
نیند کی ماتی سنہری خوابگاہوں کے چراغ،
نشے سے لبریز روشن جلوہ گاہوں کے ایاغ،
ہر نئی مہکی کلی پر ڈولتے روح و دماغ،
ایک لمحے کے کرم کا فیض ہیں!!

مراسلات

کچھ غالبیہ کے بارے میں

میں کئی سال سے مرزا غالب کے بارے میں معاصرین کی تحریریں اور بیانات (منظوم و منثور دونوں) جمع کر رہا ہوں اور اس سارے مواد کو غالبیہ کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے پہلے تین ابواب نگار رام پور میں شائع بھی کر چکا ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غالب سے متعلق سارا خام مواد یکجا ہو جائے اور محققین اور ناقدین کو ادھر ادھر تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ یہ سارا مواد میں نے کئی ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے میں نے حتی الامکان موضوع سے متعلق تمام گوشوں کی چھان بین کی ہے لیکن اس کے باوجود اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ بعض مفید مطلب تحریریں میری نظر سے رہ گئی ہوں اس لیے میں غالبیات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایک نظر ابواب کی تقسیم کو ملاحظہ فرمالیں اور ان سے متعلق جو کچھ ان کے علم میں ہو یا ان کے پاس ہو اس سے مطلع فرمائیں میں اس لطف و کرم کے لیے بے حد شکر گزار رہوں گا۔ اور ان عطیات کو مرحمت فرمانے والے کے حوالے سے کتاب میں درج کروں گا۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ میری نظر سے بعض ایسی تحریریں گزری ہیں جنھیں غالبیہ میں شریک ہونا چاہیے تھا اور انھیں میں نے نقل بھی کر لیا مگر میری یادداشتوں کا ایک فائل ضائع ہو گیا اور یہ تحریریں میری نظر سے اوجھل ہو گئیں مثلاً میں نے غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات نوٹ کیا تھا جس کا ایک مصرع یہ تھا ؎

غالب جو مر گیا ہے تو دلی اداس ہے

اب کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ کس کا تھا اور میں نے کہاں سے نقل کیا تھا بہر حال مندرجہ ذیل ابواب سے متعلق جو بھی مدد کی جا سکتی ہو مجھے امید ہے کہ میں اس سے محروم نہ رہوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(اکبر علی خاں رام پور رضا لائبریری رام پور یو پی)

پہلا باب۔ تذکروں میں غالب کا ذکر

دوسرا باب۔ ملاقاتیوں کے بیانات

تیسرا باب اخبارات میں غالب کی یا غالب پر تحریریں اور خبریں

چوتھا باب۔ غالب کی زندگی میں لکھے ہوئے ایسے اشعار جن میں غالب کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان میں قطعات تاریخ وغیرہ بھی ہیں۔ جیسے غالب کے بہرے ہونے کی تاریخ جو صاحب عالم مارہروی نے کہی تھی یا غالب کی وفات کی غلط خبر اڑ جانے پر جو قطعات کہے گئے، یا غالب کی مدح میں قصائد متفرق ایک ایک دو دو شعر بھی اس باب میں آئیں گے جیسے یہ دو شعر ؎

(۱) چو دیدم غالب آزردہ را از بند صہبائی
پیغام مرہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید (صہبائی)

(۲) ملک کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے
ہیں ہے سایہ بال ہما سے ہو (میاں داد خاں سیاح)

پانچواں باب غالب کی کتابوں پر دیباچے اور تقاریظ اور قطعات

چھٹا باب غالب کی وفات پر قطعے

ساتواں باب غالب کی وفات پر مضامین

آٹھواں باب۔ معاصرین کے خطوط جن میں غالب کا ذکر آتا ہو یا جو غالب ہی کے نام لکھے گئے ہوں

نواں باب۔ متفرقات ایسی تحریریں جن کا تعلق ان حضرات سے ہے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا ان کے دوست تھے شاگرد تھے۔ اس میں اشعار کے مطالب وغیرہ جو غالب کے حوالے سے درج کیے جائیں گے

یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر کسی شخص نے غالب کے بارے میں کوئی بیان دیا لیکن اس شخص کی ملاقات براہ راست نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے شخص کے ذریعے ہے اور وہ دوسرا شخص غالب کے عہد کا ہے تو یہ بیان بھی کتاب میں [illegible] یہ بیان [illegible] غالب سے میرے دادا کی [illegible] اس غالبیہ کے دائرے میں آتا ہے۔ جیسے امیر مینائی کے حوالے سے جلیل مانک پوری نے غالب کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ رام پور سے واپسی کے موقع پر ایک شخص نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے امداد چاہی تھی اور غالب نے اس کی مدد کی یہ بیان اگرچہ امیر مینائی کے قلم سے نہیں ہے مگر چونکہ انھوں نے خود اپنے شاگرد سے بیان کیا ہے اور امیر مینائی غالب کے ملاقاتیوں اور ہم عہد شخصیتوں میں سے ہیں اس لیے غالبیہ میں اسے شامل کر دیا جائے گا۔ (اکبر علی خاں)

ایک استفسار

آج کل اردو ڈائجسٹ، شاہکار ڈائجسٹ، عارض ڈائجسٹ، شبستان ڈائجسٹ، ہما ڈائجسٹ، حکایات ڈائجسٹ اور اداکار وغیرہ ڈائجسٹ نکل رہے ہیں۔

اصطلاحی معنوں میں DIGEST، ہضم کرنا، ہضم ہونا کو کہتے ہیں در اصل یہ لفظ قدیم رومی قوانین کے مجموعے کا نام تھا جو شہنشاہ جسٹینین کے حکم سے مرتب ہوا تھا۔ ترتیب دینا۔ مدون کرنا مرتب کرنا خلاصہ کرنا کے معنوں میں بھی مستعمل ہو سکتا ہے مگر آج کے روزمرہ کی بول چال کی نسبت میرے خیال میں "نچوڑ" موزوں رہے گا اس کے لیے ہم اردو میں کیا بدل لائیں؟ اگر اس پر ارباب زبان، روشنی ڈالیں تو ممنون ہوں گا۔

(نجم الحسن انجم ادیب)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

میں نے ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے جدیدیت اور ادب سے متعلق سیمینار میں جدید اردو نظم پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ گفتگو بمبئی کے شمارہ ۳ میں مدیر گفتگو سردار جعفری کے قائم کیے ہوئے "خط مستقیم اور خط منحنی کی شاعری" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ سردار جعفری

گئے۔ غریب اردو کا کارواں مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہا ہے اور
اسے بڑی دشوار گزار منزلیں طے کرنی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گرد آلود راستوں پر
نظر رکھنی ضروری ہے تاکہ آئندہ افسوس کے ساتھ یہ نہ کہنا پڑے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(مسعود حسن)

آغا خلش کاشمیری کے مراسلہ کے بارے میں

جناب آغا خلش کاشمیری کا مراسلہ زیر عنوان "الفاظ یا ان کا زائد استعمال"
مطبوعہ ہماری زبان مورخہ یکم فروری ۱۹۶۸ء پیش نظر ہے۔ اس ضمن میں
میں کچھ معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(۱) خلش صاحب نے موضوعِ زیر بحث سے ہٹ کر جو درپردہ چوٹیں
اور ذاتی حملے کئے ہیں اور اپنی دانست میں زورِ قلم کا بہت شاندار
مظاہرہ کیا ہے میں اس کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ ممکن ہے وہ اپنی
مجروح انا کی تسکین کے لیے اس رکیک اور سستی فقرے بازی کا سہارا
لینے پر مجبور رہے ہوں لیکن میں انتقاماً بھی اس نوع کی روش اختیار
نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ؏

آنچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است!

ثبوت کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں میرا پچھلا مراسلہ
ملاحظہ فرمالیا جائے جس میں شروع سے آخر تک گفتگو کا خالص علمی
انداز اختیار کیا گیا ہے اور ذاتی طنز و طعن تو کہیں کوئی حبہ کی
آمیزش بھی نہیں ہے۔

(۲) میں نے خلش صاحب کے مراسلہ نمبر ۲۶ علاوہ دس اغلاط کی
نشان دہی کی تھی ان میں سے ۶ کے بارے میں خلش صاحب
نے جوابی اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن وہ تمام تر آئیں بائیں شائیں کے
باوجود کسی اعتراض کو غلط ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ دس کے بارے
میں انھوں نے خاموشی اختیار کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان
دس غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں کسی مختصر سے مراسلہ میں دس غلطیوں
کا ہونا بھی کچھ کم عبرت انگیز نہیں ہے۔ یہاں ہماری زبان کے قارئین
پر (یاد رہے کہ خود خلش صاحب کے قول کے مطابق ہماری زبان
کے قارئین میں باذوق ہی نہیں، آشنائے فن بھی ہیں) یہ امر بخوبی
واضح ہو گیا کہ یہ صاحب جو تمام نثر نگاروں کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں
اور اس شوق کی پیروی میں طعن و تشنیع، تعصب اور بعد ازیں جو بن پڑے
بے دریغ کام لیتے ہیں، جب خود لکھنے پر آتے ہیں تو مشکل ہی کوئی صحیح جملہ
ان کے قلم سے نکلتا ہے۔

(۳) خلش صاحب اپنے ہر مراسلے میں اس امر کا اعلان ضرور کرتے ہیں کہ اردو
ان کی اکتسابی زبان ہے۔ معلوم نہیں اس امر کی بیجا تشہیر سے ان کا
کیا مقصد ہے اور وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر اس
کا کوئی مطلب نکل سکتا ہے تو یہی کہ اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے

اور اس کے محاورہ و روزمرہ پر آپ نے خاطر خواہ عبور حاصل نہیں
کیا ہے ممکن ہے آپ فارسی عربی کے کچھ الفاظ کے معنی جانتے ہوں، لیکن
آپ یہ نہیں جانتے کہ وہ الفاظ اردو زبان کی تحریر و تقریر میں کس ڈھب سے
استعمال ہوں گے تو پھر کوئی دوسرا کام دیکھئے زبان و ادب کے بہت
سے مختلف شعبے ہیں۔ اپنی ادبی کارگزاریوں کے لیے کسی ایسے شعبے کا انتخاب
کیجئے جو آپ کی صلاحیتوں سے میل کھاتا ہو۔ دوسرے لکھنے والوں کی ٹانگ
گھسیٹتے رہنا کوئی بامعنی مشغلہ نہیں ہے

(۴) خلش صاحب کا مراسلہ زیر نظر بھی اغلاط زبان سے خالی نہیں ہے لیکن
جہاں کٹ حجتی، بے جا ضد اور جاہلانہ نکتہ آرائی سے سابقہ ہو اور
سنجیدہ ماحول میں افہام و تفہیم کی کوئی کوشش نظر نہ آئے وہاں میں خاموش
ہو کر علیحدہ ہو جانا زیادہ پسند کروں گا۔ بقولِ شاعر ؎

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی
تا بے خبر بمیرد در رنجِ خود پرستی

(۵) اس بحث کو ہماری زبان میں چھیڑنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا۔
چنانچہ اس سلسلے میں یہ آخری سطور ہیں جو میرے قلم سے نکل رہی ہیں خلش
صاحب خواہ کچھ لکھیں یا نہ لکھیں، مجھ سے کسی مزید اظہارِ خیال کی توقع
نہ کی جائے حصول اور مقصد قلم فرسائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

(اختر انصاری)

(یہ بحث اب ختم کی جاتی ہے ادارہ)

روزنامہ پیام کا سنہ اشاعت

ہماری زبان مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں اپنے مضمون
"حیدر آباد کے اردو اخبارات" میں طیب انصاری صاحب نے حیدر آباد
کے چند دوسرے اہم اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ پیام کا بھی ذکر کیا
ہے پیام کی اشاعت کے سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۰ء
تک سید اختر قاضی صاحب کی ادارت میں حیدر آباد سے نکلتا رہا۔ اس سلسلے میں
جہاں تک مجھے علم ہے پیام ۹ مئی ۱۹۳۵ء سے ۱ فروری ۱۹۴۷ء تک
قاضی صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طیب صاحب نے
زیادہ مستند ذرائع سے معلومات حاصل کی ہوں۔ اور میری اطلاع اتنی صحیح نہ ہو
اگر موصوف اس سلسلے میں مزید وضاحت فرمادیں تو میری اور قارئین ہماری زبان
کی معلومات میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح قاضی صاحب کی ادارت میں نکلنے
والے روزنامہ "پیام" کے ایام اشاعت کا بھی صحیح صحیح تعین کیا جا سکے گا۔

(محمد علی کاظمی)

تصحیح

ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں نثار احمد صدیقی
کے مراسلہ کے بارے میں، کے مراسلہ نگار کا نام غلطی سے رہ گیا تھا۔
مراسلہ نگار جناب مظہر ہوشیارپوری ہیں۔ (ادارہ)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس کی تیاریاں شروع

پٹنہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی ایک ہنگامی نشست لالہ زار منزل دریاپور میں زیر صدارت جناب غلام سرور منعقد ہوئی جس میں طے پایا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ اردو کانفرنس پٹنہ میں تاریخ ۲۹ ر ۳۰ ر مارچ منعقد ہوگی یہ اردو کانفرنس انجمن اسلامیہ ہال میں ہوگی اس سلسلہ میں مجلس استقبالیہ کی تشکیل بھی زیر عمل میں آئی جس کے صدر جناب شاہ مشتاق احمد، جنرل سکریٹری جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب اور خازن جناب باسط عظیم آبادی صاحب منتخب ہوئے۔ کانفرنس کے لیے چھ ہزار روپے کا بجٹ بھی تیار کرلیا گیا اور کانفرنس کی ابتدائی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ (سنگم)

اردو کی بقا کے لیے اجتماعی جدوجہد اور قربانیوں کی ضرورت

حیدرآباد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اردو ہال حمایت نگر میں اردو دوستوں کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب کوئی قوم اپنی زبان اور اپنے تہذیبی ورثہ کو قائم رکھنے کا فیصلہ کر لے تو کوئی طاقت [illegible] ورثہ کو مٹا نہیں سکتی اردو کا تحفظ اردو والوں کے ہاتھ میں ہے اس کو قائم رکھنے کے لیے اجتماعی عظیم جدوجہد [illegible] ضرورت ہے اگر کوئی قوم اپنی زبان سے دستبردار ہو جائے [illegible] وہ اپنی تہذیب سے دستبردار ہو جاتی ہے جو اس کو عزیز ہے اس ملک میں اردو کا مسئلہ اس لیے معرض بحث میں آگیا ہے کہ سیاست اس میں داخل ہوگئی ہے۔ اگر ہم اس زبان کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرلیں تو زمانہ کے سبب ذرا اس پر اثر انداز نہیں ہوں گے زبان کا مسئلہ [illegible] نظام جب تک حکومتوں کے سپرد رہے انھیں [illegible] ہاتھ میں رہا اور [illegible] بقا اور تحفظ کے لیے قومی اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اس کے لیے رضاکارانہ جدوجہد اور عزم راسخ چاہئے جس قوم میں یہ طاقت رہو کہ وہ اپنی زبان کے تحفظ کے لیے [illegible] لے لے تو دنیا کی کوئی طاقت کوئی دستور اور کوئی آئین اس زبان کی ساخت نہیں [illegible] اس کی بقا کے لیے آپ کو قیمت ادا کرنی ہوگی اگر آپ کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب عزیز ہے تو آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ کے بچے اردو پڑھیں گے چاہے مالی اعتبار سے اس کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ مولانا علی میاں نے اس سلسلہ میں عبرانی زبان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہودی قوم نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زبان کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح سے ہمارے ملک کی آبادی کے ایک بڑے طبقہ نے ناگری رسم الخط کے تحفظ کا فیصلہ کیا تھا جس میں وہ کامیاب رہے۔ یہی حال انگریزی کا ہے اس نے اس ملک میں سو برس گزار دیئے۔ سیاسی رہنماؤں اور علمی شخصیتوں نے اسے اپنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو اس زبان سے غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ مولانا علی میاں نے کہا کہ ایک جمہوری ملک میں اردو پابندی کا مسئلہ کھڑا ہو جائے کیا معنی ہیں۔ جب حب الوطنی کا جذبہ نہ ہو تو زبان کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسے تعمیری جذبہ نہیں کہا جاسکتا۔ اردو کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا؟ وہ ملک جس نے صدیوں تک محبت اور بھائی چارگی کے گیت گائے ملک کے گوشے گوشے میں انسانیت کا پیام پہونچایا اور جس کے خمیر میں اخوت و ہمدردی ہو وہاں علاوہ دیگر زبانوں کا مسئلہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ ایک آزاد ملک میں زبانوں کے تحفظ کا مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہئے خالص لسانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اردو کے بارے میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اگر زبان کے ساتھ تعصب اور جنگ، فرقہ دارانہ جذبات بچوں کی منتھی اور ہوؤں کے احساسات [illegible] تازہ ہوجائیں تو یہ ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے ملک کے لیے یہ ایک بد شگون ہے زبان تو میل ملاپ اور انسان میں لطف و محبت پیدا کرنے اور مذہب کی اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ مولانا [illegible] نے کہا کہ اردو سب کی زبان ہے اور وہ اپنی بیشتر خصوصیات [illegible] شعرا نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ بات ثابت کردی کہ اردو میں اس کے [illegible] صلاحیت موجود ہے۔ اردو بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی سچ پوچھئے تو ہمارے [illegible] اردو کو مسلمانوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں [illegible] آبادی کے کسی حصہ کو [illegible] کیا جائے اور ان کو اس کی زبان اور اس کی تہذیب [illegible] جمہوریت بے معنی ہو کر رہ جائے گی اگر ملک کے چھوٹے سے چھوٹے [illegible] اظہار خیال کی آزادی نہ ملے اور اسے اپنا تہذیبی ورثہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو یہ انسانیت کے لیے ایک دھبہ ہے علی میاں نے کہا کہ اردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے جسے استحقاق کے طور پر دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں نمایاں جگہ ملی ہے خود یہاں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ نے اردو کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے یہ وہ زبان ہے جس نے کئی زبانوں سے استفادہ کیا۔ عربی کا ذخیرہ اس نے سمویا۔ فارسی کی لطافت اس نے اخذ کی، سنسکرت اور انگریزی سے اس نے استفادہ کیا۔ مولانا علی میاں نے اردو کے بہی خواہوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے افکار اور خیالات کو علاقائی زبانوں میں منتقل کریں اردو کے خدمت گزاروں کو اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ قدروں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ صدر جلسہ نواب میر احمد علی خاں نے کہا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے سلسلے میں ایسے خیالات ہیں جیسے کہ اتر پردیش میں ہیں حال ہی میں جو کانفرنس یہاں ہوئی تھی اس کے مندوبین نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اس خطہ میں دو زبانیں لازمی طور پر سکھائی جائیں، سہ لسانی فارمولا تو اردو دشمنی کی خاطر پیش کیا گیا ہے۔ اس فارمولے میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے البتہ دو لسانی فارمولے میں اس زبان کے لیے مواقع نکل آتے ہیں۔ (ترقی اردو)

حلقۂ ادب بھاگلپور کی ماہانہ نشست

حلقۂ ادب بھاگلپور کی ماہانہ نشست ۹ر مارچ کو ایوان ارشاد زیر صدارت

جناب پروفیسر مظفر اقبال صاحب صدر حلقۂ ادب بھاگلپور منعقد ہوئی جس میں دستور ساز کمیٹی کی رپورٹ اور ۱۹۶۹ء میں یوم غالب منانے کی تجویز منظور کی گئی جس غالب منانے کے لیے مندرجہ ذیل احباب پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جناب پروفیسر مظفر اقبال (صدر حلقۂ ادب)، جناب غیاث احمد اثر (نائب صدر)، جناب شاغل قادری (نائب صدر)، جناب پروفیسر لطف الرحمن (نائب صدر)، جناب محی الدین غنی (معتمد عمومی)، جناب نواب ارشاد حسن زیدی (نائب صدر)، جناب کریم اسدی (خازن)، جناب رفیق الزماں، جناب حسن رہبر، جناب شبیر احمد صابری (نائبین)، جناب پروفیسر ڈاکٹر سید احمد حسن، ڈاکٹر محمد یونس (اراکین)، جناب شاہ مشرف عالم، جناب نسیم آروی، جناب تقی شاعر، جناب ارشاد بیں، جناب منیر مجید، جناب فیاض بھاگلپوری (اراکین حلقہ)

آخر میں مندرجہ ذیل حضرات نے اپنی تخلیقات پیش کیں جسے شرکا نے پسند کیا۔

جناب پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر غیاث اثر،
تقی شاعر، نسیم آروی، اکرام انجم، رفیق الزماں،
روح آرا اسیر، حسن رہبر، کریم اسدی، پروفیسر لطف الرحمن
یہ نشست رات کے ۱۱ بجے برخاست ہوئی۔

(رفیق الزماں نائب معتمد)

لسانی اقلیت کے لیے یونیورسٹی سطح تک مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے

حیدرآباد۔ کمیونسٹ قائد جناب مخدوم محی الدین نے قانون ساز کونسل میں ریاستی بجٹ پر عام مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے سہ لسانی فارمولا پر جو دونوں ایوانوں میں منظور شدہ سرکاری زبان قرارداد میں شامل ہے تنقید کی۔ جناب مخدوم محی الدین نے کہا کہ سہ لسانی فارمولا اقلیتوں کے بچوں پر مزید بوجھ ہوگا جنھیں انگریزی، تلگو اور ہندی کے علاوہ ان کی مادری زبان اردو، تامل، کنڑی یا مرہٹی سیکھنا پڑے گا۔ انھوں نے حکومت سے طلبہ کو تمام جماعتوں میں اور یونیورسٹی سطح پر اعلیٰ تعلیم بھی مادری زبان میں دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب مخدوم نے کہا کہ ہندی اور غیر ہندی ریاستوں کے درمیان تلخیاں دور کرنے اور بچوں کو غیر ضروری بوجھ سے محفوظ رکھنے پہلی سے دسویں جماعت تک مادری زبان علاقائی زبان میں تعلیم دینے پہلی سے دسویں جماعت تک لازمی زبان، انگریزی، ہندی، پڑھانے اور آٹھویں جماعت تک ہندی یا کسی اور زبان کو بطور امتیازی زبان پڑھانے کی ضرورت ہے۔ مرکز کی رابطہ زبان ہندی ہونا چاہیے اور ہندی کے اس پوزیشن میں آنے تک انگریزی کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ (ترقی اردو)

حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد۔ مزاح نگاروں کا تیسرا سالانہ اجتماع ۲۴، ۲۵، ۲۶ر فروری کو منعقد ہوا جس میں بیرون آندھرا پردیش سے آئے ہوئے آئی ایس جوہر، رضا نقوی واہی، سلیمان خطیب اور ہلال سیوہاروی نے شرکت کی۔ ۲۴ر فروری کو وزیر آبپاشی جناب سلیم سداریڈی نے فائن آرٹس اکاڈمی کی مطبوعات گھوکرو کے کانٹے (علی صاحب میاں)، اور نشتر و مرہم (رضا نقوی واہی) کی رسم اجرا انجام دی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر مسعود حسین خاں نے کی اور شہریار کادمبری نے علی صاحب میاں اور احسن علی مرزا نے رضا نقوی واہی کی شاعری پر مضامین پڑھے۔ اسلم آزاد نے ڈاکٹر اختر اورینوی کا ایک مضمون سنایا جس میں واہی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے صدارتی تقریر میں کہا کہ دکھنی زبان میں اردو ادب کا قدیم سرمایہ موجود ہے۔ اردو کی تمام اصناف کا گہوارہ دکن ہے۔ انھوں نے علی صاحب میاں کے بارے میں کہا کہ وہ ٹھیٹ دکھنی محاورے اور روزمرہ باتوں میں نیہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ واہی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ معیاری اردو کے شاعر ہیں اور ان کے ہاں کلاسکی رنگ ملتا ہے۔ ۲۵ر فروری کو ادبی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مشہور فلمی اداکار اور مزاح نگار آئی ایس جوہر نے کی اور مجتبیٰ حسین (مار اٹھانے کو ہم رہ گئے)، ڈاکٹروں کے ابھارت چند کھنہ (گھر داماد) رشید قریشی (گھوڑا جوڑا) اور ڈاکٹر عبدالمنان (مار اٹھانے کو ہم رہ گئے) ستاروں کے مصطفیٰ علی بیگ (لنڈرہ راہی بھلا) نے اپنے مضامین سنائے۔ آئی ایس جوہر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ طنز و مزاح کا مقصد یہ ہے کہ اپنے عہد کی بیہودگیوں، سماجی، معاشی اور معاشرتی برائیوں کا خوش سلیقگی کے ساتھ مذاق اڑایا جائے۔ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو صداقت، اصلاح اور تعمیری ادب کا نام دیا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس صنف سے تعلق رکھنے والوں کی سماج میں اہمیت گھٹانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

لطیفہ گوئی میں کل ہند شہرت رکھنے والے میاں صاحب نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ انھوں نے افتتاحی اجلاس میں بیسیوں لطیفے سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا تھا۔

ادبی اجلاس ڈاکٹر رشید موسوی کے شکریہ پر ختم ہوا۔ مزاح نگاروں کے تیسرے سالانہ اجلاس کے آخری دن سائنس میدان میں مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جس میں دس ہزار سے زائد شیدائیان اردو نے شرکت کی۔ مشاعرہ کی صدارت آغا حیدر حسن مرزا نے کی اور اکیس شاعروں نے اپنا کلام سنایا

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ و پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29

Annual Rs. 5/-

per Copy-15 P.

Date

1-8-15-22

جلد ۷، شمارہ ۱۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر

جیسا کہ پچھلی اشاعت میں اعلان کیا جا چکا ہے، ۲۳ مارچ کو شام کے ساڑھے پانچ بجے شریمتی اندرا گاندھی انجمن کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھیں گی۔ اس موقع پر مجلس عام کے ممبروں اور دہلی کے ادبی اور تہذیبی حلقوں کے ممتاز افراد کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

"اردو گھر" انجمن کے ایک پرانے خواب کی تعبیر ہے۔ آزادی سے پہلے انجمن نے نئی دہلی میں ایک پلاٹ حاصل کر لیا تھا، مگر دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے حکومت نے اسے واپس لے لیا۔ آزادی کے بعد ہم نے پھر کوشش کی، اور حکومت سے زمین کے لیے درخواست بھی کی، مگر عرصے تک شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر پروفیسر ہمایوں کبیر کی مدد اور مسٹر دھرم ویر کی اعانت سے جو اس وقت دہلی کے چیف کمشنر تھے، ہمیں حکومت سے رعایتی شرح پر زمین ملی۔ انجمن کے پاس تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ عمارت فنڈ میں موجود ہے مگر اخراجات کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ کیا گیا ہے۔ ہم نے حکومت سے ایک گرانقدر عطیہ کی درخواست کی ہے مگر ہمارا تکیہ دراصل اردو دوستوں پر ہے جن کے لیے موجودہ دور کی مشکلات کے باوجود پانچ چھ لاکھ روپیہ فراہم کرنا مشکل نہ ہونا چاہیے۔ انجمن کا کام اب تک بیشتر حکومت کی امداد سے چلتا رہا ہے مگر ہم اس صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں اور اردو دوستوں کی سرپرستی اور اعانت سے ہی انجمن کے سارے کام چلانا چاہتے ہیں۔ دہلی میں انجمن کی اپنی عمارت کی وجہ سے ایک طرف اردو زبان کی حفاظت کے لیے ہمیں زیادہ کارگر ہونے کا موقع ملے گا، دوسری طرف ہم وہاں طباعت کی سہولتوں کی وجہ سے اس کے ادبی کاموں کو اور بڑھا سکیں گے۔ پھر دہلی اردو کی جنم بھومی ہے۔ یہ اردو کا بڑا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے۔ یہ ہندوستان کا دل ہے۔ انجمن یہاں سے سارے ملک میں اپنے کاموں کی بہتر نگرانی کر سکتی ہے۔

یہ موقع تمام اردو دوستوں کے لیے بڑی مسرت کا ہے۔ ہم محبت اور دوستی کا ایک نقش جمیل بنانا چاہتے ہیں اور زبان و ادب کے تمام شیدائیوں اور تہذیب اور انسانیت کے تمام علمبرداروں سے اس کام میں تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ درخواست صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی ؎

بجا کہ نقیر دل کا ہم عکس عالت\
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

پٹنہ میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کی تیاریاں مکمل

پٹنہ ۱۸ مارچ جناب غلام سرور صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے بہار کے تمام اردو دوستوں، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تمام ضلعی شاخوں، ریاستی انجمن کے منتخب کردہ تمام کانسلروں اور انجمن کے مجلس عاملہ اور کونسل کے تمام ممبروں کے نام ذیل کی اپیل کی ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو پٹنہ میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوگا۔ یہ کانفرنس انجمن اسلامیہ ہال مرار پور کے سامنے وسیع و عریض کھلے میدان میں ہوگی۔ آج ہماری اردو تحریک جس موڑ پر پہونچ چکی ہے اس کے پیش نظر یہ کانفرنس ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہندوستان کے محبان اردو سر جوڑ کر بیٹھیں اور آئندہ کے فیصلہ کن اقدام باہم مل کر طے کریں۔ اس کانفرنس میں یو۔ پی۔، حیدرآباد، دلی، علی گڑھ، لکھنؤ، کلکتہ، غرض پورے آسنسول اور بہار کے کونے کونے سے محبان زبان و ادب شرکت فرما رہے ہیں۔ کانفرنس کی تیاریاں شباب پر ہیں۔ اسے کامیاب بنانا ہر اردو دوست کا فرض ہے۔ آپ سب سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اراکین مجلس استقبالیہ سے تعاون کر کے اسے کامیاب بنائیں۔ کانفرنس کے لیے مبلغ چھ ہزار روپیہ کا بجٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ مجلس استقبالیہ کی فیس صرف پانچ روپیہ رکھی گئی ہے۔ ہر اردو دوست سے مجلس استقبالیہ کا ممبر بننے کی درخواست کرتا ہوں۔ نیز اہل ثروت حضرات سے خصوصی عطیات مرحمت فرمانے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہر مقامی شاخ کا کوٹہ صرف دس روپیہ مقرر کیا گیا ہے اور ضلعی شاخوں کا کوٹہ پچاس روپیہ۔ تمام ضلعی اور مقامی شاخوں سے ہماری اپیل ہے کہ بلا تاخیر اپنی رقم ہمیں روانہ فرمائیں۔ ریاستی انجمن کی کونسل کے لیے جو ممبران منتخب کئے جا چکے ہیں انجمن کے ضابطہ کی رو سے انہیں فی روپیہ سالانہ کی فیس رکنیت ادا کرنی ہوگی۔ کانفرنس اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور ہر شعبۂ حیات کے اور ریاست کے ہر حصہ سے اردو دوست اس کانفرنس میں شریک ہوں۔

ایک ہندوستانی اخبار کو اعزاز

نیویارک۔ مدراس سے ۹۰ سال سے نکلنے والا انگریزی روزنامہ ہندو کو ۱۹۶۸ء کا اعلیٰ صحافتی خدمات انجام دینے کے عالمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے یہ ایوارڈ ہر سال امریکی نیوز پیپر پبلشرز کی ایسوسی ایشن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

گورکی کے غیر مطبوعہ مخطوطات

ماسکو میکسیم گورکی آرکائیوز، سوویت یونین کے اس عظیم ادیب کی سو سالہ سالگرہ کی تقریب کے سلسلہ میں گورکی کے کئی غیر مطبوعہ مخطوطات کی اشاعت کرے گا طباعت کے لیے دی جانے والی کتابوں میں، گورکی کے غیر مطبوعہ مخطوطات کی ۱۲ویں جلد ہے جس کے مخطوطات کا زمانہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء ہے اس کے علاوہ "اپنے بیٹے کے نام گورکی کے خطوط" ہے۔ (تاس)

مبادیات تحقیق

نوجوان محققوں کی رہنمائی کے لیے اردو کی مبادیات تحقیق ادبی پبلشرز نے شائع کیا ہے اس کتاب میں مولف نے عالمانہ بحث کے بجائے عملی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب نئے محققین کے لیے بہت زیادہ کارآمد ہے اور ادبی پبلشرز ۸۔ شیفرڈ روڈ بمبئی ۸ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار کا اجراء

حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اخبار "ترجمان حیات" جاری کیا جا رہا ہے۔ جو اس ماہ کے آخری ہفتہ میں منظر عام پر آئے گا۔ یہ اخبار عوامی مسائل کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھے گا۔ یہ اخبار ذیل کے پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۲۲۷-۸-۳۶۰۔ پرانی حویلی حیدرآباد - ۲

اردو زبان

حاصل حسینی غازیپوری

سوز و گداز، لطف و نزاکت لئے ہوئے
شوخی حسن و عشق کی فطرت لئے ہوئے
اردو ہے ارتباط محبت لئے ہوئے
یہ اتحاد قوم کی عزت ہے دوستو
اس میں خلوص اور اخوت ہے دوستو
یہ میر کی نزاکتِ گفتار کی زبان
سودا و سوز و درد کے اسرار کی زبان
شاہ نصیر و ذوق سخندار کی زبان
غالب کی بادہ نوشی ہے مومن کی آرزو
اس میں ہے داغ و سائل و بیخود کی گفتگو
ہیں شاد کی مسرتیں حسرت کی حسرتیں
حالی کی وسعتیں ہیں و شبلی کی رفعتیں
دیکھو زبان اردو میں کیا کیا ہیں لذتیں
اقبال کا ہے "شکوہ" عبادت سے کم نہیں
سید کا "کفر" روح شریعت سے کم نہیں
یہ ہے نہال چند کی سرشار کی زبان
مستی پریم چند کے افکار کی زبان
یعنی دیا نسیم کے اشعار کی زبان
حکمت اور ملک کی پیاری زبان ہے
سب لوگ کہہ رہے ہیں ہماری زبان ہے
پھولی ہے اس سے ہند میں تہذیب کی بہار
سیکھے ہیں اس کے سائے میں ہم سب نے علم و فن
حاصل ہے اس کے فیض سے آزادیِ وطن
ناموس ملک و قوم ہے بھارت کی شان ہے
ہر اک زبان کا رس لیے اردو زبان ہے

ادیبوں کی کانگریس

ایران کے تمام ادیبوں کی ایک کانگریس ۱۹۶۸ء میں منعقد ہو رہی ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانگریس ہوگی جو ایران میں طلب کی گئی ہے اس اہم اور نمائندہ کانگریس کا افتتاح ایران کی ملکہ فرح پہلوی کریں گی کانگریس کی تیاریاں شروع کی جا چکی ہیں

غالب کے کلام کا بنگلہ میں ترجمہ

کلکتہ۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صد سالہ جشن غالب کے سلسلہ میں غالب کے کلام کو بنگلہ میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بنگلہ اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جس نے انتخاب و ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے اس ترجمہ میں اصل متن بھی دیا جائے گا اور غالب کے سوانح اور ان کے فکر و فن پر تفصیلی مقدمہ شامل ہوگا۔

مولوی خدا بخش کے کتب خانہ کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دئے جانے کا بل

نئی دہلی۔ مرکزی وزارت تعلیم کے وزیر ریاست پروفیسر شیر سنگھ نے لوک سبھا میں ایک بل پیش کیا ہے جس کا مقصد خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دینا ہے۔ مولوی خدا بخش خاں کا یہ کتب خانہ عربی اور فارسی کی نایاب قلمی کتابوں کا خزانہ ہے مولوی صاحب نے اپنی عمر بھر کے سارے سرمائے کو عوام اور اہل علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔

"بوئے گل" کی اشاعت

"بوئے گل" اردو کی ان منظومات کا مجموعہ ہے جس میں اردو شعرا نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس مجموعہ کے مرتب ایک نوجوان شاعر سید مظفر علی ایم اے ہیں اور مکتبہ نار برانچ ٹیلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

حنیف نقوی

نکات الشعرا کی ایک اور روایت کے سلسلے میں

دلّی کالج میگزین کے میر نمبر (۱۹۶۲ء) میں نکات الشعرا کی ایک اور روایت کے عنوان سے جناب نثار احمد فاروقی نے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جس میں ایک مجہول الحال تذکرے کے چند منتشر اوراق کو نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میر کے اجزائے پریشاں قرار دے کر ان کے محتویات و مشتملات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اوراق مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سر سلیمان کلکشن کے ایک کشکول "متفرقات" میں منسلک ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا خیال ہے کہ ان اوراق کا تعلق نکات الشعرا کے ایک قدیم نسخے سے ہے اور اس تذکرے کا مسودۂ اول یا نقشِ اوّل ملخص یا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ اسی خیال کی بنیاد پر موصوف نے آب حیات کا تنقیدی مطالعہ کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے مندرجات سے کچھ نتائج بھی اخذ کئے ہیں لیکن یہ ثابت کرنے کی ضرورت کہ ان کا تعلق واقعی میر کے تذکرے سے ہے، نہ فاروقی صاحب نے محسوس کی ہے اور نہ رضوی صاحب نے۔ پیش نظر سطور میں ہمارا موضوع بحث یہی بنیادی اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

تذکرہ اوراق کی کل تعداد پچیس ہے۔ بحالت موجودہ یہ غیر مسلسل بھی اور غیر مرتب بھی۔ مجموعی طور پر ان میں پچپن شاعروں کے حالات و اشعار منقول ہیں۔ ان میں سے علام احمد احمد (احسن الدین خاں) بیاں، جودت (؟) غلام مصطفیٰ خاں دل، مہربان خاں رند، محمد رضا رضا، سید علی سید، فتح علی شیدا، عیسیٰ (؟)، غلام محی الدین غلامی، مرزا قدری لاہوری، قاسم علی قاسم، شاہ قلندر، مرتضیٰ خاں مرتضیٰ (قمر الدین) منت اور امیر عسکری (نالاں) کے تراجم اور دوسرے کئی شعرا کے بیشتر اشعار نکات الشعرا میں موجود ہیں۔ میر محمدی بیدار، قوت اور دلّی کے اشعار باقی ہیں لیکن عبارتی حصّے ضائع ہو چکے ہیں۔ بعض شعرا کے حالات لفظاً بہ لفظاً میر صاحب کی تحریر کے مطابق ہیں اور بعض جگہ معمولی ترمیم یا تلخیص کی صورت نظر آتی ہے جب کہ بعض مقامات پر عبارات میں اس حد تک تغیر ہوا ہے کہ میر صاحب کے معروف بیانات اور مخصوص جملوں کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ ایک شاعر کی نسبت جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے دوسری جگہ اس کے بارے میں کچھ اور کہہ کر وہ تمام باتیں کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تمام ظاہری و معنوی اختلافات کو یکسر نظر انداز کر کے محض چند شعرا کے اشتراک اور ان سے متعلق عبارتی تحریروں کی کلی یا جزوی مطابقت کی بنا پر یہ فرض کر لینا کہ یہ اوراق نکات الشعرا کے کسی قدیم تر نسخے کے باقیات ہیں آدابِ تحقیق کے منافی ہی نہیں، بے معنی بھی ہے۔

جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ یہ اوراق نکات الشعرا کے نقشِ اوّل یا کسی قدیم تر نسخے کا حصّہ ہیں اور اس تذکرے کا جو نسخہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس اصل یا قدیم نسخے کا ملخص یا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے، اس قسم کے کسی بھی دعوے کو پورے وثوق کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور غور طلب ہیں۔

(الف) نکات الشعرا میں میر سوز کا ذکر میر تخلص کے تحت اور ان اوراق میں سوز تخلص کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ سوز نے موجودہ تخلص اپنے سابقہ تخلص میر سے (میر صاحب کے حق میں) دستبرداری کے بعد اختیار کیا تھا۔ معاصرین کے بیانات سے قطع نظر ان کا یہ مقطع بھی تبدیلی کی اس نوعیت کی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے نیاز ہم — اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

(ب) تذکرہ میر کے متداول نسخے میں میر قمر الدین منت کے حالات شامل نہیں لیکن ان اوراق میں ان کا ذکر موجود ہے، اور انھیں نواب وزیر عماد الملک کا ملازم بتایا گیا ہے۔ میر نظام الدین ممنون (فرزند منت) کی روایت کے مطابق منت کا سال ولادت ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) ہے اور ان اوراق میں ان کے تعارف کی تحویلیت کے وقت ان کی عمر کسی طرح انیس بیس سال سے کم نہ ہوگی جب کہ نکات الشعرا کا موجودہ نسخہ ان کی پیدائش کے صرف سات برس بعد ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا ہے، اس لیے ان اوراق میں ان سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بلاشبہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے کئی برس بعد کی تحریر ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی اور جناب نثار احمد فاروقی کے بیانات کی دوسری اہم ترین شق یہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کے نتائج قلم ہیں۔ ہماری نظر میں پہلی رائے کی طرح یہ فیصلہ بھی ناقابلِ قبول ہے کیونکہ ان اوراق کے مندرجات میں بکثرت ایسے قرائن و شواہد موجود ہیں جن کی روشنی میں اضافہ و حذف اور ترمیم و تغیر کے اس عمل میں میر صاحب کے قلم کا دخل حد درجہ بعید از امکان معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر۔

(الف) جعفر زٹلی (کذا) کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے۔

"مرد حق شناس مائل بہ ہزل بود۔ بندہ با او یک ملاقات کردہ ام۔ شعر ہزل خودمی خواند و مردماں را محظوظ می آورد و خودمی خندید۔ گاہ گاہے تبسمے می کرد۔ وطنش شاہجہاں آباد است"

نکات الشعرا میں جعفر کے متعلق میر صاحب کا بیان اس سے بالکل مختلف ہے اور یہ تمام باتیں جو یہاں جعفر کی طرف منسوب ہیں وہاں محمد شاکر ناجی کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ اس اختلاف کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ میر صاحب نے جعفر کے نمونۂ کلام میں اردو کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے جو عالمگیر کے پسر چہارم محمد اعظم شاہ کی ہجو سے تعلق رکھتا ہے، اور انتہائی فحش ہے جبکہ ان اوراق میں ان کے نام سے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ بالعموم اس قسم کے ہیں ؎

طرفہ عالم ہے بتاں سخت گرفتاری ہے
پوچھتا کوئی نہیں کیا تجھے بیماری ہے
لیک تب آن کے ہاتف نے کہا جعفر
شاد ہو وصل کی کچھ ان دنوں تیاری ہے

قطع نظر اس سے کہ بظاہر یہ اشعار زٹلی کی بجائے کسی اور ہی جعفر کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں، یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں کہ ایک تذکرہ نگار جسے ایک

---

[1] دیکھیں مخطوطی تعلیقی مسرورۂ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال ورق ۱۸۴ ب

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۴۲

جائے اور پورے کلام بطور نمونہ پیش کرنے میں کوئی باک نہ رہا ہو، دوسری جگہ صرف ایسے اشعار کے انتخاب پر اکتفا کرے جو کسی طرح شاعر کے غالب رجحانِ طبیعت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

(ب) سید عبدالولی عزلت کو ان اوراق میں مرزا مظہر جانجاناں کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ بیان خلافِ واقعہ ہے اور چونکہ میر صاحب عزلت سے ذاتی طور پر واقف تھے اس لئے اس قسم کی غلط بیانی ان کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کی جا سکتی۔

(ج) سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ان اوراق کے مرتب کا بیان ہے کہ "ابتدائے جوانی در شاہجہان آباد آمدہ، چنانچہ مشق سخن ریختہ در اینجا می کرد" سراج (۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء تا ۱۱۷۷ھ/۶۴-۱۷۶۳ء) میر صاحب کے ہم عصر تھے اور دہلی میں ان کے ورود اور مشق سخن کے متعلق اس بیان کے علاوہ کوئی وقیع یا غیر وقیع شہادت موجود نہیں اس لیے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ جملے میر صاحب کے قلم سے نکلے ہوں گے، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ مذکورہ شاعر نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر تک ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ نکات اول اڈیشن کی ترتیب کے وقت یعنی سراج کی وفات سے بارہ سال قبل تک وہ دائمی طور پر ان سے تعارفاً ناواقف تھے۔ سراج جیسے شاعر کا دہلی آنا اور میر صاحب کا ان کے ورود سے عرصہ دراز تک بے خبر رہنا بظاہر بعید از قیاس ہے۔

(د) انعام اللہ خاں یقین کا تعارف ان الفاظ پر مشتمل ہے

"انعام اللہ خاں یقین تخلص پسرِ اظہر الدین خاں اولاد حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبیرۂ حضرت استاد الانسان، محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ (عروۃ الوثقیٰ) شاگرد مرزا مظہر جانجاناں، خوش خلق و خوش خوے، گرم جوش و یار باش، شگفتہ روے، جوش بہار گلشن سخن، عندلیب خوش نوائے چمن ایں فن۔ زبانِ گفتگویش گرہ کشائے زلف تمام مدعا، مصرع لو ممتاز است بر صفحہ کاغذ ار کاکل صبح خوش نما، طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستان انداز است گاہے در کوچہ باغ تلاش بطریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن بندی شعر خوش (لفظ) رنگین چمن (چمن) رنگین خیال اور گل معنی دامن دامن شاعر زور آور ریختہ، در کمالِ علاقگی دارسند، مواضع آشنائے درست بندہ اکثر ملاقات کردم فقیر را اخلاص دلی است ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و فکر شعر کردن کہ در عہد عالم گیر بادشاہ باشد انعقاد کند۔"

یہاں اس بات کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ معنوی اعتبار سے یہ تعارف میر صاحب کے بیانات سے کس قدر مختلف ہے اور دونوں تحریروں میں کس حد تک تضاد پایا جاتا ہے لیکن اس واقعہ کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس اقتباس میں "خوش خلق" سے "شگفتہ روے" تک جن اوصاف کا ذکر آیا ہے نکات الشعرا میں وہ یقین کی بجائے مرزا رفیع سودا کی شخصیت سے منسوب ہیں اور ان اوراق میں بھی ان کے ترجمۂ احوال سے خارج نہیں کئے گئے ہیں، باقی عبارت کا بیشتر حصہ "جوش بہار۔۔۔۔ تا۔۔۔۔ آشنائے درست" میر صاحب کے بیان خواجہ میر درد سے متعلق ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان اوراق میں یقین سے قبل خواجہ صاحب کا تعارف بھی (میر صاحب کے بیانات کے دوسرے حصوں کو حذف کرتے ہوئے) بعینہ انہیں الفاظ میں سپردِ قلم کیا جا چکا ہے اور "جوش بہار" سے "چمنستان انداز" تک کے تمام جملے مرزا رفیع سودا کے ذکر میں بھی شامل ہیں۔

(ہ) نکات الشعرا میں [1] (اور ان اوراق میں بھی) احسن اللہ احسن کی یہ شاعرانہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود" مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے اسی مفہوم کو قدرے وضاحت کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نشد کہ خالی از ایہام باشد در ایں صنعت دستگاہ تمام داشت" [2] "مبتلا" ہمارے علم کی حد تک وہ تنہا تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے احسن کے دیوان کا مطالعہ کیا ہے اور جن کے یہاں ان کے کلام کا سب سے مفصل اور جامع انتخاب ملتا ہے اس لئے ان کی اس رائے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بہرصورت ان اوراق میں احسن کے نام سے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک مشہور اور زبان زد شعر (یہی مضمون خط سے احسن اللہ، کہ حسنِ خوب رویاں عارضی ہے) کے علاوہ کسی شعر میں اس صنعت کے التزام کا شائبہ تک نہیں گزرتا بلکہ پوری غزل اس قسم کی تمام رعایتوں سے کلیتہً مبرا ہے ؎

نہ خلوت نہ جلوت کے ہم یار ٹھہرے	فقط دیکھنے کے گنہگار ٹھہرے
رہ مشکل ہے راہ محبت کہ جس میں	نہ کافر ہی ٹھہرے نہ دیندار ٹھہرے
نہ دیکھا کبھی دل کو آباد ہم نے	تم اس گھر میں جس دل سے مختار ٹھہرے
نہیں ہوتی دل کی دیر و حرم میں	ترے در پہ ہم اپنے ناچار ٹھہرے
صبا بوئے گل تو نے پہنچائی سب کو	ہمیں تیرے گلشن میں اک خار ٹھہرے
جہاں تک کہ قوت ہے دل کی اپنا	ہم ان سب سے تیس سزاوار ٹھہرے

احسن کے رنگ سخن سے واقفیت رکھنے والے اصحاب دو ہی ایک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار ان کی تصنیف نہیں ہو سکتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ غزل ایک دوسرے شاعر مرزا احسن علی احسن لکھنوی کی تصنیف [3] ہے جو میر ضیا اور مرزا سودا کے شاگرد تھے اور بہ اعتبار زمانہ احسن اللہ احسن کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(و) مندرجہ ذیل مطلع ان اوراق میں جان آرزو سے منسوب ہے ؎

ابر زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے	در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

میر صاحب نے اسے خان آرزو کی بجائے مرزا معز فطرت کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جہاں تک اس قسم کے معاملات کا تعلق ہے، آرزو سے قرابت قریبہ کی بنا پر ان کی دو تحریروں میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

یکساں خیالات کی تکرار ہم الفاظ عبارتوں اور جملوں کے اعادے، خلاف واقعہ بیانات کی موجودگی، شاعر کے جانے پہچانے رنگ سخن کی تمیز سے محرومی اور اشعار کے غلط انتساب کی ان شہادتوں کے بعد بھی اگر بعض ناقابل لحاظ حقیقتوں

(باقی صفحہ ۸ پر)

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی صفحہ ۲۲
[2] گلشن سخن شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) ص ۲۵
[3] خوش معرکۂ زیبا مؤلفہ سعادت خاں ناصر لکھنوی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ورق ۲ الف
[4] نمونۂ نکات الشعرا، صفحہ ۱۵۵

محمد علی کاظمی

قاضی عبدالغفار اور ان کا ابتدائی دورِ صحافت

مجھے قاضی صاحب کے ایک مضمون کا مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مضمون بغیر کسی عنوان کے اور نامکمل صورت میں ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے اخباری دنیا سے اپنی ابتدائی دلچسپی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے

"... . اسکول کا زمانہ تھا دسویں جماعت کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اس زمانے میں میرے گھر سے ملا ہوا نیر اعظم کا دفتر تھا مولوی احمد علی صاحب بانیٔ اخبار کا انتقال ہو چکا تھا ان کے چھوٹے بھائی سید ابن علی صاحب اخبار چلا رہے تھے بڑے بھائی صاحب سے صرف اتنا ہی واقف تھا کہ صبح کو جب اسکول جاتا تھا وہاں کو اکثر چبوترہ پر ایک حقہ سامنے رکھے بیٹھے دیکھتا تھا ایک پڑوسی کی حیثیت سے آشنا ہی ہوتا تھا کہ یہ صاحب اخبار [illegible] والے ہیں ... . بڑے بھائی کے بعد جب سید ابن علی صاحب نے اخبار کو سنبھالا تو ان کے دفتر میں اکثر فرصت کے اوقات گزرنے لگے . . . . . ."

نیر اعظم اخبار جس کا ذکر قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے اپنے وقت میں مراد آباد کا خاصا مشہور اور مقبول اخبار تھا اس زمانے کے اور اکثر بعد کے اخبار و رسائل میں نیر اعظم کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً رسالہ مرقع لکھنؤ نے اپنی فروری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں نیر اعظم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

". . . . . . . یہ وہ قدیم اخبار ہے جس نے اپنی عمر کے پچاس سال بڑے لطف و خوبی اور شہرت و ناموری سے ختم کر کے اکیاونویں سال میں قدم بڑھایا ہے .... معیار کے اعتبار سے بھی قابلِ تعریف ہے . . . ہمیشہ مسلمانوں کا ہمدرد اور ان کی ترقی و فلاح و بہبود کا خواہاں رہا . . . ."

داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری نے بھی اس دور کے چند دوسرے اہم اخباروں کے ساتھ نیر اعظم کا ذکر کیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ

". . . . . . البشیر اٹاوہ، نیر اعظم مراد آباد، ہندوستانی لکھنؤ، رہبر دکن . . . . وغیرہ اپنے اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی سیادت زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر کی . . . ."[1]

پرانے اخبار و رسائل کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ شہر مراد آباد اخباری لحاظ سے کافی زرخیز رہا ہے۔ نیر اعظم کا ایک دوسرا ہم عصر اخبار 'مخبر عالم' بھی تھا۔ یہ بھی اپنے وقت اور اپنے حلقے کا خاصا مقبول اور معروف اخبار تھا اس کے علاوہ بھی مراد آباد کی سرزمین سے برابر اخبار نکلتے رہے ہیں جن میں منصف، کہ دبنہ، رہنما مسافر، جدت، جوہر خاصے پرانے اور اپنے حلقے میں خاصے مقبول پرچے تھے۔

ان اخبارات کے ذکر سے ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ مراد آباد کے متیر حضرات کو اخباری دنیا سے عملی طور پر دلچسپی رہی ہے۔ اور صحافت کا ذوق و شوق اور اس کا چرچا وہاں کے ماحول میں کافی رہا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے بھی اس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی۔ خود قاضی صاحب کے بقول انھیں بچپن ہی سے اپنے پڑوسی ابن علی صاحب کے توسل سے اخباری دنیا سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب اپنے متذکرہ بالا مضمون میں اپنے اس زمانے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں۔

". . . . . اسکول سے واپس آ کر میں بھی . . . . دو تین گھنٹے روزانہ مولوی صاحب کے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا علاوہ خطوط، ایڈیٹوریل اور ڈکل لکھنے اور کاپی کی صحت کرنے کے کبھی کبھی یتے کی چٹیں بھی لکھنی ہوتی تھیں میرے لیے اس زمانے میں اخبار نویسی بہت دلچسپ چیز تھی اور مضمون نویسی کے جراثیم میرے اندر پیدا ہو چلے تھے . . . ."

شہریار

غزل

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے ماحصول ہے

راتوں [illegible] کی [illegible]
خوابوں میں اس [illegible] کیسی [illegible] ہے

ہے اس کے دم قدم سے ہی کچھ آبروئے ریت
دامن میں جس کے دشتِ تمنا کی دھول ہے

سورج کا قہر صرف برہنہ سروں پہ ہے
پوچھو ہوس پرست سے وہ کیوں ملول ہے؟

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی طرح سے لڑنا فضول ہے

[1] داستان تاریخ اردو۔ از حامد حسن قادری۔ [illegible]

خود قاضی صاحب کی اس تحریر کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ "نیر اعظم" اخبار کا پرچہ اس کے ایڈیٹر ابن علی صاحب سے قاضی صاحب کی دوستی اور قاضی صاحب کا ایڈیٹر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا قاضی صاحب کا اخباری دنیا سے تعارف کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور یہیں سے انھیں اخباری دنیا سے دلچسپی ہوئی۔ اور ان کی مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔ اب یہ حسنِ اتفاق ہے کہ قاضی صاحب کی اس ابتدائی دلچسپی کو آگے چل کر ایک وسیع زمین مل گیا اور آئندہ زندگی میں ان کی یہ ابتدائی اور اتفاقیہ دلچسپی ہی ان کی زندگی کا ایک اہم مقصد اور ان کے لیے وجہ امتیاز بن گئی۔

سماجی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے قاضی صاحب کی عہدِ طفلی اور اس کے بعد کا زمانہ خاصا نشیب و فراز کا زمانہ تھا۔ ایک نوجوان، حساس، اور بیدار مغز ذہن کے لیے یہ دور اپنے میں خاصی دلچسپی اور دردمندی کا سامان رکھتا تھا۔ مراد آباد سے ہائی اسکول کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں قاضی صاحب مزید تعلیم کی غرض سے علی گڑھ چلے آئے تھے۔ لیکن ایف اے میں دو سال متواتر فیل ہونے کی بنا پر ان کے والد قاضی ابرار احمد نے انھیں علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اور کوشش کرکے محکمہ جنگلات میں انھیں سرکاری نوکری دلا دی۔ ۱۹۰۸ء میں قاضی صاحب نے علی گڑھ چھوڑا۔ اور اسی سال ملازمت کے بکھیڑے میں پڑ گئے۔

۱۹۱۲ء میں علی برادران کو کچھ ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو کامریڈ اخبار کے کلکتہ سے دلی منتقل ہونے پر برادران کے نئے نکلنے والے اخبار 'ہمدرد' میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اس تلاش و جستجو میں علی برادران میر محفوظ علی بدایونی کے علاوہ دوسرے حضرات سے بھی [illegible] اور لوگوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔ میر محفوظ علی بدایونی کی تحریک پر قاضی صاحب کا نام بھی زیر بحث آیا۔ اور آخر کار انھیں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر دلی لایا گیا۔ جہاں علی برادران کے اخبارات 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' کے سایہ میں باقاعدہ قاضی صاحب کے صحافیانہ شعور کو پنپنے کا موقع ملا۔

علی برادران کی صحبتوں کے ساتھ ساتھ انھیں حضرات کے توسل سے قاضی صاحب کو حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابرانِ وقت سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی یہ دو حضرات تھے جن کی صحافت اور جن کے خیالات کا اثر بقول آل احمد سرور ملک کی صحافتی زندگی ہی پر نہیں بلکہ اس کی ذہنی زندگی پر بھی پڑا۔

مولانا محمد علی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر قاضی صاحب نے اپنی ایک نشری تقریر میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

"...... موسم سرما۔ اور وہ بھی دلی کا موسم سرما۔ اور وقت صبح صبح پانچ بجے۔ شوکت بھائی چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے مستعفی دلا کر یہاں لے آئے تھے۔ اب دسمبر ۱۹۱۲ء کی اس صبح کو (۵ بجے)، کلکتے کی سکونت ترک کرکے محمد علی پہلی دفعہ دلی آرہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ اور میں پیدل کوچے سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا۔ اس وقت کوئی تانگہ میسر نہ آیا اس لیے ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ بھاگتے بھاگتے طے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر (۲۲) سال سے زیادہ نہ تھی۔ کامریڈ والے محمد علی سے اس قدر قریب آنے کا شوق میری جوانی کو بے تاب کر رہا تھا۔ اور دلی ریلوے اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری زندگی کا باب شروع کر رہی تھی"[1]

اور جب ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء کو 'ہمدرد'، نقیب ہمدرد' کے نام سے جاری ہوا تو

"میر محفوظ علی منیجر تھے سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سید جالب دہلوی، مولوی عبدالحلیم شررؔ، بارق صاحب رواں بھی، 'ہمدرد' کے دفتر میں موجود تھے۔"[2]

اس طرح قاضی صاحب کے صحافیانہ شعور کی پرورش اور نشوونما ایک ایسے تجربہ کار شخص کی صحبت اور رہنمائی میں ہوئی جس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے

"سیاسی ذہانت اور تربیت محمد علی کے ساتھ رہ کر جتنی حاصل ہو چلی تھی وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیاتِ ہندی سے نہیں، سیاسیاتِ عالم سے بھی۔"[3]

اس زمانے میں مولانا محمد علی کی صحبتوں سے فیضان کا ذکر اور اس کا اعتراف خود قاضی صاحب نے بھی کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی کے موقع پر قاضی صاحب نے 'پانچ سال بعد' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے اس زمانے کی [illegible] کی صحبتوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میری زندگی میں وہ ایک یادگار صبح تھی یعنی وہ پہلا دن تھا جب بحیثیت استاد و شاگرد میرے اور محمد علی صاحب کے مستقل تعلقات شروع ہوئے ... میں اس زمانے کو نہیں بھول سکتا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح دس بجے تمام ممبران اسٹاف اخبار کے متعلق مشورہ میں شریک ہوتے تھے۔ شوکت علی، محمد علی، سید محفوظ علی، راجہ غلام حسین مرحوم، میں، اور [illegible] اور ہم سب زیر بحث مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔"[4]

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

---

۱ مشاہیر ہند مولانا محمد علی تقریر قاضی عبدالغفار بحوالہ اخبار حریت، مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۴ء

۲ سیرت محمد علی مرتبہ رئیس احمد جعفری

۳ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ از عبدالماجد دریابادی۔

۴ پانچ سال بعد قاضی عبدالغفار، نقیب ہمدرد ۱۹۲۰ء بحوالہ حریت دہلی [illegible] ۱۹۴۴ء

مراسلات

"ہماری زبان" میں حصۂ نظم

"ہماری زبان" میں نئی تبدیلیاں خوشگوار ہیں لیکن ایک کمی مجھے ہی نہیں اکثر اہلِ ذوق کو گراں گزر رہی ہے اور وہ ہے "حصۂ نظم" کا برائے نام رہ جانا۔ ویسے ہی ہماری زبان میں ایک ہی صفحہ حصۂ نظم کے لیے وقف تھا!

(۱) کیا حصۂ نظم، نثر سے کم اہمیت رکھتا ہے؟

(۲) کیا کوئی اہلِ ذوق حصۂ نظم کی افادیت سے منحرف ہو سکتا ہے؟

(۳) کیا حصۂ نظم ناظرین "ہماری زبان" کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے؟

اگر ایسا ہے تو پھر ایک نظم اور ایک غزل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ ورنہ ایک صفحہ تو کم از کم حصۂ نظم کے لیے وقف ہونا ہی چاہیے کیا ناظرین "ہماری زبان" میرے خیال کی تائید فرمائیں گے؟ (میر عرفانی سرونج)

انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات کے بارے میں

(۱)

انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات کے سلسلے میں درج ذیل خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں

اردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کے مترادفات کے تعین سے پہلے ضروری ہے کہ یہ بات خاطر نشان کر لی جائے کہ اصلاً لفظ کی فطرت میں اپنے معنی سے متعلق کوئی اشارہ پوشیدہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بار وضع ہونے کے بعد (یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ الفاظ کیسے وضع کر لیے جاتے ہیں یا وضع ہو جاتے ہیں) اس کا استعمال معنی کا تعین کرتا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر لفظ اپنے پیچھے روایت اور رواج کی پوری تاریخ رکھتا ہے۔ روایت کی یہ قوت ہی ہر لفظ کو یہ اثر بخشتی ہے کہ اس کے سننے کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں ایک خاص معنوی پیکر ابھر آتا ہے۔ پھر اپنے حقیقی (لغوی) معنی کے علاوہ لفظ کے مجازی استعمال سے اس کے اور اور معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سے لفظ کے معانی میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات بھی مسلم ہے کہ انسانی خیال ماحول کے تابع ہوتا ہے اور اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے ہی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی بھی زبان میں صرف وہی لفظ پائے جاتے ہیں جو اس کے مخصوص معاشرہ کے تقاضوں اور اس کے رسم و رواج کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں اور اسی لیے ضروری نہیں کہ ہر زبان میں دوسری زبانوں کے مترادفات بعینہٖ مل جائیں۔ جب کبھی ایسی ضرورت درپیش آتی ہے تو یہی دونوں مسلمات کارفرما ہوتے ہیں شروع میں شاید کوئی لفظ معنی کی وہ کیفیت پیدا نہ کر سکے مگر جب اسی خاص معنی میں اس کا رواج ہوتا ہے تو لفظ و معنی میں خود بخود یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت ہی ہمیں اس طرح کی پریشانی ہوتی ہے۔ ورنہ خود اپنی زبان پر نظر ڈالیے تو معانی کا ایک جہان نظر آتا ہے اور اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا جاتا کہ کوئی لفظ کیوں اور کیسے ایک خاص معنی کا حامل ہے۔ مثال کے لیے ایک معمولی لفظ "نقل" لیجیے۔ اس کے خود متعدد معانی ہیں:

(۱) ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا (۲) نمونہ اتارنا (۳) نمونہ (۴) لطیفہ (۵) کہانی (۶) سوانگ (۷) محلِ استعمال ہی ان مختلف معانی میں سے کسی ایک کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس کے مشتقات کے ساتھ جو خاص معنی وابستہ ہو گئے ہیں ان میں سے صرف دو پر نظر ڈالیے

نقال لفظی معنی "نمونہ یا نقل اتارنے والا" ہوں گے لیکن اب ہر نمونہ اتارنے والے کو نقال نہیں کہتے۔

انتقال، لفظی معنی صرف "جگہ بدلنا" یا "ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا" لیکن اب ہر جگہ کی تبدیلی کو انتقال نہیں کہا جاتا

"نقل" عربی اصل لفظ ہے۔ لیکن عربی میں اس کے یہ دونوں مشتقات ان مخصوص معانی کے ساتھ نہیں ہیں۔ اردو نے ان کو یہ معنی دئے، شروع میں معنی کی یہ تخصیص نہیں ہوگی۔ چلن نے اس کے معنی متعین کرنے میں مدد دی اور رواج عام نے ان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

اس عرض داشت کا مطلب صرف یہ کہ ان الفاظ کے ترجمہ میں مکھی پر مکھی مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک مخصوص معنی میں جب لفظ کا چلن ہوگا تو کچھ عرصہ میں اس کے یہ معنی متعین ہو جائیں گے ہاں یہ ضروری ہے کہ الفاظ مانوس اور زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔

RESURRECTION کا مفہوم ایک لفظ میں "رجعت" سے ادا کیا جا سکتا ہے مادہ "فعل رجع" (لوٹنا، واپس آنا) کے کئی مشتقات اردو میں عام ہیں رجوع، راجع، مرجع، رجعت، مراجعت، وغیرہ

ایک اور لفظ "ترجیع" بھی ہے جو اردو میں معروف طور پر تو نہیں الیکن ایک دو مرکبات میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے رجعت یا مراجعت میں سے کوئی ایک لفظ اس مفہوم کے لیے بآسانی استعمال ہو سکتا ہے ان میں۔ RE سابقہ کا مفہوم بھی شامل ہے اور اس واقعہ کی تلمیح بنے کی پوری صلاحیت ان میں سے منتخب لفظ کے معنی میں ایک اور پہلو کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن ان میں سے "رجعت" اس لیے بہتر ہوگا کہ مراجعت عام واپسی کے معنی میں ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ زیادہ وضاحت کی ضرورت سمجھی جائے تو "رجعتِ عیسیٰ" یا "رجعتِ مسیح" کہا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ اس سلسلے میں جن حضرات نے اپنی رائے کا اظہار کیا، سب نے انگریزی۔ اردو لغات کے حوالے دئے ان میں سے کوئی بھی مناسب اور قابلِ اطمینان لفظ نہیں نکل سکا۔ پلیٹس کی اردو انگریزی لغت نے بھی اس سلسلے میں رہنمائی کی ہے رجعت کے ذیل میں RESURRECTION بھی موجود ہے۔ اسے بھی سند مانا جا سکتا ہے۔ (عتیق احمد صدیقی)

(۲)

جناب م۔ ن۔ سعید صاحب کا استفسار ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات کیا ہیں؟ پر بہت سے اہلِ قلم حضرات نے رائیں دی ہیں۔

اس کے بارے میں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ RESURRECTION

وہ اب ہماری زبان میں ترجمہ ترجب نہیں کہ ہے۔ اس ترجمے میں نشاۃ الثانیہ کہئے یا جو بھی چاہیے۔ آجکل زبان کو سادہ بنانے کے لیے ثقیل الفاظ سے پرہیز زیادہ اچھا ہے۔ نشاۃ الثانیہ اچھا ہے لیکن جب دوسروں کو بھی اچھا لگے۔

۲۔ ہوم سِک HOME SICK کو پڑھا لکھا طبقہ اپنی زبان میں ہوم سِک ہی بولتا ہے اس کو ہوم سِک ہی بولنا مناسب ہے کیونکہ صحیح مفہوم دوسرے ترجمے سے ادا کرنا دشوار ہے۔

۳۔ ہنی مون کا استعمال ہماری زبان میں عام ہے اس کو پُر تکلف بنانے سے کیا فائدہ اس کے مفہوم سے ہر شخص واقف ہے۔

جب ہماری زبان میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ ہم دوسری زبان کے الفاظ بالکل اسی نفاست کے ساتھ لے لیں اور بولیں تو پھر ہم کو اس قسم کے ترجموں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مثلاً اسٹیشن۔ ٹکٹ۔ ریسٹورنٹ۔ نل۔ بس۔ سینما۔ کونسل ہاؤس۔ بُش شرٹ۔ جیکٹ وغیرہ وغیرہ اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ ایسے جتنے لفظ بھی حسبِ ضرورت آ جائیں وہ سب ہم کو بے دھڑک لے لینا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال رہے کہ زبان میں ثقل نہ پیدا ہو۔

(طاہر محسن علوی)

محسن الملک کی کتابیں

مجھے نواب محسن الملک کی تین کتابیں (۱) میلاد نامہ (۲) کتاب المحبت والشوق (۳) تقلید اور عمل بالحدیث مطلوب ہیں اگر قیمتاً کوئی صاحب دے سکیں تو میں خرید لوں گا اگر عاریتاً بھیج سکیں تو نقل کر کے واپس کر دوں گا۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۸۔ رام گلی نمبر ۳۔ لاہور (مغربی پاکستان)

صفحہ ۴ سے آگے

کے باعث ان اوراق کو نکات الشعرا کا ایک جز قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میر صاحب حد درجہ ذہنی افلاس اور شعوری کم مائیگی کا شکار تھے۔ ان کی معلومات کا سرمایہ بہت ہی محدود اور کم اور تھا اور انھیں اظہار مافی الضمیر پر وہ دسترس حاصل نہ تھی جس کی ان جیسے شاعر اور معروف صاحب قلم سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ تمام باتیں کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کی بجائے کسی ایسے کم نظر اور ناپختہ کار مصنف کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جس نے اشعار کی جمع و تدوین سے اپنی دلچسپی کو عملی شکل دینے کے لیے میر صاحب کے بیانات کی قطع و برید کر ڈالا ہے اور اس کی مطلق فکر نہیں کی ہے کہ یہ سرقہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اس قسم کی دست درازیوں کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

ے جوشاں حیات اللہ قوت اور نگ آبادی کے ریاض حسنی نرتبہ ۔۔۔ ۱۲۰۲ ھ تقریباً ۔۔۔ تذکرہ [illegible] گل گویز [illegible] ماخوذ منقول ہے اس [illegible] ریاض حسنی [illegible] بقول حقیقی [illegible] لیکن دراصل [illegible] کا محض اردو ترجمہ ہے۔

انیس اور

مکتوب لندن

برطانیہ میں اردو داں

۱۹۶۶ء کی برطانوی مردم شماری کے اعداد شمار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اردو داں طبقہ کی تعداد تقریباً پونے ۴ لاکھ ہے ان میں بھارتی تارکین وطن کی تعداد ۲ لاکھ ۲۲ ہزار دو سو دس ہے۔ پاکستانی تارکین وطن ۴۰ ہزار ۱۳ ہیں اور کینیا سے آئے ہوئے ہندوستانی و پاکستانی افراد کی تعداد ۱۰ ہزار سے کچھ زائد ہے۔ ان اردو داں ایشیائی باشندوں کے علاوہ وہ تمام انگریز بھی اردو سے واقف ہیں جو گذشتہ دو سو سال سے برصغیر میں سلسلۂ حکومت، تجارت اور ملازمت متعین رہے ہیں اور جنہوں نے اردو زبان سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان انگریزوں کی تعداد میں میرے میں انگریز طلبہ کا بھی اضافہ کر دیا جائے جنھیں گذشتہ سال میں نے اردو پڑھائی ہے اور اس سلسلہ میں مشرق میں شائع شدہ ایک خط کا اقتباس بھی ایک سابطہ لئے ہوئے ہے

میں نے شادی کے بعد اردو زبان سیکھی

میرا نام سبا ہے میری پیدائش سکاٹ لینڈ میں ہوئی میرے شوہر پاکستانی سول انجینئر ہیں۔ میری ایک بچی بھی ہے زہرہ نام ہے ۲ سال کی عمر ہے شادی کے کچھ دن بعد میں نے اسلام قبول کیا تھا مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے میں ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ ولسکس ڈرائیو، ایرلینڈ کیمنٹ میں رہتی ہوں اور مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ شادی کے بعد میں نے اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا اور یہ خط میں آپ کو خود لکھ رہی ہوں" اسی خط کے ساتھ مشرق نے مسز سبا منہم کی دستخط شدہ تصویر بھی شائع کی ہے۔

بزم تفریح لندن کا بیس سالہ جشن

بزم تفریح لندن کا بیس سالہ جشن ۱۶ مارچ بروز ہفتہ الامیس ہال پالمر اسٹریٹ میں منایا جا رہا ہے بزم کے جنرل سکریٹری عبدالعلیم صدیقی نے اس تقریب میں پاکستان اور بھارت کے ہائی کمشنروں کی شرکت کی توقع ظاہر کی ہے حسب دستور اس محفل میں بھی مشاعرہ، موسیقی کا اعلیٰ انتظام کیا گیا ہے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی میں مجلس مذاکرہ

پٹنہ ۶ مارچ۔ گذشتہ دنوں شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی میں "اردو شاعری میں نئے تجربات" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والوں میں مخدوم محی الدین، اختر اورینوی، نیاز حیدر اور اسلم آزاد کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ یہ مذاکرہ تقریباً تین گھنٹے تک چلتا رہا مخدوم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ نئی شاعری خاص ہیئت اور خاص مقصد کے تحت کی جا رہی ہے۔ یہ تحریک نئی نسل سے اس کی امنگیں، امنگیں اور آرزوئیں چھین لینا چاہتی ہے۔ یہ رجحان بہت ہی مہلک اور خطرناک ہے نئے شعراء کی یہ دلیل کہ حالات بدل گئے ہیں، یہ سائنس اور ٹیکنولوجی کا عہد ہے انسان زہرہ اور قمر پر کمندیں پھینک رہا ہے لیکن یہ حالات مغرب میں ہیں مغربی ممالک جیسے حالات نہ کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں نہیں جس کی ۸۰ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ پھر ہم اپنی ذات کے خول میں کیوں کر بند ہو جائیں انھوں نے نئے شعراء پر اعتراض کیا کہ ان کی شاعری کا کوئی مقصد نہیں کوئی منزل نہیں۔ بغیر کسی مقصد کے اعلیٰ شاعری ممکن نہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے نئی شاعری کی بعض خامیوں کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ نئے شعراء تنہائی، خودکشی، گریز اور جنس کو ہی محور شاعری بنائے ہوئے ہیں۔ مگر دور حاضر میں موضوعات کی کمی نہیں۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ نئے شعراء میں اچھے اور صلاحیت مند بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اکثریت آنکھ موند کر مغرب کی تقلید کر رہی ہے ان شعراء نے جدید مغربی شاعری کا مطالعہ تک نہیں کیا ہے لیکن وہ متاثر ضرور ہیں۔ ہم اپنی افسردگی مایوسی اور نامرادی کے احساسات اور اثرات کو دوسروں پر کیسے مسلط کر سکتے ہیں؟ پھر جو شاعری خودکشی اور جنسی بے راہ روی کی ترغیب و تحریص دے ایسی شاعری کو ہم اعلیٰ اور ارفع کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ شاعری کے کچھ اصول اور ضوابط ہیں اس کے لیے ترتیب، تنظیم اور تزئین ناگزیر ہے۔ نیاز حیدر نے نئی شاعری میں ترسیل اور ابلاغ کے فقدان کا شکوہ کیا اور کہا کہ یہ شاعری بالکل مبہم اور ناقابل فہم ہے انھوں نے بتایا کہ نئی نسل خصوصاً طلبہ گمراہ ہو رہے ہیں۔ ان کے ذہن کو مفلوج اور ماؤف کیا جا رہا ہے اور دلوں کو مسخ۔ اسلم آزاد نے نئی شاعری کی حمایت میں کہا کہ ابہام اور پیچیدگی دراصل قاری کے ذہنوں میں ہوتی ہے۔ یہ شاعری ذاتی اور حسی تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے۔ ہم نئی شاعری کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ غالب اور اقبال کو ان کے عہد میں بہت کم لوگوں نے سمجھا لیکن ہم انھیں سمجھ رہے ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ آئندہ نسل نئی شاعری کو سمجھے اور اس سے مستفید ہو

شرکا میں علامہ جمیل مظہری، رضا نقوی واہی، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، پروفیسر سید حسن، پروفیسر بدرالحسن، رخشانہ خاتون، نکہت آرا اور رفعت جہاں وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ شکریہ کے ساتھ اس علمی اور ادبی مذاکرہ کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ (نامہ نگار)

بریلی میں یوم غالب کا پروگرام

ساہتیہ کلا اکاڈمی بریلی نے تقریبات یوم غالب منانے کے لیے جناب پی۔ سی۔ آزاد، ایم۔ ایل۔ سی، جناب وسیم بریلوی، جناب انور حقانی، جناب محمد حسین سابق ایم۔ ایل۔ اے اور جناب شمسی بریلوی پر مشتمل انتظامیہ کمیٹی کے زیر اہتمام ۲۰ اپریل ڈسٹرکٹ بورڈ ہال بریلی، مندرجہ ذیل پروگرام کو عمل میں لانا طے کیا ہے اس کمیٹی کے کنوینر جناب پی۔ سی آزاد ہیں یہ تقریبات دو اجلاسوں پر مشتمل ہوں گی جس میں پہلی نشست بزم تقاریر و مقالات اور دوسری نشست بزم شعر و سخن ہوگی۔ بزم تقاریر کا افتتاح جناب نسیم قریشی، شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ فرمائیں گے موضوع تقریر غالب کی شاعرانہ عظمت ہوگا۔ دوسرے مقررین حکیم عبدالوحید صاحب بریلوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر شعبۂ اردو، دلی یونی ورسٹی دلی ہوں گے بزم مقالات میں ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی، جناب عابد سہیل رکن ادارہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ، جناب منظر سلیم رکن ادارہ قومی آواز لکھنؤ اور جناب وسیم بریلوی شعبۂ اردو بریلی کالج، بریلی شرکت فرمائیں گے۔ بزم شعر و سخن میں دس مقامی نمائندہ شعراء کے علاوہ ڈاکٹر معین احسن جذبی، جناب غلام ربانی تاباں، جناب نشور واحدی، جناب نازش پرتاب گڑھی، جناب دستو کمار شوق کشمیری، جناب منظر سلیم، جناب قمر مرادآبادی وغیرہ کی شرکت متوقع ہے شعرائے کرام غالب کی زمینوں میں غزلیں پڑھیں گے۔ (نامہ نگار)

بہار میں جشن غالب کی تیاری

آرہ۔ حال ہی جناب ڈاکٹر شمیم احمد صاحب کے دولت کدے پر ایک شاندار جلسہ جناب پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کی صدارت میں بہار میں غالب کی صد سالہ تقریب منانے کے سلسلے میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب حلقۂ احباب آرہ کے زیر اہتمام منائی گئی غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب کے افتتاح کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے یہ شاندار جلسہ موصوف ہی کے ایما پر منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات کی شرکت قابل ذکر ہے۔ جناب ڈاکٹر شمیم احمد، جناب حفیظ بنارسی، جناب انیس امام، جناب طلحہ رضوی برق، جناب علیم اللہ حالی، جناب نسیم محمد جان، جناب ماہر آروی، جناب ابوالظفر، جناب جے چند پرساد جین اور جناب عبداللطیف (آرٹسٹ)

ابتدا میں جناب انیس امام صاحب نے جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کے مفید مشوروں سے استفادے کا شکریہ ادا کیا

جناب صدر نے عالمی پیمانے پر منائی جانے والی غالب کی صد سالہ تقریب کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کیا

رضا بجنوری۔ رباب رشیدی۔ فصیح اکمل قادری۔ حامد شاہجہانپوری۔ عزیز شاہ جہاں پوری۔ شاغل شاہ آبادی۔ مصور شاہ جہاں پوری۔ طرب لکھنوی۔ جاوداں لکھنوی۔ ایمپلائمنٹ آفیسر شاہ جہاں پوری وغیرہ

(شفیق مینائی سکریٹری خیابان دل شاہجہانپوری)

صفحہ ۶ سے آگے

۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ہمدرد کا ایک ورقہ 'نقیب ہمدرد' کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تب تک بیروت سے ٹائپ کی مشین نہیں آپائی تھی اور چھپائی کا انتظام مکمل نہیں ہوا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء تک یہ انتظامات مکمل ہو سکے۔ اور یکم جون ۱۹۱۳ء سے ہمدرد اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا۔ اور قاضی صاحب نے بھی مولانا محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔

قاضی صاحب کا لکھا ہوا سب سے پہلا اداریہ "ہمدرد" کی پہلی جلد کے آٹھویں شمارے میں یعنی ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا جس کا موضوع 'مصر' تھا یہ اداریہ قاضی صاحب نے کس طرح لکھا تھا۔ اور مولانا محمد علی اپنے شاگردوں کی تربیت کس طرح کیا کرتے تھے اس کا ذکر قاضی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے۔

> "دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھوں۔ کچھ نوٹ خود محمد علی نے لکھوائے تھے آٹھ دس دن تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا مجھے یاد ہے کہ دو سطریں پڑھنے کے بعد انھوں نے منہ بنایا۔ اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ یہ کیا مغلوبات گھسیٹ لائے ہو۔ میں کیا لکھوں کہ اس دن ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا کہ وہ ہمدرد کے ادارتی شعبہ میں بغیر اپنی خواہش کے اصرار کے ساتھ شریک کیا گیا ہے"

قاضی صاحب کو یہ اداریہ کئی مرتبہ لکھنا پڑا تھا۔ جب جا کر مولانا محمد علی کو پسند آیا تھا انھوں نے پڑھا اور قاضی صاحب کو گلے لگا لیا۔ مولانا محمد علی مرحوم کا اپنے نوجوان مددگاروں کو صحافت کے ابتدائی اصول سکھانے کا طریقہ کار قاضی صاحب کے الفاظ میں یہ تھا

> "ہر روز شام کو شعبہ ادارت کے ارکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لیے ایک مضمون تجویز کرتے تھے اور پھر اس مضمون کے متعلق بہت سی کتابیں اپنے کتب خانہ سے نکال کر دیتے تھے ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشاندہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا"[1]

یہ تھا ہمدرد دفتر کا وہ اخباری و صحافتی ماحول اور مولانا محمد علی کی ہدایتیں جن کے سائے میں قاضی عبد الغفار کی باقاعدہ صحافت نگاری کا آغاز ہوا۔

---

[1] ملاحظہ ہو ریاست دہلی ۱۷ دسمبر ۱۹۳۲ء

پروفیسر آل احمد سرور

میرا صفحہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

ابراہیم القاضی ڈائرکٹر نیشنل اسکول آف ڈراما نے بحث کا آغاز کیا۔ القاضی نے ابتک بہت سے ڈرامے بہایت کامیابی سے پیش کئے ہیں۔ انھیں اسٹیج کی ضروریات، ڈرامائی مواقع، فضا اور کردار نگاری کے نکتوں کا پورا احساس ہے۔ ان کے یہاں فن کا ایک وقار ہے جو بعض لوگوں کو غرور نظر آتا ہے اس لیے آپ کو لئے دیے ضرور رہتے ہیں۔ بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں انھوں نے بڑی کام کی تقریر کی پہلے تو انھوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ڈراما ہی پس ماندہ نہیں ہے بلکہ آج ہمارا سارا اہم عصر ادب دوسرے ملکوں کے ادب کے مقابلے میں پس ماندہ ہے پھر انھوں نے اصرار کیا کہ ڈراما کو صرف ادب نہیں سمجھا چاہئے بلکہ اسٹیج کے جو تقاضے ہیں ان کی روشنی میں اس کی اپنی ضروریات کو ذہن میں رکھنا چاہئے انھوں نے کہا کہ ڈراما کا سرد کار اس تبدیلی سے ہے جو آج اور کل کے درمیان ہو رہی ہے باہر سے والی ہے آج لوگوں کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے ڈراما اس حقیقت سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اسٹیج کا مقصد صرف ساز و سامان یا آرائش کے ذریعہ سے دیکھنے والوں کو متاثر کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ ذہنوں میں ہونے والی تبدیلیاں کو اداکاری کے ذریعہ سے عام کرنا ہے انھوں نے اپنی سرزمین ... کی بھی بات چھیڑی اور مغرب کی سستی نقالی کی مذمت کرتے ہوئے کہا ... آج بھی معنی رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے ڈراما ... عوام سے رشتے کی بنیاد ضروری ہے آج ہندوستان میں پتھر کے دور سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز کے دور تک کی زندگی ملتی ہے اس کے تضاد اور دھوپ چھاؤں کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم محض معاشی یا معاشرتی موضوعات پر ڈرامے لکھیں اب تک ان موضوعات پر جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو فن کی ضروریات کے مطابق پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ تنگی اور ذہنی کمی عام ہے نعرہ بازی ڈراما ہر مرض کی دوا نہیں ہے مصنف کو اور زیادہ ذہنی صلاحیت کا ثبوت دینا ہے القاضی نے ایک باشعور ہدایت کار کی حیثیت سے ڈراما لکھنے والوں کو اپنی سرزمین اور اپنی فضا جذب کرنے اور اپنی زندگی کے تضادات واضح کر کے اپنی بصیرت کا ثبوت دینے کی ہدایت کی ان کی تقریر بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی۔

ان کے بعد شمبھو مترا نے تقریر کی جو بنگالی کے مشہور ہدایت کار ہیں شمبھو مترا نے آج کے مصنفین کی اپنی سرزمین اور اپنے سرمائے سے ناواقفیت پر خاص طور سے زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ بہت سے مصنف یہ نہیں جانتے کہ ایک ناؤ کے کتنے حصے ہوتے ہیں اور ہر حصے کا نام کیا ہے مگر ملاحوں کی زندگی پر ڈرامے لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہم لوگ اپنے سارے تہذیبی اور ادبی سرمائے سے واقف نہیں ہوں گے، ہم آجکل کی زندگی کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش نہیں کر سکتے۔ ان کے بعد امرت لال ناگر اور اپیندر ناتھ اشک نے تقریریں کیں ناگر نے بعض کام کی باتیں کیں، مگر اشک زیادہ تر اس بات کا رونا روتے رہے کہ انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے ہیں مگر ہدایت کار ان کے ڈراموں کو وہ اہمیت نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اشک سے تو توقع تھی کہ وہ محض اپنے ڈراموں کی بات نہیں کریں گے بلکہ ڈراما میں مجموعی طور پر آج جو کمی ہے اس کی طرف بھی اشارہ کریں گے اس کے بعد تامل کے ایک ادیب نے تقریر کی دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک انگریزی کا ترجمان لائے تھے ایک دو جملے وہ تامل میں کہتے تھے، ترجمان انگریزی میں ترجمہ کر جاتا تھا ہم سب کو یہ احساس ہوا کہ ابھی تک صرف انگریزی ہی ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ سے تمام ملک کے ادیب اور فنکار ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔

دوپہر ہو گئی تھی اس لیے لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے کیونکہ سہ پہر میں جنرل کونسل کی میٹنگ تھی یہ چوتھی جنرل کونسل کا پہلا اجلاس تھا یہ راشٹرپتی بھون میں ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ نے صدارت کی۔ انھوں نے اجلاس کا صدر ہونا منظور کر لیا تھا اس اجلاس میں آٹھ ممتاز ادیبوں کا کونسل کے لیے انتخاب ہوا بجٹ منظور ہوا اور ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبروں کا انتخاب ہوا میرے قریب بنگال کی ایک ممتاز ادیبہ لیلا مجمدار بیٹھی تھیں جب یہ سوال اٹھا کہ پنجابی کی نمائندگی پروفیسر موہن سنگھ کریں یا امرتا پریتم تو لیلا مجمدار نے کہا کہ میں تو ایک خاتون کی حمایت کرونگی میں نے کہا ہم مردوں پر چھوڑ دیجئے آپ موہن سنگھ کی حمایت کیجئے بالآخر موہن سنگھ نے خود امرتا پریتم کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا۔ اردو کی نمائندگی کے لیے احتشام اور نیز نے میرا نام پیش کیا جس کی تائید ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کی جلسہ گھنٹہ بھر میں ختم ہو گیا اور انعامات کی تقریب ایک گھنٹے بعد تھی۔ اس لئے ہم لوگ راشٹرپتی بھون کے باغ کی سیر کو نکلے۔ امرتا پریتم، موہن سنگھ، احتشام اور میں باتیں کرتے رہے۔ اس وقت باغ پر بہار تھی رنگ برنگ کے پھول نفاست سے تراشا ہوا سبزہ، جا بجا فوارے۔ سبھی متاثر ہوئے مگر پھر پھر کر گفتگو موجودہ دور کی مشکلات، لسانی تنگ نظری، ہندوستان کی سالمیت کو خطرہ اخلاقی قدروں کے زوال، طلبہ کی شورش اور ارباب اقتدار کی بے حسی کے موضوعات پر ہوتی رہی امرتا پریتم نے میری دعوت پر علی گڑھ آنا منظور کر لیا ہے۔ ان کے گیتوں اور افسانوں سے اردو والے اچھی طرح واقف ہیں موہن سنگھ پنجابی کے سب سے اچھے شاعر کہے جا سکتے ہیں ہم دونوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ اردو اور پنجابی میں جن مصنفوں کو انعام دیا گیا ہے وہ نوجوانوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ساڑھے پانچ بجے تقسیم انعامات کے لیے سب اشوک ہال میں جمع ہوئے۔ ہر مصنف کا ہندی میں تعارف ہوا ذاکر صاحب نے انعامات دئے اور پھر ایک مختصر تقریر کی جس میں ادیبوں سے اپیل کی کہ اعلیٰ معیاروں پر نظر رکھیں اور اپنی تحریروں سے قومی سالمیت کی خدمت کریں۔ تقریب کے بعد انعام یافتہ ادیبوں کے گرد خاصا ہجوم رہا۔

ساہتیہ اکاڈمی مجموعی طور پر ہندوستانی ادب کی خاصی خدمت کر رہی ہے اس کے ذریعہ سے نہ صرف ہر زبان کے کچھ شاہکار سامنے آتے ہیں نہ صرف ادیبوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے بلکہ ایک زبان کے ادیب کو دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ملنے کا موقع بھی ملتا ہے اس ارتباط ذہنی سے جو وسعت نظر پیدا ہو سکتی ہے وہی سب سے بڑی چیز ہے ہاں اکاڈمی کو سال میں دو بار باقاعدہ سیمینار بھی کرنے چاہئیں صرف سال میں ایک دفعہ ادیبوں کا ملنا کافی نہیں کئی دن تک باقاعدہ ایک موضوع پر بحث و مباحثہ بھی ضروری ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷- شمارہ ۱۳	ایڈیٹر: آل احمد سرور	یکم اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

بھارتی بھاشا سمیتی کا دوسرا جلسہ

۲۸ اور ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو بھارتی بھاشا سمیتی کا دوسرا جلسہ ہوا۔ یہ سمیتی مرکزی وزارت تعلیم نے جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کے لیے بنائی ہے۔ پہلے اجلاس کا افتتاح ڈاکٹر سین وزیر تعلیم نے کیا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں کہا کہ اب ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے باقاعدہ پروگرام کے تحت کوشش کرنا چاہیے۔ حکومت ہند اس مقصد کے لیے اٹھارہ کروڑ کی رقم مخصوص کر رہی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ریاستوں، یونیورسٹیوں اور اہل دانش کی مدد سے یہ کام اس طرح ہوگا کہ جدید زبانوں کے علمی سرمائے میں بھی اضافہ ہو اور تعلیم کا معیار بھی گرنے نہ پائے۔ اس کے بعد چند اہم مسائل پر بحث ہوئی۔ سب سے زیادہ وقت علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کے اصولوں پر صرف ہوا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ تمام اصطلاحات سنسکرت سے لے لی جائیں۔ کچھ اس پر زور دے رہے تھے کہ تمام بین قومی اصطلاحات بجنسہ لے لی جائیں۔ کچھ لوگ ہر زبان کو اس معاملے میں آزاد چھوڑنے کے حامی تھے کہ اس کے جاننے والے جس اصول کو بہتر سمجھیں اسے برتیں۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ بین قومی اصطلاحات کو ہر زبان کے مزاج کے مطابق اپنا لیا جائے۔ وزارت کی ایک ٹیم نے اس سلسلے میں اُن اصولوں پر زور دیا جن کے متعلق مرکزی ہندی ڈائرکٹریٹ نے اپنی اصطلاحات تیار کی ہیں۔ ہمارے نزدیک یکسانیت اور سہولت دونوں کی خاطر ان قومی اصطلاحات کو جو اس وقت مغرب میں رائج ہیں، ہر زبان کے مزاج کے مطابق قبول کر لینا چاہیے۔ ہاں ہمیں علمی اصطلاحات کے سلسلے میں چلن اور قبول عام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اردو اور بنگالی کے نمائندوں نے اس بات پر زور دیا کہ جدید ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا سارا کام بجائے ریاستوں کے یونیورسٹیوں کے سپرد کرنا چاہیے کیونکہ ریاستیں اوّل تو سیاسی مقاصد کے تحت کام کریں گی اور دوسرے چونکہ انھیں بہرحال یونیورسٹیوں کی مدد لینا ہے، اس لیے یونیورسٹیوں کو ان کاموں کا ذمہ دار بنانا بہتر ہوگا۔ بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ریاستی حکومتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، البتہ ہر ریاست کی تمام یونیورسٹیوں کے نمائندوں کو جمع کر کے ان کی مدد سے ریاستیں یہ کام کریں اور سندھی کے سلسلے میں مرکزی وزارت تعلیم یونیورسٹیوں سے یہ کام کرا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ تراجم کے مقابلے میں زیادہ زور طبع زاد تصانیف پر رہے اور تراجم زیادہ تر معیاری تصانیف کے ہوں۔ دہلی میں ایک مرکزی ادارہ قائم کرنے کی تجویز بھی منظور ہوئی جو تمام زبانوں میں کام کی نگرانی کرے گا اور اردو، سندھی اور سنسکرت میں خاص طور سے کام کرائے گا۔ یہ بھی طے ہوا کہ سہ زبانی نصاب پر خاص زور دیا جائے اور ہر زبان کی ایک لغت انگریزی اور ہندی کے مترادفات کے ساتھ شائع کی جائے جس میں دس ہزار کے لگ بھگ الفاظ ہوں۔ آخر میں یہ بھی طے ہوا کہ مرکزی حکومت علمی کتابوں کی ہزار ہزار کاپیاں خرید لے تاکہ مصنفوں کی ہمت افزائی ہو اور علمی کتابیں لکھنے کا میلان عام ہو۔ بھارتی بھاشا سمیتی نے بعض اچھے فیصلے کیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان پر جلد سے جلد عمل درآمد ہو۔ اردو اور سندھی کے سلسلے میں خاص طور سے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں کام کے لیے ادارے جلد قائم ہوں۔ یہ اُن یونیورسٹیوں میں ہونے چاہئیں جن کا اردو سے خاص تعلق ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، عثمانیہ یونیورسٹی اور جموں و کشمیر یونیورسٹی اس کام کو مل کر انجام دے سکتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور اردو کے دوسرے اداروں کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہیے۔ سندھی کے لیے بمبئی یونیورسٹی سے مدد لی جا سکتی ہے۔

زبان کے مسئلے میں سب کی سہولت دیکھنی چاہیے۔ سب کی ضروریات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ پھر ہمارا رخ آگے کی طرف ہونا چاہیے پیچھے کی طرف نہیں۔ زبان کے سلسلے میں پالیسی ماہر لسانیات، اساتذہ، اہل دانش اور ادیبوں کے مشورے سے بننی چاہیے اور اس کے لیے سب سرمایہ فراہم کرنا چاہیے۔ ہمیں تمام زبانوں کو ترقی کا موقع دینا ہے تاکہ ان کی ترقی کے ذریعے سے ایک طرف قومی ذہن بنے اور ملک کی یکجہتی اور سالمیت میں مدد ملے اور دوسری طرف حریتِ فکر پیدا ہو سکے اور وہ تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے سے ایک صالح شخصیت اور ایک بیدار ذہن پیدا کر سکیں۔

....

پروفیسر مسعود حسین خاں

ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور اردو

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ سیاسی قائدین کے ہاتھوں میں ایک تماشہ سا بن گیا ہے۔ آزادی کے بیس سال میں اس کے کیا کیا فارمولے نہ بنے اور یہ کس کس نشیب و فراز سے دوچار نہ ہوا ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ آج انگریزی کے پاسباں خود صنم خانے سے مل گئے ہیں۔ انگریزی کی خاطر ہندوستانیوں نے جانیں دیں، اس کی خاطر اسٹیشن جلائے گئے، بسیں الٹی گئیں غرض کہ ہر وہ حرکت کی گئی جو جمہوریت کے چہرے پر سیاہ داغ ہے۔

اس قضیہ کی ابتدا ہوئی اس تصور سے کہ ہندی اور ہندوستانی قومیت لازم و ملزوم ہیں۔ اردو ایک پاکستانی اور انگریزی ایک بیرونی زبان ہے تامل ناڈ اور بنگال کو بھارتی بنانے کے لیے ان کا "ہندیانا" ضروری ہے یہ تصورات غلط مفروضات پر قائم تھے اس لیے ان مفروضات کو ختم ہونے کے لئے دو دہوں کی ضرورت تھی روشنی آئی لیکن دیر میں آئی اور جزوی آئی۔ سہ لسانی اور دو لسانی فارمولوں کی تکرار کے بعد بہرحال سرکاری طور پر طے یہی پایا کہ سہ لسانی فارمولے ہی میں کمال ہے یہ لسانی فارمولا لسانی اقلیتوں کے لیے چہار لسانی بن جاتا ہے بیس سال کے غور و فکر میں بہر حال دو صداقتوں کا علم ہوا پہلی یہ کہ مادری زبان تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے اور دوسری یہ کہ ملک کی وحدت اور سالمیت کے پیش نظر رابطہ کی زبان کا استحکام ضروری ہے ان دونوں صداقتوں کے انکشاف کے بعد بھی الجھاؤ باقی رہ گئے ہیں۔ پہلی یعنی مادری زبان کی صداقت کے ساتھ قضیہ یہ رہی کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہوگا جن کی مادری زبان ریاست کی علاقائی زبان نہیں دوسری کے ساتھ یہ سوال قائم رہا کہ رابطہ کی زبان ہندی ہو یا انگریزی یا دونوں۔

پہلے رابطہ کی زبان کے مسئلہ کو لیجئے آزادی کی پہلی لہر میں ہندی والے دستور ساز اسمبلی سے یہ منظور کرا لے گئے کہ ۱۹۶۵ء تک انگریزی کا چلن رہنے کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم خط میں بنائی جائے گی ہمارے دستور کی اکثر دفعات میں ابہام بالقصد رکھا گیا ہے گورنر اور ریاستی کابینہ کے باہمی ربط کے غیر واضح ہونے کا خمیازہ تو ہم آج کل بھگت ہی رہے ہیں۔ بلکہ میرے خیال میں ہمارے دستور سازوں نے سرکاری زبان کے متعلق دفعات میں جو ابہام رکھا ہے اس کی مثال متاخرین شعرائے فارسی کے یہاں بھی مشکل سے ملے گی۔ زبان کا تمام مسئلہ اسی کا بھگتان ہے چنانچہ جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے اور ۱۹۶۵ء قریب آتا گیا پنڈت نہرو کی زندگی میں سطح مرتفع دکن سے زبان کے بارے میں گڑگڑاہٹ اٹھنے لگی بالآخر اس نے ۱۹۶۵ء کے تامل ناڈ کے زلزلے کی شکل اختیار کر لی چونکہ ہماری جمہوریت میں روشن فکری کے لیے ہمیشہ ایک صدمۂ شدید کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے اچانک محسوس کیا گیا کہ ۱۹۶۵ء بہت قریب آگیا ہے ہندی ہنوز کسن کنیا ہے اور انگریزی کے بغیر کام چلانا ممکن نہیں۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے ایک تاریخی اعلان سے ہندوستان میں انگریزی کے چلن کی مدت اور بڑھ گئی جس کی مصدقہ شکل اب لینگویج ایکٹ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ بل ایکٹ بنے عمل اور ردعمل کی تکرار شروع ہوگئی اور بل کی بعض دفعات میں ایسی ترمیم کر دی گئی کہ ہندی والوں کا کام صرف ہندی پڑھنے سے چل جائے جب کہ دیگر زبانیں بولنے والے لازمی طور پر انگریزی یا ہندی سیکھیں اس کے خلاف بنگال میں طوفان اور سطح مرتفع دکن میں پھر لرزش زیریں شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ سیاسی ذہن اب اس انداز میں سوچ رہا ہے کہ سول سروس کے امتحانات میں انگریزی اور ہندی کے پرچے تو کرنا پڑیں لیکن ان پرچوں کے نمبر نہ جوڑے جائیں تاکہ نتائج امتحان پر اثر نہ پڑے۔

دوسرا مسئلہ مادری یا ریاستی (علاقائی) زبان کا ہے اردو کا مسئلہ اسی سے متعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اردو کی ایک کل ہند حیثیت ہے۔ مختلف ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ (یو۔پی) سے لے کر ۲۴ لاکھ (میسور) تک حال ہے دیگر ریاستوں میں بھی دو لاکھ تا ۱۵ لاکھ کی تعداد میں اردو بولنے والے پائے جاتے ہیں کشمیر میں اس کو مادری زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے لیکن یہ وہاں کی تہذیبی اور سرکاری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اردو کا بنیادی مسئلہ اب اس قدر کل ہند حیثیت کا نہیں رہا جتنا کہ ریاستی یا علاقائی حیثیت کا بن گیا ہے مثلاً یو۔پی اور بہار میں اس کا مقابلہ ہندی سے ہے ہندی۔ اردو ایک ہی لسانی حقیقت کی دو شکلیں ہیں اس لیے یہ ایک دوسرے میں جذب بھی ہو سکتی ہیں اور انجذاب کے اس عمل میں ایک دوسرے کو متاثر بھی کر سکتی ہیں۔ یہاں اردو رسم خط کا ایک اہم رول ہے۔ وہ حضرات جو اردو کے لیے دیوناگری رسم خط تجویز کرتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندی کے علاقے میں اردو کا وجود اسی سے عبارت ہے ورنہ اردو کے اسالیب میں وہ وسعت ہے کہ ایک طرف اس کے ڈانڈے ہندی سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف فارسی سے اردو رسم خط کے پیچھے ایک تہذیب اور تاریخ ہے اسے مفاہمتوں اور سمجھوتوں کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا تاآں کہ وہ سمجھوتہ ایک کل ہند سطح پر نہ ہو جس میں ہندوستان کی ہر زبان کو کچھ کھو کر کچھ پانا پڑے ہر زبان کا ایک اجتماعی وجود اور اس کی ایک 'انا' ہوتی ہے۔ جو تاریخ کے عمل میں رفتہ رفتہ تشکیل ہوتی ہے اتاترک نے ترکی میں اس پر جو ضرب کاری لگائی تھی اس کا ردعمل اب ترکی میں پایا جاتا ہے جس کے زیر اثر ترک اور ترکی دونوں آج اپنے وجود پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں اردو کے سلسلے میں دیوناگری رسم خط تجویز کرنے والوں سے میں یہ کہوں گا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ جرأت استدلال پیش کیوں نہیں کرتے کہ اردو والوں کو صاف صاف اب ہندی اختیار کر لینی چاہئے اس لیے کہ اردو کا اب ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں میرے خیال میں اس تجویز میں پھر بھی ایک استدلال لسانی ملتا ہے کہ اقلیتوں نے بارہا اپنی زبانیں بدلی ہیں۔ جزوی اور محتاط جرأت کے مقابلے میں بے محابا جرأت کم از کم ایک نسل کو لسانی دو رنگی سے بچا لے گی۔

اردو کا موقف، جہاں تک جنوبی ہند کی ریاستوں کا تعلق ہے قدرے مختلف ہے۔ دکن کی جن ریاستوں میں اردو بولنے والے خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور میسور ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کی علاقائی زبان کا تعلق زبانوں کے ہند آریائی گروہ سے ہے اس لیے اردو اور مرہٹی کے مابین کافی مشترک لسانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ دراصل دکن میں قدیم اردو کا تشکیلی گہوارہ مرہٹی ہی کا علاقہ رہا ہے۔ آندھرا پردیش اور میسور میں اردو کا مقابلہ [illegible]

خاندان کی دو زبانوں تلگو اور کنڑی سے ہے۔ اردو اور ان زبانوں کے مابین صرف سنسکرت سے ماخوذ الفاظ کا اشتراک ہے ورنہ قواعد کے اعتبار سے اردو ان زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ دکن کی زبانوں سے اردو کے اختلاط کی ایک حد فاصل ہے اور ان میں انجذاب ناممکن ہے۔ سابق سلطنت آصفیہ کی شہری اور قصباتی آبادی کو چھوڑ کر دکن کا تمام اردو داں طبقہ دو لسانی ہے یعنی مرہٹی کے علاقے میں وہ مرہٹی بولتا ہے اور تلگو کے علاقے میں تلگو۔ قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانے سے یہ دو رنگی قائم ہے چونکہ اردو حکمرانوں کی زبان تھی اس لیے اس وقت اس دو رنگی کا جھکاؤ اردو کی جانب رہتا تھا اب صورت حال مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ آج جبکہ تلگو اور کنڑی بولنے والوں کی نئی نسل اردو سے قطعاً انحراف کر رہی ہے اردو بولنے والے ان زبانوں کے سیکھنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد جیسے اردو شہروں میں اردو بولنے والے بچے اب تلگو پڑھ رہے ہیں یہ بچے پڑھ کر جب بڑے ہوں گے تو انھیں کام چلاؤ تلگو آتی ہوگی اور اسی نسبت سے اردو سے ان کا سابقہ کم ہوتا جائے گا۔

شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں یہ لسانی دو رنگی ابھی عرصے تک قائم رہے گی۔ جب کہ شمالی ہند میں گھریلو زبان کے محاورے میں کوئی بڑی تبدیلی ہوئے بغیر اردو والوں کی نئی نسل ہندی میں رنگی جا چکی ہے۔ دکن میں تلگو کو مادری زبان کی قدرت کے ساتھ استعمال کرنے میں ابھی عرصہ لگے گا چنانچہ اس مدت سے فائدہ اٹھا کر اردو والے چاہیں تو اپنی تنظیم کر سکتے ہیں کسی بھی تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کے یہاں لسانی انا کا شعور ہو۔ اس کی قدر کا احساس ہو اور وہ اپنے لیے اردو کو ناگزیر سمجھتے ہوں اس کے بغیر کسی بھی اقلیت کی زبان کا زندہ رہنا دشوار ہے تاریخ لسانیات شاہد ہے کہ تیسری نسل میں ان اقلیتوں کی زبانیں بدل جاتی ہیں تاآں کہ وہ ایک اسرائیلی انا کے عزم پر قائم رہ ہوں اجتماعی انا کی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے تنظیم کا ہونا ضروری ہے تنظیم ہمارا کمزور ترین پہلو رہا ہے عمل کی ناکامی ہمارا مرض دیرینہ ہے۔ خود ہمارے شہر حیدرآباد میں بے شمار ڈیڑھ اینٹ کے ادارے ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے ہم ایک بھی ادارہ جیسا کہ چاہیے نہیں چلا سکتے اقلیتوں کی زبان کے تحفظ و ارتقا کے کئی محاذ ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق محاذ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ سیاسی پلیٹ فارم کی جد و جہد سے قطع نظر اردو کے تعلیمی نظام کی تنظیم وقت کا اہم مسئلہ ہے بالخصوص ان بڑی تبدیلیوں کے پیش نظر جو آندھرا پردیش کے تعلیمی نظام میں ۱۹۶۹ء سے آنے والی ہیں جب تلگو کو یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کا آغاز کر دیا جائے گا۔ اس وقت اردو کی صورت حال کیا ہوگی اردو کالجوں کا قیام کہاں کہاں عمل میں آ سکے گا۔ اردو کی متوازی کلاسیں کہاں کہاں قائم کی جا سکیں گی۔ جن قصبوں اور قریوں میں اردو بولنے والے بچے بہ مجبوری تلگو میڈیم سے پڑھیں گے کیا وہاں اردو کو بہ حیثیت ایک لازمی مضمون کے پڑھایا جا سکے گا۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں اردو مادری زبان والے اساتذہ کا کیا حشر ہوگا اب تک تو انگریزی کے سہارے سے گزر گئی، رہ گئی ہے اس کے لیے کیا سہارا ہوگا؟

یہ ہے وہ زبردست لسانی مسئلہ جو آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں کے سروں پر آن کھڑا ہوا ہے جس کا سیاسی، علمی اور تعلیمی سطح پر حل ڈھونڈھنا ناگزیر ہے۔

صابر القاسمی شہید

حجاز میں اردو

اردو کا مستقبل ایک سوال بن چکا ہے، جواب دینے والوں نے ہر طرح کے جوابات دیئے ہیں لیکن اس سے ہر شخص کو اتفاق ہے کہ اس درخت کی جڑیں جس دور تک پھیل چکی ہیں اس سے نفی کیا جا سکتا ہے کہ اسے اپنی جگہ سے ہلانا بھی مشکل ہے۔ اردو ان چند خوش قسمت زبانوں میں سے ایک ہے جو دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اندازہ ہے کہ اس وقت حجاز میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کا اوسط دس فیصد سے کسی طرح کم نہیں ہے، ساتھ ہی اس غریب الدیار زبان کے حاملوں کو اس زبان کی زندگی اور ارتقائے دوام سے پوری دلچسپی بھی ہے آپ جب مدینہ منورہ آئیں تو یہاں کی ایک ہمہ جہت شخصیت سے ملاقات ہرگز نہ بھولیں ہمیں امید ہے کہ آپ ان سے مل کر ضرور خوش ہوں گے، ان کے چہرے کے واضح نقوش بتائیں گے کہ ان کے والد ترکستانی ہیں، اور جب اردو میں آپ کی گفتگو ہوگی تو یہ اندازہ کچھ مشکل نہ رہے گا کہ ان کی والدہ ہندوستانی ہیں جو خاص لکھنؤ کی ہیں اور اس طرح ان کی یہ مادری زبان ہے اگر آپ کی ملاقات ان سے گھر سے باہر ہوئی تو پھر [illegible] لباس اور عربی زبان میں بلا تکلف بات چیت سے اس دھوکے میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ یہ خالص عرب ہیں۔ یہ ہیں سید احمد مدنی جن کی ذاتی کوششوں کے نتیجے میں آج مدینہ منورہ میں سید لائبریری کے نام سے اردو کی راہ میں گرم سفر ایک ادارہ موجود ہے جہاں اردو کی یوں تو ہر سال سب سے [illegible] نشستیں منعقد ہوتی ہی رہتی ہیں، اس وقت میں آپ کے سامنے تمام غالب کے نام سے مرحوم کی صد سالہ برسی کے موقع پر منعقد ہونے والی اس یادگار نشست کی کچھ جھلکیاں پیش کرنا چاہتا ہوں جو ایک طرف تو مرحوم غالب کے لیے ایک امتیاز و اعزاز کا باعث ہے دوسری طرف مدینہ منورہ کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی نشست ہے نشست کا افتتاح ۲۳ فروری کو رات کے ساڑھے تین بجے محلہ حارۃ الاغوات میں صدر بزم حافظ سید احمد مدنی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا صدارت مولانا انور موہانی نے کی جو ہماری خوش قسمتی سے اس وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے اور پیرانہ سالی اور جسمانی نقاہت کے باوجود ہماری درخواست پر شریک بزم ہوئے مولانا کا خطبہ افتتاحیہ جسے منظر حسین صدیقی نے پڑھا، کامیاب خطبہ تھا نشست کا پہلا دور مقالات سے شروع ہوا سب سے پہلے سید ابو المعارف مدنی نے اپنا مقالہ "غالب بزم اردو میں" پڑھا دوسرا مقالہ مولانا عبد الملک صاحب کا تھا مولانا کی ذات گرامی سے نہ تو اہل علم ناواقف ہیں نہ مولانا کا قلم کسی تعارف کا محتاج ہے، اس مقالہ کا اصل موضوع تو مولانا محمد علی جوہر کی وہ عقیدت اور عشق ہے جو ان کو غالب سے تھی چنانچہ موصوف نے جو شواہد پیش کئے ہیں اس سے حقیقتاً یہ واضح ہوتا ہے کہ غالب کے عشاق کی صف میں مولانا مرحوم کا نام سب سے پہلے آتا ہے پر یہ ذکر بھی آ ہی گیا جو واقعی ناگزیر تھا کہ غالب کی شخصیت کسی ایک ملک یا عقیدت تک محدود نہیں رہی بلکہ اس شمع سخن کے پروانوں میں ہر وہ نام آتا ہے جو بجائے خود آسمان اردو کا ایک درخشندہ آفتاب ہو، ہماری پچاس سالہ تاریخ میں تحریک خلافت عظیم ترین تحریک ہے مولانا کے اس مقالہ کو حسب توقع سامعین سے پوری داد تحسین ملی، اس دور کے آخر میں مولانا امداد صابری نے اپنے مقالہ کا مقدمہ سنایا جس کا عنوان "حجاز میں شعرائے اردو" تھا اس پر اس بزم کا پہلا دور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس میں ذیل کے شعراء نے حصہ لیا منظر حسین صدیقی، شاکر شیرکوٹی، صابر قاسمی، سید احمد مدنی، محبوب الرحمان محبوب، عبد الجلیل صاحب سوختہ، سکندر مرزا صاحب جنون، [illegible] صاحب کوثر اور صوفی غلام محمد صاحب صوفی تھے۔ ساڑھے چھ بجے یہ یادگار بزم [illegible] کے شکریہ پر ختم ہوئی۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

گزشتہ سال اپریل کے پہلے ہفتے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے "جدیدیت اور ادب" کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں مختلف الخیال حضرات نے مضامین پڑھے تھے اور بحث و مباحثے میں حصہ لیا تھا سمینار کی آخری نشست میں بلراج کومل نے "جدید نظم۔ چند پہلو" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں اردو نظم کے بعض جدید رجحانات کی نشاندہی کی گئی تھی اور اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے تھے مقالہ نگار نے ضمنی طور پر ترقی پسند شاعروں کے معاملے میں جدید ... کے رہی رویئے اور طریق کار کا فرق واضح کرنے کے لیے یہ بھی لکھا تھا کہ ترقی پسند شاعری کو ... کی شاعری سمجھتا ہوں اور جدید ... کو خط ... کی شاعری خط مستقیم کی شاعری سے ان کی مراد اس شاعری سے تھی جو طے شدہ پروگرام کے ماتحت کسی منشور یا کسی سیاسی جماعت کی پالیسی کے مطابق کی جائے اور اس قسم کی نظم کا ... بھی طے شدہ ہو اس کے برخلاف جدید شاعری وہ ہے جو تجربات و محسوسات کے متعلق ایک فرد کے آزادانہ ردعمل اور انکشاف حقیقت میں انفرادی طرز فکر و طرز احساس پر مبنی ہو۔ کومل کے اصل الفاظ یہ ہیں

"اردو زبان کی بیشتر ترقی پسند شاعری خط مستقیم کی شاعری ہے اور طے شدہ نقطۂ آغاز سے طے شدہ نقطۂ انجام اور طے شدہ نتائج کی شاعری ہے اور ان طے شدہ نتائج کو بار بار پیش کرنا شاعروں کا شعری پروگرام ہے سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی خط مستقیم کے شاعر ہیں فیض کی شاعری کی مقابلتاً زیادہ اثر انگیزی اس مفاہمت کا نتیجہ ہے۔ جو فیض نے روحانی آویزش اور خط مستقیم کے درمیان قائم کر لی ہے۔"

سردار جعفری نے کومل کا یہ مضمون اپنے رسالہ "گفتگو" میں شائع کرنے کے لیے ان سے لے لیا تھا اس مضمون کی یہی چند سطریں ان کے دل میں اس طرح جاگزیں ہو گئیں کہ انھوں نے اپنی طرف سے مضمون کا عنوان بدل کر "خط مستقیم اور خط منحنی کی شاعری" رکھ لیا اور شائع کرنے کے بعد اس کے جواب میں ایک مضمون لکھنے کی بھی ضرورت محسوس کی۔ جوابی مضمون میں ایک جگہ انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ فیض کو خط مستقیم کے اس قبیلے سے ذرا سا مختلف بتایا گیا ہے جس کے اہم نمائندہ سردار جعفری اور دیگر شعرا ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر قمر رئیس کے حوالے سے حاشیے میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جب یہ مضمون سیمینار میں پڑھا گیا تھا کومل نے فیض کو بھی اسی زمرے میں رکھا تھا یا محض فیض کو ہی اپنے حملے کا نشانہ بنایا تھا قطع نظر اس کے کہ واقعہ کیا ہے سردار جعفری نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ادب کا کوئی طالب علم خواہ وہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو فیض اور سردار جعفری دونوں کو ایک قبیلے کا شاعر نہیں سمجھ سکتا اس لیے کہ باوجود ترقی پسند نقطۂ نظر رکھنے کے، دونوں کا شعری مزاج اور ذہنی طریق کار ایک دوسرے سے بالکل دور ہے سردار جعفری اگر براہ راست اندازِ بیان کے قائل رہے ہیں تو فیض بالواسطہ اسلوب کے۔ دلدادہ ہیں سردار جعفری کے یہاں خطابت، گھن گرج، نعرہ زنی، طوالت اور صراحت ہے تو فیض کے یہاں دھیما غنائی لہجہ، رمزیت، ایمائیت، نرمی و شیرینی اور ارتکاز و اختصار ہے۔ سردار جعفری کے قبیلے میں اگر اور ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ فیض یا اختر الایمان کی طرح کے شاعروں کا نہیں بلکہ کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجاز، مجروح، وامق جونپوری، علی سردار ... تاباں اور راہی معصوم رضا کی قسم کے شاعروں کا ہو سکتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ آج ترقی پسند شاعری کی مدافعت کے سلسلے میں فیض کی شاعری کو سپر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور سردار جعفری نہیں چاہتے کہ انھیں فیض کی صف سے الگ کہیں جگہ ملے لیکن ترقی پسند شاعری کے دورِ عروج میں (جب کہ ابھی فیض راولپنڈی کیس کے سلسلے میں جیل نہیں گئے تھے) سردار جعفری ہی کو سب سے زیادہ اس بات پر اصرار تھا کہ فیض کی غنائیت اور ان کا رمزیاتی اسلوب سکہ بند ترقی پسندی کے منافی ہے اور ان کی جگہ ان لوگوں میں ہے جن کے اندر تذبذب ہے اور جو واضح طور پر ترقی پسند قوتوں کی جانبداری کے بجائے ابہام اور رجعت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں سردار جعفری کو فیض سے کہیں زیادہ ترقی پسندی کا عنصر جگر کی شاعری میں دکھائی دیتا تھا۔

سردار جعفری کو میں ان کی یہ تنقید اس لیے یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے وہ اب یہ مضمون بھول گئے ہوں، ورنہ فیض کو اپنی صف سے الگ دیکھ کر انھیں اس قدر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس مضمون کے بعض اقتباسات یہ ہیں۔

"آج حق و باطل کی آخری لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ ایک طرف عدل اور صداقت کی طاقت ہے اور دوسری طرف ظلم اور فریب کی طاقت صف آرا ہے۔ ان دونوں کے درمیان میدان جنگ کے سوا کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ یا اس صف میں آ جاؤ یا اس صف میں چلے جاؤ" یہ سوال آج ہر ادیب اور شاعر کے سامنے ہے

آفاق شمسی

غزل

خیالِ ترکِ تعلق سے شرمسار تو ہے
ہمارے غم کا اُسے بھی اب اعتبار تو ہے

اب ... رہا ہے کیا تجھ کو گردشِ دوراں!
تصورِ غمِ جاناں بھی ناگوار تو ہے

اسیرِ نیمہ شب ہی کہو ہمیں لیکن
ہمیں بھی صبحِ درخشاں کا انتظار تو ہے

تمہارے بس میں نہ ہو چارۂ غمِ الفت
ہمارے ہاتھ میں دامانِ تار تار تو ہے

عجب نہیں جو پگھل جائے پاؤں کی زنجیر
کہ دل کی راکھ میں پوشیدہ اک شرار تو ہے

یہ آس کم نہیں شمسی کہ عہدِ حاضر کو
کسی حسین زمانے کا انتظار تو ہے

[illegible] اس معنی میں نہیں کہ شاعر کو آج یا زیادہ سے زیادہ کل صبح تک فیصلہ کرنا ہے اور اپنی صف کی پہلی صف میں جا کر کھڑا ہونا ہے ورنہ وہ منفعت میں پس جائے گا۔ مگر اس حالت میں بھی کوئی شاعر ایسے شعر کہتا ہے جس سے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس صف کے ساتھ ہے تو اس کی شاعری بیکار ہے اور اس کا انجام بڑا عبرتناک ہو۔ وہ وقت آسکتا ہے جب ہٹلری جرمنی کی طرح فاشسٹ طاقتیں یہ اعلان کر دیں کہ جو کوئی فاشزم کا حامی نہیں ہے اسے دشمن سمجھا جائے گا اور دار پر چڑھا دیا جائے گا ایسے وقت میں غیر جانبداری بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس طرح کی غیر جانبداری کی سب سے دلچسپ مثال فیض کی شاعری ہے پاکستان ٹریڈ یونین کے عہدیدار رہنے کے بعد بھی انھوں نے اپنی شاعری کو ان الفاظ سے پاک رکھا ہے جو اس دور کی سب سے بڑی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں یعنی سرمایہ دار اور مزدور اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ

ہمارے بعض ترقی پسند شاعر بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ اپنے دل کا مطلب استعاروں میں چھپا کر بیان کریں گے تو تغزل بھی پیدا ہو جائے گا اور شعر بھی حسین ہو جائے گا یہ بالکل غلط ہے۔

جگر اس دور کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں لیکن جب وہ سماجی موضوعات اور عوامی جذبات کے اظہار پر آتے ہیں تو ان کے شعر میں کوئی ابہام نہیں پیدا ہونے پاتا ؎

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

. . . . .

ہے رخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل
جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
سلطانیت حقیقت عریاں ہے آج کل

اس میں جگر نے ہندو، مسلماں، انسانیت، جمہوریت، سلطانیت اور آزادی کے لیے استعارے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ جمہوریت اور سلطانیت کی طرح کے الفاظ غزل کی روایات کے خلاف ہیں۔

اس کے برعکس فیض نے اپنی ۱۵ راگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اور آخری مصرعہ ہے ؎

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیکن یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھوں نے پاکستان کے [illegible] کا مطالبہ کیا تھا لیکن انھیں ملے مغربی پاکستان میں ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔ پھر کیوں نہ ترقی پسند عوام کے بجائے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اسے اپنا قومی ترانہ بنا لیں اور ڈاکٹر ساورکر اور گوڈسے بھی یہی کہتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھیں اکھنڈ ہندوستان نہیں ملا جیسے وہ بھارت ورش اور آریہ ورت بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پوری نظم میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی سحر ہے اور منزل سے مراد عوامی انقلاب کی منزل اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حسینان نور کا دامن ہے، صبا کا دست ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، نگار صبا ہے، چراغ سر رہ ہے، پکارتی ہوئی باہیں ہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا درد اور اس درد کا مداوا۔ ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔

یہ شاعری کے سماجی مقصد سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے کہ فیض ایسا باکمال شاعر ابہام کا شکار ہو کر رہ گیا ہے نہیں بلکہ مبہم استعاروں سے نظم کو آراستہ کرنے کی کوشش نے ایک اور گل کھلایا اور اس نظم کے دو مصرعے بے معنی ہو کر رہ گئے۔ وہ صرف خوبصورت الفاظ کا مجموعہ ہیں ؎

کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

. . . . .

فیض کے برعکس ساحر لدھیانوی کی ۱۵ راگست کی نظم بالکل صاف ہے اور اس میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہیں ہے۔ اس نے بھی استعاروں ہی میں بات کہی ہے لیکن اس نے استعاروں کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ ابہام نہ پیدا ہونے پائے اور پوری قوت اور شدت سے عوامی جذبات کی ترجمانی ہو جائے

. . . .

کیفی نے اور بھی زیادہ صاف اور واضح انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور اس میں خطابت کی شان آگئی ہے۔

. . . .

اسے نعرے بازی کہہ کر جو شخص چاہے وہ اپنی انقلاب دشمنی کو چھپا سکتا ہے۔"

(ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل۔ سردار جعفری۔ شاہراہ۔ دہلی شمارہ (۲) ۱۹۴۹ء)

سردار جعفری نے یہ سب باتیں اگر کسی تقریر میں یا زبانی گفتگو کے دوران کہی ہوتیں تو ممکن ہے وہ آج یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتے کہ۔

"جدید شاعری یا ترقی پسند شاعری یا ادب کے کسی مسئلے سے متعلق کوئی بیان میرا بیان اس وقت تک نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ خود میری تحریر میں نہ ہو۔"

مگر فیض کے خلاف یہ فریضۂ جہاد انھوں نے نہایت سنجیدگی

ذمہ داری کے ساتھ تحریری طور پر انجام دیا تھا اور نہ صرف یہ کہ فیض
راہ مستقیم پر چلنے والے کٹمیٹ ترقی پسندوں یا مینی فسٹو اور پارٹی لائن
مطابق نظمیں لکھنے والوں کی صف سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ
ں کی شاعری کے مقابلے میں "سوئے برلن جاری ہے سُرخ فوج" "سُرخ
م ہے جلوہ فگن" "حرمی پر دانگا کا سرخ پانی چڑھ گیا" جیسی نظموں کو
ع قسم کی ترقی پسند شاعری کا نمونہ قرار دیا تھا اور ان نظموں کے اقتباسات
ش کئے تھے۔ ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا کہ ترقی پسند شاعروں کا سلسلۂ نسب
یکافسکی سے ملتا ہے جبکہ فیض اس نوعیت کی شاعری کو نعرہ زنی سے تعبیر
ہیں جعفری کے اصل الفاظ یہ ہیں:

" درمیانی طبقے کے فرسودہ خیال نقاد شور مچاتے رہے کہ
وہ ڈھنڈورچی ہے۔ سرمایہ داروں کے نمک خوار چلاتے
رہے کہ وہ نعرے بازی کرتا ہے لیکن مایکافسکی کی شاعری
انقلاب کی طرح چھاگئی اور آج وہ سوویت یونین ہی کا نہیں
بلکہ ساری انقلابی دنیا کا سب سے زیادہ مقبول اور
محبوب شاعر ہے، کیونکہ اس نے انسانیت کی ترجمانی کی
ہے جو بیسویں صدی کی حامل ہے۔
ہمارے بعض ترقی پسند شاعر بھی ان نظریات کا شکار ہیں
جب فیض نے مجاز کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا
کہ وہ نعرے نہیں لگاتا تو مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم
ہوئی تھی لیکن فیض کی نظم 'مرے ہمدم مرے دوست' پڑھ
کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ فیض شاعری کو ہماری سماجی جدوجہد
کا حربہ نہیں سمجھتے۔ یہ رویہ فیض کی "موضوع سخن" میں بھی ہے
جس میں انھوں نے بھوک اگانے والے کھیتوں اور شہروں
کی اداس فرادان مخلوق کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں

اس کے برعکس مایکافسکی ایک سچے انقلابی کی طرح اپنی شاعری
کو جدوجہد کرتی ہوئی انسانیت کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی
تلوار سمجھتا ہے .. شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا بھی
شاعری کے بارے میں یہی رویہ ہے

ملک کو جذبۂ بیدار ربتے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھوں میں تلوار دیئے دیتا ہوں

مجاز بھی یہی کہتا ہے . . . . .

تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

اور ساحر لدھیانوی بھی یہی کہتا ہے۔

آج سے اے مزدور کسانو میرے راگ تمہارے ہیں "

(ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل سردار جعفری)

سردار جعفری نے اپنے مضمون میں واضح طور پر اپنے قبیلے کا تعین کیا ہے اور مایکافسکی سے رشتہ جوڑتے ہوئے اردو میں ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی کے طرز کی شاعری کو کھری ترقی پسند شاعری قرار دیا ہے اور فیض کو اس سے الگ رکھنے اور الگ ثابت کرنے کے لیے اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ یہ پروگرام مینی فسٹو اور فارمولے کی شاعری اور نعرہ زنی کو جب بلراج کومل خط مستقیم کی شاعری قرار دیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ خط مستقیم کی شاعری اچھی ہے یا بری فیض کا نام سب سے پہلے آ ہی نہیں سکتا مگر سردار جعفری کی تمنا ہے کہ صرف فیض ہی کو ہدف بنایا جائے تاکہ اس کے جواب میں فیض کی کچی اور اچھی شاعری سے مثالیں پیش کر کے معترض کا منھ بند کیا جا سکے۔ اب وہ فیض کو اپنی صف میں تلاش کرتے ہیں حالانکہ بلراج کومل سے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اس میں کیفی اعظمی، وامق جونپوری، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، نیاز حیدر اور راہی معصوم رضا وغیرہ کے نام لکھنے تھے کہ یہ میرے قبیلے کے شاعر رہے ہیں۔ سردار جعفری کو ترقی پسندی کے زمانۂ شباب میں فیض کو ثابت باہر کرنے کے لیے طول طویل مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور ان کو اپنی صف سے خارج کرنے کے لیے ان کے شاعرانہ عیوب کے لیے دلائل فراہم کرنے پڑے تھے لیکن آج وہ ایسے اصلی نقلی گواہ فراہم کرنے میں مشغول ہیں جن کی گواہی پر فیض کو کٹمیٹ ترقی پسندی کی علامت قرار دیا جا سکے اور رہبر بنا کے عہد پر فیض کا نام کام آئے۔ اس ذہنی رویئے پر ہنسی بھی آتی ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے۔

... اور نشوونما ہو رہی ہے مگر اردو زبان کے لیے ایک ... صورت حال درپیش ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ریاستوں کے ... اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور اردو زبان اور رسم خط خود ہمارے لیے اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ آج اردو میں ایک اشاعتی ادارہ بھی اس حیثیت کا نہیں ہے کہ وہ بچوں کے لیے کتابیں چھاپ سکے کیونکہ بچوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ مصنف کے پاس اس وقت بھی تقریباً درجن مسودے ایسے ہیں جو اسی سبب سے نہیں چھپ سکے۔ یہ بات کہ اردو جیسی گراں مایہ اور مہذب زبان آہستہ آہستہ مرتی جا رہی ہے ان تمام لوگوں کے لیے باعث تشویش ہونا چاہیے جو تہذیب و روایت کے رشتے سے منسلک ہوئے ہیں۔ آزادی کے بیس سال کے اندر اندر تعلیمی اداروں میں اردو کی اہمیت ختم ہوتی چلی جا رہی ہے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ آتا ہے۔ وہ کس کے لیے لکھیں؟ اردو میں بچوں کا کوئی پروگرام آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے نشر نہیں ہوتا اور اس کے نتیجے کے طور پر بچوں کے لیے لکھنے والے ادیبوں کو ریڈیو کے لیے لکھنے اور نشر کروانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ چلڈرن بک ٹرسٹ میں اردو ادیبوں کی کوئی نمائندگی نہیں کرتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس ٹرسٹ سے آج تک اردو کی کوئی کتاب نہیں چھپ سکی۔

انجمن ترقی اردو بنارس کی ادبی نشست

انجمن ترقی اردو بنارس کی جانب سے ۱۰ مارچ ۱۹۶۸ء کو مسلم ہائر سکنڈری اسکول میں مقالہ خوانی کا مقابلہ منعقد ہوا۔ مقالہ کا عنوان ... متعلق اردو نثر نگاری یا شاعری تھا جس میں حسب ذیل طلبہ نے حصہ لیا۔

(۱) بدیع الزماں — ... انٹر کالج بنارس
(۲) عبد القدوس — جے۔ پی۔ مہتا انٹر کالج بنارس
(۳) مناظر حسین — مسلم ہائر سکنڈری اسکول بنارس
(۴) شمیم احمد انصاری — ہریش چندر انٹر کالج بنارس
(۵) صابر اعظمی — مطلع العلوم بنارس
(۶) احمد منیر جمالی — کاشی ودیاپیٹھ بنارس

اس نشست کی صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر احمد حسین صاحب لکچرر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے انجام دئے۔ اس مقابلہ میں شمیم احمد انصاری کو اول، بدیع الزماں کو دوسرا اور مناظر حسین کو تیسرا انعام ملا۔ جناب ڈسٹرکٹ سیشن جج بنارس نے ان تینوں طلبہ کو انعام تقسیم کیا۔ بقیہ تین طلبہ کو حسب خواہش جناب پرنسپل صاحب اسپیشل انعام دیا گیا۔ اسپیشل انعامات جناب نہال الدین احمد صاحب پرنسپل مسلم ہائر سکنڈری اسکول نے دیا۔

مقالے کے مقابلہ کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت جناب احمد مرزا صاحب ڈسٹرکٹ سیشن جج بنارس نے فرمائی۔ مشاعرہ میں کافی شعرا نے حصہ لیا۔ سامعین کی تعداد بہت کافی تھی۔ اناؤنسر کے فرائض جناب ... صاحب نے انجام دئے۔ مشاعرہ میں مقامی و بیرونی شعرا نے حصہ لیا۔ جناب بابو شیوناتھ پرشاد صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(... جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس)

بزم شعرائے رامپور کے زیر اہتمام مشاعرہ

رامپور ... مارچ یہاں ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب میں جناب محب علی خاں قادری ڈائرکٹر اخبار ناظم کے مکان پر بزم شعرائے رامپور کے زیر اہتمام غالب کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب رگھوبیر شرن دواکر ایڈوکیٹ نے اور سکریٹری کے فرائض جناب شبیر علی خاں شکیب رامپوری نے انجام دئے۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے چند قابل ذکر شعرا کے نام حسب ذیل ہیں۔

جناب پروفیسر ... صدیقی، جناب پروفیسر نجم الدین نقوی رئیس رامپوری، خیال رامپوری، افضل نعمانی، ہوش نعمانی، دور آفریدی، اطہر جمیل نعمانی، ذکی رامپوری، ہلال رضوی، قیس رامپوری، کلیم طوری، شکیب رامپوری، دواکر راہی، جگر مرادآبادی، عروج زیدی بدایونی، دلدار ردولی اور مضطر وغیرہ۔ (ناظم علی خاں)

انجمن ترقی اردو جبلپور کا انتخابی جلسہ

جبلپور ۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو ممبران انجمن ترقی اردو جبلپور کا ایک عام جلسہ برائے انتخاب عہدیداران دفتر انجمن واقع لارڈگنج میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے سکریٹری انجمن نے انجمن کی کارگزاری و آمد و خرچ کا حساب پیش کیا۔ اس کے بعد انجمن کے مستقل سرپرست خصوصی جناب پنا لال صاحب شریواستو ایڈوکیٹ نے انجمن کے کام میں تعاون کرنے کے لیے لوگوں کو توجہ دلائی۔ بعد ازاں شریواستو صاحب ہی کی نگرانی میں انجمن کے نئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ ڈاکٹر پریم چند شریواستو وائس پرنسپل کامرس کالج
نائب صدر۔ نذیر احمد انصاری۔ سکریٹری و خزانچی حافظ محمد خلیل الرحمن خاں غوری جوائنٹ سکریٹری۔ دامودر پرساد چترویدی پرکاش۔ مجلس عاملہ کے لیے ذیل کے ممبران منتخب ہوئے۔ محمد حنیف انصاری لکچرر، دیا شنکر کھرے ایڈوکیٹ، سیٹھ عباس بھائی، محمد خضر حیات، احمد علی خاں اختر مرادآبادی، مدن پرساد تیواری۔ تمام عہدیداران کا انتخاب بالاتفاق بغیر کسی مقابلہ کے بحسن و خوبی انجام پذیر ہوا۔ اس کے بعد مشاعرہ کا دور شروع ہوا جو تقریباً دو بجے رات تک چلا۔

(دامودر پرساد چترویدی۔ جوائنٹ سکریٹری)

انجمن ترقی اردو پورنیہ کا جلسہ

پورنیہ ۔ پورنیہ ضلع انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی ایک نشست ۱۴ مارچ کو جناب وکیل الرحمٰن خاں ایڈوکیٹ کے زیر صدارت ان ہی کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی۔ ضلع کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اراکین مجلس عاملہ نے اس طویل نشست میں موجودہ صورت حال کے تحت اردو تحریک کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنوانے کا جو مطالبہ اور تحریک ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے مگر اس زبان کی ترقی و ترویج۔ اشاعت اور مقبول عام بنانے کی دشوار اور ذمہ داری انجمن ترقی اردو اور اردو داں طبقہ پر ہی ہے حکومت اس عوامی مطالبے اور کئے گئے وعدوں سے روگردانی اور وعدہ خلافی کر سکتی ہے۔ مگر انجمن ہر حال میں اردو کی بقا، تحفظ کے لیے سرگرم عمل رہے گی ہماری سرگرمیوں کا پہلا محاذ عوام میں اردو کے لیے طلب اور شعور پیدا کرنا اور اس زبان کو بچانے کے لیے لاکھوں اردو کے جاں نثاروں میں تن من، دھن کی بازی لگا دینے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ مجلس عاملہ کی نشست نے ضلع کونسل کی تجویز کے مطابق ضلع مجلس عاملہ کے لیے کشن گنج سب ڈویژن سے جناب شمس بلگرامی ایڈوکیٹ، جناب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب، جناب حاجی اشرف علی صاحب اور جناب تسنیم ربانی اور پھلواری سے جناب طلیع الرحمٰن نامزد کئے جناب الیاس صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ضلع انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے دوسری تجویز کے ذریعہ یہ طے کیا گیا کہ پورنیہ ضلع میں کثیر اردو داں آبادی ہونے کے باوجود اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے میں محکمہ تعلیم کی سرگرمی تعلق تشویشناک ہے حکومت کی طرف سے چلنے والے بہت سے اسکول سے ایسی شکایتیں ملی ہیں کہ اردو طلبہ کی مانگ کرنے پر بھی اردو ٹیچر بحال نہیں کئے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو داخلہ دینے سے بھی انکار کیا جا رہا ہے یہ نشست اس ضلع کے تمام پورے پرائمری۔ اپر پرائمری۔ مڈل اسکول دیہاتی اسکول میں پڑھنے والے اردو داں طلبہ اور اساتذہ کی مردم شماری کرنے اور اردو تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں دشواریوں کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل کرتی ہے جن کے ذریعہ پورنیہ صدر کٹیہار پر مشتمل ایک سب ڈویژن میں سب ڈویژنل سب کمیٹی کی تشکیل کرانا ان کے ذریعہ اردو داں طلبہ اور اساتذہ کے اعداد و شمار فراہم کرانا اردو تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں دشواریوں کا جائزہ لینا اور محکمہ تعلیم کے افسران سے مل کر اردو تعلیم کی مناسب سہولتیں فراہم کرانا ہوگا اس کمیٹی کے لیے ذیل کے اراکین منتخب ہوئے۔

(۱) جناب کفیل الرحمٰن خاں ایڈوکیٹ پورنیہ (۲) جناب حفیظ الدین صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۳) جناب ابوالحسن صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۴) جناب محمد زین الحق صاحب ایڈوکیٹ پورنیہ (۵) جناب تسنیم ربانی صاحب کشن گنج (۶) جناب محمد لٰسین صاحب ایڈوکیٹ (۷) جناب مختار احمد صاحب ایم اے کٹیہار۔

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی کی تقریر

علی گڑھ ۱۳ مارچ۔ انجمن اردوئے معلی شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کا جلسہ زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں مانز یونیورسٹی مغربی جرمنی کے ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی نے لسانیاتی نظریہ شعر کے عنوان سے ایک لکچر دیا۔ موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز افلاطون کے نظریہ شعر کی تنقید سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ شاعری حقیقت کی نقل اور احساسات کی عکاسی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری میں جو احساسات اور تجربات پیش کئے جاتے ہیں ان میں اور بچوں کی زبان میں بڑی مماثلت ہے مثلاً بچے اپنے تاثرات اور جذبات کو پیش کرتے وقت زبان کے مروجہ قواعد کی پابندی نہیں کرتے اور من مانے انداز میں زبان کو استعمال کرتے ہیں اور قواعد کی رو سے بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں یہی بات شعرا کی زبان کے سلسلہ میں کہی جا سکتی ہے شاعر حقیقت کو سائنسی اور معروضی انداز میں دیکھنے کے بجائے تاثراتی اور جذباتی انداز کو اختیار کرتا ہے۔ کہا صحیح ہوگا کہ شاعر حقیقت کو پیش نہیں کرتا ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ حقیقت کو اس طرح پیش نہیں کرتا جس طرح کہ ایک سائنس داں پیش کرتا ہے مثلاً جب ایک بچہ کہتا ہے کہ پیڑ بھاگے جا رہے تھے تو اس نے حقیقت کا اظہار کیا لیکن اس میں تاثراتی انداز غالب ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد صدیقی نے بچوں کے انداز اور شعرا کے طریقۂ فکر و احساس کی مماثلتوں کو بعض دوسری مثالوں سے ثابت کرتے ہوئے اردو کے قدیم شاعروں اور بعض جدید شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دیں۔ انھوں نے غالب کے دو اشعار اور جدید شعرا کے دو اشعار کے تجزیے سے یہ ثابت کیا کہ ان اشعار میں حکم ارادے، خواہشات اور جادوئی لفظ MAGICAL WORD کا ایک خاص تناسب ہوتا ہے انھوں نے شاعری کی زبان کی ایک علیحدہ قواعد تیار کرنے پر بھی زور دیا کیونکہ شاعری کی زبان ایک طرح تار کی زبان ہوتی ہے۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو ٹانکی (رانچی) کا انتخابی جلسہ

ٹانکی (رانچی) انجمن ترقی اردو ٹانکی رانچی کا ایک عام جلسہ جناب رحمت اللہ صاحب کے مکان پر ہوا جس میں حلقہ کے تمام حضرات شریک تھے زیادہ تر ہائی اسکول اور کالج کے طلبہ پیش پیش رہے جلسہ بصدارت جناب جمال الدین بی اے منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل حضرات مختلف عہدوں کے لیے منتخب ہوئے

۱۔ صدر:۔ جمال الدین صاحب

۲۔ نائبین سعید احمد صاحب، رحمت اللہ صاحب

۳۔ جنرل سکریٹری:۔ اقبال احمد صاحب، نائبین۔ محمد فاروق صاحب

۴۔ ایم اسلم صاحب

۵۔ خازن:۔ محمد طیب صاحب ممبران منتظمہ شفیق احمد، ابرار احمد، زبیر احمد، جمیل احمد، ارشد جمال، اظہر عالم، محمود الدین، شریف الدین، رفیع عالم، محمد منصور، محمد مشتاق، محمد ایوب، محمد نعیم الدین، محمد نصیر الدین، محمد لیاقت علی، محمد عثمان، محمد اسمٰعیل، محمد خورشید احمد صاحبان۔

R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

سنگ بنیاد نمبر

اردو گھر نئی دلی

جلد ۲۷، شمارہ ۱۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ر اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر کا سنگ بنیاد

جہاں ہم حسنت حرم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے (ریاض)

اردو دوستوں کو مبارک ہو کہ ۲۳ر مارچ کو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے انجمن ترقی اردو ہند کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۷۔ راؤز ایونیو دہلی میں رکھا۔ ڈاکٹر سین کے نرسنگ ہوم سے جو سڑک دائیں طرف (دہلی سے بائیں طرف) جاتی ہے، اس پر تقریباً دو سو قدم چل کر انجمن کو ایک پلاٹ جو تھائی ایکڑ کا ملا ہے۔ اس پر ایک شامیانہ لگایا گیا تھا جس میں یہ تقریب انجام دی گئی۔ حاضرین میں وزیر اعظم کے علاوہ، انجمن کی مجلس عام کے ممبر، پارلیمنٹ کے ممبر، روسی سفیر، دہلی کے علمی و ادبی اداروں کے نمائندے، ادیب اور شاعر، جامعہ ملیہ اور جمعیۃ العلماء کے سربرآوردہ حضرات اور انگریزی اور اردو اخباروں کے کئی نمائندے موجود تھے۔ صدر انجمن اور ان کے ساتھیوں نے وزیر اعظم کا دروازے پر خیر مقدم کیا۔ جب وزیر اعظم شامیانے میں داخل ہوئیں تو سب تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ جلسے کی کارروائی جامعہ کے بچوں نے اقبال کی نظم سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا سے شروع کی۔ اس کے بعد صدر انجمن پنڈت کشور نے وزیر اعظم کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، انجمن کی مختصر تاریخ بیان کی اور وزیر اعظم کو توجہ دلائی کہ اردو کے ساتھ ابھی تک انصاف نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے، اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھیں۔ سنگ مرمر کی سپید پتھر نستعلیق حروف میں پتھر بہت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔ وزیر اعظم نے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد عمارت کے ماڈل کا معائنہ کیا جو میر عمارت ڈی بھرڈواج نے تیار کیا ہے اور اس کے ساتھ انجمن کی تقریباً چار سو مطبوعات کی نمائش دیکھی۔ ڈائس پر واپس آکر انھوں نے نہایت صاف ستھری اردو میں تقریر کی جس میں اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھنے پر مسرت ظاہر کی، اردو کو ایک جاندار اور شاندار زبان قرار دیا اور افسوس ظاہر کیا کہ اردو جیسی قومی زبان بھی فرقہ وارانہ اور تنگ نظری کا شکار رہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ انجمن کی عمارت جلد تیار ہو جائے گی اور اس کے ذریعہ سے انجمن اردو کی اور دیس کی خدمت کر سکے گی۔ اس کے بعد راقم الحروف نے ایک نظم پڑھی جو اس موقع کے لئے کہی گئی تھی۔ پھر پنڈت آنند نرائن ملا نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو علاقائی زبانوں کے ذیل میں شامل نہیں کرنا چاہئے نہ اسے کسی اقلیت سے وابستہ کرنا چاہئے۔ یہ ایک کل ہند زبان ہے اور اس حیثیت سے اس کا تحفظ ہونا چاہئے۔ آخر میں ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین نے نہایت موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور انجمن کے سیکولر کردار اور اس کے عظیم رول کو مختلف مثالوں سے واضح کیا۔ اس موقع پر تعارف کے نام سے ایک کتابچہ بھی تقسیم کیا گیا تھا جس میں انجمن کے کارناموں کی مختصر تاریخ تھی جن میں گویا یادگار تقریب ختم ہوئی۔

ہمارے لئے سب سے ضروری ہے کہ تعمیر کا کام جلد سے جلد شروع کر دیں جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا عمارت کی لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ ہے جس میں سے ڈیڑھ لاکھ انجمن کے پاس سرمائے محفوظ کی شکل میں موجود ہے۔ چھ لاکھ کی رقم ہمیں چندے اور حکومت کی امداد کے ذریعہ سے حاصل کرنا ہے۔ ابھی تک حکومت نے کوئی امداد نہیں دی ہے

نہ ہم اس کی امید میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہ سکتے ہیں ہمیں تو کام اب شروع ہی کرنا ہے۔ اس لیے ہم پھر اردو دوستوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو گھر کی عمارت کے لیے اپنے چندے بھیجیں۔ ہماری ریاستی اور مقامی شاخوں کو خاص طور سے اس کام میں مدد دینا ہے انھیں ایک علاحدہ سرکلر بھیجا جا رہا ہے ریاستی شاخوں کو خود اپنے حالات دیکھ کر ایک رقم مقرر کر لینی چاہئے ہمارا ارادہ دہلی بمبئی، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں ایسے تہذیبی جلسے بھی کرنے کا ہے جن کے ذریعہ سے کچھ روپیہ مل سکے گا۔ "ہماری زبان" کا ایک کالم معطیات کی فہرست کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ ہزار، پانچ سو، سو، پچاس، دس اور پانچ روپے کی رسیدیں بھی چھپوائی جا رہی ہیں ہمیں اردو پر، اردو دوستوں پر اور اپنے پر اعتماد ہے، ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم اس سال کے آخر تک مقلد... اس عمارت کی سنگ بنیاد رکھ کر اس کی تعمیر کا کام جلد سے جلد شروع کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ ہمارے پیچھے نہ حکومت کی طاقت ہے، نہ امارت کی، نہ وزیروں کی سرپرستی ہے نہ افسروں کی پشت پناہی ہمارے پاس خلوص کی دولت اور خدمت کا جذبہ ہے ہم سیاسی گروہ بندی، علاقائی پاسداری، مذہبی اختلاف ان سب سے علاحدہ رہے ہیں۔ خدمت کا راستہ ہم نے سوچ سمجھ کر طے کیا ہے۔ ہم کسی کے آلۂ کار نہیں ہیں۔ نہ کوئی ہمیں بہکا سکتا ہے۔ ہم اپنی زبان و ادب کے لیے، ملک و قوم کے لیے اور انسانیت کے لیے جو راستہ مناسب سمجھتے ہیں اس پر چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ زندگی میں اکثر لمبے راستے سب سے اچھے ثابت ہوتے ہیں اور یقین محکم اور عمل پیہم ہی سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں

آل احمد سرور

"آئینہ خانہ بنے گا جلوۂ صد رنگ کا"

(پروفیسر آل احمد سرور نے یہ نظم دہلی میں "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں پڑھی تھی)

ہم نے کتنے خواب دیکھے خواب آزادی کے ساتھ
بستیاں کتنی بسائیں دل کی آبادی کے ساتھ
خواب کتنے ہی ابھی شرمندۂ تعبیر ہیں
نقش کتنے ہیں جو حسرت سنجِ تعمیر ہیں
یوں تو ساقی مہرباں ہے اور دورِ جام ہے
اپنے مے خانے میں پھر بھی تشنگی کیوں عام ہے
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
یہ دل ... سبزۂ بیگانہ ہے
یہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والی زباں
وادیِ گنگ و جمن کی گود کی پالی زباں
یہ محبت کی زباں حرف و حکایت کی زباں
دین و دانش کی زباں، عرفان و حکمت کی زباں
آگہی کی ترجماں، آدابِ مستی کا نشاں
بلبلِ رنگیں نوائے گلشنِ ہندوستاں
اپنے کھیتوں اپنے کھلیانوں کی خوشبو اس میں ہے
اپنے شہروں اپنے بازاروں کا جادو اس میں ہے
کیسی کومل کیسی چنچل کس قدر پیاری زباں
کیسی گن والی زباں، اور کیسی دکھیاری زباں
شوق کی وادی میں پھر خیمہ بپا ہونے کو ہے
یعنی "اردو گھر" کی دہلی میں بنا ہونے کو ہے
نقشِ نو تعمیر ہوگا دانش و فرہنگ کا
آئینہ خانہ بنے گا جلوۂ صد رنگ کا

ادیبوں کو حکومت ہریانہ کا اعزاز

چنڈی گڑھ۔ ہریانہ کے گورنر جناب بی۔ این چکرورتی نے اردو ادیب خواجہ احمد عباس ہندی ادیب ... اور سنسکرت کے عالم آچاریہ ... ان تینوں کو پانچ پانچ ہزار کی تھیلیاں اور "اعزاز نامہ" پیش کیے۔ انھیں یہ اعزاز حکومت ہریانہ کی زبانوں سے متعلق شعبہ نے ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں دیا ہے (دہلی آواز)

کلکتہ میں شاعروں کی کانفرنس

کلکتہ۔ کلکتہ میں پہلی بار شاعروں کی آل انڈیا کانفرنس ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ اپریل کو ہوگی اس کانفرنس میں مختلف ریاستوں کے ۱۴ زبانوں کے شعرا شرکت کریں گے۔ ... پہلے دن کے اجلاس کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم جناب ترگنا سین کریں گے آرگنائزروں کا کہنا ہے کہ اس قسم کی کانفرنس سے لسانی منافرت دور کرنے میں مدد ملے گی۔ (آبشار)

پرسکار یوجنا سمیتی اترپردیش کا اعلان

لکھنؤ ۲ اپریل۔ حکومت اترپردیش ۶۸-۶۹ کے دوران ادب سائنس قانون اور اصول قانونی فلسفہ اور تاریخ وغیرہ سے متعلق کتابوں پر ۵۰۰، روپے کے انعامات تقسیم کرے گی ریاستی حکومت نے ان انعامات کے لیے ہندوستان بھر کے مصنفوں اور مترجموں سے ہندی اردو اور سنسکرت کی اعلیٰ معیار کی تخلیقات اور ترجمے طلب کیے ہیں۔ انعامات دینے کے لیے صرف یکم جنوری ۱۹۶۷ء اور ۳۱ دسمبر ۶۷ کے درمیان شائع شدہ کتابوں پر ہی غور کیا جائے گا۔ ہر کتاب کے دو نسخے سکریٹری پرسکار یوجنا سمیتی ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کونسل ہاؤس لکھنؤ کو ۱۵ مئی ۱۹۶۸ء تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ (آزاد ہند)

[illegible] اب تک تقریباً ۴۵ ہزار الفاظ کے کارڈ بن چکے ہیں ابھی یہ کام بہت وقت اور سرمایہ چاہتا ہے۔ سردست اسے ملتوی رکھنا پڑا۔

انجمن کا تنظیمی نظام ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے حال میں اس نظام کو جمہوری رنگ دے دیا گیا ہے درجہ بدرجہ مقامی شاخ سے ضلعی ضلعی سے ریاستی شاخیں بنتی ہیں اور ہر ریاستی شاخ اپنا ایک نمائندہ تین سال کے لیے مرکز میں بھیجتی ہے۔ اس وقت ملک میں کل پندرہ ریاستی شاخیں اور ۴۱۳ مقامی شاخیں ہیں جن کے ممبر دو لاکھ ممبر ہیں سب سے زیادہ ممبر ریاست بہار میں ہیں

انجمن کے پروگرام میں کل ہند کانفرنس بھی ہے ادھر آزادی کے بعد ملکی معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے زیادہ کانفرنس نہ ہو سکیں اب تک صرف چار کانفرنسیں علی گڑھ، دلی، کان پور اور پٹنہ میں ہوئیں ہر جگہ اس کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم ہوا۔ حکومتوں کے گورنر، وزیر، لیڈر، ادیب، اور عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی دلی کی کانفرنس میں ادیبوں، شاعروں، معززین شہر اور لیڈروں کے علاوہ اس وقت کے وزیر اعظم اور ہمارے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور محترم وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد نیز اس وقت کے دلی عہد اور اس وقت کے ہز اگزالٹیڈ ہائنس دی نظام نے بھی شرکت کی تھی

اور دوسری جگہوں پر بھی وہاں کے گورنروں، وزیروں، ادیبوں، شاعروں، لیڈروں، اور عوام نے کانفرنسوں میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا

انجمن دراصل ایک علمی جماعت ہے اس کا تعلیمی مزاج ہے یہ ہنگاموں اور شوریدہ سری کی جوگر نہیں ہے اس کے ہر رکن کا ملک کے دستور کی صدا [illegible] اور جمہوریت کے عقیدہ پر پکا یقین ہے اسے عوام پر پورا بھروسا ہے اس لیے کوئی ناانصافی ہوتی ہے تو حتی الوسع دستور اور قانون کے راستے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد بہت سی غلط فہمیاں دانستہ و نادانستہ پھیلائی گئیں اور اہل سیاست میں سے چند عاقبت نا اندیش گروہ اور افراد نے اردو کا چہرہ مسخ کر کے اور اس کا پچھلا ریکورڈ کردار بگاڑ کر ملک کے سامنے پیش کیا۔ بعض حکومتوں نے بھی بے انصافی برتی اور دستور کی اسپرٹ اور وقار کو پس پشت ڈال دیا تو ہم بپھرے نہیں اور نہ آپے سے باہر ہوئے ہماری سچ کی پکار آہستہ آہستہ فضا میں پھیلتی رہی۔ یو۔ پی سے ۲۲ لاکھ، اور بہار سے دس لاکھ اردو دوستوں کے دستخط کا محضر بارگاہ صدارت میں پیش ہوا، اور اس سے زیادہ یہ کہ ہمارے استقلال نے ایسی راہیں تلاش کر لیں جن سے غلط فہمی کے بادل چھٹ گئے بہت سے غلط رد و معیار میں بھٹک رہے تھے صحیح راستے پر آ گئے اور آ رہے ہیں سچائی کا دھیرے دھیرے اعتراف ہو رہا ہے۔ اب مطلع صاف ہو گیا ہے چاند نکلے گا اور عالم دیکھے گا۔

اردو دوستوں کو مبارک ہو کہ آج انجمن کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کے دست مبارک سے رکھا جائے گا۔

فہرست اراکین انجمن

۱۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو (صدر) دلی
۲۔ پنڈت آنند نرائن ملا (نائب صدر) لکھنؤ
۳۔ خواجہ غلام السیدین (نائب صدر) دلی
۴۔ [illegible] دلی
۵ پنڈت سندر لال دلی
۶۔ ڈاکٹر عبد العلیم علی گڑھ
۷ پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ
۸ محمد فضل الرحمٰن علی گڑھ
۹ ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ
۱۰ پروفیسر عبد الاحد سروری سری نگر
۱۱ قاضی محمد عدیل عباسی بستی
۱۲ بیگم انیس قدوائی دلی
۱۳ مفتی عتیق الرحمٰن دلی
۱۴ کرنل بشیر حسین زیدی بمبئی
۱۵ پروفیسر سید احتشام حسین الٰہ آباد
۱۶ ڈاکٹر گیان چند جین جموں
۱۷ گوپی ناتھ امن دلی
۱۸ مولوی حبیب الرحمٰن حیدرآباد
۱۹ مس حمیدہ سلطان دلی
۲۰ حیات اللہ انصاری لکھنؤ
۲۱ بیگم سلطانہ حیات لکھنؤ
۲۲ مولانا امتیاز علی عرشی رامپور
۲۳ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی [illegible] دلی
۲۴ پروفیسر مسعود حسن رضوی لکھنؤ
۲۵ ڈاکٹر مسعود حسین خاں حیدرآباد
۲۶ شاہ معین الدین احمد ندوی [illegible] گڑھ
۲۷ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حیدرآباد
۲۸ راجندر سنگھ بیدی بمبئی
۲۹ سید سجاد ظہیر دلی
۳۰ سید شہاب الدین دسنوی بمبئی
۳۱۔ سکندر علی وجد اورنگ آباد
۳۲ ڈاکٹر نثار احمد دلی
۳۳ گنگا سرن سنہا دلی
۳۴ مالک رام دلی
۳۵ ڈاکٹر اختر اورینوی پٹنہ
۳۶ ڈاکٹر محمد حسن دلی
۳۷ شمیم احمد شمیم سری نگر
۳۸ سری نواس لاہوٹی حیدرآباد
۳۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دلی
۴۰ پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری علی گڑھ
حکومت ہند کے دو نمائندے
ریاستی شاخوں کے نمائندے

پیامات بتقریب سنگ بنیاد اردو گھر

نائب صدر جمہوریہ ہند

"اردو گھر کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر میں اس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک تمنائیں بھیجتا ہوں۔"

نائب وزیر اعظم ہند

"اردو زبان قطع نظر سرکاری سرپرستی کے قومی زندگی میں ایک اہم مقام کی مالک رہی ہے یہ ایک مالدار زبان ہے اس میں انسانی جذبات و خیالات کی بہترین ترجمانی ملی ہے اس کی شاعری کا سرمایہ اس زبان کی شاندار میراث ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس کی ترقی کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں اور ہماری وزیر اعظم ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ کو اردو گھر کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں اس موقع پر تقریب کی کامیابی کا متمنی ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اردو زبان و ادب برابر پھلتا پھولتا رہے گا"

وی کے آر وی راؤ۔ مرکزی وزیر رسل و رسائل

"اردو گھر کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر میں اس کی کامیابی کے لیے نیک تمنائیں بھیجتا ہوں۔"

پروفیسر شانتی کوٹھاری

پروجیکٹ چیرمین انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن

"پروفیسر کوٹھاری اردو گھر کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اردو گھر معراج کمال تک پہنچے۔"

شری ایس جے پوری ممبر پارلیمنٹ

"اردو گھر کی تقریب سنگ بنیاد کی کامیابی کے لیے اپنی نیک [illegible]"

سی ڈی دیشمکھ۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر

"اردو گھر کی تقریب سنگ بنیاد کی کامیابی کے لیے نیک تمنائیں بھیجتا ہوں۔"

امتیاز علی عرشی۔ رامپور

"میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں خدا کرے انجمن کی عمارت کا سنگ بنیاد اس کی نشاۃ ثانیہ کا سنگ میل ثابت ہو۔"

پروفیسر حبیب الرحمٰن۔ حیدر آباد

"خدا کرے یہ تقریب ہر لحاظ سے کامیاب ہو اور اردو کے تعلق سے حکومت کی پالیسی میں خوشگوار تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو"

پیام صدر جمہوریہ ہند

"مجھے یہ معلوم کر کے انتہائی مسرت ہوئی کہ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے دہلی میں "اردو گھر" کی تعمیر کا کام شروع ہو رہا ہے۔ یہ معلوم کر کے اور بھی خوشی ہے کہ اس گھر کا سنگ بنیاد ہماری ہر دل عزیز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں رکھا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ اس سے اردو داں طبقوں میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ جائے گی اور ان کا کام کرنے کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی ترقی کے لیے اس گھر کی تعمیر ایک ایسا نیک شگون ہے جس سے ان لوگوں کو بڑی تقویت ملے گی جو اردو کو پروان چڑھانے میں دن رات اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اردو کا مقام ہماری قومی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ یہ اس تہذیبی مفاہمت کا نشان ہے جس کی بنیاد پر ہماری متحدہ قومیت کی عمارت اٹھے گی

میری دعائیں اور نیک خواہشات ان سب بہی خواہان اردو کے ساتھ ہیں جو اردو اور اردو گھر کی تعمیر و ترقی کی جد و جہد میں مصروف ہیں خدا آپ سب کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔"

مخلص
ذاکر حسین

سری نواس لاہوٹی

حیدر آباد

"اردو گھر کی رسم سنگ بنیاد کی تقریب کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

ان کے علاوہ اور پیامات بھی آئے ہیں اور وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین، وزیر سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ، مہارانی گائتری دیوی، مسٹر ایم آر مسانی ایم سی سیتلواد منتو کھ سنگھ ممبر پارلیمنٹ ایس جی بوس ملک وائس چیرمین ڈی ڈی اے وغیرہ نے اپنی اس روز دہلی میں عدم موجودگی یا کسی اور مصروفیت کی وجہ سے شرکت سے معذرت چاہی۔

تقریب سنگ بنیاد اردو گھر

انجمن ترقی اردو ہند کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند نے راؤز ایوینیو دلی میں رکھا۔

راؤز ایوینیو نئی دلی میں سپریم کورٹ اور تلک برج کے قریب ہے۔ یہاں سے دلی دروازہ، ترکمان گیٹ، رام لیلا گراؤنڈ [illegible] اور میر درد روڈ بھی نزدیک ہیں اس لیے اسے پرانی اور نئی دلی کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔

انجمن کو جس چوڑی سڑک اور کھلی فضا میں جگہ ملی ہے وہاں آس پاس چند اور تعلیمی بھی مختلف اداروں کو [illegible] گئی ہیں [illegible] اور اداروں کا ایک محلہ بن گیا ہے۔ جہاں اداروں کی [illegible] سکونتی مکان نہ ہوں گے آبادیوں کے شور و شغب اور ہنگاموں سے دور ایک پرسکون ماحول ہوگا۔ جہاں علمی اور تعلیمی کام کرنے والوں کے لیے بڑی اچھی سہولتیں میسر آئیں گی اور جب یہاں جلسے اور اجتماع ہوں گے تو نئی اور پرانی دلی والوں کو اکٹھا ہونے میں دقت نہ پیش آئے گی۔

راؤز ایوینیو کے پلاٹوں میں سے انجمن کا قطعہ [illegible] پڑا۔ ۲۳ مارچ کی شام کو یہاں ایک وسیع، خوبصورت اور [illegible] شامیانے میں "اردو گھر" کے سنگ بنیاد کی تقریب منائی گئی

اسٹیج کے ایک طرف انجمن کی قدیم و جدید مطبوعات کی نمائش بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دی گئی تھی جس کے قریب ایک میز پر انجمن کی مجوزہ عمارت "اردو گھر" کا ماڈل (نمونہ) رکھا ہوا تھا اور عمارت سے متعلق چند نقشے آویزاں تھے دوسری طرف سنگ بنیاد تقریباً دو فٹ چوڑا اور تین فٹ لمبا سیاہ سنگ مرمر کا تختہ زنجیروں میں ٹنگا ہوا تھا، اس سیاہ سنگ مرمر پر دو سطروں میں نہایت خوش خط نستعلیق عبارت سنہری حروف میں کندہ تھی عبارت کے آخر میں ایک طرف صدر انجمن پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کا اسم مبارک دوسری طرف معمار عمارت [illegible] صاحب کا نام ثبت تھا، سیاہ چمکدار سنگ مرمر پر سنہرے خوشنما حروف کی کندہ عبارت عجب بہار دکھا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی زبانیں بے اختیار عروس جمیل دلباس حریر کہہ اٹھتی تھیں

ساڑھے پانچ بجے تک اردو دوستوں کے ہر طبقے کے لوگوں سے پنڈال بھر گیا تھا ان میں طلبہ بھی تھے اساتذہ بھی، مصنف، شعراء، ماہر ادب، دانشور، وزیر، صحافی، اراکین پارلیمان سفراء، اور دیگر مشاہیر، ہندو مسلم سکھ، عیسائی غرض ہر مذہب و کیش کے اردو دوستوں کا ایک گلدستہ کھلا ہوا تھا

عادت بہ جمع کردنِ احباب کردہ ایم [illegible] گلے [illegible] دستہ بست

ٹھیک پانچ بج کر چالیس منٹ پر مہمان خصوصی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے قدوم رنجہ فرمایا شامیانے کے قریب جیسے ہی پہنچیں صدر انجمن، دونوں نائب صدر، جنرل سکریٹری اور اراکین انجمن نے باب داخلہ پر ان کا استقبال کیا۔ اور اپنے جلوس میں اسٹیج تک لائے حاضرین نے تعظیم دی، سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو صدر انجمن نے گلابی فیتوں میں بندھے ہوئے انجمن کی چند کتابوں کے دو بنڈل پیش کیے جسے [illegible] نے قبول کیا۔ کرنل بشیر حسین زیدی نے گلپوشی کی رسم ادا کی اور جامعہ کے بچوں کی ایک ٹیم نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ شیریں سروں میں سنایا اور تقریب کا آغاز ہوگیا۔

جنرل سکریٹری نے صدر مملکت نائب صدر، اور نائب وزیر اعظم کے پیغامات تہنیت سنائے۔ صدر انجمن نے خیر مقدمی تقریر کی اس کے بعد وزیر اعظم نے سادہ اور صاف اردو میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے چاندی کی خوشنما کرنی میں مسالا لے کر بنیاد کا پتھر استوار کیا سارے پنڈال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی پھر پروگرام کے مطابق نائب صدر انجمن آنند نرائن ملا صاحب نے آفریں و تحسین کے نعروں میں مختصر تقریر فرمائی، پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری نے اپنی ایک نظم بڑے پرجوش لہجے میں سنائی جو اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھی پوری نظم داد و تحسین کی صداؤں میں سنی گئی۔

آخر میں دوسرے نائب صدر خواجہ غلام السیدین صاحب نے ایک انوکھے انداز میں مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا جس کی ملاحت اور فصاحت سے سب محظوظ ہوئے۔ جن گن من کے قومی ترانے پر یہ پُرلطف اور خوشیوں سے معمور تقریب اختتام پذیر ہوئی

صدر انجمن کی خیر مقدمی تقریر کا خلاصہ

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر انجمن ترقی اردو ہند وزیر اعظم کا خیر مقدم کرتے ہوئے سب سے پہلے ہندوستان کے معمار اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا جنھوں نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کی آزادی کی مہم سر کی اور ہندوستان کو جمہوریت اور سیکولرزم کی راہ پر چلنا سکھایا انھوں نے فرمایا۔

"جواہر لال نہرو ہماری اس مشترک تہذیب کے سچے عاشق تھے جس کی رنگا رنگی ہماری بہت بڑی دولت ہے۔ اس مشترک تہذیب کا ایک شاندار نمونہ ہماری اردو زبان ہے جسے دوسری ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے جواہر لال نہرو کی بیٹی اور مادر ہند کی مایہ ناز دختر سے ہمیں پوری امید ہے کہ وہ ہماری مشترک تہذیب کے انمول رتن اردو زبان کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی یا زیادتی نہ ہونے دیں گی اور ان تمام علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے اردو کی تعلیم اور اس کے چلن کے لیے تمام ضروری سہولتیں فراہم کریں گی۔"

پنڈت کنزرو نے انجمن ترقی اردو ہند کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا۔

انجمن ۱۹۰۳ء میں وجود میں آئی اور ۱۹۱۳ء سے ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے کام کر رہی ہے ۱۹۳۸ء تک اس کا صدر دفتر اورنگ آباد میں رہا اور پھر دلی آگیا جہاں ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں اس کے دفتر پر حملہ ہوا اور مالی اور جانی نقصان کے علاوہ بہت سے قیمتی کاغذات اور کتابیں ضائع ہوگئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اس کے دفتر کی حفاظت کا انتظام کیا اور پھر ان کے مشورے سے اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین جو اب ہمارے راشٹرپتی ہیں اسے علی گڑھ لے گئے جہاں اس کا دفتر ایک کرائے کی عمارت

ہیں ہے۔ اس وقت سے ہماری یہ کوشش تھی کہ ہم پھر انجمن کے دفتر کو دہلی لاسکیں۔ مرکزی وزارت تعلیم نے ہم پر زور دیا مگر زمین کی دستیابی میں خاصا وقت صرف ہوا۔ بالآخر ہمیں رعایتی شرح پر چوتھائی ایکڑ زمین مل گئی ہے اور امید ہے کہ تارا چند کمیٹی کی سفارش کے مطابق عمارت کی تعمیر کے لیے بھی گرانقدر امداد ملے گی تاکہ ہم اردو گھر کے ذریعہ سے اردو زبان وادب کی بقا اور ترقی کے لیے کام کر سکیں اور اردو کے وسیلے سے اپنے وطن اور انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے بتایا کہ انجمن اب تک چار سو کے قریب کتابیں شائع کر چکی ہے اور ان میں بیرونی زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے، تذکرے، دیوان، مختلف علوم پر کتابیں آکسفورڈ ڈکشنری کا ترجمہ، اردو ہندی لغت، کالیداس کی شکنتلا، افلاطون کی ریاست اور گوئٹے کا فاؤسٹ جیسی اہم کتابیں بھی ہیں۔ اس کا تحقیقی تنقیدی رسالہ اردو ۱۹۲۱ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۵۰ء سے اردو ادب کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ہفتہ وار اخبار ہماری زبان، زبان وادب کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس نے ایک جامع اردو لغت تیار کرنے کا بھی پروگرام بنایا ہے جس کے لیے اس وقت بیس ہزار کارڈ بھی تیار ہو چکے ہیں۔

آخر میں پنڈت جی نے کہا کہ ہمیں حکومت سے شکایت ہے کہ ابھی تک اردو کے حق کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اس سلسلے میں صدر جمہوریہ، پنڈت جواہر لال نہرو، [illegible] شاستری اور آپ سے بھی [illegible] کہ ہم اپنی شکایات پیش کر چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن اس موقع پر ہم ان شکایات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس کے لیے ہم دوسرے موقع نکالیں گے۔ اس وقت تو ہمیں یہی کہنا ہے کہ اردو دوستوں میں اس وقت جو افسردگی اور بددلی ہے اس کا جلد دور ہونا ضروری ہے [illegible] ہندوستان زندہ باد اردو [illegible] اس کے بعد پنڈت کشن پرشاد کول نے وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا کہ وہ انجمن کی دعوت پر اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لائیں اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے مبارک ہاتھوں سے یہ رسم انجام دیں۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی تقریر

محترمہ اندرا گاندھی نے فرمایا کہ اردو ہماری عوامی زندگی کی طرح ایک ملی جلی زبان ہے جس کا ملک کے کلچر میں ایک خاص حصہ ہے یہ بڑی جاندار اور شاندار زبان ہے اس نے اپنے دامن میں ملک کے سب لوگوں کی بول چال کا اچھا خاصا حصہ سمیٹ لیا ہے اس کے محاورے ہمارے روزمرہ کی بولی میں داخل ہیں ہمارے دیہات اور شہروں کی زبان میں رچی بسی ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں نے اس کی خدمت کی ہے لیکن بدقسمتی سے اسے [illegible] اور فرقہ واریت میں گھسیٹا گیا ہے حالانکہ اس کا ان دونوں سے کوئی واسطہ نہیں، سچ یہ ہے کہ اس زبان سے پورا انصاف نہیں ہوا ہے اور درحقیقت اردو کو جو نقصان پہنچا ہے وہ سارے ملک کا نقصان ہے۔ یہ بات لوگوں کے سمجھنے کی ہے۔ ہمیں سنجیدگی سے اس پر غور کرنا چاہیے۔

انھوں نے فرمایا کہ آج علم وادب کی اشاعت کا زمانہ ہے مغرب میں ایک [illegible] چھپنے [illegible] ہفتے کے اندر ہی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے شائع [illegible] لگ [illegible] زبان کے لوگ نئے نئے خیالات اور تازہ افکار سے واقف ہو جاتے ہیں آج ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسا ہی چلن رواج پائے اور ملک کی مختلف زبانوں میں عالمی ادب اور لٹریچر کے اچھے ترجمے میسر آئیں۔ انجمن نے یہ کام کیا ہے توقع ہے کہ اب اردو گھر اسے بڑے اور وسیع پیمانے پر سرانجام دے گا۔ انھوں نے فرمایا کہ ملک کی ایکتا ایک بنیادی اور ٹھوس چیز ہے کوئی اختلاف اور سطحی جھگڑا اس کی طاقت اور قوت کو کم نہیں کر سکتا، ہر اختلاف اور تفرقہ محض ایک وقتی اور اوپری چیز ہے جس کا سہارا لے کر بعض لوگ اپنے بیچ میں نقلی دیواریں کھڑی کر لیتے ہیں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے ان دیواروں کو ڈھانے کی کوشش کی اور ہم بھی کریں اسی طرح وہ ہمیشہ ہندوستان کو فروغ اور ترقی دیتے رہے ہندوستان کی سب کی سلامتی اور شان ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو کو ملک کی راجدھانی میں گھر بنانے کا موقعہ ملا ہے اب اسے بہت سی کام کرنے کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ سب سے بڑا کام اتحاد کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے اور اس مہم میں ہر زبان کو اپنا اپنا حصہ ادا کرنا ہے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اردو گھر اس کام میں بھرپور مدد دے گا۔

تقریر آنند نرائن ملا

انجمن کے نائب صدر آنند نرائن ملا نے شریمتی اندرا گاندھی کی شرافت ذاتی اور اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو ایک شریف زادی دمعزز خاتون اندرا گاندھی کی حیثیت سے تو ہم نے یہاں آپ کی کرم فرمائی دیکھ لی اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی اردو کے حق میں کیا کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ شکوے شکایت کا موقع نہیں ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اردو ایک مظلوم زبان ہے۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا جو زبان سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے خود دنیا کی بڑی زبانوں میں چوتھے نمبر پر ہے اور ہندوستان کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر ہے اُسے ایک علاقائی زبان کہا جا رہا ہے اور اس کا کوئی علاقہ بھی متعین نہیں۔ جو زبان مشترک ہندوستانی ثقافت اور تہذیب کی مظہر ہے جو ہر طرح اپنے بقا کی مستحق ہے اُسے برابر نظر انداز کیا جا رہا ہے اور مٹانے کی کوشش جاری ہے۔ کہیں اس کا ٹھکانا نہیں۔ خیر اب اسے چند گز زمین تو مل گئی جسے اس کا گھر کہا جا سکے گا۔ آپ اردو دوستوں کے مطالبات کے ساتھ ہمدردی اور رہنمائی کیجیے اور رہنما اساتذہ دیکھیے پھر دیکھیے ہم آپ کے ہاتھ کس طرح مضبوط کرتے ہیں اور ہم کتنے مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین کی تقریر

انجمن کے نائب صدر خواجہ غلام السیدین نے شریمتی اندرا گاندھی کا سب کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔۔۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہم ان کو تو دیکھ رہے ہیں لیکن ابھی گھر نہیں دیکھ سکتے خدا وہ دن جلد لائے کہ ہم گھر کو بھی دیکھ لیں۔ انھوں نے مہمان خصوصی سے خطاب کرتے ہوئے کہا آپ نے فرمایا کہ میں اردو نہیں جانتی لیکن جس سادہ زبان میں ابھی ابھی آپ نے تقریر فرمائی ہے یہی تو اردو ہے کسی زبان کے جاننے اور سمجھنے کے لیے پڑھنا لکھنا کچھ ضروری نہیں [illegible] کے متعلق بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ اس میں ہندی الفاظ کی گنجائش نہیں ہے حالانکہ ایسے عام فہم اور اردو کے مزاج کے مطابق نہ صرف ہندی الفاظ بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ [illegible]

معاصرین

دہلی کا اردو گھر

پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے ۲۳ مارچ کے روز دہلی میں "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھا تو سوچنے اور سمجھنے والے کتنے ہی بھائیوں اور بہنوں کے سامنے اس دیش کا پورا اتہاس اس طرح اجاگر ہو اٹھا جیسے اندھیری رات میں بادلوں بھرا آکاش لمحہ بھر کے لیے بجلی سے منور ہو اٹھا ہو۔ اور لمحہ بھر کے لیے اس دھرتی کا منظر چمک اٹھا۔

"اردو گھر" اس عمارت کا نام ہے جو نئی دہلی کی ایک سڑک پر بنے گی اور جس میں ہندوستان کی انجمن ترقی اردو کا شاندار دفتر ہوگا۔ اس انجمن کا آغاز آج سے ۶۵ برس پہلے ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ تب سے آج تک اس کے کتنے ہی صدر اور سکریٹری ہوئے کتنی ہی کتابیں اس نے شائع کیں سنسکرت، فرنچ، عربی، اطالوی، جرمن، روسی، انگریزی، اور کتنی ہی دوسری زبانوں کے شاہکار اس نے ترجمہ کرائے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب اس کا دفتر دریا گنج (دہلی) میں جلا دیا گیا اور بیشمار کتابیں تباہ کر دی گئیں تو انجمن کا ہیڈ کوارٹر علی گڑھ میں منتقل کر دیا گیا۔ اب بھارت سرکار کی کرپا سے پھر یہ دفتر دہلی میں آئے گا۔ لیکن اردو کا تعلق صرف اس انجمن سے تو نہیں۔ ۱۹۰۳ء سے پہلے بھی اردو پوری شان و شوکت سے موجود تھی آج بھی اس ملک میں کروڑوں لوگ ہیں جو اردو بولتے، لکھتے اور جانتے ہیں لیکن جنھوں نے شاید کبھی اس انجمن کا نام بھی نہ سنا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ انجمن ترقی اردو والوں کی ضرورت نہیں یا اس نے اردو کو سجانے، سنوارنے اور ترقی دینے کے لیے قابل قدر کام نہیں کیا۔ بلکہ یہ ہے کہ اردو اس انجمن سے بہت بڑی ہے۔ ہر انجمن سے بڑی ہے۔ اس کی عظمت اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس ہندوستانیت کی ترجمان ہے جو پچھلے ہزار برس میں اس دیس کے اندر ایک نئے روپ میں ابھری۔ ایک وقت تھا جب اردو والے بھی اردو کو ہندی کہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت یہی ہندوستان بھر کی سانجھی زبان تھی۔ اس سے پہلے پشتو بھی، پنجابی تھی، کشمیری بھی، برج تھی، اودھی تھی، بہاری تھی اور دوسری متعدد بھاشائیں تھیں۔ ہندی نام کی کوئی بھاشا اس دیش میں نہیں تھی۔ صرف سو یا سوا سو برس پہلے "اردو" میں سنسکرت کے الفاظ شامل کرکے اردو سے دیوناگری لپی میں لکھ کر "کھڑی بولی" کا نام دیا گیا۔ بعد میں اسے "ہندی" کہا گیا۔ تاریخی پہچان یہ ہے کہ اردو سے اس "ہندی" کا جنم ہوا۔ جسے آج ہم زیادہ سنسکرت آمیز بنا کر "راشٹر بھاشا" بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کوشش کے متعلق یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہندی کو ہم نے دیش کی سانجھی بھاشا بنانے کا فیصلہ کیا۔ تو غلط نہیں کیا۔ یہ فیصلہ قائم رہنا چاہیے۔ ہندی کو ملک بھر کے لیے آسان، عام فہم اور مقبول بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ لیکن اس دوڑ بھاگ میں اردو کے ساتھ جو شرمناک سلوک ہوا اسے تو کوئی ذی ہوش آدمی بھلا نہیں سکتا۔ اردو کی خوبیوں کو ہر آدمی نے تسلیم کیا یہ بھی تسلیم کیا کہ اردو نے اس ملک میں سانجھی بھاؤنا کو پیدا کرنے میں بے مثال مدد دی ہے۔

یہ بھی کہ وہ ہندوستان کی اس سانجھی سنسکرتی کی ترجمان ہے جو کسی ایک فرقہ، مذہب یا علاقہ کی سنسکرتی نہیں۔ اردو میں صرف مسلمانوں کے نہیں، آریہ سماجیوں کے، سناتن دھرمیوں کے، سکھوں کے، جینیوں کے، عیسائیوں کے اور ہر مذہب کے دھارمک گرنتھ موجود ہیں۔ ٹھیٹھ ہندی یا پنجابی میں تقریر کرنے والے بھی اپنے طرز بیان کو موثر بنانے کے لیے اردو اشعار اور اردو الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھتے وقت اندرا جی نے بالکل درست کہا کہ "اردو ایک شاندار زبان ہے۔" "ایک جاندار زبان ہے" لیکن اس شاندار جاندار زبان کے ساتھ جو ہندوستان میں پیدا ہوئی پھلی پھولی اور دوسرے رشتوں میں بھی بہو بھی اور جو شری ہردے ناتھ کنزرو کے شبدوں میں عام طور سے "ہندوستان کے گھر کی لکشمی" ہے ہم نے جو سلوک کیا اسے دیکھ کر کس کا دل رو نہیں اٹھے گا۔ کچھ لوگوں نے اس لیے اس کی مخالفت کی کہ یہ ایک خاص فرقہ کی زبان ہے۔ دوسروں نے اس لیے کہ یہ ہندی کی مخالف ہے باقیوں نے اس لیے کہ وہ پاکستان کی زبان ہے۔ حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ اردو کسی بھی فرقہ کی زبان نہیں اس کی ہندی سے کوئی عداوت نہیں وہ اتنی ہی ہندی بھاشا ہے جتنی ہندوستان کی کوئی بھی دوسری بھاشا ہے پوری ذمہ داری سے میں کہتا ہوں کہ اردو کسی فرقہ کی بھاشا نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی وہ یقینی طور پر ایک قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور مذہبی تعصب سے کام لے رہے تھے جن لوگوں نے اسے ہندی کا مخالف کہا وہ خود ہندی کے دشمن ہیں۔ راستے اس بھدی بنائے رہتے ہیں جو اس دیش کے عوام کی بھاشا ہے نہیں اور جنھوں نے اس کو بدیشی بھاشا کہا وہ خود اس بدیشی چال کا شکار ہو رہے تھے جو اس ملک میں انتشار پیدا کرکے اسے تباہ کرنا چاہتی ہے لیکن ان سب باتوں کا گلہ کرنے سے اب کچھ ہوگا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اردو کا بھوشیہ کیا ہے؟ کئی دوسرے دیشوں میں اردو موجود ہے ہندوستان میں اسے ختم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دہلی میں چند گز زمین پر اردو گھر بنے تو اچھی بات ہے۔ لیکن زیادہ ضروری یہ ہے کہ اردو کو وہ گھر دیا جائے جو اس سے چھینا گیا ہے آج کہنے بھر کو اردو دیش کی پندرہ قومی زبانوں میں سے ایک زبان ہے لیکن کسی بھی صوبے کی سرکاری زبان وہ ہے نہیں۔ اردو کا جنم ہوا دہلی میں وہ پھیلی پھلی اور پھولی کشمیر، پنجاب، ہریانہ، یو پی، مدھیہ پردیش، راجستھان، بہار اور حیدرآباد میں لیکن آج ان میں سے ہر صوبے میں دوسری زبانوں کے چرچے ہیں اردو کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اس کی وجہ کو سمجھنا کٹھن نہیں جن زبانوں کو آج ابھارنے کا جتن ہو رہا ہے یہ سب کی سب علاقائی یا صوبائی زبانیں تھیں اردو کسی ایک صوبے یا علاقے کی زبان تھی نہیں ہندوستان بھر کی سانجھی زبان تھی۔ سانجھی زبان کی جو حالت ہوتی ہے وہ اردو کی ہوئی سب نے اپنی اپنی پرائیویٹ جائداد کی طرف توجہ دی سانجھی جائداد کا کیا حال ہو رہا ہے یہ کسی نے دیکھا نہیں حالت یہ ہوئی کہ اردو اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوئی جاتی ہے پچھلے روز شری آل احمد سرور نے اس بات کو اپنے شعر میں نہایت خوب صورت طریقے سے بیان کرتے ہوئے کہا ہے [illegible]

اردو کے ساتھ ناانصافی کا اعتراف

نئی دہلی میں "اردو گھر" کے نام سے موسوم انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے جو تقریر کی ہے اس میں اردو کے ساتھ ناانصافی کئے جانے کا اعتراف کیا گیا ہے۔

وزیر اعظم نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اردو زبان کے سوال کو سیاست اور فرقہ پرستی میں ملوث کر دیا گیا ہے اور یہ توقع ظاہر کی ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ ہمارے ملک میں بنیادی طور پر اتحاد موجود ہے آج جو جھگڑے نظر آ رہے ہیں وہ ختم ہو کر رہیں گے

ہم وزیر اعظم اندرا گاندھی کے اعترافِ حقیقت پر انھیں مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں لیکن ہم ان سے یہ دریافت کرنے کو اپنا حق جمہوری سمجھتے ہیں کہ اردو کے ساتھ اس بے انصافی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور اب جب کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے خود انھوں نے اس بے انصافی کو تسلیم کیا ہے کیا اسے دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسی موقع پر پریسیڈنٹ آنند نرائن ملا نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ اگرچہ اردو ایک آل انڈیا زبان ہے لیکن اس کے ساتھ کی جانے والی بے انصافی کے ماتحت اول تو اسے ایک علاقائی زبان قرار دیا گیا ہے اور دوسرے اس کے لیے کوئی علاقہ بھی متعین نہیں کیا گیا۔ مسٹر ملا نے وزیر اعظم کو اس واقعہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ یوپی کے سابق نائب وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اگر حکومت ہند اجازت دے تو ہم ریاست میں اردو والوں کی دس فیصد آبادی کی بنا پر اردو کو دوسری علاقائی زبان قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن مسٹر ملا نے مزید کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب اردو والے مرکز کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ اسے ریاست کا سوال بتاتا ہے اور ریاستی اربابِ حکومت سے رجوع کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کا تعلق مرکز کے ساتھ ہے۔ اور اس طرح مسٹر ملا نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اردو کے ساتھ ناانصافی کرنے میں ریاستی اور مرکزی دونوں ہی حکومتوں کا حصہ رہا ہے۔

اردو والے اس بات کو جانتے ہیں کہ اگرچہ زبان کا سوال ریاستی سوال ہے لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے اب اس سوال کو ریاستی نہیں کہا جا سکتا اور اگر اب تک اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو اس کی بیشتر ذمہ داری مرکز ہی پر ہے اور انھیں یقین ہے کہ مرکز ہی اس بے انصافی کو انصاف میں بدل سکتا ہے۔

"ہماری زبان"

مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔ (ادارہ)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

پئے تحسین دھن طنز [illegible] امن ہے
ہم کبھی خانہ برانداز نے کرتے ہی نہیں

غالب کے ہمنام سے میرے سنا کے دیکھ
پھر اعتراض ناقدِ فن آزما کے دیکھ

منتظر ہے پاکستان اور میں نہ جاؤں گا
رزم کے معرکے پر طبع آزماؤں گا
چاہتا ہوں بھارت کا نام اونچا ہو
سوچتا ہوں مسجد سے جوتیاں چراؤں گا

شاد نے میرا اور جوش کا جس طرح اپنے حلقوں میں ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی سے مرعوب ہونے والے آدمی نہ تھے۔ شاد ہر معرکے میں حق پر نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی رائی کا پہاڑ بھی بنا لیتے تھے اور ذرا سی بات پر بدگمان بھی ہو جاتے تھے۔ انھوں نے زمانے کے ہاتھوں [illegible] تھے۔ [illegible] کہ وہ کسی نئے آدمی کو غلط کہنے کے لیے گویا [illegible] بیٹھے [illegible] سے اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ بڑے صاف سیدھے اور [illegible] اور [illegible] شاعر ان کی نظمیں اور [illegible] بڑی اہمیت [illegible] ہماری معاشرت کی بعض خرابیوں پر اس طرح طنز کی ہے کہ یہ مرقعے جیرانی ہو گئے ہیں۔ جو لوگ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اور جس طرح بقول عابد پاد "حقیقی تجربات کو زبان دی ہے اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی" انھوں نے غلط نہیں کہا ہے۔

اب اربابِ طریقت جائیں میں نے مے خانے سے [illegible]

بازدید

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

حبیب الرحمٰن کا شمار ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی جیالوجی کا مزاج و معیار متعین کیا ہے۔ اسلوب و فکر کی جدت احساس و جذبہ کی شدت اور تجربہ و خیال کی ندرت ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ "بازدید" ان کی نظموں کا بہترین انتخاب ہے جسے نفیس کاغذ پر سادہ و پرکار گرد پوش کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو کے جدید شعری رجحانات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مجموعے کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت تین روپے [illegible]

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

میرا صفحہ

چند روز ہوئے "ایک تھا شاعر" کے نام سے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر مظفر حنفی کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب پڑھی۔ مظفر حنفی کو شاد سے بڑی عقیدت ہے اور انھوں نے بڑی کاوش سے ان کے متعلق بہت سے مضامین جمع کئے ہیں اور ان کے خطوط بھی جو دستیاب ہو سکے یکجا کر دئے ہیں اس طرح کتاب دلچسپ بھی ہو گئی ہے اور بصیرت افروز بھی شاد کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے اور بیسویں صدی کی اردو شاعری میں ان کا درجہ متعین کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا

شاد عارفی ایک منفرد اور صاحب طرز شاعر تھے زمانے نے ان کے ساتھ بہت ستم کئے وہ مالی پریشانی اور نادری دونوں کے شکار رہے۔ پھر رام پور جیسے شہر میں جہاں جاگیردارانہ ماحول اب بھی باقی ہے ایک آزاد مرد کے لئے اپنی آن بان کے ساتھ برقرار رہنا یوں بھی بہت مشکل تھا۔ وہ ایک محب وطن اور روشن خیال آدمی تھے اور ایک بلند سماجی اور اخلاقی آدرش رکھتے تھے اوروں کی طرح انھوں نے بھی آزادی اور مساوات کے خواب دیکھے تھے اور پھر ان خوابوں کو حسرت ہوتے دیکھ کر چیخ اٹھے تھے انھوں نے اپنے گرد و پیش کی ذہنی اور معاشرتی بیماریوں پر بھرپور طنز کی۔ رام پور ادب اور فن کا گہوارہ رہا ہے انھیں ایک جاندار اور رنگیلی زبان ملی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس بانکی زبان سے جس میں بول چال اور چلن کی ساری طاقت سما گئی ہے سماج کی خرابیوں پر وار کیا۔ یہ شعر دیکھئے ۔

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

ہم خدا کے ہیں، وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا
جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا
خشک ہیں کھیتوں کو پانی چاہئے
کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

ہے تو احمق، چونکہ عالی شان کا شاعر بھی ہے
اس لئے جھک مارنا بھی اس کا فرمانا ہے

سینک سکے ہیں آپ بھی آنکھیں جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

مہر چاہئے اتنا جو ادا نہ ہو پائے روز خانہ جنگی ہو فیصلہ نہ ہو پائے

یہاں چراغ ملے لوٹ ہے اندھیرا ہے کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے محبت اور شباب اسانی لی بھی تصویریں کھنچی ہیں اور انھیں ایک ایسے سور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں

جذبۂ محبت کو بیر بے خطا پایا میں نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

اک عیش بے نام سی خوشبو شامل ہے ہونٹوں کے رس میں

تا حد باغبانی صحرا کرے کوئی لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

شاد پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں اس بات کا رونا بہت رویا گیا ہے کہ سماج نے شاد کی قدر نہ کی حالانکہ بات بہت صاف ہے حریت فکر اور آزادی رائے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ ایک شخص سماج پر طنز کرے اور سماج اسے سر پر بٹھائے۔ ہاں اہل نظر اور دیدہ ور اس شخص کی خوبیوں کو دیکھ لیتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور دوسروں پر اس کی عظمت واضح کرتے ہیں وہ جاگیردارانہ سماج جس میں شاد نے آنکھیں کھولی تھیں اوپری رونق کا قائل تھا، اندر لکڑی گھنی ہوں۔ ظاہر داری، منافقت، دربار داری اور خوشامد اس کا مزاج بن گئے تھے شاد اس ماحول سے باغی تھے انھیں اس بغاوت کی قیمت ادا کرنی پڑی یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ شاد کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اس بغاوت کو ایک تیکھے اور منفرد اسلوب کا روپ دیا۔ انھوں نے بول چال کی زبان کے امکانات کو بڑی خوبی سے واضح کر دیا ان پر جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ مجموعی طور پر ان کی بہت سی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہیں، مگر در اصل ان کے خطوں کی زیادہ اہمیت ہے۔ ان خطوں میں شاد کی شخصیت بڑی روشن ہے۔ وہ بہرحال پٹھان تھے مالی پریشانیوں کے باوجود وہ چوکھی لڑتے رہے۔ زندگی سے انھیں برابر پیار رہا۔ اور اپنی طنز کے تیروں سے اور اپنی نشتر کی سی تیزی رکھنے والی زبان سے اس زندگی پر وار بھی کرتے رہے اور ایک معنی میں اس پر فتح بھی پاتے رہے۔ یہ خط بڑے مزے کے خط ہیں معمولی باتوں اور فرمائشوں میں بھی ایک لطف ہے۔ ان میں ان کی تند و ترش اور بدگمان طبیعت کا بھی بڑا سچا نقشہ مل جاتا ہے اور ان کے بھولے پن اور سادگی کا بھی اور ان کی مارکاٹ کا بھی خطوں کے مطالعے سے ان کے ان اشعار کا لطف اور بڑھ جاتا ہے۔

اس نے جب سو تیر چلائے میں نے ایک غزل چپکا دی

باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲

مالک انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے پرنٹر پبلشر خلیق قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57 — Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۱۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

گورکی کی یاد میں

۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو گورکی کا صد سالہ جشن دن بھارت میں جن دن سوویٹ یونین کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی منایا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے کئی شہروں میں اور یونیورسٹیوں میں گورکی کی یاد میں جلسے کیے گئے اور اس کی عظمت کی طرف اشارے ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ۱۲ اپریل کو ایک خاص جلسہ ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر کی صدارت میں سوویٹ یونین کی سفارت کے ہندی سیکریٹری نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو ادب پر گورکی کا اثر، گورکی کے ڈراما نچلی گہرائیاں (LOWER DEPTHS) کا ایک مطالعہ گورکی کی زندگی اور تصانیف، کے کچھ پہلو گورکی کی عظمت پر مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ گورکی کی آپ بیتی کے اردو ترجمے سے چند اقتباسات اور اس کے ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے ایک ٹکڑا سنایا گیا۔ روس کے ممتاز مصنفین کی تصاویر اور گورکی کی تصانیف کے اردو، ہندی اور انگریزی میں ترجموں کی نمائش بھی کی گئی۔

گورکی ایک طرف روس کے عظیم مصنف ٹالسٹائی، داستوفسکی، چیخوف کے سلسلے کو مکمل کرتا ہے اور دوسری طرف جدید روسی ادب کا پیش رو ہے۔ اس نے جب آنکھ کھولی تو روس میں عوام کی حالت بہت خراب تھی۔ بچپن میں اسے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ برابر جدوجہد کرتا رہا۔ انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے اس کی کہانیوں کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔ وہ تمام انسانوں سے بڑی محبت کرتا تھا اور اس لیے جب اپنے گرد و پیش انسانوں کی پستی اور زبوں حالی دیکھتا تھا تو بہت تلخ ہو جاتا تھا۔ گورکی کے معنی ہی روسی میں تلخی کے ہیں۔ شروع میں اس تلخی پر بڑے اعتراضات ہوئے، مگر کچھ عرصے بعد اس تلخی کی شیرینی کا احساس ہونے لگا۔ گورکی نے نہ صرف روس کے مختلف حصوں کی سیر کی، بلکہ اپنی زندگی کا خاصا حصہ روس سے باہر فرانس اور اٹلی میں گزارا۔ اس کی ناول "ماں" کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی آپ بیتی تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا "میرا بچپن"، دوسری کا "زیست کا دور" اور تیسری کا "میری یونیورسٹیاں"۔ کئی نقادوں کے نزدیک گورکی کی آپ بیتی اس کا شاہکار ہے۔ گورکی سے لینن کی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور لینن اس کا خاصا قائل تھا۔ اسٹالن بھی اس کا خیال رکھتا تھا۔ جب انقلاب کے جوش میں روس کے مصنفین ٹالسٹائی وغیرہ کو طاق نسیاں پر رکھنے کی تلقین کر رہے تھے اور کلاسیکل روسی ادب کو برا بھلا کہا جا رہا تھا، گورکی نے ان کی عظمت کا احساس دلایا۔ کچھ طاقتور لوگ اس کے بھی مخالف ہو گئے تھے اور اگر لینن سے اس کے ذاتی تعلقات نہ ہوتے تو اسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ گورکی کی وہ تصانیف جن میں نچلے طبقے کے افراد کی حقیقی تصویریں ہیں، جن میں ایک بے رحم حقیقت نگاری ملتی ہے یا جن میں تمثیلی انداز میں زندگی کے مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں، غیر فانی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر انسان دوست ہے۔ اسے آدمی کے ہر رنگ سے محبت ہے یہاں تک کہ وہ آوارہ اور خانہ بدوش انسانوں سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس کے یہاں انسان کی عظمت پر ایک ناقابل تسخیر یقین ملتا ہے۔ جن کا رگورکی اور محنت کش نامہ نگار گورکی یا انقلاب روس کے مبلغ گورکی میں فرق ہے۔ اس کے وہ مضامین جن میں اس نے اشتراکی حقیقت نگاری کی تبلیغ کی ہے یا جن میں محنت کش عوام کی برتری کا اعلان کیا ہے، ایک زمانے میں بہت مقبول تھے، مگر آج ان کی وہ اہمیت نہیں جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں تھی۔ بات یہ ہے کہ بڑا ادب کسی ایک ملک یا زمان کی ملکیت نہیں ہوتا، وہ عالمی سرمائے کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ گورکی کے کئی ناولوں اور افسانوں میں اور اس کی آپ بیتی میں فکر و فن ایک دوسرے میں اس طرح حل ہو گئے ہیں اور ان میں ایسی سحر کارانہ حرارت ہے کہ وہ آج بھی اپنی اہمیت سب سے منوا لیتے ہیں۔ پھر اس کے یہاں انسان دوستی کی وجہ سے ایک آفاقیت آ گئی ہے جو ملکوں، طبقوں اور مذاہب کی حد بندی سے بلند ہے۔ اردو میں گورکی کی بیشتر تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی سے بھی اور براہ راست روسی سے بھی۔ ماں اور آپ بیتی کا ترجمہ تو دو دفعہ ہوا ہے۔ اردو ادب کی ایک یہ خوبی رہی ہے کہ وہ عالمی ادب سے برابر اثر قبول کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ٹالسٹائی، داستوفسکی، چیخوف اور گورکی کے تراجم آج بھی اردو والے بڑے شوق سے

ترجمہ ... ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ جو ادب دوسرے ادبیات سے بہت کچھ لیتا ہے وہی بالآخر دوسرے ادبیات کو بہت کچھ دینے کے بھی قابل ہوتا ہے امید ہے کہ عالمی ادب کے شاہکاروں کا ترجمہ اردو میں برابر ہوتا رہے گا اور پھر اردو کے شاہکاروں کا دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی شروع ہو سکے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ غالب کے روسی زبان میں ترجمے کا کام شروع ہو چکا ہے اور بڑے پیمانہ پر غالب کی صدسالہ برسی وہاں اور دوسرے ملکوں میں منائی جائے گی۔

حیدرآباد میں غالب ہال تعمیر ہوگا

حیدرآباد۔ غالب کے صدسالہ جشن کے سلسلے میں حیدرآباد میں جو کام ہو رہا ہے اس میں غالب ہال کی تعمیر بھی ہے یہ ہال پرانے شہر کے محلہ مغل پورہ کی اس زمین پر تعمیر ہوگا جو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی ملکیت ہے۔ تعمیری اخراجات کی فراہمی کے سلسلہ میں طے کیا گیا ہے کہ حکومت آندھرا پردیش، مرکزی حکومت، میونسپل کارپوریشن نظام چیریٹیبل ٹرسٹ اور عوامی عطیوں سے سرمایہ فراہم کیا جائے (ترقی اردو)

غالب کا تلگو میں ترجمہ

آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے غالب کے جشن صدسالہ کے موقع پر غالب کی بیس منتخب غزلیں تلگو رسم خط میں ان کے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں غالب کے فکر و فن سے متعلق ایک کتاب بھی شائع کی جائے گی جس کے نگراں ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقرر کئے گئے ہیں۔ اکاڈمی نے اعلان کیا ہے کہ غالب کی زندگی سے متعلق ایک ڈرامہ بھی لکھایا جائے گا جس پر (۱۱۱۶) روپیہ انعام دیا جائے گا۔ (ترقی اردو)

ہندی کی اشاعت کے لئے پانچ لاکھ رضاکاروں کی بھرتی

آگرہ۔ اس سال کے آخر تک الہ آباد کی ہندی ساہتیہ سمیلن پانچ لاکھ رضاکار بھرتی کرے گی جو ہندی کا پرچار کریں گے یہ رضاکار مختلف علاقوں میں اور خصوصیت سے جنوبی علاقوں میں بھیجے جائیں گے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہوگا اور شاخیں سارے ہندوستان میں ہوں گی۔ یہ رضاکار غیر

ہندی علاقوں میں ہندی کو فروغ دینے کی کوشش کریں گے۔ (الجمعیۃ)

اردو آرٹس کالج کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی زمین کا عطیہ

حیدرآباد۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے کالج کے جلسۂ سالانہ میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ پروفیسر حبیب الرحمٰن سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے (جو اردو آرٹس ایوننگ کالج کے بھی سکریٹری ہیں) کالج کی عمارت کے لئے ایک لاکھ روپیہ مالیت کی زمین کا عطیہ دیا ہے۔ کالج کی عمارت کا کام بہت جلد شروع ہو جائے گا۔ ... کی فراہمی کی مہم عنقریب شروع کر دی جائے گی حکومت اور اردو دوستوں سے توقع ہے کہ وہ وقت کی اس اہم ضرورت کی تکمیل میں ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے (نامہ نگار)

تذکرۂ طبقات الشعراء کی اشاعت

تذکرۂ طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق جس کے قلمی نسخے کتب خانہ صفیہ حیدرآباد اسٹیٹ آرکائیوز آفس (رجسٹر دیوانی و مال) حیدرآباد اور کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں محفوظ ہیں، حال ہی میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کر دیا ہے اسے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے انھوں نے اس کے آغاز میں ستر صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا ہے۔ اس تذکرے پر مفصل حواشی اور متعلقہ حوالے بھی فراہم کئے گئے ہیں جو دوسری جلد میں "تعلیقات طبقات الشعراء" کے نام سے شائع ہوں گے۔ (ملاحظہ)

سکندر علی وجد

آج

آج پر نظر رکھو

اس زندگی ہے یہ ... مختصر اس کا

نام کے رستے یہاں ... وقت کے اندھیرے میں

گم ہوا گزشتہ کل ... خواب، آنے والا کل

آج پر نظر رکھو

اس طلسم حیرت میں ... عہد آفریں ماضی

شاہکار، مستقبل ... ارتقاء کا ہر منظر

قافلے بہاروں کے ... نو جواں حسیں دنیا

آج پر نظر رکھو

صولت ٹونکی کی وفات

ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ راجستھان کے مشہور استاد سخن جناب مولانا سید محمود الحسن صاحب صولت ٹونکی کا ایک طویل علالت کے بعد ۲۹ مارچ کو بعمر ... انتقال ہو گیا آپ کی عمر ... سال کی تھی۔ ان کی وفات نے اہل ٹونک کو ایک دیدہ ور شاعر سے محروم کر دیا۔

(سید سعید احمد برکاتی)

---×---

رحم علی الہاشمی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ پانچ سال

۱۹۴۱ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر میں دلی گیا کہ وہاں کوئی اور روزگار تلاش کروں تو منجملہ اور لوگوں کے مرحوم مولوی عبدالحق سے بھی ملا۔ ان کا احترام میرے دل میں طالب علمی کے زمانے سے تھا مگر ان سے تعارف پہلی مرتبہ حیدرآباد میں ہوا۔ میں نے اپنی کتاب مضمون نگاری کے چار ناول عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرنے کی منظوری کے لئے بھیجے تھے اور وہاں اس پر جن لوگوں سے رائے لی گئی ان میں مرحوم مولوی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے اسے پسند فرماکر محکمہ کو بھیج دیا اور جب ایک صحبت میں میرا ان سے تعارف کرایا گیا تو انھوں نے زبانی مجھ سے میری کتاب کی تعریف کی۔ اس کے بعد پھر میں نواب ذوالقدر جنگ مرحوم کے ہمراہ ان سے دلی میں ملا جب کہ وہ کوٹھی "القریش" میں مقیم تھے اور انجمن کا دفتر پورے طور پر دلی نہیں آیا تھا۔ اس طرح اب دریا گنج میں یہ میری تیسری ملاقات تھی اور میرا خیال تھا کہ اگر انھیں میری ضرورت ہوئی تو وہ ضرور کہیں گے لیکن اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی اور باوجودیکہ مرحوم نہایت شفقت و اخلاق سے پیش آتے میں نے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں کی اور سردست کوئی اور صورت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے سید مسعود علی صاحب کے آرمی پریس میں اسسٹنٹ منیجری کی جگہ منظور کرلی اور وہیں پریس کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اس کے بعد چند مرتبہ مولوی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا مگر پھر بھی انجمن میں ملازمت کی کوئی درخواست نہیں کی۔ چند مہینوں کے بعد انجمن کے منیجر کا ٹیلیفون آیا کہ مولوی صاحب مرحوم مجھ سے ملنا چاہتے ہیں چنانچہ شام کو جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے ہاشمی فرید آبادی صاحب کے پاس بھیجا جنھوں نے مجھے نشر و اشاعت و مطبوعات کے نگراں کا عہدہ پیش کیا جسے میں نے فوراً منظور کرلیا اس لیے کہ مرحوم مولوی صاحب کے ساتھ انجمن میں کام کرنا میں اپنے لیے باعث عزت سمجھتا تھا مگر چونکہ مشاہرہ میری مرضی کے موافق نہ تھا اس لئے میں نے ایک شرط یہ پیش کی کہ دفتر کے اوقات کے علاوہ مجھے اور کام کرنے کی اجازت دی جائے اور ان اوقات میں جو چیز انجمن کے لیے لکھوں اس کا معاوضہ مجھے ماہوار مشاہرہ کے علاوہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ میرے بیوی بچے علی گڑھ میں ہیں اس لئے ہر ہفتہ علی گڑھ جایا کروں گا اور پیر کی صبح کو واپس آیا کروں گا۔ میری یہ دونوں شرطیں منظور کرلی گئیں اور دوسرے دن سے میں نے کام شروع کر دیا۔ چند ماہ بعد دفتر کی کوٹھی میں ایک کمرہ خالی ہوا تو میں اس میں منتقل ہوگیا۔ اس کمرے سے متصل ایک کمرے میں غسل خانہ اور گودام تھا اور اسی میں ایک کونے میں میں نے اپنی نماز پڑھنے کی جگہ اور کھانا پکانے کی جگہ بھی بنالی اس لئے کہ اس کا چھوٹا برآمدہ دھوپ کے رخ پر تھا۔ دفتر کے کام میں مجھے تین چیزیں انجمن کی طرف سے لکھنے کو دی گئیں یعنی ان صفحات اور مرحوم شماری ۱۹۴۱ء جو میں نے دو سال میں ختم کیں اور اس کے بعد اردو انگریزی لغت کی تدوین کا کام جو میں نے اس کے بعد دو سال میں ختم کیا اور اس کا نصف حصہ ٹائپ شدہ اور نصف حصہ مسودہ کی شکل میں مولوی صاحب مرحوم اپنے ساتھ پاکستان لیتے گئے۔

دفتر میں مجھے نشر و اشاعت اور مطبوعات کی نگرانی کے علاوہ پبلسٹی پمفلٹ اردو اور انگریزی میں لکھنا، انجمن کی سالانہ رپورٹ لکھنا اور خاص خاص خطوط جو دفتری عملہ کی استعداد سے باہر ہوتے لکھنا ہوتا تھا۔ بعض خطوط خاص اہمیت کے مجھے خود ہی ٹائپ کرنا ہوتا تھا اس لیے ایک ٹائپ رائٹر اور ٹیلیفون میری ہی میز پر ہوتا تھا۔ اکثر خطوط نہ مجھی سے کہتے تھے کہ تم خود ہی لکھ دو اور ان پر دستخط کرکے بھیج دیتے تھے۔ عموماً میں بہت محنت سے جو لکھتا تھا تو وہ فرماتے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بغیر پڑھے ہوئے کیسے جواب لکھ دیتے ہو۔ ایک مرتبہ ایک طویل خط کے جواب میں ایک بات رہ گئی تو فرمایا کہ یہ بغیر خط پڑھے ہوئے جواب لکھنے کا نتیجہ ہے۔ بعد کو انجمن نے اردو کے امتحانات جاری کئے تو ان کی رجسٹراری کا کام بھی میرے ہی سپرد کیا گیا۔ میرے ہر ہفتہ علی گڑھ جانے کے بارے میں مرحوم اکثر فرماتے کہ آج ان کے سر پر سنیچر سوار ہے۔ مجھ سے ان کا زیادہ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ شام کی چائے پر اور جب کبھی کوئی باہر کا آدمی آتا تھا تو مجھے ضرور یاد فرماتے تھے۔ اس طرح مجھے ملک کی بہت سی مسلم ہستیوں سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ شام کی چائے پر تقریباً روزانہ کچھ لوگ باہر کے مہمان ہوتے تھے۔

مرحوم اکثر بڑے بڑے سیاسی پرائیٹ ہوم دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک روسی تجارتی وفد ہندوستان آیا جس کے لیڈر ڈاکٹر تمر ... تھے اور مرحوم نے اس وفد کو ایٹ ہوم دیا۔ میز پر پنکھا اور پھلوں کے امرود بھی تھے اور ڈاکٹر نے تعریف کی کہ اس پھل کو روس میں بھی امرود کہتے ہیں (غالباً ان کا مطلب ترکستان سے تھا) ایک مرتبہ متعدد معززین کے ساتھ مسز نائیڈو مرحومہ بھی مدعو تھیں اور دوران گفتگو میں انھوں نے کہا کہ اگلے روز ہوائی جہاز سے انھیں کہیں جانا ہے۔ اس پر ایک من چلے مہمان نے کہا "تو کل آپ اڑائی جائیں گی"۔ مسز نائیڈو نے فوراً انگریزی میں جواب دیا: "ابھی تک تو کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ اب میں ساٹھ سال کی ہوں، تم کوشش کرکے دیکھو؟"

اسی دوران میں ہندوستان کو اختیارات حکومت دینے کی گفت و شنید ... ہوئی، انگلستان سے کیبنٹ مشن آیا اور ہندوستان کے لیڈروں سے گفتگو شروع ہوئی تو شام کو میرے بعض اخبار نویس احباب میرے کمرے پر جمع ہوتے اور دن بھر کی ساری باتیں تفصیل سے بتاتے اور اگر دن میں کوئی بہت ہی اہم بات ہوتی تو ٹیلیفون پر مجھے اسی وقت بتا دیتے۔ یہ سب میں صبح کو مولوی صاحب مرحوم سے بتاتا تھا اور وہ بڑی دلچسپی سے سنتے تھے اور تبصرہ کرتے تھے۔

اکثر اصحاب ٹیلیفون پر انگریزی یا عربی وغیرہ الفاظ کے اردو معنی دریافت کرتے تھے۔ عام طور پر میں خود ہی ان کی تشفی کر دیتا تھا اور نہ کر سکتا تو مولوی صاحب مرحوم سے پوچھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے VICIOUS CIRCLE کا ترجمہ دریافت کیا۔ میرے ذہن میں کوئی

[illegible] دیا تو میں نے انھیں ٹیلیفون پر روک کر کہا کہ میں مولوی صاحب سے دریافت کروں، چنانچہ میں نے مرحوم سے دریافت کیا مگر وہ بھی معذور ہوگئے تو میں نے عرض کیا کہ میری سمجھ میں ایک لفظ آیا ہے، حکم ہو تو عرض کروں، فرمایا کہ ضرور کہو تو میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا بہترین ترجمہ چوتیہ چکو ہے مولوی صاحب پھڑک اٹھے اور کھڑے ہو کر فرمایا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا میں نے عرض کی کہ میں سوال کرنے والے صاحب سے کہہ دوں کہ مولوی صاحب نے یہ ترجمہ بتایا ہے۔ فرمایا "ارے نہیں، نہیں، کیا مجھے مرواؤ گے"۔

مولوی صاحب مرحوم ہر شخص سے نہایت اخلاق اور خلوص سے ملتے تھے لیکن جب کبھی کسی بات پر رنجیدہ ہوتے تو کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ انجمن کے دفتر میں ہاشمی فریدآبادی کے علاوہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی بھی رہتے تھے اور آخر عمر میں مولوی صاحب سے [illegible] رہے تھے یہ دونوں گہرے دوست اور رفیق تھے۔ مگر افسوس دریا گنج سے انجمن کے منتقل ہونے کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور انجمن کا کام مولوی صاحب مرحوم کی جگہ چند سال جاری رکھنے کی تمنا دل میں لئے ہوئے انتقال کر گئے۔ ایک دن داغ کی شاعری پر مولوی صاحب مرحوم سے ان سے بحث ہوئی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ آخر میں مولوی صاحب نے کہا کہ میں تو رسالہ اردو میں لکھ کر اس پر بحث کردوں گا۔ اکثر میں لوگوں سے وہ ناراض ہوتے تھے انھیں [illegible] کے لفظ سے یاد کرتے تھے جن لوگوں کے لئے انھوں نے میرے سامنے یہ لفظ استعمال کیا ان کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا لیکن اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی رائے میں کتنے سخت ہوتے تھے۔

ایک دفعہ معین احسن جذبی صاحب مولوی صاحب سے ملنے آئے دوران گفتگو میں نے سوال کیا کہ حالی کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مرحوم نے جذبی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ ان سے پوچھو مگر جذبی صاحب بیچارے مرحوم کے سامنے کیا زبان کھولتے وہ خاموش رہے تو مولوی صاحب نے خود ہی فرمایا "حالی نے غزل کو زندہ کر دیا ورنہ غزل تو مر گئی تھی"۔

ایک مرتبہ میں نے سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کی ایک سو تیرہ غلطیاں نکال کر انھیں دکھائیں تو وہ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ فرمایا کہ سب جلا دو اور اسی خفگی کی بنا پر انھوں نے انجمن کی مطبوعات کے تیرہ بکس جو مختلف ذرائع سے پاکستان روانہ کئے ان میں تقریباً تین سو مطبوعہ ڈکشنری کی جلدیں شامل نہیں کیں جو بعد کو میں نے مولانا آزاد مرحوم کے حکم سے ساڑھے سات ہزار روپیہ میں فروخت کرکے روپیہ ڈپٹی کمشنر دلی کے پاس رکھوا دیا اور جب قاضی عبدالغفار صاحب انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے تو وہاں سے نکلوا کر قاضی صاحب مرحوم کے حوالے کر دیا۔

ابھی دلی میں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کو بھوپال جانا پڑا اور وہاں سے پاکستان چلے گئے ہاشمی فریدآبادی صاحب پنڈت کیفی صاحب اور دیگر دفتری عملہ کے لوگ پہلے ہی کوٹھی چھوڑ کر جا چکے تھے اور صرف مولوی صاحب مرحوم کے ذاتی ملازمین، ایک بوڑھا کاتب اس کی بیوی جو دق کے آخری درجے میں تھی اور اس کی دو چھوٹی لڑکیاں رہ گئی تھیں اور ساری ذمہ داری میرے سر پڑ گئی [illegible] ستمبر کو ایک فوجی کپتان نے وہاں سے نکال کر میرے ایک دوست سید محمد جعفری صاحب کے یہاں محلہ کوچہ چیلاں میں پہونچا دیا۔ دوسرے دن بوڑھا کاتب اور اس کی بیمار بیوی اور بچیاں قتل کر دی گئیں اور ان کی لاشیں کوٹھی کے پیچھے نالے میں پھینک دی گئیں۔ اور سامان جو کچھ لوٹنے والا تھا لوٹ لیا گیا۔ میں صرف ایک قمیص اور پتلون پہنے ہوئے کوٹھی سے نکلا تھا وہی میرے پاس رہ گئے باقی سارا سامان کپڑے برتن کتابیں وغیرہ لوٹ لی گئیں۔ مجھے انجمن کی لائبریری کی فکر سب سے بے چین کئے رہتی تھی چنانچہ میں نے جعفری صاحب کو ساتھ لے کر [illegible] دن چکر لگایا اور مولانا آزاد مرحوم کی وساطت سے [illegible] دریا گنج پر فوج کا پہرہ بٹھوا دیا۔

اس دوران میں مولوی صاحب مرحوم پاکستان سے واپس آئے اور چند دن گل رعنا میں پاکستانی ہائی کمشنر کے ساتھ مقیم رہے۔ میں باوجود شہر کی فضا خراب ہونے کے وقتاً فوقتاً ان سے ملتا رہا اور لکھنے پڑھنے کا جو کام ہوتا وہ کرتا رہا۔ شہر کی فضا کی خرابی کے باوجود مولوی صاحب مرحوم مع اپنی ترکی ٹوپی کے صبح کی چہل قدمی کے لئے نئی دلی کی مختلف سڑکوں پر جانے لگے ایک دن راستے میں انھیں ایک سکھ ملا اور اس نے حیرت سے دریافت کیا کہ آپ کس طرح یہاں ٹہل رہے ہیں جبکہ شہر کی فضا اتنی خراب ہو رہی ہے۔ مرحوم نے نہایت متانت سے کچھ جواب دیا اور دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ مرحوم کے اخلاق کا سکھ اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ دونوں میں دوستی ہو گئی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ صبح کی چہل قدمی کے لئے جانے لگے اور پھر مرحوم چند دن قیام کرکے پاکستان واپس چلے گئے۔

اس دوران میں کوٹھی واقع دریا گنج کے مالک لالہ راج کشن جین نے انجمن کی لائبریری اور بچا کھچا سامان دو کوٹھریوں میں بھر کر کوٹھی ایک ایجنسی کو کرایہ پر دیدی۔ شہر کے حالات کچھ سدھرنے پر مرحوم پاکستان سے واپس آئے اور مطبع مجتبائی چوڑی والان میں مقیم ہوئے اور کتابیں وغیرہ جو کوڑے کرکٹ کی طرح دو کوٹھریوں میں بھری تھیں انھیں ترتیب دینے کا کام چند دیگر افراد کے ساتھ میرے سپرد کیا۔ پہلے دن جب وہ کوٹھی پر گئے وہ کمرہ جس میں وہ رہتے سہتے تھے اس میں کلرکوں کی میزیں لگی دیکھ کر بیقرار ہو گئے مگر بے حد ضبط کے بعد بمشکل، آنکھوں سے صرف اتنا کہا کہ ایسے بیٹھے ہیں جیسے ان کے باپ کا گھر ہو۔ جب تک مولوی صاحب دلی میں رہے میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور ان کا جو کچھ کام لکھنے پڑھنے کا ہوتا اسے انجام دیتا رہا۔ چند روز قیام کے بعد اور بچے ہوئے سامان میں سے ضروری چیزیں لے کر وہ مستقل طور پر پاکستان چلے گئے۔ ایک لوہے کی الماری میں ان کے پانچ سو روپے رکھے تھے وہ کھولی گئی تو روپے محفوظ تھے جو اس وقت ان کے بہت کام آئے۔ میں اس وقت نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں کام کرتا تھا اور مولانا آزاد مرحوم کے حکم سے انجمن کی لائبریری علی گڑھ منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ تیرہ ٹرکوں میں کتابیں لاد کر علی گڑھ بھیجی گئیں۔ جن میں ٹرکیں دن میں لادی جاتی تھیں اور رات کو دلی سے روانہ ہو کر دوسرے دن علی الصباح علی گڑھ پہونچتی تھیں۔ دو ہفتے میں یہ کام انجام پا گیا اور انجمن سے میرے تعلق کا آخری سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسی دوران میں میری بیوی کو بجلی کا شاک لگا اور گرنے سے ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی جس سے کئی دن تک وہ صاحب فراش رہیں مگر میں انجمن کی لائبریری منتقل کرنے کے سلسلے میں اتنا الجھا رہا کہ ان کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

جدید شاعری سے متعلق اب بعض اعتراضات عمومی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، مثلاً۔ کہ یہ شاعری مبہم ہوتی ہے اور ابلاغ و ترسیل کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی، یہ مغرب کی بعض ایسی تحریکوں کی بھونڈی نقالی ہے جو خود مغرب میں بھی از کار رفتہ ہو چکی ہیں، یہ شاعری اپنے ملک کے تہذیبی و سماجی عوامل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ان موضوعات و مسائل کو پیش کرتی ہے جو مغرب میں تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں جدید شاعری کے علمبردار کچھ برخود غلط اور گم کردہ نوجوان ہیں جو اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اپنے ادب کی مسلمہ روایات سے انحراف کر رہے ہیں، ان معترضین کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ شاعری ہمارے یہاں قبول عام کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔

اس قسم کے [illegible] گرامر [illegible] [illegible] [illegible] تھی لیکن اب اس طرح کے اعتراضات ہمارے ان بزرگوں کا بھی تکیہ کلام بنتے جا رہے ہیں جو خود کسی زمانے میں جدید ذہن کی علامت تصور کئے جاتے تھے اور جن کے اجتہادات و تجربات کا تسلسل ہی نئی شاعری کو اس منزل تک لے آنے کا ذمہ دار رہا ہے۔ میں حضرت فراق گورکھپوری کی شاعری اور ان کی تنقید دونوں کا بہت قائل ہوں اور ان کی ذہانت و ذکاوت اور نکتہ رسی کا بارہا اعتراف کر چکا ہوں لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ دنوں پہلے ایک ملاقات کے دوران میں ان کی زبان سے بھی اس قسم کی بعض باتیں سننے میں آئیں۔ اس ملاقات میں بعض مسائل پر کھل کر باتیں ہوئیں اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ فراق صاحب نے آخر میں ان تمام باتوں سے اتفاق کیا جو میری اور ڈاکٹر وحید اختر کی طرف سے پیش کی گئیں۔ اس صحبت میں جناب مخدوم محی الدین اور جناب تنویر داحدی بھی شریک تھے اور ان حضرات نے بھی جدید شاعری سے متعلق ہمدردانہ غور و فکر پر اپنے آپ کو آمادہ پایا۔

فراق صاحب سے اس ملاقات کی یاد ابھی ذہن میں تازہ ہی تھی کہ اتفاقاً میرا ہاتھ اپنے بک شیلف کی طرف اٹھ گیا اور میں نے ایک پرانی کتاب کو جو برسوں پہلے پڑھی تھی اٹھا کر پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ اس کتاب کا نام ہے "نیا ادب میری نظر میں" یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نیا ادب اور نئی شاعری سے متعلق لکھے گئے تھے اور آغا محمد باقر قزلباش نے ۱۹۴۴ء میں یکجا کر کے نگارستان بک ایجنسی دلی سے شائع کئے تھے۔ اس کتاب کے بعض مضامین پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ نیا ادب اور نئی شاعری کے نام سے جو بھی رجحانات شروع ہوتے ہیں ان کے متعلق شکوک و شبہات کی نوعیت قریب قریب یکساں ہوتی ہے۔ یہاں بعض اقتباسات کا اعادہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

نواب جعفر علی خاں اثر فرماتے ہیں:۔

ان بزرگوں کا معروضہ ادب برائے زندگی سل [illegible] اشتراکی [illegible] کا [illegible] ہوا [illegible] ہے جسے خود روس بچاس برس پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ایسی شاعری کیا [illegible] مناسب ہو سکتی ہے جس سے خلا جانے کیسی مقدوم ہو اور جس میں خالق کی رجحانی کے بجائے فرسودہ مذہبی تحریکات کو ہندوستان میں منتقل کر کے ان کی مبالغہ آمیز اور بھونڈی نقالی کی گئی ہو۔ وہ بھی محض الفاظ میں۔ جبکہ ان کے عمل میں ان کے دشمن بیٹھے ہیں۔ یہ ایسی شاعری ہے جو کسی خاص مقصد کی تکمیل اور اظہار کے لیے وجود میں آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہے۔ اس کے اچھالنے والے چند گم کردہ مدعا، برخود غلط نوجوان ہیں اور بس!

خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔

"بات یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں سطح عام پر آنے کی ہوس تو ہوتی ہے مگر صلاحیت نہیں۔ بس وہ نئے نئے روپ دھار کر حلیہ بگاڑ کر سامنے آتے ہیں کہ شاید اسی ڈھنگ نظروں میں

مرغوب حسن، حال

غزل

میرے سینے [illegible] کی [illegible] کڑی ہے
ناکردہ گناہوں کی سزا مجھ کو ملی ہے

[illegible] کوئی [illegible]
[illegible] غم [illegible] ہے

[illegible]
[illegible] ہے

رنگین نظاروں کو بھی گو [illegible] حاصل
ماضی کی کہانی [illegible] کتابوں میں پڑھی ہے

احساس کے ویرانے میں مدت سے پریشاں
خواہش مری تکمیل کا گھر ڈھونڈ رہی ہے

چڑھ جائیں۔ انھیں جان لینا چاہئے کہ اس طرح اہلِ نظر کی نظروں پر نہیں چڑھ سکتے۔"

"ان بے تکی باتوں کا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قوم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہے اس حالت جذب میں جو منھ سے نکل گیا وہی اس دور کا ادب ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ حالت جذب دنیوں آپ جیسے چند لوگوں پر کیوں طاری ہوئی دوسرے بھی تو انھیں حالات میں لکھ رہے ہیں اور بامعنی لکھ رہے ہیں۔"

"لفظ شعر کا اطلاق کلام موزوں یا قافیہ پر ہوتا ہے۔ جناب جس حرف نویسی کو شعر کہہ رہے ہیں وہ اس تعریف میں نہیں آتی۔"

"بندہ نوازان کا قافیہ تنگ ہے۔ اسپ طبع لنگ ہے۔ ذوق سلیم دست زیر سنگ ہے۔ نظم کی حدود کے تحت اظہار و آلات پر عبور نہیں۔ بحر میں رہ کر شاعری دکھا نہیں سکتے اس لئے سات سمندر کی بے بہرہ شاعری لائے ہیں اور اس کو قوم پر نازل کرنا چاہتے ہیں"

جناب ماہر القادری کے ملفوظات یہ ہیں

"نئے ادب کے علمبردار تو کچھ کم سمجھ سکے ان کی کثرت تعبیر نے اس خواب ہی کو پریشان کر دیا۔ ہاں میں ترقی پسند ادب کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پریشان خیالی، انتشار ذہنی، بے ربطی اور مہمل گوئی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر طبیعت کو وحشت ہونے لگتی ہے اور وہ لٹریچر جس میں اُنس نہ ہو، جاذبیت نہ ہو خواص و عوام کے کسی طبقے میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔"

"بلینک ورس کی جتنی نظمیں اس وقت تک ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک نظم بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے اردو ادب میں کوئی درجہ دیا جا سکے۔ بعض مصرعے یا ٹکڑے البتہ شگفتہ ہیں لیکن بلینک ورس کے دوسرے بے ربط اور بے تکے اجزا سے مل کر یہ شگفتگی بھی مذاق بن کر رہ گئی ہے بلینک ورس میں ذہن انسانی کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور شعر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ سامع کا ذہن شعر سن کر اثر قبول کرے بلینک ورس میں آہنگ، ترنم اور تناسب کا فقدان ہے اور شعر انھیں جیسں اجزا سے ترکیب پاتا ہے۔ بلینک ورس شاعری کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ مذاق اگر مذاق سمجھ کر کیا جائے تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن جب مذاق کو فکر و سنجیدگی سے تعبیر کیا جائے تو یہ دعویٰ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بلینک ورس اردو شاعری میں ایک تجربہ ہے۔ ہمیں تجربہ کے نتیجے کا انتظار کرنا چاہئے ابھی شور مچانے اور واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ بعض تجربے ایسے بھی ہیں جن کی خطرناکی اور مضرت ابتدا ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے تجربوں کا ابتدا ہی میں گلا گھونٹ دینا چاہئے تاکہ آگے چل کر مضرت اور برائی کی اشاعت نہ ہو سکے برائی اور غلطی کو ڈھیل دینا عقلمندی کی بات نہیں۔ ہر جگہ رواداری اور تحمل کا استعمال اچھا نہیں ہوتا۔

ایک ناموزوں طبع آسانی کے ساتھ بلینک ورس کہہ سکتا ہے۔ اس طرح بلینک ورس کے حامی ناموزوں طبع اشخاص کو شاعروں کی صف میں لانا چاہتے ہیں اور وہ جن کو شعر گوئی کی صلاحیت ہی قدرت سے ودیعت نہ کی گئی ہو خود کو شاعر سمجھ کر ایسے غیر شاعرانہ افکار سے جو ظلم ڈھائیں گے اس کے نتائج کی المناکی سے میرا تو دل کانپا جاتا ہے۔"

"ہمارے یہ انگریزی پڑھے ہوئے آزاد خیال شعراء جو ہر آن انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں مغرب سے ذہنی طور پر اس قدر مرعوب ہیں کہ بلینک ورس کو جو اردو شاعری کے مزاج کے مخالف ہے اردو شاعری پر زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ بلینک ورس غلامانہ ذہنیت کی نشانی ہے اور ظرافت تو یہ ہے کہ اس مرعوبیت، غلامی اور محکومیت کو جدت اور آزاد خیالی کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔"

"نیا ادب زبان و ادب میں بدنما جدتوں کا اضافہ کر کے اردو کو تباہ کر رہا ہے اور اگر اس بے راہ روی کا سدباب نہ کیا گیا تو اردو زبان ایک ٹوٹا ہوا ساز بن کر رہ جائے گی اور اس میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی"

پروفیسر حامد حسن قادری کے مضمون کے بعض اقتباسات دیکھئے۔

"اگر ایک طرف پھیکی شاعری ہے تو ایک قسم مبہم شاعری کی بھی انقلاب پسندوں نے شروع کر دی ہے یعنی ساری نظم پڑھنے کے بعد کوئی مدعا و مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ صرف مرکزی خیال اور اصل مضمون تو مل جاتا ہے لیکن خیالات کی کڑیاں مربوط نہیں ہوتیں۔ کیا یہ ذا ابہام میں مطلب ادا کیا جاتا ہے مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی نظم "رس بھرے ہونٹ" کو دیکھئے (پوری نظم نقل کی ہے) اس نظم میں تشبیہ و ترکیب

تلفظ کی خامی سے قطع نظر پورا مضمون مبہم و غیر واضح ہے۔"

"ایک مبہم شاعری اور دیکھ لیجیے۔ فیض احمد فیض کی نظم "تنہائی" ہے۔ یہ تنہائی کا تصور ہے لیکن صاف و مسلسل نہیں۔ اگرچہ ن۔م راشد اس نظم کو حسین اور انتہا درجہ کی اثر آفریں نظم قرار دیتے ہیں۔"

"جن نظموں کو میں نے مبہم کہا ہے ان کا انداز یہ ہے کہ شاعر ایک مضمون سوچتا ہے اور اس کو صاف و معین الفاظ میں لکھنے کے بجائے استعارہ و کنایہ میں بیان کرتا ہے۔ اس کے لیے اصطلاحیں تجویز کرتا ہے نشانات و علامات مقرر کرتا ہے اور یہ سب کچھ شاعر کے ذہن میں ہوتا ہے۔ بادی النظر میں اور ظاہر الفاظ سے نظم کا کچھ اور مطلب ہوتا ہے اور شاعر کا مقصود کچھ اور۔ یہ پیرایہ و اسلوب فی نفسہ درست ہے نہ صرف درست بلکہ بلیغ ہے اور کچھ جدید شاعری کی ایجاد بھی نہیں ہے، ہر زبان و ادب کی شاعری میں موجود ہے لیکن وہاں وہ علامات و اصطلاحات مقرر ہوتی ہیں۔ ہر شخص ان کے ظاہر و مخفی معنی سمجھ لیتا ہے۔ نئی نظموں میں اصل مقصود بطن شاعر میں رہتا ہے اس لیے ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔"

"اسی سے ملتا جلتا ایک اور اسلوب بھی نئی تخئیل کی بدولت وجود میں آیا ہے اس پر کبھی مفصل لکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ پیرایہ غزل جدید میں پیش کیا گیا ہے مثلاً اس شعر کو پڑھیے۔

دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں
ان وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا

(فراق گورکھپوری)

اور اس کا مطلب سوچیے۔ شاعر کیا کہتا ہے؟ حسن کی سحر کاریوں کا دم لینا کیا؟ اور دم لینے کے لمحے وقفہ ہائے کفر کیوں اور ان وقفوں کو ایمان بنا دینا کیا؟ سوچ لینے کے بعد خود شاعر کی مندرجہ ذیل تشریح پڑھیے (فراق صاحب کے ایک مضمون سے اقتباس)۔

اب اسی شعر کو پڑھیے۔ کیا بانکا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن کیا یہ بانکپن تشریح معلوم ہونے سے پہلے بھی ان الفاظ میں تھا؟ یہی میرے نزدیک ابہام ہے۔"

"مقصود یہ ہے کہ کلام میں ابلاغ (کمیونی کیشن) سب سے ضروری چیز ہے۔ بات ایسے الفاظ اور پیرایے میں کہی جائے کہ سننے والا سمجھ سکے۔"

حامد حسن قادری مرحوم نے فراق کے متعدد اشعار پر عمل جراحی کرکے بتایا ہے کہ ان میں ابہام ہے اور ان کا ابلاغ خاطر خواہ نہیں ہو سکا ہے۔ قادری صاحب کے اس مضمون کے مطالعے کے دوران میں مجھے فراق صاحب کا وہ فقرہ یاد آیا جو انھوں نے پچھلی ملاقات میں کہا تھا کہ "بھائی نئے شاعروں کے یہاں ابلاغ و ترسیل نہیں ملتی اور سنا ہے وہ اس کے قائل بھی نہیں۔ پھر اپنا کلام رسالوں میں کیوں چھپواتے ہیں۔"

مگر قادری صاحب نے فراق صاحب کے شعروں میں عدم ابلاغ و ترسیل کو ثابت کرنے کے بعد یہ سطریں بھی لکھی ہیں۔

"یہ ضرور ہے فراق صاحب نے رموز و اشارات سے کام لیا ہے لیکن جن حقائق و نظریات کو بیان کیا ہے وہ خود ابھی جدید رسائل اور اردو زبان کے ارباب شعر و ادب میں شائع و معروف نہیں۔ عوام کا کیا ذکر ہے خواص میں بھی بہت سے ان مسائل کو نہیں جانتے اور جو واقف ہیں ان کے ذہن میں بھی ہر وقت یہ چیزیں اسی طرح حاضر نہیں رہتیں کہ شعر پڑھتے وقت ان کی طرف انتقال ذہن ہو سکے اس لیے فراق صاحب کے یہ اشعار [illegible] قبل از وقت ہیں۔ عصر حاضر اور نسل موجود کے لیے نہیں ہیں لیکن یہ اشعار شاعر کے کلیات میں ثبت و محفوظ رہنے چاہئیں۔ جو ہستیاں ابھی منتظر تخلیق ہیں ان کے وجود میں آنے تک ممکن ہے یہ طرز و اسلوب اور یہ علوم و حقائق روز مرہ کی باتیں ہو جائیں اور شعر و ادب میں رمز و کنایہ کی دلالت ان مسائل کی طرف واضح اور صریح ہو جائے۔"

قادری صاحب کے ان خیالات کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اس زمانے کے بزرگوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو نئی شاعری کے ابہام پر معترض ہونے کے باوجود اس بات کی گنجائش رکھتے تھے کہ طرز و اظہار و اسالیب کی یہ تبدیلیاں اگر آج نہیں تو کل ہمارے لیے گوارا ہو جائیں گی اور آنے والی نسلیں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات سے فائدہ اٹھائیں گی اس لیے وہ اس بات کے حق میں تھے کہ اس طرح کے کلام کو ثبت و محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر جب فراق صاحب جیسے جدید غزل گو اور مجتہدانہ اسلوب کے مالک کسی لمحے میں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ نئے شاعر اپنی مبہم شاعری کو چھپواتے کیوں ہیں جب کہ وہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتی تو بڑی حیرت ہوتی ہے اس لیے کہ اس طرح کی باتیں تو خود فراق صاحب کی اٹھان کے زمانے میں ماہر القادری اور خواجہ محمد شفیع جیسے حضرات کی زبان سے سننے میں آتی تھیں جو بے چارے ایک طرح سے معذور تھے۔ ہم تو فراق صاحب کو حامد حسن قادری صاحب سے بھی آگے دیکھنے کے متمنی ہیں اس لیے کہ نئی شاعری میں بہت سے ایسے عناصر شامل ہیں جو خود فراق صاحب کی اپنی [illegible]

مراسلات

اردو بھون

اردو کی مٹھاس اور شیرینی کے شیدائیوں کو جناب مسعود حسن صاحب سے ضرور اتفاق ہے لیکن اب جب کہ کمیٹی نے "اردو گھر" کے لیے تصفیہ کر دیا ہے تو سالفہ بحث اور تکرار کو مارہ کرنا مناسب نہیں حیدرآباد نے اپنی عمارت کا نام اردو ہال (HALL) رکھا اور وہ مقبولِ عام ہوا دلی اگر اردو سنٹر (CENTRE) نام رکھتا تو غیر اردو داں بھی سمجھ جاتے کہ کیا عمارت ہے۔ (سجاد مرزا)

ہماری زبان میں حصۂ نظم

۲۲؍مارچ کے "ہماری زبان" میں جناب مبر عرفانی صاحب کا مراسلہ دیکھا مراسلہ نگار کا شکوہ بجا ہے کہ اس پرچے میں حصۂ نظم کی کمی اکثر اہل ذوق کو گراں گزر رہی ہے۔ موصوف نے جو سوالات قائم کئے ہیں ہر صاحب ذوق کے نزدیک ان کا جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے۔

حصۂ نظم نثر سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے، نہ کوئی اہل ذوق حصۂ نظم کی افادیت سے منحرف ہو سکتا ہے اور نہ حصۂ نظم ناظرین ہماری زبان کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پڑھنے والوں میں اکثریت شعرا اور ادبا ہی کی ہے اور شعر و سخن ان دونوں طبقوں کے لیے غذائے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں عرفانی صاحب کے خیالات سے پورے طور پر متفق ہوں اور یہ رائے رکھتا ہوں کہ "ہماری زبان" میں حصۂ نظم کے لئے کم از کم ایک ورق ضرور مخصوص ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ یہ اس زبان کا رجحان ہے جو شعر و نغمہ کی زبان ہے اور گلستان غزل کی جان ہے۔

امید ہے کہ دوسرے شعرائے کرام اور ادبائے محترم میرے خیال سے تائید فرمائیں گے۔ (حافظ دھام پوری)

(۲)

ہماری زبان ۲۲؍مارچ ۷۸ء کے شمارے میں کسی صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حصۂ نظم کو وسعت دی جائے یا اس سلسلہ کو یکسر ختم کر دیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری زبان میں حصۂ نظم کو مناسب جگہ ملی ہوئی ہے اس پر تشنگی کا گلا جائز نہیں۔ کیونکہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے بہت سے پرچے پڑے ہوئے ہیں۔ حصۂ نظم کی جگہ میں کمی کرکے ادارہ ہماری زبان نے ادب نوازوں پر احسان عظیم کیا۔ اس کے لیے ان کا احسان مند ہونا چاہئے نہ کہ معترض۔ کیا اس طرح ادب نوازوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتے اور نایاب مواد حاصل نہیں ہوتے ان انمول اشیاء کی جگہ شعر و شاعری قابض ہو جائے کیا قارئین ہماری زبان اس بات کو پسند کریں گے؟ ہماری زبان کے صفحات کا ایک ایک انچ قیمتی ہے جس کی حفاظت لازمی ہے۔ میں تو اتنا کہوں گا کہ حصۂ نظم کو ہماری زبان سے ختم ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

ہماری زبان کے قیمتی صفحات کیا اس لیے ہیں کہ انھیں شعر و شاعری کی نذر کر دیا جائے؟ اگر نہیں تو پھر نثر اور نظم کی بحث ہی کیا؟ سیکڑوں غیر معیاری کلام سے ایک معیاری کلام شائع کرنا بہتر ہے۔

ہماری زبان کے صفحات جس طرح علم داں طبقہ کو مستفید کرتے ہیں کیا اس کا نعم البدل کہیں اور ملتا ہے؟ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ اس کا موازنہ دوسروں سے کیا جائے۔ ایک علمی اور تفریحی جریدہ میں فرق ہوتا ہے اور اسی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے معترض کو اعتراض بھی کرنا چاہئے۔

(ایم۔ اے نظر کلکتہ)

مرزا غلام علی عشرت بریلوی

مرزا غلام علی عشرت بریلوی (المتوفی ۱۲۳۶ ہجری وابستہ دربار رامپور) کی حیات اور ان کے کارناموں خصوصاً ان کی نثری داستان داستان ... بیان" پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں واقف کار حضرات مندرجہ ذیل امور سے مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(۱) کیا "داستان سحر البیان" کے تین نسخوں (رضا لائبریری رامپور، خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ اور پروفیسر ذکی الحق صاحب) کے علاوہ کوئی اور نسخہ کہیں ہے۔

(۲) "دیوان عشرت"، "مثنوی ریاض العین" اور "یادگار مادت" کے علاوہ ان کی شعری و نثری تصنیفات اور کون کون سی ہیں؟

(۳) کوئی صاحب ان کے خاندان سے اگر تعلق رکھتے ہوں تو مہربانی فرما کر مجھے آگاہ کریں۔

(۴) کسی ایسی تصنیف کی نشان دہی کی جائے جس میں رامپور اور نوابان رامپور کی سیاسی، تاریخی، ادبی اور معاشرتی زندگی کی تفصیل ہو اور خصوصیت سے دبستان رامپور کی وضاحت کی گئی ہو۔

(احمد سجاد کوارٹر نمبر 3/2 K ریاتو ہاؤسنگ کالونی رانچی)

اردو کی کہانی شعرا کی زبانی

میں اس نام سے اردو زبان و ادب پر لکھی گئی نظموں کو مرتب کر رہا ہوں جس کا دیباچہ اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" بمبئی لکھ رہے ہیں اور جو مسرت بک ڈپو پٹنہ ۶ سے شائع ہو رہی ہے۔ شعرا حضرات اپنی نظمیں اور مختصر سوانح جلد از جلد ارسال فرما کر ممنون کریں۔

(مناظر عاشق ہرگانوی۔ ہرگانواں بر گھیہ مونگیر (بہار))

انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی جشن غالب کمیٹی

بھوپال اور مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات منانے کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ صوبائی انجمن ترقی اردو کے صدر جناب فخر الدین اور جنرل سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے انجمن کی تمام شاخوں اور اردو دوستوں کے نام ایک مشترکہ اپیل میں "ہماری زبان" کے ۱۵ اپریل والے اداریہ کی اس بات پر زور دیا ہے کہ "اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے زیادہ کوشش کریں جس نے غالب جیسا شاعر پیدا کیا۔" اپیل میں مزید کہا گیا ہے کہ سارے اردو دوستوں کو مل جل کر پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔ شہر بھوپال کی انجمن ترقی اردو کے ممبران مجلس عاملہ اور ممبران کونسل کے مشترکہ جلسہ میں جو حال ہی میں منعقد ہوا تھا، غالب کی برسی کے سلسلے میں زیادہ شان کے ساتھ تقریبات منانا طے کیا ہے۔ اس جلسہ نے جناب ایم عرفان صدر شہری انجمن کی سربراہی میں ایک کمیٹی بھی پروگرام کی ترتیب و تکمیل کے لیے تشکیل دی ہے۔ پروفیسر حسن مسعود اس کے کنوینر ہیں۔

(حسان [illegible] آفس سکریٹری مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو)

جشن غالب کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو ہند شاخ بنیا پوکھر کلکتہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو ہند، شاخ بنیا پوکھر کی مجلس عاملہ کی ایک نشست ۳۱ مارچ ۶۸ء اتوار کو منعقد ہوئی جس میں ایک سب کمیٹی کی تشکیل اس مقصد کے ماتحت کی گئی کہ وہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ایک موزوں و مناسب اسکیم مرتب کرے۔

(ادریس انور۔ جنرل سکریٹری)

دائرۂ اردو گیا کی ادبی نشست

دائرۂ اردو کی بارہویں ماہانہ نشست ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام سید علی مظفر نواب کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر باسودیو نندن صدر شعبۂ ہندی گیا کالج گیا نے "ہندی ادب میں ظرافت نگاری" پر اظہار خیال کیا۔

ظرافت نگاری کی مقبولیت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر باسودیو نندن نے بتایا کہ ہندی کی ابتدائی ظرافت نگاری زبردستی کی ہنسی تھی اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں ظرافت اپنے صحیح اور اصلی رنگ میں ابھری ہے۔ سماجی مسئلوں کی کمزوریوں پر ظرافت اور ہجو کے تیر چلنے شروع ہوئے۔ ہیڈ حسب نارسی اور کاکا ہاتھرس ہندی شاعری کے نامی ظرافت نگار شاعر ہیں۔ اکبر الہ آبادی کا رنگ ہندی شاعری میں بہت مقبول رہا ہے۔ اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر باسودیو نے بتایا کہ ابھی اعلیٰ ظرافت کے نمونے اب تک ہندی ادب میں

کم ہیں۔ نو بجے پروفیسر افصح ظفر کے اظہار تشکر کے بعد نشست برخاست ہوئی۔ (م۔م۔ عالم سکریٹری نشر و اشاعت)

سہ لسانی فارمولے میں اردو کو شامل کیا جائے

حیدرآباد۔ ریاستی اسمبلی میں لسانی قرار داد کی منظوری سے اردو کے بہی خواہوں میں تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس پر غور کرنے اور سہ لسانی فارمولے میں اردو کو شامل کرانے کے لیے از سر نو جد و جہد شروع کرنے کی خاطر اردو کی مختلف تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں، اراکین اسمبلی اور ممتاز شہریوں کا ایک جلسہ ۲۴ مارچ کو اردو ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب میر احمد علی خاں صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کی۔ طے کیا گیا کہ حکومت کو اردو داں [illegible] سے باخبر اور ان کے مطالبات سے واقف کرانے کے لیے ایک جلسۂ عام منعقد کیا جائے جس میں شرکت کے لیے چیف منسٹر، وزیر سرکاری زبان، وزیر قانون کو دعوت دی جائے اور اس موقع پر ایک میمورنڈم پیش کیا جائے۔

[illegible] کا مسودہ جلسہ سے قبل گشت کروا دیا گیا تھا جس میں پروفیسر [illegible]، نواب میر احمد علی خاں، [illegible]، پروفیسر سید الدین خاں [illegible] نے ترمیمات [illegible] کے بعد متفقہ طور پر منظوری کی۔ میمورنڈم میں ترتیب دیا گیا۔ میمورنڈم میں ملک کی لسانی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اسمبلی میں قرار داد [illegible] سے پیدا ہونے والی [illegible] کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو [illegible] مایوسی اور بے چینی کا [illegible] مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو مادری زبان والے بچوں کو اپنی مکمل تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرنے کا موقع حاصل رہے۔ دوسری زبان کی حیثیت سے تلگو لازمی طور پر پڑھائی جائے، جو ان کے لیے انگریزی اور ہندی سے زیادہ ناگزیر ہے۔ تیسری زبان کی حیثیت سے انگریزی یا ہندی میں سے کوئی ایک زبان پڑھنے کا انھیں اختیار ہونا چاہیے۔

عام طور پر یہی خیال ظاہر کیا گیا کہ یہی ایک فارمولا اردو والوں کے حقوق کی ضمانت دے سکتا ہے اور ان کی بے چینی اور بے اطمینانی کو دور کر سکتا ہے اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسے قبول اور رائج کرنے میں تذبذب یا کسی ذہنی تحفظ سے کام نہ لے ورنہ ملک کے لسانی بحران میں اضافہ ہوگا اور لسانی اقلیتیں اپنی زبان اور تہذیب کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں گی۔ اس جلسہ میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر [illegible] خاں شروانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں عابد، سرینواس لاہوٹی، ڈاکٹر حسینی شاہد (انجمن ترقی اردو)، ایس۔ راجیشور راؤ، ایم۔ ایل۔ اے (کمیونسٹ پارٹی)، خلیل اللہ حسینی (تعمیر ملت)، سلطان صلاح الدین، [illegible] ایم۔ ایل۔ اے (مجلس)، رائے جانکی پرشاد (اردو مجلس)، چندر سری واستو، میر [illegible] علی خاں (انجمن تحفظ اردو)، گرونا تھ سکینہ، ڈاکٹر اختر احمد، ناصر کرنولی، ایڈیٹر ماہنامہ [illegible]، غلام یزدانی ایڈوکیٹ قابل ذکر ہیں۔

(ترقی اردو)

--- [illegible] ---

تبصرے

وحید اختر

اختر انصاری کی دو کتابیں

پرچھائیں (قطعات) — **مطالعہ و تنقید**

قیمت: تین روپے — قیمت چار روپے پچاس پیسے

ناشر: فرینڈز بک ہاؤس، علی گڑھ — ناشر: فرینڈز بک ہاؤس، علی گڑھ

اختر انصاری ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو لگ بھگ چالیس برس سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کی ادبی زندگی کا آغاز رومانی دور کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے کے مقبول اور کامیاب افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے تنقید میں ان کی انفرادیت نے "افادی ادب" اور "ایک ادبی ڈائری" کی صورت میں اظہار کیا۔ شاعری میں انھوں نے نظم اور غزل کے ساتھ قطعات پر بھی توجہ کی اور قطعہ کو اس کی موجودہ شکل اور اسلوب میں روشناس کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمات کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی تدریس کے مسائل کی تفہیم و تشریح میں بھی قابل قدر کام کیا ہے اس ضمن میں ان کی ادبی تصنیفات کے علاوہ "غزل اور درس غزل" کا نام لیا جا سکتا ہے ہمارے یہاں عام طور پر لکھنے والوں کے تخلیقی سرچشمے اتنے کم مایہ ہوتے ہیں کہ جب تک جذبات میں ابال رہے تحریر کا سلسلہ باقی رہتا ہے اور پھر قلم کی روانی مدھم ہوتے ہوتے خشک ہو جاتی ہے۔ بہت سے شاعر و ادیب جنھوں نے اختر انصاری کے بعد لکھنا شروع کیا۔ برسوں قبل اساتذۂ متقدمین کی صف میں شامل ہو کر محض تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اختر انصاری کا ذہن اور قلم اب بھی رواں ہے اسی سے ان کے علمی و ادبی انہماک، سنجیدگی، خلوص اور ذہنی زرخیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادب صحیح معنوں میں ان کا اوڑھنا بچھونا ہے زیر تبصرہ کتابوں کے علاوہ حال ہی میں ان کی ایک مثنوی "درد داغ" اور نظموں کا ایک مختصر مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اختر انصاری بھی اپنے بیشتر معاصرین کی طرح جدید ادب و شاعری سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں کر پاتے لیکن دوسروں کی طرح ان کے یہاں یہ کیفیت ذہن کے تحجر ہونے سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ ادب کے اس مخصوص تصور کا نتیجہ ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے معیاروں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک خاص عمر کے بعد پرانے لکھنے والوں سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہر نئی تبدیلی کا خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ جس ادیب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تخلیقی کاوشوں میں صرف کیا ہے اور جس کا ایک مخصوص رویہ بن چکا ہو اسے اس کے اپنے معیاروں اور رویوں ہی کی روشنی میں سمجھا اور پرکھنا چاہیے۔

اختر انصاری کی شاعری اور تنقید، دونوں ہی کا سلسلہ رومانیت اور ترقی پسندی کے ادبی تصورات سے ملتا ہے۔ تنقید میں ان کے میلانات زیادہ واضح طور پر نمایاں ہیں لیکن شاعری میں ان میلانات کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے کرب، بے یقینی، بیزاری اور ایک حد تک تشکیک نے بھی ان کی آواز میں اپنے اظہار کے امکانات ڈھونڈ لیے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری آج کی شاعری سے، مزاج اور موضوعات کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔

پرچھائیں میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۸ء تک کے بہترین قطعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ ان کے منتخب قطعات کا مجموعہ ہے۔ گذشتہ تیس سال میں اس نئی صنف کو مقبول کرنے میں اختر انصاری نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ قطعات کے موجودہ فارم (چار مصرعوں) کے امکانات کو اجاگر کرنے میں ان کے بعد صرف احمد ندیم قاسمی ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح اختر انصاری آج تک اس صنف کے جدید سے جدید تر امکانات کو برت رہے ہیں۔ اس کی مثال اور کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ حال ہی میں اختر انصاری نے زریں کمار شاد کے قطعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے (گفتگو ۳) ان کی بنا پر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اختر انصاری اور شاد کے قطعات میں کوئی معنوی اور ذہنی رابطہ بھی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، شاد بنیادی طور پر عدم کے قبیلے کے شاعر ہیں اس کے برخلاف اختر انصاری کی شاعری میں زندگی کا گہرا تجربہ اور اس سے پیدا ہونے والا ارتباط تفکر ملتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذریعہ اظہار کے مشترک ہونے سے خود اختر انصاری بھی دھوکا کھا گئے ہیں۔ کم سے کم میں تو ان دونوں شاعروں کا نام ایک سانس میں لینا سخن فہمی کی تربیت اور آگہی کے لحاظ سے کفر سمجھتا ہوں۔ دونوں کی سطح میں زمین و آسمان کا فرق ہے اختر انصاری نے واقعی قطعہ کو وہ لہجہ اور آہنگ دیا ہے جو عصر حاضر کی پیچیدہ کیفیات جس کی متقاضی تھیں اسی لیے نظریے کی سطح پر جدید شاعری سے تعصب کی حد تک اختلاف رکھنے کے باوجود، تخلیق کی سطح پر وہ آج کی شاعری سے بہت قریب ہیں

اختر انصاری کے ابتدائی دور کے قطعات موضوع کے انتخاب اور ذہنی رویے کے لحاظ سے بھی رومانی ہیں، اور لہجہ و طرز ادا کے لحاظ سے بھی۔ رومانیت کا یہ رجحان ترقی پسند دور کے قطعات میں بھی نمایاں رہا ہے اسی لئے ان کے یہاں وہ موضوعات و مسائل نظر نہیں آتے جو بہت واضح طور پر ترقی پسند کہلائے جا سکیں اور جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ہماری شاعری کے غالب موضوعات تھے۔ ان قطعات کا موضوع فطرت کے حسین مظاہر اور زندگی کے وہ تجربات و واردات ہیں جن کا رشتہ رومانیت اور داخلیت کے ساتھ گہرا ہے۔ شعر کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ جوش کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ؎

شعر یوں کہنے کو کہہ میں لیکن اختر سچ یہ ہے
دل کے محسوسات کو لفظوں میں بھر سکتے نہیں

لیکن ان کے لہجے میں انقلاب کی دھمکی نہیں جو جوش اور

R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۷ - ۲- شمارہ ۱۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ ر اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

اقبال کی یاد میں

رومین رولاں نے کہا ہے کہ "بڑا ادیب یا شاعر ساری دنیا کی ملکیت ہوتا ہے"۔ اقبال چونکہ ایک بڑے شاعر ہیں اس لیے وہ بھی ساری دنیا کی ملکیت ہیں، کسی ایک ملک کا ان پر اجارہ نہیں۔

اقبال کو کچھ لوگ اس لیے بڑا شاعر کہتے ہیں کہ انھوں نے فلسفہ نظم کیا ہے کچھ لوگ ان کے اس لیے قائل ہیں کہ وہ حرکت یا امید کا پیغام دیتے ہیں کچھ لوگوں کے نزدیک چونکہ ان کی شاعری مسلمانوں کو بیدار کرتی ہے اس لیے قابل قدر ہے۔ حالانکہ بڑے شاعر کے یہاں صرف موضوع کی اہمیت نہیں ہوتی، موضوع اور اسلوب دونوں کے اس طرح حل ہو جانے کی اہمیت ہوتی ہے کہ ایک عرفانی کارنامہ وجود میں آجائے۔

اقبال اپنے مذہبی، فلسفیانہ یا سیاسی خیالات کی وجہ سے اہم نہیں شاعری مذہب یا سیاست یا فلسفہ کا بدل نہیں۔ اس کی اہمیت یہ ہے کیونکہ وہ ایک ایسی بصیرت عطا کرتی ہے اور ایک ایسی نظر دیتی ہے جو زندگی میں اپنی الگ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے انسان اور اس کے مسائل کو شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا۔ اور شاعری کو جو عام طور پر حدیث حسن و عشق سمجھی جاتی تھی صحیفۂ کائنات بنا دیا۔ وہ انیسویں صدی کے آخر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جو مغرب کے اثر سے، مشرق کو نئے سرے سے دریافت کر رہا تھا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے نظم کو ترقی دی اور اسے ہر خیال کے اظہار کے قابل بنا دیا۔ پھر انھوں نے ہندستان کی عظمت کے ترانے گائے، فطرت کے حسن کی عکاسی کی، اپنے دور کے اہم واقعات کی دائمی معنویت واضح کی، ماضی و حال کے رشتے پر روشنی ڈالی، قوموں کی تاریخ کا عطر پیش کیا اور یہ سب ایسے الفاظ میں پیش کیا جو ذہن پر ایک عرفانی نقش چھوڑتے ہیں۔ اقبال کو آجکل کچھ صرف ان کے خیالات کی وجہ سے اچھا یا بُرا کہتے ہیں، حالانکہ شاعر کے خیالات سے اتفاق ضروری نہیں، صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ شاعر نے جو ذہنی تصویریں پیش کی ہیں ان میں ربط اور معنویت ہے یا نہیں۔ ہومر، کالی داس، دانتے، ملٹن کے خیالات سے آج اتفاق مشکل سے کیا جا سکے گا مگر ان شعرا کی اہمیت اور معنویت اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں ایسی ذہنی تصویریں دیتے ہیں جن سے ہمیں آج بھی مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اقبال کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بے انصافی ہوئی ہے ہندوستان میں ان کا نام لیا جائے تو کچھ لوگ انھیں پاکستان بنانے والا کہہ کر نظر انداز کرتے ہیں اور پاکستان میں اسی وجہ سے ان کی پرستش ہوتی ہے مگر ان کا عرفان نہیں ہے نہ ان کی نئی مشرقیت کا احساس ہے اور نہ مغرب کے خلاف ان کے اعلان جنگ کی روح کو سمجھا گیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اقبال کی شاعری کی خصوصیات کو اور واضح کیا جائے ان کے یہاں جو استعارے اور تشبیہیں ہیں، جو بلاغت ہے، جو تخیل کی پرواز ہے، جو علوم کی روح ہے، جو نئی اندیشہ ہائے افلاکی ہے اور اس کے ساتھ جو زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم ہے، وہی خاص چیز ہے اور اس کی اہمیت ہے۔

اقبال کو کچھ لوگ صرف ماضی پرست کہہ کر بھی نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ اقبال کو حال اور اس کے درد و کرب کا جو احساس تھا وہ کم لوگوں کو رہا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ آج کی زندگی اتنی پیچیدہ ہو گئی ہے اور سائنس کی ترقی اور سرمایہ و محنت کی آویزش نے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں کہ جب تک ہم زندگی کا ایک جامع تصور پیدا کریں گے اور ماضی و حال اور مستقبل کے رشتے کو اچھی طرح نہ سمجھیں گے، اس وقت تک ہم اس زندگی کے مطالبات پورے نہ کر سکیں گے اور یا تو زندگی ہمیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گی یا ہم زندگی کے دھارے پر تنکے کی طرح بہتے پھریں گے اور ہماری اپنی کوئی حقیقت باقی نہ رہے گی۔

شاعری کی ہمارے یہاں اب تک قدر غلط وجوہ پر ہوئی ہے۔

وہ ہمیں جمالیاتی ذوق دیتی ہے، زندگی کی بصیرت دیتی ہے انسانی نفسیات کا محرم بناتی ہے اور انسان کے ہر رنگ سے آنکھیں چار کرنا سکھاتی ہے۔ اقبال کی عظمت کا یہی راز ہے اور اس عظمت کا عرفان ابھی تک عام نہیں ہے۔ ہمیں اسی کی کوشش کرنی چاہئے

مولانا آزاد کی یاد میں نمائش

نئی دہلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی کے سلسلے میں یہاں مولانا آزاد کی کتابوں اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کی ایک نمائش کی گئی ہے۔ نمائش میں جو زیادہ سو کے لگ بھگ کتابیں، مسودے اور تحریریں شامل ہیں۔ ان میں بعض بہت ہی نادر اور نایاب ہیں۔ نایاب چیزوں میں مولانا کے تذکرہ کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد نے ۱۹۱۶ء میں لکھی تھی جب وہ رانچی (بہار) میں نظر بند تھے۔ مزید نوادرات میں ان کے والد مولانا خیرالدین کی تصانیف، ان کے بھائی سلام نسیں کی کتابیں اور ان کی بہن آرزو بیگم کی کتابیں شامل ہیں۔ نمائش کا افتتاح آزادی کی لڑائی کے ایک پرانے مجاہد منشی عبدالقادر نے کیا۔ (قومی آواز)

اقبال کے نظریات پر فلم

لندن۔ حال میں لندن میں ایک فلم علامہ اقبال پر برٹش میں دکھائی گئی جس کو آج کا دار نے تیار کیا ہے۔ یہ فلم شاعر مشرق کے عالمی نظریات اور خیالات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ (انکار)

بیادِ غالب

پاکستان میں ادارۂ یادگار غالب کے شاندار اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے اعلان کیا ہے کہ مشہور مصور صادقین غالب کا ایک مصور دیوان پیش کر رہے ہیں اور خواجہ معین الدین غالب پر ایک ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔

(انکار)

پنجاب میں پنجابی کو سرکاری زبان بنانے کی تقریب

پٹیالہ: حکومت پنجاب نے حکم دیا ہے کہ پنجابی کو سرکاری زبان بنائے جانے کی تقریب ایک ہفتہ تک منائی جائے۔ پہلی جنوری سے تمام ضلعوں اور ڈویژنوں کی سطح پر سرکاری کام پنجابی زبان میں ہونے لگا تھا۔ پنجابی ادیبوں اور صحافیوں نے اس زبان کی جو [illegible] کی ہے اس کے معاوضہ کے طور پر سوا لاکھ روپے کی رقم تقسیم کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انگریزی اور پنجابی زبان کی ایک لغت [illegible] ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ (قومی آواز)

سوویت شاعروں سے [illegible] میں کلام سنا

کلکتہ [illegible] ازبکستان [illegible] سلیمانوف اور [illegible] کانفرنس [illegible] سے [illegible] کانفرنس [illegible] تیمور [illegible] افتتاح [illegible] تشکر [illegible] اجلاس کی صدارت کی سلیمانوف اور سوویت شاعرہ نے اپنی اپنی زبان میں اپنا کلام سنایا۔

الہ آباد اسٹیشن کا اردو نام غائب

[illegible] الہ آباد اسٹیشن (جنکشن) پر بورڈ کے اوپر ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی لفظ "الہ آباد" لکھا تھا مگر اس مرتبہ جو رنگائی ہوئی تو اردو کو مٹا کر صرف ہندی اور انگریزی کو باقی رکھا گیا ہے۔ (سیاست)

سوال و جواب

سوال

[illegible]

جواب اقبال

[illegible]

روسی لغت تیار

ماسکو۔ کرغیزیہ کی یونیورسٹی کے پروفیسر کونستین یوداخن کو کرغیز روسی لغت تیار کرنے کے یادگار کام کے صلہ میں سوویت یونین کا ریاستی انعام عطا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کرغیز زبان کے خصوصی علمی مطالعہ کا کام ۱۹۲۴ء میں شروع ہوا جبکہ کرغیزیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کرغیز زبان کو درجہ تعلیم بنایا گیا۔ (قومی آواز)

مظفر اقبال

اردو میں خواتین کا اولین ناول ـــ اصلاح النساء

اردو میں ناول نگاری کی کوئی مستند تاریخ اب تک مرتب نہیں کی جاسکی ہے اور اسی لئے اس قسم کے سوالات اکثر اٹھائے جاتے ہیں کہ اردو کا پہلا ناول کون ہے؟ کیا نذیر احمد واقعی اردو کے اولیں ناول نگار ہیں؟ مراۃ العروس اور بنات النعش کو اردو کا پہلا ناول کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مولوی کریم الدین کی کتاب خطِ تقدیر کو ناول کہنا کس حد تک درست ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کا تشفی بخش جواب علی عباس حسینی کی کتاب اردو ناول کی تاریخ و تنقید میں ہے اور نہ محمد احسن فاروقی کی اردو ناول کی تنقیدی تاریخ میں، سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو، دار عظیم کی داستان سے افسانے تک اور حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اردو، چونکہ درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور اس لئے اس قسم کے سوالات کا جواب ان میں تلاش کرنا لاحاصل ہے البتہ محمد صادق کی تاریخ ادب اردو بزبان انگریزی (HISTORY OF URDU LITERATURE) میں اس موضوع پر کچھ بحث کی گئی ہے جو بلاشبہ محققانہ ہے لیکن اس کتاب میں بھی اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں کہ اردو میں خواتین کا اولیں ناول کون ہے؟

۲۳/دسمبر ۶۷ء کے "ہماری زبان" میں یہ سوال بیگم نسیم اقتدار علی نے قارئین کے سامنے پیش کیا اور ۲۲/جنوری ۶۸ء کے ہماری زبان میں سید سلیمان حسن نے اس کے جواب میں یہ اطلاع دی کہ ان کے علم کے مطابق محترمہ بیگم رشید النساء، اہلیہ مولوی یحییٰ علی صاحب کا سماجی و اصلاحی ناول اصلاح النساء اردو میں خواتین کا اولیں ناول ہے۔ سید سلیمان حسن صاحب کے اس خیال کی تائید و تصدیق پروفیسر شاہ مقبول احمد، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کلکتہ نے یکم مارچ ۶۸ء کے ہماری زبان میں کی اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ۔

> ناول اصلاح النساء مصنفہ رشیدہ النساء کا زمانہ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے۔ ناول زیر بحث کی بابت تفصیلات میں نے اپنی کتاب "چند ادبی مسائل" اور ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب "قدر و نظر" میں درج کردی ہیں۔

میرے پیش نظر ہماری زبان کے متذکرہ بالا تینوں شمارے ہیں۔ بیگم نسیم اقتدار علی کے استفسار سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ناول نگار خواتین کے موضوع پر ریسرچ کررہی ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ ان کے سوال کے جواب میں جو مراسلے "ہماری زبان" میں اب تک شایع ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر یقیناً انھیں اصلاح النساء اور اس کی مصنفہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور ساتھ ہی ان مراسلوں کی اشاعت سے قارئین "ہماری زبان" بھی اس مسئلہ سے دلچسپی لے رہے ہوں گے اور پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوں گے چنانچہ ان ہی باتوں کے پیش نظر میں ذیل میں اصلاح النساء اور اس کی مصنفہ رشیدۃ النساء کا تعارف پیش کررہا ہوں لیکن اس سے قبل سید سلیمان حسن اور شاہ مقبول احمد صاحبان کے مراسلات میں جو باتیں محل نظر ہیں ان کی نشان دہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

سید سلیمان حسن صاحب نے اصلاح النساء کی مصنفہ کا نام بیگم رشید النساء لکھا ہے جب کہ صحیح نام رشیدہ النساء ہے۔

شاہ مقبول احمد صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "چند ادبی مسائل" اور اختر اورینوی نے اپنی کتاب "قدر و نظر" میں اس ناول کی بابت تفصیلات فراہم کی ہیں۔ صحیح ہے کہ ان کے مجموعۂ مقالات "چند ادبی مسائل" کے ایک مقالہ بعنوان "بہار کی ماحول اور اردو ادب" میں اس کتاب کا ذکر موجود ہے لیکن صرف اسی قدر کہ۔

> "اس طرح ماحول اور زمانہ کے اعتبار سے اصلاح النساء (از رشیدہ النساء ۱۸۸۱ء) ایک قابل قدر ناول ہے اس میں بھی مدعی۔ جو رسم و رواج کی عکاسی ملتی ہے قصہ لکھنے والی مصنفہ کے پیش نظر اپنے ہی گرد و نواح کے حالات تھے۔ اصلاح غرض بھی مگر غیر ارادی طور پر مصنفہ کی گردش قلم سے ایسے نقوش ابھرے ہیں جن میں اس خطۂ ملک کے معاشرے کے آب و رنگ دکھائی دیتے ہیں جہاں اس کے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں۔"
>
> (چند ادبی مسائل صفحہ ۱۴۲ و ۱۴۳)

اس مختصر سی تحریر کو اصلاح النساء کے متعلق "تفصیلات" کہنا ہرگز مناسب نہیں ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے مجموعۂ مقالات "قدر و نظر" میں اس کتاب کے متعلق کسی قسم کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ غالباً شاہ مقبول احمد صاحب نے سہواً اس کتاب کا نام لکھ دیا ہے اس لئے کہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ اختر صاحب نے اصلاح النساء کے متعلق کچھ تفصیلات اپنے مقالہ "بہار میں اردو ناول نگاری" میں فراہم کی ہیں لیکن ان کا یہ مقالہ "قدر و نظر" میں نہیں بلکہ ان کے ایک دوسرے مجموعۂ مقالات "تحقیق و تنقید" میں شامل ہے۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں بہت ہی واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ

> "یہ خاتون غالباً سب سے پہلی ناول نگار خاتون ہیں یعنی بیگم مولوی یحییٰ علی صاحب (رشیدہ النساء) آپ نے "اصلاح النساء" ایک سماجی اصلاحی ناول لکھی۔"
>
> (تحقیق و تنقید صفحہ ۱۷۹ و ۱۸۰)

اختر صاحب نے اپنے مقالہ میں جو مزید تفصیلات فراہم کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

> اندرونی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ (یعنی اصلاح النساء) مراۃ العروس کے بعد لکھی گئی "الشو ... مولوی نذیر احمد صاحب کو عاقبت میں بھی بڑا انعام دے! ان کی کتاب کے پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہونچا جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا اور اب ہم جو

انیس انور

مکتوب لندن

انگریزی نہیں، اردو!

روزانہ صبح سات اور نو بجے بی بی سی ریڈیو سے 'ٹوڈے' (TODAY) نشر ہوتا ہے۔ گزشتہ ہفتہ مڈلینڈ کی ایک سکری کے نورمن کا انٹرویو نشر ہوا۔ اس سکری میں اردو داں ملازمین خاصی تعداد میں ہیں۔ نورمن نے انٹرویو میں انکشاف کیا کہ اردو داں ملازمین کو انگریزی سکھانے کی ناکام کوشش کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب بہتر یہی ہے کہ وہ خود اردو سیکھیں۔ چنانچہ غریب نورمن کو اردو سیکھنی پڑی اور اب وہ 'آپ کا کام بہت اچھا ہے' 'آپ کا کام بُرا ہے' وغیرہ آسانی سے بول سکتے ہیں۔ دورانِ انٹرویو نورمن نے اردو کے چند جملے خوب چٹخارے لیتے ہوئے دہرائے۔ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اصل دیسوں میں اردو کی یہ مقبولیت بہت جلد اسے ایک عالمگیر زبان کا درجہ دلادے گی۔ میری مراد اس زبان کے وسیع استعمال، رواج اور ضرورت سے ہے جو متعدد ممالک کے سیاسی و معاشی حالات اور مہاجرین و تارکین وطن کی موجودگی اس زبان کو فراہم کرنے کا موقع فراہم کررہی ہے۔

بی بی سی نے انگریزی سکھانے کی کوششیں ایک جگہ تو بڑی مبارک ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب بی بی سی والے بہت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انگریزوں کو اردو سکھانے کا بھی ایک پروگرام شروع کردیں۔ آخر ہم بھی تو ۲۰۰ برس تک ان کی زبان سیکھتے رہے گو ہم گوروں کو بڑی تعداد میں اردو سیکھنے پر مجبور نہ کرسکے۔ سو اب تو ان کی باری ہے۔

کینیا کے اردو شاعر و ادیب لندن میں

کینیا کے مشہور ادیب اور شاعر ایس۔ اے۔ مہدی ان دنوں لندن میں ہیں۔ اردو اور انگریزی کے سرار کے حالات جس ہم آہنگی کے موضوع پر ان کی انگریزی کتاب آج سے دو سال قبل برطانوی ہائی کمشنر مقیم کینیا نے بطور خاص ملکہ برطانیہ اور برٹش میوزیم کو بھجوائی تھی۔ اب یہاں کے بیشتر اداروں میں یہ کتاب موجود ہے۔ کچھ عرصہ بیشتر ان کا شعری مجموعہ 'کف گل فروش' شائع ہوا تھا تو اس وقت ہند و پاکستان کے اردو جرائد نے اسے اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا تھا۔ مہدی صاحب ہند و پاکستان کا دورہ ختم کرکے حال ہی میں لندن پہنچے ہیں اور یہاں کے اردو نواز حلقوں سے رابطہ پیدا کرنے کے متمنی ہیں۔ اس وقت وہ ساؤتھ ویسٹ ۱۸ لندن میں فروکش ہیں۔

اردو کتب کا حصول

آسٹن انڈر لائن، لنکا شائر کی مقامی لائبریری کے منتظمین نے اردو داں طبقے کے ذوق کی تسکین کے لئے اردو زبان کی کتابیں حاصل کی ہیں جو مستقبل قریب میں مطالعہ کے لئے دستیاب ہوسکیں گی۔ اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے عبد الرشید صاحب نے متعلقہ علاقوں کے اردو داں طبقے سے لائبریری کی ان سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں مستفید ہونے کی درخواست کی ہے۔

مراسلہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک شخصیت تھی۔ قدآور دگرانقدر؛ لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد آج ہم اس قدآور دگرانقدر شخصیت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ غالباً "ہماری زبان" نے بھی اپنے کسی پچھلے شمارہ میں اس ناقابل معافی بھول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "جامعہ" دہلی کے اڈیٹر جناب فاروقی صاحب اپنے "ادارتی نوٹ" "شذرات" میں اور جناب عبداللطیف صاحب اعظمی "رپورتاژ" میں مولانائے محترم کی "غریب الدیاری" پر اشکبار ہیں۔ علاوہ ازیں ۲۲ فروری کو دلی میں جو جلسہ مسز اندرا گاندھی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا اس میں انھوں نے تو سیاسی و سماجی معاملات میں مولانا کے اصولوں کو بھول جانے کا اعتراف کیا ہے جو انہی کے الفاظ میں

"ہم نے مولانا اور ان کی باتوں کو بھلا دیا، تبھی ملک کی یہ حالت ہے۔"

مجھے محترمہ کے اس خیال کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے اور نہ علمائے دین کی طرف سے جو سرد مہری اختیار کی گئی ہے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہنا کہ مولانائے محترم نے دین میں اجتہاد کی جن راہوں کو استوار کیا ہے اور جو افکار و مسائل کی نئی جہت دکھائی ہے شاید اس کی اہمیت کو سمجھنے کے ہی ہم اہل نہیں ہیں۔ البتہ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ مولانا نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ اور اپنے بے شمار مضامین اور تقاریر سے ادب کے خزانہ کو مالا مال کیا، نئی قدروں اور نئے اصولوں کو طرح دی اور ادب کو ایک طرز انشا کے ذریعہ آراستہ کیا، نیا آہنگ اور نئی آواز دی اور اردو زبان و ادب کی جو نئی صورت حال ہے اس کے نکھار اور سنوارنے میں جو اہم رول [illegible] کارنامے انجام دئے کم از کم ہم ان کے انہی کارناموں کا اعتراف کریں، خراج تحسین ادا کریں، ورنہ واقعتاً یہ ہماری احسان ناشناسی ہوگی! یہ کتنے دکھ کی بات ہے اور کبھی ہم سوچتے بھی نہیں کہ ہم مولانا کو بھول کر کیا کھو کیا پا رہے ہیں؟ مولانا زندگی بھر شہرت اور عزت کی چاہ سے بے نیاز تھے۔ وہ عالم تھے، ادیب تھے، واعظ تھے، محتسب تھے اور سیاستداں تھے، مدبر تھے اس کے باوجود انھوں نے تقدس کا لبادہ اوڑھ کر مسند ارشاد کا دعویٰ نہیں کیا، انھوں نے ملک کے نامور ادیب بن کر اپنے جشن کا اہتمام نہیں کیا اور نہ ہی سیاسی اتھل پتھل میں کسی بڑی کرسی کی خواہش کی۔ آج اگر ہم ان کی یاد منائیں گے، جشن کا اہتمام ہوگا، سیمینار و سمپوزیم ہوگا یا پھر اکیڈمی قائم کی جائے گی تو اس سے ان کی ذات کو کیا فائدہ پہنچنے والا ہے۔ ذات تو فنا ہے تاہم کوئی نیکی ذات باقی بھی رہتی ہے اس طرح کہ اس کے اچھے اور برے دو اعمال باقی رہتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ مولانا کی ذات برائیوں سے پاک تھی ہم تو ان برائیوں سے سبق بھی سیکھ سکتے ہیں، خود اپنی زندگی میں ان برائیوں سے بچ کر اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں ہم مولانا کی زندگی کی تکمیل ہو سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ وہاں کھڑے ہیں جہاں سے مولانا کی قدآور شخصیت کا سایہ بھی [illegible] نہیں ہوتا، اس لئے ان کی برائیوں پر انگلی رکھنا ہمیں زیب بھی نہیں دیتا۔ اس وقت ان کی اچھائیوں کو اجالنے اور نیکیوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ ادب کے ذریعہ جن افکار و اذکار کو انھوں نے پھیلانے کی کوشش کی انہی افکار و اذکار کو عام کرنا ہے تاکہ ملک و قوم اس راہ پر چل پڑے کہ جس کے ذریعہ امن اور سلامتی، بھائی چارگی اور آشتی کی منزل حاصل ہوتی ہے اس سے ادب کا مقصد بھی پورا ہوگا اور ادب صحت مند رجحانات کا عکاس و آئینہ دار بھی ہوگا۔

بہرحال یہ کام انفرادی کوششوں سے ہونے کا نہیں ہے اور نہ ہی ادبی انجمن اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے جو معنوی اور ظاہری اعتبار سے محدود ہے۔ میری رائے میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند اگر اس کام کا بیڑہ اٹھائے تو بہت ممکن ہے کوئی نتیجہ بھی نکلے۔ مرکزی انجمن کی طرف سے خود علی گڑھ یا دلی میں بڑی کانفرنس بلائی جا سکتی ہے اور پھر سیمینار کیا جا سکتا ہے۔ ہماری شاخیں، یوم آزاد کے ذریعہ یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ مختلف ماہنامے خاص نمبروں کے ذریعہ اور اخبارات مسلسل کالموں کی مدد سے، مضامین شائع کر کے مولانا کے حالات کو عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ قوم مختلف مسائل سے دوچار ہے اور ان مسائل میں اتفاق اور اتحاد کا مسئلہ بڑی سنگین صورت اختیار کر گیا ہے ایسی کوئی راہ نہیں ہے سوائے مولانا مرحوم کی راہ کے کہ جس کے ذریعہ ہم امن کو عام کر سکیں گے۔ ہمارا ادب ہماری بے حالی کا آئینہ بن گیا ہے ادب مقصد سے خالی ہے آج ہمیں کوئی نعرہ سنائی نہیں دیتا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ جدیدیت کو میں بری حماقت کہوں ایسا نہیں ہے یا ادب لغو بھی نہیں ہے۔ بہرحال ایک ایسی منزل آئی ہے جب ہم تنہائی اور غم محسوس کرتے ہیں، ایسے وقت ضروری ہے کہ ہمارے ادب کا دانشور طبقہ آگے بڑھے، سنبھالا دے اور بے مقصد ادب کو مقصد سے ہم آہنگ کرے۔ اس سلسلہ میں بھی مولانائے محترم کے مقاصد اور خیالات ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔ یہ اچھا وقت ہے کہ ہم مولانا کے غیر مذہبی (جو مذہبی شعور ہی کا نتیجہ ہیں) اور [illegible] رجحانات کو عام کریں۔

(طیب انصاری)
استاد شعبۂ اردو گلبرگہ کالج

انجمن ترقی اردو بہار کی ساتویں ریاستی اردو کانفرنس کی روداد

ایوب نگر (انجمن اسلامیہ ہال) مرادپور، پٹنہ میں اجلاس مندوبین کی پہلی نشست، جناب غلام سرور، صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس موقع پر صدر جلسہ کی خواہش کے مطابق بہار کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مندوبین نے ریاستی انجمن کے تنظیمی و تحریکی مسائل پر کھل کر بحث کی۔

۴ بجے شام تک انجمن اسلامیہ ہال کے اندر اور باہر کے احاطے میں شامیانوں تلے ایک چھوٹی سی خوبصورت بستی بس گئی، ایوب نگر دو بستیوں کا ایک شہر بن گیا، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، شاد عظیم آبادی، کانپور کے فضیل اردو پانڈے کے ناموں سے رنگ برنگ کے دروازے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ۵ بجے افتتاحی اجلاس کے صدر جناب ستیہ ورت سنہا (سابق جسٹس الٰہ آباد ہائی کورٹ حال سینیر ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ) تشریف لے آئے۔ پروفیسر عبدالمغنی جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ نے اجلاس کے آغاز کی مہربانی، جناب غلام سرور نے صدارت کی تحریک کی، جناب ملا ماہتاب صدیقی (جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو) نے تائید کی، جناب ستیہ ورت سنہا پھولوں کا ہار پہن کر مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوگئے، اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے جناب شاہ مشتاق احمد سابق ایم ایل اے، صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا، مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اردو تحریک کے ماضی اور عظیم آباد کی تاریخی حیثیت کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے تحریک کے مستقبل کی طرف واضح اشارے کئے۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالمغنی جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ نے اپنی رپورٹ پڑھنی شروع کی وہ کچھ دیر تک ہندوستان اور بہار میں اردو تحریک کے مسائل کا تجزیہ کرتے رہے اور ہزاروں ہزار کا مجمع ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ موصوف نے لسانی و ادبی اور سماجی و سیاسی پہلوؤں سے ملک اور ریاست میں اردو کی حیثیت و اہمیت واضح کرتے ہوئے آزاد ہندوستان کے لسانی مسئلے کا بھرپور جائزہ لیا اور اردو کے مسئلے کو ایک کل ہند سیاسی پس منظر میں رکھ کر اس کی تمام پیچیدگیوں کا تجزیہ کیا۔ اس جائزے اور تجزیے کی روشنی میں انھوں نے اہل اردو کو ... آئینی، جمہوری اور عملی اعتبار سے، مرکز سے شمالی ہند کی ریاستوں تک اردو کے لیے قومی و سرکاری سطح پر دوسری زبانوں کے مساوی درجے کا مطالبہ کیا جائے، یہی اردو والوں کی منزل ہونی چاہئے، خواہ اس تک پہنچنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے اور کیسی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ موصوف نے علمی و ادبی اور تعلیمی و صحافتی سطح پر اردو کے اندرونی استحکام کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی۔ رپورٹ ختم ہوئی۔ جناب رامائن سنگھ (چیئرمین مارواڑی بلاک بہار) سے درخواست کی گئی کہ صدر اجلاس کے خطبے سے پہلے وہ بھی مختصر طور پر اظہار خیال فرمائیں۔ موصوف نے اپنی گرم جوش تقریر میں ایک طرف اہل اردو کو جدوجہد اور ایثار و قربانی کی تلقین کی تو دوسری طرف ہندی والوں اور حکومت کے ذمہ داروں کو خبردار کیا کہ اب وہ اردو کی جمہوری تحریک کو دبا نہیں سکتے، انھیں اردو کا حق دینا ہی ہوگا۔ اب صدر اجلاس جناب ستیہ ورت سنہا تالیوں کی گونج میں صدارتی خطبہ ارشاد کرنے کھڑے ہوئے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کے ایک ایک لفظ سے عزم و جرأت کا اظہار ہو رہا تھا۔ موصوف نے بڑے ہی مفکرانہ و مدبرانہ انداز میں اور نہایت ادب بھری اور ولولہ انگیزی کے ساتھ اردو کے حقوق اور امکانات کا تذکرہ کیا۔ ان کا لہجہ نرم اور دھیما تھا، مگر اس میں فولاد کی کھنک تھی۔ انھوں نے جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ کی رپورٹ میں پیش کئے ہوئے نکتوں سے اتفاق کیا اور اس کے جرأت مندانہ انداز کو سراہا۔ موصوف نے بہت سی مثالیں دے کر بتایا کہ ارباب اقتدار شعوری طور پر اردو کی حق تلفی کر رہے ہیں اور انھوں نے اردو کشی کا گویا ایک منصوبہ سا بنایا ہوا ہے لیکن اردو کی جڑیں عوام میں پیوستہ ہیں اس کو مٹانا آسان نہیں۔ تمام حق تلفیوں اور بیخ کنی کی ساری کوششوں کے باوجود اردو آج بھی زندہ و توانا ہے اور کل بھی رہے گی، اس لئے کہ اردو ہندوستانی تہذیب کی روح ہے۔ موصوف نے اردو والوں کو تلقین کی کہ وہ ظلم اور جبر کے سامنے جھکیں نہیں، پوری ہمت، تدبر اور جوش کے ساتھ اپنی تحریک چلاتے رہیں، اگر ان کا عزم و حوصلہ اور جدوجہد برقرار رہی تو زمانے کو ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔

۳۱ر مارچ صبح جناب ستیہ ورت سنہا کی پریس کانفرنس ہوئی جس میں ایک ہینڈ آؤٹ تقسیم کیا گیا اور اخباری نمائندوں سے بات چیت ہوئی۔

اس کے بعد مجلس مضامین کا جلسہ شروع ہوا۔ جناب غلام سرور نے صدارت کی۔ ریاستی و مقامی مسائل پر متعدد تجویزیں منظور کی گئیں۔ جناب لطف رحیم (رکن مجلس عاملہ مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی آف بہار) نے اردو کے مطالبے پر خاص اور سرکاری تجویز پیش کی۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اس میں ایک ترمیم پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ اردو کے حق، صورت حال کی حقیقت اور اہل اردو کے عزائم کو مدنظر رکھتے ہوئے اب اردو کے لئے مرکزی و ریاستی سطح پر قومی و سرکاری مقاصد کے لئے دوسری قومی زبانوں کے برابر درجے کا مطالبہ کیا جائے۔ موصوف کی اس ترمیم کو قبول کرتے ہوئے، ان کے ساتھ چند اور حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی کہ وہ اجلاس مندوبین کی آئندہ نشست میں ترمیم کے ساتھ مرتب کی ہوئی تجویز کا مسودہ پیش کرے۔ یہ اجلاس شام کو جناب غلام سرور کی صدارت میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے پروفیسر عبدالمغنی نے ترمیم شدہ تجویز پڑھ کر سنائی جسے حاضرین نے باتفاق آرا منظور کر لیا۔ اس کے بعد انتخاب عہدہ داران کی کارروائی شروع ہوئی۔ جناب محمد محسن انصاری نے صدارت کے لیے جناب غلام سرور کے نام کی تحریک کی۔ جناب غلام سرور نے فوراً اٹھ کر اس عہدے کے لیے پروفیسر عبدالمغنی کا نام تجویز کر دیا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنا نام واپس لیتے ہوئے جناب غلام سرور کی امیدواری کی تائید کی۔ اس کے بعد صدارت کے لیے دو اور نام پیش کئے گئے اور واپس لے لئے گئے۔ جناب غلام سرور بلا مقابلہ صدر منتخب ہوگئے۔ جنرل سکریٹری کے لیے مولانا ماہتاب صدیقی بھی پروفیسر عبدالغنی وغیرہ کے نام واپس لے لینے کے بعد بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو کی مجلس عامہ کے لیے ریاستی نمائندہ

کی جگہ پروفیسر عبدالمغنی اور جناب غلام سرور کے نام پیش ہوئے پروفیسر عبدالمغنی نے اپنا نام واپس لے لیا۔ جناب غلام سرور بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ دوسرے عہدے داروں اور مجلس عاملہ کے ارکان کے انتخاب کے لیے ایک تجویز کے ذریعہ صدر اور سکریٹری کو اختیار دے دیا گیا۔

اس کے بعد افتتاحی اجلاس کی کارروائی جناب غلام سرور کی صدارت میں شروع ہوئی سامعین کی کثرت سے حد نگاہ تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اردو کے مطالبہ پر سرکاری تجویز پڑھ کر سنائی اس کے بعد یکے بعد دیگرے مقررین نے اپنی اپنی تقریروں میں اردو کی اہمیت اور صوف پر روشنی ڈالی اور ان حقوق کے حصول کے لیے تمام جمہوری و آئینی اقدامات کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ جناب مشتاق علی خاں ام، ال، اے، جناب رام اوتار شاستری، ام پی، جناب خادم حسین ام ال اے، جناب خلیل احمد، ام ال اے، جناب تقی رحیم، جناب رام مدن سنگھ، سکریٹری مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی آف بہار، جناب غضنفر نواب دانش، جناب محمد اعظم، مولانا اسمٰعیل اختر، جناب محمد معین انصاری نے اردو کے مختلف مسائل کا ذکر کیا اور ان مسائل کے حل کے لیے جد و جہد اور ایثار و قربانی سے کام لینے کی تلقین کی۔ جناب خادم حسین نے یہ بھی اعلان کیا کہ جب بھی ریاستی انجمن انھیں ہدایت کرے گی وہ اردو کے لیے اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ سامعین نے ان کے اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ جناب ابراہیم پردیسی، جناب شاہ فاروق عطا (اردو محاسبہ دستہ یو پی)، جناب معین اعجاز، جناب محمد الیاس (انجمن ترقی اردو مغربی بنگال) نے خاص طور پر اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ریاستی انجمن کی جد و جہد میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا آخر میں صدر اجلاس جناب غلام سرور نے اپنی مختصر و ولولہ انگیز تقریر میں اردو کو اپنا دین و ایمان بتایا اور اس کے حقوق کی بازیابی کے لیے سرفروشی اور جاں سپاری کا عزم ظاہر کیا۔ موصوف نے اہل اردو کو خطاب کرتے کہا کہ وہ اسمبلی شہادت گاہ عمل میں قدم رکھ چکے ہیں، لہٰذا اب انھیں ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہو جانا چاہئے۔

یکم اپریل کو دن میں مولانا مشتاق صدیقی کی [illegible] صدارت میں کی آخری نشست منعقد ہوئی، جس میں مقررین نے اردو کے مطالبات و مسائل پر کام کرنے کی عملی تدبیروں اور طریقوں پر روشنی ڈالی۔ اردو محاسبہ دستہ یو پی کے جناب شاہ فاروق عطا اور جناب ابراہیم پردیسی نے مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے ان کے سامنے بعض اہم عملی تجویزیں رکھیں جن سے کام کے کچھ نئے گوشے اجاگر ہوئے۔ جناب غلام سرور نے حاضرین کو ایک وسیع نقشۂ کار اور طریق عمل سے آگاہ کیا۔

اس کے بعد ایک شاندار مشاعرہ جناب عطا کاکوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب صدر کے علاوہ جن شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ پروفیسر سید حسن، جناب رضا کریم رضا، پروفیسر انیس امام، جناب کلیم احمد عاجز، جناب ارشد فیضی، جناب کوثر سیوانی، جناب شکیب ایاز، جناب عبدالمجید حمید، جناب ناظم سیوانی، جناب رمز عظیم آبادی، جناب شش۔م۔دانش، جناب خادم بلخی، جناب حسن امام درد، جناب مختار احمد عاصی۔ (مرسلہ انجمن ترقی اردو بہار)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ

علی گڑھ ۱۰ اپریل۔ انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا ایک جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں ہوا جس میں اردو کے مشہور ادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا مقالہ بہ عنوان شعر کا ابلاغ پڑھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیر مقدم کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے مضامین اور تبصروں کو بیشتر لوگوں نے پڑھا ہے اور ان کی جرأت رائے، فکر کی سنجیدگی اور وسیع مطالعہ کو سراہا ہے۔ ہماری تنقید میں مشرقی روایات کی وجہ سے مروت و وضعداری کا عنصر غالب رہا ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادھر چند برسوں سے تنقید میں معروضیت اور اعتدال پیدا ہو رہا ہے چنانچہ شمس الرحمٰن کی تنقید اور تبصروں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مجھے خوشی ہے کہ میری فرمائش پر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر کے ابلاغ کے مسئلہ پر مقالہ لکھا۔ سرور صاحب نے روایت اور جدیدیت کے مباحثوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ادب میں یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور رہنا چاہئے اور قدیم و جدید کی کشمکش کو ادبی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے اور کسی ایک رنگ، اسلوب یا لہجہ پر اصرار نہیں کرنا چاہئے بلکہ بقول ماورے رنگ چمن میں سو طرح کے پھول کھلنے چاہئے

سرور صاحب کی تقریر کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا مقالہ پڑھا اس مقالہ میں فاروقی صاحب نے شعر کے ابلاغ کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان مختلف ذرائع کی وضاحت کی جو شعر اور نثر اپنے ابلاغ کے لیے استعمال کرتی ہے اور اس نمایاں فرق اور اختلاف کی طرف توجہ دلائی جو نثر اور شعر کے ابلاغ کی سطحوں میں پایا جاتا ہے موجودہ تنقید میں ترسیل اور ابلاغ کی اصطلاحوں کو ہم معنی سمجھ کر جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا کہ ان دونوں اصطلاحوں کو استعمال کرتے وقت خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہے فاروقی صاحب نے کروشے کے مشہور نظریہ سے اپنا اتفاق ظاہر کیا اصل مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے ترسیل اور ابلاغ کے تعلق اور فرق کو واضح کیا اور کہا کہ ابلاغ شعر کی آخری منزل ہے ایک طرف تو ابلاغ وہ عمل ہے جو شعر پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں واقع ہوتا ہے جب شعر پڑھ کر میں نے ان تجربات اور کیفیات کا کسی نہ کسی حد تک احاطہ کر لیا جنھوں نے اس شعر کو جنم دیا تھا، تو مجھے ابلاغ حاصل ہو گیا دوسری طرف ابلاغ صحت کے اس درجہ کا نام ہے جس درجہ تک شاعر کی وجدانی نے لفظی ترسیل کی صورت اختیار کی ہے۔ غور سے دیکھئے تو دونوں کیفیتیں تقریباً ایک ہی ہیں کیونکہ میں اور خود شاعر شعر کو اس حد تک سمجھ سکتا ہے جس حد تک وہ الفاظ کے اندر محدود ہے اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کئی مثالیں دیں اور شعر کی ماہیت کے سلسلہ میں مشرق و مغرب کے افکار کی ہم آہنگی

آل احمد سرور

میرا صفحہ

میں نے گورکی پر ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔

تخلیقی ادب کو نظر کی ضرورت ہے نظریے کی نہیں ہاں تنقید میں نظریے کی ضرورت مسلّم ہے۔ میں اس بات کو کسی آئندہ مضمون میں واضح کرنا چاہتا تھا، مگر حال ہی میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کا ایک خاص نمبر دیکھا جو CROSS CURRENTS کے عنوان سے نکلا ہے اس میں جوناتھن ملر کا ایک مضمون اختلافی مسئلے (DISPUTED GROUND) پر پڑھا تو اس عبارت پر نظر ٹھہر گئی۔ ہماری زبان کے ترقی پسندوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں سہولت کے لیے ترجمہ دے رہا ہوں اور ترجمہ کو ملحوظ رکھا ہے

تخیلی ادبی بصیرت کی مخصوص اقدار ہیں۔ فرائڈ کو قبول ہے مگر اسے ایک خیال سے جوڑ دیا جائے، اس لیے اسے غلط سمجھا جاتا ہے کہ ایک (DOGMA) بن جاتا ہے۔ ذرے ذرے کا ناتا اس طرح مارکس کی بصیرت کو قطع کئے جاتے ہیں ایسے ہی سیدھے سادے دعوے ہوتے ہیں۔ بہترین کھیلوں میں ڈرامائی زندگی اسی وقت نمودار ہوتی ہے جب ڈراما نویس کا وسیع ادبی شعور مارکس کی بصیرت کو جذب کر لیتا ہے بجائے اس کے کہ اس کے شاگردوں کے DOGMA کے تابع کر دیا جائے۔ صفحہ ۶۵۲، ۲۷ جولائی ۱۹۶۰ء

ملر فرائڈ کے سلسلے میں بھی اس بات پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے

"جہاں جہاں فرائڈ کی تصانیف سے واضح طور سے ادب کی بنیاد رکھی گئی ہے، ناول یا ڈراما کو دائمی نقصان پہنچا ہے"

ملر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ادیب کی مخصوص بصیرت کو مارکس کے خیالات سے یا فرائڈ کے نظریات سے کوئی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے، مگر یہ سب چیزیں اس کا خام مواد ہیں۔ اس خام مواد کو جب وہ ادبی روپ دیتا ہے تو وہ سماجی صحیفہ، نفسیاتی مقالہ یا حکمت پر رسالہ نہیں لکھتا اور سماجی، نفسیاتی یا فلسفیانہ موضوعات کی وجہ سے اس کے فن پارے کی قدر و قیمت نہیں۔ فن پارے کی مجموعی قدر و قیمت زندگی کی فنکارانہ بصیرت، زندگی کی پیچیدگی، اس کے ربط، اس کی معنویت پر روشنی ڈالنے کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی ادب کو نہ سائنس کی غلامی کرنی چاہیے نہ اقتصادیات اور سماجیات کی چاکری۔ ادب ان علوم کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی اپنی دنیا میں یہ علوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ علوم میں نظریے پچھلے نظریوں کی روش پر قائم ہوتے ہیں۔ جدید علوم نے قدیم علوم کو باطل کر دیا ہے اور اب ان کی صرف تاریخی حیثیت رہ گئی ہے۔ مگر جدید ادب نے قدیم ادب کو باطل نہیں کیا۔ ادب وہ خاص علم دیتا ہی نہیں جو بعد میں بدل جائے ادب تو وہ عمومی بصیرت، وہ عام احساس، وہ عرفان دیتا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا ہاں ہلکا یا گہرا، وسیع یا علاقائی ہو سکتا ہے، مگر جس میں تازگی اور توانائی رہتی ہے۔

اگر اردو میں ادب کی اس مخصوص بصیرت کا عرفان عام ہو جائے تو نہ تو ادب کو بعض علوم کے مطابق کرنے کی کوشش ہوگی اور نہ اس کی بصیرت کو واضح کرنے کے لیے علوم کی کتابوں سے حوالے کی ضرورت پڑے گی یعنی ادب فرائڈ کے لیے یا مارکس کے لیے ادب کی افادیت کو ثابت کرنے کے لیے یا سیاست کے [illegible] کرنے کے یا اس کی ضروریات کا جواز پیش کرنے کے کام نہ آئے گا، وہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک ذریعہ ہوگا جس میں بچے کی دعا سے لے کر بڑے کا خواب تک سبھی کچھ آ سکے گا

نئے ادب کو یہ آزادی دینے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ ضد یہ ہے کہ خود ادب بھی اس کے لیے نئی نئی زنجیریں راستے میں باندھے۔ ہدایت نامے لکھے جا رہے ہیں اور سمجھتے رہیں کہ وہ اس طرح ادب کو برگزیدہ بنا رہے ہیں اور افسانہ و افسوں کے غبار سے علم و حکمت کے مینار تعمیر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسانہ و افسوں اپنی اثر پذیری کے لیے بھی حقیقت کے محتاج ہیں، مگر یہاں حقیقت اپنی ٹھوس شکل میں نہیں سیال حالت میں آتی ہے اور اس طرح ایک ایسی حقیقت بن جاتی ہے جو سائنسی یا عقلی یا معروضی یا خارجی حقیقت سے کسی طرح کم اہم نہیں ہوتی۔ اس لیے فنکار کو اپنی تخلیق کسی علمی نظریے کی بنا پر نہیں کرنی چاہیے، ہاں اس کی نظر میں مادّہ و عالم کے جلووں کے ساتھ دانش و فرہنگ کا سرمایہ بھی ہونا چاہیے مگر مشکل یہ ہے کہ ہیروں کو دیکھتے ہی کچھ لوگ اس پر گھاس لادنے کی سوچنے لگتے ہیں بیچارہ ہیرا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادیب کی بڑائی اس کے پیچھے نظریے کی بڑائی یا صحت میں نہیں، اس کی نظر کی گہرائی، اس کے فنکارانہ خلوص اور اس خلوص میں شدت، اس کے اپنے تجربے کی سنجیدگی سے مربوط ہے جب تک ادب اپنی ادبی حیثیت پوری نہ کرے اچھا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اور صحافت میں یہی فرق ہے کہ صحافت وقتی موضوعات کو ہی ابدی اہمیت دے دیتی ہے ادب وقتی موضوعات کو ابدی معنویت کی روشنی میں دیکھتا ہے خاص واقعات سے اسے غرض نہیں، عمومی صداقتوں سے بحث ہے۔ ارسطو سے اب تک ادب کے پارکھ اس چیز پر زور دیتے رہے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر مدیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

Regd. No. L-922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۷ | ایڈیٹر آل احمد سرور | یکم مئی ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم

۲۱ اپریل کو انجمن کی ادبی مجلس، مالی مجلس اور مجلس عاملہ اور مجلس عام کے جلسے ہوئے۔ اس میں بمبئی، حیدرآباد، سری نگر، دہلی، رامپور اور اورنگ آباد سے ممبروں نے شرکت کی۔ ان جلسوں میں جو فیصلے ہوئے ان میں سے خاص خاص کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) غالب کی سویں برسی کے موقع پر انجمن حسب ذیل کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

(۱) غالب کا سارا اردو کلام۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ دوسرا ایڈیشن۔

(۲) خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد نظر ثانی مالک رام دو جلدیں اس کی پہلی جلد انجمن کئی سال ہوئے شایع کر چکی ہے، مگر اب دونوں جلدیں اس موقع پر شایع ہوں گی۔

(۳) غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ از اکبر علی خاں

(۴) گنجینۂ غالب۔ مرتبہ مختار الدین آرزو

(۲) اردو تحریک کا جائزہ لینے اور شاخوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کے لیے جولائی میں مجلس عام اور ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوگا جس میں علاوہ دوسرے امور کے ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ منزل تک اردو کے ذریعہ سے تعلیم کا ریاستی شاخوں کے ذریعے انتظام کرنے یا حکومت سے مناسب انتظام کرانے کا پروگرام تیار کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کتابوں کی فراہمی استادوں کی تربیت اور دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی غور ہوگا۔

(۳) اردو گھر کے لیے عوام سے چندے کی اپیل کی گئی ہے اور اس غرض سے بعض ریاستوں میں نمائندہ کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے کنوینر مقرر کر دئے گئے ہیں۔ دہلی، بمبئی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہروں میں چندے کے لئے خاص تہذیبی پروگرام بھی ہوں گے جو نمائندہ کمیٹیاں کریں گی۔ چندے کے لیے ہزار، پانچ سو، سو، پچاس، بیس، دس اور پانچ روپے کے چندے کی رسیدیں تیار کرائی جائیں گی اور چندہ کا اعلان ہماری زبان میں برابر ہوتا رہے گا موجودہ نائب معتمد کے علاوہ ایک اور نائب معتمد چندے کی فراہمی کے کام کی نگرانی کرے گا اور اس سلسلے میں صدر، نائب صدر، سکریٹری اور مجلس عام کے ممبر خاص خاص مقامات کا دورہ بھی کریں گے مجلس عام کا ہر ممبر ایک ہزار چندہ خود دیگا یا اپنے احباب سے دلوائے گا تاکہ دوسروں سے چندہ لے سکے۔

( ) اردو گھر کی تعمیر کی فوری ضرورت ہے۔ انجمن کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپیہ اس کام کے لیے موجود ہے۔ حکومت سے امداد کی بھی درخواست کی گئی ہے، مگر ابھی تک کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا ہے۔ حکومت یہ عذر کر رہی ہے کہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے فی الحال روپیہ نہ دینے کی پالیسی کے پیش نظر اس کام میں حکومت [illegible] نہیں کر سکے گی۔ ہم اس سلسلے میں حکومت کو پھر توجہ دلا رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہماری مدد عام اردو دوست اور ہندوستان کی ہر زبان کی ترقی چاہنے والے حضرات ضرور کریں گے۔ عوام سے چندے کی درخواست صرف روپیہ جمع کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کو اردو گھر کے چلانے اور انجمن کے کاموں میں شریک کرنے، ان کی عملی ہمدردی حاصل کرنے ان سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے اور انجمن کو خود کفیل بنانے کے لیے ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں دو کروڑ اڑتیس لاکھ اشخاص کی مادری زبان اردو ہے۔ اب تو یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ انجمن ان سب کے جذبات و خیالات کی نمائندگی اسی وقت کر سکتی ہے جب اسے ان کا عملی تعاون حاصل ہو اور وہ اس کے سارے اخراجات کے کفیل ہوں [illegible] سے مدد مانگنا ہمارا جمہوری حق [illegible] زبانوں کی ترقی اس [illegible]

ہے اپنی تاریخ، اپنے چلن، اپنے ادبی سرمائے کی عظمت اور ہندستانی زندگی کے سرمائے کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے مگر زبان و ادب صرف ۔۔۔ کے سہارے ترقی نہیں کرنے، ۔۔۔ کے دبانے سے پامال ہو سکتے ہیں۔ ان کی ترقی ان کے دھرتی سے تعلق، چلن سے رشتے، اس زبان کے بولنے والوں کے حوصلے اور ان کی عملی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اردو اس لحاظ سے خوش قسمت ہے اس کے بولنے والوں کو اس سے محبت بھی ہے اور ان کے جذبے کی گرمی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ہماری صلاحیتیں اب تک احتجاجی اور ہنگامی تحریکوں میں برباد ہوتی رہی۔ احتجاج بھی ضروری ہے مگر احتجاج کافی نہیں جلسوں اور مظاہروں کانفرنسوں اور قرار دادوں کی بھی اہمیت ہے، مگر انہیں ہی سب کچھ سمجھنا غلط ہو گا سب سے بڑی چیز اپنے آپ کچھ کرنے، اپنے وسائل کو سلیقے سے استعمال کرنے اور ہر حال میں موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق اپنے دائرہ عمل کو بڑھانا ہے۔ انجمن یہی کرنا چاہتی ہے اور اردو دوستوں سے اس کی یہ اپیل ہے کہ وہ اس اہم اور بنیادی کام میں اس کی مدد کریں۔ انجمن کا کسی دوسرے ادارے سے کوئی جھگڑا نہیں۔ انجمن صرف اپنے کو اردو کا ٹھیکے دار بھی نہیں سمجھتی، مگر یہ اردو دوستوں کی سب سے بڑی سب سے منظم اور سب سے زیادہ جانی پہچانی جماعت ہے اس لیے ۔۔۔ ہیں۔ ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ کس سے نہیں ہوتیں۔ فرد ہو یا ادارہ غلطیوں سے کوئی پاک نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مقصد بعض لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ یہ راست اقدام کیوں نہیں کرتی اور یہ حکومت سے امداد کیوں لیتی ہے۔ راست اقدام کوئی ٹوٹکا نہیں ہے کہ اس کا نام لینے سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ یہ اپنے مطالبات کو منوانے کے بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جو بعض اوقات میں اور ملک کے سیاسی مزاج کو دیکھتے ہوئے انجمن کے نزدیک احتجاج کے دوسرے طریقوں کو آزمانا بہتر ہو گا۔ رہا حکومت سے امداد کا معاملہ تو یہ ہمارا جمہوری حق ہے یہ ہمارا روپیہ ہے جو ٹیکسوں کے ذریعے ہم حکومت کو دیتے ہیں اور اگر اس میں سے اگر کچھ رقم ہمیں مل سکتی ہے تو ہم کیوں اس حق سے دستبردار ہوں لیکن اس کی وجہ سے ہماری پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انجمن کی مجلس عام کے چالیس ممبر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، استادوں اور قومی کارکنوں پر مشتمل ہیں۔ یہی چالیس ممبر اس کی پالیسی بناتے ہیں۔ نئے قواعد کے مطابق ان میں بارہ ریاستی شاخوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ انجمن سارے مسائل کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتی ہے۔ اس میں مختلف مذاہب کے مختلف سیاسی پارٹیوں کے اور مختلف ریاستوں کے لوگ شریک ہیں۔ انجمن چاہتی ہے کہ اس کا "اردو گھر" جلد سے جلد بن جائے تاکہ اس کے دفتر کو دلی منتقل کیا جائے اور پھر زبان و ادب کی خدمت زیادہ تندہی سے ہندستان کی راجدھانی سے کی جا سکے۔ اس مشن کو کامیاب بنانا ہر اردو دوست کا فرض ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اردو دوست اس معاملے میں ہماری توقعات کو پورا کریں گے۔

حرمت الاکرام

پیار کی بولی

روز تکلم پر اردو نے راہ اپنی کھولی ہے
رنگ کی گہرائی پائی ہے پھول کی خوشبو لی ہے
یہ نازک جذبات کے اجلے اظہار کی بولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

گرمائی تہذیب کی محفل چمکایا انسانے کو
رنگ سنہرا آنچل آنچل ردیف مال بڑھانے کو
تندوں کے پیالے میں اس نے دل کی لالی گھولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

تیرے دل کی دھڑکن دی انساں نے فکر کا ور دیا
عالم نے آغوش کو اس کی حسن ترتیب دو در دیا
حسن پہ حرفوں کو رشک آئے، اردو کی وہ جھولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

کرشن کے اساطوں کا جادو دلوں کا سودا کرتا ہے
جگر کا نغمہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتا ہے
ملوں سے کھلیانوں تک رقص میں دیوانوں کی ٹولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

گیت فراق کے جھلمل جھلمل کرتے ہیں مشعل کی طرح
حرمت کی لے سارہ فگن ہے ساون کے بادل کی طرح
کس پیلا کا محمل ہے یہ کس گوری کی ڈولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

ساقی فاروقی کا مجموعہ کلام پیاس کا صحرا شائع ہو گیا

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ پاکستان کے مشہور و مقبول جدید شاعر ساقی فاروقی کا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے۔ اس مجموعے میں ساقی فاروقی کی منتخب غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کو مکتبہ "کتاب نما" راولپنڈی نے شائع کیا ہے ساقی فاروقی آجکل اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہیں۔

(نامہ نگار)

منظفر اقبال

اردو میں خواتین کا اولین ناول — اصلاح النساء

(گذشتہ سے پیوستہ)

ان اقتباسات سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ رشیدۃ النساء ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس اور بنات النعش کے موضوع اور مقصد سے متاثر ہیں، اس بات کا مزید ثبوت اندرونی شواہد سے بھی مل جاتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء پر نذیر احمد کے ناولوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۳ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) کے اثرات نمایاں ہیں لیکن مصنفہ کا یہ دعویٰ بھی اسی جگہ پر صحیح ہے کہ:۔

'میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا اور سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات لکھی ہے ......'

(دیباچہ اصلاح النساء)

بلاشبہ رشیدۃ النساء کے بیانات میں نسبتاً زیادہ واقعیت اور صداقت نظر آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء میں مسلم گھرانوں کی معاشرت کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ بالکل سچی اور جیتی جاگتی ہیں، مثال کے طور پر صرف ایک تصویر ملاحظہ ہو، مانجھوں کی رسم کا بیان ہے:۔

"جمعہ کے دن تین بجے تک گھر میں بسم اللہ کی ماں کے ہاں مہمانوں کا ہجوم ہو گیا، گانے والیاں آئیں، گانا بجانا شروع ہوا، تین بجے لڑکی مانجھے بٹھائی گئی، بسم اللہ جس قدر زیور پہنے تھی سب اتار دئے گئے یہاں تک کہ چوڑیاں بھی اتار دی گئیں اور سات سہاگنوں نے ابٹن اپنے اپنے گال سے چھوا کر بسم اللہ کو لگایا، داہنے ہاتھ میں کنگنا باندھا گیا جس وقت یہاں رسمیں ہو رہی تھیں زنانے دروازے پر آدمی پکار رہے تھے کہ مانجھے کی چیزیں باہر بھیجو دیر ہوتی جاتی ہے مگر گانے بجانے کا اس قدر گھر میں غل تھا کہ کسی کے کان تک پکارنے والے کی آواز نہیں پہونچتی تھی، بڑی دیر ہو گئی اور یہ لوگ چلا چلا کر تھک گئے، جب گانا موقوف ہوا تو باہر کے پکارنے والے کی آواز سن کر ایک ماما چلاتی ہوئی دوڑی اے لوگو چپ رہو کتنا غل ہے، باہر کے لوگ کشتی مانگ رہے ہیں، میاں دروازے پر کھڑے ہیں اے لوگو چپ بھی رہو اس ماما کے چلانے سے غل کسی قدر کم ہوا تو معلوم ہوا کہ باہر سمدھیانے جانے کی چیزیں مانگی جاتی ہیں۔ ایک چاندی کی چوکی، کشتیاں، خوانچے جو تیار ہوئے تھے وہ سب باہر جانے لگے، ایک کشتی میں دولہا کے لیے مانجھے کا جوڑا تھا، زرد رنگ کا انگرکھا مشروع کا پائجامہ زرد کرتا سرخ رنگ کا رومال جس کے چاروں طرف گوٹا لگا ہوا، زر کی ٹوپی زر کا جوتا بھاری کام کا۔ یہ سب چیزیں ایک کشتی میں تھیں اور پھول جیگیر طرہ مدھی اور ہار تھے یہ سب چیزیں نہایت عمدہ تورہ پوش سے ڈھکی ہوئی تھیں، دوسری کشتی میں ایک تھال چاندی کی، اوس تھالی میں سات پینڈیاں اوس میں ایک زرد رنگ کا کنگنہ تھا کچھ کار چوبی کام کیا ہوا جو اسپید رائی دے کر بنایا گیا تھا اور اسی کشتی میں ایک دوسری تھالی میں سات بیڑے پان کے ورق نقرہ لگے ہوئے اور ایک کپی میں تیل چنبیلی کا جس کے منہ پر سرخ کپڑا گوٹا لگا ہوا بندھا تھا، یہ سب چیزیں رکھ کر ایک تورہ پوش کشتی پر ڈال دیا۔ اس کے سوا کچھ خوانچے اور تھے جس میں گیارہ پنسیری پینڈیاں تھیں اور بہت سے خوانچے خالی تھے۔ ان میں تھوڑا چورہ صرف مٹھائیوں کا ڈال دیا تھا، یہ سب زینت کے لئے تھے، باجے کے ساتھ مانجھا روانہ ہوا اور باجے بھی ایسے مہیب آواز کے جس سے دل دھڑک جائے اور کانوں کو تکلیف پہونچے۔ بگی گاڑی کے گھوڑوں کی قطار، اونٹ اور ہاتھی وغیرہ جو کرایہ پر منگوائے گئے تھے سب ساتھ تھے سب کے پیچھے مانجھے کی چوکی کشتیاں اور خوانچے متعدد مگر اکثر خالی اگر خوان پوش کہیں ہوا سے اڑا تو حقیقت کھل گئی، مانجھے کے ساتھ کچھ شریف لوگ بھی تھے۔ اس تکلف سے مانجھا روانہ ہوا اور اس کے بعد سواریاں روانہ ہونے لگیں مکان محمد اعظم کا قریب تھا، سواریاں جلد جلد اوتر گئیں اور مانجھا کہیں شام کے وقت تمام شہر اور گلیوں سے گردش کرتا ہوا پہونچا....."

(اصلاح النساء حصہ اول ص۱۴۹ تا ۱۵۱)

جزئیات نگاری نے اس تصویر کو وہ رنگ و روغن عطا کیا ہے کہ آج بھی زندہ اور متحرک نظر آتی ہے، افسوس کہ ہمارے بلند پایہ ناقدین نے اصلاح النساء کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی ورنہ وہ رشیدۃ النساء کو بھی ان ہی الفاظ میں خراج عقیدت ادا کرتے جن الفاظ میں آل احمد سرور نے نذیر احمد کو ادا کیا ہے۔

• اسلامی سوسائٹی و معاشرت کی اصلاح [illegible]

کی اندرونی معاشرت کی جو تصویریں نذیر احمد نے
کھینچی ہیں وہ ایسی سچی اور بے لاگ ہیں کہ آنکھوں کے
سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔"

(بحوالہ اردو نثر کا تاریخی سفر، ص۵۸)

اصلاح النساء کا قصہ خاصا طویل ہے لیکن اس کی ترتیب
تنظیم میں کوئی الجھاؤ نہیں بلکہ سادگی اور صفائی ہے۔ نذیر احمد
کے اولین ناول مراۃ العروس اور بنات النعش کی طرح دو حصوں
پر مشتمل ہے اور اس کے مرکزی کردار اشرف النساء اور بسم اللہ مراۃ العروس
و بنات النعش کے مشہور و معروف کردار اصغری اور اکبری سے
بہت حد تک مشابہ ہیں لیکن قصہ کا محور اشرف النساء اور
بسم اللہ نہیں بلکہ بی وزیرن ہیں جو بھولی بھالی پردہ نشین
خواتین کو ٹھگنے میں ماہر ہیں حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء بنیادی
طور پر وزیرن ہی کی کہانی ہے۔ حصہ اول میں یہ کہانی نامکمل
رہ جاتی ہے اس لئے مصنفہ نے دوسرے حصے کا اضافہ
کیا ہے۔ اصلاح النساء کا قصہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے
کہ اس میں انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے مسلم
گھرانوں کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

اصلاح النساء میں تقریباً ڈیڑھ درجن کردار ہیں مردوں میں محمد اعظم
محمد معظم، اختیار الدین، میر محمد واعظ، میر غلام علی اور رمضان علی مختار
وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور عورتوں میں اختیار الدین کی ماں، مہری بیگم
بسم اللہ، رحمت النساء، اشرف النساء، امیر النساء
عرف لاڈلی، کریم النساء، شہزادی، سردار دلہن، گل چمن اور
وزیرن کے نام اہمیت رکھتے ہیں بسم اللہ پر اکبری، لاڈلی پر نعیمہ
اور اشرف النساء پر اصغری اور صالحہ دونوں کا سایہ نظر آتا ہے
اور اس اعتبار سے ان میں کوئی جدت یا تازگی نہیں لیکن اس
کی تلافی وزیرن کے کردار نے کر دی ہے جس طرح اچھی سے اچھی غزل
میں کوئی ایک شعر ہی حاصلِ غزل ہوتا ہے اسی طرح اصلاح النساء
کے کرداروں میں صرف وزیرن کا کردار بہت ہی دلکش ہے اور
یہ پورے ناول پر محیط ہے۔ بلاشبہ یہ کردار بہت ہی جیتا جاگتا اور
زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ہے۔

وزیرن ایک عیار اور پرفن عورت ہے جس کا ذریعہ معاش
ضعیف الاعتقاد عورتوں کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا ہے اس
کام کو وہ بہت سلیقہ اور ہنرمندی سے انجام دیتی ہے
عورتیں اس وقت تک اس کی معتقد رہتی ہیں جب تک کہ وہ خود
ہی اپنے فریب کا پردہ چاک نہیں کرتی لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنا
وطیرہ ترک کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے یہاں تک کہ خواب
سے متاثر ہو کر توبہ کرتی ہے اور پھر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو جاتی
ہے وزیرن کی طبیعت میں یہ عظیم انقلاب کسی مجبوری کے تحت
نہیں آتا وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کسی خوف سے نہیں کرتی بلکہ اپنی
تمام چالاکیوں اور عیاریوں کے باوجود وہ سردار دلہن کی خوش خلقی
کے سامنے بے بس ہو کر اعترافِ جرم کر لیتی ہے۔ اس اعتراف کے
بعد اس کا نفس پھر اسے ورغلاتا ہے چنانچہ وہ سردار دلہن کے
روبرو تو ظاہراً توبہ کر لیتی ہے لیکن دل میں کھوٹ باقی رہ جاتا ہے
جسے دور کرنے کے لیے رشیدۃ النساء نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو
نذیر احمد نے توبۃ النصوح میں نصوح کے قلب ماہیت کے لیے
استعمال کیا ہے یعنی خواب! ــــ اس میں کیا شبہ ہے کہ خواب
انسان کے ذہن کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے، وزیرن بھی ایک
خواب دیکھتی ہے جس سے متنبہ ہو کر اپنے اعمال بد سے ہمیشہ
کے لیے توبہ کر لیتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیرن کے
کردار کا ارتقاء فطری اور نامیاتی ہوا ہے۔

وزیرن کا یہ نیک انجام رشیدۃ النساء کی انسان دوستی کا ایک
کھلا ہوا ثبوت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں کے
برعکس انسان کو اچھے اور برے کے خانوں میں تقسیم کرنے کی قائل نہیں
انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ انسان کی طبیعت میں بیک وقت
جبرئیلیت اور ابلیسیت موجود ہوتی ہے۔ انسان خیر اور شر دونوں کا
مجموعہ ہے، انسانی فطرت کا یہ عرفان رشیدۃ النساء کو اپنے عہد کے ناول
نگاروں کے درمیان ممتاز کر دیتا ہے

اصلاح النساء کے مکالموں میں اپنی زبان اور اختصار کے باعث غیر
معمولی طوالت نظر آتی ہے۔ گفتگو کیا ہے اچھی خاصی تقریر ہے لیکن اس
کے باوجود مکالموں کا جو اصل مدعا ہے اس سے رشیدۃ النساء بے خبر
نہیں چنانچہ اصلاح النساء کے مکالموں سے کردار کی سیرت و شخصیت پر
بھرپور روشنی پڑتی ہے، مرد عورت، آقا غلام، بی بی ماما، اور بڑے
چھوٹے کی گفتگو میں ان کی زبان اور لب و لہجہ کے اختلاف کو بہت ہی
واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، مثال کے طور پر بی وزیرن اور ایک ماما کی
گفتگو کا انداز دیکھئے۔

وزیرن: خیریت تو ہے؟ تم ایسی گھبرائی ہوئی کیوں
آئی ہو صاحبزادی اور بیگم صاحب تو اچھی طرح سے ہیں؟
شراتن: سرکار تو اچھی ہیں مگر صاحبزادی کو بخار آتا ہے
سر میں درد بھی ہے اور قے بھی ہوئی ہے۔
یہ سن کر وزیرن دل میں بہت خوش ہوئی، منہ بنا کر پوچھا
کہ صاحبزادی تو سسرال ہی میں ہوں گی۔
شراتن: اللہ رے وہ لوگ تو ایسے ہیں کہ کسی کا دم نکل جائے تو کچھ فکر نہیں
ہے، صاحبزادی بیمار ہو پڑیں تو کوئی تدبیر نہیں ہوئی بس ڈاکٹر کی دوا شروع ہو گئی!
بیگم صاحب نے کہا کہ علاج مت کرواؤ ہم لوگوں نے بھی کہا کہ اگر کچھ نہیں کیا ہے تو
مولوی صاحب کے تعویذ میں کیا ہے؟ آخر وہ بھی تو پڑھے لکھے ہیں۔
اے ہے ایسی بی بی تعویذ نہیں آئے ہیں۔ وزیرن: نہیں؟
شراتن: نا بی بی! آخر بڑی مشکل سے سرکار صاحبزادی کو لے آئیں۔

(اصلاح النساء حصہ اول صفحہ [illegible] بحوالہ آئینہ)

د۔ ر۔ اختر

رفتار

اردو ادب کے تازہ شمارے میں باقر مہدی کا ایک مضمون "جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں یوں تو کئی باتیں قابلِ بحث ہیں لیکن خاص طور پر جدید شاعری کے سلسلے میں باقر مہدی نے جو فارمولا بنایا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "جدید شاعری درسی شاعری کے خلاف تخلیق کی گئی ہے اسے درسگاہوں سے بچانے کی کوشش ہی صنعتی شہروں کی شاہراہوں اور گلیوں میں لائی ہے۔" پھر انھوں نے کلیۃً شاعری کو اور زیادہ تنگ دائرے میں قید کرنے کے لیے یہ شرط بھی لگادی کہ جدید شاعر بننے کی اہلیت صرف "غیر محفوظ، تشنہ، شکستہ دل، حریص، سرکش جوانوں میں ہے۔" ان صفات سے تو اختلاف ممکن نہیں لیکن غیر محفوظ زندگی کی خصوصی شرط غور طلب ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے علی گڑھ، سرگودھا اور لاہور کے جدید شاعروں کو کتابی شاعری کرنے والا قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "اگر ان چھوٹے شہروں کے شاعر بڑے صنعتی شہروں میں مارے مارے پھریں تو ان کی قلعی اتر جائے۔"

جہاں تک میرا مطالعہ ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جدیدیت میں سب سے غالب عنصر انتہا پسندانہ اور تنگ نظرانہ کلیوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ ہے۔ ہمارے پیشرو ترقی پسندوں نے بھی شاعری اور ادب کو اسی طرح کے کلیوں میں جکڑنے کی غیر فطری کوشش کی تھی، جس کا اثر نہ صرف شاعری بلکہ ترقی پسند تحریک پر بھی اچھا نہیں ہوا۔ اس وقت تو کم از کم ایک سیاسی نظریہ ادب کا معیار سمجھا جاتا تھا اور اس سیاسی نظریے کو ماننے اور ادب میں برتنے کے لیے کسی شہر، مقام یا مخصوص قسم کی زندگی گزارنے کی شرط نہ تھی، اس کے باوجود سنجیدہ اور باشعور طبقے میں اسے تنگ نظری، انتہا پسندی اور ادعائیت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ آج بھی ترقی پسندی کے نام پر ادب کو چند خانوں میں بند کرنے اور تقسیم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ مستحسن نہیں سمجھی جاسکتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ کہیں جدیدیت بھی چند فارمولوں میں قید ہو کر نہ رہ جائے۔ اور اس طرح سے تنگ نظری، ادعائیت اور انتہا پسندی نئے لباس میں پھر ادب کے ادبی معیاروں کی جگہ غیر ادبی معیاروں اور ہمہ گیر قدروں کی جگہ شخصی یا گروہ داری مصلحتوں کو مقید پر مسلط نہ کر دے۔

جدیدیت اس وقت ادب کا ایک مثبت رجحان بن چکی ہے۔ جدیدیت کی تعریف اور تفسیر میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر اتنا ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ جدید ادب وہ ہے جو آج کے طرزِ فکر و احساس (MODERN SENSIBILITY) کے ساتھ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل و ترجمانی کرتا ہے۔ اس وسیع تر تعریف میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر شاعر یا ادیب اپنے انفرادی تجربات اور طرزِ اظہار کے لیے موزوں اسالیب کی تلاش کرے۔ جدیدیت کسی ایک نظریے سے پوری طرح وابستگی (COMMITMENT) اختیار نہ کرتے ہوئے بھی مختلف نظریات (سیاسی، سماجی اور ادبی) کے زندہ، متحرک اور صحت مند عناصر کو اپنے میں جذب کر سکتی ہے کیونکہ جدیدیت کوئی جامد یا مجرد تصور (CONCEPT) نہیں بلکہ ایک متحرک، فعال اور ارتقا پذیر عمل (PROCESS) ہے۔ اس عمل کو ہر فنکار اپنے ذاتی اور داخلی تجربوں کی روشنی میں محسوس کر سکتا اور اسے فن میں برت سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کے یہاں جدیدیت کا ایک پہلو نمایاں ہو سکتا ہے اور کچھ کے یہاں بعض دوسرے پہلوؤں پر زور ہو سکتا ہے۔ جدیدیت کے اسی وسیع تر مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو ہم ادب کو تھیلوں اگر دہول اور خانوں میں تقسیم کرنے کی بدعت سے بچ سکتے ہیں۔ جدیدیت نہ تو صرف صنعتی شہروں میں زندگی کے بکھرنے اور غیر محفوظ ہونے سے عبارت ہے اور نہ صرف تنہائی کے احساس سے، یہ محض موت یا خودکشی کے جذبے کی تسکین کا نام بھی نہیں اور جنس کے مسخ تجربات کو سنسنی خیز انداز میں پیش کرنے کا عمل بھی نہیں۔ مختلف شاعروں کے یہاں یہ عناصر کم یا زیادہ شدت کے ساتھ ضرور مل سکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی حیثیت یا منفی رویے ہی کو کل جدیدیت سمجھنا غلط ہوگا۔ جدیدیت داخلی تجربے اور انفرادیت کے

ذکاء الدین شایاں

غزل

سینے میں درد و غم کو پھر آباد ہی کرو
بھیگی ہوئی ہے رات۔ اسے یاد ہی کرو

اب تو سکوتِ لب سے بھی بنتا نہیں ہے کام
شاید سکوں ملے۔ کوئی فریاد ہی کرو

تاریکیوں کے ڈیرے ہیں کب سے خیال میں!
آنکھوں کے جگنوؤ۔ انھیں آباد ہی کرو

کوہِ گرانِ زیست ہے، اپنے نفس کو پھر
جو ہو سکے تو، تیشۂ فرہاد ہی کرو

خاموشیوں سے جیسے فضائیں بھی تنگ ہیں
اپنی زبان کھولو۔ کچھ ارشاد ہی کرو

موسم تو دل کا بدلے۔ کہیں پھول تو کھلیں
پابند نکہتوں کو تم آزاد ہی کرو

ساتھ حیات و کائنات کے مسائل کی آگہی کا بھی نام ہے۔ جدیدیت میں سیاسی اور سماجی شعور کے شاعرانہ اظہار کی بھی جگہ ہے بشرطیکہ یہ شعور سیاسی نعرہ نہ بنے بلکہ شعر کے نامیاتی کل کا لاینفک جز بن جائے۔ جدیدیت اور ترقی پسندی (بشرطیکہ اس اصلاح کے اب کوئی ادبی معنی بھی رہ گئے ہوں) میں بنیادی فرق رویے کا ہے جدیدیت ادبی رویے پر زور دیتی ہے اسی لئے اس کے نزدیک شعر کا اچھا ہونا بنیادی شرط ہے خیال یا نظریے کی حیثیت ثانوی ہے، ترقی پسندی میں فوقیت خیال یا نظریے کو دی جاتی ہے اور شاعری ضمنی شے بن جاتی ہے۔ اس رویے کے فرق کے باوجود جدیدیت اور ترقی پسندی دو متضاد یا مخالف رجحانات نہیں، جدیدیت اپنے وسیع تر غیر سیاسی مفہوم میں ترقی پسند بھی ہو سکتی ہے، اور ترقی پسند شاعری، اپنی نظریاتی وابستگی کے باوجود جدیدیت کی روح سے قریب بھی آ سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ان دونوں رجحانات کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ کر مناظرے اور مجادلے کا سلسلہ شروع کیا ہے، ان کا مقصد ادبی کم اور غیر ادبی زیادہ ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر ایک کا اور بطور خاص ان شاعروں اور نقادوں کا جو اپنے کو کسی نہ کسی عنوان سے جدیدیت کے ساتھ منسلک سمجھتے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ جدیدیت کو محدود خانوں میں تقسیم کر کے اس رجحان پر یک رنگی، انتہا پسندی اور ادعائیت کی چھاپ لگانے سے گریز کرے۔

اچھی شاعری کبھی کتابی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے براہ راست تجربے سے تخلیق پاتی ہے۔ شاعری میں کوئی نظریہ تو مل سکتا ہے لیکن نظریہ خود شاعری کے عمل میں تشکیل پاتا ہے، نظریہ شاعری کا نتیجہ ہوتا ہے سبب نہیں۔ البتہ جو لوگ پہلے نظریہ تراشتے ہیں اور پھر شاعری کرتے ہیں ان کے یہاں حقیقی شعری تجربے کا فقدان ہوتا ہے۔ جدید شاعری میں بھی کچھ عرصے سے یہ خرابی پیدا ہو چلی ہے کہ ہمارے بعض ساتھی ترقی پسندی سے برملا اعلان انحراف کرنے کے باوجود اپنے ادبی رویے میں نظریے یا فارمولے کو شاعری پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اگر ہم یہ طے بھی کر لیں کہ شاعری محض اظہار ذات یا محض احساس تنہائی، یا محض صنعتی شہروں میں فرد کے المیے سے عبارت ہے، تب بھی یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ ہر وہ شخص جو ان میں کسی ایک فارمولے کو شاعری کی استعداد و انہماک کے بغیر میکانکی طور پر شاعری کرے، صحیح معنوں میں جدید کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ جدیدیت اسی میکانکیت اور نظریہ سازی کے خلاف مثبت ردعمل سے شروع ہوئی ہے۔ جدید شاعری کے سلسلے میں جو بھی مسائل پیدا ہوئے، موضوعات اور طرز ادا دونوں کے، وہ اس شاعری کا فطری نتیجہ ہیں لیکن ان نتائج ہی کو اصول بنا کر چلنے میں خطرہ ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل جدید شاعری کے متعلق ترسیل و ابلاغ کے مسائل خاصی اہمیت اختیار کر گئے ہیں، اس کے اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جدید شاعری کی زبان اور محاورہ (IDIOM) ملی ہوئی ہے اور روایتی زبان اور پرانے الفاظ ناکافی ثابت ہو رہے ہیں اس لیے یا تو ان کے معانی کی توسیع ہو رہی ہے یا نئے الفاظ نئے مفاہیم کی ادائیگی کے لیے وضع کئے جا رہے ہیں، زبان کی تبدیلی کے اس عمل کے ساتھ ہی لہجے میں بھی بنیادی تبدیلی ہوئی ہے، اب براہ راست اور واضح قسم کی خطیبانہ صراحت کی جگہ رمزیت و اشاریت نے لی ہے اور شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ یہ تلاش ذات کا بھی نتیجہ ہے اور اظہار ذات کا بھی۔ اسی کے ساتھ اب شاعری طے شدہ نتائج کا اظہار نہیں رہی، بلکہ نظم اپنی اندرونی اور شعری منطق کے سہارے چلتی کبھی کبھی بالکل ہی غیر متوقع نتیجہ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن کی وجہ سے شاعری میں ابہام پیدا ہوتا ہے ابہام بذات خود کبھی بھی برا نہیں سمجھا گیا بلکہ مارکس اور اینگلز تک شعر کے ابہام کو حسن سمجھتے رہے ہیں اس لیے موجودہ شاعری سے وضاحت کا تقاضہ اور طے شدہ نتائج تک پہنچانے کی توقع رکھنا غلط ہوگا تلاش کا جذبہ صادق ہونا چاہئے اب یہ تلاش جہاں بھی پہنچائے۔ اگر پہلے سے منزل اور راستوں کا تعین کر لیا جائے تو پھر تلاش کے کوئی معنی ہی نہیں باقی رہیں گے یہ تو وہ صورت حال ہے جو حقیقی شاعری کو پڑھ کر سامنے آتی ہے، لیکن کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے ابہام کو شعوری یا تقلیدی طور پر شعر کا حسن سمجھ کر قبول کیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اچھی شاعری وہی ہے جو اس قدر مبہم ہو کہ کسی کے پلے کچھ پڑے ہی نہیں۔ تقلیدی طور پر شعوری ابہام بلکہ اہمال پیدا کرنے والے جدید شاعروں کا خاصا بڑا گروہ ہے۔ ان کی شاعری کی ناکامی کا اصلی سبب یہی ہے کہ انھوں نے ایک نتیجے کو جو محض طور پر سامنے آیا تھا شاعری کا منتہا مقصود اور کل سرمایہ سمجھ لیا اسی طرح اگر کچھ شاعر محض تنہائی اور ذات کے المیے ہی کو کل شاعری سمجھ لیں تو پھر ذات کے اس حقیقی تجربے تک نہیں پہنچ سکتے جو کائنات کے اسرار اور زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا اور ذات کو آفاق سے جوڑتا ہے۔ شاعری کے سلسلے میں فارمولا بنا نا ہمیشہ ہی شاعری کا بہت ہی خراب قسم کی مصنوعی اور تقلیدی شاعری کو فروغ دینے کا سبب بنتا ہے۔ نظریے اور شعر کا تعلق اتنا مصنوعی اور میکانکی نہیں ہوتا جیسا کہ جدیدیت کے بعض انتہا پسند یا ادعا پرست شارحین نے سمجھ لیا ہے جدیدیت نہ تو ابلاغ کی نفی ہے نہ شعوری یا تقلیدی ابہام پرستی نہ ہیئت پرستی ہے نہ سیاسی اور سماجی شعور کی نفی۔ جدیدیت کے مخالفین جب جدید شاعروں کو سماجی ذمہ داری کا منکر قرار دیتے ہیں یا اسے ترقی پسندی کے خلاف کوئی محاذ سمجھتے ہیں تو وہ اب بھی ادعا پرستی اور میکانکی نظریہ سازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں جدید شاعروں نے بعض اہم سیاسی اور سماجی مسائل پر جتنی اچھی نظمیں لکھی ہیں اتنی مستند ترقی پسند شعراء نے بھی نہیں لکھیں سیاسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جدیدیت کے طرفداروں میں اکثریت ان کی ہی ہے جو سوشلزم، سیکولرازم، جمہوریت اور انسان دوستی پر اپنی سماجی زندگی میں یقین رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں، یہ محض تنگ نظری ہے کہ بلا وجہ انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر رجعت پرستوں کی صف میں کھڑا

کرنے کی مذموم کوشش کی جائے۔ بات صرف اتنی ہے کہ سماج کے تمام ترقی پذیر اور زندہ اقدار کو ماننے کے باوجود جدید ادیب ادب میں ان کو فارمولا بنا کر مسلط کرنے کے قائل نہیں، جدیدیت ادبی اور سماجی سطح پر ہر طرزِ فکر اور طرزِ ادا کے ہر تجربے کو مستحسن سمجھتی اور زندگی و ادب کے لیے نیک فال گردانتی ہے۔ اظہار کی آزادی اور نئے تجربوں سے گھبرانا اچھی بات نہیں۔ ادب میں اختلاف کی آزادی کا بھی ہر ادیب کو حق ملنا چاہئے۔ جہاں اس حقیقت کو جدیدیت کے مخالفین نظر انداز کر دیتے ہیں، وہیں بعض انتہا پسند جدیدیئین بھی کسی مخصوص اور محدود نقطۂ نظر سے اختلاف کو جدیدیت سے اخراج کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر کچھ جدید نقاد صرف اپنے ذاتی نقطۂ نظر کو پوری جدید شاعری کی کسوٹی قرار دے دیں تو میرے نزدیک یہ جدیدیت کی بدمذاقی ہوگی شاعری میں داخلی اور شخصی تجربات کی اہمیت ہے لیکن تنقید میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ معروضی انداز نظر اختیار کرنا چاہئے۔

باقر مہدی ایک اچھے شاعر اور بالغ نظر نقاد ہیں ان کے مضامین ان کے مضامین میں جرات اور بے باکی کے ساتھ گہری ادبی بصیرت بھی ملتی ہے لیکن وہ اب تک اس انتہا پسندی سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے جو ایک زمانے میں ادبی مسلک کے طور پر اختیار کی گئی تھی ایک انتہا کو رد کر کے دوسری انتہا کو اختیار کرنا پچھلی غلطی کو دہرانا ہے۔ پچھلے دور کی تنگ نظری انتہا پسندی اور ادعا پرستی کی وجہ سے ادب و تنقید میں جو خامیاں پیدا ہوئی ہیں ان سے سبق سیکھنا اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ رجحان خواہ کسی صورت میں ابھرے، خطرناک ہے۔ صنعتی شہروں میں غیر محفوظ زندگی گزارنے والا شاعر یقیناً بعض ایسے تجربات سے گزرتا اور ان کے اظہار پر قادر ہو سکتا ہے جو دوسرے شاعروں کے یہاں اتنی شدت کے ساتھ راہ نہیں پا سکتے لیکن یہ جدید شاعری کا صرف ایک پہلو ہے، صنعتی شہر کے مسائل کو جدیدیت کی بنیاد بنا لینا بھی ایک میکانکی رویہ ہے اور اس فارمولے کے تحت اس سے زیادہ میکانکی اور کتابی شاعری وجود میں آ سکتی ہے جتنی چھوٹے شہروں کے محدود تجربوں میں ممکن ہے۔ ایک طرف تو ہم یہ کہتے اور لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اب دنیا اتنی سکڑ گئی ہے کہ ہم ویت نام کے اثرات اپنے گھر میں محسوس کر سکتے اور مارٹن لوتھر کنگ کے قتل کو اپنے کسی عزیز دوست کا قتل سمجھ سکتے ہیں دوسری طرف شہروں اور علاقوں کی حد بندی کرنے کے قدامت پسندانہ رجحان پر اصرار کرتے ہیں اس وقت جبکہ زمین سے چاند اور سورج تک کے سفر کی منزلیں آسان ہو رہی ہیں تخلیقی تجربے کو کسی ایک شہر یا چند شہروں تک محدود سمجھنا تخلیقی عمل کی آفاق گیری سے انکار کرنا ہے۔ یہ تو ہر شاعر کے اپنے VISION، ذہنی افق، اور تجربات کے تنوع پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کے کتنے رنگوں اور پہلوؤں کو سمیٹتا اور اپنی ذات کو کس حد تک آفاق کا آئینہ بنا سکتا ہے اس کے لیے بڑے شہر یا چھوٹے شہر، محفوظ یا غیر محفوظ زندگی کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا تخلیقی صلاحیت اور وسعتِ نظر کے ساتھ احساس کی شدت

کا سوال ہے۔ پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ محفوظ اور غیر محفوظ سے کوئی شخص کیا مراد لیتا ہے۔ اس کی بھی مختلف سطحیں اور مدارج ہیں جب پورا معاشرہ ہی شکست و ریخت، مصلحت اندیشی، ریا کاری اور معاشی تنگ دو دو میں ہر اصول کو توڑنے کے عمل سے دوچار ہے تو کوئی حساس ایماندار، خوددار، اور اصول پرست اور چند اقدار پر یقین رکھنے والا کہیں بھی اپنے کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ جس چیز کو باقر مہدی غیر محفوظ زندگی گزارنا کہتے ہیں وہ بعض صورتوں میں زندگی کی ذمہ داریوں سے گریز کی بھی ایک شکل ہو سکتی ہے۔ زندگی کا تجربہ زندگی کو ہر سطح پر برتنے اور گزارنے میں مضمر ہے نہ کہ زندگی کے ایک رخ کو اختیار کر لینے میں۔ میں باقر مہدی کے THESIS سے زیادہ بحث اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے شاید ہی کوئی پوری طرح اتفاق کرے گا۔ اصل اہمیت اس طرز فکر اور رجحان کی ہے جو جدیدیت کو اتنا محدود کرنے پر مصر ہے کہ چند "اصحابِ مقربین" کے علاوہ باقی سب شاعر اصحاب یمین و یسار بنا کر جدید شاعری کے دائرے سے باہر کر دئے جائیں۔ ہمیں تو جدیدیت کی ایسی تعریف کرنی چاہئے جو زیادہ سے زیادہ اچھے اور تخلیقی طور پر زندہ شاعروں کو اپنے دائرے میں لے سکے شاعری کے کتابی یا تخلیقی اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کسی فارمولے یا کلیے سے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوگا شاعری کا حقیقی معیار خود شاعری ہے۔ اچھی شاعری تمام فارمولوں سے آزاد اور بالاتر ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو جدیدیت کے صحیح تصور نے ہم پر منکشف کی ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے تو خود تنقید بھی کتابی ہو جاتی ہے۔ میں آخر میں جارج سٹینر (GEORGE STEINER) کا وہی قول دہراؤں گا جو خود باقر مہدی نے اپنے نظریے کی تائید میں درج کیا ہے۔

"NOTHING IS MORE ACADEMIC THAN MODERNISM MADE RIGID"

جدیدیت کو کٹر (یا باقر مہدی کے الفاظ میں سرد) بنانے سے زیادہ مدرسانہ عمل اور کوئی نہیں۔

یہ قول جدیدیت کو کٹر اور محدود بنانے کے خطروں ہی کی طرف توجہ دلا رہا ہے کیونکہ فارمولے بنانا خود درسی اور کتابی عمل ہے۔

پیش انور

مکتوب لندن

اردو میں اعلانات گذشتہ ہفتہ بی بی سی ریڈیو کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انگریزی خبریں سناتے ہوئے ایک اعلان اردو میں نشر کیا گیا۔ یہ اعلان اس ایشیائی خاتون سے متعلق تھا جس کے جسم کا کچھ حصہ دو سوٹ کیس میں ملا ہے۔ چونکہ وہ خاتون ایشیائی تھی اور اس کا تعلق بھارت یا پاکستان سے تھا اس لئے پولیس کی خصوصی ہدایت پر بی بی سی نے ریڈیو پر یہ اعلان اردو میں نشر کیا۔

یہی اعلان سلیم شاہد نے ٹیلیویژن کے پروگرام میں بھی نشر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی حرفوں کے معاملہ میں "اپنا ہی گھر سمجھئے" زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی سنتے ہیں۔

اپنے بچوں کو اردو ضرور سکھایئے ریجنٹ ٹریننگ بریڈ فورڈ سے اطلاع دی ہے کہ مقامی بچوں کی سہولت کے لئے "ایوا" کی طرف سے ہر سنیچر کو ۲ تا ۴ بجے سہ پہر آل سینٹ اسکول، کینن روڈ میں اردو کی جماعتیں باقاعدہ شروع کردی گئی ہیں تاکہ ہندوستانی بچے اپنی مادری زبان سے مانوس ہو کر اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں اور جب وہ وطن لوٹیں تو انھیں اردو سے لاعلمی کے باعث احساس کا احساس نہ ہو۔ ریڈ فورڈ میں تقریباً ۱۰ ہزار افراد والی آبادی میں مگر ابھی تک صرف ۹۴ بچے اس سہولت سے استفادہ کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے مقامی باشندوں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس مرکز میں ضرور بھیجیں۔

سالنامہ آفاق اس مہینے "آفاق" کا سالنامہ منظر عام پر آیا ہے جو عام شماروں سے زیادہ ضخیم اور علمی مواد و مضامین زیادہ معیاری و جاذب نظر ہے۔ قلمکاروں میں سعادت حسن منٹو (مرحوم)، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، تنویر نقوی، رام لعل، علامہ اقبال (غیر مطبوعہ کلام)، رباعی خیرآبادی (مرحوم) اے۔ حمید کے علاوہ انگلستان سے سلیم شاہد، شریف بقا، میر بشیر، عطا خالد عزیز، پروفیسر خالد میرزا، موہن سنگھ عاجز، مامون ایمن وغیرہ ہم شامل اشاعت ہیں۔

احباب:- سلیم شاہد

پھر جمع کر رہا ہوں پر کاہ سرگذشت
حیران ہوں کہ ذہن سے کیا کیا اتر گیا

مجھ کو تو بے مزہ لگا پانی کا ذائقہ
وہ کون تھا جو دشت میں پیاسا اتر گیا

لے آئی کس فراز پہ لفظوں کی سیڑھیاں
کاغذ پہ ہو بہو وہ سراپا اتر گیا

شاہد تلاش رزق ہے طائر کی جستجو
پانی بجھے جہاں نظر آیا اتر گیا

قتیل شفائی:-

نہ ہوس مجھے مئے ناب کی نہ طلب صبا و سحاب کی
تری چشم ناز کی خیر ہو مجھے بے پئے ہی سرور ہے

تنویر نقوی

ہمارے واسطے ہر آرزو کانٹوں کی مالا ہے
ہمیں تو زندگی دے کر خدا نے مار ڈالا ہے

احمد ظفر

آسماں کی آنکھ سورج، چاند بینائی بھی ہے
روشنی میرے لئے کیوں وجہ رسوائی بھی ہے
زہر آلودہ فضا میں جب کلی سونے لگی
اشک شبنم نے کہا گلشن میں پروائی بھی ہے

شاکر لدھیانوی

اوڑھا ہے کار سے لمحے، کارگہ ہستی کو بدل
چلنا چور ہوئے جاتے ہیں میرے ذہن کے شیش محل
مغرب کی تہذیب کا شاکر رنگ ہم نے پہچان لیا
سونے کی مانند چمکتا ہے لیکن اصل میں ہے پیتل

مامون ایمن

سنتے سنتے تھک گئے ہم زندگی کا ماجرا
ایک عنوان، ایک مضمون، ایک ہی افسانہ تھا

ڈاکٹر اسمان اخلاقی

یوں لرزتا ہے امیدوں کا دیا آخر شب
صبحدم جیسے افق پر ہو ستارہ لرزاں
سرمئی شام و سحر رقص کناں ہو ایماں
کاش ان کے لب لعلیں ہوں دوبارہ لرزاں

نذیر احمد گردیزی

شیکسپیر یا شیخ زبیر

عراق کے نوجوان اسکالر یعقوبی نے تیس سال کی عرق ریزی اور جستجو تحقیق کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ شیکسپیر مسلمان تھا۔

ڈاکٹر یعقوبی سوال کرتا ہے کہ ویسٹ منسٹر ایبے میں شیکسپیر کی قبر سب سے علیحدہ کیوں ہے اور کلیسا صلیبی کے بجائے ہلالی کیوں ہے؟ اور یہ واحد قبر ہے جس کا سر مغرب کی طرف ہے۔ شیکسپیر کے مکان میں محرابیں ہیں۔ یعقوبی نے الزبتھ کے دور میں اسپین کے سفیر کا وہ مراسلہ تلاش کیا ہے جس میں شیخ زبیر کو سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی عربی نظمیں اور آٹھ عربی ڈرامے بھی یعقوبی نے دریافت کئے اور ماریو کا وہ خط بھی جو اس نے شیخ زبیر کو لکھا تھا کہ کاش آپ اپنے عربی ذخائر کو انگریزی میں منتقل کر دیں۔ "مرچنٹ آف وینس"، "سوداگر عرب" کا بالکل ترجمہ ہے۔ اوتھیلو کا اصلی نام عطا اللہ تھا اور وہ مور تھا۔ شیکسپیر اور شیخ زبیر لاولد تھے۔ دونوں کی وصیت تھی کہ لائبریری کے ساتھ دفن ہو۔ شیکسپیر کی تصویر میں کالر ہسپانی طرز کے ہیں۔ شیخ زبیر انگلستان سے کہیں واپس نہیں گئے۔ شیکسپیر کی قبر پر صلیبی نشان دو سو سال کے بعد لگایا گیا تھا۔

***

مراسلہ

جاسوسی ادب

جاسوسی ادب کے بارے میں عام طور پر کئی رائیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی اسے "ناسور" کہتا ہے اور کوئی "ادب کی روح" قرار دیتا ہے۔ اس کے مخالفوں میں ایک تکرار سی رہتی ہے۔ ہر کوئی اپنے نظریہ کی تائید میں مثالیں پہنچاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے خیالات زیادہ مدلل اور صحیح ہیں۔ اور ان ہی جھگڑوں میں جاسوسی ادب "بیچارگی" کا شکار ہو گیا ہے۔

اس کی کسمپرسی سے چند ابن الوقت خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تفریح کے نام پر بھولے بھالے سادے عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ چونکہ وہ سطحی باتوں سے پر ہوتا ہے اور اس کے اندر غیر ادبی شہ پاروں کا ایک دافر ذخیرہ پوشیدہ ہوتا ہے لہٰذا اس کے اثرات ذہن عامہ پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو ادبی چیزیں حسنک معلوم ہونے لگتی ہیں کیونکہ انھیں سمجھنے کے لیے کافی گہرائی میں جانا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا ذہن گہرائی میں جانے سے گھبرانے لگتا ہے اور سطحی باتوں کی طرف راغب ہونے لگتا ہے اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جاسوسی ادب بھی ایک زہریلی سوئی ثابت ہو رہا ہے، وہ زہریلی سوئی جو آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر سرایت کر جاتی ہے، اس آہستگی سے کہ انھیں احساس تک نہیں ہوتا اور یہ قدر دان ادب کے لیے نیک فال نہیں اگر ابھی اس کے زہریلے دانت نہیں توڑ دیئے گئے تو مستقبل قریب میں یہ کس قدر مضر ثابت ہوگا اس کا تصور ممکن نہیں۔ اور اگر ابھی اس کی اصلاح کر دی گئی تو یہ ایسا جواہر ثابت ہوگا جو ادب کو واقعی ایک ایسی درستی سے سرفراز کرے گا کہ رہتی دنیا تک لوگ جاسوسی ادب کی اور اصلاح کنندہ کی یاد کو اپنے دل میں تازہ رکھیں گے کیونکہ سانپ بذات خود برا نہیں ہوتا اس کے زہریلے دانت مضر رساں ہوتے ہیں۔

بہت سی خامیوں کے باوجود بھی جاسوسی ادب میں لاتعداد خوبیاں موجود ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں مثلاً اس کی زبان اردو کو نیا اسلوب بیان دیتا ہے جس میں سلاست ہے، روانی ہے، سلیس انداز بیاں ہے اور ایک ایسا طرز بیاں بھی ہے جس میں خوبصورتی و دلکشی کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کی زبان آسان اور سہل الفہم ہے، اتنی آسان کہ معمولی پڑھا لکھا بھی اس کی تحریر کو بخوبی پڑھ لیتا اور سمجھ لیتا ہے اور کما حقہ اس مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جو جاسوسی ادب کو (باوجود ادبی نقائص کے) عوام میں قبول عام کا درجہ دیتا ہے اور روز افزوں اس کی مقبولیت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ جنھیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہیرا بھی پہلے پتھر ہی ہوتا ہے مگر جب اس کے گرد صاف ہوتے ہیں تو جوہری کی جوہر شناس نگاہیں اس کو اس کے صحیح مقام پر پہنچا دیتی ہیں۔

نقادان فن جو خود کو ادب کا پجاری کہتے ہیں اب ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے بوسیدہ لبادوں سے باہر نکل آئیں اور پرانی قدروں کے ساتھ نئی قدروں کی بھی ہمت افزائی کریں۔ اور اس طرف توجہ خاص کریں۔ کیونکہ پرانے تذکروں کی مدد سے تنقید کرنا کوئی بڑی بات نہیں، لطف تو جب ہے کہ ابھرتی ہوئی نئی چیزوں پر توجہ فرمائیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح انداز میں اس طرح عوام کے سامنے کر دیں کہ وہ اس کے اچھے اور برے اثرات سے کما حقہ آگاہ ہو جائیں اور نادانستگی میں غلطیوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

آج جاسوسی ادب بھی ناقدان فن کی توجہ چاہتا ہے اور وہ اس بات کا متمنی ہے کہ نقاد صاحبان اس کے مقدمہ پر مزید غور و خوض کریں اور اس پر جو "ناسور" کا الزام لگایا جا رہا ہے اور جو روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اس کو دھونے کی طرف توجہ فرمائیں۔ کیا ناقد سے ایسی مانگ ناجائز ہے؟ اگر جائز ہے تو اب تک بے توجہی کیوں برتی گئی؟ کیا نقاد صاحبان اس کا جواب دیں گے کہ اس تساہل عارفانہ کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ اپنی پرانی بے توجہی کا ازالہ کریں گے؟

ناقد ایک جوہری ہوتا ہے جو فن کی پرکھ جانتا ہے اور وہ کسی چیز پر پڑے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرتا ہے اور اس کی اصلیت کی تہ تک پہنچتا ہے اور جب اس کی تہ تک رسائی ہو جاتی ہے تب اس کو اپنی کسوٹی پر کستا ہے اور دوسروں کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے مقدار سے آگاہ کرتا اور خامیوں کو زیادہ سے زیادہ واضح انداز میں سامنے لاتا ہے تاکہ لوگ اس کی خامیوں کو دیکھ لیں اور اس سے بچنے کی تدبیر کریں۔

اگر ہمارے نقادان فن نے جاسوسی ادب کی طرف توجہ دی تو اس کی بھی خوبیاں اور خامیاں الگ الگ ہو جائیں گی جیسے دودھ اور پانی۔ اس طرح عوام اس کی اصلیت سے آگاہ ہو جائیں گے اور جب عوام کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ لوگ بھی اپنی روش میں تبدیلی لانے پر مجبور ہوں گے جنھوں نے عوام کو بیوقوف بنا کر اپنی تجوری کو بھرنا اپنا مسلک بنا لیا ہے اس کے علاوہ ہمارے وہ کہنہ مشق ادبا بھی سنبھل جائیں گے جو چاندی کے کھنکتے ہوئے چند سکوں کے عوض اپنی صلاحیت کو بیکار باتوں میں برباد کر رہے ہیں اور اس طرح ان کے اندر بھی علم کے دریچے کھل جائیں گے اور وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے صاف ستھرے ادب کو پیش کرنے کی بھرپور سعی فرمائیں گے۔ اس طرح یہ ادب جو "ناسور" بن گیا ہے واقعی "ادب ...

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے وفد کی لسانی اقلیتی کمشنر کو میمورنڈم

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا ایک وفد جناب محمد یوسف فیروزی صاحب سابق الڈرمین کلکتہ کارپوریشن کی سرکردگی میں لسانی اقلیت کے اسسٹنٹ کمشنر جناب ماجیائی سے رائٹرس بلڈنگ میں ملا۔ وفد کے دیگر اراکین انجمن کے جنرل سکریٹری جناب ایم اے مجیب، جناب اسد اللہ انصاری، ارشی، دربھنگوی اور شاعر اعظم افضل تھے۔ سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری نے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں اردو کے ساتھ سارے ہندوستان میں ناانصافیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مغربی بنگال کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے بارہ واضح مطالبات درج تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر موصوف سمیت دیگر افسران نے میمورنڈم کو پڑھا اور اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ گفتگو سب سے پہلے انجمن کے اس مطالبہ پر شروع ہوئی کہ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے اردو کا پندرہ روزہ رسالہ "مغربی بنگال" جس کی اشاعت یکم اپریل سے بند کر دی گئی ہے اسے جاری رکھا جائے۔ ڈائرکٹر آف انفارمیشن نے بتایا کہ چونکہ "مغربی بنگال" کے صرف پانچ خریدار تھے اور اس وجہ سے آڈٹ کو اس رسالہ کے جاری رکھنے پر اعتراض تھا اس لئے مجبوراً اس کی اشاعت بند کرنا پڑی لیکن حکومت کا یہ خیال ہے کہ اس کی تلافی اردو میں فولڈر اور پمفلٹ وغیرہ وقتاً فوقتاً نکال کر کی جائے۔ وفد کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی کہ اگر گورنمنٹ چاہتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کلکتہ میں اس رسالہ کے کافی خریدار نہیں ہو جاتے ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ اس کے معیار کی طرف دھیان دیا جاتا۔ ایک سوال کے جواب میں ڈائرکٹر موصوف نے بتایا کہ نیپالی کا جو ہفتہ وار اخبار نکلتا ہے اس کے کل خریدار ۱۷۵ ہیں۔ انجمن نے یہ پیش کش کی کہ اگر گورنمنٹ چاہے تو "مغربی بنگال" کے ایک سو خریدار مہیا کئے جا سکتے ہیں چونکہ نیپالی اخبار کے تناسب سے زیادہ ہی ہوگا۔ وفد نے اس سلسلہ میں دیگر طریقوں سے بھی تعاون کا یقین دلایا۔ افسران اس پیش کش سے بہت متاثر ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے افسران بالا کے سامنے پیش کریں گے۔

انجمن کی اس شکایت پر کہ جن ملازمتوں کے لئے بنگلہ جاننا ضروری نہیں ہوتا ہے اس کے لئے بھی بنگلہ جاننے پر اصرار کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں حال میں اردو لکچرار اور کلکتہ مدرسہ کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی اسامیوں کو پر کرنے کے سلسلہ میں بنگلہ جاننے پر اصرار کا تذکرہ کیا گیا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ یہ عمل مناسب نہیں اور انہوں نے فرمایا کہ اشتہارات کی نقل ان کو مہیا کی جائے تاکہ وہ ضروری اقدام کریں۔

ایک مطالبہ یہ تھا کہ لیڈی برابورن کالج اور ہوگلی محسن کالج میں اردو آنرز اور ریذیڈنسی کالج اور دارجلنگ گورنمنٹ کالج میں اردو پاس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کالجوں کے علاوہ دیگر جن جن کالجوں میں اس کا مطالبہ کیا جائے اس پر بروقت اقدام کیا جائے۔ افسران اور اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔ وفد نے یہ بتاتے ہوئے کہ ریاست میں ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو لیکن اس پر بھی یہ شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ بعض اسکولوں میں اردو کی تعلیم موقوف کر دی گئی ہے یا بند کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہندو ودیالیہ اڈال اور ایسٹرن ریلوے ہائر سکنڈری ملٹی پرپز اسکول آسنسول کے نام پیش کئے گئے۔ چیف انسپکٹر صاحب نے یہ بتایا کہ انہوں نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر بردوان کے نام ہدایت جاری کی ہے کہ وہ ہندو ودیالیہ کے بارے میں رپورٹ پیش کریں رپورٹ ملنے پر ضروری اقدام کئے جائیں گے ایسٹرن ریلوے اسکول کے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ وہ ریلوے بورڈ کے ساتھ اس سلسلہ میں گفتگو کریں گے۔ سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول میں اردو داں طالبات کے داخلے کے سلسلے میں دشواریوں کا جواب دیتے ہوئے اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ ضروری تفصیلات مہیا کی جائیں تاکہ اس سلسلہ میں ضروری اقدام کر سکیں۔ وفد کے اس مطالبہ پر کہ ٹیچرس ٹریننگ کالجوں اور کارپوریشن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں اردو متعلقہ سبجیکٹ کی حیثیت سے پڑھائی جائے چیف انسپکٹر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ کم از کم ایک دو کالجوں میں اس کا انتظام کیا جائے گا۔

اس مطالبہ کے متعلق کہ ہائر سکنڈری امتحان کی طرح ہی یونیورسٹی امتحان میں بھی طلبہ کو اردو میں جواب لکھنے کی اجازت دی جائے اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ یہ مطالبہ جائز نظر آتا ہے اور وہ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کے ذمہ داران کے ساتھ گفت و شنید کریں گے۔

وفد نے اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ ریاست کے ان مقامات میں جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہو اردو کو ثانوی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں آنجہانی ڈاکٹر رائے اور سابق چیف منسٹر جناب پی سی سین کے وعدوں کا تذکرہ کیا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ مرکزی حکومت کے قوانین کے مطابق صرف ان معاملات پر کسی اقلیتی زبان کو ثانوی سرکاری زبان تسلیم کیا جا سکتا ہے جہاں کسی ضلع میں کم سے کم ۶۰ فیصدی لوگ اس زبان کو بولنے والے ہوں۔ البتہ کسی زبان کے ۱۵ فیصدی بولنے والے لوگ کسی تحصیل یا سب ڈویژن میں ہوں تو کسی زبان میں سرکاری اعلانات وغیرہ شائع کئے جائیں گے۔ انفارمیشن ڈائرکٹر صاحب نے بتایا کہ اسلام پور، گوالپوکھر، ستشتا، ٹرلہ، بھدریسور، آسنسول وغیرہ کے علاقوں میں جہاں ۱۵ فیصدی سے زیادہ اردو بولنے والوں کی تعداد بتائی گئی ہے متعلقہ حکام کو اس کی ہدایت دے دی گئی ہے۔ وفد نے اس بات پر

زور دیا کہ خط ہدایت جاری کرنا کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ نگرانی کی جائے کہ ان ہدایتوں پر عمل ہو بھی رہا ہے یا نہیں اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے اس سے اتفاق کیا۔

اس مطالبہ کے جواب میں کہ گورنمنٹ کالجوں میں اردو داں طلبہ کا داخلہ نہیں ہو پاتا اگر وہ غیر اردو داں طلبہ کے مقابلہ میں کم نمبر یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے کالجوں میں اردو کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ایسے طلبہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں ڈائرکٹر انفارمیشن نے کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا اس لیے کہ قانونی طور پر غیر اردو داں طلبہ معترض ہوں گے انھوں نے کہا کہ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ اردو والے خود اپنا کالج قائم کریں۔ گورنمنٹ یقیناً اس سلسلہ میں مدد کرے گی۔ وفد نے بتایا کہ اگر شام کے کالج کھولنے کی اجازت دی جائے تو ہم ایسا کرنے پر فوراً تیار ہیں۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ اگر انھیں اس سلسلہ میں تفصیلات مہیا کی جائیں تو وہ کوشش کریں گے۔

اردو کو غیر اردو داں طلبہ کے لیے تیسری زبان کی حیثیت سے ثانوی اسکولوں میں پڑھانے کی اجازت دینے کے سوال پر چیف انسپکٹر اور دیگر افسران نے مجبوری ظاہر کی کہ اس طرح دوسری زبان والوں کے لیے بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ وفد بہرحال اس پر اصرار کرتا رہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ کلکتہ اور بیرون کلکتہ میں مزید پرائمری اسکولوں کے کھولنے کے مسئلہ پر کمیشن نے یقین دلایا کہ نئے پرائمری اسکول کھولتے وقت اس مطالبہ پر عمل کیا جائے گا۔ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ اسٹیشن سے اردو پروگرام نشر کرنے کے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ وہ متعلقہ حکام کو لکھیں گے بہار اور یوپی میں اردو کو ثانوی سرکاری اور علاقائی زبان قرار دینے سے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ یہ مطالبہ چونکہ دوسرے صوبے کا ہے اس لئے یا تو وہ صوبے خود اسے پیش کریں یا آپ کی مرکزی انجمن۔ وفد نے بتایا کہ یہ کل ہند مسئلہ ہے اور ہندوستان ایک اکائی ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے بہرحال اس پر تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی اجکر ۱۰ منٹ پر یہ گفتگو ختم ہوئی۔ (اقبال اکرامی پبلسٹی سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال)

انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال کا جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال ضلع گلبرگہ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت الحاج محمد حسن صاحب اختر صدر انجمن ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اردو اسکول موہن ورہ میں منعقد ہوا۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ جناب محمد علی جگنی معتمد انجمن نے سنائی۔ جلسہ عام سے شاخ کے ضمنی قواعد کی توثیق حاصل کی گئی۔ آئندہ سال برائے (۱۹۶۸ء تا ۱۹۶۹ء) کا موزانہ پیش کرکے توثیق حاصل کی گئی۔ موجودہ عہدیداروں کی مدت میں مزید ایک سال کی توسیع کی گئی۔ جلسہ عام میں انجمن کے پروگرام و پالیسی کی تشکیل پر غور کیا گیا اور خواتین کے لیے شبینہ مدارس اور غیر اردو داں طلبہ کے لیے کنٹری جماعتوں کے آغاز اور دارالمطالعہ عام کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور سالانہ حسابات پیش کئے گئے ۲ مارچ کے منعقدہ تحریری مقابلوں کے انعامات کی تقسیم مہمان خصوصی جناب جی۔ ایم۔ گپتا۔ پوسٹ ماسٹر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انعام اوّل میر احمد متعلم دہم، انعام دوم عبدالقیوم متعلم دہم نے حاصل کئے۔ جناب محب کوثر کی جانب سے ایک اور ترغیبی انعام محمد یونس متعلم نہم کو دیا گیا۔

اس شب انجمن کے زیر اہتمام ایک غیر طرحی مشاعرہ زیر صدارت حضرت عیاں حیدرآبادی منعقد ہوا۔ اناؤنسر کے فرائض جناب محب کوثر نے انجام دئے۔ مقامی شعرا جناب محمد حسین نیر، اسماعیل نسیم، الحاج محمد حسن اختر اور محسن نظامی کے علاوہ آمر۔ ملیا نے کنڑی اور سری شنکر گپتا نے ہندی میں اپنا کلام سنایا۔ مہمان شعرا پنڈت راگھویندر راجاری نے تلنگی میں اور یون بھارتی نے ہندی اور کنڑی میں اپنی نظمیں سنائیں۔ جواں سال مہمان شعرا جناب منان رہبر، جناب صابر یادگیری، جناب اعظم عاشق، جناب شمیم سرمست، جناب حافظ کبیر، جناب محب کوثر کے علاوہ کہنہ مشق شعرا جناب بالا پرشاد گوڑ، حضرت عیاں حیدرآبادی اور دکھنی زبان کے ممتاز شاعر جناب سلیمان خطیب نے اپنا منتخب کلام سنایا۔ جناب محب کوثر کے شکریہ پر اس کامیاب ہمہ لسانی مشاعرہ کا اختتام ڈھائی بجے عمل میں آیا۔

(محب کوثر نائب معتمد انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال)

[illegible]

شاہکارِ وحید

مرتب :- شبیب علی حسین

قیمت :- ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر :- گہرستان ، دریبہ جون پور

میر وحید ان مرثیہ گو اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے انیس کے بعد اس صنف کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ وہ میر انس کے بیٹے اور میر انیس کے بھتیجے تھے۔ زبان اور فن میں اسی خانوادے کی روایات پر کاربند رہے اور مرثیہ میں بعض نئے عناصر کے اضافے کے ساتھ انیس کے رنگ کو فروغ دیتے رہے عمر نے زیادہ وفا نہ کی ورنہ مرثیہ کو ان سے اور زیادہ فیض پہونچتا۔ ان کے مشہور مراثی انیس کے بہترین مرثیوں کی یاد دلاتے ہیں۔

شبیب علی حسین نے بڑی تدقیق اور کاوش سے میر وحید کا طویل ترین مرثیہ مرتب کیا ہے "ریحانِ غم" میں اس مرثیے کے صرف ۱۵۹ بند ملتے ہیں اور دوسری جگہ ایک دوسرے مرثیے کے ساتھ ۷۶ بند۔ جذب لکھنوی نے مختار وحید میں ۱۸۶ بند شایع کئے ہیں۔ لیکن یہ مرثیہ اصل میں ۲۳۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرتب نے یہ تمام بند پوری صحت اور تحقیق کے ساتھ جمع کر کے شایع کئے ہیں۔ اس مرثیے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ اردو کا سب سے طویل مرثیہ ہے لیکن اتنی طوالت کے باوجود شروع سے آخر تک فن کے تمام عناصر کا مناسب ترین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ مرثیہ عون و محمد کے حال میں ہے جو جناب زینب کے بیٹے اور امام حسین علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ وحید نے بچوں کی نفسیات، جوشِ شجاعت، اور سعادت کا جس خوبی سے ذکر کیا ہے وہ اس سے پہلے کسی مرثیے میں اس طرح پیش نہ کی گئی تھی۔ عون و محمد کے حال میں اور مرثیہ گویوں نے بھی لکھا ہے خود انیس کے کئی بہترین مرثیے ان شاہزادوں کے باب میں ہیں، میر وحید نے سب سے الگ ہٹ کر اپنا رنگ اور راستہ نکالا ہے۔ میر وحید کے یہاں لکھنوی زبان اور صنعتوں کو برتنے کا التزام انیس سے کہیں زیادہ ہے۔ انیس ان صنعتوں پر قدرت رکھنے کے باوجود ان سے بلند رہے تھے اور یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عام رنگِ سخن کے تکلف و تصنع کے شکار نہیں ہوئے۔ وحید کے یہاں یہ عنصر غالب ہے لیکن اس سے ان کے مرثیے کی خوبی میں فرق نہیں آتا۔

اس تحقیق و کاوش کے لیے مرتب کی ستائش کرنا حق ناشناسی ہوگی۔ اگر اس طرح ہمارے کلاسیکی سرمایے کے دوسرے اوراقِ پریشاں بھی مرتب کر دئے جائیں اور اس طرح محفوظ ہو جائیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ کلاسیکی شاعری سے بالعموم اور مرثیے سے بالخصوص دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شاہکارِ وحید ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

رگِ ساز

شاہین غازی پوری

ناشر :- پاک کتاب گھر ، ڈھاکہ ، مشرقی پاکستان

قیمت :- پانچ روپے

شاہین غازی پوری اردو کے نوجوان خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کا کلام ایک مدت سے ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شایع ہو رہا ہے رگِ ساز ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جس میں ۵۵ نظمیں ۳۴ غزلیں اور چند منظوم ترجمے شامل ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں پر فیض، احمد الایمان اور جمیل مظہری کا اثر ایک حد تک نمایاں ہے لیکن یہ اپنا لہجہ ان لہجوں کو ترکیب دے کر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس مجموعے میں لطیف صدیقی کا پیش لفظ بھی شامل ہے جو شاہین کی شاعری کے ارتقا کو دیکھنے میں مدد دیتا ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور حنیف فوق کی آرا بھی شامل ہیں۔ شاہین کے یہاں فکر کی تازگی کے ساتھ موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ لہجہ شایستہ اور ذوقِ سخن نکھرا ستھرا ہے۔ اچھے صاف ستھرے اور متین لہجے کی یہ شاعری اہلِ ذوق کے لیے کشش کا کافی سامان رکھتی ہے۔ اگر کسی شاعر کے حال سے اس کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ہمیں اس مجموعے کے شاعر سے مستقبل کی بہتر اور وقیع تر شاعری کی امید رکھنی چاہئے۔ کتاب بہت نفیس کاغذ پر خوبصورت کتابت و طباعت کا اچھا نمونہ ہے یہ صوری حسن کتاب کے معنوی حسن ہی کا ایک عکس ہے۔

گلِ صحرا

طالب جے پوری

قیمت :- دو روپے

ملنے کا پتہ :- ۸ ہیسٹنگز روڈ الٰہ آباد

طالب جے پوری کہنہ مشق شاعر ہیں اور صیب احمد صدیقی کے شاگرد ہیں۔ طالب صاحب کو آفتاب احمد صاحب جوہر بدایونی اور سیکش اکبر آبادی سے بھی تلمذ و مشورے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اسی لیے احتشام صاحب کے الفاظ میں ان کے بیان میں متانت، پختگی، شایستگی اور احتیاط کے وہ تمام خواص جمع ہیں جو اچھی شاعری کی پہچان ہیں۔" اس مجموعے میں پچاس غزلیں اور ۸ نظموں کے علاوہ حبیب احمد صدیقی کا پیش لفظ اور خود شاعر کا ابتدائیہ بھی شامل ہے سو صفحات کے اس مجموعے میں جگہ جگہ اچھے شعر مل جاتے ہیں جو روایتی ہونے کے باوجود تازگی رکھتے ہیں۔

[illegible] نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا

R. No. 2186/57 | Regd. No. L-922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P

جلد ۲۷ - شمارہ ۱۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ رمئی ۱۹۶۸ء

ادارئیہ

مارکس اور ہندوستان

مارکس کے ایک سو پچاس ویں جنم دن کے موقع پر ساری دنیا نے اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مارکس نے تاریخی مادیت کا نظریہ پیش کیا جس کے لیے جدلیاتی طریقہ کار کا تصور اس نے ہیگل سے لیا۔ برٹرینڈ رسل نے مغربی فلسفہ کی تاریخ میں کہا تھا کہ مارکسزم تاریخ کی سائنس اور سائنس کی تاریخ ہے، اس نے اکیس سال کی عمر میں فلسفیوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ "فلسفیوں نے صرف دنیا کی مختلف طریقوں سے ترجمانی و تشریح کی ہے، بنیادی سوال اس کے بدلنے کا ہے" چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس نے سماجی تبدیلی کے قوانین بنائے اور ان قوانین پر عمل کر کے لینن نے روس کے انقلاب کو کامیاب بنایا۔ مارکس کی بعض پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں۔ اوّل تو پرولتاری انقلاب کسی صنعتی ملک مثلاً جرمنی میں ظہور پذیر ہونے کے بجائے روس جیسے زراعتی ملک میں واقع ہوا دوسرے روس میں انقلاب کے ساتھ ساری دنیا میں انقلاب نہیں ہوا بلکہ عرصہ دراز تک ایک ملک میں انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے اور سرمایہ دار دنیا کی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے روس کو سینہ سپر ہونا پڑا گو دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی ملکوں میں اشتراکی نظام پھیلا اور دوسرے ملک اس سے متاثر ہوئے۔ پھر مارکس کے نزدیک سرمایہ داری بالآخر اجارہ داری بن جاتی ہے اور اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے پرولتاری انقلاب کے لیے فضا سازگار کرتی ہے، مگر سرمایہ داری نے بیسویں صدی میں فلاحی ریاست (WELFARE STATE) کی صورت بھی نکالی اور بعض مغربی ملکوں خصوصاً انگلستان میں اس کا کامیاب تجربہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ مارکس کے فلسفے کے اثرات ساری دنیا کے فکر و عمل پر پڑے ہیں۔ اس نے سائنسی مزاج کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اس نے اقتصادی رشتوں کی اہمیت پر زور دے کر بہت سے حقائق روشن کیے ہیں۔ طبقاتی کشمکش کے متعلق اس کے خیالات آج بھی قابل قدر ہیں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک جو سوشلسٹ خیالات رکھتے ہیں، لینن کے طریقے قابل تعریف نہیں، مگر سوشلزم کیسا ہی ہو، مارکس کے بنیادی تصورات کو اپنائے بغیر نامکمل اور ناقص رہتا ہے۔ مارکس صرف ان لوگوں کی جاگیر نہیں جو کمیونسٹ ہیں یا مارکسزم لینن ازم میں یقین رکھتے ہیں۔ مارکسزم کوئی جامد چیز نہیں۔ تاریخی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس کی نئی تعبیر و تشریح کی برابر ضرورت پڑے گی۔ مارکس کو اگر ایک درسی کتاب کی طرح نہیں ایک سماجی رہنما کی طرح پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔ بقول چیلاپتی راؤ "مارکس پہلا شخص تھا جس نے اپنے زمانے کے مخصوص انقلابی پہلوؤں کو دیکھا اور اسے آخری نہیں ماننا چاہیے"۔ جب جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ مارکسزم حرف آخر نہیں ہے تو ان کا بھی یہی مطلب تھا۔ شری گجندر گڈکر سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ نے دہلی کے ایک جلسے میں مارکس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اور اس کے انقلابی فلسفے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے، یہ بھی کہا تھا کہ مارکسزم کو ایک طرح کا مذہب یا قطعی حکم (DOGMA) سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ نہ مارکس کی یاد میں جلسے کرنا کافی ہوگا۔ یہ ایک فلسفہ ہے جس کے پیچھے سائنسی نظریہ ہے اور جس کا مقصد افلاس کو دور کرنا اور طبقوں کی اونچ نیچ کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے ملک میں چھوت چھات ممنوع ہے مگر ایک اچھوت لڑکے کو حال میں زندہ جلا دیا گیا۔ ہمارے یہاں آزادی کے بیس سال بعد بھی بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں اور یہ خطرہ ہے کہ سیکولرزم کے سارے اصول صرف لوگوں کی زبان پر ہی ہوں گے، عملی دنیا میں ان کا نفاذ نہ ہو سکے گا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی پارٹی کانگریس نے سوشلزم کو ایک نصب العین بنا لیا

...اس منصب العین کی طرف گامزن ہونے کی رفتار نہایت ہی سست ہے اور غالب کا یہ شعر ہم پر صادق آتا ہے ؎

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس لئے ضرورت ہے کہ ملک میں سائنسی مزاج پیدا ہو۔ اونچ نیچ کو کم کیا جائے۔ ملک کی صنعتی پیداوار بڑھائی جائے قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔ مذہب، ذات پات، زبان، علاقے کی بنیاد پر جو تحریکیں اٹھتی ہیں اور ملک کی طاقت کو کم کرتی ہیں ان کو روکا جائے۔ فرقہ داریت کا قلع قمع کیا جائے۔ سیکولرزم کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کیا جائے مارکس کی تعلیمات کو حکیم کے ایک نسخے کی طرح استعمال نہ کیا جائے، بلکہ ایک سماجی فلسفے کی حیثیت سے اس کا مطالعہ ہو اور ایمانداری کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جائے کہ سوشلزم کی منزل تک ہندوستان جلد سے جلد پہنچ سکے۔ مارکس کے سنجیدہ مطالعے سے اس کام میں بڑی مدد ملے گی۔

کی یاد میں جن کا انتقال تقریباً ۳۰ برس پہلے ہوا انھا یہاں پر ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے جس کی نقاب کشائی دسمبر ۲۲ راپریل کو ادا کی گئی یہ یادگار دو میٹر بلند ہے، اور اس پر لکھا ہے "پاکستان کے فلاسفر اور قومی شاعر سر محمد اقبال، پیدائش ۱۸۷۳ء، انتقال ۱۹۳۸ء جنھوں نے میونخ یونیورسٹی سے ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی"! (الجمعیۃ)

صدر انجمن ترقی اردو کی سالگرہ پر صحیفۂ سپاس

انجمن ترقی اردو ہند کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ جناب پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کو ان کی ۸۰ ویں سالگرہ پر ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک انگریزی کتاب STUDIES IN INDIA, SOCIAL AND POLITICAL DEVELOP MENTS موقعہ ایادداشت پیش کی گئی اس کتاب کی قیمت ۳۲ روپیہ ہے۔ اسے ایشیا پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔

فیض الحسن خیال

نئے چراغ

تمھارے شہر میں گر انقلاب آئے گا
دوانے دار پہ پہلے چڑھائے جائیں گے
یہ اور بات ہے جشنِ چراغاں ہوگا مگر
ہر ایک موڑ پہ بازار جگمگائیں گے
مگر خلوص کی بوباس ہی نہیں ہوگی
شکستہ جام کی مانند اہلِ مے خانہ
خموشیوں کی رداؤں میں منھ چھپائیں گے
مگر جنوں کی نوازش کی آس باندھے ہوئے
جسارتِ غمِ دوراں کی داد دیتے ہوئے
سمندروں میں جنوں کے وہ ڈوب جائیں گے
نکال لائیں گے انمول پیار کے موتی
فسادِ ذہن کے ماروں کو زہرِ غم دے کر
نئے چراغ، محبت کے پھر جلائیں گے

کارل مارکس کا جنم دن

کمیونزم کے بانی کارل مارکس کے جنم دن کی ۱۵۰ ویں سالگرہ ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو منائی جارہی ہے کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو پروشیا کے مقام ٹریسبرگ میں ایک وکیل کے ہاں پیدا ہوئے انھوں نے اپنی نوجوانی ہی میں یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اپنی زندگی عوام کی خدمت میں گذاریں گے۔ چنانچہ برلن یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا ۱۸۴۴ء میں ان کی ملاقات فریڈ ریک اینگلز سے ہوئی اور یہیں سے دونوں کی عمل اور نظریاتی مشترکہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ مارکس کی اہم تصنیف کیپٹل ۱۸۶۷ء میں منظر عام پر آئی، اس کتاب نے آنے والے زمانے میں اپنے اثرات چھوڑے۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۴ء تک ہندوستان میں جو واقعات رونما ہوئے انھیں مارکس نے تاریخ وار مرتب کیا۔ مارکس کا انتقال ۱۴ رمارچ ۱۸۸۳ء کو لندن میں ہوا۔ مارکس کے نظریات کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اقبال نے کہا تھا ؎

آں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

آگرہ میں غالب کی یادگار

لکھنؤ۔ غالب کی صد سالہ تقریبات سے متعلق یوپی کی کمیٹی نے اس بات کی سخت مخالفت کی ہے کہ غالب کا وہ گھر جہاں وہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے گرایا نہ جائے اس سلسلے میں بطور احتجاج ایک وفد صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کرے گا اور استدعا کرے گا کہ اس گھر کو غالب کی یادگار کے طور پر محفوظ کرلیا جائے۔ کمیٹی نے لکھنؤ میں غالب پر ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ایران پاکستان روس اور دیگر ممالک کے اہل علم حضرات کو مدعو کیا جائے گا نیز روس میں غالب کی جو صد سالہ برسی منائی جارہی ہے اس میں شرکت کے لئے ہند سے وفود بھیجے جائیں گے۔ (الجمعیۃ)

میونخ میں اقبال کی یادگار

میونخ ۲۲ راپریل مشہور شاعر اور فلاسفر ڈاکٹر سر محمد اقبال

سعادت مرزا

مولوی عبدالباسط مرحوم

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ حیدرآباد دکن کے ایک سوشل ورکر بقولِ "خادم القوم مخدوم" خاندانِ علماء کے چشم و چراغ مشہور و معروف، ملا عبدالقیوم مرحوم کے صاحبزادے ملا عبدالباسط صاحب کا بتاریخ ۱۵؍ رمضان ۱۳۸۶ھ ۲۸؍ دسمبر ۱۹۶۶ء بعمر ۸۲ سال، اپنے مالک حقیقی سے جا ملے انا للہ و انا الیہ راجعون (مکتوب اہلیہ محترمہ مرحوم ۱۸؍ جنوری ۱۹۶۸ء موسومہ راقم) مرحوم بڑے خوبیوں کے انسان تھے، خدا مغفرت کرے۔

مختصر حالات و علمی و قومی خدمات مرحوم کا اسم گرامی عبدالباسط نادمؔ تھا، والد ماجد کی لقب کی مناسبت سے ملا اور تخلص صاحب تھا ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اپنے جد امجد عبدالباسط عشق۔ اور ملا عبدالقیوم اپنے پدر بزرگوار کے ظل عاطفت تعلیم و تربیت پائی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں ہوئی اور مشہور مدرسہ دار العلوم سے مولوی اور مولوی فاضل کی سند حاصل کی، ان کے اساتذہ دار العلوم میں مولوی الٰہی بخش، مولوی حمید الدین برادر مولانا شبلی، علامہ سید نادر الدین سرحدی، حبیب الرحمٰن سہارنپوری، جمال الدین ندوی اور علامہ حبیب اوکرن شہاب، آقا سید علی شوستری وغیرہ تھے۔ مرحوم انجمن اخوۃ الادب دار العلوم میں علمی، ادبی، دینی اور حالات حاضرہ کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مشہور ڈاکٹر اگھور ناتھ سے عقیدتمندوں سے انگریزی میں مہارت حاصل فرمائی۔ اور قانون امتحان جو ڈلشیس سادی وکالت درجہ اول کامیاب کیا اور تعلقات ناندیڑ، آشٹی (ضلع بیڑ) میں منصف (سب جج)، رہے، اور بتدریج ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گلبرگہ شریف تک ترقی کی ۱۳۵۰ف تقریباً ۱۹۴۰ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اپنے فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دئے۔ اس کے بعد اسٹیٹ نواب فخر الملک میں اول تعلقدار اور ناظم عدالت ضلع کے فرائض ڈیڑھ سال تک انجام دینے کے بعد مستعفی ہوگئے۔

معاصرین مولوی محمد مظہر، مولوی اکبر علی مدیر اخبار صحیفہ، مولوی ابو محمد محمد عمر الیافعی، مولوی عبدالرب منصف، مولوی عبدالقدیر صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر عبدالطیف، ڈاکٹر حمید احمد انصاری دہلوی، برادر محمد اصغر بیرسٹر، صفی حیدرآبادی، امجد حیدرآبادی، مولوی مرتضیٰ مدراسی وغیرہ۔ میری ملاقات آپ سے گلبرگہ شریف میں ہوئی تھی اور میں آپ ہی کی عدالت میں منتظم عدالت تھا۔ اس کے بعد عمر یافعی کے پاس نیز مرحوم کے دولت کدہ پر ہوتی تھی بڑی شفقت سے ملتے تھے۔

قومی خدمات ملا صاحب مرحوم نے جنگ طرابلس کے زمانہ میں انجمن ہلال احمر کے بڑے سرگرم رکن تھے چنانچہ آپ نے دو لاکھ روپیہ چندہ جمع کرکے بھجوایا، اور مزید پندرہ ہزار روپیہ ڈاکٹر انصاری دہلوی کے ذریعہ روانہ کیا تھا۔

ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد دکن کو تیس ہزار روپیہ چندہ جمع کرا کے دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب حیدرآباد بوجہ تقسیم ہند و پاکستان نرغہ میں آگیا، اور وہاں خون کے دریا بہہ گئے تھے تو آپ نے حیدرآباد ریلیف کمیٹی میں آٹھ دس سال کام کیا اور مصیبت زدہ لوگوں کی بڑی مدد فرمائی۔ اور اس واقعہ جانکاہ کے متعلق عربی زبان میں ایک سو ابیات کا قصیدہ بطور شہر آشوب لکھا تھا۔ جو بقول مرحوم صالح اندلسی کے رنگ میں کہا تھا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

لکل شئی اذا ما تم نقصان ۔۔۔ [illegible]

ما الدھر لا تصار یعث وحد ثان ۔۔۔ ما للسکون لمنقلب فیہ امکان

لکل حین لمن حال حول ۔۔۔ کل آن من یومہ شان

عمارۃ الدھر تعقب بتخربۃ ۔۔۔ فما یبقی احد بان و بیان

ال الحدیث لذو حزن یذوذ تجن ۔۔۔ نی الشیوخ و نابت منہ تبان

لا نقدر المقدر ان شد قد منا یا ۔۔۔ فکیف للصدر ان فات اشجان

آلحفا سنک نرجوا ما نو ملہ ۔۔۔ فتح و نجح و احسان و رضوان

فی کل صعب و عسرانت لمجار ۔۔۔ فی النائبات علیک اللہ سکلان

و دفق العوام رشد الخدی سبلا ۔۔۔ ما السبیل فیہا لحکم اللہ عصیان

تسمی الحنیفیۃ البیضا الزمانیۃ اسمی سنام العلو و الکفم

فارسی میں آپ کو مشہور شاعر رضی الدین کیفی سے تلمذ تھا کیفی نے ایک ادبی خاص انجمن قائم کی تھی جس کا نام رکھا تھا "انجمن فتیۃ الفتیان" مقصد یہ تھا کہ ایسے مختصر جملے وضع کئے جائیں جو بڑے سے بڑے مضمون کا ملخص یا تلمیح ہو مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے قصہ کا ملخص یہ تھا۔

"پیرے بود پسرے داشت، گم شد، باز یافت"

آخر زمانہ میں ملا عبدالباسط مرحوم صدر انجمن اسلامیہ حیدرآباد اور اس کے بعد جامعہ نظامیہ کے رکن رہے، اور ایک اہم کام یہ کیا کہ جامعہ نظامیہ کے کتبخانہ کی فہرست توضیحی مرتب کروائی۔ جو غالباً نصیر الدین ہاشمی کے سپرد تھی، مگر موصوف کو اس سے کچھ اطمینان نہیں تھا۔ نیز آپ نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے جد امجد محمد مہدی واصف، ملا عبدالقیوم کے بیش قیمت کتبخانہ کی کتابیں زیادہ تر، جامعہ عثمانیہ میں فروخت کردیں، تاکہ وہ ایک خاص علمی ادارہ میں محفوظ ہو جائیں۔

آپ نے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی چھوڑی جو تعلیم یافتہ اور اچھی خدمات پر فائض ہیں۔ میرے اور علامہ عمر یافعی کے تعلقات مرحوم سے بیس پچیس برس سے تھے۔ مرحوم نے اپنے جد امجد ملا عبدالباسط عشق کا کلام اور والد بزرگوار ملا عبدالقیوم کے حالات ابو محمد عمر الیافعی کے اہتمام سے چھپایا تھا۔ ترانہ عشق تو انجمن ترقی اردو پاکستان سے مل سکتا ہے۔

آپ کی تصانیف ۱۔ ترجمہ آداب المریدین [illegible] ۲۔ [illegible] ۳۔ اسلام اور حق قطع۔ (اسلامی) مطبوعہ
۴۔ ترجمہ قرآن مولانا عبدالقادر دہلوی (اصلاح زبان مرحوم کی حد تک)، غیر مطبوعہ
۵۔ عربی نعتیہ کلام (متفرق) اور عربی قصیدہ مشتملہ صد بیت بطرز صالح ابن شریف اندلسی۔

شریف الحسن لاہرپوری

لکھنؤ کے قدیم رسائل

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے دلگداز کے علاوہ کئی رسالے نکالے تھے ان میں ایک رسالہ "العرفان" بھی تھا جو ۱۹۰۵ء میں مولوی محمد سعید الحق کی ادارت میں شایع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۰۸ء تک جاری رہا اس کے بعد مولانا شرر حیدرآباد چلے گئے لہٰذا یہ رسالہ بند ہوگیا یہ رسالہ اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب و غریب تھا اس میں الٰہیات اور تصوف سے بحث کی جاتی تھی دنیائے تصوف میں اسے خاص شہرت حاصل ہوگئی تھی اس میں مضامین زیادہ تر مولانا شرر کے ہی ہوتے تھے جو وہ "ناظم العرفان" کے نام سے لکھتے تھے یہ رسالہ دلگداز پریس میں چھپتا تھا اور محلہ کٹرہ برن سنگھ، خان لکھنؤ سے شایع ہوتا تھا اس کی ضخامت اڑتالیس صفحات تھی اس نے اغراض و مقاصد میں لکھا ہے کہ

"یہ رسالہ محض دینداری کا جوش بڑھانے رموز حقیقت اور الٰہیات کے باریک مسائل پر بحث کرنے نوجوانان اسلام کے بھٹکے ہوئے دلوں سے ملحدانہ شکوک و شبہات کے دور کرنے اور خاصہ علمائے روحانین بزرگان طریقت اور صوفیہ اسلام کے اصول بتانے کے لیے شایع کیا جاتا ہے۔

"اس کا پہلا رسالہ میمنت اثر ۲۷ رمضان مبارک یعنی شب قدر کی صبح کو شایع کیا گیا اور ہمیشہ ہجری سال کے ہر عربی مہینہ کے عشرۂ آخر میں شایع ہوا کرتا ہے عام قیمت سالانہ تین روپیہ ہے ڈاک امر خاص اہل اللہ سے دو روپیہ۔ حضرات مشایخ عظمائے باطن اور مرشدان طریقت کی خدمات میں محض نذرانے کے طور پر بلا معاوضہ قیمت پیش کیا جائے گا جس کے معاوضے میں امید ہے کہ وہ اپنے حلقہ درون کے حالات اور اپنے مریدوں کے واقعات سے اسے سرفراز فرماتے رہیں گے۔"

میرے پیش نظر صرف تین شمارے ہیں

العرفان جلد دوم تیسرا رسالہ ماہ ربیع الاول ۱۳۲۳ ہجری نبوی صلعم۔

فہرست مضامین:۔ صوفی کی ضرورت۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت صدیق کی پہلی تقریر۔ علم کے ساتھ عمل۔ علم کی ضرورت محو و اثبات۔ علما کی قدر و منزلت۔ حکم رفاعیہ۔ حضرت معروف کرخی رباعیات مولانا۔ یہ سب مضامین شرر کے ہیں۔ تعریف تصوف از کتب محمد مسعود صاحب۔ اعلیٰ تعلیم کے مقاصد اور اغراض۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

العرفان جلد دوم چوتھا رسالہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۳ ہجری نبوی صلعم۔

فہرست مضامین، تصوف کے ساتھ تعصب نہیں رہ سکتا۔ سقراط کی چند نصیحتیں۔ طریقہ قلندریہ توبہ کا ایک بہترین طریقہ عشق صادق حضرت رسالت کی غذا۔ مرادوں پر ناچ۔ جھوٹ بولنا حضرت شیرحانی رباعیات مولانا روم۔ ترجمہ البرہان المؤید یہ سب مضامین شرر کے ہیں۔

العرفان جلد دوم پانچواں رسالہ ماہ جمادی الاول ۱۳۲۳ ہجری نبوی صلعم۔

فہرست مضامین، اللہ کا دیدار۔ اسلام میں عجیب کون؟ فساد۔ حب وطن۔ ترجمہ برہان المؤید۔ تاریخ حجاز یہ مضامین شرر کے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۳۱ء کو ایک ماہنامہ "عدالت" چوک کٹرہ حیدر حسین خاں سے شایع ہونا شروع ہوا اس کے اڈیٹر کلیم صدیقی تھے اشاعت العلوم پریس فرنگی محل میں چھپتا تھا اس کا سالانہ چندہ عوام سے عہ طلبہ سے عہ والیان ریاست سے دس روپیہ روساء سے پانچ روپیہ لیا جاتا تھا یہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو شایع ہوتا تھا اس میں ادبی، اخلاقی، تاریخی مضامین شایع ہوتے تھے اس کا پہلا شمارہ میرے پیش نظر ہے

عدالت جلد ۱ نمبر ۱ ماہ مئی ۱۹۳۱ء صفحات ۳۲

فہرست مضامین۔ حصۂ نظم میں حیدر کاکوروی۔ شمس عمادپوری کیف کاکوری۔ آہ سہسرامی۔ سحر۔ اعظم لکھنوی۔ نسیم نظامی محمد اسعد لعلی شمس بدایونی اور جوش ملیح آبادی نے حصہ لیا ہے۔

حصۂ نثر میں اسد انصاری۔ ایم۔اے لکھنوی محمد عبدالحیٔ خاں اور عبداللطیف سفیر بجنوری نے حصہ لیا ہے۔

ایک مصور رسالہ اگست ۱۹۴۳ء سے "میخانہ" ماہنامہ زیر ادارت اسد انصاری شایع ہوا یہ اشاعت العلوم پریس فرنگی محل میں چھپتا تھا اور یارجنگ والی گلی لکھنؤ سے شایع ہوتا تھا اس کی ضخامت ۴۲ صفحات کی تھی اس کا ٹائٹل پیج رنگین ہوتا تھا اور یہ شعر لکھا رہتا تھا کہ

رند پی پی کے بہکتے رہیں میخانے سے
مے چھلکتی رہے ساقی ترے پیمانے سے

اور ایک آرٹ کا نمونہ اندر لگا رہتا تھا رسالہ چکنے دار کاغذ پر کور رہتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ والیان ریاست سے ۲۵ روپیہ امراء سے ۱۰ روپیہ معاونین سے ۵ روپیہ، عوام سے ڈیڑھ روپیہ اور طلبہ سے ایک روپیہ لیا جاتا تھا یہ رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا تھا اس میں علمی و ادبی مضامین شایع ہوتے تھے۔ اس کے مختلف شمارے میرے پاس ہیں مگر میں اکتوبر ۱۹۴۳ء کے شمارے کا تعارف پیش کر رہا ہوں اسی شمارے کا ٹائٹل جناب اختر حسن صاحب فاروقی آرٹسٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے

ایچ کیا تھا۔ اس پر نیا شعر بھی لکھا ہے

تجھ کو مسجد ہے، مجھ کو میخانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

فہرست مضامین:۔ حصّہ نظم میں جگر مراد آبادی۔ لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی۔ ریاض خیرآبادی حمید صدیقی لکھنوی۔ رواں ۔۔ دی اعظم لکھنوی۔ خنجر کاکوروی اور ظریف لکھنوی نے حصّہ لیا ہے۔ حصّہ نثر میں شیر احمد علوی، شاہد احمد، سیفی ملیح آبادی، عطیہ باتوحجاب، ایم۔ اے لکھنوی اور اے ایچ فاروقی نے حصّہ لیا ہے۔ ایڈیٹر کے قلم سے محفل ندانہ رنگ زمانہ اور معاصرانہ تحریر ہے۔

ایک ماہنامہ "دھورندھر" نام کا مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ باہتمام سیٹھ کیسری داس شایع ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر منشی گوری شنکر لال اختر رئیس زادہ تھے اس کی ضخامت ایک سو چار صفحات تھی اس کا سالانہ چندہ ساڑھے تین روپیہ اور فی پرچہ آٹھ آنے قیمت تھی۔ یہ کب سے شایع ہوا پتہ نہیں چلتا ہے میرے پیش نظر ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء کا پرچہ ہے۔ "دھورندھر" کا دستور العمل" کے عنوان سے لکھا ہے۔

۱۔ یہ نایاب اور نادر ۔۔ شہر لکھنؤ سے نہایت حسن و خوبی سے ہر ماہ کی پہلی کو نہایت باقاعدہ طور پر شایع ہوتا ہے۔

۲۔ اس کے مضامین کا پایہ نہایت بلند ہوتا ہے۔ اخلاق فلسفہ۔ علم و ادب۔ صنعت و حرفت۔ شاعری۔ تصوف تواریخ۔ ناول۔ ناٹک پر اثر قصے۔ بھگتی بھاؤ۔ شائستہ مذاق غرضکہ اس کے صفحات میں ہر قسم کی دلچسپیوں کا سمندر موجزن رہتا ہے۔

۳۔ دھورندھر کے نام نئے خریداروں کو شروع سال میں کوئی نہایت پُر اثر ناول ہدیۃً صرف لاگت اور محصول ادا کرنے پر نذر ہوگا اس تحفہ کے لئے کوئی خاص تاریخ مقرر ہوگی جس کا اعلان اس کے صفحات میں ہوگا۔ ازاں بعد تاریخ گذر جانے پر پھر نہ ملے گا۔

فہرست مضامین حصّہ نثر میں کرم اور حکمت کے آپکار کا خیال سیوا جی کا راج تلک بیماری اور اس کا علاج باد افسانہ۔ نیویارک زہریلے سانپ موتیوں کی لڑی۔ ریاست عورتوں کی آزادی۔ حق پرستوں کے لئے قیمتی ہدایتیں۔ شانتی اور سکھ۔ افلاس۔ باباجی کی جھول۔ مضامین ہیں حصّہ نظم میں برق دہلوی۔ گوہر لکھنوی۔ اختر کٹنوی۔ طالب بنارسی۔ صادق بلند شہری۔ طالب کاشمیری رجن لال ایجاد۔ منوّر لکھنوی۔ شنکر سروپ مفتوں نے حصّہ لیا ہے۔

بشیر بدر

غزل

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

ان پہاڑوں میں رہتے ہیں ہمزاد
بول کر دیکھو۔ بولتا ہے کوئی

آج میں جاؤں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

آسکا تو ضرور آئے گا
میرا محبوب، بے وفا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

رنگ یہ بھی بہت پرانا ہے
سوچتا کوئی، بولتا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو۔ تو دیکھتا ہے کوئی

ظفر اقبال

اردو میں خواتین کا اولین ناول ۔ اصلاح النساء

(گذشتہ سے پیوستہ)

اصلاح النساء کا طرز بیان نہایت دلکش ہے، اس کی زبان خاص ناول کی زبان ہے سلیس، عام فہم اور رواں، روزمرہ اور محاوروں کا استعمال کثرت سے اور فنکارانہ طور پر کیا گیا ہے۔ اصلاح النساء میں سرشار اور شرر کے ناولوں کی سی انشا پردازی کہیں کہیں نظر نہیں آتی لیکن اگلے وقتوں کی "ملادی اماں" اور "نانی اماں" کا دلآویز اور شیریں انداز بیان ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے ممکن ہے رشیدۃ النساء نے یہ انداز بیان غیر شعوری طور پر اختیار کیا ہو لیکن اس امر میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہی اسلوب بیان افسانوی ادب کے لیے مناسب ترین ہے اور اس اعتبار سے بھی اصلاح النساء کو اردو کے ابتدائی ناولوں میں ایک امتیاز حاصل ہے۔

اصلاح النساء میں مقامی رنگ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے اس کی طرف محترمہ اختر صاحبہ اور شاہ مقبول احمد صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے میں اس پر صرف یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اس کی زبان اور طرز بیان میں بھی مقامی رنگ و آہنگ کے اثرات ملتے ہیں، عبارت میں جا بجا بہار کے ٹھیٹ محاورات کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ وہ عبارت کا جزو بن گئے ہیں اور اس اعتبار سے اس پر شاد عظیم آبادی کے ناول صورت الخیال (۱۸۷۶) کا اثر نظر آتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اوکٹ دینا۔ "میری ماں باپ نے کیا قصور کیا تھا جو تم نے ان کو اوکٹ دیا۔"

(اصلاح النساء حصہ اول صـ۲۳)

۲۔ ادجہٹ ہونا "کیا تمہارے باپ کے یہاں کبھی میرے باپ کھانے پینے کو جانے تھے جھوٹو، پر کوئی نہ سمجھا، بس فساد کر ڈالوں گی، غرض کہ ادجہٹ ہو گئیں۔"

(اصلاح النساء، حصہ اول صـ۲۴)

۳۔ ہوڑ لوہو جانا۔ "ماما اصیلوں کے ہاتھوں سے چیزیں تلف ہونے لگیں، چوری کا بازار گرم ہوا، کریم النساء کی ساری محنت اکارت گئی وہ دیکھتی تھی اور افسوس کر رہ جاتی تھی، کرتی کیا اب تو انتظام رہا نہ حفاظت سارا کارخانہ ہوڑ لوہو گیا۔" (اصلاح النساء، حصہ اول صـ۲۸)

آخر میں اصلاح النساء کے اس امتیازی وصف کو واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے لئے یہ مضمون لکھا گیا ہے یعنی یہ کہ اب تک کی تحقیقات کے پیش نظر اصلاح النساء ہی اردو میں خواتین کا اولین ناول ہے، اردو کے افسانوی ادب سے خاص شغف رکھنے والے مشہور و معروف اہل قلم وقار عظیم صاحب اپنی کتاب "داستان سے افسانہ تک" میں رقم طراز ہیں:۔

"عورتوں نے اردو میں ناول مردوں کے بہت بعد لکھنے شروع کئے اور ان کے لکھے ہوئے ایسے قصے جنہیں ناول کی ابتدائی صورت کہا جا سکتا ہے بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے نہیں ملتے۔"

(داستان سے افسانے تک صـ۱۰۱)

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اصلاح النساء کا سنہ تصنیف ۱۸۸۱ء اور سال طباعت و اشاعت ۱۸۹۴ء ہے اس لیے اسے یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وقار عظیم صاحب کا مذکورہ بالا بیان درست نہیں ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ رشیدۃ النساء سے قبل کسی دوسری خاتون ناول نگار کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اور اس اعتبار سے اصلاح النساء کو ہی اردو میں خواتین کا اولین ناول قرار دیا جا سکتا ہے اور چونکہ اس میں اندرون خانہ کے احوال بیان کئے گئے ہیں اس لیے اس میں سب سے زیادہ "آنکھوں دیکھی" کا انداز کارفرما ہے اور اس صنف کی مدت اسے انیسویں صدی کا ایک اہم ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

مراسلات

میر کی قبر

لکھنؤ میں عام خیال ہے کہ میر کی قبر لاپتہ ہے یا پھر اس قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے یا پھر اس پر دوسرا پتھر لگا ہوا ہے میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں میر کی قبر دیکھی ہے اس پر فاتحہ پڑھی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

بیس سال قبل کی بات ہے۔ اس وقت گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا اور ڈالی گنج میں میرا قیام تھا۔ ڈالی گنج سے کالج جانے میں اس ریلوے پھاٹک کے نیچے سے گزرنا پڑتا تھا جس سے ایک سڑک میڈیکل کالج کو چلی جاتی ہے جو مکت نرائن روڈ کہلاتی ہے دوسری سڑک جوبلی کالج کو جاتی ہے۔ ریلوے پھاٹک کے پاس بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے اس سے ملا ہوا ایک قبرستان کچی پکی قبروں کا تھا۔ اسی قبرستان میں میر کی قبر تھی سفید پتھر کا کتبہ تھا قبر چبوترے کے ساتھ نہایت خستہ حالت میں تھی اس قبرستان میں سٹی اسٹیشن سے لائن پار کرکے بھی آیا جاسکتا تھا۔ سٹی اسٹیشن اور کالج کے بیچ میں صرف سڑک کا فاصلہ ہے لہٰذا طلبہ اسٹیشن پر سگریٹ نوشی کرنے کے لئے کبھی کبھی ریلوے اسٹاف اور مسافروں سے بھی چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تھی رپورٹ ہونے پر طلبہ کا اسٹیشن جانا پرنسپل کے آرڈر سے بند ہو گیا کچھ ماسٹر صاحبان اسٹیشن پر جاکر نگرانی بھی کرنے لگے لہٰذا سگریٹ پینے والے طلبہ کا اڈہ قبرستان میں جمنے لگا یہ اڈہ میر کی قبر کے پاس ہی جمتا تھا۔ کالج سے واپسی پر ڈالی گنج والے طالب علم زیادہ تر ایک ساتھ آتے تھے کبھی کبھی سب لوگ اسٹیشن سے ہو کر قبرستان سے گذر کر سڑک پر آتے تھے اس راستے سے گذرنے کا خاص سبب اڈے پر ایک ایکشن ہوتا تھا

رفتہ رفتہ طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا اور ملازمت میں آیا اور عرصہ تک لکھنؤ سے باہر رہا لکھنؤ میں اس عرصہ میں کافی تبدیلیاں ہوئیں ہیں نئی کالونیاں جگہ جگہ بن گئی ہیں۔ اس قبرستان میں بھی کچے پکے مکانات بن گئے ہیں۔ پرانا نقشہ جو تصور میں تھا اس کی مدد سے جو جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ قبر کی جگہ ایک مکان کا پاخانہ تعمیر ہے۔ میر کی قبر کا نام و نشان مٹ گیا ہے یہ سب اردو دوست لوگوں کی بے حسی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے اردو دوست اپنے اس عیب کو نظر سے چھپانے میں کہ میر کی قبر لاپتہ ہے یا اس پر دوسرا پتھر لگا ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ قبر کا دنیا میں نام و نشان ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

(منتخب الحسن عثمانی)

جلوہ جہاں نما

کچھ عرصہ ہوا جب میری نظروں سے ایک کتاب جلوہ جہاں نما گزری تھی۔ اندازاً کوئی رات کے ۲ بجے کا عمل تھا اور روشنی کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں تھا۔ کچھ عجلت میں بھی تھا کتاب کی سرسری طور سے ورق گردانی کرنے لگا۔ ایسا نظر آرہا تھا کہ پوری کتاب قلمی ہے۔ گاہ گاہ خوشخطی اور سیاہی سے یہ بھی اندازہ ہونے لگتا تھا کہ کتاب شاید مطبوعہ ہے۔ اوراق پر نمبر شمار موجود نہیں تھا۔ مصنف کا نام کتاب کے نام کے ساتھ نہیں لکھا ہوا تھا شروع کے دو ڈھائی صفحات نثر میں تھے بعد میں آغاز جلوہ کے ذیل یہ اشعار تھے ۔

شاہِ شاہان کچھ نہ پوچھو ماجرا
کیا وہ جلوہ تھا جو آیا بر ملا

شان و شوکت خوش خبرت آشکار
سب کا مرکز و توانا کردگار

آخری حصے میں بعنوان بیانِ جلوہ ہفتم، یہ اشعار تھے۔

شکر کر ارجن کہ کیا طالع زا بیدا ہے
تو اسے دیکھے جسے جلوے سے ننگ و عار ہے
سب ملائک منتظر مدت سے تھے اس دید کے
یہ نرا صدقہ ہے اور یہ واجب الاظہار ہے
دید پر تھا ایک کا کرما۔ حیرا اور حیران سے
ایسے جلوے میں ہر اک لاچار ہے بیکار ہے

اور آخیر کے دو اشعار یہ تھے۔

جو بتانا تھا بتایا دیکھ کیا باقی رہا
ایک نکتہ ہے جو تیرے حق میں اب درکار ہے
ترک کر سب ملتیں لے مجھ اکیلے کی پناہ
یہ مرا ذمہ ہے ارجن تیرا بیڑا پار ہے

سب کے آخر میں یہ عبارت تھی

نقل اس جلوہ جلوۂ جہاں نما کی حسب الحکم نیض گنجور قدر دان والا تبار جناب والا ٹھاکر رام سنگھ صاحب بی اے فاضل مجسٹریٹ درجہ دوم و منصف رو در پرگنہ باسوہ ضلع علی گڑھ دام اقبالہ کی گئی بقلم بندہ خیر خواہ ترقی دولت حشمت کمترین شیو پرشاد اہلمد دیوانی عدالت موصوفہ تاریخ ۱۱ جنوری ۱۸۹۲ء مطابق سمت ۱۹۴۸ یوم یکشنبہ کسی خاص وجہ سے میں اس مقام پر زیادہ دیر ٹھہر بھی نہیں پایا لیکن عجلت میں جو کچھ سمجھ میں آیا اس کی بنا پر اس کتاب کو ۱۸۹۲ء کا یا اس سے قبل کا نسخہ سمجھ لیا۔ چونکہ ہماری زبان کے پڑھنے والوں اور اس میں لکھنے والوں کا علمی ذخیرۂ معلومات وافر معلوم ہوتا ہے نیز اکثر اسکالرز ریسرچ کے سلسلہ میں بھی علمی مباحث اور استفسارات اس میں فرماتے رہتے ہیں لہٰذا یہ بہتر سوچا کہ ہماری زبان کے ذریعہ اپنے شکوک و شبہات کو دور کرسکوں اور قارئین کرام نیز علم دوست حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں۔ چنانچہ میں ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں مجھے مزید واقفیت دے سکیں۔ پہلا سوال تو یہی ہے کہ اس نظم کا اصل مصنف کون تھا دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا یہ کتاب شائع ہو چکی ہے یا نہیں۔ شائع ہوئی ہے تو کب اور کہاں سے اور ان دنوں کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔

(ہمامیر ٹھی)

اردو کی مخالفت کا طریقہ

[illegible] ایک مدراسی دوست ہیں، نام تو ان کا خاصا طویل ہے [illegible] ہم لوگ ان کو مسٹر نرینا کہتے ہیں۔ ان کے والد سرکاری دفتر میں ایک اونچے عہدے پر ہیں۔ یہ خود بھی ملازم ہیں اور فخر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے ہندی بھی سیکھ لی ہے، ساتھ ساتھ یہ بھی شکایت ہے کہ پھر بھی یہاں والے ہم لوگوں سے [illegible] سلوک نہیں کرتے؛ یعنی ہندی سیکھ لینے کے باوجود، ہماری رواداری کی اس بے مثال زبان کے باوصف، لوگ ہم سے بدسلوکی کرتے ہیں لیکن ایک نہایت اہم پہلو یہ سامنے آیا کہ ان کے ہندی کے استادوں نے اردو کی بات یہ بات ذہن نشین کرادی ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کے تصادم سے پیدا ہوئی اسی لیے اس میں لڑائی جھگڑے کے الفاظ ہیں اور اس کا لہجہ بہت ہی کرخت ہے۔ اب ہم لوگ ان کو کئی طرح سے سمجھاتے ہیں مگر وہ اثر نہیں زائل ہوتا۔ اس ایک مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو دشمنی کی مہم کس کس طرح سرگرم عمل ہے مگر اردو دوست زبانی جہاد کے سوا عملی جہاد سے قطعاً دور ہیں۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ انجمن ترقی اردو کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان کی ہر زبان میں اس قسم کا لٹریچر ترتیب دے کہ (۱) اردو کہاں پیدا ہوئی۔ (۲) اردو میں کس کس زبان کے الفاظ شامل ہیں (۳) اردو نے کتنی کم مدت میں ترقی کی (۴) اردو زبان کس ماحول میں پیدا ہوئی ساتھ ہی ساتھ ہر زبان کے اس لٹریچر میں اردو کے حروف تہجی اس زبان کے مماثل حرف کے ساتھ ضرور ضرور شائع کئے جائیں تاکہ اس زبان کا قاری کم از کم اردو حروف سے آشنا ہوسکے اور ہر علاقہ میں ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو اس پمفلٹ کی [illegible] کرے اور رپورٹ دے کہ اس تشہیر سے عوام کس حد تک متاثر ہوئے اولین سطر میں اس کام کی [illegible] نہیں معلوم ہو، مگر ایک عرصہ تک اگر یہ عمل جاری رہے اور مشنری طریقہ سے کام کیا جائے تو یقین کامل ہے کہ فائدہ ہوگا۔ اردو کتابیں چھاپنے کے مقابلے میں اب اردو دوستوں کو اس کام پر زیادہ توجہ صرف کرلی چاہئے خاموش خدمت کے اس عمل پر طوفان پنہاں ہے۔

(سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

گذارش

مجھے ایک مضمون کے سلسلے میں سید ہدایت علی ابن سید رفیق علی ولد سید سخاوت علی واسطی بلگرامی کے حالات زندگی درکار ہیں صاحبان علم سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں براہ راست یا بذریعہ ہماری زبان [illegible] فرمائیں۔

حنیف نقوی
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انیس انور

مکتوب لندن

مانچسٹر میں یوم اقبال نسیم احمد باجوہ کی اطلاع کے مطابق ۲۸ اپریل بروز اتوار چار بجے سہ پہر کو ردبی ہال، مانچسٹر ۱۲ میں یوم اقبال منایا جائے گا جس میں مقررین علامہ اقبال کی شاعری اور سیاسی فلسفہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حید گلوکار کلام اقبال ترنم سے پیش کریں گے۔ اس یادگار تقریب میں شرکت کے لیے مانچسٹر اور اطراف کے اردو نواز حضرات کو مدعو کیا گیا ہے۔

ٹیلی ویژن پر انگریزی تقریر اور اردو ترجمہ گذشتہ اتوار کو بی بی سی ٹیلیویژن کے پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھئے" میں نسلی امتیاز کے خلاف حکومت کی طرف سے پیش کئے جانے والے بل کے متعلق وزیر داخلہ (ریاستی) ڈیوڈ اینلز نے انگریزی میں تقریر نشر کی جس کا ترجمہ فوراً بعد مہندر کول نے اردو میں نشر کیا۔ مسٹر ڈیوڈ اینلز کی تقریر بی بی سی لندن اسٹوڈیوز سے نشر ہوئی جبکہ اردو ترجمہ بی بی سی کے برمنگھم اسٹوڈیو سے مہندر کول نے پیش کیا۔ اس ہفتہ وار پروگرام میں شاید پہلی بار یہ خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ اس ترجمہ کے بعد مہندر کول نے نسلی امتیاز کے خلاف بل پر لندن میں مقیم انڈین ایکسپریس کے نمائندے [illegible] اور ایک پاکستانی ڈاکٹر غلام صابر خاں سے اردو میں انٹرویو [illegible] نسلی امتیاز کے بارے میں ان کے خیالات و احساسات کا جائزہ لیا۔

بزم تفریح کا ماہانہ مشاعرہ عبدالعلیم صدیقی سکریٹری بزم تفریح لندن کی اطلاع کے مطابق ماہانہ مشاعرہ ۲۷ اپریل بروز ہفتہ آل انس ہال میں زیر صدارت چودھری اکبر خاں منعقد ہوگا جس میں لندن اور اطراف کے ممتاز شعرائے کرام، لطیفہ گو، اور معروف موسیقار شرکت کریں گے۔ ادب نواز حضرات اور موسیقی کے شائقین سے شرکت کی درخواست کی گئی ہے۔

ہفت [illegible] ایشیا۔

انگلستان

ار جی اے بیگ (منیلو)

حور انگلستان میں، غلمان انگلستان میں — جنت ارضی کا ہر سامان انگلستان میں
اونٹ ریگستان میں، کوہار انگلستان میں — تیل مسقط میں مگر سلطان انگلستان میں
رفتہ رفتہ ہوگئیں نابود تو آبادیاں! — رہ گئے دے کے انگلستان انگلستان میں
ہوگیا آلودہ تر [illegible] کا دامن عفیفہ — آگیا ہے جب کالا انسان انگلستان میں
آبھی جا دورہ پہ اے سید ضمیر جعفری — اب تو ملتے ہیں کباب و نان انگلستان میں
پھوٹ کر اپنے چمن سے آہ کس آفت میں ہے
بلبل بے بال و پر کی جان انگلستان میں

گذارش "ہماری زبان" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (ادارہ)

مکتوب بھوپال

غالب صد سالہ تقریبات کا افتتاح:-

مدھیہ پردیش کی راجدھانی میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کی نمائندگی کرنے والے نمایاں اصحاب کے پروقار اجتماع میں غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کا افتتاح ڈاکٹر گیان چند صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس جلسہ کی صدارت انگریزی کے اسکالر ڈاکٹر راجندر درما جوائنٹ ڈائرکٹر کالج ایجوکیشن مدھیہ پردیش نے کی۔ اس جلسہ کا انعقاد "حلقہ ارباب ادب" نے کیا تھا۔

مدھیہ پردیش میں غالب صد سالہ کمیٹی کی تشکیل:-

سیفیہ کالج میں انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی دعوت پر ایک جلسہ ہوا جس میں غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس جلسہ کی صدارت صوبائی انجمن کے صدر جناب فخرالدین نے کی۔ اس جلسہ میں صوبہ میں ان تقریبات کو عظیم شاعر کے شایان شان منانے کے لیے ایک محرک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ اس میں مسٹر فخرالدین، مس شفیعہ رحمت، مسٹر عزیز قریشی، مسٹر یوسف کمال بخاری، مولانا صدرالدین انصاری، ڈاکٹر کاشی کمار، مسٹر آفاق احمد (جنرل سکریٹری)، ۴۰ افراد پر مشتمل ایک اور کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں اور علاقوں میں غالب کی تقریبات کے لیے کمیٹیاں بنائی جارہی ہیں۔

شاعر مشرق کو خراج عقیدت:-

یہاں شاعر مشرق علامہ اقبال کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ علامہ اقبال بھوپال میں بھی رہے ہیں اس لیے اس خصوصی تعلق کو بھی یاد کیا گیا۔ ان کی یادگار میں قائم اقبال لائبریری میں مسٹر یوسف کمال بخاری ڈائرکٹر نیشنل آرکائیوز کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں مسٹر ایم عرفان صدر انجمن ترقی اردو بھوپال، مسٹر آصف شاہ میری، مسٹر شرقی خالدی، مسٹر آفاق احمد کے علاوہ صدر جلسہ نے اقبال کے فلسفہ اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ ٹی ٹی نگر میں "لوک ادب" نامی تہذیبی اور ادبی انجمن نے رائے لالہ ملک راج سابق وزیر ریاست بھوپال کی صدارت میں اقبال کی یاد میں ایک جلسہ ہوا۔

اردو کی ہمہ گیری پر مقالہ:-

"حلقۂ ارباب ادب" کے ایک خصوصی جلسہ میں جو گلشنی بائی گرلز کالج میں شعبۂ اردو کے صدر مسٹر ایم ایم خاں کی صدارت میں ہوا مسٹر ایم عرفان نے اردو کی ہمہ گیری پر ایک محققانہ مقالہ پڑھا۔ اس مقالہ کے ساتھ فاضل مقالہ نگار نے نقشوں، تصاویر، چارٹوں اور اسکیچوں کے ذریعہ اپنے موضوع کی حمایت میں ثبوت پیش کئے۔ آپ نے کہا اردو میں دنیا کی ساری زبانوں کا رس ہے جو منہ سے نکلتے ہی ذہن پر اثر کرتی ہے۔ مسٹر شاہد صدیقی نے حلقہ کی طرف سے قرارداد تشکر پیش کی۔

(نامہ نگار "ہماری زبان")

گنتور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام

اوائل مارچ میں گنتور میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی ایک شاخ قائم ہوگئی ہے۔ اس کا افتتاح مسٹر نارائن ریڈی صاحب نے کیا۔ گنتور ضلع کی جملہ آبادی ۲½ لاکھ ہے جس میں اردو مادری زبان والے ۵۴ ہزار ہیں اور اردو بولنے والے کم از کم ۷۰ ہزار ہوں گے۔ یہاں کے لوگ اردو مجلس جیسی ایک مجلس بھی قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے ماہانہ اجلاس ہوا کریں اور اس طرح فروغ اردو میں مدد ملے اور دوسرے یہ کہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے امتحانات یہاں بھی ہوا کریں۔

انجمن ترقی اردو راجستھان کا میمورنڈم

انجمن ترقی اردو راجستھان کے سکریٹری جناب احترام الدین احمد شاغل نے راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کو ایک میمورنڈم بھیجا ہے جس میں ساہتیہ اکیڈمی کی توجہ اردو کی ترقی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے میمورنڈم کا متن درج ذیل ہے

۲ راگست ۱۹۶۶ء کو انجمن ہذا کا ایک وفد گنگوال پارک جے پور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور بعد تبادلۂ خیالات قرار پایا تھا کہ انجمن ترقی اردو راجستھان کے نمائندے کی حیثیت سے اکیڈمی کی ممبری کے لئے تین ناموں کی فہرست بھیج دی جائے جن میں سے کسی ایک کو جگہ خالی ہونے پر لے لیا جائے گا۔ اس لیے ۱ ستمبر ۱۹۶۶ء کو یہ فہرست بھیج دی گئی۔ اور اس کے بعد یاددہانی بھی کی گئی۔ خاص کر اس وقت کہ جب جگہ خالی ہوئی پھر اس کے بعد حال ہی میں جناب سید عبدالرؤف صاحب نے بھی اس سلسلہ میں بمقام اجمیر جناب والا سے ملاقات کی اور منشی جید بہاری لال صاحب ضیا سے بھی بتایا کہ انھوں نے بھی اس بات پر زور دیا کہ انجمن کا کوئی نمائندہ اکیڈمی کا ممبر ضرور ہونا چاہئے۔ مگر اب تک ایسا نہیں ہوا۔

جواب میں کہا جاتا ہے کہ راؤ بہادر پنڈت اوتار نارائن صاحب بہادر۔ سابق نائب صدر حال صدر انجمن ہذا نے اکیڈمی کی ممبری سے استعفا دیدیا ہے اس لئے انجمن ترقی اردو راجستھان کا کوئی نمائندہ اکیڈمی کا ممبر نہیں ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی پنڈت صاحب موصوف نے استعفا دیا ہے؟ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ

"میں نے کوئی استعفا نہیں دیا۔ صدر صاحب اکیڈمی سے جس نے بھی ایسا کہا ہے غلط کہا ہے۔ میری وہ تحریر جس کو استعفا کہا جاتا ہے۔ صدر صاحب بچشم خود ملاحظہ فرمائیں"!

موصوف نے بتایا کہ "ایک معاملہ کے سلسلہ میں احتجاج کے طور پر میں نے یہ لکھا تھا کہ اس معاملہ کا منصفانہ

فیصلہ نہ ہوا تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔"

یہ احتجاج [illegible] کس طرح مان لیا گیا۔ جناب والا اصل تحریر کوئی ہو تو ملاحظہ فرما کر فیصلہ فرمائیں!

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ انجمن ترقی اردو راجستھان جس کی ضلعی اور مقامی چالیس شاخیں راجستھان میں کھلی ہوئی ہیں اردو زبان کی ترقی چاہتی ہے۔ اور راجستھان ساہتیہ اکیڈمی بھی اس کے ادب کی حفاظت و ترقی کا اسی طرح ذمہ لیتی ہے جس طرح ہندی۔ سنسکرت اور راجستھانی کے ادب کا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ دونوں میں تعاون نہ ہو۔ چنانچہ جس زمانے میں بنڈت صاحب کے دور میں تعاون برقرار رہا اس زمانے کی بہت سی معمولی ادبی خدمات کو نظر انداز چھوڑتے ہوئے تین بڑی یادگاریں ناقابل فراموش ہیں۔

۱۔ کل راجستھان اردو سمپوزیم جے پور مع آل انڈیا مشاعرہ
۲۔ کل راجستھان اردو سمپوزیم جے پور مع آل انڈیا مشاعرہ
۳۔ آل انڈیا اردو کانفرنس جے پور مع آل انڈیا مشاعرہ

(ہر جلسہ کی روداد طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے)

اس لئے پہلی درخواست یہ ہے کہ:

اس تجویز کو ملاحظہ فرمانے کے بعد کہ جس کو ہنڈت صاحب کا استعفا باور کرایا گیا ہے جو غلط ہے ان کی ممبری بدستور برقرار ہونے سے مطلع فرمایا جائے۔ دوسرا اس فہرست میں سے کسی کو نامزد کیا جائے جو ستمبر میں پیش کی گئی ہے۔ اس میں بھی پنڈت صاحب کا نام ہے اور اگر وہ ہر نام بھی پسند نہ ہوں تو حسب ذیل پانچ ناموں میں سے کسی کو منتخب فرما لیا جائے۔

(۱) سید احمد علی شاہ صاحب قمر جعفری آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ
(۲) سید عبد الرؤف صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل کلکٹر۔
(۳) خان محمد وحید اللہ خاں صاحب وحید۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ریٹائرڈ
(۴) صاحب زادہ خلیل احمد خاں صاحب ایم اے ایل۔ ایل۔ بی
(۵) نواب محمد عبد الباقی خاں صاحب جگر ہاؤس جے پور

راقم الحروف کو اس بات پر اصرار اس لئے ہے کہ تجربہ تو اس کی جرأت ہوئی کہ اس تعاون سے دونوں ادارے اپنے مقاصد کے مطابق بڑے بڑے کام آسانی سے کرسکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس جمہوری دور میں تعاون و اتحاد کی کس قدر سخت ضرورت ہے جس میں ادبی تعاون کو بھی خاص اہمیت ہے اس لئے جناب والا کو اپنا وعدہ پورا فرمانا چاہئے!

(احترام الدین احمد شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان)

انجمن ترقی اردو شہر علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست

علی گڑھ ۱۸ اپریل یونین بلڈنگ دارالمطالعہ بلدیہ میں شہریان کی ایک ادبی نشست زیر صدارت حضرت راز چاندپوری منعقد ہوئی سب سے پہلے مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے "انجمن اور اس کے اغراض و مقاصد" کے عنوان پر معلوماتی تقریر فرمائی۔ پھر جناب راز چاندپوری نے سیماب اکبرآبادی پر اپنا مقالہ پڑھا جسے سامعین نے بہت پسند کیا اس کے بعد جناب زاہد رضا خاں کیا تب، حافظ عبد الحمید جاذب، ضیاء الدین [illegible]، یونس آزاد شوق، شاداں، ساجد پرویز، قاضی احمد اللہ صاحب اور جناب راز چاندپوری نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں صدر کے شکریہ کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

(ضیاء الرحیم سکریٹری انجمن ترقی اردو شہر علی گڑھ)

حلقۂ ادب "رانچی کی طرف سے "یوم اقبال"

رانچی ۲۱ اپریل بوساطت کے شام ملسعی، مفکر، مصلح قوم اور عظیم شاعر علامہ اقبال اقبال کی یاد میں آزاد ہائی اسکول کے ہال میں یوم اقبال منایا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر عقران سگ، پرنسپل انجینئرنگ اسکول نے فرمائی۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز اقبال کی ایک غزل سے ہوا جسے جناب مسعود جامی نے اپنی مترنم آواز میں سامعین کو سنائی۔ پھر ایک اور صاحب نے اقبال کی ایک نظم پڑھی۔ اس کے بعد سکریٹری جناب قمر حمید نے حلقۂ ادب کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔ مذاکرہ شروع ہوا مذاکرہ کا عنوان تھا "اقبال میری نظر میں" اس میں حصہ لینے والے رانچی کالج کے تین طلبہ سید حنیظ الحسن، ایس۔ ایچ۔ التمش اور خواجہ [illegible] صاحبان تھے۔ طالب علموں نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی فیصلہ میں۔ اول انعام کا مستحق سید حنیظ الحسن کو قرار دیا گیا۔ پھر دوسرے معززین حضرات حاکم ابو الحیات، پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر ابوذر عثمانی اور پروفیسر سمیع الحق نے اقبال کے نظریۂ فن، کلام، فلسفہ، شخصیت سیرت اور کردار پر تقریریں کیں۔ حلقہ کی طرف سے کالج اور اسکول کے طلبہ کے لئے تحریری مقابلہ کا بھی اہتمام تھا۔ کالج کے لیے مقالات کے دو عنوانات "اقبال کے شعری اسالیب" اور "اقبال ایک فلسفی شاعر" پر بالترتیب جناب حبیب احمد (گیا)، اور جناب اختر امام (دربھنگہ) کے مضامین کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ "اقبال" پر نظمیں کہی گئیں۔ جن میں جناب ارشد نبی کی نظم اول آئی اسکول کے طلبہ میں دو انعامات جناب توصیف عالم گیا کو "اقبال کی فطری شاعری" پر اور جناب احمد حسن چھپرا کو "اقبال کی تعلیمات" پر ملے۔

اس مشاعرہ کا دور شروع ہوا۔ مشاعرہ میں حصہ لینے والے شعرائے کرام میں جناب صابر بہاری، مجیب الرحمٰن بزمی، قمر حمید، داؤد مضطر، حبیب الرحمٰن احمر، تسنیم جنیدی، حمید آثر، ہمس جاوید، ہمدم رانچوی، نذر رانچوی اور جناب پروفیسر سمیع الحق صاحبان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے

(منظر مسعود ناظم نشر و اشاعت)

گلزار خلیل کا رسم اجراء

بیکانیر ۱۰ اپریل بزم خلیل کے زیر اہتمام عظیم الشان پیمانے پر جشن خلیل منایا گیا۔ صدارت کے فرائض [illegible] جناب این۔ سی۔ دتہ ڈی۔ آئی۔ جی پولیس بیکانیر نے انجام دئے۔ جشن خلیل کا پہلا دور تقاریر اور مقالات پر مشتمل تھا۔ بزم مقالات کے بعد حضرت خلیل عثمانی

ایڈوکیٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو بیکانیر کے مجموعۂ کلام بنام "گلزار خلیل" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اور کل راجستھان طرحی مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ راجستھان کے نمائندہ شعرائے کرام نے بھی شرکت فرمائی۔　　(ملاپ چند راہی)

انجمن تعمیر اردو کی نشست

دلی۔ گذشتہ ماہ میں بتاریخ ۱۴ر اپریل ۹۸ء کو شام کے پونے سات بجے، اردو ناہال اردو بازار جامع مسجد دلی میں انجمن تعمیر اردو دلی کی حسب معمول ہفتہ وار ادبی نشست منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض جناب شمیم کرہانی صاحب نے انجام دئے جس میں اسیر آغا۔ پروفیسر سمنانی۔ ڈاکٹر تنویر علوی۔ جناب طالب دہلوی اور حضرت خمار دہلوی نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ اس کے بعد جناب پنڈت آنند موہن زتشی صاحب گلزار دہلوی سکریٹری انجمن ہٰذا نے اپنے حالیہ سفر حیدرآباد دکن کے تاثرات اور یادداشتوں سے وابستہ اور وہاں اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق سفرنامے کے مضمون "حریم دکن کی زیارت" اور نظم "آبروئے دکن" کے اقتباسات سنائے۔

اختتام پر صدر جلسہ جناب شمیم کرہانی صاحب نے گلزار صاحب کی شخصیت کی تعریف کی اور صدر جلسہ جناب شمیم کرہانی نے چند رباعیاں اور دو غزلیں سنائیں اور حاضرین وانجمن کا شکریہ ادا کیا۔　　(اے۔ ایم زتشی)

ذوق کا مزار کسمپرسی میں

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے اتالیق اور اردو کے عظیم شاعر شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کو دلی سے جو محبت تھی وہ ڈھکی چھپی بات نہیں چنانچہ ان کے اشعار میں اکثر اس کا اظہار ملتا ہے۔

لیکن جس دلی سے اس عظیم شاعر نے اتنی محبت اور وارفتگی کا اظہار کیا اس دلی نے اس سے اتنا ہی بے رحمانہ سلوک کیا اور آج اس عظیم ہستی کے مزار تک کا بھی نشان نہیں ملتا۔ تقسیم ہند نے جہاں متعدد بدنما داغ چھوڑے ہیں وہیں ایک یہ بھی کہ قلعۂ معلی کے آخری رہنمائے علم و ادب کا مرقد آج پبلک پاخانہ میں بدل دیا گیا ہے۔ چند سال قبل مزار صرف ڈھا یا گیا تھا لیکن پبلک پاخانہ علاقہ نبیا پوری میں دہلی میونسپل کارپوریشن نے حال ہی میں بنایا ہے۔ اس علاقے میں [illegible] بھینسیں بندھتی ہیں اور پورے علاقہ میں ڈیریوں کا جال بچھا ہوا ہے جہاں ہر طرف غلاظت کے ڈھیر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دہلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی اس پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔　　(انڈین ایکسپریس)

ریاست بہار کے اردو اقلیتی اسکولوں کے فیڈریشن کے قیام کی تجویز

پٹنہ۔ اورینٹل جونیر اسکول، پتھر کی مسجد پٹنہ ۶ میں ایک جلسہ زیر صدارت محمد سلیمان صاحب منعقد ہوا جس میں اورینٹل جونیر اسکول، جیک اینڈ جل، نائٹنگیل جونیر اسکول اور اردو مڈل اسکول آرہ کی طرف سے جناب پروفیسر احسان اشرف، جناب علی احمد صاحب، جناب اسرار الہدیٰ ریسرچ افسر پٹنہ یونیورسٹی اور پروفیسر ابو ظفر صاحب ایچ۔ ڈی۔ جین کالج آرہ نے خصوصی طور سے شرکت کی اور متفقہ طور پر ایک ایڈہاک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے کنوینر جناب احسان اشرف صاحب بہ اتفاق رائے منتخب ہوئے اور یہ طے پایا کہ جلد ہی یہ کمیٹی ریاست بہار کے اردو اقلیتی اسکولوں کا ایک نمائندہ جلسہ پٹنہ میں بلائے گی اور ان اردو اسکولوں پر مشتمل ایک فیڈریشن کا قیام عمل میں لائے گی جس کا مقصد اردو کے ان اقلیتی اسکولوں کی بنیادوں کو مستحکم بنانا، ان کی ترقی و توسیع کے ایک تعمیری پروگرام مرتب کرنا اور ابتدائی ثانوی اسکولوں کے درجے تک کے لئے اردو میں درسی کتابوں کی اشاعت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

تحریری کام کو اور اہمیت دے دیں تو اس کا اثر ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی تعلیم پر بھی پڑے گا کیونکہ یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ ہی تو ان اسکولوں میں پڑھائیں گے۔ اس کے ساتھ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کو تدریس اور اس کی ضروریات پر سب سے زیادہ توجہ کرنی ہوگی، صرف اپنی ترقی کے لیے ریسرچ کرنے اور درس و تدریس کے فرائض میں کوتاہی کرنے کی اجازت نہ ہو۔ استاد کا پہلا کام طالب علم کو زبان سکھانا اور ادب کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنا علمی و تحقیقی کام بھی کرتا رہے تو وہ بہتر استاد ہوگا، مگر تدریس کی ضروریات کو نظرانداز کر کے صرف اپنے ذاتی ادبی کام میں لگے رہنا، طلبہ کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ پھر تحقیق ہو یا تنقید۔ بغیر زبان و ادب کے خاصے ٹھوس علم کے سطحی اور سرسری ہوگی۔ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اور ہم عصر ادب کے میلانات کی ترجمانی کے لیے بھی زبان کے سرمائے اور کلاسیکل ادب پر عبور ضروری ہے امید ہے کہ وہ لوگ جو یونیورسٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اس سلسلے میں جلد ضروری اقدامات کریں گے۔ معیاروں پر اصرار بھی زبان و ادب کی حفاظت کا ایک طریقہ ہے۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

ادھر امتحانات کی کاپیاں دیکھنے اور طلبہ کا زبانی امتحان لینے کے دوران پھر یہ احساس قوی ہوگیا کہ ہماری درس گاہوں میں اردو زبان کی تدریس میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت شمالی ہند میں عموماً اور اتر پردیش میں خصوصاً صورت یہ ہے کہ ابتدائی منزل پر اردو کی تعلیم کا انتظام بہت ناقص اور ناکافی ہے۔ ثانوی منزل پر بھی بہت سے طلبہ اردو ایک مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھتے اور ثانوی منزل پر یوں بھی تعلیم کا معیار قابل اطمینان نہیں ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، زیادہ طلبہ اسے ایک آسان مضمون سمجھ کر لے لیتے ہیں۔ دلچسپی واقعی کم طلبہ کو ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت میں عام طور پر معیار کے معاملے میں خاصی نرمی برتی جاتی ہے۔ پرکھ کے بجائے پرورش کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ میں خاصی خامیاں رہ جاتی ہیں اور ایم۔ اے تک کے بعض طلبہ صحیح زبان بھی نہیں لکھ سکتے۔ انھیں طلبہ میں سے بعض پی۔ ایچ۔ ڈی کرتے ہیں اور ایک مخصوص موضوع پر محنت کرکے کوئی مقالہ لکھ لیتے ہیں پھر کسی یونیورسٹی میں لیکچرر ہو جاتے ہیں، مگر چونکہ زبان کی بنیاد مضبوط نہیں ہے اور علمی و ادبی نظر نہیں پیدا کر سکے ہیں اس لئے ان کے شاگرد بھی زبان و ادب کا کوئی قابل قدر معیار نہیں رکھتے۔ ان میں سے بعض تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر شعر کہتے ہیں، یا افسانے لکھتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیت کے باوجود زبان پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ ایک گمراہی کو فروغ دیتے ہیں اور مجموعی طور پر زبان و ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم زبان کے معاملے میں اور سخت ہو جائیں۔ یہ معاملہ صرف زبان کا نہیں ہے۔ ذہن کی تربیت اور تہذیب کے فروغ کا بھی ہے۔

ابتدائی اور ثانوی منزل پر جن اساتذہ کی ضرورت ہوگی، ان کے پاس اردو کی بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری ہوگی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لیے تو ایم۔ اے کی اچھی ڈگری لازمی ہے۔ اس طرح گھوم پھر کر بات یونیورسٹی کی منزل پر ایک معیاری نصاب کی ضرورت، تدریس کے ایک جامع پروگرام اور صلاحیت کو پرکھنے کے لیے امتحان کے طریقے میں اصلاح کی آجاتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں ہم نہ صرف ایک اچھے معیار پر اصرار کر سکتے ہیں بلکہ معیار کو بلند کرنے کی بھی کوشش کر سکتے ہیں۔

معیاری نصاب کی ضرورت تو محسوس کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کی انجمن نے کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں جن پر عمل کرنے سے یقیناً ہماری تعلیم کا معیار بہتر ہوگا، مگر تدریس کے سلسلے میں ہمیں چند باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اوّل تو درس میں نظم یا نثر خوانی کو اہمیت دینی ہوگی۔ طلبہ عام طور پر نظم کو ناموزوں پڑھتے ہیں اور نثر میں اگر کچھ فارسی کے الفاظ آگئے تو ان کی بھی صحیح قراءت نہیں کر سکتے۔ دوسرے اس پر اصرار کرنا ہوگا کہ نقادوں کی رائیں دہرانے کے بجائے وہ مضمون یا نظم کے خیال کو بیان کر سکیں اور زبان و بیان کی خوبیوں پر روشنی ڈال سکیں۔ تیسرے سال کے دوران تحریری کام یعنی اشعار کی تشریح، مضامین کے خلاصے، خصوصیات کلام اور عملی تنقید کے لیے خاصا وقت نکالنا ہوگا۔ استاد کو اس تحریری کام کو غور سے دیکھ کر زبان کی غلطیوں کو درست کرنا ہوگا تاکہ دوبارہ یہ غلطیاں نہ ہوں۔ آج کل ایسے طلبہ بہت ہیں جو الفاظوں، استغفاروں، افکاروں لکھتے ہیں، جو خورشید الاسلام کو خورشید السلام لکھتے ہیں جو توجیہ کو توضیح، رجحان کو رجحان، درجۂ اتم کو درجۂ اتم، مہتم بالشان کو محتم باشان، مہدی افادی کو مہندی افادی لکھتے ہیں۔ ایسے طلبہ درجنوں مل جائیں گے جو فسانۂ عجائب کا کوئی اقتباس صحیح نہیں پڑھ سکے مگر رجب علی سرور کے اسلوب بیان پر نقادوں کی رائیں فوراً دہرا دیتے ہیں۔ ایسے طلبہ بے شمار ہیں جنھوں نے اقبال کی نظمیں، میر کی غزلیں، نظیر اکبر آبادی کی نظمیں نہیں پڑھیں یا پڑھی ہیں تو ان کا مطلب نہیں بیان کر سکتے، ہاں ان شعرا پر نقادوں کی رائیں رٹ لی ہیں اور انھیں امتحان کی کاپی پر اگل دیتے ہیں۔ اس لیے بی۔ اے کی منزل پر کتاب خوانی اور تحریری کام کو خاص اہمیت دی جانی چاہئے اور ایم۔ اے کی منزل پر تمام بنیادی کتابوں کے مطالعے پر اصرار کرنا چاہئے۔ امتحان کے طریقے میں یہ اصلاح ضروری ہے کہ جتنے مصنف نصاب میں رکھے گئے ہیں سب کا مطالعہ ہو اور سب پر کچھ نہ کچھ لکھنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ سال کے آخر میں تین گھنٹے کے امتحان میں چار یا پانچ سوالوں کے جواب ہی دئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے سال کے دوران تحریری کام کے ذریعہ سے تمام مصنفین سے آشنا کرایا جائے اور امتحان میں صرف عمومی نظر یا ادبی ذوق کی پرکھ ہو جو چار یا پانچ سوالوں سے ہو سکتی ہے۔ ان سب کاموں کے لیے اساتذہ کو موجودہ طریقۂ کار ترک کرکے خود بہت کام کرنا پڑے گا۔ طلبہ کو شروع ہی میں اچھی خاصی ببلوگرافی دینی پڑے گی اور اس میں بھی ان ابواب یا صفحات کی نشاندہی کرنی پڑے گی جو موضوع سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کچھ بنیادی کتابیں پڑھانی ہوں گی اور پھر تحریری کام کے ذریعہ سے جو امتحان کا ایک جز ہوگا، نصاب کے تمام مصنفین سے متعلق چھوٹے چھوٹے مضمون لکھوانے ہوں گے۔ اس کے ساتھ قواعد کے مبادیات کے علم، عروض سے کچھ واقفیت اور فارسی ادب سے کچھ شناسائی پر اصرار کرنا ہوگا۔ اب شمالی ہند میں طلبہ عام طور پر ہندی جانتے ہیں، مگر فارسی بالکل نہیں جانتے اور انگریزی میں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ اس لیے بی۔ اے اختیاری اور ایم۔ اے کی منزل پر فارسی کا کچھ علم لازمی کر دینا چاہئے اور انگریزی میں بھی ایک اچھے معیار پر اصرار کرنا چاہئے۔ اگر ہم یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کے معیار کو بہتر بنا لیں اور امتحان کے طریقے میں ضروری اصلاح کر لیں۔ اگر ہم

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے چھپوا کر پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2166/57

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

Date
1-8-15-22

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ مئی ۱۹۶۸ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ ایک خاصے وقفے کے بعد ۱۰ مئی کو پارلیمنٹ میں پیش ہوئی۔ دستور میں جب کمشنر کے تقرر کے لئے گنجائش نکالی گئی تھی تو یہ بات بھی واضح کر دی گئی تھی کہ صدر جمہوریہ اس رپورٹ کی روشنی میں وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات جاری کریں گے۔

اس سے پہلے بھی کمشنر نے ریاستی حکومتوں کے تغافل کا رونا رویا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ یہ حکومتیں لسانی اقلیتوں کی شکایات پر پوری توجہ نہیں کرتیں، مگر آٹھویں رپورٹ میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ابھی تک ہم نے پوری رپورٹ نہیں دیکھی لیکن اخباروں میں رپورٹ کے اس جملے کو نمایاں طور پر شایع کیا گیا ہے۔ رپورٹ پر سیر حاصل تبصرہ ہم بعد میں کریں گے لیکن اس وقت صدر جمہوریہ کو خاص طور پر توجہ دلانا ہے کہ دستور کی ہدایات کے مطابق اور کمشنر کی سفارشات کی روشنی میں وہ ریاستی حکومتوں کو مناسب ہدایات وزارت داخلہ کی معرفت دیں۔ صورت یہ ہے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے متعلق دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف کی رو سے ریاستی حکومتوں پر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ انھوں نے اب تک پوری نہیں کی۔ ان کی کوشش کا کوئی واضح ثبوت اب تک نہیں ملا اور حد یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے بار بار انھیں توجہ دلائی مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس طرح ثانوی تعلیم اور دوسرے امور کے متعلق بھی شمالی ہند کی ریاستی حکومتوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے اور بعض جگہوں پر تو کچھ نہ کرنے کے لئے عجیب و غریب عذر بھی تراشے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ میں جب بھی کمشنر کی رپورٹ پر بحث ہوئی ہے تو ممبروں کی بے اطمینانی کھل کر سامنے آئی ہے۔ اس لئے لسانی اقلیتوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی خواہشات کے احترام میں صدر جمہوریہ کو اب مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس معاملے میں قانون کے اس بنیادی اصول کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ حقیقی انصاف وہ ہے جو نہ صرف انصاف ہو بلکہ انصاف معلوم بھی ہو۔

آہ پرویز شاہدی

کلکتہ سے یہ اندوہناک خبر موصول ہوئی ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور معلم پرویز شاہدی کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچپن سال کی تھی۔ پرویز شاہدی کے کلام کا ایک مجموعہ رقص حیات کے نام سے شایع ہو چکا ہے اور ایک دوسرا مجموعہ تثلیث حیات شایع ہونے والا تھا۔ پرویز شاہدی ایک اچھے شاعر، ایک تجربہ کار معلم اور ایک پر خلوص اور درد مند انسان تھے۔ وہ سچے ترقی پسند تھے۔ وہ کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے مگر سیاسی داؤ پیچ کے آدمی نہ تھے۔ وہ بہار کے رہنے والے تھے مگر ان کی ساری عمر مغربی بنگال میں گزری تھی۔ افسوس ہے کہ دمہ کے موذی مرض نے اردو دنیا سے ایک اچھا شاعر اور ایک مخلص انسان چھین لیا۔ ابھی ان کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اور ان سے اردو شعر و ادب کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ادارہ ہماری زبان ان کی سوگوار بیگم اور بچوں سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر بھلا — اردو دنیا اپنے بہت سے عاشقوں اور محسنوں سے واقف نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک عاشق اور محسن پروفیسر ایم۔ ایم۔ بھلا تھے جو ایک طویل مدت تک سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں انگریزی کے شعبے کے صدر رہے پھر آخر میں [illegible] یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور شعبے کے صدر ہو گئے تھے۔ پروفیسر بھلا، پروفیسر [illegible]

ڈاکٹر ریاض الحسن

مرزا حسین بیگ جرّار لکھنوی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جیسے قابلِ فخر استاد کے شاگرد اور منشی امیر احمد امیر مینائی جیسے بلند پایہ شاعر کے باعثِ فخر استاد تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے لاتعداد شاگردوں میں مرزا حسین بیگ جرّار کا نام بہت اہم ہے۔ یہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان "دیوان جرّار" کے نام سے نولکشور پریس لکھنؤ سے ماہ جون ۱۸۸۵ء میں پہلی بار شائع ہوا جو راقم کے پیش نظر ہے اسیر کے بڑے صاحبزادے سید غضنفر علی خاں حکیم لکھنوی نے دیوان کے خاتمہ پر ایک طویل تقریظ لکھی ہے جو صفحہ ۱۱۶ پر درج ہے اس میں جرّار کی شخصیت اور فن پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے اس کے علاوہ استاد اسیر ان کے دونوں صاحبزادوں یعنی حکیم اور افضل علی خاں افضل اور محمد سجاد علی خاں صاحب بہادر اشرف جنگ فرزند ارجمند بہو بیگم صاحبہ عرف چھوٹی شہزادی (شاگرد جناب اسیر) کے قطعات تاریخ بھی صفحہ ۱۱۹ پر درج ہیں جن سے جرّار کے متعلق ان حضرات کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ حکیم کی مذکورہ بالا تقریظ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

کلام ہے بے مثال اور دیوان رشک مقالِ شعرائے شیریں زباں .... زبان پر اہل زبان قربان ہیں بیاں پر صاحبانِ بیان فدا بہ صد جان ہیں تصنیف جناب جرّار فیض آبادی، شاعرِ بے نظیر، ارشد تلامذہ جناب ملک الشعراء تدبیر الدولہ، مدبر الملک، منشی سید مظفر علی خاں صاحب بہادر، بہادر جنگ المتخلص بہ اسیر ... بیان صفات مصنف امر محال ہے، فی الحقیقت شاعر عدیم المثال ہے .... نام نامی ان کا حسین بیگ، قوم مرزا، تخلص جرّار تھا، فی الواقع شاعر یکتائے روزگار تھا.. . . جب سے کہ حضرت اسیر کی خدمت میں حاضر ہوئے رموزِ فن سے بخوبی ماہر ہوئے، جس مشاعرہ میں شعر گرم سنائے، بازار شعر سرد تھا، رخ معاصرین خجالت سے زرد تھا، طبیعت نہایت عاشقانہ تھی، ہر غزل مطبوع طبائع اہل زمانہ تھی . . . ساتھ طبیعت خداداد کے علم عربی ۔ فارسی میں خوب استعداد تھی کلام میں سقم کا نام نہیں، عیوب کا کچھ کام نہیں۔ استاد سے بہت انس تھی۔ ادھر سے بھی کثرت شفقت و عنایت تھی۔"

زیر نظر دیوان بقول مصنف مقدار دوسرا دیوان ہے: مرض الموت میں مبتلا تھے کہ جرّار نے اپنے فرزند ارجمند کو یہ دیوان دیا اور وصیت کی کہ وہ اسے لے کر استاد اسیر کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ وصیت پر عمل ہوا اور باوجود عدیم الفرصتی کے استاد اسیر نے اپنے عزیز شاگرد (جرّار) کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اس پر نظر ثانی کی اور خود ہی موجودہ صورت میں ترتیب دیا۔ گویا یہ "دیوانِ جرّار" اسیر کا منتخب کردہ دیوان ہے۔

دیوان میں چند قطعات تاریخ درج ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(قطعۂ تاریخ از سید محمد غضنفر علی خاں حکیم)

چہ دیوانِ جرّار مطبوع گشت خوشا ثمرۂ انتخاب اسیر
پئے سالِ طبعش نوشتم حکیم زاد نائے فیض جناب اسیر

۱۲۹۰ھ

(قطعۂ تاریخ نواب نامدار شاعر عدیم النظیر نواب اشرف الدولہ محمد سجاد علی خانصاحب بہادر) اشرف جنگ، فرزند ارجمند نواب ملکۂ دوراں افسر بہو بیگم صاحبہ عرف چھوٹی شہزادی۔

شاگرد جناب اسیر

نام نیکش مشتہر جرّار بود طبع گردیدہ کلامش بے نظیر
بہرِ تاریخش چو سلطاں کرد فکر ہاتفے گفتہ ز ترتیب اسیر

(۱۲۹۰ھ)

(قطعۂ تاریخ نتیجۂ طبع رشک قدسی ذہن بیر سید مظفر علی خاں صاحب اسیر)

واہ کیا دیوان ہے جرّار کا تھا مرا شاگرد میرا ہم زباں
طبع کی تاریخ ہے یہ اے اسیر ہے یہ دیوان بوستان بے خزاں

(۱۲۹۰ھ)

مندرجہ بالا بیانات اور قطعات کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ جرّار کو اسیر کے شاگردوں میں ایک خاص جگہ حاصل تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ان بیانات کو معاصروں کے بیانات اور قطعات تاریخ کو اہل مطبع کے پروپیگنڈہ کے مترادف سمجھ کر

سلہ "بزم سخن" صفحہ ۳۶ پر جرّار کے متعلق یہ الفاظ درج ہیں میر محمد حسین تلمیذ اسیر از ابنا لکھنؤ است و شاعر خوش گو۔ تذکرہ اور صفحہ ۱۵ پر جرّار کی غزل درج ہے جس پر ان کا نام میر محمد حسین جرّار درج ہے لیکن حکیم کی مذکورہ تقریظ سے جو اس دیوان کے صفحہ ۱۱۸ پر درج ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر یا سید نہ تھے بلکہ قوم مرزا سے ان کا تعلق ظاہر ہوتا ہے "دیوان گلدستۂ شاعرہ" جلد ۱۱ نمبر ۴ مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں صفحہ ۱۰ پر نام "مرزا حسین بیگ تخلص بہ جرّار شاگرد اسیر" درج ہے۔ راقم

سلہ اس کے پہلے دو ایڈیشن کب اور کہاں سے شائع ہوئے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ راقم

سلہ "دیوان جرّار" صفحہ ۱۱۸ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۵ء

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۵ مئی کی شام کو اردو کے ممتاز شاعر پرویز شاہدی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پرویز شاہدی اگرچہ ایک عرصے سے کلکتہ میں مقیم تھے اور وہاں کی ادبی و تہذیبی زندگی میں انھیں ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی مگر اصل میں وہ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ دبستان عظیم آباد نے دور حاضر میں تین ایسے باکمال شاعر پیدا کیے جن کی سخنوری کا اعتراف پوری اردو دنیا میں کیا گیا ہے، یہ شاعر ہیں جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی۔ یہ تینوں شعراء اقبال اور جوش کے طرز گفتار سے بے انتہا متاثر ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ یہ تینوں شاعر شاد عظیم آبادی کی ادبی روایات کے سائے میں ہوش سنبھالتے ہیں لیکن ان کے ادبی جوہر پر جلا ہوئی ٹیگور اور نذر الاسلام کی سرزمین پر۔ بنگال کی رومانیت، غنائیت اور انقلابیت کو آمیز کر کے ان شعراء نے اردو کی نظم اور غزل کو ایک نیا لہجہ دینے کی کوشش کی ہے جس کا بھرپور اعتراف ابھی نہیں کیا گیا ہے۔

پرویز شاہدی کی عمر اس وقت لگ بھگ پچاس برس تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز ۳۶ کے قریب ہوا، ان کی نظمیں اور غزلیں ابتدا میں بہار اور بنگال کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔ میرے دوست ڈاکٹر مختار الدین آرزو بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں پٹنہ اور گرد و نواح کے مشاعروں میں پرویز شاہدی کی غیر معمولی مقبولیت دیکھی ہے۔ ان کی شخصیت میں بھی ایک عجیب رومانی سرمستی اور بانکپن تھا۔ وہ ایک مخلص انسان تھے اور ان کے دل میں قوم و ملک اور انسانیت کے لیے قربانی اور سرفروشی کا جذبہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ لاابالی پن کے باوجود بنگال کی سیاسی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے پر مجبور ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پرویز شاہدی کے نام سے میں پہلے پہل اس زمانے میں واقف ہوا جب میں اسکول کی جماعتوں کا طالب علم تھا، اس زمانے میں پرویز کلکتہ سے "جدید اردو" کے نام سے ایک ماہوار ادبی رسالہ نکالتے تھے میرے ایک عزیز عبدالرحمٰن ناصر جو اس زمانے میں میرے ادبی رہنما تھے اس رسالے کے مستقل قلمی معاونین میں تھے اور ان کے مضامین، اور افسانے اور ترجمے "جدید اردو" میں پابندی سے چھپا کرتے تھے غالباً اسی زمانے میں پرویز کی بعض نظمیں جوش ملیح آبادی کے رسالہ کلیم میں بھی پڑھی تھیں جو دہلی سے نکلا کرتا تھا۔

۱۹۵۰ء میں جب میں علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم اور یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا ایک امن کانفرنس میں شرکت کے لیے کلکتہ گیا۔ اس کانفرنس سے متعلق جہاں اور بہت سے تاثرات ابھی تک ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں وہاں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ پرویز شاہدی اس زمانے میں جیل میں تھے لیکن ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کا ہر ادیب و شاعر اور سیاسی کارکن ان کا ہی ذکر کرتا تھا اور کانفرنس کے ہر اجلاس کے شروع میں پرویز کی کوئی نہ کوئی نظم یا غزل پڑھ کر سنائی جاتی اور پورے مجمع میں جوش و حرارت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

احتر نظمی

غزل

یوں تو ہم راہ میں، کم کسی سے ملتے ہیں
آپ سے نہ ملنا تھا، آپ ہی سے ملتے ہیں

راستے میں بیٹھے ہیں، منزلوں کو ٹھکرا کر،
خضر ہم نہیں لیکن خضر ہی سے ملتے ہیں

آرزو کی راہوں میں دوسرا نہیں کوئی،
آپ سے جدا ہو کر، آپ ہی سے ملتے ہیں

کیا ہوا زمانہ کو، کیوں بدل گئی دنیا،
لوگ جانے پہچانے اجنبی سے ملتے ہیں

اس گلی میں کیا جائیں، کون ہے وہاں نظمی
راستے تمنا کے جس گلی سے ملتے ہیں

پرویز شاہدی سر تا پا شاعر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کسی فیشن کے ماتحت یا حصول شہرت کی خاطر نہ تھی۔ انھوں نے اشتراکی عقائد کو بہت سوچ سمجھ کر اپنایا تھا اور آخر عمر تک یہ عقیدہ ان کی رگ و پے میں سرایت رہا لیکن انتہا پسندی اور کٹرپن ان کے مسلک میں شامل نہ تھا خاص طور پر شعر و ادب کے معاملے میں ان کے یہاں ایک لچک اور رواداری بھی تھی اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ذاتی طور پر مجھے ان سے ملنے کے بعض مواقع حاصل ہوئے۔

پرویز شاہدی سے میری پہلی ملاقات ۵۵ء میں ہوئی جب وہ علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے یہاں تشریف لائے تھے۔ غالباً ڈیڑھ سال بعد بمبئی میں "جشن شاعر" منایا گیا۔ اس جشن میں شرکت کے لیے میں بھی گیا تھا، کلکتے سے پرویز آئے تھے۔ جہانسی پیلس میں میرے علاوہ جو اور شعراء ٹھہرائے

ں میں مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی مرحوم، کنول پرشاد
سلام مچھلی شہری تھے۔ میں اور پرویز جلسے سے ایک روز
لئے تھے۔ اس موقع پر مرحوم سے بہت کھل کر ملاقاتیں رہیں
سے ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ وہ اس زمانے
ٹ پارٹی کی اندرونی سیاست سے کچھ بیزار تھے اسی لیے
ست سے تقریباً کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور کلکتہ
ں میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے
ب کے ترقی پسند نظریے کے سلسلے میں ان کے خیالات میں
ں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ "جشن شاعر" کے مشاعرے کے بعد
نے رت جگے کا پروگرام بنایا، مخدوم، شاہد صدیقی اور
اد کے علاوہ عزیز قیسی اور بمبئی کے بعض اور نوجوان
بی اس صحبت میں شریک تھے۔ خوب ہنسی مذاق، لطیفہ گوئی
ں اور شعر خوانی کے دور چلتے رہے۔ پرویز نے بہت سی اپنی
ں سنائیں۔ اسی دوران میں میں نے اپنی ایک پسندیدہ غزل
ش کردی۔ اس غزل کا ذکر آتے ہی پرویز پر ایک عجیب کیفیت
ہوگئی اور جس موڈ میں انھوں نے ترنم کے ساتھ وہ غزل
ہ سماں اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ وہ غزل یہ ہے

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
تیر ما جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا
اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا
تیری ہموار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غم ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا
میں نے دیکھا ہے ترے حسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا
حسن ہمدرد ترا ہم سفر شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گزرنے نہ دیا
کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ بدست
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

میں نے اس غزل پر رائے دیتے ہوئے کہا کہ پرویز صاحب
نزدیک آپ کی شاعری کا اصل مزاج اس غزل میں
ا ہے۔ آپ اگر "یانگ سی کو سلام" جیسی خالص سیاسی
ی نظموں کے بجائے اس انداز کی بس بیس غزلیں اور
، تو اردو غزل کے سرمائے میں آپ کے ہاتھوں ایک قیمتی
ہو سکتا ہے۔ فرط محبت سے لپٹ گئے اور کہا کہ اپنی شاعری
ے میں اس طرح کی رائے پہلی بار سن رہا ہوں کہنے لگے
ا سیاسی زندگی نے میری حیثیت کچھ ایسی بنا دی ہے کہ مجھے
ہ چینی سننے کو بہت ملتی ہے لیکن دوستانہ تنقید سے میں
محروم رہا ہوں۔ میں تمہاری رائے کی بہت قدر کرتا ہوں

پرویز سے میری تیسری اور آخری ملاقات اس سے ایک
سال بعد دہلی میں ہوئی جب ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو کے ایک
مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے وہاں پہنچے تھے۔ مشاعرے کے
دوسرے روز شمس الرحمن فاروقی نے اپنے یہاں ایک بے تکلف
نشست کی تھی جس میں میرے اور پرویز کے علاوہ وحید اختر،
شاذ تمکنت، حسن نعیم، زبیر رضوی اور بعض دوسرے احباب تھے
اس محفل میں بھی پرویز کی بہت سی نظمیں اور غزلیں سنی گئیں، میں نے
پھر ایک بار اپنی اسی پسندیدہ غزل کی فرمائش کی تو مسکرائے اور
بڑے موڈ میں آکر غزل سنائی اس پرلطف صحبت کی یاد اب بھی
آتی ہے پرویز کے انتقال کی خبر سنی تو دیر تک ان ملاقاتوں کے
تاثرات دل کے پردے پر ابھرتے اور مٹتے رہے اور یہ محسوس ہوتا
رہا کہ کتنا اچھا شاعر اور کتنا اچھا انسان ہم سے جدا ہوگیا۔

پرویز شاہدی جتنے اچھے شاعر تھے اور جتنی مقبولیت انھیں
حاصل تھی اس اعتبار سے ان کے کلام کی اشاعت خاطر خواہ
نہ ہوسکی بعض وجوہ کی بنا پر وہ لاہور کے اہم ادبی رسائل سے
الگ رہے، ترقی پسند ادیبوں کے اہم آرگن "نیا ادب" نے بھی
غالباً ان کی مناسب پذیرائی نہیں کی اس لئے ادبی جائزے ان
کے نام سے خالی ہوتے تھے البتہ ۴۹ء، ۵۰ء کے لگ بھگ
"شاہراہ" کے ذریعہ ان کا بہت سا کلام منظر عام پر آیا۔ شاہراہ
والوں نے ۱۹۵۷ء میں ان کا مجموعہ کلام "رقص حیات" شائع
کیا تھا۔ اس مجموعے میں پرویز نے اپنا ابتدائی رومانی کلام شامل
نہیں کیا تھا بلکہ سیاسی اور ترقی پسند نظموں کو زیادہ اہمیت دی
تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ترقی پسند تحریک انتشار و اختلال کا
شکار ہوچکی تھی اور اس کے خلاف نئی نسل میں ایک ردعمل پیدا
ہوچکا تھا اس لئے پرویز کے اس مجموعے کو وہ جگہ نہ مل سکی جس کے
وہ مستحق تھے۔

ادھر پچھلے چند برسوں میں پرویز کی شاعری میں چند خوشگوار تبدیلیاں
آئی تھیں خاص طور پر ان کی نظم "بے چہرگی" میں موجودہ دور کا
کرب جس خوبصورت شاعرانہ انداز میں ابھرا ہے اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ پرویز کو اپنا اصل راستہ مل گیا ہے۔ اس نظم
میں جو بالواسطہ طریق کار اور علامتی انداز اختیار کیا گیا ہے
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرویز کا ذہن کس قدر متحرک اور
زندہ تھا اور انھوں نے نئے شعری مزاج کو کس سلیقے کے ساتھ
اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے قبول کیا تھا۔ ان کی نئی
غزلوں پر بھی لہجے کی اس تبدیلی کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ان کے لہجے پر ایک نئی دھار آگئی ہے۔ پچھلے دنوں کی
ایک غزل کے چند شعر سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

جلتے رہنا کام ہے دل کا، بجھ جانے سے کال کیا
اپنی آگ کے ایندھن ہیں ہم ایندھن کا مستقبل کیا

مراسلات

سیماب، جگر، اور داغ

"ہماری زبان" کے ۸ر مارچ ۱۹۶۸ء کے شمارے میں دیرینہ پرشاد سکسینہ صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ جگر مرادآبادی کے کسی عقیدت مند نے تو کچھ نہیں کہا البتہ مولانا سیماب کے شاگردوں نے ہماری زبان میں مضامین کا ایک تانتا باندھ دیا اور یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولانا سیماب، داغ ہی کے ایک شاگرد تھے۔ اس سلسلے میں مناظر عاشق ہرگانوی ظفر الاسلام ظفر اور شعا گوالیاری کے مضامین "ہماری زبان" میں شائع ہو چکے ہیں۔"

سکسینہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں علامہ سیماب مرحوم کا شاگرد نہیں ہوں۔ نہ کبھی میں نے سیماب سے مراسلت کی اور نہ انھیں دیکھنے یا ان سے ملنے کا شرف حاصل کیا۔ میں تو رنگ برنگے پھولوں کا شیدائی ہوں اور ہر خوشنما پھول کی پتی کو کھول کر دیکھنے سونگھنے اور اپنی نظر اور اپنے ذہن کو معطر کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب تک میری سیری نہیں ہو جاتی، میں متوالا بنا رہتا ہوں۔ بہت سارے پھولوں کے مالیوں پر میں نے مضامین لکھے ہیں اور اب بھی لکھے جا رہا ہوں۔ ان ہی مالیوں میں باغ اردو کے ایک مالی عاشق حسین سیماب اکبرآبادی بھی ہیں۔

آگے چل کر سکسینہ صاحب نے علامہ سیماب کی کتاب "دستور الاصلاح" کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کتاب نے ملک میں ایک ادبی ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔"

لیکن اس کتاب نے جتنی مقبولیت حاصل کی اس کے پیش نظر ہنگامہ کا لفظ کھٹکتا ہے اگر ایک صاحب نے اسے ناپسند کیا ہے تو سیوں قابل ذکر حضرات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے جس کے مطالعے کے بعد کتاب کی اہمیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے ایک آدمی کے غل مچانے کو ہنگامہ نہیں کہا جا سکتا "دستور الاصلاح" سے متعلق حضرت فانی بدایونی رقمطراز ہیں

"حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کی تازہ تصنیف "دستور الاصلاح" میری نظر سے گزری موصوف نے اس بیش بہا تصنیف سے دنیائے ادب کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ یہ کتاب صرف تلامذہ ہی کی حد تک قابل استفادہ نہیں بلکہ اساتذۂ فن کے لئے بھی مفید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب جہاں ادبی معلومات کا ایک دلچسپ ذخیرہ ہے اور جہاں غلط اصلاح دینے والوں کے لیے مشعل ہدایت ہے وہاں ان شعراء کو جو ابھی شاگردی کی منزل سے ہیں گزرے استاد کے انتخاب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا ایک قابل قدر وسیلہ ہے۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ نے یہ کتاب شائع فرما کر ہماری شاعری پر بے حد احسان کیا ہے۔ استادوں کی محض اصلاح کا مجموعہ تو کم از کم ایک پہلے سے موجود تھا لیکن "دستور الاصلاح" میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اس کے علاوہ ان امور سے بھی بحث کی گئی ہے جو نظام سخن کے لیے اہم اور ضروری ہیں۔ ان تمام امور پر نئے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بے راہ روی جو آجکل زندگی کے ہر شعبہ میں عام ہو رہی ہے اس کے مقابلہ میں سخن سنجی اور سخن سرائی سے متعلق آپ کی تجاویز عملی وقعت رکھتی ہیں ہر اصلاح پر جو تنقیدی نوٹ ہیں وہ اگرچہ مختصر ہیں مگر وجہ اصلاح پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کتاب کی افادیت شاعر اور غیر شاعر دونوں کے لیے یکساں ہے۔"

مولانا قمر بدایونی کی رائے ملاحظہ فرمائیے

"یہ تصنیف مولانا سیماب کی مسلسل ادبی خدمات کے نمایاں سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہے جس میں اصلاح کی ضرورت و اہمیت اور اس کے طریقوں سے روشناس کرنے کے لئے کافی محنت اور تلاش سے کام لیا ہے۔ اصلاح کے مختلف نمونوں، اصلاحی توضیحات اور موازنۂ اصلاح کا مطالعہ ان تمام ضرورتوں کو پورا کر دیتا ہے جس کے لئے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی اور بہت سا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔"

"دستور الاصلاح" سے متعلق مزید آراء "الوارث" بمبئی کے سیماب نمبر میں مل جاتے ہیں۔

"اصلاح الاصلاح" میں سیماب کے داغ کے شاگرد نہ ہونے سے متعلق جو بھی حوالہ درج ہے وہ سنا سنایا ہے۔ تحریری طور پر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت نہیں کے برابر ہے۔ اور جہاں تک سیماب کا داغ کا شاگرد ہونے کا تعلق ہے، میں ۸ر جنوری ۶۸ء کے "ہماری زبان" میں ثبوت دے چکا ہوں مزید ثبوت کے لئے "الوارث" بمبئی کا "سیماب نمبر" ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ نیز علامہ سیماب کا ناول خوبصورت بلا عرف "آئینہ" دیکھا جا سکتا ہے جس میں داغ کے دو دواوین گلزار داغ اور آفتاب داغ میں جتنے اشعار متعلق "آئینہ" آئے ہیں یا یوں کہئے کہ دونوں دیوانوں کے جن اشعار میں لفظ "آئینہ" آیا ہے اسے تمام و کمال فرداً فرداً موقع کے ساتھ علامہ سیماب نے بیان کر دیا ہے۔

سکسینہ صاحب کو شکایت ہے کہ کسی عقیدت مند نے

مرادآبادی کی داغ سے شاگردی سے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ میں جگر کی شاگردی کی تفصیل نہیں بتا سکتا کہ آیا وہ داغ کے شاگرد تھے یا نہیں۔ لیکن یہ انکشاف ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ جگر مرادآبادی علامہ سیماب کے شاگرد تھے اور ڈیڑھ سال تک سیماب سے مشورہ لیتے رہے تھے۔" انوارشؔ کے سیماب نمبر میں صبا متھراوی فاضل ادیب اپنے مضمون "سیماب کی فن اصلاح" میں رقمطراز ہیں۔

جگر مرادآبادی جن کے گرم تغزل سے آج ہندوستان کا گوشہ گوشہ جھنک رہا ہے۔ کسی زمانہ میں مسلسل ڈیڑھ سال علامہ سیماب کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے ہیں ان کے اسی زمانہ کی ایک غزل پیش کرتا ہوں جس پر انھوں نے علامہ سیماب سے اصلاح لی ہے۔ یہ غزل خاص حضرت جگر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور اس کا عکس تحریر لیکر "شاعر" آگرہ مارچ ۴۳ء میں شائع ہوئی۔"

مذکورہ غزل جدائی ہے، بن آئی ہے، خود نمائی ہے، رسائی ہے، نارسائی ہے وغیرہ قافیہ ردیف میں ہے

(مناظر عاشق ہرگانوی)

یہ غزل کس کی ہے

۸ رفروری ۶۸ء کے شمارہ میں ایک مراسلہ بعنوان "دعوت فکر" شائع ہوا تھا جس کا جواب ۸ رمارچ ۶۸ء کے شمارہ میں ایک مراسلہ بعنوان "نثار احمد صدیقی" کے مراسلہ کے بارے میں" شائع ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے تحریر کیا ہے کہ "۱۹۶۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخوں میں ایک نسخہ "صد سخن" موجود تھا اس میں" ہونہ ہو" "آرزو نہ ہو" کی ردیف و قافیہ میں ایک سو غزلیں نقل ہیں۔ غالباً یہ کسی مشاعرہ کی روداد ہے۔ ہر صفحہ یہی غزل ناظم کے تخلص سے موجود ہے مگر مقطع میں تھوڑا سا تفاوت ہے۔ "ہر جستجو عبث جو تری جستجو نہ ہو" کی جگہ "وہ جستجو نہیں جو تری جستجو نہ ہو" لکھا ہوا ہے۔"

تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ" غزل غالب کی ہے یا ناظم کی۔؟ کیونکہ مراسلہ نگار نے آگے تحریر کیا ہے کہ" یہ غزل غالب کی تھی جو کسی مصلحت کی بنا پر مقطع میں غالب کی جگہ ناظم کر دیا گیا۔" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ غزل ناظم ہی کی ہو اور لوگ غالب سے منسوب کر رہے ہوں۔ مراسلہ نگار اپنے استدلال کے سلسلہ میں ایسے مستند حضرات کے نام پیش کریں جنھوں نے "صد سخن" دیکھا ہو۔ تب ہی کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔!

(نثار احمد صدیقی)

لفظ ڈائجسٹ

امریکہ کی مطبوعہ ڈکشنری میں لفظ ڈائجسٹ کے کئی معنی ہیں اور مرادف الفاظ جن کی فہرست منسلک ہے۔ امریکی صحافت نے اس لفظ کے مخصوص معنی قرار دے کر اس کو ایک اصطلاح بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے اردو میں اس کا انھیں معنوں میں استعمال کوئی قباحت نہیں رکھتا خصوصاً جب کہ اس کے تلفظ میں کوئی مشکل نہیں ہے۔

اب رہا اردو میں اس کا بدل تو ہماری زبان میں اس کا مطلب ادا کرنے کے لئے کئی الفاظ موجود ہیں۔ خلاصہ۔ لُبّ۔ تلخیص۔ اقتباسات۔ مجموعہ۔ لب لباب وغیرہ۔

مشاعروں کے بعد منتخبہ کلام کا گلدستہ شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ لفظ بھی ڈائجسٹ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ڈائجسٹ میں زیادہ نثر کا حصہ ہوتا ہے تو اس کو گلچیں کیوں نہ کہا جائے؟ نچوڑ سے بھی مطلب ادا ہوتا ہے لیکن یہ ثقیل چھچھورا اور رکیک معلوم ہوتا ہے۔

(سجاد مرزا)

مولانا ابوالکلام آزاد پر مضامین

ایک زیر ترتیب مجموعہ کے لئے ایسے مضامین و مقالات درکار ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے کسی پہلو سے متعلق لکھے گئے ہیں بشرطیکہ یہ مضامین پہلے کسی مجموعہ میں شریک نہ کئے گئے ہوں۔ مقالات دونوں زبانوں میں قبول کئے جائیں گے۔

مضامین اس پتہ پر ارسال کریں۔

رفعت حسینی۔ اے۔ ڈی۔ پال برادرس

جمشید پور (بہار)

ایک گذارش

(۱) مجھے مرزا غالب کی زندگی پر ڈرامہ تصنیف کرنے کے سلسلے میں اس ڈومنی کے حالات درکار ہیں جن کا ذکر مرزا غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کے خط میں اشارتاً کیا ہے۔

(۲) منشی پریم چند کے ناول گئو دان پر مکمل تبصرہ کرنے کے سلسلہ میں میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب گئو دان تصنیف کی گئی تو منشی صاحب کہاں مقیم تھے اور کیا کام کرتے تھے۔

جو صاحبان براہ راست یا بذریعہ ہماری زبان مجھے یہ معلومات فراہم کرسکیں میں ان کا احسان مند ہونگا۔

قربان

ڈی۔ اے۔ ہیرسین قربان

ایم۔ اے۔ پی۔ ٹی ریلوے

کوارٹر ۶ ج۔ ہن پور۔ مدھیہ پردیش

اردو میں سکھوں کا حصہ

میں اردو میں سکھوں کا حصہ کے عنوان سے اردو کے تمام سکھ شعرا اور ادیبوں پر جامع اور مبسوط کتاب تیار کر رہا ہوں، سکھ شعرا اور ادیبوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا کلام اور مختصر سوانح جلد از جلد ارسال فرما کر ممنون کریں۔

(امام مرتضیٰ نقوی۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد روڈ۔ نئی دہلی)

یہ قول کس کا ہے؟

(۱) الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ عربی زبان کا یہ مشہور مقولہ کس کا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حدیث ہے اگر یہ خیال درست ہے تو حدیث کے کس مجموعہ میں اسے تلاش کیا جائے مکمل حوالہ باعث تشکر ہوگا۔

یہ قطعہ کس کا ہے؟

(۲) در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

فردوسی، انوری اور سعدی کے سلسلہ میں اکثر یہ قطعہ نقل کیا جاتا ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قطعہ کس شاعر کا ہے اس سلسلہ میں فارسی ادب کی مشہور و معروف تاریخوں سے رجوع کیا گیا، لیکن یہ قطعہ تو اکثروں نے نقل کیا ہے لیکن شاعر کا نام کسی نے بھی نہیں بتایا ہے کوئی صاحب نشاندہی فرماسکیں تو کرم ہوگا۔

(سید مبارز الدین رفعت۔ میسور)

شکنتلا ڈرامہ

مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک ڈرامہ شکنتلا لکھا تھا لیکن وہ کہیں مل نہیں سکا یہ ڈرامہ کسی انگریزی ایڈیشن کا ترجمہ ہے یا مولانا کا طبعزاد ڈرامہ ہے محض نام کی یکسانیت کی وجہ سے کالیداس کے ڈرامہ کی طرف ذہن منتقل ہو رہا ہے اور یہ کس سن میں شایع ہوا ہے۔ جن حضرات کو کچھ علم ہو ان سے گذارش ہے کہ بذریعہ ہماری زبان یا براہ راست معلومات فراہم کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

(شریف الحسن عثمانی ۱۱۷۔ امراؤ گنیش گنج لکھنؤ)

دکن کی نثری داستانیں

میں دکن کی نثری داستانوں پر تحقیقی کام کر رہی ہوں، اس سلسلے میں واقف کار حضرات مندرجہ ذیل امور سے مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(۱) کیا سینٹ جارج کتب خانہ مدراس کی کتابوں کا کیٹلاگ کسی مستشرق نے شایع کیا؟

(۲) دکنی کتابوں کا ذخیرہ میسور، جامعہ سعیدیہ، انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے علاوہ اور کہاں دستیاب ہو سکتا ہے۔

(فرزانہ حمید)

ہندوستان کے شعرا سے گزارش

میں ہندوستان بھر کے تمام موجودہ شعراء کا مختصر تعارف کتابی شکل میں ترتیب دینا چاہتا ہوں۔ اس تعارف میں ہندوستان کے تمام اردو شعرا کے نام مکمل پتے۔ عمر، مشاغل۔ استاد کا نام۔ خود استاد ہوں تو تلامذہ کی تعداد۔ اور مصنف بھی ہوں تو کہ کس کس نام سے کس موضوع پر کب شایع ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں وغیرہ باتوں کا مختصراً ذکر ہوگا۔ میری کوشش ہے کہ اس تعارف میں تمام موجودہ (ہندوستانی شعراء) مقید ہوں یا کم نہ مشق شامل ہو سکیں اس لیے میری تمام شعراء ہند سے بہت مودبانہ گزارش ہے کہ وہ ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ مذکورہ بالا تفصیلات سے مجھے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں بزرگ اساتذہ کے تلامذہ سے درخواست ہے کہ اپنے ساتھ اپنے استاد کے متعلق بھی مطلوبہ تفصیلات فراہم فرما کر تعاون فرمائیں۔ امید ہے تمام شعراء کرام توجہ فرمائیں گے اور اس اہم کام میں مجھ سے تعاون فرمائیں گے۔

قمر سنبھلی ۸۴۸ نئی سڑک دہلی

انجمن ترقی اردو ہیرن پور کی خبریں

ہیرن پور میں یوم اقبال :-

ہیرن پور میں مشہور شاعر علامہ اقبال کی برسی بڑے تزک واحتشام سے مقامی "بزم جمال" انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ۲۱ر اپریل ۱۹۶۸ء کی شام میں زیر صدارت جناب سریندر سوتش ایڈیٹر بن پھول منائی گئی۔ "بزم جمال" انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی نے اپنا مضمون بعنوان "اقبال کا فلسفہ شاہین" پڑھا۔ جناب ڈاکٹر اقبال رزمی نے اپنا مضمون بعنوان "اقبال کی غزلوں کی خصوصیات" پڑھا اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں جناب کمال صدیقی، سریندر سوتش، جناب اکیلا بہاری، قیوم دانش مائل کے علاوہ دیگر شعراء نے بھی حصہ لیا۔ جناب سریندر سوتش نے اپنی صدارتی تقریر میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں جناب کمال الدین صدیقی کے شکریے کے ساتھ نشست برخواست ہوئی۔

بزم جمال کی خصوصی نشست :-

"بزم جمال" انجمن ترقی اردو ہیرن پور کی ایک خصوصی نشست بر بیرا میں جناب مولانا شمس مائل کے دولتکدے پر منعقد ہوئی مقامی ہندی و اردو کے شعراء میں جناب اوسکھی، اکیلا بہاری اور شمس مائل نے شرکت کی "بزم جمال" انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے نشست کی صدارت جناب اوسکھی نے کی۔ تمام ہندی و اردو کے شعراء نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔

جامعہ اردو کے مرکز کا قیام :-

یہاں کی مقامی انجمن ترقی اردو کی ایک نشست جناب مولانا شرافت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انجمن کے جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی نے جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کی اہمیت بتائی اور زور ڈالا کہ یہاں بھی جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کا ایک مرکز قائم کیا جائے تاکہ اردو کے شیدائی جامعہ اردو کے مختلف امتحانات میں شریک ہو سکیں اور اردو کے کاز کو تقویت بخش سکیں۔ اس سلسلے میں بالاتفاق رائے سے یہ تجویز منظور ہوئی اور جامعہ اردو کے مرکز کے سلسلے کی تمام کاروائی کا مجاز جناب کمال الدین صدیقی کو دیا گیا۔

پاکوڑ میں "یوم اقبال" :-

پاکوڑ میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شاعر مشرق علامہ اقبال کی برسی ۲۲ر اپریل ۱۹۶۸ء کو مقامی نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی ہال میں زیر صدارت جناب سید جعفر علی۔ ممبر نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی منعقد ہوئی۔ جناب کمال الدین صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ ہیرن پور بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ جناب کمال الدین صدیقی، مشتاق علی شاہد، شوکت علی۔ خلیل رمزی اور دیگر حضرات نے اقبال کی شاعری کے پہلو پر مختلف عنوانات کے تحت اپنے مضامین پڑھے۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ جناب مشتاق علی شاہد۔ خلیل رمزی اور کمال صدیقی صاحبان نے حاضرین کو اپنے کلام سے نوازا۔ آخر میں صدر موصوف کی تقریر کے بعد نشست برخواست ہوئی۔

(کمال الدین صدیقی ہیرن پور دیا پاکوڑ)

انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) کی جانب سے اردو ہفتہ کا پروگرام

انجمن ترقی اردو کے پچھلے سالانہ اجتماع منعقدہ جنوری ۱۹۶۸ء میں طے پایا تھا کہ اردو والوں کے مطالبات کو تقویت پہنچانے کے لئے نیز اس تعلق سے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی خاطر ایک اردو ہفتہ منایا جائے تاکہ ہماری ریاست میں قانونی طور پر اردو کو اس کا جائز مقام مل سکے۔

اس سلسلے میں انجمن نے طے کیا ہے کہ ۲۵ رمئی سے ۳۱ رمئی ۱۹۶۸ء کے دوران میں کسی بھی ایک دن "یوم اردو" منایا جائے "یوم اردو" کے دن خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں تلگو اور دوسری زبانیں بولنے والے بھائیوں کی بھی ہمدردی حاصل کی جائے تاکہ وہ اردو کے جائز مطالبے کی تائید کرسکیں۔ [illegible] اگر ریاستی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کو قبل از وقت اطلاع دی جائے تو وہ کوشش کرے گی کہ آپ کے [illegible] منعقد ہونے والے اجتماع میں اپنے کسی نمائندے کو بھیجے۔ جلسہ میں جو قرارداد منظور کی جائے گی اس کا مسودہ بھی روانہ کیا جائے گا۔ (حبیب الرحمٰن معتمد عمومی)

انجمن کی شاخ بنیا پوکھر کلکتہ کا غالب انعامی مقابلہ

انجمن ترقی اردو (ہند)، شاخ بنیا پوکھر کے زیر اہتمام (بطور یادگار غالب، انتخاب اشعار غالب کا ایک انعامی مقابلہ عمل میں آیا، جس میں کلکتہ کے کالجوں کے طلبہ اور طالبات نے ایک بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ مقابلے کا نتیجہ درج ذیل ہے۔ اوّل جناب محمد عارف صاحب رول نمبر ۱۴ سکنڈ ایئر بی۔ اے (آنرس) مولانا آزاد کالج۔ دوم محترمہ [illegible] صاحبہ رول نمبر ۳۹ بی۔ یو (آرٹس) خضر پور کالج سوم۔ جناب محمد حبیب صاحب رول نمبر [illegible] تھرڈ ایئر بی۔ ایس۔ سی۔ ایوننگ سکشن سریندر ناتھ کالج

(ادریس انور جنرل سکریٹری)

صدر جمہوریہ کی سالگرہ پر صحیفہ سپاس

نئی دہلی ۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے موجودہ دستور سے کشتی کو صحیح و سلامت نکال کر لے جانے سے متعلق ہندوستان کی صلاحیت پر ۔ کا اظہار کیا انھوں نے کہا کہ ملک کے تئیں عوام کی وفاداری کو متاثر کرنے کے لئے زبان پرستی، فرقہ پرست اور علاقہ پرست تحریبی قوتیں زور لگا رہی ہیں صدر جمہوریہ عالموں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ علماء صدر جمہوریہ کو ایک صحیفۂ سپاس پیش کرنے کے لئے ان کی سرکاری رہائش گاہ" راشٹرپتی بھون میں جمع ہوئے تھے صحیفۂ سپاس ڈاکٹر ذاکر حسین کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع کے لیے تیار ہوا تھا۔ بارہ موضوعات کی کتاب کو دو ایڈیشنوں میں بانٹ دیا گیا ہے ایک ایڈیشن اردو میں ہے اور دوسرا انگریزی میں یہ کتاب ہندوستان اور بیرونی ممالک کے عالموں اور ماہرین تعلیم کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کے مختلف گوشے اجاگر کئے گئے ہیں انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر ریڈ ٹ ہردے ناتھ کنزرو نے کلیٹی اندر ذاکر کی جانب سے جسے ایک سال پہلے قائم کیا گیا تھا، صحیفۂ یہ پیش کیا۔

(سیاست ۱۰)

حکومت یوپی کی طرف سے اردو میں خبر رسانی کے نوٹس شائع کرنے کا فیصلہ

لکھنؤ ۔ حکومت اتر پردیش نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست میں جن تحصیلوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل آبادی کا دس فیصد یا اس سے زیادہ ہو گی وہاں داخل خارج کے مشتہری اشتہار ہندی کے علاوہ اردو میں بھی دئے جائیں گے اب تک یہ مشتہری صرف ہندی میں ہوتی تھی ۔ ریاست کے بارہ ضلعوں میں ۳۲ ایسی تحصیلیں سرکاری اعداد و شمار کے بموجب ہیں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فیصدی یا اس سے زیادہ ہے۔ تحصیلیں یہ ہیں ۔

ضلع بجنور ۔ نجیب آباد، بجنور، نگینہ اور دھامپور۔

ضلع مرادآباد ۔ حسن پور، سنبھل، امروہہ، ٹھاکردوارہ، مرادآباد، اور بلاری۔

ضلع رامپور :۔ سوار، بلاسپور، رامپور، اور شاہ آباد۔

ضلع پیلی بھیت :۔ پیلی بھیت اور پورن پور۔

ضلع بریلی ۔ بھیڑی اور بریلی

ضلع سہارنپور :۔ سہارنپور، نکڑ اور رڑکی۔

ضلع مظفر نگر ۔ کیرانہ اور مظفر نگر

ضلع میرٹھ :۔ سردھنا، موانا اور ہاپوڑ۔

ضلع بہرائچ :۔ نان پورہ

ضلع گونڈہ :۔ بلرام پور اور اترولہ

ضلع بارہ بنکی :۔ فتح پور

ضلع بستی :۔ ڈومریا گنج اور نوگڈھ

سیفیہ کالج میں اردو ایم اے کا کلاس کھل رہا ہے

بھوپال ۳ رمئی ۔ معلوم ہوا ہے کہ سیفیہ ڈگری کالج بھوپال میں نئے تعلیمی سال سے اردو ایم ۔ اے کا کلاس کھلنے والا ہے۔ سیفیہ ایجوکیشنل سوسائٹی نے اپنے حالیہ جلسہ میں یہ فیصلہ کیا ہے۔

سیفیہ کالج بھوپال کا پرائیوٹ کالج ہے جس میں اردو ایم اے کا کلاس کھل رہا ہے۔ قبل ازیں سیفیہ کالج میں انگلش، اکنامکس اور ریاضی کے ایم ۔ اے اور ایم کام اور ایل ایل بی کے کلاسیز کھل چکے ہیں پولیٹیکل سائنس میں بھی ایم ۔ اے کلاس کھلنے کی توقع ہے

اردو حلقوں میں ایم ۔ اے اردو کلاس کھلنے کی خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سیفیہ کالج کا شعبہ اردو گذشتہ کئی سال سے نہایت مستعدی محنت اور کوشش کے ساتھ نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے ایم ۔ اے کھلنے سے اس شعبے کے اور زیادہ ترقی کے امکانات ہیں اس سلسلہ میں کالج کے سکریٹری جناب فخر الدین اور شعبہ اردو کے انچارج پروفیسر عبد القوی دسنوی کی خدمات قابل قدر ہیں واضح رہے کہ بھوپال کے گورنمنٹ حمیدیہ کالج میں کئی سال قبل سے ایم اے فارسی اردو کے کلاسیز کھل چکے ہیں اور مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج میں گذشتہ سال سے اردو ایم ۔ اے کھل چکا ہے۔

(افکار)

اردو میں حلف برداری

نئی دہلی راجیہ سبھا کے لیٹ کا حلف آج ۶۸ ممبروں نے جو یا تو حال ہی میں منتخب ہوئے ہیں یا صدر نے ان کو نامزد کیا حلف لیتے ہوئے ممبروں نے ہندی، انگریزی، تامل، مرہٹی، ملایالم کنڑ، سنسکرت، اڑیہ اور اردو کا استعمال کیا۔

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ

نئی دہلی ۹ رمئی۔ لسانی اقلیتوں سے متعلق کمشنر نے اپنی آٹھویں رپورٹ میں جو راجیہ سبھا میں پیش کی گئی بتایا ہے کہ ریاستی حکومتوں کو لسانی اقلیتوں کی شکایات پر فوراً کارروائی کرنا چاہئے کمشنر جناب مارا کاتھم چندر شیکھر نے رپورٹ میں بتایا ہے کہ کئی معاملات میں ایسا ہوا کہ لسانی اقلیتوں کی شکایات اور ان پر ریاستی حکومتوں کے فیصلوں کے درمیان وقفہ کافی رہا واقع ہوا جس سے اقلیتی لسانی گروپوں کے ذہنوں میں مایوسی کا احساس پیدا ہوا۔ فوری کارروائی کی راہ میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو گروپوں کے مابین باہمی مفاہمت کو فروغ دینے نیز قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کے مفاد میں مٹا دینا چاہیے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ لسانی اقلیتوں کو اپنے حقوق کا نیز ریاست و ملک کے [illegible]

...کا تحفظ کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح اکثریتی لسانی گروپ بھی ریاست کی ہمہ گیر ترقی کے لئے اقلیتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ احساس کرنے لگے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ تعلیم کے میدان سرکاری مقاصد کے لئے علاقائی زبانوں کے استعمال اور ریاستی ملازمتوں میں بھرتی کے معاملہ میں لسانی اقلیتوں کو دئے جانے والے تحفظات کو جامۂ عمل پہنانے میں کس قدر پیش قدمی ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں پنجاب کی حکومت نے تحفظات کے بارے میں جو ہدایتیں ساری ریاست میں متفقہ اسکیم کے مطابق نہیں دی ہیں کمیشن نے افسوس کے ساتھ یہ بات تحریر کی ہے کہ حکومت آسام نے ۱۹۶۲ء میں کی جانے والی اس شکایت پر اپنا تبصرہ نہیں بھیجا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے لئے قائم ۱۱۶ اسکولوں کو سرکاری گرانٹ نہیں مل رہی ہے۔ (سیاست)

حکومت پنجاب کا ا[illegible] میں اشتہارات شائع کرنے کا فیصلہ

چنڈی گڑھ ۱۰ مئی۔ پنجاب میں ۱۳ اپریل سے گورمکھی رسم الخط میں پنجابی زبان [illegible] جانے سے صوبائی حکومت نے اخباروں کو اشتہارات دینے کی [illegible] پالیسی بدل دی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ ۳۰ فیصدی اشتہار انگریزی [illegible] ل کو ۲۰ فیصدی پنجابی اخباروں کو اور پندرہ پندرہ فیصدی اشتہار ہندی اور اردو اخباروں کو دیئے جائیں گے۔ حکومت [illegible] نے یہ بھی طے کیا ہے کہ پنجابی اخباروں کی حوصلہ افزائی کے لئے [illegible] جیسے پنجابی اخباروں میں شایع ہونے چاہئیں بشرطیکہ انگریزی اخباروں میں ان کی اشاعت ضروری نہ ہو۔ (سیاست)

لسانی مسئلے کا واحد حل سہ لسانی فارمولے کا نفاذ

نئی دہلی: نائب وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے کہا کہ لسانی مسئلے کا واحد حل سہ لسانی فارمولا ہے۔ دہلی سے شایع ہونے والے تامل ماہنامہ "لسانی ایزراہی" کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ [illegible] بات ایک انتہا پر پہونچ کر گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ دس سال میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اور تمام ریاستوں کو کسی نہ کسی شکل میں سہ لسانی فارمولا نافذ کرنا ہوگا۔ لسانی مسئلہ پر انتہا پسندی کے نظریہ کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کچھ کانگرس لیڈر تک اس انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مدراس میں مجھ بہت سے ایسے لوگ ملے جو مرکز کی لسانی پالیسی سے متفق تھے اور انھوں نے کسی اختلاف کا اظہار نہیں کیا وہ جانتے ہیں کہ یہ پالیسی ان کے خلاف نہیں ہے۔

انھوں نے کہا کہ "ملک میں ایک طرح کی فضا اندر ہی اندر پنپ رہی ہے جو اکثر فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں سامنے آتی ہے ہم ان عناصر سے لڑ رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اس میں کامیاب ہوں گے۔ (قومی آواز)

مجلس اردو بھوپال کی ادبی نشست

بھوپال ۱۴ مئی۔ شعری بھوپال کے ایک مشہور شاعر ہیں چنانچہ ابھی حال میں شعری بھوپالی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مجلس اردو بھوپال نے ایک جلسہ میں انھیں "تاج الشعرا" کا خطاب پیش کیا۔ اس جلسہ کی صدارت انجمن ترقی اردو شہر بھوپال کے صدر جناب ایم عرفان نے کی۔ جلسہ میں انجمن ترقی اردو بھوپال کے سکریٹری جناب آفاق احمد نے شعری بھوپالی کی شاعری پر جامع تبصرہ کیا۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ ہوا جس میں مندرجہ ذیل شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

تاج الشعرا حضرت شعری بھوپالی، حضرت گوہر جلالی مولانا شمس بھوپالی، عرش صدیقی، جناب مقصود عرفان۔ جناب شاہد بھوپالی، جناب ظفر نعیمی، مرتضیٰ علی شاد، عشرت قادری، کامل بہزادی، دنا صدیقی، نور محمد قمر، نجیب رامش، عبد المتین نیاز، رشید انور، عبد المجید درد، نصرت صدیقی، ذوق بھوپالی، ظفر صہبائی، سرفراز دانش، سنتوش سنگھ انجم، مسعود رضا، ثنا بھوپالی، خاطر الہاشمی، مسعود ہاشمی، شفیق عالم اسحاق ادیب، سلیم قریشی عارف،

(اسحاق ادیب سکریٹری)

باقی صفحہ ۶ سے آگے

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
"اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا
ٹوٹی دھنک کے ٹکڑے لے کر بادل روتے پھرتے ہیں
کھینچا تانی میں رنگوں کی سورج بھی ہے شامل کیا

ابھی دو ایک ماہ پہلے کسی رسالے میں یہ اعلان نظر سے گزرا تھا کہ پرویز نیر کا نیا مجموعۂ کلام "تثلیث حیات" کے نام سے شائع ہونے والا ہے اس مجموعے کی اشاعت ہم سب پر قرض ہے۔

[illegible] ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا

R. No. 8186/57 | Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

Date
1-8-.5-22

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ مئی ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو دوستوں سے خطاب

اس عنوان سے ایک کتابچہ جناب ایم - اے حسن ---- ضلع چمپارن بہار کی طرف سے ہمیں موصول ہوا ہے اور ہم سے اس پر اظہار خیال کی خواہش کی گئی ہے۔

ایم - اے حسن چمپارنی کا نام "ہماری زبان" کے پڑھنے والوں کے لئے نیا نہیں۔ موصوف اردو رسم خط کی اصلاح پر برابر زور دیتے رہتے ہیں اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک کے ہماری زبان میں ان کے مضامین اور ان پر بحث لوگوں کو ابھی یاد ہو گی۔ اس رسالے میں موصوف نے تمہید کے طور پر اردو دوستوں کو نہایت خلوص سے کچھ عملی کام کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے ہمیں ان کے درج ذیل خیالات کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ان پر غور کریں۔

اردو زبان کی ہر دلعزیزی کا ہر شخص معتقد ہے۔ اس کے الفاظ کی چاشنی سب کو مرغوب ہے اور اس کے اشعار کے حسن دلربائی کی بھی داد دیتے ہیں۔ اردو کی تائید میں ایک فلک شگاف نعرہ لگانے والے، اس سے زبانی ہمدردی جتانے والے، اس کی حفاظت کے لئے خون بہانے اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا وعدہ کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔

لیکن اردو کی ترویج و ترقی کے لئے خون کے بدلے پسینہ بہانے والوں، زبانی ہمدردی جتانے کے بدلے کچھ ٹھوس کام کرنے والوں اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے بدلے چند پیسے خرچ کرنے والوں کی بڑی کمی ہے۔

اردو میں مختلف علوم و فنون کی معیاری کتابیں نہیں ملتیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ انگریزی یا ہندی کتابوں کے محتاج رہتے ہیں مختلف پیشہ میں لگے لوگوں کو مطالعہ کے ذریعہ اپنے پیشے کے متعلق تازہ ترین اور معیاری معلومات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا، درسی طور پر اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں سہل الحصول نہیں سمجھی جاتی، اردو طباعت ہماری بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی؛ ہمیں تصاویر سے آراستہ انگریزی فیچر پر اخبار نہیں ملتے، کسی خاص فن پر اعلیٰ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے اردو رسائل نہیں چھپتے اور آج کل اخبار و رسائل پڑھنے سے ہمیں سیری نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں کہ خون کے بدلے پسینہ بہا کر اردو کی تمام خامیاں دور کی جائیں اور اس کو دنیا کی ایک اچھی زبان بنا دیا جائے۔

اس لئے اگر واقعی ہمیں اپنی زبان محبوب ہے اور ہم اس کو پوری آن بان کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو دوسروں کا شکوہ چھوڑ کر صرف یہ سوچئے کہ آپ اپنے حدود کے اندر اردو کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ادیب ہیں تو ہر فن اور ہر معیار کی اچھی کتابیں شائع کیجئے اگر آپ مدرس ہیں تو طریقہ ہائے تعلیم کی ساری خوبیاں اپنا کر اردو کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں مدرسی طور پر آسان سے آسان تر بنائیے اگر آپ ناشر ہیں تو تکنیکی طور پر اردو طباعت کو آسان اور سستا بنائیے۔ انگریزی معیار پر خوبصورت اخبار، رسائل اور کتابیں چھاپئے۔ اگر آپ کسان ہیں تو اپنے گاؤں کے ہر بچے کو مقامی سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھائیے۔ امداد باہمی کے اصول پر شبینہ اور [illegible] مدرسے کھول کر بالغ ان پڑھوں کو پڑھائیے۔ کتب خانے کھول کر اچھی کتابیں خریدئیے۔ مختلف اخبارات، رسائل اور دلچسپ کتابیں دیکر لوگوں میں مطالعہ کا شوق بڑھائیے الغرض اگر آپ کو اردو کی خدمت کرنے کا کوئی بھی موقع نہیں ہے تو کم از کم سال میں ایک دو اخبار اور چند عمدہ کتابیں ہی خرید کر اردو طباعت کی ہمت افزائی کیجئے۔ اگر آپ کی اقتصادی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی تو چائے پان اور سگرٹ وغیرہ جیسے غیر ضروری اخراجات کم کر کے مطالعہ کے ذریعہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرتے رہئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اردو کا حلقہ بڑھے گا اور ذاتی مطالعہ

ک[illegible] کے بھی ادبی شہرت حاصل کرسکیں گے"

[illegible] تمہید کے بعد اردو کی ترقی کی راہ میں کچھ [illegible] رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے اور مروجہ رسم خط کی ترقی اصلاح پر زور دیا ہے ہم تو برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ اردو کے رسم خط کو ترک کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اس میں موجودہ دور کی تعلیمی اور طباعتی ضروریات کے تحت چند اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ پھنبروی صاحب کی یہ تجویز نئی نہیں ہے کہ الف، بے، جیم، دال کو آ، با، جا، دا، یعنی ان کی صرف آواز کے مطابق پڑھا جائے جیسا ہندی میں ہے بعض دوسرے حضرات نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ اس کے متعلق معلم اور ماہرین سانیات ہی صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں پھنبروی صاحب نے اعراب کی تیرہ شکلوں کے استعمال پر زور دیا ہے مگر یہ بھی سوچنا ہے کہ اعراب دیئے ہی عام تحریر میں نہیں دئے جاتے اور ان کے بڑھانے سے تحریر اور طباعت میں دشواریاں بڑھ جانے کا بھی امکان ہے۔ جہاں تک دوسری زبانوں کے الفاظ کو صحت کے ساتھ لکھنے کا سوال ہے، اس میں بھی دوسری زبان کی صحیح آواز ادا کرنا مشکل ہے اور پھر ہر زبان دوسری زبان سے الفاظ لیتی ہے تو اس میں اپنی آوازوں کے مطابق کچھ تبدیلی کر ہی لیتی ہے۔ انگریزی بھی فرانسیسی الفاظ کا تلفظ اپنے طور پر کرتی ہے۔ غیر ملفوظی حروف کو لکھنے میں استعمال نہ کرنے کا مشورہ ضرور قابل قبول ہے۔ اس طرح کرسی کے مسئلے کو بھی حل کرنا ضروری ہے اس سلسلے میں سجاد مرزا کے معیاری رسم خط کو اپنایا جائے اور محض خوش نمائی کے بجائے افادیت اور یکسانیت پر زور دیا جائے تو بہتر ہے۔ س۔ ص۔ ث کے بجائے صرف س کا استعمال اور اردو کے قاعدوں کا جدید تعلیمی اصولوں کے مطابق مرتب کرنا یہ دونوں باتیں بھی غور طلب ہیں۔ ہماری زبان کے پڑھنے والے یہ رسالہ مصنف سے طلب کرسکتے ہیں اس بحث کے لئے ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ انجمن کی دیرینہ خواہش ہے کہ اردو دوست اس سلسلے میں کوئی عملی قدم جلد اٹھائیں ہماری رسم خط کمیٹی ایک تجاویز ہماری زبان کے ذریعہ جلد اردو دوستوں کے سامنے پیش کرے گی۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا لکھا ہوا نایاب مسودہ

لکھنؤ ۱۱ مئی۔ کانپور میں مرزا غالب کی لائبریری سے ایک نایاب مسودہ ملا ہے اس کا نام "تقویت الایمان" ہے اس پر مرزا غالب کے دستخط ہیں اور ان کی لائبریری کی مہر ثبت ہے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ مسودہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا لکھا ہوا ہے۔ (سیاست)

انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے ممبر ڈاکٹر تاراچند کو اعزاز

تہران ۱۰ ہندوستان کے مشہور مورخ اور ادیب ڈاکٹر تاراچند کو تہران یونیورسٹی کی طرف سے اعزاز دیا گیا۔ اس سلسلہ میں فردوس ہال میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ ڈاکٹر تاراچند کو یہ اعزاز ان کی فارسی خدمات کے صلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند ایران میں ہندوستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ (الجمعیۃ)

قیصر تمیم

رباعیات

کہتا [illegible] میخانے کی حالت ساقی
کی[illegible] ہے رندوں کے تدور ساقی
بہتر [illegible] کے بجائے ان کو
[illegible] بھر بھر کے محبت ساقی

[illegible] اگر پائے اسے
[illegible] ہے جو یہ ٹھکرائے اسے
[illegible] ہوتا ہے دل اے قیصر
[illegible] نہ لگ جائے اسے

[illegible] کے سینے میں یا جوش آئے
[illegible] دست آئے
[illegible] کا ہم کا [illegible] قیصر
بے ہوش اگر ہوں تو ہمیں ہوش آئے

سائنس کی تعلیم علاقائی زبانوں میں

کلکتہ ۱۳ مئی۔ یہاں پر مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگن سین نے بتایا کہ سائنس کی تعلیم کا علاقائی زبانوں میں انتظام کیا جارہا ہے انھوں نے کہا کہ سبھی ریاستوں نے کہا ہے کہ مادری زبانوں میں سائنس پڑھائی جانی چاہئے۔ (الجمعیۃ)

مولانا ابوالکلام آزاد "ایک کتاب کی اشاعت

رام پور کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی طرف سے "مولانا ابوالکلام آزاد" کے نام سے مولانا پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی کتاب شائع ہوگئی ہے یہ عابد رضا بیدار کی تصنیف ہے جس میں شخصیت، سوانح، تصانیف، صحافت، سیاسی افکار، دینی افکار اور نوادر کے تحت ان کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ضمیمۂ الہلال، ترجمان القرآن، غبار خاطر اور مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف سے دلکش انتخابات بھی شامل اشاعت ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

۱۶ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی منانے کی سارے ملک میں زور وشور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ غالب کی تاریخ وفات ہے، تاریخ پیدائش نہیں۔ صد سالہ برسی کی یہ تقریب اس لئے جشن منانے کی نہیں بلکہ یہ مشرق کے اس مایہ ناز شاعر کی یاد میں ذکر نیاز و عقیدت کی مستحق ہے۔ اس موقع پر ہمیں غالب کے نام اور کلام کی روشناسی اور اس کے فکروں کی پبلسٹی اور اشاعت میں عملی قدم اٹھانا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے مختلف ادبی و ثقافتی مرکزی و ریاستی اداروں کی طرف سے تقریب صد سالہ برسی غالب کے پروگرام میں خاطر خواہ حصہ لینے کا متواتر اعلان ہو رہا ہے۔ ملک کا ہر چھوٹا بڑا ادارہ اپنی بساط کے بموجب اس تقریب کو کامیاب بنانے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ پر وقت کم ہے، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اساس وسیع اور سود مند منظم پروگرام مرتب کریں جو غالب کی شخصیت اور اس کے آرٹ کی نشاندہی میں ہر طرح مفید ثابت ہو۔ میرے ذہن میں اس نوع کے ایک ہمہ گیر پروگرام کا خاکہ ہے جسے میں غالب پرستوں کے سامنے رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

غالب کی شخصیت بڑی رنگا رنگ اور ہر دل عزیز تھی ہر شخص کو اپنے مذاق کے بموجب غالب سے کچھ نہ کچھ مقدر ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ہمارے شعری ادب میں نظیر اکبر آبادی اور نثری ادب میں پریم چند کے بعد میں سمجھتا ہوں، غالب وہ پہلے قلم کار ہیں جس کے افکار و گفتار کے انمول خزانے سے ہر ہوش مند اور درد مند سبق حاصل کر سکتا ہے۔

غالب کی تہہ دار شخصیت کے مختلف رخ سے ارباب نقد ناشناس نہیں اور اہل نظر غالب کی باکمال قلم کاری کے معترف ہیں اس وقت توجہ طلب امر عوام، خصوصاً ملک کے غیر اردو داں حلقے میں اردو کے اس عظیم شاعر کو متعارف کرانے کی سعی ہے۔ اس پس منظر میں تقریب صد سالہ برسی کے پروگرام کو بحیثیت مجموعی ہمیں دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔

(الف) عوامی سطح کے تحریکی پروگرام۔

(ب) یونی ورسٹی اور تعلیمی اداروں کے علمی اور ثقافتی پروگرام۔

(الف) یہ حصہ دوسرے سے زیادہ ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ غالب سے عوام کو روشناس کرایا جائے (عوام سے مراد ان پڑھ جنتا نہیں بلکہ کم خواندہ و نیم خواندہ افراد ہیں) اور ان کے دل دماغ میں غالب کے لئے جگہ بنانے کی کوشش کی جائے اسی مقصد کے تحت اس پروگرام کو مقبول و مفید بنانے کے لئے حسب ذیل ITEMS شامل کئے جائیں۔

(۱) غالبی قوالی — کلام غالب کی سہل و سادہ غزلوں کی قوالی جس میں پیشہ ور قوالوں کے علاوہ خوش گلو طلبہ بھی حصہ لیں۔

(۲) مقابلۂ قوالی — ان غزلوں کی دو گروپ کی قوالیاں جس میں غالب اور ذوق دونوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

(۳) غالب اور ذوق کے ترنم کردہ سہروں کی خوش خوانی (RECITATION)۔

(۴) غالبی تمثیل — غالب کے حالات زندگی کے اہم و دلکش واقعات کی ٹیبلو پیش کش جو مندرجہ ذیل موضوعات سے متعلق ہو —
غالب کے روز و شب۔ دہلی دلیس اور غالب۔ انقلاب ۱۸۵۷ء اور غالب۔ غالب اور اہل فرنگ۔ غالب کے غیر مسلم مربی و محسن اور شاگرد۔ غالب اپنے ہمعصر شعراء کی محفل میں۔

(۵) غالبی نمائش — غالب کے حالات زندگی مرقعوں اور خاکوں میں۔ غالب کی مختلف دور کی تحریریں۔ غالب کی تصنیفات (نمائش میں پیش کئے جانے والے تمام نقشے غیر اردو رسم الخط میں بھی تیار کئے جائیں — انجمن ترقی اردو ہند اگر اس نوع کے بڑے بڑے چارٹ طبع کرائے تو مناسب ہوگا۔)

(۶) غالبی بیج اور غالبی پرچیاں — پلاسٹک یا دبیز کاغذ پر خوبصورت بیج اور پرچیاں تیار کرائی جائیں، جن پر ملک کی مختلف زبانوں میں غالب کا ایک شعر اور غالب کی تصویر مع تاریخ پیدائش و وفات درج ہو۔ یہ بیج اور پرچیاں عشرۂ غالب میں نہایت سستے داموں میں ہر ریاست میں فروخت کی جائیں اور یوم غالب میں ہم انہیں استعمال میں لائیں۔

(۸) غالبی طغرے — غالب کے مختصر اقوال یا نثری اقتباس اشعار خوبصورت پلاسٹک یا چوبی تختیوں پر [illegible]

فریم کرائے جائیں جنھیں غالب پرست اپنے کمروں کی زینت بنائیں۔

(۸) فلمی شو۔ مشہور فلم ساز ڈائرکٹر سہراب مودی کی تیار کردہ فلم "مرزا غالب" کی متعدد کاپیاں تیار کرائی جائیں اور یوم غالب کے موقع پر انھیں مفت دکھایا جائے

(۹) مشاعرے۔ ہفتۂ غالب یا یوم غالب کے موقع پر ہر جگہ مشاعرے ہوں۔

(ب) یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں کے ادبی و ثقافتی پروگرام۔ یہ پروگرام عوامی سطح کا نہیں۔ اس پروگرام کا مقصد غالب شناسی نہیں بلکہ غالب کے فکر و فن کی غیر ملکی پیش کش اور ملکی اشاعت ہے۔ اس مقصد کے تحت حسب ذیل ITEMS شامل ہوں گے۔

(۱) اسکول اور مدرسوں میں کلام غالب پر مشتمل بیت بازی کا انعامی مقابلہ۔

(۲) کالجوں میں غالب کی حیات و سیرت سے متعلق ادبی و علمی مقالات، جن میں ایسے موضوعات پر روشنی ڈالی جائے مثلاً، غالب اور لال قلعہ، غالب اور کلکتہ، غالب کا راشیدہ فلر استاد، ملا عبدالصمد، غالب اور حالی، غالب کے ہم عصر۔ وقائع، غالب تلمیذوں کی صف میں غالب کی تیع رانی۔

(۳) غالب کی حیات اور شاعری سے متعلق مخصوص انعامی نثری مقابلے، جس میں صرف طلبہ حصہ لیں۔

(۴) غالب کی حیات اور شاعری پر بہترین ادبی ڈرامے کا انعامی مقابلہ، جس میں طلبہ شامل نہ ہوں۔ انعام کی رقم نہایت معقول رکھی جائے اور انعام میں صرف وہ مطبوعات دی جائیں جو "غالبیات" پر مشتمل ہیں۔ بہترین ڈرامے کو مختلف ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور ان کی اشاعت کی جائے۔

(۵) غالب کے رنگ میں طرحی مشاعرے اور غالب کی غزلوں کی تضمین۔

(۶) مختلف ملکی زبانوں میں انتخاب کلام غالب کے ترجمہ کی اشاعت

(۷) عالمی زبانوں میں انتخاب کلام غالب کے ترجمہ کی اشاعت۔

(۸) غالب کی تمام تخلیقات کے مجموعہ کی اشاعت جو کئی جلدوں پر مشتمل ہو۔

(۹) دہلی میں غالب کی آخری قیام گاہ (جہاں ان کی وفات ہوئی) کی نگہداشت وغیرہ۔

(۱۰) ہفتۂ غالب میں ریڈیائی مذاکرے اور لیکچر کے پروگرام۔

(۱۱) ڈاک کے ٹکٹ پر غالب کی تصویر کی اشاعت۔

ان تفصیلات کو اتمام تک پہنچانے اور انھیں مقبول بنانے میں حکومت سے زیادہ ہمیں اپنے زور بازو کو دیکھنا ہوگا۔ ان تمام ادبی اور ثقافتی تمثیلوں کی تصنیف و تالیف ہمارے کام کی ابتدائی منزل ہے۔ اس طرف ہمارے اہل قلم کو فوراً توجہ دینی چاہئے۔ پمفلٹ اور طغرے کی تیاری میں ملک کے مقتدر کاروبار پیشہ اردو دوست حضرات ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ پروگرام کے دوسرے ITEMS کے سلسلے میں ہمیں انجمن ترقی اردو ہند، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، انجمن اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، ادارۂ تحقیقات ادبیہ پٹنہ جیسے مشہور اداروں کے علاوہ علی گڑھ، دہلی، عثمانیہ اور کشمیر کے جامعات سے خاطر خواہ اشتراک و تعاون حاصل ہو سکتا ہے

کتابیں ملیں

مسیح کشمیر میں۔
مصنف۔ عزیز کاشمیری
ناشر۔ روشن پبلیکشنز سری نگر
صفحات۔ ۶۹ قیمت۔ ایک روپیہ

نغمۂ شعور:۔
مصنف۔ عبدالمتین نیاز
ناشر۔ مرکز ادب۔ بھوپال
صفحات:۔ ۱۱۲، قیمت:۔ دو روپے

تکلف برطرف:
مصنف:۔ مجتبیٰ حسین
ناشر:۔ حلقۂ ارباب ذوق۔ حیدرآباد
صفحات:۔ ۱۶۰، قیمت:۔ تین روپے

سورج کا شہر:۔ (مجموعہ کلام)
مصنف۔ شہاب جعفری
ناشر:۔ ممتاز دارالنشر ۱۰/A ماڈل ٹاؤن دہلی
صفحات:۔ ۲۴۷، قیمت:۔ ۶ روپے

شاعر:۔ شمارہ ۲ و ۳ ۱۹۶۸ء
(افسانہ و ڈرامہ نمبر)
مرتبین:۔ اعجاز صدیقی و چندر ناتھ
ناشر:۔ مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۲۶۵ بمبئی ۳

ڈاکٹر ریاض الحسن

مرزا حسین بیگ جرار لکھنوی

(گذشتہ سے پیوستہ)

شیخ و زاہد دونوں تھک تھک کر گرے اٹھ اٹھ کے | عاشقوں نے طے کیا کوچہ فنا فی اللہ کا
دائما آتا ہے یہ ثابت بحمداللہ مجھ کو صاف صاف | مرتبہ دل کا زیادہ ہے کعبۃ اللہ کا

مبارک حسرت ترک جہاں اہل تنعم کو[1]
اٹھا دروںیش حب دنیا سے خالی ہو ریا چھوڑا

نہ مڑ کر رہ نوردان عدم نے اک نظر دیکھا[2]
میں پیچھے قافلے والوں کے چلّاتا کیا کیا کیا

ترے در دیش میں ہے ساتھ استغنا کے حشمت بھی[3]
بغل میں بوریا ہے پاؤں میں تخت سکندر ہے

خالص تغزل (PURE LYRICISM) اور رومانویت ROMANTICISM سے بھرپور اشعار بہت بلند پایہ ہیں۔ ان اشعار کی مدد سے جرار کی غزل گوئی اور اس کی تکنیک کا صحیح اندازہ لگانا ہرگز دشوار نہیں۔ مختلف مضامین پر مشتمل یہ اشعار قابل غور ہیں ؎

چھوٹ کر اپنے روتے ہیں گے تلووں کے[4]
لطف یاد آتا ہے جب بادیہ پیمائی کا

دشت جنوں میں پائے برہنہ کا رنج کیا[5]
تلوے کف آبلوں نے کئے نوک خار سے

دشت غربت میں ہوا سے جو بگولے اٹھے[6]
تیرے عریاں نے یہ جانا کہ قبائیں آئیں
ناز و انداز دکھانے لگیں حوریں اپنا
نہ خنجر جو تری یاد ادائیں آئیں

بعد میرے مرے ساقی کو جو آئی مری یاد[7]
بارش اشک سے چھلکا دیا پیمانہ کو
یاں تو اک شکل ہے واں کچھ نہیں آنے کا نظر
شیخ مسجد نہ بنا توڑ کے بت خانہ کو

شرمگیں قتل سے عاشق کے نہ ہوئے قاتل[8]
میرے سر پر مری آنکھوں پہ ندامت تیری
دیکھئے حسن تعلیل کی یہ مثال کتنی نازک ہے ؎
نہیں تبسم ہے یہ راتوں کو جو پھولوں پہ گری ہے[9]
کسی کے غم میں یہ آنسو گرے ہیں چشم انجم سے
اسی خیال کو عہد حاضر کے مشہور شاعر دل شاہ جہانپوری نے اس طرح نظم کیا ہے ؎
چمن والوں نے شبنم کہہ کے پردہ رکھ لیا ورنہ[10]
پسینہ آگیا پھولوں کو فریاد عنادل سے

جرار کے یہاں غزل کے روایتی مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں مگر ان کا مخصوص انداز بیان اور طرز فکر انھیں پامال اور فرسودہ مضامین کو ایک ندرت اور ایک تازگی بخش دیتا ہے مثلاً ؎

کیا ہم قریب حضرت زاہد یہ آ گئے[11]
کیوں معتقد ہے نہ کسی بادہ خوار کے
شانہ کا ہے حال پریشاں مری طرح
آفت میں پھنس گئی ترے گیسو سنوار کے

فلسفۂ گناہ اور عفو و کرم سے متعلق یہ اشعار قابل غور ہیں ؎

اطہر عزیز

غزل

یہ اعتراف تھا ہم آ گئے اجالے میں
چھپے تھے ورنہ ہزاروں ہی غار رستے میں
ذرا پکارتی رہنا مجھے بھی گردش لو
میں کھو نہ جاؤں کہیں زندگی کے میلے میں
وہی اندھیرے نے ہیں رفیق جادۂ زیست
گلے ملے تھے کبھی جن سے ہم جو دھوکے میں
روش روش یہ جو رقصاں ہوا اگ شعلوں کا
کشش کہاں سے پھر آئے دعا کے لمحے میں
حسین شب سے سیاہی سمیٹ ڈالو!
ہزاروں راز نہاں ہیں سحر کے سینے میں
نہ دل کی آگ ہے بھڑکی ہے اور بھڑکے گی
تلاش کر سکوں اور وہ بھی شعلے میں
مجھے سکھا دے نہ آداب ضبط غم یارو
کہ میری عمر کٹی ہے غموں کے سائے میں
نہ کوئی سایہ، نہ آہٹ، نہ نقش پا اطہر
کسے پکارتے رہتے ہو تم اندھیرے میں

---

[1] دیوان جرار صفحہ ۷
[2] " " " ۳۴
[3] " " " ۱۴
[4] " " " ۴۰
[5] " " " ۹
[6] ۹۳

[7] دیوان جرار صفحہ ۷۱
[8] " " " ۸۰
[9] " " " ۸۶
[10] " " " ۸۶
[11] جرار کے شعر سے یہ شعر کہیں زیادہ بلند ہے۔ راقم
[12] دیوان جرار صفحہ ۹۳

نا تماں ہیں آپ بھروسہ زہد و عبادت پہ اہلِ زہد
یاں آسرا ہے رحمتِ پروردگار کا

میں وہ ہوں رند اے زاہد جہنم سرد ہو جائے
گرے گر ایک بھی قطرہ مرے اشک ندامت کا

مری رندی وہ مستی، بادہ نوشی خوب کام آئی
سہارا اہلِ دوزخ کو ہے میرے دامن تر کا

لطیف مزاح اور خندہ زیرلب کی مدد سے شاد بیگناہ کا یہ انوکھا طریقہ ملاحظہ ہو ؎

گنہ نہ کرنے تو کس طرح بخشے جاتے ہم
سبب نجات کا پروردگار کیا کرتے

مرے گناہ جو ہوتے نہ بار سے تا سر
تو حاسبانِ عمل کیا شمار کیا کرتے

کبھی زیادہ دل لگی کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اس طرح کے اشعار نظم ہوتے ہیں ؎

ہوا سینہ سے دل غائب ہمارا انجمن میں
نگاہیں کس کو چوری یاں کوئی جانا نہ آتا ہے

دل مرا واپس کرو بوسہ کا یا وعدہ کرو
فیصلہ پہلے سے ہو جائے زر تحواہ کا

دل کو ملتا ہے مرے قند مکرر کا مزہ
کیوں نہ ہو یار کی لکنت دمِ تقریر پسند

دیکھئے طنز کا لہجہ ذرا مدھم کر دیجیے ہے۔ شعر کتنا تیر و نشتر بن گیا ہے

گھر ترا غیر سے خالی ہے جیسی آج کی رات
ہو اجازت تو میں رہ جاؤں یہیں آج کی رات

حرار کے کلام پر استاد اسیر کی زبردست چھاپ ہے مندرجہ ذیل اشعار میں اسیر کی اصلاح خاص طور پر قابل غور ہے ؎

خفا گل سے ہوئی بلبل، اڑی قمری صنوبر سے
شگوفہ آپ نے گلزار میں جا کر نیا چھوڑا

ہوئے جیب خاک پہلے گرد بن کر ان کے دامن
پس مردن نہ ہم نے شیوۂ اہلِ وفا چھوڑا

جناں میں حور نے بال اپنے سر کے کھول دئے
ترے شہید کا لاشہ جو خوں چکاں اٹھا

ظالم ذرا سمجھ کے ستا یا کسی کا دل
ہر موئے تن قلم ہے وقائع نگار کا

سوئے گورِ غریباں آج کس کی آمد آمد ہے
پئے تعظیم سو سو بار اٹھتا ہے غبار اپنا

میری طرح سے حال بھی میرا ہے بادِ صبا
اے ترک نہ چھیڑے گا زری آستیں سے کس

محنت ترک کی ہم نے کہ تم سے بیوفائی کی
ہے اس کا فیصلہ اے مہرباں محشر کے ایوان

قتل گہ میں بیکسی رہ جائے دونوں طرف
اس طرف حیرت میں قاتل ہے ادھر بسمل اڑا

دیکھئے ادبِ محبت اور احترامِ عشق کا یہ حال ہے کہ ؎

زیر پا دب کے نہ ٹوٹے کوئی کانٹا مجنوں
رکھ قدم وادیٔ وحشت میں خبرداری سے

ملتا ہے مزہ وادیٔ وحشت میں خلش سے
تلووں سے جدا خارِ مغیلاں نہ کریں گے

قدم شوقِ شہادت میں کہیں بڑھتا ہے عاشق کا
جلا میں کھینچ دے یارب زمیں کو مقتل کی

لکھنؤ کی مشہور تاریخی عمارت امام باڑہ آصف الدولہ کی اہمیت ان کی نظر میں محض اس لئے نہیں ہے کہ وہ اس دور کے فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے بلکہ اس کی عظمت اس لئے اور زیادہ ہے کہ اس کو دیکھ کر واقعات کربلا کی یاد شاعر کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کربلا کی یاد میں حرار ہے ہر مقرار
دیکھئے چشمِ تصور سے حسینؓ آباد کو

حرار کے کلام اور ان کے مخصوص رنگ سخن میں قدیم و جدید کی آویزش ہے۔ مضامین وہی پیٹے پٹائے، فرسودہ اور پامال ہیں مگر ان کے اندازِ فکر نے انھیں دلنواز کار اور ریشمی یا افتادہ مضامین میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ اسیر کی اصلاحی نظر اور ان کی ترتیب نے زیر نظر دیوان کی عظمت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دبستان لکھنؤ میں سلسلۂ اسیر کی ایک مضبوط کڑی (اس دور کی) اردو غزل کے لہجہ، شناس اور فنِ شعر کو ایک نیا رنگ عطا کرنے والے اس شاعر کو اپنے استاد اسیر پر بجا طور پر ناز ہے۔ حرار نے یقیناً ایسے اشعار نظم کئے ہیں جن کو سن کر عرفی شیرازی جیسے بلند پایہ شعراء کی روح وجد کر سکتی ہے۔ ان کا قول ہے ؎

شعر ایسے انجمن میں پڑھئے جائیں جھوم کر
عرفی کی روح وجد کرے جھوم جھوم

---

۱ دیوان حرار صفحہ ۹
۲ " " ۲۱
۳ " " ۳۹
۴ " " ۲۸
۵ " " ۱۲
۶ دیوان حرار صفحہ ۹۱
۷ " " ۱۱
۸ " " [illegible]
۱۰ دیوان حرار صفحہ ۵
۱۱ " " ۱۰
۱۲ " " ۲۲
۱۳ " " ۱۰۱
۱۴ " " ۱۱
۱۵ " " ۱۰۸
۱۶ " " ۱۱۴
۱۷ " " ۱۰۳
۱۸ " " ۷۷
۱۹ " " ۷۹

مراسلات

مشاعرے کے بارے میں

"ہماری زبان" میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے سردار جعفری کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ شاعری سننے سنانے کی چیز ہے نیز مشاعرے اردو شاعری کا رشتہ عوام سے جوڑنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ "گفتگو" کا اداریہ بلاشبہ قابل غور ہے خلیل الرحمٰن کا اختلاف کسی حد تک درست لیکن سراسر یک طرفہ ہے۔ انھوں نے مشاعرے کے منفی پہلو پر جس زاویے سے روشنی ڈالی ہے اگر اسی زاویے سے چھپنے چھپانے کو دیکھا جائے تو یہاں بھی کچھ کم اندیشے نظر نہیں آتے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اردو شاعری کو مشاعروں سے زیادہ چھپنے چھپانے کے اس شوق بے مہار سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے جسے غالب کے الفاظ میں ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی کہا جا سکتا ہے۔

مشاعروں میں بلاشبہ مختلف خیال اور مختلف ذوق کے سامعین اکٹھے ہو جاتے ہیں، رسالوں کے پڑھنے والے مخصوص ذوق و رجحان کے ہو سکتے ہیں لیکن اوّل تو یہ کہ کسی مخصوص رجحان کے رسالے بہت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ کوئی بھی رسالہ اپنے قارئین کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ چاہتا ہے اس لئے مدیر کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف ذوق کی چیزیں پیش کرے۔ لیکن ذوق میں کوئی بنیادی تبدیلی کہاں ہوتی ہے وہی ذوق جو سامعین کو مشاعروں میں کھینچ لاتا ہے رسالوں کے پڑھنے پر بھی آمادہ کرتا ہے البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ مشاعروں کے تمام سامعین نہ تو اردو زبان سے یکساں واقفیت رکھتے ہیں نہ ہی وہ رسالے خرید کر پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ایسی صورت میں اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد مشاعروں کے مقابلے میں اور بھی قلیل ہو جاتی ہے۔ کم از کم وہ حضرات جو اردو شاعری سے دلچسپی کسی نہ کسی صورت میں ضرور رکھتے ہیں لیکن رسم الخط سے عدم واقفیت کی بنا پر اردو سے اپنی دلچسپی یکسر کھو بیٹھیں گے۔ ایسے لوگوں کی رائے ہر چند کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ان کی دلچسپی اردو زبان کے حق میں غیر مفید بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اردو شاعری کے متعلق کوئی بھی رائے مشاعرے میں پڑھی جانے والی چیزوں سے قائم ہوگی۔ نہ کہ مشاعروں کے ہنگاموں سے جو سماعت میں مانع ہو سکتے ہیں لیکن کچھ نہ سننے کے نتیجے میں کسی رائے کے قیام کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ سننے کے باوجود کوئی شخص اردو شاعری کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کرلے۔ اس کا انحصار رائے قائم کرنے والے پر ہے۔ وہ کچھ سنا تو درکنار کچھ نہ بھی پڑھے جب بھی رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔

جہاں تک مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر معروف شعرا کے مجموعہ ہائے کلام کی پذیرائی خاطر خواہ نہیں ہوتی ساتھ ہی یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی پذیرائی مستقبل میں ہوگی۔ رسا[ئل] اور اخباروں کے ذریعہ بھی ان کی پبلسٹی جو تبصروں کے ذریعہ [کی] جاتی ہے کچھ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتی۔ وہاں بھی بیشتر اوقات جانبداری کو دخل ہوتا ہے اور اکثر یہی دیکھا جا[تا] ہے کہ کوئی مخصوص حلقہ کسی شاعر کو یا تو بہت زیادہ اچھال [دیتا] ہے یا پھر اس کے خلاف صف آرائی شروع کر دیتا ہے یہاں بھی قارئین کی ذہنی تربیت خاطر خواہ نہیں ہو پاتی بلکہ مشا[عروں] کے سامعین کے مقابلے میں ہمارے قارئین کچھ زیادہ ہی ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتے ہیں۔ قارئین کی قوت خرید کم ہونے [کے] باعث غیر معروف شعراء کو اپنے مجموعہ ہائے کلام یا تو مفت [تقسیم] کرنے پڑتے ہیں یا پھر وہ دھرے رہ جاتے ہیں۔ مالی نقصا[ن] یہاں بھی ہوتا ہے۔ یہ نقصان صرف شعراء یا پبلشرز کا نہیں، بعض اوقات قارئین کا بھی ہوتا ہے جو کتاب کی خریداری [کے] بعد محسوس کیا جاتا ہے۔

مشاعروں کی جن برائیوں کی نشاندہی پر اس طرف ضرو[رت] سے زیادہ زور صرف کیا جا رہا ہے وہ برائیاں صرف اس [لئے] ہیں کہ ہماری نئی نسل صحت مند قدروں کی وارث نہیں ر[ہی] اور نئی قدریں ابھی کھل کر سامنے نہیں آسکی ہیں۔ میرے خیال [میں] ایسے لوگ جو ماضی کی کسی قدر پر ایمان نہیں رکھتے نئی قدروں [کے] تعین میں بھی خاطر خواہ حصہ نہیں لے سکیں گے۔ ان کا کام سوا[ئے] اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ وہ پرانی قدروں کی دھجیاں اڑ[ائیں] لیکن اس عمل میں صحت مند قدروں کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے لہٰذا اردو زبان و ادب کے بہی خواہوں کو سنجیدگی کے سا[تھ] اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا کہ کیا مشاعرے اپنی افادیت بالکل کھو [چکے] ہیں اور اب صرف چھپنے چھپانے کی حد تک شاعروں کو اپنا کا[م] محدود رکھنا ہوگا یا ان دونوں کے صحت مند عناصر کے در[میان] توازن ناگزیر ہے۔

(انیس امام)

وضاحت

میں نے یکم فروری ۷۸ء کے "ہماری زبان" میں [...] کے کالم کے تحت اردو زبان کی تعلیم اردو کتابوں کی اشا[عت] اور ان کی فروخت، اردو اخبارات و رسائل، اردو پڑھنے والوں میں معیاری اور علمی کتابوں کے بجائے سستی [...]

اخبارات اور ناولوں کی مقبولیت اور اس قسم کے دیگر مسائل کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس سلسلے میں کچھ تعمیری تجویزیں رکھی تھیں۔ مشاعروں کا ذکر محض ضمنی طور پر آگیا تھا۔ مشاعروں سے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی نوعیت مشاعروں کی افادیت یا عدم افادیت کے بارے میں اصولی یا عمومی نہ تھی بلکہ ذکر آج کل کے مشاعروں کی عام فضا کا تھا جسے بدلنے کی میرے نزدیک بے حد ضرورت ہے۔ اس مضمون میں سردار جعفری کے اس اداریے کا کوئی حوالہ نہیں ہے جو انھوں نے گفتگو شمارہ (۳) میں لکھا ہے اور جس میں مشاعروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرے مضمون میں اس مسئلے کا ذکر ہی نہیں کہ شاعری سننے سنانے کی چیز ہے یا کتاب میں پڑھنے کی کیونکہ اس وقت تک وہ اداریہ میری نظر سے گزرا بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مراسلہ نگار نے مشاعروں سے متعلق میرے خیالات "ہماری زباں" میں نہیں پڑھے بلکہ ان کی نظر سے محض وہ اقتباسات گزرے ہیں جو "تحریک" (دہلی) نے اپنے اپریل کے شمارے میں "ہماری زبان" کے حوالے سے "مانگے کا اجالا" کے ماتحت شائع کئے ہیں۔ چونکہ "تحریک" کے اسی کالم میں سردار جعفری کے اداریے سے اقتباسات بھی دئے گئے ہیں جو مشاعرے سے متعلق ہیں اسی لئے مراسلہ نگار کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ میرا مضمون سردار جعفری کے جواب میں ہے یا ان کے خیالات کی تردید میں لکھا گیا ہے۔ یکم فروری کے بعد "ہماری زبان" میں میں نے اردو زبان و ادب کے بعض اور مسائل پر بھی لکھا ہے جس میں بعض باتیں بحث طلب ہیں، مراسلہ نگار کا ان مسائل کے بجائے مشاعرے کے مسئلے پر اتنی تاخیر سے توجہ دینا خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ غالباً انھیں اپریل کے "تحریک" کے واسطے سے میرے معروضات کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ گذارش ہے کہ موصوف کہیں سے یکم فروری کا "ہماری زبان" حاصل کرلیں اور میرے مضمون کا مطالعہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ فرمائیں۔

اگر مراسلہ نگار یا ان کے بعض ہم خیال موجودہ دور کے مشاعروں سے مطمئن ہیں تو مجھے ان سے کچھ نہیں کہنا ہے، ہاں اگر ان مشاعروں کی فضا کو بدلنے اور انھیں زیادہ موثر اور کارآمد بنانے کی ضرورت ہے تو وہ میرے پیش کردہ خیالات پر غور کریں۔ (خلیل الرحمٰن اعظمی)

مرقع اردو اخبارات ورسائل

ہندوستانی پریس اور صحافت پر" اختر شاہنشاہی"

مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء کے بعد صرف ایک کتاب اس صدی کے اوائل میں مولوی محبوب عالم مرحوم (ایڈیٹر پیسہ اخبار) نے اردو میں شائع کی تھی اور پھر ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء میں منشی محمد دین فوق نے چند صحافیوں کا ایک مختصر سا تذکرہ بھی شائع کیا تھا یہ تینوں کتابیں اب کمیاب ہیں اور سوائے" اختر شاہنشاہی" کے ان دونوں کتابوں کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا۔ حال میں ہفت روزہ "درنجف" سیالکوٹ کے پرانے فائل میں" اخباری ڈائرکٹری" (مرقع اردو اخبارات ورسائل) کا ایک اشتہار نظر سے گذرا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ (حسب بیان مشتہر) اس کتاب میں صحافت پر بہت کچھ اکٹھا کردیا گیا ہے اشتہار اخبار "درنجف" سیالکوٹ کے شمارہ ۳۳ جلد ۷۔ مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۲۷ء (صفحہ ۱۶) پر ابوطفیل احمد صدیقی۔ سی۔ ٹی۔ ڈی میجر اخباری ڈائرکٹری مقام مردان پور براہ سانور مالوہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اگر یہ کتاب کسی صاحب کی نظر سے گزری ہو یا وہ اس سلسلے میں کوئی معلومات مہیا کرسکتے ہوں تو صحافت کے موضوع میں ایک قابل قدر اضافہ ہوسکتا ہے۔

اشتہار کی نقل من وعن درج ذیل ہے۔

جس کی اخباری دنیا میں بہت عرصے سے خاص ضرورت محسوس کی جا رہی ہے چھپ کر تیار ہوگئی جس میں ہندوستان بھر کے تمام اردو اخبارات ورسائل موجودہ و "بندشدہ" اور جملہ مطابع کی مفصل کیفیت اور ان کے پتے نیز اخبارات وپریس کی ابتداء اور ان کی بسیط تاریخ اور دلچسپ اخبارات کا یورپ اور امریکہ کے اخبارات سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

نیز دیگر اخباری معلومات نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ جدید اخبارات ورسائل کے لئے صدہا اچھے نام بھی تجویز کرکے درج کردئے گئے ہیں۔ اور" ضابطہ شکن" ایڈیٹر صاحبان کا نقشہ سزایابی بھی شامل ہے۔ موجودہ اخبارات کے نقائص و اصلاح کی جانب خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ غرضیکہ ہندوستان بھر میں اپنے طرز اور موضوع کے اعتبار سے واحد مجموعہ ہے جناب مولانا ارشاد احمد صاحب صدیقی نے جو مسلسل ۲۴ سال سے اخباری دنیا میں کام کرنے کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہیں اور ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں اپنے تجربات اور معلومات کی بنا پر اس کو مرتب کیا ہے۔ یہ علمی خدمت انجام دی گئی ہے جس کی نظیر نہیں ہے جو تعلیم یافتہ ادنیٰ اعلیٰ ہر طبقہ ہر شخص کے لئے بلاتفضیل وتخصیص مذہب وملت بیحد مفید ہے ہر سوسائٹی ہر انجمن۔ مدرسہ۔ اسکول۔ کالج۔ کلب

(باقی صفحہ ۹ پر)

اے۔س۔ انور

مکتوب لندن

یوم اقبال کی تقاریب

بریڈ فورڈ میں یوم اقبال کے سلسلے میں ٹمکسٹائل ہال میں ایک عام اجتماع ہوا۔ اس مجلس کی صدارت کے فرائض چودھری فضل حق نے ادا کئے اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض عمر حیات وڑائچ نے انجام دئے۔ اس موقع پر ہمایوں مرزا صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانان برصغیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا سہرا علامہ مرحوم کے سر ہے ہمایوں مرزا کے بعد فوج فراری نے علامہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر غلام حسن نے کلام اقبال پیش کیا اور عمر حیات وڑائچ نے اقبال کی زندگی اور سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی۔ جلسہ کا اختتام بشیر سیالکوٹی نے کلام اقبال اور محمد موسیٰ اور ساتھیوں نے مشہور نظم، شکوہ، ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔

مانچسٹر کے ریڈیو ہال میں مورخہ ۲۸؍اپریل کو یوم اقبال منایا گیا اور ابتدا ہفت روزہ، نصرت، کی تقسیم سے ہوئی۔ شیر زادہ خاں صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات کی نشان دہی کی اور حاضرین کو بتایا کہ علامہ نے عمل سے پہلے فکر، عشق اور تقلید کامل کی تلقین کی ہے اور عوام کو ان ملاؤں سے دور رہنے کی نصیحت کی ہے جو معاشرہ کے لیے گمراہ کن ہیں۔ نسیم احمد باجوہ نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کو ملت اسلامیہ اور نشاۃ اسلامیہ کے صف اول کا فلسفی قرار دیا اور اقبال کے فلسفۂ حیات اور نغمات کی تشریح کی۔ اکرم چغتائی نے کلام اقبال ترنم سے پیش کیا اور سرور رجانے اپنی غزل میں علامہ کو خراج تحسین پیش کیا۔ جلسہ کی اختتامی تقریر رحمٰن صدیقی نے کی جس کا موضوع تھا ' اقبال اور مغربیت '۔

برطانیہ میں اردو کتب کی اشاعت

حال ہی میں یہاں ایک اشاعتی ادارہ نے اردو کی ابتدائی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور اب بازار میں کچھ کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ جن کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے ان میں اردو کا قاعدہ، اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کتاب قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ عوام کے لئے اردو خط وکتابت، بھی شایع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اس ملک میں آئے ہوئے اردوداں بچے اپنی مادری زبان کی تعلیم بآسانی حاصل کر سکیں گے کیونکہ یہ کتابیں ہندوستان و پاکستان کی مروجہ ابتدائی کتابوں کی طرز پر تحریر کی گئی ہیں۔

صفحہ ۸ سے آگے

لائبریری، دارالمطالعہ ہر پریس۔ سوسیل ورڈ آفس۔ اخبارات ہر کمپنی سرکاری وغیر سرکاری جملہ دفاتر تک میں رکھا جانا نہایت ضروری ہے قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ مع محصول ڈاک (حوالہ اخبار فرمائش میں ضروری ہے) (نادم سیتاپوری)

اردو شعراء سے گذارش

میں ایک مجموعہ کلام "نکہت کشمیر" ترتیب دے رہا ہوں اردو شعراء سے گذارش ہے کہ وہ مندرجہ ذیل پتے پر منظومات ۳۰؍جون ۶۸ تک روانہ فرمائیں۔

نظمیں کشمیر کے طبعی حسن، دلکش مناظر اور تہذیبی سرمایہ سے متعلق ہونی چاہئیں۔

سید نظر برنی ایم۔ اے
جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

گوا میں مراٹھی اور کونکنی کے علاوہ اردو کو بھی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کرانے کی تحریک!

پاناجی ۱۱ مئی۔ صوبائی سطح پر گوا کی زبان مراٹھی ہونی چاہئے یا کونکنی۔ یہ سوال کچھ عرصہ سے گوا کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے پریشانی کا موجب بنا ہوا ہے۔

یہ اختلافی مسئلہ اس وقت زیادہ شدت اختیار کر گیا جب مہاراشٹر وادی گومنتک پارٹی کے ایک ممبر جناب جے سنگھ راؤ نے ایک غیر سرکاری قرارداد ایوان میں بحث کے لئے پیش کی۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ حکومت کو سرکاری کاموں کے لئے مراٹھی زبان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے صاف الفاظ میں اس قرارداد کا مقصد یہ تھا کہ حکومت سرکاری خطوط کا جواب مراٹھی میں دے۔ مراٹھی میں سرکاری گزٹ چھاپے جائیں اور سرکاری مدد سے چلنے والے تمام اسکولوں میں مراٹھی کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ یونائیٹڈ گوان پارٹی نے اس قرارداد کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اپوزیشن لیڈر ڈاکٹر جیک ڈی سکویریا نے ایک ترمیم پیش کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری زبانوں کی فہرست میں کونکنی اور اردو کو بھی شامل کیا جائے۔

(دنیا سے)

بہار ریاستی کانفرنس کی چند تجاویز

انجمن ترقی اردو بہار کی ساتویں ریاستی کانفرنس کی روداد ۲۳ اپریل ۱۹۶۸ء کے ہماری زبان میں آچکی ہے اس کانفرنس کی کچھ اہم تجاویز دیر سے وصول ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

ریاست کا لسانی جائزہ حکومت بہار کی سرپرستی میں راشٹر بھاشا پریشد بہار کی جانب سے ریاست کا لسانی جائزہ لیا جانے والا ہے اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کے صدر جناب لکشمی رائے سدھانشو ہیں کانفرنس نے اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اس جائزہ میں اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا اس لئے کانفرنس نے طے کیا ہے کہ انجمن کا ایک وفد ریاستی وزیر اعلیٰ سے مل کر صورت حال بتائے اور لسانی جائزہ کے لئے از سر نو ایک ایسی کمیٹی بنانے کی ضرورت کا احساس دلائے جس میں ریاست کی کل زبانوں اور بولیوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندے شریک ہوں اور اس کا صدر کسی مستند ماہر لسانیات کو بنایا جائے بصورت دیگر انجمن کی جانب سے بھی ریاست کا لسانی جائزہ کا کام شروع کیا جائے

زبانوں کے سوال پر از سر نو غور کرنے کا مطالبہ کانفرنس کی رائے ہے کہ آزادی کے بعد ارباب اقتدار نے زبان کے سوال پر جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے ملک میں انتشار پیدا ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے لہٰذا یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زبان کی موجودہ پالیسی کو کلیتہً رد کرتے ہوئے زبان کے سوال پر از سر نو غور کرے۔

اردو اور حکومت بہار ریاست بہار میں اردو زبان کے سلسلے میں پچھلے عام انتخاب کے موقع پر یہاں کی بیشتر سیاسی پارٹیوں نے اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا وعدہ کیا گورنر کے خطبے میں بھی اس وعدہ کو دہرایا گیا لیکن بعد میں اس وقت کی ریاستی حکومت اپنے وعدے سے منحرف ہوگئی اس لئے کانفرنس نے حکومت کے اس رویے پر اپنے گہرے رنج و افسوس کا اظہار کیا۔

اردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اب تک اردو کے لئے صرف علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کی حیثیت کا مطالبہ کیا گیا لیکن اب اس جلسہ کا خیال ہے کہ اردو کو بھی وہی حقوق ملنے چاہئیں جو دستور میں درج شدہ دوسری زبانوں کو ملے ہیں لہٰذا یہ اجلاس یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اردو کو دوسری قومی زبانوں کے ساتھ ہی حکومت ہند کی سرکاری زبان قرار دیا جائے اور بہار، یو پی، دلی اور مدھیہ پردیش میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جائے

حلقۂ ادب بہار کی نشست میں پرویز شاہدی کے فکر و فن پر اظہار خیال

پٹنہ، مئی کی شام کو انجمن اسلامیہ ہال میں حلقۂ ادب بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ماہانہ نشست جناب ڈاکٹر اختر اورینوی (سرپرست حلقۂ ادب) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ صدر جلسہ کی تحریک پر طے کیا گیا کہ نشست کو جناب پرویز شاہدی مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن پر گفتگو کے لئے مخصوص کر دیا جائے چنانچہ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے جناب پروفیسر عبدالمغنی، صدر حلقۂ ادب نے مذکور ذیل تجویز تعزیت پیش کی جس کو حاضرین نے منظور کیا۔

جناب پرویز شاہدی مرحوم اردو شاعری میں اپنے کمالات کے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ بالخصوص نظم نگاری میں وہ ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ شاعری میں ان کا اپنا ایک اسلوب اور آہنگ تھا۔ لہٰذا ان کی وفات سے اردو ادب کو بڑا نقصان پہونچا ہے اور اردو شاعری کے قدر شناسوں کے لئے یہ سانحہ المناک

حلقۂ ادب کی یہ نشست مرحوم کی وفات پر اپنے قلبی صدمے کا اظہار کرتی ہے۔ اور ارکانِ حلقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے اور پسماندگان کو صبر و شکیب عطا کرے؛

اس کے بعد اکرام حسین پرویز شاہدی مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر جناب اسلم آزاد۔ جناب شکیب۔ جناب قمر اعظم ہاشمی۔ جناب ڈاکٹر عبدالوہاب اشرفی۔ پروفیسر عبدالمغنی۔ جناب رضا کریم رضا۔ جناب رضا نقوی واہی۔ پروفیسر سید حسین۔ جناب مولانا ہتیاب صدیقی۔ اور پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے روشنی ڈالی۔

جناب اختر اورینوی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پہلی ملاقات پرویز صاحب سے ۱۹۴۲ء میں اقبال ہوسٹل (پٹنہ کالج) میں ہوئی اور اس وقت پرویز صاحب کلکتے سے ایک رسالہ "جدید اردو" شائع کرتے تھے۔ پرویز شاہدی کی شہرت برصغیر ہند و پاک میں تھی، اور اردو دنیا نے ایک بڑی حد تک ان کی قدر شناسی کی، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان کی مزید قدر دانی ہونی چاہیے تھی۔

اختر صاحب نے عبدالمغنی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ مرحوم کی شاعری میں عظیم امکانات پوشیدہ تھے اور اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو یہ امکانات بروئے عمل آتے۔ سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے اختر صاحب نے کہا کہ پرویز کا دل ایک مسلمان کا دل تھا، وہ ایک مہذب اور باوضع انسان تھے، ان کی ترقی پسندی صالح رخ پر تھی، خاص کر عمر کے آخری حصے میں وہ بہت متوازن ہو گئے تھے، وہ در اصل مساوات اور عدل و اخوت کے اسلامی قدروں کے علم بردار تھے۔ آخری عمر میں اشتراکیت کے طریقے ان کی نگاہ میں مشتبہ ہو گئے تھے اور وہ اسلامی خطوط پر سوچنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ پرویز اپنے اوپر کی گئی تنقیدوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

آخر میں صدر حلقۂ ادب پروفیسر عبدالمغنی نے اعلان کیا کہ ماہنامہ "مریخ" پرویز شاہدی نمبر شائع کرے گا جس کا اجرا ر حلقۂ ادب کے زیر اہتمام پورے بہار میں ایک تقریب منعقد کر کے کیا جائے گا۔ (طلحہ ساجد)

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کا مشاعرہ

۴ر مئی کو ادبی ٹرسٹ کے سالانہ کل ہند مشاعرہ میں جو جناب ودیا شنکر سکریٹری حکومت ہند کی زیر صدارت حیدرآباد کے نمائش میدان میں منعقد ہوا۔ تقریباً ۱۵ ہزار اردو دوستوں نے [illegible] میں ریاستی وزرا، حکام، تاجر، ڈاکٹر، وکلا، خواتین سیاسی قائدین اور ہر طبقے کے نمائندے اترائے انتخاب شامل [illegible] جس شائستگی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا اس سے اردو والوں کی تہذیب و ثقافت پر ایمان تازہ ہوا۔ اس مشاعرے کی رسم افتتاح میسور کے وزیر ٹرانسپورٹ جناب محمد علی نے انجام دی۔ اور مرکزی نائب وزیر قانون جناب یونس سلیم نے اس میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ان حضرات نے ادبی ٹرسٹ کی کارکردگی کو سراہا اور توقع ظاہر کی کہ حیدرآباد اردو کے نشاۃ ثانیہ کا مرکز بن جائے گا۔ میر مشاعرہ جناب ودیا شنکر صاحب نے اردو کے تعلق سے اپنی تقریر میں بڑی دو ٹوک باتیں کہیں انھوں نے بڑے اثر انگیز الفاظ میں جنگ آزادی کے دوران اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی خدمات اور ان کی قربانیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ آزادی کے بعد اسی اردو کو اسی کے وطن میں جلاوطن کر دیا گیا ہے اور وہ کبھی بمبئی اور کبھی مدراس میں بے وطنوں کی طرح آوارہ و پریشان نظر آتی ہے تو کبھی حیدرآباد کو اپنا دوسرا وطن قرار دینے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں اردو والوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اردو کے وطن کی بازیابی کا مطالبہ کریں اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز مینا قاضی کی غزل سے ہوا اور اس کے بعد محترمہ حمیلہ بانو (دہلی)، جناب اختر سعید (بھوپال) جناب مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت (حیدرآباد) حضرت روش صدیقی (دہلی) ابن احمد تاب (حیدرآباد)، سلیم کتھولوی (دہلی)، سلیمان خطیب (گلبرگہ میسور) خیرات ندیم (حیدرآباد) علی سردار جعفری (بمبئی) کیفی اعظمی (بمبئی) حضرت میکش اکبرآبادی (دہلی) سکل اتساہی (بمبئی)، صلاح الدین نیر (حیدرآباد) تاج مہجور، ماموج بعقول (حیدرآباد) رسیر رضوی (دہلی) سعید شہیدی (حیدرآباد) نے اپنی تازہ نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ (عابد علی خان)

صفحہ ۱۲ سے آگے

کرتا ہے ادبی فارم کے ذریعہ سے زندگی کے فارم اور اس کی معنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کوئی ادیب اچھا یا برا نہیں ہوتا، اس کے بعض کارنامے اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر کارنامے پر ہونی چاہیے۔ ادیبوں پر لیبل نہیں لگانا چاہیے آج کل نظم یا افسانے کی خصوصیات پر کم گفتگو ہوتی ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار کو ترقی پسند یا رجعت پسند ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ ہمعصر ادب میں اس انتہا پسندی سے بچنے کی ضرورت اور زیادہ ہے۔ کیونکہ ادیب کے یہاں آج ایک اثر ہے تو کل کوئی دوسرا۔ ہر ادیب اور شاعر وقت گزرنے کے ساتھ بدلتا جاتا ہے ورنہ وہ اپنے کو دہرانے لگتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم کارناموں کو پرکھیں شخصیتوں پرستی لیبل لگانے سے پرہیز کریں جس طرح چیزیں اچھی یا بری ہوتی ہیں [illegible] لوگ اچھے یا برے نہیں ہوتے [illegible] سکے نئے سارے کارنامے سامنے [illegible]

آل احمد سرور

میرا صفحہ

ہمارے ملک میں تناسب کا احساس بہت کم ہے۔ ہم ہر چیز میں حد سے گزر جاتے ہیں، مدح میں بھی اور قدح میں بھی۔ ستائش میں بھی اور عیب جوئی میں بھی۔ کسی کی تعریف کریں گے تو اسے آسمان پر بٹھا دیں گے، کسی کی برائی کریں گے تو اسے تحت الثریٰ میں گرا دیں گے۔ ہمارے نزدیک صرف ہم سیدھے راستے پر ہیں باقی سب کج روی کے شکار ہیں۔ صرف ہماری نیت صاف ہے، دوسرے کی نیت میں ضرور کھوٹ ہے۔ ایک زمانے میں ملاؤں اور پنڈتوں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور تھا۔ کسی نے ایک ملّا سے پوچھا کہ بھائی آپ کے نزدیک حق پر کون کون ہے۔ اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ایک تو میں اور ایک میرا بھائی، مگر وہ بھی کیا"۔ میر سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس دور میں شاعر کون کون ہے۔ انھوں نے فرمایا ایک تو درد، ایک یہ خاکسار، آدھے مرزا رفیع سودا۔ اس پر سوز کے متعلق دریافت کیا گیا تو کہا پونے تین سہی مگر ایسے مخلص شریفوں میں ہم نے نہیں سنے۔ خیر کچھ عرصہ پہلے تک کٹرپن سیاست میں خاص نمایاں تھا۔ ہر پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کو گمراہ اور بددیانت سمجھتے تھے۔ کمیونسٹ اپنے مخالفوں کو امریکہ کا ایجنٹ کہنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے۔ کمیونسٹوں کے مخالف انھیں دھڑلے سے روس کا ایجنٹ کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سیاست تک محدود رہتا تو بھی سمجھ میں آتا کیونکہ ہندوستان میں سیاسی شعور ابھی گہرا نہیں ہے، انتہا پسندی عام ہے۔ عوام کا ذہن ابھی بیدار نہیں ہوا، اس لئے سستے نعروں اور الزامی جملوں سے لوگ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ عام چناؤ میں ووٹ سبھی سے لینا ہوتا ہے اور ان کو متاثر کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اعداد و شمار، حقائق، عملی نتائج کو نہیں دیکھتے، جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ جائز سمجھا جاتا ہے۔ کامیابی سب سے بڑی چیز ہے۔ ذرائع کی کون پروا کرتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے کہ اب ادب میں بھی یہ انتہا پسندی آ رہی ہے۔ جو لوگ قدیم رنگ کے حامی ہیں اور روایت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ اگر ہر نئی چیز کو لغو اور بے معنی اور ہر تجربے کو تخریب قرار دے دیں تو یہ عذر کیے جا سکتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں انھیں کچھ نہ کہو۔ مگر تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنے کو جدید دور کا آدمی کہتے ہیں جن کا علم وسیع اور ذہن بیدار کہا جا سکتا ہے مگر جو اپنے کو انتہا پسندی سے نہیں بچا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی ترقی پسندی پر فخر کرتے ہیں، مگر ترقی کے معنی صرف اشتراکیت کے پرچار کے لیتے ہیں۔ یہ جمہوریت کا نام لیتے ہیں مگر جمہوریت میں ہر فرد کو جس طرح اپنے خیال کے اظہار کی اجازت ہوتی ہے اس پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے مخالفوں کو جھٹ امریکہ کا ایجنٹ، بلکہ سی آئی اے کا ایجنٹ کہہ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی ترقی پسندی کے باوجود زبان کا ایک جامد تصور رکھتے ہیں۔ عوام کے علمبردار غلط العوام تو درکنار، غلط العام کو بھی نہیں مانتے، چلن کا نام لیتے ہیں مگر زبان کے چلن کو ٹھکراتے ہیں۔ اردو کو ایک خود مختار زبان کہتے ہیں مگر اسے عربی یا فارسی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں۔ جدیدیت کے میلان میں اچھے اور برے بھی پہلو ہیں۔ کس میلان میں نہیں ہوتے۔ یہ صرف برے پہلوؤں کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ کلاسکی شاعری میں غم کی ثبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر آج کل کے شاعر کے غم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ پرانی شاعری میں جنس کے چٹخارے بھول جاتے ہیں اور آج کے بعض شعرا کے یہاں جنس زدگی کی وجہ سے پوری جدید شاعری کو جنس زدہ کہتے ہیں۔ پرانی رعایت لفظی اور لفظوں کے طوطا مینا انھیں گوارا ہیں۔ مگر لفظوں سے نیا کام لینا، اس کا تہ دار اور پہلو دار استعمال انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یہ انتہا پسندی نئے لوگوں میں ہوتی تو تعجب کی بات نہ تھی۔ نئی نسل شباب کے جوش میں اپنے کو خلاصۂ کائنات سمجھتی ہی ہے اور اس کی انا کو تسکین دینے کے لئے اپنے پیش روؤں کی اہمیت سے انکار کر دینا سمجھ میں آتا ہے۔ برہم نوجوانوں (ANGRY YOUNG MEN) کی برہمی پر کوئی سمجھدار آدمی چڑتا نہیں۔ اس پر غور کرتا ہے کہ یہ برہمی کیوں ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے۔ لیکن آج کل ہمارے ادب میں کچھ برہم بوڑھے بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ برہمی زیب نہیں دیتی کیونکہ بڑھاپے کا شعور علم کی سنجیدہ گفتاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس برہمی سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں ادب کی دنیا میں ہر قسم کی اجارہ داری کے ٹوٹ جانے پر تو یہ برہمی نہیں ہے۔ ادب کو خاص سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی جو روش کچھ عرصے پہلے مقبول تھی۔ اس کے خلاف ردِ عمل پر تو یہ ناراضگی نہیں ہے۔ زندگی کی طرح ادب میں بھی لوگ صرف سفید اور صرف سیاہ نہیں ہوتے۔ نہ ادب میں دو یکسر مخالف میلان ہوتے ہیں۔ اگر ادب ادب ہے، محض ہسٹریا یا پروپیگنڈہ نہیں ہے تو اس میں صرف خیالات کی اہمیت نہیں ہوتی، خیالات کے ادبی اور جمالیاتی اظہار کی اہمیت ہوتی ہے۔ ادب کا مقصد ہر شخص کی سمجھ میں آنا نہیں، وجد میں لانا ہے، کیفیت پیدا کرنا ہے، ذہن میں فضا پیدا

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ و پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy—15 P

جلد ۲۷، شمارہ ۲۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم، جون ۱۹۶۸ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ

دستور کی دفعہ ۳۵۰ بی (۲) کی رو سے لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا فرض ہے کہ وہ صدر کو لسانی اقلیتوں کے تحفظات کے سلسلے میں تمام معاملات پر وقتاً فوقتاً رپورٹ دے۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہوتی ہے اور ریاستی حکومتوں کو بھیجی جاتی ہے اب تک سات رپورٹیں صدر کی خدمت میں پیش ہوکر پارلیمنٹ کے سامنے رکھی جا چکی ہیں اور پارلیمنٹ میں ان پر بحث ہو چکی ہے۔ آٹھویں رپورٹ مئی کے مہینے میں پارلیمنٹ میں پیش ہوئی اور ابھی اس پر بحث باقی ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ریاستی حکومتوں کے پاس بھیجی جائے گی۔ پہلے کمشنر شری بی ملک تھے جنھوں نے جولائی ۱۹۵۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک کام کیا، دوسرے کمشنر شری اے سی۔ چندا تھے جنھوں نے مارچ ۱۹۶۲ء سے اپریل ۱۹۶۶ء تک یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اپریل ۱۹۶۶ء سے اکتوبر ۱۹۶۶ء تک کسی کمشنر کا تقرر نہ ہوسکا۔ اکتوبر سے شری متی ایم۔ چندر شیکھر یہ کام کر رہی ہیں۔ آٹھویں رپورٹ انھیں کی تیار کی ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ہم اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کمشنروں نے اپنے کام میں فرض شناسی، ہمدردی اور دل سوزی کا ثبوت دیا ہے۔ کمشنروں نے اپنے دوروں میں لسانی اقلیتوں کی تمام شکایات پر پوری توجہ کی ہے اور ریاستی حکومتوں کو ان شکایات سے مطلع کیا ہے۔ اگر کمشنر کے پاس کافی اسٹاف ہوتا تو اس کی کارکردگی اور افادیت اور زیادہ ہوتی۔ ہمارے خیال میں ہر ریاست میں اس کا ایک نائب ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر ریاست کے مسائل پر اور توجہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہم یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض ریاستی حکومتوں نے نہ تو کمشنروں کو سارے اعداد و شمار مہیا کیے، نہ اُن مشوروں پر پوری طرح عمل کیا جو مختلف اوقات میں کمشنروں نے دیے، بلکہ اتر پردیش اور بہار کی حکومتوں نے تو بعض استفسارات کا اب تک جواب نہیں دیا ہے۔ یہ بات بہت نامناسب ہے اور صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ کو اس بے نیازی اور بے پروائی پر مناسب باز پرس کرنی چاہیے۔

رپورٹ کے مطالعے سے بعض حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت نے ۶۵-۱۹۶۴ء کے متعلق صرف ۳۹ ضلعوں کے اعداد و شمار دیے ہیں۔ باقی پندرہ ضلعوں کے متعلق اعداد و شمار وقت پر موصول نہیں ہوئے۔ ان ۳۹ ضلعوں میں اردو اسکولوں کی تعداد ۱۳۶۵، اردو درجوں کی تعداد ۱۵۰، اور طلبہ کی تعداد ۱،۰۱،۸۹۲۰ تھی۔ کہا گیا ہے کہ ان ضلعوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد پہلے سے کچھ بڑھی ہے مگر جب تک سارے ضلعوں کے اعداد سامنے نہ آئیں پوری ریاست کے متعلق قطعی رائے کیسے قائم کی جائے۔ ہاں کمشنر نے یہ ضرور کہا ہے کہ ریاست میں بیس اردو اسکول کم ضرور ہو گئے ہیں۔

بہار میں جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی اتر پردیش سے کم ہے ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۲،۹۴،۰۰۱۵ طلبہ اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اتر پردیش میں اردو طلبہ کی تعداد بہر حال اس سے نمایاں طور پر کم ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہار کی حکومت بھی گو اپنے فرائض کی انجام دہی میں چوکس نہیں کہی جا سکتی، مگر اتر پردیش کی حکومت تو اس معاملے میں ایسی غفلت شعار ہے کہ شاید ملک بھر میں اس کی دوسری مثال نہ مل سکے۔ ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے دینے والے اسکولوں کی بھی مثال دی جا سکتی ہے۔ [illegible] جا سکتی تو اتر پردیش [illegible]

کیا گیا ہے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحت اسکول ہیں۔ ریاست کا ان اسکولوں کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ آندھرا میں کم ہو کر بھی ۶۵، ۵۳،۷ طلبہ اردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میسور میں ۵۸۸۱، ۴ ۲ اور مہاراشٹر میں ۵۴۸۸۲، ۲ حالانکہ ان ریاستوں میں اردو بولنے والی آبادی اترپردیش کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ثانوی تعلیم کے سلسلے میں تمام ریاستوں سوائے مدھیہ پردیش، اترپردیش، بہار اور مہاراشٹر کے، یہ ہدایت ہے کہ اگر پندرہ طالب علم ایک کلاس میں اور ساٹھ ثانوی منزل کے آخری چار سالوں میں مطالبہ کریں تو ان کے لئے ان کی زبانوں میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مگر مہاراشٹر اور بہار میں کچھ ایسے اسکول پہلے سے چلے آرہے ہیں، اترپردیش اور مدھیہ پردیش میں یہ بھی نہیں۔ اترپردیش کی حکومت کو کمشنر کئی بار توجہ دلا چکا ہے کہ ثانوی تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۶۱ء کی بڑے وزیروں کی کانفرنس کی سفارشات پر عمل کرے، مگر اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی اب تک جو سہولتیں لسانی اقلیتوں کو مل رہی تھیں ان کے متعلق مرکز کی ہدایت تھی کہ ان میں کمی نہ ہونے پائے، مگر سوائے مدھیہ پردیش، آندھرا، کیرالا اور مدراس کے کسی ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں مناسب احکام جاری نہیں کئے۔ سہ لسانی فارمولا کے سلسلے میں بھی، ابھی تک خاصی گڑبڑ چل رہی ہے کمشنر

شاغل عثمانی

طنز و تدبیر

سلامت رہے بزم اہلِ ادب دل — پنپنے یہ شعر و سخن کا عمل
مگر تو لیا اردو ہے بہ آج کل — گیا جب اپنا ہی جنبو نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

غزل اور ترنم یہ اپنا شعار — اسی پر ہے علم و ادب کا مدار
تو یوں عرض پرداز ہے خاکسار — یہی ہے جو حالت تو اے غمگسار
نظر آئے گا جسم اردو کا شل

نہ تعلیم و ترویج پر دھیان ہے — نہ جائز حقوق ہی کی پہچان ہے
نشاط و طرب کا تو سامان ہے — کہ بس شعر کہہ لینا آسان ہے
اسی سے تو نکلیں گے قسمت کے بل

ستائے زمانہ تو پروا ہے کیا — ستم پر ستم ہو جفا پر جفا
ہمارا تو ہے اور ہی مدعا — ملے داد تا ہم صبح و مسا
اسی سے تو سب مسئلے ہوں گے حل

اگر ہے تو تفریح سے بس ہے کام — یہی سعی رہتی ہے اپنی مدام
بہت خوب دہرا ہے اپنا نظام — کہ گاتے ہیں ہم پھر دیں وقت تمام
زباں پر ہے نوحے کے بدلے غزل

بہت ہی مؤثر ہے اپنا کلام — کہ داد اس کی دیتے ہیں سب خاص و عام
زباں کے لئے کچھ ہے کہنا حرام — کہ یہ فرض داری کا ہے اہتمام
وفادار ہو تو اسے دو محل!

چھپیگا کلام اپنا اک دن ضرور — لکھا ہو گا جس میں بکار اور نجور
تو اس میں سراسر ہے اپنا قصور — کہ ہم کو نہیں عاقبت کا شعور
ہلاہل کو سمجھا ہے ہم نے عسل

جو کرنا ہے وہ کام خود کیجئے — جو دینی ہے امداد وہ دیجئے
یہ کڑوی کسیلی دوا پیجئے — کوئی ذمہ دار تو سر لیجئے
بھروسہ حکومت پہ طول امل

گرانی محمل کے پیش نظر — ہوئی بے نوا تلخ تر
نہ تھا جب حُدی خواں کو اس کی خبر — تو اس راہ پہ چل پڑا بے خطر
رہے تا کہ اردو کا روشن کنول

غرض یہ کہ اردو کی خدمت کرو — نکل آؤ میدان میں دوستو
یہ کرنی ہے پوری مہم آپ کو — کسی طرح اس کو نکالو کہ جو
دماغوں میں آیا ہوا ہے خلل

حکومت کے احکام ہیں صاف تر — نہیں ہیں ماتحت لیکن اثر
اسی سے ہے اردو زباں کو خطر — اسی کو سنانا ہے المختصر
کرانا ہمیں کو ہے ان پر عمل

ف عرفی شیرازی کے اس شعر سے استفادہ کیا گیا ہے
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی — ۱۲

ف خدا کرے اس کا اثر راحتمان کے لاڈ (؟) ذوقوں تک پہنچ ہو اور اکبر الہ آبادی کے اس شعر کا مصداق نہ بننا پڑے۔
یہ تو ابھی کہ گلے بانی کا قائل ہو گیا — رہ گئی ساری حُدی خوانوں کی امی تان ہی

نے لکھا ہے کہ فارمولا میں مادری زبان کا لفظ ضرور آنا چاہئے اور مادری زبان کے معنی صرف دستور کے شیڈول ۸ میں درج زبانیں نہیں لینا چاہئے۔ اترپردیش میں اب بھی یہ صورت حال ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو تیسری زبان کی حیثیت سے بھی پڑھ نہیں پاتے۔ ہاں سنسکرت پڑھتے ہیں۔ اس محرومی کا کوئی جواز نہیں ہے صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ دونوں کو اس سلسلے میں جلد مناسب ہدایات جاری کرنی چاہئیں۔ (باقی)

صد سالہ جشن غالب کی جھلکیاں

نئی دہلی، مرزا غالب کا صد سالہ جشن منانے کے لئے وزیر اعظم کی صدارت میں کل ہند سطح کی جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے زیر اہتمام غالب کی تمام تخلیقات کے تنقیدی اڈیشن شائع کئے جائیں گے مرزا کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم تیار ہوگی اور اس موقع پر ایک اعلیٰ پیمانے کے مشاعرہ کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ دہلی انتظامیہ نے عظیم شاعر کی یادگار کے طور پر ایک ہال اور ایک میوزیم بنانے کیلئے آراضی کا ایک وسیع قطعہ کمیٹی کی تحویل میں دے دیا ہے۔ یو پی حکومت سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ آگرہ کے اس مکان کو حاصل کرے جہاں غالب کی ولادت ہوئی تھی اسی طرح سے اس مکان کو حاصل کرنے کی جہاں مرزا نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ گزارا تھا درخواست دہلی انتظامیہ سے کی گئی ہے ان دونوں مکانوں کو قومی یادگار میں بدل دیا جائے گا سرکاری پریس نوٹ کے مطابق کمیٹی نے مختلف یونیورسٹیوں کو لکھا ہے کہ وہ اپنے یہاں "غالب شعبہ" قائم کرکے اس عظیم شاعر کی زندگی اور فن پر تحقیقی کام کا آغاز کریں۔

(قومی آواز)

شریف الحسن لاہر پوری

رسالہ مُرقّع لکھنؤ

لکھنؤ میں اردو صحافت کی ابتدا ہفتہ وار رسالہ سحر سامری سے ہوئی لیکن یہاں سے کچھ ایسے رسائل بھی نکلے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا ان میں سید مقبول حسین وصل بلگرامی کا رسالہ "مرقع" نامی" بھی تھا جو جنوری ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا یہ رسالہ لکھنؤ کے ماہنامہ رسالوں میں امتیازی شان رکھتا ہے اس کے مقاصد میں قدیم و جدید انداز کی باہمی کشاکش کو ختم کرنا اور اصلاح زبان تھا اس کی پالیسی کا لب لباب اعتدال پسندی اور تعصب تنگی تھا رسالہ کے قواعد وضوابط کے تحت لکھا ہے

(۱) مرقع ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو دارالادب لکھنؤ سے شائع ہوگا رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک آجانا چاہئے (۲) مرقع کی قیمت عام خریداروں سے پانچ روپیہ سالانہ مع محصول ڈاک اور قیمت رسالہ دیگر معزز اصحاب اور اس کے مربیوں سے ان کی ہمت افزائی پر منحصر ہے (۳) مرقع کو موجودہ پالیٹکس یا مذہبی مباحث سے کوئی سروکار نہ ہوگا (۴) تنقیدی مضامین بھی اس میں شائع ہوں گے مگر وہی جن میں خلوص ہوگا باہمی نزاعات یا کسی قسم کے تعصب یا کسی رنج کی بنا پر لکھے ہوئے مضامین سے احتراز کیا جائے گا (۵) مرقع کا مسلک صلح کل ہے وہ انشاء اللہ کبھی دل آزار یا متعصب ثابت نہ ہوگا۔

مرقع کے مربیوں میں عالی جناب مولانا مولوی حاجی سید محمد سبحان اللہ صاحب متخلص بہ عظیم رئیس اعظم گورکھپور، عالیجناب نواب غلام حسین صاحب قمر رئیس اعظم گنیش پور ضلع بستی اور عالیجناب مولانا مولوی سید محمد مقصود علی صاحب نائب ریاست گنیش پور تھے۔

رسالہ کے اجرا اور صلاح و مشورہ میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور ڈاکٹر علامہ اقبال شامل تھے علامہ اقبال نے رسالہ کے سرورق کے لئے اپنے خط مورخہ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۵ء میں ایک شعر عطا کیا تھا۔

مخدومی تسلیم

یہ ایک شعر حاضر ہے۔ معلوم نہیں سرورق کے لئے موزوں ہوگا یا نہیں

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشۂ دارد
تراشد مدسینہ کہسار و پاک از خون پرویز است

مخلص محمد اقبال

اتفاق سے سرورق کے لئے یہ شعر موزوں نہ قرار پایا لہٰذا علامہ نے دوسرا شعر روانہ کیا ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ شعر موزوں قرار پایا اور رسالہ کے سرورق پر لکھا جاتا تھا۔ فہرست مضامین کے ورق پر یہ شعر ہوتا ؎

جہاں مُرقّعِ تصویرِ حسن اوست تمام
بہ حیرتم کہ بندم دل از کہ بردارم

سب سے پہلے عام طور پر غزل ہوتی اس صفحہ پر ابوالعلاء حکیم ناطق کا یہ شعر ہوتا ؎

بہ عکس روئے تو ہم رنگ روح انساں است
زحسن و عشق مرصع مرقع جان است

رسالہ کی ضخامت اڑتالیس صفحات تھی آخر میں آٹھ صفحات ضمیمہ ہوتا تھا جس میں اشتہارات ہوتے تھے۔ مقبول المطابع نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔

رسالہ کے لکھنے والے لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی۔ ابوالعلاء ناطق لکھنوی میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں۔ نیاز فتح پوری اڈیٹر نگار۔ عبدالماجد دریاآبادی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ نظم طباطبائی۔ حمد لکھنوی۔ مجنوں گورکھپوری حامد اللہ افسر میرٹھی۔ فراق گورکھپوری جگت موہن لال رواں۔ حکیم برہم صفی لکھنوی۔ دولہا لکھنوی۔ سید محمد ہادی صاحب وزیر تعلیم۔ اصغر گونڈوی اثر لکھنوی۔ جگر مرادآبادی جگر بسوانی۔ پنڈت جگ موہن ناتھ شوق باسط بسوانی۔ عزیز بلگرامی۔ ہوش بلگرامی۔ شوق بلگرامی۔ قمر جہاں۔ بلقیس جہاں۔ رابعہ خاتون میمونہ غزال۔ مدرسی صاحبہ۔ اس کے علاوہ نظام حیدرآباد مولانا عبدالحلیم شرر۔ پریم چند۔ سدرشن پروفیسر امالیگان دویدی۔ شریمتی اما نہرو کے مضامین و افسانے شائع ہوتے رہے نیاز فتحپوری کے بیشتر افسانے مرقع میں شائع ہوئے ان میں کے چند ایسے ہیں جن کو نیاز نے اپنے مجموعہ میں شامل نہیں کیا ہے

اصغر گونڈوی کا مجموعہ کلام "نشاط روح" شائع ہوتے ہی اثر لکھنوی نے اس پر تبصرہ کیا اور چند اعتراضات کئے۔ مرقع میں بحث و مباحثہ کا دروازہ کھل گیا صفدر مرزاپوری نے شرر کی حمایت سے اثر لکھنوی پر اعتراضات کئے۔ وصل بلگرامی نے سمجھوتہ کرادیا ورنہ شاید شرر لکھنوی کی ہنگامہ پسند طبیعت ایک اور ادبی معرکہ کو جنم دیتی۔

اہل لکھنؤ نے زندہ دلان پنجاب کو اہل زبان نہیں سمجھا لکھنؤ کے شعرا اپنا کلام پنجاب کے رسائل میں شائع نہیں کراتے تھے لکھنؤ والوں نے علامہ اقبال پر بھی اعتراض کئے ہیں لکھنؤ میں اقبال کی وہ قدر نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ مرقع جولائی ۱۹۲۷ء میں خواجہ شمس الدین احمد صاحب کا مضمون "اقبال کی اردو" شائع ہوا ہے وہ رقمطراز ہیں۔

اقبال کی اردو دانی میں بہت لوگوں کو کلام ہے، ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ پنجابی ہیں لکھنؤ یا دہلی کے باشندہ نہیں اور نہ ان شہروں میں ان کو بود و باش کا اتفاق ہوا ہے اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ شرفائے لکھنؤ یا دہلی کے برابر زبان داں ہوں گے غلطی ہے۔ ان کی بانگ درا میں جو لغزشیں ہیں وہ زیادہ تر محاورہ کی ہیں اور بعض تذکیر و تانیث کی بھی ہیں تمثیلاً چند بیان کی جاتی ہیں ؎

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر

کسی کے سر باندھنا نہیں کہتے، بلکہ سر پر باندھنا محاورہ ہے اور خالی سر باندھنا یا سر سے باندھنا بھی بولتے ہیں مگر اس کے دوسرے معنی ہیں مثلاً یہ ہیں کہ جب کچھ ان نہ ملا تو خلاں چیز تم نے میرے سر باندھی یا مسئلہ طلسمی زبردستی کر دی۔

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں

کسی کو پیار کرنا بولتے ہیں کسی سے پیار کرنا محاورہ نہیں ہے۔ البتہ پیار اور اخلاص ساتھ کہیں تو بولیں گے آج کل ان سے آپ کا پیار اور اخلاص بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر جہاں خالی پیار کا لفظ ہے مجھے ہونا چاہیے۔"

مرقع کی یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے التزاماً اساتذہ مشاہیر شعراء دادبار کے سطور کے عکس رنمونے شائع کئے۔ ان عکسی تحریروں کے متعلق ملا رموزی نے اعتراض بھی کیا تھا اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی تحریریں شائع ہو گئی ہیں جن کا شمار مشاہیر میں نہیں ہے۔ مرقع کے مارچ ۱۹۲۶ء میں غالب کی تحریر کا ایک عکس ہے اس خط کے بارے میں رسل بلگرامی نے نوٹ لکھا ہے کہ یہ خط مولوی ابوالحسن صاحب ابن جناب مولانا عبدالحق حقانی دہلوی مرحوم نے مجھے عنایت فرمایا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور اس میں جس رباعی کا ذکر ہے وہ رباعی بھی نہ مل سکی بہرحال یہ تحریر حضرت غالب مرحوم کے قلم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے اب خط ملاحظہ ہو۔

"بندہ پرور آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی اور صبح کو آپ کا کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کے شکر میں کیا خدمت بجا لاتا بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیں۔

امید بہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو رحاف سمجھیں پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے:

امید ہے غالبیات سے دلچسپی لینے والے حضرات اس خط سے متعلق مزید روشنی ڈالیں گے۔

جنوری ۱۹۲۸ء کا رسالہ افسانہ نمبر ہے۔ افسانہ نمبر کے متعلق وصل بلگرامی لکھتے ہیں:

"اس میں اگر ایک طرف آپ نیاز، مجنوں، احسن، اثر، جلیل، سدرہ سجاد حیدر ایسے مسلمان مسلم الثبوت اور نامور افسانہ نگاروں کے شاہکار ملاحظہ فرمائیں گے تو دوسری جانب انہیں کے دوش بدوش پریم چند، سدرشن، اداں، فراق، برق، آبادیوی ایسے مستند اور مشہور ہندو افسانہ نویسوں کی سحر طرازیوں کے نقوش بھی پائیں گے۔ مرقع کے صلح کل، غیر دل آزار، غیر متعصب (اور اتفاق و اتحاد کے حامی) ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے"

اس افسانہ نمبر میں افسانوں کے علاوہ افسانوں سے متعلق دو مضمون ہیں ایک جناب اشہر لکھنوی کا "افسانے کی اہمیت" اور دوسرا جناب مشیر احمد علوی کا "افسانہ کیا ہے" دونوں مضمون اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں اور معلومات افسانہ کا ایک اچھا خاصہ آئینہ ہیں اس نمبر میں سب سے مختصر افسانہ حامد اللہ افسر میرٹھی کا "دو آنے کی قیمت" ہے۔ یہ امریکن افسانہ نگار کے افسانہ سے ماخوذ ہے جو امریکہ میں ۱۹۲۴ء کا بہترین افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مرقع میں ۱۹۲۸ء سے افسانوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تھی یہ رسالہ کب تک جاری رہا یہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اس کی ۱۹۲۹ء تک کی مکمل فائلیں حاصل ہوئی ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف پر تنقید یا محاکمہ جتنا آسان ہے اردو نثر اور نثر نگاروں کا مطالعہ اور تجزیہ اتنا ہی دشوار ہے۔ یوں تو اردو نثر پچھلے سو سال کے عرصے میں بہت سی ارتقائی منزلیں طے کر چکی ہے مگر نثری تحریروں اور ان کے مصنفوں کی ادبیت اور ان کا معیار متعین کرنے میں خاصی دقتیں ہیں۔ زمانۂ حال کے ایک ذہین نقاد کو یہ شکایت ہے کہ اب اردو میں مختلف موضوعات پر جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں اکثر ساخت اور اسلوب کے اعتبار سے اردو کی پہلی کتاب والی نثر ہے دوسری طرف بعض لکھنے والے ایسے بھی ہیں جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ وہ فلسفہ، تاریخ، تحقیق یا تنقید جیسے موضوعات پر شگفتہ زبان یا محاوراتی اسلوب میں لکھ سکتے ہیں یا ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ علمی اور سائنسی موضوعات بھی انشائے لطیف کے پیمانے میں ڈھل جائیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی ہمارے یہاں ادبی اور غیر ادبی نثر کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی ہمارے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ طرز یا اسلوب کسے کہتے ہیں اور یہ کہ آیا ہر نثر لکھنے والے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ صاحب طرز یا صاحب اسلوب نثر نگار ہو۔

میرا خیال یہ ہے کہ اسٹائل یا اسلوب کا تعلق محض اصل تخلیقی تحریر سے ہے۔ تخلیقی تحریر کے لئے مصنف کی شخصیت کا تخلیقی ہونا ضروری ہے۔ ادب، فن یا تخلیق ابلاغ محض یا صنعت گری دونوں سے الگ ایک چیز ہے۔ ہماری پرانی کتابوں میں تخلیقی نثر یا اسلوب کے متعلق کوئی ایسا اصول نہیں ملتا جس سے اسلوب اور صاحب اسلوب کی شخصیت کے اندرونی ربط کو تلاش کرکے اس طرز کے حدود متعین کئے جا سکیں۔ کچھ لوگوں نے نثر کو نثر مرجز، نثر مقفیٰ، نثر مسجع اور نثر عاری میں تقسیم کیا۔ بحر الفصاحت کے مصنف نے سلیس سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ، دقیق رنگین قسم کی اصطلاحات کی مدد سے ان کی گروہ بندی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے اس قسم کی گروہ بندی سے ہمارے یہاں یہ تصور رائج ہو گیا کہ ادبیت کوئی ایسی چیز ہے جو تحریر پر اوپر سے عائد کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے رقعے [illegible] نامے سے لے کر طرز مرصع اور فسانۂ عجائب جیسی داستانیں بیان کرنے یا روضہ تاج گنج کی تعریف میں مضمون لکھنے کے لئے ان نسخوں پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ تحریر میں ادبیت پیدا کرنے کی ضامن ہیں۔

جس طرح شاعری کی اصناف کے اوپری ڈھانچے کو برتنے والا یعنی ردیف و قافیہ اور عروض کے جملہ شرائط کو پورا کرنے والا حقیقی شاعر نہیں بن جاتا بلکہ شاعری محض کلام موزوں سے آگے کی چیز ہے اسی طرح نثر کے کسی پیرائے کو اوپری طور سے برت کر ادبی نثر کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ فن کسی علم، اطلاع یا واقعہ کو بیان کرنے سے آگے کی چیز ہے یہ بیان اگر اوپر سے رنگین بنا دیا جائے یا اس پر کچھ مرصع کاری کر دی جائے تو تحریر پر ادبی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے مگر در اصل وہ ادبی یا تخلیقی ہوتی نہیں ہے۔ فن یا تخلیقی تحریر لکھنے والے کے تجربے، علم، خیالات اس کی داخلی شخصیت اور اس کے لطیف احساسات کے امتزاج اور کیمیاوی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ خارجی علم یا تجربے اور مصنف کی داخلی شخصیت کا یہ امتزاج جتنا بھرپور اور مکمل ہوگا فنی تخلیق اتنی ہی پختہ اور کامیاب ہوگی۔ اچھے فنکار کے یہاں بھی یہ امتزاج ہمیشہ نہیں ہوتا اسی اعتبار سے اس کی تحریر کے مدارج قائم کئے جاتے ہیں اور ان میں بلند و پست اور ادبیت و غیر ادبیت کی حدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

ابرار اعظمی

غزل

عین ممکن ہے دوا درد کی پا لی جائے
کیوں نہ میخانے سے وہ چیز منگا لی جائے

خود پسندی تری تسکین انا کی خاطر،
ایک تصویر خیالی ہی بنا لی جائے۔

شہر تنہائی میں سایہ بھی مرے ساتھ نہیں،
خود کو بہلانے کی کیا شکل نکالی جائے۔

لوگ بازار میں ایمان لئے بیٹھے ہیں،
آج کوئی بھی خریدار نہ خالی جائے

اب نکلتا نہیں سورج کبھی تاریکی کو،
اب شب و روز کی یہ قید اٹھا لی جائے۔

غیر ادبی یا غیر تخلیقی نثر لکھنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے ورنہ کسی زبان کی اہمیت اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا سارا نثری سرمایہ ادبی نثر پر مشتمل ہو اور اس کے سب نثر نگار ادیب یا صاحب طرز نثر نگار ہوں۔ علمی اور سائنسی نثر کی اہمیت اور افادیت خود اپنی جگہ پر ہے بلکہ اس کے بغیر کوئی زبان وقیع نہیں کہی جاسکتی۔ ہر زبان میں ہزاروں کتابیں تاریخ، فلسفہ، نفسیات، معاشیات، سماجیات، سائنس، طب، فن تعمیر اور دوسرے علوم سے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کو اس بات کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان کتابوں کو ادبیات کے دائرے میں لایا جائے یا ان کے لکھنے والوں کو ادب کی تاریخ میں بحیثیت ادیب کے جگہ ملے۔ مگر اس کے باوجود ان کے مصنف عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سرسید جن کو اردو نثر کا معمار کہا بالکل صحیح ہے یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی نثر کو خالص ادبیات کے دائرے سے نکال کر وسعت دیں اور علمی، کاروباری اور عمومی نثر کی افادیت کو بھی عام کریں۔ خود ان کے یہاں دونوں طرح کی نثر کے نمونے مل جاتے ہیں خالص ادبی اور تخلیقی بھی اور خالص علمی اور سائنسی بھی۔ مولوی چراغ علی، محسن الملک، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، عبدالرزاق کانپوری، اور اس طرح کے لکھنے والوں کی میری نظر میں بڑی وقعت ہے کہ انھوں نے اس علمی نثر کے فروغ میں بیش از بیش حصہ لیا مگر بیسویں صدی میں نثری ادب کے تنقیدی اصول رائج نہ ہونے سے بعض غلط فہمیاں رائج ہوگئی ہیں جس کے نتیجے میں ایک طرح کی غیر فطری نثر سے ہمیں اکثر سابقہ پڑتا ہے۔ یہ غیر فطری نثر اس وقت وجود میں آتی ہے جب غیر تخلیقی حیثیت رکھنے والا کسی علم، اطلاع یا کسی اور چیز کو خارجی طور پر حاصل کر کے اسے اپنی شخصیت اور اپنے تخلیقی تجربے سے ہم آہنگ کئے بغیر محض ادبی نثر لکھنے کے لالچ میں اوپر سے رنگ آمیزی کرتا ہے اور محاورات، تشبیہات و استعارات یا کسی کی دوکان سجاتا ہے۔ نثر میں شاعرانہ ٹکڑے جوڑتا اور رعایت لفظی کے کرتب دکھاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس طرح کا لکھنے والا اپنے آپ کو صاحب طرز ادیب سمجھتا ہے اور اپنی نثر کے مقابلے میں حالی، پریم چند، یا عبدالحق کی تحریر پر ترحم کی نظر ڈالتا ہے۔

میرے خیال میں نثر کی ادبیت کا تعلق نہ تو سادگی سے ہے اور نہ رنگینی سے کیونکہ یہ ادبیت کسی میکانکی عمل یا صنعت گری سے نہیں بلکہ تخلیقی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ غیر تخلیقی ذہن خواہ سادہ پیرایہ اختیار کرے خواہ رنگینی کا جامہ پہنے ہر حال میں غیر تخلیقی چیز ہی اس سے برآمد ہوگی۔ شخصیت اگر تخلیقی ہے تو میرامن، غالب، حالی اور پریم چند بھی اسی طرح ادبی نثر نگار ہیں جس طرح سرشار، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور اس طرز کے لکھنے والے۔

جس طرح ایک غیر حقیقی اور جعلی شاعر کو ہم متشاعر کہتے ہیں اسی طرح اس نوع کے نثر نگاروں کے لئے میں کسی اصطلاح کو وضع کرنے کی فکر میں ہوں۔ میرے نزدیک علمی، سائنسی، کاروباری اور عمومی نثر لکھنے والوں کی بڑی اہمیت ہے اور میں ہر زبان کے لئے اخبار نویسوں اور مترجموں کو بھی ضروری اور مفید خیال کرتا ہوں لیکن ادبی نثر کے ضمن میں غیر فطری اور پر تصنع نثر اور جعلی اسلوب کو رواج دینے والوں کو میں نثر کے حق میں ایک مستقل خطرہ سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر کبھی اور تفصیل سے باتیں کروں گی۔

کتابیں ملیں

امیر خسرو
مصنف:- علی عباس حسینی
ناشر:- رفاہ پستک بھنڈار دہلی
صفحات:- ۱۷۴ قیمت:- تین روپے پچہتر پیسے

عروج آدم (مجموعۂ نظم)
مصنف:- رفعت سروش
ناشر:- [illegible] دہلی
صفحات:- ۱۷۶ قیمت:- پانچ روپے

تلاش و توازن
مصنف:- ڈاکٹر قمر رئیس
ناشر:- حرام پبلکیشنز - دہلی
صفحات:- ۲۵۶ قیمت:- ۶٫۵۰

نیا طبقہ
مترجم:- حلیس عابدی
ناشر:- نیشنل اکاڈمی - انصاری مارکیٹ دہلی
صفحات:- ۳۱۷ قیمت:- ایک روپیہ

مخدوم ایک مطالعہ
مصنف:- داؤد اشرف
ناشر:- انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش
صفحات:- ۱۵۳ قیمت:- ۲٫۵۰

انیس انور

مکتوب لندن

اردو اقتباسات

پنجشنبہ کی شب میں نشر ہونے والے بی بی سی کے پروگرام میں پہلی بار اردو میں شائع شدہ دو اقتباسات پیش کئے گئے۔ اس پروگرام کا عنوان ہے "اخبارات کیا کہتے ہیں"۔ یہ پروگرام گذشتہ چھ سات سال سے نشر ہو رہا ہے۔ اردو اقتباسات "برمنگھم پوسٹ" اور "یارکشائر پوسٹ" سے لئے گئے تھے۔ یہ دونوں اخبارات ہفتہ میں ایک مرتبہ اردو داں قارئین کے لئے اردو میں ایک کالم شائع کرتے ہیں اور ان اقتباسات کا تعلق مسٹر یادل کی تقریر سے تھا۔ مائیکل پارکس نے اردو میں شائع شدہ اقتباسات پیش کرنے کی قابل تقلید روایت قائم کی ہے۔ امید ہے وہ اسے مزید جاری رکھیں گے اور بہتر بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

شعبۂ علوم فارسی، مانچسٹر یونیورسٹی

۳ر اپریل کو پروفیسر بوائل، مانچسٹر یونیورسٹی نے پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر برائے لندن جناب افضل اقبال کو یونیورسٹی کے شعبۂ علوم فارسی میں مولانا جلال الدین رومی کی حیات اور فکر و فن پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا۔ معزز مہمان نے اس موقع پر مولانائے روم کی زندگی اور شاعرانہ تخلیقات پر اپنے خیالات کا موثر اظہار کیا۔ آپ نے کہا کہ مولانا جلال الدین رومی نے تیرھویں صدی میں ترکی کے شہر قونیہ میں حضرت شمس تبریز سے فیض حاصل کیا۔ اور ان کی صحبت [illegible] سے حصول فیض کیا۔ آپ نے پچاس ہزار اشعار میں اپنے مرشد کو بارہا خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنی شاعرانہ تخلیقات میں مولانا نے عقل کے مادی تجزیہ کی بجائے عشق کے کیف و مستی سے بھرپور لمحات میں مسائل کائنات کا حل تلاش کیا ہے۔ آپ کی شاعری میں زندگی کا ہر لمحہ تخلیق کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے موصوف نے مزید کہا کہ آج کے صنعتی دور میں فکر مادی روپ دھار رہی ہے۔ سائنس نے ہم سے ہمارا اطمینان و سکون چھین لیا ہے اور [illegible] دور میں مولانا روم کا کلام ہمیں ہمارا گم کردہ ایمان، قلب و اپس دلا سکتا ہے۔

انیس انور

روزِ حساب

دیارِ غرب میں رکھا ہے ظلمتوں نے قدم
سیاہ فام ہیں اب صاحبانِ سیف و قلم
حصولِ زر کا رہا ہے جو سلسلہ پیہم
حساب مانگنے آئے ہیں کشتگانِ ستم
یہ مالِ خام کے انبار کارخانوں میں!
یہ کس کے فن کی نمائش نگارخانوں میں!
نظر فریب ہیں فانوس بھی مکانوں میں!
یہ حسن عطر چمکتی ہوئی دکانوں میں!
ہیں برف خانے میں اشیائے خوردنی وافر
ہیں درسگاہوں میں غیروں کے علم و فن از بر
شراب خانے میں مصروف ہیں ساقی و ساغر
درخت ہوئے ہیں [illegible] مرمریں اکثر
لگے ہوئے ہیں سب ادارے کس کو فرصت ہے
جیالے [illegible] خدمت ہے
[illegible] قیمت ہے
سنبھل سکتے بات کر [illegible] تجارت ہے
عروج [illegible] زوال آمادہ
مثالی صنعت و حرفت زوال آمادہ
نظامِ بزمِ سیاست زوال آمادہ
وہ اجتہاد و روایت زوال آمادہ
کنواری ماؤں کو دیکھی ہے کنواری ماں
منشیات کے طالب کئی ہیں پیر و جواں
خلاف وضع کو آئین کی ملی ہے اماں
قمار خانوں میں نادار کی ہوس عریاں
خبر ہو ہوش کی روزِ حساب آپہنچا
تمہارے حیلۂ زر کا جواب آپہنچا
سنبھل کے بیٹھو زمانہ خراب آپہنچا
کہ سیفِ عصر پہ اب عتاب آپہنچا
تمام نیک و بد اعمال یاد کر لینا
[illegible] کر لینا
مسیحِ پاک کے اقوال یاد کر لینا
جوابِ پرسشِ اعمال یاد کر لینا

ہماری زبان
سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

مراسلات

غالب نگر

ہندوستان کو بہ استثنائے اجمیر شریف اگر کسی شہر پر فخر ہے تو وہ آگرہ ہے، جہاں کا تعمیری شاہکار تاج محل اپنی جگہ لاجواب ہے اور جہاں غالب جیسا انتخاب روزگار پیدا ہوا۔ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کی صد سالہ تقاریب کی کمیٹی نے حال ہی میں صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ آگرہ فورٹ یا آگرہ کے کسی دوسرے اسٹیشن کو غالب نگر کے نام سے موسوم کیا جائے۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل امریکی اور برطانوی سیاحوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہ تجویز زیر عمل لائی گئی تھی کہ آگرہ میں کسی جدید ہوٹل میں تاج محل کے نوادرات اور مصنوعات کی نمائش کی جائے، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ آگرہ میں غالب کی تصانیف اور ان کے مرقع جات کی نمائش کی جائے اور اسے مستقلاً قائم کیا جائے تاکہ نسلاً بعد نسلٍ غالب کو خود ان کی پیشین گوئی کے بموجب ؎

"کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

خراج عقیدت ملتا رہے۔

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری نے سچ کہا تھا کہ

"ہندوستان کو دو مقدس کتابیں حاصل ہوئی ہیں
ایک مقدس وید اور دوسرا کلام غالب"

کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ جس مکان میں غالب کی پیدائش ہوئی تھی اس کو غالب کمیٹی کے حوالے کیا جائے لیکن اس تجویز میں اضافے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ وہ یہ کہ یورپ میں جس طرح مشہور عالم موسیقار MOZART کے لئے SALZBURG، VIENNA میں اس کی پیدائش گاہ کے لئے MOZART MUSEUM قائم کیا گیا اور اس عمارت کے دروازے پر MOZART'S GEBURTSHAUS کی تختی لگی ہوئی ہے۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں تصاویر کے ساتھ اس کو انٹرنیشنل اشاعت کا درجہ بھی دیا گیا ہے۔

اسی طرح آگرہ میں غالب کی نمائش گاہ میں آگرے کا وہ مکان بھی شامل کر لیا جائے جہاں غالب کی پیدائش ہوئی تھی تو نامناسب نہ ہوگا۔ ورنہ امتدادِ زمانہ کے اثرات اور لسانی اور سیاسی آمیزشوں کی وجہ سے خطرہ ہے کہ غالب کا پیدائشی مکان کہیں غالب کے اس مصرع کے حسب حال نہ ہو جائے کہ

"کیونکر ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں"۔ (سید دلدار حسین)

استفسار

مجھے ایک فارسی نظم جس کا عنوان غالباً "تیر و عقاب" ہے کی ضرورت ہے۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عقاب، اپنی نظر، اپنی اڑان اور اپنی طاقت پر غرور کر رہا تھا کہ اتنے میں اس کے ایک تیر آ لگا۔ اس تیر کا پچھلا حصہ اس کے پروں سے ملتا جلتا تھا۔ اس سے عقاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "از ماست کہ بر ماست"۔ اس نظم میں یہ شعر بھی آیا ہے۔

اینش عجب آمد کہ ز چوبی و ز آہن
ایں تندی تیزی و پریدن ز کجا خاست

آگے آخری مصرع میں "از ماست کہ بر ماست" بھی آیا ہے

کسی صاحب کو یہ نظم یاد ہو تو ازراہ کرم "ہماری زبان" کے صفحات کے ذریعہ بقید شاعر اگر ممکن ہو تو اس کے عہد کی وضاحت کے ساتھ مطلع فرمائیں، کرم ہوگا۔

(سید مبارز الدین رفعت)

فتح محمد جالندھری کے حالات زندگی

مجھے مشہور ماہر گرامر مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے حالات زندگی کی ضرورت ہے۔ مجھے ان کی تاریخ پیدائش و وفات، تصانیف کی فہرست اور خاندانی حالات مطلوب ہیں۔ "ہماری زبان" کے خریداروں سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست ہے۔ (ظہیرا)

انجمن ترقی اردو اجمیر کا انتخاب

اجمیر۔ تاریخ ۱۰ مئی ۱۹۶۸ء وقت ساڑھے پانچ بجے شام دفتر انجمن ترقی اردو اجمیر میں ایجنڈے کے مطابق مجلس عاملہ کا جلسہ انتخاب زیر صدارت جناب سید عبد الرؤف منعقد ہوا۔ اور مندرجہ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

جناب سید عبد الرؤف صاحب ریٹائرڈ اڈیشنل کلکٹر صدر
جناب ہردے نرائن سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ نائب صدر
جناب حمید خان صاحب ریٹائرڈ آبکاری سپرنٹنڈنٹ نائب صدر
جناب قاضی سید حفیظ علی صاحب اطہر صدیقی سکریٹری
جناب احتشام اختر صاحب جوائنٹ سکریٹری
جناب ڈاکٹر عبد المنان صاحب راہی جوائنٹ سکریٹری
جناب رام لال صاحب ندیم اسسٹنٹ سکریٹری
جناب مولوی اقبال حسن صاحب خزانچی (سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بنگال کی طرف سے پرویز شاہدی کو خراج عقیدت

کلکتہ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا ایک جلسہ تاریخ ۱۲ مئی سات بجے شام کو ہوا جس کی صدارت صدر انجمن ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونی ورسٹی نے فرمائی۔ یہ جلسہ پرویز شاہدی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا جس میں بیٹی ایم او ہائی اسکول کے دو طلبہ محمد نعیم اختر، مرزا مختار حسین، معصوم رضا کے علاوہ (در شعرا بھی) جناب رضا مظہری، جناب سالک لکھنوی، جناب احمد اللہ افغانی، نزہی، اور رئیس الدین فریدی نے پرویز صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اس عظیم شاعر کی ایک مناسب یادگار قائم کرنے پر زور دیا۔ صدر ریاستی انجمن ترقی اردو بہار جناب غلام سرور ایڈیٹر سنگم پٹنہ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ پرویز صاحب کی مستقل یادگار قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ریاستی انجمن ترقی اردو بہار اور بہار کے عوام کے پورے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

جناب برق انصاری، جناب مضطر حیدری، جناب ادیب احمد ددراں، جناب ریاض غازی پوری اور جناب رفقا مظہری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

محمد شہاب الدین نے پرویز صاحب کی ایک غزل اور علقمہ شبلی نے ان کی آخری غزل سنائی۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل قراردادیں پیش کی گئیں اور حاضرین جلسہ نے دو منٹ خاموش کھڑے رہ کر سوگ منایا۔

پہلی قرارداد میں پرویز صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی وفات کو اردو زبان و ادب کے لئے ایک سانحہ عظیم تصور کیا گیا ہے۔ اور انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان اور وابستگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کی گئی ہے

اس تعزیتی قرارداد کے علاوہ یہ تجویزیں بھی منظور ہوئیں کہ کلکتہ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کو علیحدہ حیثیت دی جائے نیز کسی ریٹنگ" کا نام بدل کر" پرویز شاہدی رینج" کر دیا جائے۔ ان کی ایک مناسب یادگار قائم کی جائے جس کی تفصیلات انجمن طے کرے گی۔ نیز یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ انجمن دوسری ادبی انجمنوں کے اشتراک سے ایک اسا مرکزی اور مشترکہ تعزیتی جلسہ کرے جس میں نہ صرف اردو والے بلکہ بنگلہ، ہندی اور انگریزی کے ادبا، دشعرا اور دوسرے لوگ بھی شریک ہوں اس جلسے میں پیش کئے گئے تاثرات کو دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

(علقمہ شبلی اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کلکتہ)

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا توسیعی خطبہ

دہلی ۹ مئی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدر شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ۳۱ مارچ سن ۱۹۶۸ء کو ٹیوٹوریل بلڈنگ ایف میں ادبی اقدار کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی نے انجام دئے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ادبی اقدار پر بحث کرتے ہوئے ان مختلف عوامل اور محرکات پر روشنی ڈالی جن سے کسی دور کی ادبی اقدار وجود میں آتی ہیں انھوں نے کہا کہ دراصل ادب اور زندگی میں ایک زیریں رشتہ ہے ادب زادی موثر حال اور رویے مل کر وجود میں آتا ہے بڑا ادب عصری مسائل سے دست وگریبان ہونے سے پیدا ہوتا ہے اور اس عمل میں وہ اپنے عصر سے ماورا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ادبی اقدار مکمل اضافی بھی ہیں اور ابدی بھی۔ اور فن کار جس حسن کی تشکیل کرتا ہے وہ بدصورتی سے بھی عبارت ہوتا ہے علاوہ حسن کاری میں بدصورت اور کریہہ عناصر کو بھی فن کار خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتا ہے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ فن کا صحیح عرفان جذبات اور خارجیت تعلیم اور تحسین کے توازن سے پیدا ہوتا ہے اور اس لئے آرٹ کی بنیادی قدر مرکزیت اور ہم آہنگی CENTRALITY AND INTEGRATION کو قرار دیا جا سکتا اصالت پسندی اور سنگ ریزی غرض یہ کہ خطیب نے ناولوں کی اہمیت ہوتا ہے وہ دوسروں [illegible] رکھتا ہے۔ توسیعی خطبے کے بعد ڈاکٹر محمد حسن نے معزز مقرر اور حاضرین کا شکریہ [illegible]

[illegible]

جدید ہندی اور اردو ادب میں ترقی پسند میلانات پر مذاکرہ

علی گڑھ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کی ادبی انجمن 'سنگم' کی جانب سے ہندی اور اردو میں ترقی پسند رجحانات پر ایک سیمینار ۱۶ اور ۱۷ مارچ کو منعقد ہوا۔ جس میں مقامی ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد عقیل، صدیق الرحمان قدوائی اور شریف احمد صاحب نے شرکت کی۔ افتتاحیہ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کی۔ سیمینار کا افتتاح ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے ادیب کی سماجی ذمہ داریوں پر زور دیا اور کہا۔ "ادیب کو سوچنا چاہئے کہ وہ اپنے قلم اور خیالات سے کس قسم کی دنیا پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے سماج اور فرد کو کس سمت میں لے جانے کا خواہش مند ہے۔" انھوں نے مزید کہا۔ "فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ سماجی عمل ادب کا ہے اور اسی لئے اس کا ذریعہ زبان ہے جو خود سماجی عمل کی مرہون منت ہے۔ اس لئے تجریدی مصوری تو شاید ممکن ہے مگر ان معنوں میں تجریدی زبان اور ادب ممکن نہیں جو صرف مصنف کے لیے ہو اور کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔" ترقی پسندی کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر علیم نے کہا کہ ترقی پسندی کسی فیشن یا فارمولے کا نام نہیں۔ وہ کوئی بندھا ٹکا نقطۂ نظر بھی نہیں بلکہ وہ انسانی تعلقات، فکر اور جذبے کی، افراد اور معاشرے کی کشمکش اور ہم آہنگی کی خواہش کے حقیقت پسندانہ اظہار سے عبارت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کشمکش کی عکاسی تو ہو مگر ادبی اور شعری تقاضے پورے نہ ہوں اس صورت میں فن کار گویا اپنے منصب کو پورا نہیں کر سکے گا۔ ترقی پسند ادیبوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں ادبی اور شعری حسن کو محفوظ رکھیں اور اعلیٰ فنی قدروں کو اپنائیں۔

جدیدیت کے بعض گمراہ کن متعلقین کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو لوگ ادب کی سماجی ذمہ داری سے انکار کرتے ہیں وہ روٹی، روزی اور سماجی منصب کے حصول کے لئے عام انسانوں کے سے تمام گر استعمال کرتے ہیں لیکن ادب میں اپنے کو عام انسان سے اور سماج سے الگ تھلگ اور غیر متعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیا سماج کو اس کا حق نہیں کہ وہ بھی اپنے کو غیر متعلق قرار دے سکے آپ نے مزید فرمایا کہ جو ادب کسی کی سمجھ میں نہ آئے یا ترسیل سے بے پروائی برتے میں اسے سماج دشمن سمجھتا ہوں۔ نئی بات کہنے کی خواہش بہت مبارک ہے لیکن اس کوشش میں ہمیں ادب کے بنیادی منصب کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر علیم کی تقریر سے پہلے کنور پال سنگھ نے اپنی مختصر تقریر میں سیمینار کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اردو اور ہندی میں نئے ترقی پسند رجحانات کا جائزہ لیا جائے اور ان پر کھل کر بحث کی جائے۔

سید سجاد ظہیر صاحب نے اپنے مقالے میں شاعری میں فنون لطیفہ کے آغاز اور اس کے سماجی روابط پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا "ترقی پسند تحریک ادبی سطح پر استحصال پسندی، بیگانگی اور اجتماعیت دشمن رجحانات کے خلاف جدوجہد کرتی ہے مجھے افسوس ہے کہ بعض اشخاص کی غلطیوں یا ہماری تنظیمی کمزوریوں کو دلیل بنا کر اس جدوجہد کو مطعون کیا جاتا رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے میں ان کمزوریوں اور غلطیوں کے لئے معافی مانگنے پر تیار ہوں بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس کی جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جدوجہد آج نہ صرف جاری ہے بلکہ ضروری اور ناگزیر بھی ہے۔"

سجاد ظہیر صاحب کے بعد ڈاکٹر نامور سنگھ نے جلسہ کو خطاب کیا اور کہا کہ ترقی پسندی کے مفہوم پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے یورپ میں ترقی پسند اور مارکسی نقادوں کے مختلف میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لوکاس، کارڈویل، فاکس اور دوسرے دانشوروں کے خیالات کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ آج کے حالات میں ترقی پسندی ہی نہیں مارکس ازم کا بھی سخت گیر تصور ممکن نہیں۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنا مقالہ "جدیدیت نئی ترقی پسندی" پڑھا۔ اور کہا کہ جدیدیت کے نام سے جو رجحان سامنے آ رہا ہے نہ صرف ایک گروہ سے عبارت نہیں بلکہ اس میں کئی گروہ شامل ہیں۔ ایک بے چینی کو جو قدیم اقدار کے ٹوٹنے اور نئے صنعتی شکنجہ سے پیدا شدہ پابندیوں سے پیدا ہوئی ہے عقل دشمن اور سماج دشمن فلسفوں کے رنگ میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جدیدیت پسندوں میں بھی ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو صورت حال میں تبدیلی کا خواہاں ہے مگر تبدیلی کی سمت اور اس کے ذریعہ کا تعین نہیں کر پاتا۔ گویا وہ ارباب اقتدار کا آلۂ کار بننے کو تیار نہیں ہے اور اسی لئے مبہم اشاریت، مایوسی اور تنہائی میں پناہ لینا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر عرفان حبیب نے سماجی علوم میں مارکسی مطالعے کے مسائل پر مقالہ پڑھا اور بتایا کہ مختلف مورخین نے کس طرح ہندوستان کی تاریخ کو طبقہ داری اور جدلیاتی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے فرمایا کہ پچھلے دو تین سال میں برابر ترقی پسند مصنفین کے قیام کی ضرورت پر گفتگو ہوتی رہی ہے میرا یہ خیال تھا کہ مصنفین کے لئے ترقی پسندی کی صفت لگانا یا ان کو انجمن کی شکل میں منظم کرنا غیر ضروری ہے مگر مجھے سال بھر سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ موجودہ حالات میں نہ صرف تنظیم کی ضرورت ہے بلکہ نئے سرے سے ترقی پسندی کے مفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے

[illegible] جو ہندوستانی ذہن کو بیج معنوں میں جدید یا ترقی پسند اور سائنٹفک ہونے سے روک رہے ہیں۔ دوسری طرف ان عناصر سے لڑنا پڑے گا جو کبھی ہندوستان کی روحانیت کی دہائی دے کر اس کی پس ماندہ زراعت اور رجعت پسندانہ نظریات کو دل فریب اور خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر نامور سنگھ نے کہا کہ شمالی ہندوستان کے دانشوروں پر اس دور میں خاص طور پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان علاقوں میں عوامی تحریکیں کمزور ہیں اور اسی وجہ سے طرح طرح کے غیر صحت مند رجحانات فضا کو مسموم کر رہے ہیں اس صورت حال میں ترقی پسندوں سے نئی آگاہی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ادب میں مختلف تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ترقی پسند تکنیک میں تجربوں کے منکر نہیں جو لوگ بد دست کا تذکرہ ترقی پسندی کی مخالف تحریک کی شکل میں کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس تحریک کے امام ایبیٹ ہی نہیں برشٹ بھی ہیں اسی صف میں لورکا اور لوئی اراگاں بھی ہیں لوکاچ نے کہا کہ خود سارترے اس بات کو واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ آج کا فلسفہ تو مارکسیت ہے وجودیت محض ایک نظریہ ہو سکتا ہے۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

تیسری نشست کا آغاز صدیق الرحمٰن قدوائی نے کیا انھوں نے کہا کہ فنکار کو وہی کرنا چاہئے جو اس کا ضمیر کہے۔ اگر وہ ایسی قدروں پر ایمان رکھتا ہے جو ظلم و ناانصافی کی مخالفت میں ہوں تو وہ جو کچھ کہے گا وہ ترقی پسندی سے بھرپور ہوگا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مقالے میں ترقی پسندی کی مختلف توضیحات پر غور کیا انھوں نے کہا کہ ترقی پسند فنکار اور ناقد ماضی کی خامیوں اور کمزوریوں کو یکسر چھوڑ نہیں سکتا لیکن ماضی سے تعلق استوار کر کے صرف اس کی تعریف کرتے رہنے میں خطرات ہیں یہ راستہ ہمیں احیا پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ ترقی پسندی تاریخ کو ایک زندہ حقیقت کی شکل میں مانتی ہے اور وہ ماضی کے ادبی خزانے کو خام مال تصور کرتا ہے جس سے نئی عمارت کی تشکیل ہوتی ہے۔

بحث کا آغاز کرتے ہوئے قاضی عبدالستار نے کہا کہ ترقی پسند نقادوں نے کرشن چندر اور خاص طور سے نئی کہانیوں کو دیانت داری سے نہیں پرکھا ہے سردار جعفری نے سماجی جبر کی

جو تعریف کی ہے اسے رومان اور انقلاب سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ فنکاروں کی نئی پود ہدایت نہیں چاہتی بلکہ سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کہا کہ ہمیں اپنے کلاسیکی ادب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مارکس نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی کہیں بھی وضاحت نہیں کی ہے اس وجہ سے مارکسی نقطۂ نظر پر غور کرتے ہوئے آمریت کے خطرے کو بھی سامنے رکھنا چاہئے تخلیقی صلاحیت رکھنے والے فنکار کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مسائل و واقعات کو اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ سمجھ سکے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے تھی کہ ہمیں نئے اور پرانے ترقی پسندوں کے درمیان بنیادی اختلافات پر زیادہ زور نہیں دینا چاہئے بلکہ یہ بات پیش نظر ہونی چاہئے کہ اس دور میں سماجی انصاف کی مانگ کے راستے میں کون سی طاقتیں حائل ہیں ان طاقتوں کے کون لوگ ساتھی ہیں اور ان کا کون مخالف ہے۔ ڈاکٹر ظہور کا کہنا تھا کہ نئی ترقی پسندی سیاسی فارمولوں پر زور نہیں دیتی اس کا رجحان ایک نئے رویے اور نئے خیالات پر زیادہ ہے

اس نشست کے صدر سید سجاد ظہیر نے کہا کہ ادبی مسائل کا حل ادبی شکل ہی میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ آج کی ترقی پسندی ۱۹۳۶ء کی ترقی پسندی نہیں ہو سکتی ہے۔ ادب میں نئے تجربات کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہئے جدیدیت، صرف ہیئت اور فارم کا مسئلہ نہیں اس لئے اس میں کچھ اچھے اور کچھ برے کی تمیز کرنی ہی پڑے گی جدیدیت کے سلسلہ میں لوگ یورپ کے فنکاروں کا ذکر کرتے ہیں اور ترقی پسند جدید فنکاروں مثلاً برشٹ داز نوسکی پوتھ تنکو پال ایلیار لوئی اراگاں یا امریکہ کے فاکنر آرتھر ملر اور ہمنگ وے تک کو فراموش کر دیتے ہیں آخر میں انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ اس سمینار کا اثر ترقی پسند تحریک اور تہذیب پر پڑے گا اور یہ سمینار اس قسم کی کوششوں کا صرف آغاز ثابت ہوگا۔

چوتھی نشست مشاعرے کے لئے وقف تھی۔

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھیں ہوں۔ (ادارہ)
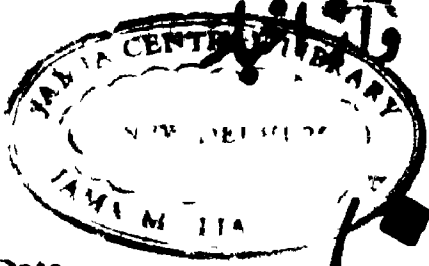
[illegible] مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

12 SEP 1969

R. No. 2186457

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29

Annual Rs. 5/-

per Copy—15 P

Date

1-8-15-22

جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۲۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ جون ۱۹۶۸ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ

(۲)

ابتدائی اور ثانوی تعلیم اقلیتوں کی زبان میں دینے کے لیے اساتذہ کی مسلسل تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ریاستی حکومتوں میں اس حقیقت کا پورا احساس نہیں ہے۔ اتر پردیش کی حکومت نے یہ تو لکھ دیا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے لیے کوئی استاد اسی صورت میں مقرر کیا جا سکے گا۔ جب وہ اردو میں مناسب صلاحیت رکھتا ہو اور ہندی بھی جانتا ہو، مگر کمشنر کا یہ فقرہ اس سلسلے میں خاص توجہ کا محتاج ہے "اتر پردیش میں اقلیتوں کی زبانوں میں استادوں کی تربیت کے لیے کسی قسم کی سہولتیں نہیں ہیں" اس سے زیادہ بلیغ تبصرہ ریاستی حکومت کے رویے پر اور کیا ہو گا۔ کچھ ریاستی حکومتوں نے یہ عذر کیا ہے کہ اقلیتی زبانوں کے استادوں کے لیے علیحدہ تربیتی اداروں کی کیا ضرورت ہے کیونکہ تربیت کا نصاب تو یکساں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عام تربیتی اداروں میں ان استادوں کی تربیت کے ساتھ اقلیتی زبانوں میں تعلیم کی تربیت کا بھی انتظام ہو تو کوئی حرج نہیں، مگر یہ انتظام بھی نہ ہو اور مخصوص ادارے بھی اس غرض سے نہ کھولے جائیں۔ یہی چیز اقلیتوں کو خاص طور پر تکلیف دیتی ہے۔ کمشنر کو اس ضرورت کا پورا احساس ہے اور وہ برابر ریاستی حکومتوں کو توجہ دلاتے رہتے ہیں۔

اتر پردیش کی حکومت کو جب انجمن نے توجہ دلائی کہ ہائی اسکول کے امتحان میں طلبہ اردو میں جوابات نہیں لکھ سکتے گو کاغذ پر اس کی اجازت ہے تو حکومت نے کہا کہ اس اجازت سے جو فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے مگر کمشنر کی آٹھویں رپورٹ میں اصل حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ صفحہ ۲۰ پر تعلیمی اعداد و شمار کے عنوان کے تحت کمشنر نے لکھا ہے کہ "ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن اتر پردیش کے بورڈ نے جو قواعد وضع کئے ہیں ان میں ثانوی تعلیم اقلیتوں کی زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔" یعنی تعلیم کے لیے تو سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی طالب علم صرف جوابات اردو میں دینے کے لئے درخواست کرتا ہے تو ایک دوسرے قاعدے کے تحت اسے صرف اس وقت اجازت دی جا سکتی ہے جب اس نے ہندی کے ذریعہ سے پڑھنے کے بجائے اردو کے ذریعہ سے پڑھا ہو۔ یعنی اردو کے ذریعہ سے طالب علم پڑھ نہیں سکتا اور چونکہ اردو ہی پڑھنے کا اسے موقع نہیں ملا اس لئے اجازت ہے جو جوابات اردو میں لکھنے کے لئے ہے۔ مناسب فائدہ نہیں اٹھا سکتا چلئے چھٹی ہوئی کاغذ پر یہ ہدایت باقی رہ گئی کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو خصوصی طور سے اجازت دینے کا اختیار ہے اس میں ترمیم کے لئے ریاستی حکومت تیار نہیں ہے۔ صفحہ ۵۵

جہاں تک لسانی اقلیتوں کی شکایات کا سوال ہے، کمشنر نے ہر شکایت کے موصول ہونے پر ریاستی حکومتوں کو توجہ دلائی ہے کچھ ریاستی حکومتوں نے بعض شکایات کو دور کرنے کے لئے احکام بھی جاری کئے ہیں۔ مگر اتر پردیش کی حکومت اپنی وضع پر بڑی حد تک قائم ہے۔ اقلیتی زبانوں کے سرکاری کاموں میں استعمال کا جہاں تک سوال ہے۔ کمشنر نے کہا تھا کہ ریاستوں کی نئی تنظیم کی کمیشن کی سفارشات اور بڑے وزیروں کی کانفرنس کی سفارشات کی روشنی میں ان تحصیلوں یا میونسپلٹیوں میں جہاں لسانی اقلیت کل آبادی کی پندرہ سے بیس فیصد ہے، اقلیت کی زبان میں تمام اہم قواعد اور قوانین شائع ہونے چاہئیں مگر ریاستی حکومت ضلع کو ایک انتظامی اکائی مانتی ہے اور اس سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کمشنر نے پھر اپنی سفارش دہرائی ہے کہ اقلیتوں کو یہ سہولت ملنی چاہئے۔ [illegible] حال میں اتر پردیش کی حکومت نے [illegible]

[illegible]وں میں خاص خاص قوانین کی پبلسٹی کرنے کے لئے احکام جاری کئے ہیں، مگر قوانین کے خلاصے سے کام نہیں [illegible] چلے گا بلکہ پورا قانون با اعلان ہونا چاہئے۔

کمشنر نے ریاستی حکومتوں کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ اقلیتی زبانوں میں عرضیاں لے لی جائیں اور ان کے جوابات بھی اس زبان میں دئے جائیں۔ بیشتر ریاستی حکومتوں نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اترپردیش کی حکومت نے بھی تحریر نہیں کہا جاسکتا کہ واقعی ہر عرضی کا جواب اسی زبان میں دیا جاتا ہے یا نہیں کمشنر نے اترپردیش کی حکومت کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ جب پارلیمنٹ کی روداد میں اردو میں تقریریں، اردو رسم خط میں چھپتی ہیں تو اترپردیش کی مجلس قانون سازکی وہ تقریریں جو اردو میں کی جاتی ہیں اردو میں کیوں نہیں چھاپی جاسکتیں؛ مگر یو۔پی ریاستی حکومت اپنی سرکاری زبان ہندی کے دقار کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ تو اردو اور ہندی میں کوئی بنیادی فرق ہی نہیں سمجھتی۔ کمشنر نے اس سلسلے میں پھر یاددہانی ضروری سمجھی ہے (صفحہ ۸) سمن اور عدالتی نوٹس کے متعلق ریاستی حکومت کا صاف انکار ہے (صفحہ ۸) مقابلے کے امتحانوں میں لازمی ہندی کے پرچے کے سلسلے میں کمشنر دفعہ توجہ دلا چکا ہے۔ اب بھی کمشنر کو کہنا پڑا ہے کہ اس معاملے میں حکومت کے عمل کا ابھی علم نہیں صفحہ ۹۳۔ یہ معاملہ سنٹرل زونل کونسل میں بھی آچکا ہے اور ریاستی حکومتوں کے نمائندے یہ وعدہ کرچکے ہیں کہ وہ اپنے طریقہ کار پر نظر ثانی کریں گے مگر ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے۔

کمشنر نے خاص طور پر اس بات پر افسوس کیا ہے کہ اقلیتوں کی شکایات کی تحقیقات اور ان پر مناسب کارروائی میں ریاستی حکومتیں بہت تاخیر سے کام لیتی ہیں صفحہ ۱۱۔ اگر ان معاملات میں پھرتی سے کام لیا جائے اور جہاں کارروائی ضروری ہو فوراً کردی جائے تو وہ بددلی اور نا یقینی جو اقلیتوں میں ہے، ضرور کم ہوسکتی ہے۔ اب پارلیمنٹ اور صدر جمہوریہ دونوں کا یہ فرض ہے کہ کمشنر کی رائے کی روشنی میں اس نا انصافی اور تساہل کو دور کرائیں کمشنر نے اپنا فرض ادا کردیا ہے۔

فاروق دیوانہ کا انتقال

علی گڑھ۔ یہ خبر نہایت رنج سے سنی جائے گی کہ ۱۳ رمئی کو گورکھپور میں فاروق دیوانہ کا انتقال ہوگیا۔ فالج کے حملہ کے باعث عرصہ سے علیل تھے۔ ریاضی کے علاوہ عربی فارسی اردو ادب پر گہری نگاہ تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد میں کام کرنے کے علاوہ ایم اے او کالج میں ریاضی کے استاد بھی رہ چکے تھے۔

شمسی طہرانی

محمد فاروق دیوانہ مرحوم

وہ فاروق وہ مردِ عظمت نشاں
خلافت کی تحریک کا رازداں
وہ جس کے ثناخواں بہ حسنِ عمل
محمد علیؒ اور شوکت علیؒ
وہ علم و ادب کا نشانِ جلیل
بہ دل رودِ کوثر، بہ حال جبرئیل
سراپا محبت، مجسم وفا
خلوص و شرافت کا وہ دیوتا
ریاضی صداقت کی تفسیر تھا
حقیقت پسندی کی تصویر تھا
علی گڑھ نے آگے بڑھایا جسے
وطن نے گلے سے لگایا جسے
وہ صد حیف دنیا سے اب چل بسا
کہ روتی ہے خوں جس کے غم میں قضا
چو دیوانہ شد سوئے دار رفیق
قضا گفت "بادا برحمت غریق"

۱۹۶۸ء

فاروق بانسپاری کی وفات

کانپور ۲۰ ر جون ملتمرا رود ضلع ملیا سے ایک اطلاع مظہر ہے کہ ۲۹ رمئی کی شب میں فاروق بانسپاری کی وفات ہوگئی فاروق صاحب شاعر، ادیب، صحافی اور بڑے مخلص نیک سیرت اور خدا ترس انسان تھے۔ (ریاست)

نذرالاسلام کی سوانح حیات

نئی دہلی۔ انقلابی شاعر نذرالاسلام کی ۶۹ ویں سالگرہ کے موقعہ پر نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے ان کی سوانح حیات انگریزی میں شائع کی گئی ہے۔ اب اس کتاب کا ترجمہ تمام ہندوستانی زبانوں میں ہوگا۔ یہ سوانح حیات ایک ممتاز صحافی جناب سبودھا مکر درتی نے ترتیب دی ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں قاضی نذرالاسلام نے انتہائی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

عمر خیام کی ۹۲۰ ویں سالگرہ

سمرقند۔ فارسی کے مشہور شاعر عمر خیام کا ۹۲۰ ویں جنم دن وسطی ایشیا کے متعدد شہروں میں خصوصاً سمرقند میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ (الجمعیۃ)

تحریر: احمد کسروی
مترجم: کبیر احمد جائسی (علیگ)

آذربایجان کی قدیم زبان اور لوگ

(ایک زمانہ میں ترکی میں یہ تحریک چلی تھی کہ وہ ترک جو ترکی کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بس گئے ہیں ان سب کو متحد کرکے "عظیم ترک قوم" کی بنا ڈالی جائے، اس سلسلہ میں ترکوں کی خاص نظر ایران کے صوبہ آذربایجان پر تھی جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔ ترکوں کی اس کوشش نے ایرانیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہاں کا دانشمند طبقہ علمی اور لسانی حیثیت سے اس تحقیق پر آمادہ ہوا کہ اس دعوی کی اصل کیا ہے؟ ایک ایرانی فاضل احمد کسروی مرحوم نے اس موضوع پر ایک کتابچہ تصنیف کیا جس کا نام "آذری یا زبان باستان آذربایجان" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ترکوں کے دعوے کی علمی انداز سے تردید کی ہے۔ زیر نظر مقالہ اسی کتاب کے باب اول کا آزاد ترجمہ ہے۔ اگر قارئین نے اس سلسلہ کو پسند کیا تو مذکورہ کتاب کے دوسرے ابواب کا بھی ترجمہ ہماری زبان میں پیش کیا جائے گا۔ مترجم)

وہ تاریخ داں جو ان علمی کوشش سے واقف ہیں جن کے گرانبہا نتائج نے تاریخ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے، یہ جانتے ہیں کہ اب سے تین یا چار ہزار سال پہلے ایک قوم کے لوگ جس کا نام آریان یا ایران (ERAN) تھا اپنے مسکن سے کوچ کرکے ایشیا اور یورپ میں بس گئے ان میں سے ہر گروہ جہاں بھی پہنچا اور جس سرزمین کو بھی اپنا وطن بنایا وہاں کے لوگوں پر غالب آیا اور اپنی حکومت قائم کی اس طرح انھوں نے تاریخ کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ جیسے یونانی اور رومی، جس سے یورپین تہذیب کی بنیاد ڈالی اور انھوں نے تاریخ کی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کی اور جرمن کہ انھوں نے مغربی روم کو فتح کیا اور اپنے جوش میں انھوں نے تاریخ یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، یہ سب لوگ آریان یا ایرانی (ERANI) اسی طرح وہ لوگ جو ایران (ERAN) کے پشتہ تک پہونچے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا ان میں سے تین خاندانوں نے جو ماد، پارت اور فارس کے نام سے مشہور ہیں اپنی اپنی باری پر حکومتیں قائم کیں، یہ سب کی سب حکومتیں عظیم ترین اور کامیاب ترین ایشیائی حکومتیں تھیں۔

اگرچہ ان لوگوں کا اپنے مسکن سے کوچ کرنا اور یورپ میں پھیل جانا زمانہ ماقبل تاریخ میں واقع ہوا تھا اور اس زمانے کی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں ہے لیکن وہ اشارے جو اس بارے میں اوستا وغیرہ میں ہیں اور وہ علمی کوششیں جو اس میدان میں ہوئی ہیں ان سب نے اس بات کو روشن اور واضح کردیا ہے۔

آج ہم اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ آریان یا ایران اپنے کوچ سے پہلے قطب شمالی کے برفستان کی طرف رہتے تھے جس کو اوستا میں "آئریا ویجو" کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ وہاں دس ماہ تک جاڑا رہتا ہے اور صرف دو ماہ گرمی رہتی ہے۔

یہ باتیں تاریخ میں واضح ہیں اور ان پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کہ ایران یا ایر کے لوگ جب پشتہ ایران تک آئے تو ان میں سے ایک بڑے خاندان نے جس کو ماد کہا جاتا ہے شمالی مغربی ایران پر قبضہ کیا جس میں آجکل آذربایجان، ہمدان، کرمانشاہان، قزوین اصفہان اور تہران کے شہر ہیں، اور یہ سرزمین ان کی نسبت سے سرزمین ماد کہی جاتی ہے۔ جس میں سے آذربایجان کو "ماد خرد" اور دوسرے حصے کو "ماد بزرگ" کہا جاتا تھا۔ وہ عظیم تاریخی کارنامے جو آل ماد نے انجام دیئے (آشوری حکومت کا خاتمہ اور سوریا و ایشیائے کوچک تک پیش قدمی) ناقابل فراموش ہیں۔

پس جیسا کہ آپ حضرات نے دیکھا آذربایجان آغاز تاریخ ہی سے لوگوں اور زبانوں کی آمدورفت کی وجہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس پر بحث ومباحثہ کی ضرورت نہیں ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایرانی جب یہاں آئے اور انھوں نے یہاں کے لوگوں کو مغلوب کیا تو دونوں نسلیں آپس میں مل گئیں لیکن یہ بات ہر جگہ ہوئی ہے اور ہم اس بات کے کہنے کے درپے نہیں ہیں کہ آذربایجان کے لوگ صرف ایرانیوں سے مخلوط ہوئے اور دوسرے لوگوں سے بالکل مخلوط نہ ہوئے کیونکہ یہ بات لغو ہوگی اور ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرنا بھی عقلمندی کے خلاف ہوگا۔

ہم سچائی کی تلاش میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ جس طرح تھا اسی طرح پیش کریں اس لئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تین ہزار سال پہلے جو آغاز تاریخ کا زمانہ تھا اس زمانے میں آل ماد آذربایجان اور اس کے اطراف میں آباد تھے، اور اگر کوئی شخص تاریخ سے واقف ہے تو یہ جانتا ہوگا کہ اب سے دو ہزار سال پہلے تک ترک وسط ایشیا میں رہتے تھے اس لئے کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی لغو ہے کہ آذربایجان ترکوں کا اولین مسکن تھا اور اس طرح کی باتوں سے کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا۔

اس سے قبل اس نسل اور قوم کے تھے جس کی سمجھ میں جو کچھ آتا لکھتا، تورات میں ایرانیوں کا تذکرہ عربوں کے ساتھ کیا گیا ہے مسعودی اور دوسرے مورخوں نے کردوں کو "بنی معز" سے متعلق لکھا ہے لیکن یہ تمام باتیں لغو ہیں اور ان پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آج کے دور میں کسی نسل کے اصل تک پہونچنے کا خاص ذریعہ اس کی زبان شناسی کو سمجھتے ہیں۔

آذربایجان کے سلسلہ میں اور باتوں کے علاوہ ایک عمدہ نمونہ ان کی قدیم زبان کا بھی ہمارے سامنے موجود ہے اور وہ اوستا ہے، کیونکہ حضرت زردشت جیسا کہ لوگوں نے لکھا ہے آذربایجان ہی میں پیدا ہوئے اور خود اوستا کی زبان یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ شمال میں پیدا ہوئی۔

یہ آغاز تاریخ اور آل ماد کے زمانے کی باتیں ہیں۔ جب ہم ہخامنشیوں، سکندر، سلوکیان، اشکانیان اور ساسانیان کے زمانے تک آتے ہیں اور ہر ایک دور پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آذربایجان پر ایسا کوئی حملہ نہیں ہوا جس سے وہاں کے لوگ مغلوب ہوکر مفتوح قوم کے دست کش ہوتے۔

سکندر کے زمانے میں ضرور آذربایجان فتح ہوا جس کی نشانیاں وہاں کی زبان میں دیکھی جاسکتی ہیں اس کی بہترین مثال خود لفظ "آذربایجان" ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس خطہ کو گذشتہ زمانے میں "ماد خرد" کہا جاتا تھا۔ لیکن جب سکندر ایران آیا اور پورے ملک پر اس کا قبضہ ہوگیا تو آذربایجان کا ایک شخص "آتورپات" نامی اٹھا اور اس نے آذربایجان پر قبضہ کرلیا وہ جب تک زندہ رہا وہاں کی فرمانروائی کرتا رہا اسی وجہ سے بعد میں یہ سرزمین "آتورپاتکان" کے نام سے مشہور ہوئی اور یہ وہی لفظ ہے جو بگڑتے بگڑتے آذربایجان ہوگیا ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آتورپات کے خاندان نے صدیوں تک بادشاہت کی اور سلوکیان و اشکانیان کے زمانے میں ان کی حکومت قائم تھی۔

اگرچہ اس لفظ آذربایجان کے بھی لوگوں نے عجیب عجیب معنی بیان کئے ہیں جیسے برہان قاطع یا دیگر کتابیں، لیکن ان کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب لایعنی ہے اور علم و دانش کے بازار میں اپنی کوئی وقعت نہیں رکھتا، بلاشبہ آذربایجان ایرانی نام ہے اور ہم نے اس کے معنی بارہا بیان بھی کئے ہیں۔

اشکانیوں کے زمانے میں ایران کے غربی علاقہ کی طرف ترکوں نے پیش قدمی کی اور ایران کے بہت نزدیک ہوگئے لیکن وہ فتح مندی و کامرانی جو اشکانیوں کے نام سے عبارت ہے اس بات کے ماننے میں سد راہ ہے کہ ترکوں کا کوئی دستہ ایران میں گھس آیا ہو چنانچہ تاریخوں میں بھی ہم کو اس طرح کی کوئی بات نہیں ملتی۔

ساسانیوں کے زمانے میں بھی ترک ایران سے نزدیک تھے اور شمالی ایران اور قفقاز کی سمت سے ایرانیوں کے ہمسایہ ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس بات کا گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ آذربایجان میں گھس آئے ہوں گے، ہاں البتہ تاریخ میں ہم ایسے لوگوں کی ضرور نشاندہی کرسکیں گے جن کو ساسانی بادشاہوں نے جنگ میں قید کرکے آذربایجان کے مختلف حصوں میں بسا دیا تھا۔ لیکن اس طرح کے لوگ خود ایرانیوں ہی میں گھل مل گئے اور ان کا اپنا کوئی وجود باقی نہ رہا۔

آذربایجان میں نہروں، شہروں اور پہاڑوں کے نام۔ ایک خاص چیز جو کسی نسل اور قوم کے لوگوں کی زبان اور سرزمین متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ان کے شہروں، دریاؤں، نہروں، دیہاتوں کے پہاڑوں کے نام ہیں کیونکہ ان ناموں کو ہر شخص استعمال کرتا ہے اور کثرت استعمال سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ آج آذربایجان کے بہت سے نام ایسے ہیں جن کے معنی ہم کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں لیکن بلاشبہ تمام کے تمام بامعنی الفاظ تھے اور جب ہم تحقیق کی رو سے ان ناموں کے معنی تلاش کرتے ہیں تو بیشتر علیحول پر ہم کو کامیابی ہوتی ہے۔

اس بات کو بلا کسی بحث کے قبول کرلینا چاہئے کہ پہاڑوں دریاؤں، نہروں، دیہاتوں اور شہروں کے جو نام رکھے گئے وہ ان لوگوں کی زبان کے الفاظ ہیں جنھوں نے ان کی بنا ڈالی اور یہ سب کے سب بامعنی الفاظ تھے اور آج بھی اسی نہج پر قائم ہیں جس نہج پر ان کے نام رکھے گئے تھے۔

اگر ہم آذربایجان کے دریاؤں، شہروں، دیہاتوں، نہروں اور پہاڑوں کے ناموں پر غور کریں تو بہت سے نام ہم کو ایسے ملیں گے جن کے معانی کا ہم کو علم نہیں ہے جیسے تبریز، خوئے، سلماس، اردی، دیکوبہ، لیلادا، الوار، آستار، ادجان، ارس، اذ نا بیہ، اور اسی طرح کے دوسرے نام۔

دوسرے قسم کے وہ آذربایجانی الفاظ ہیں جن کو اگر ہم زبان شناسی کی کسوٹی پر کسیں تو ان کے معانی تک پہونچ سکتے ہیں مثلاً مرن، آردنق، مارالان، مایال، گہرام دز (گرما دوز) مراغہ، گیلا وندوز، دلیگان، کاراردو، قارقا بازار اور باسی طرح کے دوسرے الفاظ۔

تیسرے قسم کے وہ الفاظ ہیں جو بامعنی ہیں مثلاً سردرود، گرم رود، زرین رود، گردہ، روئین دز، ہشتادسر، باکو وغیرہ

(باقی آئندہ)

طیب انصاری

روزنامہ پیام "حیدرآباد دکن"

روزنامہ "پیام" حیدرآباد کی صحافتی اور ادبی زندگی میں نئی قدروں اور نئی باتوں کا پیامبر بن کر طلوع ہوا۔ اور اس نے اپنی بے باک ترجمانی اور جواں ہمتی سے زندگی کو رہا تھا انقلاب سے دوچار کیا اور انقلاب کے زمانہ میں ڈوبتوں کو سہارا بھی دیا اور سنبھالا بھی۔ حیدرآباد کے اخباروں میں پیام بھی ایک اخبار تھا لیکن منفرد دکھتا! اس کی اپنی انفرادیت تھی اور یکتائی بھی۔ اس کا دور حیدرآباد کی تہذیبی تو نہیں سیاسی زندگی کا بحران دور ہے اور یہ بحران کنگ کوٹھی کے اندر بھی اور کنگ کوٹھی کے باہر "دارالسلام" میں بھی پرورش پاتا رہا۔ نعرہ تکبیر کے پرجوش نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے آزاد حیدرآباد کے ترانے گائے جانے لگے تھے۔ ایک طرف کنگ کوٹھی کے اندر مصالحت اور اسی گدی کی حفاظت کی تیاری جاری تھی دوسری طرف "مجلس" نے دارالسلام میں آزاد حیدرآباد کی تحریک کو ہوا دی تھی اور عوام ہاتھ میں تلوار نہ ہونے کے باوجود آمادہ پیکار تھے مختصر حیدرآباد میں سیاسی بے اطمینانی اور بدحالی عام تھی۔ جنون اور جوش کے اس اندھے سیلاب کو "پیام" نے قومی رجحانات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ کام مشکل تھا اور مشکلات سے دوچار ہونا بھی پڑا اس کے نتیجہ میں روزنامہ "پیام" بھی مختلف ادوار میں بحرانی حالات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ جب ادارۂ "پیام" کے ناظم خصوصی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ اس زمانہ کے اخبارات مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور کے سارے شمارے مکمل تاریخ تو نہیں ہیں لیکن اوراق تاریخ کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں قاضی عبدالغفار نے "پیام" کو جاری کیا۔ وہ قوم پرست مسلمان تھے اور محمد علی کے تربیت یافتہ تھے انھوں نے خلافت تحریک میں حصہ لے کر سیاست سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا جس زمانہ میں قاضی صاحب نے "پیام" کو جاری کیا اس وقت کی حیدرآبادی صحافت حاسی ولولہ انگیز تھی اور جنون خیز بھی۔ "پیام" نے اپنی علیحدہ راہ اختیار کی۔ سنجیدہ اور سیاسی اعتدال پسند راہ تھی کیونکہ قاضی صاحب خود بھی اعتدال پسند ادیب و صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ گو ابتدائی دور میں "پیام" کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام کا بڑا طبقہ وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر تو رہتا ہی ہے اور عوام کے رہنما بھی کم ہیں اور کوتاہ نظر ہوں تو اور بھی برا حال ہوتا ہے چنانچہ حال بھی برا ہی ہوا تاہم چند ایسے بھی لوگ تھے جو "غداری" کا طعنہ سن کر بھی مستقبل پر نظر گاڑے ہوئے آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ سیدھی راہ پر چل رہے تھے پیام نے انھیں روشنی دکھائی۔ پیام کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا اور یہ حلقہ پھیلتا بھی گیا۔ اشاعت تیزی سے بڑھنے لگی۔ ایک طرف تو عوام کے جذبات سے سامنا کرنا پڑتا تھا دوسری طرف خود حکومت وقت نے جس پر مختلف پابندیاں عائد کر رکھی تھیں "پیام" پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کی آزادی کے حق کے لئے آواز بلند کی۔ قاضی صاحب نے صرف اخبار کے ذریعہ [illegible] حیدرآباد کے اخبار نویسوں کی [illegible]

علیم افسر

غزل

یہ شب کی پیٹھ میں سورج کا وار لگتا ہے
بکھر رہی ہے کرن، کوئی خواب ٹوٹا ہے

کبھی خوشی کے بدن پر بھی رنگ [illegible] ہے
وہ دل کے کونے میں جو یاد کا [illegible] ہے

یہ کیا ہے؟ سوچ رہے ہیں پرندے شاخوں پر
سحر ہوئی بھی نہیں ہے مگر اجالا ہے

یہ مانا، تم نہیں قائل کہ لوگ کیسے ہیں
تمہارے ہاتھ پہ یہ سرخ رنگ کیسا ہے

ابھر گئے میری تخئیل کے بدن کے خطوط
کچھ ایسے لفظوں کا ان کو لباس بخشا ہے

وہ میرا حال پریشاں بھی پوچھتے کیونکر
کبھی گھٹاؤں نے صحرا کا حال پوچھا ہے

تمہاری پلکوں کے موتی ہی کیوں چنوں آخر
اسے نہ توڑوں وہ جو فلک پہ تارا ہے

...انے کی کوشش کی۔ وہ اس انجمن کے ...

...پیام مئی ۱۹۳۵ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں اپنی فضا اور اپنا ماحول پیدا کرچکا تھا۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے دیسی اور بدیسی خبروں کی فراہمی کے علاوہ ریاستی ہندوستانی اور بین اقوامی مسائل پر اداریے وہ تبصرے شائع کئے جاتے تھے اور تشنہ لبان ادب کے لئے قاضی صاحب کی تحریریں سرمایہ بیش بہا تھیں۔ مسلسل کالموں کے ذریعہ پیام نے اپنے چاہنے والوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ بھی جو "پیام" کی پالیسی سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے قاضی صاحب کی طرز نگارش پر مرتے تھے اس لئے "پیام" پڑھتے تھے۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں حیدرآباد کی سیاسی زندگی نے ایک خوشگوار کروٹ لی، مطلع صاف ہوا اور سیاسی مائل بہ کرم نظر آئی لیکن یہ تبدیلی ہمیشگی اختیار نہ کرسکی، اور بہت جلد آلودہ عصیاں ہوگیا اور مینہ برسا بھی تو ایسا برسا ... رحاتا کہ کے ساتھ ایوانوں کے در و دیوار بھی ہل گئے۔ ... ولٹ گئے ایک تباہی مچ گئی، ان آنے والی تباہیوں کا قاضی صاحب کو اندازہ تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ... اعتدال پسند پالیسی اختیار کریں۔ خوشگوار تبدیلی یہ آئی کہ لائق علی منسٹری کے بننے سے پہلے سر مرزا اسمٰعیل کو ریاست حیدرآباد کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مرزا اسمٰعیل کی ایما پر قاضی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کو چھوڑ کر عہدہ داری کو قبول کرلیا، پھر بھی ان کا تعلق عوام ہی سے تھا کیونکہ وہ محکمہ تعلقات عامہ کے ناظم بنا دئے گئے تھے۔ یہ سب فروری ۱۹۴۷ء کی باتیں ہیں۔ اس زمانہ میں استاد گرامی جناب اختر حسن صاحب حیدرآباد سٹی کالج میں بحیثیت استاد اردو فارسی کام کرتے تھے قاضی صاحب کے تحت اختر صاحب کو ۱۹۳۹ء میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں قاضی صاحب کے دل میں اختر صاحب کا ایک مقام پیدا ہوگیا تھا چنانچہ جب وہ "پیام" کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے تو اختر صاحب کا خیال آیا۔ انھیں خط لکھا گیا اور قاضی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ "پیام" کو سنبھالیں۔ چنانچہ اختر صاحب نے ملازمت کو ٹھکرا کر صحافت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھا جہاں سانپ بچھو ہیں اور بچھو بھی موذی پھنکارتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔ ... سے آکر اختر صاحب نے خواہش کی کہ وہ "پیام" کو ... کے حوالے کردیں چنانچہ اختر صاحب کے بیان کے مطابق ... سلیم صاحب (موجودہ نائب مدیر) نے ... ایک رومانی شخصیت ... کی ... کرا ... تین دن کی غیر حاضری

کے بعد ۱۴ر فروری ۱۹۴۷ء کو "پیام" کا پھر آغاز ہوا۔

دوشنبہ ۱۰ر فروری ۱۹۴۷ء کا اخبار قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت سے نکلنے والا آخری شمارہ تھا۔ چنانچہ صفحۂ اول پر "قارئین پیام سے" کے زیر عنوان انھیں نئی تبدیلیوں سے باخبر کیا گیا۔

"پیام" کے نظم و نسق میں چند خاص تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن کے پیش نظر ۱۱ر۱۲ر۱۳ر فروری ۱۳۵۶ف کو "پیام" شائع نہیں ہوسکے گا۔"

"ہم قارئین پیام سے توقع رکھتے ہیں کہ ان تین دنوں کی غیر حاضری کو نظر انداز فرماتے ہوئے "پیام" کے اس خاص نمبر کا انتظار فرمائیں گے جو ۱۴ر فروری ۱۳۵۶ف جمعہ کو پیش کیا جائے گا اور یہی اشاعت "پیام" کے نئے دور کا سر آغاز ہوگی۔"

براہ کرم جملہ مشتہرین نوٹ فرمالیں (مہتمم "پیام")

چنانچہ تین دن کی "غیر حاضری" کے بعد ۱۴ر فروری ۱۹۴۷ء کو جو اخبار شائع ہوا اس اخبار پر اختر حسن کا نام بہ حیثیت اڈیٹر تھا جبکہ اسی اخبار کے صفحہ اول پر قاضی صاحب کا مضمون "ترقی پسند مصنفین" بھی شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار کوئی ۱۲ صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں قاضی صاحب کے علاوہ ظفر جاوید اور جمیل الرحمٰن کے مضامین بھی شامل تھے۔ "آغاز" کے زیر عنوان اختر حسن صاحب نے اداریتی نوٹ قلمبند کیا تھا جس میں انھوں نے قاضی صاحب کی خدمات کی ستائش اور مستقبل میں "پیام" کی پالیسی کو بھی واضح کیا ہے۔

"قاضی عبدالغفار صاحب نے نظامت اطلاعات عامہ کے عہدہ کو قبول کرلیا۔ یہ خبر قاضی صاحب کے نیازمندوں میں تعجب اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سنی گئی۔"

. . . .

قاضی صاحب نے مئی ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ پچھلے (۱۲) سال کا زمانہ حیدرآباد کی قومی اور سیاسی زندگی کا بڑا ہنگامہ آرا زمانہ رہا ہے۔ اس دور میں پیام نے اپنے غیر متزلزل مسلک اور اپنی آزادئ فکر اور بے باکی و صداقت سے ایک ایسا مستحکم قلعہ تعمیر کیا جس کے در و دیوار پر قومی و ملکی مسائل کے ایسے بے شمار نقش و نگار ثبت ہیں جس سے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

انیس انور

مکتوب لندن

ریڈیو شیفیلڈ سے پہلا اردو پروگرام

ریڈیو شیفیلڈ کی ہوم سروس نے ہفتہ وار اردو پروگرام ۱۸ ارمئی سے شروع کردیا ہے۔ اب یہ پروگرام ہر سنیچر کی شام کو سوا چھ سے ساڑھے چھ بجے تک سنا جاسکے گا۔ ۱۸ ارمئی کے افتتاحی پروگرام میں شیفیلڈ کے لارڈ میئر اور پاکستانی ہائی کمشنر دہلوی صاحب کے پیغامات نشر کئے گئے۔ اس کے ساتھ اس اردو پروگرام کے مقاصد کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ بعد ازاں دو فلمی گیت پیش کئے گئے اور اخیر میں خبریں سنائی گئیں۔

آئندہ ہفتہ دوسرے پروگرام میں مس ممتاز بٹ کا انٹرویو نشر ہوگا جس میں نسلی تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ پروگرام ۲۰۶ ۸ میٹر پر نشر ہو رہا ہے۔

لبرل رہنما جیرمی تھورپ کا "مشرق" کو مراسلہ

"بحیثیت ایک لبرل کے میں انسانوں کے مابین برادرانہ تعلقات کے فروغ پر یقین رکھتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں نسل انسانی کی رنگا رنگی کا بھی قدردان ہوں لہٰذا اردو داں طبقہ کی برطانیہ میں مستقل سکونت کی مساعی کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اس طبقہ کا اپنے تہذیبی ورثہ کے تحفظ اور نشو و نما کے لئے یقین کامل سے جدوجہد کرنا خوش آئند ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ تمام قومیتوں اور نسلوں میں اخوت، خوش اعتقادی اور باہمی ہمدردی میں اضافہ ہو لیکن قومی اتصال کے معنی تہذیبی یکسانیت کے نہیں ہیں اور نہ ہونے چاہئیں۔

میں آپ کے جریدہ کا ممنون ہوں گا

مخلص جیرمی تھورپ

(انگریزی سے براہ راست ترجمہ از انیس انور)

نذرِ غالب

از انیس انور

[illegible] ہے آرزو کہوں یا نہ کہوں!
[illegible] راز کہوں یا نہ کہوں!

کہنا چاہوں بھی تو وہ بات کہی نہ جائے
ہے اسی بات پہ اصرار، کہوں یا نہ کہوں!
عکسِ خورشید ہے یا پرتوِ مہتابِ تمام
ان سے بہتر ہے رخِ یار، کہوں یا نہ کہوں!
زلف امروز نہیں، کاکلِ فردا مہکے
خواب دیکھا ہے یہ اک بار، کہوں یا نہ کہوں!
کون کہتا ہے فراعینِ جہاں ختم ہوئے
کیوں، ہے یوسف سربازار، کہوں یا نہ کہوں!
قربت ساقی و ساغر ہے، لب دار بھی ہے
دل ہے کس شے کا طلبگار، کہوں یا نہ کہوں!
ڈرتا ہوں عام نہ ہو میرے جنوں کا چرچا
گوش بر آواز ہے دیوار، کہوں یا نہ کہوں!
رازِ دل اس کو سناؤں تو سناؤں کیسے
ہے وہی واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں

یونی ورسٹیوں کا اردو نصاب

میرا صفحہ کے زیرِ عنوان ہماری زبان کے ۸ رمئی کے شمارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر خاموش رہے بغیر رہ نہ سکا۔ بھارت میں اردو کے معیار کو بلند رکھنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ بھارت کی تمام یونیورسٹیوں کا اردو نصاب یکساں ہو۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو نصابی کتب کی نایابی دکمیابی دور ہو جائے گی۔ چھاپنے اور فروخت کرنے والے بھی فائدہ میں رہیں گے۔ نصاب کا بلند معیار قائم رکھا جا سکے گا۔

آج کل یونیورسٹیوں سے منظور شدہ اردو کتب کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اور یہی بات فارسی اور عربی شعبوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے جو فارسی نصابی کتب منظور کی گئیں ہیں، ان کی لکھائی چھپائی انتہائی خراب ہے۔ کاغذ بہت معمولی استعمال کیا گیا ہے۔ کیا نصابی کتب کا جاذبِ نظر ہونا ضروری نہیں ہے؟ (عبد الحمید بانگل)

میر کی قبر

میر تقی میر جو دنیائے ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ ان کی آخری آرام گاہ کو جائے نجاست بنا دیا گیا ہے، یہ قابلِ افسوس امر ہے۔ کون ایسا ادب دوست ہے جو اس افسوسناک اور اندوہناک خبر کو سن کر کفِ افسوس نہ ملے گا اس کا دل خون کے آنسو نہ روئے گا۔ بس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ میر، جن کے کلام کو لوگ سینہ سے لگا کر رکھتے ہیں، جن کی شیریں بیانی پر دل تھام لیتے ہیں اور گرمئ کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کی علمیت کی قدر کرتے ہیں۔ زمانہ کے ہر دور میں لوگوں نے ان کو سراہا ہے خواہ غالب و ذوق کا زمانہ ہو یا حسرت و فانی کا۔ گویا کہ صرف ان کے معاصر اپنے گلشنِ شاعری کو ان کی عطا کردہ روشنی سے منور کرتے تھے بلکہ جیوں جیوں زمانہ بوڑھا ہوتا گیا، میر کے کلام کی روشنی گردشِ زمانہ کی زد میں آکر اور بھی مدھم ہوتی گئی اور نئی نسلوں کو آگے بڑھنے میں مشعلِ راہ کا کام دیتی رہی ہے اور دیتی رہے گی۔

میرے فاضل دوست عثمانی صاحب کا یہ طعنہ بجا ہے "یہ سب اردو دوستوں کی بےحسی اور لاپرواہی کا نتیجہ [illegible]"

نہیں تو آج تک ان کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟ اس کا کیا سبب ہے؟ کیا وہ اس سوال کو اس وقت نہیں اٹھا سکتے تھے جب کہ قبر صحیح حالت میں موجود تھی؟ اگر وہ بغور اپنا جائزہ لیں تو شاید انھیں اپنی غفلت اور غلطی کا احساس ہو جائے اور جب انھیں اپنے تغافل کا احساس ہو جائے گا تو شاید وہ خود کو کبھی معاف نہ کر سکیں گے۔ شاید اس بات سے کسی کو انکار نہ ہو کہ مزار کی اس خراب حالت کی ذمہ داری عثمانی صاحب کی غفلت پر بہت زیادہ عائد ہوتی ہے۔

یوں تو کسی چیز کو کسی سے منسوب کر دینا ایک آسان سی بات ہے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ معلومات بہم پہنچانا ایک دشوار کن مرحلہ ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عثمانی صاحب کی فراہم کردہ اطلاع غلط ہے بلکہ میں اس نکتہ پر آرہا ہوں کہ کسی بات کے پیچھے ایک ایسا پس منظر ضرور ہوتا ہے جو اس کی صداقت کا ضامن ہوتا ہے۔ کیا عثمانی صاحب کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ قبر میر ہی کی ہے؟ کیا وہ اپنے بیان کی تائید میں کوئی دلیل یا دلائل رکھتے ہیں؟ یا ان کی اطلاع سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے؟ کیا اس موضوع پر وہ تفصیلی بیان دینا گوارا کریں گے۔؟

اخیر میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے میں گذارش کروں گا کہ وہ اس بات کی تحقیق کرے کہ آیا وہ میر صاحب کی صحیح معنوں میں قبر ہے یا عثمانی صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے کہ وہ میر صاحب کا مزار مبارک ہے تو انجمن اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور قبر کو اصلی حالت نیز یادگاری شکل دینے کی سعی کرے۔ اگر دوسرے اخراجات کے سبب انجمن کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو انجمن کو چاہئے کہ اس کام کے لئے فنڈ کھولے اور زیادہ سے زیادہ چندہ وصول کر کے اچھی سے اچھی شکل میں میر و ذوق کی قبروں کو ایسی یادگاری شکل دیدے جو ان کے شایانِ شان ہو۔

علاوہ ازیں میں اردو دوستوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ رقم دے کر انجمن کے ہاتھ مضبوط کریں تاکہ انجمن ان نادرات کی حفاظت بخوبی کر سکے۔ یہ صرف ایک میر کا معاملہ نہیں بلکہ نہ جانے کتنی ایسی شخصیتیں غفلت کے انبار تلے دبی ہوئی ہیں۔ جن کے خزینہ سے دنیا آج بھی مستفید ہو رہی ہے۔ (ایم۔ اے نفر)

(میر کی قبر کے سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا بیان زیادہ مستند ہو سکتا ہے۔ (ادارہ ہماری زبان)

شیو ناتھ پرشاد اتر پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب

لکھنؤ:۔ ریاستی انجمن ترقی اردو (لکھنؤ) کے عہدہ داروں کا نیا انتخاب متفقہ طور پر ہوا۔ ریاستی انجمن کا یہ انتخابی جلسہ سنٹرل ہوٹل امین آباد میں پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں ہوا۔ نئے عہدہ دار یہ ہیں۔

پروفیسر شیو ناتھ پرشاد (بنارس) صدر، قاضی عدیل عباسی ایڈوکیٹ (بستی)، بیگم سلطانہ حیات (لکھنؤ)، جناب رضا الرحمان جامی (رام پور)، جناب ریاض الرحمان شیروانی (علی گڑھ) نائب صدر، سکریٹری راحت علی خاں (شاہجہاں پور)، خازن جناب حیات اللہ انصاری۔ جوائنٹ سکریٹریوں کے نام کا مسئلہ ملتوی کر دیا گیا۔ مجلس عاملہ کے عہدہ داروں کے نام یہ ہیں۔

جناب قاضی مختار احمد (کان پور)، جناب دانا رسول (بنارس)، مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی (لکھنؤ) مولانا طاہر حسن کاکوروی، حکیم ابو الکلام (گورکھپور) مولانا حکیم اللہ (بلدوانی)، جناب رگھبیر سرن دیواکر راہی (رامپور)، مولانا ابو البیان (شمس آباد)، حکیم عبد الخالق (سہارنپور) جناب ظہور احمد (سہارنپور)، جناب محمد فاضل (متھرا)، جناب احمد ابراہیم علوی (لکھنؤ)، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ)، جناب ریاض الدین احمد (الہ آباد)، جناب بدر الحسن (پیلی بھیت)، جناب عاشق مورانوی (کانپور)،

چار ممبروں کو مجلس عاملہ میں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نامزد کریں گے۔

صبح پرانی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں سابقہ کارروائی کا جائزہ لیتے ہوئے ریاستی انجمن کو سرگرم بنانے پر غور کیا گیا بحث میں صدر جلسہ پنڈت آنند نرائن ملا ایم۔پی۔ جناب حیات اللہ انصاری ایم۔ ایل۔ اے۔ مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی۔ جناب رضا الرحمان جامی اور جناب احمد ابراہیم علوی نے حصہ لیا۔

قاضی مختار احمد نے بہ حیثیت سکریٹری رپورٹ پیش کی۔ اور جلسہ نے آمد و خرچ کا گوشوارہ منظور کیا۔

جلسہ یوم اردو میں معتمد انجمن شاخ آندھرا کا خطبۂ استقبالیہ

حیدر آباد۔ ۲۱ مئی کو ہمارے آندھرا پردیش میں یوم اردو منایا گیا ذیل میں انجمن کی شاخ آندھرا کے معتمد جناب حبیب العلی صاحب کی استقبالیہ تقریر درج کی جا رہی ہے جو موصوف نے حیدر آباد میں جلسہ یوم اردو کے موقع پر کی۔

جناب صدر، خواتین و حضرات۔ میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے انجمن ترقی اردو کی دعوت پر آج اس جلسے میں شریک ہونے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ میں خصوصیت سے ممنون ہوں جناب ایم نرسنگ راؤ صاحب کا کہ آپ نے بڑی فراخ دلی سے بلا تامل ہمارے جلسے کی صدارت قبول فرمائی۔ میں انجمن کی طرف سے آپ سب کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے ہمیں پھر احتجاج کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً ڈھائی سال پہلے جب لیجسلیٹو اسمبلی میں سرکاری زبان کا مسودہ قانون پیش ہوا تھا تو اس میں اردو کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہ تھا اس پر ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے آندھرا پردیش کے اکثر مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد کئے گئے تھے جن میں ہمارے تلگو بولنے والے بھائیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور دل کھول کر ہمارے اس مطالبے کی تائید کی تھی کہ مسودہ قانون میں اردو کے لئے بھی مناسب جگہ رکھی جائے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو کا ایک وفد بھی چیف منسٹر سے ملا تھا۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون سرکاری زبان میں اردو کے تعلق سے ایک دفعہ شامل تو کی گئی لیکن کچھ اس ڈھنگ سے کہ اردو والے اس سے غیر مطمئن ہی رہے۔ دفعہ حسب ذیل ہے۔

> "ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً آندھرا پردیش گزٹ میں اعلامیہ جاری کر کے تلگو زبان کے علاوہ اردو یا کسی اور زبان کے استعمال کے بارے میں، اس زبان یا زبانوں کے بولنے والوں کے مفادات کی خاطر ان علاقوں کے لئے سرکاری مقاصد اور معینہ مدت کے لئے جن کی صراحت اعلامیہ میں کی گئی ہو ہدایت جاری کر سکتی ہے۔"

اردو زبان کی اہمیت کو گھٹانے اور اس کے مستقبل کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس دفعہ میں جو کوشش کی گئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ قانون سرکاری زبان میں اردو کے لئے جو تھوڑی بہت گنجائش فراہم کی گئی ہے وہ خوش دلی سے نہیں بلکہ بدرجہ مجبوری کی گئی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس ناقص دفعہ کو بھی روبہ عمل لانے میں غیر معمولی تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔ دو سال گزر گئے لیکن ابھی تک سوائے ایک بہت ہی مختصر اعلان کے اردو کے بنیادی حقوق کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا ہے۔ اس غفلت و لاپرواہی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے انجمن کا ایک وفد گذشتہ ماہ ستمبر میں پھر ایک بار چیف منسٹر سے ملا اور جو صورت حال ہمیں تھا

...کہ حکومت اس سلسلے میں جلد کوئی اقدام کرے گی... مہینے گذر گئے لیکن ہنوز روز اول ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہمارا فرض کیا ہے۔ یہی ضرورت تو اردو کا پھیلاؤ اور فروغ ہیں ہر ریاست میں اردو بولنے والوں کی موجودگی نیز مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اردو کا رواج یہ ایسے عوامل ہیں جو اردو کو مٹنے نہیں دیں گے بشرطیکہ خود اردو بولنے والے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اس غرض کے لئے جس ایثار کی ضرورت ہے اس سے دریغ نہ کریں۔ ایک طرف تو وہ اپنی اولاد کو کسی حالت میں بھی اردو سے محروم نہ ہونے دیں۔ خواہ اسکولوں میں اردو کا انتظام ہو یا نہ ہو وہ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر گھروں پر اردو پڑھانے سے غفلت نہ برتیں، دوسری طرف وہ ریاستی حکومتوں سے اردو کا حق منوانے کی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں سے میری یہ التجا ہے کہ وہ اپنی جد وجہد کو اب اور زیادہ تیز کردیں۔ خاص کر اس وجہ سے کہ جس خطہ ملک میں وہ آباد ہیں۔ وہاں اردو کو ہمیشہ ایک خصوصی اور اہم موقف حاصل رہا ہے وہ کم وبیش ایک صدی تک سابق ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان رہی ہے۔ ریاست کے تین علاقوں تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے درمیان اس نے مدتوں تک بڑی خوبی سے رابطہ کی زبان کا فرض انجام دیا ہے ریاست حیدرآباد ہی نے برطانوی حکمرانوں کی مخالفت کے باوجود عثمانیہ یونی ورسٹی قائم کرکے بھارت ہی کی ایک زبان اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دینے کی ہمت کی تھی جس کو رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی دیوی جیسے قومی مشاہیر نے سراہا۔

بہر حال ہم آندھرا پردیش کے اردو بولنے والے اپنے ان مطالبات کی طرف جو ہم پچھلے کئی برسوں سے پیش کرتے آرہے ہیں ایک مرتبہ پھر ریاستی حکومت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ آندھرا پردیش میں بسنے والوں کی ایک بھاری تعداد اردو بولتی ہے اور وہ آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کی مادری زبان ہے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

(۲) ان علاقوں میں جہاں آبادی کا کم از کم ۱۰ فی صدی حصہ اردو بولتا ہے حسب ذیل سہولتیں فراہم کی جائیں۔

الف۔ اہم قوانین، قاعدے، ضابطے، اور اعلانات۔ مثلاً فہرست رائے دہندگان برقی اور آب رسانی کے بل راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔

ب۔ وکلا کو عدالتوں میں اردو کے استعمال کی اجازت ہو اور عرضی دعوے، درخواستیں، مرافعے، حلف نامے وغیرہ اردو میں بھی قبول کئے جائیں۔ اگر فریقین فیصلے اور ... کے اردو ترجموں کا مطالبہ کریں تو انہیں مہیا کئے جائیں۔

ج۔ ضلع پریشدوں، پنچائت سمیتوں اور لوکل باڈیز میں اس کا انتظام کیا جائے کہ اگر کوئی رکن اردو میں تقریر کرے تو اس کارروائی کا ریکارڈ اردو میں بھی رکھا جائے۔

د۔ تعلقہ اور ضلع کے دفتروں میں اردو بولنے والے اہل معاملہ کے لئے پوری پوری سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

ہ۔ داخلہ کے موقع پر دس طلبہ کی وقت واحد میں موجودگی پر اصرار کئے بغیر، جو بعض اوقات ناقابل عمل ہوجاتی ہے، تحتانی اور ثانوی مدارس میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا انتظام کیا جائے اردو اساتذہ کی ٹریننگ اور اردو نصابی کتب کی طباعت کا بھی انتظام کیا جائے۔

و۔ تمام سرکاری عمارتوں کے سائن بورڈوں پر اردو میں بھی ان کے نام لکھے جائیں۔

(۳) مختلف سرکاری ملازمتوں میں تقرر کے اغراض کے لئے اردو کو بھی استعمال کیا جائے۔

(۴) ایوان مقننہ میں پیش ہونے والے مسودہ قانون منظور کردہ قوانین اور گورنر کے آرڈیننس کے لئے اردو بھی استعمال کی جائے۔ ریاستی سرکار کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکام، قوانین، ضابطے اور ذیلی قوانین وغیرہ اردو میں بھی ہوں۔ مقننہ کے اراکین کو اردو میں تقریر اور سوالات کرنے کی آزادی حاصل رہے اور ان کے جوابات بھی اردو میں دیئے جائیں۔ مقننہ کی کارروائیوں کی روداد میں اور حکومت کے گزٹ اردو میں بھی شائع ہوں۔ ہمارا یہ پر زور مطالبہ ہے کہ اردو کے ان واجبی حقوق کو بلا کسی مزید تاخیر کے قانونی تحفظ عطا کیا جائے۔

جناب صدر۔ ابھی ہم اپنے ان حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد ہی میں لگے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے ایک اور نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے اور وہ ہے سہ لسانی فارمولے کا مسئلہ ابھی کوئی تین مہینے قبل آندھرا پردیش لیجسلیٹو اسمبلی نے اس بارے میں ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ غیر ہندی ریاستوں کی حد تک سہ لسانی فارمولا میں یہ تین زبانیں شامل ہوں مادری زبان، ہندی اور انگریزی۔ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والے بچوں کو اس فارمولے کے مطابق اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی لازمی طور پر سیکھنا پڑے گا لیکن اس فارمولے کے مرتب کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس پر عمل کرنے سے ہمارے بچے تلگو زبان سے محروم ہوجائیں گے جو ان کے لئے انگریزی اور ہندی دونوں سے زیادہ اہم ہے

اور اگر وہ تلگو بھی سیکھنا چاہیں گے تو یہ سہ لسانی فارمولا ان کے حق میں چار لسانی فارمولا بن جائے گا۔ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے چند روز پہلے اردو ہال میں اردو کا کام کرنے والوں کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں مشورے کے بعد متفقہ طور پر طے ہوا کہ اردو بولنے والے بچوں کو سب سے پہلے تو ان کی مادری زبان اردو سکھائی جائے اور اس کے بعد انھیں لازمی طور پر اس ریاست کی اکثریتی زبان تلگو پڑھائی جائے اور جہاں تک تیسری زبان کا تعلق ہے انھیں اختیار دیا جائے کہ وہ انگریزی اور ہندی میں سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایک زبان سیکھیں۔ اس طرح سہ لسانی فارمولے کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ساتھ ہی کسی بچے پر بلا وجہ چار زبانیں سیکھنے کا بار بھی نہیں پڑے گا۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہم نے اس بارے میں ایک یادداشت آندھرا پردیش کے وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کی ہے اور ان کے جواب کے منتظر ہیں۔ میں آندھرا پردیش کے ارباب اقتدار سے ایک مخلصانہ گزارش اور کرنا چاہتا ہوں، ہم اردو بولنے والے گزشتہ کئی سال سے اپنی زبان کے تحفظ کے لئے پے درپے حکومت سے نمائندگیاں کرتے آ رہے ہیں۔ اس اثنا میں ہم نے کئی یادداشتیں پیش کی ہیں دو ایک مرتبہ کل ریاستی پیمانے پر احتجاجی جلسے بھی منعقد کئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہماری اس جدوجہد کا یہاں کے صاحبان اقتدار پر کچھ اثر بھی ہوا ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی ہماری یہ ساری جدوجہد نتائج کے اعتبار سے کامیاب نہیں کہی جا سکتی۔ میری تمنا ہے کہ شور و غل، نعرے بازی، ہنگامہ آرائی، مرن برت اور تشدد آمیز حرکات کے بغیر ہی اردو کو آندھرا پردیش میں اس کا واجبی حق مل جائے۔

انجمن ترقی اردو سرینگر کا انتخاب

انجمن ترقی اردو کشمیر، سرینگر کے لئے مندرجہ ذیل عہدہ داران منتخب ہوئے۔
شمیم احمد — صدر، میر غلام رسول نازکی۔ نائب صدر، محمد یوسف ٹینگ سکریٹری، لیکر ناتھ۔ جائنٹ سکریٹری، ایم۔ ایچ۔ رضوی۔ خزانچی،
حسب ذیل ممبران بھی منتخب ہوئے۔

پروفیسر عبدالقادر سہروردی، حبیب اللہ حامدی، ڈاکٹر شکیل الرحمان، غلام محمد ہارون، ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو، نور شاہ، نندلال کول طالب، نیسر قلندر، مظفر عازم، پیج بہادر بھان، میرزا کمال الدین شیدا، محمد عبداللہ شیدا۔ انجمن کی طرف سے اس ماہ میں "یادگار غالب" کے عنوان سے ایک تقریب منعقد کی جائے گی۔

ایک تصحیح "صید ہوی اور اردو ادب میں ترقی پسند میلانات" کے عنوان سے جو خبر ہماری زبان، کے یکم جون کے شمارے میں شایع ہوئی تھی، وہ سینئر کے کنوینر جناب کنور پال سنگھ نے بھیجی تھی۔ کاتب کی غلطی سے ان کا نام نہ دیا جا سکا۔

(ادارہ ہماری زبان)

صفحہ ۶ سے آگے

آئندہ مورخ نہ جانے ان [illegible] حقائق کے کتنے خاکے تیار کر سکے گا۔

پیام کی پالیسی اکثر احباب [illegible] والوں نے یہ دلچسپ سوال کیا کہ اب پیام کی پالیسی کیا ہوگی؟ . . . . اس امر کا یقین دلانا ہمارا فرض ہے کہ کسی فرد یا جماعت کی وفاداری اور غیر سنجیدہ تنقید و تعریض سے پیام کا دامن انشاء اللہ بھی داغدار نہ ہونے پائے گا۔ صحافت کا شریفانہ پیشہ جن اعلیٰ اور صحت مند اصول اور طریقوں کا متقاضی ہے پیام اس سے انحراف نہ کرے گا۔"

واقعہ یہ ہے کہ اختر حسن صاحب نے جن باتوں کا دعویٰ کیا وہ کر دکھایا بلکہ صحافت کا شریفانہ پیشہ ان کی شریفانہ پالیسی اور شریفانہ تحریر سے نکھر سدھر گیا۔ انھوں نے اپنی وسیع النظری اور فراخدلی سے سیاست کے مرکز [illegible] کیا ہے۔ گو ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۷ء کے دوران پیام "کو مختلف ادوار سے گزرنا پڑا، دفتر لوٹ لیا گیا، ایڈیٹر کو قتل کی دھمکی دی گئی، شورشیں سر اٹھائی اور پھٹکار [illegible] "پیام" کی بیباکانہ روی میں فرق نہ آیا۔ اس دور میں صحافت کے سرپرست [illegible] ایک قتل بھی ہوا جس میں شہید صحافت شعیب اللہ خاں (ایڈیٹر امروز) کا قتل ہوا اس دن "پیام" کے دفتر پر حملہ بھی ہوا تھا اور ایڈیٹر کو وہاں سے پاکر دفتر میں تباہی مچا دی گئی تھی اور پھر اس کے بعد احتساب بھی عاید ہوا اور لالچ بھی [illegible] لیکن "پیام" نے اپنی خون جگر سے "پیام" شروع سے آخر تک قوم پرست اخبار تھا اور اگر وہ "ترقی پسند" تھا بھی تو نظریہ کی بنیاد پر ہم اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن بڑی بات یہ تھی کہ وہ جوش و جذبہ کے اندھے کنوئیں میں غوطہ زن نہیں تھا یہی اس اخبار کی امتیازی شان تھی اور اسی وجہ سے عوام "پیام" کے گرد جمع ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کی پولیس کارروائی کے بعد یہاں ملٹری گورنمنٹ تھی اس دور میں اختر صاحب کے بیان کے مطابق اس اخبار کی اشاعت (۱۵) ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پولیس کارروائی کے زمانے میں امن کمیٹیاں قائم کی گئیں اور بحالی امن کا اہم کام انجام دیا گیا اور "پیام" کے ذریعہ بھی امن و امان کی بحالی کے لئے آواز اٹھائی گئی۔

۱۹۴۸ء کی تبدیلیوں کے بعد اختر حسن صاحب نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور پہلے انتخاب میں وہ رکن اسمبلی منتخب بھی ہوئے لیکن دوسرے انتخاب میں شکست اور بعض [illegible] بنا پر وہ [illegible] بند کر دیا گیا۔ اس طرح حیدرآباد کی صحافتی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہو گیا۔

R. No. 2186/57

Regd. No. L 982

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
L-8- 5-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy—15 P.

جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۲۲۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ جون ۱۹۶۸ء

اداریہ

بنیادی مسائل پر پہلے توجہ کیجئے

ہم نے گزشتہ دو اشاعتوں میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ پر تبصرہ کیا تھا۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو گئی کہ کچھ ریاستی حکومتیں اوّل تو دستور کی دی ہوئی ہدایات کی پابندی میں لیت و لعل سے کام لیتی ہیں دوسرے ان اعلانات پر بھی پورا پورا عمل نہیں کرتیں جو مرکز سے اس سلسلے میں جاری ہوتے ہیں اور جنھیں ان ریاستی حکومتوں نے بھی منظور کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاستی حکومتوں کو اور مرکز کو ان کا فرض یاد دلانا ضروری ہے مگر اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ملک میں عام طور پر قول اور عمل میں فرق بڑھ گیا ہے، اور دفتری نظام کی بے حسی کی وجہ سے ضروری کارروائی میں بھی بڑی ڈھیل ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ، ہمیں اب خاص طور پر خود تعمیری کاموں کی طرف توجہ کرنا ہے اور ہر ضلع میں ایسا نظام بنانا ہے کہ مقامی طور پر جائز شکایات پر توجہ ہو سکے اور اس حلقے کے اردو دوست خود کچھ کاموں کی ذمہ داری لے سکیں۔ اردو دوستوں کی شکایات کو کچھ سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنایا ہے۔ ہمیں ان کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کی تائید کا خیر مقدم کرنا چاہئے، مگر اردو کے مسئلے کو جو ایک قومی مسئلہ ہے، سیاسی پارٹیوں کے درمیان فٹ بال نہ بننے دینا چاہئے۔ ادھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کچھ سیاسی پارٹیوں نے عام چناؤ سے پہلے اردو دوستوں کے مطالبات کی تائید کی اور اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرانے کا وعدہ کیا۔ مگر جب ان کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو کچھ دوسری پارٹیوں کی ریشہ دوانی کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سیاسی پارٹیاں محض دکھاوے کے لئے اردو کی حمایت کر رہی تھیں۔ بلکہ اس صورت حال پر غور کرنا چاہئے جو خاصی پیچیدہ ہے اور جس میں مختلف پارٹیاں گو کسی ایک مقصد کے لئے مل جاتی ہیں مگر اپنے اپنے الگ الگ پروگرام کی وجہ سے زیادہ دیر تک اور دور تک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی سیاست کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے اور پورے ملک کے مفاد کو سامنے رکھنے کی عادت ابھی راسخ نہیں ہوئی ہے، وقتی اور فوری مقاصد زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر ملک میں تشدد کی فضا بڑھ رہی ہے اور کچھ شرپسند حضرات کے لئے یہ آسان ہو گیا ہے کہ ہمارے مطالبات کو غلط معنی پہنا کر فرقہ واریت کو ہوا دیں اور اس طرح ملک کے امن و امان میں خلل ڈالیں اور قومی اتحاد کو کمزور کریں۔ اس صورت حال کا ہمیں پامردی سے مقابلہ کرنا ہے۔ اپنے مطالبات قومی اور جمہوری نقطۂ نظر سے پیش کرنے ہیں۔ قومی کاموں میں شرکت کرنا ہے۔ رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے مگر اس سے زیادہ ضروری یہ کام ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعے سے دینے کا خود انتظام کریں یا ریاستی حکومت اور مقامی اداروں کے ذریعے کرائیں۔ بنیادی تعلیم بہرحال اردو میں ہر بچے کو دلانا ہمارے لئے لازمی ہے۔ اس معاملے میں کسی قسم کی کوتاہی یا غفلت ہماری طرف سے نہیں ہونی چاہئے۔ جو لوگ اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھا سکتے ہیں ان کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے بچوں کو یا تو خود اردو میں تعلیم دیں یا کسی ایسے اسکول میں بھیجیں جو شام کے وقت تعلیم دیتا ہو۔ حکومت سے انتظام کرنے کا مطالبہ درست ہے مگر خود بھی تو ہمیں اس سلسلے میں دامے، درمے، سخنے، قدمے، کوشش کرنا ہے اگر ہمارے بچوں کی زبان کی بنیاد کمزور رہی تو انھیں ہماری تہذیب ہمارے طرز زندگی، ہمارے افکار اور اقدار سے وہ تعلق نہ ہوگا جو ہونا چاہئے۔ زبان پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک بچہ اگر اردو سے بے بہرہ رہ گیا اور پھر اس نے بڑی ترقی کر لی

اور بہت اچھا افسر یا انجینیر یا ڈاکٹر بن گیا تو وہ ہمارے کام نہ آئے گا بلکہ کسی کے کام نہ آئے گا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے صرف اسکول کھولنے کی ہی ضرورت نہیں ہے مناسب استاد مہیا کرنے مناسب کتابیں فراہم کرنے، استادوں کو معقول تنخواہیں دینے اور اسکول کی تعلیم کے معیار کو بلند رکھنے کی بھی ضرورت ہے انگریزی اسکول آسمان سے کوئی بلند معیار لے کر نہیں آتے ہیں لوگ ان کے خاصے بڑے اخراجات کے کفیل ہوتے ہیں ان اسکول کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے ایک سخت اور آزمودہ طریقہ کار ہے۔ ہم اپنے اردو اسکولوں کو اگر الٹا سیدھا چلنے دیں گے، ان کے لئے اچھے معیار پر اصرار نہ کریں گے۔ انگریزی اسکولوں کے پیچھے دوڑیں گے اور اپنی چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے تو ہمارے اسکول کیسے ترقی کریں گے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قومی سیرت کی تشکیل میں تعلیم کا رول سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس وقت دوسرے تمام پہلوؤں کے مقابلے میں ابتدائی تعلیم اور پھر جس حد تک ہو سکے ثانوی تعلیم اردو میں دینے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے پھر سہ لسانی فارمولے کے ذریعہ سے اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی اہمیت ہے۔ اگر ہم ان تین باتوں پر خصوصی طور سے توجہ کریں تو ہمارے بچوں کی ذہنی نشوونما صحیح خطوط پر ہوگی اور پھر آئندہ وہ نہ صرف اچھی سیرت و شخصیت بھی پیدا کر سکیں گے اور دوسروں کے کاموں میں حصہ لینے کے بھی زیادہ اہل ہوں گے۔ ادب کی ترقی بھی اس طرح ہوگی کہ زبان کی بنیاد مضبوط رہے اور زبان کے معیار کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ زبان کی بنیاد مضبوط ہوگی تو اچھے ادب کے لئے بھی راہیں کھلیں گی۔ ورنہ ہمارا ادب ایک خاص حلقے میں محدود ہو کر رہ جائے گا اور اس کی ترقی رک جائے گی۔

انجمن کی شاخوں کو اور اردو کی انجمنوں کو اس وقت اپنے اپنے حلقے میں پہلے ابتدائی تعلیم کا مکمل اور معیاری انتظام کرنا ہے یہ ہو گیا تو دوسری باتیں بھی ہو سکیں گی یہ نہ ہوا تو ہماری زبان خطرے میں پڑ جائے گی۔

ٹورنٹو سے دو ماہی "صہبا" کا اجراء

ٹورنٹو کینیڈا میں مقیم اردو دوستوں نے بزم ادب اردو کے زیر اہتمام "رفتار" کے بجائے پھر دو ماہی "صہبا" کا اجراء کیا ہے۔ یہ تمام تر علمی مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے زر سالانہ ۳ ڈالر ہے اس کے مدیر حفیظ الکبیر قریشی ہیں دو ماہی "صہبا" اس پتہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

59 HALBORNE AVENUE

TORNTO 13, ONT, (CANADA)

پلٹزر ادبی انعامات

نیویارک گذشتہ سال کی بہترین امریکی ناول کے لئے پولٹزر انعام ولیم اسٹارن کی لکھی ہوئی ناول "کنفشن آف نات ٹرنر" کو ملا یہ ایک باغی نیگرو باشندے کی کہانی ہے جس کی عنقریب فلم بنائی جائے گی پولٹزر انعام امریکی جریدے "دی ورلڈ" کے پبلشر نے جاری کئے تھے اور یہ کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے دئے جاتے ہیں اس سال بہترین سوانح حیات کا انعام سابق امریکی سفیر جارج کینان کو ان کی کتاب "یادداشت" پر ملا۔ (انکار)

احمد انور کمال

شکایت

ماہ دسمبر کی ایک شب
تم نے کہا تھا
حسن لیلیٰ ہے چاند کے دم سے
اور میں نے آج تک
تم سے شکایت ہی نہ کی
صرف
جاگتا رہا یوں ہی
زندگی کی راتوں میں
ایک چاند کی خاطر
آہ
تم ہو اکیلی۔

اردو مراٹھی ڈکشنری

حکومت مہاراشٹر کے ادب و ثقافت کے شعبہ کے صدر جناب لکشمن شاستری جوشی نے ماہ مئی میں اردو مراٹھی شبد کوش کی اشاعت کا افتتاح کیا۔ یہ لغت بین الصوبائی اسکیم کے تحت شائع کی گئی ہے۔ سینٹ زیویرس کالج، بمبئی کے پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر اور پونہ کے جناب یاد جوشی نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں لگ بھگ پچیس ہزار الفاظ ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر گوریکر نے پہلی مرتبہ اردو حروف والفاظ کو دیوناگری رسم الخط میں پیش کرنے کی ایک علمی اسکیم و وضاحتی نوٹ کا اضافہ کیا ہے اور اسی اسکیم کے تحت اردو الفاظ دیوناگری حروف میں بھی علمی طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں۔ حکومت مہاراشٹر نے اپنے پریس میں اردو حروف بالخصوص ڈھالے ہیں۔ یہ ڈکشنری اپنی نوعیت کی پہلی ہے۔ (نامہ نگار)

تحریر: احمد کسروی
مترجم: کبیر احمد جائسی (علیگ)

آذربایجان کی قدیم زبان اور لوگ

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہم اس وقت یہاں ان الفاظ پر زیادہ بحث نہ کریں گے کیونکہ بر وقت یہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ان الفاظ کے بیان کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ الفاظ ایرانیوں کے آنے سے پہلے یہاں رائج تھے اور غالباً یہ ان زبانوں کے الفاظ ہیں جو ایرانیوں کے آنے سے پہلے یہاں بولی جاتی تھیں اسی وجہ سے ہم ان الفاظ اور آریان کی زبان میں کوئی مطابقت نہیں پاتے مثلاً خوئے، سلماس، ارومی وغیرہ۔

اگرچہ ہم مذکورہ بالا الفاظ میں سے بہت سے الفاظ کے معنی نہیں جانتے لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے الفاظ آریان کی زبان کے نہیں ہیں مثلاً ازناب، اہراب، لیلا، انجواں، بردوا، اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ، لیکن ان الفاظ سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ آذربایجان کے لوگ صرف ایران (ERAN) یا آریان نہ تھے بلکہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آل ماد بھی ان میں شامل تھے۔

آذری یا آذربایجان کی زبان، عربوں کے فتح کے بعد کی آذربایجان کی تاریخ موجود ہے اور عرب جغرافیہ نویسوں اور مورخوں کی کتابیں ہمارے پاس محفوظ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جوش و خروش نے عربوں کے ایران تک آنے کی راہ کھولی۔ کیونکہ ہزاروں سال سے عرب ایک بے برگ و گیاہ سرزمین میں مشقت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی نظر ہمیشہ سے عراق و ایران کے سبزہ زار کی طرف تھی، ان کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی اور وہ جستہ جستہ ایران کے مختلف علاقوں میں بس گئے اور انھوں نے آذربایجان کو اس کے عمدہ پانی، سبزہ زار اور چراگاہوں کی وجہ سے خاص طور پر پسند کیا اور زیادہ تر یہیں آباد ہو گئے اور صدیوں تک اس علاقہ کی سربراہی کرتے رہے۔ لیکن آذربایجانی اپنی زبان سے دستبردار نہ ہوئے اور ان میں اور عربوں میں اختلاط بھی کم ہوا۔

ان عرب جغرافیہ نویسوں نے جنھوں نے اس زمانے میں آذربایجان کا ذکر کیا ہے وہاں کی زبان کو ایک الگ نام سے موسوم کیا ہے اور اس کو آذری کہا ہے۔ ہم [illegible] پر ان کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

(۱) ابن حوقل اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں آذربایجان، آریان اور ارمنستان کے بارے میں یوں لکھتا ہے۔

"آذربایجان اور ارمنستان کے بیشتر لوگوں کی زبان عربی فارسی ہے لیکن بہت کم لوگ عربی میں گفتگو کرتے ہیں وہ لوگ جو فارسی بولتے ہیں وہ عربی نہیں سمجھتے البتہ سوداگران اور زمیندار ان اس زبان میں اچھی طرح گفتگو کر سکتے ہیں یہاں کے مقامی لوگ جو مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی ایک اور زبان ہے اسی لیے ارمنستان کے لوگ ارمنی میں اور بردعہ کے لوگ آرانی میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں پر قبق نام کا ایک مشہور پہاڑ ہے اور ان کوہستانی کافروں کی بہت سی زبانیں ہیں۔"

(۲) مشہور مورخ مسعودی چوتھی صدی ہجری میں اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں جب ایران کو آذربایجان، رے، طبرستان، خراسان، سیستان، کرمان و فارس، خوزستان اور دوسری جگہوں پر مشتمل قرار دیتا ہے تو یوں لکھتا ہے۔

"یہ تمام شہر ایک بادشاہ کے زیر حکومت اور ایک ہی ملک کے حصے تھے اور ان کی زبان بھی ایک تھی، اگرچہ ان میں مختلف بولیاں بھی تھیں مثلاً پہلوی، دری، آذری وغیرہ۔"

(۳) مشہور سیاح ابو عبداللہ بشاری مقدسی اپنی کتاب احسن التقاسیم میں جو چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں لکھی گئی ہے ایران کو جنت قرار دیتا ہوا لکھتا ہے۔

"اس آٹھویں اقلیم کے لوگوں کی زبان عجمی ہے سوائے اس کے کہ ان میں سے کچھ کی زبان دری اور کچھ کی دری سے ملتی جلتی زبان ہے ان تمام زبانوں کو فارسی کہا جاتا ہے" پھر جب آذربایجان کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو کہتا ہے۔ "ان کی زبان اچھی نہیں ہے، ارمنستان میں ارمنی میں اور آران میں آرانی میں بات چیت کرتے ہیں ان کی فارسی بھی جا سکتی ہے جو خراسانی کے قریب ہے۔"

(۴) ساتویں صدی ہجری کا مشہور جغرافیہ نویس یاقوت حموی آذربایجان کے بارے میں لکھتا ہے۔

"[illegible] کی آذریہ کہی جاتی ہے اور ان کے علاوہ کوئی اور اس زبان کو نہیں سمجھتا"

ان تمام تحریروں سے جو قدیم دانش مندوں کی تحریریں ہیں بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ زبان یا بولی جو اس زمانہ میں آذربایجان میں رائج تھی اس کو ان دانشمندوں نے آذری کہا ہے (جس طرح آران کی زبان کو آرانی کہا ہے) اور اس زمانہ میں آذربایجان (اور آران میں بھی) ترکی زبان کا کوئی وجود نہ تھا۔

اس سلسلہ میں ابوالعلای معری اور اس کے شاگرد ابوذکریا خطیب تبریزی کی سرگذشت سے ایک اور گواہ ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ یعنی اس طرح کہ ابو ذکریا اپنے استاد کی ذہانت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ایک دن میں مسجد معرہ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ایک کتاب کو اس کے سامنے پڑھ رہا تھا یکایک میں نے اپنے ایک ہم شہر کو دیکھا کہ مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھنے کا قصد کیا۔ میں دو سال سے معرہ میں تھا اور میں نے اس عرصہ میں اپنے شہر کے کسی شخص کو نہ دیکھا تھا اس لئے اس کو دیکھ کر میری عجیب حالت ہو گئی، ابوالعلا نے میرا یہ حال دیکھ کر دریافت کیا "تم کو کیا ہو گیا ہے"؟ میں نے کہا "میں نے سالوں سے اپنے شہر کے کسی آدمی کو نہ دیکھا تھا اس وقت اپنے ایک ہم شہر کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں" اس نے کہا "جاؤ! اور اس سے بات چیت کرو" میں نے کہا "سبق ختم کر کے جاؤں گا" اس نے کہا کہ "جاؤ! میں تمہارا انتظار کروں گا۔" میں اٹھا اور اس ہم شہر کے پاس گیا اور آذری میں بہت سی باتیں کیں اور جو کچھ میں نے چاہا سب کچھ پوچھا جب استاد کے سامنے واپس آکر بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا "یہ کون سی زبان تھی جس میں تم لوگ گفتگو کر رہے تھے۔" میں نے کہا "یہ آذربایجان کی زبان تھی" اس نے کہا "میں اس زبان کو نہیں جانتا اور تم لوگوں نے جو گفتگو کی اس کو سمجھ نہیں سکا البتہ تمہارے کہے ہوئے تمام کلمات میں نے یاد کر لئے ہیں" ہم لوگوں نے جو باتیں کی تھیں سب اس نے دہرا دیں مجھ کو اس کی ذہانت و حافظہ پر بڑا تعجب ہوا"

یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ کتاب نامۂ دانشوران میں جو ناصرالدین شاہ کے عہد میں لکھی گئی ہے، اس حکایت کا ترجمہ کرتے ہوئے الاذریۃ کا ترجمہ "زبان ترکان" کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ لکھنے والے آذربایجان کی کسی زمانے کی زبان سے واقف نہ تھے دوسری طرف ان سے یہ لغزش ہوئی کہ انھوں نے اپنے زعم میں آذری کو ترکوں کی زبان قرار دیا۔ اسی (غلط) وسنادیز کی وجہ سے لوگوں نے آذربایجان کو ترکوں کا مسکن اول سمجھا۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

جب سے میں نے "رفتار" کے کالم میں شعر و ادب کے موجودہ رجحانات سے متعلق اظہار خیال کا سلسلہ شروع کیا ہے میرے بعض دیرینہ اور مخلص احباب کو یہ شکایت ہے کہ میں نئے شاعروں اور ادیبوں کی ضرورت سے زیادہ ہمت افزائی کر رہا ہوں۔ کئی اصحاب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں آج کی شاعری میں معنی خیز اور قابل قدر پہلوؤں کی نشاندہی پر اکتفا نہ کروں بلکہ اصل کام تو ان ہزاروں اور لاکھوں متشاعروں یا ناشاعروں کا پول کھولنا ہے جو اپنی مہمل اور لایعنی تحریروں سے اردو ادب کے دامن کو داغدار کر رہے ہیں۔ بعض حضرات نے ملاقات کے دوران ایسے شعراء کے نام بھی لیے اور ان کے کچھ ایسے اشعار بھی سنائے جو ان کی دانست میں فضول اور لغو تھے (یہ اشعار انھیں زبانی یاد تھے) میں ایسے دوستوں کی قدر کرتا ہوں اور شعر و ادب کا جو ذوق انھیں ودیعت ہوا ہے اس کا میرے دل میں احترام ہے لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتا ہوں تو بے جان، فضول یا بے معنی اشعار سے سرسری طور پر گزرتا جاتا ہوں البتہ کوئی شعر ایسا مل جاتا ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے، تو اس پر نظر ٹھہر جاتی ہے اور اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے اشعار اکثر و بیشتر میرے حافظے میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ میں انھیں اشعار کو آج کی شاعری کا حاصل سمجھتا ہوں اور انھیں کی مدد سے آج کے ذہن کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرا کہنا یہ ہے کہ متشاعروں یا ناشاعروں کی پیدائش صرف موجودہ دور سے مخصوص نہیں ہے۔ فضول اور لایعنی اشعار کا انبار لگانے والے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں اور خدا نے چاہا تو آئندہ بھی رہیں گے۔ خود اچھے اشعار کہنے والوں کے پاس بھی کوئی ایسا بنا بنایا نسخہ نہیں ہے کہ ہمیشہ ان کے بطن سے عمدہ اور اعلیٰ درجے کے شعر کی ہی تخلیق ہو۔ میر، سودا، نظیر، غالب، مومن اور وہ تمام اساتذہ جو اردو شعر و ادب کی آبرو ہیں ان کے دواوین اور کلیات کو بھی میں نے سراسر بے داغ نہیں پایا۔ صفحے کے صفحے الٹتے جائیے اور غزلوں پر غزلیں پڑھتے جائیے تب جا کر کسی شعر پر رکنے کو جی چاہتا ہے جن اشعار پر ہم رکتے ہیں ان میں بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں کسی پر ایک صاد بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کسی پر دو اور کسی پر بے شمار۔ نام تو یاد نہیں آ رہا ہے لیکن کسی مغربی مصنف کا یہ قول کہیں پڑھا تھا کہ جو شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ آج کل فلاں فلاں لغو کتابیں شائع ہوئی ہیں فلاں شعر بکواس ہے یا بے شمار ایسے شاعروں کے نام لیتا ہے جو حقیقی معنوں میں شاعر نہیں ہیں تو وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا البتہ کوئی حسب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ فلاں کتاب پڑھنے کے قابل ہے یا فلاں نظم میں یہ نکتہ ہے یا فلاں شعر دیکھیے کتنا اچھا ہے تو یہ کہہ کر وہ میری معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور میرے لیے ایک خوشگوار اور قابل قدر اطلاع فراہم کرتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں قارئین کے اسی زمرے میں اپنے آپ کو رکھنے کا خواہش مند ہوں جو احباب متشاعروں اور ناشاعروں کا پول کھولنے کا مجھے مشورہ دیتے ہیں ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ کار خیر وہ خود ہی انجام دیں۔

کچھ دنوں پہلے ایک کتاب موصول ہوئی جس کا نام ہے "۱۹۶۷ء کی بہترین شاعری" اس کے مرتب [illegible]

مدحت الاختر

غزل

اب کے ایسا کال پڑا ہے
جو بادل تھا وہ پیاسا ہے

آنکھ کہاں! تو دیکھ رہا ہوں
سورج کا اندر سیاہ ہے

آوازیں ہی آوازیں ہیں
بستی بستی کوہ ندا ہے

دروازہ تو کھول کے دیکھو!
گھر کے باہر کون کھڑا ہے

نئے کسی سقراط کو ڈھونڈو
زہر پیا ہے ہم بھی پیا ہے

سنتا ہوں آواز یہ کیسی
کون یہ اندر چیخ رہا ہے

کمرے میں ہے اون کا گولہ
باہر جاڑا کانپ رہا ہے

آتنا تنہا ہوں کہ جی چاہتا ہے
آسمانوں کو صدا دی جائے (نذیر فیصر)

مذکورہ بالا مجموعے کی اشاعت پاکستان سے ہوئی ہے اس میں لازماً پاکستانی شعرا کا تناسب زیادہ ہے اس لئے ۱۹۶۷ء کے شعری ادب کی تصویر اس مجموعے سے مکمل ہوتی ہے جو "۱۹۶۷ء کی منتخب شاعری" کے نام سے راج نرائن راز اور کمار پاشی نے نارنگ پبلشرز دہلی سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعے میں بہت سی خوبصورت اور نمائندہ نظموں کے علاوہ غزلوں کا انتخاب بھی بہت جامع ہے۔ بعض ہندوستانی شعراء کے کلام پر میں نے اپنی پسندیدگی کے جہاں جہاں نشان لگائے ہیں ان میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:۔

صرصر کے بغیر جل رہا ہوں
میں سوتے مکاں کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوب سفر میں مبتلا ہوں
منصور نہ دعویٰ انا الحق
سولی مگر لٹک رہا ہوں
اس شہر میں وضع کجکلاہی
میں واقعی مورخور سزا ہوں (گوپال متل)

وہ نہیں ہے نہ سہی ترک تمنا نہ کرو
دل اکیلا ہے اسے اور اکیلا نہ کرو
بند آنکھوں میں ہیں نادیدہ زمانے پیدا
کھلی آنکھوں ہی سے ہر چیز کو دیکھا نہ کرو (محمود ایاز)

مرثیہ خواں ہے خود اپنی ہی تمنا دل کا
غم کی منٹی میں پگھلتا ہوا اک اک لمحہ
لوگ کہتے ہیں سیاہی کے سمندر میں کہیں
اور بھی ایک چمکتا ہوا دن ڈوب گیا (خورشید احمد جامی)

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے (بشیر بدر)

جسم اپنا ہے کوئی اور نہ سایا اپنا
جانے اس زیست سے ہے کونسا رشتہ اپنا
تونے کس موڑ پہ چھوڑا تھا مجھے عمر رواں
تک رہا ہوں کئی صدیوں سے میں رستہ اپنا
اے غم خاک شدہ جاگ برنگ اشعار
تیری مٹی میں ملا ہے مرا ہیرے سونا اپنا (منصور سرخالدی)

بے صدا لفظوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی
اور لفظوں کی فصیلیں تھیں کہ گرتی ہی نہیں

— ۶ —

محفل شب میں فقط پرچھائیوں کی گرد تھی
شمع ساں پگھلا کئے گو صورتیں بنتی نہ تھیں
دل حصار ذات میں آکر پریشاں ہو گیا
صورتیں اتنی کسی منظر میں بھی دیکھی نہ تھیں (شمیم حنفی)

یوں ہے آوارہ کہ صدیوں سے ہو بے کل جیسے
زندگی ہو کوئی اڑتا ہوا بادل جیسے
دھل گیا صبح کے چہرے سے بھی وہ غازۂ نور
بہہ گیا رات کی آنکھوں سے بھی کاجل جیسے (قمر اقبال)

اک اجنبی کی طرح ملے ہیں وہ ہم سے آج
کہنے پڑیں گے عہد گذشتہ کے واقعات (سید فضل المتین)

بارہا یہ ہوا جا کر ترے دروازے تک
ہم پلٹ آئے ہیں ناکام دعاؤں کی طرح (ممتاز راشد)

کل کی امید نے جس روز وطن چھوڑا تھا
یاد آتا ہے کہ رویا تھا دریچہ کوئی
دستکیں سب کے کواڑوں نے سنی تھیں لیکن
رات بھی میرے سوا گھر سے نہ نکلا کوئی (کمیل آذر)

ان اشعار کو ابھی درج کر ہی رہا تھا کہ بے ساختہ ایک بات یاد آگئی۔ گذشتہ ماہ ایک سلسلے میں رام پور جانے کا اتفاق ہوا، بعض ایسے احباب سے بھی ملاقاتیں رہیں جن کا ابتدائی سطروں میں ذکر آچکا ہے یعنی وہ موجودہ دور کے شعری رجحانات سے کچھ غیر مطمئن اور بیزار سے نظر آئے حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو عمر کی اس منزل میں ہیں کہ اپنے آپ کو آسانی سے آج کے دور کا انسان کہہ سکتے ہیں مگر اپنے محترم بزرگ مولانا امتیاز علی عرشی کی خدمت میں حاضر ہوا اور موجودہ شعر و ادب کا ذکر نکلا تو میری مسرت اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب موصوف نے فرمایا کہ آج کی اردو شاعری مجموعی طور پر گذشتہ ادوار کی شاعری سے آگے ہے اور بہت سے تازہ میلانات اس قابل ہیں کہ انھیں خوش آمدید کہا جائے۔ میں اس فراخ دلی اور خوش مذاقی کو عام ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔

سا اصلاحات

میر وحید اور ڈاکٹر وحید اختر

یکم مئی ۱۹۶۸ء کے ہماری زبان میں میر انیس کے صاحبزادے میر وحید کے ایک مرثیے پر ڈاکٹر وحید اختر کا تبصرہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ اقدام تو اس بات کا ثبوت ہے کہ نئے ادیب بھی اردو کی اس صنف عظیم کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ میر وحید اپنے عہد کے ایک بہترین مرثیہ گو تھے ان کی تعریف کرکے ڈاکٹر وحید اختر نے حقیقتاً فرض سخن شناسی ادا کیا ہے لیکن اس تبصرے میں دو باتیں ایسی آگئی ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا بے حد ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے زیر نظر مرثیے کو اردو کا سب سے طویل مرثیہ کہا ہے یہ بات درست نہیں ہے۔ اردو کا سب سے طویل مرثیہ میر انیس کے شاگرد رشید حضرت فارغ کا ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے میر وحید کے مرثیے میں تعداد بند ۲۳۲ بتائی ہے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ تعداد میر وحید کے دو ہم مضمون اور ہم بحر مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اس مرثیے کے ڈیڑھ سو یا ایک سو چھتر سے زیادہ بند کہیں نہیں ملتے۔ اس کے باوجود اگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کو درست مان لیا جائے تو بھی فارغ کے ہر مرثیے میں تعداد بند اس سے زیادہ ملے گی حضرت عباس کے حال میں ان کے آخری مرثیے میں ۸۲۵ بند ہیں لیکن پھر بھی سارا مرثیہ شروع سے آخر تک رزم نگاری کا ایک معجزہ ہے۔

یہ مرثیہ ۱۹۱۶ء میں فارغ کے ضخیم مجموعۂ مراثی "کوکبۂ فارغ" میں شائع ہوا تھا۔ "کوکبۂ فارغ" جو کہ اب کمیاب کتابوں میں سے ہو گئی ہے لہذا میں نے چند سال قبل اس مرثیے کا دوسرا ایڈیشن ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ "علمدار کربلا" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ یہ ایڈیشن بھی شاید قریب ختم ہے مجھے دلی مسرت ہوگی اگر ڈاکٹر وحید اختر یہ مرثیہ اور اس کے ساتھ میری کتاب "فردوسی ہند (مطالعہ فارغ)" ملاحظہ کرلیں۔

دوسری بات ڈاکٹر وحید اختر نے ایسی لکھی ہے جسے پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"میر وحید کے یہاں لکھنوی زبان اور صنعتوں کو برتنے کا التزام انیس سے کہیں زیادہ ہے۔"

یہ رائے انتہائی غیر محتاط اور یکسر غلط ہے جہاں تک لکھنوی زبان یا اردو زبان کا تعلق ہے ایک سو میر وحید بھی انیس سے تولے نہیں جا سکتے۔ لکھنؤ میں میر انیس کا عہد زباں دانی کا بہترین عہد تھا اور اس زمانے والے انیس کے سحر زبان سے مبہوت ہو کر یہی کہتے تھے کہ اردو میں قرآن نازل ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا فقرہ کس رو میں لکھ دیا ہے۔

رہیں صنائع اور بدائع وہ کلام انیس میں اتنی ہیں کہ مشکل ہی کسی شاعر کے یہاں مل سکیں گی۔ لیکن انیس کا کمال فن یہ ہے کہ صنائع ان کے کلام کے پیچھے رہتی ہیں۔ آگے نہیں آنے پاتیں۔ میں نے اپنے مختلف مضامین میں انیس کی اس صناعی کی طرف اشارے کئے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن ادیب نے تو اس موضوع پر ایک قابل قدر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ علالت کی وجہ سے میں اس وقت ان مضامین کی نشاندہی سے معذور ہوں۔ ڈاکٹر صاحب حضرت ادیب سے ان کے مضمون کی تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر قطعاً ایک ذہین اور باذوق نوجوان ہیں۔ اگر وہ ادب مرثیہ پر گہری نظر ڈال کر اس موضوع پر نئے زاویوں سے کچھ لکھیں تو اردو کی ایک عظیم خدمت انجام دیں گے۔ مرثیے میں ہماری تہذیبی زندگی کی بہترین نمائندگی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اردو کے تمام اصناف سخن فارسی سے ماخوذ ہیں۔ جس صنف کو اردو خود اپنی کہہ سکتی ہے وہ صرف مرثیہ ہے۔ مرثیے سے میرا مطلب وہ ادبی مرثیے ہیں جن کی ابتدا ضمیر اور خلیق نے کی اور جن کو انیس نے منتہائے عروج پر پہونچایا۔

(صفدر آہ)

لفظ بغداد کا ماخذ

بغداد کے لئے جو مشہور تاویل ہے وہ تو یہی نوشیرواں والی ہے کہ باغ داد یا حدیقۂ عدل ہے لیکن اس سلسلہ میں عراق کے سابق وزیر توفیق وہبی ۱۹۵۰ء میں "القصد لاستطرادی الاصول معنی بغداد" کے عنوان سے جو رسالہ لکھا، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحقیقات کے ضمیمہ کے طور سے اس کو نوٹ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے لکھا ہے کہ دیدوں کا بھگ (بھگوان میں جو شروع کا حصہ بھگ شامل ہے) ایران قدیم کا بگ اور اوستا کا بغ خدائے ذوالجلال کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے یورپ میں سلاوی زبانوں میں یہ بوغ ہو گیا مگر معنی وہی رہے

یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ بیک وقت اس کے معنی ہندی ایرانی زبان میں اور سلاوی میں خدا اور قسمت دونوں کے ہیں۔

ترکوں میں یہ لفظ اپنے وسیع تر معنی میں پہنچ کے سردار اور امیر کے معنی دینے لگا اور بگ یا بیگ، بلک یا بک ہوگیا جو بعد میں ایران کے طغرل بیگ تک پہنچ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ترکوں میں اور پھر عربوں میں بے ہوگیا۔

بہادر بھی جو اصلاً بغا تورتھا بغ اور تور کا جامع ہے (تور عبرانی میں توقانون نظام اور توراۃ کے لئے ہے)

داد دیا ہے جو جدید فارسی میں دادن مصدر میں ڈھل گیا ہے اس طرح بغداد کے معنی ہوئے عطاء اللہ، عطیہ خداوندی!		(از "عرب")

اُردو اخبارات و رسائل کا اشاریہ

انجمن ترقی اردو ہند کے اخبار ہماری زبان میں اکثر مختلف رسائل اور اخبارات کا تعارف شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ تعارف اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان اخبارات و رسائل کی اہمیت کو محسوس کیا جارہا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر اسی احساس کے ساتھ ان رسائل اور اخبارات میں (جو اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوگئے ہیں) چھپنے والے مضامین کی فہرست بھی ضروری تفصیلات کے ساتھ ہماری زبان میں شائع کردی جائے اس سے طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والے دونوں فائدہ اٹھاسکیں گے۔

(محمد انصار اللہ)

کتابیں ملیں

اردو زبان کا مذہبی ورثہ ۔ مصنف قیوم صادق احمدپوری ایم اے ناشر: علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳، صفحات ۱۲۰ قیمت تین روپے۔ یہ کتاب قیوم صادق کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں گذشتہ چھ سو برسوں کی ذہنی ادبی ثقافتی اور مذہبی افکار کا احاطہ کیا گیا ہے کتاب کے شروع میں پنڈت جواہر لال کے اردو کے سلسلے میں تاثرات اور جگن ناتھ آزاد کی نظم اردو بھی شامل ہے۔

چوڑی کا جوڑا۔ مصنف: اختر صہبائی ناشر: مکتبہ بزم سخن بھوپال صفحات: ۳۲، قیمت ۵ روپیے اس کتابچہ میں دلکش شاعری کی مرتب کردہ کتاب بھوپال میں غزل کی خامیوں کو واضح کیا گیا ہے۔

انیس انور

مکتوب لندن

شامِ غزل مانچسٹر۔ مورخہ ۱۷ مئی کو ۲۲۶ اسٹاک پورٹ روڈ کے ویلفیئر سنٹر میں شام غزل کا اہتمام کیا گیا۔ محمد احمد نقوی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہر شخص ویلفیئر سنٹر کا ممبر بن کر اپنی رضا کارانہ خدمات کے ذریعہ معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے اور آج کے دور کا تقاضا بھی یہی ہے کہ معاشرہ کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے لوگ از خود پیش قدمی کریں۔

تفریحی پروگرام کے تحت شام غزل کا آغاز ہوا اور مانچسٹر کے مقامی فنکاروں میں اراشد ہیں، عبدالرحمٰن، سرور جامی، اکرم جیلانی، بلال، فضل نقوی، خورشید نقوی کے علاوہ ایک مقامی انگریز مسٹر ڈرائے نے بھی اردو، بنگلہ، پنجابی اور ملتانی زبانوں میں غزلیں گائیں اور کا نیال پلیس کیں۔ مسٹر ڈرائے بچر سنٹرل ہائی اسکول کے ٹیچر ہیں غزل سنانے سے پیشتر انصل نے سامعین سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا نام محمد رفیع نہیں رائے بچر ہے لہذا اگر غزل میں ہاتھ ہوئے زبان اور لے میں کوئی فرق محسوس ہو تو برا نہ مانیں۔ مسٹر بچر نے پھر بہادر شاہ ظفر کی غزل گاکر اور ترنم سے سنائی اور سامعین نے بڑھ چڑھ کر ان کی پذیرائی کا اظہار کیا۔

صاحب اردو پڑھ رہے ہیں! ایم۔ اے حبیب العزازی سکریٹری اردو لائبریری نوٹنگھم کی اطلاع کے مطابق اسی لائبریری میں بالغ انگریزوں کے لئے اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کردیا گیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ ہفتہ اردو کی پہلی کلاس ہوئی جس میں پچاس انگریز طلبہ نے شرکت کی۔ ان میں مجسٹریٹ، میڈ ماسٹر، ٹیچر، پولیس آفیسر اور سماجی کارکن شامل تھے اردو لائبریری میں عدم گنجائش کی بنا پر اتنی بڑی جماعت کی تعلیم کا فوری انتظام ہوا۔ ایم سی اے ہال میں لیا گیا اور آئندہ ہفتہ سے نوٹنگھم یونیورسٹی کے مرکز تعلیم بالغان میں اس جماعت کو جاری کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ ہر ہفتہ بچوں کو بھی اردو سے روشناس کرنے کا اہتمام ہوگیا ہے۔

فلہم میں اردو لائبریری لندن شہر کے جنوب مغربی علاقہ میں باشندگان فلہم کیلئے فلہم لائبریری میں اردو سیکشن باقاعدہ قائم ہوگیا ہے مظفر علی صاحب کی اطلاع کے مطابق جو صاحب ذوق اردو کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیں وہ اگر اپنی مقامی لائبریری کی معرفت درخواست دیں تو انھیں اردو کتب فراہم کردی جائیں گی۔ فلہم لائبریری میں فی الوقت برصغیر کے ممتاز شعراء و ادباء کی کتابیں موجود ہیں۔ خیر حضرات اردو کتب بطور تحفہ بھی لائبریری کو ارسال کرسکتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو راجستھان کا سہ سالہ اجلاس

۱۵ر مئی ۶۶۸ کو ۱۲ بجے صبح بمقام سوائی جے سنگھ اردو لائبریری ریڈنگ روم جے پور میں انجمن ترقی اردو راجستھان کا سہ سالہ اجلاس منعقد ہوا جس میں انجمن کی مجلس عام و عاملہ کے ممبروں نے شرکت کر کے اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا۔
سب سے پہلے جنرل سکریٹری انجمن نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں راجستھان سے متعلق اردو کے تمام مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر خازن اور اسسٹنٹ سکریٹری نے حسابات کے گوشوارے پیش کئے۔ رپورٹ اور گوشواروں پر کافی سخت بحث و مباحثہ کے بعد ان کی بالاتفاق توثیق کی گئی۔ اس کے بعد صدر انجمن راؤ بہادر پنڈت اوتار نرائن صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس کو پسند کیا گیا۔

یہاں خطبہ کا متن درج ہے سکریٹری کی رپورٹ اگلے شمارے میں آئے گی۔

حضرات! انجمن کی کارکردگی میں اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی مجموعی ہے۔ آپ کو رپورٹ سے سکریٹری صاحب سے واضح ہو گا کہ اردو دوستی اور اردو دشمنی کے کیا کیا انتظام حکومت اور ماتحت افسروں نے کئے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے نہایت معقول و مناسب احکام جاری ہو چکے ہیں اور اس کی پالیسی بھی ہمارے موافق ہے۔ انجمن نے بھی اپنے مطالبات پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ لیکن بعض سرکاری افسر بھی گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف عمل کرنے میں کمی نہیں کر رہے ہیں جس کے خلاف ہم صدائے احتجاج بلند کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں آپ سب صاحبان کی مجموعی امداد اور تعاون کی سخت ضرورت ہے۔
انجمن نے اس دوران میں کچھ تعمیری کام بھی کئے ہیں۔ مثلاً سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم کی تعمیر اور اس کا اجرا۔ مجھے اس عمارت کی تعمیر میں اندازہ ہوا کہ کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس ریڈنگ روم کو ضرور جاری رکھنا ہے کیونکہ یہ بذات خود بھی مفید ہے۔ اور ترقی اردو کے لئے بھی اس کا جاری رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن تنہا میں یا میرے سکریٹری یہ کام انجام دیں ممکن نہیں۔ البتہ اگر آپ کی بھی دلی خواہش ہے کہ اردو کی ترقی ہو تو اس کے جاری رکھنے میں بھرپور تعاون فرمائے اور صرف اسی معاملے میں نہیں بلکہ دیگر معاملات میں بھی۔
حضرات! جناب خان بہادر الحاج الطاف احمد صاحب خیری عرصہ تک ہمارے صدر رہے ہیں اور اب ان کی غیر حاضری میں بھی ان کی سابق کوششیں اور ترقی کی تمنائیں ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دے رہی ہیں۔
جناب احمد علی شاہ جعفری صاحب یہاں سے دور ہیں لیکن درد و غم میں شریک ہیں اور ان کی ذات سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔
جناب وحید اللہ خاں صاحب انجمن کے کاموں میں پورے طور سے معاون ہیں۔ جناب نواب عبد الباقی خاں صاحب خرابیٔ صحت کے باوجود گرم جوشی کے ساتھ ہر کام میں ہر وقت شریک رہتے ہیں۔ میں جنرل سکریٹری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انجمن کے معاملات میں جو دلچسپی لی ہے اور کوشش و سعی کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ان کے دل میں ترقی اردو کی امنگیں ہیں۔ اور بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ تھکتے ہیں کہ عمر کا تقاضہ ہے۔ تھک کر رہ جاتے ہیں کبھی سبکدوشی چاہتے ہیں لیکن پھر ان کے افق ہمت پر امیدوں کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اٹھ بیٹھتے ہیں۔ قلم کو اس طرح اٹھاتے ہیں کہ جیسے کوئی مرد میدان تیغ دو دم اٹھائے۔
جناب ڈاکٹر رام سنگھ صاحب ہمارے خازن رہے ہیں ہر معاملے میں ان کا اچھا تعاون رہا ہے کہ جو قابل قدر ہے۔ وہ ہر ڈپوٹیشن اور ہر معاملے میں باوجود اپنی مصروفیات کے پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی طرح منشی عبد الواسع اور بابو عبد الرؤف ترقی اردو کے معاملات میں کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے ریڈنگ روم کی تعمیر کے سلسلے میں میری بہت مدد کی۔ جناب سید عبد الرؤف صاحب اجمیری دو تین سال سے عملی طور پر انجمن کے کاموں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔
سامعین اکرام! میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا لیکن یہ میرا فرض تھا کہ بحیثیت صدر انجمن اپنے معاونین کا شکریہ ادا کروں، یہ فہرست طویل ہے۔ میں بھی ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دیگر ہمدردان و معاونین کا بھی اور اب اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ انجمن کی بھی ترقی ہو اور اردو کی بھی۔

اردو ہال میں یوم اردو کے جلسہ کی قراردادیں

حیدرآباد:۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام اردو ہال حمایت نگر میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا یہ اجتماع اردو کے مطالبات کو تقویت پہنچانے اور اسے قانونی موقف دلانے کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کیلئے منعقد کیا گیا۔ اس اجتماع کی صدارت جناب ایم نرسنگ راؤ سابق وزیر داخلہ آندھرا پردیش نے کی۔ [illegible] ساری ریاست کے طول و عرض میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے ہفتہ اردو منایا گیا اس اجتماع میں اردو دوستوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی جناب ایم نرسنگ راؤ

سابق وزیر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ریاست میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہئے اور اردو والوں کا مطالبہ جس میں ہم بھی برابر کا شریک ہوں جائز و حق بجانب ہے ریاست میں اردو کے مسئلے کو پرامن احتجاج کے ذریعہ منوانا۔ جناب مخدوم محی الدین ایم۔ ایل۔ سی نے ریاست میں اردو کو قانونی موقف دلانے کے لئے جد و جہد کے موجودہ طریقہ کار کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ زبان کے مسئلہ کو کسی مذہب یا فرقہ سے وابستہ کرنا انتہائی تنگ نظری کا ثبوت ہے لسانی مسئلہ پر جذبات کو مشتعل کرنے والے لوگوں کی مذمت کی جانی چاہئے۔ جناب منوہر راج سکسینہ نے کہا کہ دستور میں (۱۴) زبانوں بشمول اردو کو تسلیم کرنے کے بعد اردو کی حیثیت کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ دستور میں جو ضمانات اور تحفظات دیئے گئے ہیں ان کو روبعمل لانا چاہئے۔ جناب بیرسٹر سردار علی خاں نے لسانی مسئلہ کو سیاست سے ملوث نہ کرنے پر زور دیا اور کہا کہ حکومت اردو کے ذریعہ قومی یکجہتی کے مقصد کو حاصل کرسکتی ہے جناب خواجہ نظام الدین ایم۔ ایل۔ اے نے صدر جمہوریہ کی حیدرآباد میں آمد کے موقعہ پر محبان اردو کی جانب سے یادداشت پیش کرنے پر زور دیا۔ جناب سرینواس لاہوٹی نے حسب ذیل قرار دادیں پڑھ کر سنائیں جسے جلسہ میں متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

قرارداد نمبر ا۔

قانون سرکاری زبان آندھرا پردیش کو منظور ہوئے دو سال سے زائد مدت گذرچکی ہے لیکن اس قانون میں اردو کا جو تھوڑا بہت تحفظ کیا گیا ہے اس کو روبعمل لانے کے لئے ریاستی حکومت نے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو کا ایک وفد چیف منسٹر صاحب سے ملا اور اس نامناسب صورت حال کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ایک یادداشت پیش کی چیف منسٹر نے وفد کو یقین دلایا کہ وزیر متعلقہ بہت جلد انجمن کے نمائندوں سے مشورہ کرکے اردو کے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری قدم اٹھائیں گے۔ اس ملاقات کو بھی کافی عرصہ گذر گیا لیکن اب تک اس بارے میں کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کے اراکین اور ہمدردوں کا یہ جلسہ ریاستی حکومت کی اس صریح غفلت و بے توجہی پر اپنی سخت تشویش اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ انجمن کی یادداشت میں جو مطالبات پیش کئے گئے ہیں انھیں جلد از جلد روبعمل لایا جائے۔

قرارداد نمبر ۲۔

آندھرا پردیش لیجسلیٹو اسمبلی نے ۱۵ر فروری سنہ ۱۹۶۸ء کو لسانی فارمولا سے متعلق جو قرارداد منظور کی ہے وہ اردو بولنے والوں کے نقطۂ نظر سے بہت ناقص اور غیر تشفی بخش ہے اس قرارداد میں لسانی اقلیتوں کے تعلق سے سفارش کی گئی ہے کہ ریاستی حکومتیں ان اقلیتوں کی مادری زبان میں صرف تحتانی درجے تک تعلیم کی سہولتیں مہیا کریں۔ یہ سفارش درحقیقت ایک نامناسب اقدام ہے کیونکہ ریاست آندھرا پردیش میں اس وقت بھی نہ صرف اردو ذریعہ تعلیم کے متعدد وسطانی اور اعلیٰ وسطانی درجے کے سرکاری اور امدادی مدارس موجود ہیں بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ملحقہ کالج میں بھی ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو کے اراکین اور ہمدردوں کا یہ جلسہ ریاستی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ:۔

ا۔ ریاست کی اردو بولنے والی اقلیت کے لئے تحتانیہ سے لے کر جامعاتی سطح تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا انتظام کرے اور

(۲) لسانی فارمولا میں اردو بولنے والوں کے لئے یہ تین زبانیں تسلیم کرے۔

(ا) مادری زبان — اردو

(ب) علاقائی زبان — تلگو

(ج) تیسری زبان۔ انگریزی اور ہندی میں سے کوئی ایک زبان — طالب علم کی مرضی پر۔

(سکریٹری)

انجمن ترقی اردو کوٹہ کا انتخاب

۱۰ رمئی بروقت نو بجے شب انجمن ترقی اردو کوٹہ کا انتخابی جلسہ زیر صدارت جناب عبدالشکور صاحب شمیم ایم۔ اے (علیگ) مدرسہ اسلامیہ میں منعقد ہوا۔ اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل عہدیداران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر:۔ جناب پروفیسر حافظ حکمت علی صاحب ایم اے

نائب صدر:۔ جناب عبدالمجید صاحب اختر ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

سکریٹری:۔ عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ

جائنٹ سکریٹری:۔ عبدالحمید کامریڈ ممبر میونسپل کمشنر کوٹہ

خازن:۔ محمد بخش صاحب ڈمڈم۔

ممبران مجلس عاملہ:۔ سیٹھ عمر دراز صاحب ممبر میونسپل کمشنر کوٹہ منشی خلیل احمد صاحب، بشیر احمد صاحب توفیق عبدالعلیم صاحب غلجی۔ محمد حسین صاحب انصاری انکم ٹیکس پریکٹشنر جناب شمیم صاحب۔ محمد حسین صاحب لیڈ وکیٹ سابق صدر انجمن ہذا۔ ظفر پرواز۔ عبدالسلام صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ انجمن ترقی اردو راجستھان سے بورڈ کے لئے اتفاق رائے سے عبدالمجید صاحب اختر ایڈوکیٹ کو نمائندہ

ب بنایا گیا۔ (سکریٹری انجمن ترقی اردو گوڈہ)

انجمن ترقی اردو اودے پور میں یوم اردو

انجمن ترقی اردو اودے پور کے زیر اہتمام ۲۶ رمئی کو "یوم اردو"
ریاست فضل الرحمن (پرنسپل لا کالج) منایا گیا۔ صدر
جناب محمد اسمٰعیل صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مہمانوں
سے تعارف کرایا۔ چودھری محمود (معتمد عمومی) نے انجمن کی
گذاریوں پر مشتمل رپورٹ پڑھی۔ اس کے بعد صدر جلسہ
اپنی ابتدائی تقریر میں اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور
ثابت کیا کہ اردو پاکستان کی زبان نہیں ہے۔ اور نہ ہی
مسلمانوں کی زبان۔ مزید آپ نے کہا کہ انسان اپنا
مذہب بدل سکتا ہے۔ زبان نہیں۔

صدر جلسہ کی اختتامیہ تقریر کے بعد ٹی ہاشمی (معتمد نشر و
اشاعت) نے قرارداد میں پڑھیں جس کو حاضرین نے بہ اتفاق
منظور کیا۔ جناب ایس پی عبد الباسط انتر پایہ (تعمیری) کے
شکریہ ادا اور قومی ترانے کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔

(معتمد نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو اودے پور)

انجمن ترقی اردو دربھنگہ کے زیر اہتمام یوم غالب

دربھنگہ۔ انجمن ترقی اردو شاخ لہیریا سرائے کے زیر اہتمام
یوم غالب منایا گیا۔ پروگرام کے ابتدا میں ... زیر
افتتاح ہوا جس کی صدارت مولانا عبد العلیم آسی نے
سب سے پہلے مولانا عطاء الٰہی فکری نے غالب کی زندگی
اور ان کی شاعری پر تقریر کی پھر مقالات کا سلسلہ شروع ہوا
جن میں محمد سہیل صاحب ... زاہد حسین خاں جناب عبد المنان طرزی
جناب حبیب الرحمن۔ جناب حسن امام درد و قاری مرتضیٰ اظہر
نے اپنے مقالے پیش کئے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب مولانا
عبد العلیم آسی نے "غالب کی فارسی شاعری" پر مقالہ پڑھا۔
ان کے بعد پروفیسر مہدی رضوی راجندر کالج چھپرہ نے
غالب کی شخصیت پر ایک تقریر کی۔ مقالوں کے بعد طرحی
مشاعرہ شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر مہدی رضوی
نے کی۔ شعراء میں خصوصیت کے ساتھ محسن دربھنگوی
عطاء الٰہی رضوی، عبد العلیم آسی، شاداں فاروقی حسن امام
درد، قاری داؤد طالب، مرتضیٰ رضوی، عبد المنان طرزی
ڈاکٹر مجیب اختر، رستم علی راحت، عظیم عادل، رضی احمد رضوی
عبد المنان، فضل الرحمن افضل، ڈاکٹر قمر الحق اور جوہر اجودھی
کے نام قابل ذکر ہیں۔

(سکریٹری)

بتیا میں "ایوانِ غالب" کا قیام

بتیا چمپارن (بہار) جناب ایم عالم کے دولتکدے پر
غالب کا جشن صد سالہ فروری ۱۹۶۹ء میں منانے کے ضمن
میں ایک نشست منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت جناب
حکیم عبد المنان صاحب مشتاق نے کی۔ اس نشست میں ایوانِ غالب
کے نام سے ایک عارضی کمیٹی بنائی گئی جس کے کنوینر جناب
محمد نصیر الدین صاحب اور معاون کنوینر جناب شمس الہدیٰ
صاحب بی ایس سی ایڈیٹر "انجلی" پٹنہ منتخب ہوئے۔ اس
کے علاوہ بارہ ممبران مجلس عاملہ کے لئے منتخب ہوئے

(محمد نصیر الدین کنوینر)

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ کی رسم اجرا

گلبرگہ۔ ہندوستان کے نوجوان مزاح نگار اور روزنامہ سیاست
(حیدرآباد) کے کالم نویس و صحافی جناب مجتبیٰ حسین کی
پہلی تصنیف "تکلف برطرف" کی اشاعت کی مسرت میں
ایک خیر مقدمی تقریب ۱۹ رمئی یکشنبہ کو نو بجے شب بمقام مسلم
ہاسٹل زیر صدارت پروفیسر محمد یعقوب پرنسپل گورنمنٹ کالج
گلبرگہ منعقد کی گئی۔ جناب عبد القادر بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ
و صدر استقبالیہ نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اپنی نیک توقعات
کا اظہار کیا۔ جناب وہاب عندلیب صاحب ایم۔ اے جناب
سید حبیب الرحمن، جناب طیب انصاری (شعبہ اردو گلبرگہ کالج)
نے مجتبیٰ حسین کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر سرور فرزانی
صلاح الدین نیر کے علاوہ ممتاز دکنی شاعر جناب سلیمان
خطیب نے بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب محمد معظم علی
نائب صدر استقبالیہ کمیٹی کے شکریہ پر تقریب کا اختتام عمل میں
آیا۔

(نامہ نگار)

بزم سخن اڑیسہ کٹک کا مشاعرہ

۲۶ رمئی کی شام کو بزم سخن اڑیسہ کٹک کا ایک سو تیسواں مشاعرہ
احاطہ خانقاہ چشتیہ میں زیر صدارت ڈاکٹر محمد ایوب منعقد ہوا
سکریٹری کی ماہانہ رپورٹ کے بعد صدر جلسہ نے جناب پرویز شاہدی
کی اچانک وفات پر ایک تعزیتی تجویز پیش کی جس کو حاضرین نے منظور
کیا اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں شعراء نے اپنے تازہ کلام
سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(عبد الصمد)

—— x ——

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر خلیل الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع کیا۔

R. No. 2186/57 Regd. No. L. 982

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ جون [illegible]

اداریہ

اردو گھر کے لئے چندے کی فراہمی

ہم یہ اعلان کر چکے ہیں کہ "اردو گھر" کی تعمیر کے لئے ہمیں اردو دوستوں سے چندہ کرنا ہے۔ اس غرض سے دہلی، بمبئی، حیدرآباد اور دوسرے بڑے شہروں میں خاص تہذیبی پروگرام ہوں گے جن کے لئے مقامی اردو دوستوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ فی الحال ہم ہماری زبان کے ذریعے سے اخبار کے خریداروں اور ان اردو دوستوں سے اپیل کرنا چاہتے ہیں جن کی نظر سے یہ اخبار گزرتا ہے۔ ہماری زبان انجمن کا آرگن ہے اس کے خریداروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طور پر بھی اس کار خیر میں حصہ لیں۔ یکم جولائی سے ہر ہفتے ہماری زبان میں ان اشخاص کی فہرست شائع ہوگی جو براہ راست جنرل سکریٹری کے نام اپنا چندہ بھیجیں گے۔ یہ چندہ چیک، منی آرڈر یا بینک کے ڈرافٹ سے بھیجا جا سکتا ہے۔ شاخوں سے چندے کے لئے علیحدہ اپیل کی گئی ہے اور ان اشخاص سے جو صاحب استطاعت ہیں اور اردو سے ہمدردی رکھتے ہیں براہ راست رابطہ قائم کیا جائے گا۔ لیکن عام خریداروں کا بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا ضروری ہے۔ اسی طرح قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے۔

ہم نے ایک روپے، پانچ روپے، دس روپے، بیس روپے اور پچاس روپے کی رسیدیں، عام چندے کے لئے چھپوائی ہیں۔ رسیدوں کی کتابیں تو صرف ریاستی شاخوں، مجلس عام کے ممبروں اور خاص خاص نمائندوں کو دی جائیں گی لیکن جس کا چندہ دفتر میں وصول ہوگا اس کو دفتر سے باقاعدہ رسید بھیجی جائے گی۔ اس رقم کے لئے اردو گھر کے نام سے بنک میں علیحدہ حساب کھول دیا گیا ہے۔

پانچ لاکھ کی رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ ہندوستان میں ڈھائی کروڑ سے تین کروڑ تک اردو بولنے والے بستے ہیں۔ جو لوگ اپنی زبان کے علاوہ اردو بھی جانتے ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔ اس کے علاوہ اردو سے ہمدردی رکھنے والے اور اس کے ادب کی قدر کرنے والے بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ ای۔ ایم فاسٹر نے جو راس مسعود مرحوم کا دوست تھا، اردو کے لئے چندہ دیا تھا، حالانکہ وہ اردو نہیں جانتا تھا، مگر چونکہ یہ اس کے دوست کی زبان تھی اس لیے اسے بھی اردو سے دلچسپی تھی۔ ایسے بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو اردو نہیں جانتے ہوں گے مگر اس کی ترقی چاہتے ہوں گے ان سب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اردو گھر کے لئے چندہ دے کر اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت دیں اور اس زبان کی بقا اور ترقی کی مہم میں تعاون کریں۔

زبان کے مسئلے پر جذبات کا اظہار تو بہت ہوتا ہے، مگر عملی قدم لوگ کم اٹھاتے ہیں۔ اگر آج کے پرآشوب دور میں اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اس کے لئے ایک نہیں بہت سے ذرائع استعمال کرنے ہوں گے۔ ان اداروں اور انجمنوں کو جو خلوص اور سنجیدگی سے اردو کی خدمت کر رہی ہیں مضبوط کرنا ہوگا، انھیں خود کفیل بنانا ہوگا، اردو کی تعلیم کا بڑے پیمانے پر خود انتظام کرنا ہوگا، اردو کے اخباروں کا معیار بہتر کرنا ہوگا اور ان کی اشاعت بڑھانا ہوگی۔ اردو کی اچھی کتابوں کی نکاسی کی سبیل کرنی ہوگی۔ اردو کے کتب خانے اور ریڈنگ روم قائم کرنے ہوں گے۔ بالغوں کو اردو پڑھانے کے لئے مرکز کھولنا ہوں گے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کرنی ہوگی۔ ہر فرد یہ سب کام نہیں کر سکتا، مگر بڑے ادارے ان سب پہلوؤں کی طرف توجہ کر سکتے ہیں۔ انجمن اس وقت اردو کی سب سے پرانی اور سب سے بڑی جماعت ہے۔ ۱۹۰۳ء سے یہ اردو کی خدمت کر رہی ہے۔ اس نے اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے زبان کی حفاظت کے سلسلے میں اس نے ہنگامہ آرائی نہیں کی مگر یہ حکومت اور عام لوگوں کو ان کا فرض برابر یاد دلاتی رہتی ہے اور اس کے پیچھے تمام اہم سیاسی [illegible] اور تمام مذاہب کے لوگوں کی تائید ہے۔ انجمن کو مضبوط بنانا اور اسے خود کفیل کرنا ہر اردو دوست کا فرض ہے۔ ان سب [illegible] کے لیے ضروری ہے کہ انجمن کا دفتر

دہلی میں جلد سے جلد بن جائے۔ وزیر اعظم اس کا سنگ بنیاد رکھ چکی ہیں عمارت کے نقشے تیار ہیں۔ تعمیر کا کام عنقریب شروع ہو جائے گا۔ انجمن اپنے سرمایہ محفوظ سے جو ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ خدا کا نام لے کر تعمیر کا آغاز کر رہی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اردو دوست نہایت گرم جوشی سے اس کی اپیل پر لبیک کہیں گے اور چند مہینے کے اندر پانچ لاکھ کی رقم جمع ہو جائے گی۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء کے آغاز میں جشن غالب کی سوویں برسی منائی جائے گی۔ انجمن کے نئے دفتر میں غالب کی یاد میں بھی جلسے ہوں اور اس موقع پر انجمن کی وہ کتابیں بھی منظر عام پر آئیں جو انجمن تیار کروا رہی ہے۔

ہماری زبان کے خریداروں سے ہماری اپیل یہ ہے کہ وہ اپنا چندہ جنرل سکریٹری کے نام جلد سے جلد بھیج دیں۔ رقم کے سلسلے میں سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص جو کچھ دے سکتا ہے وہ خوشی سے قبول کیا جائے گا۔ مقصد صرف چندہ نہیں، ہر اردو دوست سے براہ راست تعلق قائم کرنا بھی ہے تاکہ اردو گھر کے بنانے میں اس کا ذاتی حصہ بھی ہو اور اس طرح انجمن کا کام زیادہ ہمہ گیر، زیادہ مضبوط اور زیادہ جاندار ہو سکے۔

لسانی جھگڑوں کے سدباب کے لیے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبا و شعرا کی کانفرنس

بمبئی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں میں قومی وحدت پیدا کرنے کے لیے ستمبر کے مہینہ میں مہاراشٹر گجرات اور گوا کے شعرا اور ادیبوں کی ایک سہ روزہ کانفرنس ہونے والی ہے اس کا اہتمام ایک تنظیم دچار بچار نے کیا ہے جو ملکی زبانوں اور علاقوں کے ادبا کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کانفرنس میں علاقائی لسانی اور طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی کانفرنس کے دوران ایک نمائش کا اہتمام کیا جائے گا جس میں مذکورہ آٹھ زبانوں سے متعلق تمام کتابیں رکھی جائیں گی۔ اس تنظیم میں مراٹھی، گجراتی، [illegible] اور انگریزی کے ادبا شامل ہیں۔ (ریاست)

علی گڑھ میگزین غالب نمبر

علی گڑھ۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ "غالب نمبر" کی شکل میں پیش کرے گی جس میں مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے مضامین مرزا غالب کی زندگی اور مختلف پہلوؤں پر شامل ہوں گے۔ غالب نمبر کے اڈیٹر بشیر بدر اور اس کے نگراں پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوگا۔ (نامہ نگار)

حسن شہیر

جادو ہے

جادو ہے میری آنکھوں میں تمہاری آنکھوں کا
نہیں وہ بیٹھے سے یقین کر یہ جادو تمہاری آنکھوں میں لگتا ہے
قہقہہ لگاتا ہے تو سبز پھول جھڑتے ہیں
قہقہے کے
اجلی اجلی باہوں پہ گرتے ہیں
فرش پر بے شمار قہقہے گرے ہیں
اور میں ان کو اپنے ہاتھ [illegible] کر دیکھتا ہوں
فرش پر بے شمار جادو کے تارے پڑے ہوئے ہیں
ہنوز تمہاری آنکھوں میں [illegible]
بہت دنوں سے میں نے تم کو نہیں دیکھا ہے
پھول نہیں کھلایا ہے تمہاری آنکھوں میں
گیت نہیں گایا ہے تمہاری آنکھوں میں
سورج کی روشنی تمہاری۔ ماتھے پہ چمک رہی ہے
جس سے ویران دل میں روشنی ہوتی ہے
ویران ویران راتوں میں روشنی ہوتی ہے
محبت کے پھول کھلتے ہیں
اور قہقہے تمہاری آنکھوں میں گاتے ہیں

عالمی پنجابی کانفرنس

نئی دہلی۔ آئندہ سال پٹیالہ میں ایک عالمی پنجابی کانفرنس ہوگی۔ اس کا اہتمام پنجابی کے مشہور ادیب کر رہے ہیں۔ اس کانفرنس میں ایک اسکیم تیار کی جائے گی جس کا مقصد دنیا کے مختلف حصوں میں پنجابی ادب اور پنجابی ثقافت کو فروغ دینا ہوگا۔ (سید)

مثنویات شائع ہو گئی

اردو کے مشہور محقق اور ماہر لسانیات پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی مرحوم کی کتاب مثنویات کا نیا اڈیشن شائع ہو گیا ہے، اسے انجمن ترقی اردو دلی نے کیفی کے جشن صد سالہ کے سلسلہ میں شائع کیا ہے کتاب کی ترتیب و تدوین کا کام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی نے کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ جناب مالک رام صاحب نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں ڈاکٹر نارنگ نے کیفی کی لسانی خدمات پر روشنی ڈالی ہے اور وضاحت طلب امور سے بحث کی ہے۔ آخر میں اشاریہ بھی موضوعات کا اضافہ کر دیا ہے، جس سے مطالعہ اور مراجعت میں آسانی ہو جائے گی، کتاب انجمن ترقی اردو دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(نامہ نگار)

طیب انصاری

تاریخ اردو ادب سے متعلق ایک اہم تحریری دستاویز

تحقیق کی دنیا امکانی دنیا ہے اور یہ دنیا وسیع بھی ہے اور بسیط بھی اس لئے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے فن میں "حرف آخر" "حرف غلط" ہے! اور اسی وجہ سے ہمیں جلد بازی میں حکم لگانے اور تاریخ کے تعین میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارا پہلا شاعر تھا۔ زور مرحوم کی کوششوں کے نتیجہ میں قلی قطب شاہ کو زمانہ دراز تک اردو کا پہلا شاعر" قرار دیتے رہے پھر ہاشمی نے نظامی بیدری کے بارے میں لکھا "یہ پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ (۸۶۵ تا ۸۶۷ھ) کے دور حکمرانی میں موجود تھا" آج کل ہم بندہ نواز ہی کو پہلا شاعر، نثار سمجھنے لگے ہیں حالانکہ ابھی ہم تحقیق کے کام میں جٹے ہوئے ہیں! بندہ نواز کے بارے میں مختلف رائیوں کا اظہار کیا گیا اور بعض محقق تو ایسے بھی ہیں جو معراج العاشقین کو حضرت بندگی مخدوم کی تصنیف ہی نہیں مانتے اس تعلق سے ہم فی الحال کیا کہہ سکتے ہیں جب کہ ابھی تک ایسی شہادتیں اندرونی یا بیرونی نہیں ملی ہے جس کی مدد سے قطعی حکم لگا سکیں؟! تاہم ہم اس بات پر متفق تھے کہ اردو نثر و شعر کا آغاز بندہ نوازی عہد کی دین ہے لیکن آج میں محققین اردو ادب کے سامنے ایک ایسی تاریخی تحریر کو پیش کر رہا ہوں جس سے یہ بات ہو جاتا ہے کہ اردو ادب کی ابتداء حضرت بندہ نواز کے دکن میں آمد سے قبل ہی ہو چکی تھی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت کلیم الدین انصاری المعروف بہ میاں محمود انصاری نے دکنی نثر و نظم میں اپنے کارنامے چھوڑے ہیں گو آپ کا تعلق بھی عہد بندہ نواز ہی سے ہے لیکن آپ بندہ نواز کی دکن میں آمد سے قبل الند شریف (ضلع گلبرگہ) میں اپنے خاندان کے ساتھ موجود تھے اور اپنے دادا حضرت شیخ علاؤ الدین انصاری قدس سرہ العزیز کے زیر تربیت تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے اور اسی تحریر کی روشنی میں ہم شیخ کلیم الدین انصاری المعروف بہ میاں محمود انصاری کو اردو کا (قدیم تحریر) پہلا نثر [illegible] کہہ سکتے ہیں اور یہی اردو کے پہلے ادیب و شاعر بھی ہیں چنانچہ میں یہاں اس "تحریر" کو پیش کر رہا ہوں جس کی مدد سے ہم تاریخ ادب کے آغاز و ابتدا کے بارے میں ایک نئے زاویہ نگاہ کو اختیار کر سکیں اور یقیناً یہ اہم تحریر ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک اہم بنیادی موڑ بھی ہے!

میرے جد امجد حضرت شیخ رشید الدین انصاری لاڈلے انصاری بسران شیخ قمر انصاری نے قرآن حکیم کے ایک قلمی نسخہ میں حضرت کلیم الدین انصاری المعروف بہ میاں محمود انصاری ابن حضرت قمر انصاری کی دیگر تالیفات و تصانیف کا ذکر فرمایا ہے اور ان کتابوں کو بحفاظت محفوظ رکھنے اور حالات کے سازگار آنے پر ان کی نشر و اشاعت کی ہدایت بھی آنے والی اولاد کو فرمائی ہے اس تحریر کا مقصد تاریخ ادب اردو میں کلیم الدین انصاری کو پہلا شاعر یا ادیب قرار دینا نہیں بلکہ اپنے بزرگوں کے علمی سرمایہ کی حفاظت ہے جو کہ اس تحریر سے بھی عیاں ہے اس حیثیت سے یہ تحریر جہاں ہمارے لئے "وصیت" کا درجہ رکھتی ہے وہیں تاریخ اردو ادب کے محققین کے لئے تحقیق کی نئی کڑی بھی ہے اور جریدہ "غیر معمولی" بھی۔ اس کی مدد سے ہم اردو ادب کی ابتداء کی سمت [illegible] قدم اٹھا سکتے ہیں۔ مضبوط اور مستحکم اور اس مصدقہ اور پہلے شاعر و ادیب سے روشناس ہوتے ہیں جس نے زبان دکنی (قدیم اردو) اہم کارنامے چھوڑے ہیں۔

قبل اس کے کہ حضرت کلیم الدین انصاری المعروف بہ میاں محمود انصاری کے ادبی کارناموں سے متعلق مصدقہ تحریر کو پیش کروں "[illegible]" کے بارے میں بھی چند باتیں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ اور ہم دونوں بھی اس روایت کو تاریخ ادب کی اہم کڑی سمجھنے میں دشواری محسوس نہ کریں چونکہ ایسی کوئی تحریر یا تصنیف حاصل نہیں ہوئی ہے جس سے ہم ثابت کر سکیں کہ میاں محمود انصاری سے قبل ہی قدیم اردو میں تحریر و تصنیف کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے فی الحال ہمیں کلیم الدین انصاری ہی کو [illegible] مصدقہ ادیب بھی اور شاعر بھی مان لینا چاہیئے ہیں یہ کہتے [illegible] رہوں گا کہ اس "تحریر" کے ذریعہ جن تراجم و تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ان کارناموں کی موجودگی میں دیگر حضرات کے کارناموں یا پھر اس سے قبل بھی ایسے شہ پاروں کے وجود اور اس کے امکانات سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہاں تو! مولانا رشید الدین انصاری جو حضرت کلیم الدین انصاری ہی کی اولاد اور میرے اجداد میں بزرگ شخصیت گزرے ہیں اپنے اجداد کے کارناموں سے متعلق قرآن حکیم کے قلمی نسخے میں "[illegible]" ایک [illegible] چھوڑی ہے [illegible] حضرت قدس سرہ العزیز جن کا مزار درگاہ حضرت ملک المشائخ شیخ علاؤ الدین انصاری المعروف بہ لاڈلے مشائخ انصاری میں موجود ہے۔ یہ حضرت لاڈلے مشائخ انصاری کے بھتیجے و خلیفہ بھی ہیں۔ آپ حضرت دادا پیر لاڈلے مشائخ انصاری قبلہ ہی کے ساتھ دہلی سے الند تشریف لائے (الند میں آپ کی آمد سے متعلق کسی تفصیلی مضمون میں روشنی ڈالوں گا یہاں چند اشارے مقصود ہیں!) شیخ قمر انصاری کے فرزند اکبر حضرت کلیم الدین انصاری اپنے وقت کے جید عالم تھے اور صوفی بھی۔ آپ کو تحریر و تصنیف سے غیر معمولی شغف تھا۔ حضرت بندہ نواز جب اپنے "دوست عزیز" حضرت علاؤ الدین انصاری (جن کی ملاقات بھی بندہ نواز ہی سے حاصل ہوئی تھی) ملنے کی غرض سے الند تشریف لائے (۸۰۲ھ) تب تک حضرت علاؤ الدین کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت کلیم الدین انصاری ہی بزرگ خاندان تھے چنانچہ

آپ نے ایک روایت کے مطابق حضرت بندہ نواز کی آمد پر ایک نظم بزبان دکنی لکھی۔ علاوہ ازیں آپ کی بہن بی بی مارہ نے دلی کی جدائی اور غریب الدیاری کا حضرت بندہ نواز کے سامنے جو رونا رویا ہے وہ نوحہ بھی دکنی زبان میں نظم ہے اور میرے لئے یہ بات اب بھی روایت ہی کی حیثیت رکھتی ہے گو بعض حضرات کے مطابق انھوں نے اس نوحہ کو دیکھا بھی ہے۔ یہ سارا مواد جیسے ہی ہاتھ آئے گا مدلل بحث کی جائے گی۔

جہاں تک زیر بحث تحریر کا تعلق ہے یہ ۱۱۳۰ھ تا ۱۲۰۰ھ کی درمیانی تحریر ہے گو حضرت رشید الدین انصاری قبلہ نے اس تاریخی تحریر جس کا عنوان انھوں نے "گذارش" لکھا ہے کے ختم پر تاریخ نہیں لکھی ہے لیکن تحریر کے اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت عالمگیر کے آخری دور سے لے کر آصفجاہ ثانی کے عہد سے قبل کی لکھی ہوئی ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اتے بہوت کیا باں مرے پڑدادا سے مرے پدر لاڈلے انصاری کے ہات آئے مرے چچا شیخ سیف الدین انصاری نواب حیدرآباد تیغ جنگ بہادر کے سرکار کے سبب مجھ بکوکے کر یہ کتب بہوت [illegible] سے رکھیا۔"

اور نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے تیغ جنگ بہادر کو شمس الامراء کا مورث اعلیٰ بتایا ہے۔

"شمس الامراء کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خان تیغ جنگ ہیں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں آپ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے اور خان کے خطاب سے ممتاز کئے گئے آصفجاہ اول کے عہد میں کارہائے نمایاں انجام دے کر اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے اور منصب چہار ہزاری و سہ ہزار سوار عطا ہوئے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ کے عہد میں بھی آپ دیانتدارانہ خدمات برابر انجام دیتے رہے اس زمانہ میں بھی آپ کو اعلیٰ خدمت کے صلہ میں امام جنگ کے خطاب کے ساتھ جاگیر و منصب میں بھی اضافہ ہوا۔ آخر ۱۱۹۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا" (دکن میں اردو ۱۹۴۶ء صفحہ ۹۹)

اس اعتبار سے یہ تاریخی تحریر دو سو سال پرانی قرار پاتی ہے بعد کو نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے تیغ جنگ بہادر کے فرزند کو بھی تیغ جنگ بہادر کے خطاب کا دیا جانا لکھا ہے اور ان کا انتقال ۱۲۰۵ھ میں ہوتا ہے اس طرح بھی یہ ۱۲۰۰ سے قبل ہی کی تحریر ثابت ہوتی ہے۔ اس تحریر سے جہاں حضرت علاء الدین انصاری کی تصانیف کا پتہ چلتا ہے وہیں کلیم الدین انصاری کے بیان محمود کے دکنی کارناموں کا انکشاف بھی ہوتا ہے اور یہ انکشاف تاریخ اردو ادب میں ایک نیک شگون ہے!

چونکہ حضرت کلیم الدین انصاری حضرت مولانا علاء الدین انصاری کے زمانہ میں ہی تحریر و تصنیف کا کام شروع کر چکے تھے اور انکے عہد میں انھوں نے بزبان دکنی کتابیں لکھی ہیں اس لئے یہ کتابیں ۷۶۱ھ کے بعد کی اور ۷۷۵ھ سے قبل کی تصنیف کردہ قرار دی جاتی ہیں۔ ۷۶۱ھ حضرت علاء الدین کی آمد کا سنہ ہے جب کہ آپ کا وصال رجب ۷۷۵ھ کو ہوتا ہے ۸۰۲ھ کو بندہ نواز الند تشریف لاتے ہیں چنانچہ آپ ہی کے ساتھ حضرت کلیم الدین بھی گلبرگہ تشریف لے جاتے ہیں۔ ممکن ہے گلبرگہ جانے کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہو لیکن اب تک ایسا کوئی سرمایہ منظر عام پر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی تذکرہ کہیں ملتا ہے۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یہ سرمایہ وہیں گلبرگہ میں کہیں رہ گیا ہو۔ معراج العاشقین ملوک ہدایت نامہ یہ سب ۸۰۲ھ کی تصانیف ہیں اس لئے کلیم الدین انصاری کی تصانیف کو اولیت حاصل ہوئی ہے اور یہ اولیت زمانی بھی ہے اور معنوی بھی۔ معنوی اس لحاظ سے کہ اس کا مواد تاریخی بھی ہے اور مذہبی بھی اور ساتھ ہی ساتھ خالص ادبی بھی جب کہ اس دور کی تمام تر تصانیف کا موضوع خالص مذہبی ہے۔ یہ بات زیادہ تعجب خیز ہے اور غور طلب بھی کہ آپ نے "شرح فارسی و دکنی نحو" لکھی معلوم ہوتا ہے قدیم اردو اس دور میں عام بول چال سے نکل کر علم و ادب کا احاطہ کر چکی تھی۔

میں نے قارئین کرام و محققین ادب کی سہولت کے لئے مندرجہ بالا چند باتیں کہی ہیں۔ اشارۃً و اجمالاً ورنہ اصل مقصد تو اس تاریخی تحریر کو پیش کرنا ہے جو ہمارے ادب کی تاریخ میں اہم تبدیلی کا موجب ہوگی اس تحریر کی صداقت پر ہمیں اس وجہ سے بھی شبہ نہیں کرنا چاہئے کہ ایک صاحب ایمان و ذی علم بزرگ نے قرآن حکیم کے قلمی نسخہ پر تحریر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ راحت و سکون نصیب فرمائے کہ ان کے دل میں اپنے اسلاف کے کارناموں کی کتنی وقعت تھی اور اہمیت بھی۔

اصل تحریر کے پڑھنے سے قبل اس درمیانی دور کی اردو میں مروجہ الفاظ سے تھوڑی سی واقفیت حاصل کرتے جائیے تاکہ تحریر کے پڑھنے میں آپ کو دشواری نہ ہو اور مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آئے۔

گذارش: گذارش، ہور: اور، کوں: کو، جنگانی: زندگانی، زندگی، کتاباں: کتابیں، انے: نے، بہوت: بہت، درکاہ: درگاہ، ہمرے: ہمارے، سنکات [illegible]، سات: ساتھ، سوب: سب، انکار: انگار، آگ، ایک: ایک، کریا: کیا (لکھا سے مراد ہے) پن: مگر، لیکن، آرجو: آرزو، بزرگوار: بزرگوار، جنوکو: جنھیں، جن کو، کتے: کہتے، انے: اتنے، ہات: ہاتھ، لوہیر الکو: کہہ کر، کیہ گے، اپے ہوکو: خود ہو کر، اُو: وہ، حجرے، تھوڑے، جبان: زبان، دیتوں: دیتا ہوں، چنانکہ: چنانچہ، جیادا: زیادہ، الٹی: بہت، کرتیا: کرتا، [illegible]

"گذارش"

"میں نصیحت کرتا چل آنے والے ہور ان کی آنے والی اولادکوں مرے دادا پیر حضرت ملک المشائخ مولانا علاء الدنیا والدین انصاری کی جنگانی کے حالات کے

بہوت کتاباں اصل جلاتیں ہورتیں آپ ہو کو مرے پدر
لاڑے انصاری ست یعنی تو سو سب قصہ بتاتے
کو فرقی شیخ جمال کے سراج الدین انو کے دادا سے
بغض و حسد بہوت رکتے انتے اہل ہود ملازم دو کاہ
اتے تکیوں فکب حال سوکو ایک رات کوں کتب خانہ
کوں آگی لگاتے سب کتاب بک سنکات ہمراہ
مرے پڑ دادا اصل کتاباں تھی ہو دے پڑ دادا جل کو مرے
چرے کتاباں بچے ہیں سو دکھ جیا ان میں میں انو
کتاباں کوں مرے دادا خواجہ انصاری گھر لاتے
اتھے سو بچے میں ان کتاباں کو مرے دادا مرے پدر
کے ہات دئے ہور رہے یہ یہ کتاباں مرے ہاتھ
میں رہتے ہے۔ انو کتاباں دیکھ کرے کوست کرایں
عمر سنکات نہیں ہے۔ اب یہ کتاباں مرے پسر خواجہ
انصاری کو دیتوں ۔ ۔ میرا بھتیجا مخدوم بن شیخ
نبی صاحب انصاری کو بہوت ذوق انوا پو اللہ کو
مرے سامنے دیا ہوا ۔ ملہ اس مرا پسر لیا ہے۔
مرے یہ کتاباں مرے پسر کو بعد اوس ان اولادکوں
بعد او لاد کی اولاد کوں دیتا ہوں۔ ۔ ۔ ر اللہ پاک
کی قسم ہور دادا پیر کی قسم ہے یہ کتاب بہوت چالاکی
سے رکھنا۔ جان سے جیادا رکھو اللہ انو کو علم میں
ترقی و رزق میں برکت دھندہ میں مدد دیوے گا۔
مری اولاد کی میں پچھلے کی۔ یہ مری نشانی ہے دشمناں۔
بیر بود رکھیں ہیں۔ لہیٰ ہشیار رہنا اللہ مری اولاد
مری مدعا د خاندانی ہیل کوں بڑے د حضرت دادا
پیر کی دعا سنکات ہیں۔ ان کی نشانی قائم رکھے۔
میں ہور کتوں کان کھول سو دا۔ اپیر کی نشانی ہے
یہ کتاباں بہت ہشیاری سے رکھنا۔ اپنی بردار میں
کسو کو نہ کتا۔ اللہ سلامت رکھے۔ مری اولاد کو کہ یہ مری
آرجو کو پوری کرے ثم آمین۔

دحقیر فقیر شیخ رشید الدین انصاری بن لاڑے انصاری
پسران جبر انصاری)

اللہ کا احسان اور اس مرد خود آگاہ و خدا آگاہ کی دعاؤں کا صدقہ، آج اس تحریر کو ادبی حلقوں تک پہنچانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ قرآنی قلمی نسخہ جس میں حضرت رشید الدین انصاری مرحوم کی تاریخی تحریر موجود ہے مجھے اپنے برادر حقیقی جناب کلیم الدین انصاری سے دو تین روز قبل ہی حاصل ہوئی۔ یہ نسخہ اور دیگر نسخے انھیں اپنے والد بزرگوار حضرت مشائخ صاحب انصاری رشید مرحوم کے ہاتھ سے اور انھیں اپنے والد محترم کے ہاتھ سے حاصل ہوئے ہیں۔ آپ کی خدمت میں مندرجہ تحریر کو جو مورخ ادب کے لئے "صحیفہ" کی حیثیت رکھتی ہے اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ بار امانت سے سبکدوش ہو جاؤں اور تاریخ ادب کے تعین میں اس سے مدد بھی حاصل ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بزرگوں کی آرزو بھی پوری ہو جائے۔ خدائے بزرگ و برتر قبول فرمائے۔

مندرجہ بالا تحریر سے حضرت بندگی مخدوم علاء الدین انصاری کی کوئی بارہ تصانیف کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے یہ پوری کی پوری زبان فارسی ہیں۔ جد امجد حضرت کلیم الدین انصاری عرف میاں محمود انصاری کی کوئی جملہ دس تصانیف ہیں جن میں پانچ کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قدیم اردو کے کارنامے ہیں۔ شرح آداب المریدین اور سیرۃ النبیؐ دادا پیر کی تصانیف ہیں جنھیں آپ نے ہندی اور دکنی میں بالترتیب ترجمہ فرمایا اور جہانگرد لاڑے مشائخ انصاری" و "تاریخ چالوکیہ" سوامی لنگا کی تصنیف کردہ ہیں جنھیں آپ نے فارسی و دکنی میں ترجمہ کیا اور "شرح فارسی و دکنی نحو" آپ کی تصنیف ہے شرح آداب المریدین از علاء الدین انصاری کا آپ نے ہندی میں ترجمہ فرمایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بیک وقت دکنی، فارسی اور ہندی کے بھی عالم و ماہر تھے۔

آخر میں اپنے برادر عزیز جناب کلیم الدین انصاری صاحب کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ازراہ کرم اس نسخہ کو میرے حوالے فرمایا اور اہل علم و ادب کی طرف سے گذارش کروں گا کہ وہ دیگر مخطوطات و نسخہ جات کو بھی جلد ہی منظر عام پر لانے کا موقع دیں گے کہ جن کی نشر و اشاعت ادب کی خدمت تو ہے ہی یہ ہمارا فرض اولیں بھی اور یہی بزرگوں کی ہدایت بھی ہے۔

• انیس انور

مکتوب لندن

لندن میں یوم اقبال

مجلس اقبال کے زیر اہتمام، اسلامک کلچرل سنٹر میں ایک عظیم الشان عوامی اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں حکیم الامت علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تقریباً ہر مذہب و ملت کے افراد نے شرکت کی۔ مجلس میں مقالات اور تقاریر کی نشست کی صدارت کے فرائض بیگم لطیف نے انجام دئے اور مشاعرہ کی صدارت افضل اقبال، ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کے حصہ میں آئی۔ محمد شریف بقا اسٹیج سکریٹری تھے۔ نذیر حیدر آبادی نے تلاوت قرآن مجید سے جلسہ کا آغاز کیا۔ مولانا یعقوب حسینی نے بانگ درا کی ایک نظم گوش گذار کی۔ پھر سردار گورچرن سنگھ درد نے بڑے پرسوز اور دلنشین انداز میں کلام اقبال سنایا۔ نومسلم خاتون مریم عبدالستار نے ہالینڈ سے "ڈاکٹر اقبال اور مغرب" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کرکے روانہ کیا تھا جسے پڑھ کر سنایا گیا۔ موصوفہ نے اپنے مقالہ میں کہا کہ مشرق و مغرب کے مابین جو مسلسل چپقلش جاری ہے اسے مختصراً جذبہ و عقل یا روحانیت اور مادیت کی آویزش کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ مشرقی تصورات کو پرکھنے کے لئے مغربی منطق کی کسوٹی استعمال کی جائے اور مشترکہ مشرق و مغرب کی منتخبہ اعلیٰ اقدار اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے اختیار کی جائیں۔

مقالہ کے بعد نذیر حیدری نے "جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی" بڑے مترنم انداز میں سنائی۔ سردار استور سنگھ چترکار نے "نقش آتش نقش۔ میرا اقبال" کے موضوع پر تقریر کی۔ سردار صاحب لندن میں پنجابی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مصور ایم اختر نے مجلس اقبال کو گندم کے تنکوں سے بنائی ہوئی علامہ اقبال کی ایک نادر تصویر پیش کی۔

پھر محمد امین نے ایک مختصر اور جامع مقالہ بعنوان "مغربی تہذیب و تمدن اقبال کی نظر میں" گوش گزار کیا۔ اس مقالہ میں امین صاحب نے کہا کہ اقبال مغربی اقوام کی عمل پرستی تحقیق پسندی اور دیگر اوصاف کے قائل تھے۔

مشاعرہ کا آغاز تصادق صاحب نے علامہ کی ایک غزل سے کیا۔ ضعیف العمر شاعر حکیم غلام نبی نے ایک طویل نظم بعنوان "علامہ اقبال" پیش کی۔ بے تاب سوری نے ایک مزاحیہ نظم سنا کر داد حاصل کی۔ پھر احسان دانش کے صاحبزادے دی شان دانش غزل سرا ہوئے ؎

جانی ہی رہی دل سے مرے یاد نشیمن
صیاد قفس میں مجھے آرام بہت ہے

صداقت حسین سوز نے بھی علامہ کو ایک طویل نظم کے ذریعہ ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ عطا جالندھری نے اپنی نظم بعنوان "روح اقبال سے خطاب" پیش کی۔ رحمت قرنی کا ایک شعر بہت پسند کیا گیا ؎

تم اپنی حرافوں کو آزما کر تو ذرا دیکھو
ہوائیں تو موافق نا موافق چلتی رہتی ہیں

حسن صاحب نے تین بند پر مشتمل ایک نظم پیش کی عنوان تھا "اقبال" ان کے بعد مسز بشیر۔ علیم صدیقی۔ امولک سنگھ خواجہ مصطفیٰ اور سردار مضطر نے حکیم الامت کو منظوم ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں شریف بقا نے "یاد اقبال" کے عنوان سے ایک نظم پیش کی اور علامہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

بریڈ فورڈ کے کتبخانہ میں اردو اور بنگلہ کتابیں

اسلامک لائبریری، بریڈ فورڈ کے ناظم اعزازی کی اطلاع کے مطابق موسم گرما میں لائبریری کے اوقات جمعہ، ہفتہ اور اتوار کے لئے شام ۵ بجے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس لائبریری میں اردو، بنگلہ اور انگریزی کتب کا ذخیرہ ہے جو بیشتر اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کے حصول کے لئے اردو داں حضرات کے لئے چندہ یا رکنیت کی قید نہیں ہے۔ صاحب ذوق حضرات کتب خانہ میں آکر استفادہ کرسکتے ہیں۔

بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے پر توجہ کیجئے

لکھنؤ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی سکریٹری شہری انجمن ترقی اردو لکھنؤ نے ایک پریس نوٹ میں اردو دوستوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یہ ضروری ہے کہ آپ کے بچے اپنی تمام ابتدائی تعلیم (درجہ ایک سے درجہ پانچ تک) اور ثانوی تعلیم (درجہ چھ سے بارہویں درجہ تک) اردو زبان اور اردو رسم الخط میں حاصل کریں۔ محض یہی کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اردو زبان پڑھیں بلکہ تعلیمی نصاب کے جملہ مضامین مثلاً حساب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، وغیرہ کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہو اور نصابی کتابیں بھی اسی زبان میں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اردو داں والدین کے بچے اردو زبان اپنی ماں کی گود سے سیکھنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے ماحول میں بھی صرف اسی زبان کا استعمال ہوتا ہے وہ اسی زبان میں سوچتے ہیں اور اسی زبان میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں، اسی زبان کی بدولت ان کی دماغی نشو و نما ہوتی ہے اور اسی زبان کے استعمال سے وہ اپنی تہذیبی اور مذہبی وراثت حاصل کرتے ہیں۔ جن تعلیم کا بنیادی اصول ہے کہ بچوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ دی جائے اس طرح وہ جو مضمون بھی پڑھیں گے آسانی سے ذہن نشین کر لیں گے اور انھیں محنت بھی کم کرنی پڑے گی یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں میں طالب علموں کی مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم ہوتی ہے خاص کر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے تو مادری زبان سب اہمیت رکھتی ہے آپ کو یہ مشورہ دینا اس لئے ضروری ہوا کہ آج کل مدارس میں تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم ہندی ہے ظاہر ہے کہ اردو داں بچوں کے لئے ہندی غیر مادری زبان ہے جب انھیں تمام مضامین ہندی میں پڑھائے جاتے ہیں تو ان کے دماغ پر دگنا بوجھ پڑتا ہے۔ ایک تو غیر زبان پڑھنے سمجھنے کا دوسرے دوسرے مضامین یاد کرنے کا بوجھ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طوطے کی طرح ان مضامین کو رٹتے ہیں اور محض قوت حافظہ کی مدد سے امتحانات میں پاس ہونے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ انھیں امتحانات کے پرچوں کے جوابات بھی ہندی میں لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ بعض اوقات فیل ہو جاتے ہیں اور اگر پاس بھی ہوتے ہیں تو انھیں اچھا ڈویژن نہیں ملتا ان کی امتحانات میں کمزوری اور ناکامیابی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کی تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ والدین کو یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم کا محض یہ منشا نہیں کہ طلبہ مضامین طوطے کی طرح رٹ کر امتحان پاس کر لیں اور پھر فوشامد درآمد سے ملازمت حاصل کر لیں۔ تعلیم کا صحیح مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ طالب علم کے جسمانی دماغی، اخلاقی اور روحانی قوی کی نشو و نما ہو اور وہ اس قابل ہو جائے کہ سماج میں رہ کر اپنے انفرادی اور سماجی فرائض بہتر طریقے سے انجام دے تعلیم کا یہ ہمہ گیر مقصد مادری زبان کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے بیشک ایک یا دو زبانوں کا جاننا بھی اس کے لئے مفید ہوگا لیکن یہ ان زبانوں کو بطور زبان کے اپنی تعلیم کی کسی منزل میں حاصل کر سکتا ہے یہ امر اس کی تعلیم کے لئے بے حد مضر ہے کہ کسی غیر زبان کو اس کا ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے۔ اردو داں طبقہ اپنی زبان کے تحفظ اور اس کی بقا سے بہت لاپرواہ ہے اس کو اپنی زبان اور اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ اسی لئے وہ اپنے بچوں کو ایسے مدارس میں بغیر سوچے سمجھے داخل کرا دیتا ہے کہ جہاں نہ تو اردو ذریعہ تعلیم ہے اور نہ اردو بطور ایک زبان کے پڑھائی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے اپنی مادری زبان اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں۔ اردو داں والدین اپنے بچوں کی تعلیمی مدد نہیں کر سکتے انھیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے بچے کیا پڑھ رہے ہیں اور کس طرح پڑھ رہے ہیں اور ان کے مذہب اور تہذیب پر اس کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ تو اپنے مذہبی پیشواؤں کی تقریریں سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان کا علم محض ایک زبان کی حیثیت سے ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے بھی اس کا جاننا لازمی ہے ایک زبان کے ساتھ ایک کلچر وابستہ ہے اردو زبان کا بھی ایک ثقافتی پہلو ہے آپ کا تمام تہذیبی، ادبی اور علمی سرمایہ اردو زبان میں ہے جو آپ کے بزرگوں کی صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اگر اس زبان کا آپ کی غفلت کی بدولت خاتمہ ہو گیا تو آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے علمی اور ثقافتی کارناموں کا نام و نشان مٹ جائے گا آپ کی زبان ایک ترقی یافتہ زبان ہے اس میں ہر قسم کا ادبی و علمی سرمایہ موجود ہے مگر آپ کی لاپرواہی کی بدولت اس کی ترقی رک گئی ہے چونکہ آپ اس امر پر زور نہیں دیتے کہ آپ کے بچوں کا ذریعہ تعلیم "اردو" ہو اس لئے بازار سے مختلف علوم مثلاً تاریخ، "اردو" جغرافیہ، سائنس، تعلیم، علم المعاشیات، علم سماج، علم الانسان وغیرہ وغیرہ جملہ تدریسی اور غیر تدریسی علوم کی اردو کتابیں غائب ہو گئی ہیں۔ پرانی کتابوں کی اشاعت کا خاتمہ ہو گیا، نئی کتابیں لکھی نہیں جا رہیں کیونکہ مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہندی ہے ان تمام علوم کی کتابوں کی نشاعت ہے۔ اردو کی طرف سے غفلت کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کے ذریعہ معاش کا خاتمہ ہو گیا۔ اردو کے مصنف ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اردو کاتب، مطابع اور کتب فروش کثیر تعداد میں بیکار ہو گئے ہیں ہندی کے حامی آپ کی طرح غافل نہیں۔ انھوں نے کوشش کر کے ہندی کو علاقائی اور سرکاری زبان بنوا دیا اور اتر پردیش کے مدارس میں ذریعہ تعلیم ہندی ہے اسی وجہ سے ہندی زبان اردو سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے اس کی بدولت ان کے لٹریچر پر

اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو اگر اردو سے محبت ہے اور اگر آپ اولاد کی بہتری چاہتے ہیں اور اپنی مادری زبان و ادب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو حسب ذیل مشورہ پر عمل کیجئے۔

۱۔ آپ اپنے بچوں کو ایسے مدارس میں داخل کرائیں کہ جہاں کا ذریعہ تعلیم اردو ہو یا جہاں کم از کم اردو زبان لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہو۔

۲۔ اسکول میں داخلے کے وقت اپنے بچے کی مادری زبان اردو لکھوائیں اور ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل سے درخواست کریں کہ اس کو مختلف مضامین کی تعلیم اردو زبان اور اردو رسم الخط کے ذریعہ دی جائے۔

۳۔ اگر ممکن ہو تو کم از کم دس بچوں کا ابتدائی درجہ میں داخلہ دس سرپرست مل کر کرائیں اور ہیڈ مدرس سے درخواست کریں کہ ان کو اردو زبان کے ذریعہ جملہ مضامین پڑھائے جائیں کیونکہ حکومت اتر پردیش نے اپنے بیان (مطبوعہ گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۹ء) میں وعدہ کیا ہے کہ اگر کسی جماعت میں دس اردو داں بچے یا کسی اسکول میں چالیس اردو داں بچے ہوں گے تو ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام اردو میں کر دیا جائے گا۔

۴۔ آپ ان تمام اداروں اور افراد کے ساتھ تعاون کریں اور ان کی مدد کریں جو اردو کو بھی اتر پردیش کی علاقائی زبان بنوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۵۔ اگر اردو تعلیم کے سلسلے میں آپ کو کچھ مشکلات پیش آئیں اور مدارس کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ آپ کی شنوائی نہ کریں تو مندرجہ ذیل اصحاب سے مل کر یا بذریعہ تحریر مشورہ کریں۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی سکریٹری انجمن ترقی اردو لکھنؤ
اردو گھر ۱۵۲۔ نقاشی باڑہ لکھنؤ

نوٹ:۔ اگر کوئی ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل یہ کہے کہ اردو ہندی میں کوئی فرق نہیں لہٰذا ہندی تعلیم سے کوئی حرج نہیں تو آپ ان کو باتوں پر یقین نہ کریں اور ان سے پرزور الفاظ میں کہیں کہ ہم اپنے بچے کی تعلیم اردو زبان اور اردو رسم الخط میں چاہتے ہیں۔ (سکریٹری)

انجمن ترقی اردو راجستھان کا سہ سالہ اجلاس

جے پور۔ ۱۹ر مئی کو بمقام سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم جے پور میں انجمن ترقی اردو راجستھان کا اجلاس منعقد ہوا۔ ۱۵ اپریل کے شمارے میں ریاستی انجمن کے صدر کا خطبہ دیا جا چکا ہے یہاں انجمن کے سکریٹری جناب شاغل عثمانی کی مرتبہ وہ انجمن کی سہ سالہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے۔

جناب صدر اور حاضرین کرام! انجمن ہذا کا گذشتہ سہ سالہ اجلاس ۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا اور سہ سالہ انتخابات ۶ر مئی ۶۵ء کو جس کی تفصیل روداد (نمبر ۳) میں شائع ہو چکی ہے چونکہ انجمن کا مالی سال یکم جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے یہ رپورٹ یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۷ء تک کی پیش کی جا رہی ہے اس عرصہ میں انجمن ہذا نے جو خدمات انجام دیں ان کو اگر تفصیل سے عرض کیا جائے تو یقیناً آپ حضرات کا بہت وقت صرف ہوگا۔ اس لئے سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم کے علاوہ کہ جس کا حال آخر میں عرض ہوگا۔ دیگر معاملات کے متعلق صدر صاحب انجمن ہذا کی چھٹی نارکی ۲۵ کا متن اور اس کے ساتھ بھیجے گئے میمورنڈم کی عبارت جو در یہ لسانی اقلیات کو بھیجی گئی گوش گذار کر رہا ہوں جس سے یقیناً حسب ضرورت معلومات حاصل ہوگی۔ مضمون یہ ہے کہ۔ جناب والا! انجمن ترقی اردو راجستھان نے بتاریخ ۲۲ر جولائی اور ۲۹ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو جناب والا کے قیمتی وقت میں سے بہت تھوڑا سا وقت برائے ملاقات طلب کیا تھا۔ تاکہ اس کا ایک وفد حاضر خدمت ہو کر وہ دقتیں عرض کرے جو گورنمنٹ راجستھان کے احکام کی تعمیل میں ماتحت افسروں نے پیدا کر رکھی ہیں۔ مگر یہ درخواستیں شرف قبولیت حاصل نہ کر سکیں اس وقت انجمن کا وفد جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا وہ اس عرضداشت میں درج ہے جو آپ کے نام تیار کی گئی تھی اور اب شامل ہذا ہے حال میں بھاشا وبھاگ راجستھان کی طرف سے اطلاع ملی تھی کہ لسانی اقلیات کے کمشنر صاحب ۱۵ر اور ۱۶ر دسمبر ۶۶ء کو جے پور تشریف لا رہے ہیں۔ اگر لسانی اقلیت کو کوئی دقت ہو تو ان کے روبرو پیش کی جائے لہٰذا ان کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے بھی جو درخواست تیار کی گئی تھی اس کی نقل بھی اس چٹھی کے ساتھ شامل ہے۔ مگر بعد میں مطلع کیا گیا کہ ان کا دورہ ملتوی ہو گیا ہے اس لئے وہ درخواست ڈاک کے ذریعہ ان کی خدمت میں بھیج دی گئی۔ اب پھر ذریعہ ہذا التماس ہے کہ اگر انجمن کے وفد کو تھوڑا سا وقت عنایت کر دیا جائے تو وہ حاضر ہو کر بالمشافہ اپنے معروضات مع ثبوت پیش کرے مثلاً گورنمنٹ راجستھان کا صاف حکم جاری ہو جانے کے باوجود اور کئی برس کا عرصہ گذر جانے کے باوصف اور مقررہ تعداد طلبہ ہونے کی حالت میں بھی خاص شہر جے پور کے بہت سے پرائمری اسکولوں میں نہ تو کل مضامین مادری زبان اردو میں پڑھائے جا رہے ہیں نہ ذریعہ تعلیم ہی مادری زبان اردو ہے۔ صرف اردو کی ریڈر پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ تعداد طلبہ پوری ہونے اور مادری زبان اردو کے ذریعہ تعلیم کی خواہش کرنے کے اردو پڑھانے والے ٹیچر بھی ان اسکولوں میں موجود ہیں مگر احکام گورنمنٹ کی مطلق تعمیل نہیں کی جاتی پہلے تو یہ عذر تھا کہ ہر مضمون کی کتاب اردو میں نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ سراسر غلط تھا کیونکہ منجانب حکومت راجستھان احکام جاری ہو چکے تھے کہ غیر سرکاری یا ریاستوں کی کتابیں لے لی جائیں تاہم اب تو خود گورنمنٹ نے سب مضامین کی کتابیں چھپوا دی ہیں۔ جو اگرچہ بہت غلط ہیں تاہم ہیں تو سہی جن کی بابت میمورنڈم میں مفصل عرض کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کا دوسرا ایڈیشن نہ شائع ہوا اس وقت تک کے لئے اغلاط نامہ چھپوایا جا کر کتابوں میں منسلک کر دیا جائے۔ چیف سکریٹری صاحب نے اس بابت ڈسٹلائزیشن ٹیکسٹ بک بورڈ کے سکریٹری صاحب کو حکم دیا تھا کہ فوراً غلطیوں کی جانچ کی جا کر ایک رپورٹ پیش کریں اور جو غلطیاں رہ گئی ہیں ان کو دور کرنے کی کارروائی جلد سے جلد کی جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج تک وہی سعید غلطیوں والی کتابیں اسی حالت میں ہے کہ جس میں تھیں۔ نہ کوئی اغلاط نامہ چھپا ہے نہ کسی اور طرح غلطیاں دور ہوئیں۔ طلبہ کے دماغوں میں املا و انشا کی غلطیاں پیوست ہو رہی ہیں۔ یہ امر نمایاں ہوتا ہے گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل نہ کرنے کا منجانب ذمہ دار عہدہ دار یعنی منجانب سکریٹری ڈسٹلائزیشن ٹیکسٹ بک بورڈ راجستھان۔

سچایت سمتیاں۔ چیف سکریٹری صاحب نے یقین دلایا تھا کہ پنچایت سمیتیوں کے اسکولوں میں جو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا رواج بند کر دیا گیا ہے اور مادری زبان کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے وہ اس بابت معقول انتظام کر دیں گے۔ انجمن کو یقین ہے کہ احکام ضرور جاری ہوئے ہوں گے۔ مگر اب تک عملی شکل نظر نہیں آئی اگر مستکاہ ذرا اس سے یہ معلوم فرما لیا جائے کہ پنچایت سمتیوں کے کس کس اسکول میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور کہاں کہاں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ تو انجمن کی اس گزارش کا پہلا ثبوت سامنے آ جائے گا کہ ایسا کہیں بھی نہیں ہے

سرکاری اسکول۔ سرکاری اسکولوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دئے جانے کی بابت چیف سکریٹری صاحب نے ایجوکیشن سکریٹری صاحب سے کہا تھا کہ وہ ایک ڈائرکٹر کے نام ایک خصوصی حکم جاری کر دیں کہ وہ یہ بتائیں کہ اردو کے متعلق احکام کی تعمیل کہاں تک ہو رہی ہے اور اس مقصد کے لئے اسٹیٹس رپورٹ میں ایک کالم بھی بڑھا دیا جائے۔

چونکہ میٹنگ مذکور کی تاریخ سے اب تک با حسان محکمہ تعلیم کے رویہ اور طلبائے اردو کے متعلق عمل میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی شکایات برابر وصول ہو رہی ہیں مثال کے طور پر چورو کے شکایتی نامہ کی نقل پیش ہے اس لیے انجمن کے خیال سے گورنمنٹ کے ان احکام کی بھی پابندی نہیں ہونی یا ہوتی تو بے اثر رہے نتیجہ سابقہ میمورنڈم میں حسب ذیل امور کی بابت یہ عرض کیا گیا تھا کہ

(۱) جن پرائمری اسکولوں میں گورنمنٹ کی منظور کردہ تعداد طلبہ پوری ہے اور پھر بھی اردو جاری نہیں ہے وہاں اس کا اجرا کیا جائے۔

(۲) مادری زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

(۳) پنچایت سمیتیوں کے پرائمری اسکولوں میں اردو کا بحیثیت مادری زبان پڑھائے جانے کا انتظام کیا جائے۔

(۴) مڈل اسکولوں میں مقررہ تعداد طلبہ موجود ہونے کی حالت میں اردو کی تعلیم جاری کی جائے

(۵) سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں تھرڈ لینگویج اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا اجرا فرمایا جائے۔

(۶) کورس کی کتابوں کی صحت کرائی جائے۔

(۷) اردو کی کتابوں کی اسکول لائبریریوں اور پبلک لائبریریوں کے لئے خریداری کا انتظام ہو۔

(۸) اردو کے ٹیچروں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے۔

(۹) رجسٹر تعداد طلبہ کا اجرا کرایا جائے۔

(۱۰) نقول اردو دستاویزات کا اردو میں دیا جانا شروع کرایا جائے۔

(۱۱) قوانین وغیرہ کی اردو میں اشاعت ہونا شروع ہو۔

(۱۲) ساہتیہ اکڈیمی کی جانب سے اردو کی کتابوں کی طباعت کا انتظام کرایا جائے

عالیجناب! یہ سب امور وہ ہیں جن کی بابت گورنمنٹ راجستھان احکام جاری کر چکی ہے لیکن ماتحت تعمیل نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی بابت تو صرف اسی قدر گذارش ہے کہ حکومت اپنے ماتحتوں سے تعمیل کرائے تاکہ بار بار تصیع خواص کی تکلیف نہ دی جائے اور اہل اردو مطمئن ہو کر شکر گزار ہوں۔ البتہ حسب ذیل امور ایسے ہیں کہ جن کی بابت ہماری حکومت نے ابھی کچھ نہیں کیا۔

(الف) دہلی، بہار، یوپی، کشمیر، آندھرا، پنجاب اور مغربی بنگال سے اردو کے ماہنامے نکل رہے ہیں۔ مگر راجستھان سے کوئی رسالہ اردو میں نہیں نکلتا وہ نکلنا چاہیے۔

(ب) ان ریاستوں کی طرح راجستھان میں بھی اردو سیکشن قائم ہو جو حکومت کی اسکیمیں وغیرہ صحیح طریق پر شائع کرائے۔

(ج) ۱۵ اگست ۲۶ جنوری ۲ اکتوبر اور ۱۴ نومبر کو سرکاری سطح پر مشاعرے ہونے چاہئیں۔

(د) دوسری ریاستوں کی طرح اردو کی اچھی کتابوں پر انعام دئے جائیں۔

(ہ) عرس وغیرہ کے موقع پر اردو میں گورنمنٹ کی نشر کے مطابق اچھی پبلسٹی ہو سکتی ہے گورنمنٹ چاہے تو ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھائے۔

(و) راجستھان کے کسی ایک بھی ضلع میں کوئی پی۔ آر۔ او۔ یا اے۔ پی۔ آر۔ او۔ ایسا نہیں جو اردو داں ہو، لہٰذا جہاں اردو داں طبقہ معتد بہ تعداد میں ہے وہاں ایسے بھی افسر مامور کئے جائیں جو اردو بھی جانتے ہوں۔

(ز) ساہتیہ اکڈیمی راجستھان میں ایک ... یا زائد نمائندہ اردو منجانب انجمن ترقی اردو راجستھان بھی مقرر کیا جائے۔

(ح) اردو کمیٹی مقررہ گورنمنٹ راجستھان کی میٹنگیں وقت پر ہوتی رہنی چاہئیں۔

براہ کرم ان جملہ امور پر توجہ مبذول فرما کر احکام جاری فرمائے جائیں اور ان کی تعمیل بھی کرائے جائے۔

حضرات! اسوائی مادھوپور کے ... اردو ریڈنگ روم کے انتظام کا مسئلہ بھی کافی اہم ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے ضلع دس ہزار روپیہ کی رقم حاصل ہوئی اور مزید رقم انجمن اپنے سرمایہ سے فرنشنگ ریڈنگ روم کے لئے بقدر ضرورت ... میں بھی فراہم ہو چکی ہے لیکن ما ہوار اس کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا ہے جس کی سخت اور جلد تر ضرورت ہے۔

حضرات! انجمن ہذا کے سابق صدر الحاج خان بہادر السلطان احمد صاحب تیری نے چودہ سال تک انجمن ہذا کی جس مدبرانہ انداز میں اور جس توجہ اور خلوص سے ہر گونہ قیادت فرمائی وہ تعریف و توصیف سے بالاتر ہے ان کے بعد نومبر ۱۹۶۶ء سے جس دور اندیشی، دلچسپی، ... انتہائی دلچسپی سے ... پریسیڈنٹ ... صاحب بہادر اس ادارے کی صدارت فرما رہے ہیں اس کی مثال ملنی دشوار ہے انجمن ان صاحبان کی بیحد ممنون و شکرگزار ہے۔ ... اپنے تمام کارکنوں اور بہی خواہوں کے تعاون کا شکر گزار ہے۔ ... سکریٹری ...

میرا صفحہ

۲۰ اپریل کو سری نگر میں قومی یک جہتی کونسل کا جو جلسہ ہو رہا ہے وہ کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ ادھر ملک میں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں اور جیسا کہ جے پرکاش نرائن نے ایک بیان میں کہا ہے، بہت چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر یہ بڑے بڑے اور مسلسل فسادات ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی جماعت در پردہ ہر بات کا بتنگڑ بنانا اور اقلیتوں کے جان و مال کا نقصان کر کے، اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے اس پر بھی بڑے رنج کا اظہار کیا ہے کہ وہ بہت بڑا طبقہ جو ان فسادات کو پسند نہیں کرتا، خاموش اور بے بس ہے۔ دراصل یہی بات سب سے زیادہ تشویش ناک ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت اگر چوکس ہو تو وہ آسانی سے فسادات کو بڑھنے سے روک سکتی ہے۔ اگر فسادات کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ اگر وقت پر حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں، اگر غافل افسران سے باز پرس ہو تو فسادات کی لے ضرور کم ہو سکتی ہے مگر ہماری یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اسے صرف قانون اور امن کا ایک مسئلہ سمجھیں۔ کسی شہر میں کچھ جھگڑالو آدمی ضرور ہوں گے۔ کچھ غنڈے بھی ہوں گے اور غنڈے کسی بھی مذہبی فرقے کے ہو سکتے ہیں، مگر غنڈے اپنی من مانی کرتے رہیں، عوام کو مشتعل کرا کے ان سے انسانیت سوز حرکات کرائیں، قتل و غارت گری کے مرتکب ہوں اور وہ اکثریت جو فسادات کو پسند نہیں کرتی خاموش اور بے بس رہے۔ یہ بات اس اکثریت کے لئے شرمناک ضرور ہے۔ اس لئے ہمیں معاملہ کی تہ میں جانا چاہئے۔

ہندوستان ایک سیکولر جمہوریت ہے۔ ہم نے اس سیکولر جمہوریت کا جو دستور بنایا ہے اس میں تمام مذاہب، تمام علاقوں، تمام زبانوں اور تمام تہذیبی گروہوں کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ ریاست مذہب کی بنیاد پر اپنے باسیوں میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ ہمارے ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اقلیت میں سب سے بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، اس کے بعد سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کی۔ اکثریت کا یہ فرض ہے کہ وہ اقلیت کی دلجوئی کرے اور اپنے عمل سے ثابت کرے کہ ملک میں اقلیت کی بھی باعزت جگہ ہے۔ اقلیت کا فرض ہے کہ وہ اکثریت سے تعاون کرے، اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرے، اسے اپنے قریب لائے اور آپس میں ایک خوشگوار رشتہ قائم کرے۔ کوئی مذہب ملک کی خدمت میں حارج نہیں ہے۔ ہر مذہب والے کو اظہار خیال کی آزادی ہے بلکہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی بھی۔ اس آزادی کی ذمہ داریاں بھی ہیں یعنی اپنی بات اس طرح کہی جائے کہ دوسری جماعت کی دلآزاری نہ ہو۔ اگر دستور کی اسپرٹ کو سمجھا جائے، اگر ہندوستان کی ہزاروں سال کی رواداری کی روایات کو اپنایا جائے، اگر ملک کو افلاس کی پستی سے نکال کر جدید دور کی خوشحالی کی منزل تک لانے کی لگن ہو تو یہ [illegible] بہت جلد ختم ہو سکتے ہیں۔ ان جھگڑوں سے اقلیت میں ہراس، بددلی اور مایوسی [illegible] قوم کی تعمیر کے لئے کارکردگی مجروح ہوتی ہے۔ قومی دولت برباد ہوتی ہے۔ [illegible] فضا [illegible] ہوتی ہے۔ اقتصادی ترقی رک جاتی ہے۔ بیرونی [illegible] دنیا میں رسوائی ہوتی ہے اور یہ سب کچھ اکثریت کو بھی متاثر کرتا ہے [illegible] اقلیت سے زیادہ [illegible] تو اکثریت کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ [illegible] ملک پیچھے ہٹتا ہے تو اکثریت کا نقصان بالآخر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ باتیں سبھی جانتے ہیں پھر بھی فسادات کی لے کم نہیں ہوتی۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان فسادات کی ذمہ داری سب سے زیادہ موجودہ سیاسی پارٹیوں پر ہے۔ اگرچہ چند کے سوا ملک کی بڑی بڑی پارٹیاں اپنے کو سیکولر کہتی ہیں، مگر اول تو چناؤ کے وقت وہ بیشتر جذبات متعصبانہ سے کام لیتی ہیں۔ دوسرے چونکہ اب تک ان کا مطمح نظر زیادہ تر کسی صورت سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا رہا ہے اس لئے اگر ان کے سیاسی نقشے کے سلسلے میں کچھ فسادات بھی ہو جائیں تو انھیں پروا نہیں ہوتی۔ پھر کچھ ایسی پارٹیاں بھی ہیں جو صاف صاف فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتی ہیں۔ ایسی پارٹیاں اکثریت میں بھی ہیں اور اقلیت میں بھی، مگر یہ بھی واضح ہے کہ اکثریت کی فرقہ واریت، اقلیت کی فرقہ واریت سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس کے پاس طاقت اور تعداد دونوں زیادہ ہیں۔ ہمارے نزدیک سیاسی معاملات میں فرقہ وارانہ پارٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اکثریت کو تو اس کی سرے سے ضرورت نہیں، اقلیت کے بھی سیاسی حقوق سیکولر پارٹیوں کے ذریعے ہی مل سکتے ہیں۔ صرف مذہبی اور چند مخصوص تہذیبی معاملات میں اقلیت کے تمام لوگ مشترک مفاد رکھتے ہیں۔ عام سیاسی اور اقتصادی اور پیشوں کے معاملات میں اقلیت کا مفاد بھی اپنے ساتھ کے اقتصادی طبقے کے ساتھ ہے۔ ایک مسلمان استاد کا مفاد، دوسرے مذاہب کے استادوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک مسلمان کسان کا دوسرے کسانوں کے ساتھ، ایک مسلمان مزدور کا دوسرے مزدوروں کے ساتھ۔ دنیوی معاملات کو دنیوی علوم کی روشنی ہوئی آگہی کے مطابق طے کرنا کسی طرح لادینیت نہیں ہے۔

اس لئے فسادات صرف حکومت کی مستعدی کی وجہ سے نہیں رکیں گے۔ اس کے لئے لوگوں کا ذہن بدلنا ہوگا۔ جمہوریت اور سیکولرازم کا زبان سے نام لیا اور عمل میں انھیں [illegible] کر دیا، کسی طرح نہیں چل سکتا۔ قول اور عمل میں مطابقت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ترقی اور امن کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ سیکولر ذہن ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوتا، مگر اس کے لئے واقعی اور بھرپور کوشش تو ہونی چاہئے۔ اس کوشش کے معنی یہ نہیں کہ صرف لوگوں کو نصیحت کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دانشور، استاد، وکیل، ڈاکٹر، سیاست داں، فن کار، ادیب، تاجر، صنعت کار قومی اتحاد کے لئے سرگرم ہوں، سیکولر خیالات عام کریں۔ فرقہ واریت کے ہر چھوٹے سے چھوٹے مظاہرے کے خلاف آواز اٹھائیں۔ امن قائم کرنے میں خود مدد کریں اور حکومت سے سختی سے اصرار کریں۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کا یہ بھی فرض ہے کہ تشدد کی سخت مذمت کریں خواہ بظاہر اس کے پیچھے کیسا ہی مقصد ہو، چنانچہ طلبہ کا تشدد بھی جو دراصل نئی نسل کی پہلی نسل سے مایوسی اور اس کے غصے کو ظاہر کرتا ہے اسی وقت رد کیا جا سکتا ہے جب مذہب کے نام پر یا زبان کے نام پر یا علاقے کے نام پر جھگڑے بند ہوں، یا اگر جھگڑا ہو تو سختی سے مقابلہ [illegible]

دراصل آزادی کے بیس سال بعد لوگوں کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان بیس سالوں میں ہم سے ہمارے رہنماؤں نے جو وعدے کئے تھے وہ پورے نہیں کئے۔ ہم کو جس رفتار سے ترقی کرنی تھی وہ ہم نہیں کر سکے اور ایک نیا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اپنی بانسری بجانے میں مصروف ہے حالانکہ ہمارا گھر جل رہا ہے۔ یہ غم و غصہ بجا ہے، مگر اس غم و غصہ کے لئے اقلیتوں کو نشانہ بنانا اور قومی دولت کو برباد کرنا کس دھرم میں جائز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بحث و مباحثہ سے تبادلۂ خیال سے جمہوری طریقۂ کار کے مطابق اپنے مسائل کا حل نکالیں، ایسا نہ ہو کہ تشدد اور فسادات جاری رہے تو پھر ہمارا حال غالب کے اس شعر کے مصداق ہوگا ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

[illegible] نے ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۲۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم جولائی ۱۹۶۸ء

ادار یہ

اتر پردیش کی ریاستی شاخ

اتر پردیش کی ریاستی شاخ کے نئے انتخابات اب تک نہ ہو سکے تھے اب ۲۸ مئی کو یہ انتخابات ہوئے اور خوشی کی بات ہے کہ اتفاق رائے سے ہوئے۔ ریاستی شاخ کے نئے صدر اردو کے پرانے خادم اور ممتاز کارکن جناب شیو ناتھ پرشاد ہوئے ہیں جو دستخطی مہم کے زمانے سے ریاست میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے برابر کام کر رہے ہیں۔ جنرل سکریٹری ایک اور کارآزمودہ اور مخلص کارکن جناب راحت علی خاں بنائے گئے ہیں۔ ہم دونوں کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ان حضرات کی رہنمائی میں اتر پردیش میں اردو کی بقا اور ترقی کی مہم تیز ہوگی اور جلد رنگ دبار لائے گی۔

ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد اتر پردیش میں ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد ۷۶ لاکھ تھی۔ اب تو اس سے بہت زیادہ ہوگی۔ اتر پردیش اردو کا گہوارہ ہے۔ ریاست کی تہذیبی زندگی میں اردو کا حصہ بہت بڑا ہے۔ ریاست کی تاریخ میں اردو کے نقوش قدم قدم پر ملتے ہیں۔ دہلی کے بعد لکھنؤ نے اردو کو نکھارا اور سنوارا اتر پردیش میں آج بھی اردو کے اخباروں کی خاصی تعداد ہے۔ یہاں سے کتابیں بھی خاصی تعداد میں شایع ہوتی ہیں۔ یہاں کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کا معاصر اردو ادب میں ممتاز مقام ہے۔ یہاں کی تہذیب، معاشرت، رسم و رواج، آداب مجلس، بول چال، غرض زندگی کے ہر شعبے میں اردو کی چھاپ مل جائے گی۔ غازی آباد سے مغل سرائے تک ریل میں سفر کیجیے اور تھرڈ کلاس میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ارباب سیاست کچھ کہیں مگر یہاں کی سب سے عام زبان، آج بھی اردو ہی ہے۔

مگر اس ریاست میں آزادی کے بعد سے اردو کا حال سب سے برا ہے۔ اگر اور کچھ نہ کیا جائے صرف لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھوں رپورٹوں کی ورق گردانی کر لی جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں اردو بولنے والوں کی آبادی کے لحاظ سے، ابتدائی اسکولوں میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد یہاں بہت کم ہے۔ یہ تعداد بھی زیادہ تر بیسک تعلیمی بورڈ کے اپنے اسکولوں یا مکاتب یا مدارس کے طلبہ کی ہے ضلع پریشد اور لوکل باڈیز کے زیر اہتمام عام اسکولوں کی کل تعداد کو دیکھتے ہوئے اردو اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ثانوی اسکولوں میں اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے کچھ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے مگر اردو کے ذریعہ سے ثانوی تعلیم سرے سے پوری ریاست میں دی ہی نہیں جاتی سہ لسانی فارمولے کی رو سے توقع تھی کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں اردو تیسری زبان کے طور پر پڑھنے کا موقع ضرور فراہم کیا جائے گا مگر یہ بھی بہت کم اسکولوں میں ہوا ہے۔ زیادہ تر سنسکرت تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ غرض ریاستی حکومت نے اردو کی طرف سے بڑی غفلت برتی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بیس سال بعد بھی اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا اور اردو بدستور کس مپرسی اور بے حسی کی شکار ہے۔ ان حالات میں ہماری ریاستی شاخ کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو ہر ضلع میں انجمن کی شاخ کو فعال بنانا ہے اور اسے اس کام پر لگانا ہے کہ اپنے علاقے میں اردو میں ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور سہ لسانی فارمولے میں اردو کے لئے گنجائش پر اپنی پوری توجہ اور طاقت صرف کر دے۔ یہ بنیادی کام ہے۔ اس کے بغیر اردو کی ترقی کا خیال، خیال خام ہے، اس سلسلے میں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ صرف ضلع پریشد اور لوکل باڈیز سے کہنا کافی نہیں، اگر یہ ادارے [illegible] کرنے میں تال مٹول کریں اور دستور کی صریح ہدایت کی [illegible]

اپنے ادارے قائم کرنے چاہئیں جنہیں دستور کے مطابق سرکاری امداد بھی ملے۔ یعنی ضلع کی شاخوں کا کام دہرا ہونا چاہئے ایک طرف یہ حکومت کو توجہ دلائیں اور دوسری طرف اپنے وسائل سے کام لے کر خود اردو کے اسکول چلائیں۔

ضلع کی شاخوں کو فعّال بنانے کے بعد ریاستی شاخ کو پوری ریاست میں اردو کی تعلیم کی مہم کا آغاز کرنا چاہئے اور تعلیم کے علاوہ عدالتوں، دفاتر، اور زندگی کے اور رفاہ عام کے دوسرے شعبوں میں اردو کے تحفظ کے لئے زور دینا چاہئے اتر پردیش کی شاخ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اِدھر ریاست میں اردو کے تحفظ کے کام پر پوری توجہ نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اب ریاستی شاخ کے نئے عہدہ دار اس بنیادی کام کو اپنے ہاتھ میں لیں گے ریاستی شاخ کا دفتر زیادہ پابندی سے کام کرے گا۔ اور ہمیں پوری ریاست کے اردو دوستوں کے تعاون سے اتر پردیش میں اردو کو اس کا حق دلانے میں کامیابی ہو سکے گی۔

احمد آباد سے اردو ماہنامہ کا اجراء

احمد آباد۔ بزم خلوص مرزا پور احمد آباد نے فیصلہ کیا ہے کہ یکم اگست سے احمد آباد سے ایک ماہنامہ ندائے گجرات کا اجرا کیا جائے یہ ماہنامہ گجرات کا پہلا اردو ماہنامہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔ دفتر ماہنامہ ندائے گجرات مرزا پور احمد آباد ؟

شاہد احمد دہلوی کے مضامین کا مجموعہ اجڑا دیار شائع ہوگیا

علی گڑھ۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے پڑھی جائے گی کہ شاہد احمد دہلوی مرحوم کے اُن مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے جس کا موضوع دلّی ہے۔ اجڑا دیار میں ۲۶ مضامین شامل ہیں۔ جن میں شاہد احمد دہلوی نے دلّی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت دس روپیہ۔ اور ملنے کا پتہ ہے مشتاق بک ۱۱، اردو کالج شملڈن روڈ کراچی۔

تحریر و تنقید

پرویز بک ایجنسی حیدرآباد اُردو کے نئے نقاد و ادیب جناب طیب انصاری کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعہ "تحریر و تنقید" کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی ہے اس مجموعہ مضامین کے بیشتر مضامین ہند پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ماہ تک یہ کتاب شائع ہو جائے گی۔

اختر نظمی

نغموں کا المیہ

میرے نغموں کی کسک، درد مرے گیتوں کا
میں تو سمجھا تھا کہ ہر دل میں اتر جائے گا
یہ نہ سوچا تھا کہ تعریف کے ہنگاموں میں
کوئی آواز ابھرنے ہی نہیں پائے گی!
راگنی کوئی سنورنے ہی نہیں پائے گی!
لوگ عادی ہیں اندھیروں کے تو میرا کیا ہے
میں بھی راگوں کی شعاعیں نہ بکھیروں گا کبھی
میں کسی بزم میں اب ساز نہیں چھیڑوں گا
کوئی لے اب مرے ہونٹوں پہ نہ رقصاں ہوگی
اپنی امیدوں کا سرمایہ، تمنا کا چمن
اپنے ہاتھوں سے لٹا دوں مجھے منظور نہیں!!
خونِ دل خونِ جگر دے کے سنوارا ہے انہیں
میں نے ہر چیز گنوا دی ہے تو پایا ہے انھیں

بیرونی ممالک میں غالب کی سویں برسی کی تیاری

آئندہ فروری کے مہینہ میں حکومت پاکستان مشہور اُردو شاعر اسداللہ خاں غالب کی یاد میں ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کرے گی غالب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں خاص پروگرام نشر کیے جائیں گے۔ ان کا مواد جمع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان افغانستان، ایران۔ روس برطانیہ اور امریکہ میں بھی غالب کی سویں برسی منانے کے لیے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں ان ممالک میں نمائش، ورمشاعرے ہوں گے اور کتابیں چھاپی جائیں گی۔ ہندوستان میں اس مقصد سے ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کے سرپرست ڈاکٹر ذاکر حسین اور صدر مسز گاندھی ہیں۔

اقوام متحدہ کی جانب سے بھی غالب کے بارے میں خاص مطبوعات شائع کی جا رہی ہیں۔　　　(ریاست)

میرا ایوارڈ کے لئے اردو کی چار کتابیں منتخب

لکھنؤ ۲۴ رجون۔ آل انڈیا میرا اکاڈمی نے ۱۹۶۶ء کی اردو تصانیف میں سے چار کو میرا ایوارڈ کے لئے منتخب کرتے ہوئے مجموعی طور پر دو ہزار روپے کے انعامات دینے کا اعلان کیا ہے آل انڈیا میرا ایوارڈ کے لئے منتخب کتابوں میں ماثر دلآ وری از قاضی ابرار حسین) دبستان دبیر (از ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بمبئی) جگر حیات و شاعری (از ڈاکٹر محمد اسلام لکھنؤ) اردو ڈرامہ (از عبد العلیم نامی بمبئی) ہیں۔　　　(قومی آواز)

سید احتشام حسین۔

لسانی پیچیدگیاں، دستورِ ہند اور اردو

دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جس میں لسانی مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہو۔ جتنا ہندوستان میں یہ الجھاؤ کچھ تاریخی حالات کا نتیجہ ہے اور کچھ ان کو نہ سمجھنے کا، کچھ غیر شعوری طور پر الجھ گیا ہے کچھ شعوری کوششوں سے الجھایا جا رہا ہے۔ اس پیچیدگی کے اسباب سیاست، مذہب، تعلیم، قومیت، قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کے غلط رجعت پسندانہ، غیر عقلی اور محدود مفاد پرستانہ تصورات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ عقلی حیثیت سے بات اتنی ہی ہے کہ جو فرد بھی کسی زبان کو اپنی زبان کہتا ہے اسے اس میں اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ہو اور عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ سماج اس کے لئے بھی وہی سہولتیں فراہم کرے جو کسی زبان کے لئے فراہم کی جا سکتی ہیں۔ بولنے والوں کی کمی کی وجہ سے یا ان کے انتشار کی وجہ سے کسی زبان کو اس کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ عملی دقتوں کی وجہ سے پابندیاں اس حد تک عائد کی جا سکتی ہیں جس حد تک اس زبان کی بقا اور ترقی کو نقصان نہ پہنچائیں ہندوستان میں اردو کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہاں کے تعلیم یافتہ اور بہ ظاہر جمہوریت دوست بھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔

یہ حقیقت کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان میں مختلف گروہوں اور لسانی نسلوں کی متعدد زبانیں رائج ہیں۔ بعض ایک دوسرے سے بہت دور ہیں، بعض بہت قریب۔ دراوڑ زبانیں آریائی سے، آریائی کشمیری سے، کشمیری، تبتی اور بعض شمالی ہند کی پہاڑی بولیوں سے بہت مختلف ہیں پھر خود ان کے اندر اختلافات ہیں دراوڑ زبان کے چار روپ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ آریائی زبانیں بنیادی ایک ہونے کے باوجود الگ الگ قرار دی جاتی ہیں اور کوئی ایک دوسرے میں ضم ہونا نہیں چاہتی بعض بولیاں جنھیں علمائے لسانیات زبان کا درجہ نہیں دیتے زبان ہونے اور اپنا الگ وجود رکھنے کا دعویٰ کرتی ہیں، ان کی خواہش بھی یہی ہے کہ وہ کسی دوسری زبان میں ضم نہ ہوں کوئی ایک زبان ایسی نہیں ہے جو ملک کے ہر حصے میں یکساں یا عام طور سے سمجھی جاتی ہو۔ یہ ساری باتیں تو اتنی واضح ہیں کہ ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں صرف اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ ان زبانوں کے علاقے جیسے بھی ہیں انھیں کے اندر ایسے گروہ بھی بستے ہیں جو وہاں کی علاقائی زبان کو اپنی زبان نہیں سمجھتے

مزدور نا سیکھنے اور استعمال کرنے کی بات اور ہے۔ ایسی جگہوں پر بڑی زبان چھوٹی کو دبانے کی جو کوشش کرتی ہے اس کی مثالیں بھی ہندوستان کے لسانی تنازعہ میں بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔

اب ایک اور صورت حال پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ زبانوں کے استعمال اور چلن کے نقطۂ نظر سے یہاں کی زبانوں کا مطالعہ مندرجہ ذیل شکلوں میں بھی کرنا چاہئے کہ ان کی الگ الگ حدود کیا ہیں۔

(۱) زبان بہ حیثیت مادری زبان۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص سب سے پہلے ایک ایسی زبان استعمال کرتا ہے جو وہ اپنے گھر کے اندر سنتا اور زیادہ کاوش کے بغیر تقریباً فطری طور پر استعمال کرنے لگتا ہے۔ عام طور سے اس زبان کو بولنے والے کی اصل زبان کہا جائے گا۔ اسی کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ انسان اسی میں سوچتا اور آسانی سے اظہارِ خیال کرتا ہے اس لئے اس کی تعلیم اسی زبان میں ہونا مناسب ہے۔

(۲) علاقائی زبان، جغرافیائی۔ تاریخی اور تہذیبی اسباب سے بعض علاقوں میں تقریباً سبھی لوگ ایک زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ اس علاقہ کی علاقائی زبان ہوگی حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ وہی اس علاقہ کے تمام لوگوں کی مادری زبان بھی ہو۔ چونکہ ایک مخصوص علاقے میں ایک زبان اکثریت کی ہو جاتی ہے اس لئے وہ علاقہ اسی کے نام سے منسوب ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس علاقہ میں کوئی دوسری زبان موجود ہی نہیں ہے۔ دوسری زبان کے بولنے والے اگر خاصی تعداد میں ہوں تو وہ یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی زبان کو بھی دوسری علاقائی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس علاقہ کے بہت سے لوگ دو زبانوں کے جاننے والے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ صورت سرحد پر خاص طور سے نمایاں ہوگی جہاں دو زبانیں ایک دوسرے پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔

(۳) سرکاری زبان۔ یہ وہ زبان ہے جو قانون کے ذریعہ کسی خاص علاقہ یا پورے ملک میں دفتری اور دوسرے کاموں کے لیے استعمال کا حق حاصل کرتی ہے۔ یہ علاقائی زبان بھی ہو سکتی ہے کسی مخصوص تاریخی یا سیاسی وجہ سے بھی یہ منصب حاصل کر سکتی ہے۔ انتظامی حالات کے پیشِ نظر مختلف ریاستیں اپنی اپنی سرکاری زبانوں کے قانون بناتی ہیں۔ اور پھر پورا ملک اپنی سرکاری زبان بنا سکتا ہے۔ یہ بھی کسی علاقے کی یا کچھ لوگوں کی مادری زبان ہو سکتی ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ محض سیاسی یا تاریخی حیثیت سے اس کی مستحق قرار دی گئی ہو۔ جب یہ زبان کچھ لوگوں کی مادری زبان ہوتی ہے تو [illegible] کے استعمال میں زیادہ آسانی بھی ہوتی ہے اور [illegible] کا

احساس برتری بھی پیدا ہو چلتا ہے کہ ان کی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔

ایسی حالت میں دوسرے لوگ احساس زیاں کا شکار بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان پر ایسی زبان مسلط کی گئی ہے جو ان کی زبان نہیں ہے۔ انھیں تعلیم، امتحان، وغیرہ میں بھی اکثر وہ سہولتیں نہیں حاصل ہوتیں جو اصل بولنے والوں کو ہوتی ہیں۔

(۴) دوسری سرکاری زبان۔ یہ وہ زبان ہوگی جو کسی خاص علاقہ میں بولنے والوں کی معتدبہ تعداد اور اپنی تاریخی اہمیت کی وجہ سے قانوناً دوسری سرکاری زبان قرار دی جائے گی اسے تقریباً وہی مرتبہ حاصل ہوگا جو سرکاری زبان کو ہوگا۔ بس فرق یہ ہوگا کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد کسی قدر کم ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے سارے کاموں کے بجائے چند ایسے بنیادی کاموں کے لئے استعمال کیا جائے جس کا تحفظ دستوری نقطۂ نظر سے ضروری ہو۔

(۵) مشترک زبان۔ یہ زبان رابطہ کے لئے فطری طور پر استعمال ہونے لگتی ہے یا قانونی مرتبہ حاصل کر لینے کے بعد لوگوں کے درمیان اظہار خیال کی کڑی بن جاتی ہے۔ اسے قانونی مرتبہ کبھی نہ حاصل ہو تو یہ لوگوں کے درمیان رابطہ کا کام دیتی رہتی ہے۔

(۶) قومی زبان ایک مشترک اور متحد قوم اگر یہ جو کسی ایک زبان کو اپنی قومی زبان قرار دیتی ہے تو کوئی بات ہی نہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس قوم کے لوگ جتنی زبانیں استعمال کرتے ہیں سب قومی کہی جائیں گی کوئی ایک دوسرے سے کمتر نہیں قرار دی جا سکتی۔ کسی کو "غیر قومی" یا بیرونی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سرکاری زبان کا قومی زبان ہونا لازمی نہیں، دونوں مترادف نہیں ہیں۔ قومی زبان میں جبر کا شائبہ نہیں۔ سرکاری زبان بہ جبر بھی قانوناً لوگوں پر مسلط کی جا سکتی ہے

جب ہم زبان کا لفظ ضروریات اور چلن کے سلسلہ میں استعمال کرتے ہیں تو غالباً ہمارے سامنے انھیں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے (اصول زبان کی بحث یہاں اس لئے نہیں ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ میں ہم کوئی زبان اپنے ادبی اظہار کے لئے استعمال کر سکتے ہیں چاہے وہ اجنبی ہو یا علاقائی، قومی یا غیر قومی) اب ذرا یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو کو ہندوستان کے کسی علاقے میں کیا حیثیت حاصل ہے اور دستور ہند اس سلسلہ میں کس حد تک اس کی حیثیت کا تحفظ کرتا ہے۔

(۱) اردو زبان ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کی مادری زبان ہے چونکہ [illegible] اس کے بولنے والوں کی تعداد کم ہے بعض [illegible] آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش

کے بعض حصے ہریانہ اور پنجاب کے بعض حصے ایسے ہیں جہاں دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی علاقائی حیثیت حاصل ہے جن کی یہ مادری زبان نہیں ہے۔ وہ بھی اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے یوپی، بہار، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش کے علاقوں نے اپنے یہاں کی سرکاری زبانیں قانون کے ذریعہ سے ہندی اور تلگو مقرر کر دی ہیں۔ ان میں سے کم سے کم تین ریاستوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ان علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دے دیا جائے۔ آئینی حیثیت سے اس مطالبہ کو دفعات ۱۹، ۲۹، ۳۰، ۳۴۵، ۳۴۷، ۳۵۰، ۳۵۰ (الف) اور ۳۵۰ (ب) سے تقویت پہنچتی ہے۔ ایک طرف آئین نے زبان کے آزادانہ استعمال کو بنیادی حقوق میں جگہ دی ہے دوسری جانب جمہوریہ ہند کے صدر اور مجالس قانون ساز کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ مطالبہ کئے جانے پر اردو کو بھی (یا کسی زبان کو) سرکاری زبان کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اگر یہ حق نہیں دیا جاتا تو دفعہ ۱۵ (یعنی کسی کو اس کے مذہب، زبان، جنس، نسل وغیرہ کی وجہ سے دوسرے سے برتر یا کمتر نہیں سمجھا جائے گا) دفعہ ۱۹ (جس میں استعمال زبان کی آزادی ہر شہری کے لئے تسلیم کی گئی ہے) دفعہ ۲۹ (جس میں ہندوستان میں بسنے والے ہر گروہ کی زبان، رسم خط اور تہذیب کے تحفظ کا اعلان ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان، مذہب، نسل وغیرہ کی بنیاد پر کسی تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا) دفعہ ۳۰ (جس میں اقلیتوں کو اپنی زبان کو ترقی دینے کے لئے ادارے قائم کرنے کا حق ہے) اور شہریت کے بنیادی حقوق کا اعلان سب بے معنی ہو جائیں گے۔ ہر ریاست کو شہری کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرنے کی ہدایت دفعہ ۳۵۰ (الف) میں موجود ہے ان سب پر بالا دفعہ ۳۵۰ ہے جس میں ہندوستان کے کسی شہری کو ہندوستان کے خطہ میں کسی زبان میں (جس کا شیڈول آٹھ میں ذکر ہے) شکایتی درخواست دینے کا حق حاصل ہے اور کسی علاقہ کی عدالت کو قانوناً اس درخواست سے انکار کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اگر محض آئینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حسب ذیل باتیں واضح ہیں:۔

(۱) اردو ہندوستان کی ایک قومی زبان ہے۔

(۲) اردو جن کی مادری زبان ہے انھیں اس میں تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

(۳) اردو میں درخواستیں ہندوستان کی کسی عدالت میں دی جا سکتی ہیں اور عدالت ان کو [illegible]

(۴) جہاں اردو بولنے والے خاصی تعداد میں ہیں وہ [illegible] جمہوریہ سے بھی مطالبہ کر سکتے ہیں اردو یا [illegible]

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "مکتوبات نیاز" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بہترین خطوط وہ ہوتے ہیں جو جلا دیئے جائیں" غالباً یہ ردعمل تھا ان خطوط کے مطالعے کا جو خطوط غالب کی شہرت ومقبولیت کے بعد عالم وجود میں آئے اور انھیں پڑھ کر یہ گمان ہونے لگا کہ یہ بغرض اشاعت" تحریر کئے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ بے تکلفی اور بے ساختگی نہیں پائی جاتی جو نجی خطوں کی سب سے اہم خصوصیت ہے یہ بات اپنی جگہ پر صحیح بھی ہے کہ ذاتی خطوط اگر تصنیف و تالیف کا رنگ اختیار کرلیں تو لکھنے والے کو چاہیے کہ ان خیالات یا معلومات کو کتاب یا مقالے کی صورت میں ہی قلم بند کرے تاکہ ان سے ہر عارف و عامی کو استفادے کا موقع مل سکے لیکن اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ خطوط لکھنے والے کی شخصیت کا مظہر ہوتے ہیں اور شخصیتیں بھی مختلف طرح کی ہوتی ہیں کسی ایک شخص کے مختلف اشخاص سے تعلقات کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹے بیٹیاں، دوست، قرابت دار محبوب، پیر، مرید، استاد، شاگرد، بزرگ، خرد، دیدہ، نادیدہ غرض کہ صدہا قسم کے رشتے اور نسبتیں اس دائرے میں آجاتی ہیں اس لئے خطوط کی بھی صدہا قسمیں ہوتی ہیں اور سب کی سب لکھنے والے کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو سامنے لاتی ہیں۔ اس لئے صرف ضائع کر دینے اور جلا دینے کے قابل خطوط ہی اہم اور دلچسپ نہیں ہوتے بلکہ وہ بھی ہمارے لئے دلچسپی، عبرت اور بصیرت کا سامان ہوتے ہیں جو ضائع کرنے یا جلانے سے بچ جاتے یا جنھیں ضائع کرنے یا جلانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی رشید صاحب کا مشورہ اگر ہم سب قبول کرلیں تو مجھے نہیں معلوم کہ اس کے کیا نتائج ہوں گے لیکن اردو زبان ایک اہم صنف

سے ضرور محروم ہو جائے گی جو بیک وقت بہت سی اصناف مرکب یا مجموعہ بھی ہے اور اپنا علیحدہ ذائقہ بھی رکھتی ہے۔ غا سرسید، شبلی اور مہدی افادی سے لے کر محمد علی ردولوی ا صفیہ اختر تک کے مجموعۂ مکاتیب کے مطالعے سے میں نے رائے قائم کی ہے اور اب یہ رائے اور بھی مستحکم ہوتی جارہی نقوش (لاہور) کے "خطوط نمبر" کی اشاعت کا میں اسی ۔ خیر مقدم کرتا ہوں اور اسے اردو زبان کے سرمائے میں ا اضافہ تصور کرتا ہوں۔

محمد طفیل کا رسالہ "نقوش" اپنے ضخیم اور شاندار نمبروں اشاعت کی وجہ سے اپنی خاص انفرادیت متعین کرچکا ہے خا طور پر شخصیات نمبر (دو حصے آپ بیتی نمبر (دو حصے) ا مکاتیب نمبر کی اشاعت کے بعد تو بلاخوف تر د جاسکتا ہے کہ اس وقت کی کسی زبان میں بھی ا بڑے پیمانے پر کسی رسالے خاص اشاعتوں کا اہتما نہیں کیا جاتا۔ رسالے کیا انھیں دیکھ کر "انسائکلوپیڈ کا گمان ہوتا ہے۔ خطوط فراہمی کے سلسلے میں تو اور حیرت ہوتی ہے اس لئے سب سے پہلے ۱۹۵۷ء نقوش کا مکاتیب نمبر دو میں شائع ہوا اب ۱۹۶۸ میں خطوط نمبر تین حصوں م چھپ کر سامنے آیا ہے جس ضخامت تقریباً دو ہزار صف ہے۔ غالب اور سرسید سے لے کر دور حاضر تک کی تمام ا علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیتوں تک ان خطوط دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ ان میں نجی حیثیت کے خطوط بھی ہیں او وہ بھی جن کو تاریخی یا علمی دستاویز کی حیثیت سے محفوظ کر کی ضرورت تھی اس لئے کہ ان خطوط کے ذریعہ گذشتہ ایک صدی کی سیاسی اور تہذیبی زندگی اپنے پورے خدوخال ۔ ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔

ان خطوط کا مفصل جائزہ لینا ان صفحات میں ممکن نہ ہے اور ان کی افادیت کا صحیح اندازہ بھی بغیر تفصیلی مطا نہیں کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں سے بعض دلچسپ ٹکڑے چن نقـ

ندا فاضلی

غزل

سب کی بات سنے ہر کوئی من کی بپتا جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

لاکھ پکارے سورج سورج، لاکھ بجائے دھوپ گھڑی
اندھوں کی اندھی نگری میں دیوانے کی مانے کون

صدیوں صدیوں وہی تماشا، رستہ رستہ لمبی کھوج
لیکن جب ہم مل جاتے ہیں کھو جاتا ہے جانے کون

جانے کیا کیا بول رہا تھا سرحد، پیار، کتابیں، خون
کل میرے بستر پر تھک کر لیٹ گیا تھا جانے کون

کرن کرن الساتا سورج، پلک پلک کھلتی نیندیں
دھیمے دھیمے بکھر رہا ہے، ذرہ ذرہ جانے کون

کئے جاتے ہیں۔

"مولانا حالی اب تک علی گڑھ میں ہیں۔ نئی بات یہ ہے کہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے جو میری لائف منشی سراج الدین سے لکھوائی تھی انھوں نے مولوی الطاف حسین صاحب کو دے دیا اب مولوی الطاف حسین بطور خود میری لائف لکھیں گے اور خود ہی چھپوائیں گے۔ اور جو چاہیں گے کریں گے میں بھی اس پر راضی ہو گیا ہوں کہ مولوی الطاف حسین جو لکھیں چھاپ جاوے۔ آں مولوی سراج الدین نے جو کچھ لکھا تھا وہ چھاپہ ہونے کے قابل نہ تھا بعض واقعات اس میں صحیح نہ تھے اور طرز بیان درست نہ تھا۔ لائف ایک مدح نامہ نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہونی چاہیئے کہ اس شخص کی بھلائی برائی سب کا نمونہ ہو اور الفاظ مدح و ذم اس سے زائد معنوں پر دلالت کرنے والے نہ ہوں جو درحقیقت اس میں ہو۔ میری نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم و فاضل اکمل ہیں کیسی غلط بات ہے۔"

(سر سید احمد خاں بنام مولوی ممتاز علی)

"ایک امر اخلاقی کے متعلق آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ ہر مسلمان جو ہم ترک موالات میں کچھ حصہ لے اور بالخصوص جس پر کوئی مقدمہ قائم ہو اس کو خطاب مولانا دے دیا جائے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اور ہر شخص اس تعلیم کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مولانا کہا جائے۔ رسوم و رواج کی کوشش میں معمولی آداب و القاب کو میری رائے میں ترک کرنا مناسب نہیں ہے اور لفظ مولانا ہرگز بمنزلہ "مسٹر" نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی نہ کسی تعظیمی یا اخلاقی لفظ سے ہر شخص خواہ ہندو ہو یا مسلمان یاد کیا جانا چاہیئے ہندی میں لفظ شریمت یا شری یان ایسے جامع ہیں کہ جو ہر شخص کی نسبت استعمال کئے جا سکتے ہیں کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ لالہ، بابو، پنڈت اور بہت سے الفاظ ہیں جو خاص خاص ہندوؤں کی جماعت کی نسبت بلا لحاظ قابلیت یا درجہ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی لفظ مسلمان صاحبان کے لئے بھی ہونا چاہئے مولوی یا منشی بھی ہر شخص کو نہیں کہا جا سکتا میرے خیال میں لفظ "صاحب" نام کے اخیر میں قریب قریب لفظ مسٹر کے معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کے رائے صائب کی ضرورت ہے۔"

(موتی لال نہرو بنام مولانا عبد الباری فرنگی محلی)

"آپ نے ایک تراشہ بھیجا تھا "شوکت تھانوی ایکٹر بن گیا" خداوند کریم اسی گناہ کو معاف کر دے کہ فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھتا ہوں مگر باپ دادا کی عزت کا اتنا دشمن بھی نہیں کہ ایکٹنگ شروع کر دوں ؎

غلطی ہائے کتابت مت پوچھ
لوگ شوکت کو لما باندھتے ہیں"

(شوکت تھانوی بنام مولانا عبد الماجد دریابادی)

"شرخ آنچل" ایک مجموعہ میری عدم موجودگی میں پوسٹ مین گھر دے گیا۔ میری بیوی نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں عورتوں کے فوٹو اور محبت بھرے افسانے موجود تھے۔ اسی سلسلے میں ممتاز شیریں نے مجھے ایک خط اپنے رسالے کے لئے لکھا تھا وہ بھی اسی دن پہنچا تھا اس نے اسے بھی کھول کر پڑھ لیا۔ ممتاز شیریں کا نام دیکھ کر اچھل پڑی اور میری والدہ سے کہا دیکھئے آپ کے لڑکے پرائی عورتوں سے خط و کتابت کرتے ہیں۔ والدہ صاحبہ ایک ہی سیدھی ٹھہریں۔ میں جب آیا تو مجھ پر برس پڑیں کہ یہ کیا نالائقی ہے۔ میں نے ہر چند سمجھایا کہ ادب و شعر میں یہ چیز بُری نہیں یہ سب ادبی خدمت کے سلسلے میں مجھے خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں نہ والدہ مگر پھر رفتہ رفتہ بات صاف ہو گئی۔"

(شاد عارفی بنام علی حماد عباسی)

"بھائی ابھی تبلیغ کروں گا کانگرس کے موقع پر آنے کی بشرطیکہ آپ کے "فسانۂ عزائم" صاحب کو خبر نہ ہو جائے ورنہ وہ بزرگوار مجھ اپنے آپ کو پہنچوانے کے طفلانہ جذبے میں آ کر میری راہ میں لاکھوں ہمالہ نصب فرما دیں گے۔ ہر چند کہ بار بار کہہ چکا ہوں:

اے یارِ خدا جان چکا ہوں تجھ کو
جانا ہی نہیں مان چکا ہوں تجھ کو
پھر کیوں ہے مرے فسخ عزائم پہ مصر
کہتا ہوں کہ پہچان چکا ہوں تجھ کو

لیکن ان حضرت کو یقین ہی نہیں آتا اور یقین آئے تو کیونکر عادت تو آپ حضرات نے بگاڑ دی ہے ان کی۔ جس شخص کو آپ کی سی سمجھی ہوئی عبدیت

(باقی صفحہ ...)

صفحہ ۴ سے آگے

مجالس قانون ساز سے بھی کہ ان کی زبان کو بھی سب کاموں کے لئے یا کچھ کاموں کے لئے دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے (خاص ناممتدبہ تعداد کی قانونی تعبیر جو بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ یوپی، بہار، دہلی اور آندھرا پردیش میں اردو کو وہ تاریخی، تہذیبی اور لسانی حیثیت حاصل ہے کہ اسے استعمال کئے بغیر ایک بہت بڑی جماعت کا کام ہی نہیں چل سکتا۔)

(۵) بہ ظاہر کسی اور قانونی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے لیکن پھر بھی ریاستی عملے، مرکزی دفاتر اور تعلیمی اداروں سے ان حقوق کے تحفظ میں غلطی ہو سکتی ہے، اس کے تدارک کے لئے دفعہ ۳۵۰ (ب) کے تحت لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا تقرر کیا گیا ہے جو اپنی رپورٹ صدر جمہوریہ کے توسط سے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے گا تاکہ ناانصافیوں کی تلافی اور تدارک ہو سکے۔ اگر ان حقائق پر نگاہ رکھی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اردو کے لئے کسی قسم کے حق یا تحفظ حقوق کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد دن رات مطالبہ کر رہی ہے وہاں بھی بچوں کو ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم دینے کا انتظام یا تو سرے سے نہیں ہے یا بالکل ناقص ہے۔ مطالبے کے باوجود بہت سی عدالتیں اردو میں کاروبار کی اجازت نہیں دیتیں، ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والے معتدبہ تعداد میں موجود ہیں اور برابر صدر اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کر رہے ہیں اردو کو علاقائی یا سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ بعض حقوق کے موجود ہوتے ہوئے ان کا حاصل نہ ہونا بعض سہولتوں کے قانونی طور پر درج آئین ہونے کے باوجود ان پر عمل درآمد نہ ہونا صرف اردو کے بولنے والوں کی کمزوری اور کوتاہی نہیں ہے دستور اور قانون کے ساتھ مذاق ہے جس کو کسی منصف مزاج جمہوریت دوست ہندوستانی کو برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی انفرادیت، لسانی، ادبی اور تہذیبی حیثیت کی وجہ سے اردو کو ایک الگ زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ وہ ہندی کا ایک اسلوب ہے اس کی انفرادی حیثیت نہیں بدلتی اسی انفرادیت کی وجہ سے قواعدی ساخت کی یکسانیت کے باوجود میتھلی کو ہندی سے علیحدہ الگ زبان تسلیم کیا گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب راجستھانی بھی ہندی سے الگ ایک زبان تسلیم کر لی جائے گی۔ اردو کی اس انفرادیت کو نظر انداز کرنا جو صوتی، صوتیاتی، نحوی، محاوراتی، ادبی حیثیت سے اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ زبانوں کے اصول ارتقا سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

جب تک ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو ایک علیحدہ زبان ہے اس وقت تک ہمیں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا ہوگا جو ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے لئے روا رکھا جاتا ہے۔

اردو کی وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو انگریزی یا سنسکرت کی ہے کیونکہ انگریزی اور سنسکرت یہاں نہ کسی کی مادری زبان ہے اور نہ ان کا کوئی علاقہ ہے۔ جب تک اردو کو خود اس کے علاقہ میں علاقائی زبان نہیں بنایا جائے گا اس وقت تک اردو بولنے والوں کے حقوق کا تحفظ نہیں ہو سکے گا۔ مجھے اردو کے علاقائی زبان یا دوسری سرکاری زبان تسلیم کئے جانے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا جس پر بعض حضرات نے قلمی جنگ جاری کر رکھی ہے علاقائی یا سرکاری زبان تسلیم کئے جانے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوں گے کہ

۱۔ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کو اردو میں تعلیم دی جائے۔

۲۔ جو طلبہ ثانوی درجوں میں اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں سہولتیں دی جائیں اور ان کے لئے نصاب کی کتابیں فراہم کی جائیں۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم میں بھی اردو کے لئے سہولتیں مہیا کی جائیں اور اردو اساتذہ کی تربیت کا انتظام ہو۔

۴۔ سرکاری قوانین، گزٹ، احکام، اعلانات، ووٹروں کی فہرستیں اردو میں بھی ہوں۔

۵۔ عدالتوں میں درخواستیں اردو میں قبول کی جائیں اور اردو دستاویزات کی رجسٹری بھی ہو۔

۶۔ اردو کی ہمت افزائی اسی طرح کی جائے جیسے کسی دوسری زبان کی۔

یہ وہ کم سے کم مطالبات ہیں جن کی دستور میں گنجائش ہے ان کے حاصل کرنے کی جد و جہد میں اور مطالبات پیش کرنے کے طریق کار میں اختلاف ہو سکتا ہے ان میں تبدیلی یا کمی نہیں ہو سکتی۔

(بشکریہ قومی آواز)

مراسلات

غالب کا ایک قطعہ

ہر چہ درگفتار فخر تست آں ننگ منست

میرے کتب خانہ میں کلیات غالب فارسی مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ کا ۱۸۶۲ء کا چھپا ہوا دوسرا اڈیشن ہے اور اس کے صفحہ ۱۲۳ پر قطعہ نمبر ۱ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

اے کہ در بزم شہنشاہِ سخن رس گفتہ
کے بشیر گوئی فلاں در شعر ہم سنگِ منست

اس قطعے میں انیس اشعار ہیں اور اسی قطعے کے چوتھے شعر میں مجموعۂ اردو کو بے رنگ منست اور بارہویں شعر میں ننگ منست کہا گیا ہے۔

چونکہ اس قطعے کے چودھویں شعر میں بہادر شاہ ثانی کا اسم گرامی اس طرح نظم کیا گیا ہے ؎

دیدہ در سلطاں سراج الدیں بہادر شہ کہ از
آں شہر ہید کہ پنہاں در رگ سنگ منست

لہذا اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس شہنشاہِ سخن رس کی بزم میں کسی شاعر کو پر گوئی میں غالب کا ہم سنگ بتا کر غالب کے دعوی انا ولا غیری کو مجروح کیا گیا تھا وہ شہنشاہ بہادر شاہ ثانی تھا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بزم شاہنشاہ میں پر گوئی میں کس نے کس کو غالب کا شریک بتایا تھا؟

بے شک مولنا محمد حسین آزاد نے علی اسبیل الاحتمال اور مولنا الطاف حسین حالی نے وثوق کے ساتھ غالب کے اس قطعے کا مخاطب ذوق کو بتایا ہے لیکن آب حیات اور یادگار غالب کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولنا آزاد اور مولنا حالی نے اس قطعے کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی بس سماعیات پر اعتبار فرما لیا تھا اور اسی وجہ سے ان دونوں بزرگوں کو غالب کے اس قطعے کے اشعار کی صحیح تعداد بھی معلوم نہیں تھی۔

مولانا آزاد آب حیات طبع ثانی کے صفحہ ۴۸۸ کے حاشیہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں " دیوان فارسی میں بیس پچیس شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے بعض اشخاص کا قول ہے کہ ذوق کی طرف چشمک ہے غرض اسی میں کا ایک شعر ہے ؎

راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

اور مولنا حالی یادگار غالب کے صفحہ ۱۰۶ پر یوں رقمطراز ہیں " قطع نظر اس کے وہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اردو شاعری کو داخل کمالات نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں اپنی کسر شان جانتے تھے چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید — ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

کیا خوب ہو اگر غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں کوئی اہل نظر بزرگ یہ تحقیق فرمائیں کہ غالب کے اس قطعے کے مخاطب خاقانیٔ ہند ذوق تھے یا کوئی اور استاد؟ (محمد عباس طالب صفوی)

خود بینی عقاب

"ہماری زبان" مورخہ یکم جون ۱۹۶۸ء میں صفحہ ۸ پر آغائی محترم سید مبارز الدین صاحب رفعت کا "استفسار" پیش نظر ہے۔ مطلوبہ فارسی نظم کا عنوان "تیر و عقاب" نہیں بلکہ "خود بینیٔ عقاب" ہے یہ نظم تمام و کمال جناب رفعت صاحب کی خواہش کے مطابق بھیجی جا رہی ہے۔ نظم ہذا کا آخری مصرع "از ماست کہ بر ماست" نہیں ہے جیسا کہ پوری منقولہ نظم سے ظاہر ہے۔ البتہ "از ماست کہ بر ماست" نے فارسی ضرب المثل کا جو بصورت ردیف اپنا لیا ہے۔

باور ہے کہ "خود بینیٔ عقاب" نظم اخلاقی شاعر ناصر خسرو کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جس کے عہد کی وضاحت اس بنا پر تحصیل حاصل ہے کہ جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت غالباً آغای رضا زادہ شفق کی مشہور فارسی تصنیف "تاریخ ادبیات ایران" کو اردو جامہ پہنا چکے ہیں۔ استدعا ہے کہ آپ از راہ کرم "ہماری زبان" کی اگلی اشاعت میں "خود بینیٔ عقاب" نظم کو شائع فرما کر خاکسار اور رفعت صاحب دونوں کا دلی شکریہ قبول فرمائیے گا۔ خدائے برتر "تنقید کیا ہے؟" کے مخلص خالق کو جزائے خیر دے۔ ع تشکر صد متہائی توجند الحمد منہائی تو

(کلدیپ پرکاش آرہ)

خود بینیٔ عقاب

روزی ز سر سنگ عقابی بہ ہوا خاست — و اندر طلب طعمہ پر و بال بیاراست
بر راستی بال نظر کرد و چنین گفت — امروز ہمہ روی زمیں زیر پر ماست
چوں من کہ تواند بپرد در ہمہ عالم — چہ کرگس و چہ تقنس و چہ سیمرغ و چہ عنقاست
بر اوج چو پرواز کنم از نظر تیز — بینم سر موئی ہمہ گر در تہ دریاست
گر بر سر خاشاک یکی پشہ بجنبد — آں بر زدن پشہ ہمہ در نظر ماست
بسیار منی کرد و ز تقدیر نترسید — بنگر کہ ازیں چرخ جفا پیشہ چہ برخاست
ناگہ ز قضا سخت کمانی ز کمیں گاہ — تیری ز قضا و قدر انداخت بر راست
بر بال عقاب آمد آں تیر جگر دوز — و ز عالم علویش بہ سفلیش فرو کاست
بر خاک بیفتاد و بغلطید چو ماہی — و انگہ پر خویش کشود از چپ و از راست
ایش عجب آمد کہ ز چوبی و ز آہن — ایں تندی و تیزی و پریدن ز کجا خاست
چوں نیک نظر کرد پر خویش دراں دید — گفتا ز کہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست
ناصر تو منی را ز سر خویش بدر کن — بنگر کہ عقابی ز منی کرد چہا خاست

ایس انور

مکتوب لندن

بزم تفریح کا ماہانہ مشاعرہ

عبدالعلیم صدیقی کی اطلاع کے مطابق بزم تفریح لندن کا ماہانہ مشاعرہ الائنس ہال، پامر اسٹریٹ ایس۔ ڈبلیو ا لندن میں ۱۵ جون بروز ہفتہ شام چھ بجے منعقد ہوگا جس میں ممتاز شعرائے کرام کو شرکت کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ مشاعرہ کے ساتھ محفل موسیقی بھی ترتیب دی گئی ہے۔

ماہنامہ آفاق شمارہ مئی و جون

آفاق کے مئی اور جون کے شمارے جون کے دوسرے ہفتہ میں موصول ہوئے۔ مئی کا شمارہ اب کے بہت تاخیر سے شائع ہوا۔

اس شمارہ میں ٹیپو سلطان، ہیر رانجھا (حمید احمد خاں) اقبال کا تصور کائنات (محمد شریف بقا) اور میں اسد ہیں یٹ مال ٹریٹمنٹ (طنزیہ۔ عنقا) خاص مضامین ہیں ہماری گلی (تمثیلیہ۔ ممتاز مفتی) اور مکان کا مرثیہ (استاد ڈنگی) بھی شامل اشاعت ہیں۔

جون کے شمارہ میں آخری مغل تاجدار۔ بہادر شاہ ظفر (عاصم صہبائی)، سوہنی (فہمیدہ عبادت) ایک رقاصہ سے (نیاز فتحپوری) اے ملکہ جمال (آغا حشر) اصفہان، نصرت جہاں (سید عنصر علی) بچے (لیطرس) وغیرہ خاص مضامین ہیں۔ انتخاب درج ذیل ہے۔

رفعت سلطان

تیرگی کو نور کیسے جان لوں
حرف آتا ہے مرے ادراک پر
ناامیدی میں کرن امید کی
جس طرح شبنم خس و خاشاک پر

ناصر شہزاد

شاید کوئی پھر آکے تری سیج ریجھائے
سرسوں کی کھیتیوں سے کھلا پھول توڑ لے
روشن رہی نظر تو بڑھے بدن کی پیاس
اس کی لگن میں آئینے آنکھوں کے پھوڑ لے

میر بشیر

زندگی تنظیم کے آداب سے حاصل نہیں
سر بکف بیمار ہے صحت کے آغوش میں

انجم رومانی

کیسے پیر فقیر جو بولیں کرادے بول
دل کھولیں تو اب کہاں بیٹھیں کس کے پاس

دیکھا ہم نے آپ کو انجم صاحب خوب
من میں بیٹھوں ہی مَل ہے تن پر صاف لباس

استاد ڈنگی

اس دیس میں کالوں کالے اللہ ہی نگہبان
جس دیس کی سرکار ہو غنڈوں کی طرفدار

ساغر عاشق ہرگانوی

جو سرکا وہ رہیں زوال بستر
ارتقا کا کمال ہے شاید
دست حالات کے شکنجے میں
زندگی یرغمال ہے شاید

رفعت سلطان

اک ساغر حیات کی خاطر تمام عمر
وہ کون سا ہے زہر جو میں نے پیا نہیں

ظفر واسطی

یوں مرے دل سے تمنا نکلی
شہر سے کوئی رہا ہو جیسے

علامہ حسین میر کاشمیری

کیا حسرتی انقلاب آسمان ہو جائے گا
قوم مسلم نصیب امتحان ہو جائے گا

ونسٹن چرچل۔ میں رجائیت پسند ہوں کیونکہ قنوطی ہونے میں کوئی فائدہ نہیں۔

شریف بقا۔ علامہ اقبال کے تصور کائنات کے اہم عناصر یہ ہیں ۱۔ کائنات کی تخلیق بامقصد ہے۔ ۲۔ کائنات میں ہمیشہ حرکت جاری رہتی ہے یہ کوئی جامد شئے نہیں بلکہ یہ تو تغیر پذیر رہا کرتی ہے۔ ۳۔ چونکہ عالم محسوسات یا مادی دنیا حقیقی ہے اس لیے اس کا علم بھی قابل اعتبار ہے۔ ۴۔ کائنات فعل ایزدی ہے مادے کی ہرگز پیداوار نہیں۔ ۵۔ دنیاوی مشکلات عموماً ہماری تعمیر ذات اور تشکیل سیرت میں مددگار اور معاون ثابت ہوتی ہیں ۶۔ انسان کائنات کا غلام نہیں بلکہ وہ اس میں خدا کا نائب ہے، کائنات انسان کی خادم ہے نہ کہ آقا۔ ۷۔ کائنات کی اصل روحانی ہے۔ ۸۔ کائنات دارالجزا نہیں بلکہ یہ دارالعمل ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ علامہ اقبال کا تصور کائنات قرآنی نظریۂ کائنات کے تابع ہے اسی لئے وہ دوسرے لوگوں کے تصورات سے زیادہ ٹھوس، مفید اور دلکش ہے۔

"ہماری زبان" [illegible]
[illegible]

لکھنؤ کارپوریشن میں اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل تجویز پاس کی ہے اور کارپوریشن کے تمام ممبران سے اپیل کی ہے کہ وہ کارپوریشن میں اردو کے تحفظ اور انجمن ترقی اردو کے موقف کی عملی تائید کریں آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے عملی تعاون کے متعلق صدر یا سکریٹری انجمن ترقی اردو کو جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

تجویز: یہ جلسہ لکھنؤ کارپوریشن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کارپوریشن کی جملہ کارروائی مثلاً ایجنڈا، جلسہ کی کارروائی، نوٹس، اشتہار، ہدایات، اطلاعات وغیرہ کو اردو میں بھی جاری کرے نیز اپنے تحت تمام تعلیمی اداروں میں اردو طلبہ کے لئے اردو کی تعلیم کا بلا تاخیر فوری طور پر انتظام کرے۔"

یہ جلسہ تمام ممبران کارپوریشن سے اپیل کرتا ہے کہ وہ کارپوریشن میں اردو کے حقوق کا تحفظ اور انجمن کے مطالبہ کی تائید کریں اور اپنے عملی تعاون سے انجمن کو مطلع فرمادیں۔

(سکریٹری)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے عہدہ داران

جناب غلام سرور صدر اور جناب تیاب صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے بہار اسٹیٹ اردو کانفرنس کے مجلس مندوبین کی تجویز اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے کانسلروں کی تفویض کردہ اختیارات کے تحت انجمن کی مجلس عاملہ کے لئے درج ذیل حضرات کی نامزدگی فرمائی ہے۔

صدر:۔ جناب غلام سرور نائبین صدر: محترمہ عزیزہ فقی امام پٹنہ۔ جناب غضنفر نواب دانش پٹنہ سٹی، جناب خادم حسین ایم۔اے۔ایل۔ خازن: جناب شاہ مشتاق احمد سابق ایم۔ایل۔اے۔ سکریٹریز: جناب سید رضی حیدر۔ ایڈیٹر صدائے عام پٹنہ۔ جناب شمیم ربانی۔ کشن گنج پورنیہ۔ جناب غنیم احمد صدیقی ایڈیٹر معاشرہ پٹنہ،

ممبران مجلس عاملہ: جناب رامائن سنگھ۔ پٹنہ۔ جناب محمود عالم ایڈوکیٹ۔ سیتامڑھی۔ جناب پروفیسر عبدالمغنی پٹنہ جناب تقی رحیم پٹنہ۔ جناب جوہر نظامی۔ سمری بختیار پور۔ جناب باسط عظیم آبادی۔ سکروھر پور۔ جناب زین الحق کٹیہار۔ پورنیہ جناب مولانا جمیل اختر رانچی۔ جناب مظفر اقبال بھاگلپور۔ جناب محمد طیب عثمانی۔ مجیب الحق ایڈوکیٹ مظفرپور۔ جناب [illegible] ایم ایل سی مجیب (بھاگلپور)

جنرل سکریٹری جناب تیاب صدیقی۔

اسسٹنٹ سکریٹری دفتر انچارج۔ خمشاد علی خان یعقوبی سیوان

[illegible] سکریٹری نشر و اشاعت جناب [illegible] ایم اے ڈپٹی [illegible]

اسسٹنٹ سکریٹریز۔ جناب خواجہ منظر صدیق۔ سکندرہ، جناب اظہار عالم پٹنہ جناب پروفیسر انیس امام آرہ۔ جناب عبدالعلیم ہیڈ ماسٹر مدن پور ہائر سکنڈری اسکول۔

(شمشاد علی خان یعقوبی)

انجمن ترقی اردو راجستھان کی مجلس عاملہ کا انتخاب

انجمن ترقی اردو راجستھان کی مجلس عاملہ کے لئے آج حسب ذیل عہدہ داران کا انتخاب بااتفاق عمل میں آیا

راؤ بہادر پنڈت اوتار نرائن صاحب بہادر صدر

نواب محمد عبدالباقی خاں صاحب۔ نائب صدر

سید احمد علی شاہ صاحب قمر جعفری نائب صدر

خان محمد وحید اللہ خاں صاحب وحید نائب صدر

احترام الدین احمد شاغل۔ جنرل سکریٹری

ڈاکٹر سردار رام سنگھ صاحب۔ خازن

بابو عبدالرؤف صاحب۔ اسسٹنٹ سکریٹری

ماسٹر محمد انعام الدین صاحب عثمانی۔ اسسٹنٹ سکریٹری

محمد عبدالصمد خاں صاحب اثر ٹونکی۔ سکریٹری برائے آل راجستھان اردو سمپوزیم و مشاعرہ ۱۹۶۸ء۔

(احترام الدین احمد شاغل)

شکرنگر میں یوم اردو

شکرنگر (حیدرآباد) انجمن ترقی اردو شاخ بودھن کی جانب سے "اردو ہفتہ" کے سلسلے میں "یوم اردو" کا ایک جلسہ جیٹس کلب شکرنگر میں منعقد ہوا۔ جناب بھوم راؤ صاحب ایم۔ایل۔اے بودھن نے صدارت فرمائی۔ جناب سوم شنکر صاحب دیس مکھ چیرمین بلدیہ بودھن اور سرینواس لاہوٹی مہمان خصوصی تھے۔ جناب سرینواس لاہوٹی صاحب۔ وحید مرزا۔ کملا کرشنا ریڈی جمیل الرحمٰن۔ ایچ۔کے۔ اسمانہ بی۔ ڈی۔ راجیا۔ ارشد مرزا اور صدر جلسہ نے اپنی تقریروں میں اردو کو دستوری حق دینے کی پرزور وکالت کی۔ صدر جلسہ نے قرارداد پیش کی اور لاہوٹی صاحب نے اس کی تائید کی۔ متفقہ طور پر قرارداد کو منظور کیا گیا۔ جلسہ کے اختتام کے بعد مشاعرہ ترتیب دیا گیا جس کی صدارت جناب کرشنا ریڈی صاحب نے فرمائی۔ (ساغر حیدرآبادی)

انجمن ترقی اردو سمرالہ (لدھیانہ) کا اردو تعلیم کا اسکول

انجمن ترقی اردو سمرالہ ضلع لدھیانہ کی طرف سے اردو تعلیم کا اسکول دوبارہ یکم رجب ۱۹۶۸ء سے شروع کیا گیا ہے۔ جناب رام سروپ نائب صدر انجمن دے رہے ہیں۔ اردو سیکھنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور انجمن کو طلبہ کی تعداد کو دیکھ کر مزید انتظام کرنا پڑے گا۔

(اوم پرکاش ودگ)

مدھیہ پردیش میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں

مدھیہ پردیش میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخیں مختلف مقامات پر بڑی خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہیں اور اردو کی بقا و ترقی کے لئے سرگرم عمل ہیں ذیل میں ان میں سے چھ شاخوں کی سرگرمیوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

انجمن ترقی اردو کھنڈوا

کھنڈوا کی انجمن کا شمار صوبائی انجمن ترقی اردو کی بے حد فعال شاخوں میں ہوتا ہے۔ اردو کی عملی خدمت کے میدان میں یہ ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے حال ہی میں اردو تعلیمی مدارس کے قیام کے سلسلہ میں کئی دیہی علاقوں کا سروے کیا ہے اور یہ کام ابھی جاری ہے۔ کھنڈوہ اور اطراف میں اس کی کوششوں کے نتیجہ میں کئی اردو پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کامیابی سے چل رہے ہیں۔ توقع ہے کہ اگلے تعلیمی سیشن تک مزید اردو پرائمری اور مڈل اسکول جاری ہوں گے۔

کھڑلیا میں انجمن نے اردو پرائمری اسکول قائم کیا ہے۔ اس کی عمارت کے لئے مدھیہ پردیش وقف بورڈ کے صدر خان شاکر علی خاں سے ایک وفد ملا جس کی عرضداشت کو صاحب موصوف نے توجہ سے دیکھا اور ضروری کارروائی کا حکم صادر کیا۔ اس وفد میں مسٹر آغا احمد صوبائی انجمن کے جنرل سکریٹری، پروفیسر حسن مسعود صوبائی انجمن کے جنرل سکریٹری اور شیخ محمد صدیقی (کھنڈوہ) شامل تھے۔

انجمن ترقی اردو جبلپور

جبلپور کی انجمن اردو کے فروغ کے لئے جہاں بہت سے دوسرے کام کرتی ہے وہاں وہ ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ بھی منعقد کرتی ہے اور اسے پمفلٹ کی شکل میں طبع بھی کراتی ہے۔ اس سال ابھی تک وہ تین مشاعروں کی کارروائیاں طبع کرا چکی ہے۔ مارچ کے مشاعرہ کے مصرع ہائے طرح تھے ــ "آہ میں بھی اثر نہیں ہوتا" اور "کسی پردہ نشیں کی یاد بھی پردہ نشیں نکلی" ڈاکٹر پریم چند سریواستو کی زیر صدارت اس مشاعرہ میں جناب پیارے لال سریواستو ایڈوکیٹ، چودھری بے کس جیب، محمد حنیف صاحب انصاری، منشی ہدایت حسین شرر، جناب عبدالحمید حسرت، جناب انتقوی مادان، حافظ خلیل الرحمن غوری نے علاوہ ۲۲ شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا۔ یہ مشاعرے جہانگیر منزل میں منعقد ہوئے ہیں

انجمن ترقی اردو بھوپال

مدھیہ پردیش کی راجدھانی کی انجمن بھی سرگرم عمل ہے۔ اس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ ایم عرفان صاحب صدر انجمن کی صدارت میں ہوا۔ اس میں مختلف تنظیمی امور پر غور کیا گیا۔ انجمن نے میونسپل ریڈنگ رومس میں اردو اخبارات کے دوبارہ اجراء کے لئے جو کوشش کی تھی وہ بار آور ہوئی اور ان میں پھر اردو اخبارات آنے لگے ہیں۔ انجمن نے ایک ادبی فورم بھی تشکیل دیا ہے جس کے کنوینر جناب قوی دسنوی ہیں۔ انجمن نے رکنیت سازی کی مہم کو تیز کرنے کے لئے جناب قمر اشفاق مدیر روزنامہ ندیم، پروفیسر حسن مسعود جنرل سکریٹری اور جناب احمد سعید ندوی پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائی ہے جو اس مہم کے ذریعہ ہزاروں کی تعداد میں محبان اردو کو انجمن کا رکن بنانے میں مصروف عمل ہے۔

انجمن ترقی اردو اندور

صوبہ کے صنعتی شہر اندور میں اردو دوستوں نے ایک نشست میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کے قیام کا فیصلہ کیا۔ جلسہ میں کہا گیا کہ اردو کے مسائل کے حل کے لئے ایک فعال جماعت کی حیثیت سے انجمن کی شاخ کا قیام ضروری ہے مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک اڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی جو انجمن کے پیغام کو گھر گھر عام کرنے اور ممبر سازی میں مصروف ہے۔

صدر: جناب ایس ایم رویا ئن سلیم۔ نائب صدر: جناب ایس این سریواستو۔ جناب صادق اندوری۔ جنرل سکریٹری: جناب عزیز اندوری سکریٹری جناب رونق القیصری۔ خازن جناب عزیز انصاری۔ ناظم نشر و اشاعت۔ جناب محمود نشتری۔

ممبران مجلس عاملہ پروفیسر عادل جعفری۔ پروفیسر عبداللطیف خاں۔ جناب حبیب عالم، جناب مضطر اندوری۔ جناب ایس ایم طارق۔ جناب مقصود نشتری۔ جناب عبدالمجید خاں پردیپ۔ جناب ابراہیم علی۔ حاجی محمد فضل الرحمن شعلہ۔

انجمن ترقی اردو منگاؤلی

انجمن ترقی اردو منگاؤلی (ڈسٹرکٹ گنا) بڑی کامیابی کے ساتھ ایک مدرسہ چلا رہی ہے جس میں بچوں کو اردو اور عربی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ مدرسہ بغیر کسی سرکاری گرانٹ کے خود انجمن کے باحوصلہ عہدیداروں اور کارکنوں کی مدد سے چل رہا ہے جس کے ذریعہ اردو تعلیم کا چراغ روشن ہے۔

انجمن ترقی اردو نیمچ

اس انجمن کی تشکیل کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے لیکن اس کے حوصلہ مند کارکنوں نے اپنا دائرہ عمل ارگرہ اور مالسنہ تحصیلوں تک بڑھا لیا ہے۔ خاص نیمچ میں یہ انجمن شاعرے نو کرتی ہی ہے لیکن اس نے تعلیم بالغان کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا ہے۔ اس شبینہ مدرسہ میں بڑی تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی اردو سیکھنے آتے ہیں ان میں کچھ تو کافی عمر ہیں۔ ان اسکول کے طلبہ کو بھی اردو تعلیم دی جاتی ہے جو اس سے محروم ہیں۔ (حیات صدیقی)

(باقی صفحہ ۶ سے آگے)

ہی گزر نہیں پاتے بس جھٹ سے فیصلہ کر دیتے
ہیں کہ یہ بدبخت ہمیں پہچانتا نہیں۔ پہلے ان بزرگوار
کے پاس خوردبین تھی جس سے دلوں کے راز دیکھ
لیتے تھے۔ وہ خوردبین اپنے قلبی عیوب چھپانے کے
لئے آپ حضرات نے بڑی چالاکی سے اڑا کر کہیں
گم کر دی ہے اور اس کی جگہ بڑے میاں کی خدمت
میں وضو کے بدھنے پیش کر دئے ہیں اور اب وہ
صرف بدھنوں ہی کی معرفت انسانوں کو پرکھ سکتے
ہیں۔ اللہ اللہ کیا انقلاب آیا ہے"! (جوش ملیح آبادی بنام سکسینہ اکبر آبادی)

"آپ صالحہ اور اکبر کی شکایت کرتے ہیں، یہ
اگر ان باتوں کو جان جائیں تو ہمارے برابر کے ہو کر
رہ جائیں گے۔ ابھی انھیں ہم تک پہنچنے کے لئے
سالہا سال درکار ہیں۔ اس وقت انشاء اللہ
یہ بھی اپنے چھوٹوں سے یہی شکایت کیا کریں گے
اور ہمیں بھی کبھی کبھار اس بہانے یاد کر لیا کریں گے
مگر کیا معلوم کہ یاد کرنے کو بھی ہیں یا نہیں رہائے والدین
کی جوش نہیں" (ممتاز علی عرشی بنام حامد حسین جیلانی)

مجھے نہیں معلوم کہ ان اقتباسات سے آپ کہاں تک
لطف اندوز ہوئے۔ لطف اندوزی کا تعلق بھی انسان کے اپنے
مزاج اور مذاق پر منحصر ہے لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ دو ہزار
صفحوں کے اس ذخیرے میں ہر مزاج اور ہر مذاق کے
لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

محمد طفیل مدیر نقوش کا نام بابائے اردو مولوی عبدالحق
نے "محمد نقوش" رکھ دیا تھا اور ایک خط میں انھیں لکھا تھا
کہ "تم آدمی نہیں ہو جن ہو، آخر ایسے ایسے ضخیم نمبروں کے لئے
مواد کہاں سے فراہم کر لیتے ہو۔" ہماری زبان کی کسی گذشتہ
اشاعت میں سرور صاحب نے نقوش کے خطوط نمبر کا ذکر
کرتے ہوئے محمد طفیل کے لئے "محمد نقوش" لکھا تھا ہمارے
کاتب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے "محمد نقوش" کی جگہ
"محمد فاروق" رکھ دیا۔ میں ماہر نفسیات نہیں اور نہ لاشعوری
تلازموں کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن میں
نے اس غلطی کا مزہ اس طرح لیا کہ اسی اشاعت میں کئی جگہوں
پر محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری کا ذکر آیا تھا اور اگر یہ بات
صحیح ہے کہ عربی میں دیوانہ کے لئے لفظ "مجنوں" ہے جس کے
معنی ہیں وہ شخص جس پر جن کا سایہ ہو تو محمد طفیل کو "دیوانہ"
کہنا زیادہ غلط نہیں جبکہ بابائے اردو انھیں "جن" سے تعبیر
کر چکے ہیں اور اگر ان کی دیوانگی مسلم ہو تو "محمد فاروق" بھی
"دیوانہ" کا ہی ایک نام ہے جو ان کے صفاتی نام کے لئے
کچھ ایسا ناموزوں بھی نہیں۔

تبصرہ

محمد انصار اللہ

تسہیل الاملا۔ مرتب لالہ تیج رام
نظر ثانی و اضافہ از منشی عبدالقدیر
طابع و ناشر۔ انجمن ترقی اردو، دہلی
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے
ضخامت ۱۱۲ صفحات

آج اردو کی درس و تدریس کے سلسلے میں جو مسائل درپیش ہیں ان
کا تصور بھی بیس پچیس سال پہلے شاید ممکن نہ تھا۔ انھیں مسائل میں سے
ایک پیچیدہ مسئلہ املا کا بھی ہے عربی اور فارسی کا چلن اب تقریباً اٹھ
گیا ہے۔ ہماری نئی نسل کے لئے ان زبانوں کے وہ الفاظ بھی مشکل
ہو چلے ہیں جو کثرت استعمال سے اردو ہی کے ہو کر رہ گئے تھے
تسہیل الاملا کے مرتب نے اس مسئلہ کا حل نکالنے کی بروقت
کوشش کی ہے انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت ایسے الفاظ
کو جمع کیا ہے جن میں قریب المخرج حروف کے استعمال کے سبب
غلطی کے امکانات ہیں۔ بعض عنوانات یہ ہیں:-

"ان لفظوں کے شروع میں 'ث' ہے 'س'، 'ص' نہیں ہے
" " " " 'ص' " 'ث'، 'س' " "
ان لفظوں میں 'ذ' ہے 'ز' نہیں ہے
" " " 'ز' " 'ذ' " "
" " " 'ط' " 'ت' " "
" " " 'ض' " 'ظ' " "

متشابہات سے بچنے کے لئے اس طور پر الفاظ کا انتخاب اور
ان کی ترتیب بجائے خود بڑا مفید کام تھا لیکن فاضل مرتب نے اسی پر
اکتفا نہیں کی بلکہ ہر لفظ کے ساتھ اس کے اصطلاحی اور مجازی معنی بھی
لکھ دئے ہیں [لغوی معنی لکھنے کا التزام البتہ نہیں معلوم ہوتا] کتاب
کے آخر میں "واحد اور جمع کے نمونے" بھی درج کئے ہیں۔ کتابت میں بھی
زیر زبر کا التزام کیا ہے گویا املا کے ساتھ ساتھ صحیح تلفظ کی تعلیم بھی دی ہے۔

کتاب عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ اس طرح اسے صوری اور
معنوی ہر قسم کے محاسن سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے قیمت بھی زیادہ
نہیں ہے۔ سہو و خطا سے کون پاک ہے! اس کتاب میں بھی بعض
باتیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۱ پر "سیدھا سادا" کی جگہ "سیدھا سادھا"
لکھا ہے یا صفحہ ۱۲ پر "حلیم" کے بعد "د" رہ گیا ہے وغیرہ لیکن ان باتوں
سے کتاب کی اہمیت اور افادیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یقین ہے
کہ ضرورت مند اس قابل قدر کتاب سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر سید سجاد علی نے لیتھو کلر پریس
علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے
شائع کیا

R.N. 2456/57 — REGD. NO. L 92 E

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷، شمارہ ۲۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ر جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

یونی ورسٹی کے اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس

یونی ورسٹی کے اردو اساتذہ کی پہلی کانفرنس مئی ۱۹۶۶ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے اہتمام میں ہوئی تھی۔ دوسری کانفرنس جون ۱۹۶۷ء میں جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر سری نگر میں ہوئی۔ اب تیسری کانفرنس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی دعوت پر ۲۰، ۲۱، ۲۲ر اکتوبر کو علی گڑھ میں ہوگی۔

یونی ورسٹی کے اردو کے اساتذہ کی انجمن جس کی تیسری کانفرنس ہونے والی ہے، ایک علمی ادارہ ہے جس کا مقصد یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کے معیار کی نگہداشت کرنا، نصاب کے مسائل پر غور کرنا، اردو میں ریسرچ کے سرمایے کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لئے خطوط تجویز کرنا، اردو میں تنقید کے تمام میلانات کو ذہن میں رکھنا اور تنقید کے ایک اعلیٰ معیار پر اصرار کرنا ہے۔ اس کے ساتھ یہ درس و تدریس کے مسائل اور اساتذہ کے ان حقوق کی نگہداشت بھی ضروری سمجھتی ہے جو ان کے پیشے سے متعلق ہیں۔ پہلی کانفرنس کی مکمل روداد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کانفرنس کی روداد بھی عنقریب شائع ہو جائے گی۔

اس کانفرنس میں نصاب کے مسائل، تحقیق کے مسائل، تنقید کے مسائل، تدریس کے مسائل کے علاوہ ایک خاص اجلاس اردو ذریعہ تعلیم کے موضوع پر بھی ہوگا۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ اور وائس چانسلروں کی کانفرنس نے اصولاً یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تمام علاقائی زبانوں میں پانچ سے دس سال کے اندر بی اے کی منزل پر تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعہ سے بی اے اور بی ایس سی اور بی کام کی تعلیم دینے کا سوال بھی اٹھتا ہے۔ گو عثمانیہ یونی ورسٹی اردو کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کر چکی ہے اور اردو میں جدید علوم کی کچھ معیاری کتابوں کے تراجم بھی موجود ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ہمیں یونی ورسٹی کی تعلیم سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد کو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ صورت یہ ہے کہ ابتدائی منزل پر اردو میں تعلیم گو اتنے بڑے پیمانے پر نہیں دی جاتی جتنے بڑے پیمانے پر اس کی ضرورت ہے اور نہ کتابوں اور استادوں کی فراہمی قابل اطمینان ہے۔ مگر یہ تعلیم دی تو جا رہی ہے اسے صرف حسب ضرورت پھیلانا اور اس کے معیار کو تسلی بخش بنانا ہے۔ مگر ثانوی منزل پر ضرورت کے مطابق اردو کے ذریعہ سے تعلیم کا انتظام صرف چند ریاستوں میں ہے اور وہاں بھی ناکافی ہے۔ یہاں مناسب کتابوں اور اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ان حالات میں ایک نظریہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ابتدائی اور ثانوی منزل پر حسب ضرورت اور مناسب معیار کے مطابق اردو میں تعلیم کا انتظام ہر جگہ ہو جائے، پھر یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعہ سے تعلیم کا مسئلہ اٹھایا جائے۔ یہ بات بظاہر منطقی معلوم ہوتی ہے، مگر قوموں کی زندگی میں منطق کی اتنی اہمیت نہیں جتنی وقت اور ضرورت کی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک یونی ورسٹی کی منزل پر اردو کے ذریعہ سے تعلیم کے لئے فوری اقدامات کرنے چاہئیں اور اگر یہ انتظامات ہو جائیں گے تو ان سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا معیار بھی بہتر ہوگا۔ گو یا عام طور پر نیچے سے اوپر جایا جاتا ہے۔ مگر خاص حالات میں اوپر سے نیچے جانا بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی کی منزل پر اعلیٰ تعلیم ایک فوری حکم کے ذریعہ سے نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لئے خاص تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اس تیاری کے لئے عمر نوح کی ضرورت نہیں پانچ سے لے کر دس سال تک کی مدت کافی ہوگی۔ ہمیں سب سے پہلے ہر مضمون کی معیاری کتابیں تیار کرانی ہیں۔ یہاں صرف تراجم سے کام نہ چلے گا۔ طلبہ کی نفسیات اور ضروریات اور معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں لکھوانی بھی ہوں گی۔ پھر اصطلاحات کے سلسلے میں دانش مندی سے کام لینا ہوگا۔ ہم نہ تو آنکھ بند کر کے تمام اصطلاحیں مغرب سے لے سکتے ہیں نہ سائنسی اصطلاحات اس طرح گڑھ سکتے ہیں جس طرح ہندی والے

کہنا ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ خالص فنی اصطلاحیں کس حد تک ہم اپنی زبان میں معمولی تصرف کے بعد داخل کر سکتے ہیں اور اپنی مروجہ اصطلاحوں میں سے کتنی نیم فنی (سیمی ٹیکنیکل) ہے نکال بہت سکتے ہیں۔ پھر یہ مسئلہ بھی پیدا ہوگا کہ اساتذہ کی موجودہ کھیپ کو جو اردو سے جذباتی تعلق رکھتے ہوئے، اس سے زیادہ واقف نہیں ہے اور اس واقفیت کے لئے تھوڑی سی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنی چاہتی، کس طرح ساتھ لیا جائے اور کس طرح اس کے درس کے معیار کو بھی گرنے نہ دیا جائے۔ اس لئے کانفرنس میں ذریعہ تعلیم کا شعبہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر یونی ورسٹی کی منزل پر خاص خاص یونی ورسٹیوں میں اور کچھ کالجوں میں ہم اردو کے ذریعہ سے تعلیم دیں اور یہ اردو اردوئے معلی نہ ہو، بلکہ آج کی عام فہم اردو ہو، تو جو طلبہ اس طرح فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے وہ ثانوی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کی منزل پر بھی معیاروں کو بہتر بنانے میں معاون ہوں گے۔

نصاب کا مسئلہ بھی خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے اردو کی معیاری کتابیں روز بروز نوادر بنتی جا رہی ہیں سارے علمی و ادبی ادارے اتنے سرمایہ دار نہیں کہ ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور بہتر کتابت و طباعت کے لئے روپیہ لگا سکیں۔ حکومت کو اس کام سے ہمدردی نہیں ہے۔ اچھے انتخابات کے لئے بھی اچھی خاصی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ کچھ یونی ورسٹیاں اپنے طور پر کچھ انتخابات تیار کراتی ہیں، مگر ان میں یہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ جامع ہوں اور ہر جگہ کام آ سکیں اس لئے اساتذہ کی انجمن بی اے اور ایم اے کے لئے اور ابتدائی اردو کے لئے ایسے انتخابات تیار کرا سکتی ہے جو وہ مختلف یونیورسٹیوں کی مدد سے شائع کرے اور انھیں سبھی یونیورسٹیاں استعمال کر سکیں۔

اردو کے استادوں کا کام دوسرے مضامین کے استادوں سے زیادہ مشکل ہے انھیں نہ صرف اپنے پیشے کے فرائض ایمانداری سے انجام دینے ہیں، بلکہ ان حالات کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو اردو کی طرف سے ریاستی حکومتوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی انھیں زبان و ادب کی حفاظت کے لئے بھی فضا ہموار کرنا ہے۔ پھر ان کو درس و تدریس کے مسائل اور طلبہ کی نفسیات کو بھی ذہن میں رکھنا ہے۔ ان وجوہات سے اساتذہ کی انجمن کا کام نہایت اہم ہے اور ہمیں یقین ہے کہ علی گڑھ کی کانفرنس ان تمام توقعات کو پورا کر سکے گی جو اس سے بجا طور پر وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

آج ہماری یونیورسٹیوں میں جو کام ہو رہا ہے کچھ حلقے اس پر اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کام کو اور بہتر بنایا جا سکتا ہے مگر آج بھی اس کی افادیت اور معنویت میں کلام نہیں یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے ذریعہ سے ہی اردو میں تحقیق و تنقید کے معیار کو عالمی معیاروں تک لایا جا سکتا ہے۔ انھیں کے ذریعہ سے طلبہ میں زبان و ادب سے وہ لگن پیدا کی جا سکتی ہے جو سائنس اور صنعت و حرفت کے دور میں صالح سیرت و شخصیت کے لیے ضروری ہے۔

پاکستان میں دو نئی زبانیں ایجاد ہوں گی

نئی دہلی یکم جولائی۔ حکومت پاکستان نے دو نئی زبانیں ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک کا نام "پاکستانی بنگلہ" ہوگا۔ اور دوسری کا "پاکستانی اردو" ان زبانوں کو ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے پاکستانی سمجھ سکیں گے۔

یہ اعلان جب پاکستان کی قومی اسمبلی میں وزیر زراعت و تعمیرات نے کیا تو ایوان کے ہر حصے سے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ (قومی آواز)

ساحل

امجد نجمی

رات کا پچھلا پہر — ایک دم خاموش ہے
پی کے خواب آور دوا — ہر کوئی بے ہوش ہے
نیند سے بیدار میں — جب اچانک ہو گیا
کی نظر سوئے فلک — سوچ میں پھر کھو گیا
ہے ابھی گرم سفر — زندگی کا کارواں
جگمگاتے ہیں ابھی — چاند تارے کہکشاں
جب نمود صبح سے — ان کی شام آجائے گی
لیکے پیغام اجل — ان کے نام آجائے گی
ڈولتی ہے جو مری — کشتیٔ عمر رواں
جاکے ملتا ہے اسے — دیکھئے ساحل کہاں؟

اترپردیش غالب کمیٹی کے زیر اہتمام کلچرل وفد کٹھمنڈو جائے گا

لکھنؤ۔ اترپردیش صد سالہ جشن غالب کمیٹی کے زیر اہتمام ایک ثقافتی وفد جولائی کے نصف میں نیپال جائے گا۔ یہ وفد سرکردہ ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور کمیٹی کے بعض ممبروں پر مشتمل ہوگا۔ وفد اس ہمالیائی سلطنت میں تقریباً دو ہفتہ قیام کرے گا۔ وفد اترپردیش صد سالہ جشن غالب کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی۔ ایس۔ سیٹھی کی قیادت میں جائے گا۔

(قومی آواز)

اردو کے نوجوان صحافی مظفر شاہ کا انتقال

نئی دہلی ۲۹ جون کی صبح ۶ بجے اردو کے ایک صحافی حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن کے گزیٹڈ افسر مظفر شاہ کا انتقال ہوا۔ مرحوم کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ادارہ ہماری زبان پسماندگان کے رنج و غم میں شریک ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

اردو کا جمہوری حق

لسانی اور تہذیبی مسائل پر گفتگو کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستان مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اس لیے یہاں تہذیبی، لسانی یا سیاسی مسائل کا حل اس طرح ممکن نہیں جس طرح انگلستان یا دوسرے یک قومی ملکوں میں ممکن ہے ہندوستان ایک ایسی وحدت ہے جو مختلف کثرتوں سے عبارت ہے اس کی وحدت کثرتوں کی لاش پر نہیں ان کے تعاون سے ہی ہے اور صرف ان کے تعاون ہی سے متشکل ہے اس لئے کسی ایک زبان کو قومی زبان قرار دینا یا کسی ایک فرقے یا گروہ کی تہذیب کو قومی تہذیب قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تاریخی اور تہذیبی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہاں وحدت کو اسے قومی یک جہتی کا نام دیا جائے یا قومی تہذیب کہا جائے یا قومی زبان کا لقب دیا جائے جبراً نافذ نہیں کی جا سکتی یہاں کی وحدت وہی ہوگی جو مختلف تہذیبوں اور لسانی گروہوں کے اشتراک سے خوش دلی اور پرخلوص تعاون سے پیدا ہو۔

اس لئے صرف ایک زبان کو قومی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ جتنی جدید ہندوستانی زبانیں ہیں وہ سب ہماری قومی زبانیں ہیں اور ایک کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔

اگر ہم اس بنیادی تصور کو تسلیم کرلیں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ نہ صرف مرکز میں حکومت کا سرکاری کام حسب ضرورت ایک سے زیادہ زبان میں چلانا چاہئے۔ اور تامل، تلگو، ملیالم اور بنگالی وغیرہ زبانوں میں مراسلت کی آزادی متعلقہ ریاستی حکومتوں اور مرکز کے درمیان ہونی چاہئے اور اس طرح کی دوسری ضروری آسانیاں ملنی چاہئیں بلکہ ہر ریاست میں جہاں یہ صورت حال موجود ہو ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری زبانیں تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہونا چاہئے۔ ان ریاستوں میں جہاں غالب علاقائی زبان بولنے والوں کے علاوہ دوسری زبان والوں کی خاصی بڑی تعداد ہو وہاں ریاستی حکومت کو پوری فراخ دلی کے ساتھ تعلیم اور انتظام کے شعبوں میں غالب علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کو بھی جگہ دینی چاہئے اور ثانوی سرکاری زبان تسلیم کرنا چاہئے۔

اس فراخ دلانہ جمہوری رویے کے سلسلے میں دشواریاں کیا ہیں؟ مالی وسائل؟ حکومت کے لئے ایک زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبان میں اپنے دفاتر کے ریکارڈ تیار کرالینا اور اس کے لئے مناسب عملے کا انتظام بہت بڑا مسئلہ نہیں ہو سکتا خصوصاً اس وقت جب کہ اکثر ریاستوں میں ایسے صاحب استعداد حضرات کثرت سے ملیں گے جو دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ چند لاکھ روپے کا مزید خرچ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ہر ریاست کے لاکھوں افراد یہ محسوس کریں کہ ان کی مادری زبان کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے ان کے تخلیقی جوہر نکھر کر صرف اس لیے سامنے نہ آسکیں کہ انھیں اپنی مادری زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی سہولت نہ ملی اور وہ جمہور سے کٹ کر رہ جائیں اور اپنے دلوں میں گھٹن، بے زاری اور بے اطمینانی کے جذبات لئے بیٹھے رہیں جن سے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ایسی قوم کیا ترقی کر سکتی ہے جس کے ایک تہائی یا ایک چوتھائی افراد اس کے ترقی کے منصوبوں میں سرگرمی سے حصہ نہ لے سکیں یا غیر مطمئن اور بے زار رہیں۔

دشواری دراصل اخراجات کی نہیں چودھراہٹ کی ہے یہ چودھراہٹ عام ہندی بولنے پڑھنے والا قائم کرنا نہیں چاہتا وہ ایماندار بھی ہے سچا قوم پرست بھی اور انصاف پسند بھی اس کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے کہ وہ جبراً اپنی زبان کو دوسری زبانوں پر غلبے کے لیے استعمال کرے لیکن وہ برسر اقتدار گروہ جو ہندی کو اپنے اقتدار کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے وہ اس کے لئے ہرگز آمادہ نہیں کہ جبر کی جگہ اشتراک کو اور "وحدت" کی جگہ کثرت کے تعاون سے پیدا ہونے والی وحدت کو نصب العین بنائے وہ دوسری تہذیبوں کو کچل کر اپنی تہذیب اور دوسری زبانوں کو پامال کر کے اپنی زبان نافذ کرنا چاہتا ہے وہ ہندی کو انگریزی کی جگہ اقتدار کی زبان بنانا چاہتا ہے۔

ایسے ہی ایک بزرگ کی زبان میں نے یہ کلمات تحریر سے ہیں کہ مشہور بنگالی ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی آج ہندی کے راشٹر بھاشا ہونے کی مخالفت کرتے ہیں یقین مانئے ان کی تیسری پشت ہندوستان میں بھیک مانگے گی"

لہٰذا اردو کا مسئلہ ہندوستان میں براہ راست صحیح جمہوری قدروں کے تحفظ کے سوال سے وابستہ ہے ایک طرف وہ لوگ ہیں جو فاشزم کے بالواسطہ یا بلا واسطہ علمبردار ہیں اور جبری مرکزیت کے قائل ہیں یہ لوگ محض اردو کے دشمن نہیں زندگی کے تمام ترقی پسند اور صالح قدروں کے دشمن ہیں وہ رواداری، وسعت فکر، فراخ دلی اور آزادیٔ رائے کے بھی مخالف ہیں اور جمہوریت سماجی انصاف مساوات اور سیکولرزم کی نعمتوں کے بھی منکر ہیں دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک وحدت اور صحیح وحدت کے لئے ضروری ہے کہ لسانی اور تہذیبی اقلیتیں مطمئن ہوں اور اپنی رضامندی سے قومی ہم آہنگی پیدا کریں جس کے لئے سماجی انصاف لازمی ہے اور اردو بھی اس سماجی انصاف کی حق دار ہے بنیادی بات یہ ہے کہ اردو ۱۹۶۱ء کے انتہائی غیر اطمینان بخش مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق دو کروڑ تینتیس لاکھ اکیاون ہزار آٹھ سو اٹھاون ۳۳۱۵۱۸۵۸ ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے ان ہندوستانی شہریوں کا مذہب کیا ہے؟ یہ سوال غیر متعلق ہے۔ جب تک اس زبان کے بولنے والے ہندوستانی جمہوریت کے شہری ہیں ان کو پورے لسانی اور تہذیبی

خصوصیت نہ ملنی چاہئیں اُن کا مذہب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو کسی مذہب کے ماننے یا نہ ماننے سے ان کے اسانی حق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اردو کے بارے میں جو مختلف الجھنیں پیدا کی جاتی ہیں ان میں مرکزی حیثیت دو باتوں کو حاصل ہے ایک یہ کہ اس زبان کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے جہاں یہ بات صحیح ہے کہ پورے ملک میں ایسا ایک ضلع بھی نہیں ہے جہاں صرف اردو بولنے والے ہی آباد ہوں اور اردو کے علاوہ کوئی دوسری ہندوستانی زبان نہ بولی جاتی ہو وہاں یہ بات بھی سچ ہے کہ ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جہاں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے اور اسے مادری زبان ماننے والے معتدبہ تعداد میں موجود نہ ہوں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے ناقص اعداد و شمار کے اعتبار سے۔ آندھرا میں ۲۵۵۳۷۵۳، بہار میں ۴۴۵ر ۹۴۱،۴۔ گجرات میں ۵۳۸ر ۴۵۹ ۔ مدھیہ پردیش ۹۸۔۴،۷ ۔ مدراس میں ۵۰۳ر ۶۱۵۔ مہاراشٹر میں ۶۸۹ر ۲۵،۲،۷ ۔ میسور میں ۸۱۴ر ۲۰۲۴ اڑیسہ میں ۸۹۱ر ۲۱۲۔ پنجاب میں ۶۶۰ر ۲۵۵۔ راجستھان میں ۶۵۴ر ۵۰۹۔ اتر پردیش میں ۷۱۰ر ۸۹۱ر ۷۔ مغربی بنگال میں ۸۴۷ر ۸۳۲۔ انڈمان میں ۴۴۲، ۱۵۳۔ ہماچل پردیش میں ۹۸۱ر ۶۲۳۔ دہلی میں ۲۵۱ر ۱۵۳ بولنے والے موجود ہیں۔

بعض حضرات نے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ اتر پردیش اور بہار کے صرف بعض ضلعوں میں اردو بولنے والوں کی وافر تعداد ہے لہذا صرف ان ضلعوں میں اردو والوں کو چند آسانیاں دے دی جائیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے ناقص اعداد و شمار کے مطابق بھی اردو اتر پردیش کے سبھی ۵۴ اضلاع میں اور بہار کے سبھی ۱۸ اضلاع میں بولی جاتی ہے اور اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے لہذا مسئلہ محض چند ضلعوں کا نہیں بلکہ پوری ریاستوں کا ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو ناقص اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اوّل تو آسام جموں اور کشمیر اور پنجاب کی لسانی صورت حال کے بارے میں اعداد و شمار کی تفصیل اس میں فراہم نہیں کی گئی ہے۔ دوسری اس میں اردو اور ہندی کے علاوہ ہندوستانی کو بھی ایک الگ زبان تسلیم کر لیا گیا ہے جب کہ ہندوستانی کا دستور اسے تسلیم نہیں کرتا تیسرے خود مردم شماری کے اعداد و شمار کے مرتبین نے ہندی اور اردو کے اعداد و شمار کو جگہ جگہ خلط ملط کر کے ایک ہی جگہ شامل کر لیا ہے اس کے علاوہ اردو بولنے طبقے میں یہ شکایت عام ہے کہ جن لوگوں نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ان کے ناموں کے آگے بھی صحیح اندراج نہیں کیا گیا۔

مسئلے کو الجھانے کی غرض سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اردو مغل دربار کی زبان تھی اور مغلوں نے اپنی انتظامی آسانیوں کی غرض سے اسے عوام پر لادا اور درحقیقت یہ عوام کی زبان نہیں تھی۔ اصل یہ اعتراض صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو تاریخ ادب سے صحیح واقفیت نہیں رکھتے حقیقت یہ ہے کہ اردو آخری چند برسوں کو چھوڑ کر کبھی مغل دربار کی سرکاری زبان نہیں رہی دوسرے لسانی ارتقا کی اس شکل کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ عہد وسطیٰ میں جاگیر داری نظام نے جب اپنے طور پر تجارتی اور انتظامی مرکز یعنی شہر اور زراعتی جاگیر یعنی دیہات کی تقسیم روا رکھی تو زبان و ادب اور تہذیب کی سطح پر بھی یہ تقسیم ابھری۔ شمالی ہند کے دیہاتوں کا ادب خصوصاً شاعری بولیوں میں ہوئی اودھی اور برج بھاشا کی شکل میں سامنے آئی اور شہروں میں بولیوں کی جگہ نئی مخلوط اور مشترک زبان کھڑی بولی نے ایک نیا روپ لیا جس کی ایک شکل اردو ہے دوسری ہندی۔ اور یہ بات فراموش کرنے کی نہیں کہ ہندی نے کھڑی بولی کو اپنانے کے بجائے مدتوں برج بھاشا اور اودھی ہی کو ذریعہ اظہار مانا جب کہ اردو نے کھڑی بولی ہی پر ساری توجہ صرف کر دی دوسرے لفظوں میں دیہات کے کسانوں کا ذریعہ اظہار بولیاں اور خصوصاً برج اور اودھی تھیں اور شہروں کے عوام کا ذریعہ اظہار کھڑی بولی جس کا نکھرا روپ اردو ہے اس طرح اردو بھی سچی عوامی زبان ہے اسی میں انھوں نے محبت کے زمزمے گائے ہیں اسی میں انقلاب کے ترانے۔

انقلاب زندہ باد' کا نعرہ اردو نے دیا ۱۸۵۷ء میں ان گنت اردو شاعر اور ادیب توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑائے گئے جن میں دہلی کالج کے استاد مولانا امام بخش صہبائی کا نام سرفہرست ہے نہ جانے کتنے جدوجہد کی صعوبتوں کا شکار ہوئے جن میں منیر شکوہ آبادی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے اردو اخبارات و رسائل کو مشہور فرانسیسی عالم گارساں دتاسی نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے لئے ہندوستانیوں کے ذہن کو تیار کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے آزادی کی جدوجہد میں اردو کے جتنے اخبارات و رسائل ضبط ہوئے اتنے ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے نہیں ہوئے ان میں مولانا محمد علی کا ہمدرد مولانا ابوالکلام کا الہلال مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ لالہ لاجپت رائے کا سوراجیہ اور ہندے ماترم مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار شامل تھے مشہور شہید سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی زبان پر پھانسی کے تختے پر چڑھتے ہوئے بھی جو اشعار تھے وہ اردو کے تھے مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل خود شاعر تھے۔ اردو کے بیس رسالے اور ڈرامے انقلابی موضوعات پر لکھے گئے اور ضبط ہوئے جن میں کشن چند زیبا کا زخمی پنجاب بہت مشہور ہے سوشلزم کا مفہوم اسی زبان میں سب سے پہلے عام ہوا اردو کے ادیبوں میں ترقی پسند تحریک کی جڑیں سب سے پہلے مضبوط ہوئیں اور سب سے بعد تک رہیں اس زبان اور ادب کی روایت میں رواداری آزاد خیالی اور انسان دوستی کی قدریں موجود رہی ہیں جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جدید ہندوستانی زبانوں میں شاید اردو مذہبی ادب سے سب سے زیادہ آزاد رہی ہے ہندی کا اعلیٰ ترین ادب

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ایم۔ اے۔ نصر

میر کے بہتر نشتر

میر کے بہتر نشتر کے بارے میں متضاد رائے ہیں۔ اس باب میں اصحاب رائے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر کبھی کسی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی بھی دیتی ہے تو اس کا اظہار بیان الجھا ہوا ہوتا ہے، جس کا مقصد الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں بلکہ "گول مول" بات کہہ کر محض اپنی جان چھڑانا مقصود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر کے نشتروں نے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

وہ بھی ایک ایسا مسئلہ جس میں کوئی الجھا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی اس الجھی ڈور کو سلجھانے کی سعی کرتا بھی ہے تو پرانے تذکرہ نویسوں کے متضاد بیانات کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ جن تذکرہ نویسوں سے متاثر ہوتا ہے، ان کے خیال کی مناسبت سے خود بھی اظہار خیال کر دیتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کو پیش کرنے سے گھبراتا ہے، اور اسی اس خامی کو چھپانے کے لئے اپنے سحر طراز قلم سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور مصنف کی ذاتی رائے جاننے کا خیال ان کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف اندازسے ان کی زندگی کے لطیف گوشوں اور ان کی حیات و شاعری پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند باتوں میں قدیم تذکروں کی اندھی تقلید کی گئی ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ من و عن ان تذکروں کی تحریر کو صحیح مان لیا گیا ہے اور مختلف و نمایاں لہجہ میں ان ہی کے الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔ "بہتر نشتر" بھی ان بہت سی غلط لیکن مشہور روایتوں میں سے ایک ہے۔

اگر میر نے اپنے زمانے کے ماحول سے متاثر ہو کر "فارسی" کی تقلید کی ہے اور نتیجۃً کچھ پست اشعار کہے ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری میں تصنع زیادہ ہے اور صرف آورد ہی آورد ہے، "آمد" کا پتہ ہی نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا کہ آورد کا غلبہ ہے، صحیح نہیں ہے۔

اس نظریہ کے زیر اثر کوئی رائے قائم کر کے، ان کے اچھے اشعار کی تعداد کو محدود کر دینا، ایک بے معنی سی بات ہے، ابو میر

میر جیسا شاعر جس نے اپنی تمام زندگی کو شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا اور شاعری اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی تھی جس پر یہ مقولہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ "تصنیف مصنف کی زندگی ہوتی ہے" اور بقول مولوی عبدالحق "جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو، وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کے مدد کے خود بخود ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا" اور بقول رام بابو سکسینہ، "میر کی زندگی درد و الم کی زندگی ہے" اور سکسینہ نے انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور بھی نقل کی ہیں کہ "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارہ..

.... میں ڈال دئے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"

ایسا شاعر جو اردو غزل کا سرتاج ہو اور جس کی مدح و ستائش میں بقول مترجم ذکر میر نثار احمد فاروقی "ان کی خدائی کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی 'بندگی' کا اظہار کیا ہے، جن کا مسلک مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔" ایسے پر عظمت شاعر کے کلام کی عظمت کو صرف 'بہتر اشعار' میں مقید کر دینا، کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے میر کے کلام کے بارے میں آزردہ کی یہ رائے صحیح ہو کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است" لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ میر کے پست کلام تک بھی دوسروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

عادل جعفری

غزل

ہو خیریت ادب کی جو مسطور دوستو
آپس کی کشمکش تو کرو دور دوستو

لہجہ ہو باوقار متانت لئے ہوئے
سمجھے نہ جاؤ معت میں مغرور دوستو

تم حدِ قافیہ سے بھی آگے نکل گئے
دیکھیں تو کون کہتا ہے مجبور دوستو

عرضِ ہنر کو چاہئے فنکار کا خلوص
ہو جاؤ گے تم آپ ہی مشہور دوستو

تنخواہ آج دوسرے دن ختم ہو گئی
ہم سے تو اچھے روز کے مزدور دوستو

عادل جسے جو کہنا ہے کھل کر کہے ہمیں
ہے ہم کو پاسِ عزتِ جمہور دوستو

کے ساتھ جبر یا ظلم ہے۔ زندگی ہمیشہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ہر آنے والا لمحہ انسانی زندگی میں ایک انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ادبی زندگی کا بھی حال ہے۔ یہ بھی ہر دور کے اثرات کو قبول کرتی ہے اور اس پر زمانے کی بدلتی ہوئی روش کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے اور یہ اپنے ذہن پر ان کے اثرات کو مرتسم کرتی ہے اور اس طرح ہر آنے والا زمانہ ایک نئے اضافہ کا سبب بنتا ہے اور اپنے ماضی و حال کے ان اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔

شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے اور میر بھی ایک انسان تھے۔ اگر انھوں نے اپنی ڈگر سے ہٹ کر ماحول کا اگر کہیں ساتھ دیا ہے تو یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ بے حسی ہوتی اور کوئی بھی شاعر بے حس نہیں ہوتا — کیونکہ جذبات ہی اس کے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، جن کی بدولت وہ بلندی پر پہنچتا ہے، 'جزویست از پیغمبری' کا لقب پاتا ہے۔

اردو تذکروں میں 'آب حیات' کی اہمیت مسلم ہے۔ اس تذکرہ کی کتاب میں میر کے نشتروں کے بارے میں آزاد نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے کہ "اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستر اور دو بہتر نشتر باقی میر صاحب کا ترکہ ہے" لفظ جوہری اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد کے پاس اپنے ان الفاظ کی تائید میں کوئی مستند ثبوت نہ تھا بلکہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر 'نشتروں' کی بنیاد رکھی ہے اگر ان کے ذہن میں کوئی ایسی مستند تحریر ہوتی جو ان کے قول (بیان) کی تائید کرتی تو وہ ضرور اس کو نقل کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشا پردازی کی دھن میں آزاد نے اس باب میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور ایک غلط بات میر سے متعلق بیان کر دی ہے۔

دراصل یہ اپج محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی کی دین ہے۔ آزاد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے انشا پردازی کو حقیقت پر متقدم رکھا ہے، گویا ان کے یہاں تحریر کے طابع خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے فرضی واقعات کو بھی اپنا لیا ہے جو سراسر غلط باتوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔ بقول شخصے "آزاد کا بیان سو فی صدی حقیقت پر مبنی نہیں ہے" نشتروں کے بارے میں بھی آزاد نے سنی سنائی باتوں کو مد نظر رکھا ہے اور اس کی بنیاد بھی ان ہی غلط مگر مشہور مروجہ باتوں پر رکھی گئی ہے۔

اور آزاد کا پھر یہ کہنا کہ "... لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو سخن شناس سے مبالغہ میں یہ سنا جاتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے" آزاد کا اس طرح کے لفظوں میں بہتر نشتروں سے منسوب روایت کو فرضی گردانا اس بات کا شاہد ہے کہ آزاد خود بھی اپنی اس غلط گوئی سے مطمئن نہیں ہیں اور اسی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بوکھلا کر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی غلط بیانی کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے ایسا کیوں کیا؟ بظاہر تو اس کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے مگر ذہن پر ذرا زور ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اس غلط بیانی کا محرک کون ہے؟

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ 'آب حیات' میں آزاد نے ذوق کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس کی وجہ ذوق سے ان کا دلی لگاؤ ہے اور ذوق، سودا سے بہت متاثر تھے۔ لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ آزاد بھی ان سے متاثر ہوئے۔

میر کے سامنے سودا کی شمع شاعری مدھم تھی۔ سودا خود کو میدان غزل کا لاکھ بڑا شاعر سمجھیں اور ان کے معتقد ان کے خیال کی تائید میں لاکھ سر پٹکیں مگر یہ حقیقت ہے کہ میدان غزل میں میر نے سودا کو مات دیا ہے اور ان کا رتبہ بلند ہے ممکن ہے میر کی گرفت کو کمزور کرنے اور ان کے زور کو گھٹانے اور سودا کو ان کا ہم پلہ بنانے کی جستجو میں آزاد سے ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے

'تاریخ ادب اردو' کے مصنف کے بقول "ان کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انھیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں . . . مگر سچ پوچھیے تو ان کے صدہا ایسے اشعار نکلیں گے جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف " بدرجہ احسن موجود ہیں'

ان کے علاوہ بھی بہت سے تذکرہ نویسوں نے ڈھکے چھپے اور صاف لفظوں میں اس کو 'فرضی' گردانا ہے اور ان حضرات نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ میر کے اچھے اشعار کو اس قدر محدود سمجھنا میر کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

پرانے اہل قلم حضرات کے علاوہ ابھرتی ہوئی نئی پود نے بھی اس کی مذمت کی ہے جن میں کمال الدین کمال صاحب کی رائے مجھے بہت پسند آئی ہے۔ نہ صرف کلکتہ کے ایک ہونہار شاعر ہیں بلکہ ایک اچھے تنقید نگار بھی ہیں، بقول ان کے "دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے سمندر کو نہیں اور میر ایک بیکراں سمندر ہیں" اس باب میں احمد علی جوہر کا یہ خیال ہے کہ میر کی شاعری ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جو اپنے دامن میں خس و خاشاک کو سمیٹے ہوئے بہتی ہے۔"

واقعی میر کی شاعری ایک بیکراں سمندر ہے جو اپنے دامن میں ایک اتھاہ گہرائی رکھتی ہے محض اس سے ابھرتے ہوئے چند بلبلوں کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر سمندر کی سی وسعت رکھنے والی شاعری میں کچھ خس و خاشاک آ گئے ہیں تو اس کے لئے شاعر کو سرزنش نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کے فن کو محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی خامیوں کو دیکھ کر اس کے کلام کی خوبیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بلکہ کوئی بھی رائے قائم کرنے میں ایک ترازو کے

(باقی صفحہ ۱۱)

مراسلات

غالب کے سلسلہ میں مولوی عبدالحق کا ایک مراسلہ

لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ "الناظر" کے پرانے پرچے دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے ماہ مئی ۱۹۱۴ء کے شمارے کے ساتھ ایک ضمیمہ نظر پڑا جس میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) کی ایک مختصر سی رپورٹ بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۴ء درج تھی۔ اس رپورٹ سے جہاں اور بہت سی باتیں انجمن کی کارگزاری کے بارے میں معلوم ہوتیں، وہاں یہ پتا بھی چلا کہ انجمن نے اس زمانے میں یہ ارادہ کیا تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نہایت نفیس اور صحیح اڈیشن طبع کیا جائے۔ اس نسخے میں یہ جدت ملحوظ رکھی جائے کہ اردو زبان کے اس وقت کے مشاہیر شعرا اور انشاپردازوں سے مرزا کی شاعری کی بعض خصوصیات پر مضامین لکھوا کر دیوان کے شروع میں لگائے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں متعلقہ حضرات کی خدمت میں جو مراسلہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم (آنریری سکرٹری) نے جاری کیا تھا، اس کی نقل ذیل میں درج کرتا ہوں۔ ممکن ہے غالب کی صد سالہ برسی منانے والوں کو اس سے کوئی رہنمائی حاصل ہو سکے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مراسلے کا حشر کیا ہوا کس کس نے کیا کچھ لکھا اور وہ کہاں اور کب شائع ہوا؟ مولانا شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالی تو اسی سال ایک مہینہ بارہ دن کے وقفے سے ۱۸ نومبر اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھیں سوچنے کا موقع ہی کہاں ملا ہوگا البتہ باقی اصحاب اس کے بعد دیر تک زندہ رہے ممکن ہے ان میں سے کسی کی توجہ اس کام کی طرف ہوئی ہو۔ کیا کوئی صاحب اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

(محمد عبداللہ قریشی اڈیٹر ادبی دنیا۔ لاہور)

بابائے اردو کا مراسلہ

جناب مخدومی تسلیم۔

انجمن ترقی اردو نے ارادہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اپنی نگرانی میں "دیوان غالب" اردو کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ چھپوا کر شائع کرے۔ جناب کو معلوم ہے کہ غالب کی مقبولیت اور فلسفیانہ شاعری کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مرحوم کا کلام پسند کرنے والے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ پس بالکل برمحل ہے کہ ایک جماعت کثیر کی خواہش پوری کرنے کا سامان کیا جائے اور دیوانے تحول کی بجائے، جن میں ناقص کاغذ اور غلط کتابت سے زیادہ کوئی شے نمایاں نہیں ایک پاکیزہ اور خوبصورت مجلد بازار میں آ جائے۔ آج جبکہ طوطا کہانی اور دلفروش ناٹک تک سفید کاغذ پر چھپ رہے ہیں، باعث حجاب ہونا چاہیے کہ اردو علم ادب کے مایۂ ناز اور انقلاب انگیز شاعر کا جگر تاثیر دیوان گھٹیا اور بے نور کاغذوں پر شکوہ گزار کس مپرسی ہو۔

لیکن اس عریضے سے محض یہ اطلاع دینا مقصود نہیں اور نہ نیازمند کی رائے میں کسی علمی انجمن کا یہ معمول کچھ زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ مطبوعہ کتب کے صرف اچھے نسخے چھاپا کرے بلکہ اصل غرض اس تحریر کی یہ ہے کہ جناب سے یہ درخواست کی جائے کہ مرزا غالب مرحوم کی شاعری پر ایک واضح تبصرہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں

یہ اسلامی مجالس علمی کی تقلید میں ہے کہ انجمن اساتذۂ ماضیہ پر موجودہ ارباب ذوق سے ان کی رائے لکھوانے کی خواہاں ہے تاکہ اس کے شائع کردہ نسخے میں خصوصیت بھی پیدا ہو جائے اور مستند ادبائے وقت کا مجموعہ آرا اردو علم ادب میں ایک دلکش اضافہ ہو اور اردو شاعری کے طلبہ کو مفید اعانت بھی اس سے مل سکے۔

اس غرض سے میں نے ذیل میں چند عنوانات قائم کئے ہیں اور ہر مبحث کے مقابل ان حضرات کے نام درج ہیں جنھیں اس بارے میں زحمت دی گئی ہے۔ جناب کا اسم گرامی بھی اس میں شریک ہے؟

۱۔ مرزا صاحب کے خاندانی حالات، تعلقات احباب و اقربا کے ساتھ عوام و خواص کے ساتھ ان کا برتاؤ اور عام گفتار و کردار، نشست و برخاست، معاشرت کا طریقہ۔

(نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب دہلوی)

۲۔ مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات ان کی زبان اور طرز بیان کی قدرت۔

(۱) مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی۔

(۲) مولوی رضا علی وحشت کلکتہ

۳۔ مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور اساتذۂ فارسی سے اس کا تاثر۔

(مولانا شبلی نعمانی)

۴۔ مرزا صاحب کا فلسفۂ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعرا سے۔

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبال۔ لاہور۔

۵۔ مرزا صاحب کی شاعری کا اثر ہم عصروں پر۔

(۱) مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

(۲) مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی

۶۔ مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات

از مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی

(۲) راقم الحروف عبد الحق

(جناب مولانا حالی کی خدمت میں بھی عرض کیا گیا ہے کہ اگر وہ کچھ تکلیف لکھنے کی فرماسکیں تو انجمن کے لئے اس سے بڑھ کر قابل رشک کوئی اعزاز نہیں)

مجھے پوری امید ہے کہ میری درخواست پر جناب بالضرور توجہ فرمائیں گے اور دو ایک مہینوں میں مطلوبہ تبصرہ ارسال فرماکر انجمن کو بھی احسان مندی کا موقع دیں گے۔ حقیقت میں یہ کام جناب کی معمولی التفات سے نہایت دلچسپ اور ممتاز اور عام پسند ہو سکتا ہے۔ یہ لکھنا شاید غیر ضروری ہے کہ اس تحریر میں مرزا غالب مرحوم کے وہ واقعات زندگی جو پہلے سے عام ہو چکے ہیں دہرانے سے زیادہ کارآمد یہ ہوں گے۔

(عبد الحق آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو)

مرکزی غالب کمیٹی سے

مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی غالب کمیٹی غالب کی صد سالہ برسی پر ۲۵ لاکھ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ یہ رقم غالب ہال اور غالب کی تصانیف کے ایڈیشنوں پر صرف کی جائے گی۔

مرکزی کمیٹی کے فیصلوں اور خود ہماری زبان کے اداریوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ برسی کے سال میں غالب پر کتابیں لکھ کر شائع کی جائیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والوں کو ان کی اشاعت کی کوئی سہولت نہیں دکھائی دیتی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مرکزی غالب کمیٹی اس اہم کام کو بھی اپنے فرائض میں شامل کرلے تاکہ ان کتابوں کے مصنف ایک در کے بعد دوسرا در کھٹکھٹاتے نہ پھریں۔ غالب پر کتابوں کے مسودے طلب کئے جاسکتے ہیں اور ان پر ماہرین غالبیات سے رائے لی جاسکتی ہے۔ جن کاموں کو قابل قدر سمجھا جائے ان کی اشاعت کمیٹی کی جانب سے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ معیاری مسودے اتنی تھوڑی تعداد میں ہوں گے کہ ان کی اشاعت کمیٹی کے لئے بار نہ ہوگی۔

غالب پر اچھی کتابیں لکھنا بھی اتنا ہی اہم کام ہے جتنا غالب کی تصانیف کو دوبارہ شائع کرنا یا غالب کے نام پر عمارتیں بنانا امید ہے کہ کمیٹی اس مفید کام کے لئے بھی اپنے بجٹ میں کوئی مد قائم کرے گی۔ (گیان چند)

انجمن کی تنظیم۔ ایک جائزہ

یکم رمئی ۱۹۶۸ء کے "ہماری زبان" کے اداریہ میں انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم کے عنوان سے جو اداریہ لکھا گیا ہے اس میں ۲۲ر اپریل کو انجمن کی مجالس، مالی مجلس، انتظامی مجلس، مجلس عاملہ اور مجلس عام کے جلسے کے تازہ فیصلوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس وضاحت کے نمبر (۲) میں کہا گیا ہے: "اردو تحریک کا جائزہ لینے اور شاخوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کے لئے جولائی میں مجلس عام اور ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک جلسہ ہوگا جس میں علاوہ دوسرے امور کے ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ منزل تک اردو کے ذریعہ سے تعلیم کا ریاستی شاخوں کے ذریعہ سے انتظام کرنے یا حکومت سے مناسب انتظام کرانے کا پروگرام تیار کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کتابوں کی فراہمی استادوں کی تربیت اور دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی غور ہوگا۔ اس وضاحت میں میرے نزدیک جو باتیں وضاحت طلب (تشریح طلب) ہیں ان کو میں ذیل میں تقسیم کر رہا ہوں۔

(۱) اداریہ کے شروع میں ۲۲ر اپریل کے جس جلسے کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس میں جن شہروں کا نام درج ہے کیا انجمن ترقی اردو (ہند) کی تنظیم انھیں چند شہروں تک محدود ہے۔ ملک کے باقی حصوں میں انجمن ترقی اردو کے نام سے جو انجمنیں کام کر رہی ہیں وہ مرکز سے ملحق نہیں ہیں یا ان کے نمائندے مرکزی انجمن کے جلسوں میں کبھی شرکت ہی نہیں کرتے؟

(۲) جولائی میں جو جلسہ ہونے والا ہے کیا اس میں بھی یہی نمائندے شرکت فرمائیں گے اور پھر ان کے فیصلوں کو پورے ملک کے اردو دوستوں (حامیان انجمن ترقی اردو (ہند) کے فیصلے کہا جائے گا۔

(۳) کیا مجھے بتایا جائے گا کہ ملک کی کتنی ریاستی شاخیں ترمیم شدہ دستور عمل کے مطابق کام کر رہی ہیں؟ نہیں تو مرکز نے اس سلسلے میں کون سا موثر اقدام کیا ہے؟

(۴) کیا جولائی میں ہونے والے جلسے میں ان ریاستی شاخوں کے نمائندے بھی مدعو کئے جائیں گے جن ریاستوں میں باقاعدہ تنظیم نہیں ہے صرف کاغذی شاخیں ہیں؟

(۵) کیا جولائی کے مشترکہ جلسے میں "تنظیم کو بہتر بنانے کے اہم ترین سوال" پر وہ لوگ غور کریں گے جنھوں نے خود اپنی ریاستوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کی آج تک کوئی عملی سعی نہیں فرمائی؟

(۶) اگر انجمن ترقی اردو (ہند) "ایک عوامی ادارہ" ہے اور اس کا "دستور" اردو دان عوام کے حقوق کا "تحفظ" کرتا ہے تو پھر اس کو بہتر بنانے کا سوال "عوامی سطح" پر کیوں نہیں حل کیا جاتا؟ جب کہ چند ایک ریاستوں کو چھوڑ کر دوسری ریاستوں کی تنظیم (برائے نام) پر بے عمل شاعروں اور ادیبوں کا تسلط ہے جو تنظیم کے معنی سے تو واقف ہیں مگر یہ آج تک نہیں جان سکے کہ "تنظیم" کس طرح کی جاتی ہے۔ کیا مرکز بے عملوں کی موجودگی میں "تنظیم کو بہتر بنانے" کے صرف خواب ہی دیکھنا چاہتا ہے؟!

(۷) ریاستی شاخوں کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کرنے کا جو حوالہ دیا گیا ہے کیا مرکز یقین کرتا ہے کہ وہ اپنی کاغذی ریاستی شاخوں کے ذریعہ یہ اہم کام کر سکے گا۔ جب کہ ان میں سے اکثر شاخیں اپنے گھر کی اردو اسکولوں کو بند ہونے سے نہ روک سکیں؟

مجھے امید ہے کہ مرکز کا آرگن ان وضاحت طلب (تشریح طلب) سوالوں کا جواب جولائی کے پہلے عنایت فرمادے گا۔ تاکہ مجوزہ جلسے میں شرکت کرنے والے نمائندوں کا ذہن اس وقت بیدار رہے جس وقت وہ "اردو کی موت و حیات" کے سوال پر غور کرنے بیٹھیں۔

(فیض انصاری)

مدھیہ پردیش میں غالب کی سویں برسی کی تیاریاں

ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ مدھیہ پردیش میں اُردو کے عظیم شاعر و ادیب مرزا غالب کا صدسالہ جشن منانے کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ صوبائی غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کی دعوت پر صوبہ کے مختلف شہروں میں کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ جن کا الحاق صوبائی کمیٹی سے کرایا جا رہا ہے۔ صوبائی کمیٹی میں جو کم از کم سو افراد پر مشتمل ہوگی ابھی تک صوبہ بھر کے ۶۵ ممتاز دانشور، صحافی، سیاسی و سماجی رہنما، ادبا و شعرا اور دیگر نمایاں شخصیتیں اپنی شمولیت کی منظوری دے چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

علامہ محوی صدیقی، شری اے ڈی مانی رکن راجیہ سبھا، نواب صابر قلی خاں آف محمد گڑھ، خان شاکر علی خاں ایم ایل اے صدر ایم پی وقف بورڈ، شری پرتاپ کشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو اندور بھوپال، ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن پرنسپل مادھو کالج اجین، وکرم یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز اُردو کے چیرمین ڈاکٹر ابو محمد سحر، ہندی کے مشہور کہانی نویس شری دھ جوشی، جناب شری بھوپالی مسٹر کے این پردھان ایم ایل اے، شری کالی چرن شکر گاہٹی ایم ایل اے، شری شیام سندر شیام ایم ایل اے جبل پور یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو فارسی کے صدر پروفیسر شیخ فرید، شری کرشنن سکریٹری راجیہ پال مدھیہ پردیش، ڈاکٹر راجندر ورما جوائنٹ ڈائرکٹر کالج جیئٹ ایجوکیشن ایم پی شری گنگا چرن مصرا چیرمین میونسپل بورڈ کھنڈوا، شری فقیر چند کپور چیرمین میونسپل بورڈ برہان پور، شری دھنا لال شاہ صدر مدھیہ پردیش جرنلسٹ اسوسی ایشن، شری رامیشور گرو سابق منسٹر جبل پور کارپوریشن، شری پنا لال شریواستو سابق میئر جبل پور کارپوریشن، ڈاکٹر خورشید احمد صدر انجمن ترقی اُردو کھنڈوہ، حاجی صلاح الدین صدر انجمن ترقی اُردو برہان پور، حکیم سید قمر الحسن چیف ایڈیٹر ندیم۔ مسٹر اے آر رشدی ایڈیٹر افکار، شری کے پی نارائنن ایڈیٹر ایم پی کرانیکل، ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ پرنسپل ایس ایل جین کالج ودیشہ، شری مرکیار کلکٹر رتلام، مسز اندو وجھتا پرنسپل لکشمی بائی گرلس کالج بھوپال۔ ڈاکٹر راجیشور گرو، پرنسپل سائنس کالج رائے پور، ڈاکٹر گوپال ویاس پرنسپل حمیدیہ کالج بھوپال وغیرہ وغیرہ۔

حال ہی میں مسٹر فخر الدین صدر انجمن ترقی اُردو مدھیہ پردیش کی صدارت میں غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کی محرک کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس میں تقریبات کو منانے کے سلسلے میں پروگرام پر غور ہوا۔ متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔ جن میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ نسخۂ حمیدیہ کا مستند اڈیشن مع ضروری حواشی شائع کیا جائے نیز بھوپال کے سُہا مجددی نے "مطالب غالب" کے نام سے جو شرح لکھی تھی اور جو اب نایاب ہے اسے دوسرے شارحین کی کاوشوں کی روشنی میں اڈیٹ کیا جائے۔ اس کے علاوہ صوبہ بھر میں تقریبات کا ماحول بنانے کے لیے دیدہ زیب ایک بڑا پوسٹر شائع کیا جائے۔ جس میں غالب کا مختصر تعارف اور تصویر ہو۔ اور اُسے ہزاروں کی تعداد میں پھیلایا جائے۔ اس کے علاوہ صوبہ بھر میں غالب کے جو شاگرد تھے ان کا ایک تذکرہ اور ہندی انگریزی میں غالب کے شعروں پر ایک ایک کتاب شائع کی جائے۔ اس کے علاوہ عوامی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ مُشاعرے، سمپوزیم، شامِ غالب، ڈرامے تمثیلیں بیت بازی کے مقابلے وغیرہ کرائے جائیں۔

ابھی تک صوبائی کمیٹی کی دعوت پر کھنڈوا، برہان پور، جبل پور، اندور، نیمچ، منگاؤلی، میں کمیٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہر مقام پر "انجمن ترقی اُردو" اسی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے بھی مصروف عمل ہے جس نے غالب جیسا عظیم شاعر پیدا کیا۔" اور کمیٹیوں کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کر رہی ہے۔ اسی کی دعوت پر جلسہ بلایا جاتا ہے اور کمیٹی میں ہر مکتبِ فکر کے نمایاں اور ممتاز شخصیتوں کو شامل کیا جاتا ہے۔

بھوپال شہر کی انجمن ترقی اُردو نے اپنے حالیہ جلسہ میں طے کیا کہ صوبائی کمیٹی کو ہر ممکن تعاون دیا جائے اور شہر میں جہاں غالب کے چہیتے شاگردوں کے علاوہ ان کے دیوان کو الہامی کتاب قرار دینے والے ڈاکٹر بجنوری دفن ہیں۔ اس تعلق کی بنا پر شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ بھوپال شہر کے علاوہ تانتا ٹوپی نگر اور ٹی ٹی ای ایل میں بھی کمیٹیاں تشکیل پا چکی ہیں۔

منگاؤلی کی اطلاع ہے کہ وہاں غالب کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں چیرمین میونسپل بورڈ بھی موجود تھے۔ وہاں غالب کی یادگار میں دار المطالعہ قائم کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔

کھنڈوا اور برہان پور میں وہاں کی انجمنوں کی دعوت پر میٹنگ بلائی گئی اور ہر دو جگہ کی کمیٹیوں کا صدر وہاں کے میونسپل بورڈ کے چیرمین صاحبان کو بنایا گیا۔

گوالیار، رائے پور، رائے گڑھ، رتلام، جاورہ، ریوا، دوتیہ ساگر اور دوسرے شہروں میں بھی کمیٹیاں تشکیل دی جا رہی ہیں جولائی کے پہلے ہفتہ میں صوبائی کمیٹی کا پہلا اجلاس بلایا جائے گا جس میں پروگرام کو آخری شکل دی جائے گی۔

(آفاق احمد

سکریٹری ایم۔ پی غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی بھوپال

انجمن ترقی اردو ہیرن پور کی خبریں

بوہرا میں انجمن ترقی اردو کا قیام

گذشتہ ہفتہ جب جناب کمال الدین صدیقی۔ اسسٹنٹ سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو بوہرا کے دورے پر آئے تو اردو داں حضرات نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان سے انجمن ترقی اردو کی شاخ بوہرا میں بھی قائم کرنے کی گذارش کی انتخاب کے لئے جناب کمال الدین صدیقی پھر کسی تاریخ کو بوہرا آئیں گے اور انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام عمل میں آئے گا۔

ہیرن پور میں یوم پرویز

۲۸ جون ۶۸ء کو مقامی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہند و پاک کے مشہور شاعر جناب پرویز شاہدی کے انتقال پر ملال پر اظہار غم کے لئے "یوم پرویز" زیر صدارت جناب مہیش پرشاد منایا گیا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی کے اسسٹنٹ سکریٹری و مقامی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی نے جناب پرویز شاہدی مرحوم کی مختصر سوانح کے بعد ان کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی اور ان کی وفات کو اردو ادب کے لئے سانحۂ عظیم بتایا۔ جناب مظفر امام، رگھونندن جاراہی، قیوم احمد اور عبدالحسن خاں صاحبان نے اپنی تقاریر کے ذریعہ مرحوم پرویز شاہدی کی خدمات میں خراج عقیدت پیش کیا۔

صاحب گنج میں ادبی نشست

صاحب گنج میں ایک ادبی نشست کا انعقاد زیر صدارت جناب کمال الدین صدیقی کاؤنسلر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو جناب سریندر سوس کے دولتکدہ پر ہوا جناب کمال الدین صدیقی نے "اندھیرا سایہ" جناب نریندر رمیش نے "آگ کا دھواں" اور جناب سریندر سوس نے "ہم راہی" "عنوانات" کے تحت اپنا اپنا افسانہ پیش کیا۔ اس کے بعد جناب کمال الدین صدیقی نے اپنی غزل، جناب رام اوتار انند نے اپنی ایک ہندی نظم اور جناب اکلاّ نے ایک آزاد نظم پیش کی۔

جناب کمال الدین صدیقی کے اعزاز میں جلسہ

مقامی "بزم جمال" انجمن ترقی اردو ہیرن پور کے زیر اہتمام جناب کمال الدین صدیقی کو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا نائب سکریٹری مقرر کئے جانے پر ان کے اعزاز میں ایک جلسہ زیر صدارت جناب سیدلال بھگت منعقد ہوا۔ جناب ابوالقیس، ابوالخیر، سریندر سوتن، مظفر امام، اور مہیش پرشاد مہیش نے جناب کمال الدین صدیقی کو مبارکباد پیش کی جناب کمال الدین صدیقی نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (نامہ نگار)

آندھرا میں اُردو ذریعہ تعلیم کے بارے میں انجمن کے کارکنوں کا جلسہ

حیدر آباد۔ اُردو کے دانشوروں اور انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کا ایک جلسہ اردو ہال میں بتاریخ ۳۰ جون منعقد ہوا۔ جس میں اُردو بولنے والے بچے اور بچیوں کے کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب نواب میر احمد علی خاں صدر انجمن ترقی اردو آندھرا نے فرمائی۔

شرکائے جلسہ نے آندھرا کے کالجوں اور یونیورسٹی میں تلگو ذریعہ تعلیم کے فیصلہ کو سراہتے ہوئے ایڈمنسٹریشن کے اس رویہ کی شدید مخالفت کی کہ اردو بولنے والے بچوں کیلئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تلگو کے ساتھ اُردو ذریعہ تعلیم کے متوازی درجے نہیں قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور نہ اُردو ذریعہ تعلیم کے جونیر کالج قائم ہو رہے ہیں۔

حالانکہ بڑے وزیر، وزیر تعلیم اور تینوں وائس چانسلروں نیز دوسرے متعلقہ افسروں کی میٹنگ میں جو مئی ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی یہ طے ہوا تھا کہ یونیورسٹیوں میں شہروں کے کالجوں میں اور جہاں اُردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہوگی، نیز دوسری لسانی اقلیتوں کے طلبہ کے لیے اُردو اور دوسری اقلیتی زبانیں بھی ذریعہ تعلیم ہوں گی اور یہ کہ یہ بچے انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ جلسہ محسوس کرتا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے طلبہ کے ساتھ انگریزی ذریعہ تعلیم کے سلسلہ میں امتیاز نہیں برتا جانا چاہیئے۔ اور انھیں خود ان کی زبان میں تعلیم ملنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل اردو ذریعہ تعلیم کے فیصلہ کو نظر انداز کر رہی ہے۔

اس جلسہ میں جونیر کالجوں کے قیام کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ گورنمنٹ تلگو کے جونیر کالج تو قائم کر رہی ہے۔ لیکن لسانی اقلیتوں کے جونیر کالجوں کے قیام کا مسئلہ خود لسانی اقلیتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے چار لاکھ اُردو بولنے والے نہ تو اتنے وسائل رکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے کالج قائم کر سکیں اور نہ وہ اتنی کم تعداد میں ہیں کہ گورنمنٹ ان کو نظر انداز کر کے نیز ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ ایک وفد ذیل کی مانگوں کے لیے آندھرا کے بڑے وزیر سے ملے۔

۱۔ آندھرا کی یونیورسٹیوں کو اردو ذریعہ تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے۔

۲۔ جہاں اردو بولنے والے لوگوں کی قابل لحاظ آبادی ہے وہاں اردو جونیر کالج قائم ہونے چاہئیں۔

۳۔ اس سلسلہ میں نصابی کتب اور ٹیچرس کا بھی انتظام ہونا چاہیئے۔ (سری نواس لاہوٹی)

باقی صفحہ ۴ سے آگے

مذہبی ہے تلسی داس، سور داس، میرا بائی بھی مذہبی روایات کو لے کر چلتے ہیں اردو میں ادب کا بالعموم مزاج لامذہبی اور آزاد روی کا ہے اور غیر مذہبی ہے حتیٰ کہ مذہبی خیالات کو بھی غیر مذہبی روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں جملۂ معترضہ کے طور پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اپنے کروروں بولنے والے ہندوستانیوں کے وجود کی وجہ سے ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح حقوق ہیں اسے مراعات نہیں حقوق چاہئیں ہماری غیر جمہوری پارٹیاں اسے مراعات دینے کو تیار ہیں حقوق دینے میں آنا کانی کرتی ہیں حالانکہ اب معاملہ حقوق ہی کا ہے اور وہ یہ کہ اترپردیش بہار، دہلی میں ثانوی سرکاری زبان قرار دیا جائے اس کے معنی یہ ہیں کہ

(الف) اترپردیش میں بھی بچے آٹھویں درجے تک لازمی طور پر یا تو اختیاری یا اسلامی اردو پڑھیں اور اس کا انتظام ریاست کی تمام تعلیم گاہوں میں کیا جائے۔

(ب) سرکاری دفاتر میں جن میں کچہریاں بھی شامل ہیں اردو کو بھی اختیار کیا جائے یہ اردو بولنے والوں کے بنیادی اور آئینی حقوق ہیں اور انھیں ضرور ملنے چاہئیں۔

یہ حقوق کیوں کر حاصل کئے جائیں؟ اسی سلسلے میں اردو بولنے والوں پر دو فرائض عائد ہوتے ہیں ایک احتجاجی جدوجہد کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کا فرض، دوسرا تعمیری جدوجہد کو جاری رکھنے کا فرض۔ اردو کے لئے جو تحریک جاری ہے وہ مبارک ہے البتہ اس تحریک کو جمہوری تحریکوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ فرقہ پرستانہ نہ بن سکے اس تحریک سے یہ پہچاننے میں بھی مدد ملے گی کہ ہندوستان میں کون سی سیاسی جماعتیں اور گروہ ایسے ہیں جو مصلحت سے بے نیاز ہو کر بھی جمہوریت کے صحیح معنوں میں علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔

تعمیری جدوجہد کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اردو پڑھانے کا ایک مختصر نصاب تیار کریں اس ضمن میں ایک مفید کام حیات اللہ انصاری کی "دس دن میں اردو" کی شکل میں سامنے آچکا ہے اس پر نظر ثانی کر کے زیادہ موثر بنانے اور اس سلسلے کی دو ایک اور کتابیں مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ چھ ہفتے میں بنیادی اردو زبان قواعد اور رسم خط پڑھنا اور لکھنا کام چلانے بھر کا ضرور آ جائے اس کے بعد چھوٹے اسکول ہر شہر اور قصبہ میں قائم کرنے کے لئے تعلیمی کام ضروری ہے اردو پڑھنے والے مل جائیں گے اور پڑھانے والے بھی جگہیں اور سامان بھی فراہم ہو جائیں گی مگر ایک معقول تنظیم اور مستقل مزاج کارکنوں کی ضرورت ہے جو خلوص اور لگن سے اس کام کو شروع کر سکے۔ اور ان سب باتوں سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری مسئلہ اردو والوں کے ذہنی رویے کا ہے اگر وہ پست ہمتی اور شکست خوردگی کا شکار رہے گے تو پھر اردو کو کوئی بچا نہیں سکتا انھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اردو پچھلے بیس سال کے نامساعد حالات کے بعد بھی مٹی نہیں ہے ۱۹۶۱ کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق بھی آگے ہی بڑھی ہے اور اس پر یہ پاور یکا ایمان رکھنا چاہئے کہ اگر پر خلوص طور پر اردو کی خدمت کرنے والے موجود رہے تو اسے کوئی مٹا نہیں سکتا اردو زندہ رہے گی مگر اس کی زندگی کا تعلق براہ راست ہماری جدوجہد سے ہے اردو کی زندگی اور موت دراصل اس پر منحصر ہے کہ ہم جمہوریت کے خلاف چیلنج کو کس حد تک قبول کرتے ہیں ملک میں جمہوریت کا مستقبل (باوجود تمام عارضی دشواریوں کے) شاندار ہے اس لئے اس پر یقین بلکہ ایمان مستحکم ہوتا ہے کہ اردو بھی زندہ رہے گی کیونکہ جمہور اور ان کی زبان کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔

(بہ شکریہ قومی آواز)

صفحہ ۲ سے آگے

رسل کے خیالات سے اتفاق ضروری نہیں مگر ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ رسل دنیا کے ان مفکروں اور دانشوروں میں ہے جنھیں آدمی سے اور زندگی سے محبت ہے اور وہ جس بات کو سچ سمجھتا ہے اسے بیان کرنے میں کبھی نہیں جھجکتا۔ اس نے اپنے خیالات کے برملا اظہار کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلی ہیں۔ مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہا ہے ۹۰ سال کی عمر میں وہ جوانوں سے زیادہ مستعدی کے ساتھ ایٹمی جنگ کے خطرے سے دنیا کو آگاہ کرتا رہا ہے۔ ویت نام میں امریکہ کے رول کے خلاف اس نے اپنی جنگ برابر جاری رکھی ہے۔ اس نے ساری دنیا کے افکار پر ایسا اثر چھوڑا ہے۔ زندگی ہی میں اس نے ابدیت کو پا لیا ہے۔

یہ کتاب پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اچانک ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہوں اور پہاڑ کی تازہ، روح پرور ہوائیں، کائنات اور اس کے حسن، وادیوں کی شادابی، دریاؤں کے پیچ و خم، آسمان کی نیلاہٹ اور بادل کے ٹکڑوں کی روئی کی سی کیفیت، برف کی دودھ کی سی سفیدی ہوا سے ہلتے ہوئے چیڑ کے درختوں میں عورت کے جسم کی سی لچک دیکھ رہا ہوں اور اس ایک لمحے میں زندگی کی عظمت اور اس کی ابدیت کھنچ آئی ہے۔

باقی صفحہ ۶ سے آگے

دلیلوں پر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو رکھ کر یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔

ہمارے ادب کے کرم فرماؤں کو چاہئے کہ وہ اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، حقیقت اور مجاز کو اس طرح الگ کر دیں جیسے دودھ اور پانی ــــ کیا ہمارے دانشور حضرات میرے بستر لستر پر روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

برٹرینڈ رسل کا شمار اب ان دانش وروں، فلسفیوں اور مصنفوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ساری دنیا کو متاثر کیا ہے چھیانوے سال کے اس بوڑھے کی ترکیب معلوم ہوتا ہے پارے اور بیسیوں ہوئی بجلیوں سے ہوئی ہے۔ اس کی تصانیف میں مغربی فلسفے کی تاریخ، مسرت کی فتح، تصوف اور منطق، شادی اور اخلاق، تعلیم اور سماجی نظام، سماج کی تشکیل نو کے اصول، امن کے لئے کون سا راستہ ہے، کیا انسان کا کوئی مستقبل ہے؟ بہت مشہور ہیں۔ گذشتہ سال اس کی خود نوشت سوانح عمری کی پہلی جلد شایع ہوئی تھی جس میں ۱۸۷۲ سے ۱۹۱۴ء تک کی داستان زندگی بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے شروع میں اس نے لکھا تھا کہ تین چیزیں میری زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ اوّل محبت دوسرے علم کی پیاس۔ تیسرے مظلوم انسانیت کے لئے بے پناہ درد۔ رسل کی نثر ہیرے کی طرح ترشی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ذہن میں روشنی بھی کرتی ہے اور ایک ناقابل بیان لطف بھی دیتی ہے۔ کتاب میں زیادہ تر رسل کے خط اپنے دوستوں کے نام اور ان میں سے کچھ کے جوابات ہیں۔ ان میں انکار بھی ہیں، جذبات کی گرمی بھی اور زندگی کے متعلق گہرا شعور بھی۔ رسل ان فلسفیوں میں سے ہے جو اپنی حریت فکر اور اپنی نثر کی دل نشینی اور دلپذیری کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے پہلی جلد کو کچھ لوگوں نے روسو کے اعترافات اور پیپیز (PEPYS) کے ارشادات کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔

حال میں اس کی خود نوشت کی دوسری جلد پڑھنے کا موقع ملا اور مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ ایسی جاندار مزے دار اور زندہ کتاب میں نے بہت دن کے بعد دیکھی ہے۔ اس میں ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک کے حالات ہیں۔ گویا یہاں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک کی رسل کی مصروفیات اور ذہنی و علمی کاوشوں کی مرقع کشی ملتی ہے۔ اس نے کتاب کے شروع میں ہی لکھا ہے کہ "۱۹۱۴ء سے پہلے کی میری زندگی اور ۱۹۱۴ء کے بعد کی زندگی میں وہی فرق ہے جو فاوسٹ کے شیطان سے ملنے سے پہلے کی زندگی میں اور اس کے بعد کی زندگی میں ہے۔" پہلی جنگ میں رسل نے بڑی جرأت سے جنگ کے متعلق عام خیالات سے اختلاف کیا اور اس کے صلے میں ۱۹۱۸ء میں اسے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ جنگ کے بعد وہ روس گیا مگر وہاں اسے اپنے خوابوں کی جنت نظر نہ آئی اور وہاں سے مایوس لوٹا۔ اس نے کچھ دن چین میں بھی گزارے جہاں اس کی غیر معمولی ذہانت اور علمی صلاحیت کے لوگ معترف تھے۔ وہاں مذہب اور اخلاق کے متعلق اس کے نظریات سے اختلاف خاصا شدید بھی تھا امریکہ میں اسے لکچر دینے کے لئے بلایا گیا مگر مذہب و اخلاق کے متعلق خیالات کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے اتنے خلاف ہو گئے کہ اسے یونیورسٹی چھوڑنی پڑی اور کتابیں لکھ کر اسے کام چلانا پڑا۔ مغربی فلسفے کی تاریخ اسی زمانے میں لکھی گئی اور اس کتاب سے رسل کو خاص آمدنی ہوئی۔ رسل لکھتا ہے کہ یہ کتاب لکھتے ہوئے اسے بڑی خوشی ہوتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک تاریخ بڑا دلچسپ موضوع ہے اور اسے پڑھنا چاہئے۔ کچھ ریویو نگاروں نے اسے جانبدار تاریخ کہا ہے مگر رسل کا کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی خاص جھکاؤ (BIAS) نہ ہو تو دلچسپ تاریخ لکھی بھی نہیں جا سکتی۔ تاہم یہ بھی نہایت صفائی سے کہتا ہے کہ جس شخص کا کوئی خاص جھکاؤ نہیں ہے وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے، ہاں اپنے اس جھکاؤ کو صفائی سے بیان کر دینا چاہئے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ رسل کو اپنی مغرب کے فلسفے کی تاریخ مغرب کی حکمت (WISDOM OF THE WEST) سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کیونکہ موخر الذکر کتاب میں اس جھکاؤ یا میلان یا عصبیت کو ہلکا کر دیا گیا ہے مئی ۱۹۴۴ء تک رسل امریکہ میں رہا پہلی جنگ کی مصروفیات کے مقابلے میں دوسری جنگ کی مصروفیات کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ یوں بھی کتاب میں خطوط کی تعداد زیادہ ہے رسل کا اپنا بیان کم، مگر دلچسپی میں خطوط بھی کم نہیں ان صفحات میں رسل کے علاوہ ٹی. ایس. ایلیٹ، ڈی. ایچ. لارنس، جے. ایم. کینس، گلبرٹ مرے، لاسکی، کانریڈ، برنارڈ شا اور بہت سے مصنف مفکر اور دانش ور بھی چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ رسل نے کئی شادیاں کیں خوبصورت اور ذہین عورتوں سے رسل بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کی زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں محبت کو وہ محض جسموں کا ملاپ نہیں روحوں کا ملاپ بھی سمجھتا ہے اس کا خیال ہے کہ محبت انسان کو خدا کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اس کے بعض خیالات اتنے دلچسپ ہیں کہ یہاں ان کا اظہار و ترجمہ کئے بغیر طبیعت نہیں مانتی۔ اپنے متعلق کہتا ہے۔

"میں نے باری باری سے اپنے کو لبرل، سوشلسٹ یا امن پسند خیال کیا ہے، مگر دراصل کسی گہرے مفہوم میں میں ان میں سے کچھ بھی نہیں رہا ہوں۔ ہمیشہ ایک متشکک ذہن، جس میں نے اس کی خاموشی چاہی، سرگوشی میں اپنے شبہات بیان کرتا رہا ہے اس نے مجھے دوسروں کے سستے جوش سے علیحدہ رکھا ہے اور مجھے ایک اجاڑ تنہائی میں پہنچا دیا ہے۔"

"میں انسان کی مسرت کے لئے نہیں جیتا، ہاں اس سچی کے لئے جس میں ذہن کی بلندی ظاہر ہو۔ میرا خیال تھا کہ متمول لوگ تمام چیزوں سے زیادہ دولت کو چاہتے ہیں لیکن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ سچائی کو اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں میرا خیال تھا کہ ذہین زیادہ تر صداقت سے لو لگاتا ہے مگر یہاں بھی مجھے معلوم ہوا کہ دس فی صدی سے زیادہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو صداقت کے مقابلے میں مقبولیت کو ترجیح نہ دیتے ہوں۔"

"ہماری نسل پچھلی نسلوں کے مقابلے میں کچھ دیوانی ہے کیونکہ اس نے صداقت کی کچھ جھلکیاں دیکھا گوارا کیا ہے اور صداقت ایک پرچھائیں ہے، دیوانی ہے اور ہیبت ناک ہے۔ جتنا بھی ہم اس کو دیکھ پاتے ہیں اتنی ہی ہماری ذہنی صحت پر اثر پڑتا ہے۔ وکٹورین عہد کے لوگ معقول اور کامیاب اس لئے تھے کہ وہ صداقت کے پاس بھی نہ پھٹکے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میں پاگل ہونا پسند کروں گا مگر ایسی معقولیت سے سروکار نہ رکھوں گا جس میں جھوٹ کی آمیزش ہو۔"

"روایتی رسمی اخلاق کی بنیاد پر ہم معقول لوگوں سے بے غرضی کی توقع کرتے ہیں، غلطی ہے۔ آدمی ایک جانور ہے جسے اپنی غذا حاصل کرنے اور اپنی نسل کی افزائش سے سروکار ہے۔ ایک طریقہ ان مقاصد میں کامیابی کا یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو یہ یقین دلا دے کہ اسے ان کا مفاد عزیز ہے، مگر اپنے اور اپنے بچوں کے مفاد کے علاوہ دوسروں کے مفاد کی سوچنا غیر فطری ہے۔ ایک اچھا سماجی نظام لوگوں کو بے غرض بنانے سے وجود میں نہیں آئے گا، بلکہ ان کے حیات بخش جذبات کو دوسروں کے حیات بخش جذبات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے ممکن ہو گا۔"

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، مدیر و پبلشر سید ضیاء (؟) نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شایع کیا

R-No.-2196/57

REGR NO. L 022

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۴۴

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

بنارس کی کارپوریشن اور اردو

اب تک پارلیمنٹ اور ریاستی ودھان سبھاؤں میں یہ دستور رہا ہے کہ ممبر جس زبان میں چاہیں حلف لیں۔ اب کے بنارس کی کارپوریشن کے میئر نے انیس ممبروں کو اپنی مادری زبان اردو میں حلف نہ لینے دیا، جس پر یہ ممبر احتجاج کے طور پر ہال سے باہر چلے گئے بعد میں ان کا ایک وفد گورنر سے ملا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اترپردیش کی حکومت نے اب اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے جس کی رو سے ممبروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج کسی بھی زبان یا انگریزی میں حلف لے سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان کی روشنی میں بنارس کی کارپوریشن کے میئر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے کہا جاتا ہے کہ جن سنگھ کی ریاستی شاخ کے دفتر سے میئر کو اس قسم کی ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ اردو میں حلف لینے کی وہ اجازت نہ دیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو جن سنگھ نے اس معاملے میں بہت بڑی غلطی کی ہے اور ہندوستان کے کچھ شہریوں کو اپنے بنیادی حق سے محروم کرنا چاہا ہے۔ یہ ایک معمولی واقعہ نہیں ہے، اس سے ایک خاص ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے ہندوستان کی قومی زبانوں میں اردو بھی ہے اور اترپردیش میں تو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۰ لاکھ سے اوپر اشخاص کی مادری زبان اردو ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد اب ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ اتنی بڑی آبادی کی مادری زبان کو نظر انداز کرنا اور اس کے استعمال پر پابندی لگانا ظاہر ہے تنگ نظری اور تعصب کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ یہ کسی طرح ہندی کی خدمت نہیں۔ ہندی اردو کو دبا کر ترقی نہیں کر سکتی۔ ہاں اردو کو ترقی کے مواقع ملیں گے تو اس سے ہندی بھی مضبوط ہوگی اور ترقی کرے گی۔ اترپردیش میں سب رہنے والے ہندی کو اس ریاست کی سرکاری زبان مانتے ہیں۔ وہ سب ہندی کی ترقی چاہتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ اترپردیش کی دوسری زبانوں کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔ اس قسم کی باتوں میں فسطائیت کی بو آتی ہے۔ ہمیں اردو دوستوں سے توقع ہے کہ وہ اس قسم کی رکاوٹوں کا کوئی اثر نہ لیں گے اور ہر جگہ اور ہر حال میں اپنے بنیادی حقوق پر اصرار کریں گے۔ ہمیں صرف حلف اردو میں لینے پر ہی اصرار نہیں کرنا ہے، یہ بھی دیکھنا ہے کہ بنارس کی کارپوریشن کے تحت حسب ضرورت اسکولوں میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے یا نہیں، اردو کے استاد مناسب تعداد میں موجود ہیں یا نہیں اور کتابوں کی فراہمی میں کوئی دقت تو نہیں ہوتی امید ہے کہ ہماری بنارس کی شاخ اور ریاستی شاخ دونوں اس معاملے میں چوکس رہیں گے اور اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ہر رکاوٹ کو دور کرائیں گے۔

سہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں جنوبی ہند کی ایک زبان کو ترجیح کیوں؟

ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ دہلی کارپوریشن میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ہندی اور انگریزی کے بعد تیسری زبان کے طور پر جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے گی۔ بظاہر قومی یکجہتی کے لحاظ سے یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ تیسری زبان کے طور پر ہندوستان کی کسی جدید زبان کو لینے کی سہولت ہونی چاہیے، یہ بھی اچھی بات ہے کہ جو لوگ جنوبی ہند کی کوئی زبان لینا چاہیں ان کے لئے اس کا انتظام کیا جائے۔ مگر جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دینا، اور دہلی کی علاقائی زبان اردو کو نظر انداز کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہونا یہ چاہیے کہ تیسری زبان کے طور پر جس کا جی چاہے اردو لے اور جس کا جی چاہے جنوبی ہند کی کوئی زبان یا بنگالی یا پنجابی پڑھے۔ ترجیح کا لفظ بظاہر معصوم لفظ ہے مگر ہمارے دفاتر اور سرکاری ادارے ترجیح کے معنی یہ لیتے ہیں کہ یہ لازمی ہے۔ اگر دہلی میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ جنوبی ہند کی کسی زبان کو سب کے لئے لازمی کر دیا گیا تو یہ بہت غلط بات ہوگی۔ قومی یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تیسری زبان

کے لیے زبردستی مسلط کر دی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر جدید ہندوستانی زبان کی تعلیم کی سہولت رہے۔ دہلی کی کارپوریشن کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اردو بھی دہلی کی علاقائی زبان ہے، دہلی اردو کی جنم بھومی ہے اور اردو ادب کا بہت بڑا مرکز۔ یہاں تو اردو کی تعلیم کے لیے خاص طور پر سہولتیں ہونی چاہئیں، نہ کہ دشواریاں پیدا کی جائیں۔ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے یہاں ہر پردانت کے رہنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں اس لئے تیسری زبان کے طور پر تمام جدید ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کے لئے پوری سہولتیں ہونی چاہئیں اور طلبہ کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ کوئی سی جدید ہندوستانی زبان لے سکیں انتظامی سہولت کے لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کم سے کم پانچ طلبہ جب کسی زبان کے پڑھنے کی خواہش ظاہر کر دیں تو کارپوریشن اس زبان کی تعلیم کا انتظام کرے

محمد احسن مارہروی کا انتقال

علی گڑھ۔ یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور ناقد وادیب جناب شاہ علی احسن، احسن مارہروی شاگرد داغ دہلوی کے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن مارہروی سابق ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی گڑھ نے ۲ اور ۳ر جولائی کی درمیانی شب میں حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ۱۲ بج کر ۱۵ منٹ پر اس دارفانی سے کوچ کیا موصوف خاندان بلگرام کی آخری نشانی تھے ۸۰ سال سے زیادہ کی عمر تھی مگر وضع داری، رکھ رکھاؤ میں بے مثل تھے۔ نواب مزمل اللہ خاں سے لے کر عہد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کے واقعات وحالات پر آپ ایک مستند شاہد کی حیثیت رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندانی روایت کے تحت علم وادب اور مطالعہ ادب سے بے انتہا شغف تھا، حال ہی اپنی سرگذشت کے چند اوراق مرتب کرنا شروع کیا تھا (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

اردو میں گزٹ

لکھنؤ: جناب جی ان ڈاکٹ ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیت نے ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد سے ملاقات کے دوران یہ انکشاف کیا کہ ریاستی حکومت نے اردو میں گزٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ گزٹ آئندہ چند دنوں میں جاری ہو جائے گا۔ (قومی آواز)

برطانیہ کا ایک بنک اردو میں اشتہار دیتا ہے

برمنگھم: ایک برطانوی بنک جو برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں اپنے گاہک حاصل کرنا چاہتا ہے، ایک اشتہار شام کے ایک اخبار میں اردو زبان میں شائع کرتا ہے اس اشتہار میں بنک کی ۱۶۵ شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بنک کے ایک ترجمان نے بتایا ایشیائی لوگ بنکوں میں اپنے حساب کھول رہے ہیں اس لئے میرے بنک نے یہ مناسب سمجھا کہ اسی زبان میں اشتہار دیا جائے جسے زیادہ لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ اشتہار برمنگھم میں چھپا ہے جو برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر ہے (سیاست)

فاروقی کے تبصرے شائع ہوگئی

الہ آباد۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے نوجوان نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'فاروقی کے تبصرے' شائع ہو گئی ہے' اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی کے وہ خیال انگیز تبصرے شامل ہیں جو انھوں نے ماہنامہ شب خون' میں کئے۔ یہ کتاب تین روپے میں شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد سے مل سکتی ہے۔ (منیجر شب خون کتاب گھر)

ساجد اثر

مجبوری

کئی سال پہلے
میں اپنی انا کے
حوالے برم کی اصول رلبسم کو
پرہول حالات کی دسترس سے
بچائے ہوئے تھا
مگر دست لے آج اس عمی ندر درب کو
تحریک دے کر
مری زندگی کی ہر ک رالس کو
تپ دن کے تنور میں جھونک ڈالا
مرے دل کے پارس منی کو
یہ احساس بن کے دھندلکا
نگلنے لگا ہے
کہ اندھی نفرت رسانی
منحوس منطق سے مجبور ہو کر
مجھے آج اپنی انا کے حوالے
ترنم کو
مجروح کرنا پڑے گا!!

بچوں کے ادب سے متعلق انعامی مقابلہ

نئی دہلی مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے ادب سے متعلق پودھویں انعامی مقابلے کے لیے ۱۶ر اگست تک بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں اور قلمی نسخے طلب کئے ہیں مصنفین اور ناشرین اپنی کتابیں بالترتیب تین روپے اور پانچ روپے داخلہ فیس کے ساتھ اس پتہ پر بھیج سکتے ہیں۔ اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر وزارت تعلیم سیکشن پی ایس ای ۳ شاستری بھون نئی دہلی

ری شنکر
بہ اصغر عباس

ویتنامی شاعر فام دوئی کے گیت

پتّوں پر بارش کے قطرے خوشی کے ان آنسوؤں کے مانند
ں جو ایک دوشیزہ کی آنکھوں سے اس وقت نکلتے ہیں جب اس
محبوب جنگ سے واپس آتا ہے۔
پتّوں پر بارش کے قطرے اس ماں کے تلخ آنسوؤں کی مانند
ں جو یہ سنتی ہے کہ اس کا بیٹا جنگ میں کام آگیا ہے۔
پتّوں پر بارش کے قطرے اس نوزائیدہ بچے کی چیخ کے مثل ہیں
ب وہ پہلی بار دنیا میں آتا ہے۔
پتّوں پر بارش کے قطرے ان دو چاہنے والوں کے پیار کی طرح
جن پر ۱۰ سال کی گرد پڑ چکی ہے لیکن ان کی محبت تازہ و شیریں
ہے

آج جب کہ اخبارات ویتنام میں امن و امان کی نئی امیدوں
خبریں شائع کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جنگ کا عذاب گذشتہ
ں برسوں کی طرح اب بھی موجود ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان میں
وں کی نمایاں خصوصیت امید و بیم رہی ہے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ آزادی
امید کے ساتھ ملک کی تقسیم، امن و سکون کی امید ان کے ساتھ خانہ
ی کا خطرہ لاحق رہا ہے اور اگر بہتر معیار زندگی کی تمنا کی گئی ہے تو
ے موت کے خطرے نے تاریک بنا دیا ہے چنانچہ امید و بیم کی اس
میت کا نقشہ ہمیں ویتنام کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے میں ملتا ہے
راس کا سب سے بہتر اظہار ہمیں دیہات کے لوک گیتوں میں
تا دیتا ہے

نت کا نگ اور شمالی ویت نام کے رہنے والوں کے گیت
جنوبی ویت نام میں ہونے والی جنگ کی تصویر ہوتے ہیں جن
کہ اشتعال ہوتا ہے اور جن میں رفاقت کی تمنا ہوتی ہے اور
ر منزل حاصل کرنے کا ایقان ہوتا ہے چنانچہ یہ بات تعجب خیز
ہیں جائے گی کہ جنوبی ویتنام کے لوک گیت شمالی ویتنام کے
گیتوں سے زیادہ مشہور اور ہر دل عزیز نہیں ہیں۔
جنوبی ویتنام کے لوک گیت کار دل میں فام دوئی کا مقام
بہت اہم ہے بہت سے قوم پرستوں کی طرح جو آج کل سائگوں
ں میں فام دوئی بھی شمالی ویتنام میں پیدا ہوا تھا اور فرانسیسیوں
ے خلاف جو سرفروش ویت منہ کے دوش بدوش ملک کی آزادی
لے لئے لڑے ان میں یہ پیش پیش تھا جب فتح حاصل ہوگئی اور فرانسیسی
مقام سے چلے گئے تو فام دوئی نے بھی تقریباً دس لاکھ ویتنامیوں
کے ساتھ پہنچ کی جو اس کا آبائی وطن تھا۔ اسے خیرباد کہہ دیا تاکہ

وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے رہ سکے اور گیت کی تخلیق
کرسکے۔
فام دوئی کے گیت ویتنام کے قصباتیوں کی زندگی کا جز
بن گئے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سیلانیوں کی طرح گاؤں
گاؤں گھوما ہے اور ان میں اپنی عمر کا بیشتر وقت صرف کیا ہے اور
یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں میں دیہاتی زندگی کے تجربات حاوی
ہیں۔ اس کے نغمے پورے ویتنام میں ہر جگہ مقبول ہیں چاہے وہ کسی
تیج تہوار کا موقع ہو یا کھیتوں میں کام کرنے کا زمانہ ہر موقع پر فام دوئی
کے گیت گائے اور سنے جاتے ہیں۔ اس کے گیتوں میں روایت کا
احساس بھی ہے اور نئے زمانہ کا شعور بھی چنانچہ ان گیتوں میں
قدیم عشقیہ ترانوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور جنگ کے طویل اور
دل خراش لمحات کا بیان بھی یہی وجہ ہے کہ بعض گیت مغرب میں بھی
مقبول ہوئے ہیں اس سلسلہ میں ہم THE RAIN ON THE LEAVES
کو بطور مثال پیش کرسکتے ہیں۔
فام دوئی ویتنام کے دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں ویتنامیوں
کے جذبات ان کے آس و یاس کے ملے جلے احساسات کو شاعرانہ انداز
میں اور ان سے بہتر طور پر پیش کرتا ہے۔ ویتنامی خانہ جنگی سے عاجز
آچکے ہیں اب انھیں اپنے نوجوانوں کو جنگ پر بھیجنے سے کوئی دریغ
نہیں ہوتا اور وہ ایسی زندگی کے شدت سے خواہش مند ہیں جو
انھیں ایک بہتر اور روشن مستقبل کی ضمانت دے سکے۔
فام دوئی کے گیتوں میں سے چند گیت یہاں پیش کئے جا رہے
ہیں جنھیں ایک امریکی لوک گیت کا اسٹوڈیو اینڈرس کی شرکت میں شاعر نے
خود انگریزی زبان میں ڈھالا ہے۔ ایسے ایک گیت DAY OF HOME
COMING میں فام دوئی اس قوم کے غم انگیز خیالات کو پیش کرتا
ہے جو جنگ کی آگ میں جل رہی ہے اس قوم کا ایک گھر اپنے
محبان وطن کا استقبال اس طرح کرتا ہے۔

گھر کو لوٹنے کے دن (خوشی میں)
تم مینڈھ پر کودتے چلتے ہو
تم بانس کے بنے ہوئے دروازے سے داخل ہوتے ہو
تمہارے استقبال کے لئے سورج چھوٹے سے باغ میں ہر سمت
زردی بکھیر دیتا ہے۔
تمہاری ماں خوشی کے مارے لڑکھڑانے لگتی ہے
جب وہ ایک ایک قدم لیتے ہوئے تالاب کی جانب
تمہاری ہنڈی لے کر جاتی ہے وہ سوچتی ہے کہ یہ سب خواب ہے
وہ بہت زیادہ نڈھال ہو چکی ہے اس کی آنکھیں انتظار کرتے
کرتے بند ہو چکی ہیں۔
گھر لوٹنے کے دن، ....
گھر لوٹنے کا دن ختم ہونے کے بعد
لوگ ایک کسان کو ہاتھ میں سنبھالے ہوئے دیکھتے ہیں

دریائی جانور بھی اس پر رحم کرتے ہیں اور اس کو اس کے
کام میں مدد دیتے ہیں

گھر لوٹنے کا دن ختم ہونے کے بعد
جلد اگنے کے لئے بیجوں میں مقابلہ ہوتا ہے
ہوا بھی فرحت بخش ہے ماہتاب بھی منور ہے
گھر لوٹنے کا دن گذرنے کے بعد
ایک زخمی سپاہی سکون کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے

بالکل اسی طرح فام دوئی اپنی نظم RECOMMENDATIONS میں بھی وطن کو مزاحمت کی خواہش کو بیان کرتا ہے اور خصائل زندگی کے حسن پر جنگ کے مدہم اثرات کو بے نقاب کرتا ہے۔

میری تسریلب زندگی تم گھر پر ہی ٹھہر د
ملبری کے درختوں کی نگہبانی کرو
اور ہماری بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کرو
کیونکہ اب میں اپنے اسلحوں کے ساتھ یہاں سے وداع ہو رہا ہوں

مجھے اپنے باغیچہ کی یاد آ رہی ہے
جو ہمارے دشمنوں کی وجہ سے ویران ہے
اور تم بھی اے میرے بیٹے گھر پر ہی ٹھہرو
اور ہمیں ہم اپنے بارے میں سوچتے ہیں تاکہ ہم آزادی کے ساتھ رخصت ہو سکیں

اگر میں اپنے دشمن کو زیر کر سکا۔
تو ہماری زندگی تبسم لے افتخار کی مانند حسین ہو گی
لیکن اگر میں بھی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا
تو میرا خون آلود جسم اور میری روح تمہارا انتظار کرے گی
تاکہ تم میدان جنگ میں جاؤ اور دشمن سے میرا خون بہا لو

ایک عرصہ کی خانہ جنگی کے باعث آج کا ذہن کس قدر سخت دل اور سخت جان ہو گیا ہے چنانچہ اکثر ماہرین سماجیات کا خیال ہے کہ ویتنامی تہذیب جنگ کو اپنے لہو میں اتار چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ جنگ کے لئے نفسیاتی طور پر ہر وقت تیار رہتے ہیں اور یہ ان واقعات و حوادث کو ہنسی کھیلے اپنا لیتے ہیں جو اگر دوسری اقوام پر بیتے تو ان میں انتشار اور بدنظمی پیدا ہو جائے۔ ویتنام میں المیہ کی اسی قربت کے باعث فام دوئی کی اکثر نظموں میں تلخی اور جھلاہٹ کا عنصر پیدا ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بے باکی بھی ملتی ہے جو دوسرے لوک گیتوں میں نہیں پائی جاتی مثال کے طور پر اپنی نظم THE MOTHER OF GIA LINH میں وہ جنگ کی بربریت کی ایک دلدوز داستان یوں پیش کرتا ہے۔

بوڑھی ماں آلو کا پودا لگانے کے لئے زمین کھود رہی ہے
اپنے اس بیٹے کی پرورش کرنے کے لئے جو کہ رات دن دشمن سے مقابلہ کر رہا ہے اس کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں گھر میں ایک دانہ بھی کھانے کو نہیں ہے۔

دشمنوں نے ہمارے گھروں کو آگ لگا دی ہے اور ہم اس سے انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

ماں اس بات پر خوش ہے کہ اس کا بیٹا سرہنگ ہے
اسے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے کہ اس کا بیٹا میدان جنگ میں ہے۔

گو اس کے ایک ہی بیٹا ہے لیکن وطن کی محبت اس کے دل میں کسی دوسرے سے کم نہیں رات میں جب وہ جنگ کا نگل بستی ہے تو اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا مانگتی ہے جب گاؤں کے لوگوں کی چیخ بلند ہوئی تو بوڑھی ماں سریوں میں پانی رہے رہی تھی کیونکہ دشمنوں نے اس کے بیٹے کو پکڑ لیا تھا اور سر بازار اس کا سر قلم کر دیا

ماں پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے وہ اپنے بیٹے کا سر لینے جاتی ہے
کال کے راستے پر ایک مندر ہے اس مندر کی گھنٹی زور زور سے بج رہی ہے

ماں اپنے بیٹے کے سر کو اپنے ہاتھ سے اٹھاتی ہے اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں
وہ اپنے خون سے بھیگی ہے اس کے چاندی جیسے بال ہوا میں اڑنے لگتے ہیں

آہ میں اپنے بیٹے سے محبت کرتی ہوں گو کہ اس کا منہ خون آلود ہے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہے اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں
ہمدردی کس قدر کرتی ہے اور یتیموں اور بیواؤں کا دل غم سے بھر جاتا ہے

ہر روز میں بوڑھی ماں سے ملنے آتا ہوں اور چولہے کے قریب بیٹھ جاتا ہوں
وہ آلو کا سالن تیار کرتی ہے اور چولہے کا دھواں جو سندو کی طرح پھیلنے لگتا ہے

گو کہ وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے لیکن بہت سے یتیم بچے دیکھ بھال کے لئے اسے مل گئے ہیں۔

اے میرے بچو! تم اپنی چائے ختم کرو اور مجھ سے ملنے چلے آؤ

شاید فام دوئی کی نظموں میں امید و بیم کا بہترین امتزاج اس کی غنائیہ نظم THE WOUNDED SOLDIER میں ملتا ہے سادگی و پرکاری کے ساتھ وہ ایک دیہاتی گھرانے کی زندگی بیان کرتا ہے جو جنگ کی تباہیوں کا شکار ہے۔ بیوی بے قراری سے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے اور استعجابیہ انداز میں کہتی ہے کہ امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا؟

ایک دن سہ پہر کے وقت ایک لڑکی
چاولوں کا گٹھا ہاتھ میں لئے ہوئے نظر آئی
اس کے نازک بازوؤں کے لئے یہ بوجھ بہت تھا
اس کا کام ایک مرد کے کام کے برابر ہے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

اردو ادب میں افادی، مقصدی، اصلاحی، اخلاقی اور سیریل ادب کی تحریک نے جس ذہنی رویے کو جنم دیا تھا اس کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کا احساس اب عام ہو چلا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کے جس ادبی سرمائے کو مبالغہ، جھوٹ اور غلاظت کا پشتارہ سمجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں اس کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی معنویت کا ادراک جدید تنقیدی ذہن کے اہم ترین اکتسابات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں قدیم اردو داستانوں کی بازیافت ان کی پشت پر کام کرنے والے عوامل کا تجزیہ اور ان کی ادبی و تمدنی قدر و قیمت کا مطالعہ نئے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں جن اصحاب نے کیا ہے ان کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ داستانوں کے معنی خیز عناصر کی طرف جس شخص نے پہلے پہل توجہ دلائی وہ کلیم الدین احمد ہیں جنھوں نے اردو غزل کی ریزہ خیالی سے بدظن ہو کر اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا اور یہ لے ان کی تنقید میں اتنی بڑھی کہ انھیں پوری اردو شاعری میں "چند دھیموں اور پرزوں" کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آیا۔ کلیم الدین نے "اردو زبان اور فن داستان گوئی" لکھ کر گویا اپنی اس تنقیدی کج روی کا ایک طور سے کفارہ ادا کر دیا ہے اور میرے نزدیک ان کی یہ کتاب اردو تنقید میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کلیم الدین کے اس کام کو بڑے پیمانے پر ڈاکٹر گیان چند نے آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اردو کی نثری داستانوں کی چھان بین میں ان کی نظر بڑی گہرائیوں تک گئی ہے۔ ان کی یہ کتاب تحقیق و تنقید کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد داستانوں کا نیا مطالعہ ہماری تنقید و تحقیق کا ایک اہم شعبہ بن گیا ہے جس کے بعض مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اردو داستانوں کے مطالعے کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسن عسکری (انتخاب طلسم ہوش ربا)، ممتاز حسین (باغ و بہار کا نیا ایڈیشن مع طویل مقدمہ)، وقار عظیم (ہماری داستانیں) اور راز یزدانی مرحوم کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن کے متعدد مقالے داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا سے متعلق آجکل، نیا دور، نقوش اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ابھی چند ماہ پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب "باغ و بہار۔ ایک تجزیہ" شائع ہوئی ہے جو اس سلسلے کی تنقید و تحقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔

رجب علی بیگ سرور پر بھی مناسب توجہ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ضمیر حسن دہلوی کی کتاب "فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ" اور نیر مسعود رضوی کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ "رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے سرور کے سلسلے میں گذشتہ ایک صدی کے تنقیدی فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے استاد اطہر پرویز نے "فسانۂ عجائب" کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کے متن کی تصحیح کی ہے اور اس پر ایک طویل تنقیدی و تحقیقی مقدمہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی جلد ہی شائع ہو جائے گی اور اہلِ نظر سے خراج تحسین وصول کرے گی۔

داستانی ادب کی بازیافت کے سلسلے میں پچھلے دنوں ایک معرکے کی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "قصۂ مہر افروز و دلبر" ہے۔ اس کتاب کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین (ریڈر و صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد) کے سر ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آغا حیدر حسن صاحب کے ذخیرۂ کتب میں تھا جو انھیں ۱۹۲۹ء میں خانقاہ گوالیار کے سجادہ نشین حضرت سید علی شاہ قادری دہلوی ثم الگوالیاری معروف بہ حضرت جی نے

رئیس مینائی

غزل

آنگن میں چاند اور ستارے اتار دو
یہ رات تم بھی جاگ کے یونہی گذار دو

ماضی کے کتنے نقش ہیں دھند لے پڑے ہوئے
یادوں کے جھنڈ میں انھیں پھر سے سنوار دو

گاؤں میں اس کا نام ہے آوارہ بدچلن
تم اس کو دیکھ بھال کے بابا ادھار دو

مدت سے سطحِ آب یہ کیوں بے جمود ہے
پتھر اٹھاؤ، پھینک کے، اک نقش ابھار دو

کتنی کہانیاں ہیں ادھوری پڑی ہوئیں
پھر ان کے تانے بانے لہو سے نکھار دو

مقتل ہو کوئے یار ہو یا بیہودہ میکدہ
خیرات جس جگہ بھی ہو دامن پسار دو

نذر کیا تھا۔ اس قسم کی قلمی کتابیں اور بھی خاندانوں میں محفوظ ہوں گی لیکن ان کی ادبی، تہذیبی اور لسانی اہمیت کو پہچاننے کے لئے جس نظر کی ضرورت ہے وہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں عام نہیں ہے۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں ہمارے یہاں تحقیق کا میلان بہت تیزی سے بڑھا ہے لیکن اس سلسلے میں افسوسناک حد تک افراط و تفریط ملتی ہے۔ تحقیق کو بعض لوگوں نے ایسا سرخاب کا پر سمجھ لیا ہے جسے لگانے کے لئے ہر کس و ناکس مترددنظر آرہا ہے مگر اس گرم بازاری میں نہ تو اصلی اور جعلی سکوں میں تمیز کی جا رہی ہے اور نہ جنس اور کوڑے کا امتیاز رہ گیا ہے۔ کسی کتاب کا صرف غیر مطبوعہ یا قلمی ہونا یا طبع ہونے کے بعد نایاب یا کمیاب ہوجانا ہی اہم نہیں ہے، اس کی افادیت یا قدر و قیمت کو پرکھنے کے لئے بہت گہرے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے ورنہ اس کے بغیر تحقیق محض برائے تحقیق یا نقل نویسی ہوکر رہ جاتی ہے۔ بہت معمولی صلاحیت رکھنے والے حضرات جو تصنیف یا تخلیق کا اپنے آپ کو اہل نہ پاکر کسی چھپی ہوئی کتاب پر مرتب یا مولف کی حیثیت سے اپنا نام دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں اس سلسلے میں بہت پیش پیش ہیں۔ ضرورت ہے کہ سنجیدہ اہل قلم ہر طرح کی مروت اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس طرح کی خام اور فضول کوششوں کا جائزہ لیں کیونکہ اگر ان سے اغماض برتا گیا تو ان کے منفی اثرات معتبر اور بامقصد تحقیقی کارناموں کی طرف سے بھی پڑھنے والوں کے ذہن کو مشکوک بنا دیں گے۔ اس طور پر یہ فن جو اپنی جگہ پر بے حد کارآمد ہے پایۂ اعتبار سے گر جائے گا اور اس کو ہمارے ادب میں وہ جگہ نہ مل سکے گی جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے "قصہ مہر افروز و دلبر" کے نسخے کو جس دیدہ ریزی کے ساتھ پڑھا ہے اور خود نفس موضوع کے جن جن نازک پہلوؤں پر ان کی نظر پہنچی ہے اس کا اندازہ تو کتاب کو پڑھنے سے ہی ہوسکتا ہے۔ کچھ دن پہلے قاضی عبدالودود صاحب نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ کوئی کتاب کس طرح نہیں ایڈٹ کی جانی چاہئے اس کی ست اچھی مثال یہ کتاب فراہم کرتی ہے" میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر ہمارے تحقیق کے شوقین حضرات یہ اندازہ لگانا چاہتے ہوں کہ کس قسم کی کتابوں کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے اور ان کی معنویت اور اہمیت کو کس طرح اجاگر کرنا چاہئے وہ مسعود صاحب کی مرتب کی ہوئی یہ داستان ملاحظہ فرمائیں اور اس کے مقدمے کو غور سے پڑھیں۔

جیسا کہ مرتب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس کتاب کے قلمی نسخے سے بظاہر یہ پتہ لگانا آسان نہیں ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف کیا ہے مگر جو لوگ ترقیمہ وغیرہ سے آگے جاکر کتاب کے مطالب کی گہرائیوں میں جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ ایسی داخلی شہادتیں فراہم کرلیتے ہیں جن سے کتاب کے زمانے اور اس ماحول کا تعین ہوسکتا ہے جس میں وہ وجود میں آئی۔ چنانچہ مسعود صاحب نے تجزیے کے لئے اس کتاب کے دو پہلوؤں پر خاص طور سے غور کیا ہے۔ ایک تو خود اس کا موضوع اور اس قصے کی جزئیات و تفصیلات کے بیان میں اپنے دور کے تاریخی عوامل اور مظاہر سے اس کا گہرا تعلق دوسرے اس کی لسانی و اسلوبی خصوصیات۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ موصوف کو اس سلسلے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ غالباً ان کا رچا ہوا تنقیدی و ادبی ذوق اور اردو کے لسانی ارتقاء پر ان کی گہری نظر ہے ان کے تجزیے کے مطابق یہ کتاب اورنگ زیب کے بعد لگ بھگ محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ جزئیات و تفصیلات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف (عیسوی خاں بہادر) دلی کا رہنے والا ہے اور لال قلعے سے اس کا گہرا تعلق ہے دوسرے وہ جس ماحول کو پیش کر رہا ہے وہ زوال آمادہ مغلیہ تہذیب کا ماحول ہے کتاب کی زبان اور اسلوب کے سلسلے میں مقدمہ نگار کی یہ رائے دیکھنے کے قابل ہے۔

"اردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ پوری داستان بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے بلکہ جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا لکھوائی گئی ہے جملوں کا دروبست تحریر کا نہیں تقریر کا ہے جملہ ادا کرتے وقت مصنف کو نہ مبتدا کی خبر ہے اور نہ خبر کی، وہ "اور اور" کی تکرار سے فقروں کا تسلسل قائم رکھتا ہے"

"اس میں شک نہیں کہ خالص اسلوب کے نقطۂ نظر سے عیسوی خاں کی عبارت ٹکسال سے درست نہیں۔ شمالی ہند میں فارسی کے مقابلے میں جس زبان کو دربار نے ٹھکرا دیا تھا اور محمد شاہ کے عہد تک لائق اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ظاہر ہے اس میں ادبی تخلیق کرنا کس قدر دشوار طلب ہوگا۔ مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور نہ اردو شاعری کے رچے ہوئے اسلوب کی داغ بیل پڑی تھی۔ اس کے پیش نظر یا تو فارسی داستانیں تھیں یا بھگتی اور ریتی کال کی شاعری کے وہ نمونے جو زبان زد خلائق ہوچکے تھے چنانچہ انھیں روایات سے وہ اپنے ادبی اسلوب کے تانے بانے مرتب کرتا ہے۔ داستانیں عام طور پر برمحل اشعار سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ قصہ مہر افروز اس اعتبار سے

منفرد ہے کہ اس میں فارسی اردو یا ہندی کا
ایک بھی شعر یا دوھا درج نہیں کیا گیا ہے۔ اردو
اشعار کی غیر موجودگی سے اس کی قدامت اور
مسلم ہو جاتی ہے اور یہ قیاس کہ یہ قصہ محمد شاہ کے
عہد کی تصنیف ہو سکتا ہے صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اس
وقت شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی
جا رہی تھی البتہ فارسی اور ہندی اشعار سے اجتناب
حیرتناک ہے۔"

"قصہ کی زبان اکھڑی اکھڑی ہونے کے
باوجود تخیل کی بے پناہ قوت رکھتی ہے جو زبان کو
اسلوب کے نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مصروف
کار ہے۔ اس میں ندرت ہے نفی ہے، گہرائی اور
بینائی ہے، سادگی اور توانائی ہے۔ مصنف جو
کہنا چاہتا ہے بے محابا کہہ جاتا ہے۔ جو دکھانا چاہتا
ہے دکھا جاتا ہے اور نوک پلک سے درست
نہ ہونے کے باوجود ہم مصنف کی قوت اظہار
پر عش عش کر کے رہ جاتے ہیں۔ دراصل قصہ کی
زبان شمالی ہند میں پہلی بار اردو کا ادبی سطح پر
استعمال ہے اس لیے عیسوی خاں کی حیثیت ایک
بانیٔ اسلوب کی ہے جسے پہلی بار بول چال کی زبان کو ادبی
سطح بخشنے کا موقع ملا ہے۔"

"تبلیغ اسلام کا وہ جذبہ جو دیگر داستانوں کا
جزو لازم ہے اس قصے سے بالکل غائب ہے۔ یہ
خود اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ ایک ایسے
زمانے میں لکھا گیا ہے جب لال قلعۂ دہلی سے
روح عالمگیر پرواز کر چکی تھی۔"

"قصہ مہر افروز کی قدامت کا تعین اس
کی زبان کے تجزیے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک
طرف قصے کی زبان خسرو کے عہد کی زبان دہلوی
کی ترقی یافتہ شکل ہے تو دوسری طرف جہانگیری
عہد کے مصنف افضل کی "بکٹ کہانی" کی زبان
سے ان معنوں میں جدید ہے کہ اس میں برج بھاشا
کا پٹ کم پایا جاتا ہے۔ یہ شمالی ہند کے دو ہم عصر
مصنفین فائز اور فضلی کی زبان سے بھی مختلف
ہے اس لیے کہ یہ دونوں کتابی اور ادبی زبان
کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے برعکس عیسوی خاں
اس عہد کی بول چال کی زبان کو اپنے قصے کے
لئے منتخب کرتا ہے۔ بکٹ کہانی کی زبان میں ٹھیٹھ
اردو کے محاورے کا تعین نہیں ہو سکتا اس

کا مصنف ابھی تک ریختہ گوئی کی روایات کا
تتبع کر رہا ہے اس کے برعکس قصہ مہر افروز کی
زبان، زبان دہلوی کا نقش ثانی ہے جو شاہجہاں
کے ۱۶۴۸ء میں دار السلطنت آگرہ سے دہلی
منتقل کرنے کے بعد متشکل ہوتا ہے۔ اردو کا مرکز
ثقل ایک بار پھر برج بھاشا کے علاقے سے ہٹ
کر کھڑی بولی اور ہریانی کے علاقے میں آ جاتا
ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس انتقال سلطنت
کے دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں سترھویں
صدی کے نصف آخر میں ہی جدید اردو کا وہ
ڈول متعین ہوتا ہے جس کے پہلے نمونے ہمیں
دہلوی مصنفین فائز، فضلی اور عیسوی خاں
کے یہاں ملتے ہیں۔"

آگے چل کر مرتب نے اپنے مقدمے میں تفصیلی طور پر داستان
کی زبان اور اسلوب کی لسانی خصوصیات کو مع مثالوں کے
واضح کیا ہے۔ یہ مقدمہ تحقیق اور تنقید کے امتزاج کا ایک
مثالی نمونہ ہے جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

"داستان مہر افروز و دلبر" کی اشاعت کو اردو
تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک اہم واقعہ سے تعبیر کیا جائے
تو غلط نہ ہوگا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہمیں اپنے
ادبی اسالیب اور اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے میں
بڑی مدد ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ باغ و بہار اور دوسری
اہم کتابوں کے ساتھ اس داستان کو بھی ہمیں اپنے نصاب
کا ضروری جزو بنا لینا چاہیے۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گلزار خلیل۔ (مجموعہ کلام)

مصنف: خلیل احمد خلیل ہمدانی
مرتب: طفیل احمد تابش بیکانیری
ملنے کا پتہ آزاد منزل نزد مدینہ مسجد بیکانیر (راجستھان)
قیمت: تین روپے

قدیم اردو (جلد دوم ۱۹۶۷ء)

مدیر: ڈاکٹر مسعود حسین خاں
ناشر: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (آندھرا پردیش)
قیمت: تیرہ روپے

مراسلات

غالب کا اسلوب از شمس العلماء ذکاءاللہ دہلوی

رسالہ ماہ نو کراچی جنوری ۱۹۵۰ء میں "آئندہ ماہ کے متوقع مضامین" کی ایک فہرست شائع ہوئی تھی جس میں ایک عنوان یہ بھی تھا۔ غالب کا اسلوب از شمس العلماء ذکاءاللہ دہلوی۔

لیکن فروری ۵۰ میں یہ مضمون شامل نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں میں نے سید وقار عظیم صاحب سے جو اس وقت ماہ نو کے مدیر تھے دریافت کیا کہ انھوں نے مذکورہ مضمون کہاں سے شائع کرنا چاہا تھا۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے یہ مضمون پہلے کہیں شائع ہو چکا ہے۔ شاید میرا خط موصوف تک نہیں پہنچ سکا اس لئے میں اس مراسلے کے ذریعے وقار صاحب ہی سے نہیں دیگر اہل نظر سے بھی غالب کے بارے میں ذکاءاللہ کے مضمون کی نشاندہی کی درخواست کرتا ہوں۔

ماہ نو فروری ۵۰ء ہی میں ایک مضمون احتشام الدین دہلوی کا بعنوان "غالب کے چند غیر مطبوعہ لطیفے اور شعر" بھی شائع ہوا ہے اور مضمون نگار کے نام کے ساتھ مرحوم بھی چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کی اشاعت کے وقت مضمون نگار حیات نہ تھے میرا خیال ہے کہ یہ مضمون بھی پہلے کہیں چھپ چکا تھا اور ماہ نو میں اس کی اشاعت دوسری بار ہوئی تھی۔ اگر کسی صاحب کے علم میں پہلی اشاعت کا مقام ہو تو مطلع فرمائیں نیز میں احتشام الدین دہلوی کی تاریخ وفات بھی جاننا چاہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وقار عظیم صاحب۔ مظفر قریشی، شان الحق حقی اور دیگر اہل نظر اطلاع کی زحمت برداشت فرما کر مجھے نوازیں گے۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(ڈاکٹر علی خاں۔ رامپور رضا لائبریری رامپور یو۔ پی)

اردو کی ترقی کے لئے مختلف سطحوں پر کام کی ضرورت

میں خلیل الرحمن اعظمی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری غلط فہمی دور کردی نیز یکم فروری کے "ہماری زبان" میں رفتار کے کالم کے تحت اپنے پیش کردہ خیالات پہ غور و فکر کی دعوت دی میرے ردّ عمل کے متعلق ان کا قیاس صحیح ہے کہ تحریک دہلی کا اپریل کا شمارہ میرے سامنے تھا ان کے مشورے کے مطابق میں نے یکم فروری ۱۹۶۸ء کا 'ہماری زبان' ابھی دیکھا موصوف نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بلاشبہ قابل غور ہیں مشاعروں کی موجودہ فضا کی تصویر کشی میں انھوں نے غلط نہیں کی ہے۔ مشاعروں کی تمام فضا کو بدلنے اور انھیں زیادہ موثر اور کارآمد بنانے کی ضرورت کا احساس ہر سنجیدہ اور بالغ نظر اردو کے نام لیوا کو ہونا ہی چاہئے مجھے اس سے سو فیصد اتفاق ہے لیکن موصوف کی تحریر کی آخری عبارت یہ سمجھنے پہ مجبور کرتی ہے کہ وہ مشاعروں کی بجائے محض کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ میں بھی ایسے مشاعروں کے حق میں نہیں ہوں جن میں شعراء کی اکثریت محفل مشاعرہ کو محفل قوالی میں تبدیل کر دیتی ہو یا پھر وہ سماں پیدا کردیں ہے جس کی تفصیل موصوف نے مختلف مثالوں اور حوالوں کے ذریعہ پیش کی ہے لیکن میں جملہ معترضہ کے طور پر موصوف سے یہ ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ مدیر تحریک نے موصوف کی محولہ بالا تحریر (مطبوعہ یکم فروری ہماری زبان) اور 'گفتگو' شمارہ (۳) کے اداریہ بعنوان 'لحن داؤدی' سے مخصوص اقتباسات کیوں پیش کئے؟ بظاہر اس کا سبب یہ نظر آئے گا کہ دونوں اقتباسات میں چونکہ مشاعرے سے متعلق خیالات پیش کئے گئے ہیں اس لیے اردو شاعری کے مفاد کے پیش نظر قارئین تحریک کو ان خیالات سے روشناس کرانا ضروری سمجھا گیا۔ معلوم نہیں موصوف نے کیا سمجھا لیکن وہ حضرات جو تحریک دہلی کے مزاج اور رویے سے واقف ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ یہ محض دوستوں کو ٹکرانے کی ایک کوشش ہے۔

آخر مدیر تحریک نے ان ہی صفحات پر دوسرے اہم مسائل پر روشنی ڈالنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی؟

میرا خیال ہے کہ مشاعروں کے لئے زیادہ سے زیادہ چندہ دینے والوں میں بھی ایسے لوگ ملیں گے جن کی دلچسپی اردو زبان و ادب سے محض ظاہری ہوتی ہے وہ مشاعروں سے سستی تفریح حاصل کرنے کے علاوہ دراصل اردو زبان و ادب کے اہم مسائل کی طرف سے اردو والوں کی توجہ ہٹائے رکھنا چاہتے ہیں۔ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتیں بھی کم و بیش یہی کر رہی ہیں۔ کانگریس دور اقتدار میں یہی ہوا آج بھی وہی ہو رہا ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں کہ "مشاعروں کے ذریعہ اردو شاعری کے جو نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ قطعاً اس شاعری سے مختلف ہیں جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے لیکن کتابوں اور رسالوں کی سرپرستی کے بجائے کیوں ہم مشاعروں کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں اور کس لئے قوم و ملک کا لاکھوں روپیہ ہر سال ایسے شعراء پہ صرف کیا جاتا ہے جو اردو شاعری اور اردو زبان کو جی بھر کر رسوا کر رہے ہیں۔ ان مسائل پہ ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے"

موصوف نے بات بہت صحیح کی ہے کیا اچھا ہوتا کہ وہ اس مختلف شاعری کی طرف بھی کوئی اشارہ کر دیتے تاکہ یہ شاعری سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جاتا اور کتابوں اور رسالوں کا معیار بھی سامنے آجاتا۔ جہاں تک اردو کے مسائل پہ سنجیدگی سے غور کرنے اور ٹھوس عملی اقدام کی طرف متوجہ ہونے کا تعلق ہے عرض کرنے دیجئے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپس کے ذہنی اختلافات کو دور کرنے کی ضرورت ہے اس کے

ہی وہ احساس پیدا کیا جا سکے گا جو ہماری شخصیت کو جھنجھوڑ سکے اور وہ جذبہ جو آتش نمرود کا جواب پیدا کر سکے۔ یہ سارا کام کئی سطح پر ایک ساتھ کرنا ہوگا۔ بنیادی سطح پہ اردو کے شبینہ مکتب اور ابتدائی مدارس کا قیام ضروری ہے۔ اردو لوئر پرائمری، اپر پرائمری اور مڈل اسکول بھی قائم کئے جائیں۔ بنیادی مدارس کا قیام کوئی مشکل نہیں۔ صرف چند افراد کی تگ و دو اور کچھ پیسوں کی قربانی درکار ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر ہم تمام عمر بھی اردو کے مطالبات کے لئے لڑتے رہے اور اردو کے بنیادی سرچشموں پر توجہ نہ دی تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ آنے والی نسلیں اردو سے بکسر بیگانہ ہو جائیں اردو صحافیوں کو اس سلسلے میں اپنی تمام سیاسی مصلحتوں کو بھول کر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو عوام سے ان کا رابطہ براہ راست ہے اس لئے موثر طریقہ پر اس کام کو انجام دے سکتے ہیں اردو کے مختلف اداروں اور محافظ دستوں کو بھی اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ میں تو تبلیغی جماعت کے سربراہوں سے بھی یہی گذارش کروں گا کہ اپنے پروگراموں میں اردو مدارس و مکاتب کا قیام بھی شامل کرلیں تو انھیں حصول مقصد میں دوہری کامیابی ہاتھ آئے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخیں اردو کے بیشتر علاقوں میں پھیل چکی ہیں لہٰذا اس انجمن سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس طرح کا جذبہ پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت ہوگی۔ مختصر یہ کہ یہ کام ہماری پوری توجہ کا متقاضی ہے اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ اب تک جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ غلط تھا یا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ اردو کی لڑائی مختلف محاذ اور مختلف سطح پر لڑی جاتی چاہئے اردو کے تحفظ و بقا کے لئے جنگ کے پیمانے پر کچھ کرنا ضروری ہے۔ اردو ادیبوں کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ قدیم و جدید کی جنگ میں کہیں ایسے عناصر حاوی نہ ہو جائیں جو ہمارے درمیان اردو کے بنیادی مسائل کے معاملے میں بھی اختلافات پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت نیز اردو اخبارات و رسائل کے معیار کے متعلق خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے خیالات بجا اور قابل توجہ ہیں۔ اردو ادیبوں کو مشترکہ طور پر تیسری معیاری پبلشنگ کا کام شروع کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت اس طرح کے جتنے بھی اشاعتی ادارے ہیں انھیں اپنے طریقۂ کار میں مناسب تبدیلی لانے اور تقسیم کار میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(انیس امام)

تصحیح مسامحت آپ نے میرا جو مضمون (سانحہ پیدا گیا دستور ہند اور اردو) ہم جولائی ۸ ۹۸ کے ہماری زبان میں قومی آواز سے نقل کیا ہے اس میں ایک بڑی غلطی رہ گئی ہے، جو قومی آواز میں بھی تھی لیکن دوسرے دن اس کی تصحیح کر دی گئی تھی ممنون ہونگا اگر اگلے نمبر میں آپ کے یہاں بھی تصحیح ہو جائے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ ہماری زبان صفحہ کالم ۲ کی پانچویں سطر میں انگریزی اور سنسکرت کے بجائے اردو اور سنسکرت چھپ گیا ہے، جو غلط ہے۔ انگریزی کی جگہ اردو ہونا چاہئے جیسا کہ پہلے کی سطر میں ہے۔

(احتشام خیری)

انیس انور

مکتوب لندن

اردو برائے عبادت۔

گزشتہ ہفتہ کوسٹری کیتھیڈرل میں برطانوی تاریخ میں پہلی بار عبادت کے لئے اردو زبان کا استعمال کیا گیا۔ یہ اہتمام بھارت و پاکستان سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کے لئے خصوصی طور پر کیا گیا تھا۔ اس بابرکت تقریب میں تقریباً پانچ سو مسیحی شریک ہوئے اس اجتماع کے انعقاد کا سہرا ایک بھارتی مسیحی گروپ کے سر ہے۔

انتخاب مشرق،

کالا لوگ

جے۔ اے۔ بلبل لندن

لاکھ گورا لوگ میں چھ سات کالا لوگ ہے — لیکن آنکھ میں ملک کی بات کالا لوگ ہے
پھر محاذ جنگ کیوں کھولا گیا ان کے خلاف — سارے اخباروں کے عنوانات "کالا لوگ ہے"
کونسلوں، جلسوں، جلوسوں اور بازاروں میں پھیل — ایک ہیجان سا صبح و شام دن رات کالا لوگ ہے
رنگ لائے نہ کہیں یہ دن رات رنگ و نسل اب — وقت کے بدلے ہوئے حالات کا ذ لوگ ہے
کاموں نے فیکٹری میں یہ بیچ کی بات کی — آنکھ گورا لوگ ہے اور ہاتھ کالا لوگ ہے
شاہد لندن نے وعدہ آج پھر کل پر رکھا
ہے غلط فہمی اسے بد ذات کالا لوگ ہے

[انجمن] ترقی اردو بنارس کا جلسہ

[بنارس] انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا ایک جلسہ ۳۰ رجون کو منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔ (۱) انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا یہ جلسہ اردو زبان والے کا رپورٹرلیا [اردو] زبان میں عہدوفاداری کے مطالبہ پر گورنر اتر پردیش ڈاکٹر بی [گوپال] ریڈی صاحب کی لسانی پالیسی کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ جس کے [تحت] انھوں نے اردو داں نیز غیر ہندی داں کارپوریٹروں کی پریشانی کا لحاظ [رک]ھتے ہوئے ان کے جائز مطالبہ کو تسلیم کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس [منت]ظمہ گورنر موصوف کی وسیع النظری سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ حد بندی [کم]یشن کے سفارشات کا سے یہ بھی امید رکھتا ہے کہ وہ حد بندی کمیشن کے [س]فارشات نیز چیف منسٹرس کانفرنس ۱۹۶۱ء کے فیصلے کے پیش نظر [بن]ارس شہر کے ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اردو والوں کی تعداد کے کو حصہ [د]وسرکاری اعداد وشمار کے لحاظ سے ۱۷ فی صدی ہے اور ۱۹۶۱ء کی مردم [ش]ماری میں یقینی طور پر بڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں سرکاری نوٹسوں، ووٹر [لسٹ کی] فہرستوں اور راشن کارڈ وغیرہ پر اردو کے رجسٹر کی سہولتیں بہم پہنچانے [کے] احکام متعلقہ حکام کو صادر فرمائیں گے۔ تاکہ لسانی اقلیتیں مطمئن [ہ]وکر قومی یک جہتی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں اکثریت کے ساتھ [ش]امل ہو سکیں۔ یہ جلسہ کارپوریشن کو اردو درخواستوں کے قبول کرنے اور ان کے جوابات عرضی دہندہ کی درخواستی زبان میں دیئے جانے کے مطالبہ [پر عم]ل درآمد کرانے کے لیے گورنر صاحب موصوف سے مناسب اقدامات کرنے کی درخواست کرتا ہے کیوں کہ حکومت اتر پردیش نے گورنمنٹ آرڈر نمبری 3 6 3 (۰)-۱۰-۱-xx-549 مورخہ ۱۴ ر اگست ۱۹۶۳ء کے مطابق مذکورہ بالا اصول کے قابل عمل تسلیم کرلیا ہے۔

۲- انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا یہ اجلاس الحاج مولوی محمد اطہر صاحب ایڈوکیٹ کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ اور خداوند رب العزت سے دست بدعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(داتا رسول سکریٹری)

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی جانب سے شعرا کو استقبالیہ

کلکتہ ایران سوسائٹی میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے زیر اہتمام، فراق گورکھپوری اور دوسرے مہمان شعرا کو استقبالیہ دیا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب سید امیر رضا کاظمی نے فرمائی۔

فراق گورکھپوری نے اس موقع پر اردو کے ساتھ سلوک ناروا پر اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ شمالی ہندوستان میں جہاں کہ اردو کو نمایاں مقام حاصل تھا ہندی دوستوں نے ایسی چالیں چلیں کہ اردو خود بخود سسک سسک کر دم توڑ دے۔ کسی بھی ادب کو مذہب کا رنگ دے کر اسے ملامت بنانا بہت ہی خطرناک اور غلط ہے۔ جس طرح بنگلہ زبان بنگال کے ہر فرقہ کے لیے ہے ہندو مسلمان سب کی ایک ہی زبان ہے۔ اردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے۔ بار بار ہم یہی نعرے بلند کرتے رہیں گے۔

فراق صاحب نے اپنی تقریر میں پرزور الفاظ میں کہا کہ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف اردو کو مٹانے کی تمام تر کوششیں جاری ہیں اور دوسری طرف لوگ اردو کے ناولوں افسانوں اور شعرا کے مجموعوں کو دیوناگری رسم خط میں چھاپ کر کروڑوں روپیے کا نفع کما رہے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ اردو رسم خط کو جو ختم کرنا چاہتے ہیں ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے میں کافی دشواریاں ہیں۔ اردو رسم خط کو کسی بھی صورت میں بھی نہیں ختم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اردو کی کتابیں جب دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوتی ہیں تو پڑھنے والوں کے لیے بڑی دشواری ہوتی ہے وہ کتابیں ان کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ہندی پڑھنے والے اردو کا صحیح تلفظ ہی ادا نہ کرسکیں تو اردو کی تصانیف کو ناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے سے فائدہ؟ اردو کو ناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے کا خیال ہی بے تکا ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی ہندی رسم الخط کو بدلنے کی کوششیں نہیں ہوئیں جب کہ وہ جس طرح چاہتے کرتے مگر انھوں نے فیاضی و دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے فارسی و ہندی کے ساتھ اردو شامل کرکے نئی زبان "اردو" کو بیش بہا خزانہ بخش دیا۔

انھوں نے کہا کہ اردو کو ملت و دگی سے ضرور بچانا چاہیئے مہدی اردو سے محبت رکھنے والوں کو دونوں ہی رسم الخط پڑھنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ میں انگریزی کا بھی حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی ضروری ہے۔ انھیں باتوں کو رکھ کر انجمن ترقی اردو کو اردو کی ترقی کے لیے کام کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد مہمان شعرا فراق گورکھپوری، واقف مراد آبادی، دستور داحدی، پیام فتحپوری، نسیم فاروقی، کرشن بہاری، نور لکھنوی، ماجد سلیمان اور نفیس لکھنوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے علاوہ مقامی شاعروں میں ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی، منظر حیدری، علقمہ شبلی، اعزاز افضل اور وکیل اختر نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

(اے۔حمید)

یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان آئین کی زبانوں میں ہوں گے

نئی دہلی۔ مرکزی حکومت کی یہ تجویز ہے کہ کلرکی اور دوسری مرکزی ملازمتوں کے امتحان میں بیٹھنے والے امیدواروں کو سوالات کا جواب ان زبانوں میں سے کسی میں بھی دینے کی اجازت دیدی جائے جو دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج ہیں۔

وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے یاد دلایا کہ حال ہی میں،

پارلیمنٹ نے زبانوں کے بارے میں جو ریزولیوشن منظور کیا ہے اس کی رو سے صرف آل انڈیا اور اعلیٰ مرکزی ملازمتوں کے لئے آٹھ میں درج زبانوں کو نافذ کیا جائے۔ وزارت داخلہ کا ارادہ ہے کہ یہ اصول کلرکی اور لوور سبارڈینیٹ سروسز کے امتحانوں کے لئے بھی نافذ کیا جائے۔ یہ اسکیم جس قدر جلد ممکن ہوگا یونین پبلک سروس کمیشن کے مشورے سے شروع کی جائے گی۔ (ریاست)

فلموں میں اردو کی مقبولیت کا اعتراف

لکھنؤ: ہندوستان کی فلمی صنعت پڑھے لکھے لوگوں اور اہل علم کے حلقہ سے نکل کر عام لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی دلچسپیوں کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجہ کی فلموں کی تیاری کی امید نہیں کی جا سکتی"

یہ ہے وہ شکایت جو فلمی دنیا کی دو مشہور شخصیتوں سنیل دت اور عشق جنگ بہادر نے کل یہاں ایک اخباری نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے کی۔ انھوں نے فلمی صنعت کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اعتراف کیا لیکن صرف اس لئے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر سکیں انھوں نے اپنی اور کئی دوسرے فلمی صنعت کاروں کی (جن میں شانتا رام کا نام بھی شامل ہے) مثالیں پیش کیں کہ جب کوئی اعلیٰ درجہ کی علمی اور معلوماتی ہندی فلم تیار کی تو اس پر خسارہ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ جس طرح انھوں نے فلموں کی عوامی مقبولیت کا اظہار کیا اس کے لب و لہجہ میں غیر شعوری طور پر اردو کی مقبولیت اور دلعزیزی کا بھی ذکر کر ڈالا اور کہا کہ اس وقت ملک کے سارے فلمی حلقہ پر اردو شاعروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔" انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ اترپردیش میں قائم ہونے والے فلمی کارپوریشن کے ذریعہ ہندی شاعروں کی کمی کو دور کیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندی کے قومی زبان قرار دئے جانے کے بعد سے فلمی دنیا میں اس کا گھٹتا ہوا وقار بہت ہی تشویشناک ہے۔ (ریاست)

فلموں میں دیوناگری کے ساتھ اردو رسم خط کو نظر انداز کرنے کی مخالفت

بھوپال: یہاں کی مقتدر ادبی انجمن "حلقۂ ارباب ادب" کے ایک مخصوص جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی نے کہا کہ "میں قطعاً اس کے حق میں نہیں ہوں کہ فلموں کے ٹائٹل صرف دیوناگری رسم خط میں ہوں اور اردو کو نظر انداز کر دیا جائے۔ آپ نے کہا کہ یہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بہترین حل یہی ہے کہ ہندی اردو یا ہندوستانی زبان میں بنی فلموں کے ٹائٹل دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں دئے جائیں۔ اس جلسہ میں جناب جاں نثار اختر بھی شریک تھے اور انھوں نے بھی اس کی تائید کی۔ یہ جلسہ برقی ہاؤس میں منعقد ہوا۔ ساحر اور جاں نثار اختر نے اپنا منتخبہ کلام بھی سنایا۔ اس میں ساحر کی نامکمل نظم اور جاں نثار کی وہ رباعیات بھی شامل تھیں جن میں روایتی وصال و فراق سے ہٹ کر ازدواجی زندگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جلسہ میں اختر سعید، شاہد بھوپالی، اختر نظمی، سلطان حیدری، مظفر رئیس، ایم۔ اے شمیم نے بھی اپنا کلام سنایا۔ پروفیسر آفاق احمد نے "حلقہ" کی طرف سے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے درمیان وہ شعراء موجود ہیں جو ایک اچھے خوشحال سماج کی تشکیل کے لئے اپنے شعروں کی زبان سے مصروف ہیں۔ (نامہ نگار)

بنارس کارپوریشن میں اردو کا حق دینے سے انکار

وارانسی۔ شیام موہن سنگھ دال نے وارانسی کے میئر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ڈویژنل کمشنر برج پال سنگھ سیٹھی نے ان سے عہدہ اور رازداری کا حلف لیا۔ تقریب سگرا میں نگر مہاپالیکا کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔ میئر نے خود حلف لینے کے بعد ایلڈرمینوں اور کارپوریٹروں (سبھاسدوں) کو حلف دلایا۔ دو ایلڈرمینوں اور پندرہ کارپوریٹروں کو حلف نہ دلایا جا سکا کیونکہ ان کا اصرار اردو میں حلف لینے کا تھا۔ میئر نے کہا کہ چونکہ ریاست کی اور نگر مہاپالیکا کی سرکاری زبان ہندی ہے اس لئے حلف ہندی میں اور نگر مہاپالیکا ادھنیم کے مطابق ہی دلائی جا سکتی ہے۔ احتجاج کے طور پر مذکورہ ممبران واک آؤٹ کر گئے۔ (ریاست)

کسی بھی ہندوستانی زبان یا انگریزی زبان میں ممبر حلف اٹھا سکتا ہے

لکھنؤ: اترپردیش کی میونسپل کارپوریشنوں کے ممبر دستور ہند کی آٹھویں فہرست میں مندرج زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں، اردو میں بھی یا انگریزی میں حلف لے سکتے ہیں۔ کارپوریشنوں کے ممبروں کی حلف برداری کے طریقۂ کار سے متعلق جن نئے قواعد کے مسودے کا اعلان ریاستی حکومت کے ایک غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ کیا گیا ہے اس میں اس اجازت کا اندراج بھی ہے۔ (قومی آواز)

دہلی میں اردو کو دبانے کی ایک نئی کوشش

نئی دہلی: راجدھانی میں سہ لسانی فارمولا کے نفاذ کے ساتھ ساتھ جن سنگھ نے اردو کا حق دبانے کی پوری کوشش شروع کر دی ہے۔ چیف اگزیکٹیو کونسلر جناب وجے کمار ملہوترا نے راجدھانی کے مرکزی علاقہ میں سہ لسانی فارمولا نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ہے جس کے تحت ہندی لازمی زبان ہوگی دوسری (غیر ملکی) زبان انگریزی، روسی، جرمن یا جاپانی اور تیسری زبان کوئی ہندوستانی زبان مگر ترجیح جنوبی ہند کی کسی زبان کو ہوگی جن سنگھ اردو کو ہٹانے کے لئے جنوبی ہند کی کسی زبان کو پڑھانے کا نام لے رہی ہے اس کھلی اردو دشمنی کے سلسلے میں جب یہ سوال ہوا ہے کہ کیا مرکزی حکومت نے یہ بات مان لی ہے تو جن سنگھ کے لیڈر نے کہا کہ تعلیم ایک ریاستی اختیار کی چیز ہے مرکز کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ (قومی آواز)

تبصرے

اصغر عباس

جواہر لال نہرو — رادھا کرشنن کی نظر میں

شائع کردہ: پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی

قیمت: ایک روپیہ

زیر نظر کتابچہ RADHAKRISHNAN ON NEHRU کا اردو ترجمہ ہے یہ رادھا کرشنن کے ان پیغامات اور تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے پنڈت جی کے انتقال کے بعد مختلف موقعوں پر کیں۔ یہ تقریریں اور پیغامات مختلف عنوانات کے تحت دئے گئے ہیں جن سے قاری کو پنڈت جی کے کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان تقاریر اور پیغامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رادھا کرشنن پنڈت جی سے بے پناہ خلوص اور عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی سمت اور سطح سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ انھوں نے نہرو کے افکار کی وضاحت ان تقریروں میں جس طرح کی ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ نہرو نے یقیناً کوئی نئی طاقتور اور انقلابی چیز پیش کی جس کی بنا پر سترہ سال میں ملک نے مختلف جہتوں میں خاصی ترقی کی آزادی، جمہوریت، بقائے باہم، منصوبہ بندی، سماجی انصاف، سائنٹفک نقطۂ نظر وغیرہ کے خیالات تو خاصے پرانے ہو گئے ہیں لیکن ان خیالات کو زندگی کے قالب میں ڈھالنا ان میں تھرتھراہٹ پیدا کرنا ان چیزوں کو اس طرح پیش کرنا کہ یہ ہمارے حالات کے مطابق بن جائے اور یہ کہ بلند خیالات صرف لاحاصل ہی نہیں ہوتے بلکہ انھیں عمل میں بھی لایا جا سکتا ہے یہی وہ چیزیں تھیں جنھیں نہرو نے سوچا اور ان پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کی۔ نہرو میں یہ خوبی تو تھی ہی کہ وہ دھن کے پکے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر طرح کے لوگوں میں جوش و جذبہ بھی پیدا کر دیتے تھے۔ ان کی مقبولیت بھی ہر طبقہ میں تھی خواہ وہ خواندہ ہوں ناخواندہ ہوں عالی مرتبہ ہوں یا معمولی ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان کی رحلت سے ہر طبقہ میں ایک خلا محسوس کیا گیا چونکہ یہ تقریریں اور پیغامات خراج عقیدت کے طور پر ہیں اس لئے ان میں غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز نظر کی توقع مناسب نہ ہوگی لیکن یہ تقریریں پنڈت جی کی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں تقریروں کے چند عنوانات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آزادی دلانے والا عظیم انسان جدید ہندوستان اس کی یادگار ایک بہت بڑا انسان دوست، ان سے بڑھ کر ہمت دلانے والا اور کوئی نہیں، بچوں کا پیارا دوست، وغیرہ اس کتابچہ کے شروع میں پنڈت نہرو اور رادھا کرشنن کی ایک تصویر بھی ہے جس سے رادھا کرشنن اور نہرو کے قریبی اور پرخلوص تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ نہرو کے افکار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

صفحہ ۴ سے آگے

لڑائی میں جانے سے پہلے اس کا شوہر اس کام کو انجام دیتا تھا لیکن اس کی روانگی اس (لڑائی) کے لئے دل پر ایک بھاری (بوجھ) بن گئی ہے۔

دن اور ہفتے اسی طرح گذرتے گئے
ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے
فصلیں بھی آئیں اور چلی جاتی ہیں
لیکن کون جانتا ہے کہ اس کا شوہر (لڑائی سے) کب واپس آئے گا
ایک دن سہ پہر کے وقت
اس کا شوہر واپس آتا ہے اس کی ڈھیلی آستین ہوا میں اڑ رہی ہے
لڑائی میں اس کا ایک بازو کام آ چکا ہے
اس کے تمام احباب اس کی پذیرائی کر رہے ہیں کیونکہ اب وہ لڑائی سے واپس آ چکا ہے
اس کی بیوی اس کو پہلے سے بھی زیادہ چاہتی ہے
کھیت میں وہ دونوں ساتھ مل کر کام کرتے ہیں
دن اور ہفتے گذرتے جاتے ہیں
ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں
ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے اور چلی جاتی ہے
لیکن امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا
لیکن امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا۔

آج جبکہ امن کی باتیں صرف ہوائی ہیں عام زندگی کے سوال کا جواب صرف سیاسی مدبر ہی دے سکتے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلیشر سید حامد علی نے لیتھو کو پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57

REGD. NO. L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۳ – ۱۵۔۸۔۱

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

کیا اردو کا مسئلہ محض سیاسی ہے؟

آج کل کچھ لوگ باربار یہ بات دہراتے ہیں کہ اردو کا مسئلہ لسانی نہیں رہا، سیاسی ہوگیا ہے اور اسے سیاسی سطح پر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک سستی اور سطحی رائے ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ہے۔ اس کے بولنے والے ڈھائی کروڑ سے کم نہیں بلکہ تین کروڑ کے قریب ہوں گے۔ یہ ہندوستان کی ہر ریاست میں بولی جاتی ہے۔ مگر اس کے بولنے والے کسی ریاست میں اکثریت میں نہیں ہیں۔ ہاں اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش، میسور، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان، مغربی بنگال میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس کا ایک شاندار ادب ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں میں سبھی مذاہب کے لوگ مل جائیں گے گو مسلمانوں کی تعداد یقیناً غالب تعداد ہے مگر چونکہ مسلمان بھی ہندوستانی قوم کا ایک جز ہیں، اس لئے اس بات سے اردو کی قومی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اردو کو وہ سہولتیں نہیں ملتیں جن کی وہ ایک قومی زبان کی حیثیت سے مستحق ہے۔ اس کی تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے۔ اس کے چلن پر پابندیاں ہیں۔ اس کے اخباروں اور رسالوں کے خریدار کم ہیں۔ اس کی کتابوں کی نکاسی بہت کم ہوتی ہے اس کے ادیبوں اور شاعروں کی وہ ہمت افزائی نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان سب باتوں کے لئے اردو والے عام طور پر حکومت اور اکثریت کو الزام دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اردو کے معاملے میں حکومت اور اکثریت نے اپنا فرض انجام نہیں دیا۔ حکومت جمہوریت کے آئین کے مطابق چلنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ دستور سب کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ سکولرزم ہمارا مسلک ہے اور سوشلزم کی منزل ہماری منزل مقصود۔ اس لئے حکومت پر لازم آتا ہے کہ جو کہتی ہے وہ کرے، جو دعویٰ ہے اس کے مطابق عمل ہو۔ جو ہدایات اور اعلانات ہیں ان کی پابندی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ حکومت خود جمہوریت کے اصولوں کو پامال کرتی ہے۔ اکثریت اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کرتی ہے۔ اس لئے حکومت مورد الزام ہے، اکثریت تنگ نظر ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں اردو کی ترقی کیسے ہو۔ ہماری سیاست گمراہ ہے۔ اس گمراہ سیاست نے اردو کی حق تلفی کی ہے۔ یعنی جو پارٹیاں برسر اقتدار رہی ہیں انھوں نے اردو کی ترقی نہیں ہونے دی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ دوسری پارٹیاں لے لیں جو اردو کے معاملے میں زیادہ انصاف پسند معلوم ہوتی ہیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اردو کے دن پھر جائیں گے۔ اردو دوستوں کو چاہئے کہ ایسی پارٹیوں کو اقتدار دلائیں جو اردو کے ساتھ انصاف کریں گی۔ اردو کی تحریک کو اس لئے عوامی بنانا چاہئے کہ وہ احتجاجی ہو اور اس کا احتجاج سیاسی پارٹیاں محسوس کریں اور پھر اردو کے ساتھ انصاف بھی چناؤ میں ایک مسئلہ ہو۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اردو دوستوں کو سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ اردو کے حقوق کو منوانے کے لئے حکومت یا اکثریت یا عوام کو اپنے احساس سے باخبر نہیں رکھنا چاہئے۔ ہمیں جو حقوق جمہوریت نے دئے ہیں وہ سب استعمال کرنے چاہئیں مگر ہمیں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور ہماری رائے میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ بنیادی اہمیت اس چیز کی ہے کہ اردو دوستوں کو اپنی زبان کس حد تک پیاری ہے اور وہ اس کے لئے عملی طور پر کیا کرتے ہیں۔ اردو کے لئے جان دینے کی ضرورت نہیں اردو کے لئے زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے حقوق نہ ملنے پر حکومت یا اکثریت کو الزام دینے سے یا ماتم [illegible] حالات کا ماتم کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ آج کی دنیا میں ہر شخص خود غرض ہے اسے اپنے کام سے واسطہ ہے۔ انصاف ایک اخلاقی [illegible] کے کاروباری دور میں انصاف کا نام [illegible]

تعلیم کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی مگر افسوس کی یہ دا کم لوگوں کو ہے۔ آج ہر فرد اور جماعت کو خود وہ کام کرنا ہے جسے وہ ضروری سمجھتی ہے۔ اردو دوست اگر اردو کو عزیز رکھتے ہیں تو انھیں یا تو اپنے بچوں کو عام اردو اسکولوں میں پڑھانا ہوگا یا اگر اردو اسکول کا ریاست نے انتظام نہیں کیا ہے تو اپنے اسکول کھولنے ہوں گے اور یہ بھی ممکن نہ ہوا تو اپنے بچوں کو خود پڑھانا ہوگا یا ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ جز وقتی معلم انھیں پڑھا سکیں۔ اگر ہم دس برس تک اور صرف حکومت اور اکثریت کی زیادتیاں گنا تے رہے اور اردو پڑھانے کے لئے خود ہم نے کچھ نہیں کیا، تو اردو کا خدا ہی حافظ ہے۔ اگر ہم اردو کی کتابیں اور رسالے صرف تحفے میں پڑھتے رہے اور کتاب یا رسالہ یا اخبار خریدنا ہم نے اپنا فرض نہیں سمجھا تو یہ اخبار اور رسالے ترقی کیسے کریں گے۔ اگر ہم نے اپنے بچوں کو کم عمری میں اردو نہیں سکھائی، اپنے ادیبوں اور شاعروں سے واقف نہ کرایا تو آگے چل کر ان کا ہمارے ادب سے اور ہماری تہذیب سے تعلق کیا ہوگا۔ اس لئے اردو کے لئے اصل اور بنیادی کام ہمیں خود کرنا ہے یہ اصلی اور بنیادی کام اردو کی تعلیم کا ہے اردو بھی ابتدائی تعلیم کا۔ ہم ایسے کتنے ہی لوگوں کو جانتے ہیں جو پلیٹ فارم پر اردو کے لئے تقریریں کرتے ہیں۔ حکومت کو سخت سست سناتے ہیں مگر اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھیں اردو نہیں آتی۔ اگر کوئی کام ضروری ہے تو اسے خود کرنا چاہئے اس میں کوئی سیاست نہیں ہے [illegible]

برہم ناتھ دت

طبل

(۱) سنو! سنو! قدموں کی چاپ سنو!
ہتھیار بند بہادروں کی للکار سنو
دیکھو! دیکھو! قومی لشکر کی قطار بندی دیکھو!
طبل بہ بانگ دہل کہہ رہا ہے
"آؤ بہادرو آؤ!
جوہر مردانگی دکھاؤ!"

(۲) متذبذب دل نے کہا:-
"زندگی کا مقصد کشت و خون تو نہیں!
کھیتوں کو پانی کون دے گا؟
فصلیں کون کاٹے گا؟"
مگر طبل کی پکار تھی:
"آؤ! بہادرو آؤ!
تیغ کے جوہر دکھاؤ
خون سے آبیاری کرو"

(۳) مضطرب دل نے کہا:-
"جنگ جیت بھی لی تو کیا حاصل؟
دشمن پچھاڑ بھی لیا تو شر کا کیا علاج؟"
مگر طبل کی پکار تھی:-
"آؤ بہادرو آؤ!
تمہیں اجداد کی قسم!
تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا"

(۴) مغموم دل نے کہا۔
"توپوں کی مار، بموں گولیوں کی بوچھار
جب اپنوں کو فنا کر دے گی تو چین کہاں؟
بیواؤں کی سینہ کوبی، یتیموں کی بکا
یہ ہولناک منظر کس سے دیکھا جائے؟"
مگر طبل کی پکار تھی:-
"آؤ! بہادرو آؤ!
جیالے کی موت پست ہمتی کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے"

(۵) بعض تذبذب میں تھے، بعض امید و بیم میں
بعض اعتماد سے بڑھے بعض نیم دلی سے
مگر جب طبل پر چوٹ پڑی اور یہ پکار اٹھی
"آؤ! آؤ! وطن کے سپوتو آؤ!
تو طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ طبل خاموش ہوگیا
اور سب بیک زبان بول اٹھے
"لو! ہم آئے! لو! ہم آئے"

جس کی عملی صلاحیت اتنی کم ہے وہ اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرلے تب بھی یہ بات کاغذ پر ہی رہے گی۔ ہاں اردو والے خود اپنے بچوں کو اردو بہر حال پڑھائیں گے تو یہ بچے اردو کے لئے تمام حقوق بھی حاصل کرلیں گے آج کی سیاست اقتدار کے لئے ہے اردو کا مسئلہ خدمت کا مسئلہ ہے اردو کو اقتدار نہیں چاہئے ٹھوس اور پر خلوص خدمت چاہئے۔

نیپال نے اردو کو نصاب میں شامل کرلیا

کھٹمنڈو۔ نیپال نے اردو کو نصاب تعلیم میں شامل کرلیا ہے۔ میٹریکولیشن کے نصاب میں اردو کی جو کتاب رکھی گئی ہے اس کا نام "انتخاب نثر و بوستان نظم" ہے، اس کتاب کے مولف ایس، ایس، صالح ہیں اس کی اشاعت ہندوستان میں ہوئی ہے۔ (قومی آواز)

برطانیہ میں اردو اور ہندی میں پوسٹر

برمنگھم:- تفریحوں اور تماشوں کا اہتمام کرنے والی ایک جماعت یہاں رہنے والے ہندوستانی اور پاکستانی عوام کے لئے ہندی، اردو اور بنگال میں پوسٹر چھاپ رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مقامی حالات سے ان کو دلچسپی پیدا ہو یہ پوسٹر جناب پرماننت شرمانے تیار کئے ہیں جو ایک مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں مترجم ہیں انھیں اس لئے یہ کام سونپا گیا کہ ہندوستانی اور پاکستانی ان تفریحوں اور تماشوں میں شرکت کریں اور کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔

(ریاست)

احمد لاری

بیگم حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اگر بیگم حسرت، بیگم ابو الکلام آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے ابو الکلام آزاد "الہلال" اور "البلاغ" نکالتے رہتے اور جواہر لال نہرو زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے یہ تینوں عورتیں پیکر ایثار و قربانی تھیں اور انھوں نے زندگی کے ہر مرحلے میں اپنے خاوندوں کی مکمل رفاقت کی۔ میں اس صحبت میں بیگم حسرت موہانی کا مختصر تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

عبد الشکور صاحب نے اپنی تالیف "حسرت موہانی" میں رسالہ رہبر نسواں کے نومبر ۱۹۴۳ء کے شمارے سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہ اقتباس ذیل میں درج ہے۔

> "محترمہ نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیر حسن موہانی مرحوم، جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، رائچور (ریاست حیدر آباد) میں وکیل ہائیکورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔ زمانہ دور تربیت میں آپ کا خاص مشغلہ تھا کہ بستی مادہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔"[1]

نشاط النساء بیگم مولانا حسرت موہانی کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں اور ان کی قریبی عزیز تھیں۔ نشاط النساء بیگم کے والد حسرت کے ماموں بھی تھے اور پھوپھا بھی چونکہ اس خاندان میں آپس ہی میں شادی بیاہ کا رواج تھا، اس لئے نشاط النساء بیگم اور حسرت میں اور بھی قرابتیں تھیں، جن پر حسرت نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[2]

نشاط النساء بیگم کی شادی حسرت کے ساتھ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ علی گڑھ چلی گئیں اور ۱۹۱۹ء تک علی گڑھ میں قیام پذیر رہیں۔ حسرت نے جب ۱۹۲۰ء کے شروع میں کانپور کو اپنا مستقر بنایا تو ان کے ساتھ وہ بھی کانپور منتقل ہو گئیں وہ صحیح معنوں میں حسرت کی شریک حیات تھیں۔ حسرت کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں وہ پورے طور پر ان کی شریک کار نہ رہی ہوں۔ حسرت کے قید و بند کے ایام میں ان کے مقدمات کی پیروی پریس کا بندوبست، تجارت کا انتظام، دواوین کی ترتیب و اشاعت الغرض ہر کام انھوں نے حسن و خوبی انجام دئے۔

سیاسی کاموں میں بھی بیگم حسرت پورے طور پر حسرت کی رفیق کار تھیں۔ وہ کل ہند کانگرس کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں اور حسرت کے ساتھ سیاسی جلسوں میں برابر شرکت کرتی تھیں[1]۔ ۱۹۲۵ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انھوں نے حسرت کے ساتھ مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت کی تھی اور اس جلوس کے روکے جانے پر پنڈت جواہر لال نہرو کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ اس واقعے کی تفصیل مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے الفاظ میں سنیے:-

> "۱۹۲۵ء (میں) کانگرس کا سالانہ اجلاس مسز نائیڈو کی صدارت میں کانپور میں ہو رہا تھا۔ مولانا حسرت اور بیگم حسرت مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ جب کانگرس کے پنڈال کے قریب یہ جلوس پہنچا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کانگرس رضا کاروں کی کمان کر رہے تھے اس جلوس پر لاٹھی چارج کرنے کی دھمکی دی۔ اس پر مرحومہ بیگم حسرت موہانی نے بڑھ کر جواہر لال نہرو کے منہ پر طمانچہ لگایا اور نادری حکم کی بدتمیزی پر سرزنش کی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور یہ جلوس کانگرس کے اجلاس میں شامل ہو گیا۔"[2]

حسرت کی طرح بیگم حسرت بھی مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھیں وہ نماز روزہ کی بچپن سے پابند تھیں۔ انھوں نے چار حج بھی کئے (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء) انھیں حضرت غوث پاک سے بڑی عقیدت تھی اور وہ حسرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ عبد الوہاب فرنگی محلی کی مرید بھی تھیں[3]

بیگم حسرت کا ادبی ذوق بھی بہت بلند تھا۔ حسرت کے دواوین کی ترتیب و اشاعت کے علاوہ ان سے دو مختصر کتابیں "سفرنامہ عراق"

---

[1] عبد الشکور، حسرت موہانی (اشاعت سوم)، ص ۱۱۷

[2] حسرت موہانی، مقالہ "بیگم حسرت موہانی" موشوعہ اردوئے معلی، شمارہ اگست تا اکتوبر ۱۹۳۰ء ص ۴۔

---

[1] عبد الشکور، حسرت موہانی (اشاعت سوم)، ص ۱۱۷ و ۱۱۸

[2] جمال میاں فرنگی محلی مقدمہ "کلیات حسرت موہانی" (اشاعت سوم)، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ص ۳۰

[3] نعیمہ بیگم، حسرت گھر کی چہار دیواری میں، ص ۳۰

اور "سفر نامہ عراق" بھی یادگار ہیں۔ یہ کتابچے دراصل خطوط کے مجموعے ہیں جو انھوں نے حج کے سفر کے دوران اپنی دختر نعیمہ بیگم کو لکھے تھے۔ "سفر نامہ حجاز" میں ۱۹۳۵ء کے سفر حج کا بیان ہے۔
۱۹۳۶ء میں حسرت اور بیگم حسرت نے خشکی کے راستے عراق ہو کر حج کا سفر کیا تھا۔ "سفر نامہ عراق" اسی سفر کی روداد ہے[1]
بیگم حسرت نہایت شریف، وفادار، جری، مستقل مزاج اور خود دار عورت تھیں۔ حسرت کی پہلی گرفتاری (۲۳ رمئی ۱۹۰۸ء) کے بعد انھوں نے پردہ ترک کر دیا۔ لیکن وہ نہایت سادہ اور پردہ پوش لباس میں باہر نکلتی تھیں[2] حسرت کے ایام قید و بند میں انھوں نے جس جرأت و استقلال اور خودداری کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ذرا مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ حسرت کی دوسری گرفتاری کے بعد پنڈت کشن پرشاد کول نے ایک موقع پر بیگم حسرت کو مالی امداد کی پیش کش کی تھی، مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا[3] یہ واقعہ ان کی خودداری اور استقلال کی ایک روشن مثال ہے۔
حسرت نے اپنے ایک مضمون میں بیگم حسرت کی سیرت کا جو خاکہ پیش کیا ہے اسے انھیں کے الفاظ میں سنیے:

"خدا گواہ کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، محبت و مروت، فہم و فراست، جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا، حسن عقیدت، صدق نیت و خلوص عبادت، حسن خلق، صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھکر عشق رسول اور محبت حضرت حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کے برابر بھی قرار دے سکیں"[4]

مولانا حسرت کے لئے تو بیگم حسرت کی سیرت کی بلندی اور کردار کی عظمت کا اعتراف کرنا فطری تھا۔ لیکن دوسرے معاصر مشاہیر جیسے مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، خواجہ حسن نظامی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی بیگم حسرت کے جرأت و استقلال، عزم و ہمت اور وفاشعاری کی بڑی تعریف کی ہے۔ طوالت کے خیال سے میں یہاں مولانا محمد علی کے ایک مراسلہ خواجہ حسن نظامی کے ایک مضمون اور جواہر لال نہرو کے ایک پیغام سے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

"مگر بھائی حسرت سے کہہ دیجیے کہ برادرم باوجود ہمت و استقلال کے تمہارا مرتبہ ہماری نظر میں ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں بظاہر تم سے بھی بڑا دل موجود تھا اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال جرأت و حوصلہ کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر نہ دے سکتے تھے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہیں دیا۔"[1]

"حسرت کی بیوی مسلمانانِ ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے ایام بلا میں ایسی وفاشعاری اس عورت سے ظاہر ہوئی جیسے سیتا جی نے رام چندر جی کی تھی"[2]

"مولانا کی بیوی ایک نہایت دلیر خاتون تھیں جن کی ہمت کی میں بہت تعریف کرتا ہوں"[3]

"ایک طویل عرصے تک بیمار رہنے کے بعد بیگم حسرت ۱۸ راپریل ۱۹۳۷ء (مطابق ۲۵ رمحرم ۱۳۵۶ھ) کو داصل بحق ہوئیں[4]۔ ان سے ایک لڑکی نعیمہ بیگم یادگار ہیں جو اس وقت اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ بیگم حسرت کی وفات کے بعد حسرت نے دو نہایت پردرد غزلیں کہی تھیں۔ جو ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں ان غزلوں کے مطلعے ذیل میں درج ہیں ؎

وہ کیا خواب میں نہ آئے شرم انھیں ہو نہ روٹھ جانے کی

عاشق کا حوصلہ بیکار رہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

---

[1] حسرت موہانی، مقدمہ سفر نامہ عراق "مولفہ بیگم حسرت موہانی، ص ۲ ("سفر نامہ حجاز" راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کا ذکر حسرت نے سفر نامہ عراق" کے مقدمہ میں کیا ہے)

[2] سید سلیمان ندوی مقالہ "حسرت کی سیاسی زندگی"، موشولہ "نگار" لکھنؤ (حسرت نمبر)، ص ۱۱۸

[3] پنڈت کشن پرشاد کول مقالہ "حسرت موہانی کی شخصیت" موشولہ "نگار" لکھنؤ (حسرت نمبر) ص ۵۹

[4] حسرت موہانی مقالہ "بیگم حسرت موہانی" موشولہ اردوئے معلیٰ شمارہ فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء ص ۱۔

[1] مولانا محمد علی کا خط بیگم حسرت موہانی کے نام، از چھندواڑہ مورخہ ۲۲ رفروری ۱۹۱۸ء (اصل خط مولانا خیر بھوروی صاحب کے پاس محفوظ ہے)

[2] خواجہ حسن نظامی مقالہ "مشاہیر ہند" موشولہ درویش جنتری ۱۹۲۳ء بحوالہ "کتابی دنیا" کراچی، شمارہ جنوری فروری ۱۹۶۷ء، ص ۲۴

[3] جواہر لال نہرو کا پیغام بنام حسرت میموریل سوسائٹی کانپور بحوالہ نعیمہ بیگم۔
حسرت گھر کی چہار دیواری میں ص ص ۲۳ و ۲۴

[4] حسرت موہانی، مقالہ "بیگم حسرت موہانی"۔ موشولہ اردوئے معلیٰ شمارہ فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء ص ۱۔

ہندی میں ڈھالے ہوئے جدید اصطلاحات کا استعمال سارے ہندوستان میں مقبول عام نہ ہو جائے۔ ہندی پھر بھی سارے ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان ہے مگر نہ تو اردو کو اور نہ کسی دوسری علاقائی زبان کو وہ درجہ حاصل ہے جو ہندی کو۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کے تعلیمی نصاب میں اگر ہم اردو کی ہندی اصطلاحات کسی طرح شامل بھی کر لیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور کہاں اور کس طرح ان کے استعمال کا موقع مل سکے گا اور ایسے طلبہ کی کھپت کہاں ہوگی۔ یہ عملی دشواریاں ہیں اس لئے قبل اس کے کہ زبان اردو میں ہم بلند پردازی اختیار کریں ان مشکلات پر غور کر لینا ضروری ہے۔ بلند پردازی سے میرا منشا زبان کو فصیح و بلیغ بنانے کا ہے اور تمام ٹکنیکل اصطلاحات کا رجحان اردو میں ہونے کا ہے اور اگر بہ لحاظ حالات زمانہ یہ ممکن نہیں ہے تو سوائے اس کے کہ زبان کو سیدھا سادہ اور عام فہم بنائے رکھنے کے دوسری صورت نہیں ہے۔ سہولت بھی اسی میں زیادہ ہوگی اور زبان اردو کا وجود برقرار رہ سکے گا۔

جامعہ عثمانیہ میں جو کچھ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کا کام کیا گیا تھا وہ سب ایک قسم کا نقلی کام تھا۔ اور نقلی کام کی نہ تو وہ قدر ہو سکتی ہے اور نہ اس قدر مفید ہو سکتا ہے جس قدر کہ اصلی کام۔

آئندہ واقعات جو رونما ہونے والے ہیں ہم کو ان پر بھی غور کر لینا چاہیے مثلاً ہر صوبہ یا اسٹیٹ میں اب جب کہ علاقائی زبان پر زور دیا جا رہا ہے تو ان حالات میں آئندہ چل کر اردو زبان میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوں گی وہ اس طرح کہ ہر اسٹیٹ کی اردو زبان میں کچھ نہ کچھ علاقائی زبان کے الفاظ مل جل جائیں گے اور ایک اسٹیٹ کے مقابلہ میں دوسری اسٹیٹ کی زبان اردو میں کچھ نہ کچھ فرق ہوگا۔ مثال کے طور سے آندھرا پردیش کو لیجیے۔ یہاں اردو زبان میں بہت کچھ تلنگی الفاظ شامل ہو جائیں گے اور تامل ناڈ کی اردو میں تامل الفاظ ہوں گے۔ اردو از خود کوئی خالص زبان نہیں ہے اور اس کو وسعت دینے کے لئے علاقائی زبانوں کے الفاظ مل جل جانا کوئی نئی بات نہ ہوگی اور نہ اس کو کوئی طاقت روک سکے گی۔

بجائے اس کے کہ ہم مخصوص اردو کے واسطے کوئی علیحدہ یونی ورسٹی یا بڑے بڑے کالج قائم کرنے کی سوچیں ہم کو پہلے بنیاد کو مضبوط بنانا ہے تاکہ سیدھی سادی عام فہم زبان اردو جو اس وقت رائج ہے اس کا وجود قائم رہے۔ اگر بنیاد ہی مضبوط نہ ہوگی تو علیحدہ یونی ورسٹی یا کالجوں کے قیام کا کیا نتیجہ ہوگا اور جہاں سے نکلے ہوئے طلبہ کی کھپت کے مواقع کیا ہوں گے؟

بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسٹیٹ کی ہر یونی ورسٹی اور کم از کم ہر کالج میں ایک شعبہ اردو مضمون کا رہے اس طرح دائرہ وسیع ہوگا اور ہر شہر کے ہر محلہ میں کم از کم ایک اردو مکتب قائم کیا جائے۔ اردو پڑھانے کے لئے کچھ والنٹیرز بھی پیدا کئے جائیں اور حکومت سے امداد بھی حاصل کی جائے۔ کچھ ایسے رسالوں کی بھی اشاعت کی جائے جن کے ذریعہ اردو کی تعلیم ہر گھر کے بچوں کو دی جائے تاکہ اردو کا ذوق شوق عوام الناس میں رہے اور جو لطف عوام کو سنیما گھر میں یا ریڈیو پر رکارڈ سننے میں آتا ہے وہ برقرار رہے۔ (مرزا حبیب اللہ بیگ)

ایڈیٹر ہماری زبان کے نام

۱۔ اردو میں یورپی زبانوں کے ادب کے انتقال کی رفتار اطمینان بخش ہے لیکن دوسری زبانوں کے معاملہ میں یہ بات نہیں ہے۔ خصوصاً ترکی ادب (اور جاپانی و عربی وغیرہ بھی) ضرورت ہے کہ اہل زبان اس طرف توجہ کریں۔

۲۔ انجمن کے مرحوم رسالہ سائنس کا دوبارہ اجرا وقت کی اہم ضرورت ہے کہ اردو کو آخر صرف شعر و ادب ہی جاندار نہیں بناسکتے! بلا تاخیر اس پر توجہ دینی چاہیے۔

۳۔ ۸ رجون کے "میرا صفحہ" کے تحت آپ نے میرے دل کی بات کہی کہ اپنے ملک کی علاقائی زبانوں کے ادب کی اردو میں نمائندگی خاطر خواہ ہونی چاہیے۔ ریاستی انجمنوں کو یہ کام فوری شروع کرنا چاہیے۔

۴۔ آئے دن مشاعرے اور جلسے منعقد ہوا کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اردو کی تاریخ اور اردو کی ترقی میں غیر مسلموں کا حصہ کے عنوان سے علاقائی زبانوں میں مختصر کتابچے شائع کروا کر مفت تقسیم کروانے چاہئیں۔ کہ اسی ذریعہ سے غیر اردو داں لوگ اردو دانوں کے موقف کو ٹھیک طور پر سمجھ سکیں گے۔ یہ ایک ٹھوس خدمت ہوگی اور وقت کی پکار بھی یہی ہے۔ (ابن غوری دکنی)

ایک استفسار کے جواب میں

مبارز الدین صاحب کے استفسار کے سلسلے میں عرض ہے کہ ان کی مطلوبہ نظم حکیم ناصر خسرو (۱۰۰۵ء۔ ۱۰۸۰ء) کی ہے جو "دیوان قصائد و مقطعات حکیم ناصر خسرو" میں درج ہے دیوان میں اس نظم کا کوئی عنوان نہیں ہے اور متفرقات نامی باب میں درج ہے طہران میں شائع شدہ دیوان کی کاپی آصفیہ کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نظم کا نہایت عمدہ انگریزی ترجمہ پروفیسر ہادی حسن مرحوم نے کیا ہے جو ان کی A GOLDEN TREASURY OF PERSIAN POETRY میں درج ہے۔ یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(حسن اسیم)

مراسلات

مولوی عبدالحق کی بیوی

آج (۵ رجولائی) مولوی صاحب مرحوم کی بیوی کے شوہر کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ ہارون احمد جو ہاپڑ کے رہنے والے ہیں اور عرف عام میں ڈپٹی صاحب مشہور ہیں چھٹی جماعت تک پڑھا ہے اور مولوی صاحب کے چلے جانے کے بعد سے بیکار ہیں۔ اس وقت اپنی عمر ۴۸ سال کے قریب بتاتے ہیں۔ جب ۴۷ء میں انجمن کے دفتر (واقعہ کوٹھی ڈاکٹر انصاری دریا گنج) پر حملہ ہوا تو ان کا بیان ہے کہ وہ دفتر میں موجود تھے اور یہ کہ دریا گنج کے لوگوں نے فسادیوں کو منتشر کر دیا اور وہ لوگ سوائے باہر کے کواڑوں کو نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ مولوی صاحب ان کا بیان ہے اس وقت قائم گنج (ذاکر صاحب کا قصبہ) کے دورے پر تھے اور دفتر کے انچارج اس وقت ہاشمی صاحب تھے۔

ان سے مزید معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے ایک بھائی ضیاء الحق صاحب تو تھے ہی، ایک چھوٹے بھائی احمد حسن بھی تھے جو سیہور میں انجینیر تھے اور ان کا بیٹا بھوپال میں ایگزیکیٹیو آفیسر تھا۔ مولوی صاحب کے بھانجے شیخ حامد حسن صاحب محلہ قانون گویان میں اب بھی رہتے ہیں جن کے قریب ہی مولوی صاحب کا اپنا آبائی مکان بھی ہے جس میں ایک پنجابی سوداگر شیخ عبدالسلام رہتے ہیں۔ ہاپڑ میں اب بھی ۲۱-۲۲ ہزار مسلمان ہیں پاکستان ادھر سے کم ہی لوگ گئے۔ ان کے بقول تو صرف سات۔ جن کے وہ نام تک بتاتے تھے!

لیکن سب سے زیادہ معرکہ کی بات جو اپنے ڈپٹی صاحب نے بتائی وہ یہ بھی کہ (ڈپٹی صاحب) ہارون احمد صاحب کی والدہ سعیدہ کے انتقال کے بعد جب راوی کی عمر ڈھائی تین سال کی رہی ہوگی، راوی کے والد نے ایک اور شادی کی۔ ہاں یہ بات میں نے ذرا قبل از وقت شروع کر دی اصل میں راوی میرے پاس آئے تو اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ میں مولوی عبدالحق صاحب کا عزیز ہوں۔ اس بارے میں میں نے مزید تفصیل چاہی تو کہا یا کہ وہ میرے نانا ہوتے تھے۔ اب صرف نانا سے میرا کام تو نہیں چلتا تھا میں نے اور کریدا تو رشتہ خاصا نازک نکلا۔

کہ مولوی صاحب نے شادی کے چند ہی دن بعد اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور راوی کے بقول ان کے والد سے کہا کہ تم شادی کر لو انھوں نے شادی کر لی کیونکہ ان کی پہلی بیوی کا کچھ ہی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا میں نے پوچھا مولوی صاحب نے طلاق کیوں دیدی۔ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ ناچاقی ہو گئی تھی مگر ناچاقی کی وجہ؟ انھوں نے بیان بدل کے اس طرح تصریح کی کہ مولوی صاحب کے والد شیخ علی حسینی صاحب نے بالا ہی بالا شادی طے کر دی تھی مولوی صاحب حیدرآباد میں رہتے تھے شادی ہوئی دو تین روز ہاپڑ میں ٹھہرے پھر بیوی کو ساتھ لے جانے کے لئے کہا جس پر ان کے سسر شیخ محمد الیاس رضامند نہیں ہوئے مولوی صاحب نے کہا میں گھر داماد تو ہونے سے رہا۔ اور طلاق دیدی! ان خاتون کا نام ذکرالنساء تھا جن کے انتقال کو راوی کے بقول چوتھا برس ہے۔ راوی کے والد کے انتقال کو نواں برس ہے اس شادی پر راوی کے بقول مولوی صاحب ان کے والد سے بے حد خوش تھے۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان سب کچھ پوچھنے کے بعد بھی۔ اب جب میں نے اپنے نوٹس دیکھے تو راوی کے والد کا نام پوچھنا بھول ہی گیا جو اگلی ملاقات میں پتہ چل سکے گا جو دیکھیے کب ہو۔ ایک ضروری بات نہ رہ بھی ہے کہ راوی بظاہر تو معتبر ہی معلوم ہوتے تھے لیکن ۴۷ء کے بعد سے ان کا حال اور مشغلہ شاید خاص معتبر نہیں اس لئے!!!

(از "عرب")

اردو دوستوں سے سوال

ہماری زبان جلد ۲۷، شمارہ ۵ (۲۰) مورخہ ۲۲ر مئی ۱۹۶۸ء میں اداریہ بعنوان "اردو دوستوں سے خطاب" دلچسپ ضرور ہے مگر اس سوال سے متعلق چند اہم امور قابل توجہ بھی ہیں۔ اداریہ میں یہ لکھا ہے کہ "اردو میں مختلف علوم وفنون کی معیاری کتابیں نہیں ملتیں" اور ان کی ضرورت بتلائی گئی ہے۔ علوم وفنون میں ٹکنیکل مضامین مثلاً ڈاکٹری و انجینیرنگ وغیرہ بھی شامل ہیں اور ان مضامین میں کتابیں لکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے فنی اصطلاحات سے واقف ہونا ضروری ہے اس لئے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنٹیفک اور ٹکنیکل اصطلاحات کس زبان میں استعمال کی جائیں خصوصاً جبکہ اردو زبان میں ان کا وجود نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں جب اردو زبان ذریعہ تعلیم تھی اور وہاں یہ زبان عروج پر تھی اس زمانہ میں ایسی اصطلاحات کا ترجمہ زیادہ تر عربی و فارسی زبانوں سے الفاظ لے کر کیا گیا تھا مگر وہ تجربہ بہت ہی تلخ رہا اور یہ اصطلاحات اس قدر ثقیل تھیں کہ خود طلبہ کے لئے دشواریاں پیدا ہوئیں۔ مثلاً ڈاکٹر نسخہ میں ادویہ کے نام کس زبان میں لکھے؟ اگر وہ اردو میں مستعمل ہوئے الفاظ میں ادویہ کے نام لکھے تو بازار میں عام طور سے ان ناموں سے ادویہ ملنا یا نسخہ بندھوانا غیر ممکن ہوگا تا وقتیکہ خود دواساز ان ناموں سے واقف نہ ہو اور کتنے دواساز ایسے ملیں گے جو دواؤں کے اردو میں ترجمہ کئے ہوئے ناموں سے واقف ہوں گے۔ گھوم پھر کر یورپ و امریکہ میں دواؤں کے نام جو رائج ہیں وہی استعمال کرنا ہوگا تا وقتیکہ

اور اشیاء د امور میں گہرے تفکر کی ضرورت ہے خارجی حس کے ساتھ داخلی احساس، شعور اور جذبہ کو بھی شعر میں منتقل کرنا ضروری ہے۔

عقاد شوقی کے مراثی کو خالص تقلیدی قرار دیتے ہیں اور کہتے کہ اگرچہ اس میں فلسفۂ موت و حیات کا ایک وسیع میدان ہے مگر شوقی محض تقلید سے کام لیتے ہیں بلکہ تقلید میں بھی سطحی درجہ تک رہ جاتے ہیں حالانکہ ان سے قبل متنبی اور معری نے کہیں کہیں موت و حیات کے بارے میں اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور زندگی کے بارے میں پائدار تجربات پیش کئے ہیں۔

عقاد شوقی کے قصائد پر وحدت کی کمی اور بے ترتیبی کا الزام بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قصائد میں جسم انسانی کی سی وحدت در کار ہے۔ شکری نے اپنے دیوان کے پانچویں حصہ میں مازنی پر یہ تنقید کی کہ وہ مغربی ادیبوں پر تنقید بھی کرتے ہیں اور بلا ان کا حوالہ دئے ان کے انکار اپنے نام سے شائع بھی کردیتے ہیں مازنی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

جب عقاد اور مازنی نے کتاب "الدیوان" شائع کی تو اس میں دو فصلیں شکری پر تنقید کے لئے وقف تھیں مازنی نے شکری پر سخت تنقید کرکے ان کی اس تنقید کو رد کیا جو انھوں نے حافظ کی شاعری پر کی تھی۔

اس تحریک میں شریک ناقدوں کے خیالات اور پھر ان میں آپس میں تنقیدی مناقشات نے ایک ادبی تنقید کی فضا سے عربی ادب کو زندگی و تابندگی کی دولت عطا کی۔

بہر حال مازنی و شکری کا معرکہ اس طرح ختم ہوا کہ مازنی نے شاعری کو چھوڑ کر صحافت و سیاست کی راہ لی۔ شکری نے بھی شاعری سے پیچھا چھڑایا اور میدان میں صرف عقاد رہ گئے وہ اپنے خیالات و نظریات پر جو شاعری کے بارے میں انھوں نے "الدیوان" میں پیش کئے تھے قائم رہے اور مسلسل اپنے کلام کے مجموعے پر مجموعہ شائع کرتے رہے۔ ان کے اشعار میں اکثر انگریزی شعرا شکسپیر و شیلی وغیرہ کے اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تنقیدی تحریک نے فکر و نظر کو جلا بخشی اس تحریک کے ناقدوں نے حافظ و شوقی جیسے عظیم شعراء پر بصیرت انگیز تنقیدوں سے فکر کے گوشوں کو اجاگر کیا اور اس طرح اہل نظر ان کی تنقیدی کاوشوں کے اجالے میں خوبی و خامی کا اندازہ کرسکنے کے لائق ہوسکے۔ اگرچہ تحریک کی ابتدا کے وقت اعلان کیا گیا تھا کہ "الدیوان" دس جلدوں پر مشتمل ہوگی مگر صرف دو حصے ہی منظر عام پر آسکے۔ پھر ان تنقیدوں نے جدید طرز فکر کی دعوت کو عام کیا اور ادبی تنقید میں ایک نیا انداز نظر پیش کیا جو قدیم عربی تنقید سے قطعاً مختلف تھا۔

ماخذ: (۱) ادب المعاصر فی مصر تالیف شوقی ضیف
(۲) فی ادب الحدیث ج ۱، ۲ تالیف عمر الدسوقی
(۳) تطور الشعر العربی فی العصر الحدیث

ماہر حسن فہمی

انجمن کی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-۲	اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	۵ر۵۰
۳	نسیم مغرب	امیر چند بہار	۲ر۵۰
۴	نئے ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۵ر
۵	ہندوستانی اخبار نویسی	محمد عتیق صدیقی	۱۲ر
۶	تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴ر۵۰
۷	بازدید	ڈاکٹر منیب الرحمٰن	۳ر۵۰
۸	اردو ہندی لغت	مرتب انجمن ترقی اردو (ہند)	۲۰ر
۹	اردو صرف و نحو	مولوی عبد الحق	۱ر۲۵
۱۰	ادبی اور قومی تذکرے	پنڈت کشن پرشاد کول	۴ر۵۰
۱۱	اردو ساہتیہ کا اتہاس	سید احتشام حسین	۷ر۷۵
۱۲	اردو غزل (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹ر
۱۳	اطلاقی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴ر۵۰
۱۴	الایام (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر طٰہٰ حسین مترجم سید عبد الباقی شطاری	۴ر۰۰
۱۵	انتخاب شرح دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳ر۵
۱۶	انتخاب کلام میر	مولوی عبد الحق	۲ر۵۰
۱۷	انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲ر۵۰
۱۸	بچوں کے ادب کی خصوصیات	مشیر فاطمہ	۱ر۰۰
۱۹	بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲ر۵۰
۲۰	پرچھائیں	آصف علی	۴ر۰۰
۲۱	تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲ر۰۰
۲۲	تذکرۂ گلشن سخن	مسعود حسن رضوی	۶ر۰۰
۲۳	چند ہم عصر	مولوی عبد الحق	۱ر۵۰
۲۴	روزگار شرح سود اور زر	ابو سالم	۸ر۵۰
۲۶	دھمپد	منور لکھنوی	۳ر۰۰
۲۷	نوائے ظفر	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	۲ر۲۵
۲۸	یادگار حالی (جدید ایڈیشن)	بیگم صالحہ عابد حسین	۴ر۵۰
۲۹	کلام سودا	خورشید الاسلام	۶ر۰۰

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

تحریک الدیوان

(مصر کی ایک ادبی تحریک)

عقاد اور مازنی نے دس جلدوں میں ایک کتاب "الدیوان" کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا اسی وجہ سے اس ادبی تحریک کا نام بھی "الدیوان" قرار پایا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ قدیم تقالید اور طرز فکر پر تنقید کر کے جدید مغربی خیالات سے شعراء کے دماغوں کو روشن کیا جائے۔ عقاد، مازنی اور شکری اس تحریک کے بنیادی روح رواں تھے۔ ناقدوں کی اس جماعت نے فکر کے نئے پیمانے وضع کئے جن پر مغربیت کی گہری چھاپ تھی۔ عربی شاعری میں تجدد پسندی کی تحریک نے فکر و تخیل کو روشنی بخشی اور ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کی جدید طرز پر تربیت کی۔ ان ناقدوں نے قدیم روایات شعر و ادب پر دلائل سے پُر اور سخت اعتراضات کئے۔

اس تحریک کی اہمیت اس نقطہ نظر سے بہت زیادہ ہے کہ اس کے نمائندوں نے عملی طور پر نظم و نثر میں اپنے خیالات کا پوری طرح اظہار کیا۔ عبدالرحمٰن شکری نے "ضوء الفجر" شائع کر کے اپنے اشعار سے قدیم شاعری پر ایک عملی تنقید پیش کی۔

مازنی شعرائے محافظین کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ الفاظ کی تزئین میں مبتلا ہیں مگر نفس انسانی کے اندرونی جذبات، زمانہ کے رجحانات اور سماجی اثرات سے دور رہ کر بے روح شاعری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار قدما سے مشابہ یا ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر انسانی زندگی کے وسیع تجربات کا فقدان ہوتا ہے۔ مازنی، حافظ و شوقی کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ "جریدہ" میں رقمطراز ہیں کہ ان کے اشعار میں ایک عمدہ اسلوب پُرتکلف طرز بیان، خیرہ کن الفاظ

تراکیب میں متانت اور تخیل میں لطافت محسوس ہو گی لیکن اس طرز میں عیب یہ ہے کہ اس میں خود شاعر کی شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور روح سماج و عصر کا پتہ کہیں دور دور نہیں چلتا۔ یہ شعراء عمدہ اشعار اور اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں مگر ان میں جدید معنی اور جدید زندگی کی جھلک تک نہیں ہوتی ان کی نگاہیں قدیم شاعری کی طرف لگی رہتی ہیں اور اس سے وہ اخذ و اقتباس کرتے ہیں۔

اسی طرح مازنی نے حافظ ابراہیم کی شاعری پر تنقید کی اور بتایا کہ وہ سیاسی اور صحافیانہ طرز کی شاعری کرتے ہیں۔ وہ ایک خاص طرز کی صنعت گری سے کام لیتے ہیں جس سے کائنات حقیقت اور حسن کے جلوے اجاگر نہیں ہو پاتے۔ مازنی حافظ ابراہیم کی شاعری کو مبالغہ آمیز، حقیقت سے بعید اور صداقت سے عاری قرار دیتے ہیں جس میں شاعر کے جذبات و احساسات کی تصویر کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ حافظ کے سرقات اور الفاظ کے غلط استعمال کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مازنی نے حافظ پر جو تنقید کی ہے اس کے بعض حصے بے جان ہیں اور ان کے غلط طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس تحریک کے بانیوں نے اپنی تنقیدوں سے ایک فضا قائم کی اور شوقی و حافظ جیسے درجہ اول کے شعراء پر بے جھجک تنقیدیں کیں۔ عقاد "الدیوان" میں لکھتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو اشیاء کے جوہر تک پہونچ جائے محض ان کی اشکال و الوان پر قناعت نہ کرے ایک چیز کو کئی طرز کی رنگین تشبیہوں سے پیش کرنا شاعری نہیں ہے شاعری دراصل کسی شئے کی ماہیت، جوہر اور زندگی سے اس کے تعلق کو پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعری کوئی میدان مبارزت نہیں بلکہ خود اپنے مشاہدات و احساسات کو کائنات، زندگی اور سماج کے بارے میں پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعر کو کسی شئے کے اندر پہونچ کر اپنے جذبات کے ساتھ اس کی گہرائی اور وسعت کو منتقل کرنا چاہئے۔ تشبیہ کے بجائے نئے معانی کی نئی تصویریں

ایم کوٹھیاوی راہی

غزل

دورِ شوق میں یہ بھی نہ مجھ کو یاد رہا
کہ اس سے مل کے ہجر ہجر و غم ملے گا کیا

میں وہ وجود ہوں خود کو مٹا دیا جس نے
مجھے پکار رہا ہے بکھر کے ہر ذرہ

نہ کوئی فکر کا تارا نہ کوئی یاد کا چاند
چلی ہے آج فلک پر بھی کیا اجل کی ہوا

مجھے بھی اہل شرافت میں خوار ہونا ہے
نہیں تو بیٹھ مکاں میں ہمارے ساتھ رہا

سنائی دیتی ہے شہروں میں آج بھی راہی
وہی اداس خموشی وہی شبوں کی صدا

آگرہ یونیورسٹی میں اردو کی راہ میں دشواریاں

ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیت سے ریاستی انجمن ترقی اردو کا وفد ملا

لکھنؤ۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد نے جو جناب حیات اللہ انصاری ایم۔ پی خازن، بیگم سلطانہ حیات، نائب صدر، جناب راحت علی خاں جنرل سکریٹری، جناب احمد ابراہیم علوی، مولانا محمد ہاشم فرنگی محل اور سید فدا حسین ممبران مجلس عاملہ پر مشتمل تھا، جناب جی ایس ٹرائک ڈپٹی کمشنر اقلیت سے ملا۔ ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے ایک یادداشت ان کے سامنے رکھی جس میں پرائمری اور ثانوی سطح پر ریاست میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی دشواریوں کے ساتھ آگرہ یونیورسٹی میں نصاب کی تبدیلی سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے نصاب کی اس تبدیلی سے اب اردو یا ہندی میں سے طلبہ ایک ہی مضمون لے سکیں گے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت کچھ حلقوں پر اردو ٹیچروں کا تقرر کیا گیا ہے۔ لیکن ایسے ٹیچروں کو تعلیمی سیشن کے ختم ہونے سے پہلے ٹرینڈ نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے یادداشت میں کہا گیا ہے کہ ایسے ٹیچروں کے لئے تھوڑی مدت کے ریفریشر کورس کا بندوبست کر کے انھیں ٹریننگ سے مستثنیٰ کیا جائے جیسا کہ پہلے زبان کے ٹیچروں کے لئے ایسا ہی انتظام تھا۔ سرکاری اعلان کے باوجود اہم قوانین کا اردو ترجمہ، اردو میں فہرست ووٹران، دفتروں میں اردو میں درخواستیں دینے کی اجازت اور داخل خارج کے مقدموں کی نوٹسیں اردو میں جاری کرنے کی کوئی سہولت موجود نہیں ہے محکمہ حفظان صحت کی طرف سے متعدی امراض وغیرہ کے تحفظ کے اشتہارات وغیرہ اردو میں شائع نہیں ہوتے ہیں۔

بہار میں اردو آبادی کے سروے کا کام جلد شروع ہوگا

پٹنہ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا جلسہ زیر صدارت جناب غلام سرور صدر انجمن، انجمن اسلامیہ ہال میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت کی:۔

جناب غلام سرور، مولانا شہاب صدیقی، عنصر نواب دانش، پروفیسر عبد المغنی، محمد تقی رحیم، شاہ مشتاق احمد، شاہد رام نگری، شمشاد علی خاں یعقوبی (سیوان)، باسط عظیم آبادی (چکردھرپور)، جوہر نظامی (سمری بختیارپور)، محمد زین الحق (کٹیہار)، پروفیسر مظفر اقبال (بھاگل پور)، عثمان یوسف (پٹنہ سٹی)، اصغر امام فلسفی (پھلواری شریف)، محمد حسین انصاری (دانا پور)، خواجہ نواب منظر صدیقی (سکندرہ)، اظہار عالم، معصوم شرف امیر صاحبان۔

۱۔ طے کیا گیا کہ انجمن کا ایک وفد صدر انجمن کی قیادت میں گورنر بہار سے ملاقات کر کے ان سے گذارش کرے کہ اردو کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے جن اقدامات کا فیصلہ ہو چکا ہے ان کو مستعدی کے ساتھ روبہ عمل لایا جائے ساتھ ہی اردو کے سلسلہ میں کی جانے والی بعض زیادتیوں کی تلافی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائے۔

۲۔ یہ جلسہ بہار کی بعض یونی ورسٹیوں کی اس غیر جمہوری عمل کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں انگریزی کی جگہ جن زبانوں کی تعلیم تجویز کی گئی ہے ان میں اردو کا نام نہیں ہے

۳۔ طے کیا گیا کہ مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل اردو کے سلسلے میں اعداد وشمار فراہم کرنے کے لئے ایک سروے کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ پروفیسر سید مظفر اقبال، جناب زین الحق ایم۔ کام، جناب شمیم ربانی اور جناب کمال الدین صدیقی۔ کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے کاموں کی تفصیلات مرتب کر کے عملی اقدامات کرے۔

۴۔ طے کیا گیا کہ جن سب ڈویژنوں میں اردو میڈیم اسکول نہیں ہیں وہاں کی شاخوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے علاقے میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کے وسائل پر غور و فکر کر کے ریاستی دفتر کو مطلع کریں اور اس سلسلے میں اس کے ساتھ مراسلات کریں۔

دہلی یونیورسٹی کے بی اے (مراسلاتی) کورس میں اردو کو بھی اختیاری مضمون بنایا جائے

سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی نے وائس چانسلر کو میمورنڈم پیش کیا

نئی دہلی ۱۱ جولائی دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دہلی یونیورسٹی کی جانب سے بی اے کے مراسلاتی کورس میں اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ یہ مطالبہ ایک میمورنڈم میں کیا گیا ہے جو انجمن ترقی اردو دہلی کے جنرل سکریٹری جناب بہار برنی نے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر گنگولی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میمورنڈم پر ان طلبہ کے دستخط بھی ہیں جو اس سہولت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔

میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ اردو اس ملک کے دو کروڑ تیس لاکھ آدمیوں کی مادری زبان ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں یہ اس وقت ہندوستان کی ستر میں سے ۵۹ یونیورسٹیوں میں اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے اور دہلی یونیورسٹی وہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے آزادی کے بعد اردو کا شعبہ قائم کیا تھا۔ اس لئے یہ خواہش قدرتی ہے کہ اس یونیورسٹی کے بی اے کے مراسلاتی کورس میں اردو کو شامل کیا جائے۔

اردو کی تعلیم کی راہ میں دشواریاں

لکھنؤ۔ دینی تعلیمی کونسل نے ۱۳ جولائی کو ڈپٹی لسانی کمشنر کو ایک توجہ نامہ بھیجا تھا۔ اس میں کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تخمیناً ۲۰ ہزار پرائمری ٹیچرس تھے جو اردو اور ہندی دونوں زبانیں جانتے تھے۔ جیسے

سال کے اندر ان کی اکثریت کا یا تو انتقال ہوگیا یا ریٹائر ہوگئے ان کی جگہ خالص ہندی والے ٹیچرس کا تقرر کیا گیا علاوہ ازیں اب تک مختلف پلانوں کے تحت ڈیڑھ لاکھ یا سوا لاکھ نئے ہندی پرائمری ٹیچرس کا تقرر کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے شاذ ہی ایسے ہوں جو اردو زبان بھی جانتے ہوں اردو ٹیچرس کی ٹریننگ کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔ ٹریننگ کے لئے ٹیچرس کے انتخاب اور ان کی ملازمت کے سلسلے میں اردو جاننے کی شرط ہٹا دی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن اردو ٹیچرس کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شاید پرائمری اسٹیج میں اردو ٹیچرس کا وجود ہی باقی نہ رہے جونیر اسٹیج کی بھی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ جب پرائمری اسٹیج میں اردو کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا تو جونیر اسٹیج میں اردو پڑھنے والے طلبہ کہاں سے آئیں گے۔ ڈپٹی لسانی اقلیتی کمشنر کی توجہ وزرائے تعلیم کانفرنس منعقدہ دہلی اگست ۱۹۴۹ء کے اس ریزولیوشن کی طرف بھی دلائی گئی ہے جس میں طے ہوا تھا کہ کسی اسکول کے طلبہ کی بڑی تعداد ایسی ہو جو ہندی کے بجائے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کے لئے ان کی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ مگر یو۔پی گورنمنٹ نے اس پر عمل درآمد کا بندوبست نہیں کیا ایجوکیشنل کوڈ میں ایسی ترمیم نہیں کی گئی جس سے کسی اسکول میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکے۔ اس کے لئے نہ تو کتابوں کا بندوبست کیا گیا اور نہ اردو میں امتحان لینے کا انتظام کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ یوپی میں قریب ڈیڑھ سو سے لے کر دو سو تک اسلامیہ جونیر ہائی اسکول اور کالج مسلمانوں کی زیر نگرانی چل رہے ہیں مگر ایک اسکول بھی اردو میڈیم اسکول نہیں حالانکہ آندھرا پردیش مدھیہ پردیش اور بہار اتر وغیرہ میں اردو میڈیم اسکول اور ہائی اسکول اب بھی موجود ہیں۔ اردو کو بطور زبان پڑھانے کی جو سہولتیں پہلے تھیں وہ سہ لسانی فارمولا کے نفاذ کے بعد ختم کر دی گئیں مرکزی حکومت کی واضح ہدایات اور بار بار یاد دہانیوں کے باوجود سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں شامل کیا گیا اور ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ ہر سنسکرت لینے کے لئے مجبور ہو جائے۔ اس طرح بہ طور ایک زبان کے اردو اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی تعلیم کے لئے راہ مسدود کر دی گئی حکومت ہند نے جو اعداد و شمار اڈیشنل لینگویج ٹیچنگ کے سلسلے میں شائع کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال ۱۹۶۶ء و ۱۹۶۵ء میں پورے صوبے میں ہندی کے علاوہ اور زبانوں کے ٹیچر ۵۱۰۵ تھے جس میں سے سنسکرت کے ۴۶۱۸ تھے گویا کل کے مجموعہ کا تخمیناً نوے فیصد سنسکرت پر ہی حکومت نے سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں بطور ایک زبان کے پڑھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سنسکرت کو ہندی کا جزو بنا دیا ہندی کے پرچہ میں بیس نمبر کی سنسکرت لازمی کر دی گئی ہے جس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان لینے والے طلبہ کے مقابلے میں اردو یا دیگر جدید زبانوں والے طلبہ ہندی میں نمبر کم پاتے ہیں بلکہ اکثر فیل ہو جاتے ہیں اس طرح طلبہ مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان چھوڑ کر سنسکرت لیں علاوہ ازیں اردو میں جو کتابیں رائج ہیں وہ بہت سخت ہیں۔ پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کی راہ میں جو مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں ان کی موجودگی میں شاید ہی طالب علم ایسے ہو سکتے ہیں جو ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں اردو بہ طور زبان پڑھنے کی اہلیت یا ہمت رکھتے ہوں اگر وہ ارادہ بھی کریں تو اسکیموں میں مختلف مضامین کا جوڑ اس طرح رکھا گیا ہے جس کے ماتحت کوئی اچھا طالب علم اردو لینا پسند نہیں کرتا۔

ان حالات میں ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت کے محض کاغذی اعلانات اور نام نہاد مراعات پر اپنی رائے قائم نہ کریں۔ عملی دشواریوں کو دیکھیں اور ان کا حل تلاش کریں۔

(قومی آواز)

انجمن ترقی اردو ہند شاخ بنیا پوکھر کا جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ بنیا پوکھر کے زیر اہتمام محترم جناب سالک لکھنوی کی صدارت میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں "مغربی بنگال میں اردو کا حال اور مستقبل" زیر بحث آیا۔ صدر محترم نے اپنی فاضلانہ تقریر میں تاریخی پس منظر کے ساتھ اس حقیقت پر کافی زور دیا کہ زندہ رہنے والی قوم کی زبان کبھی نہیں مٹتی۔ آپ نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کسی صوبے کا لسانی مسئلہ دراصل پورے ملک کے لسانی مسئلے کا ایک جز ہوتا ہے اس صورت حال پر روشنی ڈالی کہ موجودہ ملکی سیاست کے تنگ نظر گوشے اب خود اپنے مفاد کے پیش نظر اپنی اردو دشمنی پر کچھ پشیماں سے دکھائی پڑ رہے ہیں آپ نے ملک کی سیاست میں ایک ابھرتی ہوئی روشن تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو کے روشن مستقبل کی کچھ واضح توقعات کا اظہار کیا۔ مباحثے میں جناب ادریس احمد دوراں، جناب غلام قادر (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ کلکتہ) جناب مناظر الحسن (سکریٹری کلکتہ کارپوریشن اردو ٹیچرس سوسائٹی) جناب مولانا عبد الحلیم شمسی اور جناب شوکت احمد (سکریٹری فری ریڈرس سرکل) نے خاص طور پر حصہ لیا۔ کلکتے کی انجمن کی تمام علاقائی شاخیں بھی مدعو تھیں۔ جناب الحاج شمس الدین صاحب (صدر انجمن) نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا نشست کے بعد چائے سے حاضرین کرام کی ضیافت کی گئی۔ نشست کے شروع میں "انتخاب اشعار غالب" کے مقابلے کے انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔

انجمن اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے جانشین وحشت حضرت شاکر کو ہم سے اچانک چھین لیا دنیائے اردو اس سانحۂ پر ملال پر جتنا غم و صدمہ کرے کم ہے۔

(ادریس انور جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام نیلور میں مشاعرہ

انجمن ترقی اردو (ہند) نیلور کے زیر اہتمام آٹھواں سالانہ مشاعرہ ۸ر جولائی ۱۹۶۸ء کو نذیریہ موٹر سروس کے وسیع میدان میں شب کے دس بجے

منعقد کیا گیا۔

مشاعرہ کی صدارت حضرت کاوش بدری صاحب بی اے مصنف مثنوی قبلہ نما دستر دھا گلی نے کی۔ دوران تقریر آپ نے ارشاد فرمایا کہ" اردو زبان کی ترویج میں دکنی صوفیائے کرام نے پہل کی تھی اور اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے اسی زبان کو منتخب کیا۔ اردو کی عالمگیرانہ ہمہ گیری کا راز اولیائے کرام کے مقدس ہاتھوں اس کی بنیاد ہے" اس سلسلہ میں شہر نیلور کے اولیائے کرام کی خدمات عالیہ کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ" غالب مرحوم پر اردو دنیا کو ناز ہے اور غالب مرحوم کو اپنے قابل فخر صاحب دیوان شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا نیلوری پر ناز تھا۔ جو سرزمین نیلور سے تھے" اردو کے ان دونوں مشہور و معروف اساتذۂ فن غالب و ذکا نیلوری کے دوستانہ تعلقات و ادبی خدمات پر اپنے تحقیقاتی انکشافات بھی پیش کئے پھر فرمایا کہ جس کا بہت کچھ حصہ تاریخ ادب اردو سے مخفی رہا یا حذف کیا گیا جسے اب اخفائے راز میں نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کام اردو کے ریسرچ اسکالروں کا ہے"

اس مشاعرہ میں قابل ذکر بیرونی شعراء میں اجمل سعیدی بدر حیدرآبادی سالار مختار محمل مدراسی، نعیم صدیقی، نظر کڈپوی اور حبیب کڑپوی اور بجنت شامل تھے اور مقامی شعراء میں ڈاکٹر نازؔ۔ تسنیم۔ واحد۔ روح چشتی ساثر۔ شیدا کے علاوہ دیگر مقامی و مضافاتی ممتاز شعراء نے شرکت کی۔

(عبدالرؤف۔ صدر انجمن ترقی اردو ہند نیلور)

سہ لسانی فارمولہ میں جنوب کی زبانیں پڑھنے پر زور۔ قومی پالیسی کا اعلان

نئی دہلی۔ مرکزی کابینہ نے معمولی ترمیمول کے ساتھ وزارت تعلیم کے اس ریزولیوشن کی منظوری دے دی جس میں بیس سال کے واسطے قومی تعلیمی پالیسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ریزولیوشن تعلیم کمیشن کی رپورٹ پر مبنی ہے البتہ اس میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں ممبران پارلیمنٹ مختلف پارٹیوں کے نمائندگان اور ریاستی وزراء تعلیم کی ترمیمیں شامل ہیں۔ ہندوستان کے حصول آزادی کے بعد نیز برطانوی ہندوستان میں تعلیم کے صوبوں کو منتقل کئے جانے کے بعد تعلیمی پالیسی سے متعلق یہ پہلی قرارداد منظور ہوئی ہے۔ پچھلا ریزولیوشن ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے منظور کیا تھا۔

پالیسی سے متعلق ریزولیوشن کی اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ آئین کے آرٹیکل ۴۵ کے مندرجات کے بموجب ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے بھرپور کوشش کی جائے۔

۲ ٹیچروں کی جنہیں سماج میں عزت کا مقام حاصل ہے حیثیت اور تنخواہوں کا تسلی بخش تعین ان کی استعداد اور صلاحیت کی مطابقت سے کیا جائے۔

۳۔ تحقیق اور اس کی اشاعت کرنے اور قومی اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں تقریر و تحریر کے سلسلہ میں ٹیچر کی تعلیمی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔

۴۔ ہندوستانی زبانوں کو محنت سے ترقی دینا ہوگی اور ان کو یونی ورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی (اس مقصد سے وقت کی کوئی قید ریزولیوشن میں نہیں رکھی گئی ہے)

۵۔ سکنڈری (ثانوی) منزل پر سہ لسانی فارمولہ اختیار کیا جائے گا تاکہ ہندی بولنے والے علاقے میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ کسی جدید ہندوستانی زبان :بہ کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے گی) اور غیر ہندی علاقہ میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ علاقائی زبان کی پڑھائی ہو سکے۔

۶۔ ہندی کی ترقی کو بڑھاوا دینے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

۷۔ ہندوستانی زبانوں کی نشوونما اور ہندوستان کے ثقافتی اتحاد میں سنسکرت کی مدد پیش نظر اس کے مطالعہ میں فراخدلی سے مدد دی جائے۔

۸۔ عالمی معلومات سے قدم ملا کر چلنے کے لئے انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کے مطالعہ پر خصوصیت سے زور دیا جانا چاہئے۔　　(ریاست)

صفحہ ۱۲ سے آگے

اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون "اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی"، اردو داں طبقہ کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مضامین بھی علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ چھ سو ستر صفحے کی اس دیدہ زیب کتاب کی قیمت تیس روپے موجودہ گرانی کے زمانے میں کسی طرح زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔

دوسری کتاب انگریزی میں ہے۔ اس میں برنارڈ لیوس، منٹگمری واٹ، اے۔ جے۔ آربری۔ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر اینی میری شمل۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، آصف فیضی، ہمایوں کبیر، ڈاکٹر عبدالمعید خاں، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر شبیر خاں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر مقبول احمد، ڈاکٹر گوپال سنگھ اور کچھ اور حضرات کے مضامین ہیں۔ دونوں کتابوں کے شروع میں ڈاکٹر تاراچند صدر مجلس نذر ذاکر کا تعارف ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں طباعت کی کچھ غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔

اپنے محسنوں کی خدمات کا اعتراف کرنا، ان کے کارناموں کی اہمیت واضح کرنا اور ان کے چراغ سے لوگوں کے ذہن و دل میں بہت سے چراغ روشن کرنا، ایک مبارک اور روح پرور کام ہے۔ اپنی ایک نظم میں اقبال نے اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ ذاکر صاحب پر صادق آتا ہے۔

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ"

ال محمود

میرا صفحہ

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے صدر جمہوریہ ہی نہیں، ملک کے سب سے ممتاز ماہر تعلیم، قوم کے معمار، ایک صاحب طرز ادیب اور ہندوستان کی مشترک تہذیب کے ایک انمول رتن ہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی، اپنی ذہانت، تحریر و تقریر کی غیر معمولی صلاحیت اور اپنے ساتھیوں کی اعلیٰ معاصر کے لئے قیادت کے لئے ممتاز تھے۔ جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے طالب علموں کو ترک موالات کا مشورہ دیا تو ذاکر حسین نے اپنے رفیقوں کے ساتھ علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے سرکار پرست ماحول کو چھوڑ کر جامعہ کی آزاد فضا میں پناہ لی۔ وہاں سے وہ جرمنی گئے اور اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے۔ اس وقت ترک موالات کے زمانے کا جوش سرد پڑ چکا تھا اور جامعہ کو چلانے میں دشواریاں محسوس ہو رہی تھیں۔ ذاکر صاحب نے اپنے رفیقوں ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کے ساتھ، ایک ایسی جماعت تیار کی جو جامعہ کی ساری ذمہ داری برائے نام معاوضہ پر لینے کو تیار تھے۔ اس کے بعد جامعہ کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ اس کا بچوں کا اسکول اور پھر اساتذہ کا اسکول اپنی تعلیم اور تربیت کے لئے مشہور ہوا۔ ایک اردو اکاڈمی قائم ہوئی، رسالہ جامعہ نکلا، جامعہ قرول باغ کی کرایہ کی عمارتوں کے بجائے اوکھلے کی کھلی فضا میں آئی مشکل مقامات قدم قدم پر آئے مالی دشواریوں نے برابر پریشان کیا مگر جامعہ ترقی کرتی گئی اور ہندوستان کا ایک ممتاز قومی ادارہ بن گئی جس کا مقصد شخصیت کی تعمیر، ذہن کی بالیدگی اخلاق کی استواری اور خدمت خلق کی لگن عطا کرنا تھا۔ ذاکر حسین نے گاندھی جی کے تعلیمی تصورات کی روشنی میں بنیادی تعلیم کا خاکہ بنایا جسے ملک اپنی ذہنی کاہلی اور ہوس کی گرم بازاری کی وجہ سے کامیابی سے نہ چلا سکا جب ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی مادر درسگاہ پر بیپتا کا وقت پڑا تو وہ علی گڑھ آ گئے جہاں انھوں نے علم کا ماحول اور عمل کا ولولہ پیدا کیا۔ علی گڑھ کی امتیازی خصوصیات پر اصرار کرتے ہوئے انھوں نے ان کو قومی دھارے سے ہم آہنگ رکھا اور نئے ہندوستان کی تشکیل کی طرف علی گڑھ والوں کے ذہن کی باگ موڑ دی۔ آٹھ سال علی گڑھ کے وائس چانسلر رہنے کے بعد صحت کی خرابی کی بنا پر وہ یہاں سے الگ ہو گئے۔ انھیں عہدے کی ہوس کبھی نہ تھی۔ وہ نام و نمود کے پیچھے بھی کبھی نہ دوڑے۔ مگر ہمارے معمار اعظم جواہر لال نہرو ان کے جوہر کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے پہلے انھیں بہار کا گورنر اور پھر ہندوستان کا نائب صدر بنایا۔ ان دونوں اہم عہدوں پر انھوں نے اپنی شرافت، اپنے اخلاق، اپنے تدبر اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے لاکھوں کے دلوں کو موہ لیا۔ ذاکر صاحب اچھے کاموں میں دل کھول کر مدد کرتے ہیں، وہ کسی کی مخالفت نہیں کرتے، اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ حیرت انگیز ہے۔ اقتصادیات و سیاسیات ہو یا فلسفہ و ادب انھیں تمام اہم میلانات سے واقفیت ہے۔ وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ذہن سے پردے اٹھ رہے ہیں اور دل میں گرمی آ رہی ہے۔ ان کی تحریروں میں حکمت و شعریت کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔ ان کا افلاطون کا ترجمہ ریاست، اور ان کے تعلیمی خطبات اور بچوں کے لئے ان کی کہانیاں برابر ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی اور ذہن میں روشنی اور دل میں گداز پیدا کرتی رہیں گی۔ جب انھیں گذشتہ سال ہندوستان کی جمہوریت کا صدر مانا گیا تو چند ایسے اشخاص کے سوا جن کے دلوں پر مہریں ہیں اور جن کے کان بند ہیں اور آنکھیں نابینا سبھی نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے سچے جانشین اور نئے ہندوستان کے پہلے شہری کے انتخاب کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہ تھا ہماری جو کچھ ساکھ آج بیرونی ملکوں میں رہ گئی ہے وہ ہمارے سیاسی لیڈروں اور نیتاؤں کی وجہ سے نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین، ونوبا بھاوے، جے پرکاش نرائن اور ہمارے جیسے دانشوروں، فنکاروں اور ادیبوں کی وجہ سے ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ابھی اور لکھی جائیں گی لیکن ۲ رمئی ۱۹۶۸ء کو ایک سادہ سی تقریب میں، ان کی اکہترویں سالگرہ پر مجلس نذر ذاکر دہلی کی طرف سے ان کی خدمت میں جو دو کتابیں پیش کی گئیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں پہلی کتاب اردو میں ہے دوسری انگریزی میں۔ اردو میں جو کتاب ہے وہ اپنے مضامین کے علاوہ، کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی ایک خاص معیار رکھتی ہے جس پر مجلس نذر ذاکر مبارکباد کی مستحق ہے اس سلسلے میں مضامین کی فراہمی اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اردو کے مشہور عالم اور محقق جناب مالک رام نے جو تگ و دو کی اس کے لئے ہم سب کو ان کا ممنون ہونا چاہئے اردو کی کتاب کے دو حصے ہیں۔ تذکرے کے عنوان سے ڈاکٹر تاراچند پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مضامین ہیں۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون جامعے کی چیز ہے اور ان کے اسلوب کا ایک دلکش نمونہ۔ یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کے بزرگوں اور خاندان کے دوسرے اشخاص کے متعلق بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ مجیب صاحب کے مضمون سے یہ اہم انکشاف ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے نہ صرف جامعہ کے پودے کو پروان چڑھایا، بلکہ اس کی بنیاد رکھنے کے لئے بھی قومی رہنماؤں خصوصاً حکیم اجمل خان کو آمادہ کیا۔ مقالات کے ذیل میں اٹھارہ عالموں اور ماہرین فن کے مقالات ہیں جن کا جائزہ لینا اس صفحے پر ممکن نہیں۔ ان میں ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون ہندوستانی روح کا بحران، پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون، شاہان اودھ کا علمی ذوق، مالک رام کا مضمون گل رعنا غالب کا گمشدہ انتخاب، پروفیسر گیان چند کا مضمون اردو کی ہندی کر

(باقی صفحہ ۱۷ کالم ۲پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

فون نمبر ۲۹

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۲ - ۱۵ - ۸ - ۱

سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم اگست ۱۹۶۸ء

اداریہ

قومی تعلیم کی پالیسی

حکومت ہند نے قومی تعلیم کے متعلق اپنی پالیسی کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی ہے۔ اس قرارداد میں تعلیم کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے اور مرکز اور ریاستوں کے باہمی اشتراک کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرارداد میں مجموعی طور پر بہت اچھی باتیں کہی گئی ہیں، مگر اول تو یہ واضح نہیں ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لیے جو وسائل درکار ہوں گے انھیں کس طرح فراہم کیا جائے گا، دوسرے اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ چونکہ تعلیم دراصل ریاستوں کے دائرۂ اختیار میں ہے، اس لیے مرکز کس طرح ان کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرسکتا ہے آزادی کے بیس سال کے بعد تجربہ یہ ہوا کہ اچھی اچھی اسکیمیں اس وجہ سے رہ جاتی ہیں کہ ان کے نفاذ کے لیے جو اقدامات کرنے ہوتے ہیں ان کا پہلے سے کوئی نقشہ نہیں بنایا جاتا، نہ وسائل کی فراہمی کے سوال پر غور ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مرکز اوّل تو ریاستوں کا ردِّعمل جلد سے جلد معلوم کرے اور انھیں اپنے ساتھ چلانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے دوسرے ساری اسکیم پر عمل کرنے کے لیے وسائل فراہم کرے۔

قرارداد میں سترہ رہنما اصول ہیں۔ ان میں پہلا چودہ برس کی عمر تک تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا اصول ہے۔ اس کی اہمیت سے کسے انکار ہوگا، مگر اس کے لئے اساتذہ کی فراہمی، کتابوں کی فراہمی، عمارتوں اور سازوسامان کا جو سوال آتا ہے اسے بھی حل کرنا ہوگا، ورنہ یہ خواب بھی دوسرے خوابوں کی طرح شرمندۂ تعبیر رہے گا۔ دراصل چودہ برس کی عمر تک مفت اور جبری تعلیم، ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے لئے وسائل مہیا کرنا ہر روشن خیال حکومت کا فرض ہے۔ یہ واقعی شرم کی بات ہے کہ ابھی تک ہم اس معاملے میں اپنی منزل سے بہت دور ہیں اس بنیادی مسئلے پر زور دینے کے بعد قرارداد میں اساتذہ کی مناسب تنخواہوں اور سماج میں ان کی منزلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس بات کو بھی سبھی مانتے ہیں مگر عمل کا معاملہ دوسرا ہے۔ ابھی تک ابتدائی اور ثانوی درجے کے اساتذہ کی تنخواہیں موجودہ گرانی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں اور گو زبان سے ان کے رتبے کا اعتراف ہوتا ہے مگر درحقیقت آج کل کے کاروباری دور میں استادوں کی کوئی وقعت نہیں ہے خصوصاً ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے استادوں کو تو ہر لحاظ سے حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو جلد سے جلد بدلنا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ قرارداد میں اساتذہ کی ذہنی آزادی کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہاں بھی عمل کی دنیا میں حالات دوسرے ہیں اور آزادیٔ خیال پر خاصی پابندیاں ہیں۔

ہندوستانی زبانوں اور ادبیات خصوصاً علاقائی زبانوں کی ترقی پر بجا طور پر زور دیا گیا ہے اور پہلی دفعہ صاف طور پر یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ مناسب تیاری کے بعد انھیں یونی ورسٹی کی منزل پر بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ اصول صرف ان زبانوں کے لئے ہے جو کسی نہ کسی ریاست میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں یا اس کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے یوں تو کہنے کو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے مگر دراصل ایک کل ہند زبان ہے اور کئی ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی خاصی بڑی آبادی ہے۔ لسانی اقلیتوں کے متعلق ایک صراحت نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ہندی کی ریاستوں میں ہندی اور [illegible]

وہ کوئی ایک جدید ہندوستانی زبان بھی پڑھائی جائے اور
ہیں جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے اور غیر ہندی
ستوں میں، علاقائی زبان اور انگریزی کے علاوہ تیسری زبان
سلسلے میں ہندی کو ترجیح دی جائے بظاہر یہ بات قومی یکجہتی
ے لئے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ لسانی اقلیتوں
لے لئے اس طرح بڑی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ہندی ریاستوں
ب ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو لینا چاہیں تو ہو سکتا
ہے کہ حکومت اس کے بجائے جنوبی ہند کی کسی زبان کو لینے پر
میں مجبور کرے اور جنوبی ہند میں تامل یا تیلگو یا کنڑ یا ملیالم
ر انگریزی کے علاوہ اردو لینے سے انھیں روکا جائے اور
ہندی لینے پر مجبور کیا جائے۔ اس لئے ہماری رائے میں ہندی
یاستوں میں جنوبی ہند کی زبانوں کو ترجیح نہ دی جائے اور نہ
نوبی ہند میں ہندی لینے پر
مرار کیا جائے، بلکہ اس معاملے میں
قسم کی سہولتیں فراہم کرتے
ہوئے طلبہ کو آزاد چھوڑ دیا جائے
بہتر ہوگا۔ ہندی کی ترقی پر زور
یتے ہوئے، قرارداد میں یہ
بھی بات کہی گئی ہے کہ اسے
ہندوستان کی مشترک تہذیب
کے تمام عناصر کے اظہار کا وسیلہ
بنا ہے، مگر ایک خاص بات
رہ گئی ہے یعنی ہندوستانی کی
روح اور اس کے مواد کو ملحوظ
رکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے
جب کہ دستور کی دفعہ ۳۵۱
میں اس کی صراحت ہے۔
سنسکرت کی اہمیت میں قومی زبانوں کی اہمیت، سائنس، زراعت
اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ، اچھی اور معیاری کتابوں کی تیاری،
امتحانات کے طریقے میں اصلاح، عام اسکولوں کی اہمیت، خواندگی
اور بالغوں کی تعلیم کو بڑھانے کی ضرورت اور دس سال کی اسکول کی
تعلیم کے بعد، دو سال کی اعلیٰ ثانوی تعلیم اور تین سال کی
یونیورسٹی کی تعلیم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لسانی اقلیتوں کی
تعلیم کے سلسلے میں اگست ۱۹۶۱ء کی بڑے وزیروں کی کانفرنس
کے بیان کو بنیاد مانا گیا ہے، مگر یہاں لسانی اقلیتوں کی ان
کی مادری زبان میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اصول کی
صراحت کرنی چاہئے تھی کیونکہ ریاستوں نے ابھی تک ابتدائی
تعلیم کے معاملے میں بھی بہت سستی دکھائی ہے اور اس وجہ سے لسانی
اقلیتوں میں بڑی بددلی اور مایوسی ہے۔

مجموعی طور پر حکومت ہند کی یہ قرارداد قابل قدر ہے،
مگر اس قسم کے بیان تو پہلے بھی دئے جا چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ
ان پر عمل کتنا اور کس طرح ہوتا ہے۔

فقیر وحید الدین کا انتقال

لاہور ۲۳ رجولائی اردو کے ایک ممتاز ادیب کرنل فقیر
وحید الدین کا انتقال گذشتہ اتوار کو کراچی میں ہو گیا۔ مرحوم
لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے بزرگ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ
میں تعلیم حاصل کی شاعر مشرق علامہ اقبال سے دیرینہ یارانہ مراسم
اور گہری عقیدت کی بنا پر انھوں نے علامہ کی زندگی اور افکار پر
"روزگار فقیر" اور "اقبال ان کی لیکچرر" مرتب کر کے شائع کیا انھوں
نے حال ہی میں جناب فیض احمد
فیض کے تعاون سے اقبال
کی تعلیمات پر ایک فلم بھی تیار
کی تھی۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم پر ان کی کتاب محسن اعظم
بھی مقبول ترین کتابوں میں ہے
انھوں نے اپنے نامور ہم عصر دل
کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک
ادبی شاہکار انجمن کے نام
سے تصنیف کیا۔ (قومی آواز)

شفا گوالیاری کی وفات

بھوپال۔ اردو کے مشہور شاعر
شفا گوالیاری کا ۲۲ رجولائی کو
انتقال ہو گیا آپ علامہ سیماب
کے فارغ الاصلاح شاگرد تھے۔ آپ کے کلام کے چار مجموعے آیات
شفا، شاخ زیتون، نبض حیات، اور پرچم اردو شائع ہو چکے ہیں
پانچواں مجموعہ کلام زخم گل ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے
آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دو سال قبل رسالہ شمع
ادب سلطان پور نے شفا نمبر بھی نکالا تھا۔

روسی ادیب سیاسی پناہ لینے امریکہ پہنچ گئے

واشنگٹن۔ امریکی محکمۂ خارجہ کے ایک ترجمان نے جمعہ کو اعلان
کیا ہے کہ ۴۷ سالہ روسی ادیب ارکادی بیلنکوف اور ان کی بیوی یوگنی
کے امریکی قونصل خانہ سے سیاحوں کا ویزا حاصل کرنے کے بعد سیاسی
پناہ لینے امریکہ آپہنچے ہیں۔

(ریاست)

رؤف خیر

پناہ

بے تحاشہ دوڑتا ہے
اک سراسیمہ ہرن
اڑ رہا ہے دور تک اس کی چھلانگوں سے غبار
اک شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے دیر سے

خوف کا مارا
پریشاں،
تھر تھراتا ہے ہرن
ایک بھوکے شیر کے مسکن میں لیتا ہے پناہ

محمد انوس واقف

سید سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر یلدرم نے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہٹور کے ایک ممتاز گھرانے میں ۱۸۸۰ء میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد خان بہادر سید جلال الدین بڑی پرشکوہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مختلف اونچے اونچے عہدوں پر سرفراز رہے لیکن ان کے مزاج میں غرور نہیں پیدا ہوا۔ وہ ایک متواضع، منکسر مزاج اور بااخلاق انسان تھے۔ شرافت اور دلنوازی میں تو ان کا خاندان ہمیشہ سے ممتاز تھا، خود یلدرم مرحوم حد درجہ شریف اور پاک طینت انسان تھے۔ قرۃ العین حیدر جو مرحوم کی دختر ہیں انھوں نے بھی باپ کی شرافت اور نیکی سے اپنی زندگی کو نکھارنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کا بچپن گنگا اور جمنا کے دلکش و دلاویز کناروں پر گزرا جہاں سے ان کی طبیعت کو لازوال رنگینی و رعنائی ملی۔ کچھ بڑے ہوئے تو اسکول میں داخل کرائے گئے۔ وہ ذہین بھی تھے اور محنتی بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی امتحانات کامیاب کرنے کے بعد جب وہ ایف۔ اے کے امتحان میں بیٹھے تو الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی و فارسی میں اوّل آئے۔ اور بی اے کے امتحان میں وہ سارے صوبے میں سکنڈ تھے۔ طبعاً وہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے وہ کالج کی اور کالج سے باہر کی تمام ادبی سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیتے رہے ایک بار وہ کالج یونین کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے جس زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ میں طالب علم تھے مولانا شبلی وہاں فارسی کے پروفیسر تھے۔ چونکہ یلدرم کو فارسی سے خصوصاً لگاؤ تھا۔ اس لیے مولانا کو ان سے انسیت ہو گئی تھی۔ شبلی ہی کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ یلدرم اردو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ اس زمانے میں انھوں نے چھوٹی بڑی کئی نظمیں لکھیں جنھیں ان کے معاصرین نے پسند کیا انھوں نے اچھوتے موضوعات اور اعلیٰ خیالات کے ذریعے اردو شاعری میں جامعیت پیدا کی۔ شاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ کبھی نہیں بنایا اور نہ ہی اسے تفریح و تفنن کا ذریعہ سمجھا۔ شعر کہتے وقت انھیں اپنے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا تھا بلکہ ان کی موزونیتِ طبع خود انھیں مجبور کرتی تھی۔

سید سجاد حیدر یلدرم ایک جلیل القدر نثار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت شاعر بھی تھے۔ اور یہ بھی حق بجانب ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مقتضائے وقت کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ انھیں جو غیر معمولی شہرت و مقبولیت ملی وہ صرف ان کے نثری کارناموں کا نتیجہ ہے۔ یلدرم نے لکھنا اس وقت شروع کیا جب وہ ایف۔ اے میں پڑھتے تھے انھوں نے اپنے شوق، دلچسپی اور مشق سے بہت جلد افسانہ نگاری میں مہارت پیدا کر لی۔ ان کی کہانیاں ملک کے موقر رسالوں مثلاً "معارف علی گڑھ" "اردوئے معلّٰی" "مخزن" (دورِ اوّل) علی گڑھ میگزین وغیرہ میں چھپنے لگیں۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ترکی زبان سیکھنا شروع کی اور ایک قلیل مدت میں اس غیر ملکی زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی کہ وہ اس زبان کے ڈراموں اور کہانیوں کے ترجمے اپنی زبان میں کرنے لگے۔ انھوں نے ترکی ادب کو اردو ادب سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ وہ جس زمانے میں علی گڑھ کالج میں ایل۔ ایل۔ بی کر رہے تھے فارن آفس سے علی گڑھ کے ایک پروفیسر کے نام خط آیا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانہ کے لیے ترکی زبان کے ایک ترجمان کی ضرورت ہے پروفیسر موصوف نے یلدرم سے کہا کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لیں یلدرم نے اسے قبول کر لیا اور وہ بغداد کے لئے روانہ ہو گئے۔ بغداد پہنچنے کے بعد ان کی ادبی سرگرمیوں میں کسی طرح کی کمی نہ آئی بلکہ ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہاں سے وہ ترکی ڈراموں اور افسانوں کے ترجمے ہندوستانی رسالوں میں ارسال کرتے رہے۔ ان کے ترجموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمے نہیں ہیں بلکہ ان کی تخلیقات ہیں کیونکہ ترجمہ کرتے وقت انھوں نے ایک مترجم ہی کی حیثیت کو نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ اگر قلم ان کا مترجم کا تھا تو ذہن ایک افسانہ نگار کا۔ ان کے تراجم و تخلیقات سے اردو ادب میں ایک نئے طرزِ نگارش یعنی ادبِ لطیف کی بنیاد پڑی مولانا سید سلیمان ندوی "مکاتیبِ مہدی" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"آج کل رنگ و بو کی دنیا" ادبِ لطیف "پر مٹ رہی ہے۔ پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گری سے مسحور کر رکھا ہے۔ مشرقی زبانوں میں فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلی بار اٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا سینہ کم از کم تین سو برسوں سے یورپ کے مشقِ ناز کا نشانہ ہے یعنی ترک۔ ترکوں نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس کی محبوبہ کو پہلو میں پایا۔ اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان میں پھیلی اور اس لئے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر یلدرم ایک علیگ طالب علم کو ترکی پڑھوائی اور اس نگاہ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت خانہ کے لیے کارآمد ٹھہرایا۔ اس لیے "زمانی قرب" اس کو ترکوں کا اور "مکانی قرب" بھی بخشا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بن کر آج سے ۲۵ سال پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مفتوحات کی صورت میں بدلنا شروع کیا اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نئے ادب

کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اردو رسالے کے صفحات پر نظر آتی ہیں۔"

ترکی ڈراموں اور ناولوں کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے زنانہ کرداروں پر خاص توجہ دی ہے۔ در اصل وہ عورتوں کو آزادی دینے کے حق میں تھے۔ مغربی علوم و فنون کے ذریعہ وہ خواتین میں وسعتِ نظر اور بلندیٔ فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ان خیالات کی مخالفت کی گئی لیکن وہ برابر کوشش کرتے رہے۔ وہ اس طرح کے جلسے جلوس میں بڑی مسرت کے ساتھ شرکت کرتے جن میں آزادیٔ نسواں کی مانگ کی جاتی۔ وہ ان عورتوں سے مل کر بے انتہا خوش ہوتے تھے جو آزاد خیال ہوتی تھیں۔ سر شیخ عبد القادر مرحوم اپنی ایک تحریر میں یوں رقمطراز ہیں۔

"۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی ایک اعلیٰ کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ سید سجاد حیدر یلدرم بھی شریک تھے۔ ایک دن جس میں جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کے قریب جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد حیدر یلدرم آتے دیکھ پڑے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کئی ایک چکر لگائے مجھ سے کہنے لگے کچھ نہ پوچھئے میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا کچھ تو بتاؤ کہ کیا دیکھا ہے کہنے لگے ایک ایسی خاتون سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامل ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں"

سجاد حیدر یلدرم آزادیٔ نسواں کے قائل ضرور رہے لیکن بقول قرۃ العین حیدر "جدید کلب لائف" اور حد سے زیادہ مغرب زدہ خواتین انھیں سخت ناپسند تھیں۔ قسطنطنیہ، بونہ وغیرہ میں سرکاری خدمات انجام دینے کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کی شادی ایک معزز خاندان کی خاتون سے ہوئی جو بذاتِ خود ایک ممتاز ادیبہ تھیں اور شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئیں۔ ترکِ موالات کے زمانہ میں نذر سجاد صاحبہ نے بڑی گرم جوشی سے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ایک بار وہ سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر بھی گئی تھیں۔

غیر ملکی اقامت کے بعد یلدرم جب ہندوستان آئے تو کچھ دنوں تک وہ یو۔پی میں سرکاری خدمات انجام دیتے رہے پھر مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے حکومتِ ہند کے اصرار پر پھر وہ سرکاری ملازمت میں آگئے اسی سلسلے میں ان کو انڈمان نکوبار بھیجا گیا۔ آخر میں پھر ان کا تبادلہ ہندوستان میں ہوا۔ اور وہ غازی پور و اناوہ کے ضلعوں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انھیں سرکاری کاموں سے فرصت مل گئی اور وہ حج بیت اللہ کے لئے گئے۔

سجاد حیدر یلدرم نے اردو ادب کے خزانے میں بہت اضافے کئے۔ انھوں نے طبع زاد افسانے لکھے، مضامین تحریر کئے۔ ترکی کہانیوں، ڈراموں اور ناولوں کے ترجمے کئے۔ ان میں "خیالستان" جو ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے شاہکار ہے اس میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ ترکی قصوں کے ترجمے۔ اس کتاب میں یلدرم کی رومانیت اور ان کی اعلیٰ تخیل کی مثالیں بھی مل سکتی ہیں اور حسین دلچسپ اور کیف و وجد میں ڈوبی ہوئی تصویریں بھی ابھرتی ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست اور روانی ہے جس سے قاری ذہنی طور پر محظوظ ہو سکتا ہے اس سے قطع نظر "ہما خانم" "پرانا خواب" "آسیب الفت" "جنگ و جدل" اور "جمال الدین خوارزم" وغیرہ تراجم بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم
مصنف:۔ سریندر پرکاش
ناشر:۔ شب خون کتاب گھر۔ الہ آباد
صفحات:۔ ۱۹۹، قیمت: ۳ روپے ۷۵ پیسے

طبقات الشعراء مصنف قدرت اللہ شوق
مرتب: نثار احمد فاروقی
ناشر: مجلس ترقی ادب۔ لاہور
صفحات: ۷۱۷، قیمت ۱۶ روپے

غزال و غزل۔
مصنف: سراج الدین ظفر
ناشر: پیرزر سنسر۔ لاہور
صفحات: ۲۱۲ قیمت: دس روپے

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

پچھلے چار برسوں میں ہمارے یہاں جن نوجوان لکھنے والوں نے اپنی تحریروں سے ادبی حلقوں کو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں شمس الرحمن فاروقی کا نام اب بہت نمایاں ہو چلا ہے۔ یوں تو انھوں نے متعدد ادبی مباحث پر مضامین و مقالات لکھ کر اپنی غیر معمولی ذہانت اور تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے مگر ان کی جن تحریروں نے پڑھنے والوں کو سب سے زیادہ چونکایا ہے وہ ان کے تبصرے ہیں جو اردو کی بعض اہم کتابوں پر الہ آباد سے شائع ہونے والے جریدہ "شب خون" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان تبصروں میں جس قسم کی بے خوفی اور دیانت داری کو روا رکھا گیا ہے اور ہر قسم کی مروت اور مصلحت سے بلند ہو کر جس بے لاگ اور معروضی انداز میں زیر بحث مصنفین کے حسن و قبح پر اظہار خیال کی کوشش کی گئی ہے اس کے ابھی ہم زیادہ عادی نہیں ہیں اس لئے ان تبصروں کی اشاعت سے تبصرہ نگار کو وہ نیک نامی حاصل نہ ہو سکی جس کی تمنا ہر نئے لکھنے والے کو ہوتی ہے۔ ان تبصروں کے ردعمل میں جو خطوط یا جوابی قسم کی تحریریں شائع ہوئیں اور ان میں سخن فہمی کے بجائے طرفداری کا جو مظاہرہ کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں مصنف اور ناشر اپنی کتابیں تبصرے کی غرض سے بھیجتے ہیں تو ان کے ذہن میں محض یہ تصور کارفرما ہوتا ہے کہ تبصرہ بھی ایک طرح کا اشتہار ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کو کتاب کی خریداری کی ترغیب دیتا ہے۔ فاروقی نے نہ صرف یہ کہ اس روایت پر کاری ضرب لگائی ہے بلکہ ان تبصروں کو کتابی صورت میں شائع کر کے پڑھنے والوں کو ایک بار پھر بحث و تمحیص کی دعوت دی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں تبصرے کی روایت بہت زیادہ جاندار نہیں رہی ہے اور تبصرے کا مقصد عام طور پر کتاب کا سرسری تعارف یا کچھ اشتہاری قسم کی رایوں کا اظہار ہوتا تھا اور اگر اس کے خلاف عمل ہوتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تبصرہ نگار کو مصنف یا کتاب سے کوئی خاص پرخاش ہے اور یہ تبصرہ محض اس کتاب میں کیڑے نکالنے یا مصنف کی شہرت پر خاک ڈالنے کے لئے لکھا گیا ہے یعنی اس طور پر بھی تصویر کا ایک ہی رخ سامنے آتا تھا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے تبصرے لکھے ہی نہ گئے ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے کتابوں پر تفصیلی تبصروں کا سلسلہ سب سے پہلے مولوی عبد الحق نے رسالہ اردو میں شروع کیا تھا مولوی صاحب نے خود بھی متعدد کتابوں پر بہت تفصیلی بے لاگ اور متوازن تبصرے کئے اور بعض دوسرے ادیبوں سے بھی اسی نوعیت کے تبصرے لکھوائے۔ مولوی صاحب کے تبصروں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اور رسالہ اردو میں اختر حسین رائے پوری، جلیل قدوائی اور عزیز احمد کے تبصرے بعض لوگوں کو اب بھی یاد ہوں گے۔ پریم چند کے ناول "میدان عمل" پر اختر حسین رائے پوری کا تبصرہ اور مجاز کے مجموعۂ کلام "آہنگ" کے پہلے ایڈیشن پر جلیل قدوائی کی بے لاگ تنقیدی رائے اس سلسلے میں خاص طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ علی گڑھ میگزین میں بھی بے لاگ تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں۔ "انگارے" جب نئی نئی شائع ہوئی تھی تو آل احمد سرور نے اس پر ایسا منصفانہ تبصرہ کیا تھا جس کی تلخی بہت دنوں تک قائم رہی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے رسالہ "سہیل" میں سرور صاحب نے اردو کی بعض اہم مطبوعات مثلاً "شبلی کے خطوط" اور "بال جبریل" وغیرہ پر مفصل اور متوازن تبصرے لکھ کر تبصرہ نگاری کی روایت کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ کم کم سہی لیکن کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا ہے۔ ممتاز شیریں نے بنگلور سے "نیا دور" نکالا تو اس میں تبصروں کا حصہ بہت اہم ہوتا تھا۔ عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" اور سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" پر عزیز احمد کے تبصرے اور عبد القادر سروری کی تصنیف "جدید اردو شاعری" پر محمد حسن عسکری کی بے لاگ تنقید اب بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد تبصروں کی اس روایت کو صرف محمود ایاز نے اپنے رسالہ "سوغات" میں برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ محمود ایاز نے بعض بہت اچھے تبصرے کئے جن میں اختر الایمان

عادل جعفری

غزل

یہ بات اور ہے کہہ دیجئے سویرا ہے
اندھیرا کل بھی تھا اور آج بھی اندھیرا ہے

زباں تو چلنے کو یاروں کی خوب چلتی ہے
عمل کی دنیا میں ان کے گھنا اندھیرا ہے

الٹ پلٹ گئی ساری بساط استادی
تلامذہ! یہ نئی شاعری کا پھیرا ہے

یہاں تو شام ہی کیا صبح بھی اندھیری ہے
یہ غیر کا نہیں، گھر، دوستو یہ میرا ہے

کبھو خوشی سے مرے گھر کا رخ کبھی تو کرے
بہت دنوں سے یہاں غم ہی غم کا ڈیرا ہے

کے مجموعۂ کلام "آب جو" ممتاز شیریں کے "میگھ ملہار" اور قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" پر تبصرے اردو زبان کے چند معیاری تبصروں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے جن لوگوں نے پڑھے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ وہ ان چند لکھنے والوں میں ہیں جن کی مغرب اور مشرق کے ادب پر گہری نظر ہے۔ وہ اپنے تبصرے کو صرف زیر بحث کتاب تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کے وسیلے سے ادب کے بعض اہم مسائل پر اپنے سوچے سمجھے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان خیالات سے اتفاق ضروری نہیں لیکن یہ ہمیں غور و فکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں اور اپنے بہت سے تاثرات و تعصبات پر نظر ثانی کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

فاروقی کے متعلق یہ رائے عام طور پر سننے میں آئی کہ وہ نئی شاعری کے اندھے پرستاروں میں ہیں اور اس کی حمایت بیجا حمایت ان کا مقصد زندگی ہے۔ مگر زیر نظر کتاب میں سب سے پہلا تبصرہ جو نئے شعراء کے ایک انتخابی مجموعہ "آبگینے" (شائع کردہ ادارہ مصنفین نوحیدرآباد) پر شامل کیا گیا ہے اس میں فاروقی کی یہ رائے ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

"اس کتاب میں جو بات مجھ دودھ کے جلے قاری کو فوراً کھٹکتی ہے وہ جذباتیت اور سطحیت ہے۔ زیادہ تر نظموں اور غزلوں میں شاعر اپنے تصورات کی اوپری سطح میں الجھا نظر آتا ہے۔ اپنی شخصیت کے نہاں خانوں کے کونے کھدروں کی تلاش کی شاید ہمت نہیں پڑتی یا اگر کبھی ادھر جھانکنے کا موقع مل بھی جاتا ہے تو وہاں جو کچھ دیکھتا ہے اسے کسی لمحۂ وقت سے منسلک کرکے اس کا بنیادی ربط یا بے ربطی ڈھونڈھنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ دوسری طرف عشقیہ جذبات کی عمومیت اور روایتی طرز مطالعہ نظموں اور خاص کر غزلوں کے حسن کو ہم رنگی کے زہر بے تریاق کی نذر کر دیتی ہے 'یہ سب و پہلے بھی کہیں پڑھا تھا' کا احساس جو نئی شاعری کے قاری کو اکثر ہوتا ہے اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں بار بار شدت سے پیدا ہوتا ہے"

اسی طرح محمد علوی کے مجموعہ "خالی مکاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بے لاگ رائے دی ہے

"محمد علوی کی خلاقانہ قوت کبھی کبھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہتی ہے اور نتیجے میں ایک طرح کی چیٹی، تجربہ و تصور سے معرا پھیکی شاعری جنم لیتی ہے کھپریل کی منڈیر پر اونگھتے اور غٹرغوں کرنے مٹیالے کبوتر ہوں یا خفائے بسیط میں پرواز کرتے طائر لاہوتی۔ شعر کا موضوع اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان کا تذکرہ قاری کے ذہن میں تجربے کے کسی سلسلے کو تحریک دے یا معنی خیز امکانات کے دروازے کھولے یا تخیل انگیز قال و اقوال پیدا کرے محمد علوی جس طرح کی شاعری کرتے ہیں اس کا توازن بگڑنا بہت مشکل نہیں ہوتا روایتی قسم کی گمبھیر شاعری تو پرانے کارآزمودہ ستونوں کے سہارے ایک اچھی خاصی مضبوط چھت کھڑی بھی کر لیتی ہے لیکن محمد علوی جب توازن ہاتھ سے کھو دیتے ہیں تو کھوکھلی کوڑیوں کی مالا کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں وہ بھی اسی طرح اپنے لہجے اور محاورے کے غلام ہو کر نہ رہ جائیں جس طرح روایتی شاعری کے علمبردار اپنی بے کیف رعنائیوں اور بے معنی بہار و خزاں اور گل و بلبل کے تار عنکبوت میں اسیر ہو کر رہ گئے تھے روایتی شعراء کو نوچتے ہیں اور سہل انگار لعط ماری یک آنے آنے سو ریس لگے لیکن محمد علوی جس بال سے باریک پل پر کھڑے بارہ گودوں والا کھیل دکھا رہے ہیں اس پر سے گرنے اور الفاظ کے دریائے پرشور میں ڈوبنے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

اب ایک اور نئے شاعر راج رائں راز کے شعری مجموعے "اساڑھ کی چاندنی" پر تبصرے کے ذیل میں یہ سطریں دیکھئے۔

"انھوں نے علامت کو محض استعارہ سمجھ کر استعمال کیا ہے اس لئے ان کی شاعری ذاتی رنگ میں رنگی ہونے کے باوجود کسی مکمل اور گہری علامت کا اظہار نہ بن کر اکہرے استعاروں کی محدود شاعری ہو کر رہ گئی ہے اس کے علاوہ ان کی شاعری میں تجربے کو عام، غیر منحنی اور تقریباً نثری زبان میں بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے ۔   راج رائں راز چونکہ بالکل سامنے کی باتوں سے رس نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ان کی نظموں میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

زبیر رضوی کے مجموعہ "لہر لہر ندیا گہری" پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان کے زیادہ تر کلام کا دھندلا نیم روشن تاثر ذہن پر قائم رہ جاتا ہے لیکن کوئی واضح صورت نہیں بن پاتی جو مردانہ شاعری کا خاصہ ہے۔"

یہ مثالیں میں نے اس لئے فراہم کی ہیں کہ فاروقی کے متعلق یہ خیال کہ وہ محض پرانے یا ترقی پسند شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے سنگ دلی اور بے رحمی اختیار کرتے ہیں اور نئے شعراء کی محض پیٹھ ٹھونکنا ان کا مشغلہ ہے کسی صورت صحیح نہیں ہے۔

فاروقی نے جن کتابوں پر ہنگامہ خیز تبصرے کئے ہیں ان میں سکندر علی وجد

کا مجموعہ" اوراقِ مصور" مخدوم محی الدین کا" بساطِ رقص" اور سردار جعفری کے مجموعے " ایک خواب اور" اور "پیراہن شرر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تبصروں کی خوبی یہ نہیں ہے کہ یہ بہت متوازن ہیں یا ان میں جو رائیں دی گئی ہیں ان سب سے اتفاق کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بات قابل قدر ہے کہ ان مشہور اور مسلم الثبوت شعرا کے بارے میں عام تنقیدی رایوں سے مرعوب ہوئے بغیر لکھنے والے نے اپنی کسوٹی پر انہیں پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بعض خیال انگیز باتیں کہی ہیں

وجد کے مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو پست یا افتادہ کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں

" اس پستی یا افتادگی، سطحیت یا غیر قطعیت کی سب سے بڑی وجہ شاعر کے ذہن میں اس تجسس، کرید، بے چینی اور کرب کی کمی ہے جو اسے کسی چیز کی صوری قیمت کو قبول کرنے سے روکتا ہے اور اسے سوال کرنے، پوچھنے اور الجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے ادب بلکہ ہر اچھے ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی سوالیہ نشان ہے . . . . . اگر آج کا شاعر سوال نہیں کرتا تو اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کم بچ رہتا ہے"

اسی طرح وجد کی مقبول عام نظموں" اجنتا" اور" ایلورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں تعمیم زدہ شاعری کا نمونہ قرار دیا ہے جس سے اس چیز کی کوئی تصویر ذہن میں نہیں ابھرتی جس پر یہ نظم لکھی گئی ہو مثال کے طور پر اگر ان کے عنوان تبدیل کر کے "اجنتا" والی نظم پر" ایلورا" یا" ایلورا" پر" اجنتا" کے عنوان دے دئے جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا بلکہ یہ اشعار کھجوراہو کے مندر" ایلیفنٹا کے غار یا کسی اور آثار قدیمہ پر منطبق کئے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں"۔

وجد پر یہ تبصرہ بڑی حد تک صحیح ہے مگر فاروقی نے ان کی غزل کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے لکھتے ہیں:۔

" وجد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے میں استادانہ پختگی سے تعبیر کرتا ہوں یعنی لہجے میں ایک اعتماد اور وقار اور ادائیگی خیال میں ایک دھوکا دینے والی آسانی اس لئے شعر بظاہر بلا کسی غیر معمولی کوشش کے کہا ہوا اور خود بخود ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ کیفیت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کی غزل کی شاعری بہت محتاط شاعری ہے ان کے یہاں کھل کھیلنے کے وہ انداز نظر نہیں آتے جو حسرت کی غزل کو اگر زندگی اور گرمی بخشتے ہیں تو اسے بھونڈی، عام اور کبھی کبھی بنا دیتے ہیں۔"

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وجد نظم ہی کے شاعر ہیں البتہ ان کی نظم کا سانچہ اور اس کا اسلوب اس طرح کی نظم گوئی سے قریب ہے جو اب گزرے زمانے کی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ نظم نگاروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں حکمت، سرور جہان آبادی اور تلوک چند محروم وغیرہ آتے ہیں۔ اقبال کی ابتدائی نظمیں بھی اس ذیل میں آتی ہیں وجد کی ان نظموں میں جس عنصر کی کمی ہے وہ داخلی عنصر ہے اسی لئے یہ نظمیں اس کرب اور تجسس سے عاری ہیں جس کی فاروقی صاحب کو تلاش ہے مگر یہ خصوصیت در اصل وجد کے شعری مزاج کی ہے۔ ان کے یہاں داخلیت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اسی لئے وہ غزلوں میں اور بھی زیادہ بے کیف نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی غزلیں ابتذال سے پاک ہوں اور نشیب و فراز کے بجائے ان میں ایک طرح کی ہمواری ملتی ہو مگر اس سے ان کی غزل میں کسی مثبت عنصر کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ان میں ایک طرح کی سطحیت ملتی ہے خارجی قسم کی نظمیت جو غزل کی تہ داری نرمی اور گھلاوٹ سے انھیں دور رکھتی ہے۔ وجد کو حسرت یا کسی غزل گو کے مقابلے میں رکھنا ایک طرح کی زیادتی ہوگی، ان کی جگہ نظم نگاروں کے ہی قبیلے میں ہوگی، وہ نظم نگار جو اقبال، حکمت اور جوش کے اسلوب سے آگے نہ بڑھ پائے بلکہ اسی دائرے میں رہ کر اب بھی مطمئن ہیں۔ روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کی نظمیں اسی طرز کی حامل ہیں البتہ ان میں تھوڑا بہت فرق موضوعات کی نوعیت سے ہو سکتا ہے۔ وجد نے زیادہ تر تاریخی عمارتوں اور اہم قومی و سیاسی شخصیتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے یہ نظمیں ایک نئے انداز کا قصیدہ ہیں۔ دیکھنے میں شاندار مگر داخلی سوز و ساز اور شخصی تجربے سے خالی۔ اس طرح کی شاعری کو میں اکہری شاعری کہتا ہوں۔

مخدوم کے مجموعہ" بساطِ رقص" پر بھی فاروقی نے مفصل تبصرہ کیا ہے مگر اس تبصرے میں زیادہ توجہ مخدوم کی ابتدائی دور کی نظموں پر صرف ہوئی ہے۔ اس دور کی نظمیں خواہ رومانی ہوں یا انقلابی و سیاسی اس نسل کی ترجمان ہیں جو ہیجان و انتشار کا شکار تھی۔ یہ سب شعرا، جوش کی قیادت میں ایک طرح کی اعصاب زدہ شاعری کی تخلیق کر رہے تھے۔ مخدوم کے یہاں تو پھر بھی حسن ہے دوسرے شعرا کی نظمیں تو دوبارہ پڑھنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ مخدوم کے یہاں" گل تر" سے ایک واضح ارتقا ملتا ہے اور صحیح معنوں میں پائدار شاعری انھوں نے اسی زمانے میں کی ہے۔ فاروقی نے بجا طور پر" چاند تاروں کا بن" اور" لحنِ جگر" کو اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ اگر وہ ان نظموں کا مفصل تجزیہ کرتے اور ان کی معنویت و ندرت کو اجاگر کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس رائے سے بھی اتفاق کرنا مشکل ہے کہ چارہ گر،

مراسلات

استفسار کے جواب میں

ایک استفسار کے ذریعہ "ہماری زبان" مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۶۸ء میں ڈی۔ اے ہیرسن قرآن صاحب نے اس ڈومنی کا حال معلوم کرنا چاہا ہے جس کا ذکر مرزا غالب کے ایک خط میں پایا جاتا ہے دوسرے گئودان کی تصنیف کے وقت منشی پریم چند کہاں مقیم تھے اور ان کے کیا مشاغل تھے اس ضمن میں میری معلومات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرزا غالب کے حالات زندگی پر اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں اس واقعہ پر کوئی تفصیلی مواد موجود نہیں، البتہ مالک رام نے ذکر غالب کے صفحہ ۴۸ سے ۵۱ تک "جوانی کی رنگ رلیاں" کے زیر عنوان مرزا حاتم علی بیگ مہر کے خط کے حوالہ سے کچھ مبہم اشارے کئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا ذکر مرزا غالب نے صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کے خط میں ہی "ستم پیشہ ڈومنی" کے الفاظ میں کیا ہے وہی اول اور آخر ہے اس کے علاوہ تفصیلی طور پر اس کے حالات اور کسی جگہ نظر سے نہیں گزرے۔

(۲) گئودان منشی پریم چند کا آخری ناول ہے جو جون ۱۹۳۶ء میں مصنف کی وفات سے چار ماہ قبل انھیں کے زیر اہتمام انھیں کے مملوکہ سرسوتی پریس بنارس سے ہندی میں شائع ہوا تھا بعد میں اسے جامعہ ملیہ دہلی کے مکتبہ سے اردو میں شائع کیا گیا، ۱۹۳۵ء میں وہ بمبئی کی فلم کمپنیوں سے علیحدگی اختیار کر کے تا دم مرگ بنارس ہی میں مقیم رہے جہاں وہ اپنے مطبع سرسوتی کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے اس کے علاوہ ہندی میں ایک ماہنامہ ہنس بھی اپنے زیر ادارت شائع کرتے رہے۔

گئودان کی تصنیف و اشاعت کے تمام مراحل اسی زمانہ قیام بنارس میں انجام پذیر ہوئے مزید تفصیل کے لئے زمانہ کانپور کا پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء کا وہ مضمون ملاحظہ کیا جائے جو مدیر زمانہ منشی دیا نرائن نگم نے "پریم چند کی باتیں" کے زیر عنوان لکھا ہے۔

اس کے علاوہ منشی پریم چند کے ایک قریبی رفیق جناب مدن گوپال نے ان کے حالات زندگی پر ایک کتاب "قلم کا مزدور" لکھی ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے ابھی حال میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(محمد ظہیر وارثی کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر)

فلموں میں اردو شعرا کا کلام

یہ بات تو صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ آبا و اجداد کی وفات کے بعد ان کی ساری ملکیت اولاد کی وراثت میں آتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر ہے تو اس کی وفات کے بعد اس کے دیوان و کلیات کا پاسبان اس کی اولاد ہوگی۔ اگر اس کی غزلیات منظر عام پر نہیں آئی ہیں تو شائع کرا کے ایک یادگار کے طور پر رکھا اسی طرح اگر کوئی ادیب ہے تو اس کا بھی مسودہ بعد وفات محفوظ رکھا جائے۔ در اصل میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی اردو کی کل ہند کمیٹی بن جائے جس میں شعرا و ادبا کا ادبی ذخیرہ رکھا جائے۔ ہم شبانہ روز دیکھتے ہیں کہ کئی شعرا کا کلام فلموں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور ان سے کتنی ہی رقم کی کفایت ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایک مذکورہ بالا کمیٹی عمل میں لائیں۔ اگر کوئی فلمساز و موسیقار کسی بھی شاعر و ادیب کی ادبی تخلیق فلم میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے پہلے کمیٹی سے اجازت طلب کرنا ہوگی۔ اور جو بھی اس تخلیق کی واجبی و مناسب قیمت ہو اسے وہ ادا کرنا ہوگی۔ اور اس رقم کو کمیٹی کے کام میں لایا جائے۔ اور اس رقم سے دیگر شعرا و ادبا پر ابھی سے ابھی تک کا اجرا عمل میں لایا جائے۔ اس امر سے اردو ادب کی خدمت بھی ہوگی اور ادبی تشکل بھی برقرار رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقدام بہت ہی مجبوری کی حالت میں اٹھائے جائیں گے کیونکہ آج اردو زبان کو ایک غیر ملکی و لاوارث زبان سمجھا جاتا ہے لہذا اسی بہانے اردو فروغ پائے گی۔ اور بہت سے پروگرام بھی اردو کے لئے عمل میں آئیں گے اور امید ہے کہ اہل ذوق حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی استفادہ اٹھا سکتی ہیں۔ فلم مرزا غالب میں کتنی ہی غالب کی غزلیں مستعمل ہوئیں۔ اگر آج کوئی مذکورہ بالا کمیٹی ہوتی تو فلمساز، ہدایت کار و موسیقار صاحبان سے کچھ معاوضے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ مجاز کی غزلیں فلم ٹھوکر و آسماں محل میں لی گئیں۔ غالب و مجاز کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کی غزلیں و نظمیں بھی فلموں کی زینت کی اہم اجزا ثابت ہوئیں۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی غزلیں فلم لال قلعہ میں پیش کی گئیں۔ میں تو صرف ایک کمیٹی بنانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ محض اس لئے کہ آج اردو کمیٹیوں کے پاس آمدنی نہیں ہے کہ وہ آگے اقدام بڑھا سکیں۔ اگر یہ مشورہ سہی ہے کارآمد ہے تو پھر کہنا ہی کیا۔ میں فلمسازوں، ہدایت کاروں و موسیقاروں سے التماس کروں گا کہ اگر کوئی ایسی کمیٹی بنے تو اس میں آپ حضرات بھی پورے پورے تعاون سے اس کمیٹی کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

میں اہل ذوق حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مشورے کو عملی جامہ پہنا کر اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں مجھے امید ہے کہ فلمساز و موسیقار حضرات میری اس تجویز سے ضرور متفق ہوں گے۔ اگر اس مضمون میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو میری اصلاح فرمائیے اور مجھے شکر گزاری کا موقع عطا فرمائیے۔

(محمد خالد جو اہل رود بھوپال ما)

شکاگو سے اردو ادب کے بارے میں نکلنے والا رسالہ "محفل"

شکاگو (پی ٹی آئی) تاشقند، ماسکو ہی میں نہیں بلکہ یورپ اور امریکا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں جدید ترین طریقوں سے اردو پڑھانے کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہ مرکز اپنے طلبہ کو اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھی بھیجتا ہے۔ غیر ممالک میں اردو کے مقبول ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے شکاگو سے نکلنے والا رسالہ "محفل"۔ اس جریدے کے ایڈیٹر جناب کارلو کپولا نے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اپنے جریدے "محفل" کے بارے میں کچھ اہم اور دلچسپ اطلاعات دیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جریدہ نکالنے کے بارے میں بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کیونکہ کوئی ایسا رسالہ ہونا ضروری تھا جس کے ذریعہ امریکا اور یورپ کے لوگوں کو صرف اردو ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب سے متعارف کرایا جا سکے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں چودھری محمد نعیم نے (جو شکاگو میں اردو کے استاد ہیں) کارلو کپولا کی کافی مدد کی۔ (یہ دونوں حضرات "محفل" کے ایڈیٹر ہیں) جریدہ نکالنے کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے دوستوں سے صرف ۳۰ ڈالر جمع کئے۔ کارلو کپولا نے انٹرویو دیتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا کہ اس طرح صرف ۳۵ ڈالر میں "محفل" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس پہلے شمارے میں اردو کہانیوں کے ترجمے اور فیض احمد فیض کی نظموں کے ترجمے شامل کئے گئے تھے۔ کارلو کپولا نے کہا "بغیر کسی مستقل مالی تعاون کے "محفل" جیسے خالص ادبی رسالہ کا نکالنا ایک بہت دشوار گزار کام ہے۔ امریکا جیسے ترقی پسند ملک میں بھی اچھے ادب کو پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑی نہیں ہے۔ اس طرح "محفل" ایک بیوپاری رسالہ کی حیثیت سے ناکام ہو گیا جیسے کہ عام طور سے ادبی رسالے ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم نے اپنے دوستوں کی مدد سے "محفل" کی سہ ماہی اشاعت جاری رکھی۔ "محفل" میں اب تک اردو کے مشہور افسانہ نگاروں جیسے قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بیدی، عصمت، کے افسانے اور فیض، مجاز، جذبی، اختر الایمان، ساحر اور بہت سے دوسرے شعراء کے انگریزی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ کارلو کپولا پچھلے سال جولائی میں شکاگو سے اردو ادب کا مطالعہ کرنے علی گڑھ آئے ہیں۔ انھوں نے شکاگو میں اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ کیا تھا۔ مسز ایلیا کپولا بھی شکاگو میں ملیالم کی طالبہ رہ چکی ہیں۔ انھوں نے اسپینی (جو ان کی مادری زبان ہے) سے انگریزی میں کچھ اہم ترجمے کئے ہیں۔ کپولا نے "محفل" کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اردو کے ادب پاروں کا انگریزی میں ترجمہ حاصل کرنا ایک دشوار کام ہے۔ عام طور سے جو ہندوستانی ترجمے کرتے ہیں وہ کم از کم زبان کے اعتبار سے تو قطعی نامناسب ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کا مزاج انگریزی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ انگریزی میں اردو شاعری کی باریکیوں کا ترجمہ کرنا ایک بہت دشوار اور دیر طلب مسئلہ ہے۔ ترجمے کے لئے دونوں زبانوں کا مطالعہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے خیال سے بہترین ترجمے اس صورت میں ہو سکتے ہیں جب کوئی ایسا شخص جس کی مادری زبان اردو ہو اور وہ کسی امریکی کے ساتھ مل کر ترجمے کرے۔ اس طرح انھیں ترجمے ہندوستانی طلبہ کے ساتھ مل کر کرنا پڑتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دوسرے امریکی بھی ہندوستانی ادب کا مطالعہ کرنے آئے ہیں۔ اسٹیو مارک پولیس نے بھی شکاگو میں اردو اور ہندی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اب "محفل" کے ایک سب ایڈیٹر ہیں اور علی گڑھ میں جدید ہندی کہانی کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اردو کی غیر ممالک میں مقبولیت اور "محفل" جیسے جریدے کا نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ایک ترقی یافتہ اور مقبول زبان ہے۔ ہر سال کافی طالب علم امریکا اور یورپ کے مختلف ممالک سے اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ہندوستان آرہے ہیں۔

مکتوب بھوپال

مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر جرمنی روانہ

مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر جناب فخر الدین ترقی پسند کسانوں کے ایک ۸ رکنی وفد کے ہمراہ مشرقی جرمنی روانہ ہو گئے۔ اس وفد کے دورہ کا انتظام بھارت سرکار کی وزارت خوراک و زراعت نے کیا ہے۔ فخر بھائی کو اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے بھوپال انجمن ترقی اردو کے صدر جناب ایم عرفان اور انجمن کے دوسرے اراکین موجود تھے۔

غالب — ملک کے عظیم فرزند و یادگار عالمی شخصیت"

وکرم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہندی کے صف اول کے کوی ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن نے صوبائی غالب تقریبات کمیٹی میں شمولیت کے دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے لئے باعث صد فخر و مسرت قرار دیا ہے۔ آپ نے اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ صوبہ میں غالب کی صد سالہ تقریبات "ہندوستان کے اس عظیم فرزند اور یادگار عالمی شخصیت" کی شایان شان منائی جائیں۔ راجیہ پال کے سکریٹری اور انگریزی کے اسکالر جناب دی کرسٹن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار اس وفد سے کیا جو آپ کو شمولیت کی دعوت دینے راج بھون میں گیا تھا۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان کو فراخ دلی سے اس ورثہ کو اپنانا چاہئے جو غالب کی دین ہے

بھوپال میں اردو میڈیم کا پہلا ہائی اسکول قائم

بھوپال کے مدرسہ حمیدیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ مدھیہ پردیش کی راجدھانی کا پہلا اردو میڈیم کا ہائی اسکول ہوگا۔ اس سال مڈل کے شاندار نتائج کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے اسے ہائی اسکول میں تبدیل کرایا ہے۔ ایم پی انجمن کے آفس سکریٹری جناب حسنات صدیقی اور انجمن ترقی اردو بھوپال کے جنرل سکریٹری پروفیسر حسن مسعود نے اسے اردو کے لئے ایک خوش آئند علامت قرار دیتے ہوئے اردو دوستوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے عملی تعاون اور مدد کے ذریعہ اپنا فرض ادا کریں۔

انجمن ترقی اردو ایچ۔ای۔ایل کی اہمیت تسلیم

انجمن ترقی اردو ہیوی الیکٹریکلز (بھوپال) کی اہمیت کو وہاں کی قومی و تہذیبی سرگرمی کمیٹی نے اپنے ایک یونٹ کی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ یہ کمیٹی کارخانہ کی تہذیبی انجمنوں اور اداروں اور سماجوں کو ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ یہ ایچ۔ای۔ایل کی تسلیم شدہ کمیٹی ہے جو اپنے سے ملحقہ اداروں کو برائے نام کرایہ پر دفتر کے لئے کمرہ، جلسوں اور تقریبات کے لئے جگہ فراہم کرتی ہے۔ اس کا تسلیم شدہ ادارہ ان سارے حقوق سے فیضیاب ہوتا ہے جو اس کے دائرہ عمل میں ہیں۔ اردو کا یہ پہلا ادارہ ہے جو تسلیم کیا گیا ہے۔

مراسلاتی کورس میں اردو کی کوچنگ کا مطالبہ

انجمن ترقی اردو شہر بھوپال نے جناب شاکر علی خاں ایم ایل اے، جناب کے این پردھان ایم ایل اے، جناب قمر الحسن حنیف ایڈیٹر ندیم، جناب اے آر رشدی ایڈیٹر افکار، جناب ممنون حسن خاں صدر انڈو سوویت کلچرل اسوسی ایشن، جناب حسن مسعود جنرل سکریٹری اور جناب ایم عرفان صدر شہری انجمن کے دستخطوں سے چیرمین مدھیہ پردیش ہائر سکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن کو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں انٹرمیڈیٹ میں اردو میں بھی مراسلاتی کوچنگ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

علامہ یوسف قیصر کا انتقال

بھوپال کے قدیم صحافی اور بزرگ شاعر و مصنف علامہ یوسف قیصر کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ علامہ تقریباً ۸۰ برس کے تھے۔ آپ کئی کتب کے مصنف تھے۔ آپ کلکتہ کے مشہور رسالہ "الناظر" اور اخبار "اودھ پنچ" سے بھی وابستہ رہے۔ بھوپال میں آپ کے انتقال کی خبر سے صف ماتم بچھ گئی۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو کوٹہ کا جلسہ

کوٹہ انجمن ترقی اردو کوٹہ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب شافعل عثمانی صاحب منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں پیش کی گئیں جن کو حاضرین جلسہ نے اتفاق رائے سے منظور فرمایا۔

بہی خواہان اردو کا یہ کثیر اجتماع جو انجمن ترقی اردو کوٹہ کے زیر اہتمام جمع ہوا ہے۔ حکومت راجستھان سے اس کے منظور کردہ حسب ذیل مطالبات پر افسران محکمہ تعلیم سے واقعی طور پر عملدرآمد کرانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

(۱) اردو مادری زبان والے طلبہ کی مقررہ تعداد جن جن پرائمری اسکولوں میں پوری ہے وہ خواہ سرکاری طور پر چل رہے ہوں یا سمیتیوں کے زیر اہتمام ہوں اردو کی تعلیم اردو کے ذریعہ جاری کرائے۔ (۲) مڈل اسکولوں میں اختیاری حیثیت سے جہاں جہاں اردو کا مطالبہ ہے اس کا اجرا کرائے (۳) سکنڈری اور ہائی اسکولوں میں جہاں جہاں طلبہ کا مطالبہ ہے۔ اختیاری اور لسانی فارمولہ کے تحت اردو کی تعلیم کا انتظام کرایا جائے۔ (۴) جہاں جہاں ضرورت ہے اردو کے ٹیچروں کا واقعی طور پر انتظام کرائے۔ واضح رہے کہ اردو ٹیچرس کی کمی نہیں ہے مگر افسران متعلقہ دانستہ ان کا تقرر نہیں کرتے ہیں (۵) لسانی اقلیتی کمشنر الہ آباد کا تجویز کردہ رجسٹر تعداد طلبہ ہر اسکول میں رکھوایا جائے (۶) اردو کمیٹی مقررہ راجستھان کی تجویز کے مطابق اپلیکشن رپورٹ میں اردو کے طلبہ کی تعداد کا خانہ واقعی بڑھوایا جائے (۷) اردو کے ٹیچرس کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے (۸) پرائمری اسکول کے کورس کی کتابوں کی غلطیاں جلد از جلد دور کی جائیں (۹) اردو کے طلبہ کو سیکشنوں میں خلاف حکم گورنمنٹ نہ بانٹا جائے۔ (۱۰) ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۲۹ کے تحت کوئی شخص اپنی زبان مذہب اور نسل وغیرہ کی بنیاد پر کسی تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا۔ لیکن باوجود اس کے متعدد سرکاری اسکولوں کے ہیڈ مدرسین اردو کے داخلوں میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اور صرف اردو کے طلبہ کا داخلہ یہ کہہ کر کہ جگہ نہیں ہے انکار کر دیتے ہیں ایسے ہیڈ مدرسین کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے۔

تجویز نمبر ۲ بہی خواہان اردو کا یہ کثیر اجتماع حکومت راجستھان سے مطالبہ کرتا ہے۔ (۱) کہ اس کی مقررہ کمیٹی متعلقہ کی میٹنگ فوری طور پر کی جائے۔ اور حسب قاعدہ اس کے دو جلسے ہر سال ہوا کریں اور اس کی خالی جگہ فوراً پر کی جائے۔ (۲) اردو کی کتابیں طبع کرانے پر جو دس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرنے کا اعلان چیف منسٹر صاحب نے کیا ہے اس پر فوری عمل کیا جائے۔ (۳) اردو کی کتابیں اسکولز اور پبلک لائبریریوں میں خریدی جایا کریں۔ (۴) تمام قوانین و اطلاعات اشتہارات اور دیگر معلومات کے متعلق لٹریچر اردو میں شائع کرایا جائے (۵) دیگر ریاستوں کی طرح ریاست راجستھان سے بھی ایک اردو کا رسالہ جاری کیا جائے۔ اور اردو سیکشن کھلوایا جائے۔ (۶) جہاں جہاں اردو داں طبقہ اچھی تعداد میں ہے وہاں اردو داں C. R. R. A. مقرر کئے جائیں۔ (۷) ساہتیہ اکاڈمی راجستھان اودے پور اردو کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے۔ اس کو ہدایت کی جائے کہ مثل دیگر زبانوں کے جن کو وہ منظور کر چکی ہے اردو پر بھی اس کی رقم صرف کرے۔ کتابیں چھپوائے، انعامات دے اور مستند ادبا و شعرا کو وظیفہ دے اور انجمن ترقی اردو راجستھان کا مقرر کردہ نمائندہ اپنی کمیٹی میں شامل کرے۔

تجویز نمبر ۳ انجمن ترقی اردو کوٹہ جامعہ اردو علی گڑھ سے درخواست کرتی ہے کہ اس کے امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے لئے کسی مقامی پروفیسر یا مستند منشی یعنی مہتمم امتحانات مقرر کیا جائے۔ اور اس ضلع کے دیگر مقامات کے لئے بھی یہاں سے موزوں شخص مہتمم سینٹر بنا کر بھیجے جایا کریں۔ تاکہ جامعہ کے مصارف بھی کم ہوں اور سینٹروں کو بھی سہولت ہو۔ مذکورہ بالا قرار دادیں پیش کر کے انجمن ترقی اردو کوٹہ امید کرتی ہے کہ راجستھان گورنمنٹ ان پر توجہ دے کر یہاں اردو کی ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے گی۔

(عبدالرحیم ایڈوکیٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو کوٹہ راجستھان)

انجمن ترقی اردو کانپور کی مجلس عاملہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کانپور کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب سید قاضی محمد علی صاحب بتاریخ ۱۴ جولائی ۶۸ء بمقام دفتر انجمن ترقی اردو چمن گنج کانپور منعقد ہوا۔ جلسہ میں طے پایا کہ نئے سال کی ممبر سازی کا کام پوری شد و مد سے شروع کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ معززین شہر، ادبا و شعرا اور ممبران مجلس منتظمہ کا ایک جلسہ جلد سے جلد بلایا جائے اور ان حضرات کے مشورہ سے صوبائی کانفرنس بلانے پر غور کیا جائے تاکہ آئندہ اتر پردیش میں اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جا سکے۔ (عاشق صمدانوی سکریٹری)

انجمن ترقی اردو امرتسر کی ماہانہ ادبی نشست

امرتسر۔ انجمن ترقی اردو امرتسر کے زیر اہتمام تیسری ماہانہ ادبی نشست جناب بی۔ ایس۔ جج ایڈیٹر روزانہ "سکھ" کے دفتر واقع کورٹ روڈ میں زیر صدارت رائے بہادر پرکاش چندر پرکاش صدر انجمن ہذا منعقد ہوئی۔ جس میں امرتسر کے سرکردہ شعرا کرام کے علاوہ جناب صابر ابوہری ایم۔ اے سینئر سپرنٹنڈنٹ ٹیلیگراف، جناب پورن سنگھ ہنر، جناب کیشو رام کمشنر ایس۔ ڈی۔ او ٹیلی فون، جناب راز منتوکھوی، جناب اندر جیت دت شرف اور جناب جے۔ ڈی۔ ایس۔ صابر ایم۔ اے نے شرکت فرمائی۔ (پورن سنگھ ہنر)

انجمن ترقی اردو بیرن پور کی خبریں

گڈا میں پبلک اردو لائبریری کا قیام

بیرن پور (سنتھال پرگنہ)۔ گڈا کے اردو دوستوں کا ایک عام جلسہ انجمن ترقی اردو شاخ گڈا کے زیر اہتمام زیر صدارت جناب کمال الدین صدیقی، نائب سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو و جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ بیرن پور (سنتھال پرگنہ) منعقد ہوئی۔ اولاً الحاج حبیب عالم و طیب علی صاحبان نے گڈا میں اردو لائبریری کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ متفقہ طور پر مندرجہ ذیل حضرات "پبلک اردو لائبریری" کے عہدہ دار منتخب ہوئے سرپرست جناب صغیر احمد صاحب ایڈوکیٹ، صدر جناب نذیر احمد صاحب وکیل، سکریٹری۔ جناب طیب علی کامل مظہری، خازن عبدالرزاق صاحب، لائبریرین، جناب حافظ عبدالحق صاحب، محصل، جناب شرف الدین صاحب۔

ممبران مجلس عاملہ۔ جناب منظور۔ شمس الحق۔ معراج الدین۔ معین الدین۔ عبدالصمد۔ محمد حاتم و محمد حنیف تبلر ماسٹر صاحبان۔ آخر میں صدر جلسہ جناب کمال الدین صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کرکے اردو زبان کو اس کا صحیح اور جائز مقام دلانے کے لئے جدوجہد کرنے کا پیغام دیا۔ انھوں نے لائبریری کے قیام پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اسے ایک اچھا شگون بتایا۔ ساتھ ہی ایسی اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے تعاون کا پورا پورا یقین دلایا۔ آخر میں صدر جلسہ کی اجازت سے جلسہ برخاست ہوا

انجمن ترقی اردو بیرن پور کا جلسہ

جناب کمال الدین صدیقی نائب سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو و جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ بیرن پور جب گڈا کے دورے پر آئے تو ان کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو شاخ گڈا کے زیر اہتمام ایک جلسہ انھیں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب الحاج حبیب عالم و جناب صغیر احمد ایڈوکیٹ صاحبان نے جناب کمال الدین صدیقی کی اردو کی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی اور امید ظاہر کی کہ ان سے اردو زبان کی بہت زیادہ خدمت ہوسکے گی۔ اردو لائبریری کے قیام کے سلسلہ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور انھیں سنتھال پرگنہ ضلع میں اردو زبان کا سالار اعظم کہا۔ آخر میں جناب کمال الدین صدیقی نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ سنتھال پرگنہ ضلع میں اردو تحریک کا مختصراً خاکہ پیش کیا اور یقین دلایا کہ اگر ضلع کے تمام اردو دوستوں کا تعاون مل سکا تو بہت زیادہ کام اردو زبان کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لئے ہوسکے گا۔ (نامہ نگار)

آسان اردو کی تعلیم ہی کے ذریعہ نئی نسل لکھنؤ کی تہذیب سے روشناس ہوسکتی ہے

لکھنؤ، گورنر گوپالا ریڈی نے یاتکا دو یا لکھنؤ کے لیے لکھنؤ ایجوکیشنل سوسائٹی کے لئے حاصل کی ہوئی عمارت کی رسم افتتاح ادا کی۔ اس موقع پر ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے گورنر نے طلبہ کردار اور ہمہ گیر شخصیت کی تعمیر کی ضرورت واضح کی اور اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہ لکھنؤ کی تہذیب تیزی سے مٹتی جارہی ہے۔ گورنر نے کہا کہ اگر آسان اردو کی تعلیم بھی ساتھ ہی ساتھ دی جاسکے تو ممکن ہے کہ نئی نسل اردو ادب کے مطالعہ سے اس تہذیب کے بارے میں کچھ خیالات برقرار رکھ سکے پھر وہ چکبست جیسے شاعروں کو بھی سمجھ سکے گی۔ (سیاست)

بڑودہ میں ایک اردو لائبریری کا قیام

بڑودہ ۲۵۰ رجولائی۔ بزم محبان ادب کی طرف سے بڑودہ میں ایک اردو لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی رسم افتتاح جناب مظہر الحق صاحب علوی نے ادا فرمائی۔ اس کے بعد پروفیسر منصور صاحب قریشی کی زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں مقامی اور بیرونی شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کے بعد جناب مظہر الحق علوی اور دیگر اراکین بزم نے یہ تجویز پیش کی کہ بڑودہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی جائے۔ یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کرلی گئی چنانچہ اسی وقت سے کوششوں کا آغاز کردیا گیا اور انشاء اللہ جلد ہی بزم محبان ادب انجمن ترقی اردو کے دفتر کی بھی رسم افتتاح ادا کرے گی۔

(معصوم بڑودوی۔ سکریٹری بزم محبان ادب بڑودہ)

اردو زبان کی فلاح وبہبود کی طرف حکومت ہریانہ توجہ دے گی

چنڈی گڑھ ۱۲ رجولائی ٹیگور تھیٹر سدھار سمیتی چنڈی گڑھ کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ کی صدارت فرماتے ہوئے چودھری رن سنگھ وزیر محنت و ترقیات ہریانہ نے اردو زبان کی ہردلعزیزی اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ اردو کی ترقی تعمیر اور زبان کی حفاظت کے لئے جو طریقے ممکن ہوں وہ اختیار کئے جائیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کی طرف حکومت ہریانہ متوجہ ہوگی۔ مشاعرہ میں ملک کے جن مشہور شعرا حضرات نے حصہ لیا ان میں سے جناب معصوم، جناب شباب للت ایم۔ اے، جناب تسنیم ایم۔ اے، پروفیسر رام مورتی کمل ایم۔ اے۔ ایم ایڈ۔ پروفیسر رام کمار کوتل، صادق انبالوی ایم۔ اے۔ ایم ایڈ، جناب پرکاش نانند پرویز ایم۔ اے، جناب پرواز انبالوی ایم۔ اے، جناب راشد جلال آبادی، جناب ادم پرکاش ملک ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کنوینر انجمن ترقی اردو ہریانہ اور جناب جسپال کے نام قابل ذکر ہیں۔ (نامہ نگار)

پارلیمنٹ میں ممبروں کو مادری زبان میں بولنے کا حق دلانے کی جدوجہد

...سبھا نے ایک غیر سرکاری بل پر تمام بحث کی جس کا مقصد آئین میں ترمیم لا کے پارلیمنٹ کے ممبروں کو ایوان کی کارروائی میں مادری زبان میں حصہ لینے کا حق دلانا تھا۔ بل دراوڑ منترکزہاگام کے ممبر ایرا اسیزہاین نے پیش کیا تھا۔ اس کے ذریعہ آئین کے آرٹیکل ۱۲۰ میں ترمیم کرانا مقصود تھا۔ محرک نے کہا کہ وہ موقع خوشی کا ہوگا جب ہر ممبر ایوان کے اندر اپنی مادری زبان میں بول سکے گا۔ جو لوگ ہندی یا انگریزی نہیں بول سکتے وہ بھی دس لاکھ افراد کی نمائندگی کرتے ہیں اس وقت انہیں اسپیکر کو قائل کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہندی یا انگریزی میں اظہار خیال کرنے سے قاصر ہیں ڈپٹی اسپیکر آر کے کھاڈلکر نے جو صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے بتایا کہ ممبروں کو اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ اپنے معروضات مادری زبان میں پیش کریں۔ (ریاست)

جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اردو علی گڑھ سنٹر کوٹہ راجستھان

انجمن ترقی اردو شاخ کوٹہ کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم اسناد بتاریخ ۲۵ و ۲۶ رجون ۱۹۶۸ء کو زیر صدارت جناب الحاج مولانا احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور منعقد ہوا۔ جناب عبدالرحیم ایڈوکیٹ جنرل سکریٹری نے انجمن ترقی اردو کوٹہ کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد کامیاب طلبہ کو صدر جلسہ نے اسناد تقسیم کیں۔ اس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جناب تابش سرونجوی، جناب میر عرفانی، جناب سالک عزیزی جھنجھنوی، اور راہی بھوپالی کے علاوہ مقامی شعراء میں قمر، شاد، راز صاحبہ، اور ناز صاحبہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا

صفحہ ۷ سے آگے

معمولی اور سطحی نظم ہے۔ ممکن ہے اس کا گیتوں کا لہجہ اور پھر فلم میں اس کی مقبولیت نے فاروقی کو بدگمان کیا ہو ورنہ واقعہ یہ ہے کہ "چارہ گر" ایسی جگہ پر ایک خوبصورت اور موثر نظم ہے مخدوم کی اور بھی متعدد نظموں پر انہیں غور کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ اس کے بعد بھی ان کے یہاں مسلسل تبدیلی اور ارتقا کا عمل جاری ہے۔ سردار جعفری کے مقابلے میں مخدوم کی تازہ نظمیں نئی شاعری سے زیادہ قریب ہیں اگرچہ وہ اپنی سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے نئی شاعری کے بارے میں نامناسب بیانات دیتے رہتے ہیں۔

سردار جعفری پر تبصرہ بھی اچھا ہے اگرچہ صرف دو مجموعوں کو سامنے رکھنے سے ان کی شاعری کے بیشتر عیوب پر فاروقی کی نظر نہ جاسکی۔ اس تبصرے میں بعض جگہ متضاد خیالات بھی ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سردار کے اچھے اشعار میں جو چیز ہمیں فوراً متوجہ کرتی ہے وہ ان کے لہجے کی اشرافیت اور علویت ہے۔"

مگر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔

"اگر عوامی شاعری کوئی چیز ہے تو اس کی جھلکیاں سردار کے یہاں ملتی ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ جس شاعری کی بنیادی خصوصیت علویت اور اشرافیت ہو وہ عوامی شاعری کبھی نہیں ہو سکتی۔ عوامی شاعری کی مثال جعفری کا کلام نہیں ہے بلکہ مطلبی فریدآبادی کی نظمیں اور گیت ہیں۔ ان کے مجموعے "پنہاری" "کسان رت" اور "ہیا ہیا" غالباً فاروقی کی نظر سے نہیں گزرے فاروقی کے تبصروں سے اختلاف اور بھی جگہوں پر ہو سکتا ہے لیکن اس سے ان تبصروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ یہ تبصرے ہمیں اکساتے، چھیڑتے اور کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلیشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R.N.2186/57 REGD NO-L92..

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت ۱-۸-۱۵-۲۲

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۲۷ - شمارہ ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ ر اگست ۱۹۶۸ء

اداریہ

غالب کی سو برسی کے سلسلے میں

کاموں کی تنظیم کی ضرورت

خوشی کی بات ہے کہ غالب کی سو برسی کے سلسلے میں اردو کے ادارے، ریاستی حکومتیں اور ادب دوست حضرات سبھی خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ غالب کی یاد میں جلسے کرانا، ان پر اچھے مقالے پڑھوانا، ان کے متعلق ڈرامے یا فلم تیار کرنا، ان کی تصانیف کی نمائش کرنا، ان کی تصانیف کے اچھے ایڈیشن شائع کرنا۔ ان کی تصانیف کے ترجمے ہندوستان کی دوسری زبانوں اور بیرونی زبانوں میں شائع کرنا، مشاعرے کرنا، اس دور کی اہم چیزوں کے فوٹو شائع کرنا، یہ اور بہت سے کام ہیں جن کی تیاری ہو رہی ہے اور امید ہے کہ فروری تک بہت سے کام ہو جائیں گے مگر اس وقت سب سے ضروری، ان چیزوں میں ربط و تنظیم پیدا کرنا ہے۔ مرکزی کمیٹی کو اس سلسلے میں جلد سے جلد یہ اعلان کرنا چاہئے کہ وہ کیا کام خود کرے گی اور کن کاموں کی دوسرے لوگوں سے توقع رکھتی ہے۔ ریاستی کمیٹیوں کو مرکزی کمیٹی سے ربط پیدا کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ کاموں کی تکرار نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سو برسی کے موقع پر جو اجتماع ہوں وہ سب ایک دن یا چند دنوں میں نہ ہوں بلکہ اس طرح پھیلائے جائیں کہ ۱۹۶۹ء میں جنوری سے لے کر جون تک تقریبات ہوتی رہیں اور لوگ جن تقریبوں میں چاہیں شریک ہو سکیں۔ مرکزی کمیٹی سے یہ بھی توقع ہے کہ وہ ریاستی کمیٹیوں یا یونی ورسٹی کی کمیٹیوں کو جو سہولتیں فراہم کر سکے کرے۔ مثلاً بعض تصانیف کی اشاعت کے لئے امداد دے بشرطیکہ مسودے تیار ہوں۔ نمائش کے لئے تصویریں اور دوسری چیزیں فراہم کرے اور ان کے لئے مناسب کرایہ لے لے۔ کچھ ریاستوں میں کمیٹیاں بن چکی ہیں۔ اب مرکزی کمیٹی ان کو نظر انداز کر کے دوسرے لوگوں کو نگراں مقرر کرے گی تو آئندہ کام میں دقت پیدا ہوگی۔ مناسب یہ ہوگا کہ ان سے رابطہ قائم کر کے ان کمیٹیوں اور مرکزی کمیٹی کے کاموں میں تنظیم پیدا کی جائے۔ اس موقع پر علمی کام ضروری ہیں، مگر وہ تو برابر ہوتے رہیں گے۔ غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی بہت سے پہلوؤں پر لکھنے کی گنجائش ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مگر یہ موقع خاص طور پر ہندوستان کے عوام، دوسری زبانوں کے جاننے والوں اور بیرونی ملکوں میں اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو غالب کی عظمت کا احساس دلانے کا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ غالب جس زبان کے شاعر تھے اس زبان کی قدر و منزلت بڑھے اور اس کی تعلیم اور چلن میں جو دشواریاں ہیں وہ دور ہوں۔ اس لئے اردو کی تمام انجمنوں، خصوصاً انجمن ترقی اردو ہند کی شاخوں کو چاہئے کہ غالب کی یاد میں پروگرام بنائیں اور اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لئے پوری کوشش کریں۔

شعبۂ لسانیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں

پروفیسر مسعود حسین خاں کا تقرر

علی گڑھ۔ ۴ ر اگست ۶۸ء علمی اور ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے چوٹی کے محقق، نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کا تقرر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ لسانیات میں پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا ہے اور موصوف نے یکم اگست کو اپنے نئے شعبے کا چارج لے لیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پرانے طالب علم اور استاد ہیں۔ ۶۱ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں قیام کے دوران مسعود حسین خاں

صاحب نے جو علمی اور تحقیقی کام کئے ان میں "قدیم اردو" بکٹ کہانی در قصۂ مہر افروز و دلبر کی اشاعت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(نامہ نگار ہماری زبان)

اردو نثر کی ایک معیاری انتھالوجی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب "ریڈنگز ان لٹریری اردو پروز" (READINGS IN LITERARY URDU PROSE) وس کانسن یونی ورسٹی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ان طلبہ کے لئے ہے جن کی اردو مادری زبان نہیں۔ اردو کی کئی سو سالہ نثر کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ثانوی سطح پر نہ صرف اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جا سکے بلکہ اردو کی پشت پر جو مخصوص تہذیبی تصور ہے اس کے بنیادی عناصر بھی سامنے آ جائیں۔ کتاب میں میر امن، مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، کرشن چندر وغیرہ مصنفین کی تحریریں شامل ہیں

بارہ بنکی کی تحصیل فتحپور میں ووٹروں کی فہرستیں اردو میں بھی

بارہ بنکی۔ بارہ بنکی ضلع کی فتح پور تحصیل کو درمیانی مدت کے الکشن کے لئے ریاستی حکومت نے اقلیتی زبان کا علاقہ قرار دیا ہے۔ اس قسم کی دوسری تحصیلیں بہرائچ۔ گونڈہ اور بستی میں ہیں ایک نوٹیفکیشن کے بموجب ان علاقوں کے ووٹروں کی فہرستیں اردو میں بھی شائع کی جائیں گی

(سیاست)

سہ ماہی مجلہ صحیفہ

مجلس ترقی ادب لاہور کا سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" ڈاکٹر وحید قریشی اور کلب علی خاں فائق کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے جس میں علمی، ادبی، تحقیقی اور سوانحی مقالات، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی مضامین کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی رفتار ادب کی عکاسی بھی ہوتی ہے نیز اس میں مجلس ترقی ادب لاہور کی تازہ ترین مطبوعات پر تبصرے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی سالانہ قیمت چھ روپے ہے جسے مجلس ترقی ادب ۲۔ کلب روڈ لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(دا صدیقی)

استاذی حضرت شفا گوالیاری کے نام

اے مرے محترم، مرے مشفق
کون کہتا ہے مر گئے ہیں آپ؟
آپ سا ایک محسن اردو
سچا فنکار، شاعر ممتاز
صاحب علم، رہبر کامل
بے غرض دوست حضرت ساقی
نیک فرزند، خیر خواہ پدر
مہرباں بھائی، باوفا شوہر
یعنی اک نیک خوش صفات انساں
ذہن و دل سے جدا نہیں ہوتا
کبھی مر کر بھی مر نہیں سکتا
اے مرے محترم، مرے مشفق
کون کہتا ہے مر گئے ہیں آپ!

حکومت یوپی نے مشاعروں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے کا فیصلہ کیا ہے

لکھنؤ۔ حکومت یو پی نے کوی سمیلن، مشاعروں، موسیقی، ناچ، کھیل کود کے پروگراموں اور تفریح کے طور پر ہوائی جہاز کی سواری اور اسی طرح کی سرگرمیوں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کر دینے کا فیصلہ کیا ہے سرکاری ذرائع کے بموجب ان پروگراموں اور سرگرمیوں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ کرکے یوپی میں علمی ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور فنون لطیفہ کو ترقی دینا مقصود ہے۔

(سیاست)

راجندر سنگھ بیدی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری

جناب سید نثار مصطفےٰ کو پٹنہ یونیورسٹی نے زیر نگرانی جناب ڈاکٹر اختر احمد اورینوی، ان کے تنقیدی مقالہ "راجندر سنگھ بیدی اور ان کی ادبی خدمات" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا اعلان کیا ہے

(نامہ نگار)

آخری دن کی تلاش شایع ہوگیا

محمد علوی کا نیا مجموعہ "آخری دن کی تلاش" شایع ہوگیا اس مجموعہ کی قیمت تین روپے ہے۔ شبخون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب

دنیائے ادب میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ پروفیسر ایم۔ این جین۔ ہاشمی (جو کہ ادبی دنیا میں جاوید نہال کے نام سے مشہور ہیں) کے مضامین کا مجموعہ (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب) شائع ہو گیا ہے۔

(ایم۔ اے نصر)

عبدالقوی دسنوی

محمد یوسف قیصر مرحوم

یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے میں تازہ تازہ بھوپال آیا تھا، مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں یہ تاج بھوپالی، وہ باسط بھوپالی (مرحوم)، آپ شعری بھوپالی، اور یہ شریف احمد جمالی، یہ حسن مسعود، یہ آفاق احمد اور کچھ شعراء اور ادبا سے بھی تعارف ہوا۔ دراصل میں "احمد ہوٹل" میں ٹھہرا ہوا تھا اور یہ جگہ یہاں کے شعراء، ادباء اور سیاسی لوگوں کے لئے بڑی پرکشش تھی۔ زیادہ تر حضرات سے یہیں ملاقات ہوئی کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے ان سے ملنے کے لئے جانا پڑا۔ علامہ محوی صدیقی۔ ان سے گھر جاکر ملا بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ ملے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر ابو محمد سحر سے حمیدیہ کالج میں ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی امتحانات کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ انھیں لوگوں کے ساتھ بھوپال کے مختلف مقامات احمد آباد اور شملہ دیکھنے کا موقع ملا، لیکن اب تک یوسف قیصر صاحب سے ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوئی کہ گرمی کی چھٹیاں آگئیں اور میں اپنے وطن دلسنہ چلا گیا

وطن سے واپسی پر کالج کے کاموں میں لگ گیا مجلس اردو کا انتخاب ہوا تو افتتاح کا سوال پیدا ہوا۔ طے یہ پایا کہ افتتاح ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کے ہاتھوں ہو اور اس موقع پر بھوپال کے بوڑھے لیکن قابل فخر شاعر و ادیب محمد یوسف قیصر صاحب کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک تہنیتی مجلس اردو سیفیہ کالج کی طرف سے پیش کی جائے۔ چنانچہ مجلس کا افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ پھر بوڑھے شاعر کو ایک طالب علم نے تہنیتی پیش کی۔ شاعر نے دھیمی آواز میں جوابی تقریر کی۔ سکریٹری مجلس نے شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ ختم ہوا۔ شہر کے لوگوں نے سیفیہ کالج کی اس پیشکش کو بے حد پسند کیا۔ اس لیے کہ قیصر صاحب کی سب عزت کرتے تھے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

قیصر صاحب کو میں نے پہلی بار سیفیہ کالج میں دیکھا۔ قد نکلتا ہوا، رنگ صاف، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ چھوٹی سی سفید داڑھی، اجلی بھنویں، آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ چلتے آہستہ آہستہ لیکن جسم میں تناؤ ابھی باقی تھا خمی نہیں آئی تھی۔

میں اکثر انھیں شام کو ابراہیم پورہ یا لوہا بازار میں دیکھتا آہستہ آہستہ جمعراتی کی طرف آتے ہوئے، معمولی جوتے اور نہایت میلی شیروانی میں، منہ میں پان اور پیک کے دھبے کپڑوں پر۔ داڑھی کا کچھ حصہ بھی پیک سے سرخ۔ قیصر صاحب کا روز معمول تھا جمعراتی آنا۔ کچھ لوگوں کے ساتھ سلامیہ ہوٹل میں بیٹھنا اور واپسی پر جمعراتی سے پان خریدتے جانا۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی یوسف قیصر ہے جو شاعر بھی تھا مضمون نگار بھی، مترجم بھی تھا اور مورخ بھی جس نے بھوپال میں صحافت کے گیسو سنوارے اور جس کی تنقید ایسی تیکھی تھی کہ حکومت بھوپال اسے شہر بدر کرنے پر مجبور ہوئی، لیکن شریف طبیعت تھے اور علمی صلاحیت کے مالک تھے اس لئے ان کے چاہنے والے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے "شہر بدر" کے زمانے کو اپنی سفارشوں سے مختصر کر دیا۔

آج سے تقریباً اسّی سال بیشتر یوسف قیصر فروری ۱۸۸۸ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے والد کا نام ناظم علی تھا۔ اس لئے اکثر مضامین میں نام کی جگہ "ناظم زادہ" رقم کرتے تھے۔ ابتدا میں گھر ہی پر اردو فارسی کی تعلیم ہوئی تھی اور انھوں نے جلد ہی ان

فضل احمد کریم فضلی

غزل

زہر غم کھا کے بھی اچھا تو ہوں
اور کیا چاہیے ہنستا تو ہوں
دل دشمن میں کھٹکتا تو ہوں
کچھ نہ ہونے پہ بھی آتا تو ہوں
کیا کروں آہ جو منہ سے نکلے
ویسے خاموش میں رہتا تو ہوں
کیا ضرورت مجھے ویرانے کی
بزم یاراں میں بھی تنہا تو ہوں
تم اگر میرے نہیں ہو، نہ سہی
میں بہر حال تمہارا تو ہوں
جانے وحشت کہ محبت ہے مجھے
کھویا کھویا ہوا رہتا تو ہوں
دیکھئے دیکھئے کب آتے ہیں
آنے والے ہیں یہ سنتا تو ہوں
آپ کو کھیل تماشے ہیں پسند
میں بھی اک کھیل تماشہ تو ہوں
آپ دیکھیں نہ تو کیا اس کا علاج
ویسے میں بزم میں بیٹھا تو ہوں
حال زار ان سے کہوں کیا فضلی
وہ سمجھتے ہیں میں اچھا تو ہوں

دسترس حاصل کر لی تھی، پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع
اس زمانہ میں منشی احمد علی شوق قدوائی کے والد کے یہاں ان
ناجانا تھا ان کی نظر سے قیصر صاحب کی غزلیں گزریں، انھوں
ان کا تخلص قیصر تجویز کیا۔ قیصر صاحب کے استاد معشوق علی خاں
ہتے جو غالب کے شاگرد تھے اس لئے قیصر صاحب کی ابتدائی
لیں غالب کی رنگ میں تھیں علامہ محوی صدیقی صاحب کا کہنا
ہے کہ قیصر تخلص اپنے استاد جوہر کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔

۱۹۰۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد امرتسر سے بھوپال تشریف
ے تھے اور تقریباً ایک ماہ قیام کیا تھا قیصر صاحب کے مولانا آزاد
سے بڑے گہرے تعلقات ہوگئے تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مجھ سے تعارف تو ہو چکا تھا اب ان کے ساتھ
رہنے کی بھی عزت حاصل ہوئی مولانا کی زبان پر
اردو فارسی کے سیکڑوں اشعار رہتے تھے، اٹھتے بیٹھتے
یہی مشغلہ تھا۔ امرتسر سے آتے وقت ان کے پاس
فارسی شعرا کا تذکرہ "آتش کدہ" تھا جس میں سے
بعض وقت اچھے اچھے شعر سنایا کرتے۔ رات کے
بارہ بجے تک کھلے میدانوں اور ریلوے پلیٹ فارم
پر چہل قدمی رہتی اور دن کو اکثر مولوی محمد امین زبیری
کے یہاں مجلس مباحثہ گرم رہتی۔"

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں۔

"یہ متین تذکرے پاکر مولانا صاحب بہت مسرور رہے
اب آتشکدہ ملا کر ان کے پاس چار تذکرے ہوگئے،
مولانا صاحب دن بھر ان کو دیکھا کرتے جو اچھا شعر دل
میں بیٹھ گیا وہ ہر وقت زبان پر رہتا تھا بڑے مزے
سے سنایا کرتے تھے سناتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ
اس کے کیف سے خود بھی بے خود ہوگئے ہیں۔ کبھی دل
چاہا تو میرے اصرار پر اپنی غزل کے دو چار شعر سنا دئے
مگر وہ بے کیف ہوتے تھے اور ان سے کوئی سرور
پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

(آج کل ستمبر ۱۹۵۸ء)

اسی زمانے میں قیصر صاحب نے والٹر کی ایک نظم کا ترجمہ
"مالن کی لڑکی" کے نام سے کیا۔ یہ نظم بنگلور کے ایک میگزین میں
شایع ہوئی۔

یہ زمانہ نواب سلطان جہاں کا تھا۔ سلطانیہ گرلس اسکول کے نصاب
میں جو ریاست کے محکمہ تعلیم سے منظور شدہ تھا کچھ خامیاں رہ گئی تھیں
قیصر صاحب نے اس پر سخت تنقید کی جو "پیسہ اخبار" لاہور میں
شائع ہوئی۔ حکومت نے قیصر صاحب کی اس تنقید کو پسند نہیں کیا
اور انھیں جلاوطن کر دیا۔

قیصر صاحب بھوپال سے نکل کر کانپور پہنچے پھر لکھنؤ میں مستقل
قیام کیا۔ یہیں عزیز لکھنوی سے ملاقات ہوئی اور دوستی ہوگئی۔ مولانا
ظفر الملک کے رسالہ "الناظر" سے جب متعلق ہوئے تو علامہ شبلی نعمانی
سے بھی ملاقات ہوئی اور پھر قیصر صاحب ہر دوسرے تیسرے دن
علامہ شبلی کے یہاں جانے آنے لگے جس سے تعلقات اور زیادہ
گہرے ہوگئے۔ مولوی عبدالرؤف عشرت کی کتابوں کی دکان تھی
جہاں عام طور سے شعراء اور ادباء جمع ہوا کرتے تھے قیصر صاحب
کی وہیں مولانا عبدالحلیم شرر اور ریاض خیرآبادی سے ملاقات
ہوئی اور تعلقات پیدا ہوئے۔ قیصر صاحب کچھ دنوں تک نول کشور
پریس میں بھی ملازم رہے۔

مولوی وحید الدین سلیم لکھنؤ سے "مسلم گزٹ" نکالتے تھے۔
علامہ شبلی کی وجہ سے قیصر صاحب اس کے سب اڈیٹر ہوئے۔ اس
زمانہ میں ایک فقیر بہت لہک لہک کر یہ شعر گلی کوچے میں گایا کرتا
تھا ؎

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

جب فقیر یہ شعر گاتا ہوا نکلتا تھا تو سننے والوں کے دلوں میں
ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ قیصر صاحب بھی
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے غلامی کے خلاف ایک نظم
لکھی جو "مسلم گزٹ" میں شائع ہوئی۔ جس کی اہمیت کا اندازہ اس
سے ہو سکتا ہے کہ حکومت نے "مسلم گزٹ" کی ضمانت ضبط کر لی
وحید الدین سلیم گرفتار ہوگئے اور حکومت نے ان پر مقدمہ چلایا۔

یوسف قیصر اس طرح جلاوطنی کے ایام گزار رہے تھے کہ آخر
علامہ شبلی کی سفارش سے بھوپال سرکار نے ان کا قصور معاف کر دیا اور
انھیں یہاں آنے کی اجازت دے دی چنانچہ بھوپال واپس آگئے
اور نواب سلطان جہاں کے ذاتی کتب خانے کے لائبریرین ہوئے۔

۱۹۰۷ء میں عبدالمتین تحاردی کے تعاون سے بھوپال میں
"مالوہ ریویو" جاری کیا۔

جون ۱۹۰۹ء میں بھوپال سے عورتوں کا رسالہ "الحجاب" نہایت
آب و تاب کے ساتھ نکالا جس کی سرپرست نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ
تھیں۔

اس زمانے میں شعرائے بھوپال نے اپنی ادبی صلاحیتوں کی تربیت
اور شعری ذوق کو نکھارنے کے لئے "صحبہ یاران" کے نام سے ایک
انجمن بنائی جس کے ممبران علامہ محوی صدیقی، سید محمد یوسف قیصر،
ارشد تھانوی، احسن دہلوی، عظمت اللہ بیگ، سرور قادری بدایونی
اور ذکا صدیقی صاحبان تھے اس انجمن کے خاتمہ پر انھیں لوگوں نے
"دائرہ ادبیہ" کی بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام ۱۸ اگست ۱۹۱۰ء کو
آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں بیرونی شعراء نے بھی شرکت کی تھی
اور جس کی روداد "آئینہ مشاعرہ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

غالباً ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد دوبارہ بھوپال
تشریف لائے تھے۔ جس کے بارے میں قیصر صاحب تحریر کرتے ہیں:

"ان اموات کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی بھوپال تشریف لائے اور بھوپال آکر احمد آباد ہی میں مقیم ہوئے۔ اب کے مولانا آزاد کے بہت سے عقیدت مند بھوپال میں ہوگئے۔

مولانا صاحب گھر سے چل کر درختوں کے سایہ میں صاف و شفاف پتھر کی چٹانوں پر بیٹھ جاتے، عقیدت مند ان کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے اور مولانا کی سحر البیانی اور زور کلام سے اس درجہ مسحور ہو جاتے کہ گھنٹوں سنتے رہنے پر بھی یہی دل چاہتا تھا کہ اسی طرح سنا کریں اور یہ آواز کانوں میں آتی رہے۔ کبھی رشد و ہدایت کی باتیں ہوتیں، کبھی اسلام کے حقائق و معارف تھے۔ کبھی حالات حاضرہ کا جائزہ تھا، کبھی مسلمانوں کی غفلت و جہالت کا تذکرہ تھا۔ کبھی منتخب اشعار زبان پر تھے کبھی طنز و مزاح تھا۔ غرض جس موضوع پر زبان کھلتی تھی ایک دریا موجزن ہو جاتا تھا۔

کچھ دنوں رہ کر کلکتہ چلے گئے پھر نہ آنا تھا نہ آئے۔ کلکتہ جا کر اخبار الہلال جاری کیا جو ملک میں بے حد مقبول ہوا" (آج کل ستمبر ۱۹۵۸ء)

۱۹۱۵ء میں نواب سلطان جہاں کی سرپرستی میں بھوپال سے ماہنامہ "ظل السلطان" جاری ہوا۔ شروع میں مولوی امین زبیری کے ساتھ یوسف قیصر صاحب بھی اس کے ادارہ میں شامل تھے۔

۱۹۱۸ء میں قیصر صاحب محکمہ تاریخ میں منتقل ہو گئے۔ اور مولوی امین زبیری کے مددگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ دفتر تاریخ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد قیصر صاحب کو پنشن ہو گئی۔ جب تک اس دفتر سے قیصر صاحب کا تعلق رہا وہ بڑی دلچسپی اور محنت سے کام کرتے رہے چنانچہ مولوی امین زبیری نے اپنی تصانیف کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور نواب سلطان جہاں بیگم نے بھی اپنی تصانیف کے سلسلے میں ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

قیصر صاحب کی تحریریں ملک کے معتدر رسائل تنویر المشرق، ادیب الہ آباد، العصر، دکن ریویو، الناظر لکھنؤ، زمانہ کانپور، آج کل، ہم گرٹ وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ اور ان کے تعلقات بھی اس دور کے ادیبوں اور شاعروں سے بڑے اچھے رہے، اکبر الہ آبادی، نوبت رائے نظر، احمد علی شوق قدوائی، مہدی افادی، علی حیدر طباطبائی، علامہ تحوی صدیقی ملا پوری، وغیرہ صاحبان کی ایک لمبی فہرست ہے جن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ منشی احمد علی شوق قدوائی ۲۸ رمئی ۱۹۱۳ء کو تحریر کرتے ہیں۔

"آپ میرے دوست ہیں۔ میں دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا یہ تو پاجیوں کا کام ہے کہ سامنے کی دوستی اور غائبانہ دشمنی۔ . . . . . . نقاد کے نکلنے پر ہم سبھوں نے جواب کو دیکھا حق یہ ہے کہ صفدر صاحب نے قابلیت کا حق ادا کر دیا بھوپال میں آپ بمشکل آپ کے ایک یا دو اصحاب ہوں گے جو پورے طور پر اسے سمجھیں ورنہ سوا اوپری باتوں کے عرب کے فلسفۂ عشق و حسن پر جو کچھ لکھا ہے اسے عامی کیا سمجھیں۔

(نقوش خطوط نمبر حصہ اول ص ۳۵۲)

شوق قدوائی کے ۱۰ رجون ۱۹۱۳ء کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ قیصر صاحب اپنی نظموں کی اصلاح ان سے چاہتے تھے۔

" . . . . واللہ باللہ جو بات آج آپ نے مجھے لکھی ہے اسی کو بجائے خود اور بھوپال کی موجودگی میں میں اکثر اپنے مرحوم دوست منشی شبیر حسن کو کہتا تھا کہ میرے دوست منشی ناظم علی کے بیٹے قیصر طباع، ذی علم اور ہر معنی سے ہوشیار۔ مگر ستم یہ ہے کہ وہ چوک جاتے ہیں اور تصحیح پر توجہ نہیں کرتے ہیں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ خود ہی آپ کو ایسا خیال ہوا۔ اور جب میں آپ کی نظموں کو درست کر کے آپ کے پاس بھیجوں گا اور ایسی جگہ جہاں میں دخل دوں گا وہاں دخل دینے کی وجہ بھی لکھ دوں گا۔ تو چند ہی دنوں میں آپ اپنی نظمیں کیا دوسروں کی نظموں پر بھی تصحیح کی عمدہ نگاہ ڈال سکیں گے۔

(نقوش خطوط نمبر حصہ اول صفحہ ۳۵۳)

مہدی افادی لکھتے ہیں،

"آپ صرف میرے ڈھب کی چیز نہیں بلکہ خیر سے میرے اچھے خاصے رقیب نکلے آپ لکھتے ہیں "میں اچھی کتابوں پر جان دیتا ہوں، پاکیزہ لٹریچر ہو لکھائی اچھی ہو، عمدہ جلد بندی ہو بس دیکھ کر بیقرار ہو جاتا ہوں۔"

یہ نئی آواز ہے جو میرے کانوں میں پڑی لیکن اس سے آپ کی مذاق حسن پرستی کی ایک کافی حد تک غمازی ہوتی ہے۔

(نقوش خطوط نمبر حصہ اول ص ۳۵۵)

ایک دوسرے خط میں مہدی لکھتے ہیں:

"آپ پہلے شخص ہیں جو برادُن سے اس حد تک اظہار دلچسپی کر سکے اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اس ملک میں ان کی تحقیقات کی گنجائش کہاں تک ہے۔" (نقوش خطوط نمبر حصہ اول ص ۳۵۷)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قیصر صاحب کی شخصیت کیا تھی اور ان کے تعلقات اس وقت کے مشہور ادبا سے کس طرح کے تھے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قیصر صاحب کے یہاں مشاہیر کے خطوط کا انبار لگا ہوا تھا لیکن یہ تمام خطوط

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

میٹڈ
۱۶

، اور اس کی تاریخ ولادت کا سرٹیفکیٹ بھی ساتھ
ے سال میں حج نہیں کیا علاوہ ازیں عازم حج
عازم حج محصول اور سفر حج کے قابل ہے
۱۴ (۳) اہمیت یعنی مرد یا عورت۔ ۴۔ عمر ۵۔
ح باست ۹ ہندوستان میں ماہر و کردہ شخص کا
رشتہ اور نیز ۱۱ رمضان سے پہلے سفر کرنا ہے یا
اگر اس جہاز میں جگہ نہ مل سکے تو دوسرے جہاز کا
ا ہے ۱۵ ارسال کردہ رقم، ڈرافٹ کا نمبر، رقم
الی تاریخ ۱۸ منسوخ کرنے کے لئے درخواست دہندہ

سٹ کلاس۔ (۱) درخواست مع نقل ہونی
اتو جس کی عمر چودہ سال سے اوپر ہو کرایہ کی پوری
لے ۵ سو روپے اور ۱ سال سے کم عمر کے بچے کے
ہر برکۃ کے لیے ۵۰ روپے زائد دینے ہوں گے
کا بعد ا حاجیوں کو ڈی لکس کیبن کی رقم کرایہ کے
یک حاجی کو بطور خدمت گار لے جانے کی اجازت
ں درخواستوں کی مجموعی تعداد سات سے زیادہ نہیں چاہئے۔
حالی چاہئے ہر بالغ کی درخواست کے ساتھ جس کی
۱۳ روپے، ایک تا تین سال کی عمر کے بچے کے لئے۔

مثال
ب جائیں اور ڈرافٹ ایسا ہونا چاہئے جسے بمبئی
پوسٹ سے بھیجا جائے۔ البتہ ایسے مقامات پر جو
سکتے ہیں، جو ملک ڈرافٹ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء سے
دالے ملک کے ذریعہ دوبارہ بھنانے کے قابل نہ
۲ خواتین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ہمسفر مرد
ب جائی جائیں اور وہ ایک ہی طبقے کی ہونی جائیں۔
۔ شخص کا نہیں یہ امر لازمی ہے کہ بہتر ہے اس لیے کھی
ست کے نام سے یا لفافوں پر اپنا نام اور پتہ نہیں
بیے اور ہر ماہ رمضان کے دوران چلنے والے دو
سعودی سے اور بقیہ ۷۵ حاجی منظوری سے بھیجے جائیں
۔ کیا جائے گا۔ (۵) کسی بھی لفافے کے اندر سات
"طبقہ" کی ہونی چاہئیں جب لفافے میں سات سے

ں جس کا تعین ذیل میں کیا گیا ہے۔
. W-FIRM .
نمبر / FIRM-
. .. / R / -
ہوگا "کسی طبقے کی نہیں"
ل ہوگا درخواست کا نشان طبقہ ہوگا اور لفافے کا
تردہ ہوتی رہی ہو تو اس پر اس طرح نمبر ڈالا جائیگا
نمبر MK/RM/

معاونہ برائے سلسلہ درخواست دہندہ
ہر ایک ریاست کا حرف تہجی نشان۔ ۸۔ اترپردیش۔ ۲ مغربی بنگال۔ ۷ بہار۔ ۳ مہاراشٹرا۔ ۴ کیرالا۔ ۲ آسام بی آندھرا پردیش ۸ جموں کشمیر
۱ میسور ۲ گجرات ۷ مدراس ۸ مدھیہ پردیش ۹ راجستھان ۱۰ پنجاب اور ہریانہ ۱۱ تری پورہ ۱۲ اڑیسہ ۱۵ دہلی ۔ ۱ منی پور ۔ ۶ ہماچل پردیش ۲ لکادیپ
ل پانڈیچری۔ نگوا۔ دمن اور دیو۔ ۲۷ انڈمان نکوبار۔ سکم۔ ۷ ناگالینڈ ۲۹ دادرا نگر حویلی۔ ۲ نیفا۔

(۱) طبقہ نمبر ۱۔ جن حاجیوں کے نام حج ۱۹۶۸ء کی ٹورسٹ کلاس یا فرسٹ کلاس ویٹنگ لسٹ پر تھے اور جنھیں کسی بھی جہاز میں جگہ نہ مل سکی۔ ان کو امسال یقینی طور پر جگہ دی جائے گی چنانچہ ان حاجیوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ آئندہ موسم حج کے لئے اپنی نئی درخواست کے ساتھ اپنے ویٹنگ لسٹ فارم منسلک کریں اور انھیں ایک ہی لفافے میں بھیجیں لیکن جن حاجیوں نے اپنے ویٹنگ لسٹ فارم کمپنی میں جمع کرکے اپنی رقم واپس لے لی ہے وہ اپنی تازہ درخواست پر گذشتہ سال کی ویٹنگ لسٹ نمبر کا حوالہ درج کر سکتے ہیں جن تازہ درخواستوں کے ساتھ یہ تفصیلات نہ ہوں گی انھیں اس طبقے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

(۲) طبقہ نمبر ۲۔ جن اصحاب نے حج ۱۹۶۸ء کے لئے یا سال ہائے ماسبق میں درخواست دی تھی اور جن کی درخواست دو سال یا اس سے زائد بار مسترد ہو چکی ہیں انھیں بھی امسال یقینی طور پر جہاز میں جگہ دی جائے گی چنانچہ ان حاجیوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی تازہ درخواستوں کے ساتھ دو سال کی رد کردہ درخواستیں منسلک کریں اور انھیں ایک ہی لفافے میں بھیجیں۔

(۳) طبقہ نمبر ۳۔ فرسٹ یا ٹورسٹ کلاس کی جو درخواستیں ۱۹۶۸ء میں مسترد ہو گئی تھیں، انھیں امسال قرعہ میں ترجیح دی جائے گی چنانچہ ان حاجیوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ حج ۱۹۶۸ء کی رد کردہ درخواستیں نئی درخواستوں کے ساتھ منسلک کریں اور انھیں ایک ہی لفافے میں بھیجیں اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کی درخواستیں طبقہ نمبر ۴ میں شمار کی جائیں گی۔

(۴) طبقہ نمبر ۴۔ جو اصحاب پہلی بار درخواست بھیج رہے ہیں یا جن کا شمار مندرجہ بالا تین طبقات میں نہیں ہوتا۔ ان کی درخواستوں کی معمول کے مطابق قرعہ اندازی ہوگی۔ انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے لفافے میں دوسرے طبقات کی درخواستیں نہ ہوں۔

طبقہ نمبر ۵۔ (الف) جن خواتین کا شمار طبقہ ۱ یا طبقہ ۲ میں ہوگا انھیں چاہئے کہ وہ اپنے اس محرم کا نام اپنی درخواست میں لکھیں جو ان کے ساتھ حج پر جانے والے ہیں اگر محرم کا تعلق بھی اسی طبقہ سے ہے جس طبقہ سے خاتون کا ہے دونوں کی درخواستیں ایک دوسرے بھیجی جا سکتی ہیں لیکن اگر محرم کا تعلق طبقہ ۳ یا ۴ سے ہے تو ان کی درخواستیں علیحدہ بھیجی جانی چاہئیں۔ (ب) دیگر صورتوں میں جہاں کہ عازمین حج ایک ساتھ سفر کرنا چاہتے ہیں جیسے میاں بیوی، بھائی اور بہن یا باپ اور بیٹی وغیرہ لیکن جن کا تعلق مختلف طبقات سے ہو مثلاً کوئی ۱۹۶۸ء کی ویٹنگ لسٹ کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے کوئی دو سال یا ایک سال کی رد کردہ درخواست کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا کسی کی درخواست پہلی بار ہیتی کی جا رہی ہو تو وہ ایک ہی لفافے میں اپنی درخواستیں بھیج سکتے ہیں لیکن اس لفافے کو سب سے نچلے طبقہ والی درخواست میں شمار کیا جائے گا مثال کے طور پر اگر کسی ایک لفافے کی ایک درخواست طبقہ نمبر ۱ کی ہے دوسری طبقہ ۲ کی ہے اور تیسری طبقہ ۴ کی ہے تو اس لفافے کا شمار طبقہ ۴ میں کیا جائے گا۔

عازمین حج کو اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ ایک لفافے کے اندر مختلف طبقوں کی درخواستیں نہ ہوں دوسرے لفظوں میں ہر طبقے کی درخواستوں کے لئے ایک علیحدہ لفافہ اور علیحدہ ڈرافٹ ہونا چاہئے۔

(۷) ویٹنگ لسٹ (۱) درخواستوں میں سے ایک مخصوص تعداد کو قرعہ اندازی کے ذریعہ فرسٹ اور ٹورسٹ کلاس کی ویٹنگ لسٹ پر لیا جائے گا اور ریزرویشن منسوخ ہونے کی صورت میں ویٹنگ لسٹ والوں کو موقع دیا جائے گا اور متعلقہ حاجی کو اس کی اطلاع فوراً دی جائے گی (۲) جن عازمین حج کے نام ویٹنگ لسٹ پر آئیں گے انھیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بغیر بلائے بمبئی نہ آئیں۔ ورنہ سفر حج کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں کمپنی کوئی ذمہ داری قبول نہ کرے گی۔ (۳) جو درخواستیں قرعہ اندازی میں کامیاب نہ ہوں گی انھیں ڈرافٹ وغیرہ کے ساتھ بھیجنے والوں کو لوٹا دیا جائے گا۔ (۸) بکنگ کا آغاز کمپنی کے دفتر کے کاؤنٹر پر کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی تمام درخواستیں رجسٹرڈ یا بیمہ شدہ لفافوں میں اس طریقے سے بھیجی جائیں جو اوپر بتایا گیا ہے درخواستیں ۱۶ ستمبر ۱۹۶۹ء تک کمپنی مل جانی چاہئیں اس تاریخ کے بعد جو بھی درخواست موصول ہوگی اسے واپس کر دیا جائے گا۔ (۹) بار ریزرویشن کی منسوخی۔ (۱) اگر کوئی عازم حج اپنا ریزرویشن منسوخ کرانا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ کم از کم دس روز قبل کمپنی کو مطلع کر دے ورنہ کرائے کی رقم واپس کرتے وقت اس میں سے دس فیصدی کاٹ لی جائے گی اس قاعدے کا اطلاق ویٹنگ لسٹ کے ان حاجیوں پر بھی ہوگا جنھیں جہاز میں جگہ پیش کی جائے گی ۲ ریزرو اس کا فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ ۳ اگر کوئی صاحب اپنا ریزرویشن منسوخ کرانا چاہیں تو انھیں اپنا پی، فارم یا ویٹنگ لسٹ فارم واپس کرنا ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہوگا کہ ان کی ارسال کردہ رقم بینک ڈرافٹ سے بھیجی جائے یا منی آڈر بینک ڈرافٹ سے رقم منگانے کی صورت میں ضروری ہوگا کہ اشتہار کی رسید منسلک بھی جائے جس پر کسی گواہ کی موجودگی میں دستخط کئے جائیں

۳۔ ٹیکہ اور انجکشن۔ عازمین حج کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس مخصوص انٹرنیشنل فارم پر مندرجہ ذیل ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ہوں۔ اگر ممکن ہو تو یہ سرٹیفکیٹ ملک سے روانگی قبل حاصل کر لیے جائیں۔ ۱۔ ہیضہ۔ ہیضے کے سرٹیفکیٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ عازم حج نے سات تا تیس دن کے وقفے سے دو انجکشن لگوائے ہیں پہلا انجکشن نصف سی۔سی اور دوسرا انجکشن ایک سی سی کا ہونا چاہئے۔ یہ سرٹیفکیٹ، دوسرا انجکشن لگوانے کی تاریخ سے چھ ماہ تک کارآمد ہوگا۔
۲ چیچک۔ چیچک کے ٹیکے کا سرٹیفکیٹ کامیابی کے ساتھ ابتدائی ٹیکہ لگوانے کی تاریخ سے آٹھ روز بعد قابل ہوگا اور تین سال تک کام دے سکے گا دوبارہ ٹیکہ لگوانے کی صورت میں یہ اسی روز سے کارآمد سمجھا جائے گا۔
۴۔ اسٹول کلچرل سعودی حکومت نے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ ہر حاجی کے پاس نگیٹیو اسٹول ٹیسٹ سرٹیفکیٹ ہو جو جہاز پر سوار ہونے کی تاریخ سات دن سے زائد کا نہ ہو۔ یہ سرٹیفکیٹ کسی سرکاری لیبوریٹری کا جاری کردہ ہو اس پر محکمہ حفظان صحت کے حکام کی تصدیق بھی ہونی چاہئے

۱۴۔ دیگر امور۔ (۱) سفر حج کے لیے درخواست کے فارم مغل لائن سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ۲۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے علاوہ حج ۱۹۶۹ء کے متعلق کوئی بات دریافت کرنی ہو تو براہ مہربانی ایکزی کیٹیو آفیسر حج کیمپ، لوکمانیہ تلک مارگ، بمبئی نمبر ۱ سے رجوع کریں

دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ فورٹ بمبئی نمبر ۱

تار کا پتہ:۔ مغل بمبئی
فون نمبر ۲۵۶۸۳۵

مراسلات

تصویرِ غم

ہماری زبان کے قارئین کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ
ے ایک پروفیسر دوست کے گمشدہ تحقیقی مقالہ اور چند نایاب
کتابوں کی تلاش اور بازیافت میں میری مدد فرمائیں۔

یہ تحقیقی مقالہ ۵۷ء میں حیدرآباد میں چوری ہو گیا تھا اس
بعد اسے دوبارہ لکھا گیا لیکن ۱۹۵۹ء میں امارسی اسٹیشن پر
لشدہ مقالہ کی زرفی یافتہ شکل اور چند نایاب قلمی کتابیں جس
ٹ کیس میں رکھی ہوئی تھیں وہ گم ہو گیا اس سوٹ کیس میں مقالہ نگار
لب انگریزی تاریخی کتاب کے مسودہ کے چند مضامین کا اردو
یتھا۔ اس مسودہ کے شروع میں مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر
، سیتا رمیا کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا پیش لفظ تھا۔ اس سوٹ کیس
چند ایسی قلمی کتابیں بھی تھیں جن کے دوسرے نسخے بہت کم یاب

فی الحال ان تاریخی مضامین اور اس مقالہ کی بازیافت
وب نہیں ہے۔ مقالہ مکمل ہو گیا ہے اور مضامین کا از سر نو
کر لیا گیا ہے ان میں سے بیشتر مضامین عرصہ ہوا چھپ چکے ہیں
، دوران میں ان نایاب قلمی کتابوں کی تلاش میں ہر طرف سے
ی ہوئی اور مقالہ کے متعلق کتابوں کی فراہمی اور مطالعہ میں
، صبر آزما اور حوصلہ شکن دقتیں پیش آئیں۔

اتنی مدت کے بعد اس امر کی اطلاع کی ضرورت یوں
یں ہوئی کہ مئی ۶۸ء کے ھدیٰ (اردو ڈائجسٹ دہلی) میں
یرِ غم زین آباد" کے عنوان سے ایک انشائیہ شایع ہوا ہے۔
یہ انشائیہ ممتاز محل کے عارض مدفن کی زندہ اور جیتی جاگتی
یر ہے اور فاضل انشائیہ نگار کے "کمالِ فن" کا شاہد "سحر
ي" کا نادر شاہکار اور "چابکدستی" کا مدلل ثبوت ہے، تصویرِ غم
چند المناک پہلو ملاحظہ کیجیے۔

- ھدیٰ: صفحہ ۹۰ کالم ۱ سطریں ۷، ۸، ۹، ۱۰ کے لئے ملاحظہ کیجئے! "آہو خانہ" مطبوعہ بہارستان اگست ۶۵ء صفحہ ۲۴
- ھدیٰ: صفحہ ۹۱ کالم ۱ سطریں ۶، ۷ کے لیے ملاحظہ کیجئے اردو ادب ۶۴ء شمارہ ۱ ص ۱۳۰، بہارستان ص ۲۴
- ھدیٰ، صفحہ ۹۱ کالم ۱ سطریں ۹، ۱۰ "تاج محل" اردو ادب ۶۴ء ص ۱۳۰ بہارستان ص ۲۴
- ھدیٰ: ص ۹۱ کالم ۲ سطریں ۱۴، ۱۵، ۱۷ اور ۱۸ کے علاوہ پورا صفحہ ملاحظہ ہو: اردو ادب ص ۱۲۸-۱۲۹، بہارستان ص ۲۳-۲۴

۵۔ ھدیٰ: ص ۹۲ کالم ۱ پہلی ۸ سطریں سب نقل ہیں
کالم ۲ سطور: ۴ تا ۲۶ اردو ادب ص ۱۳۹ بہارستان ص ۲۵

۶۔ ھدیٰ: ص ۹۳ کالم ۱ سطریں ۳ تا ۷ نقل ہے اردو ادب ۱۳۱
ص ۹۳ کالم ۲ سطریں ۱۱ بہارستان ص ۲۵

ہماری زبان ۲۲ نومبر ۶۴ء

مذکورہ بالا اقتباسات کی غیر معمولی یکسانیت جس میں الفاظ اور نقاط کا بھی ذرّہ برابر فرق نہیں ہے راقم کو اس جسارت پر مجبور کرتی ہے کہ وہ فاضل انشائیہ نگار سے تصویرِ غم زین آباد کے متعلق اپنی پوزیشن کی وضاحت کا مطالبہ کرے۔

بہارستان اور اردو ادب کے مطبوعہ مضامین کے تراشے ھدیٰ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعہ بھیجے گئے تھے۔ جواب سے محرومی ان سطور کی تحریر کا باعث ہوئی

(عبداللہ کوثی ندوی)

گل ہائے عقیدت

میں "گل ہائے عقیدت" کے عنوان سے ان منظومات کو ترتیب دے رہا ہوں جو وقتاً فوقتاً شعرائے کرام نے غالب کی شخصیت و شاعری سے متاثر ہو کر کہی ہیں لہذا متعلق حضرات سے گذارش ہے کہ درج ذیل پتہ پر اپنی نظمیں، رباعیات یا قطعات مع اپنی مختصر سوانح عمری کے مرحمت فرما کر اس امر میں مجھے سہولت بہم پہنچائیں۔ شکر گزار ہوں گا۔

عادل جعفری۔ ۷۹۔ ادتا گنج اندور

صدائے مشترک

ادارۂ تعلیم و دہلی کے زیر اہتمام میں "صدائے مشترک" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کر رہا ہوں جس میں اردو سے متعلق نظمیں غزلیں، قطعات، تضمینات وغیرہ شامل کر رہا ہوں۔ شعرا سے درخواست ہے کہ اگست کے اواخر تک اپنی دس غزلیں مختصر سوانح عمری اور اپنی تصویر کے ساتھ ذیل کے پتہ پر بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔

پتہ۔ عاصی رامپوری۔ ایڈیٹر ماہنامہ تاج محل ۳۲۴۴ کمرہ بنگش دریا گنج دہلی۔۶

انیس انور

مکتوب لندن

تارکین وطن کے لیے خصوصی لائبریری

باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ برمنگھم سٹی کونسل اس سال کے اواخر تک تارکین وطن کے استفادہ کے لئے ایک خصوصی لائبریری قائم کر رہی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے برطانیہ کی منفرد لائبریری ہوگی۔ اس لائبریری میں اردو، پنجابی اور بنگلہ کتب کا ذخیرہ ہوگا اور یہ بھارتی و پاکستانی تارکین وطن کے لئے مخصوص ہوگی۔

برمنگھم کی مرکزی لائبریری میں برصغیر کی مختلف زبانوں کی ۷۰۰ کتابیں موجود ہیں مگر مطالعہ کنندگان کی کثیر تعداد کے لئے یہ ذخیرہ ناکافی ہے۔ برمنگھم کی دیگر لائبریریاں انڈیا آفس لائبریری سے کتابیں مستعار لیتی تھیں مگر اب انڈیا آفس لائبریری نے کتابیں دینے سے انکار کر دیا ہے چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سٹی کونسل نے ایک خصوصی لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ لائبریری دس ہزار کتب پر مشتمل ہوگی اور یہاں سے برمنگھم کی دوسری لائبریریاں کتابیں مستعار لے سکیں گی۔ برمنگھم سٹی کے چیف لائبریرین جناب ٹیلر نے انکشاف کیا ہے کہ وزارت تعلیم و سائنس نے مجوزہ لائبریری کے لئے وافر مالی امداد کی پیش کش کی ہے۔ اس لائبریری میں دو لائبریرین مقرر کئے جائیں گے ان میں ایک لائبریرین کے لئے برصغیر کی دو زبانیں جاننا ضروری ہوگا۔ لائبریری کے لئے بھارت اور پاکستان سے کتب کی برآمد کا سلسلہ عنقریب شروع ہوگا۔

اردو لائبریری ناٹنگھم کے قیام کی سالگرہ

۲۷ر جولائی بروز ہفتہ ۵ بجے شام مڈلینڈ ڈیزائنرز اینڈ بلڈنگ سنٹر، ناٹنگھم میں اردو لائبریری کے قیام کی پہلی سالگرہ منائی جا رہی ہے نائب وزیر مملکت برائے دولت مشترکہ مسٹر ولیم وائٹ لوک مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان، رکن دار العوام مسٹر مائیکل انگلش اور دیگر بھارتی، پاکستانی اور مقامی حضرات شریک ہوں گے۔

'آفاق' (جولائی)

غزل

از سید احمد شہید صاحب اکولہ (بھارت)

دل مطالعی میکدے میں سرِ شام آگیا　　گویا حدودِ کفر میں اسلام آگیا
گلچیں کی گردش کی سازش بھی رہی　　لے دے کے فصلِ گل ہی پہ الزام آگیا
دانش کے ناخنوں سے تو عقدے نہ کھل سکے　　اک جذبۂ جنون مگر کام آگیا

شہرِ خموش میں یہ چراغاں ہے آج کیوں
شاید شہیدِ گردشِ ایام آگیا

'مشرق' (جولائی)

راہِ عشق

از سید سجاد حسین شمس (لندن)

یہ تری نگاہ کا تھا فسوں، کبھی جی اٹھا کبھی مر گیا
کبھی یہ ادائیں تھیں دلنشیں، کبھی یہ ادائیں تھیں دلشکن
کوئی ہم سخن ہے نہ ہم زباں، کوئی غمگسار نہ مہرباں
مرے دل کے حالِ خراب پہ مری بیکسی بھی ہے نوحہ زن
یہ تضاد ہم نہ سمجھ سکے یہاں سکھ بھی ہے یہاں دکھ بھی ہے
ہے کلی کلی پہ جہاں پھبن، وہاں ساتھ خار کی ہے چبھن
رہِ زیست شمس سہل نہیں، ہیں قدم قدم پہ صعوبتیں
یہ امتحاں ہے نفس نفس، کہیں دار ہے کہیں ہے رسن

مدینہ میں اردو

مدینہ منورہ بزمِ اردو نے مدینہ منورہ میں اردو زبان و ادب کے لیے جو خوشگوار ماحول پیدا کیا ہے اور عربی سماج میں اسے پروان چڑھانے کی خاطر جن بے لوث خدمات سے عہدہ برآ ہو رہی ہے وہ یقیناً ہندوستان کے محبانِ اردو کے لئے ایک قابلِ قدر مژدہ ہے اس بزم کی سرگرمیاں اور اس کے مقاصد و عزائم ہماری زبان میں منظرِ عام پر آچکے ہیں اس لئے اب کسی تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔

۱۵ ربیع الاول میں اس بزم کی جانب سے ایک نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا نشست کی کارروائی بعد نماز عشا مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی صدارت میں شروع ہوئی، قاری احمد علی خاں صاحب نے تلاوت قرآن کریم سے جلسہ کا افتتاح کیا اس کے بعد صدر بزم اردو سید احمد مدنی صاحب نے اپنے افتتاحیہ خطبہ میں بزم اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بزم کے مقاصد کو واضح کیا۔ خطبۂ افتتاحیہ کے بعد صدر مجلس نے اپنے خطبۂ سیرت سے حاضرین کو مستفید کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بزم ہمارے درمیان اتحاد و یگانگت اور اخلاق و محبت و اخوت کا رشتہ استوار کرتی ہے نیز اردو زبان کے سلسلہ میں اس بزم کی خدمات نہایت خوش آئند ہیں۔ صدارتی تقریر کے بعد سید ابو الفاروق ندوی صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ محسنِ اعظم کے عنوان سے اپنے تاثرات کا اظہار کریں آپ نے محسنِ انسانیت کے خط و خال اور آپ کی عظمت و آفاقیت کو اپنے مختصر مقالہ کے آئینہ میں منعکس کرنے کی کوشش کی نشست کا دوسرا دور نعتیہ مشاعرہ سے شروع ہوا، عبد العزیز صاحب نے ایک نعت پیش کی ان کے بعد حافظ محمد حسین صاحب نے حضرت جامی کا کلام روائتی انداز میں پیش کیا پھر بزم کے شاعر شاکر عنایت اللہ صاحب شاکر شیر کوٹی، عبد المبین صاحب سوختہ، حبیب اللہ صاحب، مدثر حسین صدیقی، نے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

اس کے بعد سکریٹری صاحب نے مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کیا صدر بزم نے شرکا کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ محفل بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

بہار کی خبریں

شمالی اور جنوبی ہندوستان میں اردو یونی ورسٹی قائم کی جائے۔

پٹنہ۔ لسانی مسئلہ سے متعلق سیمینار میں لسانی اقلیتوں کے لسانی مسئلہ پر جس ذیلی کمیٹی میں غور و خوض ہوا اس کی صدارت لیبر اینڈ سوشل ویلفیر شعبہ کے صدر ڈاکٹر جی پی سنہا نے کی انھوں نے اپنے مضمون میں لسانی اقلیتوں کے مسائل کا ذکر کیا اور بہار میں لسانی اقلیتوں کے مسائل کا ذکر کیا اور بہار میں لسانی اقلیتوں کے جو مسائل تھے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ لسانی اقلیتوں کو آئین کے مطابق جو سہولتیں حاصل ہیں وہ ملنی چاہئے۔ پرائمری درجہ کے علاوہ سکنڈری درجہ تک مادری زبان میں تعلیم کی سہولت دی جائے۔ اقلیتوں کی زبان میں کتابوں کی معقول چھپائی کا انتظام کیا جائے۔ اسکول اور کالجوں میں اقلیتوں کی زبان میں تعلیم دینے کی سہولت ملنی چاہئے یونیورسٹی سطح تک اقلیتی طلبہ کو اپنی زبان میں جوابات دینے کی سہولت برقرار رہنی چاہئے۔ ڈاکٹر سانتا نے اپنے مضمون میں اقلیتوں کے تعلیمی اداروں میں مداخلت پر افسوس کا اظہار کیا، اور کہا کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں مرکزی یونی ورسٹی قائم کی جائے اور اس میں ذریعہ تعلیم اردو رکھی جائے۔

بہار میں اردو آبادی کا سروے

کٹیہار۔ جناب محمد زین الحق اہم کام جنرل سکریٹری پورنیہ ضلع انجمن ترقی اردو و جوائنٹ کنوینر اعداد و شمار کمیٹی نے ایک بیان کے ذریعہ بہار کی اردو آبادی سے درخواست کی ہے کہ وہ تعلیمی، سماجی، معاشی سروے کے کام میں انجمن کی مدد کریں۔ انجمن کی نئی مجلس عاملہ نے اپنی پہلی نشست میں یہ طے کیا کہ بہار میں اردو آبادی کا لسانی سروے کیا جائے اور اس غرض سے محمد زین الحق صاحب، پروفیسر سید مظفر اقبال صاحب کمال الدین صدیقی بی۔ اے اور شمیم ربانی پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ واضح رہے کہ حکومت نے ایک لسانی سروے کمیٹی لکشمی نرائن سدھانشو کی نگرانی میں قائم کی ہے اس کمیٹی میں اردو کا کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا لہذا اپنے ذرائع سے اردو آبادی کا اپنا سروے مکمل کرنا ضروری ہے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ کارپوریشن دانا پور، کھگول شہری حلقوں میں کامریڈ معصوم شرفی اسیر، محمد معین انصاری، سید ضیاء الدین احمد بی۔ اے، سید فیاض الرحمٰن ایم۔ اے ڈی ان ایڈ، باسط عظیم آبادی اور شمشاد علی خاں یعقوبی سروے کا کام عنقریب شروع کر رہے ہیں۔ اس غرض سے سروے فارم کی چھپائی ہو رہی ہے۔ جناب محمد زین الحق نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ خوش قسمتی سے آج سارے بہار میں اردو کا مسئلہ انجمن ترقی اردو کے دفاتر سے نکل کر ایک عوامی مسئلہ بن چکا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ریاست کی بیشتر آبادی بلکہ سیاسی شعور اور جانکاری رکھنے والے سبھی افراد خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو اردو کو بہار کی علاقائی زبان کا درجہ دینے کے مطالبے کو ایک پیچیدہ مگر ناقابل اعتنا مسئلہ سمجھ رہے ہیں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی پالیسی اور پروگرام کے مطابق اردو بولنے پڑھنے اور سمجھنے والے افراد اور خاص طور پر انجمن ترقی اردو سے متعلق سبھی کارکنان اور عہدیداران سے ہماری یہ اپیل ہے کہ پوری ریاست میں جہاں اردو بولنے والوں کی معتدبہ آبادی ہے اردو ہائی اسکول۔ مڈل اسکول اپر اور لوئر پرائمری اسکول قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل اور مستعد ہو جائیں۔ اس کے علاوہ کنڈر گارٹن اور مونٹیسری اسکولوں کے طرز پر اعلیٰ انگلش میڈیم سے تعلیم دینے کے لئے ایسے اسکول کا قیام ان تمام شہروں میں ہو جائے جہاں اردو بولنے والی آبادی معاشی طور پر اس قابل ہو کہ ایسے رہائشی اسکول قائم کر سکیں اور اپنے بچوں کی تعلیم رہائش اور خورد و نوش کی پوری کفالت کر سکے۔ انجمن نے یہ طے کیا ہے کہ اردو بولنے والی آبادی کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے اردو کے ذریعہ معاشی و سماجی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے جن مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا قابل اعتماد منظم اور سائنٹیفک ڈھنگ سے جائزہ لیا جائے۔ اس مقصد کے تحت انجمن نے یہ طے کیا ہے کہ وہ تمام ضروری اعداد و شمار فراہم کئے جائیں جس سے ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ ریاست میں اردو بولنے والے بالغوں اور بچوں کی کتنی تعداد ہے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں کتنے بچوں کو حاصل ہیں اور ایسے کتنے بچے ہیں جنھیں اردو کی بجائے مجبوراً دوسری زبان اور بالخصوص ہندی پڑھنا پڑتا ہو کتنے ایسے بچے ہیں جنھیں سرے سے تعلیم حاصل کرنے کی کوئی سہولت ہی حاصل نہیں۔ اردو پڑھانے والے کتنے اساتذہ فی الحال برسر روزگار ہیں اور اردو زبان میں تعلیم دینے کے لئے کتنے استادوں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس بات کا بھی جائزہ لیں گے کہ کہاں کہاں اسکولوں کے قیام کی ضرورت ہے جہاں صرف اردو کے ذریعہ تعلیم دی جا سکے۔ اور کتنے ایسے اسکول ہیں جہاں ضرورت ہونے کے باوجود اب تک اردو میں تعلیم دینے کے لئے استاد بحال نہیں کئے گئے۔ اس مقصد کے تحت فی الحال پورنیہ، بھاگل پور، سنتھال پرگنہ ضلعوں میں اور پٹنہ ضلع کے شہری حدود کے اندر وسیع پیمانہ پر اعداد و شمار کی فراہمی کی ایک تحریک انجمن ترقی اردو بہار کے زیر نگرانی جلدی شروع کی جا رہی ہے۔ ہمیں ان تمام حضرات کے عملی تعاون کی ضرورت ہے جنھیں اپنی مادری زبان سے محبت اور وابستگی ہے۔

بہار میں لسانی اقلیتوں کا مسئلہ

پٹنہ: راج بھون میں گورنر بہار سے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، بنگلہ اسوسی ایشن بہار اور بورڈ آف سینورلی اسکولس بہار کا ایک مشترکہ نمائندہ وفد ملا اور انھیں بتایا کہ افسران کی ناعاقبت اندیشی، حکام کی تنگ نظری اور ایڈمنسٹریشن کی جانبدارانہ روش کے باعث آج بہار میں لسانی اقلیت کے حقوق کی پامالی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

اردو کو دہلی کے مرکزی علاقہ میں مناسب اہمیت دینے پر غور

نئی دہلی ۲ راگست امور داخلہ سے متعلق پارلیمنٹ کی غیر رسمی مشاورتی کمیٹی کے جلسے میں کل مرکزی علاقہ دہلی میں امن وامان کی صورت حال اور اردو کو مناسب اہمیت دیئے جانے کے اقدامات پر غور کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت مرکزی وزیر داخلہ جناب وائی بی چوہان نے کی۔ اردو کے سلسلے میں بتایا گیا کہ اردو کو اہمیت دینے کے متعلق جو فیصلے کئے گئے تھے ان پر عمل درآمد کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان کی رفتار کار کا جائزہ لیا جا رہا ہے کمیٹی سے یہ بھی بتایا گیا کہ وزیر داخلہ نے ایسی ریاستوں کے وزراء اعلیٰ کو جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہے اس سلسلے میں لکھا تھا وہاں کے وزراء اعلیٰ نے وزیر داخلہ کو اردو کے سلسلے میں کئے گئے اقدامات سے مطلع کیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو بولنے والوں کو تعلیم اور دوسرے شعبوں میں ضروری سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

(قومی آواز)

اترپردیش انجمن ترقی اردو کی کونسل کے ممبران نامزد

لکھنؤ، ریاستی انجمن ترقی اردو کے آنریری جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے بتایا ہے کہ ریاستی انجمن کے صدر جناب شمبھو ناتھ پرشاد نے ریاستی کونسل کی چار نشستوں پر مندرجہ ذیل حضرات کو نامزد کیا ہے۔ ۱۔ محترمہ راجکماری سورج کلا سرن الٰہ آبادی ۲۔ ڈاکٹر چرن سنگھ ایم ایل سی (لکھنؤ) ۳۔ جناب عثمان غنی حرمت (لکھنؤ) چوتھا نام زیر غور ہے۔ صدر نے بہ مشورہ جنرل سکریٹری حسب ذیل جوائنٹ سکریٹری مقرر کئے ہیں (۱) جناب عثمان غنی حرمت (لکھنؤ) ۲۔ جناب احمد ابراہیم علوی (لکھنؤ) صدر صاحب اس کے علاوہ ریاستی مجلس عاملہ اور کونسل کے جلسوں میں شرکت کرنے اور ان کے خیالات سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے کچھ اردو دوست اور ادب نواز حضرات کو بھی خصوصی حیثیت سے مدعو کریں گے۔

صفحہ ۵ سے آگے

شائع ہوگئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بھی پندرہ سے اوپر بتائی جاتی ہے لیکن مندرجہ ذیل تصانیف کا مجھے اب تک علم ہو سکا ہے۔
۱۔ القاہرہ۔ مصر پر لکھا ہوا تاریخی ناول۔ ۲۔ ٹھنڈی گولی۔ ناول سودیشی تحریک کی حمایت میں۔ ۳۔ دیار عجیب۔ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ۔ ۴۔ خیابان ادب۔ بچوں کے لئے نظمیں اور کہانیاں۔ ۵۔ خانہ داری۔ امور خانہ داری سے متعلق ۶۔ اوراق گل۔ انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ۔ ۷۔ بیاض گل۔ مختلف نظموں کا مجموعہ۔ ۸۔ گلبانگ۔ مجموعۂ قصائد و غزلیات ۹۔ رسالہ تمدن۔ ۱۰۔ امور سائنس۔ سائنسی ترقیات سے متعلق۔ ۱۱۔ تصور خیال۔ مولانا حالی کے رنگ میں شعر و شاعری پر بسیط تبصرہ۔ ۱۲۔ لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ
نصر صاحب بھوپال کی تاریخ بھی مرتب کر رہے تھے لیکن وہ شائع نہ ہو سکی۔
ان سے میری آخری بار ملاقات ۱۹۶۶ء کے آخری مہینوں میں ہوئی تھی میں اس زمانہ میں "علامہ اقبال بھوپال میں" لکھ رہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ پہچان بھی نہیں سکتے تھے اور نہ بات چیت کر سکتے تھے۔ ادھر کچھ ماہ پہلے معلوم ہوا کہ وہ کراچی چلے گئے۔ اب اطلاع آئی کہ وہ ۱۲ رجولائی ۱۹۶۸ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ حق مغفرت کرے۔

اردو گھر فنڈ

اردو گھر فنڈ کے چندے کی وصولی کا کام شروع ہو گیا ہے رفتار میں تیزی آتی جا رہی ہے سر دست ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ کے ہماری زبان میں ان تمام چندہ دینے والوں کی فہرست شائع ہوا کرے گی جن کی رقمیں دس تاریخ تک صدر دفتر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں پہنچ جائیں گی۔

اردو گھر فنڈ

انجمن ترقی اردو ہند کی ایک پانچ منزلہ عمارت نئی دہلی میں بن رہی ہے اس کا نام "اردو گھر" رکھا گیا ہے۔ زمین لے لی گئی ہے سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا ہے اور تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

تعمیر کے سلسلے کے جملہ کاموں کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ جو تکمیل تک نگراں رہے گی۔

اس عمارت کے نقشے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت انجمن کے تمام شعبوں کے لئے آرام دہ ہو مگر بہت سادہ، کم خرچ اور خوشنما ہو۔ شان و شوکت اور نمائش سے حتی الوسع بچا جائے لیکن حسن و رعنائی عمارت میں ایسی نمایاں ہو کہ نئی دلی کے ماحول میں کھپ سکے اور اجنبی نہ معلوم ہو۔ ساتھ ہی اس کے در و دیوار سے اردو کی عظمت، رفتار، شیرینی و دل آویزی بھی جھلکتی ہو۔

اس عمارت پر لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ روپیہ کیا گیا ہے اور اردو گھر مد میں انجمن نے جو رقم اس تک جوڑ جوڑ کر حفاظت سے رکھی ہے وہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ بنک میں موجود ہے۔ ایک لاکھ بڑے عطیوں سے ملنے کی توقع ہے، اب پانچ لاکھ اور جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی مقبولیت اور ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے اس رقم کے فراہم ہونے میں بظاہر کوئی دقت نہ ہوگی۔ اتنی رقم تو حکومت اور چند محبان اردو کے دست کرم سے بہ سہولت بہم پہنچ سکتی ہے لیکن اراکین انجمن کی تمنا ہے کہ اردو گھر کی تعمیر میں ہر اردو دوست کا حصہ اور شرکت ہو۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر عوام کی محبت کی مہر ثبت ہو۔ اس کے بنانے والوں میں ہزاروں اور لاکھوں ناموں کی طویل فہرست ہو۔

اس مقصد کے لئے طریقہ کار یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خود اراکین انجمن جن کی تعداد لگ بھگ پچاس ہزار ہے اور انجمن کی شاخوں کے ذمہ دار ملک بھر میں چندہ جمع کریں۔ اس غرض کے لئے چندہ وصول کرنے والوں کے پاس ہر صوبے اور بڑے شہروں میں مندرجہ ذیل رسیدیں مطبوعہ ہوں گی۔

ایک روپیہ، پانچ روپیہ، دس روپیہ، بیس روپیہ اور پچاس روپیہ والی رسیدیں۔ جس پر رقم چھپی ہوئی ہے صرف ایک سطر نام پتے اور وصول کنندہ کے دستخط کی ہے۔ رقم جب دفتر پہنچ جائے گی تو رقم دینے والوں کے نام "ہماری زبان" میں ہفتہ وار شائع ہوں گے۔

ظاہر ہے یہ کام انجمن اپنی بساط کے مطابق زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ انجام دینے کی سعی کرے گی۔ پھر بھی کام کرنے والوں کی تعداد چند دہائیوں سے زیادہ نہ ہوگی اور مناسب بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو چندہ وصول کرنے کا مجاز نہ بنایا جائے۔ اسی میں انتظام قائم رہے گا اور کسی قسم کی بے عنوانی نہ ہو سکے گی۔ جو کارکن ہوں گے وہ سب اعزازی ہوں گے ان کے پاس نہ اتنا وقت ہوگا اور نہ اتنے وسائل کہ وہ ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گھر تک پہنچ سکیں۔

اس لیے زیادہ تر حضرات کو براہِ راست انجمن کے صدر دفتر منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ وغیرہ سے رقم بھیجنی ہوگی۔ رقم بھیجنے کے لے اتنا پتہ کافی ہوگا:۔

"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ (یوپی)"

عنقریب ہر ریاست میں جو صاحب بھی چندے کی مہم کے ذمہ دار ہوں گے اُن کے اور ان کے معاونین کے ناموں کا "ہماری زبان" اور دوسرے اخبارات میں اعلان ہوگا۔ تاکہ مقامی طور پر رقم حوالے کرنے میں آسانی ہو۔

جو رقمیں براہِ راست یا بہ توسط دفتر پہنچیں گی دفتر سے اُن کی ایک رسید جاری ہوگی اور اُن کے اسمائے گرامی کی فہرست ہفتہ وار "ہماری زبان" میں شائع ہوگی۔

اس سلسلے میں "ہماری زبان" کی اشاعت کی طرف بھی اہلِ استطاعت توجہ کریں تو انجمن کے لیے اور اردو تحریک کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ چندہ دینے والے حضرات وہی رقم دیں جو اُن کے حالات کے مطابق ہو اور طبیعت پر بار نہ گزرے۔ مگر ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ جو بھی آپ بہ سہولت عنایت کریں اس میں دیر نہ کریں تاکہ ہمارا کوٹہ جلد سے جلد پورا ہو جائے اور ہم فخر و مسرت کے ساتھ فہرست کے خلد بند کرنے کا اعلان کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سب اردو دوستوں کے تعاون سے اردو گھر بہت جلد بن جائے گا۔

(پروفیسر) آلِ احمد سرورؔ۔ جنرل سکریٹری انجمن

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع

REGD NO-L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۰ پیسے

جلد ۲۷ - شمارہ ۳۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ اگست ۱۹۶۸ء

اداریہ

آزادی کے اکیس سال

آج ہندوستان کی آزادی کو اکیس سال ہو گئے۔ اس عرصے میں ہم نے لمبا سفر کیا ہے اور کیسے کیسے تجربے حاصل کیے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ آج کے مبارک دن ہم ذرا سا رک کر اس لمبے سفر کا جائزہ لے لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ہم کہاں سے چلے تھے، کدھر جانا تھا اور کہاں جا رہے ہیں۔

آج کے دن ہمیں صرف اپنی حالت سے ملک کی حالت کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ گو ہم اپنی حالت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آج کے دن ہمیں اس مشترک خاندان کو دیکھنا ہوگا جس کا نام ہندوستان ہے۔ یہ مشترک خاندان بہت بڑا ہے اس کا گھر بھی بڑا ہے اور اس کے افراد کی تعداد بھی بہت بڑی ہے اس لیے گھر کے چند افراد یا اس کے ایک گوشے سے مشترک خاندان کے متعلق رائے قائم کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ سب کی حالت پر نظر رکھنی ہوگی اور سبھی گوشوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑے گا۔

شروع شروع میں ہم سب پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ ہستی حسین معلوم ہوتی تھی، ہر شخص دوست نظر آتا تھا۔ کیسے کیسے ارمان تھے کیسے کیسے خواب تھے۔ ہم اپنے آدرشوں کی جنت کسی خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے۔ معلوم ہوتا تھا ساری دنیا کی نگاہوں کا مرکز ہندوستان ہے۔ اپنی شاندار تاریخ، آزادی کی جدوجہد، ۵ سالہ جمہوریت، سیکولرزم اور بہتر سماج کے ہمارے تصورات سب ہمیں اڑائے لیے پھرتے تھے۔ ہم نے صدیوں کے کام کو دنوں میں کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اس عزم کے سامنے دنیا کی ہر مشکل پانی ہو جائے گی۔

ہم نے ایک دستور بنایا جس میں سب کو برابری کی بشارت دی گئی تھی جس میں تحریر و تقریر کی آزادی تھی جس میں جلد سے جلد جہالت، مفلسی اور ذہنی جمود کو دور کرنے کا پیام تھا۔ ہم نے صنعتی دور میں قدم رکھنے کے لیے منصوبے بنائے تھے۔ ہم ساری دنیا سے دوستی رکھنا چاہتے تھے۔ ہم امن عالم کے علمبردار تھے، ہم اپنی زبانوں کو ترقی دینا چاہتے تھے، ہم اس مشترک خاندان کے جلوۂ صد رنگ کی حفاظت کرنا چاہتے تھے، ہم نے دریاؤں پر بند باندھ کر ان کے پانی سے ویرانوں میں پھول کھلانے اور اندھیری کٹیاؤں میں اجالا کرنے کا نقشہ بنایا تھا، ہم نے فولاد کے کارخانے قائم کر کے اور جدید ضروریات کے لیے مشینیں تیار کر کے ملک کو خود کفیل بنانے کی تیاری کی تھی۔ ہم نے مختلف زبانیں بولنے والوں، مختلف مذاہب کے ماننے والوں، مختلف ریاستوں میں بسنے والوں کو ایک ذہنی وحدت اور یک جہتی کے ایک تصور سے سرشار کرنا چاہا تھا۔

مگر آج ہمارے بہت سے کام ادھورے ہیں، ریاستوں میں من مانی کرنے کی لے بڑھ رہی ہے، لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم نے ساری الجھنیں کم کرنے کے بجائے بڑھا دیں، ہم اپنی غذا کے لیے بھی دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں، ہم فرقہ واریت کو ختم نہیں کر پائے اور وہ برابر سر اٹھاتی رہتی ہے، ہم اقلیتوں کو مطمئن کرنے میں ابھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ہمارے یہاں گرانی بہت بڑھ گئی ہے، قانون کی عزت کم ہو گئی ہے، طلبا میں بے چینی ہے، پچھلے انتخاب نے ظاہر کر دیا کہ کسی پارٹی کو ہمیشہ کے لیے ملک کا ٹھیکہ نہیں دیا جا سکتا، مگر اس نے ایک بے اطمینانی اور بے یقینی کی فضا بھی پیدا کر دی یعنی اس نے دائیں بازو کو بھی تقویت دی اور بائیں بازو کو بھی۔ یہ مخالف عناصر بعض معاملات میں آپس میں مل کر چل نہ سکے۔ ہمسایہ ملکوں کی طرف ہم نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر اس کا صلہ یہ ملا کہ ہمیں اپنے دفاع کی طرف پوری توجہ کرنی پڑی۔ سرمایہ داروں نے ملک کی خوش حالی اور عوام کے معیار زندگی کو بڑھانے کی طرف کم توجہ کی، اپنی تجوریوں کو بھرنے میں لگے رہے۔ پبلک سیکٹر اہلیت کا ثبوت نہ دے سکا اور دفتر شاہی کا شکار رہا۔ ہمارے یہاں ہندو ہیں، مسلمان ہیں، سکھ ہیں، پارسی ہیں، عیسائی ہیں، ہندی والے ہیں، تامل

والے ہیں، مگر ہندوستانی کم ہیں۔ ہم اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنے علاقے کا زیادہ سوچتے ہیں پورے ملک کے فائدے پر نظر نہیں رکھتے ہمارے اصولوں اور ہمارے عمل میں بڑا فرق ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کا ہم نام لیتے ہیں ان کی تعلیم کو بھلا چکے ہیں۔ جواہر لال ہماری آنکھ کا تارا تھے، کہ ملک کی ساری مشکلات کی ذمہ داری ان کی پالیسی پر ڈال کر ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو گئے۔ ہمارے یہاں امریکہ کے حامی بھی بہت مل جائیں گے اور روس کے حامی بھی۔ ہندوستان کے حامی کم ملیں گے۔ ہم دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا سارا کام کر دیں۔ خود محنت سے جی چراتے ہیں۔ ہمارے نیتا اقتدار کے نشے میں مست ہیں ہماری سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں، ہمارے افسر اپنی حکومت جتانے میں، ہمارے استاد حالات کا ماتم کرتے میں اور ہمارے طلبا اپنی برہمی اور بیزاری ظاہر کرنے میں اتنے مصروف ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

اس لیے ضرورت ہے کہ آج کے دن ہم اپنی ترقی کو بھی ذہن میں رکھیں اور سست رفتاری کو بھی۔ اپنے اصولوں کو بھی اور اپنے عمل کی کوتاہی کو بھی۔ اپنی طاقت کو بھی اور اپنی کمزوری کو بھی۔ ہم ایک قدیم ملک کے باشندے ہیں مگر ایک نئی قوم ہیں اور ابھی صحیح معنی میں قوم نہیں ہیں۔ ہم دنیا کی طرف دیکھتے ہیں اپنی طرف نہیں دیکھتے۔ ہم چیزوں کو صرف سیاہ یا سفید سمجھتے ہیں، درمیان میں جو بہتیرے رنگ ہیں وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ اگر ہم چھوٹے راستے اور سستے نسخے استعمال کرنا چھوڑ دیں، اگر ہم صرف ردعمل نہ دکھائیں عمل بھی دکھائیں، اگر ہم سمجھ لیں کہ اصولوں کی خاطر ہمیشہ کچھ دشواریاں جھیلنی پڑتی ہیں، اگر ہم میں ضبط و نظم آ جائے، اگر ہم آزادی کے معنی صرف ایک اور سیڑھی طے کرنا نہیں بلکہ ایک اور ذمہ داری قبول کرنا سمجھ لیں تو اپنی ساری مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں اور اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہو سکتے ہیں۔

ہماری بنیاد جمہوریت ہے، ہم سیکولرزم کے مسلک پر گامزن ہیں، ہمیں حقوق کے ساتھ فرائض کو بھی یاد رکھنا ہے۔ ہمیں اپنی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہے ہمیں اپنے اختلافات بحث اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ سے دور کرنے ہیں، ہمیں جیٹ ہوائی جہاز کے دور میں بیل گاڑی کے ذہن کو بدلنا ہے، ہمیں کامیابی کے آئیڈیل کو چھوڑ کر کارکردگی کا مزاج پیدا کرنا ہے، ہمارا بڑا خاندان ہے ہمارا بڑا گھر ہے۔ بڑے دماغ اور بڑے دل کے ساتھ ہی ہم اسے چلا سکتے ہیں۔ یہ بڑا دماغ اور بڑا دل کوئی اور ہمیں نہیں دے گا، ہمیں خود پیدا کرنا ہوگا۔ دنیا اپنے راستے پر چل رہی ہے۔ ہم دوسروں کے راستوں سے، دوسروں کی منزلوں سے کچھ سیکھ سکتے ہیں، مگر ہمارا راستہ اور ہماری منزل، ہماری اپنی ہونی چاہیے۔

جس طرح دس برس پہلے کا نشہ غلط تھا، اسی طرح آج کا خمار غلط ہے۔ اکیس سال کے بعد آدمی صحیح معنی میں بالغ ہوتا ہے اور اسے ہماری جمہوریت میں ووٹ کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ قوم کو بھی اب اپنی بلوغت کا ثبوت دینا ہے اور اس کے لیے ہر فرد کو نشے کی ترنگ یا خمار کی انگڑائی چھوڑ کر اپنی ساری طاقت کو ملک کی تعمیر میں لگانا چاہیے۔ ہندوستان اس عزم کا منتظر ہے۔

اختر لکھنوی

صلیبِ احساس

بڑی اداس فضا ہے
بڑا اندھیرا ہے
کسی کی شکل کسی کو نظر نہیں آتی
فلک ہے اوڑھے ہوئے اک ردا دھندلکوں کی
بچھی ہوئی ہے زمیں پر گلیم بخت سیاہ
ہے کائنات کہ ظلمات کا شکنجہ ہے
کہ جس میں روح بھی جکڑی ہوئی ہے جسم کے ساتھ
بڑی اداس فضا ہے
بڑا اندھیرا ہے
یہ چند سائے جو ٹکرا رہے ہیں آپس میں
یہ آدمی ہیں؟ چلو آدمی ہیں مان لیا
مگر یہ لوگ اندھیرے میں ڈھونڈتے کیا ہیں؟
سیاہ رات کے دامن میں بس سیاہی ہے
سیاہیوں کا فسوں کون توڑ سکتا ہے۔!
دلوں میں چھٹکی ہوئی شوخ چاندنی کے سوا
دلوں میں چاند اگاؤ، کہ تیرگی کم ہو
بڑی اداس فضا ہے!
بڑا اندھیرا ہے!!

علامہ اقبال کے کلام کا مصوّر ایڈیشن

لاہور۔ علامہ اقبال کے کلام کا مصوّر ایڈیشن عملی چھپائی اشاعت کے آخری مرحلوں میں ہے اس ایڈیشن کو عبد الرحمٰن چغتائی نے تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کیا ہے اس کی اشاعت پر کم و بیش تین لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں اس ایڈیشن میں کم و بیش سو تصویریں رنگین لوح جمیل صفحات قدیم ایرانی اور مغلیہ مرقعوں کی صورت میں شامل ہیں۔ اس ایڈیشن میں بعض تصاویر ایسی ہیں جو علامہ کی زندگی میں بنائی گئی تھیں اور بعض ایسی ہیں جو ان کے مطالعے میں رہی ہیں۔ (افکار)

رشید احمد صدیقی

میر مرحوم عجب تھا کوئی!

محمد فاروق دیوانہ مرحوم (ایم۔ ایس۔ سی علیگ) کی رحلت کی خبر ہماری زبان سے ملی۔ ایک مدت سے یاد نہ آئے تھے۔ عرصے سے علیل صاحب فراش تھے۔ خط کتابت بھی نہ تھی لیکن جب کبھی وہ باتیں ذہن میں آتیں جو علی گڑھ کہلاتی ہیں تو مرحوم کا سراپا اور شخصیت سامنے آ جاتی کیا بتاؤں جب سے علی گڑھ گردش میں آیا ہے اولڈ بوائز کی ناموس کی اتنی نہیں مار آئی جتنی موجودہ نوجوان طلبا کی معصیت و محرومی مضطرب رکھتی ہے

ہر آدمی کی وفات پر خواہ وہ اچھا ہو یا برا مسلمان کی زبان پر بے ارادہ دعائے مغفرت آتی ہے۔ دعائے مغفرت مانگ کر مرحوم کو جوار رحمت میں دیدینا ٹھیک ہے لیکن مغفور کو محبت و احترام سے اپنے شعور و ادب میں آنے والی نسل کی محبت و احترام کے لئے محفوظ کر دینا اور اس کی امانت میں دینا دعا سے آگے کی ایک چیز ہے یعنی دعائے مقبول ایسے ناچیز بندے کو خدا نے یہ ایک اختیار و استیار بخشا ہے کہ وہ دعا مانگ کر اسے خود بھی قبول کر سکتا ہے اس عطیہ الٰہی کی طرف ہمارا دھیان کم جاتا ہے ورنہ دعا کی طرف سے کبھی کبھی مایوس یا بدگمان ہونے کے بجائے ہم ہمیشہ اپنے کو مسرور و مطمئن محسوس کریں۔ کبھی کبھی میں اس طرح کی بھی دعائیں مانگ لیتا ہوں۔

مرحوم کتنے ناموں سے مشہور تھے اور یہ سارے القاب ان کے شیدائیوں نے کس محبت و عزت سے ان کو دئے تھے حاجی مع العلیٰ حاجی بہلول بہلول اور یوسف غالباً مشہور کلاسیکی بہلول دیوانہ کی یاد و احترام میں اپنے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے۔

مع العلیٰ تھا نام مرا اس کو دیکھئے   اتنا بگاڑا لوگوں نے بہلول کر دیا!

اگلے زمانے میں جب حکومت مطلق العنان ہوتی تھی مخلص اور عقلمند لوگ دیوانے اور دیوتی وطیور کی زبان سے کلمۂ حق کہلواتے اور اس کی تلقین کرتے۔ جابر آدمی کو نہیں پہچانتا جانوروں سے ڈرتا ہے مظلوموں اور بچوں کو اس زمانے میں اسی طرح اچھی باتیں بتائی سکھائی جاتی تھیں دیوانے کی باتیں فرزانوں کی فرمودات سے زیادہ موثر ہوتی تھیں۔ اس لئے کرنا لائق سے نالائق بھی دیوانے کو مخلص سمجھتا ہے۔

فاروق صاحب علی گڑھ کے اس زمانے کے طلبا میں سے تھے جب ہم سب علی گڑھ کو مسلمانوں کا اندلس اور یونان سمجھتے تھے کیسے کیسے ذوق ذہن اور ہمت و حوصلہ کے طالب علم یہاں تھے کتنے عمیق اور قوی عوامل و عناصر اور کیسی صحت مند و صحت بخش فضا میں ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہوتی تھی ان میں سے کس کس کے نام لوں اور کہاں تک ان کی تفصیل سناؤں۔ علی گڑھ کے اس زمانے کے فرزندان باصفا ان کو جانتے پہچانتے ہوں گے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی ۳۰۔۴۰ سال میں جتنے نامور طلبا اس ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے وہ پھر کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جیسے اقدار اعلیٰ کے وہ سانچے ٹوٹ چکے ہوں جن میں نوجوانوں کی سیرت و شخصیت ڈھلتی تھی یا وہ روایات اپنا اعتبار کھو چکی ہوں جن میں ہماری فکر و نظر بیدار و بالیدہ ہوتی تھی۔ جس نسل کا ذکر کر رہا ہوں وہ اس تہذیب کی شکست و ریخت سے برآمد ہوئی تھی جس کو تاریخ میں ایسی تہذیب قرار دیا گیا ہے جو اپنی ترکیب، توانائی اور تازگی کے اعتبار سے تہذیب ہی نہیں تحریک بھی ہے۔ یہ تہذیب اور ایسی تہذیب ختم نہیں ہوتی بلکہ کلام الٰہی کے لفظوں میں اپنی شان بدلتی رہتی ہے۔ کم تہذیبیں تحریک رہی ہیں!

فاروق صاحب ریاضی (میتھمیٹکس) کے ایم۔ ایس۔ سی تھے۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا سائنس یا ریاضی میں یہ امتیاز حاصل کرنا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہم میں جو اس علم سے واقفیت رکھتے تھے ان کو کچھ اس طرح کا اسکالر سمجھتے تھے جو ریاضی کا عالم ہی نہ ہو جیسا کہ اکثر لوگ ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ریاضی کے ادا شناس تھے۔ وہ ریاضی سے دوسرے علوم کی بھی تعبیر و تصدیق کر سکتے تھے۔ وہ تمام علوم کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی ہامیاتی رشتے میں منسلک سمجھتے تھے۔ اس طور پر ریاضی کو انھوں نے اپنے طلبا کے لئے بہت دلچسپ اور سبق آموز بنا دیا تھا ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ان کو لکچرشپ کے علاوہ قانون مسعودی کے ترجمے کا کام بھی سپرد کر دیا تھا۔ فاروق صاحب ڈاکٹر صاحب کے بڑے چہیتے اور لائق شاگرد تھے۔ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور تمام عمر ڈاکٹر صاحب کے متخب رفقاء میں رہے۔ ممتاز ہاؤس میں قیام تھا لیکن دن رات حالت سفر میں رہتے کوئی ساتھ نہ ہوتا۔ صرف ایک کمل کندھے پر ڈالے ہوتے جس سے وہ جس طرح کا سلوک چاہتے کرتے چلتے ہوتے تو کمل گردن پر سوار رہتا جہاں بیٹھنے کو ہوتا وہاں کمل کو ٹیک کر اس پر خود سوار ہو جاتے جاڑے گرمی بہار برسات کسی کی قید نہ تھی کمل ان کا سمبل یا سلف ریکٹ بن گیا تھا۔

یاد نہیں آتا ان سے کب کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی، شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہو۔ وہ خود مجھ پر منکشف ہو گئے ہوں۔ اس کا سلسلہ اس طرح رہا کرتے کہ جب تک علی گڑھ میں رہے دن رات میں کسی وقت ایک بار مجھے دیکھنے اور اپنے کو دکھانے کے لئے ضرور آ جاتے۔ موجود نہ ہوتا تو بچوں کو طرح طرح کے حرکات و سکنات سے لبھاتے، بچوں سے بھی زیادہ بچوں کی طرح باتیں کرتے اور کھلکھلا کر چلے جاتے۔ کوئی نہ ملتا تو نوکروں سے اظہار تلطف کی خاطر کوئی چھوٹی موٹی سی فرمائش کر دیتے اور ان کو خوش کرنے کے لئے اپنے خاص انداز سے پرسش احوال کرتے اور چلے جاتے۔ میں گھر آتا تو یہ ملازم فاروق صاحب کی تشریف آوری کو اس طرح بیان کرتے جیسے فاروق صاحب میرا نہیں ان کا کارنامہ تھے۔ نوکروں اور بچوں میں شاید ہی کوئی فرزانہ اتنا مقبول تھا جتنا یہ دیوانہ!

جیسا کہ اوپر بیان کر آیا ہوں وقت کا زیادہ حصہ گھومتے پھرنے کاٹ دیتے جیسے کوئی ناقابل تسخیر باطنی تقاضا یا طاقت جس سے بیٹھنے نہ دیتی ہو۔ نووارد طلبا یا اجنبی اشخاص سے راستے میں کھڑے کھڑے گفتگو کرنے لگتے جو ان کی ہیئت اور الکھڑی الکھڑی باتیں سن کر ان کو نیم پاگل سمجھتے لیکن مخاطب کو وہ باتیں اتنی عجیب اور دلکش معلوم ہوتیں کہ ان سے اس وقت تک

جدا نہ ہوتے جب تک یہ خود گفتگو کے دوران ہی میں ان کو سخیر چھوڑ کر کسی اور طرف نہ نکل جاتے۔ فاروقی صاحب کا سراپا اور طور طریق دیکھ کر قدیم یونان کے ارباب دانش اور اہل فن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ترشا ہوا ناک نقشہ متناسب اعضا رکھلتا ہوا رنگ، آنکھیں متجسس کبھی اتنی گہری پُراسرار اور ٹھہری ہوئی جیسے گہرا خاموش بے کنار سمندر۔ غیر معمولی طور پر نمایاں چوڑی ہموار اونچی پیشانی، سر کے بال صاف الجھی گھنی ہوا میں بکھرتے رہنے والی کھچڑی داڑھی جو ان کے انداز گفتگو کے ساتھ اس طرح متحرک رہتی اور خفیف سے خفیف ارتعاش کو ریکارڈ کرتی جیسے راگ آواز ہی نہیں جنبش (رقص) بھی ہو۔ اوسط کھودی قد آواز بھاری نہیں تھی لیکن اشعار ہمیشہ ایسی گمبھیر آواز و انداز سے پڑھتے جس میں گونج اور گمک ہوتی۔ بالعموم ایسے ہی شعر پڑھتے جن میں صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جزالت ہوتی ان کی زبان سے شاید ہی میں نے کبھی ایسا شعر سنا جس میں غزل کا رنگ و آہنگ ہو۔ پتلے دبلے لیکن ہلکے پھلکے نہیں۔ اعصا اور عضلات میں بڑی لچک اور توانائی معلوم ہوتی تھی۔ یونانی دانشوروں ہی کی طرح مسائل کو سنجیدہ گفتگو اور سوال جواب سے سلجھ کرتے۔ کیسے ہی غبی یا بر خود غلط سے کیوں نہ سابقہ ہو نہ اکتاتے تھے نہ بیزار ہوتے تھے۔

یونی ورسٹی میں اکثر رزم و بزم کے معرکے پیش آتے رہتے۔ ایسے مواقع پر بعض محترم مہمانوں کا اجتماع میرے یہاں ہو جاتا۔ فاروقی صاحب حسب معمول گھومتے پھرتے گنگناتے آنکلتے۔ ان کی پذیرائی میں رکھ رکھاؤ لطف شگفتہ روی اور شائستہ بے تکلفی سے ہوتی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ظاہر اور باطن دونوں میں مہمانان اکابر کے لئے کتنی کشش و احترام تھا فاروقی صاحب کو جس نے قریب سے دیکھا ہے وہ جانتا ہوگا کہ ان کے ظاہر اور باطن میں اختلاف ہوتے ہوئے کتنا اتحاد تھا۔ ایسا اتحاد جس کو اتنا آرٹسٹ نہیں جتنا عارف سمجھ سکتا تھا تا وقتیکہ کہ آرٹسٹ اور عارف بیک ناقہ دو محمل نہ ہوں۔

یہ قرآن "ملا پوشیدہ اور کافر کھلا" شاذ و نادر ہی دیکھا گیا ہے اس صحبت میں کوئی نہ کوئی سیاسی علمی یا تہذیبی مسئلہ بغیر ارادہ کے چھڑ جاتا فاروقی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کی موجودگی میں موضوع گفتگو کچھ ہی ہو اس کی سطح ہمیشہ بلند ہوتی۔ یہ بڑی معتبر پہچان حقیقی آرٹسٹ اسکالر یا شخص کی ہے۔ باتیں سنجیدہ اور شگفتہ ہوتیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال سے لے کر آخرت میں ان کے عروج تک کے سارے مسائل زیر بحث آجاتے۔ درمیان میں تفنن کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ فاروقی صاحب کہیں بند نہ تھے۔ یکایک پہلو بدلتے مجلس برخاست ہو جاتی اور اس طرح رخصت ہو جاتے جیسے جھونکا نسیم کا تھا ادھر آیا ادھر نکل گیا!

سال نہیں یاد آرہا ہے تقریب یاد ہے۔ طلبا نے اسٹریچی ہال میں ڈراما کیا تھا۔ فاروقی صاحب چیف ایکٹر تھے ایسے ایکٹر جس کے "روئے زیبا کے لئے مزید کسی "آب و رنگ و خال و خط" کی حاجت نہ تھی وہ سماج ہی نہیں سنسار کے سنسر ایکٹر تھے۔ اسٹیج پر نمودار ہوئے تو پورا ہال تحسین اور تالیوں سے ہلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے فاروقی صاحب اپنے حلیہ و ہیئت اور اپنے سے متعلق جس حرف و حکایت کی صدائے بازگشت میں نمودار ہوئے تھے وہی بھرپور ڈراما تھا از اول تا آخر اسے شیت میں مدت گم یا متسل ہو۔ پھر اسا خطبہ پڑھا جو صحت "متشابہات" میں لکھا گیا تھا۔ اس صنعت کی کھوج میں نہ پڑیئے فاروقی صاحب کو نظر میں رکھئے پہلے ہی فقرے سے تماشہ لگنا شروع ہوا ہر متشابہ کی برجستگی پر سامعین دل کھول کر داد دیتے اور لطف اٹھاتے اس صنعت کو فاروقی صاحب نے کہیں سے کھوکھلی یا آورد سے بے کیف نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے سامعین جن میں کبھی وہ خود رہ چکے تھے بڑے سخت گیر اور صرف آمد کے قائل تھے آورد اور تتبع کو کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتے تھے انھوں نے ہر موڑ پر ہر لفظ اور فقرے میں کوئی نہ کوئی گدگدی پھلکی یا چٹکی رکھدی تھی۔ معلوم نہیں یہ خطبہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔ یہ صنعت اتنی صنعت نہیں ہے جتنا لطیفہ یا تفریح طبع حکمت سے ملتی جلتی ایک چیز۔ اس سے کام لینے والا اگر کوئی اچھا فن کار ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم اور دلچسپ واقعات حالات و تجربات کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس خطبے کا اختتام کچھ اس طور پر ہوا تھا۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ المخاتون وا شیخ عبداللہ! اس زمانے میں ویمنز کالج علی گڑھ کے بانی اور سکریٹری جان بہادر شیخ عبداللہ مغفور ایک رسالہ خاتون نکالتے تھے۔

فاروقی صاحب اچھے شاعر تھے اور ایسے ہی شعر کہتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ وہ شاعر شاعری اور سامعین سب کا حق ادا کر رہا ہے۔ لکھے اور بار بار کے پڑھے ہوئے اشعار مجھے یاد نہیں رہتے چہ جائیکہ سنتے سنائے۔ سر راس مسعود مرحوم کے اسکول کے ساتھی تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اسٹاف کلب میں فاروقی صاحب نے بڑی دھوم کا ایک خیر مقدمی قصیدہ پڑھا کس اعتبار و افتخار سے یہ مصرعہ پڑھا تھا:

بہ ہمت جوان و بتدبیر پیر!

اس وقت جنگ بلقان کے زمانے کی ایک نظم کا مشہور شعر یاد آرہا ہے جو مدتوں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رہا

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے   پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے!

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ نظم فاروقی صاحب ہی کی تصنیف تھی یا کسی اور کی۔ عام طور سے منسوب انھی کی طرف کی جاتی تھی۔ ان کی اردو نثر میں بڑی جان اور روانی تھی جس میں جا بجا طنز و ظرافت کے جگنو جگمگاتے تھے۔ طنز و ظرافت کے لئے نہ چہرہ باندھتے نہ مواقع تصنیف کرتے۔ ان کی تحریر سے طنز و ظرافت اسی طرح برآمد ہوتی جیسے پیڑ پودوں سے پھل پھول۔ مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد سے کچھ دنوں وابستہ رہے۔ اردو کے بیشتر مضامین اسی میں شائع ہوئے۔ بات میں بات نکلتی ہے اور جب "دیوانے کا پاؤں دبانا ہو" تو ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے

شکل فن ہے۔ ہنس ہنس کے اور ہنسا ہنسا کے مار ڈالنا بہرحال فساد کرا کے مار ڈالنے سے بہتر اور بڑا کارنامہ ہے۔ متشابہات کا تعلق ظرافت سے ہے اور متشابہات میں پتے کی بات کہنے جانا آسان نہیں ہے لیکن یہ کوئی اعلیٰ اسلوب نہیں ہے البتہ اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ کوئی اچھا لکھنے والا ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم واقعات حالات اور تجربات کی نشاندہی اس پیرائے میں دلنشیں انداز میں کر سکتا ہے

ہمدرد کے دفتر دہلی میں ایک بار فاروق صاحب کا مہمان ہوا فاروق صاحب اپنے CELL (حجرہ یا زاویۂ زاہداں) میں زیادہ تر چارپائی پر لیٹے چھت کو تکتے اور گنگناتے رہتے۔ اکتا جاتے یا خیالات یکسو ہو جاتے تو سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ لیتے۔ یہ ایک طرح کا نوٹس تھا کہ جو کچھ سوچ لیا ہے۔ وہ دم بخت ہو رہا ہے۔ پھر یکلخت اٹھ بیٹھتے اور میل سے کٹے پھٹے کاغذ پر جلد جلد لکھنا شروع کر دیتے دو چار صفحے لکھے کاتب آیا مسودہ لے گیا محمد علی صاحب کے احکام دو شام یا نہ دار آواز سے مسلسل براڈ کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ شام ہو رہی تھی مولانا کی آواز گونجی "دیکھو فاروق کیا کر رہا ہے" پاس سے شاید کسی نے کہہ دیا ہو کمبل میں روپوش ہیں۔ موسمی خلفشار کو روزنامچہ کرتا ہوا محمد علی صاحب کا ترٹا آنا موصول ہوا۔ جیسے ریڈیو پر بجلی کے بجائے آواز گری ہوا " ارے اس سے کہو اٹھ بیٹھے ورنہ دیوانہ تو ہے ہی پاگل ہو جائے گا"

محمد علی جیسے تھے سب جانتے ہیں۔ ایسی کھلی کتاب کہاں ملی ہے۔ زندگی کی جس منزل اور زمانے کی جس گردش سے گزر رہا ہوں اور علی گڑھ کو جس درماندگی میں پاتا ہوں اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب کسی محمد علی کو نہ دیکھ پاؤں گا۔ مرحوم کے بارے میں متضاد رائیں ملتی ہیں۔ مجھے تو ان کی خامیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے وہ ان میں نہ ہوتیں تو شاید ان کی شخصیت اتنی سحر کن، ناقابل تسخیر اور دل آویز نہ ہوتی جتنی کہ تھی۔ کاش ناظرین نے ان کو اپنے خوردوں میں سے کسی پر برہم ہوتے پایا ہو اس کے بعد یہ دیکھا ہو کہ اس برہمی کے طفیل اور اس کی تلافی میں محمد علی کی شرافت شفقت شجاعت اور سخاوت کا کیا عالم ہوتا تھا کیسے کہوں کہ اب ایسے لوگ نہ پیدا ہوں گے اس لئے کہ شخصیت مٹاتی ہے لیکن مٹنے نہیں دیتی۔ وہ مٹاتی ہی ہے بنانے کے لئے شاید طرفہ تر اور عظیم تر شئے یا شخصیت بنانے کے لئے۔

محمد علی مرحوم تین شخصوں کا غیر معمولی لحاظ کرتے تھے۔ میرے علم میں یہی تین ہیں۔ بہت ممکن ہے دوسرے بھی ہوں۔ سید محفوظ علی بدایونی، راجہ غلام حسین اور فاروق صاحب کا۔ راجہ غلام حسین کامریڈ میں محمد علی کے دست راست تھے۔ تھوڑے سے وارستہ مزاج تھے۔ محمد علی صاحب ایک دن ان کی تلاش میں پتہ لگاتے لگاتے بام نشینوں تک جا پہنچے راجہ مرحوم کو پکڑ لائے اور یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے دفتر پہنچے:

> میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

غلام حسین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ محمد علی صاحب بے قرار ہو گئے۔ رجانگداز مرثیہ لکھا۔ ایک شعر یاد آ رہا ہے:

> خوب کھلتا بہشت کا رستہ
> ہم کو بھی ساتھ کر لئے ہوتے

ان دنوں کبھی کبھی بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے کہ ایک دفعہ پھر یونین میں محمد علی کی زبان سے وہ شعر سن سکتا جس کا قصہ یہ ہے، محمد علی ۱۹۱۸ء میں طویل نظر بندی سے رہا ہو کر علی گڑھ پہنچے تھے۔ علی گڑھ کے طلبا، علی گڑھ کے محراب و منبر علی گڑھ کی فضا، علی گڑھ کے تقاضے اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا جب محمد علی اپنی محبت مسرت اور افتخار کا اظہار کرنے بیٹھے۔

> ابر اٹھا تھا کعبے سے جھوم پڑا مے خانے پر!

شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا۔

> شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد

دیر تک اور طرح طرح سے اسے پلٹے دیتے رہے کبھی سنجیدہ ہو کر کبھی بلند بانگ ہو کر کبھی بڑے ہلکے پھلکے تفریحی انداز سے اور ہم سب کے شوق کو مہمیز کرتے رہے جب دیکھا کہ پیالے کے چھلکنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تو دوسرا مصرعہ پڑھا اور اس طرح پڑھا اور ایسے ادا کیا کہ کیا کوئی مشاق شاعر یا ایکٹر ادا کرے گا۔ اس سے پہلے انہوں نے اتنا اور کہہ دیا صاحبو یہ شعر میرے وطن رام پور کے ایک شاعر کا ہے۔ اتنا کہہ دینے سے شعر کی تاثیر اس موقع پر جتنی بڑھ گئی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، پورا شعر یہ ہے۔

> شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
> بند سے دیوانہ رہا ہو گیا!

کیا بتاؤں محفل کا کیا حال ہوا۔ ثانی مصرعہ طرح طرح سے بار بار پڑھتے۔ کیسا مژدہ اور کیسی دعوت تھی یہ اسیری اور یہ رہائی۔ جس کا احساس و اظہار جگر صاحب کے اس شعر میں ملے گا۔

> اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
> کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!

یہ ان اشعار میں ہے جسے اچھے شاعر بھی اتفاقیہ ہی کہہ جاتے ہیں۔ ہم میں پاکر اور ہم میں پہنچ کر محمد علی سے زیادہ دھوم مچانے والا، جان چھڑکنے والا اور فخر کرنے والا مجھے تو اب تک ملا نہیں جیسے ان کی ساری اعلیٰ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہوں۔ اور ہاں یہ کہنا تو بھول

سی جا ... کیا ہی سور ما کیوں نہ ہو محمد علی کو PATRONISE نہیں کرسکتا تھا۔

۱۹۳۵ء میں اودر ہالنگ کمیٹی نے جتنے اراکین اسٹاف کو یونی ورسٹی کی ملازمت سے برطرف کیا ان میں ایک فاروق صاحب بھی تھے۔ علی گڑھ چھوڑنے کا ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے علم وفن اور دید و دانش کی جتنی رنگین روشن عفیف اور کشادہ آغوش وادیاں تھیں ان سب کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کر لیا ہو۔ اس حادثے پر فاروق صاحب کا قلندر جاگ پڑا اور یہ پکار کر کہ،

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی تنگ آستاں کیوں ہو

ان کو عرش پر سے فرش پر اتار لایا اور ایک نیا دل تفویض کیا۔ اس قلندر نے ان سے پہلے اور سب سے پہلے ہمارے جد اولیں کو بھی یہی کہہ کر سہارا دیا تھا اور زمین پر اتار لایا تھا۔ پھر معلوم نہیں کتنے بہانے اور کیسے کیسے بھیس میں اس کارگاہ عمل کو وہ حیثیت و منزلت بخشی جس کا بارگاہ عبادت میں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا

لیکن یہ داستان لمبی ہے اور رات تھوڑی۔ قصہ کوتاہ فاروق صاحب اپنے وطن گورکھپور کو مراجعت کر گئے شاید پھر کبھی علی گڑھ نہ آئے۔ وہاں انھوں نے شکر سازی کے ایک کارخانہ کی منیجری قبول کرلی اور فیکٹری کو ایسا عروج دیا کہ اس زمانہ اور اس نواح میں ان کے اس کارنامے کی دھوم مچ گئی۔ علی گڑھ کے فدایانِ ذوق خوار کے ایسے کتنے کارناموں میں ایک اور کا اضافہ ہوا،

یہ سب تو ہوا لیکن اس سوسائٹی کو کیا کہیے جہاں ہر عظمت کی تقدیر میں عبرت لکھی ہو!

صفحہ ۱۱ سے آگے

ہم ہی نہیں ہوں گے تو ان کی سکھ منیں کا لنناموں
ہر بادل کے جل جانے پر چھاؤں میں برسا تو کیا
جتنی چادر کی پونجی ہو اتنے ہی پھیلا کر پاؤں
جڑ جائے زخموں کو نمک ہی مشک ہوا ست تو کیا

برہمی اور تلخی کی یہ لے اب نئی غزل میں اور بھی ادبی ہوتی جا رہی ہے۔ آج کی غزل نہ عاشقانہ ہے نہ ماہرانہ اور نہ ہی اس طرح کی فاسقانہ جو داغ و امیر کے اثر سے ہمارے یہاں رائج ہوئی تھی بلکہ یہ غزل اپنے زمانے کی آگہی اور بصیرت اور آج کے انسان کے مضطرب اور بے قرار روح کو پیش کرتی ہے۔ اگر آج کی نئی غزل کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پر شاد عارفی کا اثر بھی خاصا نمایاں ہے اس لحاظ سے وہ ان چند شاعروں میں ہیں جن پر ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بنیادی قرآنی قاعدہ

مصنف:- سید محمد ابراہیم نہری
ناشر:- العلمیہ حیدرآباد (آندھرا)
قیمت:- چار روپے، صفحات: ۳۲۰

غزال (غزلوں کا مجموعہ)

مصنف:- کرشن موہن
ناشر:- انڈین اکیڈمی، نئی دہلی
قیمت:- سات روپے
صفحات:- ۱۶۸

مراسلہ

علامہ کیفی اور صنفِ غزل

پنڈت کیفی میرے غنایت فرماتے۔ کبھی کبھی اپنے گرامی ناموں سے مجھے سرفراز فرماتے تھے۔ اِدھر اُن کی کتاب "منشورات" کا جو نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس کے پیش لفظ میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"ہمیں ان کے غزل کہنے پر تعجب نہ ہوتا کیونکہ وہ دور ہی غزل کا تھا۔ ہر کہ دمہ غزل کہتا تھا لیکن حیرت اس پر ہے کہ انھوں نے اسی ذوق و شوق سے نظمیں بھی کہی ہیں۔"

اس عبارت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ پنڈت کیفی کی شاعری میں غزل کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور نظم کو ضمنی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے پنڈت جی کا ایک خط شائع کیا جا رہا ہے جس میں انھوں نے غزل کے بارے میں اپنی رائے تفصیل سے لکھی ہے۔ اس خط کا موقع ورود یہ ہے کہ آج سے بیالیس سال پہلے ۱۹۲۶ء میں میری کتاب ہماری شاعری کا (جس کے اب گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، دس اصلی اور ایک جعلی) ایک حصہ ایک طویل مضمون کی صورت میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سہ ماہی رسالے اردو میں شائع ہوا اور پنڈت جی کی نظر سے گذرا۔ انھیں دنوں میں لکھنؤ یونی ورسٹی کی ایک خاص تقریب میں شرکت کرنے اور لکچر دینے کے لئے میں نے پنڈت جی سے درخواست کی۔ انھوں نے اس درخواست کے جواب میں یہ خط لکھا تھا جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں لکچر کے متعلق ہدایتیں وغیرہ ہیں دوسرے حصے میں میرے مضمون پر مختصر اور غزل کے بارے میں تفصیلی رائے ہے۔

مکتوب کیفی بنام مسعود حسن رضوی

ماس سٹری انارکلی۔ لاہور۔ ۴ر دسمبر ۲۶ء

میرے مشفق، تسلیم

۳۰ر نومبر کا عنایت نامہ پہنچا۔ لکچر کے متعلق تو مجھے کچھ لکھنا ہے نہیں آپ اپنی مجلس انتظامیہ میں سب مدارج طے کر ہی لیں گے۔ اس تاریخ تک جو روانگی کے لئے میں نے مقرر کی ہے، شیعہ کانفرنس ہو چکی ہوگی، جو شاید کہیں بہار میں منعقد ہونے والی ہے۔ کانگرس اور اس کا تسلسل بھی ختم ہو چکا ہوگا۔ بہر حال میرا پروگرام میری طرف سے تغیر پذیر ہے اس لئے اس کی تقدیم و تاخیر ممکن ہے۔ ہاں ایک بات آپ کو بتانی ضروری ہے کہ ۱۵ر دسمبر سے یہاں صوبے کی تعلیمی کانفرنس ہونے والی ہے اس سلسلے میں کچھ بیگار میرے سر بھی پڑی ہے، جس سے امید ہے مجھے دنوں کے ابتدائی ایام تک فراغت ہو جائے اب رہیں ایسی باتیں جیسے جلسے کا مقام اور وقت اور صدر جلسہ وغیرہ یہ جزوی معاملے ہیں۔ بہر حال صدر کا نام جب تجویز ہونے لگے تو دو تین نام پہلے سے تجویز کر لینے چاہئیں جو علی الترتیب متبادل ہوں۔ یعنی اگر اول صاحب کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکیں تو نمبر ۲ یہ فرض ادا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت پر کسی ایسے صاحب کو متعین کرنا پڑے جو پہلے سے اس کے اہل نہیں سمجھے گئے تھے۔ اکثر جلسوں میں ایسا ہو جاتا ہے۔ لکچر کا وقت تعین کرنے وقت مغرب کی نماز کا خیال رکھا جائے۔ یہ مقامی مصلحتوں میں سے ہے جن کو آپ ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ لکچر کی مدت ایک گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹے تک ہوگی۔

اب رہا آپ کے مضمون کا معاملہ۔۔۔ میں اس وقت لکھنؤ کے لکچروں اور لاہور کی کانفرنس کے کاموں میں مستغرق ہوں۔ اس انہماک میں اتنی فرصت کہاں کہ مفصل رائے تحریر کروں۔ ایک لکچر ختم ہو چکا ہے، دوسرا زیر تحریر ہے۔ اردو کا وہ نمبر بھی کوئی صاحب لے گئے ہیں جس میں آپ کا مضمون ہے۔ بہر حال اس کو پڑھ کر میری یہ رائے ہوئی تھی کہ غزل اور پرانی چال کی شاعری کی حمایت میں آج تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے اور میرے علم میں آیا ہے اس میں یہ مضمون بہترین ہے۔ جو قابلیت اور تحقیق آپ نے اس مضمون میں صرف کی ہے بے شک داد کے قابل ہے۔

خود میری شاعری غزل سے شروع ہوئی اور میں نے ہی غزل کے خلاف جیسا کہ اسے متاخرین نے بنا دیا، قصیدے کہے، جن میں سے ایک میرے کلام کے چھوٹے سے مجموعے میں شامل ہے جو چند سال ہوئے احباب نے چھپوا دیا ہے۔ اور ایک لمبا قصیدہ ۱۹۱۵ء کے کسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اصل یہ ہے کہ غزل منجملۂ اصناف محض مبتدیوں کی مشق کے لئے وضع کی گئی ہے۔ اس لئے اس میں مضامین کا تنوع جائز رکھا گیا ایران کے اساتذہ کا کلام دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ غزل ان کے لئے مایۂ فخر ہرگز نہ تھی۔ خواجہ حافظ نے غزل کو فروغ دیا کیونکہ شعر کی کسی اور صنف میں انھیں کمال اور شغف حاصل نہ تھا۔ اردو یا ریختے کی شاعری کو جب دکن کی نقل و حرکت اور باہر کی ہلچل سے فراغت پا کر دلی میں مدوّن کیا گیا تو ان کے سامنے حافظ اور نظیری تھے۔

آپ نفسیات کے نکات سے ماہر ہوں گے اور جانتے ہیں کہ متنوع اور گوناگوں احساسات سے دماغ پر کیا تاثر ہوتا ہے اور شعور یعنی نفس ناطقہ مسلسل تخیل سے محروم ہو جاتا ہے اسی سے تو ہم دیکھتے ہیں کہ متقدمین قصیدے میں بھی غزلیں داخل کر دیتے تھے بلکہ مثنوی میں بھی (میر تقی کا کلیات ملاحظہ ہو) کیونکہ ان کے متخیلہ کو تسلسل کی برداشت تھی نہ سامعین کے سامعہ کو۔ قوم کی قوم ذہنیت اس قدر ماؤف ہو گئی تھی کہ ایک مستقل موضوع پر کہتے کہتے اور سنتے سنتے دماغ تھک جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میر اور سودا جیسے قادر الکلام استاد بھی کوئی شان دار ضخامت کی مثنوی ہمارے لئے نہ چھوڑ سکے اور جب لمبی مثنوی کی ساعت آئی تو ستانے کے لئے اس میں بھی غزل آموجود ہوئی۔ گلزار نسیم میں کم سے کم دو غزلیں ضرور ہیں۔ یہی حال سحر البیان کا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

ل الرحمن اعظمی

رفتار

ابھی چند ماہ پہلے شاد عارفی کی شخصیت اور فن سے متعلق مضامین
ایک مجموعہ ان کے شاگرد مظفر حنفی نے مرتب کرکے شائع کیا
ا۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں
، خاصی پذیرائی ہوئی اس لئے
اس کے ذریعہ اردو کے ایک
مثال اور منفرد شاعر کی
رگی کا المیہ اور اس کے
ن کے بعض قابل قدر پہلو
ی بار ہمارے سامنے آئے
ر اس کتاب کے مطالعے
ہ دوران یہ احساس بھی
منگیر ہوتا تھا کہ ان کے
بی کام کی کلی حیثیت، اور
دگی قدر وقیمت کا تعین ابھی
تی ہے۔ اس کی سب سے
ی وجہ یہ ہے کہ شاد عارفی
کلام یکجا صورت میں کہیں
ستیاب نہیں ہوتا۔ وہ بہت
وشاعروں میں تھے اور اپنی
ندگی کے تقریباً پچاس سال
ہوں نے اردو شاعری کی
بیاری میں صرف کئے۔ اردو
ہ چند اہم اور بڑے شعراء
طرح شاد عارفی بھی کلیات
ہ شاعر تھے اور ان کے
ں کا دائرہ اس قدر وسیع
ہ کہ جب تک سارا کلام
سامنے نہ ہو تو ان پر تنقید و تبصرے کا حق ادا ہوتا ہے اور
ان کے موضوعات اور اسالیب کے ساتھ پورا انصاف
جا سکتا ہے۔ شاد صاحب کی نظموں کا ایک مجموعہ "سماج" کے
م سے ۱۹۴۵ء میں ان کے دوست رشید احمد خاں مخمور نے
ائع کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس مجموعے کی مناسب اشاعت نہ ہو سکی
س کے بعد ان کی زندگی میں صرف دو مختصر انتخابات شائع ہوئے
یک انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے اور دوسرا عابد رضا بیدار

کا مرتب کیا ہوا رام پور سے۔ شاد صاحب کی وفات کے چند ماہ
بعد رام پور سے ایک اور مجموعہ "سفینہ چاہئے" کے عنوان
سے سلطان اشرف نے مرتب کرکے شائع کیا تھا بڑی خوشی کی
بات ہے کہ یہ سلسلہ اب آگے بڑھ رہا ہے اور شاد صاحب کے
انتخابی مجموعے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا لوگوں میں
میں حوصلہ پیدا ہو رہا ہے پچھلے دنوں ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے
ہیں: "اندھیر نگری" کے نام سے ان کی طنزیہ نظموں کا ایک
مجموعہ نیا ادارہ (لاہور) نے
خوبصورت ٹائپ اور اعلیٰ درجے
کی سرورق کے ساتھ شائع کیا ہے
دوسرا مجموعہ "شوخیٔ تحریر" کے
نام سے مظفر حنفی نے مرتب کرکے
مرکز ادب بھوپال سے شائع
کیا ہے اگرچہ یہ دونوں مجموعے بھی
شاد صاحب کی پوری نمائندگی
نہیں کرتے اور انھیں بھی "نمونہ
کلام" کے زمرے میں ہی رکھنا
ہوگا لیکن ان دونوں کتابوں
کے مطالعے سے بھی شاد صاحب
کے مخصوص طرز فکر اور ان کے
اسلوب بیان کے اہم اور
بنیادی عناصر کا سراغ لگانا
کچھ مشکل نہیں ہے۔
شاد صاحب صحیح معنوں میں
ایک صاحب طرز شاعر تھے۔
نظم ہو یا غزل ایک دو مصرعے
پڑھنے یا سننے کے بعد ہی ان کی
آواز پہچان لی جاتی ہے۔
اردو نظم میں ہیئت و اسلوب
کے جتنے تجربے اب تک ہوئے
ہیں وہ مغربی اثرات کے
مرہون منت ہیں۔ غزل، قصیدہ
مثنوی، مسدس اور قطعے کے طرز پر ہمارے یہاں جو نظمیں لکھی
جاتی تھیں ان کی ناسیاتی وحدت ہمیشہ مشتبہ رہی۔ دوسرے یہ کہ
رومانیت، جذباتیت یا خطابت اور پیامیہ و ناصحانہ طرز ہماری
اردو نظم نگاری کی تقدیر بن کر رہ گیا تھا۔ اس طرح سے نکلنے اور
جدید طرز کی نظموں تک پہنچنے کے لئے اردو شاعروں نے خاصا وقت
لیا ہے اور مغربی نظموں کی تقلید میں بسا اوقات نظم ہیئت کی تکمیل
کا احساس تو دلاتی ہے لیکن مواد اور ہیئت کے ناگزیر ربط سے

رؤف خیر

غزل

اس ادا پر تو مٹا جاتا ہے طالب کوئی
سننے والا ہے کوئی اور مخاطب کوئی

آج تک بھی ہے جو تسکیں انا سے قاصر
زندگی ہے کہ بھٹکتا ہوا راہب کوئی

مرنے والوں پہ تو بہتان تراشو لیکن
جینے والوں کو دو الزام مناسب کوئی

بولتے دیکھ رہا ہوں میں تھکی نظروں سے
جیسے شرمندہ ہو حالات سے تائب کوئی

زندگی تو نے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ
دور تک دیکھ رہا تھا تری جانب کوئی

ہنس رہا ہے مری پلکوں پہ جو یہ قطرۂ کرب
افقِ درد سے ٹوٹا نہ ہو ثاقب کوئی

غم جدا، فکر جدا، زیست کی اقدار جدا
خیر شاعر ہے مگر میر نہ غالب کوئی

تخلیقی جوہر جس طرح بروئے کار آتا ہے اس کی مثالیں کمیاب ہیں۔ شاد عارفی کی نظمیں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے مغربی شاعری سے بے نیاز ہو کر خود اپنی نظموں کے لئے نئے سانچے وضع کئے۔ یہ سانچے خود ان کے موضوع اور ان کے مخصوص زاویۂ نگاہ کی پیداوار ہیں۔ ان نظموں میں جو خالص داخلیت ہے اور جو بیانیہ قسم کی سپاٹ اور بے رس خارجیت۔ بلکہ شاد صاحب نے داخلیت اور خارجیت کو یکجا کر کے ایک نیا نمونہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے افسانوی اور ڈرامائی طرز اور کردار نگاری کے ذریعہ ان نظموں میں لہجے اور اسلوب کے عجیب و غریب تجربے کئے ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظمیں دیکھئے۔

۱۔ اندھیر نگری۔ ۲۔ بیٹے کی شادی۔ ۳۔ مشورہ۔ ۴۔ ساس۔ ۵۔ ساس اور بہو۔ ۶۔ رت جگا۔ ۷۔ ملازمہ۔ ۸۔ مہترانی۔ ۹۔ پرانے نوٹ۔ ۱۰۔ مرید کی بیوی۔ ۱۱۔ غمازہ۔ ۱۲۔ فلمی محبت۔ ۱۳۔ برزدو سر۔ ۱۴۔ شوہر۔ ۱۵۔ نمائش۔ ۱۶۔ دایہ۔ ۱۷۔ میرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری۔ ۱۸۔ رنگیلے راجہ کی موت۔ ۱۹۔ پرانا قلعہ۔ ۲۰۔ ان اونچے اونچے محلوں میں۔ ۲۱۔ ٹکڑ گدے۔ ۲۲۔ مرگ عورت کا ذلیل کتا۔ ۲۳۔ دیہاتی لاری۔ ۲۴۔ ابھی جبل پور جل رہا ہے اور "آپ کی تعریف" کے سلسلے کی نظمیں۔

ان نظموں کی انفرادیت یہاں دوچار اشعار یا چند بند نقل کرنے سے پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ انھیں شروع سے آخر تک نہ پڑھا جائے۔ البتہ غزلوں کی بات اور ہے غزل میں شاد عارفی کا لہجہ ان کے ہر ہر شعر سے پہچانا جا سکتا ہے اور متفرق اشعار سے بھی الگ الگ لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

شاد عارفی کی غزل ہماری غزل کی اس روایت سے ہٹی ہوئی ہے جہاں غزل کا رنگ داخلی اور باطنی تجربات کی وجہ سے نکھرتا ہے وہ ایک طور پر غیر رومانی اور غیر داخلی غزل کے شاعر ہیں۔ اس طرح کی غزل لکھنا خطرے سے خالی نہیں اس لئے کہ نغمگی اور شیرینی کا عنصر یہاں کم ہو جاتا ہے اور جذبے کی نوعیت بھی خاصی بدلی ہوئی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات جذبے کی نفی بھی کرنی پڑتی ہے۔ شاد نے اس رنگ کی غزل کو اپنی شخصیت سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ متغزلانہ کیفیت کی پوری تلافی ہو گئی ہے بلکہ اس کے لہجے میں ایسا تیکھا پن پیدا کر دیا ہے کہ یہ غزل اردو شاعری کے غزلیہ سرمائے میں ایک نئے امکان کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ شاد عارفی کی غزل شیریں غزل نہیں ہے یہ کٹھی میٹھی شاعری کا ایک نمونہ ہے جو بعض اوقات شیرینی سے بھی زیادہ لطف دیتی ہے شاد نے دراصل سماج کے ناسور پہلوؤں سے متعلق اپنے غم و غصے کو غزل کا پیرایہ دینے کی کوشش کی ہے اور اس کی تلخی اور زہرناکی کو ایک حد تک نرم کر کے لطیف طنز کی صورت دے دی ہے۔ یگانہ اور فراق کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں غزل کو نئے لہجے اور نئے ذائقے سے روشناس کرانے اور اسے اپنے دور کی کھردری حقیقتوں سے دوچار

ہونے کے قابل بنانے میں شاد عارفی کا کام خاص طور پر قابل توجہ ہے ان کے چند اشعار مثال کے لئے کافی ہوں گے۔

آئی ہیں مرے طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر
یہ کیا کہ فقط آپ برا مان رہے ہیں

شریک دوم سیاست ہیں کچھ "بڑے چہرے"
ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے

چور کی داڑھی میں تنکے کا منظر اکثر اکثر دیکھا
میرے رہبر کے نعرے پر راہنماؤں نے ٹھوکر دیکھا

کانوں میں پہننے کی بالوں کا زمانہ لد گیا
نظم محفل جس کو سونپا ہے وہ اس قابل نہیں

آشیاں پھول نہیں تھے کہ خزاں لے اڑتی
آپ اس بحث میں جلنے کی اجازت دیں گے

صرف ایموں کے تقرر کا ارادہ ہو گا
اور اخبار میں اعلان ضرورت دیں گے

کیا عجب ہے کہ تیشوں کی طرف بڑھ جائیں
لوگ ہاتھوں کو سوالوں سے جو مہلت دیں گے

تو پھر اسے ساقی و بہ طے رہا تھا
کہیں بھی راہ میں منزل نہ ہو گی

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

اللہ بھی دیں گے ہوادار ظل سبحانی
جو آ رہے ہیں نہائے ہوئے پسینوں میں

ایک رنگ آتا ہے ایک رنگ جاتا ہے
مصلحت پرستوں کی شاعری مجبوری ہے

جن مسائل میں وطن الجھا ہے
ہاتھ لکھتا ہوں اگر سلجھا دو

آپ کی یہ دلچسپی ہم شکستہ حالوں سے
واسطہ نہ پڑ جائے مختلف سوالوں سے

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں کے
طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے

احتیاطوں کو نیا انداز دوں
اس کو اپنے نام سے آواز دوں

سادہ دلوں نے راہ نمایاں تو ہم سے
اتنے فریب کھائے کہ چالاک ہو گئے

ہم جس کے لئے آپ سے انصاف طلب تھے
وہ جرم ہمیں پر ہے تو کیا عرض کیا جائے

ہے تو حق چونکہ عالیشان کاشانے نہیں ہے
اس لئے جھک مارتا بھی اس کا فرمانے میں ہے

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

غریبی جن کے پیچھے لگی تا حد عریانی
جو میں ان عصمتوں کو بیچتی کہہ دوں تو کیا
دیا تی صفحہ کالم

سالار جنگ میوزیم

ہندوستان میں دو سو سے زیادہ عجائب گھر ہیں لیکن حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ صرف ایک فرد واحد کے شوق، دلچسپی اور زندگی بھر کی محنت کا نتیجہ ہے۔ حال ہی میں جب صدر جمہوریہ ذاکر حسین نے حیدرآباد کا دورہ کیا تو اس میوزیم کی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ سالار جنگ میوزیم کی جدید عمارت موسیٰ ندی کے کنارے تقریباً (۶) ایکڑ آراضی پر تعمیر کی گئی ہے۔ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اس عمارت کا ڈیزائن ملک کے ممتاز آرکیٹکٹ جناب حشمت رضا نے تیار کیا ہے۔ میوزیم کی جدید عمارت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے قبل یہاں میوزیم کی تحریک اور دنیا کے عجائب گھروں میں سالار جنگ میوزیم کی اہمیت سے متعلق چند باتیں لکھنا غیر ضروری نہ ہوگا

قدیم یونان کے علم الاصنام میں تین دیویوں کا ذکر آتا ہے جو آرٹ ثقافت اور علم کی سرپرست سمجھی جاتی تھیں چنانچہ عجائب گھروں میں ان ہی شعبوں کے قدیم و جدید شاہکاروں کی تلاش کی جاتی ہے اس لئے یہ میوزیم کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مصر کے بادشاہ طالمس کے زمانے میں سب سے پہلا میوزیم قائم کیا گیا تھا دنیا میں جو میوزیم اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں ایک تو لینن گراڈ کا میوزیم جو ۳۵۰ کمروں پر مشتمل ہے۔ برطانوی میوزیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر دنیا کے اکثر ممالک سے متعلق تاریخی حیثیت کے حامل نوادرات کا ذخیرہ ہے۔ لوور میوزیم فرانس میں واقع ہے جس کا قیام سولھویں صدی میں ہوا تھا نیویارک میں میٹروپولیٹن آرٹ کا میوزیم ہے ہندوستان میں ۱۸۳۷ء میں کلکتہ میں پہلا میوزیم قائم کیا گیا تھا اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں مدراس میں بھی ایک میوزیم کا قیام عمل میں آیا سالار جنگ میوزیم دنیا کے بڑے عجائب گھروں میں شمار کیا جاتا ہے اس میوزیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس عجائب گھر میں ایک فرد کی جمع کردہ نوادرات ہیں۔ نواب سالار جنگ کو بچپن ہی سے نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا چنانچہ سالار جنگ مرحوم نے نوادرات کی خریداری کے لئے مصر، فلسطین، عراق، شام اور یورپ کے دورے کئے اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات سے بھی انھوں نے نوادرات خریدے۔

نوادرات کو میوزیم کی شکل دینے کا خیال سالار جنگ کو بھی تھا جس کے لئے وہ ایک عمارت تعمیر کروانا چاہتے تھے لیکن یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہوسکا۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے ایک خاص حکم کے ذریعہ ان کی پوری جائداد کو ایک وقف کمیٹی کے سپرد کردیا اور اس کمیٹی نے ان نوادرات کو میوزیم کی شکل میں ترتیب دیا۔ ۱۹۵۱ء میں آنجہانی پنڈت نہرو نے اس کا افتتاح کیا۔ میوزیم تقریباً (۱۷) سال تک دیوان ڈیوڑھی میں تھا لیکن گنجائش کی کمی کے باعث جدید عمارت تعمیر کی گئی۔ جناب مسعود احمد رضوی کیپر میوزیم نے ایک ملاقات میں بتایا کہ موجودہ عمارت کی آراضی سالار جنگ مرحوم کے ورثاء نے اسٹیٹ کمیٹی کے توسط سے حکومت ہند کو دسمبر ۱۹۵۸ء میں بلاقیمت دی اسی وقت جب کہ میوزیم قومیا لیا گیا تھا۔ اسٹیٹ کمیٹی کی رہنمائی میں ورثائے سالار جنگ نے مذکورہ آراضی بغرض تعمیر حکومت ہند کے حوالہ کی۔ اس کے علاوہ موجودہ عمارت کے دونوں طرف تقریباً (۴) ایکڑ مزید آراضی ۶ لاکھ روپیوں کے کثیر صرفہ سے حاصل کی گئی ہے اس اعتبار سے میوزیم (۱۱) ایکڑ آراضی پر مشتمل ہوگا۔ موجودہ عمارت آندھرا پردیش کے محکمہ تعمیرات کی زیر نگرانی ۳۴ لاکھ روپے کے صرفہ سے تعمیر کی گئی ہے لیکن عمارت کی مزید توسیع کے بعد جملہ لاگت اندازاً ایک کروڑ روپے تک ہوگی۔ اس عمارت کا وسطی حصہ تعمیر ہوچکا ہے لیکن کتب خانہ شعبۂ اطفال آڈیٹوریم اور ورکشاپس کے حصے تعمیر ہورہے ہیں جس کی تکمیل پروگرام کے مطابق ہوگی موجودہ عمارت ۳ منزلہ ہے جس میں میوزیم کے جملہ شعبوں کو جگہ دی گئی ہے نچلی یا پہلی منزل میں یوروپی نوادرات اور شعبۂ اطفال کو سجایا گیا ہے اس کے علاوہ اسی منزل میں میوزیم کا اسٹور بھی ہے اس منزل میں داخل ہوتے ہی سالار جنگ روم ملتا ہے جہاں سالار جنگ اور ان کے آباؤ اجداد کی اشیاء کی نمائش کی گئی ہے۔ یہ کمرہ دکنی ثقافت کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ پہلی منزل پر ہی فرانسیسی کمرہ، یوروپی گلاس روم یوروپی مجسموں کا کمرہ یوروپی تصویر خانہ اور شعبۂ اطفال ہے جب کہ دوسری منزل پر ایشیائی نوادرات مختلف کمروں میں سجائے گئے ہیں جن میں ہندوستانی تصویر خانہ ہاتھی دانت کا کمرہ، ایرانی قالین کا کمرہ خطاطی کا کمرہ اسلحہ خانہ بیدری اور چاندی کی اشیاء کا کمرہ، کشمیری کمرہ برمی، نیپالی چینی جاپانی اور دیگر نوادرات کے کمرے شامل ہیں جنوبی ہند کا کمرہ، مصری اشیاء کا کمرہ اور ہندوستانی پارچہ جات کا کمرہ بھی دوسری منزل پر ہے۔ تیسری منزل پر سالار جنگ مرحوم کا کتب خانہ اور دارالمطالعہ ہے جس کا راستہ علحدہ رکھا گیا ہے چوتھی منزل پر کنزرویشن لیباریٹری، فوٹوگرافی سیکشن، بورڈ روم اور میوزیم کا دفتر ہے دوسری منزل پر عارضی نمائش کے لئے ایک گیلری بھی چھوڑی گئی ہے اس اعتبار سے میوزیم کے نوادرات جملہ (۳۲) کمروں میں خوبصورتی اور سلیقہ کے ساتھ سجائے گئے ہیں جس کے منجملہ ۱۷ کمرے پہلی منزل (۱۵) کمرے دوسری منزل پر وسیع ترین ہال کی لمبائی و چوڑائی $\frac{۱۸۳}{۱۴}$ ہے جسے ہندوستانی تصویر خانہ سے موسوم کیا گیا ہے جہاں ہندوستانی آرٹ کی نمائش کی گئی ہے بجا طور پر کمرہ ہندوستانی آرٹ و ثقافت کی ترجمانی کرتا ہے ایک اور ہال $\frac{۸۴}{۴۴}$ کا ہے جسے کارپیٹ روم کا نام دیا گیا ہے سب سے چھوٹا ہال $\frac{۳۵}{۲۳}$ کا ہے جہاں کشمیری نوادرات سجائے گئے ہیں میوزیم میں تقریباً ۴۳ ہزار نوادرات ہیں۔

(بشکریہ قومی آواز)

اترپردیش غالب صدسالہ کمیٹی مرکز کی تسلیم شدہ کمیٹی ہوگی

لکھنؤ غالب صدسالہ مرکزی کمیٹی کے نائب صدر اردو کے ممتاز شاعر پنڈت آنند نرائن ملا (ایم۔پی) نے یہاں اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ریاستی غالب صدسالہ کمیٹی کی تشکیل اس اختیار کے تحت کرنے والے ہیں جو مرکزی کمیٹی نے انھیں دیا ہے۔ ملا صاحب نے جو آج شام مقامی ادیبوں شاعروں اور سربرآوردہ شہریوں کے ایک نمائندہ اجتماع کو یوپی پریس کلب میں خطاب کر رہے تھے بتایا کہ مرکزی کمیٹی کے دیئے ہوئے اختیار کے تحت جو ریاستی کمیٹی بنائی جا رہی ہے نمائندہ اور سرکاری (آفشل) کمیٹی ہوگی۔ انھوں نے کہا "سرکاری کمیٹی نہ صرف یہ کہ غالب کے شایان شان یادگار منانے کا انتظام کرے گی بلکہ دوسری غیر سرکاری کمیٹیوں سے جو غالب کے سلسلے میں قائم ہیں یا قائم ہوں گی پورا پورا تعاون بھی کرے گی۔

ملا صاحب نے حاضرین کو توجہ دلائی کہ غالب کے نام پر بڑے چھوٹے مشاعرے کرنا یا کچھ ادبی جلسے منعقد کرنا محض وقتی اور ہنگامی کام ہیں سرکاری کمیٹی کے تحت ایسے امور انجام پائیں گے جن کی حیثیت وقتی نہ ہو اور ہمیشہ غالب کے نام کو یاد دلاتے رہیں انھوں نے کہا غالب محض اردو کے ایک بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ اس درجہ کے ایک ادیب اور فن کار تھے جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا اور عالمی ادبیات میں غالب کے کارناموں کے ذریعہ ہندوستان کو ممتاز مقام حاصل رہے گا۔ ملا صاحب نے امید ظاہر کی کہ ایک ـ وطنی اور قومی ہیرو کی حیثیت سے غالب کی یاد ان کی ص ـ رسی کے موقع پر منائی جائے گی۔ اخباری نمائندوں کے سوا ... جواب میں ملا صاحب نے بتایا کہ ریاستی کمیٹی قائم ہوجا ـ کے بعد ... سرکاری وسائل اس کے ذریعہ اس سلسلے میں بروئے کار لائے جائیں گے۔ اترپردیش میں غالب صدسالہ ... کمیٹی کے سلسلے میں جو ایک سال قبل نجی کوششوں سے بنی ہے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ملا صاحب نے کہا اس کی حیثیت غیر سرکاری کمیٹی کی ہے اگرچہ گورنر صاحب نے اس کی ... قبول کرلی ہو مرکزی کمیٹی کی ہدایت پر جو سرکاری ... کمیٹی بنائی جا رہی ہے وہی دراصل مجاز ہوگی کہ غالب صدسالہ یادگار کے سلسلہ میں ریاستی سرکار کے عطیات لے اور ان کا مناسب استعمال کرے۔ ملا صاحب نے جلسے کے سامنے ... خط کو بھی پڑھا جو مرکزی کمیٹی کی طرف سے ان کو ریاستی کمیٹی بنانے کے اختیار دینے کے سلسلے میں موصول ہوا ہے۔

یادگار غالب کمیٹی، الہ آباد کا جلسہ

الہ آباد مرزا غالب کی صدسالہ برسی کی تقریبات کا مکمل پروگرام منظور کرنے کے لئے کمیٹی کا ایک جلسہ زیر صدارت ذوالفقار اللہ صاحب ہوا۔ پروفیسر سید احتشام حسین کنوینر کمیٹی نے گذشتہ جلسوں اور کمیٹیوں کے کاموں کا مختصر خاکہ پیش کیا، پہلی تجویز میں طے ہوا کہ ذوالفقار اللہ صاحب اس کمیٹی کے مستقل صدر ہوں جسے موصوف نے منظور کرلیا۔ مختلف تجاویز کے ذریعہ طے پایا کہ چندے کی فراہمی کی مہم تیز کی جائے، ایک آل انڈیا مشاعرہ غالب کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما، ایک کلچرل پروگرام، ایک سمپوزیم جس میں اردو، ہندی انگریزی کے ادیب حصہ لیں منعقد کئے جائیں اور الہ آباد میں یہ ساری تقریبات فروری ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتہ میں منائی جائیں یہ بھی طے پایا کہ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کے تحریری اور تقریری مقابلے ہوں اور اگر ممکن ہو تو غالب کے نام سے وظائف جاری کئے جائیں۔ سی۔ پی۔ راؤ صاحب صدر ہندوستانی اکیڈمی یو۔پی کی یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہندی کے ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے مضامین پر مشتمل ہندی میں ایک کتاب مرزا غالب پر شائع کی جائے جس کی طباعت اور اشاعت اکیڈمی کی طرف سے ہو۔ یہ بھی طے پایا کہ ... کمیٹی کے پروگراموں کی اطلاع ریاستی اور مرکزی صدسالہ ... غالب کمیٹی کو دی جائے (کنوینر)

خواتین کی غالب کمیٹی

لکھنؤ۔ مال ایونیو میں ایک جلسہ پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا جس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ لکھنؤ میں غالب کی صدسالہ یادگار منانے کے لئے خواتین کی ایک کمیٹی بنائی جائے اس کے لئے بیگم سیدہ نسیم چشتی کو کنوینر مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ میں خواتین کا ایک جلسہ طلب کرکے مزید کارروائی کریں اور اس کمیٹی کا الحاق آل انڈیا غالب صدسالہ کمیٹی دہلی سے کرالیں اور لکھنؤ کی اس کمیٹی کو پورے صوبے کی خواتین کمیٹی بنائیں۔

شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی ریسرچ ایسوسی ایشن کا جلسہ

علی گڑھ۔ اس سال شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی ریسرچ ایسوسی ایشن کا پہلا جلسہ ۳۱ر جولائی کو زیر صدارت جناب پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں شعبۂ اردو کے استاد جناب اطہر پرویز نے اپنا مقالہ "فسانۂ عجائب۔ ایک مطالعہ" پڑھا۔ یہ مقالہ اطہر پرویز کے اس طویل مقدمہ کا ایک حصہ تھا جو انھوں نے فسانۂ عجائب پر اس کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ فسانۂ عجائب اور اس کے مصنف کے بارے میں مختلف نقادوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے پرویز صاحب نے اس کا جائزہ لیا اور بتایا کہ سرور کے ساتھ ابھی تک انصاف نہیں ہوسکا کیونکہ زیادہ تر رائیں یک رخی ہیں اس کے علاوہ یہ کہ یہ غلطی ابھی تک چلی آرہی ہے کہ فسانۂ عجائب کو باغ و بہار کا مقابل قرار دے کر ان دونوں

کتابوں کا موازنہ کیا جاتا ہے حالانکہ ان دونوں میں کوئی بات تقابلی مطالعہ کا موضوع نہیں بن سکتی۔ فسانۂ عجائب ایک ایسا قصہ ہے جس کے اجزا اور عناصر پر ہندوستانیت کے گہرے نقوش ہیں فسانۂ عجائب میں ہمیں انشاپردازی کے مختلف مزے نظر آتے ہیں چنانچہ بیانیہ موقعوں پر مقفیٰ و مسجع عبارت نظر آتی ہے تو واقعہ نگاری کے موقع پر سادگی و پرکاری کا انداز ہے۔ فسانۂ عجائب کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے پرویز صاحب نے بتایا کہ جان عالم کو ہم ایک کامل عاشق مزاج اور دل پھینک شہزادہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے عشق میں ایک دنیا رو تمکنت کا انداز موجود ہے۔ البتہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ طوطے کے ساتھ مصنف نے انصاف نہیں کیا۔

مقالہ کے اختتام پر بحث کا آغاز ہوا جس میں خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب ڈاکٹر وحید اختر صاحب، شہریار صاحب نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ اچھے مقالہ کے لئے تین باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے اول تو یہ کہ موضوع کے ہر پہلو سے بحث کرکے اس کے ساتھ انصاف کیا گیا ہو دوسرے یہ کہ صرف تصویر کے دونوں رخ دکھانے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے بلکہ مقالہ نگار کا نقطۂ نظر بھی واضح ہونا چاہئے تیسرے یہ کہ موجودہ تنقیدی شعور کی روشنی میں موضوع کی معنویت نئے سرے سے دریافت کی جائے ادبیات میں ذوق بدلتا رہتا ہے ایک دور کی پسندیدہ چیز دوسرے دور میں ناپسندیدہ قرار دی جا سکتی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فسانۂ عجائب کا اسلوب بہت عمدہ ہے لیکن یہ ایک اسلوب ہے جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی اس کی قدر و قیمت کا تعین ہونا چاہئے۔ سرور صاحب نے کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فسانۂ عجائب کو داستان کہنا درست نہیں۔ داستان کے لئے طوالت ضروری ہے اس قصہ میں، واقعہ نگاری سے زیادہ انشاپردازی پر زور دیا گیا ہے اس دور میں اس کی اہمیت تھی اور اسے مقبولیت حاصل تھی لیکن اب ہمیں دلی اور لکھنؤ کے بت نہ بنانے چاہئیں بلکہ پورے ادبی سرمایہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے سرور صاحب نے پرویز صاحب کی اس کوشش کو ایک کامیاب کوشش کہا اور کہا کہ وہ ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ (نامہ نگار)

سیفیہ کالج میں انجمن اردوئے معلیٰ کا قیام

بھوپال۔ سیفیہ کالج بھوپال کے ایم۔اے اردو کے طلبہ نے حال ہی میں اپنی ایک نشست میں طے کیا ہے کالج میں اردو کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لئے ایک مجلس "اردوئے معلیٰ" قائم کی جائے جس کا مقصد طلبہ میں تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اردوئے معلیٰ کی نشست کا وقفہ ہفتہ وار ہوگا جس کے تحت کسی عالم، ادیب یا شاعر کو تقریر کے لئے مدعو کیا جائے۔ پہلے سے طے شدہ موضوع پر مباحثہ کیا جائے۔ طلبہ میں مقالہ اور مضمون نویسی کی بہتر صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ان سے مقالات اور مضامین لکھوائے جائیں اور ان کو اردوئے معلیٰ کی نشست میں پڑھ کر سنایا جا سکے۔ (نامہ نگار)

ٹونک میں یوم صولت

ٹونک۔ راجستھان کے مشہور شاعر سید محمود الحسن صولت مرحوم کی یاد میں ۶ر جولائی کو اردو سمپوزیم اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ سمپوزیم کا افتتاح جناب محمد علی خاں نے کیا اس سمپوزیم میں نشاط، سالک عزیزی، حکیم فضل الرحمٰن اور عبد البصر نے صولت مرحوم کی ادبی خدمات اور شخصیت پر مقالے پڑھے۔ یوم صولت کے مشاعرہ کی صدارت ہزہائنس نواب محمد اسماعیل خاں صاحب بہادر تاج نے فرمائی مشاعرہ کا افتتاح جنت آشیاں محمد ابراہیم علی خاں کی غزل سے ہوا۔ مشاعرہ کئی نشستوں میں ہوتا رہا آخری نشست کا افتتاح ہزہائنس نواب محمد اسماعیل علی خاں تاج کی غزل سے ہوا۔ مشاعرہ میں مندرجہ ذیل شعرائے کرام نے حصہ لیا کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بملا رانی ناز، صبا افغانی، عالم فتحپوری، بسمل سعیدی، بملا کماری ناز، راہی بلند شہری، اسلم اکبرآبادی، پیکر ہاپوڑی، محمود سعیدی، جمیل افغانی، عزیز وارثی، عرشی اجمیری، ساغر اجمیری۔ (محمد عبد الحی فائز)

گونڈہ میں جگر میموریل اسکول کی رسم افتتاح

گونڈہ "اس ملک اور ریاست اتر پردیش میں اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اس سے لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ خود میں بھی مطمئن نہیں ہوں اور اسے نیک فال نہیں سمجھ رہا ہوں" یہ الفاظ یہاں ایک بڑے اجتماع میں جگر میموریل اسکول کی افتتاحی رسم انجام دیتے ہوئے یونس سلیم مرکزی نائب وزیر قانون نے کہے۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو ایسی زبان نہیں ہے کہ اس کو مٹایا جا سکے۔ بشرطیکہ اردو کے شیدائی جذبات سے ہٹ کر صحیح معنوں میں اردو کے فروغ کا تہیہ کرلیں۔ رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مرکزی وزیر نے کہا کہ جگر مرادآبادی کی عظمت اردو کے بغیر بے معنی ہے اس لئے ضروری ہے کہ جگر مرحوم کی یاد کو ایک مستقل یادگار کی صورت دی جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ گونڈہ میں یہ کام پر ہو رہا ہے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ جگر مرادآبادی بہت بڑے شاعر تھے اور شاعر سے زیادہ بہت بڑے انسان تھے جن لوگوں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کی صفات حمیدہ سے ضرور متاثر ہوئے ہیں تقریر ختم کرتے ہوئے جناب یونس سلیم نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ اسکول نہ صرف انٹر کالج بلکہ ڈگری کالج کی شکل اختیار کرے گا انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

چودہ زبانوں کو پارلیمنٹ کی سرکاری زبانیں نہیں بنایا جائے گا

نئی دلی۔ نائب وزیر اعظم جناب مرار جی ڈیسائی نے ڈی ایم کے کے اس مطالبہ کو اصولی طور سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ پارلیمنٹ کی کارروائی دستور میں درج چودہ زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں ہو سکتی ہے اس میں دستور کی دفعہ ۱۲۰ میں ترمیم سے اسی کے مفہوم کی ایک قرارداد جناب تیزیاں (ڈی ایم کے) نے پیش کی تھی لیکن اسے پڑی کی اکثریت حاصل نہ ہو سکی اس لئے وہ ایوان میں زیر بحث نہ آسکی جناب شکلا وزیر مملکت برائے وزارت داخلہ نے کہا کہ دستور میں صراحت کی گئی ہے اگر پارلیمنٹ کا کوئی ممبر ہندی یا انگریزی میں اظہار خیال پر قادر نہ ہو تو وہ ایوان سے اپنی مادری زبان میں خطاب کر سکتا ہے انھوں نے کہا آج بھی یہی ہو سکتا ہے انھوں نے کہا کہ اگر پارلیمنٹ میں چودہ زبانیں بولنے کی اجازت دی گئی تو انگریزی سمیت سرکاری زبان کی تعداد ۱۵ ہو جائے گی۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو قطعاً ناقابل برداشت ہے۔ اس کے بعد بل کو زیر بحث لانے کی تجویز پر ووٹ ڈالے گئے جو ناکام ہو گئی۔ (الجمعیۃ)

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سوا ہر قسم کی سہولتیں دینے کا وعدہ

لکھنؤ۔ بھارتیہ کرانتی دل کی یوپی شاخ کا دو روزہ اجلاس ختم ہو گیا کانفرنس کے اختتام کے بعد اخبار نویسوں کو ایک ۱۸ نکاتی الکشن مینی فسٹو دیا گیا جس میں بھارتیہ کرانتی دل نے ایک صاف ستھرا نظم ونسق دینے کا وعدہ کیا ہے۔ منشور کے مطابق بھارتیہ کرانتی دل اردو کو ہر طرح سے فروغ دینے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار نہیں دے گا۔ اس کے علاوہ پی۔ کے رڈی یونی ورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں سیاست کے دخل کے خلاف ہے۔ (قومی آواز)

اردو کی مقبولیت کا اعتراف

نئی دہلی۔ مرکزی وزیر اطلاعات جناب کے۔ کے شاہ نے دلی کے ماہنامہ "ہما ڈائجسٹ" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر لوگ اسی زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ ہندوستان کی زبان ہے۔ شمالی ہندوستان میں بھی خاص طور پر یو۔ پی کی زبان ہے۔ یو۔ پی میں بلاشبہ اس کو سرکاری درجہ دیا جانا چاہئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہاں کے لوگ اسے کیوں نہیں مان لیتے۔

انھوں نے اپنے تعلق سے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے ذمے نشریات و اطلاعات کا محکمہ ہے، اس محکمہ میں

اردو خوب چلتی ہے، یہ پیاری زبان سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گئی ہم سب ہی اردو کے حق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس سے کسی کو بھی دشمنی نہیں ہے۔ (شاہی)

بھاگلپور میں اردو گرلز ہائی اسکول اور اردو کنڈر گارٹن اسکول کے قیام کا فیصلہ

بھاگلپور: انجمن ترقی اردو بھاگلپور و محبان اردو کی ایک میٹنگ زیر صدارت ڈاکٹر محمد یونس صاحب صدر انجمن منعقد ہوئی، جس میں پروفیسر مظفر اقبال کنوینر سروے بہار کمیٹی محمد نعیم الدین جنرل سکریٹری تاتار پور مارکیٹ مولانا محمد شرف عالم ندوی جنرل سکریٹری، مولانا غلام حسین صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء بھاگلپور اور نسیم صابری نمائندہ صدائے عام و سکریٹری جمعیۃ علماء بھاگلپور اور سکریٹری انجمن کے علاوہ کثیر تعداد میں محبان اردو نے شرکت فرمائی میٹنگ میں بڑے پیمانے پر ۱۸ر اگست کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک جلسۂ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس میں خاص طور پر غلام سرور صاحب صدر انجمن ترقی اردو (بہار)، جناب مولانا میاں صدیقی صاحب جنرل سکریٹری، جناب زین الحق صاحب جوائنٹ کنوینر اردو سروے کمیٹی (پورنیہ) کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ بھاگلپور میں عنقریب مسلم گرلس ہائی اسکول اور اردو کنڈر گارٹن قائم کرنے کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا گیا۔ (نظم)

اقوام متحدہ کی رپورٹ میں اردو کا دنیا میں پانچواں مقام

کلکتہ یہاں گذشتہ دنوں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی طرف سے پنڈت آنند نرائن ملا ممبر پارلیمنٹ کے اعزاز میں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے کی اس موقع پر ملا صاحب نے ایک مختصر تقریر کی جس میں پوری صفائی اور بے باکی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے صاف کہا کہ اردو کا مسئلہ سیاسی ہے اور اسے سیاسی سطح پر حل کیا جا سکتا ہے اس کے ساتھ اردو کو ایڈمنسٹریٹو مسئلہ بنا دیا گیا ہے جب بھی ہم کسی صوبے میں اردو کو ثانوی حیثیت سے تسلیم کرنے کی بات اٹھاتے ہیں تو حکام کی طرف سے اختلافی اور اقتصادی حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ دو زبانوں میں کام کرنے کا اسٹاف بڑا ہونا چاہئے جس کے لئے پیسہ نہیں ہے دوسری طرف انتظامی مشکلات بھی پیدا ہوں گی، لیکن درحقیقت یہ سب حیلہ بازی ہے اور جب تک سیاسی سطح پر اسے حل نہیں کیا جائے گا یہ بہانہ سازی جاری رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ بحیثیت سیاسی جماعتوں کے جن سنگھ کے علاوہ اور کوئی جماعت سیاسی سطح پر اردو کی مخالفت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے کہ اگر اردو والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ملا صاحب نے اردو کا رسم الخط تبدیل کرنے کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ابھی

حال ہی میں سندھی زبان کو دستور کے شیڈول میں اسی رسم الخط کے ساتھ جو کہ اردو جیسا ہے، شامل کیا گیا ہے اور اسے کوئی نہیں کہتا کہ سندھی کا رسم الخط تبدیل کر دو لیکن اردو کے لئے کہا جاتا ہے آپ نے بتایا کہ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی زبانوں میں اردو کا پانچواں نمبر ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستان میں اردو کا رسم الخط برقرار رہے اور ہندوستان میں اسے دیوناگری کر دیا جائے۔ (سنگم)

آگرہ میں اردو کالج کا قیام

آگرہ میں ایک مقامی تعلیمی و ثقافتی انجمن بزم اقبال نے ایک اردو کالج قائم کیا ہے یاد ہوگا کہ آگرہ کالج اور سینٹ جونس کالج میں اردو کی تعلیم بند ہو چکی ہے یہ کالج اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ (نامہ نگار)

صفحہ سے آگے

متوسطین اور معاصرین کے قصائد سے قطع نظر تمام اردو لٹریچر میں ۱۸۵۷ء سے قبل (جب نئی یعنی نیچرل شاعری کا آغاز ہوا) ہم کو صرف ایک مسلسل غزل ملتی ہے جس کا آخری مصرع ہے ؎

"یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا"۔ حتیٰ کہ غالب نے اپنی معشوقہ کا مرثیہ بھی غزل میں کہا (اصغر تمہاری ہائے ہائے) ممکن ہے ایسی کوئی غزل اور مسلسل نکل آئے، لیکن وہ نوحہ وغیرہ ہوگا نہ کہ غزل۔

غزل کی تعریف آپ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ غزل کہنے کے متعلق کیا کیا ہدایتیں عروض کی کتابوں میں درج ہیں صاف لکھا ہے کہ پہلے قافیے چھانٹ کر لکھ لو اور پھر اس فہرست کو سامنے رکھ کر انھیں اشعار میں باندھو تاکہ اس طرح کلام موزوں کہنے کی مہارت ہو جائے اب امید ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ غزل محض ابتدائی مشق کی خاطر وضع کی گئی تھی۔ پختہ مشق اور منتہی شخص کے نزدیک غزل کی حیثیت ظاہر ہے بہ میری رائے غزل کی نسبت ہے

رہے خارجی مضامین اور غزل پر ان کا حاوی اور مسلط ہونا یعنی گل و بلبل، کنگھی چوٹی وغیرہ یہ اپنی اپنی طبیعت کا میلان اور عوارض و معاشرتی اور اخلاقی ماحول کا تاثر ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ غزل میں ان بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کے اٹھانے کی اور اصناف شعری سے زیادہ قابلیت اور استعداد ہے۔ غزلیں اچھی بھی ہیں اور بری بھی۔ پتھر کے ایک ٹکڑے سے اکبر اور عالمگیر کے بت بھی گھڑے جا سکتے ہیں اور ہلاکو اور چنگیز خاں کے بھی۔

اس مختصر نویسی یا طول کلامی کو معاف فرمائیے گا۔ (کیفی)

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

اردو گھر فنڈ

۱۰ اگست ۶۸ء تک جو رقمیں صدر دفتر انجمن میں پہنچی ہیں وہ سب اس فہرست میں درج ہیں۔

نمبر شمار	نام مع مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ وصول کیفیت
۱	ظفر علی بیگ صاحب نئی دہلی	۱— ۰	منی آرڈر جور
۲	ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ نئی دہلی	۱ —	منی آرڈر
۳	پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن علی گڑھ	۱ —	چیک جور
۴	اقبال رودلوی صاحب بارہ بنکی	۵ —۰	منی آرڈر جور
۵	محمد حفیظ الدین صاحب اسسٹنٹ انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۰۱ —	نقد جور
۶	ام حبیب خاں صاحب لائبریرین کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵۱ — ۰	نقد جور
۷	ٹی ڈی بیڈیا صاحب محاسب انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵۱ — ۰ ۰	نقد جور
۸	سید تفضل حسین صاحب مہتمم امور تعلیمی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵۱ —	نقد جور
۹	سید ضیا علی صاحب کارکن انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵۱ — ۰	نقد جور
۱۰	اصغر عباس صاحب لٹریری اسسٹنٹ انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵۱ — ۰	نقد جور
۱۱	معظم علی صاحب کارکن انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۲۱ — ۰ ۰	نقد جور
۱۲	استیاق حسین صاحب جوش ویس انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۲۱ —	نقد جور
۱۳	عبد الحق صاحب چپراسی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰	نقد جور
۱۴	عبد الرحیم خاں صاحب دفتری انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰ ۰	نقد جور
۱۵	منشی خاں صاحب چپراسی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰ ۰	نقد جور
۱۶	جمعراتی صاحب چپراسی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰	نقد جور
۱۷	رام اوتار صاحب چپراسی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ —	نقد جور
۱۸	عظیم الدین صاحب چپراسی انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰ ۰	نقد جور
۱۹	شفیق احمد صاحب چوکیدار انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰ ۰	
۲۰	سوہن لال صاحب جاروب کش انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۵ — ۰ ۰	نقد جور
۲۱	روحی علی اصغر صاحب حیدر آباد	۱ — ۰ ۰	منی آرڈر جور
	میزان	۴۴۴ ۵ — ۰ ۰	

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ چیف ایڈیٹر و پبلشر سید ضیا علی نے میتھو کلر پرنٹرس میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD NO - L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۳۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر کے لئے چندہ

۱۵ اگست کے ہماری زبان میں ہم نے ان حضرات کے ناموں کی فہرست شائع کی تھی جنھوں نے "اردو گھر" کی تعمیر کے لئے چندہ بھیج دیا ہے۔ اس فہرست سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ "اردو گھر" کی تعمیر میں صدر جمہوریہ سے لیکر انجمن کے دفتر کے چپراسیوں تک کا چندہ شامل ہے۔ یعنی اردو گھر سے خواص و عوام سبھی کو ہمدردی ہے۔ مجلس عام کے ممبروں سے توقع ہے کہ وہ خود یا اپنے حلقۂ اثر سے ایک ایک ہزار ضرور چندہ کرادیں گے۔ انجمن کی شاخوں سے علحدہ درخواست کی گئی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں اس مقصد کے لئے کمیٹیاں بنائی جارہی ہیں۔ دہلی کی کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کمیٹی کے کنوینر جناب مالک رام ہیں۔ کمیٹی کا ایک جلسہ ۱۰ اگست کو ہمدرد ہاؤس میں ہوا تھا جس میں دہلی کے بیشمار شہریوں نے شرکت کی تھی۔ یہ کمیٹی ان تمام حضرات کی فہرست تیار کرا رہی ہے جن کے پاس کمیٹی کے ممبر چندہ لینے کے لئے جائیں گے۔ کمیٹی اکتوبر نومبر میں کچھ تہذیبی پروگرام بھی منعقد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے بمبئی، حیدرآباد، سری نگر، لکھنؤ، کانپور، پٹنہ، کلکتہ اور دوسرے مقامات پر بھی جلد اس قسم کی کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ مگر اس وقت ہم خاص طور پر ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ براہ راست جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند سلطان جہاں منزل کے نام اپنا عطیہ روانہ کریں۔

ہماری زبان کے پڑھنے والوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ وہ صرف ہمارے اخبار کے خریدار نہیں ہیں، وہ ہماری زبان کے دوست اور ساتھی ہیں۔ وہ اردو زبان و ادب کے ایک ترجمان کی ہی ہمت افزائی نہیں کرتے وہ انجمن کے دکھ درد کے شریک، اس کے سوز و ساز سے آشنا، اس کے خوابوں اور تمناؤں کے محرم ہیں۔ آج کی دنیا میں اخبار کا ایک خاص رول ہوتا ہے کئی مواقع پر اخباروں نے قومی مقاصد کے لئے چندے کی مہم چلائی ہے اور اس طرح صرف قومی ضرورتوں کے لئے سرمایہ ہی فراہم نہیں کیا بلکہ قومی مقاصد کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو گھر کی تعمیر میں ہماری زبان کے پڑھنے والوں کا بھی نمایاں حصہ ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ اردو گھر کی ایک ایک اینٹ کی تعمیر میں ہندوستانی عوام کی شرکت ہو تاکہ وہ اسے اپنی چیز سمجھیں، اس پر ان کا حق ہو اور اس حق کے لئے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہیں۔ یہاں چندے کی رقم کا سوال نہیں ہے خلوص سے اپنی بساط کے مطابق ایک قومی کام میں شرکت کا سوال ہے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد ڈھائی کروڑ اور تین کروڑ کے درمیان ہے اور اردو کی قدر کرنے والوں کی تعداد اور اس سے دلچسپی یا ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے جو کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ ہمیں موجودہ دور کی ہوش ربا گرانی کا احساس ہے مگر ہم کیا کریں کہ ہمیں اردو زبان کے شاندار سرمائے، اس کے ادب کی عظمت اس کے بولنے والوں کی ملک گیر تعداد اس میں ہر مذہب ہر مسلک، ہر ریاست کے افراد کی نمائندگی کا بھی احساس ہے۔ ہم اردو گھر صرف حکومت یا مالدار طبقے کی پشت پناہی پر نہیں بنانا چاہتے۔ حکومت سے ہم اس لئے امداد مانگتے ہیں کہ اس پر ہمارا حق ہے۔ مالدار طبقے سے بھی ہم گرانقدر عطیوں کی اس لئے توقع کرتے ہیں کہ ہر مہذب سماج میں مالدار طبقہ قومی، تعلیمی اور ادبی کاموں میں فراخدلی سے حصہ لے کر اپنی سماجی ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ مگر ہم حکومت یا مالدار طبقے کے سہارے جینا نہیں چاہتے اس میں بڑی پابندیاں ہوتی ہیں۔ اس میں ہمارے عمل کی راہیں محدود ہوتی ہیں۔ ہم ایک آزاد ملک میں جو جمہوریت پر ایمان رکھتا ہے ایک ایسا آزاد ادارہ بنانا چاہتے ہیں جو خود کفیل ہو، جو سوائے عوام کے کسی کا محتاج نہ ہو لیکن جو حکومت اور خواص و عوام سب کی توجہ کا مستحق ہو۔ ہم روز بروز اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ زبان کے حقوق کا مطالبہ ضروری ہے مگر [illegible] نہیں اور ہمیں سامنے ملک بھی

محمد شیث شیام پوری۔ ایم۔ ایس۔ سی

اردو کی ترویج و ترقی

کچھ دن ہوئے ٹریننگ کالج میں جناب ایم۔ اے حسن بھنہروی کا ایک پرچہ "اردو دوستوں سے خطاب" نظر سے گزرا میں نے پرچہ ہذا کو بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ چند صفحات کے پرچہ میں نہایت پیچیدہ باتوں سے بحث کی گئی ہے اس پرچہ میں موصوف نے چار عظیم مقاصد کے پیش نظر اپنی تجاویز اردو دوستوں کے سامنے رکھی ہیں اوّل یہ کہ اردو رسم خط کو صوتی اعتبار سے اس لائق بنایا جائے کہ ہماری تحریر تلفظ کی صحیح ترجمانی کر سکے اور پڑھنے والا عبارتوں کو وہی پڑھ لے جو لکھا ہو دوم یہ کہ حروف کی کرسیاں درست کی جائیں تاکہ تحریر کی معیار بندی ہو سکے اور کسی ڈوری پر کھینچے گئے دو متوازی خطوط کے درمیان ہر شخص سانچا جو خط لکھ سکے اور اردو طباعت کو بھی مشینی بنایا جا سکے۔ سوم یہ کہ درسی طور پر اردو کو زیادہ سے زیادہ سہل الحصول بنانے کے لئے ایک قابل فہم پرائمر تیار کیا جائے۔ اور چہارم یہ کہ مروجہ اردو قواعد کی ترتیب نو کی جائے تاکہ کم پڑھے لکھے لوگوں کو اس سے صحیح لکھنے پڑھنے میں مدد مل سکے۔ میں حسن بھنہروی کی اس تعمیری تحریک کی سو فیصدی تائید کرتا ہوں۔ اس تحریک کا تذکرہ کالج کے پروفیسروں اور دوسرے علمی حلقوں میں بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہر شخص اس تحریک کی کامیابی کا خواہش مند ہے ہمارے اکثر احباب حسن صاحب کی کوششوں کی داد بھی دیتے ہیں بلکہ آپ کی تجاویز کی تردید یا تائید میں قلم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ واقعی حسن صاحب نے جن پیچیدہ اور اہم مسائل کو بحث کا موضوع قرار دیا ہے ان پر ایک مقدس رائے قائم کرنے کے لئے کافی سر کھپانے کی ضرورت ہے اردو دوستوں کو اس مسئلہ پر جم کر سوچنا چاہئے اگر یہ تجاویز معقول ہیں تو ان کی تائید ہونی چاہئے اور اگر نہیں تو پھر زوردار تردید ہونی چاہئے

ہمارے ایک دوست نے ۲۲ر مئی ۱۹۶۸ء کے ہماری زبان کے اداریہ کی کٹنگ راقم الحروف کے یہاں بھیجی ہے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ادارہ نے بجا طور پر اس تحریک کی اہمیت کے پیش نظر اردو دوستوں کو اس پر تبصرہ کرنے کی دعوت عام دی ہے۔ دیکھنا ہے کتنے حضرات اردو کے اس اہم مسئلہ سے دلچسپی لیتے ہیں بحث میں حصہ لینے کے لئے ملک کے تعلیمی اداروں، با اثر رہنماؤں، کثیر الاشاعت اخبار کے سرپرستوں اور متعلقہ واقف کاروں کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دینی چاہئے۔ ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہم کسی ٹھوس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گے میری تجویز ہے کہ موصوف کی تجاویز کو چار مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہماری زبان کے صفحات پر باری باری سے انھیں زیر بحث لایا جائے۔ بہ یک وقت موصوف کی ساری باتوں پر تبصرہ کرنا خاصہ مشکل کام ہے اور ہماری زبان کے صفحات اس کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔

سردست میں موصوف کی تجاویز پر حسب ذیل مختصر تبصرہ پیش کر رہا ہوں

(۱) تلفظ میں قطعیت

واقعی اردو کے مروجہ اعرابوں کی آوازیں متعین نہیں ہیں۔ ایک ہی اعراب اردو میں دو دو آوازوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کیاب میں ک کی آواز (कि) لیکن کیس میں ک کی آواز (कै) ہے اسی طرح پوری صحت کے ساتھ لکھنے پر بھی ہم کوٹ کو कोट یا कूट اور میل کو मील یا मेल بھی پڑھ سکتے ہیں موصوف نے کیاب کو کِیاب، کیس کو کَیس، कोट کو کوٹ، कूट کو کُوٹ، मेल کو میل اور मील کو مِیل لکھنے کی تجویز پیش کی ہے میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ ابھی تک ہم صرف ا، و، ی کو ہی حرف علت کہتے تھے لیکن آپ نے آ (आ) اَ (अ) [illegible]، اِ (इ) [illegible] (आ) اور اُ (उ) چھ خفیف اور ان میں ہی "ی" یا "و" جوڑ کر اَی (ऐ) اِی (ई) اَی (ए) اَو (औ) اُو (ऊ) اور اُو (ओ) چھ کثیف اعرابوں کی تجویز پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ ہندی کے تین متفرق اعرابوں (ऋ، अं، अः) کا بھی اردو بدل مقرر کیا ہے۔ چھ کثیف اعرابوں کے متعلق موصوف نے ایک انقلابی تجویز بھی پیش کی ہے آپ چاہتے ہیں کہ اردو کے داخلی (کثیف) اعرابوں کو کسی خارجی اعراب کا محتاج نہ رکھا جائے۔ آپ 'ی'، کے دو لفظوں کو ہی بنیاد مان کر 'ی' کی مختلف چار آوازوں (ये، ई، ए، ऐ) کے لئے مختلف صورتیں مقرر کر دینا چاہتے ہیں۔ جیسے 'ی' کی آواز جہاں 'ये'

دہلی یونیورسٹی کی مراسلاتی اسکیم (کرسپانڈنس کورس) میں اردو

دہلی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اور توسیعی تعلیم میں اردو بھی شامل کر لی گئی ہے۔ جو طالب علم بی۔ اے میں اردو کے ساتھ داخلہ لینا چاہتے ہیں وہ داخلہ کی درخواست ۳۱ر اگست سنہ ۱۹۶۸ء تک پرنسپل کرسپانڈنس کورس ۵۔ کے ڈیلری لائنس دہلی یونیورسٹی دہلی۔ ۷ کے نام بھیج دیں۔

ہندوستان کے ہر صوبہ کے طالب علم بغیر عمر کی قید کے جو ہائر سکنڈری یا انٹرمیڈیٹ یا اس کے برابر کا کوئی امتحان پاس کر چکے ہوں۔ اپنی ملازمت کے دوران میں دہلی یونیورسٹی کی مراسلاتی اسکیم کے ذریعہ بی اے کر سکتے ہیں۔ ان کو دہلی آنے کی ضرورت نہیں۔ روز کا سبق استاد کی ہدایتیں دروس کے حل شدہ اوراق خود ان کے پاس ڈاک کے ذریعے پہنچ جائیں گے۔

داخلہ کا فارم اور پراسپکٹس پچاس پیسے کا منی آرڈر بھیج کر پرنسپل کرسپانڈنس کورس دہلی یونیورسٹی دہلی سے منگوا لیجئے۔ داخلہ کی آخری تاریخ ۳۱ر اگست ۱۹۶۸ء ہے۔

پرنسپل کرسپانڈنس کورسز
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی ۷

ہو وہاں 'ی'، جہاں 'ے' ہو وہاں 'ی'، جہاں 'ے' ہو وہاں 'ی'، اور جہاں 'ے' ہو وہاں 'ی'، لکھا جائے۔

موصوف نے 'ی'، اور 'و' کی مختلف آوازوں کے لئے جو صورتیں مقرر کی ہیں اگر وہ مان لی جائیں تو اردو کے کثیف اعراب کسی خارجی اعراب کے محتاج نہ ہوں گے۔ ایسی حالت میں کسی حرف پر پہلے خارجی اور بعد میں داخلی (کثیف) اعراب دے کر ۳۶ حرفوں ان اعرابوں کی آوازیں بھی پیدا کی جاسکتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ طریقہ قابل عمل بھی ہوگا کیونکہ داخلی اعراب کسی خارجی اعراب کے محتاج نہیں ہوں گے

بلاشبہ یہ تجویز انقلابی ہے۔ قدامت پسندی کے اس دور میں اسے قبول کئے جانے کی توقع نہیں ہے۔ اگر یہ تجویز مان لی جائے تو بھی موصوف کی پہلی تجویز سے بھی تلفظ میں قطعیت ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ تجویز قدیم تعلیمی نہج کے عین مطابق ہے اس لئے اس کو قدامت پسند حضرات بھی تسلیم کریں گے۔ میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ اگر تمام مجوزہ اعرابوں کی آوازیں 'ب' میں جوڑی جائیں تو 'ب' کی آوازیں 'بَ (ब) بٓ (خفیف बा) بٗ (बु خفیف) بُ (बू خفیف) بِ (बि خفیف) با (बा) بی (बी) بےٓ (बे) بی (बै)، بو (बो)، بَو (बौ) بٗ (बृ) بَں (बं) ب: (बः) بنائی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان اعرابوں سے پوری صحت کے ساتھ اجنبی الفاظ لکھے جائیں تو تلفظ میں قطعیت ہو جائے گی۔ عام تحریر میں ہم آج کی طرح بغیر اعراب ہی لکھیں گے۔ لیکن جہاں کہیں کسی اجنبی الفاظ کا صحیح تلفظ کرانا مقصود ہوگا پوری صحت کے ساتھ اسے لکھ دیں گے۔ موصوف نے اعرابوں کا بالکل نئے ڈھنگ سے تعارف کرایا ہے۔ اردو کے لئے آپ کی یہ نئی دین ہے۔

(۲) تحریر کی معیار بندی

آپ نے تجویز رکھی ہے کہ اردو تحریر کی معیار بندی کی جائے تاکہ کسی دوری پر کھینچے گئے دو متوازی خطوط کے درمیان ہر شخص نپا تلا خوشخط حرف لکھ سکے اور اردو طباعت کو بھی انگریزی میچر پر مشین بنایا جاسکے۔ اس کے متعلق پہلی تجویز یہ ہے کہ جب اردو میں 'ن' کو 'نہ'، 'ج' کو 'جہ'، 'ک' کو 'کہ' اور 'ب' کو 'بہ' لکھا جاتا ہے تو کیوں نہیں حرف کی یہی موخر الذکر صورت کو ہی مستقل طور پر اپنا لیا جائے۔ یعنی حروف کے شوشوں میں بحال طور پر ہائے مخفی کی علامت جوڑ کر 'ب' کو 'بہ'، 'ج' کو 'جہ'، 'س' کو 'سہ'، 'ص' کو 'صہ'، 'ل' کو 'لہ'، 'م' کو 'مہ' اور 'ی' کو 'یہ'، لکھا جائے اور ہائے مخفی کا دوسرا استعمال بند کر دیا جائے اگر اس تجویز کو تسلیم کرلیا جائے تو حرف کی کرسیاں بلاشبہ درست ہو جائیں گی کاسانی اور مستقل ٹائپ بھی تیار ہوسکے گا اور کسی خط مستقیم کے اوپر خوشخط لکھنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

کرسیوں کے متعلق دوسری تجویز یہ ہے کہ مروجہ رسم تحریر میں اردو کے حروف ہمیشہ لگاتار نہیں ملتے اور ایک ہی حرف کی مختلف صورتیں لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے حروف کسی خط مستقیم پر لگاتار لکھے جائیں اور ہر حرف کی صرف ایک ہی صورت لکھی جائے۔ اگر یہ تجویز مان لی جائے تو تعجب کو تعلجب، نصیحت کو نصیحنہ، تصحیح کو تصحیحہ، نستعلیق کو نستعلیقہ اور حجم کو حجمہ، نستعلیق خط میں ہی لکھیں گے۔ یہ تجویز واقعی قابل غور ہے لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ کرسیوں کا معاملہ ایک آزاد موضوع بحث قرار دیا جائے اور تجربہ کار لوگوں کو کسی ماڈرن ری میں بھیج کر اچھے ٹائپ تیار کرائے جائیں۔

۳۔ اردو پرائمر

مہندی صاحب نے تجویز رکھی ہے کہ حروف تہجی کے بدلے جانے پہچانے اور دلچسپ عبارتوں سے پڑھائی شروع کی جائے تاکہ پہلے ہی دن بچے لکھنے پڑھنے کا مدعا سمجھ جائیں اور ان کے دماغ کی خاطر خواہ نشو و نما بھی ہوتی رہے۔ جس صاحب جہاں عبارتوں سے پڑھائی شروع کرنے کی باتیں کر رہے ہیں وہاں ہندی میں اب کہانیوں سے پڑھائی شروع کی جا رہی ہے مرکزی وزارت تعلیم کی نگرانی میں تجربہ کار حضرات سے رانی، مدن اور امر نامی ایک پرائمر تیار کرایا گیا ہے۔ اس پرائمر کی تیاری میں لاکھوں روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ مجھے اس پرائمر پر کئی لکچر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لئے اردو دوستوں کو پرائمر تیار کرنے وقت اس پرائمر سے بھی مدد لینی چاہئے۔ املا اور کرسیوں کا قابل عمل حل نکل آنے کے بعد سہل الحصول پرائمر تیار کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ بہرحال کسی بھی حالت میں حروف تہجی سے پڑھائی شروع کرنے کا قدیم طریقہ بلا تاخیر ترک کر دینا چاہئے۔

(۴) اردو قواعد کی ترتیب نو

ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ مروجہ اردو قواعد سے صحیح لکھنے پڑھنے میں مدد نہیں ملتی واقعی اردو قواعد کی ترتیب نو کی بڑی ضرورت ہے حسن صاحب نے بجا طور پر مروجہ اردو قواعد کی دو اصطلاحوں کی تقسیم کو غلط قرار دیا ہے۔ میں موصوف سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اردو قواعد کی وہ کون سی صورت ہوسکتی ہے جس سے ہمیں صحیح لکھنے پڑھنے میں مدد ملے گی یقیناً موصوف کے دماغ میں اردو قواعد کا ایک خاکہ ہوگا۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ متوقع اردو قواعد کی مختلف اصطلاحوں کا ایک شجرہ ہماری زبان میں شائع کرایا جائے۔ تاکہ اس میں تبصرہ کے لئے قارئین ہماری زبان کو موقع مل سکے۔

فضل المتین

صولت مرحوم

ایک تاثر　　ایک جائزہ

۶-۷ر جولائی ۱۹۶۸ء کو راجستھان کے مشہور استادِ سخن حضرت سید محمود الحسن صولتؔ مرحوم کی یاد میں "یوم صولت" کے سلسلہ میں "تاج اکیڈمی"، ٹونک کی جانب سے بزمِ مقالات اور بزمِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ یہ مضمون بھی "بزمِ مقالات" کے لئے تاج اکیڈمی کی دعوت پر لکھا گیا۔ (ف۔م)

صولتؔ مرحوم کا نام راجستھان کے اردو ادبی حلقوں میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس احترام کی وجہ — ان کی بزرگی، شعر گوئی، شعر فہمی، سچائی اور کردار رہا ہے۔ ان کی حیات میں، ان کی عمر کے راجستھان میں صرف ایک دو ہی شاعر ہوں گے۔ شعر گوئی کے لحاظ سے چند در چند وجوہ کی بنا پر ان کا مقابلہ ان کے معاصر کسی بھی شاعر سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

زود گوئی کے لئے تو وہ عدیم المثال تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جس قدر شعر کہے ہیں وہ بیشتر شاعروں کے تمام سرمایۂ شاعری سے کہیں زیادہ ہیں آج سے کم و بیش سولہ سال پہلے اجمیر کے ایک مشاعرہ کی شرکت کے وقت نعمانی صاحب مرحوم نے صولت کے لئے کہا تھا۔

"صولت صاحب عرب — ٹونک کے رہنے والے کہنہ مشق شعراء میں سے ہیں کہ شاعری کے میدان میں ان کے دل کے تمام حوصلے نکل چکے ہیں، مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس وقت تک کئی ہزار شعر لکھ چکے ہیں۔"

تمام اصنافِ سخن پر انھیں جس طرح قدرتِ تامہ حاصل تھی اور انھوں نے ہر صنفِ سخن میں اپنے جوہرِ کمال کو جس طریقہ پر نمایاں کیا ہے وہ نہ صرف قابلِ قدر ہے بلکہ حیرت انگیز طور پر اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ راجستھان کی ایک مسلم ریاست میں گوشہ گیر ایک مردِ فقیر کو قاسمِ ازل نے متاعِ سخن کی کن اعلیٰ صفات سے مالامال فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے مشاہیرِ ادب و شعرائے کرام نے ان کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے۔ انھیں کاملِ فن اور صاحبِ سخن مانا۔ اگر جوشؔ نے انھیں — "یکتائے روزگار" کہا تو جگرؔ نے انھیں — "شعر و ادب کا روحِ رواں" قرار دیا۔"

شعر فہمی — کے سلسلہ میں مرحوم کی ایک خاص اہمیت تھی۔ ان کی "پسند" اور نا "پسند" "سند" کی حیثیت رکھتی تھی۔ مشاعروں میں شرکت۔ کلام کو توجہ سے سننا۔ اشعار پر بروقت اور بےساختہ داد دینا۔ معاصر اور بزرگ شعراء کے کلام کو فنی تنقید کی کسوٹی پر کسنا بزرگانہ شفقت سے نوعمر اور مبتدی شعراء کی جائز حوصلہ افزائی فرمانا۔ مرحوم کی ادبی زندگی کا ایک خاص انداز تھا اشعار کے حسن و قبح پر جس طرح ان کی نظر جاتی اور وہ شعر کو جتنی جلد پرکھ لیتے۔ اس کی مثال بھی راجستھان کے ادبی حلقوں میں مفقود تھی۔

صاف گوئی اور اظہارِ حقیقت کے سلسلہ میں بھی مرحوم کا جواب نہ تھا وہ حق کہتے اور برملا کہتے وہ کبھی کسی مصلحت کے روادار نہ تھے انھیں جو کچھ کہنا ہوتا۔ بلاتکلف اور بلاجھجک کہتے۔ نتائج سے بےخبر اور پیش آنے والے حالات سے بےپرواہ ہوکر کہتے۔

ان کا کردار — ایک آئینہ تھا۔ ان کے ظاہر و باطن میں کسی قسم کا تضاد نہ تھا۔ انسانی اعلیٰ قدریں انھیں ہمیشہ عزیز رہیں وہ ایک پرخلوص، با اخلاق اور وضع دار انسان تھے جنھوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دیں گے کہ وہ کس قدر [illegible] بے لوث اور بے غرض و بےنفع ہوئے تھے۔ انھوں نے کن [illegible]

اقبالؔ ردولوی

غزل

کاش وہ صورتِ زیبا دیکھوں
کیا بہارِ گل و لالہ دیکھوں

ایسی نظریں بھی عطا ہوں یارب
دل ہر ذرہ میں دنیا دیکھوں

اے مری صبحِ زر افشاں آخر
اور کب تک ترا رستا دیکھوں

میرا سایہ بھی مرے ساتھ نہ ہو
خود کو یوں بھی کبھی تنہا دیکھوں

یوں بھی آجائے کبھی فصلِ جنوں
رقص کرتی ہوئی دنیا دیکھوں

آرزو ہی رہی اقبالؔ کہ میں
کوئی ایسا بھی شناسا دیکھوں

سے زندگی بسر کی اور وہ استغنا و خودداری کی کن اعلیٰ صفات کا مظاہرہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے عالم میں کرتے رہے آزمائش کے وقت ہی آدمی کی جانچ ہوتی ہے۔ مرحوم کی آزمائش حالات و وقت نے مختلف انداز سے کی وہ ہمیشہ ہر حال میں ہر اس کسوٹی پر پورے اترے جو ان کے لئے معیار قرار دی گئی۔

انھیں نہ شہرت کی ہوس تھی۔ نہ نام و نمود کا چسکا۔ وہ ہمیشہ اس زندگی پر قانع رہے جو ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ وہ فیاضی کے اس مرتبہ پر فائز تھے جہاں انسان اپنا سب کچھ لٹا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ دنیاوی مال و متاع میں ان کے پاس شاعری کا بے پناہ خزانہ تھا اور بقول فضائی صاحب مرحوم:۔

"شاعری دنیا کی دولتوں میں کچھ ایسی عجیب و غریب دولت ہے کہ شعراء کے سامنے اہلِ دولت اور صاحبِ ثروت لوگ تک ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔"

اور اہل ٹونک یہ خوب جانتے ہیں کہ ٹونک کے اس قلندر اور مردِ فقیر کے درِ دولت پر متاعِ سخن کے طلبگار ہمیشہ ہی موجود رہے بقول سید منظور الحسن صاحب برکاتی۔

(مرحوم نے) "بہت کہا — زیادہ دوسروں کے لئے اور کم اپنے لئے۔ پچیسوں دیوانوں کے اس خالق کے پاس بمشکل چند اشعار سرمایۂ حیات کے طور پر محفوظ ہیں۔"

یہ بات برکاتی صاحب نے ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک مضمون "شعرائے ٹونک" کے سلسلہ میں مرحوم کے بارے میں کہی تھی۔ اور واقعی مجھے بھی یہ کہنا پڑے گا کہ جب کوئی اہل ذوق یا محقق راجستھان کے اس مشاق اور زود گو شاعر کے تمام کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کرے گا اور مرحوم کی سحر گوئی کے تعلق سے کوئی بات واضح کہنا چاہے گا تو اسے بڑی دقتوں کا سامنا ہوگا۔

میں اپنے بچپن ہی سے مرحوم کا نام سنتا آ رہا تھا ان کا ذکر "بیت المعنی" کی ادبی صحبتوں میں آتا رہتا تھا اور مرحوم کے میرے معظم محترم مولانا خواجہ معنی اجمیری سے بڑے نزدیکی اور مخلصانہ مراسم تھے لیکن پہلی بار مرحوم سے شرفِ نیاز کا موقعہ ۱۹۵۹ء میں اس وقت ملا۔ جب مرحوم اودے پور کے آل راجستھان منعقدہ مشاعرہ میں شرکت کے بعد بہمراہی حضرات عرشی اجمیری۔ مفتوں کوٹوی۔ عارف بیکانیری وغیرہ اجمیر تشریف لائے۔ میں نے مرحوم اور آپ کے رفقاء سفر کے اعزاز میں "بزم معنی" کی جانب سے ایک نشست کا اہتمام کیا۔ اس وقت آغاز مشاعرہ سے قبل میں نے مہمان شعراء کا تعارف کراتے ہوئے صولت مرحوم کا خاص طور پر ذکر کیا۔ میرے اس اظہار اخلاص پر مرحوم بہت خوش ہوئے اور بیٹھے بیٹھے میرے قریب آ گئے۔ اور اس پہلی ملاقات نے [illegible] مرحوم کا گرویدہ کر لیا۔ اس ملاقات کے

بعد سے مرحوم کی علالت سے کچھ پہلے تک مرحوم سے خط و کتابت رہی۔ آخری خط مرحوم نے مجھے ٹونک کے ایک طالب علم کے لئے جو اجمیر گورنمنٹ کالج میں لا کے اسٹوڈنٹ تھے۔ کی رہائش اجمیر کے سلسلہ میں تعاون کے لئے لکھا تھا۔

ایک راجستھانی اور اردو ادب کا ایک خدمت گذار ہونے کی بنا پر مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ صولت مرحوم شاعرانہ حیثیت سے راجستھان کی تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہیں گے اور انھوں نے راجستھان میں شعر گوئی کے سلسلہ میں ایثار و قربانی سے کام لیتے ہوئے جو خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں راجستھان کی تاریخ ادب اردو کا مورخ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔

میں نے شعرائے راجستھان کے مطبوعہ کلام کی ایک "بیاض یادداشت" ترتیب دی ہے اس میں ۴۷ء سے اب تک کے شعرائے راجستھان کا وہ کلام جمع کیا ہے۔ جو ہند و پاک کے ان مختلف معیاری رسائل میں شائع ہوا ہے۔ جن تک میری رسائی ہو سکی ہے۔ اس "بیاض" میں مرحوم کا کلام بھی ہے اور یہ کلام زیادہ تر ماہنامہ "شان ہند" دلی سے لیا گیا ہے صولت مرحوم کے سلسلہ میں "شان ہند" اور مدیر "شان ہند" کے تذکرہ سے گریز ممکن نہیں "شان ہند" کے صفحات اور مدیر "شان ہند" کے قلم نے مرحوم کے کلام ان کے حالات اور ان کی ذات کو جس طریقہ پر اردو کے ادبی حلقوں سے متعارف کرایا ہے۔ اس کے لئے راجستھان کی تاریخ ادب اردو ہمیشہ "شان ہند" اور مدیر "شان ہند" کو یاد رکھے گی۔ ابھی کچھ دن پہلے "شان ہند" کے صفحات پر "جشن صولت" کے اعلانات آ رہے تھے اب یقین ہے کہ مدیر "شان ہند" "شان ہند" کا صولت نمبر نکالیں گے۔

جملہ معترضہ کے طور پر میں یہ بات کہنا چاہوں گا کہ ہم راجستھان والوں کے لئے یہ صورت حال انتہائی شرمناک ہے کہ ہم اپنے صوبے کی قابل قدر ہستیوں کی ان کی زندگی میں وہ قدر و منزلت نہیں کرتے جس کی بہر صورت وہ مستحق ہوا کرتی ہیں۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صولت مرحوم جیسے مایۂ ناز شاعر کا ان کی زندگی میں نہ کوئی "دیوان" طبع ہوا۔ نہ کوئی انتخاب کلام شائع ہوا۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ "تاج اکیڈمی" کی جانب سے صولت مرحوم کے کم از کم ایک معیاری "انتخاب کلام" ہی کی اشاعت عمل میں آئے اور "تاج اکیڈمی" — "یوم صولت" کی طرح یہ یادگار اور پائیدار خدمت بھی انجام دے۔ "تاج اکیڈمی" کا ذکر آیا ہے تو بانیٔ "تاج اکیڈمی" کا اسم گرامی بھی لیا جانا ضروری ہے۔ جن کی ذات والا تبار در اصل "یوم صولت" کے انعقاد کا اصل سبب ہے۔

یہ ایک تاریخ ساز حقیقت ہے کہ راجستھان کی قاعد مسلم

ریاست ٹونک کے رئیس۔ صاحب سیف و اہلِ ثروت ہونے کے ساتھ علم پرور اور صاحب قلم بھی تھے۔ انھوں نے اپنے محدود وسائل اور ذرائع کے باوجود اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اور اہلِ قلم کی جس طرح سرپرستی فرمائی ہے وہ کسی طرح بھی حیدر آباد جیسی عظیم ریاست اور بھوپال و رامپور جیسی نامی گرامی مسلم ریاستوں سے کم نہیں ہے۔ موجودہ رئیس ٹونک معلیٰ القاب نواب سر محمد اسماعیل علی خاں بہادر ماتج بھی اپنے اسلاف کے صحیح جانشین ہیں اور ایک اعلیٰ پایہ کے سخن فہم شاعر ہیں استاد صولت مرحوم کی جناب والا نے ان کی زندگی میں جس طرح خبرگیری اور قدر افزائی فرمائی اور "یومِ صولت" کے سلسلہ میں جو توجہ خاص مبذول فرمائی وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں صولت مرحوم کو جملہ اصنافِ سخن پر تمام و کمال عبور حاصل تھا۔ جہاں ان کے قصائد سے قدرت کلام، فنی مہارت اور مشاقی کا علم ہوتا ہے وہاں ان کے نعتیہ کلام سے ان کی دینی وسعتِ علم و فضل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کی غزلیات سے ان کے مخصوص مزاج اور مذاقِ سخن کو صاف طور پر پہچانا جا سکتا ہے جہاں تک غزل کا تعلق ہے یہ صنف انھیں خاص طور پر محبوب رہی ہے اور غزل میں بھی عاشقانہ رنگ تغزل سے انھیں ایک خاص الخاص لگاؤ تھا۔

نعت گوئی — شعرائے ٹونک اور والیان ٹونک کا خاص وصف رہا ہے اور ٹونک میں عاشقِ رسول خلد آشیاں نواب ابراہیم علی خاں خلیل نور اللہ مرقدہ امام الشعراء حضرتِ کیف مرحوم فردوسی اسلام حضرت کلامی، اور ادیب الملک اختر شیرانی جیسے مشہور اور عدیم المثال نعت گو شعراء گذرے ہیں یہ صنفِ سخن ایک خاص اہتمام، رکھ رکھاؤ، متانت، علمی درک اور ایک مخصوص مزاج کی متقاضی ہے صولت مرحوم میں وہ خصوصیات موجود تھیں جو ایک نعت نگار شاعر کا خاصہ ہوتی ہیں۔

میری نظر میں صولت مرحوم کی بحیثیت قصیدہ نگار اور غزل گو خاص اہمیت ہے۔ غزل اردو کی سب سے زیادہ اہم اور مقبول صنف رہی ہے اس لئے عام طور پر غزل کے سامنے دیگر اصنافِ سخن پر قادر شعراء کے ذکر کے وقت ان کی غزل گوئی کی بنا پر ان کی ان اصنافِ سخن کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا جس میں واقعی انھوں نے کارنمایاں انجام دئے ہیں۔

میرے سامنے صولت مرحوم کے رنگِ سخن کے سلسلہ میں مکمل [illegible] کلام کی عدم دستیابی ہے۔ فی الوقت میں جو کچھ بھی کہوں گا۔ مرحوم کے اس کلام کی روشنی میں کہوں گا۔ جو میری "بیاض یادداشت" میں مرقوم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اربابِ نقد و نظر مرحوم کی شاعری سے متعلق میری جانب سے کہی جانے والی باتوں سے اختلاف کریں اور اس اختلاف کی وجوہات ان کے سامنے ہوں۔ بہرحال، اظہارِ خیال اور اظہارِ رائے کا ہر ایک کو حق و اختیار ہے۔

جہاں تک استاد صولت مرحوم کے قصائد سے بحث کا تعلق ہے، میں کہوں گا کہ مرحوم نے اپنے قصائد میں ہمیشہ اس عامیانہ روش سے دامن بچایا ہے۔ جس کی بنا پر قصیدہ بدنام رہا ہے، چاپلوسی، کاسہ لیسی، خوشامد اور بے جا تعریف مرحوم کی طبیعت اور فطرت کے بالکل برخلاف تقاضے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد پر وہ الزام نہیں تراشا جا سکتا ہے جس کی بنا پر قصیدہ کو خاص طور پر نشانۂ ملامت بنایا جاتا ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وہ دربار رس ہونے کے باوجود دربار ٹونک سے اپنی ذات کے لئے ایسا فائدہ نہیں اٹھا سکے جو عام طور پر قصیدہ نگار شعراء کا مقصود و مدعا ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے حال میں مست رہنے والے ایک قناعت پسند تھے۔ بلکہ حقیقت شناسی کے سبب

یہ دو مصرعے نہیں دیوان ہیں سرکارِ عالی کے

جیسی بے معنی اور عامیانہ مدح سرائی سے ہمیشہ متنفر رہے اور جہاں تک اعترافِ حقیقت اور اظہارِ صداقت کا تعلق ہے انھوں نے اپنے قصائد میں اپنے ممدوح کی خوبیوں کو ہر طرح سراہا اور ان کی وضاحت اپنی فنی لیاقت اور خداداد اہلیت کے سہارے شاعرانہ انداز سے کرتے ہوئے قصیدہ گوئی کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے اپنے قصائد میں قابلِ غور پہلوؤں پر مربوط اظہارِ خیال کے ساتھ ان قابلِ قدر حقائق کی منظم تصویر کشی سے کبھی گریز نہیں کیا جو ان کے ممدوح سے متعلق تھے۔

ان کے قصائد، ان کی قدرت کلام، فنی مہارت اور مشاقی کے ساتھ زبان و بیان پر ان کے کامل عبور کے آئینہ دار ہیں۔

میرے پیشِ نظر صولت مرحوم کی جو غزلیات ہیں۔ ان سے شاعر کی پختہ گوئی اور استادانہ مہارت ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ یہ غزلیں اپنے قاری کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ کلام اردو کے بیشتر اساتذہ کے کلام کی طرح نہ بے نمک ہے۔ نہ خلوص و ولولے سے محروم اور نہ صرف مشاقی کی دین ہے اس کلام میں جا بجا ایک ذہین دردمند انسان کے حساس دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

اس کلام کے پڑھنے سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو زبان و بیان پر قدرت تامہ حاصل ہے۔ وہ اردو کے مرکزی [illegible] دور رہتے ہوئے اہلِ زبان کی طرح اردو کے ٹکسالی محاورے استعمال کرتا ہے۔ وہ استعارات و تشبیہات کلام میں

لاتا ہے جن پر اجارہ داری نام نہاد اردو ادبی اسکولوں
کے چند شعرا اپنا ورثہ سمجھتے ہیں۔ وہاں اس کا بھی
اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاعر نے مشکل زمینوں میں شعر
کہہ کر الفاظ کی صحیح نشست و استعمال کا خیال رکھ کر،
مصرعوں کی تراش خراش کے ساتھ ان کی بندش اور چستی
پر توجہ دے کر اشعار میں مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ
کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حق بھی بہ بابت روانی و سادگی
سے پوری طرح ادا کرتے ہوئے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور
فنی لیاقتوں کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ مرحوم کی غزلیات کے
مطالعہ سے ہمیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کے
مزہ اور چٹخارے کے پردے میں شاعر نے ایسے نشتر دل کو
بھی پوشیدہ رکھا ہے۔ جو دل کی گہرائیوں میں دور تک پیوست
ہو جاتے ہیں اور اپنا کارگر اثر دکھاتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ استاد صولت مرحوم کی غزلیات میں نظر
کی وسعت، علمی بصیرت، واردات، مشاہدہ، جذباتی گہرائی،
احساس کی نشتریت اور فنی مہارت کی جلوہ گری عام ہے۔

آخر میں مجھے صولت مرحوم کے بارے میں دو باتیں اور
کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھیں مزاح میں بھی بدطولیٰ حاصل تھا۔
وہ اکثر برجستہ و برمحل ایسے اشعار فرما دیتے جو موقعہ و محل کی
مناسبت سے حاضرین کو محظوظ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ زبان
زد خاص و عام ہو جاتے تھے۔ اور مدتوں کسی واقعہ یا صحبت کی
یاد برقرار رہتی تھی۔

دوسرے یہ کہ مرحوم انتہائی زود رنج واقعہ ہوئے تھے وہ
خلاف طبیعت معمولی بات بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے، جلد غضبناک
ہو جاتے اور غصہ میں وہ کچھ کر گذرتے جس کی ان سے توقع نہیں
ہوتی۔ یہ ان کی ایک فطری کمزوری تھی۔ لوگ ان کی اس فطری
کمزوری سے کافی فائدہ اٹھاتے اور انھیں
نقصان پہنچاتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرحوم
کا غصہ وقتی ہوتا۔ وہ کینہ، کدورت اور
دشمنی سے ہمیشہ دور رہتے کسی سے عناد
بغض یا مخاصمت نہیں رکھتے جلد روٹھتے
اور جلد من جاتے۔ اپنی زیادتی اور غلطی
کا اعتراف کر لیتے اور تعلقات استوار
کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی فرماتے۔
غرض یہ کہ بہت سی خوبیاں تھیں
مرنے والے میں۔

(باقی صفحہ ۹ سے آگے)

میں امداد دے سکیں تو اردو ادب کی ایک ٹھوس خدمت
ہو جائے نئے مصنف اپنی تصانیف تو منظر عام پر لائیں ہی مگر
مرحوم مصنفوں کو بھی نئی زندگی بخشنے میں امداد دیں۔

اردو کے ہر نام لیوا کا اخلاقی فرض ہے کہ اس ضمن میں وہ
پوری دیانتداری سے تعاون دے ایسے مراکز کی تشکیل میں امداد
کرے اور اردو ادب کی پھلواری کے ان باغبانوں کو دہری
موت مرنے سے بچائے جنھوں نے اپنی حیات میں اس پھلواری
کے لئے کبھی اپنے خون سے آبیاشی کی تھی ورنہ کہنے والے یہی کہیں
گے ؎

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت

اگر مرحوم مصنفوں کی تصانیف کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے
ایک ہمہ گیر کھوج کی مہم چلا دی جائے تو انشا، اللہ اس کا نتیجہ
بہت تابناک ہوگا۔ اردو کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ
اردو ادب کو زندہ رکھے اور ادب کو زندہ رکھنے کے لئے اس
کے مصنفوں اور تصانیف کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔

(ہماری زبان)

مراسلہ

اردو کے کم معروف ادیبوں پر توجہ دی جائے

یہ بات بڑی مسرت کی ہے کہ بھارت میں آج بھی اردو ادب کی تصانیف آن بان سے شائع ہو رہی ہیں۔ جان رسکن (John Ruskin) نے ادب کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول غیر فانی تصانیف (Book of all time) اور دوئم وقتی تصانیف (Book of the hour)۔ اردو کی موجودہ تصانیف میں کس تصنیف کو کونسا درجہ حاصل ہے یہ دیکھنا اور پرکھنا نقادوں کا کام ہے۔

بہر حال یہ بات اردو ادب کے تابناک اور درخشندہ مستقبل کی دلیل ہے کہ اس میں تصانیف شائع ہو رہی ہیں اور وہ بھی ایسے پرآشوب زمانے میں جب اردو زبان کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جا چکی ہے اور لائی جا رہی ہے۔ موجودہ اردو شعراء کے دواوین بھی منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اور ملک کے ہر حصہ سے اردو کی عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ اردو ادب کا ایک روشن پہلو ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ایک تاریک پہلو بھی ہے تقسیم ملک کے وقت اردو کی کتنی گرانمایہ اور بیش بہا غیر مطبوعہ تصانیف ملیامیٹ دنا بود کر دی گئیں اس کا اندازہ صحیح طور پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ اصحاب علم و فکر اور ارباب علم و ادب پورے ملک میں ایک ہمہ گیر مہم چلائیں اور اگر اب بھی ایسی تصانیف کے کچھ اوراق ہی فراہم کر لیں تو شاید کئی غیر فانی غیر مطبوعہ تصانیف کی نشاندہی اور سراغ رسی ہو سکے۔ ع

تمام بیکو رفتگاں ضائع مکن

اس کے ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ بھارت میں اردو کے کتنے ہی اچھے شعرا ناسازگار حالات کا شکار ہو کر وقت سے پہلے ہی عدم کو سدھار جاتے ہیں اور ان کا قیمتی ذخیرۂ ادب کسی ردی فروش کی تحویل میں پہونچ جاتا ہے اردو کے ممتاز شعراء بھی اس سے بری ذمہ نہیں رہ سکے۔ عام شعراء تو عموماً اپنے غیر مطبوعہ کلام کو محض ضائع ہو جانے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ انھیں زندگی میں اتنی توفیق نہیں مل پاتی کہ اپنے شہ پاروں کو اپنی حیات میں شائع ہوتے دیکھیں۔ مرنے کے بعد کسی اور کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ادھر متوجہ ہو کر ان کے رشحات علم کو کتابی صورت میں لا سکے۔

میرٹھ ہی کو لیجئے جس نے کتنے ہی اچھے ادیبوں اور شعراء کو جنم دیا۔ مگر اس میں سے کتنے ہیں جن کے دیوان یا تصانیف منظر عام پر آ سکے۔ حضرت بیان میرٹھی۔ حضرت عیاں میرٹھی۔ صوفی میرٹھی۔ (شاگرد نوح)۔ ثاقب میرٹھی۔ اختر داغ میرٹھی۔ شہرت میرٹھی۔ قہر نظامی (شاگرد سیماب)۔ شاکر میرٹھی۔ ان میں سے ہر شاعر ایک مکمل فنکار تھا مگر ان کی تصانیف اور دواوین منظر نہیں آ سکے صوفی صاحب کے ۱۲ دیوان تھے جو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب تھے اور بڑے خوشخط لکھے ہوئے تھے۔ قہر نظامی کے ۴ دیوان تھے شہرت میرٹھی کے ۷ دیوان تھے۔ ثاقب اور اختر دونوں کے دو دیوان تھے۔ شاکر صاحب کے چار دیوان تھے قہر نظامی خواب میں مضمون کے اشعار کہتے تھے اور جو اشعار یاد رہتے تھے وہ بیاض میں بھی لکھتے تھے۔

یہ حال میرٹھ ہی کا نہیں اور جگہوں کا بھی ہے گوالیار میں حضرت غنی کے پچیس دیوان تھے۔ جناب خواجہ سائل کے نو دیوان تھے ان حضرات کو مرے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا ہے۔

مختلف شہروں میں ایسی کتنی ہی مثالیں ملتی چلی جائیں گی میر تقی میر کی جانشینی وراثت میں جناب ابو الخیال نادر شاہجہانپوری کو ملی تھی۔ وہ فن عروض کے ماہر اور چوٹی کے اردو شاعر تھے۔ ان کے بھی دو دیوان تھے جو جھانسی میں تھے۔ حضرات اسحٰق۔ عابد مرادآبادی بی اے شفا لکھنوی۔ رسا لکھنوی۔ ذاکر میرٹھی۔ ان حضرات کے دیوان بھی شائع نہیں ہوئے۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ شعراء زیادہ مشہور نہ ہوں مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آئندہ چل کر وہ مشہور ہو سکیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اردو ادب کے نام لیوا اس قسم کے ادبی مراکز کی تشکیل کریں جہاں مرحوم شعراء اور مصنفوں کی تصانیف دیر تک محفوظ رکھی ہیں غالب اپنے زمانے کا اچھا شاعر تھا مگر آج دنیا اسکو شوق سے پڑھتی ہے اور وہ اس مقام کو پہونچ چکا ہے جہاں وہ خود اپنے زمانے میں نہیں پہونچ سکا تھا اگر اس کے دیوان شائع نہ ہوتے اور یوں ہی تلف ہو جاتے تو اردو ادب کا سہاگ لٹ چکا ہوتا۔ ممکن ہے کہ غیر معروف شعراء بھی آئندہ چل کر کوئی ممتاز مقام پالے۔ لہذا یہ بہت ضروری ہے کہ مرحوم شعرا اور مصنفوں کی غیر مطبوعہ تصانیف کو کسی دیانتدار اور مستعد ادارے کو سونپ دیا جایا کرے۔ جہاں وہ کافی دیر تک محفوظ رہ سکیں۔ اور وقت ضرورت اردو ادب کے مفاد کے لئے اسے منظر عام پر بھی لایا جا سکے۔ خواجہ سائل مرحوم نے نعت میں ایک مسدس لکھا جو ۱۸ بندوں پر مشتمل تھا اور ہر بند علیحدہ زبان میں تھا مگر ایک ہی بحر میں تھا۔ جو شاعر اٹھارہ زبانوں پر قادر ہو اس کے غیر مطبوعہ دواوین کا تلف ہو جانا اور اردو ادب کی خوش قسمتی نہیں کہی جا سکتی۔

نئے مصنفوں کو دھن لگی ہوتی ہے کہ ان کی تصانیف جلد از جلد منظر عام پر آ سکیں اگر یہی مصنف تھوڑی سی زحمت گوارا کر لیں اور اپنے شہر اور اس کے آس پاس کے مقامات کے مرحوم شعراء اور مصنفین کی غیر مطبوعہ تصانیف منظر عام پر لانے

انجمن ترقی اردو بہار کی سرگرمیاں

پٹنہ:۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو ۱۹۵۱ء سے مسلسل بہار میں اردو کے مسائل پر کام کر رہی ہے۔ ان سترہ برسوں میں انجمن نے اپنی کارگذاریوں کی ایک تاریخ بنائی ہے کہ اس پورے عرصہ میں عوامی سطح پر اردو کے تحفظ و بقا کی جدوجہد خالص جمہوری انداز سے اور سر دائرے میں جس طرح بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے کی ہے وہ ایک مثالی نمونہ ہے۔ ادبی، علمی، لسانی، سماجی، اور سیاسی، تمام ہی دائروں میں ریاستی انجمن اردو کے کاز کی خدمت کرتی رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہار میں اردو اور ریاستی انجمن ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں اور ریاست کے اندر اردو کے سلسلہ میں جو کچھ بیداری اور کارگذاری پائی جاتی ہے وہ سب براہ راست ریاستی انجمن کی رہنمائی میں بروئے کار آئی ہے۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار حکومت کے پروگرام کی ایک شق اردو کے مطالبے کی تعمیل قرار پائی، یہاں تک کہ گورنر نے اپنے خطبے میں حکومت کی پالیسی بیان کی اس میں ایک عنصر اردو کو بھی قرار دیا لیکن افسوس کہ متحدہ محاذ میں شریک فسطائی جماعت جن سنگھ کی سازشوں اور دوسری جماعتوں کی مجرمانہ غفلتوں کے سبب نہ صرف یہ کہ اردو کا مطالبہ پورا نہیں ہوا بلکہ بلاوجہ اردو کا بہانہ بنا کر اور اس طرح ایک دھوکے کی ٹٹی قائم کر کے فرقہ پرستوں نے فساد اور خون خرابہ بھی کیا اور متحدہ محاذ کی حکومت بحیثیت مجموعی اس فساد اور خون خرابے کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ چنانچہ ریاستی انجمن کے اصحاب کار نے ایک بار پھر اپنی سیاسی بصیرت و جرأت کا ثبوت دیا اور متحدہ محاذ کی حکومت سے اپنی حمایت اس کے قیام کے چھ ماہ کے اندر واپس لے لی۔ ریاستی انجمن نے اپنے وسائل کا ایک بڑا حصہ تعمیری کاموں پر مرکوز کر دیا ہے، تعلیم کی تمام جہتوں میں کام کیا جا رہا ہے ابتدائی تعلیم کے لئے بچوں کی درسگاہیں قائم کرائی جا رہی ہیں۔ ثانوی سطح پر سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکولوں کا بھی نظم کیا جا رہا ہے اسی طرح ایک اردو یونیورسٹی کا قیام بھی مدنظر ہے۔ خالص علمی و ادبی سطح پر حلقہ ادب بہار ریاستی انجمن ترقی اردو مستقل اور موثر طور پر کام کر رہا ہے اس کا ماہانہ ترجمان "مریخ" اس وقت برصغیر ہند و پاک میں ادبی رجحانات کو صحیح رخ دینے کی تاریخی جدوجہد کر رہا ہے۔ ریاستی انجمن نے باضابطہ ایک لسانی سروے کمیٹی بھی تشکیل دیدی ہے۔ اس کمیٹی نے اپنے کاموں کا نقشہ اور منصوبہ تیار کر لیا ہے اور اب یہ اپنی عملی مہم بھی شروع کر چکی ہے کمیٹی کے کارکن پورے بہار میں تدریج و ترتیب کے ساتھ قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں پھیل کر ایک ایک دروازے پر پہونچیں گے اور ایک چھپے ہوئے فارم پر ایک ایک اردو پڑھنے والے کی تفصیل [illegible] کریں گے یہ ریاستی انجمن کی طرف سے بہار کے اندر اردو [illegible]

کی مستند مردم شماری ہوگی اور آئندہ ریاستی انجمن اس مردم شماری میں اپنے جمع کئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق ہی تمام کام کرے گی، تعمیری منصوبے اور لسانی مطالبے سب اسی مردم شماری کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر کئے جائیں گے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ اردو دشمن اردو بولنے والی آبادی کی تعداد کو حقیقت سے کم بتا کر ہمارے جمہوری موقف کو کمزور نہیں کر سکیں گے۔

میں ایک بار پھر قطعیت کے ساتھ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا مطالبہ حکومت اور سیاسی جماعتوں سے یہ ہے کہ بہار میں اردو کو بھی علاقائی اور سرکاری زبان قرار دیا جائے اور ہم اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک ہمارا یہ مطالبہ پورا نہیں ہو جاتا خواہ اس کے لئے کچھ بھی ہو یہ ہماری تہذیبی زندگی کا سوال ہے اور اس کو ہم اپنے لئے دوسری تمام باتوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں لیکن اس ملک اور ریاست میں اردو کے مسئلے کو باقی رکھنے اور اردو کے کاز کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اردو والے ٹھوس اور تعمیری سطح پر اپنی تہذیبی زبان کی خدمت انجام دیں لہذا میں بہار کے اہل اردو سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے کئے جانے والے تعمیری کاموں میں پورے خلوص اور سرگرمی کے ساتھ حصہ لیں اور اس طرح ہمیں اس بات کا موقع دیں کہ ہم ان کے کاز کی خدمت کے لئے جمہوری دائرے میں آخری حد تک جا سکیں اس موقع پر میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ عنقریب انجمن کی جوبلی سالانہ جشن زریں ہونے والی ہے اس کے لئے ہمارا تخمینہ دو لاکھ ہے۔ اس سلسلہ میں، میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت اردو والوں کو سب سے زیادہ ضرورت آپس میں زیادہ سے زیادہ اتحاد اور تنظیم کی ہے۔ بہار میں دوسرے ادارے بھی اردو کی خدمت کر رہے ہیں لیکن دوسرے جزوی اداروں کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، اردو کی خدمت کا ایک وسیع عوامی محاذ ہے لہذا سب لوگوں کو مل جل کر اس محاذ کو مضبوط بنانا چاہئے۔ ریاستی انجمن کسی فرد یا حلقے کی جائداد نہیں ہے بلکہ بہار کے تمام اردو والوں کی مشترک اور بلا تمیز و تفریق میراث ہے۔ یہ ایک جمہوری ادارہ ہے جو براہ راست عوام کا نمائندہ ہے لہذا بہار کے اردو عوام کو چاہئے کہ اس ادارے کو زندہ و فعال رکھنے کے لئے اسے اپنا ہر طرح کا تعاون دیں۔

ریاستی انجمن بحیثیت مجموعی بہار کے تمام اردو عوام پر اپنا حق رکھتی ہے اور اسی طرح تمام اردو عوام اس پر اپنا حق رکھتے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ بہار کے اردو دوست ہمارے کاموں میں حسب معمول جوش و خروش کے ساتھ اپنا تعاون دیتے رہیں گے۔

([illegible] جوائنٹ سکریٹری)

سینٹ کولمبس کالج میں اردو کی تعلیم کے لئے ہدایت جاری

پٹنہ ۱۵ اگست کو طلبہ کا ایک وفد رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملا۔ انھوں نے کولمبس کالج میں اردو کی تعلیم جاری کرنے کے احکامات جاری کر دئے ہیں۔ ۱۳ جولائی کو ولسٹ بوکارو میں (گھاٹو کولیری) انجمن ترقی اردو کی ایک نئی شاخ قائم ہوئی ہے جس کا افتتاح جناب قمر اعظم ہاشمی نے فرمائی۔ جناب محمد قدوس صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو پرسونی (مظفرپور) اپنے حلقہ میں ستمبر اکتوبر میں سٹامڑھی سب ڈویژنل اردو کانفرنس کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ تاکہ اس موقع پر ایک اردو ماڈل اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس طرح ہماری انجمن کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

جناب محمد بسم اللہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو سیوان نے اردو دوستوں سے اپیل کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وقت آپس میں الجھنے کا نہیں ہے اردو کا کارواں آگے بڑھ رہا ہے اور واقعی اردو کا دل ہمارے سینہ میں دھڑک رہا ہے تو ہم متحد ہو کر قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھیں اور ریاستی انجمن ترقی اردو کے صحیح پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تن من دھن سے جٹ جائیں۔

بزم ادب پٹنہ کالج کے زیر اہتمام شام پرویز

پٹنہ ۳ اگست ۱۹۶۸ء کو زیر اہتمام بزم ادب "پٹنہ کالج" پٹنہ یونیورسٹی "شام پرویز" کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب شاہ جعفر صاحب نے فرمائی اس جلسہ میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ پرویز شاہدی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جمیل مظہری کی یہ رباعی حاضرین نے بہت پسند کی۔

غم کی بدلی سی یہ چھائی ہے آج یہ کس کی یاد آئی ہے
شام پرویز ہے اداس اداس آنکھ بیٹھے کی ڈبڈبائی ہے

(محمد عبد العلیم جنرل سکریٹری)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر مسعود حسین خاں کے اعزاز میں استقبالیہ

علی گڑھ اردو کے ممتاز محقق اور نقاد پروفیسر مسعود حسین خاں کو شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ایک استقبالیہ دیا گیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور نے پروفیسر مسعود حسین خاں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا شعبۂ لسانیات میں بہ حیثیت پروفیسر تقرر پر مسرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرانے طالب علم اور استاد ہیں۔

سرور صاحب کی تقریر کے بعد پروفیسر مسعود حسین نے سرخیل دبستان بیجاپور عبدل دہلوی کے ابراہیم نامہ کے مقدمہ کے بعض حصے ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسہ میں پڑھ کر سنائے۔ ابراہیم نامہ کے اب تک صرف دو نسخے دریافت ہوئے ہیں ایک سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے اور دوسرا ریاست اوندھ (مہاراشٹر) کے ایک کتب خانہ میں محفوظ تھا جو اب بمبئی آرکائیوز میں منتقل ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین صاحب پچھلے تقریباً تین سال سے ابراہیم نامہ کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے اور اب یہ طباعت کے آخری مراحل سے گذر رہا ہے۔ ابراہیم نامہ کے مقدمہ میں دیگر محققین کے برعکس جو عبدل کے پورے نام کا تعین عبد الغنی کرتے رہے ہیں پروفیسر مسعود حسین نے اس کے نام کا تعین عبد اللہ کیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ابراہیم نامہ کا تاریخ تصنیف سنہ ہجری میں نہیں بلکہ سنہ شہور میں ہے جس کے ۱۲-۱۶۱۱ سنہ عیسوی نکلتے ہیں۔ عبدل کے ابراہیم نامہ کی شعری اہمیت کے علاوہ لسانی اہمیت یہ بھی ہے کہ وہ دلی کی اردو اور دکن کی اردو کے درمیان ایک پل کا کام دیتا ہے ابراہیم نامہ کی دریافت سے یہ بات بھی پایہ تصدیق کو پہنچ جاتی ہے کہ ۱۶۰۰ء کے قریب شمالی اردو اور دکنی اردو میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا مقالہ کے اختتام پر شعبہ کی جانب سے پروفیسر مسعود حسین خاں اور شرکائے جلسہ کا شکریہ جناب نسیم قریشی صاحب نے ادا کیا۔

صفحہ ۱۲ سے آگے

یہاں جواد مسعود حسین سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جواد صاحب نے مجھ پر بہت احسانات ہیں وہ لیکچر نہیں دیتے تھے۔ اپنے لکھے ہوئے لیکچر پڑھ دیا کرتے تھے شروع شروع میں میرے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا پھر ان کی بتائی ہوئی کتابیں پڑھنا شروع کیں تو ان کے لیکچروں سے بصیرت ملنے لگی۔ ان کی لائبریری ہر اچھے طالب علم کے لئے وقف تھی وہ براؤننگ پڑھاتے تھے یوعالب کے اشعار کی مدد سے براؤننگ کے مشکل مقامات کی تشریح کرتے جاتے تھے۔ ایم۔ اے کے لئے ہمارا خاص پرچہ ڈاکٹر جانسن تھا جس نے اسے بہت اچھی طرح تیار کیا تھا مگر امتحان سے دو دن پہلے منظور صاحب نے مجھ سے کہا کہ جانسن پر ایک نئی کتاب آج ہی میرے پاس آئی ہے۔ چاہو تو پڑھ ڈالو۔ میں نے ایک دن میں پڑھ ڈالی اور اپنے پرچے میں اس کا حوالہ بھی دیا۔ پروفیسر ہل نے اس پرچے میں مجھے ۷۵ نمبر دئے۔ منظور صاحب کے ٹوٹوریل سے بڑا فائدہ ہوتا تھا۔ وہ ہر کوتاہی پر ٹوکتے تھے مگر اس طرح کہ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور بڑھتا تھا۔ منظور صاحب نے مجھے انگریزی ادب ہی نہیں پڑھایا انگریزی ادب کا عشق بھی دے دیا۔ اس عشق پر میں شرمندہ نہیں ہوں۔ اس نے مجھے اپنے ادب سے بھی عشق سکھایا ہے بقول فیض۔

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

کل اور آج

میرا صفحہ

آج بےساختہ مجھے اپنے کچھ استاد یاد آئے۔ ان کے ذکر سے شاید کسی کو دلچسپی نہ ہو، مگر اس مرقعے کے کچھ رنگوں سے یہ ضرور واضح ہو جائے گا کہ اچھا استاد کسے کہتے ہیں۔ اچھا استاد اپنے شاگرد پر اپنی شخصیت کا کوئی نہ کوئی نقش ضرور ثبت کر دیتا ہے۔ اور وہ نقش وقت کے مٹائے نہیں مٹتا۔

مجھے اپنے مکتب کے استاد عین الحق یاد آتے ہیں جنھوں نے اردو پڑھائی ان کے پڑھانے کا طریقہ یاد نہیں مگر یہ یاد ہے کہ وہ بدایوں کی ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ انھیں بدایوں کے بزرگوں، شاعروں، عمارتوں، زمانوں سب سے دلچسپی تھی۔ وہ بزرگوں کی کرامات کے قصے سناتے تھے اور شاعروں کے کارنامے بیان کرتے تھے پھر مجھے بدایوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ماسٹر عبدالغنی یاد آتے ہیں جو ڈائرکٹ میتھڈ سے انگریزی پڑھاتے تھے اور میری انگریزی میں استعداد کا فخریہ ذکر کرتے تھے، وہ انگریزی اس طرح پڑھاتے تھے کہ نہ انگریزی کے الفاظ کے ہجے مشکل معلوم ہوتے تھے نہ اس کا تلفظ چھٹے درجے میں انھوں نے مجھے انگریزی میں تھوڑی بہت بات چیت کرنا سکھا دی تھی۔ اس کے بعد غازی پور کے وکٹوریہ اسکول کے ماسٹر رام ناتھ یاد آتے ہیں جنھیں ہم لوگ پروفیسر کہا کرتے تھے ماسٹر رام ناتھ گورا بازار میں رہتے تھے اور روز سائیکل پر اپنے لڑکے کو بٹھائے ہوئے اسکول آتے تھے۔ میرے والد پوسٹ ماسٹر تھے۔ ڈاکخانہ گورا بازار کے قریب ہی تھا۔ میں میل ڈیڑھ میل روز پیدل آتا تھا۔ ماسٹر رام ناتھ انگریزی پڑھاتے تھے میں سب مضمونوں میں اچھا تھا سوائے حساب کے ششماہی امتحان میں میں حساب میں فیل تھا مگر میرے مجموعی نمبر سب سے زیادہ تھے ماسٹر رام ناتھ نے مجھ سے کہا کہ تم ہائی اسکول اسکالرشپ کا امتحان دو۔ یہ امتحان اس زمانے میں بنارس میں ہوتا تھا۔ حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے مجھے اسکالرشپ نہ ملا۔ مگر ماسٹر رام ناتھ بدستور مہربان رہے۔ وہ کورس سے زیادہ ادھر ادھر کی باتوں پر زور دیتے تھے۔ کبھی شیکسپیئر کا کوئی سین سنا رہے ہیں۔ کبھی لڑکوں سے تقریریں کرا رہے ہیں کبھی الہ آباد یونی ورسٹی کے پروفیسروں کے قصے سنا رہے ہیں۔ مجھے لائبریری لے جاتے تھے اور انگریزی کی کتابیں نکال کر پڑھنے کو دیا کرتے تھے۔ ڈراپس کروسو میں نے آٹھویں درجے میں پڑھی تھی۔ رام ناتھ کھلاڑی بھی بہت اچھے تھے۔ اسٹاف اور طلبہ کی کرکٹ میچ میں انھیں آؤٹ کرنا طلبہ کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔ مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہندو طلبہ کو مسلمان طلبہ پر فوقیت دیتے ہیں۔ وہ اچھے طلبہ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی دلچسپ باتوں سے، اپنی تقریروں سے، اپنے لطیفوں سے ہم کو ادب کا عاشق بنا دیا تھا۔ ان کے گھنٹے میں کوئی غیر حاضر نہیں ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ گھنٹہ بجتا تھا تو افسوس ہوتا تھا کہ اتنی جلد کیوں بج گیا۔ کئی برس ہوئے جب میں نے سنا ماسٹر رام ناتھ کا انتقال ہو گیا تو مجھے بہت رنج ہوا۔

ہائی اسکول کے بعد میں سینٹ جانس کالج آگرہ چلا گیا۔ یہاں کے دو استاد مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک کمسٹری کے لیکچرر انستانی تھے یہ گجراتی تھے صرف کمسٹری نہیں پڑھاتے تھے، سائنس کی پوری کہانی بیان کر دیتے تھے۔ کالج کی ہر تقریب میں ان کی تقریر ضرور ہوتی تھی۔ ان کی وجہ سے میری عام معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ میں نے کالج میں سائنٹفک سوسائٹی بنائی مگر یار لوگوں نے نہ مجھے صدر بنایا، نہ نائب صدر، نہ سکریٹری۔ صرف مجلس عاملہ کا ممبر چن لیا۔ مجھے تو خیر رنج ہوا، مگر انستانی نے پورے کلاس کو جس طرح جھاڑا ہے، اس کا مزا آج تک یاد ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر گرج رہا ہے۔ کہتے تھے کہ اگر تم مذہبی بنیاد پر فیصلے کرو گے تو ساری عمر خسارے میں رہو گے۔

فرسٹ ایر میں ایک نوجوان انگریز اسیل سے بھی واسطہ پڑا۔ یہ ... سے آئے تھے۔ کلاس میں بھاگتے ہوئے داخل ہوتے اور گھنٹہ بجتے ہی بھاگتے ہوئے نکل جاتے۔ ہمیشہ پورے وقت پڑھاتے۔ کلاس کے باہر اپنے شاگردوں سے دوستوں کی طرح ملتے۔ اپنے گھر کبھی کبھی چائے پر بھی بلاتے ایک دن پڑھاتے پڑھاتے گھڑی دیکھی اور کہنے لگے کہ مجھے آدھے گھنٹے میں کینٹ سے بمبئی کے لئے گاڑی پکڑنا ہے، اس لئے آج دس منٹ پہلے کلاس چھوڑنے پر مجبور ہوں بمبئی جا کر مجھے شادی کرنا ہے میری ہونے والی دلہن انگلستان سے آرہی ہیں میں جب کالج یونین کے سکریٹری کے عہدے کے لئے امیدوار تھا تو ان کے پاس ووٹ کے لئے گیا۔ کہنے لگے کہ میں یونین کے انتخابات میں ووٹ نہیں دیتا، مگر تمہیں ووٹ دینے ضرور آؤں گا میں کمسٹری میں اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا، مگر پریکٹیکل میں اپنے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے پھسڈی تھا کوئی نہ کوئی تجربہ ضرور گڑبڑ ہو جاتا۔ ایک دن انھیں آئے مجھ سے کہا کہ میں چند اچھے طلبہ کو کلاس کی حاضری سے معاف کر دوں گا اور ہفتے میں ایک بار انھیں اپنے گھر پر پڑھاؤں گا دیکھنا ہے کہ تم لوگ سال بھر میں کلاس کے معیار سے کتنے آگے پہنچ جاتے ہو۔ پہلی دفعہ انھوں نے ایک گھنٹے تک پڑھایا۔ پھر ایک سوال دیا کہ اس کا جواب لکھ کر اگلے ہفتے آؤ پھر چائے پلائی کچھ دیر گپ شپ کی اور رخصت کر دیا۔ اب یہ سوال جان کا عذاب بن گیا۔ ہم چار یا پانچ طلبہ اور سب کام کریں یا نہ کریں یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ سب سے بہتر جواب لکھیں نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم نے سال بھر میں بی۔ایس۔سی سے زیادہ کا کورس از بر کرا دیا اور جب انھیں نے میری کاپی ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر مکینزی کو دکھانے کے لئے مانگی تو اس دن میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور بی۔ایس۔سی میں نامیاتی کیمیا کے پرچے میں میرے فرسٹ کلاس نمبر آئے انگلستان سے انھیں کے خط کئی سال تک آتے رہے۔ پھر قدرتی طور پر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

بی۔ایس۔سی کے بعد میں انگریزی میں ایم۔اے کرنے علی گڑھ آیا

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مکتبہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹرز و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD NO-L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷ شمارہ ۳۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم ستمبر ۱۹۶۸ء

ادارتیے

پریس رجسٹرار کی رپورٹ

پریس رجسٹرار کی ۱۹۶۷ء کی بابت رپورٹ شائع ہوگئی ہے اس رپورٹ میں عام اخبار بینوں کے لیے عموماً اور اردو داں طبقے کے لیے خصوصاً خاصا دلچسپ مواد موجود ہے۔ یہ رپورٹ حال میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوئی۔

۱۹۶۷ء کے دوران اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں ۷۰۱ کا اضافہ ہوا اور ان کی اشاعت میں دو لاکھ کا۔ ان سالوں کو شامل کرکے جنھیں اخبار کہنا صحیح نہ ہوگا، مجموعی تعداد ۱۹۶۶ء کے ۱۰۹۷۷ کے مقابلے میں ۱۹۶۷ء میں ۱۱۶۷۰ تھی گذشتہ سال کے مقابلے میں اخباروں کی تعداد میں اضافہ ۸۰ء۷ فی صدی ہے اور ۱۹۶۲ء کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ۲۵ء۹ فی صدی ہے۔ گویا پانچ سال میں ۲۵ء۹ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ یہ ہندوستان کے لئے دلخوش کن بات ہے۔

خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ اس اضافے میں اردو بھی شریک ہے ۱۹۶۷ء میں ہندوستانی پریس، ۶۴۲ روز ناموں ۲۶۹۷ ہفتہ دار اخباروں اور ۷۵۹۲ دوسرے رسالوں پر مشتمل تھا ہندی کے اخباروں کی تعداد ۲۲۰۷ یعنی سب سے زیادہ تھی۔ اس کے بعد انگریزی کے ۱۹۵۸ اخباروں کا نمبر تھا۔ تیسرے نمبر پر اردو تھی جس میں اخباروں کی تعداد ۸۶۴ ہے کئی سال سے اردو کا نمبر تیسرا ہے۔ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، تامل، تلنگو، کنڑ، ملیالم، پنجابی، آسامی، سنسکرت اڑیہ کے بعد سب سے آخر میں سندھی کا نمبر ہے ۶۹۱ اخبار دو زبانوں میں اور ۱۶۸ اخبار دو سے زیادہ زبانوں میں شایع ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے ۳۱ اخبار ہیں۔ اس فہرست سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں تین زبانیں ایسی ہیں جو ایک یا دو ریاستوں تک محدود نہیں بلکہ کل ملک میں پھیلی ہوئی ہیں یہ ہندی انگریزی اور اردو ہیں۔ گویا ہندوستانی زبانوں میں ہندی کے بعد اردو کل ہند زبان کہی جاسکتی ہے۔

مہاراشٹر کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ وہاں سے سب سے زیادہ تعداد میں اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ ان کی تعداد ۲۴۵۲ ہے۔ اترپردیش کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ اترپردیش میں یہ تعداد ۱۴۰۶ ہے۔ یہ بات کسی طرح اتنی بڑی آبادی کی ریاست کے لئے باعث فخر نہیں ہے ہاں مغربی بنگال اور دہلی کے رقبے اور آبادی کو دیکھتے ہوئے ۱۰۵۰ اور ۱۰۴۰ کی علی الترتیب تعداد یقیناً ان ریاستوں کے لئے قابل اطمینان ہے۔

اترپردیش سے سب سے زیادہ روزنامے نکلتے ہیں۔ ان کی تعداد ۱۱۴ ہے۔ سنسکرت میں کوئی روزنامہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے ہندوستان کی پندرہ بڑی زبانوں کے علاوہ ۲۹ دوسری زبانوں میں بھی اخبار شایع ہوتے ہیں۔

ہر سال کچھ نئے اخباروں کا اضافہ ہوتا ہے اور کچھ بند ہوجاتے ہیں۔ اس سال کے دوران ۱۲۰۲ نئے اخبار جاری ہوئے اور ۳۶۹ بند ہوگئے۔ گویا اضافے کی رفتار برابر بڑھتی رہی ہے۔ یہ ملک کے لئے اچھی بات ہے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اضافے کے لحاظ سے بھی کل ہند زبانوں میں درجہ بندی برقرار ہے۔ سب سے زیادہ نئے اخبار ہندی میں نکلے۔ ان کی تعداد ۳۶۱ تھی۔ انگریزی میں نئے اخباروں کی تعداد ۲۱۳ تھی اور اردو میں ۱۲۹۔ انگریزی اور ہندی میں بند ہونے والے اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ تھی اردو دوستوں کے لئے یہ اعداد بھی ہر طرح تسلی بخش ہیں۔

روزناموں میں سب سے زیادہ ہندی میں نکلتے ہیں۔ اس کے بعد اردو میں اور اس کے بعد انگریزی میں۔ سب سے زیادہ خریدار انگریزی روزناموں کے ہیں۔ اس کے بعد ہندی کا نمبر آتا ہے۔ افسوس ہے کہ خریداروں کے لحاظ سے اردو کا نمبر دوسری کئی زبانوں کے بعد آتا ہے۔

[illegible] اعدادوشمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ اگر اردو والے طبقہ اخباروں اور رسالوں کی خریداری کو اور زیادہ اہمیت دے تو خریداروں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ سکتی ہے۔ امید ہے کہ اردو دوست اس طرف خاص طور سے توجہ کریں گے تاکہ اردو زبان اور ترقی کر سکے۔ آج کی دنیا میں روزناموں کے دس بارہ ہزار خریدار، معیاری رسالوں کے چار پانچ ہزار خریدار اور کتابوں کے ایک ہزار کے ایڈیشن، کسی طرح کافی نہیں۔ دیکھنا ہے کہ کب اردو کا کوئی روزنامہ پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور کب پانچ پانچ ہزار کا ایک ایڈیشن روزمرہ کی بات ہوتا ہے۔

کالی کٹ یونیورسٹی میں

اردو کا شعبہ

ترونندرم۔ کیرالا کے وزیر تعلیم جناب محمد کویا نے کالی کٹ یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اعلان کیا کہ اس یونی ورسٹی میں اردو، فارسی، عربی، تامل اور کنڑ کے خاص شعبے قائم کئے جائیں گے۔ (سنگم)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں

اردو سرٹیفکیٹ کورس

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اردو مختلف جماعتوں میں لازمی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے لیکن بعض طلبہ کو شوق رکھنے کے باوجود اردو سیکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر شعبۂ اردو نے اس سال سے سرٹیفکیٹ کورس کی کلاسیں شروع کی ہیں۔ یہ جز وقتی ایک سالہ کورس ہے۔ اس کورس کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی اور ہندوستانی طلبہ جو یونی ورسٹی کے کسی اور کورس میں اردو نہیں پڑھ سکتے اور اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں وہ اس زبان کا کچھ علم حاصل کر سکیں۔ اس سال ۱۴ امیدواروں نے داخلہ لیا ہے۔ (رفتار)

مسلم یونیورسٹی میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی تیسری کل ہند کانفرنس

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی پہلی کل ہند کانفرنس دہلی میں اور دوسری کل ہند کانفرنس سری نگر میں منعقد ہوئی تھی۔ اب تیسری کل ہند کانفرنس شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے زیر اہتمام علی گڑھ میں ۲۰، ۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو منعقد ہو رہی ہے۔ (رفتار)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں ماریشس کے طالب علم کا داخلہ

امسال جن طلبہ نے اردو ایم۔اے میں داخلہ لیا ہے ان میں ماریشس کے ایک طالب علم عنایت حسین عیدن بھی شامل ہیں۔ عنایت حسین عیدن نے اسی سال علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے فرسٹ ڈویژن بی۔اے پاس کیا ہے۔ بی۔اے میں ان کے اختیاری مضامین میں، اردو ادب بھی شامل تھا۔ عیدن صاحب ماریشس کے بہت سے فرانسیسی رسائل کے اعزازی نامہ نگار ہیں اور ہندوستان کی تہذیبی و ادبی زندگی پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے غالب کی حیات و شاعری پر فرانسیسی میں مفصل مضمون لکھا ہے۔ آج کل وہ غالب کے منتخب کلام کا فرانسیسی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

حسرت موہانی چوک

ممبئی میونسپل کارپوریشن میں مسٹر پیر محمد انصاری نے ایک تجویز پیش کی ہے کہ ناگپاڑہ چوک کا نام بدل کر حسرت موہانی چوک رکھا جائے۔ میونسپل کارپوریشن کی آئندہ نشستوں میں اس تجویز پر غور کیا جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی کو اعزاز

راولپنڈی۔ پاکستان کے صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے قابل فخر کارکردگی پر اردو کے مشہور شاعر و ادیب جناب احمد ندیم قاسمی کو صدارتی تمغہ اور دس ہزار روپیہ بطور اعزاز عطا کیا ہے۔

علقمہ شبلی

غازہ

لہو آج پھر بہہ رہا ہے
زمیں تو زمیں، آسماں سرخ ہے
دیارِ اشوکا میں پھر رقص ابلیس کا ہے
چمن زارِ گوتم میں ہیں چاک در چاک کلیاں
زباں میرؔ و غالبؔ کی اب کشتنی ہے
نگارِ وطن دربۂ جمہور کے سرنگوں ہے

مگر اے شہیدانِ اردو!
تمہارا لہو
چراغ سرِ رہگذر ہے
متاعِ گراں بہرِ فکر و نظر ہے
پیام طلوعِ سحر ہے
تمہارے لہو سے
لبِ وقت پر آگیا ہے تبسم
عنادل نے پایا ہے ذوقِ ترنم
زبان خموشی نے سیکھی ہے طرزِ تکلم

یقیں ہے لہو یہ تمہارا
رخِ میرؔ و غالبؔ کا غازہ بنے گا
جبینِ وطن کا ستارہ بنے گا

نے لکھا ہے: "اردو ادب کی محفل جو مولانا نے آراستہ کی تھی اس کے ایک گوشے میں کوئی مقام حاصل کرنے کی آرزو میرے دل کے ایک گوشہ میں کبھی خلوت نشین تھی لیکن سیاسی وار وگیر کے ہنگاموں میں ساری محفل درہم برہم ہوگئی۔ اور کچھ اس طرح درہم برہم ہوگئی کہ ادب کا وہ صاحب کمال آرٹسٹ اپنی سیاسی قیادت کی ناموری اور شہرت میں گم ہوگیا!"

زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ فنکار سماج کے دباؤ یا زمانے کے تقاضے سے دب کر خود کو وقت کے دھارے پر ڈال دیتا ہے وہ بجائے قومی، اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے خود زمانے کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے اور اسے پتا کا ایک زبردست آلہ بن جاتا ہے اس کی عام وجہ یہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات اس کی رائیں، اس کی عادتیں اس کے رسم و رواج اس کا میلان اور اس کا مذاق بدلتا رہتا ہے اسی قدر فنکار کے تخلیق کی ہیئت بدلتی رہتی ہے یہ تغیر عین رفتار زمانہ کے مطابق ہوتا ہے عام طور پر اس کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ تقاضائے وقت کے خلاف اس کے سامنے کوئی تیسرا نہیں آتی سوسائٹی کی حالت دیکھ کر فنکار اپنے قلم کو زمانے کے رنگ میں ڈھال دیتا ہے یا یوں کہئے سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بدل جاتا ہے لیکن مولانا نے سوسائٹی اور حالات کے دھارے پر خود کو ڈالنے کے بجائے اپنے زور قلم سے حالات کا رخ پھیر دیا رفتار زمانہ کے اندر تغیر پیدا کر دیا اپنے وقت اور زمانے کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک قوم عرصۂ دراز تک ترقی کے زینے پر گامزن رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ترقی کیوں مسدود ہو جاتی ہے یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اس قوم میں سے روح قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی قوتیں پیدا ہوتی ہیں ایسے دور میں وقت کا ایک باص ضرور ہوتا ہے جو اپنی تحریر، تقریر یا خطابت سے قوم کو بیدار کرکے آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہے اور قوم کے اندر اپنی فنکارانہ صلاحیت سے وہ روح پھونک دیتا ہے کہ قوم بیدار ہو جاتی ہے اور قوم مستقبل کے خطرات سے واقف کار ہو کر دفاع کی تیاریاں کرنے لگتی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت ایسی ہی تھی جس نے ہر نازک اور سنگین موقع پر قوم کی باگ ڈور سنبھالی اور عوام کو آنے والے خطرات سے ہمیشہ خبردار رکھا۔

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان میں غالب

یہاں جنوری ۱۹۶۷ء سے لے کر اب تک ہماری زبان میں غالب سے متعلق خبریں مراسلے اور مضامین و اداریوں کا اشاریہ دیا جا رہا ہے۔

رپورٹر / جگہ / تاریخ

۱۔ انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ وسط فروری میں یوم غالب منایا جائے گا۔ — دہلی — ۱-۲-۶۷

۲۔ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے کے کام (اداریہ) — علی گڑھ — ۱۵-۲-۶۷

۳۔ پاکستان میں غالب کی صد سالہ برسی — کراچی — ،،

۴۔ غالب کی صد سالہ یادگار — دلی یونیورسٹی — ،،

۵۔ غالب سے منسوب ایک شعر کے بارے میں — اسمٰعیل احمد مینائی — ،،

۶۔ پاکستان میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی کا پروگرام — لاہور — ۲۲-۲-۶۷

۷۔ غالب کے صد سالہ جشن یادگار میں سوویت یونین کو شرکت کی دعوت — دہلی یونیورسٹی — ۱-۳-۶۷

۸۔ راشٹریہ ایسوسی ایشن بڑودہ کی جانب سے ادبی نشست (غالب اور اقبال) — ۸-۳-۶۷

۹۔ انجمن ترقی اردو دہلی کے تحت یوم غالب — دہلی — ۸-۳-۶۷

۱۰۔ انجمن ترقی اردو شاخ اسالت کے زیر اہتمام یوم غالب — اسالت — ۱۵-۳-۶۷

۱۱۔ مرزا غالب کی ایک اردو تقریظ — سید ریاست علی ندوی — ۱۲-۴-۶۷

۱۲۔ غالب سے منسوب ایک شعر کے بارے میں — رشید احمد — ۱-۵-۶۷

۱۳۔ انجمن کے سہ ماہی رسالے (اردو ادب) (غالب کی صد سالہ برسی) کا خاص نمبر شائع ہوگا — علی گڑھ — ۸-۵-۶۷

۱۴۔ ماسکو میں اردو دوست بھی غالب کے جشن صد سالہ کی تیاریاں — ماسکو (روس) — ۸-۵-۶۷

۱۵۔ غالب کے جشن صد سالہ کے لیے بین الاقوامی تعاون کی کمیٹی — مرکزی کمیٹی دہلی — ۱۵-۵-۶۷

۱۶۔ غالب کی ایک اردو تقریظ (مراسلہ) — مختار الدین احمد — ۱۵-۵-۶۷

۱۷۔ امریکہ میں غالب کی صد سالہ برسی کا پروگرام — چودھری محمد نعیم، شکاگو یونیورسٹی — ۲۲-۶-۶۷

۱۸۔ مرزا غالب کا صد سالہ جشن۔ ایشیا اور یورپ کے تمام ادبی ادارے مدعو کئے جا رہے ہیں — قومی آواز لکھنؤ — ۲۲-۶-۶۷

(باقی آئندہ)

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

اس سے کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے نیا دور (کراچی) اور سوغات (بنگلور) میں ایک نوخیز نوعمر شاعر ساقی فاروقی کی بعض نظموں نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ان نظموں میں ہیئت یا اسلوب کا کوئی ایسا تجربہ تھا جو اپنے انوکھے پن کی وجہ سے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے یا ان کے لیے حیرانی و سراسیمگی کا باعث بنتا ہے، بات دراصل یہ تھی کہ ان نظموں میں آج کے نوجوان کا روحانی کرب اور اس کی شدید ذہنی الجھن ایک ایسے علامتی سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی جو خاصی حد تک مانوس ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر تازگی اور ندرت کا پہلو رکھتا تھا۔

میں لمحہ لمحہ اپنے اندر سے
ٹوٹتا جا رہا ہوں روز بروز
(شکست کی آواز)

اے ہوائے خوش خبر نوید سنگ دے
میری جیب و آستیں میرے خون رنگ دے
میری عمر کج روش مجھ سے کہہ رہی ہے تو
اک طلسم ہے تجھے ٹوٹنا ضرور ہے
(انہدام)

یا بعد نظم میں یہ لہجہ اپنے اندر ایک سی نوک اور سی دھار رکھتا ہے میراجی اور اختر الایمان کی طرح ان نظموں میں اپنے اندر ڈر اور اکیلے پن کا وہ انداز ملتا ہے جو شخصی تجربے کے بغیر ممکن نہیں

پھر ایسا ہوا کہ ساقی فاروقی نئی نسل کا علم اٹھائے ہوئے "برہم نوجوانوں" کی صف میں نظر آنے لگے۔ انتظار حسین نے "ادبِ لطیف" میں ان کی کچھ نثری تحریریں شائع کیں جن میں بار بار ایلیٹ اور پاؤنڈ کے ناموں کا حوالہ دیا جاتا اور اپنے بزرگ معاصرین پر طنز و تعریض بھی ہوتی۔ ان کے اس رویے پر کچھ لے دے بھی ہوئی۔ پاکستان میں شاعری کے جدید اور جدید تر اسالیب اور تجربوں کا ایک لیب سا انسٹڈیٹرا افتخار جالب، جیلانی کامران، عباس اطہر، انیس ناگی، گوہر نوشاہی، اختر احسن اور اسی طرح کے کئی ایسے شاعر سامنے آئے جن کی نظر میں راشد اور میراجی بھی "آؤٹ آف ڈیٹ" ہو گئے۔ غالباً انہیں دنوں ساقی فاروقی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن چلے گئے۔ لندن سے انہوں نے ادبی مسائل پر ایک مضمون لکھا تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ اس مضمون کے بعض فقرے خاص طور پر قابلِ توجہ تھے۔

"اگر کسی ایسے لمحے سے ملاقات ہو جاتی ہے جس سے پرانے لکھنے والے گزر چکے ہیں اور میرے لیے اس لمحے کو لفظوں میں قید کرنا ناگزیر ہے تو چراغ سے چراغ جلا لیتا ہوں مگر میں اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ ایسی سچائی بھی ملانے کی کوشش کرتا ہوں جسے صرف میں نے محسوس کیا ہو یا کم از کم جسے صرف میں لفظوں کی شکل دینے کا گنہگار ہوا ہوں۔ اس بات کو روایت سے رشتہ سمجھتا ہوں اور اردو کے پرانے لکھنے والوں میں اپنی جڑوں کا سراغ پاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں کائی کی طرح زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"یہ جھوٹ ہے کہ اردو کا لکھنے والا فرانسیسی ادب پڑھ کر لکھنا شروع کر دے یا انگریزی میں لکھنے والا صرف جاپانی ادب پڑھ کر لکھنا شروع کر دے ہر لکھنے والے کا یہ جاننا ضروری ہے کہ اس نے اپنے ادب میں کہاں تک سفر کیا ہے ورنہ اس کا لکھنا بے معنی ہو گا۔ ستاروں کی چال عجیب ہے ملٹن کے بغیر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا تصور محال ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ لکھنے والے نے پہلے اپنا ماضی پہچانا ہو اور اپنے ادب کے بارے میں کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو، دوسری زبان کی طرف چلے جانے میں بھٹکنے کے امکانات زیادہ ہیں اور اگر کسی ادب پر ایسا برا وقت آ پڑے کہ اس کے لکھنے والے دوسری تہذیب میں سانس لینا زیادہ پسند کریں تو بہتر یہاں

آفتاب شمسی

غزل

زخمِ دل سب سے چھپا لیتا اور آنسو پیا
کتنا مشکل نظر آتا ہے ہمیں اب جینا

رات کے ہاتھ میں یوں چاند نظر آتا ہے
جیسے تھامے ہوئے کشکول کوئی نابینا

لفظوں کے راستے سے دل میں اترنے کے لئے
عمر لگ جاتی ہے تب ملتا ہے جا کر زینہ

زندگی اپنی کوئی منظر ہے جیسے دن رات
اشک آنکھوں میں لئے چھیڑ رہی ہو مینا

حسرتوں کو نئے ارمانوں میں کر کے ملبوس
آئینے ہی کو دکھا دیتے ہیں ہم آئینہ

یاد یوں آئی ہے آج اس کی دلاسہ دینے
جیسے غربت میں ملے دوست کوئی دیرینہ

ایک ہی درد سے ملتی رہی تسکین مجھے
ایک ہی درد سے جلتا رہا میرا سینہ

تم جو مرنے کی تمنا میں جیا کرتے ہو
ٹھان لو جی میں تو مشکل بھی نہیں ہے جینا

کے بعد ایک نئی نسل پیدا ہوگی اور بونوں اور باشتیوں کا ادب میں ڈھینگ جائے گا اور ادب کسی رمز آشنا کے انتظار میں اپنی جگہ پر کھڑا رہے گا۔"

"دوسری زبان کا ادب روشنی اسی وقت دکھاتا ہے جب اس کے چراغ پر گرفت مضبوط ہو یہ بات اور مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جب سارتر اور ریوڈ یہ کہہ رہے ہوں کہ ہمارے سوتے خشک ہو چلے ہیں اور ہماری آنکھیں مشرق کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور مشرق انھیں سے خیال اور اسلوب کی بھیک مانگے۔"

ساقی فاروقی ابھی لندن ہی میں مقیم ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "پیاس کا صحرا" چند ماہ پہلے پاکستان سے شائع ہوا ہے میرے نزدیک یہ ان چند مجموعوں میں سے ہے جن میں جدید نظم اور جدید غزل کا تخلیقی اور مثبت تصور ملتا ہے جدید شاعری کے زیادہ تر آج بہت سے ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو صحیح معنوں میں تخلیقی شخصیت نہیں رکھتے ان میں بہت سے ایسے ہیں جو دراصل متشاعر ہیں یہ نیشن و تقلید کا رنگ انھیں ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی اصل شخصیت اور مزاج کو فراموش کرکے صرف نئے شاعر کہلوانے کے لئے اوپری طور پر نئی شاعری کا فارمولا یا نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ ان شعرا کا کلام خواہ اپنے اندر کتنا ہی انوکھاپن رکھتا ہو اس لطف و اثر سے خالی ہوتا ہے جو شاعری کا پہلا اور بنیادی مطالبہ ہے۔ نئی شاعری کے مخالفین انھیں کو مثال کے طور پر پیش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کی شاعری ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے متشاعروں اور مقلدوں سے ادبی تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا ہے یہ ضرور ہے کہ فیشن بدلتے رہتے ہیں۔

ساقی فاروقی نے اپنی جڑیں تلاش کرلی ہیں اور روایت سے ان کا رشتہ مضبوط ہے مگر ان کی شاعری آج کی شاعری ہے۔ رویے کے اعتبار سے بھی اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی انھوں نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں، آزاد نظم کو بھی برتا ہے اور غزلیں بھی کہی ہیں مگر ان تمام اسالیب اور سانچوں میں شاعر کا بنیادی مزاج اور اس کا لہجہ پہچانا جاتا ہے۔ ساقی کی شاعری فرد کے المیے کی شاعری ہے اور جدید دور کے انسان کو ٹوٹتے، بکھرنے اور نئی نئی شکلوں میں جنم لیتے ہوئے اس نے اپنے اندر محسوس کیا ہے۔

میں بال روموں میں تھرک رہا ہوں شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا تھا وہ مر رہا ہے
(نوحہ)

ناچ اے رات کی بانہوں میں سسکتے ہوئے شہر
مرتے جاتے ہیں کلب خار کی مانیں ہوئیں سلب
صبح کی چاپ سے اندھے ہوئے جلتے ہوئے بلب
(کاسنی روشنی)

اور دھوئیں کی شال میں لپٹا شہر سسکتا ہے کہ نہیں
اس پتھر دل کی جھیل میں دل کا کنول اکیلا ہے کہ نہیں
(بس اسٹاپ)

اور غزل کے یہ اشعار دیکھئے۔

میں وہ مردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندوں جیسی
بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا
تو مگر کون سا بادل ہے برسنے والا
سنگ بن جانے کے آداب سکھائے جس نے
دل عجب غنچۂ نورس تھا لچکنے والا

مجھے لگتا ہے یہ دوستوں کی راکھ بکھری ہوئی
میں اس بہار میں یہ راکھ بھی اڑا دوں گا

اب گھر بھی نہیں گھر کی تمنا بھی نہیں ہے
مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن

ترے وصال کی خوشبو سے بڑھتی جاتی ہے
نہ جانے کون سی دیوار درمیاں میں ہے
مگر یہ لوگ بھلا کس لئے اداس ہوئے
یہ کیا طلسم یہ ردوں کی داستاں میں ہے

سائے کے تعاقب میں گنوائی ہے مگر عمر
ہر سمت وہی ایک صدا لے گئی ہم کو

وہ اندھیرا ہے کہ تنہائی سے ہول آتا ہے
سارے بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدا دو کوئی
ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان رسی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

میں آنسوؤں میں بہا بہا ہوا کھڑا ہوں ابھی
تنم جسم کا اندھیرا بلا رہا ہے مجھے

ساقی فاروقی کا یہ مجموعہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ حقیقی معنوں میں جدید شاعروں اور فیشن کے طور پر انوکھی اور بے تکی نظمیں لکھ کر جدید شاعری کا علم اٹھانے والوں کے درمیان امتیاز کی بے حد ضرورت ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں بھی ایسے شاعروں اور نقادوں کا ایک گروہ تھا جو شاعر کو ایسی مشین سمجھتا تھا جس کے اندر صحت مند خیالات، رجائیت

(باقی صفحہ ۱۰۲)

مراسلات

غالب صدی

غالب کی "ڈیڑھ سینٹینری" کے لئے اردو میں عام طور پر "جشن صدسالہ اور "سویں برسی" کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یوم وفات کی تقریبات کو جشن کا روپ دے کر دے دیا جائے لیکن اس کو جشن سے موسوم کرنا صحیح نہیں ہے۔ سویں برسی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اس سے انگریزی کی طرح کئی مطلوبہ مرکبات نہیں بنتے۔ اصل دقت یہ ہے کہ اردو میں انگریزی لفظ "سینٹیری" کے لیے کوئی مفردہ لفظ نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسب ضرورت "پیدائش" اور "وفات" کو جوڑنا اور بھی مشکل ہے۔ ہندی میں بالکل انگریزی طرز پر ترجمے کر لئے گئے ہیں اور شتابدی، جنم شتابدی اور مرن شتابدی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں کیا اچھا ہو کہ اس موضوع پر اردو میں بھی مناسب ترجمے کر لئے جائیں۔

میرے نزدیک "سینٹیری" کے لئے "صدی" کا لفظ آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ "پیدائش صدی" اور "وفات صدی" کی ترکیبیں بظاہر اردو میں میل نہیں کھاتیں لیکن غور طلب ہیں کیونکہ دوسری زبانوں کے مرکبات کے بعض ترجموں میں اصل کی ساخت کو اپنا لینے سے ترکیب کے بدلے ترکیب مل سکتی ہے اور اظہار کے جامع اور مختصر پیرائے ہاتھ آ سکتے ہیں۔

میں "ہماری زبان" کے ذریعے سے یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کے سلسلے میں اگر "وفات صدی" نہیں تو "صدی" کا استعمال متفقہ طور پر جلد از جلد شروع کر دیا جائے مثلاً غالب صدی، غالب صدی تقریبات، غالب صدی کمیٹی اور غالب صدی ایڈیشن وغیرہ اس طرح استعمال کی جو سہولت اور نفاست پیدا ہوگی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (ابو محمد سحر)

غالب کی حیات پر مبنی فلم کی ضرورت

"ہماری زبان" اور دیگر اخبارات کے ذریعہ غالب صدی" کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی تقریبات کے اشتہارات کا یہ چلتا رہتا ہے لیکن یہ بات خصوصاً محسوس کی جا رہی ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری فلم انڈسٹری منور خاموش و غیر متعلق سی ہے حالانکہ فلمی دنیا میں اردو زبان اور خصوصاً غالب کے پرستاروں کی کمی نہیں ہے۔ حکومت ہند اگر غالب کے متعلق دولی ڈاکومنٹری فلم تشکیل دیتی ہے تو اس سے یہ تقاضہ پورا نہیں ہوگا دراصل غالب کی حیات پر مبنی ایک FULL LENGTH فلم کی تشکیل کے ذریعہ ہی فلم انڈسٹری صحیح معنی میں اس "شاعر اعظم" کو خراج عقیدت پیش کر سکتی ہے۔ فلمی دنیا میں چند اہم شخصیتیں ایسی ضرور موجود ہیں جو اس سلسلہ میں ہر ممکن مدد اور معاونت کر سکتی ہیں حکومت ہند کی قائم کردہ "فلم فنانس کارپوریشن" اس فلم کے لئے فنانس مہیا کر سکتی ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر مصنف اختر مرزا نے اعلان کیا تھا کہ وہ غالب سے متعلق فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مرزا جی خواہشمند ہے کہ وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں۔ میرا خیال ہے دلیپ کمار اور مینا کماری سے اگر اختر مرزا صاحب اس سلسلے میں گفتگو کریں تو ان فنکاروں کی ادب نوازی کے پیش نظر یقین ہے کہ یہ دونوں فنکار اس فلم میں بلا معاوضہ کام کرنے کے لئے راضی ہو جائیں گے۔ اس طرح اس فلم کے لئے پرتھوی راج کپور، مراد، دینا، سپرو، جانی واکر، احسن "ارشاد بخش وغیرہ سے بھی برائے نام معاوضہ پر کنٹریکٹ کیا جا سکتا ہے۔ فلم کی کہانی اُرمیلا صاحبہ اختر مرزا صاحب سے تحریر فرمائے ہیں اور جو بحمدہ حال ہی میں غیر ملکی دورہ سے واپس آئے ہیں جہاں انھیں غالب کے متعلق ریسرچ کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا میرا دہ اس فلم کی ڈائرکشن کے لئے بھی موزوں ترین شخص ثابت ہوں گے۔ اس فلم کی موسیقی کسی ایک موسیقار کے سپرد کرنے کے بجائے اگر مختلف موسیقاروں سے ایک ایک نغمہ تخلیق کرا کے (جملہ ہوتو بلا معاوضہ) شامل کیا جائے تو بہتر ہوگا اس سلسلہ میں نوشاد، سچن دیو برمن، مدن موہن، انیل چودھری، خیام اور ہیرا ماسٹر وانس (۷۰۰ ۱۸ ۲؟) کے موسیقاروں میں یونس ملک اور تمام ترہا کا انتخاب موزوں رہے گا۔ غالب کی غزلیں گانے کے لئے معروف گلوکار بیگم اختر اور محمد رفیع کی خدمات حاصل کی جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان فنکاروں کا تعاون حاصل ہو جائے تو ایک معیاری اور کامیاب فلم تخلیق کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ چند سال پیشتر سہراب مودی نے "مرزا غالب" نامی فلم بنائی تھی جو بے حد کامیاب ثابت ہوئی تھی صدر جمہوریہ اعزاز بھی حاصل کیا۔ (شمس الرحمن)

شعراء کے دیوان درکار ہیں

مندرجہ ذیل شعرا کے دیوان درکار ہیں جن شعرا کے زائد دیوان ہیں وہ سبھی درکار ہیں۔ ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس سلسلہ میں میری امداد فرمائیں۔ دیوان قیمتاً بھی لئے جا سکتے ہیں اور دیانتداری سے واپسی کی شرط پر بھی۔ شعرا کے نام یہ ہیں۔

۱۔ سراج الدین خان آرزو اکبرآبادی۔ ۲۔ سید حسن عسکری عرش میر کلو عرش لکھنوی (خلف میر)۔ ۳۔ شیخ محمد جان صاحب شاد لکھنوی (پیر دبیر)
۴۔ خواجہ عشرت لکھنوی۔ ۵۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی۔

اگر کسی صاحب کو پتہ ہو کہ ان شعرا کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ دیوان کس جگہ دستیاب ہو سکتے ہیں یا محض دیکھنے کے لئے مل سکتے ہیں تو اس کی اطلاع بھی دیدیں میں ان کا ممنون ہوں گا۔

(دہری دلیم ہما۔ ل۔ اے)

مرزا غالبؒ کے یوم پیدائش پر درمیانی الکشن نہیں ہوگا

لکھنؤ۔ الکشن کمیشن نے غالب کی صد سالہ تقریبات کمیٹی کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا کہ درمیانی مدت کے انتخابات اترپردیش میں ۱۵ر فروری کو نہ کرائے جائیں کیونکہ اس دن اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کا یوم پیدائش ہوگا۔ اور اس موقع پر غالب صد سالہ کمیٹی تقریبات منائے گی۔ غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی۔ ایس سیٹھی نے آج اپنے ایک اخباری بیان میں اس بات کا اعلان کیا۔ جناب پی۔ ایس سیٹھی جنرل سکریٹری غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی نے اپنے اخباری بیان میں یہ بھی کہا کہ حکومت ہند اس بات پر رضامند ہوگئی ہے کہ ۱۵ر فروری کو ۱۵ پیسے کا مرزا غالب یادگاری ٹکٹ جاری کیا جائے۔ جناب سیٹھی نے کہا کہ کمیٹی نے مرکزی حکومت کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ۱۵ فروری کو عام تعطیل منائی جائے کمیٹی کی اس تجویز پر حکومت ہند غور کر رہی ہے اور یہ معاملہ ریاستی حکومت کے بھی زیر غور ہے جناب سیٹھی نے کہا کہ کمیٹی نے وزارت ریلوے سے کہا ہے کہ آگرہ ریلوے اسٹیشنوں میں سے کسی ایک اسٹیشن کا نام "مرزا غالب" رکھا جائے وزارت ریلوے اس تجویز پر تیزی سے غور کر رہی ہے۔ (قومی آواز)

آگرہ میں غالب کا مکان قومی یادگار بنایا جائے

بنارس۔ غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی اترپردیش نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور گورنر یو پی ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی سے یہ درخواست کی ہے کہ آگرہ میں مرزا غالب کے مکان کو حکومت حاصل کرکے اسے قومی یادگار بنادے۔ غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی اترپردیش کے جنرل سکریٹری جناب پی ایس سیٹھی نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ گورنر یوپی نے اپنے حالیہ دورہ آگرہ کے دوران مرزا غالب کے مکان کے سلسلے میں ضلع حکام سے بات چیت کی۔ انھوں نے کہا کہ اکتوبر میں غالب کی غزلوں پر طلبہ اور طالبات کا ایک شعری مقابلہ غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کے زیر اہتمام ہوگا۔ اور ایک خواتین کا غالب کی طرح پر مشاعرہ بھی اس سلسلے میں ہوگا لکھنؤ میں یا بنارس میں غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کا اجلاس نومبر میں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ دسمبر میں کانپور میں غالب کی شاعری پر ایک سمینار ہوگا جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے ممتاز عالم شرکت کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ستمبر میں فرقہ واریت کے خلاف ایک کل ہند کنونشن لکھنؤ میں ہوگا جس میں ممتاز ادیب اور شاعر شرکت کریں گے۔ (قومی آواز)

سرکاری ریاستی غالب کمیٹی کے عہدیداران نامزد

لکھنؤ۔ مرکزی غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کے نائب صدر اور اترپردیش میں سرکاری یادگاری کمیٹی قائم کرنے کے لئے مجاز پنڈت آنند نرائن ملا (ایم۔ پی) نے ریاستی کمیٹی کے عہدیداروں کو نامزد کردیا ہے۔ ریاستی غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کے صدر گورنر یو پی ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نامزد کئے گئے ہیں اور نائب صدر مقبول احمد لاری ہیں جو آل انڈیا میر اکاڈمی کے صدر ہیں۔ ریاستی کمیٹی کے جنرل سکریٹری لکھنؤ کے میئر ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ ایس سدھو نامزد کئے گئے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ مرکزی غالب کمیٹی کی طرف سے اترپردیش میں سرکاری (ریاستی) غالب کمیٹی بنانے کے لئے ملا صاحب کو (جو مرکزی غالب کمیٹی کے نائب صدر بھی ہیں) مجاز کیا گیا ہے اس سلسلے میں ملا صاحب نے ایک ماہ قبل یہاں ایک اجتماع میں بتایا تھا کہ ریاستی کمیٹی کے لئے وہ جلد ہی عہدیداروں کو نامزد کریں گے۔ مرکزی کمیٹی کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن ملا سے یہاں موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق گذشتہ ہفتے دلی میں تین عہدیداروں کو صدر گورنر یوپی ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نائب صدر جناب مقبول احمد لاری اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر ایم ایم ایس سدھو کو نامزد کیا ہے۔ ان عہدیداروں کے علاوہ ریاستی کمیٹی کے ممبران بھی نامزد کئے جائیں گے اور یہ ممبران ریاست کے مختلف حصوں اور اہم شہروں اور حلقوں سے ہوں گے۔ پتہ چلا ہے کہ ملا صاحب جو اس وقت لوک سبھا کے اجلاس کی وجہ سے دلی میں قیام پذیر ہیں جلد ہی یہاں واپس آکر اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں گے۔ (قومی آواز)

روس میں غالب کی سوویں برسی منانے کی تیاریاں

ہندوستان کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سوویں برسی ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء کو منائی جائے گی شاعر کے اپنے وطن کی طرح سوویت یونین میں بھی اس کی تیاریاں جاری ہیں روس میں سائنسوں کی اکاڈمی کے ایشیائی اقوام کے انسٹی ٹیوٹ نے ایک خاص تیاری کمیٹی قائم کردی ہے کمیٹی کے لئے منتخب کئے جانے والے عالموں اور ادیبوں نے اس تقریب کے لئے ابھی سے ہی ایک پروگرام تیار کرلیا ہے سوویت ادیبوں نے ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کا سال قرار دیا ہے اور یہ منصوبہ بنایا گیا ہے کہ اس سال غالب پر اور بھی زیادہ کتابیں شائع کی جائیں۔ ان کی غزلوں کے اور بھی زیادہ ترجمے ہوں اور کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر ادبی تصنیفات کا انتظام کیا جائے۔ گذشتہ اکتوبر سے سوویت یونین میں مرزا غالب کی سویں برسی کے سلسلے میں بننے والی کمیٹی شاعر کی تصانیف پر مزید تحقیقی کام کو بڑھاوا دینے ان کی غزلوں کے ترجمے کرانے اور ان سے متعلق مواد تیار کرانے کا کام بڑے پیمانے پر کر رہی ہے جو ماسکو نیز دوسرے سوویت شہروں سے شائع کیا جائے گا کمیٹی کی سرگرمیوں کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس نے مختلف ملکوں میں ایسے عالموں اور ادیبوں سے رابطہ قائم کیا ہے۔ جو غالب کی زندگی اور تصانیف پر کام کر رہے ہیں ہندوستانی کمیٹی کی درخواست پر بعض ممتاز سوویت مستشرقوں کے مقالے ہندوستان

بھیجے جا رہے ہیں۔ ان میں پروفیسر دیاکوف اور پروفیسر ایپوف (؟) میں ہندوستانی فوجی بغاوت کی تاریخ دار ڈائری "مرزا غالب کی دلی ڈائری دستنبو"، پروفیسر گوروون پونکا یا "مرزا غالب کے سماجی، سیاسی، فلسفیانہ اور جمالیاتی تصورات"، پروفیسر علی شیف "غالب اور ۱۹ ویں صدی میں ہندوستان کی ادبی زندگی" نیز دوسرے لوگوں کے مقالات شامل ہیں۔ سوویت روس میں موقع پر غالب کے بارے میں مضامین کا جو مجموعہ شائع ہوگا اس میں سوویت اور غیر ملکی دونوں مستشرقین کے مقالے شامل ہوں گے۔

سوویت کمیٹی روسی اشاعتوں کے سلسلے میں بہت مصروف ہے یہ بھی ہے کہ ہندوستانی علما کو خاص مدت کے لئے مدعو کیا جائے تاکہ وہ سوویت مستشرقین کے کام میں مدد دے سکیں۔ ہندوستان کے عظیم شاعر غالب کی شاعری سے محبت کا جذبہ سوویت اور ہندوستان کے درمیان [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے (رسالہ [illegible])

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام

غالب کے صد سالہ جشن کی تقریبات

علی گڑھ، ہندوستان کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ء میں بڑے پیمانے پر پورے ملک میں اور بیرونی ممالک میں منائی جا رہی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی اس صد سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے صدر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جناب محمد [illegible] اور [illegible] پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اردو مقرر کئے گئے ہیں۔ کمیٹی کے دیگر اراکین میں یونیورسٹی کے [illegible] ڈاکٹر [illegible] شعبہ ہندی کے صدر پروفیسر [illegible] شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر مختار الدین احمد، شعبہ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر منیب الرحمن کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ یونیورسٹی کی اس کمیٹی نے ان تقریبات کے سلسلے میں جو پروگرام بنایا ہے اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

[illegible] کی ہیں۔

۱۔ غالب کی اردو شاعری اور اردو نثر کی عظمت۔ تنقید مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور

مضامین: غالب کی فکر — ڈاکٹر وحید اختر

غالب کا فن — پروفیسر اسلوب احمد انصاری

غالب کی اردو نثر — ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

اردو ادب پر غالب کا اثر — پروفیسر آل احمد سرور

۲۔ غالب کی فارسی شاعری کا انتخاب مع مقدمہ۔ نگراں ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ غالب کے اردو خطوط کا انتخاب (اردو اور دیوناگری رسم خط میں) پروفیسر آل احمد سرور

۴۔ غالب کے کسی غیر مطبوعہ یا نایاب رسالہ کی ترتیب۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد

۵۔ حیات غالب پر ایک ڈرامہ۔ ڈاکٹر منیب الرحمن

۶۔ غالب کی منتخب اردو اور فارسی شاعری کا انگریزی ترجمہ۔ پروفیسر آل احمد سرور

ان مجوزہ کتابوں کے علاوہ یونیورسٹی کمیٹی کے زیر اہتمام فروری ۶۹ء میں ایک سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔ غالب کی تصانیف اور غالب پر تصانیف کی ایک نمائش کی جائے گی، فرحت اللہ بیگ کا یادگار مشاعرہ اسٹیج کیا جائے گا۔ غالب ببلوگرافی جو شعبہ اردو مرتب کر رہا ہے پیش کی جائے گی اور ایک کل ہند مشاعرہ کیا جائے گا۔

یونیورسٹی کے علمی مجلے "فکر و نظر" کا ایک خاص نمبر شایع کیا جائے گا اور علی گڑھ میگزین کا ایک شمارہ ان مضامین پر مشتمل ہوگا جو غالب کی حیات اور شاعری پر علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ لکھیں گے۔

صد سالہ تقریبات کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی غالب وظائف ہیں ان وظائف میں سے ایک وظیفہ (ڈھائی سو روپیہ ماہوار) اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اور ایک وظیفہ (سو روپیہ ماہوار) ایم اے (اردو) کے طالب علم کو دیا جائے گا۔ ایک وظیفہ (سو روپے ماہوار) ایم۔ اے (فارسی) کے طالب علم کو بھی دیا جائے گا۔ ان وظیفوں کی مدت دو سال ہوگی۔

غالب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں یونیورسٹی کی طرف سے مندرجہ بالا تقریبات منانے کے لئے اور غالب وظائف کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک معقول رقم منظور کی ہے۔

(شہریار پبلسٹی اینڈ پبلیکیشنز انچارج شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

گوالیار میں غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی تشکیل اور صوبائی کمیٹی سے الحاق

صوبائی۔ گوالیار ضلع میں باقاعدہ غالب صد سالہ تقریبات کمیٹی کی تشکیل عمل میں آگئی ہے۔ اس کا الحاق صوبائی کمیٹی سے عمل میں آگیا ہے گوالیار کمیٹی نے اپنا دائرہ ملحقہ علاقوں بھنڈ، مورینا، شیوپوری، گنا اور [illegible] تک بڑھا کر وسیع کر دیا ہے اور ان علاقوں کے علم دوست حضرات بھی اپنے اپنے علاقوں میں اردو کے اس عظیم شاعر کے شایان شان کمیٹیاں تشکیل دینے اور پروگرام بنانے میں مصروف ہیں۔ گوالیار کمیٹی کے زیر اہتمام غالب لائبریری کی تشکیل، غالب پر ببلوگرافی اور دوسرا علمی کام زیر تکمیل ہے کمیٹی نے یہ بھی ذمہ داری لی ہے کہ وہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کامل میں جو طالب علم غالب کا خصوصی پرچہ لیں گے انھیں وہ کتب فراہم کرے گی۔ اس طرح غالب پر ایک جامعہ لائبریری کی تشکیل بھی عملاً ممکن ہوگی۔ کمیٹی میں سرکردہ شہری، ممتاز ادبا و شعرا، دانشور، اساتذہ اور سماجی و سیاسی رہنما شریک ہیں۔ اس کے کنوینر اسلام الدین صاحب قریشی نائب معتمد انجمن ترقی اردو گوالیار جو کہ پنچایت ویلفیر ڈپارٹمنٹ میں ڈپٹی ڈائرکٹر [illegible] لائبریرین بھی ہیں سرگرمی کے ساتھ پروگرام کو عملی جامہ

پہنانے میں مصروف ہیں دیگر اراکین میں قاضی ریاض الدین انصاری سرپرست انجمن ترقی اردو گوالیار، محترمہ پربھا جوہری ڈائرکٹر ہیلتھ سروس گورنمنٹ آف انڈیا، محترمہ فاطمہ بیگم، پروفیسر حسین نقمی، جناب ردوریان جی، پروفیسر دشو داسوانی، جناب مدن بھٹناگر، جناب ہیم چند ماتھر چیرمین سہکاری بھنڈار، جناب پریم چند کشپ سوز سابق ایم۔ایل۔اے، ڈاکٹر کومل سنگھ سولنکی، ڈاکٹر لکشمی چند گپتا، ڈاکٹر جگدیش سلیل، پروفیسر مبارک علی خاں (گورنمنٹ میوزک کالج)، جناب ذوار احمد صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو گوالیار، جناب گنگا پرشاد اپادھیا، محترمہ نادرہ سلطان، جناب سنتوش نگم، جناب رؤف محمد خاں، جناب نثار دیدی، جناب کاشی ناتھ گپتا سینئیر جیواجی یونیورسٹی کورٹ شامل ہیں۔

(نامہ نگار)

برطانیہ میں بچوں کے لئے اردو تعلیم کا مطالبہ

لنڈن یہاں رہنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو یہ شکایت ہے کہ چونکہ ان کے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں ہندی اور اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی اس لئے آئندہ زندگی میں انھیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی ایک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہتے ہیں جو شہر کے تعلیمی حکام کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرے گی۔ مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نصاب میں ہندی اور اردو کے مضامین کو بھی شامل کیا جائے۔ یہ تجویز ایک اسکول ٹیچر جناب ایس اے۔ اے چھباری نے پیش کی ہے جو لنڈز کے مسلمانوں کی کونسل کے صدر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گو یہ بچے گھروں میں ہندی اور اردو بولتے ہیں لیکن اگر انھیں اسکول میں ان مضامین کی تعلیم نہ دی گئی تو وہ اپنی مادری زبان پر موثر قسم کا عبور حاصل نہیں کرسکیں گے جناب چھباری نے کہا کہ ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں جب یہ بچے ہندوستان یا پاکستان واپس گئے تو وہ اپنے رشتہ داروں سے ہندی یا اردو میں روانی سے بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ ان کے بچوں کو اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی، تاکہ وہ ہندو اور اسلامی اصطلاحات سے واقف ہوسکیں جناب چھباری نے جو مسائل اٹھائے ہیں ان پر لیڈز کے افسر تعلیم جناب شیلڑے رائے زنی کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے والدین مجھ سے ملنا چاہیں تو میں بڑی خوشی سے ان کی باتیں سننے کے لئے تیار رہوں گا۔

(قومی آواز)

ناٹنگھم میں برطانیہ کی پہلی اردو لائبریری کی سالگرہ کا جشن

ناٹنگھم۔ ناٹنگھم میں برطانیہ کی پہلی اردو لائبریری کی سالگرہ کے جشن کا افتتاح کرتے ہوئے اس کے لائبریرین جناب ایم۔ اے حبیب نے کہا کہ جب لائبریری کا آغاز کیا گیا تھا تو بعض یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ لائبریری برطانیہ کے باشندوں اور تارکین وطن میں ایک علیحدگی پسندی کے رجحان کو فروغ دے گی لیکن اس کی کارکردگی نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ احساس باطل تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس لائبریری نے برطانیہ کے باشندوں اور تارکین وطن کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے چنانچہ آجکل تقریباً پچاس آدمی اس لائبریری میں اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس میں معلم منصف حفظان صحت کے افسران، گھریلو عورتیں اور سول سرونٹس شامل ہیں انھوں نے کہا کہ لائبریری کی ابتدا ایک ہزار کتابوں سے کی گئی تھی لیکن اب یہ تعداد سہ گنا ہوگئی ہے اس کے ممبروں کی تعداد اب تقریباً ڈھائی سو ہوگئی ہے یہ لائبریری برطانیہ کے دوسرے حصوں میں اردو کے فروغ کا باعث ہوئی ہے چنانچہ برطانیہ کے مختلف حصوں میں اس قسم کی اردو لائبریری کے قیام کی کوششیں ہو رہی ہیں پورے ملک میں کتابیں فراہم کی جارہی ہیں نیز اسپتالوں میں مریضوں کو بھی کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ جناب ایم۔ اے حبیب نے کہا کہ اب اس کی ضرورت شدید طور پر محسوس کی جارہی ہے کہ برطانیہ کے اسکولوں میں بھی اردو تعلیم کی سہولتیں ملیں اور مہاجرین کے بچوں کو اردو کی تعلیم ملے۔

لائبریری کے سالانہ جشن پر ممبر پارلیمنٹ اور دولت مشترکہ کے امور کے انڈر سکریٹری جناب ولیم وہٹلاک جو آج کل اسپتال میں ہیں باوجود اپنی علالت کے اس اردو لائبریری کے فروغ و ترقی کے لیے اپنی نیک خواہشات بھیجی ہیں موصوف کے پیغام کو جلسہ میں ان کی اہلیہ نے پڑھ کر سنایا اردو لائبریری ناٹنگھم کے اس جلسہ میں جناب جیک ڈڈسٹ ممبر پارلیمنٹ، جناب مائیکل انگلش اور پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب افضل اقبال بھی موجود تھے مسز ایس۔ ے بارگسٹ چیرمین شہری کونسل نے ہندوستانی پاکستانی بچوں کو جو انگریزی پڑھ رہے ہیں انعامات تقسیم کئے۔

(بہ شکریہ ایوننگ پوسٹ ایڈ نیوز لندن)

ناٹنگھم میں اردو لائبریری کی سالگرہ کے موقع پر ہائی کمشنر ہندوستان متعینہ لندن کا پیغام

ناٹنگھم میں برطانیہ کی پہلی اردو لائبریری کی سالگرہ کے جشن پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کے ہائی کمشنر متعینہ لندن جناب ایس ایس دھون نے یہ پیغام بھیجا ہے۔ "مجھے نہایت مسرت ہے کہ میں ناٹنگھم میں اردو کتاب خانہ کے افتتاح کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنی مبارکباد بھیج رہا ہوں۔ اردو کا شمار ہندوستان کی اہم زبانوں میں ہوتا ہے اور ہندوستان کے دستور اساسی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کی ایک بھاری اکثریت کی مادری زبان اردو ہے۔ ہندوستان

نے اردو نظم و نثر کے معروف صاحب قلم پیدا کئے ہیں جیسے غالب، ذوق، برج نرائن چکبست، رتن ناتھ سرشار، داغ، تلوک چند محروم، میر، سودا، اقبال، انیس، سوہن سنگھ جوشی، فراق، انوش وغیرہ اور یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے اردو ایک طاقتور زبان ہے اور اس کی قوت بیانیہ دنیا کی دوسری اہم زبانوں کے ہم پلہ ہے سب سے بڑھ کر اردو ہمارے عظیم ہمسایہ ملک کی سرکاری زبان ہے اور اس وجہ سے ہند و پاکستان کے درمیان ثقافتی رابطہ کا کام دیتی ہے۔

اس مبارک موقع پر میں نوشہم کی اردو لائبریری اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے افراد و جماعت کو اپنی تبریکات اور نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔"

(ایم اے۔ حبیب)

لسانی اقلیتوں اور اردو کے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت سے اتفاق
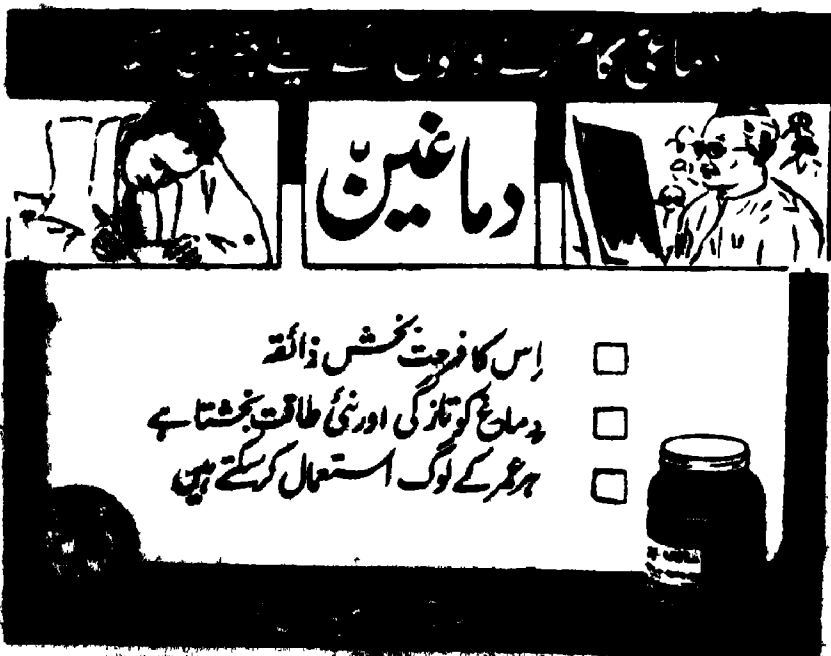
حیدرآباد ریاستی وزیر تعلیم جناب پی وی نرسمہا راؤ نے لسانی اقلیتوں پر تین سے زائد زبانوں کے موجودہ بوجھ اور اس سلسلہ میں حائل دشواریوں کی یکسوئی سے غور و فکر اور ٹھوس فیصلہ کو ضروری قرار دیا اور انکشاف بھی کیا ہے کہ ریاست اس سلسلہ میں مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے رہی ہے وزیر تعلیم نے اولڈ بوائے طلبہ کمیٹی چھاؤنی نادر علی بیگ کی جانب سے کل شام ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں ماہرین تعلیم پر زور دیا کہ وہ لسانی فارمولہ کو اقلیتوں کے لئے بھی قابل عمل بنانے کی تدابیر پیش کریں وزیر تعلیم نے اردو سے متعلق مسائل کو حل کرنے کی ضرورت سے اتفاق کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اختیار کردہ پالیسی پر موثر عمل آوری کو ممکن بنانے کا تیقن بھی دیا۔ انھوں نے اردو کو کسی مخصوص مذہب سے وابستہ کرنے کی موجودہ ذہنیت سے سخت اختلاف کرتے ہوئے لسانی امور میں مذہب کا سوال ہی نہیں کیا جانا چاہئے اردو سے اپنے تعلق و وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بیان کیا کہ وہ زمانہ طالب علمی میں اردو میں ہمیشہ امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے ہیں اور اس زبان پر ان کا گہرا عبور ہے۔ وزیر تعلیم نے بتایا کہ تلگو کو نظم و نسق کی زبان بنانے میں حائل دشواریوں کو دور کیا جا رہا ہے۔ وزیر تعلیم نے انگریزی بات چیت اور تعلیم کے موجودہ رجحان کو "جنون" قرار دیا کہ ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کو فروغ دیا جانا چاہئے انھوں نے اردو مسائل کے سیاسی استحصال اور جذبات کو بھڑکانے والی تحریکوں پر اپنی شدید ناپسندیدگی ظاہر کی اس ریاست میں تلگو کے علاوہ اردو کی ترویج کے مواقع بھی حاصل رہیں گے

(الجمعیۃ)

ناگارجنا ساگر میں اردو مدرسہ کا قیام

نلگنڈہ دو جے پورہ شمالی ناگارجنا ساگر)۔ ناگارجنا ساگر پراجکٹ پر اردو کے پہلے مدرسہ کا قیام عمل میں آیا ہے اور تعلیم بھی شروع ہو چکی ہے۔ اس وقت اس مدرسہ کے طلبہ کی تعداد (۴۰) ہے اردو کی متواری جماعتیں پیلان بازار کے سنٹرل پرائمری اسکول بلاک (۱۵) میں قائم ہوئی ہیں۔ بزم کے معتمد عمومی نے پیلان کالونی اور ہل کالونی کے اردو دانوں سے ان کے بچوں کو اس مدرسہ میں شریک کرنے کی خواہش کی ہے انھوں نے کہا کہ اگر طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو آئندہ سال بزم اردو مدرسہ کے لئے علیحدہ عمارت کی کارروائی شروع کر دے گی۔

فانی بدایونی کے مزار کی مرمت و تعمیر کی اپیل

حیدرآباد۔ مقامی ادبی تنظیم "بزم صبا" نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال فانی کی ۲۷ ویں برسی کے موقع پر ان کے مزار کی مرمت اور شایان شان یادگار تعمیر کی جائے شوکت علی خاں فانی کا مزار یہاں یوسف صاحب شریف صاحب کی مشہور درگاہ میں ہے ۲۷ برس پہلے ۲۸ راگست کو ان کا حیدرآباد میں ۹ برس کے قیام کے بعد انتقال ہوا تھا۔ بزم صبا نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ مزار کی مرمت اور تعمیر نہ کی گئی تو اس کا حشر بھی میر، ذوق اور دوسرے بڑے اردو شاعروں کی آخری یادگار بعض کی طرح ہوگا۔

(قومی آواز)

ہندوستانی زبانوں میں اردو اخبارات کی تعداد دوسرے نمبر پر

نئی دہلی۔ ملک میں اخبارات اور دیگر پرچوں کی تعداد میں ۱۷ اور اشاعت میں تقریباً دو لاکھ کا اضافہ ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ یہ بات اخبارات کے رجسٹرار کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۶۷ء میں بتائی گئی ہے۔ رپورٹ پارلیمنٹ میں وزیر اطلاعات و نشریات کے سامنے پیش کی ۱۹۶۷ء میں ہندوستانی اخبارات میں ۶۴۲ روزنامے، ۹۹ سہ روزہ اور ۲۰۷۵ دیگر پرچے تھے ہندی اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۲۲۰۷ رہی اس کے بعد انگریزی کے اخبارات ۱۹۵۸ء ان کے بعد اردو کے اخبارات (۸۴۴) کا نمبر رہا۔

مکتوب بھوپال

اردو میں ایم اے کرنے سے طلبہ کی دلچسپی۔ بھوپال۔ اس برس ایم۔ اے اردو میں طلبہ نے داخلہ لینے میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ اس وقت تک صرف بھوپال کے کالجوں میں ۹۴ طلبہ داخلے لے چکے ہیں حمیدیہ کالج لکشمی بائی گرلز کالج اور سیفیہ کالج میں ایم۔ اے تک اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ یہ تعداد گذشتہ دس سال میں سب سے زیادہ ہے صرف حمیدیہ کالج میں اس برس ۲۲ طلبہ نے داخلہ لیا جبکہ لکشمی بائی گرلز کالج میں ۱۵ طالبات کے اور سیفیہ میں ۲، داخلے ہوئے ان سب کالجوں میں بی۔ اے میں بھی تقریباً چار سو طلبہ و طالبات نے اردو کو بحیثیت اختیاری مضمون کے لیا ہے۔

غالب پر طرحی مشاعرے۔ بھوپال میں ادارہ تجدید ادب، جو کہ گذشتہ دو سال سے بڑی کامیابی کے ساتھ ہر ماہ طرحی مشاعرہ کرتی رہی ہے اس نے اس پورے سال کو "یادِ غالب" کا نام دے کر غالب کی کسی غزل کے مصرع کو بطور طرح دے کر مشاعروں کا اہتمام کیا ہے ویسے نومبر ۲۰واں مگر اس سلسلہ کا پانچواں مشاعرہ انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے جنرل سکریٹری جناب آفاق احمد کی صدارت میں ہوا جس میں ۴۲ شعرا نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا مصرع طرح تھا: "پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

انجمن ترقی اردو جبلپور بھی اس پورے سال ہر ماہ غالب کی غزل کا مصرع دے کر طرحی مشاعرہ کرنے کا اعلان کر چکی ہے اور ابھی تک کامیابی کے ساتھ تین مشاعرے کر چکی ہے۔

علامہ اقبال پر توسیعی لیکچرز۔ لکشمی بائی گرلز کالج میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے توسیعی لیکچرز کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس کا پہلا لیکچر جناب ممنون حسن خاں نے علامہ اقبال پر دیا۔ ممنون صاحب اقبال کے بھوپال میں قیام کے دوران کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ آپ نے کلام اقبال کی مشکلات اور ان کے حل پر تقریباً ایک گھنٹہ تک روشنی ڈالی آپ نے اقبال کے بارے میں کہا کہ علامہ ایک ذہنی اور شعوری انقلاب کے متمنی تھے۔ وہ ایک شاعر، فلسفی، ایک حکیم، ایک دانائے راز تھے۔ انھوں نے غلام آباد میں آزادی کے گیت گائے نوجوانوں کے کردار کی تکمیل کی ضرورت کو سمجھا اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو ابھارا۔

اندور گرلز کالج میں اردو کا مطالبہ۔ مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے آفس سکریٹری جناب حسنات صدیقی نے وزیر تعلیم کو ایک خط لکھا ہے جس میں اندور گرلز کالج میں اردو کو بحیثیت ایک مضمون شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی نقول سکریٹری ایجوکیشن اور نائب وزیر تعلیم کو بھی ارسال کی گئی ہیں۔ اس سے قبل اندور انجمن ترقی اردو کے صدر جناب ابو الحسن سلیم بھی ایک میمورنڈم کے ذریعہ وزیر تعلیم سے یہ مطالبہ کر چکے ہیں۔

(نامہ نگار)

اردو گھر فنڈ

۱۱؍ اگست ۱۹۶۸ء سے ۳۱؍ اگست ۱۹۶۸ء تک

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	وصولی کیفیت
۱	بیگم انیس قدوائی	۱۰۰/-	چیک	خود
۲	قیصر جہاں صاحبہ شیر پور	۱۰۰/-	منی آرڈر	خود
۳	شریف احمد صاحب دہلی	۵/-	چیک	معرفت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۴	کندن لال صاحب دہلی	۵/-	″	″
۵	انور کمال حسینی صاحب دہلی	۵/-	″	″
۶	سید اطہر حسین صاحب نقوی دہلی	۵/-	″	″
۷	نفیس جہاں صاحبہ دہلی	۵/-	″	″
۸	سید حامد حسین صاحب خضر دہلی	۵/-	″	″
۹	کرشن چندر شرما صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۰	لارنس پال صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۱	محمد ارشاد صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۲	علاء الدین عباسی صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۳	اونکار سنگھ ورک صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۴	ڈاکٹر قمر رئیس صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۵	زبیر رضوی صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۶	قاضی المظفر احمد صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۷	بلراج کومل صاحب دہلی	۲۵/-	″	″
۱۸	محمود ہاشمی صاحب دہلی	۵/-	″	″
۱۹	عبد العلی خاں صاحب بیجاپور	۲۵/-	منی آرڈر	″
۲۰	شریف الحسن عثمانی صاحب لکھنؤ	۲/-	″	″
۲۱	معرفت مس عبد سلطان صاحبہ دہلی سے	۵۰/-	چیک	تفصیل آئندہ
۲۲	منشی محمد علیم الدین صاحب بگڈاہرا	۱/-	منی آرڈر	خود
۲۳	عبد الرزاق صاحب بمبئی	۱۰/-		″

سابق میزان Rs ۲۸۹۵

کل میزان Rs ۳۲۸۳/-

صفحہ ۶ سے آگے

سماجی شعور اور اس طرح کی چیزیں ڈال دینے سے اچھی اور ترقی پسند شاعری برآمد ہو جاتی ہے آج جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شہری زندگی کا کرب، صنعتی دور کے انسان کی تنہائی، ناآسودگی خوف، احساس شکست وغیرہ کو اوپر سے اس مشین میں ڈال دیں تو جدید شاعری بن جائے گی وہ دراصل ادبی تخلیق کے سلسلے میں رویّے اور طریق کار کے اعتبار سے ایسے سطحی ترقی پسندوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ میں فارمولے والے جدید شاعروں کو بھی اس مشینی قسم کے ترقی پسندوں اور تحریک زدہ شعرا کی ہی اولاد سمجھتا ہوں یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ سب سے زیادہ اپنے انھیں اجداد سے برہم ہیں اور ان کے اجداد کو بھی دن رات انھیں کا غم ستاتا رہتا ہے۔

[illegible] پرنٹر پبلشر [illegible] لیتھو پریس میں چھپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R-N-2/86/56

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

REGD NO-L922

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۲۷ . شمارہ ۳۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر

اردو گھر کے لیے چندے کی مہم شروع ہوگئی ہے۔ مجلس عام کے ممبران نے اپنے کوٹے کے کچھ عطیات بھیجنے شروع کر دیے ہیں۔ براہ راست جنرل سکریٹری کو بھی چندے وصول ہو رہے ہیں اور ہر پندرہ دن کے بعد ہماری زبان میں تمام چندوں کا اعلان بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ بہت سے خریدار اور دوسرے ادب نواز حضرات چندہ کرنے کے لیے رسیدوں کی کتابیں طلب کر رہے ہیں۔ ان کی دل شکنی کسی طرح منظور نہیں مگر اتنے بڑے چندے کی مہم اور کام کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے فی الحال رسیدیں صرف مجلس عام کے ممبروں اور ریاستی شاخوں کے عہدہ داروں کو ہی بھیجی جا رہی ہیں تاکہ حسابات کی چیکنگ میں آسانی ہو۔ اگر بعض افراد کو رسیدوں کی کتابیں جائیں گی تو یا تو جنرل سکریٹری کی ذاتی ذمہ داری اور واقفیت کی بنا پر یا ریاستی شاخوں کے عہدہ داروں کی وساطت سے۔ اس کے علاوہ کوئی طریقۂ کار مناسب نہیں ہے۔

ہم نے تمام حالات پر غور کرتے ہوئے صرف عوام کے بھروسے پر چندے کی یہ تحریک شروع کی ہے۔ حکومت سے ہم نے ضرور امداد کی درخواست کی ہے مگر یہ ہمارا حق ہے اور ہم اس حق سے دست بردار نہیں ہو سکتے مگر ہماری اپیل کسی وزیر، کسی سرمایہ دار، کسی سیاسی رہنما کے سہارے پر نہیں ہے ہم سب کے پاس جائیں گے، مگر دراصل ہمارا خطاب عوام سے ہے۔ ہمیں چندے کی رقم سے اتنی غرض نہیں جتنی زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے، انہیں اردو گھر کی تعمیر میں شریک کرنے، ان کا اردو گھر پر حق رکھنے سے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو دوست ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور ڈیڑھ مہینے میں ہمیں جو ردّ عمل محسوس ہوا ہے وہ ہماری ہمت افزائی کا باعث ہے۔ ہماری زبان کے خریداروں سے ہماری خاص طور پر درخواست ہے کہ وہ براہ راست جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند اپنا عطیہ بھیجیں۔ بڑی رقم کی فکر نہ کریں جو رقم سہولت سے بھیج سکیں بھیج دیں قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے۔ پانچ لاکھ کی رقم ویسے تو بہت معلوم ہوتی ہے مگر سارے ملک میں اردو دوستوں کی پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہے ہمیں توقع ہے کہ دسمبر کے آخر تک یہ رقم جمع ہو جائے گی۔

آل انڈیا غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کی عاملہ کے ۱۱ ممبران نامزد

نئی دہلی۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے آل انڈیا غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کی مجلس عاملہ میں ملک کے اردو کے ۱۱ ممتاز سرپرستوں اور عالموں کو نامزد کیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی تقریبات کمیٹی کی چیرمین ہیں۔ نامزد شدہ افراد میں سے جن کے نام حسب ذیل ہیں: دہلی کے لفٹننٹ گورنر مسٹر اے۔ این جھا مسٹر ایس۔ ایس دسنوی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی بیگم حمیدہ سلطان۔ پروفیسر ایم۔ مجیب۔ اور مسٹر رنبیر سنگھ ہیں۔ آل انڈیا غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کے ایگزیکیوٹو سکریٹری مسٹر انصار ہروانی نے بتایا کہ غالب صدسالہ تقریبات ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء سے ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء تک منائی جائے گی۔

(قومی آواز)

گلشن ہمیشہ بہار شائع ہوگیا

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ نصر اللہ خاں خویشگی کا تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار شائع ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ "گلشن بے خار" کے جواب میں نصر اللہ خاں خویشگی نے لکھا تھا اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا اور اب نایاب تھا۔ اب کراچی یونیورسٹی کراچی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اسلم فرخی نے اسے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ اس تذکرہ میں ۴۱۹ شاعروں کے حالات ہیں اور مرتب نے جا بجا حواشی لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے قیمت آٹھ روپے ہے اور مشتاق بک ڈپو شلڈن روڈ کراچی مغربی پاکستان سے مل سکتا ہے۔

(نامہ نگار)

سائے کا سفر

ادبی حلقوں میں یہ خبر پڑھ کر مسرت ہوگی کہ نوجوان افسانہ نگار عوض سعید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سائے کا سفر" عنقریب شائع ہوگا۔ (نامہ نگار)

میرا وارڈ کے لیے اردو کتابیں مطلوب

گلشن ۱۹۶۶ء کی بہترین غزلیں، دلی، تاریخ ادب تنقیدی اردو کتاب

اور ستری مطبوعات پر میرا ایوارڈ ساڑھے بارہ سو روپے پیش لیا جائے گا۔ ہر کتاب کی پانچ جلدیں ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء تک جنرل سکریٹری آل انڈیا میرا اکاڈمی، لاری ہاؤس، لکھنؤ کے پتے پر پہنچ جانی چاہئیں۔ اکاڈمی کی طرف سے ۶۷-۱۹۶۶ء کے لئے تین سو ساٹھ روپے کے چھے ادبی وظیفے بھی جاری کئے گئے ہیں جو تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنؤ کاشی رام چاولا لودھیانہ، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کلکتہ، شمیم کرہانی دہلی، حرم محمد آبادی کلکتہ، نذیر بنارسی وارانسی کو دئے گئے ہیں ۶۹-۱۹۶۸ء کے لئے ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام بھیجے جا سکتے ہیں جنھوں نے اردو کی خدمت کی ہے اور جن کے قلم نے قومی یک جہتی کو تقویت پہنچائی ہے۔

(سکریٹری)

عظیم اور لازوال

مندرجہ بالا عنوان سے رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورئنٹل اسٹڈیز نے چینی مفکر لاؤتسزا، لاطینی سیکار، ہندی گوتم بھرتری ہری، جرمن نتشے فرانسیسی کامیو، نارڈی ہیر شیلڈ، لبنانی جبران اور اقبال اور رشید احمد صدیقی کے افکار ایک لڑی میں پرو کے پیش کئے ہیں۔ رشید صاحب کی مختلف تحریروں سے انتخاب کیا ہے اور بقیہ کا ترجمہ انگریزی اور عربی سے کیا گیا ہے۔ تقریباً نوے صفحے کی بڑے سائز کی کتاب ہے کتاب عابد رضا بیدار نے ترتیب دی ہے اس میں حاشے کی چیز تین ڈائریاں کامیو، اقبال اور ہیر شیلڈ کی ہیں

(نامہ نگار)

فراق گورکھپوری علیل

الہ آباد۔ یکم ستمبر اردو کے ممتاز شاعر فراق گورکھپوری امراض قلب میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ڈاکٹروں نے ان کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ اس ماہ کے آخر میں روس کے دورے پر جانے والے تھے جہاں وہ تاشقند میں افریشیائی ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے والے تھے لیکن غالباً اب نہ جا سکیں گے۔ ان کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ان کا مرض تشویشناک نہیں ہے لیکن ڈاکٹر نے ۳ ماہ مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ فراق گورکھپوری جو نہرو انعام پا چکے ہیں اور جن کی عمر ۷۰ برس سے تجاوز کر چکی ہے ہلکی قلبی تکلیف نیند نہ آنے اور اعصابی کمزوری کے شکار رہے۔

کرشن موہن

تین مختصر نظمیں

تہذیب نفس

چنچل تھا میں، لیکن میں نے
مشکل سے اسے سمجھا لیا ہے
نفس امارہ سرکش تھا
اس نے کھائی
دہن ارفع سے مات مگر

. . .

نا مکمل سی ہے مات مگر
اک شیر یہ سادھو بیٹھا ہے

نمک

تھا بہت بیقرار چنچل میں
اور اسے پھیکے پن سے نفرت تھی
نرط، عشرت نے کیا غضب ڈھایا
میں نے کیوں اس قدر نمک کھایا
جو مرے خون کا خلل بن کر
میری کنپٹیوں سے نکل آیا

قافیہ

میں نے تھا کچھ اور سوچا کیا کروں
ہو گیا مجروح احساس لطیف
قافیے نے آ دبوچا، کیا کروں

بھوپال میں بزم شفا کا قیام

بھوپال بسا اسلوب نمائندہ اور ملک کے مشہور و مقبول شاعر حضرت شفا گوالیاری کے انتقال کے بعد ان کے ادبی مشن کو جاری رکھنے اور ہندو پاک میں پھیلے ہوئے کثیر تعداد میں تلامذہ کو اردو زبان و ادب کی تحریکات اور سرگرمیوں کو حسب سابق آگے بڑھانے کی ضرورت کے پیش نظر بھوپال میں مرحوم کے معتقدین اور معروف شاگردوں کا ایک نمائندہ جلسہ منعقد ہوا "لکی ہاؤس" میں "بزم شفا" کو مرکزی حیثیت دی گئی اور اس کی حد بندی تشکیل ہوئی۔

(حنیف بھوپالی سکریٹری)

ادبی انعامات

لاہور۔ ادارۂ مصنفین پاکستان کے زیر اہتمام ایک تقریب میں اردو اور بنگلہ کے پندرہ مصنفین کو ان کی تصانیف پر ستر ہزار روپے کے انعامات تقسیم کئے گئے جن اداروں کی طرف سے ادیبوں کو انعامات دیئے گئے ان میں آدم جی داؤد، نیشنل بینک، یونائیٹڈ بینک اور ادارۂ مصنفین پاکستان شامل ہیں۔ انعام پانے والوں میں مرزا ادیب، ادا جعفری، عبدالقادر، سردار زین الدین، حسن ریاض، سنیل کمار، محمد ولی اللہ، ڈاکٹر احمد علی انور، شفیق الرحمن، اکبر علی، ایم مصلح الدین، شمس الحق، بلبن عثمان، اصغر علی گھرال، اور حسن حفیظ الرحمان شامل ہیں۔

(قومی زبان)

رئیس بیسائی بنگلوری

نئی شاعری چند باتیں چند مسائل

آج جدید شاعری متضاد ذہنی رویوں کے نرغے میں گھری ہوئی ہے لیکن جدید نظم کی کڑیاں اور اس کے ڈانڈے جب تاریخ سے ملائے جائیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس کو اردو میں اپنانے اور برتنے کی کوشش کچھ زیادہ پرانی نہیں اگر لفظ جدید کے مفہوم و معنی کو وسعت دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ میر و غالب کا آہنگ ان کے مطالبات ان کا عصری شعور اور ان کی شاعری کے موڑ اس دور کے لحاظ سے مائل نئے تھے، امتداد زمانہ کے ساتھ غالب اور میر کی شاعری آفاقی سمتوں اور وسعتوں کو چھو رہی ہے، آج کی شاعری اگر نئی ہے تو کن معنوں میں نئی ہے کم از کم اس نئے پن کا تعین تو ہونا چاہئے اگر نئی شاعری لفظوں کو جوڑنا ہی ٹھہرا جیسا کہ محمد علوی نے کہا ہے

کیوں سر کھپا رہے ہو مضامین کی کھوج میں
کر لو جدید شاعری لفظوں کو جوڑ کر

اگرچہ جدید شاعری کے حواری ایسے شعر اپنی مدافعت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، تو صورت حال پہلے بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی، اس لئے کہ ہمارے بزرگ شعراء، انشاء، جرأت، جعفر زٹلی وغیرہ بھی الفاظ کی بازی گری، ہیئت بازی اور شعبدہ گری سے مداری کا تماشا دکھا چکے ہیں

ہر دور اور ہر عہد کا ایک IDIOM لب و لہجہ انداز و اسلوب اور طرز احساس ہوتا ہے ہمارے دور میں سائنس کی حیرت انگیز ایجادات دن بہ دن بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کی حشر سامانی اور لمحوں میں سمٹتے ہوئے فاصلوں کی زلزلہ حالی اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج و عواقب کے باعث چاروں طرف قومیت، وطنیت اور اجتماعیت کی سنگین دیواریں یریحو JERICHO کی شہر پناہ کی طرح منہدم ہو رہی ہیں معاشرہ کا ہر فرد شعوری اور غیر شعوری طور پر ان حالات سے متاثر ہے

آج جدید لکھنے والوں کے کشکول میں مغرب کے چبائے ہوئے نوالے ہیں یا تحلیل نفسی، غم ذات اور تنہائی کے کھوٹے سکے ارسطاوی فلاسفر برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے "ہمارے عہد کے نوجوان کا سب سے بڑا المیہ [illegible] ہے" ہم نے اپنے اساتذہ سے تحلیل صرفی و ترکیب نحوی کی اصطلاحات سنی تھیں لیکن تحلیل نفسی کی اصطلاح نے جدید فکر و ذہن کو جتنا گمراہ کیا ہے نفسیات کے کسی اور نظریے نے اتنا گمراہ نہ کیا انکشاف ذات کے پس پردہ بڑی بے راہروی ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت ہے جس کے پینگ سمونے کی کہیں جگہ نہیں ملتی اور جس سے کوئی تخلیقی لذت بھی حاصل نہیں ہوتی، اس کے علاوہ زبان اور قواعد کے مروجہ اصول سے کھلم کھلا انحراف ہے پچھلے برس "کتاب" لکھنؤ میں ایک مباحثہ کے دوران محمود ہاشمی نے کہا کہ نظم کو نظم کہنے والے کی زبان کو بھی صحت کی سند حاصل ہونی چاہئے اتنا ہی نہیں محمود ہاشمی کے دارالافتاء سے یہ فتویٰ بھی صادر ہوا ہے کہ کوئی نظم کو نظم کہے تو اسے بھی زبان کے دائرے ہی میں شامل سمجھا جائے سوچئے تو سہی اس الٹی منطق کا کوئی کیا جواب دے۔

اس میں شک نہیں زبان کا دائرہ سابق تصورات کی قیود اور تلازمات کی حدود سے باہر ہے اب زبان کا آزادانہ تصور و اظہار اس کا نعرہ ہے اور زبان کوئی جامد و ساکت شے بھی نہیں کہ ایک ہی ڈھرے پر قائم رہ جائے لیکن ہر زبان کا اپنا ایک مخصوص آہنگ اور صوتیاتی مزاج ہے اور الفاظ کے تلفظ میں تبدیلیاں کچھ اصول و ضوابط کے تحت وجود میں آتی ہیں یوں کوئی بیٹھے بٹھائے زبان کی ماہیت اور اس کی اشکال کو مسخ کر دے اور اس کے ضابطوں فارمولوں اور مروجہ روایات سے انحراف کرے تو اس کا یہ فعل "ایجاد بندہ" سے زیادہ نہیں سمجھا جائے گا خیر یہ تو ہوئی زبان و قواعد کے مسلمہ اصولوں کو بدل دینے کی ایک ضمنی بات۔

آج نئے لکھنے والوں کے پاس مسائل زیادہ ہیں اور ادب کم ان کا کوئی مربوط، منضبط، منظم، جامع ہمہ گیر فلسفہ نہیں ہے چند بندھے ٹکے مستعار فارمولے اور نعرے ہیں آج کی نئی شاعری ان کی روحانی تشنگی، نفسانی الجھنوں، جسمانی ناآسودگی، جنسی گھٹن اور ان کے ذہنی کرب کی غمازی کر رہی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے چند ذہین جینئس اور انٹلکچوئل ٹائپ کے فنکار اس رجحان کے پس پشت کام کر رہے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ اردو میں تجرباتی شاعری ایک تحریک کی صورت نہیں اختیار کر سکی اور جدید تجربات کے خلاف تعصب کا زور بھی کم نہیں ہوا؟

فلسفۂ حیات و موت پر سوچنے والے فرانسیسی ادیب آل بیر کامیو کی کوئی ڈائری چھپی ہے ایک جملہ دیکھئے شاید بہتوں کا بھلا ہو "جدید لکھنے والوں کی چیزیں چونکاتی ضرور ہیں لیکن بہت کم متاثر کرتی ہیں"۔

اب اس فیصلے کی روشنی میں افتخار جالب اور احمد ہمیش کی شاعری تجرباتی انتشار پسندی کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

جدید شاعروں کے بے تکے پن کی چند مثالیں بھی آپ دیکھتے چلیں ؎

سخت بیوی کو شکایت ہے جہاں بھر سے
گاڑی چلتی نہیں گر جاتا ہے پہلے سگنل

سوچنے سے یہ مرض جاتا نہیں   شاعری اپنے لئے سوزاک ہے

کھرے کھوٹے کا سارا بھید کھل جائے گا رانوں میں
(سلیم احمد)

مچھلی باہر گئی ہوئی تھی   پانی کا مکان بے صدا تھا
(ظفر اقبال)

تو کس کے کمرے میں تھی　　میں تیرے کمرے میں تھا

بے کے نیچے ایک نقطہ تے کے اوپر دو نقطے (عادل منصوری)

خدارا مجھے کوئی بتلائے کہ اس بے مقصد، سپاٹ، بے سک، اور پھسپھسی شاعری میں کہیں تکنیک کا تنوع ہے، کہیں فکر و احساس کے نئے افق کی روشنی ہے، کہیں جذبہ کا انوکھا پن اور ندرت ہے سوائے جنسی تلذذ اور لذت پرستی کے اور کیا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کے نزدیک تو شاعری میں جذبے کی وضاحت اور ایک نقطے پر اس کا ارتکاز ہی فکر بن جاتا ہے۔

ان ٹیڈی، شارٹ کٹ اور جھنجھلائی ہوئی ذہنیت کے نئے شاعروں کے علاوہ بھی ان نئے شاعروں میں چند صالح صحت مند اور روا فکر کے افراد بھی ہیں جن کی شاعری میں روح عصر کے ساتھ ساتھ ایک اپیل کرنے والی لذت اور مقصدیت ہے میں اچھے اور برے شاعروں کی طبقاتی تقسیم نہیں کروں گا کہیں مجھ پر جانب داری، تنگ نظری، تعصب اور دوست نوازی کا لیبل نہ لگا دیا جائے۔ میں ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے بہت حد تک متفق ہوں کہ اور یہ رائے کا فیصلہ عصر سے نہیں مزاج اور لب و لہجہ سے ہونا چاہئے

چند برسوں پہلے کی بات ہے محمود ایاز نے سوغات کا جدید نظم نمبر نکالا میں نے اس نمبر کے بعض اہم مضامین و مباحث، نئی نسل اور پرانی نسل (محمد حسن) اردو نظم کا مزاج (وزیر آغا) جدید نظم اور تعصب (بلراج کومل) پڑھے تو بعض کے اٹھائے ہوئے چند بنیادی اور فکر انگیز مسائل ایک سوالنامے کی شکل میں ترتیب دے کر محمود ایاز کے پاس لے گیا اور پوچھا کہ آپ کے جدید نظم نمبر کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جدید لکھنے والوں کے مضامین بھی ان کی نظموں کی طرح ژولیدہ بیانی، بے سکی، دوری، یاوہ گوئی، ابہام اور مشکل پسندی کا نمونہ ہوئے ہیں ذرا براہ کرم آپ ان سوالات کی تشریح و توضیح کر دیجئے۔ ایاز صاحب نے کہا بھائی جان سوغات کے جدید نظم نمبر کو ذرا غور سے پڑھو اکثر و بیشتر سوالات کے جوابات تم اسی میں سے پاؤ گے۔ میں دراصل محمود ایاز کی شرکا ٹرا معترف تھا اور اب بھی ہوں اور یہ چیز ہمارے آج کے بعض پیشہ ور نقادوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ایاز صاحب کے بارے میں اس بات کا اعتراف خود آل احمد سرور صاحب نے بھی کہیں کیا ہے) اور پھر اپنی عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے مجھے ٹال دیا۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی لیکن مجھ جیسے کم سواد و بے بضاعت کی اس سے تسلی نہ ہوئی ایک دن میں نے اپنے برادر محترم سلیم میسانی سے اس امر کا اظہار کیا کہ جدید شاعری اور اس کے مسائل سے متعلق میں نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جدید و قدیم لکھنے والوں کے پاس یہ سوالنامہ بھجواؤں اور ان سے اس کے جوابات حاصل کر کے "جدید نظم کا مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دوں بھائی صاحب نے پر زور الفاظ میں میری تجویز کی تائید کرتے ہوئے میری ہمت افزائی کی بھائی صاحب قدیم و جدید ادب پر بڑی گہری بصیرت رکھتے ہیں باوجود اچھی استعداد اور صلاحیت کے اپنی مخصوص افتاد طبع کی بنا پر تنہائی کے خول میں چھپے ہوئے ہیں لیکن وہ بھی جدید شاعری سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں اور پھر میری یہ تجویز آگے نہ بڑھی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اسی سوالنامہ کو از سر نو ترتیب دے کر دور حاضر کے نمائندہ نقاد وزیر آغا کے نام میں نے پوسٹ کر دیا چند دن بعد وزیر آغا کا خط میری سے آیا جہاں وہ مقیم تھے میرے ان بھیجے ہوئے سوالات کے بارے میں وزیر آغا صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

"جدید شاعری کے سلسلے میں آپ نے بڑے عمدہ سوالات مرتب کئے ہیں دقت یہ ہے کہ اس میں بہت کم سوال ایسے ہیں جن کا جواب چند سطروں میں دیا جا سکے اتفاق سے ان ہی دنوں میری ایک کتاب چھپی ہے۔ اردو شاعری کا مزاج۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کے بیشتر سوالات کا تشفی بخش جواب موجود ہے اس کے مطالعے کے بعد اپنی رائے سے مجھے مطلع کریں"

خط کے ساتھ ہی وزیر آغا صاحب نے مجھے اپنی تصنیف اردو شاعری کا مزاج بھجوائی، میں خود جدید شاعری کے عالی معتقدوں اور پرستاروں میں سے ہوں اور جدید ادب کا ایک ادنی طالب علم ہونے کے ناطے اس کو مستقلاً طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں البتہ کبھی کبھی افتخار جالب اور احمد ہمیش کی بیانات اور طویل نظمیں دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں اور زیر لب کہتا ہوں

چہ قیامتے کہ نمی رسید ز کنار ما بہ کنار ما

جدید ادب کے علمبردار میری یاوہ گوئی، تلخ نوائی اور دراز نفسی کو مخاصمانہ و معاندانہ رویہ پر محمول نہ فرمائیں

مرا دو خصلت عیاں گیر بادا چپ و راست
کہ کجروی نہ کنم ورنہ عزم راہ خطا است

آخر میں چند بنیادی مسائل دور حاضر کے ذہین اور باشعور لکھنے والے، محمد حسن، خلیل الرحمن اعظمی، باقر مہدی، محمود ہاشمی، شمس الرحمن فاروقی، محمود ایاز، وحید اختر، بلراج کومل، اور عمیق حنفی کی خدمت میں اس نیت سے پیش کئے جا رہے ہیں کہ ان کی تحریروں میں منطقی نظریات سے قطع نظر ایک ضبط و توازن پایا جاتا ہے جو میانہ روی اور اعتدال پسندی کی ایک اچھی مثال ہے اب سوال جدید شاعری کی بقا و ترقی یا فلاح و بہبود کا نہیں بلکہ اس کے ابہام اور ترسیل

اور املاع کا ہے اور ابلاغ و ترسیل کے مسئلے کو حل کرنے میں تنقید و تجزیہ اور نظریاتی احتساب معاون ثابت ہو سکتا ہے پاکستانی نقادوں وزیر آغا، مجتبیٰ حسین، مظفر علی سید، سلیم احمد، شمیم احمد، افتخار جالب نظیر صدیقی اور جمیل جالبی کو کچھ لکھنے پر اس لئے مجبور نہیں کر رہا ہوں کہ ان کی تحریریں ہندوستانی رسائل میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں اس لئے میری آواز کہیں صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو اگر میری یہ تحریر ان کی نظر سے بھی گذر گئی تو چنداں مضائقہ نہیں!

۱۔ اردو کی آزاد نظم میں علامتی شاعری کا بانی کون ہے؟

۲۔ ہمارے یہاں علامتی شاعری کن مرحلوں سے گذری اور گذر رہی ہے اردو میں اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟

۳۔ علامتی شاعری کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہئے؟

۴۔ اردو میں بہترین علامتی شاعری کے نمونوں کی تنقید و تشریح بیان کیجئے؟

۵۔ اس وقت تک اردو میں فنی اعتبار سے بہترین آزاد نظمیں اور معریٰ نظمیں کن شاعروں نے کہی ہیں ان نظموں کی انفرادی خوبیاں کیا ہیں؟

۶۔ کیا آزاد نظم کو بھی شاعری کہا جا سکتا ہے؟

۷۔ کیا جدید نظم اردو زبان و ادب کی روایت کے خلاف بغاوت ہے اور زبان و ادب کے اصولوں کا کھلا مذاق ہے۔

۸۔ کیا جدید نظم کچھ "ان پڑھ" نوجوانوں کی تجرباتی انتشار پسندی کی پیداوار ہے؟

۹۔ کیا وجہ ہے کہ اردو میں تجرباتی شاعری ایک تحریک کی صورت نہیں اختیار کر سکی اور جدید تجربات کے خلاف تعصب کا زور بھی کم نہیں ہوا؟

۱۰۔ کیا ہمارے معاشرے میں جدید اردو نظم کے مزاج کو اپنانے کی صلاحیت ہے اور کیا قاری کا ذہن اس کی موجودہ ہیئت کو قبول کر سکتا ہے۔

۱۱۔ اردو کے پرانے لکھنے والوں کی حد کہاں تک ہے اور نئے لکھنے والوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

۱۲۔ کیا تنہا نئے مسائل کی جستجو ہی نئے ادب کی تخلیق کے لئے کافی ہے؟

۱۳۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں بحیثیت مجموعی پہلی جیسی جاذبیت اثر انگیزی اور بلند نگہی نہیں رہ گئی ہے اور ابھی تک غالب و اقبال کے پایہ کا بلند آہنگ شاعر ہمارا موجودہ ادب پیدا نہ کر سکا؟

۱۴۔ نئی نسل کیا چیز ہے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں

۱۵۔ مختلف ادوار کے ادب میں قدر مشترک کا پایا جانا اپنی جگہ صحیح تو ہے لیکن کیا ہر دور کے ادب کی الگ الگ خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں؟

۱۶۔ کیا ادب میں نسلی امتیازات پر زور دیا جا سکتا ہے؟

۱۷۔ نئی اقدار سے کیا مراد ہے کیا ادبی اقدار منتقل ہوتی ہیں اگر نہیں تو نئی اقدار کے کھوج کے مطالعہ کی اہمیت کیا ہے؟

۱۸۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق میں کیا فرق ہے جس طرح ترقی پسند تحریک ایک مخصوص فلسفہ و مسلک کی پابند ہو کر رہ گئی ہے کیا حلقہ ارباب ذوق بھی کسی مخصوص فلسفہ کا پابند ہے اور کیا جدید شاعری کے نام لیواؤں کا بھی کوئی گروپ ہے مذکورہ دونوں تحریکوں اور جدید شاعری کے گروپ کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

شاہ کبیر

غزل

گھوم کر شہر کی فضاؤں میں
لوٹ آئے تمہارے گاؤں میں

زلف سے چاندنی سی چھنتی ہے
حسن چھپتا نہیں گھٹاؤں میں

رہگذاروں میں آج بھی پرخار
آبلے ہی نہیں ہیں پاؤں میں

دن کے ساتھ آس کی کلیاں
جل گئیں سوچ کی چھاؤں میں

کوئی آمادۂ سفر تو ہو
انگنت چاند ہیں خلاؤں میں

اس جنم میں بچھڑ گئے تو کیا
پھر ملیں گے نئی کتھاؤں میں

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔　　(ادارہ)

اسلام الدین فرشتی

ہماری زبان میں غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

عنوان — رپورٹر / مقالہ — ہماری زبان تاریخ

۱۹۔ غالب کی صدسالہ برسی کے سلسلے کے کام (اداریہ) — علی گڑھ — ۱-۸-۶۷

۲۰۔ غالب پر بہترین ڈراما، گیارہ سو کا انعام — حیدرآباد — ۸-۸-۶۷

۲۱۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب (سردار جعفری کی غزل اور کرشن چندر کے دفن کے سلسلے میں) — حبیب الرحمٰن صدیقی — ۸-۸-۶۷

۲۲۔ سوویت یونین میں غالب کی صدسالہ سالگرہ — نووستی، ماسکو — ۱۵-۸-۶۷

۲۳۔ لکھنؤ میں مرزا غالب کے بارے میں بین الاقوامی مرکز — لکھنؤ — ۲۲-۸-۶۷

۲۴۔ غالب کی صدسالہ برسی کے لئے مسلم یونیورسٹی کا پروگرام — علی گڑھ — ۸-۹-۶۷

۲۵۔ غالب انعام۔ بحوالہ ہماری زبان مورخہ ۲۲ راگست ۱۹۶۱ء (ٹیگور انعام۔ ساہتیہ اکیڈمی) — ذرتیرچس — ۲۲-۹-۶۷

۲۶۔ مرزا غالب کی صدسالہ تقریبات ناگری پرچارنی سبھا کتاب شائع کرے گی — بنارس — ۱-۱۰-۶۷

۲۷۔ لکھنؤ میں غالب کی صدسالہ سالگرہ کا پروگرام — لکھنؤ — ۱-۱۱-۶۷

۲۸۔ اعلان۔ غالب پر ڈراما کے لئے انعام — دہلی — ۸-۱۱-۶۷

۲۹۔ غالب کی صدسالہ برسی پر دو لاکھ کے خرچ کا تخمینہ — دہلی — ۱۵-۱۱-۶۷

۳۰۔ کتابیات اور اس کا فن (یادگار غالب مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی) — امام مرتضیٰ نقوی — ۱۵-۱۱-۶۷

۳۱۔ غالب کی صدسالہ برسی اور اردو دوستوں کے فرائض (اداریہ) — علی گڑھ — ۲۲-۱۱-۶۷

۳۲۔ غالب کی صدسالہ تقریبات کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبران کا انتخاب — ۱-۱۲-۶۷

۳۳۔ غالب کا ایک شعر — نور الحسن ہاشمی — ۱-۱۲-۶۷

۳۴۔ یورپ اور امریکہ میں یوم غالب — قاضی ظہیر الحسن — ۱۵-۱۲-۶۷

۳۵۔ غالب کی صدسالہ تقریبات میں بین الاقوامی ... کی جائیں گی — قومی آواز لکھنؤ — ۲۲-۱۲-۶۷

۳۶۔ ذ ماتریہ کیفی کے خطوط (غالب، شبلی، اقبال کی طرح بہت اچھے خطوط نگار بھی تھے۔ غالب کے خطوط کا طرہ امتیاز ہے) — ابوعلی — ۲۲-۱۲-۶۷

۱۔ ممتاز بنگالی ادیب غالب کی جان پر ناول لکھیں گے — نئی دہلی — ۱-۱-۶۸

۲۔ غالب صدسالہ کمیٹی، جموں — جموں — ۸-۱-۶۸

۳۔ غالب صدسالہ جشن کمیٹی کے عہدیداروں کا اعلان — لکھنؤ — ۱۵-۱-۶۸

۴۔ دور آصفی کے اردو رسائل (ماہنامہ ذخیرہ) تنقیدی مضامین حضرت غالب مغفور (علامہ مصطفےٰ ذہین) دیوان اردو کے غالب اور شوکت بریلوی (مہر حسن بلگرامی) — طیب انصاری — ۲۲-۱-۶۸

۵۔ مغربی بنگال میں جشن غالب کی تیاریاں — کلکتہ — ۸-۲-۶۸

۶۔ گورکھپور یونیورسٹی میں جشن غالب کی تقریبات کے لئے کمیٹی کا قیام — گورکھپور — ۸-۲-۶۸

۷۔ ایک دعوت فکر (غزل غالب کی ہے یا کسی ؟) مراسلہ — نثار احمد صدیقی — ۸-۲-۶۸

۸۔ کچھ غالب کی صدسالہ برسی کے بارے میں (اداریہ) — علی گڑھ — ۱۵-۲-۶۸

۹۔ جشن غالب کے سلسلے میں بین الاقوامی سیمینار — بنارس — ۱۵-۲-۶۸

۱۰۔ مرزا غالب کی صدسالہ برسی منائی جائے گی (امریکی یونیورسٹیوں میں) — وائس — ۱۵-۳-۶۸

۱۱۔ رفتار (غالب برسی پر مضمون) — خلیل الرحمٰن اعظمی — ۱۵-۲-۶۸

۱۲۔ صدر جمہوریہ نے غالب میموریل کا سنگ بنیاد رکھا — نئی دہلی — ۲۲-۲-۶۸

۱۳۔ جشن غالب کے موقع پر انجمن ترقی اردو گوالیار کا پروگرام — اسلام الدین گوالیار — ۲۲-۲-۶۸

۱۴۔ انجمن ترقی اردو گورکھپور کی جانب سے جشن غالب منانے کا فیصلہ — گورکھپور — ۲۲-۲-۶۸

۱۵۔ تسبیل خبر آملدی تلمیذ امیر مینائی (عقیدت خواجہ اور وفات) بحوالہ از مضمون مردان علی خاں رعنا تلمیذ غالب مطبوعہ ہماری زبان ۲۲-۱۰-۶۳ — سید فضل المتین — ۲۲-۲-۶۸

(باقی آئندہ)

مراسلات

کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے

صحیفہ لاہور، چالیسواں شمارہ، جولائی ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۴ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریر فرماتے ہیں

" ریحان لکھنوی مصنف باغ و بہار کا سراغ نہیں ملتا۔ بعض مقالہ نگاروں نے ریحان کا نام دیا کرشن بتایا ہے لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔"

اور فٹ نوٹ میں ہماری زبان علی گڑھ کے ۱۵ جنوری ۶۱ء اور یکم فروری ۱۹۶۱ء کے دو مضمونوں کا حوالہ دے کر ان غلط خیال مقالہ نگاروں کے نام معراج دھول پوری اور سید مسعود حسن نقوی بتائے گئے ہیں۔ اس طرح مجھ پر یہ غلط الزام آتا ہے کہ میں نے مثنوی باغ و بہار کے مصنف ریحان کا نام دیا کرشن بتایا ہے۔

میرے جس مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا عنوان ہے گل بکاولی کا ایک اور قصہ۔ اس مضمون میں (۱) ڈال کر یہ لکھا گیا ہے۔

"۱۵ جنوری ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں جناب معراج دھول پوری کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے فارسی اور اردو کی ان کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن میں گل بکاولی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اس موضوع پر ایک اور کتاب میرے علم میں ہے۔ نام اس کتاب کا گل باغ بہار ہے اور مصنف اس کے محمد داؤد علی ناداں حیدرآبادی ہیں۔ یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار شعر کی اردو مثنوی ۱۲۶۹ھ کی تصنیف ہے۔ ناداں کی چار کتابوں کے قلمی نسخے میرے کتب خانے میں موجود ہیں کبھی فرصت ملی تو ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے اس غیر معروف مصنف کا تعارف کیا جائے گا۔"

میرے اس بیان میں نہ مثنوی باغ بہار کا ذکر ہے نہ اس کے مصنف ریحان کا۔ ایک دوسری مثنوی گل باغ بہار کا ذکر ہے جس کے مصنف کا نام محمد داؤد علی ناداں حیدرآبادی بتایا گیا ہے۔

اس مضمون میں نمبر (۲) ڈال کر یہ لکھا گیا ہے۔

"منشی دیا کرشن ریحان لکھنوی کا قطعہ لاجواب زیر لحاظ مراسلے میں آثار الشعرائے ہنود سے نقل کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

کوئی ہمارے تغافل شعار سے کہہ دو ... کہ آپ ذرّہ نوازی جو مہر دار کریں
تو باوجود تقاضائے مرگ و شدت غم ... ہم اور بھی نفسے چند انتظار کریں

مدت ہوئی مجھ کو یہ قطعہ کہیں حسب ذیل صورت میں ملا تھا اور اسی صورت میں میں نے اس کو اپنی کتاب ہماری شاعری میں نقل کیا ہے۔

کوئی یہ میرے تغافل شعار سے کہہ دے ... کہ آپ ذرّہ نوازی جو مہر دار کریں
تو باوجود تقاضائے مرگ شدت نزع ... ہم اور ابھی نفسے چند انتظار کریں

اور یہی صورت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اس بیان میں بھی نہ مثنوی باغ بہار کا ذکر ہے نہ اس کے مصنف ریحان کا۔ صرف دیا کرشن ریحان کے ایک قطعے کا ذکر ہے۔

میرے ان بیانوں پر نظر کی جائے تو جناب فرمان کے مندرجہ بالا ارشاد پر یہ مصرع صادق آئے گا۔ 'کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے'

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

مدیر ہماری زبان کے نام

ملیالم، تامل، بنگالی وغیرہ علاقائی زبانوں کے جاننے والے اگر اردو سیکھنا چاہیں تو آپ انھیں کن کتابوں (قاعدوں) کی سفارش کریں گے؟ کسی انجمن یا ادارہ نے بھی آج تک اس مسئلہ پر توجہ دی ہی نہیں۔ کم از کم اب تو ریاستی انجمنیں علاقائی زبانوں کے ذریعے اردو زبان سیکھنے کے قاعدے بلا تاخیر مرتب کرا کر شائع کرائیں جن کی قیمت معمولی ہو۔ اردو کا کیس (CASE) ایسے ٹھوس کاموں سے مضبوط ہوگا۔ یہی حال ڈکشنریوں کا بھی ہے!۔ اتنے برس گزر گئے لیکن آج تک علاقائی زبانوں سے اردو (اور اردو سے علاقائی زبانوں میں) ڈکشنریاں مرتب نہ کی جا سکیں۔ کم از کم اب تو کوئی منصوبہ تیار کیا جائے کہ اتنے عرصہ میں ایسا کام ہوا۔ اس امر عظیم کی تکمیل کے لیے سرمایہ کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ تو عرض کروں گا کہ جب اور اغراض کے لئے مشاعروں کے ذریعہ رقم جمع کی جا سکتی ہے تو پھر مذکورہ بالا شدید ترین ضرورت کے لئے کیوں نہیں؟ (اطلاعاً عرض کر دوں کہ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے صرف تین سالانہ مشاعروں ہی میں ہزاروں روپے کمائے ہیں!!) براہ مہربانی ذمہ دار احباب و ادارے فوری توجہ فرمائیں تو مناسب ہے۔

یکم اگست کے شمارے میں فلموں میں اردو شعراء (مرحوم) کے کلام کی ریکارڈنگ وصول کرنے سے متعلق محمد حال صاحب بھوپالی کی تجویز واقعی سنجیدگی سے غور طلب اور فوری فیصلہ کا خواہاں ہے۔

(راہی غوری دکنی)

تصحیح

۲۲ اگست ۶۸ء کے ہماری زبان میں صفحہ ۲ پر اردو گھر کے عنوان سے رؤف خیر صاحب کی ایک اچھی نظم شائع ہوئی ہے جس کا تیسرا شعر یہ تھا۔

تم تلخ و اجنبیا سا غونا لاؤ ... تم الفت و اخلاص کا چونا لاؤ

اور آخری شعر یہ تھا۔

اے جھاگ خزانوں سے نمٹا لو یارو ... [illegible]

بہار میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں

انجمن ترقی اردو بہار لسانی سروے کمیٹی کا جلسہ

لسانی سروے کمیٹی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی پہلی نشست اعلان کے مطابق تاریخ ۱۸ اگست ۶۸ء بروز اتوار بوقت دس بجے دن بمقام ماہتاب منزل، نانکپور، بھاگلپور زیر صدارت الحاج غلام سرور، صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو منعقد ہوئی جس میں پروفیسر مظفر اقبال کنوینر اور زین الحق صاحب، جوائنٹ کنوینر، لسانی سروے کمیٹی کے علاوہ ڈاکٹر محمد یونس صدر ضلعی انجمن ترقی اردو بھاگلپور اور مولانا سید شاہ شرف عالم ندوی جنرل سکریٹری ضلعی انجمن ترقی اردو، بھاگلپور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، جناب قیام صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کمال الدین صدیقی، رکن لسانی سروے کمیٹی اور تسنیم ربانی رکن لسانی سروے کمیٹی چند مجبوریوں کی بنا پر شرکت نہیں کرسکے اس نشست میں ایجنڈا پر غور و فکر کے بعد مندرجہ ذیل تجویزیں بہ اتفاق رائے منظور کی گئیں:۔

۱۔ آج کی نشست یہ طے کرتی ہے کہ ریاست کے تمام اضلاع کا لسانی جائزہ علیحدہ علیحدہ لیا جائے اور اس کام کے لئے ہر ضلع میں لسانی سروے کمیٹی اپنے چند نمائندوں پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی قائم کرے، یہ ذیلی کمیٹیاں اپنے اپنے ضلع کے کل سب ڈویژن، انچل یا بلاک یا وارڈ اور پنچایت یا محلہ میں اپنے نمائندے مقرر کریں تاکہ سروے کا کام پنچایت وار اور محلہ وار کیا جاسکے مزید یہ کہ ذیلی کمیٹیوں کے قیام کے لئے انجمن کی ضلعی شاخوں سے مدد لی جائے۔

۲۔ آج کی نشست طے کرتی ہے کہ پہلی سطح میں سروے کا کام صرف چار اضلاع یعنی پٹنہ، رانچی، بھاگلپور، اور پورنیہ میں کیا جائے اور اس کا صدر دفتر بھاگلپور میں قائم کیا جائے۔

۳۔ آج کی نشست طے کرتی ہے کہ کمیٹی کے تیار کردہ فارم اور "رہنمائے لسانی سروے" کو جلد از جلد طبع کرالیا جائے اور آغاز کار سے قبل سروے کنندگان کو فارم کی خانہ پری کی تربیت دی جائے۔

۴۔ آج کی نشست یہ طے کرتی ہے کہ کمیٹی کے صدر دفتر کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کمیٹی انجمن سے مبلغ ڈھائی ہزار روپے (۲۵۰۰ روپے) طلب کرے اور مختلف اضلاع کی کمیٹیوں کے اخراجات کے لئے انجمن سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی ضلعی شاخوں کو ہدایت کرے کہ وہ اپنے ضلع کی سروے کمیٹیوں کے اخراجات برداشت کریں اور اس سلسلے میں انہیں انجمن کی رسید پر رقم فراہم کرنے کا اختیار دیا جائے۔

۵۔ آج کی نشست یہ طے کرتی ہے کہ کمیٹی کے بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر مندرجہ ذیل حضرات کو کمیٹی کا رکن نامزد کیا جائے۔

۱۔ احمد حمید صاحب (رانچی) ۲۔ فیاض الرحمٰن صاحب (پٹنہ) اور ۳۔ محمد رفیق صاحب (تاتارپور۔ بھاگلپور)

(مظفر اقبال کنوینر لسانی سروے کمیٹی بہار ریاستی انجمن)

بھاگلپور میں انجمن ترقی اردو کا جلسہ

بھاگلپور مسلم اسکول کے احاطے میں انجمن ترقی اردو کی ضلعی شاخ کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں دس ہزار سے بھی زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ بھاگلپور کے علاوہ صاحب گنج کے عوام بھی بڑی تعداد میں جلسے میں شریک ہوئے۔ جلسے میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے مرد، عورت، بوڑھے، جوان، تاجر، کاشتکار، ڈاکٹر، وکیل، طلبہ، اساتذہ، غرضیکہ ہر پیشہ اور ہر طبقہ کے لوگوں نے جلسے میں شرکت کی اور اس کو کامیاب بنایا۔

کنوینر لسانی سروے کمیٹی کی اپیل

اس جلسہ میں پروفیسر مظفر اقبال، کنوینر لسانی سروے کمیٹی، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے انجمن کی منظور کردہ تجویزوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بھاگلپور میں اب تک اردو تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہے، اردو طلبہ کے لئے ایسی درسگاہوں کی کمی ہے جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے، چنانچہ اسی کمی کو دور کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو بھاگلپور نے اس شہر میں ایک اردو کنڈرگارٹن اور ایک اردو گرلز ہائی اسکول کے قیام کی تجویزیں منظور کی ہیں اردو گرلز اسکول وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے بھاگلپور میں اب تک اردو طالبات کے لئے ایسی کوئی درسگاہ موجود نہیں ہے جس میں ہائی اسکول کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی ہو محلہ ... میں ایک لوئر پرائمری اسکول ضرور ہے جو کبھی اپر پرائمری تھا لیکن ارباب اقتدار کی مہربانیوں کے باعث اب وہ لوئر پرائمری بن چکا ہے انجمن کی طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ اس اسکول کو کم سے کم مڈل اسکول بنا دیا جائے اور مجوزہ اردو گرلز اسکول میں آٹھویں درجہ سے میٹریکولیشن تک کی تعلیم دی جائے مجھے امید ہے کہ بھاگلپور کے اردو دوست انجمن کی اس تجویز کی تائید کریں گے اور حکومت بھی اس سلسلے میں تعاون کرے گی اس لئے کہ حکومت ہند کی درارست تعلیم کی پالیسی ہے کہ طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے لہٰذا پوری توقع ہے کہ ریاستی حکومت مرکز کی پالیسی کی خلاف ورزی نہیں کرے گی۔ اس کے علاوہ شہر کے کچھ اردو دوست اردو کنڈرگارٹن کے قیام کے سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی کوشش میں پورا پورا تعاون کرے لہٰذا میں بھاگلپور کے تمام اردو دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ان اردو دوستوں کے ساتھ تعاون کریں۔

مجلس استقبالیہ بھاگلپور کے صدر کا خطبہ

مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر محمد یونس صاحب نے اپنے خطبہ میں فرمایا سارے ہندوستان کی طرح بھاگلپور کمشنری کے بھی ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر بستی کے بیشتر افراد اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور اگر اس کا سروے کیا جائے تو تعداد میں کسی دوسری زبان سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں گے اردو لسانی، عوامی، علمی، ادبی اور کاروباری کسی بھی اعتبار سے ملک کی کسی زبان سے کمتر اور دوتر نہیں ہے آئینی اعتبار سے بھی یہ ملک کی ویسی ہی اور اتنی ہی قومی جمہوری زبان ہے جیسی اور جتنی دوسری چودہ زبانیں بشمول ہندی نہ ایک درجہ کم اور نہ زیادہ رہی یہ بات کہ اردو کو مسلمانوں کے سر تھوپ کر اس کو سیاسی طور پر اقلیت کی زبان کہا جاتا ہے اور مسلمانوں ہی کی آبادی اور تعداد کے پیش نظر اب تک اس کا کوئی علاج متعین نہیں کیا گیا ہے تو یہ دھاندلی اور دیپ کاری کے سامنے ایک چیلنج رکھتی ہے اس لئے انجمن اردو کے کارکو یاد رکھو مخالفت کے بتدریج آگے بڑھ رہی ہے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک ایک فرد انجمن کے ساتھ ہو کر اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں ۲۰-۲۱ برسوں کی اردو مخالفت نے اب ہم کو اعلانیہ دو محاذ سنبھالنے پر مجبور کر دیا ہے اور دونوں محاذوں پر نہایت مستعدی سے ہم سب کو کاربند ہونا ہے پہلا محاذ تو لسانی جنگ کا ہے جو انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے باضابطہ لڑی جا رہی ہے اور اگرچہ اس محاذ پر ہمیں مکمل کامیابی اب تک نہیں ہوئی ہے پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں اور مایوس ہونا بھی نہیں چاہئے اس لئے انجمن نے فیصلہ کیا ہے کہ بہار کی ساری اردو آبادی کا سروے کیا جائے اور ان کے مسائل کا جائزہ لیا جائے تاکہ اسی نہج پر انجمن کا کام آگے بڑھے۔ دوسرا محاذ ہے اپنا ہی سہی اردو کے لئے وہ کام ہم انفرادی یا اجتماعی طور پر کر سکتے ہیں اور جس پر ہم کو مکمل قدرت حاصل ہے مثلاً اردو اخبار میں، اردو کتب میں، اردو پبلک لائبریری کا قیام اور اس سے استفادہ اس محاذ پر ہمیں اپنے آپ سے لڑنا ہوگا اور یہ کام کرنا ہوگا۔

ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکول میں اردو کے ذریعہ تعلیم

پٹنہ ڈی پی آئی بہار کے احکامات کی تعمیل میں گردنی باغ ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکول پٹنہ میں پچھلے دنوں پھر اردو اور بنگلہ کے مزید دو دو اساتذہ کو واپس کر لیا۔ یاد ہوگا کہ پورے اسٹیٹ میں صرف اسی اسکول میں پچھلے سال اقلیتی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا تھا اور اردو اور بنگلہ کے اساتذہ کا اسی غرض سے دوسرے اسکولوں سے تبادلہ ہوا تھا اور تعلیم ہو ہی رہی تھی کہ موجودہ ڈی پی آئی نے ان تمام اساتذہ کو پھر اپنی پرانی جگہ پر جانے کا حکم دیدیا اور یہ چلے بھی گئے۔ واضح رہے کہ ۱۴ر جولائی کو انجمن ترقی اردو اور بنگلہ ایسوسی ایشن کا ایک مشترکہ وفد گورنر بہار سے ملا تھا اور جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں اس زیادتی کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔

چنانچہ خبر ملی ہے کہ گورنر بہار نے اسکول مذکور میں اردو اور بنگلہ کے ذریعہ تعلیم دینے کا فوری آرڈر دیا جس پر عمل کرتے ہوئے ڈی۔ پی آئی نے دوسرے چار اساتذہ کا اس اسکول میں پھر سے ٹرانسفر کر دیا اور ان ٹیچروں نے واپس بھی کر لیا

محکمہ تعلیم کے افسران اردو کے ساتھ کھلی بے انصافی سے کام لے رہے ہیں

دھنباد ضلع میں اب تک بہت سے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اس ضمن میں دھنباد ضلع انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب قمر محمودی نے کئی بار ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ضلع سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن سے ملاقاتیں کیں اور جھکی ہائی اسکول ٹیکی مڈل اسکول، اپر اسلام پور اور جھریا کے بعض اسکولوں کی طرف دھیان دلایا

انجمن ترقی اردو شاخ راجگیر تھانہ

راجگیر انجمن ترقی اردو راجگیر تھانہ شاخ کی تنظیمی کمیٹی کی میٹنگ زیر صدارت جناب سمیع اللہ صاحب موضع کڑاہ منعقد ہوئی تنظیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب ایم بشیر الدین نے رپورٹ پیش کی اس کے بعد باضابطہ تھانہ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا جس میں جناب بدر الدین صاحب موضع عوئی صدر منتخب ہوئے نائب صدر جناب مریم پردیپ موضع دیپ نگر اور سکریٹری کامریڈ سمیع احمد صاحب موضع کڑاہ اور اسسٹنٹ سکریٹری جناب اتول کمار سنہا موضع کرٹڈیہ متفقہ منتخب کئے گئے۔ ایک تجویز کے ذریعہ ریاستی انجمن ترقی اردو کے منتخب نمائندوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا اور یہ تجویز باتفاق رائے پاس ہوئی۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے رہنماؤں سے مطالبہ کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو کی پٹنہ کانفرنس نے سال سروے کے سلسلے میں جو تجویز پاس کی ہے اس کو تابہ تندہی سے بروئے کار لانے کے لئے کوشش کی جائے۔

انجمن کی سرگرمیوں کے بارے میں صدر انجمن بہار کا بیان

پٹنہ صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے حسب ذیل بیان برائے اشاعت ارسال کیا ہے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا قافلہ خدا کے فضل و کرم سے رواں دواں ہے۔ ہم نے عزم صمیم کیا ہے کہ دیر یا سویر آج یا کل، کسی قیمت پر بھی اردو کو بہار کی علاقائی اور دوسری زبان بنا کر ہی دم لیں گے اور اس راہ کی تمام صعوبتوں کو جھیلیں گے مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا ڈٹ کر کریں گے اور کسی بھی قربانی سے گریز نہ کریں گے۔ انشاء اللہ آخری فتح ہماری ہوگی۔ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ ہم اگلے ماہ کے اواخر میں اپنی مجلس عاملہ اور کونسلروں کی ایک اہم اور غیر معمولی نشست بلا رہے ہیں اس موقع پر ہم اسے

دوستوں کو اپنے قطعی فیصلے اور تفصیلی اقدامات سے آگاہ کریں گے۔
پچھلے دو برسوں میں ہم نے تعمیری اقدامات پر اپنی ساری توجہات مرکوز کردی ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں خدا نے چاہا تو بہت جلد بہار کے گوشہ گوشہ میں بچیوں کے اسکول، چھوٹے بچوں کے انگریزی طرز کے اسکولوں، پرائمری، مڈل، ہائر سکنڈری اسکولوں، اقلیتی اداروں اور کالجوں کا ایک جال بچھا دیا جائے گا۔ تحریک زور پکڑ چکی ہے اور ہر ضلع میں اردو دوست سرگرم عمل ہیں یہ بات باعث اطمینان ہے کہ سروے کا کام شروع کر دیا گیا ہے محبان اردو نئے عزم و حوصلے سے میدان عمل میں کود پڑے ہیں ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال بہار بھر میں دو لاکھ ابتدائی ممبر بنائیں گے۔ یہی اس امر کا ثبوت ہوگا کہ ہماری انجمن اور اردو دوست اب زیادہ متحد و متفق اور پہلے سے کہیں بہتر طور پر منظم و مستحکم ہیں۔ اردو دوستوں سے میری درخواست ہے کہ وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں اور دست تعاون دراز کریں۔

یونیورسٹی کی سطح پر اردو کتابیں چھاپنے کے لیے کمیٹی

نئی دہلی۔ یہاں وائس چانسلروں کی میٹنگ ہوئی جس میں گفتگو کے نتیجے کے طور پر ایک ایسی کمیٹی کے قیام کی تجویز ہے جو اردو میں یونی ورسٹی کی سطح کی کتابیں تیار کرے گی یہ میٹنگ مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے بلائی گئی تھی اس کی صدارت مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر تری گنا سین نے کی۔ اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب جی ایم صادق سے درخواست کی جائے کہ وہ اس مجوزہ کمیٹی کے صدر ہوں اور اس کی میٹنگ جلد از جلد بلائیں۔ اس کمیٹی کے دیگر ارکان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جموں اور کشمیر یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی لکھنؤ یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر شامل ہوں گے تعلیم سے متعلق قومی پالیسی کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو اہم اقدامات کئے جا رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے علاقائی زبان میں یونی ورسٹی کے معیار کی درسی کتب کی تیاری کا کام کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے بھارت سرکار نے چوتھے منصوبے میں ریاستی سرکاروں کو امداد دینے کے لئے ایک اسکیم شروع کی ہے توقع ہے کہ ریاستی سرکاریں اس امداد کو مختلف یونی ورسٹیوں کے اشتراک عمل سے کتابوں کی تیاری کے لئے کام میں لائیں گی۔ اردو کے فروغ کے لئے مالی امداد ریاست جموں اور کشمیر کے توسط دی جائے گی۔ (الجمعیۃ)

یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے

نئی دہلی۔ راجیہ سبھا میں یوپی کے ضمنی بجٹ سے متعلق تصرف بل پر بولتے ہوئے فارورڈ بلاک کے ممبر چنیا باسو نے صدر پر زور دیا کہ وہ موجودہ قانون میں ترمیم کریں تاکہ اردو کو یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ (سیاست)

حیدرآباد میں فانی بدایونی کی برسی

حیدرآباد۔ بزم صبا کی جانب سے شوکت علی خاں فانی بدایونی کی (۲۷) ویں برسی ۲۷ اگست کو اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔ پانچ بجے شام فانی کے مزار واقع درگاہ یوسفین پر انجمن ترقی اردو ادارہ ادبیات اردو، اردو مجلس اور بزم صبا کی جانب سے چادر گل چڑھائی گئی اس موقع پر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد موجود تھی فانی کے مزار پر بزم صبا کی جانب سے کتبہ نصب کیا گیا اور جنگلہ لگا کر اسے مزید محفوظ کیا گیا ہے۔ چھ بجے شام اردو ہال میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ ابتدا میں جناب سلیمان اریب کنوینر جلسہ نے بتایا کہ میر اور دکنی کی قبروں کی بے حرمتی نے ہمیں یہ احساس دلایا کہ ایسے عظیم المرتبت شاعروں اور ادیبوں کی قبروں کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ کی جانی چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ بزم صبا فانی کا کلیات ترتیب دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مولوی سید علی اکبر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ چار پانچ برس فانی کے ساتھ محکمہ تعلیمات میں کام کر چکے ہیں۔ فانی نہایت منکسر المزاج تھے، انگریزی پر انھیں خاص دسترس حاصل تھی۔ علامہ حیرت بدایونی نے اپنی تقریر میں فانی بدایونی سے اپنے مراسم کا حال تفصیل سے بتایا انھوں نے کہا کہ فانی ابتدا میں شوکت تخلص کرتے تھے وہ غزل گو شاعر تھے، لیکن غزل ہی میں انھوں نے غم اور موت کا فلسفہ پیش کر کے اردو ادب میں

اسی ایک منفرد حیثیت بانی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے صدارتی تقریر میں بزم صبا کی مساعی کی تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ بزم صبا کلیات کی اشاعت کا کام بھی بحسن خوبی انجام دے گی (کلیات ڈاکٹر معینی تبسم مرتب کر چکے ہیں جنہیں مالی ہی پر مقالہ لکھنے پر ڈاکٹریٹ ملی ہے) آخر میں عارف رؤف، ممتاز احمد، حکیم راگی اور عابد علی خاں نے فانی کا کلام سا پیش کر کے بے حد داد تحسین حاصل کی جس نے طلبہ پر سکت لی۔ جناب سلمان ارب کے شکریہ پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔

دینا بندھو کالج شب پور میں اردو کی تعلیم

ہوڑہ یہاں کی ایک سماجی انجمن یونائٹڈ سٹیزن سوشیل آرگنائزیشن کے زیر قیادت ایک وفد دینا بندھو کالج کے سکریٹری اور پرنسپل سے ملا وفد نے اردو تعلیم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بتایا ہوڑہ کے علاقہ میں کسی کالج میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے جو یہاں کے اردو داں طلبہ کے لئے ایک بڑی پریشانی کا باعث ہے۔ اس لئے اس کالج میں اردو تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئے چنانچہ اردو داں طلبہ کی دقتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینا بندھو کالج کے پرنسپل اور سکریٹری نے مذکورہ کالج میں اردو تعلیم کا انتظام کر دیا ہے اس سلسلہ میں محمد عباس پردیز صاحب کا بحیثیت اردو لیکچرر تقرر ہوا ہے۔

(ایم اے قاسم)

اردو طلبہ کو انجمن کی شاخ مالیگاؤں کی جانب سے انعامات

مالیگاؤں یوم آزادی کے موقع پر اس بار انجمن ترقی اردو شاخ مالیگاؤں کی جانب سے اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے مندرجہ ذیل طلبہ اور طالبات کو ۲۵، ۲۵ روپے کی کتابیں انعام میں دی گئیں

	نام	اسکول
۱	انصاری احمد حافظ فہیم رسولپورہ	جمہور ہائی اسکول
۲	الف صدیقی پروین محمد حسن دانش	مالیگاؤں ہائی اسکول
	ب نسرین خاں کا باڑہ	
	ب فاری رضیہ محمد امین	"
۳	محمد امین امام الدین ۷۰ ہزار کھولی	اردو اسکول ۷
۴	شمس النساء محمد حسن اسلام پورہ	اردو اسکول ۲

(شعبان انصاری سکریٹری)

گورنمنٹ انٹر کالج ہردوئی میں اردو طلبہ کو پریشانی

ہردوئی۔ امسال گورنمنٹ انٹر کالج ہردوئی کے اردو طلبہ کو جن کی تعداد تقریباً ۲ سو بتائی جاتی ہے۔ بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ گذشتہ سال جن اردو ٹیچر کا یہاں سے ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ اس کی جگہ پر ابھی تک کسی اردو ٹیچر کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک مقامی گرلز انٹر کالج میں نہم و دہم کلاسوں کی طالبات کو اردو ٹیچر کی فراہمی سے انکار کیا جا رہا ہے۔ جب کہ لڑکیوں کو اردو بحیثیت اختیاری مضامین لینے کی اجازت دے دی گئی ہے جس سے طالبات اور ان کے رشتہ دار کافی پریشان ہیں۔

دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دو ادبی نشستیں

دہلی۔ انجمن کی پہلی نشست ۲ اگست کو آرٹ انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ میں زیر صدارت جناب عبداللہ ولی بخش منعقد ہوئی جلسہ میں محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ، جے پال سنگھ زرنگ صاحب، محمد یوسف پاپا اور سیفی سرونجی صاحب نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ انجمن کی دوسری نشست جناب محمد یوسف صاحب پاپا کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں پنڈت رادھے شیام پاٹھک صاحب، جے پال سنگھ ترنگ صاحب، سید آل حسن کاظمی صاحب، جناب سطوت رسول صاحب، ڈاکٹر اجمل اجملی صاحب، جناب محمد یوسف پاپا صاحب نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

(سکریٹری سیفی سرونجی)

صفحہ ۱۲ سے آگے

کوتوال نہیں ہو سکتے۔ وہ شاہی اصطبل کی آبرو ہوتے پر فخر کر سکتے ہیں اگر وہ نالائق طلبہ کے سعادت مند دالدین بن گئے تو بھی بات نہ بنے گی نہیں بگڑے گی انہیں اپنے فرض کو پہچاننا ہے۔ اگر نوجوانوں میں رہتے ہوئے بھی ان کا ذہن پرانی باتوں کا خوگر ہے اگر وہ نئی نسل کے وسوسوں اور الجھنوں اور اس کے غم و غصے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اگر وہ ہمدردی اور خلوص سے ان کو صحیح راستہ پر نہیں لے جا سکتے، تو یہ ان کی بہت بڑی کوتاہی ہوگی۔ ہاں وہ اس وقت طلبہ کی رہنمائی کر سکیں گے جب طلبہ کے سامنے ان کا نقش (IMAGE) اچھا ہوگا۔ اگر طلبہ نے اساتذہ کو ارباب سیاست کا مصاحب یا ارباب دولت کا پجاری یا اعلیٰ علمی اور اخلاقی اور سماجی معیاروں سے عاری پائیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی بات نہ سنیں گے کیونکہ ان کے دل میں ایسے استادوں کا کوئی احترام نہ ہوگا استاد اگر اچھے استاد ہو جائیں تو طالب علموں کو بھی راہ راست پر لا سکتے ہیں موجودہ صورت حال صرف استادوں اور طالب علموں کے لئے ہی نہیں ملک کے مستقبل کے لئے تشویشناک ہے۔ اساتذہ کو اس وقت اپنے خول سے نکلنا چاہئے اپنی گروہ بندی اور سیاست کو خیرباد کہنا چاہئے اور ملک کی ذہنی تعمیر کی خاطر علم کی یونیورسٹیوں کو دنگل کے اکھاڑوں اور علم کے مزاروں کی جگہ جیتے جاگتے متجسس اور بیدار ادارے بنانے چاہئیں دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ سے ہمیں توقع ہے کہ وہ اس معاملے میں دوسری یونیورسٹیوں کی قیادت کر سکیں گے۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

دہلی یونی ورسٹی ہندوستان کی بہترین یونی ورسٹیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعض شعبے اور بعض پروفیسر بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اس لئے وہاں آج کل جو بے چینی ہے اور جس کے نتیجے میں وائس چانسلر کو دس دن کے لئے یونی ورسٹی بند کرنا پڑی یہ دہلی یونیورسٹی کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ ملک کے سب دانشوروں معلموں اور طالب علموں کا مسئلہ ہے یعنی اس کی قومی اہمیت ہے اس لئے میں آج کی صحبت میں اس پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

میرے نزدیک یونیورسٹی کی بہت سی الجھنیں اس وجہ سے ہیں کہ یہ بہت بڑی ہوگئی ہے۔ اس میں طلبہ کی تعداد لگ بھگ پینتالیس ہزار ہے بیس سے اوپر کالج اس سے ملحق ہیں اور کم و بیش تین ہزار اساتذہ اس سے متعلق ہیں ظاہر ہے کہ یونی ورسٹی کا پرانا ڈھانچا اس پھیلاؤ کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ ہمارے ارباب حل و عقد کا روایتی نسخہ ایسے معاملات میں انتظار کرنے اور دیکھنے کا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور پھر فیصلہ میز کے گرد نہیں چوراہے پر ہوتا ہے۔

اس لئے اگر یونیورسٹی کیمپس میں جو کالج ہیں دہلی یونیورسٹی انھیں تک محدود رہتی اور دوسرے کالجوں کے لئے دہلی میں ایک اور یونیورسٹی قائم کر دی جاتی تو غالباً انتظامات میں سہولت ہوتی نہرو یونیورسٹی جب بھی بنے گی ایک خاص قسم کی یونی ورسٹی ہوگی۔ دہلی میں اب ایک ایسی یونی ورسٹی کی ضرورت ہے جو شہر میں پھیلے ہوئے کالجوں کا الحاق کر سکے۔

موجودہ پیچیدگی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ میں وہ رابطہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔ جب طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ جائے تو رابطہ رہ بھی نہیں سکتا ہے۔ اگر اساتذہ کا طلبہ سے گہرا تعلق ہو، اگر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور کالجوں کے پرنسپل درس و تدریس اور طلبہ سے رابطہ پر زیادہ زور دیں اور انفرادی ریسرچ کو جو بیشتر صرف اگلی سیڑھی چڑھنے کے لئے ہوتی ہے اور بعض اوقات درس و تدریس اور طلبہ سے رابطے کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ہوتی ہے ثانوی قرار دیں تو اساتذہ کا ہاتھ طلبہ کی نبض پر رہے اساتذہ طلبہ پر زیادہ اثر ڈال سکیں اور طلبہ کے جذبات سے ارباب حل و عقد کو خبردار رکھ سکیں۔ موجودہ حالات میں احتجاج اور ہنگاموں کے دوران اساتذہ کی بڑی تعداد صرف تماشائی ہوتی ہے وائس چانسلر یا پرنسپل ان ہنگاموں کو صرف ایک انتظامی مسئلہ سمجھ کر حل کرتے ہیں تاکہ بحران کسی طرح ٹل جائے، ان ہنگاموں کے بنیادی اسباب پر غور کرنے کی انھیں فرصت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہنگامے ہوتے رہیں گے، ارباب اختیار زیادہ تر ہنگاموں سے گھبرا کر یکے بعد دیگرے مطالبات مانتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ نوبت آجائے گی کہ اپنے وقار کی خاطر کوئی بالکل جائز مطالبہ نامنظور کر دیا جائے گا اور پھر دگنی شدت سے ہنگامہ ہوگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ لوگ فوری اقدامات یا چھوٹے راستے کا خیال چھوڑ دیں، بنیادی مسائل پر غور کریں اور ان کا حل تجویز کر کے ان پر سختی سے کاربند ہوں۔

یہ حل صرف ارباب اختیار کو تجویز نہیں کرنا چاہئے بلکہ اساتذہ اور سنجیدہ پوسٹ گریجویٹ طلبہ سے مشورہ کر کے ایک سوچا سمجھا پروگرام وضع کرنا چاہئے اس میں اس بات کو خاص اہمیت دینا چاہئے کہ طلبہ میں کوئی بنیادی خرابی نہیں ہے مگر ملک کے عام حالات آزادی کے بعد روز افزوں گرانی اور ناکام منصوبہ بندی کی ناکامی، سیاسی پارٹیوں کی تنگ نظری اور سستے جذبات کو ہوا دینے اور گدلے پانی میں ہاتھ گھنگولنے کی عادت، رہنماؤں کی خود غرضی، ملک میں تشدد کی ہوا، سرکاری افسروں کی بے نیازی، سرمایہ دار طبقے کی دھڑلے سے نفع خوری، ہندوستان کی اندر اور باہر سبکی اور ہوا خیزی، دانشوروں اور ادیبوں اور معلموں کی جن سے کچھ توقع تھی عام طور پر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور حکومت کا قرب حاصل کرنے اور آزادی کی دین ہوئی سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور بالآخر (ESTABLISHMENT) کا جز بن جانے اور طلبہ اور نئی نسل کے جذبات کو سمجھنے اور ان کی صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر رہنے کی وجہ سے آج عام وائس چانسلر اور عام پرنسپل اور عام طور پر ایک پرانا استاد، طلبہ کو قصور وار ٹھہرا کر یا سیاسی پارٹیوں پر اعتراض کر کے رہ جاتا ہے اور ایسے حلقے میں جو کر سکتا ہے نہیں کرتا مثلاً اس نے امتحان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے درس میں حاضری کی ایک مقررہ تعداد کو مقدس مان لیا ہے۔ طلبہ کی جائز شکایات کو بھی بدنظمی کا مظاہرہ سمجھ لیا ہے بے روح لیکچروں کو کافی سمجھ لیا ہے، فرسودہ نصاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے کلاس میں سنجیدہ اور علمی بحث کو بے ادبی قرار دے رکھا ہے۔ استاد اپنی کہہ کر چلا جاتا ہے، طلبہ کے پلے کتنا پڑا اس کی اسے پروا نہیں ٹیوٹوریل کا نظام رسمی طور پر چل رہا ہے مگر اس کی روح نہیں ہے۔ آج کی سخت اور ہمت شکن زندگی میں فیل ہونے کا مسئلہ اقتصادی بھی ہے اور نفسیاتی بھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم ایک مضمون میں بہت اچھا ہو اور دوسرے میں کمزور اب اگر وہ فیل نہ کیا جائے بلکہ کسی مضمون میں مقررہ نمبر نہ لانے پر اس مضمون میں دوبارہ امتحان دے سکے اور کل مضامین میں کم سے کم مقررہ نمبر ایک مقررہ مدت میں لے آنے پر اسے ڈگری مل جائے تو اسے ایک سال کی بربادی کا خوف نہ ستائے۔ پھر طلبہ کی اقامتی زندگی کی پوری دیکھ بھال ہو اور اس کے چلانے میں طلبہ کا مشورہ بھی شامل ہو بلکہ ان کے کھانے کا انتظام تمام تر انھیں کے سپرد ہو تو بہت سی شکایات آسانی سے دور ہو سکتی ہیں آخر میں استاد کی بات طالب علم کے دل و دماغ کا جز بنانے کی بات ہے اور یہ کام صرف اپنی زبان میں ہو سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ فوراً انگریزی کی جگہ علاقائی یا مادری زبان رائج کر دی جائے اور انگریزی کے ایک اچھے معیار پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی کے ساتھ علاقائی یا مادری زبان میں بھی لیکچر ہوا کریں اور طلبہ کو ایک سے زیادہ زبان میں لکھنے کی اجازت ہو۔

اس سلسلے میں وائس چانسلروں اور پرنسپلوں یا طلبہ سے زیادہ ذمہ داری استادوں کی ہے کیونکہ استاد ہی یونی ورسٹی کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ استاد

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R-N-2/86/56
REGD NO. L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان
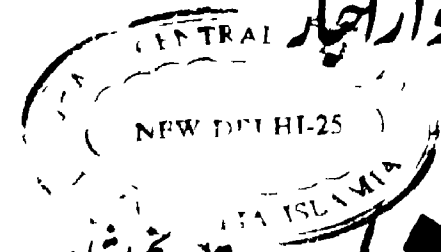
تاریخ اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۔ ۲۷، شمارہ ۳۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

آل احمد سرور

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

نجیب اشرف ندوی ایک عرصے سے بیمار تھے۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد وہ بجھ سے گئے تھے، پھر بھی اپنے علمی کاموں میں لگے رہتے تھے اور صحت کی خرابی کے باوجود اپنی وضع پر قائم تھے۔ بالآخر ۵ ستمبر کو وہ اس زمانے سے رخصت ہو گئے اور اپنے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کے ایک بڑے حلقے کو سوگوار چھوڑ گئے۔

میری ملاقات ان سے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں میرے والد ماندوی (بمبئی) میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ بمبئی دیکھنے کا شوق بچپن سے تھا چنانچہ یونیورسٹی کی تعطیل میں بمبئی پہنچا۔ اسماعیل کالج اندھیری بھی پہنچا۔ وہاں عبدالرحمٰن صاحب پرنسپل اور نجیب اشرف صاحب ندوی سے ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا، کالج میں کوئی کلچرل پروگرام ہو رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں طلبہ نے گجرات کا مشہور رقص گربا پیش کیا۔ نجیب اشرف صاحب نے خاص فخر کے لہجے میں بتایا کہ یہاں طلبہ اور طالبات مل کر ایسے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بھی اور ہندو بھی۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہوا کہ نجیب اشرف صاحب قدیم [illegible] کے دلدادہ ہونے کے باوجود سنجیدہ تہذیبی پروگراموں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرکت کو برا نہیں سمجھتے۔ انھوں نے علی گڑھ کے ہر جانے والے کا الگ الگ حال پوچھا، سب کے کارناموں پر تبصرہ کیا۔ بہار کے ایک ہونہار طالب علم معین الدین دردائی کے متعلق کہا کہ نہایت محنتی اور مخلص نوجوان ہیں مگر ان میں بہاریت ہے۔ غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ مقامی رنگ ان پر زیادہ ہے۔ ویسے وہ خود بہار سے تعلق رکھتے تھے اور سید سلیمان ندوی کے عزیز اور ہم وطن تھے۔ اس گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ علاقائی تعصب سے آزاد ہیں۔ غرض اس باغ و بہار شخصیت نے میرے ذہن پر بہت دلکش نقش چھوڑا۔

پھر تو نجیب اشرف صاحب سے خط و کتابت بھی رہی، جلسوں، کانفرنسوں اور یونیورسٹیوں کی کمیٹیوں میں اکثر ملاقات بھی ہوتی رہی اور ان سے خاصا ربط ضبط بڑھا۔ جب کبھی بمبئی جانا ہوا تو ان سے ملاقات ضرور ہوئی۔ آخری بار چونکہ صرف ایک دن کے لئے گیا تھا اس لیے نہ مل سکا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں اورینٹل کانفرنس تھی۔ اردو کے شعبہ کے صدر [illegible] تھے۔ سکریٹری میں تھا۔ میری دعوت پر اور لوگوں کے علاوہ ندوی صاحب بھی تشریف لائے۔ ایسے موقعوں پر مقالہ نگار، عام طور پر وقت کی کمی کے باوجود اپنا مقالہ پورا پڑھنا چاہتے ہیں اور ذرا بھی اختصار کی ضرورت کا اظہار کیا جائے تو خفا ہو جاتے ہیں۔ ندوی صاحب نے خود ہی صورت حال کا اندازہ کر لیا، مقالہ میرے حوالے کیا اور دس منٹ میں اس کا خلاصہ بیان کر کے اپنی نشست پر آ بیٹھے۔

بمبئی یونیورسٹی میں اردو کا علم انھوں نے عرصہ دراز تک بلند رکھا۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ جمع کیا، پھر عبدالرزاق قریشی جیسے نوجوان تیار کئے جنھوں نے تحقیق و تدوین میں قابل قدر کام کیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے رسالے نوائے ادب نے تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا اور رسائل کے اشاریے شائع کرنے کی طرح ڈالی۔ نجیب اشرف صاحب کاتا اور لے دوڑی کے قائل نہ تھے۔ جو کام کرتے تھے اس میں پوری تلاش اور تحقیق سے کام لیتے تھے۔ اشتہاریت، اپنی تعریف، دوسروں پر اعتراض اور طنز سے وہ ہمیشہ کوسوں دور رہے۔

نجیب اشرف صاحب نے کوئی ادبی گروہ نہیں بنایا۔ ... نے کوئی سیاست نہیں چلائی۔ انھوں نے دوسروں کے کیڑے ڈال کر شہرت حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔

کوئی اچھا علمی تحقیقی یا تنقیدی کارنامہ دیکھتے تھے، کھلے دل سے اس کی تعریف کرتے تھے۔ وہ تنقید بھی کرتے تھے تو تعمیری اور کسی خامی کی طرف بھی اشارہ کرتے تھے تو اس طرح کہ اس کو دور کرنے کا جذبہ خود بخود بیدار ہو جائے۔ لکھنے والوں اور طالب علموں کے ساتھ انھیں گہری ہمدردی تھی۔ علم، ادب، تہذیب، انسانیت کی قدروں کو انھوں نے ہمیشہ عزیز رکھا

دہلی میں ایک اردو کانفرنس کے موقع پر جامعہ میں نمائندوں کی چائے پر دعوت تھی۔ چائے کے بعد میں نے دیکھا کہ نجیب اشرف صاحب ایک ایک سے آٹوگراف لے رہے ہیں اور اصرار کر کے کچھ لکھنے کو۔ میرے پاس بھی تشریف لائے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو یہ کیا سوجھی۔ کہنے لگے ادیبوں کی تحریریں جمع کرنے کا مجھے شوق ہے آپ دیکھئے گا بعد میں یہ تحریریں کتنی مفید ثابت ہوں گی۔

نجیب اشرف صاحب کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ممبئی والوں کو خصوصاً اور اردو دوستوں کو عموماً اردو میں ریسرچ کے لئے کوئی فیلوشپ اور توسیعی لیکچروں کا کوئی سلسلہ قائم کرنا چاہئے۔ ان کے غیر مطبوعہ مضامین کو شائع کرنے کے لئے بھی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔

برہم ناتھ دت

روداد!

اے رات، قیدی کو اپنا گیت الاپ لینے دے
پو پھٹنے سے پہلے اس کے بازو ڈھیلے پڑ جائیں گے
اور اس کی دار پر کھنچی ہوئی لوتھ
ہوا کے جھونکے کے ساتھ جھولا جھول رہی ہوگی

اے رات! ذرا آہستہ چل
مجھے دل کی بات کہہ لینے دے
میں کون ہوں؟ شاید تو مجھے
اور میری دکھ بھری کہانی کو بھول چکی ہے

اے دلسوزی! زندگی کے کتنے لمحے
جیف تو نے انھاسوں میں یونہی گذار دئے
میرے رونے میں "خوف" کو کوئی دخل نہیں
یہ آنسو میں نے اپنے وطن کے لئے بہائے ہیں

ان بے آسرا بچوں کے لئے ہیں
جو گھر میں بلک رہے ہیں
بے باپ کے، فاقوں کے مارے
میرے بعد ان کی کون خبر گیری کرے گا

میرے دو بھائی تھے، ماں جائے!
وہ مجھ سے پہلے دار پر چڑھ چکے ہیں
وطن کی ناموس کے لئے
ان سے جو بن آیا وہ کر گزرے
آہ میری بیوی کس طرح دن کاٹے گی
تنہا، لاوارث، اگر یاں دیا لال
جب وطن کو اسلحہ کی ضرورت پڑی
تو میں اس کے طلائی کنگن بھی اتار لایا تھا

ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی

حیدرآباد۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی جس میں سب سے پہلے ایک ملکی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا۔ اس کی گولڈن جوبلی اکتوبر میں منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر حیدرآباد کے جنرل پوسٹ آفس اور جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ آفس میں اس مضمون کی ڈاک کی مہر لگائی جائے گی "عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۱۸-۱۹۶۸ء گولڈن جوبلی" مہر کی یہ عبارت صرف دو زبانوں ہندی اور انگریزی میں ہوگی۔ عجیب اردو کو اس میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔

(سماج)

ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ساہتیہ اکیڈمی کا پہلا فیلوشپ

مدراس۔ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کو موصوف کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک خصوصی تقریب کے دوران میں ساہتیہ اکیڈمی کا پہلا فیلوشپ پیش کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا انتخاب اکیڈمی مذکور کی طرف سے پہلے فیلو کی حیثیت سے ہوا ہے اس موقع پر موصوف کو ایک تمغہ پیش کیا گیا جو فیلوشپ کی علامت ہے۔ (الجمعیۃ)

روہیل کھنڈ اخبار بند

بریلی یہاں سے نکلنے والا اردو ہفتہ وار "روہیل کھنڈ اخبار" ۴۸ برس کے بعد اردو میں اپنی اشاعت بند کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اس کے بانی اور ایڈیٹر شیخ بہادر سہائے اعلان کیا ہے کہ اردو جاننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اس لئے اخبار کی اشاعت بھی برابر متاثر ہو رہی تھی اب اس کو انگریزی میں شائع کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ (قومی آواز)

---x---

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

ہمارے یہاں پچھلے چند برسوں سے نئے اور پرانے ادب کی آویزش کے سلسلے میں جو دھواں دھار بحثیں چل رہی ہیں ان سب کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ شاعری پر ٹوٹتی ہے۔ نیا طرزِ احساس، نیا ذہنی رویّہ، نیا پیرایۂ اظہار، نیا لہجہ، نئی علامتیں، نئے تلازمے نئے استعارے جیسے ادبی تمغے بھی نئے شاعروں کے ہی سینے پر آویزاں کئے جا رہے ہیں اور سماجی ذمہ داری سے گریز، انفرادیت پرستی، کلیت ابہام، اہمال اور مریضانہ لذت پسندی جیسی بیسیوں اصطلاحوں کی مدد سے جو فردِ جرم تیار کی جا رہی ہے اس کا رخ بھی نئے شاعر اور صرف نئے شاعر کی طرف ہے ایسا کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اردو افسانے میں ادھر کوئی نیا موڑ یا نقطۂ انحراف آیا ہی نہ ہو یا اردو میں تنقید نگاری کا دائرہ سمٹتے سمٹتے اب صرف شاعری اور وہ بھی نئی شاعری تک محدود ہو کر رہ گیا ہو؟

ہمارے یہاں ۱۹۳۰ء کے بعد جب نئی ادبی تحریک سامنے آئی تو سب سے پہلے جس کتاب نے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا وہ "انگارے" تھی یہ ایک بچکانی کوشش تھی جس میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ یہ افسانے جس دور میں لکھے گئے اس وقت ہمارے افسانوی ادب پر پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور چودھری محمد علی ردولوی جیسے کہنہ مشق اور پختہ کار افسانہ نویس چھائے ہوئے تھے۔ ان افسانہ نویسوں کے مقابلے میں "انگارے" کے مصنفین بالکل نو آموز تھے اور ان کی کہانیوں میں ادھ کچرا پن بھی نمایاں تھا لیکن ان افسانوں سے ہماری ادبی دنیا میں جو ہلچل مچی وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس ہلچل سے فائدہ یہ ہوا کہ اردو افسانے کو ایک نئی سمت مل گئی اور کچھ ہی وقفے کے بعد سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی محمد حسن عسکری، اختر انصاری، اوپندر ناتھ اشک، غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی دھرم پرکاش آنند، مدھو سودن، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر اور اس طرح کے دوسرے درجنوں افسانہ نگاروں نے اردو ادب میں اعتبار و افتخار حاصل کیا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعری، افسانہ اور تنقید تینوں اصناف نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے بے حد قریب تھیں بلکہ نئے ادبی رجحانات اور نئے فنی تجربوں یا نئے ذہنی رویّوں کی مکمل تصویر اس وقت تک بن ہی نہیں سکتی تھی جب تک ہم ان تینوں اصناف کو ایک ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ تنقید و تجزیہ سہ ماہی یا سالانہ جائزہ، انتخابات، ادیبوں پر تعارفی مضامین اور اس طرح کی تمام تحریریں الگ الگ دائروں میں نہیں تھیں بلکہ ایک دوسرے سے مربوط و ہم رشتہ تھیں۔ "ادبی دنیا" میں میراجی نے نئی نظموں کے تجزیہ و تفہیم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا تو ساتھ ہی ساتھ صلاح الدین احمد نئے افسانے پر یہی عمل کر رہے تھے نئے زاویے کی دونوں جلدیں نئی شاعری، نیا افسانہ اور نئی تنقید کا احاطہ کرتی تھیں محمد حسن عسکری نے "میری بہترین نظم" کے ساتھ ہی ساتھ "میرا بہترین افسانہ" بھی مرتب کیا۔ اگر کچھ لوگوں نے اپنی تنقید کو نئی شاعری کے لئے مخصوص کر لیا تھا تو ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے نئے افسانے کو خاص طور پر اپنے تنقیدی مطالعے کا موضوع بنایا مثلاً وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے عنوان سے کتاب لکھی اور ممتاز شیریں نے نہ صرف یہ کہ اپنے رسالہ "نیا دور" میں افسانوی ادب کا سہ ماہی جائزہ لینا شروع کیا بلکہ "تکنیک کا تنوع" اور "اردو افسانے پر مغرب کا اثر" جیسے معرکے کے مضامین لکھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے یہاں کی شاعری بھی بعض [illegible]

حرمت الاکرام

غزل

ظلمت و نور کا ہر خواب پگھل جاتا ہے
کبھی خاور کبھی مہتاب پگھل جاتا ہے

سرِ محراب لرزتی ہے کوئی شوخ کرن
کوئی سجدہ تہِ محراب پگھل جاتا ہے

کون جانے کبھی شبنم نے یہ سوچا کہ نہیں؟
کیوں یہ ہر گوہرِ خوش آب پگھل جاتا ہے

مجھے شعلوں میں کہاں اتنی حرارت باقی
خود ہی اکثر دلِ بیتاب پگھل جاتا ہے

چشمِ بے خواب کو دو کوئی جہانِ بے صبح
رات ڈھل جاتی ہے مہتاب پگھل جاتا ہے

ڈوبنا سیکھ تو پہلے تو بتاؤں تم کو
کس طرح وقت کا گرداب پگھل جاتا ہے

تیشۂ فکر سے لرزاں ہوں کہ اکثر حرمت
شعلۂ اک آنچ سے ہر خواب پگھل جاتا ہے

سے دو چار ہوئی۔ افسانہ بھی مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تنقید نے آہستہ آہستہ افسانوی ادب اور اس کے مسائل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اکا دکا مضامین لکھے بھی گئے تو ان کا نہ تو پڑھنے والوں نے کوئی خاص اثر قبول کیا اور نہ افسانہ نگاروں پر اس کا ردعمل ہوا مثلاً ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ محمد حسن عسکری نے "اردو افسانے کا مستقبل" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مضمون لکھا تھا جس میں اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ ہمارا افسانہ پھر رومانیت کی طرف واپس جا رہا ہے۔ اس مضمون پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ انتظار حسین نے "اجتماعی تہذیب اور افسانہ" کے عنوان سے ایک معرکے کا مضمون لکھا تھا، اس مضمون کے بعد بھی سناٹا رہا۔ ۱۹۶۳ء میں دہلی سے ایک رسالہ "تلاش" نکلتا تھا اس میں محمود ہاشمی نے "تخلیقی افسانے کا فن" کے عنوان سے ایک بے حد چونکا دینے والا مضمون شائع کیا اس پر صرف دیویندر ستیارتھی کا ایک خط اور دو ایک مبہم سی آوازیں سنے میں آئیں پھر وہی خاموشی۔

نئی شاعری سے متعلق ادھر کئی اہم اور خیال انگیز کتابیں شائع ہوئی ہیں مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" اور "اردو شاعری کا مزاج" سلیم احمد کی "نئی نظم اور پورا آدمی" جیلانی کامران کی "نئی نظم کے تقاضے" افتخار جالب کی مرتب کردہ کتاب "جدید شاعری" جس میں مختلف اصحاب کے مضامین شامل ہیں، مگر ہمارے افسانوی ادب پر اس طرح کی مفصل تنقیدیں اب نہیں لکھی جا رہی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ افسانے یا ناول میں نئے رجحانات سامنے نہ آئے ہوں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" خدیجہ مستور کا "آنگن" رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا" جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں" ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" جیسے ضخیم اور بڑے کینوس پر لکھے گئے ناول زمانۂ حال کی ہی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ مختصر افسانہ بھی چند نئی جہتوں سے آشنا ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، ضمیر الدین احمد، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، انور سجاد، الطاف فاطمہ، سید خلیل احمد، غلام علی چودھری، محمد کاشمیری، رحمان مذنب، خالدہ اصغر، غلام الثقلین نقوی، رام لعل، جوگندر پال، اقبال متین، عوض سعید، محمد عمر میمن، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، بلراج مینرا اور اس کے علاوہ درجنوں ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں ہمیں نیا ذہنی رویہ اور افسانوی تکنیک کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کو سمجھنے کے لئے اب وقار عظیم یا ممتاز شیریں کی تنقیدیں کام نہیں آ سکتیں۔

ایک شکایت مجھے نئے افسانہ نگاروں سے بھی ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس کے تخلیقی اور فنی مسائل سے خود ان لوگوں کو سب سے پہلے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو خود اس کے عامل ہیں۔ نئے افسانہ نگار اگر اپنے تخلیقی اور فنی مسائل پر بھی کبھی کبھار لکھا کریں اور بحث مباحثے کے دروازے کھولنے کی کوشش کریں تو دوسرے لوگوں کو بھی ان مسائل پر سوچنے کی تحریک ہو سکتی ہے لیکن اب ہمارا افسانہ نگار افسانے لکھ کر چھپوا لیتا ہے اور کسی نقاد کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے جو اس کے افسانے کی معنویت دوسروں کو سمجھائے اور اس کے کارنامے کی داد دے۔ خالص نقادوں پر اس قدر تکیہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ ہمارے نئے افسانہ نگار اگر کوئی بحث چھیڑتے بھی ہیں تو یہ کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا ہے یا فلاں صاحب کی فہرست میں ہمارا نام نہیں ہے میرا خیال ہے کہ نئے افسانے کے بنیادی مسائل یہ نہیں ہیں کہ نقاد کس کا نام لیتے ہیں اور کس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ نئے افسانے کو نئی زندگی اور نئے طرز احساس کے پس منظر میں ابھارنے کی ضرورت ہے، نئے افسانوں کے اچھے انتخابات سامنے آنے چاہئیں۔ خود نئے افسانہ نگاروں کو نئے افسانے کی تنقید و تجزیہ کی ابتدا کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر نئے افسانوی ادب کی اہمیت اور معنویت پر پوری توجہ نہ ہو سکے گی جس سے عام قاری کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں کا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔

سید شہاب الدین دسنوی

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (مرحوم)

سن سفید بال، مرنجاں مرنج، خوش مزاج اور خوش اخلاق، عام طور سے بمبئی شہر میں "پروفیسر ندوی" اور سارے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں "نجیب اشرف ندوی" کے نام کی شخصیت ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو تقریباً ۱۲ بجے دن کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی ان کی عمر ۷۶ سال تھی۔

نجیب اشرف ندوی دسنہ (ضلع پٹنہ) کے باشندے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی ایما پر ندوۃ العلماء (لکھنؤ) بھیج دئے گئے۔ ہوا یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے بھتیجے سید ابوظفر (ندوی) کی شادی کی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دسنہ آئے ہوئے تھے اسی سلسلے میں نجیب اشرف اور ان کے والد ڈاکٹر سید حسین بھی وہاں پہنچے تھے سید صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے (جو ان کے چچا تھے) دریافت کیا "نجیب اشرف کا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے اور میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں، انہیں آپ میرے ساتھ کر دیجئے" ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل ان کی بات مان لی چنانچہ آٹھ سال کی عمر میں نجیب اشرف صاحب ندوہ میں داخل کر دئے گئے۔ اور ۱۹۱۳ء تک وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے مولانا شبلی کے ندوہ سے متعفی ہونے پر طلبہ کی اسٹرائک کے ساتھ نجیب اشرف نے بھی ندوہ چھوڑا اور انگریزی پڑھنے پٹنہ چلے گئے میٹرک اور انٹر کے امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اسکالرشپ ملی بی اے کے آخری سال میں تھے کہ ملک میں سیاسی شورش برپا ہوئی۔ نجیب اشرف بھی تعلیم ترک کر کے دل و جان سے تحریک میں شریک ہوئے۔ اس وقت ان کے ہیرو جواہر لال اور سید سلیمان ندوی تھے۔ پہلے تو ان کے والد ماجد نے تحریک سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر اس زمانے کے صوبوں کے برابر انھوں نے اپنی مخالفت۔ اس لئے تحریک ختم ہو گئی تو دوبارہ تعلیم کی تکمیل کا خیال آیا پٹنہ کالج کے پرنسپل نے واپس لینے کی شرط میں معافی نامہ طلب کیا جس پر وہ تیار نہ ہوئے۔ نجیب اشرف کے چھوٹے بھائی علی اشرف کلکتہ میں زیر تعلیم تھے ان کے بلانے پر کلکتہ چلے گئے اور بی اے فائنل میں داخل ہوئے ۱۹۲۴ء میں فارسی لے کر فرسٹ کلاس فرسٹ آئے پھر ۱۹۲۶ء میں ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ اور یونیورسٹی کا سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

کلکتہ میں اپنی تعلیم کے دوران ہی وہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے بھی وابستہ رہے تھے۔ جب تعلیم پوری کر لی تو رقعات عالمگیر کی ترتیب کے سلسلے میں مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار کے ساتھ دو سال تک کام کرتے رہے۔ انہی دنوں کلکتہ میں پروفیسر محفوظ الحق، چراغ حسن حسرت (لاہور) عبدالرزاق ملیح آبادی، وغیرہ سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے صرف سو روپے ماہانہ پر کام کرنے لگے ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج، احمد آباد میں لکچرر مقرر ہوئے۔ وہیں گجراتی اور گجراتی زبان سے تعلق پیدا ہوا اور گجرات میں اردو کی پہلی ادبی صورت پر تحقیق کی۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ اسماعیل یوسف کالج کا بمبئی میں اجرا ہوا اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے یہاں آ گئے اور ۲۴ سال کی خدمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں پینشن پائی اس کے بعد وہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مستقل ڈائرکٹر اور اس کے سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے، یہاں تک کہ موت نے یہ رشتہ منقطع کر دیا۔

نجیب اشرف ندوی کا پہلا مضمون "زمانہ" کانپور میں چھپا۔ اس کے بعد معارف، ہمایوں، اردو، الناظر، جامعہ، نیرنگ خیال، زمیندار (لاہور)، انقلاب (لاہور)، ہمدرد (دلی) میں ان کے بے شمار مضامین اور مقالے شائع ہوئے۔

کتابوں میں رقعات عالمگیر، لغات گجری، مہاتما گاندھی کی تصنیف سوراج" کا ترجمہ" رسمائے سخن شائع ہوئیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایک شفیق استاد تھے، اپنے شاگردوں سے وہ اس طرح تعلق رکھتے تھے کہ وہ انہیں کبھی نہیں بھولے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بڑے احترام سے پیش آتے۔ ایک محقق کی حیثیت سے وہ بے حد محتاط تھے تحقیقی کاموں میں وہ ہمیشہ گہرائی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک بار انہیں معارف" کے لئے ایک مشہور تحقیقی کتاب پر ریویو لکھنا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اس کام کے لئے انھوں نے پہلے ڈیڑھ سو کتابوں کا مطالعہ کیا تب جا کر وہ تبصرہ لکھا۔ ان کے مقالوں اور تصنیفات میں بھی ہر لفظ اور ہر فقرہ جچا تلا اور تحقیق کی کسوٹی پر کسا ہوا تھا تحقیق کے ساتھ ان کی تحریر میں زور تھا۔

نجیب اشرف ندوی نہ صرف عالم اور محقق تھے بلکہ اردو کی تحریک سے بڑی گہری اور عملی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق بمبئی آئے تو انجمن کی ریاستی شاخ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دورے کئے شاخیں قائم کیں۔ پی۔ ای۔ این، یونیورسٹی، سکنڈری بورڈ اور مختلف تعلیمی اور علمی اداروں سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ امسال اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

ندوی صاحب کے گھر کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ مقامی اور باہر سے آنے والے ادیب، شاعر، انشا پرداز اور محقق وہاں جا کر اس بزرگ ادیب سے شرف ملاقات حاصل کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔ نجیب اشرف ندوی کی وفات سے اردو ادب میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے۔

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان میں غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۶۔ غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات (مراسلہ) — اکبر علی خاں رامپور — ۱-۲-۶۸

۱۷۔ غالب میموریل عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے صدر جمہوریہ کی تقریر — نئی دہلی — ۱-۳-۶۸

۱۸۔ غالب نے آنے والی نسلوں کو دیا انداز فکر جدید رجحان اور ترقی پسند شعور بخشا — لکھنؤ — ۱-۳-۶۸

۱۹۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں یوم غالب — دلی — ۱-۳-۶۸

۲۰۔ انجمن ترقی اردو بنارس میں یوم غالب — بنارس — ۱-۳-۶۸

۲۱۔ نثار احمد صدیقی کے مراسلے کے بارے میں (بحوالہ ہماری زبان ۸ فروری ۶۸ء ایک دعوت فکر) — ۸-۳-۶۸

۲۲۔ جموں و کشمیر میں جشن غالب کمیٹی کا قیام — جموں — ۸-۳-۶۸

۲۳۔ ہیرن پور میں یوم غالب — ہیرن پور سنتھال — ۸-۳-۶۸

۲۴۔ اودے پور میں یوم غالب — اودے پور — ۸-۳-۶۸

۲۵۔ صد سالہ جشن غالب کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا پروگرام — بنگال — ۸-۳-۶۸

۲۶۔ مشاعرہ بسلسلہ جشن صد سالہ غالب — بنارس — ۸-۳-۶۸

۲۷۔ اردو گھر (اداریہ)
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
— علی گڑھ — ۲۲-۳-۶۸

۲۸۔ غالب کے کلام کا بنگلہ میں ترجمہ — کلکتہ — ۲۲-۳-۶۸

۲۹۔ بریلی میں یوم غالب کا پروگرام — بریلی — ۲۲-۳-۶۸

۳۰۔ بہار میں جشن غالب کی تیاری — آرہ بہار — ۲۲-۳-۶۸

۳۱۔ مشاعرہ بیاد غالب — حیدرآباد — ۲۲-۳-۶۸

۳۲۔ شاہجہاں پور میں یوم غالب — شاہجہاں پور — ۲۲-۳-۶۸

۳۳۔ بیاد غالب — پاکستان — ۲۲-۴-۶۸

۳۴۔ مولانا آزاد کی یاد میں نمائش مولانا کا انگریزی میں لکھا ہوا غالب پر تبصرہ بھی دکھایا گیا ہے بحوالہ پیٹریاٹ انگریزی روزنامہ بتاریخ ۱۶ اپریل ۱۹۶۸ء — نئی دہلی — ۲۲-۴-۶۸

۳۵۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے
— علی گڑھ — ۲۲-۴-۶۸

۳۶۔ انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم (۱) غالب کی سویں برسی کے موقع پر انجمن کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے — علی گڑھ — ۱-۵-۶۸

۳۷۔ دیار کی پولی الطلم" غالب نے آغوش کو اس کی حسن ترتیب دو دو رو دیا" — حرم الاکرام — ۱-۵-۶۸

۳۸۔ نذر غالب — انیس انور — ۸-۵-۶۸

۳۹۔ پنسلوں پر مرزا غالب کی تصویر — کراچی — ۱۵-۵-۶۸

۴۰۔ یہ غزل کس کی ہے (تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ غزل غالب کی ہے یا ناظم کی) — نثار احمد صدیقی — ۱۵-۵-۶۸

۴۱۔ ایک گذارش (مجھے مرزا غالب کی زندگی پر ڈرامہ فلمبند کرنے کے سلسلے میں اس ڈومنی کے حالات درکار ہیں) — ڈی۔ اے ہیرسن — ۱۵-۵-۶۸

۴۲۔ انجمن کی شاخ ضیا پوکھر کلکتہ کا غالب انعامی مقابلہ — ادریس انور — ۱۵-۵-۶۸

۴۳۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — ڈاکٹر سید محمد حسن — ۲۲-۵-۶۸

۴۴۔ صد سالہ جشن غالب کی جھلکیاں — نئی دہلی — ۱-۶-۶۸

۴۵۔ غالب نگر — سید دلدار حسین — ۱-۶-۶۸

۴۶۔ انجمن ترقی اردو دربھنگہ کے زیر اہتمام یوم غالب — دربھنگہ — ۱۵-۶-۶۸

۴۷۔ ملتان میں ایوان غالب کا قیام — محمد نصیر الدین — ۱۵-۶-۶۸

۴۸۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر — علی گڑھ — ۲۲-۶-۶۸

۴۹۔ بیرون ممالک میں غالب کی سویں برسی کی تیاری — سیاست — ۱-۷-۶۸

۵۰۔ غالب کا ایک قطعہ (مراسلہ) — محمد عباس طالب صفوی — ۱-۷-۶۸

۵۱۔ اتر پردیش غالب کمیٹی کے زیر اہتمام کل ہند کمیٹی منعقد کی جائے گی۔ — لکھنؤ — ۸-۷-۶۸

۵۲۔ غالب کے سلسلے میں مولوی عبد الحق کا ایک مراسلہ — محمد عبد اللہ قریشی — ۸-۷-۶۸

۵۳۔ مرکزی غالب کمیٹی سے — گیان چند — ۸-۷-۶۸

۵۴۔ مدھیہ پردیش میں غالب کی سویں برسی کی تیاریاں — آفاق احمد — ۸-۷-۶۸

۵۵۔ غالب کا اسلوب از شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی۔ — اکبر علی خاں — ۱۵-۷-۶۸

۵۶۔ میرا صفحہ (گل رعنا غالب کا گم شدہ انتخاب مالک رام) — آل احمد سرور — ۲۲-۷-۶۸

غالب کو وزیر اعظم کا خراجِ تحسین

نئی دہلی۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا کہ اردو کے مشہور شاعر غالب حیاتِ جاوید حاصل کرنے والے شاعروں میں سے ایک ہیں غالب کی شاعری سے زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بات اس پیغام میں کہی ہے جو انھوں نے بمبئی یادگار کمیٹی کو روانہ کیا ہے۔ مسز گاندھی کل ہند غالب صد سالہ تقریب کمیٹی کی بھی چیرمین ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک شاعر کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خراجِ تحسین ہوگا کہ اس کا کلام عوام کے کلچر میں شامل ہو جائے۔ انھوں نے بہت پرآشوب زمانہ دیکھا تھا جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے ان کا بیشتر کلام عوام کی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ اور ان کے خوبصورت اشعار کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ کسی شاعر کی عام مقبولیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ (قومی آواز)

بمبئی میں غالب ٹرافی کے لئے مباحثہ

بمبئی گذشتہ ہفتہ، سینٹ زیویر کالج کے آڈیٹوریم میں مرزا غالب اردو ٹرافی کے لئے ایک شاندار تقریری مقابلہ منعقد ہوا جس میں بمبئی عظمیٰ کے ۶ کالجوں مہاراشٹر کالج، اسمٰعیل یوسف کالج، صوفیہ کالج، سدھارتھ کالج، سینٹ زیویر کالج اور مہارشی دیانند کالج کے طلبہ نے حصّہ لیا۔ تقریب کی صدارت اکبر پیر بھائی نے انجام دی۔ ججوں میں مشہور شاعر کیفی اعظمی بھی شامل تھے۔ اول آنے والے ایم۔ ڈی کالج کے طلبہ کی تقاریر کو بہت سراہا گیا۔ جن دیگر کالجوں کو انعام دیا گیا ہے ان میں اسمٰعیل یوسف کالج (سکنڈ پرائز) اور سینٹ زیویر کالج (رعایتی پرائز) شامل ہیں (ہندوستان)

مدراس میں غالب کی صد سالہ برسی کا پروگرام

مدراس۔ جمال محمد کالج ترچناپلی صوبہ مدراس کی اردو اسوسی‌ایشن نے یہ طے کیا ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ایک سیمینار اور مشاعرے کا انتظام کرے۔ تقریبات کی تفصیل یہ ہے۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء دوپہر میں دو بجے سے ساڑھے چار بجے تک "غالب سمپوزیم" ہندوستان کی مختلف زبانوں میں غالب پر مقالے پڑھے جائیں گے۔ پانچ بجے سے چھ بجے تک غالب کی زندگی پر ایک مختصر ڈرامہ پیش کیا جائے گا۔ چھ سے ساڑھے سات بجے تک "محفلِ نغمہ" ہوگی جس میں جنوبی ہند کے قد آور موسیقار غالب کی غزلوں کو ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کریں گے۔ اسی شب کو دس بجے سے کل ہند مشاعرہ ہوگا جس میں مقامی اور بیرونی شعراء شرکت فرمائیں گے۔ ان تقریبات میں جنوبی ہند کے کالجوں کے اردو شعبہ جات کے اساتذہ اور طلبہ شرکت فرمائیں گے۔ جو مقالے سمپوزیم میں پڑھے جائیں گے ان کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں کالج لائبریری ہال میں "غالب نمائش" ترتیب دی جائے گی۔ جس میں غالب سے متعلق مختلف کتابیں اور تصویریں رکھی جائیں گی "مرزا غالب" فلم شو کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ (حسرت سہروردی)

کشمیر میں غالب صد سالہ کمیٹی کے زیر اہتمام شامِ قوالی

جموں، غالب صد سالہ کمیٹی جموں کے زیر اہتمام گلاب بھون میں ایک شامِ قوالی منعقد کی گئی۔ مہمانوں میں مجبور گڈر کمیشن کے ممبران جناب بدرالدین طیب جی اور جناب شنکر پرشاد اور سکریٹری بی۔ پی مانگی بھی موجود تھے۔ یہ پروگرام غالب صد سالہ تقریبات کے حصے کے طور پر غالب صد سالہ کمیٹی نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیلڈ پبلسٹی یونٹ کے اشتراک سے ترتیب دیا تھا۔ (سکریٹری)

ہندوستان کی ذہنی و سائنسی ترقی میں ہندی کا حصہ برائے نام
جلسہ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کا خطبہ

کلکتہ ممتاز زبان داں اور علوم لسانی کے نیشنل پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے ہندوستانی تعلیم میں انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر برقرار رکھنے کی وکالت کی ہے۔ انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے سالانہ کانوکیشن سے خطاب کرتے ہوئے مادری زبان انگریزی اور ایک تیسری زبان کا خواہ وہ قومی ہو یا بیرونی مطالعہ لازمی قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر چیٹرجی نے تجویز پیش کی کہ اسکول کی دس سالہ تعلیم کالج کی چار سالہ تعلیم اور تین سالہ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا نظام بحال کیا جائے۔ انھوں نے سیاسی جماعتوں کو قصوروار قرار دیا کہ وہ طلبہ کو اپنے ناپاک جماعتی مفاد کے لئے استعمال کر رہی ہیں اور دانستہ طور پر بدقسمت اور مایوس طلبہ کو گھٹیا نعروں اور غلط سلط باتوں سے گمراہ کر رہی ہیں ڈاکٹر چیٹرجی نے رفتہ رفتہ تعلیم کے معیار کے گرنے پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں بہت سے مضامین کا حد سے زیادہ بوجھ اور تعلیمی منصوبوں کے غیر ذمہ دارانہ اور بے لگام تجربہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ میں مرکزی حکومت سے انکساری کے ساتھ درخواست کروں گا کہ وہ لوگوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے جو ہندی بولتا یا استعمال کرتا ہے اور جس کا غالبہ صدیوں میں ہندوستان کی ذہنی اور سائنسی ترقی میں حصّہ بالکل برائے نام رہا ہے، صرف خیالات اور جذبات کا احترام کرنے کے لئے ہماری قومی زندگی کی اچھی اور قابلِ قدر چیزوں کو تباہ نہ کرے۔ ہندی کی تنصیب ایک زبان کے طور

والے [illegible] مستقلاً غیر منصفانہ خصوصی مراعات دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں دینے کے مترادف ہوگا۔ آل انڈیا سروسوں کے امتحانات صرف انگریزی میں جاری رکھنا ہوں گے۔ (سیاست)

غازی آباد کی فلمی صنعت میں دوسری زبانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا

بمبئی، فلمی دنیا کے مشہور و ممتاز اداکار پروڈیوسر اور ڈائرکٹر جناب سنیل دت نے اپنے سے منسوب اس قسم کے تمام بیانات کو غلط قرار دیا ہے کہ غازی آباد (اتر پردیش) میں قائم ہونے والی فلمی صنعت زبان کے معاملہ میں صرف ہندی کو اپنائے گی انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی پوری طرح تشریح و توضیح کی اور بتایا کہ بعض ہندی اخبارات نے اپنے طور پر مجھ سے منسوب کر کے متعلقہ بیانات شائع کئے اور انھیں کی وساطت سے دوسرے اخبارات نے ان بیانات کی اشاعت کی۔ یہ ان اخبارات کی اپنی خواہش اور رائے ہو سکتی ہے میری نہیں۔ جہاں تک میرے اپنے نقطۂ نظر کا تعلق ہے میں قومی یکجہتی پر عقیدہ رکھتا ہوں ہندو۔ سکھ۔ عیسائی سب کو ہندوستانی قوم کا حصہ تصور کرتا ہوں اور سب کا برابر کے درجہ عزت و احترام کرتا ہوں اسی طرح زبانوں کے معاملہ میں بھی کسی تنگ نظری کا شکار نہیں ہوں۔ ہندی، اردو اور تمام دوسری درج آئین زبانیں میرے لئے قابل احترام ہیں اور حسب ضرورت ہم ہر زبان سے فائدہ اٹھائیں گے میرے لئے محض "ہندی نواز" ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(سیاست)

ہندو شاعروں نے اردو کے لئے مسلمانوں سے زیادہ کام کیا ہے

مراد آباد: توڑی جانے والی اتر پردیش اسمبلی کے اسپیکر جگدیش سرن اگروال نے ہندی کو ہندوستان کی رابطہ کی زبان برقرار رکھنے کی وکالت یہاں روٹری کلب میں انگریزی زبان کے ذریعہ کی۔ روانی سے انگریزی بولتے ہوئے انھوں نے اس تضاد پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ روٹری کلب کے ممبران انگریزی میں بہتر سمجھتے ہیں اور میرے نقطۂ نظر کو اس زبان کے ذریعہ بہتر سمجھ سکتے ہیں اس لئے میں انگریزی میں بول کر اپنے اس خیال کو پیش کر رہا ہوں کہ انگریزی نہیں بلکہ ہندی رابطہ کی زبان ہو۔ اگروال نے کہا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے اعلان کے فوراً بعد ہندی کو عام زبان بنانے کے بارے میں دستور ساز اسمبلی کے فیصلہ کو عملی جامہ نہ پہنا کر بہت بڑی غلطی کی گئی تھی ہمارے سامنے ترکی کی مثال ہے جس نے حصول آزادی کے فوراً بعد ترک زبان کو قومی زبان قرار دینے میں پس و پیش نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یہ سوال متنازعہ نہ بنتا جیسا کہ آج بنا ہوا ہے۔ انھوں نے ہندی کے شیدائیوں سے اس بات پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی اپیل کی کہ راجاجی جیسے پایہ کا لیڈر جس نے اس زمانہ میں جب وہ مدراس کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ہندی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا آج ہندی کے شدید مخالف ہیں آج ہندی کے حامیوں میں کچھ خامی ہے جس کے باعث دکنی ہندوستان والے ہندی کو عام زبان نہیں تسلیم کرتے انگریزی سائن بورڈ ہٹانے اور ہندی کے نام پر تشدد کا ارتکاب کرنے سے وہ اپنے نصب العین کے ایک انچ بھی قریب نہ ہو سکیں گے۔ صرف پیار سے ہندی کو غیر ہندی لوگوں کے لئے قابل قبول بنایا جا سکتا ہے۔ ہندی کی خاطر جنگ غیر ہندی ریاستوں میں ہونی چاہئے ہندی بولنے والی ریاستوں میں نہیں۔ انگریزی کے متعلق اگروال نے کہا کہ یہ خیال غلط ہے کہ سائنس میں ترقی انگریزی کے بغیر ناممکن ہے روس والے سائنسی اعتبار سے آج دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن انھوں نے سائنس اپنی زبان کے ذریعہ پڑھی انگریزی کو لائبریری کی زبان کے طور پر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا کا منظر پیش کرنے والی واحد کھڑکی نہیں ہے بلکہ کئی کھڑکیوں میں سے ایک ہے انھوں نے اردو کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ کہنا بہت غلط بات ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے درحقیقت ہندو شاعروں نے اس کی ترقی کے لئے مسلمانوں سے زیادہ کام کیا۔ (سیاست)

پی ٹی آئی کا شعبۂ اردو

حیدرآباد۔ جناب کے کے شاہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات کو پریس ریوڈیرس گلڈ میں منعقدہ تقریب میں پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد سے متعلق اردو سکشن میں توسیع کی ضرورت پر متوجہ کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ دہلی سے اخبارات کو اشاعت کے لئے مواد بعجلت تاخیر سے وصول ہوتا ہے جناب شاہ نے کہا کہ یہ مواد بذریعہ طیارہ دہلی سے حیدرآباد بھیجا جاتا ہے جس پر ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی کہ یہ دوسرے اخبارات میں اشاعت کے بعد وصول ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ حیدرآباد کے اردو پی ٹی آئی سکشن میں اضافہ کی ضرورت ہے جس طرح تلگو اور انگریزی میں زیادہ اسٹاف ہے اسی طرح اردو سکشن پی ٹی آئی میں بھی اضافہ کیا جانا چاہئے کیونکہ حیدرآباد سے چھ اردو روزنامہ اور ۴۰ ہفتہ وار اور کئی سو کی تعداد میں ماہنامے اجرا ہوتے ہیں جناب شاہ نے اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کا یقین دلایا۔ (رہنمائے دکن)

ترقیاتی منصوبہ کی اشاعت کے لئے یوپی میں اردو کا استعمال غیر تسلی بخش

لکھنؤ۔ حکومت یوپی نے اپنے چوتھے منصوبے کے بارے میں نشر و اشاعت کے لئے ابھی تک اردو زبان کا استعمال نہیں کیا ہے حالانکہ یوپی میں ایک کروڑ افراد کی مادری زبان اردو ہے مولانا شاہد فاخری نے منصوبہ بندی مشاورتی کمیٹی کے ۲۸ جولائی والے جلسہ میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ریاست کے پلاننگ ڈیپارٹمنٹ

مراسلات

استادِ غالب کے سلسلے میں

منشی درگا پرشاد نادر دہلوی نے اپنی کتاب "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" (مطبع مفید عام، لاہور؛ ۱۸۷۹) میں صفحہ ۲۰۸ پر لکھا ہے:

"غالب جو اپنے تئیں شاگردِ خالق اور استادِ مخلوق سمجھتے رہے، ان کی نسبت صاحبِ "گلستانِ بے خزاں" نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ شخص نظیر اکبر آبادی اور اس کے بیٹے میر گلزار علی اسیر کے شاگرد ہیں۔ میں نے (نادر نے) جو ایک دو شاعر عمر رسیدہ سے سن کر ان کو نصیر کا شاگرد لکھا ہے تو اکثر شعرائے دہلی نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے۔ واقعی غالب نے اشعار اردو کی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ غرضیکہ شائقین کتاب مذکورۂ بالا کو ملاحظہ فرمائیں تو اس کا لطف اٹھائیں، نہ مجھے یارائے مقابلہ و مجادلہ، نہ میرے اس کاغذ ناکارہ میں اس کی تحریر و تقریر کا گزارہ العاقل تکفیہ الاشارہ۔ ہاں دہلی کے ایک شخص منشی کنھیا لال صاحب وحشی تخلص نے اس کا مختصر سا جواب الجواب چھپوایا ہے وہ بھی ملاحظے کے لائق ہے۔"

قارئین ہماری زبان سے یہ التماس ہے کہ کنھیا لال وحشی کا مذکورۂ بالا رسالہ جو انھوں نے "گلستانِ بے خزاں" کے رد میں اور غالب کے شاگردِ نظیر اکبر آبادی نہ ہونے کے اثبات میں لکھا تھا، کہیں نظر سے گذرا ہو تو اس کی نشاندہی کریں۔

(نعیم احمد شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ایک تجویز

میں محترم اداریہ ہماری زبان کو ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں امید ہے کہ کارگر ثابت ہوگی اور پسند کی جائے گی۔ وہ تجویز یہ ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے پرمسرت موقع پر ہماری زبان بھی غالب نمبر کا اجرا کرے۔ اور دوسری تجویز ہے کہ ایک ایسا ماہنامہ رسالہ نکالا جائے کہ جس میں نئے ادبا و شعرا اپنی تخلیقات شائع کرا سکیں۔ کیونکہ بڑے بڑے اخبار و رسائل نئے لکھنے والوں کو چانس ہی نہیں دیتے اور اس ماہنامہ کا نام آہنگِ نو رکھا جائے۔

(محمد خالد ہوا محل روڈ بھوپال)

نظم مجبوری کے بارے میں

اس وقت میرے سامنے ہماری زبان کا مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۶۸ء کا شمارہ ہے اور اس سلسلے میں مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے تاکہ اگر مجھے کوئی غلط فہمی ہوگئی ہو تو وہ آپ کے ذریعہ جواب پاکر رفع ہو جائے۔

شمارہ ہذا کے صفحہ ۱۲ پر جناب ساجد اثر صاحب کی نظم "مجبوری" شائع ہوئی ہے۔ اس نظم کے سلسلے میں کچھ گوش گذار کر رہا ہوں۔

اولین چیز اور خاص بات یہ ہے کہ نظم اثر صاحب نے کسی "وزن" کا التزام رکھتے ہوئے لکھی ہے یا "بے وزن" ہے۔ اگر "بے وزن" ہے تو مجھے کچھ نہیں کہنا ہے!! اور اگر اثر صاحب نے کسی وزن کا التزام رکھا ہے جیسا کہ نظم کے آہنگ سے ظاہر ہے تو نظم کو اس کے "ارکان" "وزن" کا التزام رکھتے ہوئے کیوں نہیں لکھا گیا؟ نظم کے خیالات و جذبات کے برعکس (ویسے نظم خاصی فکر انگیز ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناظم نے دانستگی یا نادانستگی میں نظم کو اس کے "ارکان" یا "وزن" کے مطابق نہ لکھ کر یوں ہی لکھ دیا ہے جس سے کہ وزن کے ارکان مجروح ہوتے ہیں۔

(رضاء القدر خاں خاطر حافظی گورکھپوری)

تصویرِ غم کے بارے میں

۸ اگست کے ہماری زبان میں "تصویرِ غم" کے عنوان سے کسی عبید اللہ صاحب کا مراسلہ میری نظر سے گذرا جس میں فاضل مراسلہ نگار نے میرے مضمون تصویرِ غم زین آباد (صدی مئی ۶۸ء) اور پروفیسر شیخ فرید کے مضمون "تاج محل" (اردو ادب علی گڑھ ۶۵ء) میں کچھ سطور کی مماثلت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محترم شیخ فرید کی تھیسس اور کچھ دیگر ضروری کاغذات جو ۱۹۵۷ء میں کسی سفر میں گم ہوئے تھے، وہ میرے ہاتھ لگ گئے ہیں جن سے استفادہ کرکے میں نے زیرِ بحث مضمون لکھا ہے۔ میرے مضمون کا ماخذ محترم شیخ فرید کا مضمون "تاج محل" اور ڈاکٹر انشور پرشاد کی دو کتابیں تھیں جن کا حوالہ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ ایڈیٹر کو لکھے گئے خط میں دیدیا تھا اس لئے مماثلت کا ہونا ضروری تھا۔ جہاں تک تھیسس اور ضروری کاغذات کی گمشدگی کا سوال ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ محترم عبید اللہ صاحب کو یہ سوچنا چاہئے کہ کوئی کسی کی تھیسس پاکر اس سے مضمون لکھنے کی حماقت نہیں کرے گا بلکہ وہ ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

(موسیٰ مجروح)

ا[illegible] عقلیت پسندی کے دھارے

مہدی افادی کے مقالات" افادات مہدی" میں بعض ایسی غیر معمولی چیزیں نظر آتیں جن کی طرف یا تو اردو ادیبوں، ادب دوستوں اور ناقدوں نے توجہ ہی نہیں دی۔ یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اردو ادب میں عقلیت پسندی کی اس اہم رو کا نوٹس لینا ضروری ہے: اور کتنا پہلے لکھا ہے مہدی نے! یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے جب وہ لکھتے ہیں۔

" انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم کے خیال کے مطابق مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں اعتقادی اور عملی عملیات کا زیادہ تر حصہ صرف مختصر انتظام سوسائٹی اور اس کی وقتی ضروریات ہوا کرتی ہیں۔۔۔ روشن خیال علمائے اسلام کا خیال ہے کہ شرائع ضروریات انسانی کے تابع ہیں، جس طرح ضروریات انسانی بدلتی رہتی ہیں شرائع میں بھی ربڑ کے سے تمدد یعنی گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے۔ کیونکہ اصولاً اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اول ان لوگوں کی دماغی قابلیت اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہو لیتا ہے جو اسے قبول کرتے ہیں اور بعد میں ان کی دماغی اور اخلاقی سطح کو بلند کرتا ہے یعنی اسلام ایک ترقی پذیر مذہب ہے۔ ۔ ۔

" تمدنی امور میں سرے سے مذہب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں ہمارے افعال کو صرف حیثیت افادی اور فوائد اخلاقی کا تابع ہونا چاہیئے یہی اصول موضوع آج شائستہ اور مہذب دنیا کی ترقیات کا عنوان ہے ایک کام کو اس لئے کیجئے کہ اس میں بمقابلہ جز اکے فوائد کے پہلو زیادہ ہیں اور یہ کہ وہ فی نفسہ اچھا ہے اور چونکہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے، میں نہیں جانتا اخلاقی منظوری کے سوا کسی اور منظوری کی ضرورت ہے! یہی حیثیت افادی ہے جس کا مذاق یورپ میں رچ گیا ہے ۔۔

"یونانیوں کا تخیل صرف تکمیل انسانیت تھا، یعنی وہ ہستی موجودہ سے آگے نہیں جاتے تھے۔ ان کے خیال میں قوائے فطری کی کامل نشو و نما اور ان کا معتدل استعمال بس یہی غایت زندگی تھی یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ہستی جو گہوارے سے شروع ہوتی ہے اور بہیئت موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی، ایک حرف غلط ہے ترقی کا افتتاح آغوش لحد میں پہنچ کر ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم کہاں تک متمدن اقوام سے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے!

"... پردہ ایک نہایت قدیم رسم ہے جو مختلف اقوام و ملل میں وقتاً فوقتاً رہی ہے، جس کو اسلام کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں۔۔۔ ہر زمانہ میں عورت ایک اضافی اور ضمنی شے سمجھی گئی جو محض حصول تلذذ کے لئے مردوں کے نفسانی جذبات کا تختۂ مشق بنتی رہی ۔۔۔۔۔۔ جب اس کے اچھے دن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کا ایک ضمیمہ یعنی زیادہ سے زیادہ کنیز تھی۔۔۔۔۔۔

" آج کل زمانہ تزاحم فی الحیات کے سلسلے میں جکڑا ہوا ہے۔ جس کے لئے ہم کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کی بھی، اخلاقی اور دماغی قوتوں کو کامل نشو و نما اور تحریک دی جائے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ گرفتاران قفس یعنی عورتیں پردہ کی اوٹ سے باہر نہ آئیں!

" ۔۔۔۔ میں نہیں جانتا اختلاف جنس کے سوا مرد و عورت میں کوئی تفریق ممکن ہے۔ عورت مرد کی طرح فطرۃً ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور وہ اپنے اعمال و افعال میں اتنی ہی آزاد ہے جس قدر اس کا فرد مقابل۔ اس لئے انسانی پیداوار کے نصف بہتر حصے کی روپوشی یعنی ناک کان چھید کر گھر کی چار دیواری میں نظر بند رکھنا، ایک طرح کا غیر ضروری تعطل اور واضع آئین فطرت کی غایت اصلی کے لحاظ سے بالکل غیر طبعی امر ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری عورتیں اپنے فیصلۂ قسمت یعنی دائم الحبس رہنے پر رضامند ہیں ان کو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ رضا اگر ہو ایسی ہی ہوگی جس طرح پر شکستہ طائر قفس اپنی محدود وسعت پر قانع ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے تمدن کی طرف سے یہ امر بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہے کہ صنف نازک کا چہرہ اور ہاتھ ستر عورت نہیں ہے ۔ ۔

" ہم کو اپنے آئندہ نسل کی ترقی کے لئے یہ کرنا ہے کہ جن گہوارے میں ان کی ابتدائی نشو و نما ہو وہ نمونۂ شائستگی اور دماغی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ہر طرح کے معنوی لطف سے آراستہ و پیراستہ ہوں، اور یہ قطعاً ممکن نہیں جب تک موجودہ گھونگھٹ کو خیرباد نہ کہا جائے۔

" عورتوں کی آزادی کے خلاف جو شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں ان میں آزادی کا جو فی نفسہ اچھی چیز ہے ہمیشہ غلط استعمال ہوا ہوگا، اس کی روک تھام ضروری ہوگی بے شک! یہ ایک دن کا کام نہیں، نہ یہ منظور ہے کہ کل کا ہوتا آج ہی سب کچھ ہو جائے مگر اصولاً ہم کو ایک بات طے کر لینی چاہئے!" (از عرب)

منصر
شہریار

سہ ماہی 'صبح' - جواہر لال نہرو نمبر
مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

ستمبر ۶۵ کے بعد سے ہندوستان کی سیاست میں اس حلقہ کا اثر بڑھتا جارہا ہے جو پنڈت جواہر لعل کی انسان دوست پالیسی سے بنیادی اختلاف رکھتا تھا پنڈت جی کی خارجہ پالیسی سے اس حلقہ کی بے اطمینانی اور ان کی امن پسندی سے بیزاری بڑی حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن ادھر ملک کے ترقی پسند حلقوں میں جس طرح سے پنڈت جی کے کارناموں کو کم کرکے پیش کرنے کا رجحان پیدا ہورہا ہے۔ وہ خاصا خطرناک ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پنڈت جی کے سیاسی کارناموں کو اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ان کی خواہشوں اور خوابوں کو معروضی طور پر لیکن اس کے صحیح اور حقیقی پس منظر میں پیش کیا جائے۔ ہندوستان کی مختلف جدید زبانوں میں یہ کام کسی نہ کسی حد تک شروع ہوچکا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان و ادب نے جس طرح پنڈت جی سے اپنے کو IDENTIFY کیا ہے کسی اور زبان نے نہیں کیا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان و ادب جن انسانی اور تہذیبی قدروں اور معیاروں سے عبارت ہے اس کی جلوہ گری اگر کسی ایک ہندوستانی میں نظر آتی ہے تو وہ پنڈت جی کی ذات ہے اپنے محدود وسائل کے باوجود اردو رسائل نے پنڈت جی کی شخصیت اور کارناموں پر جتنے اور جیسے معیاری خاص نمبر شایع کئے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ رہاستی شارع دہلی کے سہ ماہی علمی رسالہ 'صبح' نے بھی حال میں جو جواہر لعل نہرو نمبر شایع کیا ہے اس نمبر کی ترتیب کے فرائض جناب عبداللطیف اعظمی نے انجام دئے ہیں۔ اس نمبر میں جہاں مضامین کے موضوعات اور عنوانات کے انتخاب میں جہاں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پنڈت جی کی شخصیت اور کارناموں کے اہم پہلو ضرور سامنے آجائیں وہاں ان مضامین کی ترتیب میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ ان سے پنڈت جی کی دلنواز شخصیت اور ان کی گہری فکر اور ہندوستانی عوام کے مسائل اور مستقبل کے خوابوں میں جو تعلق، ربط اور ہم آہنگی ہے وہ بھی ظاہر ہوجائے۔

نمبر کی ترتیب میں سب سے پہلے ان مضامین کو جگہ دی گئی ہے جو سیرت و شخصیت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے بعد 'انہوں کی نظر میں' کے زیر عنوان پنڈت جی کے بارے میں ہندوستان کی اہم شخصیتوں کے تاثرات کو اور 'غیروں کی نظر میں' کے زیر عنوان

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۱)

اُردو گھر فنڈ

یکم ستمبر ۱۹۶۸ء سے ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء تک

نمبر شمار	نام ومقام	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	کیفیت
۱	ڈاکٹر الف اے خاں کلیم شاہجہانپوری	۵-۰۰	منی آرڈر	خود
۲	قاری مراد خاں صاحب نون حیدرآباد	۱-۰۰	"	"
۳	ذکاالقدر خاں صاحب حافظ ہلدی حافظی گورکھپوری خورد	۵-۰۰	"	"
۴	سید شہاب الدین صاحب دسنوی بمبئی	۱۰۱-۰۰	چک	"
۵	پرنسپل عبدالغفار شاہ صاحب سری نگر کاشمیر	۱۰-۰۰	منی آرڈر	"
۶	ایم ایم گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول بولواہہ کاشمر	۹۰-۰۰	"	معرفت پرنسپل صاحب عبدالغفار شاہ
۷	انوار الحسن صاحب رانچی (بہار)	۱۵-۰۰	"	خود
۸	طاہر صدیقی صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	نقد	معرفت ایم۔ حبیب خاں صاحب، ماسٹر … برانچ انجمن ترقی اردو ہند
۹	نور الحسن لاری صاحب گورکھپور	۱-۰۰	"	
۱۰	اصغر علی ٹھیکیدار صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	"	
۱۱	نظام الدین صاحب لڑیا "	۱-۰۰	"	
۱۲	رحیم الدین صاحب ٹن ٹن پاڑہ "	۱-۰۰	"	
۱۳	ماسٹر ریاست علی خاں صاحب علی گڑھ	۱-۰۰	"	
۱۴	ماسٹر چودھری عبدالغفار خاں صاحب	۱-۰۰		
۱۵	ماسٹر محمد اراحمد خاں صاحب	۱-۰۰	"	
۱۶	مس افضال جہاں "	۱-۰۰		
۱۷	ماسٹر انوار احمد صدیقی صاحب "	۱-۰۰		
۱۸	ماسٹر خلیل الرحمٰن صاحب "	۱-۰۰		
۱۹	امام الدین ٹھیکیدار صاحب لڑیا	۵-۰۰		
۲۰	مدثر حسین صوفی صاحب ایم اے دانشکدہ امروہہ	۱-۰۰	منی آرڈر	خود
۲۱	صغرا بیگم صاحبہ مارٹ جلی سکندر آباد	۳-۰۰	نقد	معرفت …
۲۲	ڈاکٹر ہاشم اسرعلی صاحب تبلیار حیدرآباد	۱-۰۰	"	
۲۳	جناب ایس۔ ایم کاظم لکڑی کاپل حیدرآباد	۱-۰۰	"	
۲۴	جناب محمد فضل الرحمٰن پرو وائس چانسلر علی گڑھ	۵۰۰-۰۰	چک	خود
۲۵	سلطان احمد صدیقی صاحب اجین	۵-۰۰	منی آرڈر	"
۲۶	ایس ایچ اے قاضی صاحبہ ہیڈ ماسٹر ماناوسی بیک اسکول (کنارا)	۲-۰۰	"	"
۲۷	بشیر احمد ڈار صاحب منجانب سکیش ایم۔ ایم گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول پلواما کشمیر	۲۷-۰۵	"	معرفت بشیر احمد ڈار ٹرسٹ ایر کلاس

میزان حال	۱۰۲۴۹-۵۰
" سابق	۳۰۲۸۳-۰۰
کل میزان	۴۰۵۳۲-۵۰

مالک انجمن ترقی اردو ہند۔ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا

R.N-2/86/56

REGD-NO-L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

فون نمبر ۲۹ ILII۸
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۲۷ شمارہ ۳۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ ستمبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ہمارے پاس ممبئی کے گیارہ اردو دوستوں کا ایک خط آیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کئی سال ہوئے ممبئی کے مزدور علاقہ مدن پورہ میں ایک اردو ہال کی تعمیر کے لیے ممبئی کی پبلک سے چندہ لیا گیا تھا۔ مدن پورہ میں ایک دیواس کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ اس کے پاس ایک پریس اور کئی عمارتیں ہیں اس سوسائٹی کی ایک عمارت کا بالائی حصہ اردو ہال کی تعمیر کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ پروپیگنڈا شروع ہو گیا کہ ممبئی میں جو تنخواہ دار طبقہ اردو کے لئے تعمیری کام نہیں کر سکا۔ ممبئی کے مزدور اردو ہال بنائیں گے۔ اس میں کتب خانہ ہوگا، باہر سے علمی ادبی مقررین آئیں گے ان کے قیام کے لیے مہمان خانہ ہوگا عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لئے اس عمارت کی کھلی چھت پر مشاعرے، ادبی اور سیاسی تقریریں ہونے لگیں اردو ہال کے لیے مشاعرے، ڈرامے، دہلی کا یادگار مشاعرہ اسٹیج کیا گیا جس میں سہراب مودی سے لے کر راج کپور تک نے اداکاری کی۔ یہ سارے پروگرام ٹکٹ، عطیات، چندہ، بروشر شائع کر کے کاروباری اور فلمی حلقوں سے اشتہارات حاصل کئے گئے۔ اندازہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ چندہ جمع ہوا۔ ایک سہانی صبح سورج کی کرنیں پھیل رہی تھیں ان کی آمد کے ساتھ اخبارات ہاتھوں میں آئے تو معلوم ہوا کہ سوسائٹی کے لاکھ سوا لاکھ روپیہ نہایت چابکدستی سے خرد برد کر لئے گئے۔ اردو ہال کے روپے غائب ہیں۔ اخبارات میں مضامین آئے لیکن اردو کے ہمدردان و بہی خواہاں جو تمام پروگرام میں ٹکٹ، عطیات اور اشتہارات کے حصول میں پیش پیش رہے تھے، ایک نے بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ حساب فہمی کا تقاضا کرے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخ ممبئی کے اراکین نے بھی مصلحت پسندی کو شعار بنایا"

ممبئی کے ان اردو دوستوں نے ... اپیل کی ہے کہ

"اردو ہال کی رقم حاصل کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو ممبئی، اردو گھر ... ممبئی اور اردو زبان وادب سے متعلق جتنے ادارے ہیں ان کے نمائندے ایک کمیٹی بنا کر جد وجہد شروع کریں۔ اگر آسانی سے یہ رقم حاصل نہیں ہوتی تو اخبارات کے تعاون سے عطیات، چندہ، اشتہارات دینے والوں کی فہرست بنا کر رقم کا اندازہ لگایا جائے۔"

انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "اردو ہال کے لئے جو رقم اکٹھا ہوئی تھی اردو ہال کے منتظمین سے وہ رقم حاصل کر کے اردو گھر دہلی کو دے دی جائے۔"

ہمیں معلوم نہیں کہ اس خط میں جس بات کا ذکر کیا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ مگر چونکہ معاملہ اہم ہے اس لیے ہم ممبئی کے اردو دوستوں اور اردو اداروں کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس شکایت کی پوری جانچ کریں اور اگر خدانخواستہ اتنی بڑی رقم کا حساب صاف نہیں ہے تو متعلقہ حضرات سے حساب صاف کرلے اور رقم بینک میں جمع کرنے کا مطالبہ کریں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ اگر یہ رقم محفوظ ہے یا اسے متعلقہ حضرات سے حاصل کیا جائے گا، تو ہم چاہیں گے کہ یہ اردو ہال کی تعمیر پر ہی صرف ہو یا ممبئی کے اردو دوستوں کے مشورے سے ممبئی میں اردو کی بقا اور اشاعت کے کاموں پر صرف ہو۔ اردو گھر کے لئے ہم علیحدہ چندہ جمع کرنا چاہتے ہیں اور ممبئی کے اردو دوستوں سے بھی اردو گھر کے لئے چندے کی درخواست کرتے ہیں مگر یہ رقم ممبئی کے اردو دوستوں نے جس خاص مقصد کے لئے جمع کی تھی اسی پر صرف ہونی چاہیے۔

بہرحال اگر یہ الزام غلط ہے تو متعلقہ حضرات کی طرف سے اس کی تردید ضروری ہے اور اگر خدانخواستہ صحیح ہے تو ممبئی کے اردو اداروں کو مل کر اس سلسلے میں مناسب قدم اٹھانا چاہیے تاکہ یہ رقم اس کام میں آسکے جس کے لئے جمع ہوئی تھی۔ ہم نے

خط لکھنے والوں کے نام اور جن لوگوں سے شکایت ہے ان کے نام حذف کرنے مناسب سمجھے تاکہ بلاوجہ کسی پر الزام نہ آئے اور سارے معاملے کی پوری جانچ ہو سکے۔

۲۱ برس بعد حکومت اترپردیش کے اردو گزٹ کی اشاعت شروع

لکھنؤ۔ حکومت اترپردیش کا پہلا اردو گزٹ جاری ہو گیا ہے۔ اردو میں گزٹ جاری کرنے کا اعلان حکومت نے ۱۴ مہینے ہوئے کیا تھا۔ یہ پہلا گزٹ ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو گزٹ شائع کرنے کا اعلان ملی جلی ریاستی سرکار کے سربراہ چودھری چرن سنگھ نے یو۔پی اسمبلی میں ۱۴ ماہ قبل کیا تھا۔ اترپردیش حکومت کا دراصل یہ پہلا اردو گزٹ نہیں ہے آزادی سے قبل جب دوسری کانگرسی وزارت ۱۹۴۶ء میں بنی تھی تو اس وقت کے ریاستی وزیر داخلہ جناب رفیع احمد قدوائی کی کوششوں سے ریاستی سکریٹریٹ میں ایک "شعبۂ اردو" قائم ہوا تھا اور سرکاری گزٹ کے کچھ حصے اس محکمہ کے تحت اردو میں شائع ہونا شروع ہوئے تھے لیکن آزادی کے فوراً بعد اس اردو گزٹ کی اشاعت بند کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد ۲۱ برس تک اردو جاننے والوں کی اس سب سے بڑی ریاست اترپردیش میں اردو گزٹ شائع نہ ہو سکا۔ اس دوران اردو والوں کی طرف سے متعدد تحریکیں چلتی رہیں۔ انجمن ترقی اردو اور دوسری تنظیموں نے برابر حکومت سے مطالبہ جاری رکھا کہ ریاست میں اردو کی سرکاری سرپرستی بھی کی جائے اور منتخب قوانین و اعلانات اردو میں بھی شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں رائے عامہ کے دباؤ سے رفتہ رفتہ حکومت نے اردو کو بعض مراعات دینے کا اعلان کیا۔ فیصلہ یہ لیا گیا کہ چند منتخب اضلاع میں دفاتر و عدالتوں میں اردو میں درخواست دینے کی اجازت ہوئی اور گزشتہ الکشن کے بعد اردو گزٹ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود یہ معاملہ معرض التوا میں رہا۔ اترپردیش میں صدر راج قائم ہونے کے بعد ریاستی گورنر جناب بی گوپالا ریڈی اور چیف سکریٹری جناب بپن بہاری لال نے اس اردو گزٹ کے اجرا میں خصوصی دلچسپی لی اور ان دو افراد کی دلچسپی کی بنا پر اردو گزٹ شائع ہوا۔ سرکاری احکام اور ضوابط کے اردو میں ترجمہ کی روایت بہت پرانی ہے لگ بھگ سو سال پہلے آگرہ اور اودھ کے متحدہ صوبے (یوپی) کے قیام کے ساتھ ہی انگریزی میں مرتب اور نافذ ہونے والوں کا اردو ترجمہ ہونے لگا تھا منشی نول کشور کے پریس نے اس سلسلہ میں ریلوے، ریونیو، پولیس اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ان گنت سرکاری ایکٹ اور ضابطے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیے تھے اس سلسلے میں اصطلاحات کا مسئلہ کافی پیچیدہ تھا لیکن جب مولوی نذیر احمد نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا تو یہ مسئلہ کم از کم فوجداری اور دیوانی قانون کے میدان میں حل ہو گیا۔ مولوی نذیر احمد کے وضع کردہ الفاظ دفتری اور سرکاری نظم و نسق میں عام طور پر استعمال ہونے لگے۔ پولیس اور عدالت کے کام کاج میں آج تک مولوی نذیر احمد کے ترجمہ کی اصطلاحات رائج ہیں۔ اردو گزٹ کے اجرا کا اردو داں طبقوں میں زبردست خیر مقدم کیا گیا ہے اور اردو کی پرامن لڑائی لڑنے والے تمام افراد و انجمنوں نے اس گزٹ کا خیر مقدم کیا ہے اور گورنر اور چیف سکریٹری کو مبارکباد دی ہے۔ (قومی آواز)

دیوان غالب کا "لندن ایڈیشن" شائع ہوگا

لکھنؤ۔ لندن سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ "نئی صدی" کے زیر اہتمام لندن میں غالب صد سالہ یادگار "جشن منانے کا پروگرام" بنایا گیا ہے۔ اس موقع پر مرزا غالب کا اردو دیوان "لندن ایڈیشن" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ ماہنامہ "نئی صدی" کے مدیر اعلیٰ جناب سردول سنگھ نے جن کے اہتمام میں "لندن ایڈیشن" مرتب ہو رہا ہے مقدمہ لکھنے کے لیے پروفیسر سید احتشام حسین رضوی صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے استدعا کی ہے۔ دیوان کا متن اور انڈیکس آل انڈیا غالب اکاڈمی کے صدر مولانا مہیشر سنگھ تیار کریں گے۔ غالب صد سالہ تقریب کے سلسلے میں ادارہ "نئی صدی" لندن میں بزم مشاعرہ بھی منعقد کرنے کا اہتمام کر رہا ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز شعرا مدعو کیے جائیں گے۔ مرزا غالب کی نایاب تصاویر اور یادگار تحریروں کی جو صدر آل انڈیا غالب اکاڈمی مہیشر صاحب نے برسوں میں فراہم کی ہیں نمائش بھی کی جائے گی۔ اس جشن کے موقع پر اردو کے چند ممتاز انگریز شعرا کے موضوع پر ایک سمینار بھی کیا جائے گا۔

(قومی آواز)

غالب کی سویں برسی کے لیے بیرونی ملکوں کا دورہ

لکھنؤ۔ معلوم ہوا ہے کہ مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب کے سلسلہ میں چندہ جمع کرنے کے لئے دو اردو شاعر آئندہ مہینے کے دوران برطانیہ جائیں گے۔ واپسی پر وہ کینیا، یوگنڈا اور افغانستان کا دورہ کریں گے یہ دونوں شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی اور شکیل اتساہی ہیں۔ (سیاست)

نیپال کی بزم ادب کے اہتمام میں ایک اردو مشاعرہ

لکھنؤ۔ نیپال کی بزم ادب کی دعوت پر ہندوستان کے چھ شعرا نیپال جائیں گے۔ یہ ایک مشاعرے میں شرکت کریں گے۔ (الجمعیۃ)

چھاپا گیا ہے۔

(۴) ح یا ج ح خ یا ع غ کی درمیانی شکل نہیں بدلی گئی ہے مثلاً "سعید" کو "سعید" اور "صحت" کو "صحت" لکھا گیا ہے۔ (ہماری زبان کے ۲۲ر اگست ۱۹۶۸ء کے شمارے میں محمد شیث قیام پوری صاحب نے یہی بات لکھی ہے اس سے پہلے بھی یہ تجویز پیش ہوئی لیکن اسے عام کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔)

(۵) حتی الامکان آوازوں کے لحاظ سے جملوں کو اس طرح مترنم بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کی زبان پر آسانی سے چڑھ جائیں

(۶) ہم آواز عربی حروف مثلاً ح ع ص ض ط ظ وغیرہ اس وقت کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں جب کہ بچہ روانی کے ساتھ چھوٹی موٹی عبارت پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اس طرح پہلے اس میں خود اعتمادی پیدا کی جاتی ہے۔

(۷) جب بچہ ستائیس سبق پڑھ کر حروف تہجی سے پوری طرح روشناس ہو جاتا ہے اور مسلسل عبارت پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تب ایک عبوری سبق کے ذریعے اسے نسخ سے نستعلیق رسم خط کی طرف لایا جاتا ہے اٹھائیسویں سبق میں خاص طور پر ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جو پہلے آ چکے ہیں۔ انھیں پہلے نسخ اور اس کے نیچے نستعلیق رسم خط میں لکھا گیا تاکہ بچے خود ہی ان دونوں کا فرق معلوم کر لیں خاص طور پر شکلیں بدلنے والے حروف کا فرق سمجھ لیں۔[1]

(۸) دس سبق نستعلیق رسم خط میں درج ہیں جن سے اچھی خاصی مشق ہو جاتی ہے۔ اور بچے اگلی کتابیں نستعلیق میں پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے

(۹) کتاب میں تقریباً چھ سو الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ یہی تعداد مراٹھی اور دوسری زبانوں کی کتاب میں بھی ہے

(۱۰) تصویروں کے سلسلے میں آرٹسٹ کی داد دینی چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ چہرے مہرے میں بچے سے طلبہ کے نقطۂ نظر سے کافی جاذبیت پائی جاتی ہے بلکہ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تصویروں کو قد اور رنگوں کے اعتبار سے اسباق پر حاوی نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ صرف دلچسپی قائم کرنے کی ضرورت پوری کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قاعدہ اپنی نوعیت کا واحد قاعدہ ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اس سے بہتر اردو کا قاعدہ آج تک شایع نہیں ہوا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف مدرسین بلکہ تعلیم اور اردو کے بنیادی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب نقائص سے پاک نہیں امید کہ آئندہ وہ دور کر دیے ٭٭

٭٭ جائیں گے۔ کتاب کا سرورق مضبوط کاغذ سے بنایا گیا ہے۔ طباعت کی ساری خوبیوں کے باوجود قیمت ۹۰ پیسے رکھی گئی ہے بمبئی کے کسی تاجر کتب یا براہ راست "مکمل بک سیریز" سریکھا" یونیورسٹی روڈ پونا ۱۶ سے مل سکتی ہے۔

---

[1] انگلستان میں انگریزی کے سلسلے میں I.T.A ابتدائی حروف تہجی کی تعلیم کے طریقے میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ sh، ch وغیرہ کے لیے نئے حروف کی مدد سے جو s h یا c h سے ملتے جلتے ہیں، پڑھایا جاتا ہے اور جب طلبا روانی سے عبارت پڑھنے لگتے ہیں تو پھر انھیں مروجہ حروف سکھائے جاتے ہیں۔ اس طریقے سے طلبہ کا بہت کافی وقت بچتا ہے۔

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان کے اداریے

۱۹۶۷ء میں ہماری زبان میں جو اداریے لکھے گئے ان کا اشاریہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

	عنوان	ہماری زبان بتاریخ
۱۔	نیا سال اور ایک سوال	یکم رجنوری ۱۹۶۷ء
۲۔	ہندوستان کے اردو شاعروں سے (۱)	۸ ر ″ ″
۳	ہندوستان کے اردو شاعروں سے (۲)	۱۵ ر ″ ″
۴۔	اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری کام	۲۲ ر ″ ″
۵۔	وزیر اعظم سے انجمن کے وفد کی ملاقات (آل احمد سرور)	یکم رفروری ″
۶۔	یہ چناؤ	۸ ر ″ ″
۷	غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے کے کام	۱۵ ر ″ ″
۸۔	مولانا آزاد کی یاد میں	۲۲ ر ″ ″
۹۔	کیا اتر پردیش میں اردو کو واقعی سہولتیں ملی ہیں؟ (۱)	یکم رمارچ ″
۱۰۔	اتر پردیش میں اردو کے لئے سہولتیں؟ (۲)	۸ ر ″ ″
۱۱۔	میر عثمان علی خاں (آل احمد سرور)	۱۵ ر ″ ″
۱۲۔	عام چناؤ کے بعد	۲۲ ر ″ ″
۱۳۔	فوری حل اور دور رس پروگرام دونوں پر نظر ضروری ہے	یکم راپریل ″
۱۴۔	جن سنگھ اور اردو	۸ ر ″ ″
۱۵۔	جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے	۱۵ ر ″ ″
۱۶۔	اقبال اور ہم	۲۲ ر ″ ″
۱۷۔	پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعلیم کے سلسلے میں سفارشیں	یکم رمئی ″
۱۸۔	انجمن کے سالانہ جلسے	۸ ر ″ ″
۱۹۔	نئے صدر جمہوریہ	۱۵ ر ″ ″
۲۰	کچھ بنیادی حقائق	۲۲ ر ″ ″
۲۱۔	جواہر لال نہرو کی یاد میں	یکم رجون ″
۲۲۔	ہم اردو کو سرکاری زبان کیوں تسلیم کرانا چاہتے ہیں؟	۸ ر ″ ″
۲۳۔	اثر صاحب کی یاد میں (آل احمد سرور)	۱۵ ر ″ ″

باقی آئندہ

ڈاکٹر محمد یٰسین

کشمیر میں اردو

تاریخ بتاتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ لوگوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ فاتحین آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ مبلغین اور صوفیائے کرام نے اسے اپنا مسکن بنایا۔ پریشان حال قسمت کے مارے ہوئے مہاجرین نے اسے اپنا وطن سمجھا اور یہاں کے باشندوں نے انہیں خندہ پیشانی سے گلے لگایا جو اس ریاست میں آیا وہ پھلا پھولا۔ یہ صرف یہاں کی روح پرور ہواؤں کا طفیل نہیں ہے جس کی طرف عرفی نے

یہ سوختہ جانے کہ بکشمیر درآید
والے شعر میں اشارہ کیا ہے دراصل اس ریاست کی جبلت میں وسعت اور فراخ دلی ہے دوسروں کو اپنانے اور گلے لگانے میں اسے کبھی بھی عار نہیں ہوا یہاں کے لوگ ہر اچھی چیز کو یوں اپنا لیتے ہیں جیسے وہ انہیں کی ہو۔ یہی حال اس ریاست میں اردو کے ساتھ ہوا۔ دکن میں جنگ بازوں کے درمیان اس نے آنکھ کھولی قلعۂ معلیٰ کی عیش بھری فضاؤں میں اس نے ہاتھ پیر نکالے اور لکھنؤ کے محلوں نے اسے پروان چڑھایا اب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے لئے ہجرت روز ازل سے مقدر ہو چکی ہے دکن سے دلی اور پھر لکھنؤ۔

اردو ہندوستان کا قومی ورثہ ہے یہ یادگار ہے ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی، ۱۹۴۷ء میں غلامی کی زنجیریں تو ضرور کٹ کر گر پڑیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم میں بوکھلاہٹ بھی عود کر آئی۔ اردو کی حالی برہن آئی اردو سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جس میں سلاست ہو، روانی ہو، سادگی ہو، عام فہم ہو جسے ہندوستان کے ہر مکتبۂ خیال کے لوگ اپنی زبان سمجھیں۔ وہ زبان جو کسی ایک فرقے کی زبان ہو یا صرف کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کی سمجھ میں آئے اردو نہیں ہے

قیام پاکستان کے بعد جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے اردو پاکستان منتقل ہو گئی۔ لیکن پاکستانی اردو اردو سے زیادہ بنا دی ہے نہ اردو کے خد و خال ہیں اور نہ اس کی روح۔

بدقسمتی کی انتہا اس وقت ہوئی جب آزاد ہندوستان میں اردو کا دم گھٹنے لگا۔ اس دلی اور لکھنؤ کی چھوکری کو خود اپنے گھر میں اجنبیت محسوس ہونے لگی۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر ہی سے اردو نے اپنی نزاکت سج دھج اور جولانیٔ طبع سے کشمیر کو رجھانا شروع کیا تھا ریاست جموں و کشمیر نے اسے سرکاری زبان کا منصب عطا کیا اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں سرکاری اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی اردو کی مقبولیت اور بہ دلعزیزی بڑھتی گئی لہٰذا جب آزاد ہندوستان میں اردو اپنے کو جکڑا ہوا محسوس کرنے لگی تو کشمیر کی کھلی ہوئی آغوش میں وہ آ دبکی۔

اردو کی ہر دل عزیزی

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کی پوری آبادی ۳۵ لاکھ ۶ ہزار نو سو ۷۶ ہے یہ معمولی بات نہیں ہے کہ اسی رپورٹ کے مطابق جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی تعداد ۱۹۲۴۵ ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے تین مختلف علاقے ہیں۔ وادیٔ کشمیر، جموں اور لداخ۔ وادیٔ کشمیر کے لوگ کشمیری بولتے ہیں۔ جموں کے ڈوگری اور پنجابی اور لداخ کے لداخی۔ اردو ان تینوں علاقوں میں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور مقبول عام ہے۔ پٹھان کوٹ سے آگے ریل کی مسافر گاڑیاں نہیں چلتی ہیں ساری آمد و رفت موٹروں اور بسوں کے ذریعہ ہوتی ہے ٹرک مال گاڑی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں عموماً اور جموں صوبہ میں خصوصاً سارا ٹرانسپورٹ سکھ اور پنجابی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ سکھ ڈرائیور اپنے ٹرکوں کو دلہن کی طرح سجاتے ہیں بس کے اندر جہاں اردو میں ایسی عبارتیں تحریر ہوتی ہیں "سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہوگی" "سگریٹ پینا منع ہے" "کھڑکی سے

محمد مختار الرحمٰن خاں مختار

غزل

چاند کے ارادے ہیں نقد ہیں ستاروں کے
حوصلے کوئی دیکھے ہم جنوں شعاروں کے

ایسے عزم محکم پر کیوں نہ ناز ہو ہم کو
رخ پلٹ دئے اس نے کیسے کیسے دھاروں کے

اے جمال سرتاپا اے شبیہ رعنائی
تیرے رخ سے ملتے ہیں سلسلے بہاروں کے

ان سے زندگانی کا حوصلہ کوئی سیکھے
پھول مسکراتے ہیں پہلوؤں میں خاروں کے

جانے کھو گئے ہیں وہ کون سے اندھیروں میں
خواب ہم نے دیکھے تھے جن حسیں بہاروں کے

کس سے داد غم چاہیں کس کو حال بتلائیں
وہ جو زخم خوردہ ہیں آپ اپنے یاروں کے

سچ تو ہے یہی مختار آج کی گرانی نے
ہوش کر دئے رخصت کتنے ہوشیاروں کے

ہاتھ اور سر باہر نہ نکالیں" وہاں بس کے اندر اور باہر یہ بھی لکھا ہوتا ہے "ملے گا مقدر اپنا" "ست گرو تیری اوٹ" اور "یارب تیرا سہارا" وادیٔ کشمیر کی بسوں کو یہ کتبے زینت بخشتے ہیں۔ "خدا حافظ" "شب بخیر" "خوش آمدید" اور "ھذا من فضل ربی" پٹھان کوٹ سے جموں اور جموں سے سرینگر تک ٹرکوں کا لامتناہی سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے ٹرک ہیں کہ ہوا میں اڑ رہے ہیں اور ان کی پشت پر لکھا ہوا ملتا ہے "پھر ملیں گے" "اشارے کا انتظار کریں" "فرنٹیئر میل جا رہی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

یہ ثبوت ہے اس غیر ارادی اور والہانہ لگاؤ کا جو ریاست جموں و کشمیر کے باشندوں کو اردو سے ہے جموں کا رہنے والا اپنے میں یا پنجابیوں کے ساتھ یا تو پنجابی میں گفتگو کرے گا یا ڈوگری میں۔ لیکن دوسروں کے ساتھ وہ اردو میں بات چیت کرتا ہے۔ یہی حال وادیٔ کشمیر میں ہے گفتگو یا تو کشمیری میں ہوگی یا پھر اردو میں پوری ریاست میں عام لوگ خط و کتابت اردو میں کرتے ہیں جموں کے رہنے والے ایک پروفیسر سے زبان کے مسئلے پر بات چیت چلی انھوں نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے دو جملوں میں گفتگو کا خاتمہ کر دیا۔

"ہمیں نہ تو کشمیری چاہیے اور نہ ہندی ہمارے لئے بس اردو ٹھیک ہے۔"

کشمیر میں ہائی اسکول تک ذریعہ تعلیم اردو ہے اس کے بعد اس کی جگہ انگریزی لے لیتی ہے۔ بچے کے ورچوں کے لئے نصاب میں جو کتابیں داخل ہیں ان کی زبان اردو ہے اور کتابیں فارسی اور دیوناگری دونوں رسم خط میں چھپی ہیں

صحافت کے میدان میں

جموں و کشمیر میں شائع ہونے والے تقریباً تمام اخبارات اور رسائل اردو میں ہیں اور معیاری ہیں۔ وادیٔ کشمیر کے روزناموں میں پردیس کانگرس کا ترجمان "خدمت" (اڈیٹر نند لال وانل) سناتن دھرم یوک سبھا کا "مارتنڈ" (اڈیٹر بدری ناتھ منٹو) آزاد اخبار "آفتاب" (اڈیٹر ثناء اللہ بٹ) اور "سیاست" (اڈیٹر غلام رسول عرفانی) ترقی پسند "مزدور" (اڈیٹر پیارے لال کرہیو) اور نیشنل کانفرنس کا آرگن "نوائے کشمیر" (اڈیٹر غلام محمد ڈار) سرفہرست ہیں۔ جموں کے روزناموں میں کانگریس کا "سندیش" جن سنگھ کا "دیش" اور آزاد اخبار "اجالا" قابل ذکر ہیں۔

وادیٔ کشمیر سے غلام رسول عارف کی ادارت میں سہ روزہ "ہمدرد" اور ہفتہ وار "ہمدرد" نکلتے ہیں ہفتہ وار اخبارات کی فہرست کافی طویل ہے "دیش" (کسان سبھا) "پیام انقلاب" "روشنی" (احمدیہ) "محافظ" "نیا دور" "جیوتی" "نوجوان" "آئینہ" "جہان نو" "ہوتشا" "رہنما" "ہمارا کشمیر" "کشمیر سماچار" "کاروان" "زمیندار" "اذان" (جماعت اسلامی) اور "تازہ پرچہ" "جہلم" پیش پیش ہیں۔ جموں سے ہفتہ وار "چاند" اور "سچ" قابل ذکر ہیں۔ ڈیموکریٹک کانفرنس کا "جموں سندیش" بڑی تعداد میں چھپتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔

پندرہ روزہ میں وادی سے اہل حدیث حضرات کے دو الگ الگ پرچے "مسلم" اور "توحید" نکلتے ہیں ماہناموں میں اتحاد المسلمین کا "سفینہ" اور "الارشاد" کافی پڑھے جاتے ہیں۔ پندرہ روزہ "کرم دیر" سکھ لوگوں کا ترجمان ہے جموں و کشمیر کی کلچرل اکاڈمی کا دو ماہی جریدہ "شیرازہ" ہندوستان اور پاکستان کے چوٹی کے رسائل میں شمار کیا جاتا ہے دوسرا سرکاری ماہنامہ "دیہات سدھار" ہے جو ڈیولپمنٹ کمشنر کے دفتر سے شائع ہوتا ہے۔

محکمہ نشر و اطلاعات جموں و کشمیر نے اردو میں بڑے اچھے کتابچے شائع کئے ہیں ان میں "درخشاں مستقبل کی راہوں پر" "جمہوریت کا استحکام" "سیکولرازم کی جیت" "کشمیر کا سوال" اور "پاکستان کے تین رخ" نمایاں ہیں۔

شعر و ادب

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ کشمیر نے مجموعی طور پر اردو کی نشو و نما میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے اردو شعر و ادب کی تاریخ بغیر کشمیری پنڈتوں کے ذکر کے مکمل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، برجموہن ناتھ دتاتریہ کیفی، رتن ناتھ سرشار، آغا حشر کاشمیری، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، برج نرائن چکبست اور علامہ کیفی، اردو شعر و ادب کے روشن ستارے ہیں۔

موجودہ زمانے میں کشمیر کے اردو شعراء میں سے زود کشمیری، غلام رسول نازکی، نیصر قلندر، مرزا کمال الدین شیدا، مہجور شاہد، ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی، عشرت کشتواڑی، جنوہر لال دل، کشن سمیل پوری اور پروفیسر طالب کے نام آتے ہیں جدید نسل کے شعراء میں پروفیسر شوریدہ کشمیری، وید راہی، مہجور رستہ، عرش صہبائی، فاروق نازکی دل رضوانی اور سنتوش ہولوری کا نام لیا جا سکتا ہے ان کے علاوہ اردو کے بے شمار نوخیز شعراء ہیں جن کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ جلد ہی اپنی جگہ تلاش کر لیں گے۔

نثر لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی مرحوم، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، نور شاہ، حامدی کاشمیری، غلام رسول نازکی، شمیم احمد شمیم، صوفی غلام محمد، غلام احمد میر، ڈاکٹر اکبر حیدری، غلام رسول سنتوش، ڈاکٹر عزیز احمد، فدا محمد حسنین، پریم ناتھ در، برج پریمی، پشکر ناتھ، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، تیج بہادر بھان، نرودش، محمود حسین، مرحوم ڈاکٹر شمس الدین اور عبد الاحد آزاد مرحوم نمایاں ہیں۔

جس طرح بہت سے اردو کے کشمیری شعراء اور ادیب بیرون ریاست اقامت گزیں ہیں جیسے پنڈت آنند نرائن ملا، کشمیری لال ذاکر، کرشن چندر، اور رامانند ساگر، وغیرہ اسی طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں سے اردو کے ادیب اور شعراء کشمیر میں بسلسلہ ملازمت قیام پذیر ہیں مثلاً پروفیسر عبد القادر سروری،

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، وامق جونپوری، کمال احمد صدیقی، آفاق احمد آفاق، اور بہت سے ایسے دوسرے حضرات کی موجودگی سے اردو میں نکھار پیدا ہو رہا ہے۔

ادبی انجمنیں

ریاست جموں و کشمیر میں مختلف اوقات میں صاحب ذوق اور اردو دوست حضرات کی کوششوں سے مختلف انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ حلقہ ارباب ذوق، انجمن ترقی پسند مصنفین، کلچرل کانگرس، انجمن سیاست، بزم اردو اور انجمن فروغ اردو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان انجمنوں کے مباحثے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ ان میں سے اب بہت سی انجمنیں غیر متحرک ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو کی سرینگر میں شاخ قائم ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں اس کی نئی تشکیل ہوئی اس کشمیر سے انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کے لئے تمیم احمد تمیم نامزد ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۹ء کشمیر میں اردو کے لئے مبارک سال تھا۔ اسی سال بزم اردو کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال جموں و کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے بزم ادب قائم کی۔

ادبی سرگرمیاں

اردو کی ادبی سرگرمیوں کی تعداد جتنی جموں و کشمیر میں ہے اتنی ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ریڈیو کشمیر کے مشاعرے جو جموں اور سرینگر دونوں جگہ منعقد ہوتے ہیں بڑے پیمانے پر اور بڑے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ کلچرل اکاڈمی کا مشاعرہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل کلچرل اکاڈمی کے قیام سے اردو زبان اور ادب کو بڑا بڑھاوا ملا ہے۔ اکاڈمی اردو کی کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد دیتی ہے۔ اکاڈمی کے زیر اہتمام موسم بہار اور خزاں میں گلمرگ اور پہلگام میں ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں "انوار ابوالکلام آزاد"، "سد گل" اور "ہمارا ادب" اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔

جماعت اسلامی نے جامعۂ اردو علی گڑھ کے تحت اردو کے امتحانات کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا اب سری نگر میں یہی جامعہ کالج ہے ایک کے چیرمین مولوی عبد الحیٔ ہیں اور دوسرے کے پرنسپل رشید۔

ریاست کے سبھی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹی جموں و کشمیر کے دونوں ڈویژنوں میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ یہ شعبے اپنی اپنی جگہ پر مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد کرتے ہیں اردو کے شاعروں کی برسیاں نہایت ہی جوش و خروش سے منائی جاتی ہیں۔

اردو اور دوسری زبانیں

وادیٔ کشمیر میں کشمیری زبان میں شعر کہنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو سند حاصل کر چکے ہیں پرانے لوگوں میں پنڈت دینا ناتھ نادم کو دنیا ایک شعلہ نوا شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے

نوجوان شعراء میں رحمان راہی کو ساہتیہ اکاڈمی نوازچکی ہے۔ ڈوگری میں جموں کے ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ نام پیدا کر چکے ہیں لیکن سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ جموں اور کشمیر نے اردو کے بھی اچھے شاعروں اور انشا پردازوں کو جنم دیا ہے ان کے اشعار معیاری ہیں اور نثر میں جان ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو نہ تو کسی کی رقیب ہے اور نہ کوئی اس کا دشمن کشمیری زبان کے شعراء اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ڈوگری اور پنجابی کا شاعر اردو میں بھی شعر کہتا ہے۔

ریاست میں ہندی کی تعلیم کے لئے پرائمری سے لے کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک کا انتظام ہے اور ہندی کے پروفیسران اردو میں بات چیت کرنے اور شعر کہنے میں۔ ریاست میں ہر زبان کے پھولنے اور پھلنے کے مواقع ہیں۔

ریڈیو کشمیر

اردو کی ترویج و ترقی اور اس کو مقبول عام بنانے میں ریڈیو کشمیر جموں اور سری نگر بھی بڑا اہم رول ادا کر رہا ہے نہایت ہی شستہ زبان ہوتی ہے جو صحیح تلفظ سے ادا کیا جاتا ہے مختلف موضوعات پر تقریروں کا دلچسپ سلسلہ سازو آہنگ، عرض خواں، حالات حاضرہ پر تبصرہ، خبرنامے اور بات چیت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں پروگرام "وادی کی آواز" میں منشی اللہ رکھا اور ان کی نوک جھونک دلی کی ٹکسالی زبان کا لطف دیتی ہے صبح سویرے ریڈیو "آداب عرض" سے شروع ہوتا ہے اور رات گئے "شاکشمیر پائندہ باد اور جمہوریت ہند زندہ باد" سے ختم ہوتا ہے۔

مراسلات

نظیر اکبر آبادی کا مزار

مدراس سے دلی جاتے ہوئے یہ ارادہ کرکے چلا تھا کہ آگرہ میں حضرت نظیر اکبر آبادی کے مزار کی زیارت کروں گا۔ اس نظیر کے مزار کی زیارت جس نے اردو میں عوامی شاعری کے تاج محل کی صرف بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ اپنے ہی ہاتھوں اس کو سنوار بھی دیا۔ آگرہ میں نظیر کے مزار کا پتہ لگانے کی کوشش کی تعجب ہے کہ اکثر احباب نے اس نام ہی سے ناواقفیت کا ثبوت دیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ ایک حد تک میں مایوس بھی ہو گیا تھا لیکن ایک معمر تانگہ والے کے توسط سے مجھے وہ جگہ معلوم ہوئی جہاں میاں نظیر دفن ہیں۔ تانگہ والا جگہ سے تو واقف تھا لیکن مزار کا تعین نہیں کر سکا۔ اس نے بڑے زور سے آواز دی۔ ایک جھونپڑے سے ایک معمر بزرگ نکل آئے میرے استفسار پر انھوں نے شہتوت کے نظیر کے مزار کی طرف اشارہ کیا۔ مزار ایک درخت کے سائے میں واقع ہے اور سراپا تصویر درد ہے یہاں آکر دنیا کی بے رخی اور اردو زبان والوں کی بے اعتنائی پر بے حد افسوس ہوا۔ یہ اس نظیر کا مزار ہے جس نے عوام کے دکھوں کا علاج اپنی بے مثال شاعری سے کیا تھا۔ ایک طرف ماحول کی گندگی اور ٹوٹے ہوئے مزار کی بے رونقی سے وحشت سی محسوس ہونے لگی میں نے کتبہ پڑھا۔ چند آنسو نذر کئے اور چلا آیا۔

۳۰ر جولائی کی شام کو دلی میں محترم سجاد ظہیر صاحب نے مجھے اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا سجاد صاحب اور رضیہ آپا کے علاوہ محترم ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر خلیق الرحمان، مخمور صاحب، سیفی پریمی اور بھی دلی کے کئی شعرا، اور ادیب مدعو تھے میں نے اپنی تقریر میں نظیر کے مزار کی کس مپرسی کا ذکر کیا سب لوگ اس سے بے حد متاثر ہوئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے یہاں تک کہا کہ میں اس سلسلے میں حکومت کو ضرور متوجہ کروں گا۔

مجھے یقین ہے کہ اردو والا طبقہ ضرور اس پر توجہ فرمائے گا اور نظیر کے مزار کی مرمت پر غور کرے گا اگر فوری طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا تو دو چار سال کے اندر اندر جو چند قبریں رہ گئی ہیں ان کو بھی توڑ پھوڑ کر مکان بنوا دئے جائیں گے مزار کا نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

اگر ہم اپنے بزرگوں کو بھلا دیا تو آنے والی نسل یقیناً ہمیں بھلا دے گی اور نظیر ہی کے الفاظ میں۔

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(حسرت سہروردی)

اردو رسم خط

ہماری زبان ۲۲ر اگست کے شمارہ میں ایک مضمون جناب تنویت شیام پوری کا بعنوان "اردو کی ترویج و ترقی" شائع ہوا ہے انھوں نے جناب حسن نیہروی صاحب کے اردو رسم الخط کے سلسلے میں اپنا اظہار خیال کیا ہے اور دعوتِ فکر و نظر دی ہے۔

اردو کے رسم الخط کے سلسلے میں ایک عرصۂ دراز سے غور کر رہا ہوں اور اس سلسلے میں میری دلی خواہش رہی ہے کہ جب کہ اردو زبان ایک زندہ جاوید زبان ہے اور اس کا ادب دنیا کے اعلیٰ ترین زبانوں میں شمار ہوتا ہے۔ دنیا کے اندر اس کا پانچواں نمبر ہے اور ہندوستان میں تیسرا بلکہ دوسرا ایسا ہونے ہوئے اردو زبان کا اب تک کوئی پیارا سا ٹائپ نہیں؟ اور اگر ہے بھی تو نہایت پیچیدہ! آج بھی اردو کے بیشتر اخبارات و رسائل کاتب کی چھپائی یا یوں کہیں کہ مشہور رسائل کتابت کے ذریعہ چھپائی اور عموماً فوٹو آفسیٹ کے محتاج ہیں!

اردو رسم الخط کی جہاں تک کرسیوں کا تعلق ہے میں نے غور کیا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کرسیاں خواہ نسخ ہوں یا نستعلیق انگریزی یا مغربی ممالک کی دیگر زبانوں کی طرح ہم شکل یعنی ایک طرح کی نہیں ہیں بلکہ اُن کو لکھنے پر مختلف شکلیں بنتی رہتی ہیں اور یہ اپنی زبان کا رسم الخط ایک طرح کا PICTURESQUE تصویری رسم الخط کہا جا سکتا ہے گو کہ یہ بہت ترقی یافتہ اور بڑھا چڑھا ہے! (فدی القدر حال خاطر حافظی گورکھپوری)

یہ اشعار کس کے ہیں

کہاں طاقت ہے ایسی ہر بشر کی — مصیبت کو سہے آکر ظفر کی
طلب چھوٹے لئے خواہش میں زر کی — بہو دی احسن اللہ اس لعیں نے
قمر سے دور ہوں اپنے پدر کی — مجھے رنگوں میں کیوں کر پڑے چین

مندرجہ بالا اشعار کے بارے میں ہمارے دوستوں کے درمیان اختلاف ہے لیکن کثیر رائے یہ ہے کہ یہ اشعار بہادر شاہ ظفر کی غزل سے ماخوذ ہیں، جو انھوں نے قیام رنگون کے درمیان کہے ہیں۔ لہٰذا قارئین ہماری زبان نیز ارباب نظر سے گذارش ہے کہ وہ اپنی قیمتی رائے سے بذریعہ "ہماری زبان" نوازکر ممنون احسان کریں۔

(ایم۔ اے۔ نصر)

اردو ہندوستان میں ہر جگہ سب سے زیادہ بولی جاتی ہے

علی گڑھ۔ جامعہ اردو کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد یہاں لال بہادر پنڈت راج ناتھ کنزرو کی صدارت میں ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد العلیم نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ "موجودہ حالات کے باوجود اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے اور جتنی زیادہ تعداد میں عوام اسے بولتے ہیں اس اعتبار سے اس کی حیثیت آسامی، اڑیہ، کشمیری، پنجابی، گجراتی، ملیالم اور کنڑ زبانوں سے مختلف اور اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ "مردم شماری رپورٹ کے مطابق دو کروڑ ۲۵ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی عوام اردو بولتے ہیں جو بڑی تعداد میں یوپی، بہار، مہاراشٹر، آندھرا، میسور، اور دہلی وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔" انھوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے ہر جگہ اس اعتبار سے کہ اردو بولنے والے تمام ملک میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اور کہیں نہیں ان معنوں میں کہ سوائے کشمیر جہاں اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ کسی اور ریاست میں اسے یہ حیثیت حاصل نہیں ہے انھوں نے کہا کہ ان حالات میں جامعہ اردو جیسے اداروں کی ضرورت اور اہمیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے رجسٹرار جامعہ جناب جعفری نے سالانہ رپورٹ سنائی اور بتایا کہ ہر اہم سو ۲۸ امیدواروں نے جامعہ کے امتحانات میں شرکت کی اور ے فیصدی رزلٹ رہا۔ پنڈت راج ناتھ کنزرو نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اردو کی مخالفت کیوں کرتے ہیں اور سرکاری سطح پر اردو کے لئے برائے نام جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض ایک خالی چمچہ بچے کے منہ میں رکھنے کے مترادف ہے۔"
(قومی آواز)

اردو کو اگر ترقی نہ دی گئی تو قومی یکجہتی کبھی حاصل نہ ہوگی

نئی دہلی۔ وزارت داخلہ کی مشاورتی کمیٹی کو خطاب کرتے ہوئے جناب شیر احمد خاں ایم۔ پی نے کہا کہ اردو پورے کشمیر، پنجاب، ہریانہ، مغربی بنگال اور دوسرے بہت سے شہروں کے رہنے والے ہندو، مسلمان دونوں کی زبان تھی۔ لیکن اب یہ معدوم ہو رہی ہے حکومت کی کھلی پالیسی ہے کہ جس درجہ میں مادری زبان رکھنے والے دس طلبہ ہوں ان کے لئے استاد مہیا کیا جائے گا۔ لیکن یہ صرف کاغذ کی بات ہے موصوف نے کہا کہ اگر اعداد و شمار دیکھے جائیں تو بہت سی ریاستیں اس کے بالکل خلاف عمل پیرا ہیں۔ موصوف نے نینی تال اور کاس گنج کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کے ہزاروں افراد کا یہ بیان ہے کہ اردو مٹائی جا رہی ہے وہ اسے بچانے کے لئے اپنے اسکول کھولنا چاہتے ہیں۔ جناب شیر احمد خاں نے کہا کہ اگر اردو کی ترویج و ترقی پر زور نہ دیا گیا تو ہندوستان میں قومی یکجہتی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ (الجمعیۃ)

عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ملکی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کامیاب تجربہ کیا

حیدر آباد۔ ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے اردو ہال حمایت نگر میں طلبہ اردو آرٹس (ایوننگ) کالج کی انجمن کا افتتاح سات شمعیں روشن کر کے کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں لوگوں نے علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کا فیصلہ کر کے اپنی حقیقت پسندی کا جو ثبوت دیا ہے وہ کوئی نیا کام نہیں۔ بلکہ کئی سال پہلے سابقہ حکومت نظام اس کا کامیاب تجربہ کر چکی ہے عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی واحد یونیورسٹی ہے جس نے ایک ملکی زبان کو نہ صرف ذریعہ تعلیم بنایا بلکہ تمام پیشہ ورانہ تدریس کے تمام شعبوں میں اعلیٰ سطح تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا۔ انھوں نے اردو آرٹس (ایوننگ) کالج کی ترقی کے تعلق سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کالج کو جلد از جلد ڈے کالج اور اس میں سائنس کے شعبے کا قیام عمل میں لانا چاہئے اور یونیورسٹی اس کی ہر طرح ہمت افزائی کرے گی اور حکومت کو بھی اس ضمن میں فراخدلانہ امداد دینی چاہئے مرزا رضا علی بیگ نائب صدر کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا بعد جلسہ کالج کے طلبہ نے ایک کلچرل پروگرام پیش کیا۔ (رہنمائے دکن)

شمالی ہند نے سہ لسانی فارمولے پر عمل نہیں کیا

کوچین۔ مرکزی وزیر تعلیم جناب تری گونا سین نے کہا کہ سہ لسانی فارمولا مسئلہ زبان کا سب سے مناسب حل ہے وہ ہندی پرچار سبھا کے تین اسکولوں کا افتتاح کر رہے تھے انھوں نے کہا کہ مادری زبان ہندی اور انگریزی کی تعلیم بہت ہی ضروری ہے۔ قومی یکجہتی کے لئے ضروری ہے کہ ہر بچہ یہ تینوں زبانیں سیکھے انھوں نے الزام لگایا کہ شمالی ہند نے اس فارمولے کی پابندی نہیں کی ہے۔ (الجمعیۃ)

ایسا نظام تعلیم بنایا جائے جس سے قوت فکر کو جلا ملے

کالی کٹ۔ وزیر تعلیم جناب تری گونا سین نے کالی کٹ یونیورسٹی کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں تعلیمی ڈھانچہ پر از سر نو غور کرنا چاہئے کالی کٹ یونیورسٹی ٹریونڈرم میں دوسری یونی ورسٹی ہے انھوں نے کہا کہ ماہرین کا خیال ہے کہ ہم تعلیم پر جو روپیہ خرچ کر رہے ہیں وہ غلط خرچ ہو رہا ہے نظام تعلیم ایسا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی قوت فکر کو جلا نہیں ملتی۔ ایسی تعلیم جو انسان کو غور و فکر سکھائے بیکار کی محنت ہے انھوں نے سائنس کی تعلیم پر بھی زور دیا۔ (الجمعیۃ)

اردو میں حلف جائز الہ آباد ہائیکورٹ کا فیصلہ

الہ آباد۔ ہائیکورٹ کے جسٹس جی۔ سی ماتھر نے وارانسی میونسپل کارپوریشن کے تین جن سنگھی کارپوریٹروں کی رٹ کی درخواست خارج کردی جس میں ریاستی گورنر کے ۱۹ر جولائی کو جاری کئے ہوئے نوٹیفکیشن کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اس نوٹی فکیشن کے ذریعہ کارپوریشن کے ممبروں کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ انگریزی میں یا آئین کے آٹھویں گوشوارہ میں درج کسی بھی زبان میں حلف لے سکتے ہیں اس کے موجب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حلف دلا سکتے ہیں۔ درخواست گذاران نے استدعا کی تھی کہ ۲۱ دیگر کارپوریٹروں کے خلاف جنھوں نے ہندی میں حلف نہیں لیا تھا اور جن کی حلف برداری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کرائی تھی کوارنٹو کی رٹ جاری کرکے جواب طلب کیا جائے کہ وہ کس حیثیت سے کارپوریشن کے اراکین کے طور پر کام کررہے ہیں۔ ہائی کورٹ نے وہ عارضی حکم امتناعی واپس لے لیا جو ۹ر اگست کو جاری کیا گیا تھا اور جس کے ذریعہ شفیع اللہ اور ۱۹ دیگر کارپوریٹروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ تا حکم ثانی کارپوریشن کے اجلاسوں میں شرکت نہ کریں اور کارپوریشن کے ممبر کی حیثیت سے کام نہ کریں۔ درخواست گذاروں کے اس استدلال کو مسترد کرتے ہوئے فاضل جج نے کہا کہ گورنر کورٹ کی اس درخواست میں فریق نہیں بنایا گیا ہے اس لئے موصوف کو ان الزامات کا جواب دینے کا کوئی موقع نہیں حاصل ہو سکا جو ان کے خلاف عائد کئے گئے ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ ضابطے نیک نیتی سے بنائے گئے ہیں اور اختیارات کا بنیادی استعمال نہیں کیا گیا گورنر کو یہ اختیار ہے کہ وہ مسلمانوں سمیت عوام کے تمام طبقوں اور ان کی اردو میں حلف لینے کی خواہش کا لحاظ رکھیں۔

(سیاست)

آل انڈیا غالب کمیٹی کی ریاستی شاخ کی تنظیم کے سلسلے میں فخرالدین علی احمد کا دورہ

لکھنؤ۔ آل انڈیا غالب صدسالہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری مرکزی وزیر صنعت جناب فخرالدین علی احمد ۱۸ر اور ۱۹ر اکتوبر کو غالب صدسالہ کمیٹی کے سلسلہ میں لکھنؤ اور کانپور کا دورہ کریں گے۔ آل انڈیا غالب صدسالہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین اور صدر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ہیں۔ آل انڈیا کمیٹی کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن ملا (ایم۔ پی) اترپردیش میں۔ آل انڈیا کمیٹی کی شاخ قائم کرنے کے مجاز کئے گئے ہیں اور وہ ریاستی غالب صدسالہ کمیٹی کے لئے گورنر اترپردیش ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی کو صدر جناب مقبول احمد لاری (صدر آل انڈیا میر اکاڈمی) کو نائب صدر لکھنؤ کے جناب ڈاکٹر ایم، ایس سدھو کو جنرل سکریٹری اور سابق میئر جناب گرراج دھرن رستوگی کو خزانچی نامزد کرچکے ہیں۔ یہ ریاستی غالب کمیٹی واحد کمیٹی ہے جو مرکزی غالب کمیٹی سے ملحق ہوگی اور اس کی باضابطہ شاخ کہلائے گی۔ دوسری کمیٹیاں جو غالب کے نام پر بنی ہیں یا بنائی جائیں گی۔ وہ اسی ریاستی کمیٹی کے تعاون و اشتراک سے مرکزی غالب کمیٹی کے پروگراموں میں حصہ لیں گی اور ان دوسری غیر سرکاری کمیٹیوں کو یہ بھی حق ہے کہ وہ بالکل آزادانہ طور پر اپنے پروگرام کریں۔ مرکزی غالب کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب فخرالدین علی احمد لکھنؤ اور کانپور کے دورے میں ریاستی شاخ سے متعلق سرگرمیوں کا پروگرام طے کریں گے۔ جناب فخرالدین کے اس دورے کا پروگرام مرکزی غالب کمیٹی کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے طے کیا ہے کہ ان کے ذریعہ یہ تفصیل یہاں پہنچی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ ہفتے ریاستی کمیٹی کے عہدیداروں کی دعوت پر ادبی شخصیتوں کا ایک مشاورتی جلسہ یہاں ہوگا جس میں پنڈت آنند نرائن ملا بھی شرکت کریں گے اور اس جلسے میں جنرل سکریٹری کی آمد کے موقع پر وسیع پیمانے پر ادبی شخصیتوں کے اجتماع کا پروگرام طے کیا جائے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ ملا صاحب اس موقعہ پر ریاستی کمیٹی کے سکریٹریوں کو بھی نامزد کریں گے سکریٹریوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین ہوگی۔

(قومی آواز)

کلکتہ اور مغربی بنگال میں غالب کی سویں برسی

ایم۔ اے حمید صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے فیصلہ کیا ہے کہ سارے ہندوستان کی طرح مغربی بنگال میں بھی غالب کی صدسالہ برسی موثر اور شایان شان طور پر منائی جائے

اس سلسلہ میں انجمن نے ایک یادگار غالب کمیٹی کی تشکیل کی تھی جس نے اس کا پروگرام طے کرلیا ہے اور انجمن کی مختلف شاخوں کے نمائندوں کے ایک حالیہ جلسہ میں اسے منظور کیا گیا ہے۔ پروگرام حسب ذیل ہیں۔ (۱) اشاعتی پروگرام۔ اس سلسلہ میں غالب کے منتخب اشعار اور غزلوں کا ترجمہ بنگلہ میں شائع کیا جائے گا۔ ترجمہ کا کام شروع ہوچکا ہے غالب سے متعلق مضامین کا ایک اردو مجموعہ شائع ہوگا۔ ایک یادگار مجلہ برسی کی تقریب کے موقع پر شائع کیا جائے گا اس مجلہ میں غالب سے متعلق مضامین اور بطور بیہ اشتہارات شامل ہوں گے۔ (۲) غالب سے متعلق طلبہ سے مضامین طلب کئے جائیں گے اور بہتر مضامین پر انعامات دیئے جائیں گے۔ مضمون کا عنوان ہوگا "غالب کے کلام میں اخلاقی قدریں"۔ تفصیلات عنقریب شائع کی جائیں گی طلبہ کے درمیان تقریری مقابلہ بھی کرایا جائے گا اور اچھی تقریروں پر انعامات دیئے جائیں گے۔ (۳) کلکتہ کارپوریشن سے اپیل کی جائے گی کہ کلکتہ کی کسی مشہور شاہراہ کا نام بدل کر غالب کے نام پر رکھا جائے حکومت مغربی بنگال سے درخواست کی جائے گی کہ کلکتہ مدرسہ عالیہ کے تاریخی مشاعرہ میں جس جگہ غالب شریک ہوئے تھے وہاں ایک کتبہ نصب کرایا جائے حکومت سے یہ بھی درخواست کی جائے گی کہ وہ ویکر ہوسٹل یا بیث ہوسٹل کا نام بدل کر غالب ہوسٹل رکھ دیا جائے (۴) جشن کی تاریخوں کا تعین کرکے مندرجہ ذیل تقریبیں منعقد کی جائیں گی (الف) تمثیلی مشاعرہ (ب) کل ہند مشاعرہ (ج) غالب سے متعلق مختلف زبانوں کے دانشوروں کا سمینار (د) غالب کی غزلوں کی نغمہ سرائی اور نغمہ سرائی کا مقابلہ (ہ) مرزا غالب فلم کی نمائش (و) غالب کی اور غالب کے متعلق تصانیف کی نمائش (ہ) مندرجہ بالا تقریبات کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں یہ طے پایا ہے کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء تک یادگار غالب کمیٹی کے ممبران بنائے جائیں اور ان ممبروں سے دس روپیہ ممبری فیس وصول کی جائے۔ مقامی طرح کم از کم دس ممبر بنانے پر شاخ کی ممبر سازی کے بعد ہی ممبران باضابطہ مجلس عاملہ کی تشکیل کریں گے سرپرستی قبول کرنے والے حضرات سے کم از کم ایک سو روپیے وصول کئے جائیں گے۔ تمام اردو دوستوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں یادگار غالب کمیٹی کے ممبر بن کر اس کام کو تقویت پہونچائیں۔ دیگر تفصیلات عنقریب شائع کی جائیں گی۔

(نامہ نگار)

غالب کنونشن اور مشاعرہ

لکھنؤ۔ یہاں قیصر باغ کی بارہ دری میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک کل ہند کنونشن ہو رہا ہے۔ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب جی ایم صادق نے اس کنونشن کے لئے اتر پردیش غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب پی این ہکسر کے نام ایک پیغام میں کہا ہے کہ "غالب نے انسانیت کے لئے جو پیغام دیا ہے اس میں رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی کوئی قید نہیں ہے انھوں نے کہا کہ غالب کی یاد ہمارے دلوں میں ہردم تازہ رہتی ہے۔ بحیثیت شاعر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انھوں نے انسان کی فطرت اور اس کی امنگوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شاعری ہمہ گیر ہے اور ساری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اردو شاعری کے معماروں کی صف میں غالب ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی ادب کی تاریخ کے اوراق پر نقوش ثبت کئے ہیں میں اس موقع پر غالب صد سالہ جشن کمیٹی اتر پردیش کو اپنی نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔" اس کنونشن کی صدارت علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد العلیم نے کرنا منظور کرلیا ہے۔ افتتاح ہندی کے ادیب اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی کریں گے۔ اس کنونشن میں ملک بھر کے دو سو ادیب اور شاعر شرکت کریں گے۔

(قومی آواز)

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے سوگ میں دہلی یونیورسٹی میں تعزیتی جلسہ

دہلی۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کرام کا ایک جلسہ ٹیوٹوریل بلڈنگ کے کمرہ الف ۳۵ میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کے انتقال پر ملال پر تعزیتی تقریر منظور ہوئی۔ اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ آخر میں جناب منعت الدین فریدی صاحب استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے پروفیسر ندوی مرحوم کی وفات پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ پیش کیا

رخصت ہوا وہ ساقی صہبائے علم و فن
"بزم خیال میکدہ بے خروش ہے"
سید نجیب اشرف ندوی کی موت سے
"ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے"
شامل ہے دل کا کرب بھی سال وفات میں
"اک شمع رہ گئی ہے ۲۲ سو وہ بھی خموش ہے"

۲۲۲ + ۱۷۴۶ = ۱۹۶۸ عیسوی　(دیہ ظہیر الحسن)

گورکھپور یونیورسٹی میں نجیب اشرف ندوی کا سوگ

گورکھپور۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کا ایک تعزیتی جلسہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمود الٰہی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی کے انتقال پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا ایک قرارداد کے ذریعہ مرحوم کی علمی اور ادبی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے پسماندگان سے صبر جمیل کی تلقین کی گئی۔ (منظور حسین گورکھپوری)

اردو گھر فنڈ

انجمن ترقی اردو ہند کی ایک پانچ منزلہ عمارت نئی دہلی میں بن رہی ہے اس کا نام "اردو گھر" رکھا گیا ہے۔ زمین لے لی گئی ہے سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ہے اور تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

تعمیر کے سلسلے کے جملہ کاموں کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ جو تکمیل تک نگراں رہے گی۔

اس عمارت کے نقشے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت انجمن کے تمام شعبوں کے لئے آرام دہ ہو مگر بہت سادہ، کم خرچ اور خوشنما ہو۔ شان و شوکت اور نمائش سے حتی الوسع بچا جائے لیکن حسن و رعنائی عمارت میں ایسی نمایاں ہو کہ نئی دہلی کے ماحول میں کھپ سکے اور اجنبی نہ معلوم ہو، ساتھ ہی اس کے در و دیوار میں اردو کی عظمت و وقار، شیرینی و دلآویزی بھی جھلکتی ہو۔

اس عمارت پر لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ روپیہ کیا گیا ہے اور اردو گھر فنڈ میں انجمن نے جو رقم اب تک جوڑ جوڑ کر حفاظت سے رکھی ہے وہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ بنک میں موجود ہے۔ ایک لاکھ بڑے عطیوں سے ملنے کی توقع ہے اب پانچ لاکھ اور جمع کرنے کی ضرورت ہے اردو کی مقبولیت اور ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے اس رقم کے فراہم ہونے میں بظاہر کوئی دقت نہ ہوگی اتنی رقم تو حکومت اور چند محبان اردو کے دستِ کرم سے بہ سہولت بہم پہنچ سکتی ہے لیکن اراکین انجمن کی تمنا ہے کہ اردو گھر کی تعمیر میں ہر اردو دوست کا حصہ اور شرکت ہو۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر عوام کی محبت کی مہر ثبت ہو۔ اس کے بنانے والوں میں ہزاروں اور لاکھوں ناموں کی طویل فہرست ہو۔

اس مقصد کے لئے طریقۂ کار یہ تجویز کیا گیا ہے کہ خود اراکین انجمن جن کی تعداد لگ بھگ پچاس کے ہے اور انجمن کی شاخوں کے ممبر اور ملک بھر میں چندہ جمع کریں اس غرض کے لئے چندہ وصول کرنے والوں کے پاس ہر صوبے اور بڑے شہروں میں مندرجہ ذیل رسیدیں مطبوعہ ہوں گی۔

ایک روپیہ، پانچ روپیہ، دس روپیہ، بیس روپیہ اور پچاس روپیہ والی رسیدیں جن پر رقم چھپی ہوئی ہے صرف ایک سطر نام پتے اور وصول کنندہ کے دستخط کی ہے۔ رقم جب دفتر پہنچ جائے گی تو رقم دینے والوں کے نام "ہماری زبان" میں ہفتہ وار شائع ہوں گے ظاہر ہے یہ کام انجمن اپنی بساط کے مطابق زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ انجام دینے کی سعی کرے گی۔ پھر بھی کام کرنے والوں کی تعداد چند دہائیوں سے زیادہ نہ ہوگی اور مناسب بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو چندہ وصول کرنے کا مجاز نہ بنایا جائے اسی میں انتظام قائم رہے گا اور کسی قسم کی بے عنوانی نہ ہو سکے گی۔ جو کارکن ہوں گے وہ سب اعزازی ہوں گے ان کے پاس نہ اتنا وقت ہوگا اور نہ اتنے ذرائع کہ وہ ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گھر تک پہنچ سکیں۔

اس لئے زیادہ تر حضرات کو براہِ راست انجمن کے صدر دفتر میں آرڈر، چیک یا ڈرافٹ وغیرہ سے رقم بھیجنی ہوگی۔ رقم بھیجنے کے لئے اتنا پتہ کافی ہوگا۔

"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ (یوپی)"

عنقریب ہر ریاست میں جو صاحب بھی چندے کی مہم کے ذمہ دار ہوں گے ان کے اور ان کے معاونین کے ناموں کا "ہماری زبان" اور دوسرے اخباروں میں اعلان ہوگا۔ تاکہ مقامی طور پر رقم حوالے کرنے میں آسانی ہو۔

جو رقمیں براہِ راست یا بہ توسط دفتر پہنچیں گی دفتر سے ان کی ایک رسید جاری ہوگی اور ان کے اسمائے گرامی کی فہرست ہفتہ وار "ہماری زبان" میں شائع ہوگی۔

اس سلسلے میں "ہماری زبان" کی اشاعت کی طرف بھی اہلِ استطاعت توجہ کریں تو انجمن کے لئے اور اردو تحریک کے لئے بڑی تقویت کا باعث ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ چندہ دینے والے حضرات وہی رقم دیں جو ان کے حالات کے مطابق ہو اور طبیعت پر بار نہ گزرے مگر ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ جو کچھ بھی آپ بہ سہولت عنایت کریں اس میں دیر نہ کریں تاکہ ہمارا کوٹہ جلد سے جلد پورا ہو جائے اور ہم فخر و مسرت کے ساتھ فہرست کے جلد بند کرنے کا اعلان کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سب اردو دوستوں کے تعاون سے اردو گھر بہت جلد بن جائے گا۔

(پروفیسر) آل احمد سرور۔ جنرل سکریٹری انجمن

مالک انجمن ترقی اردو ہند پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

دیواریں کھڑی ہوں اور اس کی سب کھڑکیاں بند رہیں۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں دیس دیس کی ہوائیں خوب آئیں خوب چلیں مگر میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ان ہواؤں کے زور سے میرے پاؤں اپنی زمین سے اکھڑ جائیں۔ میری عین خوشی ہے کہ ہمارے لڑکے لڑکیاں جو علمی، ادبی مذاق رکھتے ہیں دل کھول کر انگریزی اور عالمی زبانیں سیکھیں اور پھر اپنے علم سے ہندوستان کو فائدہ پہنچائیں۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندوستانی اپنی مادری زبان کو بھول جائے یا اس سے غفلت برتے یا اسے اپنی زبان کہتے ہوئے شرمائے یا یہ محسوس کرے کہ وہ اسے بہترین فکر یا اظہار فکر کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔"

(۵) "جو لوگ میری نصاویر بیچ کر میری عزت کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اس روپیہ کو میری جن سیوک سنگھ، گرام ادیوگ چرخہ سنگھ یا تعلیمی سنگھ کے کام میں لگائیں۔ میں اسے اپنی کافی عزت خیال کروں گا۔"

گاندھی جی کے صد سالہ جنم دن کی دنیا بھر میں تیاریاں

نئی دلی مہاتما گاندھی کے صد سالہ جنم دن کی تقریبات دنیا بھر میں منائی جائیں گی ہر طرف اس کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں ان تقریبات کا آغاز اس ماہ میں ۲ اکتوبر سے ہوگا اس وقت تک ۷۴ ملکوں میں قومی کمیٹیاں بن چکی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے سرپرست یا چیئرمین اکثر ملکوں میں خود ان ملکوں کے سربراہ ہیں برطانیہ میں اس سلسلہ میں جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے چیئرمین ہندستان کے سابق گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہیں موصوف تقسیم ہند کے بعد ہندستان کے گورنر جنرل تھے اور امریکہ میں جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے چیئرمین امریکہ کے نائب صدر جناب ہربرٹ ہمفری ہیں۔ جرمنی میں ۲ اکتوبر کو گاندھی جی کی یاد میں ایک جلسہ ہوگا جس کی صدارت جرمن کے وزیر اعظم جناب کیسنگر کریں گے۔ اسی دن برلن میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا جلسہ ہوگا جس میں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا جائے (الجمعیۃ)

مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کے خطوط کی بازیافت

دلی، پرائیویٹ کاغذات کے دو گراں قدر ذخیرے جن میں مولانا محمد علیؒ اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے دو ہزار خطوط شامل ہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیچر ٹریننگ کالج کے تہ خانے سے ملے ہیں۔ ان کو دیمک اور پھپھوندی لگی ہوئی ہے مولانا محمد علی کے کاغذات میں ان خطوط کے مسودے شامل ہیں جو مولانا نے مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز اینی بیسنٹ، جناب محمد علی جناح، ڈاکٹر اقبال، جناب تیج بہادر سپرو اور بہت سے دوسرے لیڈروں کو لکھے تھے یا ان سے مولانا کو موصول ہوئے تھے مولانا محمد علی کے کاغذات میں بہت سے ایسے نایاب پمفلٹ بھی ہیں جو اب کہیں دستیاب نہیں ہوں گے ان کی مطبوعہ تحریروں کے مسودے اور مولانا کے ہفت روزہ انگریزی کامریڈ اور اردو روزنامہ ہمدرد کے مکمل فائل بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کے کاغذات میں گاندھی جی، علی برادران، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، جناب رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے سرکردہ لیڈروں کے نام خطوط شامل ہیں۔ یاد رہے مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری مرحوم ان لیڈروں میں سے ہیں جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ، مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی تھی، مولانا محمد علی مرحوم جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر انصاری مرحوم پہلے امیر جامعہ تھے۔ دونوں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے تھے اور دونوں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے بھی سرکردہ لیڈروں میں تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان دستاویزات اور کاغذات کی جامعہ میں موجودگی کا علم جامعہ ملیہ کے ایک لائبریرین حافظ نبی احمد صاحب کو تھا ان کا چند سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ان دستاویزات کو انھوں نے ہی دوسری کتابوں کے ساتھ تہ خانے میں رکھا تھا۔ ان میں سے کچھ دستاویزات پہلے سے جامعہ میں موجود تھیں باقی دوسری جگہوں سے فراہم کی گئیں ان کے انتقال کے ساتھ ان دستاویزات کا راز بھی دفن ہو گیا۔ (الجمعیۃ)

ہندستانی اخبارات اور رسالے خریدنے کے لئے پاکستان کے قواعد

لاہور، مرکزی حکومت کے ایک فیصلہ کے مطابق پاکستان کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو جن ہندستانی اخبارات اور رسالوں کی ضرورت ہوگی وہ نئی دہلی میں متعین پاکستان کے ہائی کمشنر کی معرفت خریدے جائیں گے چونکہ ملکوں کے درمیان ہندستان اور پاکستان میں لین دین بند ہے اس لیے اخبارات، رسائل اور کتابوں کی قیمت نئی دہلی سے پاکستان ہائی کمیشن کو بھیجی جائے گی۔

(الجمعیۃ)

صدر ایوان اردو (پاکستان) کو اعزاز

جناب ڈاکٹر قمر حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) صدر ایوان اردو کو ان کی علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں گوئٹے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے گوئٹے مڈل حکومت جرمنی کا سب سے بڑا اعزاز گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف میرٹ، اور پنجاب یونیورسٹی کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ (خواجہ حمید الدین شاہد)

محمد ایوب واقف

سید نجیب اشرف ندوی

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست این سعادت قسمتِ شہبازِ و شاہیں کردہ اند

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کی عدیم المثال شخصیت کے ترجمان کہے جا سکتے ہیں مرحوم یکم دسمبر ۱۹۰۰ء کو جاندہ ضلع صوبہ بہار اسٹیٹ کے ایک گاؤں آزمورہ میں پیدا ہوئے تھے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ندوۃ العلوم لکھنؤ بھیجے جہاں علامہ شبلی نعمانی جیسے عالم سے براہ راست کسبِ فیض کی۔ ان دنوں سید سلیمان ندوی نے بھی ان کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا خیال رکھا عربی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں ۔ الٰہ داکٹر سید محمد حسین کے مشورے سے میٹرک کا امتحان دیا اور درجۂ اول کی کامیابی حاصل کی ساتھ ہی ساتھ انہیں وظیفہ بھی ملا اس کامیابی نے ان کے ذوق و شوق کو بڑھا دیا اور بڑی پابندی سے درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے نتیجے کے طور پر جب انہوں نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء میں الف اے اور بی اے کے امتحانات دیئے تو ان امتحانات میں بھی وہ اول آئے بی اے میں انہیں آنرز بھی ملا ۱۹۲۳ء میں انہوں نے فارسی سے ایم اے کیا ایم اے میں نہ صرف یہ کہ وہ اول آئے بلکہ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا ان کی اس شاندار کامیابی پر انہیں دو سو روپے کی گراں قدر تصانیف بطور انعام پیش کی گئیں۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں ایک فیلو کی حیثیت سے کام کرتے رہے دراصل یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا پہلا دور شروع ہوتا ہے دار المصنفین کے آٹھ سالہ دورِ قیام میں انہوں نے ادبی تحقیقی تنقیدی و تاریخی موضوعات پر گراں قدر مقالات و مضامین تحریر کئے کلیمنٹ ہارٹ (cleamant Hauert) کی مشہور تصنیف "تاریخ ادبیات عربی" (History of Arabic Literature) کا اردو ترجمہ بھی کیا جو کافی مقبول ہوا اسی دوران میں انہوں نے اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط و رقعات کا مجموعہ ترتیب دیا جو "رقعاتِ عالمگیر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس سلسلے میں مرحوم نے ایک طویل اور مبسوط مقدمہ بھی لکھا جس میں خطوط نگاری کی تاریخ اس کی اہمیت اور عالمگیر کی خطوط نویسی کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے یہ مقدمہ ایک تاریخی و ادبی دستاویز ہے جس کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہے گی اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی وہ لکھتے رہے جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ دار المصنفین کے ماہوار "معارف" میں کبھی کبھار وہ تبصرے بھی لکھتے رہے ان کے بعض تبصرے تو تنقیدی نقطۂ نظر سے اتنے اہم ہیں کہ انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موقع و محل کے اعتبار سے یہاں ان تبصروں کے نام دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

او پی لائبریری پٹنہ کا کیٹلاگ (catalouge of The O P L, Patna)

بوہار لائبریری کلکتہ کیٹلاگ (catalouge of Buhar library calcatta)

انڈیا آفس لندن کو کیٹلاگ catalogue of The urdu MSS India office london)

"مخارن عبدالغنی" "پنجاب میں اردو" "افغانستان اور سنٹرل ایشیا" "تاریخ نثر اردو" اور "صحافت" وغیرہ

تاریخی موضوعات پر اس زمانے میں انہوں نے جو مقالے لکھے ان کے نام حسب ذیل ہیں

او پی لائبریری پٹنہ میں دیوانِ حافظ کا ایک شاہی نسخہ" (A royal copy of Diwoni Hafizm O.P.L Patna

"اورنگ زیب کا ہندوستان" (India of Aurangzeb

"اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی تاریخ" (History of oriental public library Patna)

"دارا کی موت اور اس کا اعتقاد" Dara, s Death and his faith)

"محمد قاسم کے انتقال کے اسباب" (Causes of Mohammad Quasim, s Death)

"اورنگ زیب اور مراد" (Aurangzeb and Murad)

"فدا اللہ کے خطوط" (letter of Fada ullah)

"اختیاراتِ بدید" (Akhtiyarat-e Badyid

انہوں نے ای اے ہارن (E-H Horn) کی تصنیف "برٹش ہند کی سیاسی تعلیم" (Political system of BRITISH INDIA) کا عثمانیہ یونیورسٹی کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اردو کے عناصر خمسہ شبلی، حالی، آزاد اور نذیر احمد پر ان کے معلوماتی مضامین اسی عہد کی یادگار ہیں ان مضامین و تصانیف کے علاوہ انہوں نے اور بہت سارے ادبی و تحقیقی مضامین لکھے جو "معارف" کے علاوہ برصغیر ہند و پاک کے دیگر معتبر رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے یہاں ان مضامین کی فہرست دی جاتی ہے۔

"بہار میں اردو" اردو اورنگ آباد، "ہندوستانی ادب" ہمایوں لاہور، "سوری خاندان کے عہد کا بہار" زمانہ کانپور،

حسام الدین سلیم

کدھر سے

چار سو اندھیرا ہے
سوجھتا نہیں کچھ بھی
روشنی کے متوالو!
پوچھتا ہوں میں تم سے
مجھ کو اتنا بتلا دو
دن کدھر سے نکلے گا!

رہائیدن سے حاصل مصدر رہائش یعنے چھٹکارا اور رہائی ہے اس
غلط العوام مشتق کو کسی فاضل ادیب کے لئے استعمال کرنا اچھی بات
نہیں ہے پھر صفحہ ۲ کے پہلے کالم کی ۲۳ ویں سطر میں عالی جناب
سہیل المتین صاحب راجستھانی "نور اللہ مرقدہ" کا مرکب واؤ
معطوفہ کے ساتھ لائے ہیں جو عربی زبان سے ناآشنائی اور ادب کے
[illegible] علم کی علامت ہے اسا ر [illegible] جملہ استعمال کرنے میں اعراب
سے اعتماص کرنا غلط تیر اندازی پر دال ہے اور نور اللہ کے بعد واؤ
یعنی حرف عطف رکھ دینا ہے علمی کی شہادت ہے آگے چل کر صفحہ
[illegible] کے پہلے کالم کی دوسری سطر میں "ورثہ" بمعنی میراث لکھا گیا ہے
حال یہ امر شاید ناگوار خاطر نہ ہوگا کہ مرنے کے مال متروکہ کو ارث
کہا جاتا ہے اور ورثہ بطور جمع وارث لوگوں کا مفہوم دیتا ہے مثلاً
عامل کی جمع عملہ۔ واصل کی جمع وصلہ۔ طالب کی جمع طلبہ جاہل کی جمع
جہلہ اور وارث کی جمع ورثہ۔

اعادہ میں ایک بار پھر اعلان کرتا ہوں کہ اردو میری اکتسابی
زبان ہے جس کی خدمت میں مادری زبان کی طرح سے کرنا اپنا فرض
[illegible] قرار دیتا ہوں ع

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

(آغا حلش کاشمیری)
[illegible] ۲۷

اسلام الدین قریشی

ہماری زبان کے اداریے

(گذشتہ سے پیوستہ)

۲۳۔ یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی دوسری کانفرنس (آل احمد سرور)　　۸ جولائی ۱۹۶۷ء
۲۵۔ اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر توجہ سب سے زیادہ ضروری ہے　　۱۵ " "
۲۶۔ ہندستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم　　۲۲ " "
۲۷۔ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے کے کام　　یکم اگست ۱۹۶۷ء
۲۸۔ رہبر وقت مطلب نہ گھبرانا　　۸ " "
۳۰۔ آزادی کے بیس سال　　۱۵ " "
۳۱۔ اردو کالجوں کا قیام　　۲۲ " "
۳۲۔ سرکاری زبان یا علاقائی زبان　　یکم ستمبر " "
۳۳۔ انجمن کی شاخوں کی تنظیم　　۸ " "
۳۴۔ تعمیری نقطۂ نظر اور احتجاجی نقطۂ نظر　　۱۵ " "
۳۵۔ سری نے پرکاش نارائن اور اردو　　۲۲ " "
۳۶۔ گاندھی جینتی　　یکم اکتوبر "
۳۷۔ کیا ہم اپنا رسم خط بدل دیں؟　　۸ " "
۳۸۔ خطرہ [illegible] دیدۂ تر یاد آیا [illegible]　　۱۵ " "
۳۹۔ [illegible] زبان کا مطالعہ [illegible]　　۲۲ " "
۴۰۔ اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مسائل　　یکم نومبر "
۴۱۔ انقلاب روس کی طلائی جوبلی　　۸ " "
۴۲۔ ایک تھا جواہر لال　　۱۵ " "
۴۳۔ غالب کی صد سالہ برسی اور اردو دوستوں کے فرائض　　۲۲ " "
۴۴۔ ہندی دوستوں سے ایک سوال　　یکم دسمبر " "
۴۵۔ ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے　　۸ " "
۴۶۔ سرکاری زبان بل پر یہ ہنگامے کیوں؟　　۱۵ " "
۴۷۔ ایک تلخ حقیقت　　۲۲ " "

لسانی اقلیتوں کے لئے معقول تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں

حیدرآباد مہتممان تعلیمات سہ روزہ سالانہ کانفرنس میں جو ۱۱ ستمبر کو ختم ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو تعلیم کی معقول سہولتیں بہم پہونچانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ کانفرنس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے تیقن کے لئے لسانی اقلیتوں کے بچوں کے نام قبل از وقت درج رجسٹر کرلئے جائیں اس کانفرنس میں منظورہ قرارداد جس میں مہتممان تعلیمات کے علاوہ ڈاکٹر آر ناگ چودھری رکن منصوبہ بندی کمیشن اور جناب جے پی نائک مشیر تعلیم حکومت ہند نے شرکت کی تھی آج پریس کے حوالہ کی گئی۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ ریاست میں ایک مدرس والے مدارس کی تعداد کو مراسلاتی پروگرام کے تحت ان مدارس میں مزید اساتذہ کا انتظام کر کے گھٹا دیا جائے اس وقت آندھرا پردیش میں ایک مدرس والے مدارس کی جملہ تعداد (۱۸) ہزار ہے کانفرنس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سال حال ماہ دسمبر میں وزارت تعلیم حکومت ہند کے تعاون سے ریاستی سطح پر ایک سمینار کے منعقد کرنے کا انتظام کیا جائے تاکہ ہر سطح پر معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے اسکیمیں مرتب کی جاسکیں ایک اور فیصلہ جو اس کانفرنس میں کیا گیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی مدرس کے تعلق سے کوئی بھی کارروائی متعلقہ مہتمم تعلیمات کے پاس پندرہ یوم سے زائد نہ روکی جائے اور مہتمم تعلیمات کے ہر دفتر میں ان کارروائیوں میں تاخیر کی وجوہات اور ان کی یکسوئی کی تفصیلات کے اندراج کے لئے ایک علیحدہ رجسٹر رکھا جائے اور یہ بھی تجویز کی گئی کہ نظامت کی سطح پر کسی ایک نائب ناظم کو اساتذہ کے جملہ مسائل کی یکسوئی اور جانچ پڑتال کے لئے ذمہ دار بنایا جائے جس کے پاس اساتذہ راست اپنی شکایات پہونچا سکیں اور ان کے ازالہ کے لئے شخصی طور پر ملاقات کرسکیں وزیر تعلیم جناب پی وی نرسمہا راؤ نے جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی یہ تجویز پیش کی اساتذہ کی فلاح و بہبود کے لئے ایک خصوصی فنڈ قائم کیا جائے جو دو لاکھ روپے کا ہو اس فنڈ کا تعلق ٹیچرس ویلفیر فنڈ سے نہیں ہوگا جو حکومت ہند کی اسکیم کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ (رہنمائے دکن)

اردو آرٹس کالج کی رفتار ترقی

حیدرآباد جناب حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس ایوننگ کالج کی بموجب اس کالج میں طلبہ کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس تک پہنچ چکی ہے اردو ذریعہ تعلیم کی طرف طلبہ و طالبات کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جناب حسینی شاہد نے بتایا کہ آئندہ سال پی یو سی میں تلگو کے نفاذ کے بعد اس کالج کی افادیت اور اہمیت میں زبردست اضافہ ہوسکتا ہے چونکہ یونیورسٹی نے اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے خواہش مندوں کے بارے میں اپنی کسی پالیسی کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس کالج میں علی گڑھ میٹرک کے کامیاب طلبہ و طالبات کو بھی پی یو سی میں داخلہ دیا جا رہا ہے جناب حسینی شاہد نے تمام محبان اردو سے اردو آرٹس کالج کی کامیابی کے لئے تعاون کرنے کی اپیل کی اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں بااثر اور ممتاز شخصیتوں کی توجہ سے بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

(رہنمائے دکن)

ہنٹرگنٹہ ریلوے اسکول میں اردو کے ساتھ ناانصافی

ہنٹرگنٹہ ملازمین ریلوے کی مسلسل نمائندگی کے باوجود ریلوے اسکول میں اردو کی جائیدادوں کی آج تک گنجائش نہیں نکالی گئی ہے جس کی وجہ اردو مادری زبان والے طلبہ کا بڑا نقصان ہو رہا ہے نومبر ۱۹۶۱ تک یہ مدرسہ المنٹری اسکول تھا۔ ۱۹۶۱ میں مڈل اسکول اور جون ۱۹۶۷ میں ہائی اسکول بنایا گیا لیکن کسی مرحلے پر اردو کی جائیداد کے لئے گنجائش نہیں نکالی گئی حالانکہ مدرسے کے قیام کے وقت ہی سے زبان اول کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس وقت مدرسہ میں (۱۹۰) طلبہ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اور ان سب کی تعلیم کی ذمہ داری اس استاد کے ذمے ہے جو پرائمری کی جماعتوں کے لئے متعین ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسکول کی تمام جماعتوں کی تعلیم سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اس لئے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مزید اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ انجمن ترقی اردو نے ملازمین ریلوے ہنٹرگنٹہ کے اس مطالبے کو وزارت ریلوے اور مقامی عہدہ داروں کے سامنے پیش کیا ہے۔ توقع ہے کہ جلد ہی

وحید اختر

رفتار

اکثر اپنے ادب کے متعلق یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے جو ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا تخلیقی سرمایہ مغرب کے لکھنے والوں کے مقابلے میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بہت ہلکا ہوتا ہے۔ جو لوگ اردو میں بہت لکھتے ہیں وہ معیار کی سطح برقرار نہیں رکھ سکتے اور ادب کو صحافت بنا دیتے ہیں۔ کیفیت اور کمیت دونوں کا پورا حق ادا کرنا اردو کے لکھنے والوں کے لئے دشوار کیوں ہے؟ شاعروں کو لیجئے پوری زندگی شعر کا سرمایہ ایک یا دو دیوان ہوتے ہیں، وہ بھی بہت مختصر سے۔ نقادوں کا بیشتر سرمایہ متفرق مضامین، مختلف موضوعات پر لکھے گئے پرچوں، ریڈیو کی تقریروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اور ناول نویس بھی چند تخلیقات کے بعد یا تو اپنے کو دہرانے لگتے ہیں یا پھر قلم رکھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مغرب کے لکھنے والے آخر تک نہیں تھکتے۔ ان کا تخلیقی سرمایہ متنوع بھی ہوتا ہے اور کمیت کے لحاظ سے بھی وسیع ہوتا ہے۔ یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ ہمارے یہاں صلاحیتوں، مطالعے اور مشاہدے کی کمی ہے۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے؟

اس سوال کا ایک ہی جواب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اب تک ادب ہمارے یہاں کل وقتی کام (Whole Time Job) نہیں بن سکا ہے۔ ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں تو آزادی کے بعد سے یہ نقشہ پیدا ہو چلا ہے۔ ہندی کے بہت سے ادیب کوئی اور کام کئے بغیر محض ادب کے سہارے اچھی زندگی گزار لیتے ہیں اور اپنا پورا وقت ادب کو دے سکتے ہیں۔ اردو کا معاملہ برعکس ہے اگر آزادی سے پہلے اردو ادیب کے لئے ادب کے سہارے زندگی گزارنے کے کچھ امکانات پیدا بھی ہو چلے تھے تو آزادی کے بعد اردو پڑھنے والوں کی تقسیم اور ہندوستان میں اردو کے حلقۂ اثر کے سکڑتے جانے کے نتیجے کے طور پر یہ امکانات معدوم ہو گئے۔ ہمارے یہاں ادیب یا شاعر کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے دفتروں کی ملازمت، فلم، تجارت، مدرسی، ریڈیو یا بہت ہوا تو یونیورسٹی میں تدریس و تحقیق۔ اپنے ان کاموں سے جو وقت بچتا ہے اس کا کچھ حصہ ہی ہم ادب کو دے سکتے ہیں۔ گویا جو دراصل کل وقتی کام ہے ہمارے یہاں ادب فالتو وقت کا محض ایک مشغلہ یا ہابی ہے۔ اس میں قصور لکھنے والوں کا نہیں، وہ اپنے معاشی حالات سے بندھے ہوئے ہیں، زندہ رہنے اور پیٹ بھرنے کے لئے ادب سہارا بن نہیں سکتا۔ اس مقصد کے لئے کوئی اور پیشہ اپنانا پڑتا ہے۔ پیشہ ورانہ فرائض اور مصروفیتوں میں سے وقت نکالنا خاصا دشوار کام ہے کیونکہ آدمی جس پیشے میں بھی ہو اس کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ترقی اور بہتری کے لئے وہاں مقابلہ بھی ایسے لوگوں سے کرنا پڑتا ہے جن کی اپنے پیشے کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ادیب ایک طرح سے دونوں جگہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اپنے شوق ادب کی وجہ سے وہ پیشہ ورانہ کاموں میں دوسروں سے ویسا مقابلہ نہیں کر سکتا، جو ضروری ہے اور اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے ادب پر بھی اتنی توجہ صرف نہیں کر سکتا جتنی ادب میں سنجیدہ کام کرنے کے لئے ضروری ہے۔ نتیجہ یہ کہ توجہ اور ریاض کے لئے وقت بچتا نہیں۔ روزمرہ میں فرصت اور موڈ کے لحاظ سے کبھی کچھ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ مہینوں اور برسوں سناٹا رہتا ہے۔ زندگی سے چند لمحے چرا کر ادب کو دے دینا ہی کافی نہیں ادب پوری زندگی مانگتا ہے۔

پریم چند کے لئے ہم پڑھتے ہیں کہ وہ روز پابندی سے فرض کی طرح چند گھنٹے کسی نہ کسی ناول یا افسانے پر کام کرتے تھے۔ جوش اور اقبال کو بھی شعر کہنے کے لئے پورا وقت ملتا تھا۔ یہ اسی وقت ممکن ہوا جب ان لوگوں نے اور تمام مشاغل کو چھوڑ کر پوری طرح اپنے کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ اس میں سے بھی پریم چند کو ذریعۂ معاش کے طور پر ہندی ادب کو اپنانا پڑا کیونکہ اردو سے ان کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تعداد کے لحاظ سے بھی بہت لکھا ہے۔ یا پھر نیاز فتح پوری ہیں جن کے لئے ادب کل وقتی کام تھا، انھوں نے مختلف اور متنوع موضوعات پر بہت کام کیا۔ آج بھی جو لوگ لکھنے کا زیادہ کام کر رہے ہیں یہ وہ ہیں جنھیں یا تو

کرامت علی کرامت

غزل

سمجھ رہے ہیں جسے آپ میری ذات کا کرب
دراصل ہے وہی ستے ساری کائنات کا کرب

نحیف جسم پہ کیا کم تھی سارے دن کی تھکن
کہ میری روح پہ چھایا ہوا ہے رات کا کرب

کیا ہے قطع تعلق اگرچہ ہر شے سے
نہ دب سکے گا مگر اس سے خواہشات کا کرب

یہ جانے، ذہن کے کس حادثے کا فیض ہے یہ
کہ منکشف ہے مرے شعر سے حیات کا کرب

حیات ہے کہ ہے چٹخی ہوئی چٹان کوئی
شکست میں ہے یہاں حسن کی اک ممات کا کرب

سنور سنور گیا احساس کا صنم خانہ
ملا مجھے یہاں جب سے مہیجات کا کرب

خلوص کہتے ہیں جس کو ہوس سے وہ مفقود
شعور میں نہ اگر ہو جمالیات کا کرب

نکتہ خوشحالی کے ایسے ذرائع میسر ہیں کہ وہ معاش کی فکر سے آزاد ہیں یا پھر وہ ادیب ہیں جن کا پیشہ ہی کسی نہ کسی طرح ادب ہے۔ لیکن ایسے ادیبوں کی تعداد ناقابل لحاظ ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے جو پیشے ادیبوں کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں، ان کا کام اس قدر میکانکی، یکساں اور بے رنگ قسم کا ہوتا ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آنے کے بجائے کند پڑ جاتی ہیں۔ جیسے فلم اور ریڈیو میں کام کرنے والوں کو اس طرح کی عامیانہ، سطحی اور میکانکی چیزیں لکھنی پڑتی ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کا معیار، تخلیقی سطح اور ذہن اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر اور کچھ اور اعلیٰ معیار کی تخلیقات کے لئے ان کی صلاحیتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یونیورسٹیوں کی ملازمت اور ادیب کے پیشے میں زیادہ بعد نہیں۔ یہ بات صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے وہ لوگ جو یونیورسٹیوں کے ایسے شعبوں سے وابستہ ہیں جن کا ادب سے براہِ راست تعلق نہیں اپنے مضمون کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے پر مجبور ہیں، اگر ایسا نہ کریں تو اپنے مضمون سے انصاف نہیں کر سکتے اور ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری جامعات میں تحقیق اور مطبوعہ کاموں کا ایسا محدود تصور ہے کہ سماجیات، فلسفہ، نفسیات یا سیاسیات کے کسی استاد کا ادبی کام اس کے اپنے مضمون کے کام سے بالکل غیر متعلق اور بڑی حد تک ناقابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں کوئی ادیب ادب پر زیادہ توجہ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اساتذہ جو ادب کے شعبوں سے وابستہ ہیں، انھیں نسبتاً آسانی میسر ہے اس لئے کہ ان کے پیشے اور ادب میں کوئی بعد نہیں مگر تجربہ کیا جائے تو یہاں بھی صورت زیادہ حوصلہ افزا نہیں

جامعات کے ادب کے شعبوں میں تخلیقی کام نہ تقرر کے وقت دیکھا جاتا ہے نہ ترقی کے وقت۔ اس کے برخلاف ہمارے صدور شعبہ کا تقلیدی میکانکی ذہن تخلیقی کام کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اگر تمام اور QUALIFICATIONS برابر ہوں تب بھی ایک شاعر یا کہانی کار یا نقاد پر ایسے شخص کو ترجیح دی جاتی ہے جس نے کسی بہت ہی محدود اور اکثر صورتوں میں انتہائی غیر اہم اور غیر ضروری موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھا ہو۔ تخلیقی فنکار کو تدریس و تحقیق کے پیشے کی ذمہ داریوں کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ درجۂ اول کی تخلیق پر تیسرے درجے کی تحقیق کو فوقیت دی جاتی ہے۔ جو صدور شعبۂ ادب تخلیقی کام کی اہمیت سے واقف ہیں وہ بھی قاعدوں اور قانونوں میں اتنے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ انھیں فضول سمجھنے کے باوجود یا انھیں توڑنے نہیں پاتے یا توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ صدیوں کی غلامی اور پسماندگی نے ہمارے ذہن کو مجموعی طور پر بڑا جامد اور ظاہر پرست بنا دیا ہے۔ ہم قاعدے قانونوں کو ان مقاصد پر ترجیح دیتے ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ وضع کئے گئے ہیں۔ ہم روح سے زیادہ لباس کو دیکھتے ہیں، قابلیت اور صلاحیت سے زیادہ رسمی ڈگریوں اور قدیم شرطوں پر توجہ کرتے ہیں۔ مطالعے کی وسعت سے زیادہ صرف ایک مسئلے یا موضوع کی تحقیق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر بلندی اور گہرائی کو ناپنے کے بجائے صرف افقی سمت میں کام کرتی ہے۔ حالانکہ یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں کہ چند امیدواروں میں سے ایسے کو انتخاب کیا جائے جس کا مطالعہ وسیع، ادب و شعر کا ذوق تربیت یافتہ اور نظر گہری ہو، لیکن اس کے لئے خود منتخب کرنے والے میں جس گہری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے عام طور پر اسی کا فقدان ہے اس لئے بندھے ٹکے قاعدوں پر عمل کرنے ہی میں عافیت نظر آتی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی شخص نے کسی دوسرے یا تیسرے درجے کے قدیم شاعر پر داد طلب بڑا قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے تب بھی اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس کی نظر مجموعی طور پر پورے ادب کا احاطہ کرتی ہے اور اس کی ادبی بصیرت بھی قابل قدر ہے۔ ادب کی تدریس کے لئے محض کسی ایک شاعر یا ادیب یا موضوع پر کام کرنا کافی نہیں۔ یہ سیدھی سی چیز ہے لیکن ہمارے یہاں آج کل میکانکی اور بے روح، بے مقصد تحقیق کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے مقابلے میں تخلیق و تنقید کی صلاحیتوں کو بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے تخلیقی فنکاروں کو جن کا ادب اور دوسرے علوم کا مطالعہ وسیع ہو اور جن میں تدریس و تنقید کی نمایاں صلاحیت ہو جامعات میں رسمی ڈگریاں رکھنے والوں پر ترجیح دینی چاہئے

مغربی جامعات میں اساتذہ کے تقرر کے لئے اس قدر میکانکی قاعدے ضروری نہیں سمجھے جاتے۔ یورپ اور امریکہ میں وہ شخص جس نے کسی بھی شعبے میں بڑا اہم اور قابل قدر تخلیقی کام کیا ہے رسمی ڈگریاں رکھنے والوں سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور اس کے تقرر کے وقت رسمی ڈگریوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ ہالڈین کو ہندوستان آنے کے بعد یہاں کے اصولوں اور قاعدوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ اگر وہ یہاں کسی بھی یونیورسٹی میں سائنس کی لیکچررشپ کے امیدوار ہوتے تو وہ بھی انھیں نہیں مل سکتی تھی اس لیے کہ ان کے پاس ایم اے۔ بی ایس سی کی ڈگری نہیں تھی۔ یہ مضحکہ خیز صورت اکثر ہمارے یہاں پیدا ہوتی رہتی ہے کہ ایک بڑے ادیب اور نقاد کے مقابلے میں محض رسمی ڈگریوں کی روشنی میں ایک ایسے شخص کو جس کے پاس محض ڈگریاں ہوں لیکن جس کی ادبی بصیرت اور صلاحیت دونوں مشکوک ہوں، ترجیح دی جاتی ہے۔ ایجوکیشن کمیشن کی حالیہ سفارشات میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ادب کے شعبوں میں محض رسمی ڈگریوں پر قابلیت، صلاحیت اور تخلیقی کام کو ترجیح دینی چاہئے۔ لیکن یہ سفارش ہمارے بے روح اور بے مقصد نظام تعلیم میں مشکل ہی سے قبول کی جائے گی اور قابل عمل قرار پائے گی۔ اور اگر کبھی اس پر عمل بھی کیا گیا تو شاید ہمارے پورے معاشرے کے کرپشن اور اخلاقی انحطاط کی روشنی میں یہ اندیشہ غلط نہیں کہ مستحقین کے بجائے نااہلوں ہی کو اثر، رسوخ اور سفارش کے بل پر کرسیاں فراہم کی جائیں گی۔

اس صورت حال میں جبکہ تخلیقی کام کی ادب کے شعبوں میں

بھی بدرہیں ادیب مجبور ہے کہ وہ ادب کو ایک وقتی مشغلہ اور "شوقِ فضول" ہی سمجھتا رہے اور اس کے مطابق فرصت کے اوقات میں ادب سے حظ اٹھایا کرے۔

ہمارے ملک میں اردو پڑھنے والوں کا دائرہ جس تیزی سے سکڑ رہا ہے اس کی روشنی میں یہ توقع کرنا کہ کبھی ہمارے قارئین کا حلقہ اتنا بڑا ہو جائے گا کہ صرف کتابوں کی رائلٹی سے ہم مغرب کے ادیبوں کی طرح فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں گے اور پورا وقت ادب کو دے سکیں گے ایک ایسا واہمہ ہے جس کی حقیقت بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موجودہ صورت حال میں علمی زبان کی حیثیت سے اردو کے ترقی کرنے کا امکان بھی بہت ہی موہوم بلکہ معدوم ہے جب ہمارے یہاں سنجیدہ ادب پڑھنے والے ہی نہیں تو علمی موضوعات پر سنجیدہ مضامین اور کتابیں پڑھنے والے کہاں سے پیدا ہوں گے اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک اردو علم کی زبان نہیں بنتی اس کا ادب بھی ترقی نہیں کرسکتا۔ یوں ہم اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اپنی زبان کے ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا مقابل سمجھ لیں لیکن ہمارا ادبی سرمایہ اور ہمارے قدیم و جدید ادیبوں کی تخلیقی کام اس خوش فہمی کو جھٹلاتا رہے گا۔ ادب کی ترقی کے لئے پہلے دو چیزیں ناگزیر ہیں، ایک تو اردو کا علمی زبان بنانا تاکہ علوم پر ہماری زبان میں طبع زاد اور اعلیٰ معیار کا بامقصد تحقیقی کام ضروری ہے دوسرے ادب کو کل وقتی کام کا درجہ دینا۔ پہلی بات کے لئے ہمارے ملک کے ارباب اقتدار اور سیاسی عصبیت سازگار حالات پیدا نہ کرے گی دوسری شرط اس پہلی شرط ہی کا تتمہ ہے۔ جب پہلی شرط کی تکمیل بعید از قیاس ہے تو دوسری کی تکمیل کے خواب دیکھنا بھی عبث ہوگا۔

فی الوقت تو یہی نظر آتا ہے کہ جب تک بھی اردو کے چند پڑھنے والے باقی ہیں ہمارا ادیب اپنی انا کی تسکین کے لئے ادب کو "شوقِ فضول" سمجھ کر اور معاش سے بے نیاز ہو کر لکھتا رہے کچھ لکھ لیا کرے گا اور بس۔ "شوقِ فضول" اوائل عمر کے جوش اور تصور رنگینی میں تو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر زندگی کی تلخ حقیقتوں کے مقابلے میں زیادہ دن ساتھ نہیں دے سکتا۔ تخلیقی کام کے لئے سازگار فضا بہت ضروری ہے۔ ایسے دیوانے اب بھی مل جائیں گے جو اپنی زندگی کی خوشحالی اور مستقبل ہر چیز کی قربانی دے کر اور ہر طرح کا نقصان برداشت کر کے ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ ایسی مقدس دیوانگی مبارک اور مستحسن ہے مگر کوئی ادب محض "دیوانگیِ شوق" کے سہارے ہی ترقی نہیں کرسکتا اور پھر دیوانگی شوق بھی کتنے دن باقی رہ سکتا ہے؟

صفحہ ۴ سے آگے

اور اب اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے

خاک اڑاتی ہے گلستاں میں صبا تیرے بغیر
چاک کرتے ہیں گل ولالہ قبا تیرے بغیر

لیکن افسوس کرنے اور قبا چاک کرنے سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس خلوص اور لگن سے مرحوم اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اسی خلوص اور اسی لگن کے ساتھ ان کے مشن کو فروغ دیا جائے اور اگر ایسا کیا گیا تو یقیناً ان کی یاد باقی رہے گی۔

مراسلات

انجمن ترقی اردو آندھرا کی ادبی سرگرمیاں

"ہماری زبان" کے شمارے مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء میں جناب ابن عوری دکنی کا ایک مراسلہ "مدیر ہماری زبان کے نام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ریاستی انجمنوں کو ٹھوس کام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ وہ علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں اور اردو ادب کے شہ پاروں کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کے علاوہ ڈکشنریوں کی تیاری پر پوری توجہ دیں نیز علاقائی زبانوں کو سیکھنے کے لئے قاعدے بلا تاخیر مرتب کریں۔ تجویز نہایت معقول ہے۔

اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے جو کام انجام دیا ہے وہ مختصراً حسب ذیل ہے۔

(۱) تلگو سے اردو اور اردو سے تلگو سیکھنے کے لئے قاعدے مرتب کئے جا چکے ہیں جو کئی سال سے مروج ہیں۔

(۲) ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے اردو سے تلگو اور تلگو سے اردو میں ڈکشنریاں مرتب کرائی جا کر انہیں شائع کروایا جا چکا ہے۔

(۳) تلگو ادب کی ایک مختصر تاریخ اردو میں شائع ہو چکی ہے۔

(۴) تلگو کے نمائندہ افسانوں کا ایک مجموعہ انجمن کی ایما پر ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش نے اردو میں شائع کیا ہے۔

(۵) اس وقت انجمن کی جانب سے ایک مبسوط اردو تلگو لغت کی ترتیب کا کام انجام پا رہا ہے۔ اب تک (۱۸۰) الفاظ کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اگلے سال کے اوائل تک شاید یہ لغت طباعت کے مراحل بھی طے کرے۔

(سری واس لاہوٹی)

دودرکھ میں غالب صدی

آئندہ فروری میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے ساری دنیا کے ادبا دوست اس کا اہتمام کر رہے ہیں دودرکھ میں جہاں مشاعرے موسمی بیماری بن گئے ہیں غالب صدی کا کوئی چرچا نہیں ہے انجمن ترقی اردو (ہند) علاقۂ دودرکھ غالب صدی کا ایک پروگرام مرتب کر رہی ہے دودرکھ کی انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخوں کو چاہئے کہ وہ غالب صدی منانے کا اہتمام کریں جو شاخیں اس طرف متوجہ ہوں وہ مجھ سے مراسلت کریں انجمن کی شاخوں کے علاوہ وہ ادارے بھی اس سلسلے میں انجمن کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں جو غالب صدی منانے کا عزم رکھتے ہوں

(نفیس انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دودرکھ شاخ)

"ہماری زبان" کے ایک مضمون کے بارے میں

میں نے ایک طویل عرصے سے "ہماری زبان" میں مطبوعہ مضامین پر کچھ لکھنا روک رکھا تھا۔ ایک بار کسی اختر صاحب انصاری کا حدود اربعہ دریافت کرنے پر گالیاں تک وصول کر کے ارادہ یہی تھا کہ "خاموشی بہ است"۔ اختر صاحب انصاری نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ میں اہل زبان نہ ہونے کا اشتہار دے کر اپنے لئے ڈھال مہیا کرتا ہوں آج ۲۲ راگست ۱۹۶۸ کا "ہماری زبان" زیر مطالعہ آیا تو صفحہ ۷ کے دوسرے کالم میں عالی جناب فضل المتین صاحب کا یہ ارشاد "بہرحال اظہار خیال اور اظہار رائے کا ہر ایک کو حق و اختیار ہے" ذرا ڈھارس بندھی کہ دل کی بھڑاس نکال دوں۔ انھیں ف م صاحب نے اپنے متعلق صفحہ ۷ کے دوسرے کالم میں فرمایا ہے "ایک راسخ العقیدہ اور اردو ادب کا ایک خدمت گزار ہونے کی بنا پر مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ صولت مرحوم شاعرانہ حیثیت سے راسخ العقیدہ کی تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہیں گے۔"

مرزا صائب کا فرمان ہے ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

تبلد صولت ٹونکی سے مجھے بھی شناسائی کا شرف حاصل ہے اور میں کبھی ان فضل المتین صاحب کی طرح سے یہ کہنے کو تیار نہیں "وہ استغنا و خودداری کی کن اعلیٰ صفات کا مظاہرہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے عالم میں کرتے رہے" بظاہر ف م صاحب روا روی میں یہ فرما گئے ہیں کہ استغنا اور خودداری باہم متعلق ہیں بصورت دیگر یہ کہنا لازم آئے گا کہ فضل المتین صاحب "جو می سرایند" سے آگاہ نہیں آمدم برسر مطلب۔ عالی جناب فضل المتین صاحب نے صفحہ ۵ کے دوسرے کالم کی گیارھویں سطر میں "زود رنج زوداں" کا استعمال فرمایا ہے اس چلنے والی زود رنج سے ف م صاحب کو کیا مقصود ہے کیونکہ درست مرکب "زود رنج و زوداں" ہے اسی کالم کی ۳۴ ویں سطر میں "بے پرواہ" کا مرکب رکھا ہے درحالیکہ صحیح لفظ "بے پروا" ہے پروا کے بعد ہائے ہوز لانا نادانی ہے پھر صفحہ ۶ کے پہلے کالم کی ۹ویں سطر میں "دنیاوی" کا لفظ آئے ہیں حالانکہ درست لفظ دنیوی ہے اور "دنیاوی" کا استعمال فصحا جائز قرار نہیں دیتے پھر اسی کالم کی ۲۹ ویں سطر میں "مولینا" بجائے "مولانا" تحریر کیا گیا کیا فضل المتین صاحب جانتے ہیں کہ مولینا یا مولائے نا مہمل الفاظ ہیں اگر عربی رسم الخط کا تتبع ضروری تھا تو "مولٰنا" لکھ سکتے تھے "مولائے ما" فارسی ترکیب سے درست ہے مگر "مولائے نا" نہیں۔ صفحہ ۷ کے دوسرے کالم کی تیسری سطر میں "رہائش" بمعنی قیام مستعمل ہے حالانکہ جس طرح سے کہنا کا حاصل مصدر کہاوت ہے اسی طرح سے رہنا سے حاصل مصدر رہاوت (یو۔پی) کے دیہات میں مروج ہے فارسی زبان میں رہاندن با

اس قدیم مطالبے کی یکسوئی ہو جائے گی۔ (ترقی اردو)

سنگاریڈی میں انجمن کا قیام

سنگاریڈی اڈہاک کمیٹی کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو سنگاریڈی کا انتخاب ہوا۔ انتخابات کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عہدہ داروں نے جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے اردو کی جدوجہد کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔ آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کرے اور ایسے جونیر کالج بھی قائم کرے جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔

(نامہ نگار)

جوگی پیٹ میں اردو پنڈت کی جائدادوں کا مطالبہ

جوگی پیٹ۔ انجمن ترقی اردو جوگی پیٹ نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر اور سکریٹری ضلع پریشد کو ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ضلع میدک کے سرتعلقے میں ایک ہائی اسکول اور کئی مڈل اسکول ہیں لیکن ان میں سے کسی مدرسے میں اردو جونیر پنڈٹ کی جائداد نہیں ہے، حالانکہ اسی (۱۶) جائدادوں کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ انجمن کی توجہ دلانے پر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر نے ناظم تعلیمات سے درخواست کی ہے کہ مطلوبہ جائدادوں کے انصرام کی اجازت دی جائے۔ (ترقی اردو)

برلن میں اردو

لکھنؤ۔ برلن یونیورسٹی میں انڈیالوجی کے لکچرر جناب عارف نقوی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست خواجہ محمد ہائی ایڈوکیٹ کے مکان پر منعقد ہوئی جس میں مشرقی برلن میں آٹھ سالہ قیام کے تاثرات بیان کرتے ہوئے، ساحر لکھنوی کے ایک سوال کے جواب میں جناب عارف نقوی نے بتایا کہ مشرقی برلن میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔
اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شکوہ کیا کہ ان ممالک کے سربراہ دادوار جہاں بڑی تعداد میں اردو بولی جاتی ہے مشرقی برلن میں اردو کی ترویج کے بارے میں لاپرواہی برت رہے ہیں جس کے باعث وہاں اردو کو وہ مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی جو اس کا حصہ ہے حالانکہ اردو نظم دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلے میں فخر سے پیش کی جا سکتی ہے۔
انھوں نے کہا کہ یہ بہترین وقت ہے کہ اردو کی بہترین نظموں اور غزلوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور خصوصیت سے انھوں نے جرمن زبان میں ترجمے کی اہمیت پر زور دیا۔ جناب عارف نقوی خود بھی کچھ اچھے اردو افسانوں اور نظموں کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔
اس ادبی نشست میں شارب لکھنوی، یوسف سہری، نسیم ماردنی، نشتر واجدی، سلیم عمر، ناظر خیامی، حیدر طباطبائی، شان عالم، اور ناوک لکھنوی وغیرہ شامل رہے۔

(قومی آواز)

امریکہ میں اردو

علی گڑھ۔ انجمن اردوئے معلی (شعبۂ اردو) کا ایک جلسہ ۲۵ ستمبر ۹۸ء کو زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں اردو کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم صاحب نے "امریکہ میں اردو" پر تقریر کی۔ سکریٹری نے گذشتہ جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اس کے بعد صدر جلسہ پروفیسر سرور نے حسن نعیم صاحب کا تعارف کرایا۔ سرور صاحب نے کہا کہ حسن نعیم صاحب اگرچہ نیویارک میں ہندوستانی وزارت خارجہ کے ایک افسر کی حیثیت سے مقیم تھے لیکن انھوں نے اپنے قیام کے دوران امریکہ میں اردو تعلیم و تدریس کے مسائل سے خاص دلچسپی لی اور اردو شعر و ادب کو امریکہ میں متعارف کرانے کے کام کی ابتدا کی۔ حسن نعیم اردو کے ایک خوش گو شاعر ہیں ان کی غزلوں میں جدید ہیں کے ساتھ ساتھ کلاسکی روایات کا پاس ملتا ہے۔ اپنی تقریر میں جناب حسن نعیم نے امریکہ اور کنیڈا میں اردو کی تعلیم و تدریس اور ترویج [illegible] کے سلسلے میں جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی [illegible] انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کی درسگاہوں میں اردو کو [illegible] انھوں نے بتایا کہ امریکہ کی بارہ یونیورسٹیوں میں [illegible] تعلیم دی جاتی ہے جن میں شکاگو وسکانسن، [illegible] کولمبیا، [illegible] جیسی عظیم یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مختلف موقعوں پر مجھے یہ احساس ہوا کہ امریکہ میں اردو شعر و ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ اگرچہ وہاں کے بیشتر لوگ زبان کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ بعض ترجموں کو سن کر یا پڑھ کر اردو کی اہمیت کا وہاں احساس پیدا ہو رہا ہے۔ نعیم صاحب نے نورتھ ویسٹرن یونیورسٹی کا ذکر خاص طور پر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں ایک تجرباتی سہ سالہ ڈگری کورس شروع کیا گیا ہے جس میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ اختیاری ہیں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جو مضمون وہاں لازمی طور پر طالب علم کو لینا پڑتا ہے وہ اردو ہے جسے پاس کئے بغیر ڈگری نہیں مل سکتی ہے اس وقت وہاں ۲۲ لڑکے اور ۳۲ لڑکیاں داخل ہیں ایک تجرباتی کورس کے لحاظ سے یہ تعداد خاصی تسلی بخش ہے۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے جناب حسن نعیم نے کہا کہ امریکہ میں اردو کو پاکستان کی زبان سمجھا جاتا ہے

تبصرہ

شہریار

سنہرے سپنے (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف: رہبر سنگھ آمر
قیمت: تین روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ: نمبر ۱- ج- بی- ۳ سیکٹر ۲۲ ڈی چنڈی گڑھ

سنہرے سپنے میں جو افسانے شامل ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کا زندگی کو دیکھنے کا انداز خاصا رومانی ہے وہ افسانہ یا کہانی میں غیر معمولیت کو ضروری خیال کرتے ہیں اور رقت آلود مکالمات اور واقعات سے کرداروں کی جذباتی زندگی اور ٹھوس حقیقی زندگی کے ٹکراؤ اور تضاد کو ظاہر کرتے ہیں فن کا یہ انداز اب خاصا پرانا ہو چکا ہے لیکن جب ہم محمد حسین آزاد کے اسلوب میں عبد الحلیم شرر کے تاریخی قصوں کو پھر سے زندہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ افسانے بہت زیادہ پرانے نہیں معلوم ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ زمانہ سریندر پرکاش کی تلخ، تند اور تخلیقی سرا احمد ہمیش کی چھیا نک حقیقت پسندی اور بلراج مینرا کی دل دہلا دینے والی تجریدیت کا ہے لیکن عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے سنہرے سپنے جیسے افسانوی مجموعوں کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس مجموعے کی ترتیب میں رہبر صاحب نے خاصی جدت سے کام لیا ہے۔ مثلاً انگریزی داں طبقہ کی خاطر مجموعہ کے نام کا انگریزی ترجمہ بھی ڈسٹ کور پر دے دیا ہے۔

صفحہ ۱۱ سے آگے

میں نے اور بہت سے دوسرے ہندوستانیوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ہمیں تھوڑی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے امریکہ میں اردو کو اور زیادہ مقبول بنانے کے لئے ہم نے ترجموں کی ایک اسکیم بنائی ہے، دراصل کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا ہے جن کے ذریعہ سے ہم اردو ادب کی اہم اصناف کو امریکیوں سے متعارف کرا سکیں۔ ان لوگوں کی اردو دوستی اور شعر و ادب سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے ہم نے بعض رسائل بھی نکالے۔ بعض احباب اس طرف اور زیادہ توجہ کرنے والے ہیں۔ حسن نعیم نے بتایا کہ کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آٹھ ہزار سے لے کر دس ہزار تک اردو داں لوگ مل جائیں گے جن میں بیشتر ہندوستانی اور پاکستانی مہاجرین ہیں لیکن صرف کناڈا میں بھی اردو جاننے والے خاصی تعداد میں ہیں صرف ۲۴

اردو گھر فنڈ

۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۶۸ء تک

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل و وصول	کیفیت
۱-	جناب کبیر احمد جائسی میرس روڈ علی گڑھ	۵-۰۰	نقد	خود
۲-	طلبہ سیکنڈ ایر (A) ایم ایم گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول پلوامہ کشمیر	۱۸-	منی آرڈر	غلام احمد وانی پرنسپل
۳-	طلبہ فرسٹ ایر (B) ایضاً	۲۰-	"	ریاض احمد اندرابی ماسٹر
۴-	جناب لالہ شانتی پرکاش آنند امرتسر	۱۰۰-۰۰	چیک	جناب برہم ناتھ دت
۵	جناب لالہ لال چند صاحب میرٹھ	۲۰۰-۰۰	"	"
۶-	جناب نظام محمد صالح اسسٹنٹ رجسٹرار چنتامنی میسور تعلقہ	۵-	منی آرڈر	خود
۷-	جناب رحمت اللہ فاروقی ادیب (علیگ)	۱-	"	"

میزان حال ۳۴۹-۰۰
" سابق ۴۵۳۲-۵۰
کل ۴۸۸۱-۵۰

۲۴ ٹورنٹو شہر میں ہی تقریباً ڈھائی ہزار اردو جاننے والے موجود ہیں کناڈا میں بہت بڑے پیمانے پر اردو کا کام ہو رہا ہے۔ اپنی تقریر کے دوران حسن نعیم صاحب نے بعض ایسی تقریبات کا بھی تذکرہ کیا جن میں انھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے نعیم صاحب نے بتایا کہ امریکہ میں ادب، شعر کے میدان میں تخلیقی کام کرنے والوں کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ہمارے ملک کے ادیبوں میں پایا جاتا ہے مثلاً امریکہ میں ادب و شعر کی تخلیق اور اس کی اشاعت بھی تجارتی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ شاعر و ادیب کو اپنی تخلیق، زندگی کے ابتدائی زمانے میں لٹریری ایجنٹوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور لٹریری ایجنٹ ادیب سے مشوروں کے لئے اور اس کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے اس سے باقاعدہ فیس لیتے ہیں۔

صدر صاحب کی فرمائش پر حسن نعیم صاحب نے اپنی منتخب غزلیں سنائیں۔ سکریٹری کے شکریہ کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

(حسن احمد نظامی سکریٹری)

R.N. 2/86/5 REGD. No. L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۴۹
سالانہ قیمت پانچ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
یکم - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ شمارہ ۳۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ / اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

کیا ہم اپنی تاریخ کو جھٹلا سکتے ہیں؟

ادھر کچھ حلقوں سے پھر یہ آواز اٹھی ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے۔ اردو مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے گو اردو بولنے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پھر جنوبی ہند اور بنگال میں بہت سے مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے گو ان میں اردو جاننے کی خواہش اس لئے ہے کہ اس طرح وہ اپنے مذہبی اور مخصوص تہذیبی سرمائے سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں آج بھی خاصی تعداد ایسے غیر مسلموں کی ہے جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ پھر اردو کی بنیاد اس کی تاریخ، اس کی روایات، اس کا ادبی سرمایہ۔ اس کا مزاج بتلاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کی یادگار اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے کے لئے ہندو فرقہ پرست اور مسلم فرقہ پرست دونوں ہم آواز اور ہم زبان ہو جاتے ہیں اور اس سے اس خیال کی بنیادی کجی ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب بعض قومی نقطۂ نظر رکھنے والے بھی، غالباً حالات کی تلخی سے گھبرا کر ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا رسالہ تحریک، ستان ہند اور رنگین (بمبئی) میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کے خلوص نیت میں کوئی شبہ نہیں، مگر انہوں نے اردو کی ترقی کے لئے غلط نسخہ تجویز کیا ہے۔ جس طرح فرد کو کسی طرح اپنے حسب نسب، خاندان اور ورثے سے انکار نہیں کرنا چاہئے اسی طرح زبانوں کو بھی اپنی بنیاد، ساخت اور ارتقا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے، جو ہندی کی بھی بنیاد ہے، مگر تاریخی، سماجی اور ادبی اثرات کی وجہ سے ایک بنیاد پر دو مستقل آزاد اور خود مختار زبانیں وجود میں آگئی ہیں۔ اس مشترک بنیاد کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ اس آزاد اور خود مختار ارتقا کو جو بعد میں ہوا ہے۔ اس کی نظم و نثر کے سرمائے میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی برابر کا حصہ ہے اور سکھوں اور عیسائیوں کا بھی قابل قدر کام ہے۔ مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بستے ہیں۔ انگریزی بولنے والے بیشتر عیسائی ہیں، مگر انگریزی عیسائیوں کی زبان نہیں ہے۔ عربی بولنے والے بیشتر مسلمان ہیں، مگر عربی پر عرب عیسائی بھی اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا عرب مسلمان۔ مذہب کا زبانوں کے سرمائے پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے مگر زبانوں کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر نہ کی جا سکتی ہے نہ کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اردو بولنے والوں میں بہت بڑی تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے۔ یہ اسی طرح ہندوستان کے شہری ہیں جیسے دوسرے شہری۔ ان ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و خیالات، ان کے افکار و اقدار، اگر اردو میں آئے ہیں تو اس کی وجہ سے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہو جاتی ایک جدید ہندوستانی زبان رہتی ہے اور رہے گی، ہاں اس پر اگر کچھ مخصوص تہذیبی میلانات کی جو مسلمانوں کے یہاں نمایاں ہیں، چھاپ ہے، تو اس سے ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگی ظاہر ہوتی ہے جس پر فخر کرنا چاہئے، مگر جس کی وجہ سے ہم اسے کسی فرقے کے حوالے نہیں کر سکتے۔ یہ اپنی میراث کے ساتھ غداری ہوگی۔ زبان کا مذہب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ زبان ایک تہذیبی آلہ ہے اور دوسرے تہذیبی آلات کی طرح یہ بھی مذہب سے متاثر ہوتا ہے مگر اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اگر جمہوری ہندوستان میں لسانی اقلیتوں کو ان کا حق نہیں ملا ہے، تو ہمیں جمہوری روایات کو مستحکم کرنا چاہئے، اگر مذہبی اقلیتوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو سیکولرزم کے مسلک کو کاغذ کی زینت رکھنے کے بجائے عام زندگی کا آئین بنانا چاہئے۔ دراصل حقیقی خرابی یہ ہے کہ جمہوریت اور سیکولرزم کا نام سب لیتے ہیں مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں مقصود اکثریت اور سیاسی پارٹیوں

…زیادہ ہے اور جو سیاسی پارٹی اب تک برسر اقتدار رہی ہے اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے کہ اس نے جمہوریت اور سیکولرزم کا نام تو لیا مگر اسے دلوں میں جاگزیں کرنے اور عام زندگی کی وضع بنانے کے لئے بہت کم کام کیا۔ اس کے ساتھ ان عناصر کو بھی نہ بھولنا چاہئے جو جمہوریت اور سیکولرزم کے خلاف ہیں اور ملک کی ساری تاریخ کو نظرانداز کرکے، اسے صرف قرون اولیٰ کے ہندوستان میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ تمام اردو دوستوں کا فرض یہ ہے کہ جمہوریت کو کمزور کرنے والے اور سیکولرزم کو برا کہنے والے عناصر کے خلاف صف آرا ہوں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کا ابھی تک ہمارے یہاں کوئی قابل قدر بدل سامنے نہیں آیا۔ اس کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔ مگر ہمارا راستہ یہی ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ صرف اسی کے ذریعہ سے ہم اپنی پچاس کروڑ آبادی کو خوشحالی، ذہنی آسودگی اور روحانی ترقی تک لے جا سکتے ہیں گاندھی جی نے ایک زمانے میں جب کانگریس میں قوم پرست مسلمان بہت کم تھے کسی نے کہا کہ اس کا نام ہندو کانگریس رکھ دیا جائے انھوں نے جو جواب دیا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس میں ایک بھی مسلمان نہ رہے تو بھی یہ انڈین نیشنل کانگریس رہے گی، کیونکہ اس کا مقصد پوری ہندوستانی قوم کی خدمت کرنا ہے۔ یہ اس خدمت کی ذمہ داری کیسے ترک کرے ہمارے کچھ دوست اس بات سے رنجیدہ ہوتے ہیں کہ غیر مسلموں میں صرف وہی لوگ اردو کو اپنانے پر تیار ہیں جو چالیس سے اوپر ہیں اور نوجوان اردو کو ترک کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔ لیکن یہ ان کا فعل ہے۔ وہ اگر اپنے تہذیبی سرمائے سے اور اپنی میراث سے انکار کرتے ہیں تو ان کا نقصان ہوگا۔ ہم کیسے اپنی میراث سے انکار کر دیں۔ اردو اور ہندوستان دونوں کا بھلا اپنی پوری تاریخ کو اپنانے میں ہے۔ اسے کسی خاص مذہبی گروہ سے وابستہ کرنے میں نہیں۔ بہت سے لوگ اردو کو اس لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ اردو کے ذریعہ سے وہ روزی نہیں کما سکتے۔ ایسے صرف غیر مسلم نہیں ہیں مسلمان بھی ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو صرف ان کا فرض ہی یاد نہیں دلانا ہے ان کے لئے روزگار بھی مہیا کرنا ہے آج بھی اردو بہت سے غیر مسلموں کو روزگار دے رہی ہے۔ اگر ہم موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھیں اور اخبارات و رسائل اور ہر قسم کی کتابوں کی بہتر اشاعت پر توجہ کریں تو یہ اور زیادہ لوگوں کے لئے روزگار فراہم کرے گی۔ کاش اردو کے مسئلے کو خالص لسانی، قومی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا اور اسے موجودہ سیاست کے داؤ پیچ کا آلہ نہ بنایا جاتا تو اردو کی قومی حیثیت اور واضح ہوتی۔ اردو کی ترقی کے لئے اس کی بنیاد اور اس کے ارتقا، اس کی روایات اور اس کے مزاج سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں، جمہوریت اور سیکولرزم کی طاقتوں کو ملک میں مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور اس لئے اردو دوستوں کو صرف اردو کے لئے ہی کام نہیں کرنا ہے، ملک کی مضبوطی اور خوشحالی کے لئے بھی کام کرنا ہے۔ یہ غلط ہوگا کہ جب تک اردو والوں کے مطالبات منظور نہ ہوں وہ ملک کے مسائل سے دلچسپی نہ لیں اور ملک کو آگے بڑھانے میں مدد نہ دیں۔ ہمارا ملک ترقی کرتا ہے تو ہم بھی ترقی کرتے ہیں۔ ہمارا ملک گرتا ہے تو ہم بھی گرتے ہیں۔ ہاں ہمارا یہ ضرور خیال ہے کہ حکومت اور اکثریت کو اس لئے خاص طور سے اردو کی راہ میں دشواریاں دور کرنا چاہئیں کہ وہ جمہوریت اور سیکولرزم کی روایات کو اور قومی یک جہتی کے تصور کو ملک میں جاگزیں کرنے کے لئے مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے زیادہ اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ اردو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے وہ ایک کل ہند زبان ہے اور اس کی ترقی پورے ملک کی ترقی پر بہرحال اثرانداز ہوگی۔ اس کی زبوں حالی بھی، اس طرح پورے ملک کی زبوں حالی میں اضافہ کرے گی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں دو کروڑ اڑتیس لاکھ اردو بولنے والے ہیں جبکہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے یعنی ساڑھے چار کروڑ کے لگ بھگ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی آدھی تعداد نے اپنی مادری زبان اردو نہیں لکھوائی اور ایک تہائی غیر مسلم آبادی نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ہے۔ کیا ہم اس غیر مسلم آبادی سے جو اردو کو آج بھی اپناتی ہے یہ کہیں کہ بھائی تم غلطی پر ہو، اردو تمہاری زبان نہیں۔ ہمارا فرض اردو کی خدمت کرنا ہے اس کا کسی کے ہاتھ نیلام کرنا نہیں۔

اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں ریونیو بورڈ کی ہدایت

گورکھپور۔ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ بورڈ آف ریونیو یو۔ پی نے تمام ضلع کلکٹران اور ماتحت افسران کو ہدایت دی ہے کہ ریونیو کورٹ مینول پیرا ۱۴۱ کے مطابق تمام دستاویزات اردو زبان میں بغیر کسی دوسری زبان کے ترجمے کے قبول کی جائیں۔ نیز یہ ہدایت بھی کی ہے کہ اردو رسم خط میں دوسرے قسم کی درخواستیں، توجہ نامے وغیرہ بھی قبول کئے جائیں۔ اس سرکلر کا اطلاق دفاتر نیز مالیاتی عدالتوں پر یکساں طور پر ہوگا۔ (قومی آواز)

فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام کی سوویت یونین میں اشاعت

الماتا۔ قزاقستان کے ادبی اشاعت گھر نے نغمۂ مسترد کے نام سے فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام قزاق زبان میں شائع کیا ہے اس مجموعہ میں فیض کی کئی غزلوں اور نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ پاکستانی شعرا میں ظفر اور احمد ندیم قاسمی کا کلام سوویت یونین میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ (سیاست)

ذکاء الدین شایاں

میتھو آرنلڈ ـــ اور مشینی عہد کا المیہ

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے میتھو آرنلڈ نے مشینی دور کے اس کرب کو محسوس کر لیا تھا جو آج "شہر کے المیہ" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور جس کی کوکھ سے "تنہائی کا احساس اور" فرد کی ذات" جیسے مسئلوں نے جنم لیا۔

اگر ان مسئلوں پر دیانت اور وسیع القلبی کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آرنلڈ سے بہت پہلے اس کے پیش رو ورڈسورتھ اور کالرج وغیرہ نے "انقلاب فرانس" کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں شہروں میں ہونے والی قتل و غارتگری سے خوفزدہ ہوکر انسانیت کو "فطرت کی طرف واپسی" کا جو مشورہ دیا تھا اس میں کتنی حقیقت اور سچائی تھی۔ ان شاعروں کی بہت پر تنبیہ کرنا اور یہ کہہ دینا کہ انھوں نے فطرت پرستی کا سبق دے کر انسان کو شہری زندگی کے ہنگامہ خیز دائرے سے باہر کر دیا تھا، مناسب نہیں ہے۔ ورڈسورتھ نے یہی تو کہا تھا کہ انسان فطرت سے دور ہوکر شہر میں درندہ بن گیا ہے۔ اگر کسی طرح اسے پھر وہ موقع فراہم کر دیا جائے جہاں وہ فطرت کو بے نقاب دیکھ کر اور اس سے دو بدو باتیں کرکے اپنے احساسات اور ماحول کو ہم آہنگ کر لے، تو یقیناً اسے ذہنی اور روحانی سکون مل جائے گا۔ وہ سکون جسے شہر کے انسانیت کش صفات اور اعمال نے برباد کر دیا ہے۔ اگر یہ مراجعت ذہنی "رومانوی" اور غیر فطری ہے یا انسانیت کے لئے مفید نہیں ہے تو پھر شہری ہنگاموں سے اکتا کر ذات اور تنہائی کے خول میں اسیر ہو جانا بھی ایک رومانوی انداز ہے اور اسے بھی ایک قسم کی مراجعت یا فراریت کہا جا سکتا ہے۔ آرنلڈ کی شاعری اور ماحول کے پس منظر میں ان مسائل کو دیکھنا مناسب ہے۔

آرنلڈ نے جب ہوش سنبھالا تو انگلستان میں وکٹوریہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی وکٹوریہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے زراعت، صنعت، کلچر، تہذیب، علم و ادب اور شعر و فن سب پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ وکٹوریہ نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ان سب کو ترقی ہوئی۔ مگر سب سے زیادہ فروغ تجارت اور صنعت کو ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں "پہلا ریفارم ایکٹ" (FIRST-REFORM ACT) اور ۱۸۴۶ء میں "ریپل آف دی کارن لا" (REPEAL OF THE CORN LAW) اور ۱۸۶۷ء میں "دوسرا ریفارم ایکٹ" (SECOND REFORM ACT) کا نفاذ ہوا۔ ان قوانین نے انگلستان کی کایا پلٹ کر دی۔ ملک زراعت کو چھوڑ کر ایک دم صنعت و حرفت کی طرف مائل ہو گیا، "ریفارم ایکٹ" نے متوسط طبقے کو صاحب اقتدار بنا دیا۔ اور "کارن لا" (CORN LAW) سے تجارت کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ سرمایہ دن بدن بڑھنے لگا اور چیزیں بنانے کی مشینیں ایجاد ہونا شروع ہو گئیں۔ "فیکٹری ایکٹ" اور "مائنس ایکٹ" (MINES ACT) لاگو ہونے کے باوجود سرمایہ داروں اور مالکوں کے لئے یہ زرّیں عہد تھا۔ دوسری طرف قلیل سرمایہ رکھنے والوں کا حال تباہ ہو رہا تھا۔ ان کی خوشحالی ختم ہوتی جا رہی تھی ۱۸۵۱ء کی بڑی نمائش نے یہ یقین دلا دیا کہ صنعتی حیثیت سے انگلستان کا مرتبہ بہت بلند ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد "آزاد تجارت" کے ایسے اصول وضع کئے گئے اور ان پر اس ڈھنگ سے عمل ہوا کہ ملک کی تجارتی اور مشینی رفتار کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

عہد وکٹوریہ میں سائنس، آرٹ اور علم و ادب کے ساتھ صنعتی ترقی کتنی تیزی کے ساتھ ہوئی اس کا اندازہ اس صدی میں ہونے والی مشینی ایجادات سے لگایا جا سکتا ہے۔ چرخے سے لیکر بھاپ کے انجن تک اور ماچس سے لیکر بجلی تک کس قدر صنعتی ارتقاء ہوا ہے، اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ان تمام مادی ترقیوں کے ساتھ علم و ادب کے فروغ نے لوگوں کے ذہن و دماغ کو بڑی حد تک بدل دیا۔

وکٹورین عہد کے اس سماجی، تہذیبی، علمی اور صنعتی پس منظر میں جب آرنلڈ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو دو نہایت اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ عہد وکٹوریہ کا ذہنی انتشار (VICTORIAN UNREST)

۲۔ شہری زندگی کا کرب اور تنہائی کا احساس (MELANCHOLY MOOD)

نوشتہ (آرتھر ویلی)
مترجم (برہم ناتھ دت)

سرخ توتا

یہ اس نظم کا ترجمہ ہے جو آرتھر ویلی نے برٹرانڈ رسل کو ۱۹۱۸ء میں بھیجی جب کہ وہ جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔

آسام سے ایک تحفہ آیا
ایک سرخ توتا
گلنار کی طرح گل رنگ،
جو آدمیوں کی بولی بولتا تھا
اس کے ساتھ وہی ہوا جو
علما و فضلا کے ساتھ ہوتا آیا ہے
انھوں نے مضبوط سلاخوں کا ایک پنجرہ بنایا
اور اس میں اس کو بند کر دیا۔

"یقین کا لبریز سمندر —
پہلے دنیا کے کناروں کے گرد
ایک چمکدار اور لپٹی ہوئی پیٹی کی مانند جمٹا ہوا تھا
لیکن اب میں صرف اس کی غمگین
اور بتدریج مدہوش ہوتی ہوئی پکار کو سن رہا ہوں۔"

'SCHOLAR GIPSY' آرنلڈ کی شاہکار نظم سمجھی جاتی ہے جس میں صنعتی ترقیوں کی لعنتوں کو دکھایا گیا ہے۔ اور انسان کے اس ذہنی انتشار کی عکاسی کی گئی ہے جو نئے سماجی اور اقتصادی نظام سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نظم میں آرنلڈ نے ایک ایسے ذہین طالب علم کی تخلیق کی ہے جو آکسفورڈ میں پڑھتا تھا۔ جس نے ایسے ماحول کی نئی ترقیوں سے دل برداشتہ ہو کر یونیورسٹی کی تعلیم ترک کر دی اور جنگلوں میں آوارہ گردی کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو کے خود آوارہ گرد اس بیتاب ہیں گیا کہ ان لوگوں (آوارہ گردوں) کی صحبت میں رہ کر ان سے وہ علم حاصل کر لے جو روحانیت کا سرچشمہ ہے اور جس کے ذریعہ موجودہ زمانے کی مادی ترقی کا کرب اور دکھ سے کے استار کو ٹھیک پایا جا سکے یا اس کا حل تلاش کیا جا سکے۔ آرنلڈ نظم میں اس آوارہ گرد لڑکے کو علامت کے طور پر پیش کرتا ہے اس نے دنیا کو چھوڑ کر اور بنجاروں میں شامل ہو کر اپنے آپ کو غیر فانی بنالیا ہے۔ وہ ذہنی اور روحانی سکون کی علامت ہے جو مادیت سے بیزار ہے۔ نظم میں ایک جگہ آرنلڈ اس رومانی لڑکے کو بنجاروں کی ٹولی میں افضل جسا فرسودہ اور شکستہ لباس پہنے ہوئے دنیا کے جھگڑوں سے دور جوشی میں مگن پاتا ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"اے لڑکے، تو نے بہت پہلے اس تازہ ہمت کے ساتھ دنیا کو چھوڑ دیا جو خارجی جہان کے اثر سے کبھی نہیں مُرجھا سکتی
اس ہمت پر تو قائم ہے۔ اور تو نے اسے (ہماری طرح) اور چیزوں میں بیکار استعمال کیا۔
اسی لئے تو بیمار تھکن اور کمزور تشکیک سے آزاد ہے۔"

اسی نظم میں آگے آرنلڈ پھر اس لڑکے سے مخاطب ہے اور موجودہ دور کی پریشانیوں سے پہلے کی صاف ستھری اور پرسکون زندگی کو یاد کرتا ہے۔ موجودہ زندگی کے عجیب و غریب "مرض" سے بہت پہلے۔ تو اس دور میں پیدا ہوا۔ جب عقل تازہ اور صاف تھی اور زندگی دریائے ٹیمس کی چمکدار لہروں کی مانند رواں تھی۔

مستقبل کے بارے میں آرنلڈ بہت نا امید تھا وہ جب یہ سوچتا کہ انسان مستقبل کی نظر میں کیسے کیسے غلط تصورات قائم کر لیتا ہے تو اسے ذہنی کوفت ہونے لگتی۔ وہ جانتا تھا کہ مستقبل ایک ایسا سرسبز باغ ہے جو انسان کو حال کے بنجر اور گرم صحرا سے نکال کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے حال سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور مستقبل کی رنگینیوں کو بھی گرفت میں لانے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک نظم میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے مبہم اور مشکوک مستقبل کی مسرت کے بارے میں غلط خیال قائم کر لیتے ہیں۔
اور جب ہم اس کا تصور کرتے ہیں۔ تو اپنی تمام موجودہ حالت کو بھلا دیتے ہیں۔ اور اس دنیا سے کٹ کر الگ ہو جاتے ہیں — اور وہ دنیا بھی ہم سے دور رہتی ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

ایک نظم میں اپنے عہد کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔
" دنیا سے تنگ آ کر کیا ہوا اور لعنت بھیجا ہوا

اسحاق احمد اعظمی

غزل

لیا ہے آ گیا ہے یہ کیسا خراب وقت
ہر لمحہ دل کی موت ہر اک کام ہر شکست

یہ تو کہو سنبھالے ہوئے ہیں کسی طرح
وہ الجھی الجھی زلف ہم افسانہ لخت لخت

ہر سمت ہے خموش جراحتوں کی اک قطار
کہتی زبان حال سے خود اپنی سرگزشت

ہم لوٹ لوٹ آئے ہیں اپنی ہی ذات میں
وہ سن رہے ہیں اپنی ہی آواز بازگشت

یہ ندیاں ہیں جاڑے کی برسات کی نہیں
ان میں کہاں وہ جوش کہ ساحل لگائے جست

کیدر رواں دواں ہی رہیں کیا خوف ہے
بیٹھے ہوئے ہیں کیوں یہ ارادے بریدہ دست

راہ سفر تھی ایک فغاں وہ بھی لٹ گئی
اسحاق اور بھی ہوئی راہ حیات سخت

بڑائی کا یہ عذاب آخر کیوں ہے!
کیا یہ اس غرض سے ہے کہ اس کی سادگی اس
حاسد اور دل شکستہ عہد کا تمسخر اڑاتی ہے۔"

اسی نظم میں آرنلڈ اپنے دور کی ان سربلندیوں کا ذکر کرتا ہے جن کو وقت نے اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا تھا۔ اور جن کی قابل قدر صفات پستی میں گھل مل چکی تھیں۔

"عیار اور صاحب تدبیر سرداروں کے آگے ہر جگہ
سادہ اور مضبوط دل جھکے ہوئے نظر آتے تھے
بڑی بڑی صفات کچل دی گئی تھیں"

اس دور میں آرنلڈ "شہر" کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے شہر کی فضا میں گھری ہوئی تمام انسانیت اطمینان اور سکون کی طرف لپک رہی ہے اور یہ ذہنی اطمینان شام کے وقت غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرح آہستہ آہستہ رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ شہر میں صنعتی زندگی کا شور و غوغا اور چیخ پکار ہے۔ ہر شخص اپنے کام میں اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کی بات ایک لمحے کے لیے بھی سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح اور شام کی نیرنگیاں، موسموں کی تبدیلیاں اور مناظر فطرت کی گوناگوں کیفیات اس دنیا کو کس طرح جاذب کر لیتی ہیں اور روح و دل پر کیسے کیسے تاثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیا میں اشتعال، غصہ، تاریکی اور جھگڑوں کا دور دورہ ہے اور انسان ان سب کے درمیان گھرا ہے۔ آرنلڈ اس کا نقشہ کھینچتا ہے۔

"میں غصہ، تاریکی، اشتعال اور جھگڑوں کے
درمیان جی رہا ہوں اور ہمیشہ ان سے برسرپیکار
ہوں
میں اپنی روح کی گرمی اور روشنی سے بہت دور
ہوں لیکن ان بدصفتوں میں رہ کر میں مطمئن نہیں
ہوں۔"

اپنی نظم "THYRSIS" میں آرنلڈ شہر کے ہنگاموں سے اکتا کر اپنے عزیز دوست (THYRSIS) کے ساتھ سکون سے گزارے ہوئے ان لمحوں کی آوازوں کو یاد کرتا ہے جن سے اسے بھی اطمینان کی روشنی ملتی ہے۔ آرنلڈ اپنے دوست سے مخاطب ہے۔

"بڑے شہر کی سمت، کھردری اور دل کو تکلیف پہنچانے
والی چیخ پکار میں سے
تیری آواز سرگوشی کرتی ہوئی اکثر آتی ہے اور
خوف اور تھکن کا پیچھا کرتی ہے۔"

آرنلڈ نے جگہ جگہ اپنی نظموں میں جب شہر کا ذکر کیا ہے تو اسے شور و غل اور آبادی سے بھرا ہوا بتایا ہے۔ کہیں اسے "POPULOUS CITY" کہا ہے تو کہیں "NOISY TOWN"۔
ایک نظم (RESIGNATION) میں ایک شاعر کو دکھایا گیا ہے جو بلندی سے شہر کی ہنگامہ خیز زندگی پر نظر ڈالتا ہے۔

"کسی بلند مقام سے وہ لوگوں کی بھیڑ اور آبادی
سے بھرے ہوئے شہر پر شام کے وقت نظر ڈالتا
ہے جب سورج چھپنے کے قریب ہے۔
وہ روشن سڑک پر اور گلیوں میں گھومتی ہوئی انسانوں
کی ان ٹولیوں کا جائزہ لیتا ہے جو اپنے دن بھر کی محنت
اور کاموں کے بعد شہر کی سڑکوں پر رواں دواں ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنے ساتھ
کوئی خبر یا پیغام لیے ہوئے ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا ---
میں تنہا ہوں"

اسی نظم میں آرنلڈ ایک جگہ اپنے ہمسفر (FAUSTA) سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے

"ہم اور تم تنہا پھر اس جگہ پر چل رہے ہیں ---
ہم تم تو یا لوگوں کی ہنگامہ خیز صحبتوں سے دور روحانی
پیکر ہیں ... آسیب ہیں
اس چمکیلے ہوئے صاف اور کم گہرے چشمے کے کنارے
جہاں سے بہت دور پیچھے کی طرف ہلکے دھوئیں کی
ٹکڑیوں میں لپٹا ہوا شور و غل سے پُر شہر نظر آ رہا ہے
--- ہمیں ہم پیچھے ... اپنے راز دل کو بے نقاب
کر رہے ہیں"

شہری معاشرے کی اور بیت مالی اور مشینی انسانوں کی بھیڑ بھاڑ میں آرنلڈ اپنے ضمیر اور اپنی ذات کی طرف لوٹتا ہے۔ تو وہاں اسے دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے۔ یہ دنیا خارجی حالات سے مصالحت کرنے کو بالکل تیار نہیں ہے۔ آرنلڈ محسوس کرتا ہے کہ اس دور نے انسانوں کی انفرادیت کو ختم کر دیا ہے۔ اجتماعیت کے شور و غل میں فرد کی آواز دب کے رہ گئی ہے۔ انسان کے سامنے زندگی کی مصروفیتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے مگر وہ ایک سورج کی مانند تنہا اور بے قرار ادھر ادھر پھر رہا ہے فرد کے تمام سماجی رشتے جو بظاہر بہت مستحکم نظر آتے ہیں اندر سے بالکل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انسان جب باہر کی ہنگاموں سے گھبرا کر اپنی ذات کے خول میں پناہ لیتا ہے تو وہاں بھی اسے سکون نہیں ملتا۔

آرنلڈ ایک تنہا فرد کو بھری دنیا میں دکھاتا ہے۔

"تیرے ستار کی آواز ہر جگہ تنہا ہے۔
دیوتاؤں کے دربار میں بھی۔ انسان کے شہر میں بھی۔"

انسان کو اپنی تنہائی کا کتنا شدید احساس ہے اور اس
کی روح اس بوجھ سے کتنی دبی جا رہی ہے، ذیل کی سطروں
میں اسی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے (آبادی سے دور پہاڑی پر
کھڑے ہوئے ایک تنہا شخص یہ سوچتا ہے)

"میں ـ صرف میں ـ
جس کی آرزوؤں کے چشمے خشک ہو چکے ہیں
جس کی روح شکست کھا چکی ہے ـــــ
میں (ان پہاڑوں اور جنگلوں کی طرح) تنہائی میں
ہمت اور طاقت کو بچا نہیں سکتا ـ
اور نہ اپنے بلند حوصلوں کو آباد رکھ سکتا ہوں
میں تنہا ـ زندگی اور اس کی دوستیوں کے لئے مر چکا ہوں
اکیلا ہے ہر راستے کے چہرے پر اپنی مردہ دلی کو پڑھ رہا ہوں
یہ ماورا میں شخص جب تہذیب و تمدن سے ہٹ کر
تاروں کو دیکھتا ہے تو وہ بھی اسے اسی طرح دکھائی دیتے ہیں ـ
... قیمت ... ہیں لیکن انفرادی شکل میں
... وہ تاروں سے کہتا ہے
"تم بھی ہماری طرح بکھرے ہوئے اور بے خبر ہو
تم بھی ہماری مانند بے بس ہو ـ
کیا تمہیں ہماری بے بسی کا اندازہ نہیں"
اور انسان کی تنہائی کے احساس کو آرنلڈ ایک سطح
پر یوں بیان کرتا ہے ایک شخص خود اپنے دل سے باتیں کر رہا
ہے)
"یہ دنیا اپنا مخصوص دل رکھتی ہے، جو تجھے پارہ پارہ کر دے گی
تو دنیا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـ
تو انسانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل نہیں ـ
ان کے خیالات، طور طریق (خواہشات) تجھ سے
میل نہیں کھا سکتے اور تنہائی کے اس احساس
کی وجہ ہی سے تو پریشان ہے ـ تو نہ صرف یہ کہ
انسانوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا ـ بلکہ اپنے ساتھ بھی
تیرا گذارہ نہیں ہوگا"

ہمارے آج کے معاشرے میں جب مشینی زندگی کی رفتار
تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور انسان کی تنہائی، غمگینی، بے یقینی
اور مایوسی نے بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں ـ ضرورت اس بات
کی ہے کہ آرنلڈ کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے، کیونکہ مجھے
اس محسوس ہوتا ہے کہ ایک صدی پیشتر کے وکٹورین عہد میں
تشکیک، احساس تنہائی، فرد کی ذات کا مسئلہ اور پرانی
قدروں کی شکست وغیرہ کے سلسلے میں آرنلڈ نے اپنی شاعری میں
جو صحیح اشارے کئے ہیں، اسی سے ملتی جلتی صورت آج ہمارے
کی سماجی زندگی میں موجود ہے

کتابیں ملیں

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری
ہیں ـ

سرورِ سرمدی (مجموعۂ کلام)
مصنف ناشاد کاپوری
ناشر ـ ایس ـ بی ـ بیگم ناشاد، پانڈو نگر ـ کانپور
صفحات ۲۰۸
قیمت چار روپے پچاس پیسے

نیل مرام مصنف حسین محمد اسلم عظیم آبادی
ناشر: مکتبہ اردو پٹنہ
صفحات ۲۹۵
قیمت ساڑھے چار روپے

خطوط بہادر یار جنگ
مرتب: مولوی نذیر الدین احمد
ملنے کا پتہ ـ ادبی ٹرسٹ
بک ڈپو، عابد روڈ
حیدرآباد دکن
صفحات: ۱۲۰
قیمت: ایک روپیہ
پچاس پیسے ـ

مراسلات

ریاض العارفین

۱۵ر جنوری ۱۹۶۸ء کے "ہماری زبان" میں جناب نیاز حیدر صاحب کا مراسلہ "تنبیہ الغافلین" اور "ہزار مسائل" سے متعلق شائع ہوا ہے۔

یوں تو والد صاحب مرحوم مولانا شاہ ابوالحسن ادیب کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بے شمار تھا جس میں قلمی نسخے، نایاب کتابیں اور سلطنت خداداد کے شعرا سے متعلق بھی بہت کچھ مواد تھا اور سب سے پہلے مولانا ادیب نے سلطنت خداداد کے شعرا سے متعلق اپنی تصنیف "غازیٔ اعظم" میں تذکرہ کیا تھا جس کے حوالے مصنف "میسور میں اردو" (ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما) ترقی اردو بورڈ کراچی اور بہت سوں نے دئے ہیں۔

سن ۱۹۲۱ء میں والد صاحب مرحوم نے ایک مختصر تاریخ "تاریخ میسور" کے نام سے لکھی تھی جو پچیس مرتبہ شائع ہو کر چالیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ اس کتاب کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے ایک مفصل تاریخ لکھنے کا تقاضہ کیا تو والد صاحب نے ایک مکمل تاریخ اس ملک کی لکھی اور اس کے تین حصے کئے۔ پہلا حصہ جس میں راجگان میسور کے ساتھ ساتھ مختصر طور پر کچھ مسلمان بادشاہوں کا بھی ذکر شامل کرایا تو صیغۂ تعلیم کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے وی۔ ٹی۔ سی۔ کلاس کے لئے ٹکسٹ مقرر کر لیا اور دوسرا حصہ "غازیٔ اعظم" سن ۱۹۳۲ء میں شائع کیا جس میں غازیٔ اعظم نواب حیدر علی خاں بہادر والیٔ میسور کے حالات لکھے ہیں اور تیسرا حصہ "شہید اکبر" (جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے) میں شہید اکبر جو سلطان میسور ابو الفتح فتح علی ٹیپو سلطان سے متعلق ہے جب والد محترم بقید حیات تھے تو لاہور کے کسی ایک پبلشر کا اس سلسلہ میں خط آیا تھا مگر چند وجوہات کی بنا پر وہ معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا یہ قلمی نسخہ اب میرے پاس محفوظ ہے (اگر کوئی پبلشرز صاحبان اس سلسلہ میں کچھ مراسلت کرنا چاہتے ہوں تو براہ مہربانی اس پتہ پر توجہ فرمائیں۔ ایس نجم الحسن انجم ادیب نمبر ۲۷۳۸ ساڈسے روڈ منڈی محلہ میسور)

والد محترم کے انتقال کے بعد جو صاحب ہمارے یہاں آئے اور ان کی نظر جس کتاب پر پڑی وہ ساتھ لیتے گئے ایسے ان کی بے شمار کتابیں بٹ چکی ہیں اور چند کتابیں مہاراجہ کالج میسور کی لائبریری کی بھی زینت ہیں اور جو کچھ باقی رہ گئی تھیں وہ میں اور میرے بھائی صاحبان سراج ادیب، بشیر ادیب اور انور ادیب نے بطور یادگار اپنے پاس رکھ لی ہیں مراسلہ کے شائع ہونے کے بعد میں نے اپنے کتب خانہ کی از سر نو تنظیم کی تو اس میں دکنی نظم کا ایک قلمی نسخہ "ریاض العارفین" نکل آیا جس کی کتابت اچھی ہے کاغذ موٹا ہے اور اس کا حجم ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے بطور نمونہ دو چار شعر ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

شکر ہر حال اسا اسحاق توں — جی خدا کے لطف ہور توفیق سوں
یو بزرگاں کے بزرگے کا کلام — نظم دکھنی توں دیا زینت تمام
صد ہزاراں شکر رب العالمیں — ختم پایا جو "ریاض العارفیں"
تھی جو اخبار صحیح مرادیاں — عارفاں کا نسخہ نی ذکر دیاں
صد ہزاراں شکر رب العالمین — ہوئی ختم مثنوی "ریاض العارفیں"

(نجم الحسن انجم ادیب)

نکہت کشمیر

نکہت کشمیر کی تدوین کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس میں شعرا کی ان نظموں کو یکجا کیا گیا ہے جس میں انھوں نے کشمیر کے غیر فانی فطری حسن اور تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شعرا سے درخواست ہے کہ ابھی اس مجموعہ میں چند نظموں کی اور گنجائش ہے اس لئے براہ کرم اپنی تخلیقات میرے پاس ۳۱ اکتوبر تک بھیج دیں۔

([illegible] لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو و لسانی سروے کمیٹی کی نشست

بہار لسانی سروے کمیٹی، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی دوسری نشست اعلان کے مطابق تاریخ ۲۴ ستمبر ۶۸ء کو دفتر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو واقع لالہ رار مرل دریاپور، پٹنہ، زیر صدارت الحاج غلام سرور صاحب صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو منعقد ہوئی۔ نشست میں ایجنڈے پر غور و خوض کے بعد حسب ذیل تجویز بہ اتفاق رائے منظور کی گئی۔

(۱) آج کی نشست یہ طے کرتی ہے کہ کمیٹی کے اراکین بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے اراکین کے ساتھ تمام ضلعی شاخوں کے مراکز کا دورہ کرکے انجمن کے عام اراکین اور محبان اردو کو سروے کے لئے رقم فراہم کرنے پر آمادہ کریں۔ (۲) سروے کا کام [illegible] اکتوبر سے شروع کیا جائے اور ۲۸ اکتوبر تک مکمل کر لیا جائے۔

(پروفیسر مظفر اقبال، کنوینر لسانی سروے کمیٹی، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو)

بھاگلپور اردو گرلز ہائی اسکول کا قیام

بھاگلپور انجمن ترقی اردو بھاگلپور کی سب کمیٹی برائے مجوزہ اردو گرلز اسکول کی ایک نشست زیر صدارت محمد احمد صاحب ایڈوکیٹ منعقد ہوئی جس میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر محمد یونس صاحب نے مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول بھاگلپور نے گرلز ہائی اسکول کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جناب پروفیسر مظفر اقبال صاحب نے مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کے سلسلے میں سامعین سے کہا کہ جب ضلع انجمن نے اسکول کے قیام کا فیصلہ کر دیا ہے تو اس سلسلے میں اب ضروری ہو گیا ہے کہ اسے عملی شکل دینے کے لئے پوری کوشش کی جائے اور تعلیم کا آغاز فی الحال آٹھویں کلاس سے شروع کر دیا جائے۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فی الحال عوامی چندہ نہ کیا جائے بلکہ صاحب حیثیت لوگوں کی ایک فہرست مکمل کی جائے اور انہیں کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد کی طرف توجہ دینے کو کہا جائے۔ اسکول جب چل پڑے گا اور عوام اس سے روشناس ہو جائیں گے تو پھر ایسی صورت میں عوامی چندہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے حسب ذیل تجاویز کی منظوری کے بعد کارروائی ختم کر دی گئی۔ ۱۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کو عملی شکل دینے کے لئے شہر اور مضافات کی کل اردو آبادی سے چندہ طلب کیا جائے لیکن فی الوقت صرف خصوصی چندہ کیا جائے اور عمومی چندہ کی اپیل اشتہارات کے ذریعہ کر دی جائے۔ ۲۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول کو جلد از جلد قائم کرنے کے لئے دو ماہ کے اندر تخمینی رقم اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۳۔ یہ نشست مزید یہ طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول کے قیام کے سلسلے میں فی الوقت کم سے کم بیس ہزار روپے اکٹھا کئے جائیں۔ ۴۔ یہ نشست طے کرتی ہے کہ سب کمیٹی کے اراکین شہر اور مضافات کے مختلف علاقوں میں اردو دوستوں سے مل کر ان کو مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آمادہ کریں۔ ۵۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول میں صرف دو کلاسیں یعنی آٹھویں اور نویں کھولی جائیں۔

(مسلم)

آسن سول کے ریلوے اسکول سے اردو کی تعلیم ختم کرنے کی کوشش

آسن سول آسن سول ایسٹرن ریلوے بوائز ایچ۔ ایس۔ ایم۔ پی اسکول سے اردو کی پڑھائی کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اردو طلبہ کے داخلہ میں مختلف قسم کی دشواریاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اسکول مذکور کے پرنسپل کا رویہ خاص کر انتہائی جانبدارانہ اور ناقابل اعتراض بتایا جاتا ہے، طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ اسکول مذکور صرف بنگلہ پڑھنے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہے اس لئے غیر بنگلہ طلبہ دوسرے اسکولوں میں چلے جائیں اسی بنا پر اردو طلبہ کا داخلہ نہیں لیا جا رہا ہے۔ اسکول مذکور مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہے اور خاص کر ریلوے ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا۔ اسکول کے قیام وقت سے ہی یہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن اب اسکول سے اردو ختم کرنے کی کوشش ہے۔ اس سلسلہ میں ریلوے بورڈ دہلی کے چیئرمین کو درخواست دی گئی ہے جس میں تمام حقائق کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس وقت اسکول مذکور میں اردو پڑھنے والے بیس طلبہ ہیں اور اردو اور فارسی کے صرف ایک معلم ہیں۔ بنگلہ پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۸۴۱ ہے جبکہ بنگلہ اساتذہ کی تعداد ۳۶ ہے۔ اس طرح ہر ۲۳ بنگلہ طلبہ پر ایک معلم ہیں لہٰذا طلبہ کی تعداد کی بنا پر اردو کی تعلیم کے ختم کر دینے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا ہے۔ جو لوگ اسکول مذکور کو صرف بنگلہ اسکول بنانا چاہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مغربی بنگال کے محکمہ تعلیم کی ہدایت کے مطابق جب تک اردو پڑھنے والوں کی تعداد چالیس نہیں ہو جاتی اس وقت تک اردو کی پڑھائی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس ہدایت کا مقصد لسانی اقلیت والے طلبہ کے لئے سہولت پہنچانا ہے۔ جہاں اردو کی تعلیم رائج ہے وہاں اس ہدایت کی بنا پر اردو کی تعلیم کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

پنجاب میں اردو کے ساتھ ناانصافی

امرتسر زبان کے جھگڑوں نے مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے ساتھ شدید ناانصافی ہو رہی ہے۔ بالخصوص پنجاب میں اسے مکمل طور پر نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک ادبی سرگرمیوں کا تعلق

ہے تقسیم وطن سے پہلے ہندوستان میں پنجاب اردو کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ آج بھی جب کہ اسے نیست و نابود کرنے کی مجنونانہ مہم بائیسویں سال میں داخل ہو چکی ہے، اس صوبہ میں اردو خواں افراد کی تعداد ہندی داں اور پنجابی داں افراد کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دعوے کا واضح اور ناقابلِ تردید ثبوت درکار ہو، تو یہاں کے اردو اخبارات کی اشاعت سے ہندی اور پنجابی کے اخبارات کی اشاعت کا مقابلہ کر لیجئے۔ مشکل یہ ہے کہ اردو کو غلط طور پر مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا گیا ہے اور چونکہ تقسیم وطن کے بعد پاکستانی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کا نکاس اور ہندوستانی پنجاب سے مسلمانوں کا نکاس اجتماعی سطح پر عمل میں آیا۔ یہاں سے اردو کا دیس نکالا بھی ارباب سیاست کی نظر میں ضروری قرار پایا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی ارباب سیاست جو پبلک طور پر اردو کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ نجی بات چیت میں اس کی گوناگوں خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی حق تلفی پر ہمدردی کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کے پبلک اور پرائیویٹ طرز عمل میں یہ تضاد ان کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ یہ صورت حالات اردو کی کس مپرسی اور حق تلفی کا بہت بڑا سبب ہے۔ اسکولوں اور سرکاری دفتروں کے دروازے اردو پر کلیتًا بند ہیں۔ صرف محکمہ السنہ کی طرف سے اس کی سرپرستی ہوتی ہے۔ مگر برائے نام حکومت پنجاب کے بجٹ میں زبانوں کی ترقی کے لئے رقم رکھی جاتی ہے اس کا زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد اردو کے حصے میں آتا ہے، باقی ۹۵ فیصد پنجابی اور ہندی پر صرف ہوتا ہے۔ (مرسلہ سورج سویر)

پنجاب کو یک لسانی ریاست تسلیم کرنے سے گووند داس کا انکار

فیروز پور: ممبر پارلیمنٹ اور ہندی کے ادیب سیٹھ گووند داس نے آج یہاں کہا ہے کہ ہم پنجاب کو یک لسانی ریاست تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔ پنجاب کے ۰۴ فیصدی لوگ ہندی جانتے ہیں اس لئے انھیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ ان کی زبان کو بھی سرکاری درجہ دیا جائے۔ سیٹھ جی نے بتایا کہ ۳۱؍دسمبر تک ہندی کو ہندی ریاستوں کی سرکاری زبان نہ بنا دیا گیا تو ہم وزرائے اعلیٰ کا گھیراؤ کریں گے اس کے لئے ۵ لاکھ رضاکار بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا کہ ہماری تحریک پُر امن ہوگی۔ (قومی آواز)

ہریانہ میں یوم جمہوریہ سے صرف ہندی

چنڈی گڑھ: ہریانہ میں تمام سرکاری کام کاج کو صرف ہندی میں انجام دینے کے لئے مناسب تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ صرف ہندی میں سرکاری کام کاج کے حکم کا نفاذ اگلے یوم جمہوریہ سے ہوگا۔ ہریانہ حکومت کا محکمہ لسانیات سرکاری ملازموں کو ہندی سکھانے کی مہم میں مصروف ہے ہندی شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کے خاص کلاس ہو رہے ہیں۔ (قومی آواز)

کسی کے دبانے سے تہذیب یا زبان کو مٹایا نہیں جا سکتا

لکھنؤ: ڈاکٹر ابا دصبا نے جو غالب صد سالہ جشن و غیر سرکاری کمیٹی کے زیر اہتمام ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے فرقہ واریت کے خلاف اور قومی یکجہتی یک روزہ کنونشن کی صدارت کر رہے تھے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے کہا کہ اس وقت آپ کے قلم کو کلہاڑی بن جانا چاہئے اور مذہب کے نام پر ملک میں جتنی غلاظت اور خباثت ابھرتی چلی آرہی ہے اس کا بھرپور جواب آپ کی طرف سے ہونا چاہئے۔" کنونشن کا افتتاح بنارس ہندو یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی اور صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد العلیم کرنے والے تھے لیکن ان دونوں نے کنونشن میں شرکت نہیں کی۔ ڈاکٹر عبد العلیم کی عدم شرکت خیال کیا جاتا ہے کہ اس بےچینی کی بنا پر ہے جو کنونشن کے دعوت نامے سے پیدا ہوئی ہے جس میں ان کو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر لکھا گیا ہے اور "مسلم" کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے جب کہ ڈاکٹر دویدی کے نام کے ساتھ بنارس ہندو یونیورسٹی لکھا گیا ہے۔ افتتاح کے فرائض مرکزی نائب وزیر قانون و امور جناب یونس سلیم نے ادا کئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں افسوس کے ساتھ کہا کہ اگرچہ ملک کی ۹۵ فیصدی اکثریت دنگے فساد اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کو نہ صرف ناپسند کرتی ہے بلکہ نفرت کرتی ہے مگر ۵ فی صدی فسادی عناصر کے مقابلہ سے پہلوتہی کرتی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا "ظلم و جبر اور قتل و غارت کے مقابلے میں اکثریت کی یہ بےبسی اس کی بےعملی کا نتیجہ ہے۔ مرکزی نائب وزیر نے ادیبوں اور شاعروں

کو آگاہ کیا کہ اگر اس وقت ملک کے حالات کو سنبھالا نہ گیا تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا اور آنے والی نسلیں ہماری آج کی کوتاہی کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ یہ ایک روزہ کنونشن اور مشاعرہ شہر کی تاریخی عمارت قیصر باغ بارہ دری میں ہوا۔ (قومی آواز)

قومی یک جہتی کنونشن سے ہندی ادیبوں کا واک آؤٹ

لکھنؤ، فرقہ واریت کے خلاف اور قومی یک جہتی کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی نائب وزیر الحاج محمد یونس سلیم نے شکایت کی کہ ان کو دعوت نامہ جس لیٹر ہیڈ پر بھیجا گیا وہ صرف ہندی میں تھا۔ انھوں نے کہا 'غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے نام پر ہونے والے اس کنونشن میں اردو کو نظر انداز کر دینا سیاست افسوسناک ہے'۔ انھوں نے زور دے کر کہا اس ملک میں اردو بھی چلے گی ہندی بھی چلے گی اور انگریزی بھی چلے گی ورنہ کوئی زبان نہیں چلے گی۔ مرکزی نائب وزیر یونس سلیم صاحب جس وقت مذکورہ بالا باتیں کر رہے تھے بعض مقامی ہندی ادیبوں میں بے چینی محسوس کی گئی اور ان کی تقریر ختم ہوتے ہی جناب یشپال، جناب بھگوتی چرن ورما، جناب سیدھرلک سارس اور جناب ٹھاکر پرشاد جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔

(قومی آواز)

کرانتی دل اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے حق میں نہیں ہے

نئی دہلی۔ بھارتیہ کرانتی دل پارٹی کی نیشنل ایگزیکٹیو نے یہاں اپنے دو روزہ اجلاس میں اپنے منشور کی منظوری دی۔ منشور میں یوپی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ کرانتی دل اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنانا چاہتا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی تعلیم ہر طالب علم کے لئے لازمی قرار دینا ہوگی لیکن وہ اس زبان کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی حامی ہے۔ (سیاست)

ری پبلکن پارٹی کے منشور میں اردو شامل نہیں ہے

لکھنؤ۔ ری پبلکن پارٹی نے اپنے پیش کئے ہوئے ۹ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر ریاستی کانگریس سے انتخابی سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریاستی ری پبلکن پارٹی کے لیڈر بی۔ پی۔ موریہ سے دریافت کیا گیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ ۹ نکات میں سے کیوں خارج کر دیا گیا موریہ نے جواب دیا کہ کانگریسی لیڈروں کی تجویز پر ایسا کیا گیا۔ (سیاست)

گورکھپور یونیورسٹی میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تقریر

گورکھپور۔ شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا خیر مقدم کرنے کے لئے شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمود الٰہی کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے شروع میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے پروفیسر انصاری کا تعارف کرایا اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

انصاری صاحب نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ایک غلط رجحان بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر طلبہ ایک سے زیادہ زبان نہیں پڑھنا چاہتے انھوں نے کہا کہ یہ ایک خطرناک زوال کی علامت ہے انھوں نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی، فارسی اور ایک یورپی زبان لازمی طور پر پڑھیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنے ادب کو اس وقت تک ترقی نہیں دے سکتے جب تک کہ اس کا دروازہ باہر کے خیالات کے لئے کھلا نہ رکھیں۔ انصاری صاحب نے اپنی تقریر میں اردو نثر کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا اور کہا کہ مولانا حالی نے نثر کو جس منزل پر لا کے چھوڑا تھا وہ ایک خوش آیند علامت تھی لیکن ان کے بعد کی نسل نے اسے آگے بڑھانے کے بجائے اور پیچھے ڈھکیل دیا۔ انصاری صاحب نے سرشار، کرشن چندر اور ابو الکلام آزاد کی نثر پر سخت تنقید کی اور کہا کہ ان ادیبوں کی نثر کو معیاری نثر کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا انھوں نے یہ بھی کہا کہ موجودہ اردو نثر رومانیت عدم توضیح اور شوکت الفاظ میں اسیر ہوتی جا رہی ہے انصاری صاحب نے تنقید کی زبان پر بھی اظہار خیال کیا اور کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تنقید سائنس نہیں ہے لیکن تنقید کی زبان کو سائنس کی زبان کی طرح واضح اور غیر مبہم ہونا چاہئے۔ آخر میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے انصاری صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ (مسور حسین)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

مخصوص آئیڈیالوجی سے وابستگی کے بجائے پوری زندگی سے گہری وابستگی پر زور دیتی ہے اس وجہ سے وہ لوگ جو ادب سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کو عزیز رکھتے ہیں، اس میلان میں خطرہ محسوس کرتے ہیں حالانکہ اونچ نیچ اور افراط و تفریط کے باوجود مجموعی طور پر یہ میلان قابل قدر ہے اور اس میں زبان اور اظہار کے تجربے اپنے اندر خاصے اہم امکانات رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر نیا میلان اور ہر ہیئتی تجربہ سراہا نہیں جا سکتا، مگر جو لوگ تجربے سے خائف ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح کے (VESTED INTEREST) کی نمائندگی ضرور کرتے ہیں۔

"آج کل" کا اردو نمبر اگر آزادی کے بعد اردو زبان کا جائزہ علیحدہ لیتا اور آزادی کے بعد ادب کا علیحدہ تو بہتر ہوتا پھر بھی موجودہ صورت میں یہ زبان و ادب کے مسائل کے متعلق ہمیں بہت کچھ دیتا ہے اور اس میں مسرت اور بصیرت اور عبرت تینوں کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ کاش اردو دوست اس سے یہ سبق بھی سیکھیں کہ حالات کا ماتم کرنے اور دوسروں کو الزام دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عزم کو بھی اور نئے حالات کا عرفان ہو تو بے ستون سے جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

جو لوگ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنے تاثرات اور تجربات کی روشنی میں اپنی رائے دیتے ہیں ظاہر ہے کہ ان تاثرات اور تجربات کی بھی اہمیت ہے، مگر ضرورت یہ ہے کہ ان کو معروضی حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی جائے جمہوری ہندوستان میں تمام قومی زبانوں کی ترقی لازمی ہے۔ اردو کی ترقی بھی اس دور میں ہوئی، مگر اردو کچھ مخصوص سیاسی حالات کا شکار ہو گئی ہے جن کی وجہ سے اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ مگر کوئی یہ کہے کہ اردو ختم ہو رہی ہے یا چند سال کی مہمان ہے تو یہ زیادتی ہوگی۔ اردو دوستوں کا اصل کام یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے طور پر اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے لئے کوشش کریں اور دوسری طرف جمہوری رجحانات، سیکولر رجحانات، قومی تحریکات کو اپنائیں اور ملک کے دکھ درد میں دل و جان سے شریک ہوں تاکہ اردو کے خلاف چند اجارہ پرست اور تنگ نظر پارٹیوں نے جو محاذ بنا رکھا ہے وہ ٹوٹ سکے اور اردو کی ترقی کو سبھی لوگ قومی زبانوں کی ترقی اور اس طرح قومی یک جہتی کا فروغ اور قومیت کا استحکام سمجھ سکیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات جو اردو کی ترقی میں حائل ہے وہ مجموعی طور پر اردو دوستوں کا زبان و ادب کے پرانے خیالات اور نظریات سے چمٹے رہنا ہے۔ زبانیں کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں ان میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اردو کی وہی شکل باقی رہے جو انیسویں صدی میں تھی، وہ چاہے نیک نیت ہوں مگر ان کی مایوسی یقینی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو کو ترقی کرنا ہے تو اسے جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا پڑے گا اور نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے نئے طریقوں کو اپنانا پڑے گا۔ ہاں اسے اردو رہنا چاہئے تعمیر کی رو میں کچھ اور نہیں بن جانا چاہئے۔

"آج کل" دہلی کا اردو نمبر اس سلسلے میں ہمارے لئے مسرت اور عبرت دونوں کا سامان رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود دشواریوں اور پابندیوں کے آزادی کے بعد اردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد بڑھی ہے، اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد، جو ہونی چاہئے تھی ریاستی حکومتوں کی غفلت کی وجہ سے نہیں ہے، مگر اس میں آسانی سے اضافہ ہو سکتا ہے۔ ثانوی اسکولوں میں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے یا تیسری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے اگرچہ اتنے نہیں جتنے ہونے چاہئیں، مگر پہلے سے زیادہ ہیں اور یونیورسٹیوں میں تو اردو کی تعلیم کی نمایاں ترقی ہوئی ہے اور آج چالیس یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس طرح اردو کے اخبارات و رسائل کی تعداد ہندی کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اردو کی کتابوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے، مگر "آج کل" کے ادارے کے اندازے کے مطابق دس ہزار سے کم نہ ہوگی، بہر حال تمام اردو دوستوں کو "آج کل" کے اردو نمبر کے وہ مضامین غور سے پڑھنا چاہئیں جن میں اردو زبان آزادی کے بعد، اردو بیرونی ممالک میں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کی رفتار، اردو صحافت آزادی کے بعد، ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار آزادی کے بعد، اور اردو کی ترقی کے لئے حکومت ہند کے اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں خاص طور پر ایڈیٹر کا مضمون ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار آزادی کے بعد، غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے اشاعت اور کاروبار کے مخصوص مسائل کا علم ہوگا جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتے اور جن کی طرف توجہ سے یقیناً ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اعداد و شمار مہیا کرنے کی جو کوشش اس نمبر میں کی گئی ہے وہ باوجود بعض کوتاہیوں کے، قابل قدر ہے اور اس سلسلے میں مزید اور مکمل اعداد و شمار مہیا کرنے کی شدید ضرورت کو اور زیادہ واضح کرتی ہے۔

آزادی کے بعد ادب کا جائزہ بھی اس لحاظ سے مفید ہے کہ لکھنے والوں نے تحقیق، تنقید، ناول، افسانہ، طنز و مزاح، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم، جدید شاعری کا تنقیدی مطالعہ اور اردو ڈرامہ اور اسٹیج کے اہم میلانات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو تحقیق پر مضمون معلوماتی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے ذریعے سے باوجود کوتاہیوں کے تحقیق کا ایک اچھا معیار رفتہ رفتہ سامنے آ رہا ہے۔ اردو تنقید پر مضمون بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہے اور اگرچہ اس میں اشارے زیادہ ہیں اور بہت سی چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جو "آج کل" کے پڑھنے والوں کے لئے شاید زیادہ مفید نہیں ہے، مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اردو تنقید اب فارمولوں اور نسخوں کے چکر سے نکل رہی ہے اور کچھ ادبی شعبدہ بازوں یا چٹکلے بازوں کے باوجود، اپنے منصب کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ ناول پر مضمون میں اردو میں اچھے ناولوں کی کمی کی طرف بجا اشارہ کیا گیا ہے اور شاید اس کی وجہ سے ناول کے فن کے ساتھ انصاف کرنے کا جذبہ ابھر سکے۔ طنز و مزاح پر مضمون نسبتاً سطحی ہے کیونکہ طنز کی تلخی اور مزاح کی کمی کے سماجی اسباب پر نظر نہیں ڈالی گئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم اور جدید شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دونوں مضمون بہر حال یہ واضح کر دیتے ہیں کہ اب شاعری وقتی سیاست کی غلام نہیں رہی۔ شاعر کی انفرادی بصیرت اور ذاتی احساس کی ترجمانی کی کوشش کر رہی ہے در اصل یہ کسی

باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے سیتو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R-N-2/86/56

REGD-NO-L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹

سالانہ قیمت ۵ روپے

فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت

۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۳۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

یوم سر سیّد

۱۷ اکتوبر کو سر سیّد کا جنم دن ہے۔ سر سیّد ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اس طرح ان کی پیدائش کو ایک سو اکیاون برس ہوگئے۔ سر سیّد نے ہمیں ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن سے نکالا اور عقلیت کے سہارے نئے حالات میں نئی زندگی بنانے کی طرف مائل کیا۔ سر سیّد ماضی کی صالح روایات کا احساس رکھتے تھے وہ اپنی تہذیب، زبان، ادب، معاشرت کی خوبیوں کو بھی جانتے تھے اور خامیوں کو بھی، مگر وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے محض پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا انہیں پسند نہ تھا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے تمام خیالات سے اتفاق کیا جائے کیونکہ انھوں نے بہت سی باتیں ان مخصوص حالات کو دیکھ کر کہی تھیں جو ان کے زمانے میں درپیش تھے مگر ان کے افکار و اعمال کے پیچھے جو روح تھی اس سے آج بھی ہمیں روشنی اور گرمی مل سکتی ہے۔ آج بھی ہمیں ایک تنقیدی شعور پیدا کرنا ہے۔ جو نئے کو ڈر کے مارے رد کردے نہ پرانے کو آنکھ بند کرکے قبول کرے بلکہ ہر چیز کو اس کی ضرورت اور افادیت کے لحاظ سے دیکھے اور جو چیز ناموزوں یا نامناسب ہوگئی ہے اس پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرے۔ سر سیّد چاہتے تھے کہ لوگ نئی تعلیم سے بہرہ مند ہوں۔ اس کے لئے ان کے زمانے میں مغربی علوم کی انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم کی ضرورت کو آج بھی مانا جاسکتا ہے مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ کوئی قوم دوسری زبانوں کے ذریعہ سے اپنی شخصیت کی پوری نشو و نما نہیں کرسکتی، اسے بالآخر اپنی زبان کے ذریعہ سے ہی نئی تحقیقی و علمی فضاؤں میں پرواز کرنی پڑتی ہے۔ ہاں اس کے معنی یہ نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں کا اچھا معیار نہ رکھیں کیونکہ عالمی ذہن سے آشنا ہونے کے لئے انگریزی اور دوسری عالمی زبانوں سے گہری واقفیت ضروری ہے، مگر بنیاد اپنی ہی زبان کی ہونی چاہئے۔
اس طرح سر سیّد نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے لئے جو منصوبہ بنایا تھا اور جو بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں ظاہر ہوا، اسے مکمل کرنا ہے۔ سر سیّد دراصل انگریزی کے ذریعہ سے ایک طرف زندگی کی عام ضروریات اور ملازمتوں میں حصہ چاہتے تھے دوسری طرف وہ ایسے لوگ بھی پیدا کرنا چاہتے تھے جو مغربی علوم سے بہرہ ور ہو کر دینی قیادت کا فرض انجام دے سکیں وہ ایک اور مدرسہ اس غرض سے بھی قائم کرنا چاہتے تھے کہ عوام کو اردو زبان میں جدید علوم کی تعلیم دی جاسکے اور جانتے تھے کہ اس قسم کی ذہنی انقلاب لانے میں کتنی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان لوگوں کے لیے جو اردو کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرچکے ہوں اور انگریزی بھی جانتے ہوں، ایک ایسا مدرسہ بھی قائم کرنا چاہتے تھے جو عربی اور فارسی میں اعلیٰ دستگاہ پیدا کریں اور اس طرح ہمارے مذہبی سرمائے میں اضافہ کرسکیں اور نئے زمانے کے چیلنج کو قبول کرسکیں۔ سر سیّد کے منصوبے کا صرف ایک تہائی حصہ پورا ہوا۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے منصوبے کو مکمل کیا جائے اور ہماری یونیورسٹی انگریزی کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اردو کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم بھی دے اور عربی، فارسی کا ایک مدرسہ بھی قائم کرے جس کے ذریعہ سے ہماری مذہبی تصانیف جدید ریسرچ کے معیاروں پر پہنچ سکیں اور علماء کو نئے دور کے تقاضوں کا احساس دلا سکیں۔ سر سیّد کی یاد میں جلسے ہوتے رہیں گے۔ ان کی بھی افادیت ہے، مگر اصل کام یہ ہے کہ ہم ان کے مشن کو آگے بڑھائیں اور نئے دور میں اپنے لئے باعزت جگہ پانے کے اہل ہوں۔

سر سید سے قریبی رابطہ رکھنے والوں کی تلاش

پٹنہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے تحت یوم سر سیّد منائے جانے کے سلسلے میں ایسے باحیات بزرگوں کی تلاش ہے جنھیں اس عظیم شخصیت اور محسنِ قوم سے ملنے یا دیکھنے کا شرف نصیب ہوا ہو یا مرحوم کے حالات ایسے حضرات سے معلوم ہوئے ہوں جو ان سے ملے ہوں یا دیکھا ہو۔ سر سید ۱۸۸۳ء میں پٹنہ تشریف لائے تھے اور شاید اس کے بعد بھی تشریف لائے ہوں۔ اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ کس کس خوش نصیب کے مہمان رہے تھے، وہ مکان کون کون سا تھا جہاں ان کا قیام رہا تھا۔ اور اسی طرح کی متعلق باتیں کسی بزرگ سے براہ راست یا کسی دوسرے واسطے سے معلوم ہوں جیسے کہ مرحوم کے صاحبزادے راس مسعود صاحب پٹنہ کالجیٹ اسکول میں کافی عرصہ تک رہے۔ ان کی معرفت بہتوں کو سر سیّد کے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہوگا۔

سرسید پر مقالہ نگاری کا انعامی مقابلہ

پٹنہ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے یوم سرسید کے موقعہ پر "قومی یک جہتی میں سرسید کا حصہ" کے عنوان سے ہندی، اردو اور انگریزی میں مقالہ کا اعلان کیا ہے۔ ہندی اور اردو میں پچھتر پچھتر روپے کی قیمتوں کے انعامات اور انگریزی میں بہ لحاظ استحقاق میں انعامات پچھتر، پچاس اور پچیس روپوں کی قیمت کے ہوں گے مقالے لگ بھگ پندرہ سو الفاظ کے ہوں۔ (روشنی)

پاکستان میں ہندستان کی اردو کتابوں کا داخلہ بند

لکھنؤ معلوم ہوا ہے کہ حکومت پاکستان نے ہندوستان سے آنے والی اردو کتابوں کا داخلہ اپنے ملک میں خلاف قانون قرار دیا ہے اس حکم کے بعد ہندوستان سے ڈاک یا پارسل کے ذریعے پاکستان بھیجی جائے گی وہ پاکستان میں بحق سرکار ضبط کرلی جائے گی اور مرسل الیہ کو نہیں ملے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مدت سے کتابوں، اخبار اور رسالوں کا لین دین چل رہا تھا کیونکہ باقاعدہ خریداری میں بڑی دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں۔ زرمبادلہ نہ ملنے کی وجہ سے کتاب فروش کتابوں کا باہمی تبادلہ کرلیتے تھے مگر حکومت پاکستان کے حالیہ احکام کے نفاذ پر یہ صورت بھی ختم ہوجائے گی اس کا سب سے زیادہ اثر ہندوستان میں اردو کتابوں کے چھاپنے اور بیچنے والوں پر پڑے گا۔ (قومی آواز)

قومی یک جہتی پر "بچوں کی نہرو لائبریری" کے لئے کتابیں

نئی دہلی نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے بچوں کی کتابوں کی نہرو لائبریری کے نام سے ایک پروجکٹ شروع کیا ہے جس کا بنیادی موضوع قومی یکجہتی ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہر منتخب کی ہوئی کتاب کی مختلف زبانوں میں کم سے کم ایک لاکھ کاپیاں حکومت ہند اور ریاستی حکومتیں خریدیں گی۔ ابتدائی مرحلہ میں اس پروجکٹ کے تحت ۰ کتابیں چھاپی جائیں گی۔ پروجکٹ میں جو کتابیں شامل ہوں گی وہ یک وقت ہندوستان کی سب بڑی زبانوں میں شائع کی جائیں گی اور کتاب کا گیٹ اپ اور قیمت ایک ہوگی۔ ابتدا میں صرف ۱۱ سے ۱۲ برس کے بچوں کے لئے کتابیں چھاپی جائیں گی لیکن بعد کو یہ پروجکٹ تدریس کی نچلی اور اعلیٰ سطح کا بھی احاطہ کرے گا۔ کتابیں نقشہ کے روپ میں ہوں گی اور اپنے موضوع سے اس طرح عہدہ برآ ہوں گی کہ بچے اسے آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرلیں۔ کتابیں جن موضوعات سے متعلق ہوں گی وہ ہندوستان کا ثقافتی ورثہ تاریخ، لوک کہانیاں اور تیوہار، ملک اور عوام کے بارے میں جانکاری ترقیاتی سرگرمیاں، دستور ہند، تحریک آزادی، سائنس اور ٹکنالوجی ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ تمام ہندوستانی زبانوں کے ماہرین پر مشتمل ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی بنانا چاہتا ہے، جو اس پروجکٹ کے بارے میں ٹرسٹ کو مشورہ دے گا تعلیمی کمیشن نے اپنی حالیہ رپورٹ میں رائے دی ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو ہندوستان کے تمام بچے پڑھ سکتے ہوں اور یہی سبب ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام کا قومی یک جہتی میں اتنا حصہ ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ مختلف زبانوں میں کتابوں کے الگ الگ عنوان تجویز کرنے کے لئے مشاورتی کمیٹیاں بنادی جائیں گی۔ (قومی آواز)

علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو ایم اے کا کلاس کھل گیا

گیا۔ یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اس سال سے مگدھ یونیورسٹی میں اردو (ایم۔ اے) کا کلاس کھل گیا وائس چانسلر جناب بی۔ ام۔ کے۔ سنہا نے ڈاکٹر سید محمد حسنین نائب صدر شعبہ اردو گیا کالج کو اس نئے شعبہ کا صدر بنایا ہے۔ کلاس نومبر سے شروع ہوجائے گا۔ (زاہد۔ سکریٹری)

نیو جنریشن نمبر ۳ شائع ہوگیا

کلکتہ یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت سے سنی جائے گی کہ نیو جنریشن نمبر ۳ شائع ہوگیا۔ اس رسالہ میں اردو کی نمائندہ تخلیقات انگریزی میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس شمارہ میں اردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ ۱۶۰ صفحات کے اس مجموعہ نظم و نثر آرٹ کے ایڈیٹرز رام لعل اور سیدہ نسیم چشتی ہیں قیمت تین روپے ہے یہ رسالہ رائٹرز ورکشاپ ۱۶۰/۹۲ لیک گارڈنز کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری سالانہ کانفرنس

علی گڑھ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری سالانہ کانفرنس امسال شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۲۰ تا ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء منعقد ہو رہی ہے اس کا افتتاح پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب فرمائیں گے۔ کانفرنس کا پروگرام یہ ہے:-

۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

افتتاحی اجلاس

پہلا اجلاس	اردو ذریعہ تعلیم
دوسرا اجلاس	اردو اساتذہ کے مسائل

۲۱ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

تیسرا اجلاس	نصاب کے مسائل
چوتھا اجلاس	تدریس کے مسائل

۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

پانچواں اجلاس	تحقیق کے مسائل
چھٹا اجلاس	تنقید کے مسائل

سلطان احمد سابق مدیر اتحاد پٹنہ

بزرگِ قوم سید احمد خاں

ادھر سلطنت مغلیہ کا آفتاب ڈوب رہا تھا۔ ادھر برطانیہ عظمیٰ کا ستارہ بلند ہونے لگا۔ یہ ایام واقعات و حوادث کے دن ہیں۔ جو قوموں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس رد و بدل سے ان کی آزمائشیں پوری ہوں۔ کہتے ہیں آنے والے حالات کے وقوع سے پہلے ان کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ابھی عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ ملک میں اندھیرا چھا گیا، ہر طرف انتشار پھیلا، صوبے مرکز سے علیحدہ ہوئے اور صدیوں کی سلطنت کا جاہ و جلال خاک میں مل گیا۔ یہی زوال کی نشانی جو ۱۷۰۷ سے شروع ہوئی اور ۱۸۵۷ میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کے برعکس اس پیشہ ور قوم کا حوصلہ بلند دیکھو جس نے تجارتی معاملہ کی کامیابی پر کسی والی انعام و اکرام کی جگہ اپنی قوم کے لئے صرف تجارت کی سہولت مانگی تھی۔ جب افراد کے دلوں میں قومی ترقی کا خیال پیدا ہو جائے تو پھر اس کے عروج و ترقی میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ کی تباہیوں میں اسی ملک کا ایک دوسرا واقعہ ہمارے لئے انتہائی سبق آموز ہے۔ خود بزرگ قوم کی زبانی سنئے ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو ایک لکچر کے ضمن فرماتے ہیں

"بعوض اس وفاداری کے، تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ کی ملکیت تھا۔ مجھ کو دیا جاتا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات ہے۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔ اور میرے بال سفید کر دئے۔ جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہو گئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"

واقعہ کی سچائی، بیان کی سادگی اور زبان کی دوسری خوبیوں کے لحاظ سے تقریر کا یہ مختصر ٹکڑا ان کے خلوص عمل اور قدرت بیان و زبان کی خصوصیتوں کو نمایاں اور ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک مخلص رہنما، عظیم مفکر اور ادب کے زبردست فنکار ہونے کی سند بھی ہے۔ ایک دفعہ کسی مقرب نے ان سے پوچھا تھا کہ اپنی تقریروں اور لکچروں کے لئے آپ کوئی تیاری نہیں کرتے؟ لکھنے کی زحمت نہ سوچنے کی مہلت، کھڑے ہوئے اور تقریر کرنے لگے۔ انھوں نے جواب دیا، جس کے گھر میں آگ لگی ہو۔ اس کو سوچنے اور عبارت آرائی کا موقع کہاں۔ وہ بے تحاشہ لوگوں کو پکارتا ہے دوڑو، آگ لگی ہے بھائی یہی حال میرا ہے، دل میں سوز ہے منہ میں زبان، بغل میں ستار (ڈھولکی) ہے کھڑے ہوئے اور بجانے لگے!

غرض ہند کی بیقراریوں میں، دلی کے گہوارہ علم و فضل کی تربیت یافتہ، ایک جاں سوز و جاں نواز شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ روشن دماغ، پاک نفس مرد مومن جو اپنے عہد کی تاریکیوں میں روشنی و ہدایت کا منبع و مرجع بن گیا۔ بچپن ہی میں ایسا توانا و تندرست تھا کہ اس کو دیکھ کر خاندان کے بڑے بوڑھے کہنے لگے بھلا سادات کے گھر میں یہ جاٹ کہاں سے آیا۔ مگر جوانی کا ڈیل ڈول، جسم لمبا بھرا اور سڈول کہ تناسب کی یہ تصویر دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ جامہ زیب اور سفید رنگ گویا حسن و جمال و جلال لباس کے پردے سے ٹپکتا۔ اس پر خاندانی وجاہت اور ذاتی فضیلت سونے پر سہاگہ۔ جدھر نکلتے لوگ اپنا کام بھول جاتے اور لڑکوں کی ٹکٹکی بندھ جاتی لیکن شباب آیا اور گیا' اس کی بھی خبر نہ ہوئی کہ جس سیر کو آیا تھا سو کر گیا۔ قوم کے غم نے ایسا سیدھا کر دیا کہ بس ایک صراط مستقیم کے ہو رہے۔ یہ خودداری و اولوالعزمی تھی کہ آبائی جائداد اور شاہی وظیفہ خواری سے قطع نظر، اپنے پسینہ کی گاڑھی کمائی کی خاطر اس نے کمپنی بہادر کی ملازمت اختیار کر لی اس طرح ملک کے آئندہ حکمرانوں سے اس کا تعلق اتنا گہرا ہو گیا کہ اس غیر ملکی حکومت کے استحکام میں اپنے ملکی تعاون کو قینچی کے ان دو پلڑوں سے مثال دی تھی۔ جن کی کارگزاریوں میں ایک سے دوسرے کا فرق کرنا مشکل ہے اور یہ بتانا دشوار ہے کہ کس پلڑے نے زیادہ کام کیا۔ مگر جب معاملہ اس حد تک پہنچا کہ ہندوستانیوں کے لئے حقوق طلب کئے جائیں اور وہ حکومت میں برابر کے شریک ہوں تو ان مطالبہ کی صورتوں میں نہ تو ملازمت ایک لمحہ کے لئے مانع ہوئی نہ ذاتی رسم و راہ میں کوئی فرق آیا۔ وہ حق کے اظہار سے کبھی باز آئے نہ حقوق کے مطالبوں سے رکے۔ آگرہ کے دربار سے وہ اس بات پر خفا ہو کر چلے آئے کہ وہاں انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو نیچے بیٹھنے کی جگہ دی گئی تھی۔ حالانکہ اسی دربار میں ان کو ایک طلائی تمغہ بھی ملنے والا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر اور سر ولیم میور کی کتابوں کی تردید

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

میں قائم ہوئی کچھ دنوں بعد اس انجمن کے سکریٹری دادا بھائی نوروجی مقرر ہوئے
اس ایسوسی ایشن کا مقصد یہ تھا کہ جن امور میں جملہ ہندوستانیوں کی بہبودی متصور
ہو ان میں جہاں تک ممکن اور قابل عمل ہوگا ایسوسی ایشن کی جانب سے ہندوستانیوں کی وکالت
ہوگی اس سوسائٹی کی کارروائیاں اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں شائع ہوتی تھیں
سرسید چاہتے تھے کہ اس انجمن کی روداد اس ملک کی دوسری زبانوں میں بھی شائع
ہوں تاکہ اس کا حلقہ اثر وسیع ہو جائے۔ اس کے سکریٹری دادا بھائی نوروجی سے خط و کتابت ہوئی
ذیل کا یہ خط سرسید کے مکاتیب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

"بخدمت دادا بھائی نوروجی صاحب آنریری سکریٹری ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن
صاحب من۔ جو کوششیں میں نے اول اس
ایسوسی ایشن کے حق میں کی تھیں ان کے نتیجے سے میں بخوشی آپ
کو مطلع کرتا ہوں بعض شخصوں نے جو بہ نسبت اور شخصوں کے
ہندوستان کے معاملات میں زیادہ متوجہ تھے درباب اس ایسوسی
ایشن کی ممبری کے امیدوار ہوئے لیکن بہت سے شخصوں نے اس
میں شریک ہونے سے تامل کیا کیونکہ ان کو اس امر کی نسبت اطمینان
نہ تھا کہ آیا اس سوسائٹی کے سلسلے سے ہندوستان کی حاجتیں رفع
ہوں گی یا نہیں جس وقت میں ہندوستان سے روانہ ہوا تھا میں
نے بعض ان شخصوں سے یہ خواہش کی کہ وہ اپنی درخواست بھیج دیں
لیکن انھوں نے یہی اعتراض پیش کیا اور یہ کہا کہ جس وقت سے
یہ سوسائٹی قائم ہوئی اب تک اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا
ہے جو اس ملک کے حق میں نافع ہو اور اس نے بہت سی تدبیریں
پیش کیں لیکن کسی کو پورا نہیں کیا چونکہ آپ کی کوئی کارروائی
بھی ہندوستان کی دیسی زبانوں میں مشتہر نہیں ہوتی ہے اس
وجہ سے اس ملک کے امرا اس سوسائٹی کی جانب اور بھی کم
مائل ہیں اور اس کی کارروائی میں بھی بہت کم توجہ ظاہر
کرتے ہیں۔ آپ کا نہایت صادق دوست
سید احمد"

اطلاع از طرف جانب سید احمد
دستخط کنندہ سے خط و کتابت کرنے میں ان کی جانب
یہ عرض ہے کہ میرے نام بیرنگ خط بلا قیمت ٹکٹ لگا
کر خط روانہ نہ فرمایا کریں۔ میں نے قطعاً ڈاک والے کو منع
کر دیا ہے کہ جو خط بیرنگ بلا قیمت ٹکٹ کا میرے نام پر ہو
میرے پاس نہ لایا کرے بلکہ ڈاک خانہ ہی سے واپس کر دیا
کرے۔ راقم
سید احمد

"اطلاع
ہمارے پاس ہمارے بہت سے دوستوں کے خطوط آئے ہیں۔
جو اپنی عنایت سے میرا فوٹوگراف طلب فرماتے ہیں میں
نے حال میں اپنا فوٹوگراف ایک نہایت عمدہ فوٹوگرافر سے
بنوایا ہے اور وہ سب تصویریں فوٹوگراف کی کمیٹی مدرسۃ العلوم
کو دے دی ہیں پس میرے جن دوستوں کو میری تصویر فوٹوگراف
کی مطلوب ہو وہ روپیہ قیمت بھیج کر طلب فرمالیں وہ سب روپیہ
چندہ مدرسۃ العلوم میں جمع ہوگا۔ راقم
سید احمد"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سرسید وطن پرست نہ تھے کیونکہ گزٹ
میں ان کی تمام تحریریں اس بات کی ضامن ہیں کہ وہ سچے محب وطن تھے اس
کے علاوہ سرسید کی وسیع المشربی ان کے غیر فرقہ وارانہ ذہن کی عکاسی ان کے
حوالوں کے کالج مدرسۃ العلوم مسلمانان اور بعد میں مسلم یونیورسٹی میں آج بھی
ملتی ہے۔ ابتدا ہی میں مدرسۃ العلوم مسلمانان میں ہندو اساتذہ اور طلبہ کی اچھی
تعداد ملتی ہے۔ ذیل کی اطلاع بھی ملاحظہ ہو۔

اطلاع
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے بی اے کلاس کے ہندو طالب علموں
کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جو ہندو طالب علم اگلے امتحان بی اے
میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگا اس کو سید احمد خاں اپنے
پاس سے ایک طلائی تمغہ انعام میں دیں گے۔
دستخط سید احمد

جی ایف آئی گراہم جو سرسید کے پہلے سوانح نگار ہونے کا مرتبہ حاصل
ہے۔ گراہم سرسید کے دوستوں میں تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے سلسلہ
میں جو کوششیں سرسید نے کیں اور ہندوستان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور
انگریزوں کو پہلی بار ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں
انھوں نے انجام دئے ان میں سرسید کے شریک کار جی ایف آئی۔ گراہم
بھی تھے۔ گراہم نے انگریزی میں ۱۸۸۵ء میں THE LIF AND WORKS
SYED AHMAD KHAN لکھی اس سوانح حیات کے اردو ترجمہ کے سلسلہ میں
سرسید نے گزٹ میں اطلاع دی

"لیف آف سید احمد خاں مصنفہ کرنل جی ایف گراہم
سید احمد خاں کے بہت سے دوستوں نے ان سے درخواست
کی ہے کہ لیف کے اردو ترجمہ کرنے اور چھاپنے کی اجازت دیں
ان صاحبوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس لیف کے ترجمہ کرنے
اور چھاپا کرنے کی اجازت دینا سید احمد خاں کے اختیار میں
نہیں ہے مصنف نے اور لیف مذکور کے چھاپنے والے نے
کاپی رائٹ معہ تمام حقوق تصنیف جس میں ترجمہ بھی داخل ہے
قانوناً محفوظ کر لیا ہے پس اب اس کے ترجمہ اور چھاپنے کی
اجازت دینا کرنل گراہم صاحب کے اختیار میں ہے بشرطیکہ
انھوں نے چھاپنے والے سے کوئی خاص معاہدہ نہ کیا ہو اور اگر
انھوں نے کوئی خاص معاہدہ کیا ہوگا تو چھاپنے والے کی اجازت
درکار ہوگی۔ کرنل گراہم یقین ہے کہ جنوری میں ہندوستان میں
آجاویں گے اس وقت سب حال معلوم ہو جاوے گا۔"

غر عباس

یک جوئے کہستاں کی موج رواں

سر سید نے مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کے اندھیرے سے نکال کر جدید خیالات
دھوپ میں لا کھڑا کیا۔ یہ کام کس قدر مشکل تھا اس کا اندازہ ہم آج
کر سکتے ہیں کیونکہ آج بھی حالات کے تقاضے تقریباً وہی ہیں جو سر سید کو
پیش تھے۔ اس لئے سر سید کو سچا خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے
بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم ان کے کارناموں کا جائزہ لیں اور ان کے بنیادی
پہلوؤں کو مشعل راہ بنائیں۔ ذیل میں سر سید کے کارناموں کا ایک نہایت مختصر
خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۷ راکتوبر ۱۸۱۷ء　دہلی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ، نانا خواجہ فرید الدین اور شاہ غلام علی کی نگرانی میں ہوئی

۱۸۳۸ء　دہلی کی عدالت میں ملازم ہوئے

۱۸۳۹ء　آگرہ میں نائب منشی کے عہدہ پر تقرر ہوا

۱۸۴۰ء　رسالہ قواعد اردو (غیر مطبوعہ[1]) جو سر سید کی اولین تصنیف ہے کی تکمیل کی اور اسی سال رسالہ جام جم شائع کیا۔

۱۸۴۱ء　مین پوری میں منصف مقرر ہوئے

۱۸۴۲ء　مین پوری سے فتح پور سیکری تبادلہ ہوا اسی سال بادشاہ دہلی نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب دیا رسالہ جلاء القلوب بذکر المحبوب کی اشاعت ہوئی۔

۱۸۴۴ء　رسالہ تحفۂ حسن اور تحصیل فی جر ثقیل مکمل کیا

۱۸۴۶ء　رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار کا اردو ترجمہ کیا۔

۱۸۴۷ء　آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن شائع کیا۔

۱۸۴۹ء　رسالہ کلمۃ الحق شائع کیا

۱۸۵۰ء　رسالہ سنت در رد بدعت کی اشاعت

۱۸۵۲ء　نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ اور سلسلۃ الملوک کی تکمیل ہوئی۔

۱۸۵۴ء　آثار الصنادید کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔

۱۸۵۵ء　بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے یہیں آئین اکبری کی تصحیح کے بعد اس کی پہلی اور تیسری جلد شائع کی دوسری جلد کی تصحیح کا مسودہ غدر میں تلف ہو گیا

۱۸۵۸ء　مراد آباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے تاریخ سرکشی ضلع بجنور شائع کی۔

۱۸۵۹ء　بغاوت کرنے والوں کی جائداد ضبط کرنے کمیشن میں ممبر نامزد ہوئے اسباب بغاوت ہند لکھی اور مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ کی بنیاد ڈالی

۱۸۶۰ء　رسالہ لائل محمڈنس آف انڈیا کا اجرا کیا اور رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ تحریر فرمایا۔

۱۸۶۲ء　غازی پور تبادلہ ہوا تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام شائع کیا۔

۱۸۶۳ء　التماس بخدمت ساکنان ہند در باب ترقی تعلیم اہل ہند چھاپ کر مشتہر کیا

۱۸۶۴　غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے بارے میں

EMINENT MUSSALMANS

میں سر سید کا سوانح نگار رقمطراز ہے کہ

IT WAS AN HONEST ATTEMPT
ON THE PART OF SIRSYED TO
BRING HINDUS AND MOHAMEDANS
ON ONE COMMON NON CONTROVERSIA-
PLAT FORM

غازی پور میں سر سید نے ایک انگریزی مدرسہ کی بنیاد رکھی اسی سال ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ کے اعزازی ممبر منتخب ہوئے۔ تزک جہانگیری ترتیب دی۔

۱۸۶۵ء　سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ کو ایک عرضداشت بھیجی کہ زراعت کے موضوع پر سوسائٹی سے کتابیں شائع کرنے کا بندوبست ہو اور اس سلسلہ میں سرکار امداد دے۔ اسی سال تبیین الکلام کی دوسری جلد شائع ہوئی۔

۱۸۶۶ء　برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے پارلیمنٹ سے رابطہ قائم کریں اور یہ انجمن اس سلسلہ میں امداد دے۔ اسی سال ۳۰ رمارچ سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا
[illegible]

---

[1] رسالہ قواعد اردو (غیر مطبوعہ) عبد الغفار صاحب تشکیل ترتیب دے رہے ہیں۔

۱۸۶۷ء برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے
وائسرائے کو ایک عرضداشت بھیجی کہ دیسی
زبان کی یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں
"بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان
میں ہوا کرے" اسی سال سرسید کا تبادلہ
علی گڑھ سے بنارس ہوگیا۔ یہاں انھوں
نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کی ترویج و
اشاعت کے لئے ایک کمیٹی قائم کی اور
ایک شفاخانہ "ہومیوپیتھک ڈسپنسری
اینڈ ہاسپٹل" کھولا

۱۸۶۸ء رسالہ احکام طعام اہل کتاب شائع کیا

۱۸۶۹ء بنارس سے انگلستان تشریف لے گئے
یہاں سرسید نے ہندوستان میں انگریزی
نظام تعلیم کی خامیوں پر ایک رسالہ
انگریزی میں STRICTURES UPON
THE PRESENT EDUCATIONAL
SYSTEM IN INDIA
شائع کیا۔ الخطبات الاحمدیہ فی العرب
والسیرۃ المحمدیہ چھاپ کر مشتہر کیا۔ اس کے متعلق
محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں "مواعظ احمدیہ
(یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں سخت دور
مصروف ہوں اس کے سوا اور کچھ خیال
نہیں۔ کھانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔
ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے [illegible] لکھا ہے
اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب
[illegible]
کرکے [illegible] کیا ہے
اس کتاب کے چھپنے کے بعد [illegible] ہوگیا
ہے لندن [illegible] اخبار سائنٹفک
سوسائٹی کو لندن کے سفر کے حالات لکھ کر
بھیجتے رہے جو سید [illegible] اخبار میں شائع
ہوئے۔ لندن میں وہ ایتھینیم کلب کے
اعزازی ممبر منتخب ہوئے۔ اسی سال
انھیں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔

۱۸۷۰ء لندن سے ہندوستان واپس آئے۔ تہذیب الاخلاق
کا اجرا فرمایا کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان
کی تشکیل کی۔

۱۸۷۱ء ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN
MUSSALMANS کا جواب لکھا۔

۱۸۷۲ء کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی تشکیل کی

۱۸۷۳ء مدرسۃ العلوم مسلمانان کے قیام کی اسکیم پیش کی
جس میں مدرسۃ العلوم کو تین مدرسوں میں تقسیم
ایک مدرسہ انگریزی کا جس میں سارے علوم
انگریزی میں پڑھائے جائیں۔ دوسرا حصہ اس
کا اردو ہوگا اور تمام علوم دونوں سب اردو میں
پڑھائے جاویں گے مگر اسی کے ساتھ ہر ایک طالب
کو دوسری کوئی مفصلۂ ذیل زبانوں میں سے سیکھنی
پڑے گی انگریزی یا فارسی یا عربی۔ تیسرا حصہ
مدرسہ کا عربی فارسی کا تھا

۱۸۷۵ء مدرسۃ العلوم مسلمانان (ایم۔اے۔او کالج) قا[illegible]

۱۸۷۶ء ملازمت سے پنشن لے لی تفسیر قرآن لکھنے کی ابتد[illegible]

۱۸۷۷ء لارڈ لٹن علی گڑھ آئے اور ایم اے او کالج کا سنگ [illegible]

۱۸۷۸ء وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔

۱۸۷۹ء چیچک کے قانون کا مسودہ مرتب کیا اور اسے پاس کر[illegible]
تہذیب الاخلاق کو دوسری بار جاری کیا۔

۱۸۸۰ء قانون تقرر قاضیان اور قانون [illegible]
مرتب کیا۔ البرٹ بل کی کونسل میں حمایت کی۔ اسی سال [illegible]
پریس سے تفسیر القرآن کی پہلی جلد شائع کی

۱۸۸۲ء ایجوکیشنل کمیشن کے ممبر ہونے سے انکار [illegible] کمیشن
سامنے ہندوستان کی تعلیمی حالت پر [illegible]
کمیشن کے سامنے جب اردو ہندی کا [illegible]
سرسید اردو کے تحفظ کے لئے [illegible] تفسیر
کی دوسری جلد شائع کی

۱۸۸۳ء محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی

۱۸۸۵ء تفسیر القرآن کی تیسری جلد شائع کی

۱۸۸۶ء محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) قا[illegible]

۱۸۸۷ء سول سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے

۱۸۸۸ء پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔ اسی سال تفسیر القرآن
کی چوتھی جلد شائع کی۔ اس سال کی ابتدائی تاریخوں میں
کے سی۔ ایس آئی کا خطاب ملا۔

۱۸۸۹ء ٹرسٹی بل مشتہر کیا۔

۱۸۹۲ء ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری
ملی تفسیر القرآن کی پانچویں جلد شائع کی۔

۱۸۹۴ء تہذیب الاخلاق کا تیسری بار اجرا کیا

۱۸۹۵ء تفسیر القرآن کی چھٹی جلد شائع کی

۱۸۹۸ء ۲۷ مارچ کو قوم کا یہ بطل جلیل موت کی آغوش میں چلا گیا۔ [illegible]
سے پہلے ۱۹ مارچ کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اردو کی حمایت [illegible]
ایک اداریہ لکھا۔ اردو کی حمایت میں یہ ان کی آخری تحری[illegible]

مراسلات

غالب اور سرسید

ماہنامہ ماہِ نو کراچی کی اشاعت فروری ۱۹۵۱ء میں مشہور محقق جمیل نقوی کا ایک گرانقدر مضمون غالب اور سرسید کے زیرعنوان شائع ہوا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا کی تصانیف نظم و نثر اور ان کے کمالات و حالات پر اردو میں سب سے پہلے سرسید نے قلم اٹھایا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف آثار الصنادید میں مرزا پر سترہ صفحے وقف کئے ہیں۔

آثار الصنادید کی تصنیف ۱۸۴۶ء کے وقت مرزا کی عمر ۴۹ سال تھی کلکتہ کا پہلا سفر کر چکے تھے اور ملک میں ایک استاد پردار اور شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت کے مالک تھے۔

کیا ان حقائق کی بنا پر آثار الصنادید میں غالب کے اس تذکرہ کو اردو میں ان کے تعارف کی سب سے پہلی تحریر قرار دیا جا سکتا ہے ہماری زبان میں ارباب نظر اس معاملہ پر ضرور محققانہ نظر ڈالیں۔

(محمد طیب وارثی کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر)

جمیل مظہری کے ایک شعر کے بارے میں

ہماری زبان کی ۲۲ر فروری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں آپ نے صفحہ ۱۶ پر جمیل مظہری صاحب کا ایک شعر اس طرح نقل کیا ہے ؎

ہم پھول نہ شبنم ہیں نہ کھیتوں پہ گھٹا ہیں
جلتے ہوئے تپتے ہوئے صحرا کی دعا ہیں

اس شعر کا پہلا مصرعہ صحیح نہیں ہے۔ میں قارئین "ہماری زبان" کی واقفیت کے لئے اصل شعر ذیل میں درج کر رہا ہوں ؎

ہم پھول پہ شبنم نہیں کھیتوں پہ گھٹا ہیں
جلتے ہوئے تپتے ہوئے صحرا کی دعا ہیں

واضح ہو کہ یہ جمیل صاحب کی اس غزل کا مقطع ہے جو موصوف نے "بزم ادب" رانچی کالج یونیورسٹی کی ایک خصوصی نشست منعقدہ ۱۸ر فروری ۱۹۶۸ء میں سنائی تھی۔ یہ غزل رانچی کالج میگزین کے آئندہ شمارے بابت ۶۹-۱۹۶۸ء میں شائع بھی کی جا رہی ہے۔

(ابوذر عثمانی شعبۂ اردو، رانچی کالج)

صفحہ ۳ سے آگے

اس شد و مد کے ساتھ کی کہ سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ انھوں نے علی الاعلان کہا تھا "ہمیں دکھا دینا چاہئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے۔ مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔" یہی جرأت و ہمت کا وہ پہلا نعرہ تھا، جو تقریباً نصف صدی کے بعد مقاطعہ اور عدم تعاون کی تحریکیں بن کر ظاہر ہوا۔

اس بزرگ قوم کی دوسری خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی ان کی حق گوئی اور حب الوطنی تھی جس کا ایک زبردست ثبوت وہ تاریخی رسالہ اسباب بغاوت ہند ہے جو تعاون کی صورتوں میں حکومت کی سخت ترین خامیوں کو بیان کرتا ہے۔ اور ہندوستان کے مطالبہ حقوق کی قرارداد اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر کس خطرناک اور خوں ریزی کے زمانہ میں وہ لکھا اور شائع کیا گیا جب کہ ملک میں فوج حکمران تھی اور ہر ہندوستانی اس کی گولیوں کا نشانہ۔ چنانچہ دوست، ہمدرد اور معتقد سبھی مانع تھے خصوصاً ماسٹر رام چندر (دہلی کالج) کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مرادآباد میں منصف تھے اور گہرے دوست انھوں نے کہا "ان کل رسالوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالو مگر جواب ملا" ایسے کام پر جو حکومت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہے اگر مجھ کو گزند بھی پہنچے تو گوارا ہے۔" رسالہ شائع ہوا آگ بھی لگی اور جان کے لالے پڑے لیکن یہ مطمئن و شاد کام تھے۔ فوج منتظر ہے کہ گرفتار کریں اور گولی ماریں معتمد خارجہ جناب بیڈن نے شعلے ملتہب کئے۔ بغاوت کا الزام لگا یا سخت ترین سزا کا مستحق سمجھا لیکن الوان نے تحمل سے کام لیا اور بالآخر رسالہ کے مضامین سے اتفاق کرنا پڑا۔

یہ تھے سید احمد خاں جنھیں سلطنت مغلیہ سے جواد الدولہ کا آبائی خطاب ملا۔ بادشاہ نے بطور خود عارف جنگ کا لقب دیا۔ اور عوام الناس کے نزدیک رہبر قوم ٹھہرے انگریزوں نے دوست درحق، برطانیہ عظمیٰ کے ناموراور سرفراز، خیال کی بلندیوں اور عمل کی برکتوں سے دنیا پر چھائے۔ شہرت و عظمت کی داستان سارے عالم میں پھیلی آج اپنی یادگار کے ایک گوشے میں دو گز زمین کے نیچے پڑے سوتے ہیں اور لوح مزار کا کتبہ نقیب بن کر پکارتا ہے ؎

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کہ صد گونہ ہزار الدیدہ است

باقی صفحہ ۷ سے آگے

کہا ہوگا۔ کسی ادیب یا شاعر کو ہم ایسی اکائی نہیں فرض کر سکتے جو محض ایک خصوصیت کا حامل ہو اور دوسری خصوصیت کبھی اس میں پیدا ہی نہ ہو۔ زندگی کی طرح خود انسان بھی متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ ایک ہی ادیب ایک تخلیق میں قدامت کا حامل ہو سکتا ہے تو دوسری تخلیق میں جدیدیت کا۔ اسی طرح اس کی کوئی تحریر ناکام ہو سکتی ہے تو دوسری کامیاب۔ ادب اور ادبی تنقید کو ادبی اور جمالیاتی معیاروں کے علاوہ دوسرے تمام مفروضات سے بالاتر ہونا ہوگا۔ جدید نسل کو اسی ادبی مزاج اور تخلیقی رویے کو آگے بڑھانا ہے ورنہ جدیدیت بھی کچھ دنوں میں ایک تحریک بن کر رہ جائے گی اور اس کے خلاف بھی وہی ردعمل ہوگا جو گذشتہ تحریکوں کے خلاف ہوا۔

آندھرا میں غالب کی سویں برسی کا پروگرام

حیدرآباد۔ اردو کے شہرۂ آفاق شاعر حضرت غالب کی صد سالہ جشن کی تقریبات ۱۵ر اور ۱۶ر فروری ۱۹۶۹ء کو آندھرا پردیش کے مستقر حیدرآباد میں منائی جائے گی۔ صد سالہ جشن غالب کمیٹی برائے آندھرا پردیش نے اپنے حالیہ اجلاس منعقدہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۶۸ء میں ان تقریبات کو نہایت ہی شاندار پیمانے پر منانے کے لئے ایک وسیع تر پروگرام کو قطعیت دی ہے۔ ریاستی حکومت سے ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء کو عام تعطیل کا اعلان کرنے کی خواہش کی گئی ہے۔ ان تقریبات کی صدارت کے لئے ڈاکٹر بی گوپال رڈی، گورنر اتر پردیش سے خواہش کی جائے گی۔ جناب کھنڈو بھائی دیسائی، گورنر آندھرا پردیش سے ان تقریبات کی رسم افتتاح انجام دینے کے لئے ربط پیدا کیا جائے گا۔ اس موقع پر ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء کو "شب غالب" کے نام سے ایک میوزیکل پروگرام پیش کیا جائے گا اور دوسرے دن یعنی ۱۶ر فروری کو ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوگا۔ کمیٹی اس بات کے لیے بہت کوشاں ہے کہ رحمت اللہ بیگ کا لکھا ہوا "یادگار مشاعرہ" اس موقع پر پیش کیا جائے۔ ان تقریبات میں ایک تلگو اجلاس بھی شامل ہے جس میں غالب سے متعلق تلگو کتابوں کی رسم اجرا انجام دی جائے گی۔ اس اجلاس کے افتتاح کے لئے آندھرا پردیش کے چیف منسٹر جناب برہمانند ریڈی سے خواہش کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ آندھرا کے وزیر اصلاحات جناب جے وی نرسنگ راؤ اس تلگو اجلاس کی صدارت کریں گے۔ تلگو اجلاس کے کنوینر جناب ڈی رامانج راؤ صاحب معتمد آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی ہوں گے۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری سے اس موقع پر غالبیات کی نمائش ترتیب دینے کی خواہش کی گئی ہے۔ جناب مالک رام، جناب آنند نرائن ملا اور ایسی ہی دوسری ممتاز ادبی شخصیتوں سے ان تقریبات میں شرکت کی خواہش کی جا رہی ہے۔ ان مقاصد کے سلسلے میں جو ادبی کمیٹی قائم کی گئی ہے اس کی رپورٹ کے بموجب آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے غالب کی منتخب غزلوں کے تلگو ترجمے کا کام مکمل کر لیا ہے اور اس کے مسودہ پر بھی نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فن پر انگریزی میں مضامین کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اسکالرز نے غالب پر جو مضامین لکھے ہیں انھیں بھی ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ غالب کے ہمعصر مختلف ہندوستانی زبانوں کے شعرا پر مضامین لکھوائے جائیں گے تاکہ انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ یہ مجموعہ پہلے انگریزی میں اور بعد میں اردو میں شائع کیا جائے گا۔ کمیٹی نے ایک اور تجویز بھی منظور کی ہے کہ غالب کے فارسی کلام کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان تقریبات پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوگا جس میں غالب کے نام سے ایک ہال کی تعمیر کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ ان تقریبات کے لئے مالیہ کی فراہمی کی جدید تجاویز پر بھی غور کیا گیا اور کہ اس خصوص میں مرکزی حکومت، ریاستی حکومت، نظام چیریٹیبل ٹرسٹ اور مجلس بلدیہ حیدرآباد سے ربط پیدا کرنے کا فیصلہ کیا گیا نیز اردو کی مختلف تنظیموں اور اداروں سے بھی خواہش کی جائے گی کہ وہ اس سلسلے میں مدد کریں۔ استقبالیہ کمیٹی کی فیس رکنیت دس روپیہ رکھی گئی ہے۔ آخر میں یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ مرکزی کمیٹی دہلی سے خواہش کی جائے کہ وہ تمام ریاستی کمیٹیوں اور انفرادی طور پر صد سالہ جشن غالب منانے والوں کے کام کو مربوط شکل میں پیش کرنے کے لئے ایک نیم ماہی خبرنامہ جاری کرے جس میں ملک بھر کے مختلف اداروں اور افراد کی جانب سے انجام پانے والی سرگرمیوں کی تفصیلات ہوں تاکہ غالب کی صد سالہ تقریبات کے کاموں میں "ٹکراؤ" پیدا نہ ہو اور انھیں منظم شکل میں انجام دیا جا سکے۔

(سرینواس لاہوٹی جوائنٹ کنوینر صد سالہ جشن غالب کمیٹی آندھرا پردیش)

سیفیہ کالج میں غالب صدی تقریبات

بھوپال۔ سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جریدہ مجلہ "سیفیہ" نے برصغیر کے باشعور علمی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس معیاری صحیفہ کا "غالب نمبر" زیر ترتیب ہے۔ غالب صدی کے موقع پر پیش کئے جانے والے اس خاص نمبر میں ممتاز قلمکاروں کے اہم تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ طلبہ کی ادبی کاوشیں بھی شامل ہوں گی۔ "غالب صدی" تقریبات کے سلسلہ میں انجمن اردو "سیفیہ" بھی یادگار پروگرام پیش کرنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر تقاریر، طرحی مشاعرہ، "جشن غزل" (غالب کی غزلوں کا موسیقی پروگرام) وغیرہ کے متعلق تفصیلات طے کی جا رہی ہیں۔ ان پروگراموں میں شرکت کے لئے ملک کے نامور فنکاروں، ممتاز قلمکاروں اور معروف شخصیتوں کو مدعو کیا جائے گا۔ (عتیق الرحمٰن)

اردو گھر فنڈ

چندہ اردو گھر فنڈ یکم اکتوبر تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	ذریعہ وصولی و کیفیت
۱	طلبائے مثیل اردو ہائی اسکول کلیان ضلع تھانہ	۸۰-	منی آرڈر	معرفت پرنسپل صاحب
۲	وحید اللہ خاں صاحب بھوپال	۲۰-	〃	خود
۳	بیگم رحم علی الہاشمی صاحبہ علی گڑھ	۵-	نقد	〃
۴	آسد پرکاش کپور صاحب امرتسر	۱-	چیک	
۵	رائس سلک ملس 〃	۱۰۰-	چیک	
۶	وشوناتھ مہرا صاحب 〃	۲۰-	چیک	
۷	شرب دیال صاحب 〃	۵-	چیک	
۸	روشن لال صاحب 〃	۵-	چیک	
۹	برج لال اوروہ صاحب 〃	۵-	چیک	
۱۰	لالہ کرشن لال پردیومن لال صاحب	۵-	چیک	
۱۱	پرکاش سائیکل اسٹور	۵-	چیک	
۱۲	اشوک کمار صاحب 〃	۲-	چیک	
۱۳	ہنتا پرسنگ فیکٹری 〃	۳-	چیک	
۱۴	چرن جیت اگروال صاحب 〃	۲-	چیک	
۱۵	رویندر کمار صاحب 〃	۱-	چیک	
۱۶	ایشیاٹک ٹرینلرز کارپوریشن	۱-	چیک	
۱۷	بلجیت سنگھ صاحب 〃	۱-	چیک	
۱۸	پنڈت مہر چند صاحب 〃	۱-	چیک	
۱۹	ترسیم لال 〃	۱-	چیک	
۲۰	شری جے رائے صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۱	شری وی پی جین صاحب	۱-	چیک	
۲۲	مہنش چند صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۳	سری وی ناگر اے صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۴	امر جیت سنگھ صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۵	بابو مہندر سنگھ صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۶	تسیو ساج بوہر صاحب 〃	۱-	چیک	
۲۷	کاشی رام منی لال صاحب 〃	--	چیک	
۲۸	ڈاکٹر پیا نم پی عبداللہ صاحب کالی کٹ - ۱	۵-	منی آرڈر	خود
۲۹	خلیل خاں صاحب کلرک اکھاڑہ محبوب گنج	۲-	〃	〃
۳۰	طلبائے سکنڈ ایر (ڈی) پلو امہ ایم ایم گورنمنٹ ایم ایل ہائر سکنڈری اسکول پلوامہ	۱۹-	〃	〃
۳۱	طلبائے VIII بی ایم ایم گورنمنٹ ایم ایل ہائر سکنڈری اسکول پلوامہ	۱۱-	〃	معرفت غلام رسول جان صاحب مانیٹر
۳۲	〃 III اے سی 〃 〃 〃	۱۵-۵۰	〃	〃 مشتاق احمد صاحب مانیٹر
۳۳	〃 II 〃 بی 〃 〃 〃	۱۸-	〃	〃 غلام محی الدین جان صاحب مانیٹر
۳۴	〃 II 〃 سی 〃 〃 〃	۱۶-۵۰	〃	〃 علی محمد دار صاحب مانیٹر
۳۵	〃 I 〃 سی 〃 〃 〃	۳۲-	〃	〃 نذیر احمد وانی صاحب مانیٹر
۳۶	〃 VIII 〃 اے 〃 〃 〃	۱۷-	〃	〃 ثناء اللہ صاحب مانیٹر
۳۷	〃 III 〃 بی 〃 〃 〃	۱۳-	〃	〃 عبدالاحد ملک صاحب مانیٹر
۳۸	جناب محمد حبیب اللہ باوڑہ	۲-	منی آرڈر	
۳۹	〃 ایم اے خانم بیگ 〃	۲-	〃	
۴۰	〃 عبدالرشید 〃	۱-	〃	
۴۱	ایس ایم ابراہیم صاحب باوڑہ	۱-	منی آرڈر	
۴۲	〃 سلطان احمد صاحب 〃	۲-	〃	
۴۳	〃 عبدالرحیم صاحب 〃	۲-	〃	
۴۴	〃 علی حسن انصاری صاحب 〃	۲-	〃	
۴۵	عبدالصمد صاحب 〃	۲-	〃	
۴۶	نصیر الدین احمد صاحب 〃	۲-	〃	
۴۷	〃 احمد علی صاحب 〃	۲-	〃	
۴۸	〃 ولی اللہ صاحب 〃	۲-	〃	
۴۹	〃 حیدر علی صاحب 〃	۱-	〃	
۵۰	محمد عباس صاحب 〃	۲-	〃	
۵۱	ستیا پر یہ چٹرجی صاحب 〃	۱-	〃	
۵۲	عبدالرحمٰن صاحب 〃	۱-	〃	
۵۳	〃 عبدالرؤف صاحب 〃	۲-	〃	
۵۴	محمد نعمت اللہ صاحب 〃	۱-	〃	
۵۵	〃 فضل الرحمٰن صاحب 〃	۲-	〃	
۵۶	شمس الدین صاحب 〃	۱-	〃	
۵۷	〃 صابر علی صاحب 〃	۱-	〃	
۵۸	بھولا پاسبان صاحب 〃	۱-	〃	
۵۹	محمد الیاس صاحب 〃	۱-	〃	
۶۰	〃 محمد شفیق صاحب 〃	۱-	〃	
۶۱	عبدالستار صاحب 〃	۲-	〃	
۶۲	〃 احتشام الدین صاحب 〃	۲-		
۶۳	〃 بابو عبدالرزاق صاحب 〃	۲-	〃	
۶۴	〃 بابو عبدالعزیز صاحب 〃	۲-	〃	
۶۵	〃 محمد اشرف علی صاحب 〃	۱-	〃	
۶۶	عبدالوحید صاحب 〃	۲-	〃	
۶۷	〃 محمد شمس الدین صاحب 〃	۱-		
۶۸	〃 محمد مستقیم صاحب 〃	۳-		
۶۹	〃 حسن ہاشم صاحب ٹڈے ہال	۲-	〃	خود
۷۰	〃 لالہ رتن چند صاحب کپور امرتسر	۵-	چیک	معرفت شری پریم ناتھ ورما
۷۱	〃 محمود انار صاحب منگلور	۱۰۱-	ڈرافٹ	خود
۷۲	〃 کبیر حسن صاحب ادارہ ضلع پرولیہ	۱-	منی آرڈر	
۷۳	〃 افتخار احمد صاحب آزاد 〃	۱-	〃	
۷۴	〃 حسین علی صاحب 〃	۱-	〃	
۷۵	〃 محمود عالم انصاری صاحب 〃	۱-	〃	
۷۶	〃 محمد اصغر صاحب طالب علم 〃	۱-	〃	
۷۷	〃 خواجہ احمد عباس صاحب دہلی	۵۰-	چیک	
۷۸	ممتاز مرزا صاحب 〃	۱۰-	چیک	
۷۹	〃 انور عظیم صاحب 〃	۱۰-	چیک	
۸۰	〃 بیگم انور عظیم صاحبہ 〃	۱۰-	چیک	
۸۱	〃 ایل. کے جوشی صاحب 〃	۱۰-	چیک	
۸۲	〃 کیپٹن پی کے ڈھلوں صاحب 〃	۱۰-	چیک	
۸۳	شنکر پرشاد صاحب 〃	۱۰-	چیک	

میزان حال ۵۵۶-۰۰
〃 سابق ۵,۸۸۱-۵۰
〃 کل ۶,۴۳۷-۵۰

تصحیح معذرت کے ساتھ

پہلی اکتوبر کی فہرست میں لالہ لال چند صاحب مہرہ امرتسر کے نام میں بجائے مہرہ کے میرٹھ شائع ہو گیا ہے موصوف نے دو سو روپے عنایت کئے ہیں۔

REGD-NO-L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷- شمارہ ۴۰ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

رسم خط کا مسئلہ

در اصل کسی زبان کا کسی خاص رسم خط سے کوئی لازمی رشتہ نہیں ہوتا مگر کوئی زبان اگر عرصہ دراز تک ایک رسم خط میں لکھی جائے اور اس کا علمی و ادبی سرمایہ اسی رسم خط میں ہو تو پھر یہ رسم خط اس زبان کے ساتھ ملتبس ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑنا گوشت سے ناخن کو جدا کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جو لوگ کوئی زبان پہلی دفعہ سیکھ رہے ہیں انہیں تو کسی رسم خط میں وہ زبان سکھائی جا سکتی ہے مگر جو لوگ ایک رسم خط کے عادی ہیں انہیں کسی دوسرے خط میں لکھنے پر مائل کرنا بہت مشکل ہے پھر ان کے اپنی زبان کو پڑھنے اور اس میں لکھنے کی رفتار سست ہو جاتی ہے پڑھنے اور لکھنے میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو الفاظ کے نقش ہو جانے اور دل میں اتر جانے کے لئے ضروری ہے، خیال کی رو ہموار نہیں رہتی بلکہ معلوم ہوتا ہے آدمی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔

اس لئے جو لوگ اردو رسم خط کو ترک کرکے دیوناگری یا رومن رسم خط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ زبان اور نفسیات کے رشتے کو نظر انداز کرتے ہیں اور جو لوگ اس رسم خط کی خامیوں کی وجہ سے اسے چھوڑ دینے کا مشورہ دیتے ہیں وہ ہر معمولی بیماری کا علاج عمل جراحی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اردو رسم خط اب اردو زبان کی تاریخ اس کے سارے ادبی سرمائے اور ہمارے ادبی مزاج سے اس قدر ہم آہنگی اختیار کر چکا ہے کہ اب اسے ترک کرکے کسی دوسرے رسم خط کو اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں تعلیم و تدریس کی ضروریات، موجودہ دور میں ٹائپ رائٹر، ٹیلی پرنٹر اور چھپائی کی ضروریات کی وجہ سے اس کی اصلاح ضروری ہو گئی ہے اور اسے ٹالنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تیس برس سے جو تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) عام چھپائی کے لئے نستعلیق کے بجائے نسخ کو اختیار کر لیا جائے نستعلیق صرف خاص ایڈیشنوں کے لئے استعمال ہو۔

(۲) سجاد مرزا کا معیاری ٹائپ اختیار کر لیا جائے جس میں ہر حرف کی صرف دو شکلیں ہیں پوری اور ادھوری۔ ابتدا میں درمیان میں ادھوری شکل اور آخر میں پوری شکل استعمال کی جا سکتی ہے

(۳) حروف ابجد کی ترتیب صوتی لحاظ سے رکھی جائے نہ کہ صوری لحاظ سے۔

(۴) شروع میں ہم آواز حروف مثلاً ث، س، ص میں سے ایک حرف مثلاً س سکھایا جائے بعد میں دوسرے حروف بھی سکھائے جا سکتے ہیں

(۵) ہر حرف پورا لکھا جائے جس طرح انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔

در اصل اب تک رسم خط کے معاملے میں ہم افادیت کے بجائے خوش نمائی پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہمیں پہلے افادیت اور ضرورت کا لحاظ رکھنا چاہئے بعد میں خوشنمائی کا۔ اس لئے ہماری رائے ہے کہ سجاد مرزا کے معیاری ٹائپ کے عام طور پر اختیار کرنے میں ہمارا زیادہ فائدہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ اصلاح کے معاملے میں جذبات سے قطع نظر کرکے ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے۔ جذبات کی پاسداری کی وجہ سے ہی تو ہم اردو رسم خط کو باقی رکھنا چاہتے ہیں مگر اس کی اصلاح کو اب ٹالنا نہیں چاہئے۔ ہمیں موجودہ نسلوں کا خیال ہے مگر آنے والی نسلوں کی ضرورت کو کیسے نظر انداز کریں۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری کانفرنس

علی گڑھ۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری کانفرنس ۲۰، ۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کا افتتاح ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم اور نامور ادیب و انشا پرداز جناب خواجہ غلام السیدین فرمائیں گے۔ کانفرنس کے پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہے

کانفرنس کے مختلف اجلاس کے لئے جو مباحث منتخب کئے گئے

۲۰ [illegible] ۱۹۶۸ء

افتتاحیہ اجلاس ساڑھے گیارہ بجے دن
خطبۂ استقبالیہ: ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
خطبۂ افتتاحیہ: جناب خواجہ غلام السیدین
خطبۂ صدارت: پروفیسر عبد القادر سروری۔ صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند
سالانہ روداد: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ سکریٹری انجمن اساتذہ اردو
شکریہ: پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پہلا اجلاس: تین بجے سہ پہر
موضوع: اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے
صدر: ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ صدر شعبۂ لسانیات علی مسلم یونیورسٹی۔
کنوینر: نسیم قریشی لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دوسرا اجلاس ساڑھے چھ بجے شام
موضوع: معلمین اردو کے مسائل
صدر: پروفیسر اختر اورینوی۔ صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی۔
کنوینر: ڈاکٹر قاضی عبد الستار۔ لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء

تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح
موضوع: نصاب کے مسائل
صدر: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی
کنوینر: عتیق احمد صدیقی لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

چوتھا اجلاس تین بجے سہ پہر
موضوع: تدریس کے مسائل
صدر: پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی
کنوینر: ڈاکٹر منظر عباس نقوی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

پانچواں اجلاس ساڑھے نو بجے صبح
موضوع: تحقیق کے مسائل
صدر: پروفیسر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی
کنوینر: ڈاکٹر انصار اللہ نظر لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

چھٹا اجلاس۔ تین بجے سہ پہر
موضوع: تنقید کے مسائل
صدر: پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کنوینر: اخلاق محمد خاں شہریار لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ہیں ان کے بارے میں متعلقہ شعبوں کے صدارتی خطبوں کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے اپنے مقالات پیش کریں گے اور ان پر تبادلۂ خیال ہوگا۔ ۱۲ اکتوبر کی شام میں مندوبین کا ایک تنظیمی جلسہ ہوگا۔

۲۲ اکتوبر کو چھ بجے شام ایک محفل شعر وسخن منعقد کی جائے گی جس میں مندوبین اور مہمان شعرا کے علاوہ علی گڑھ کے شعرا اپنا کلام سنائیں گے۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے نمائندے بطور خاص نامزد کئے ہیں۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی،	ڈاکٹر سید رفیق حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں
پٹنہ یونیورسٹی،	ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر صدر الدین فضا
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ
دہلی یونیورسٹی	صدیق الرحمان قدوائی
گورکھپور یونیورسٹی	ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر سلام سندیلوی
مگدھ یونیورسٹی،	شاہ شکیل احمد
بنارس ہندو یونیورسٹی،	ڈاکٹر حکم چند نیّر
کشمیر یونیورسٹی،	پروفیسر عبد القادر سروری، پروفیسر گیان چند جین
میسور یونیورسٹی،	ڈاکٹر آمنہ خاتون
سری وینکٹیشور یونیورسٹی	ڈاکٹر رضی الدین احمد
گجرات یونیورسٹی،	وارث حسین علوی
مدراس یونیورسٹی،	محمد یوسف کوکن
اودے پور یونیورسٹی	سید ثاقب رضوی
کانپور یونیورسٹی	ایم۔ اے رضوی، رئیسہ حسن

ان کے علاوہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں اور اہم کالجوں سے اردو کے اساتذہ اپنے طور پر اس کانفرنس میں شرکت کے متعلق اطلاع دے چکے ہیں۔ کانفرنس کا افتتاحیہ اجلاس کمرہ ۱۲ فیکلٹی آف آرٹس میں اور دوسرے تمام اجلاس فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں ہوں گے۔ تمام شرکا و مندوبین کے قیام وطعام کا انتظام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کر رہی ہے جناب وائس چانسلر کی طرف سے مہمانوں کو ایک عصرانہ بھی دیا جائے گا۔ کانفرنس کی طرف سے آزاد لائبریری میں اردو مخطوطات، نادر مطبوعات اور معلمین اردو کے تصنیفی کاموں کی ایک نمائش بھی ترتیب دی جا رہی ہے۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی آنریری سکریٹری)

سہیل اعظمی کی وفات

نابھہ۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کی ریاستی شاخ کے رکن شری رام رتن بھاردواج میونسپل کمشنر نابھہ ایک مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال کر گئے۔ مرحوم اردو زبان کے سرگرم حامی، انتھک سوشل کارکن اور خوش فکر شاعر تھے۔ ادبی حلقوں میں وہ سہیل اعظمی کے نام سے مشہور تھے۔

(مسعود تنویر)

———×——

کے سامنے ... "روزگارِ فقیر" میں علامہ کی شخصیت کو میں نے بنیادی طور پر ایک عاشقِ رسول کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ میرے خیال میں ان کی ذاتِ گرامی کا یہی پہلو سب سے زیادہ اہم اور شاندار ہے اور اس پہلو پر اب سے پہلے محققین نے سب سے کم توجہ دی تھی میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

مجھے بہت مسرت ہے کہ آپ علامہ کے "سفرِ دکن" سے متعلق ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں، اگرچہ اس سے قبل "اقبال اور حیدرآباد دکن" کے نام سے یہاں ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو نظر حیدرآبادی صاحب نے مرتب کی تھی، لیکن اگر آپ اس موضوع پر زیادہ تحقیق اور تجسس سے کام لے رہے ہیں تو "مدائحِ اقبال" اس مضمون کی ایک زیادہ جامع اور مکمل کتاب کا مطالعہ کر سکیں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ فاصلے کی طوالت اور سفر کی مشکلات نے اس بات کا امکان باقی نہیں رکھا کہ مخطوطات، تصاویر وغیرہ کی صورت میں آپ کے پاس جو نوادر موجود ہیں ان کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کر سکوں بہرحال آپ کی مخلصانہ دعوت کا بہت بہت شکریہ!

آپ یہ سن کر مسرور ہوں گے کہ میں نے اپنی کراچی کی قیام گاہ میں حال ہی میں علامہ کے ذاتی استعمال کی بہت سی اشیاء، تاریخی نوادر کی صورت میں محفوظ کر کے رکھی ہیں، اور اس امر کا انتظام کیا ہے کہ شائقین انھیں دیکھ سکیں کہ اپنے دور کی اس عظیم شخصیت لباس اور ذاتی ضروریات کے معاملے میں قلندری اور فقیری کا کتنا بڑا نمونہ تھی۔

آپ یقیناً یہ خبر بھی دلچسپی سے سنیں گے کہ میں آج کل علامہ کی زندگی اور شاعری پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنا رہا ہوں جو غالباً ۹۰ منٹ میں ان کی زندگی کے تمام گوشوں کی ترجمانی مکمل کر دے گی، اسے ایک شاہکار علمی فلم بنانے کے لئے انگلستان بھیج کر رنگین کرایا گیا ہے۔ میسور اور مدراس کی تصاویر بھی اس میں شامل ہیں۔

آپ نے چودھری محمد حسین مرحوم کی جس مجوزہ کتاب "سفرنامہ جنوبی ہند" کا تذکرہ کیا ہے۔ میرے علم میں چودھری صاحب کی ایسی کوئی کتاب نہیں جو شائع ہوئی ہو البتہ آپ روزنامہ "انقلاب" کے مضامین کے متعلق، مولانا غلام رسول مہر، مسلم ٹاؤن لاہور کے پتہ پر خط لکھ کر تحقیق فرمالیں۔

اگر کتابوں کی ترسیل اور وصولی شرح ہونے کے بارے میں اطمینان ہو جائے تو میں "روزگارِ فقیر" کی دونوں جلدیں آپ کو ضرور ارسال کر دوں گا آپ نے جس خلوص و محبت کے جذبے سے خط لکھا ہے اس کے لئے بے حد مشکور ہوں۔

نیازمند

فقیر سید وحید الدین

میں نے اس خط کے جواب میں ایک اور خط لکھنے کی سعادت و مسرت حاصل کی۔ راقم نے روزگارِ فقیر سے متعلق بھی اپنی ناقص رائے لکھی اور اپنے البم کے لئے تصویر بھی مانگی اور سلطان ٹیپو کی تحریر[1] کا ایک حقیر تحفہ بھی روانہ کیا جس پر وہ کافی خوش ہوئے، دوسری جلد سے علامہ اقبال کی کچھ نظمیں بھی اپنے مضمون میں اخذ کرنے کی اجازت مانگی تھی فقیر صاحب نے بزرگانہ شفقت و کرم کے ساتھ تصویر روانہ کرتے ہوئے لکھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفقر فخری

۴۴۔ روز اسٹریٹ

میکلیوڈ روڈ۔ کراچی کینٹ

۲۷ اگست ۷۶ء

مکرمی سلیم صاحب تمنائی!

سلام مسنون

امید ہے آپ بفضلِ خدا بخیریت ہوں گے

آپ کا خط موصول ہوا انتہائی خوشی ہوئی۔ آپ نے جن الفاظ میں "روزگارِ فقیر" کو سراہا ہے، میں اس کے لئے تہِ دل سے مشکور ہوں آپ کی تحریر سے آپ کی بلند نظری عیاں ہے۔ آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو "روزگارِ فقیر" حصہ اول پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس میں بھی اہم واقعات درج ہیں۔

مجھے کبھی بھی تصویر اتروانے کا شوق نہیں رہا۔ محض آپ کے خلوص اور اصرار پر ایک تصویر جس پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دئے ہیں روانہ کر رہا ہوں۔

سلطان ٹیپو کی تحریر کا جو تحفہ آپ نے ارسال کیا ہے ایک ایسا سرمایہ ہے جو میرے خاندان میں آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہے گا علامہ مرحوم سے عقیدت کے لئے "روزگارِ فقیر"[2] جلد اول اور "اقبال اِن پکچرز" بھجوا رہا ہوں سلطان ٹیپو کی تصویر کا مقصد اس سے پورا ہو جائے گا کیونکہ اس کتاب میں علامہ مرحوم کی زندگی کا مکمل نقشہ نادر تصاویر میں

---

[1] اس میں سلطان کی مہر اور دستخط بھی تھے۔ یہ خاص طور پر سلطان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی بسم اللہ خاصہ کی چیز تھی۔ سلطان کو شیر سے مناسبت تھی۔ وہ شیر کو بہت پسند کرتا تھا مہر کا نشان اکثر ہتھیار وں اور خاص اس کے مقبرہ میں بھی ہم پاتے ہیں۔ بسم اللہ کے حروف میں بھی یہی نشان نمایاں ہے۔

[2] روزگارِ فقیر جلد دوم میں علامہ اقبال کی ایک تصویر چھپی ہے جس میں علامہ کو مزار ٹیپو کے قریب استادہ دکھایا گیا ہے، میں نے اسی کی نقل مانگی تھی۔

دیا گیا ہے۔

"روزگارِ فقیر" جلد دوم میں شامل ڈاکٹر صاحب کی جو نظمیں بچوں کے لئے منتخب کرنا چاہیں بڑی خوشی سے لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، علامہ مرحوم کے کلام کا مقصد یہی ہے۔ ان کا پیغام صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام افرادِ نسلِ انسانی کے نام ہے۔ اس کو تجارتی منفعت کے تحت نہیں لانا چاہئے۔

آخر میں میری یہ ضرور استدعا ہے کہ آپ اقبالیات پر میری ان کتابوں سے مواخذہ کرکے جو کتاب بھی شائع کریں اس میں اس کتاب کا حوالہ ضرور درج فرمائیں، یہ ضروری ہے امید ہے میری استدعا کو آپ ملحوظ خاطر رکھیں گے۔

صدر پروفیسر سید مدیر احمد صاحب سے میرا سلام کہدیں۔

آپ کا نیازمند

فقیر سید وحید الدین

کسی کے یا کسی چیز کے انتظار میں کسی کو مزہ ملے تو ملے مگر مجھے ہمیشہ تکلیف ہوئی ہے کیا کہوں کا انتظار رہا، مزہ نہیں ملا تکلیف ہوئی کسی چیز میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے یا ہاتھ آتے سے رہی تو مایوسی یا صبر کی بات زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔ مجبوری کا نام صبر ہوا مگر اس صبر میں بھی انتظار کی دبی چنگاریاں کبھی کبھی ضرور روشن ہو جاتیں۔ معاملہ کچھ دھیمی آگ کا سا تھا۔ ڈاکیے مہربان نہ تھے ورنہ ان کو دشمن سمجھتا۔ دل ہی دل میں گالیاں دیتا۔ غرض تھک ہار کر سوچا کہ خط لکھوں۔ گلہ کر دوں بچوں کی طرح ضد کر دوں۔ مگر یار لوگوں نے ایک اللہ کے بندے کو جو مسجد کے زیرِ سایہ نہیں بلکہ قریب ہے، دیر و حرم کا آدمی سمجھ، بزرگوں کا واسطہ یا حوالہ (شاید غیرت دلانے کے لئے) دے محراب میں نہیں بٹھا اور کھڑا کیا بلکہ اس کے انتظامی امور ہاتھ میں دے دیئے اور کہا (یا میں نے، یا میرے دل نے اس کا مطلب یوں نکال لیا) کہ آپ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔ من تو نظر نہیں آتا، تن اجلا ہے، سجا چکا ہے، لہٰذا آپ کے بزرگوں نے یہ عنایت کی تھی۔ اب آپ سنبھالئے

زیب غوری

غزل

کمرے کی ہر الماری کتابوں سے بھری ہے
ہر سمت روایات کی دیوار کھڑی ہے

مشکل ہے بتا پانا کہ ہے اندر کا دربار
یا روم مرا گھر ہے کہ کوئی دھوپ گھڑی ہے

بستر پہ مرے چاندنی سوتی ہے اکیلی
یا کروٹیں لیتی کوئی آوارہ پری ہے

کب فصل گلابوں کی زمینوں سے اُگے گی
مدت سے مری روح میں تلوار گڑی ہے

مانیں گے نہ ہم زیب کے اِس رنگِ سخن کو
زندہ ہیں جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے

ہم چین کی بانسری بجاتیں، اور اپنے گھر تان کر، گھوڑے بیچ یا مردے سے بازی لگا سوتیں۔

جب کوئی تعریف منہ پر کر دے تو گرم بھی نرم ہو جاتا ہے ہم بھی نرم ہوئے ویسے گرم کبھی نہیں رہے لیکن حال پتلا ضرور ہوا، یعنی رمضان تشریف آئے اور ہم لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں کچھ بیکار سے ہو گئے، طلبہ بھی روزے رکھے تھے، اس طرح وہ اپنے آپ پڑھنے سے بچے اور افطاری کے انتظار میں سونے کے زیادہ قائل تھے۔ اور جو رمضانی نہیں تھے وہ ہم پر ترس کھا کر بھی فلم کا پروگرام بنا دیتے اور گھر میں دالدین منکر نکیر کا روپ دھارن پوچھ تاچھ کرنے یا استادِ محترم کا نام نامی اسم گرامی لے دیتے مقتدی کا سارا گناہ امام کے سر۔ اس بیچ محمد طفیل صاحب المعروف بہ محمد نقوش نے ہمیں پہلی بار خطوط نمبر کے سلسلے میں خط تحریر فرمایا، ہم پر ترس نہ کھایا یہ کی بات لکھی اور محترم وحید صاحب کو بھی لکھا۔ وہ بھلا کب ترس کھاتے معاملہ چکی کے دو پاٹ اور بیچ اس کے دانے کا سا تھا۔ ہم نے تراویح کے بعد صبح معمول میں سحر کی مضمون تیار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف روزگارِ فقیر کے خط بھی۔

ایک دن شام گھر لوٹے تو حالی بیچلی تحریر کا لفافہ نظر آیا ایک ہی عادت کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ ہم ہندو، مسلم اور کھڑی بولی کی دو ادبی بیٹوں کے ملاپ کی طرح، اس پر بھی خوش ہو گئے۔ اور بعد میں یہ دعا آرزو کی صورت میں دل سے نکلی کہ اتحاد و ملاپ پیار محبت ان دو بہنوں میں بھی ہو جنھیں ہم ہند و پاک کہتے ہیں۔

کرم نامہ اپنے بزرگ محترم فقیر وحید الدین صاحب کا تھا۔ جو بنگلور سے آیا تھا مگر وہ کراچی ہی میں تھے۔ در اصل اس کے بھیجنے والے جناب عبد الغفور صاحب بنگلوری تھے اور محترمی عبد العزیز بنگلوری ڈپٹی مینیجنگ ڈائرکٹر کمرشیل بنک آف پاکستان کے حسنِ توسط سے فقیر صاحب تک ان کی رسائی ہوئی تھی۔ اور ان ہی کے ہاتھوں روزگارِ فقیر کی دونوں جلدیں اور "اقبال اِن پکچرز" البم روانہ کیا تھا۔

میں بنگلور جا نہ سکا۔ عزیزی نعیم اقبال نے ان سے بھجوا دو

حاصل کر ہم تک پہنچائے۔ شکریہ کے لئے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہے۔

آپ نے اس آخری خط میں دوبارہ میرے ناچیز ترین تحفے کا شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ کیا تھا، لکھا تھا۔

۱۸-۱-۱۹۶۸ء

مکرمی و محترمی سلیم تمنائی صاحب

السلام علیکم۔

آپ کا عنایت نامہ اور سلطان ٹیپو شہید کی تحریر کا نادر عکس موصول ہو گیا تھا۔ آپ کے اس پرخلوص ہدیے کے لئے سراپا تشکر ہوں۔ اور اس قیمتی نوشتے کو نہایت حفاظت سے رکھوں گا۔ تاکہ میری زندگی میں اور اس کے بعد میرے جمع کردہ نوادر میں شائقین علم و اسلاف اس بطل جلیل کے اندازِ تحریر سے بھی اپنی آنکھیں روشن کرتے رہیں

آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے آپ کی لائبریری کے لئے اسی وقت مطلوبہ کتب ارسال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہندوستان کے ساتھ رجسٹری پارسل کا سلسلۂ ڈاک منقطع ہونے کے سبب یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

اب حسنِ اتفاق سے میرے عزیز و محترم دوست جناب ایس، کے، عبد العزیز ڈپٹی منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان کے دوسرے ہی دورہ پر بنگلور آ رہے ہیں۔ میں نے اس خواہش کا ذکر کیا تو از راہ عنایت انھوں نے یہ کتب اپنے ساتھ لے جانے اور آپ کو پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ چنانچہ ان کے ذریعے آپ کی لائبریری کے لئے" اقبال ان پکچرز " اور روزگار فقیر جلد اول و جلد دوم کی ایک ایک کاپی روانہ کر رہا ہوں۔

جب یہ تینوں کتابیں آپ کو مل جائیں تو آپ مجھے اطلاع ضرور دیں۔ نیز ان کتابوں کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے بھی آگاہ فرمائیں۔

امید ہے کہ آپ مع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا نیازمند

فقیر سید وحید الدین

میں نے حکم کی تعمیل میں رسید روانہ کر دی۔ ڈھیروں شکریہ ادا کیا۔ پھر میں اپنی تعلیمی مصروفیات میں کھو گیا۔ میری اور اپنوں کی بیماریوں میں شہر قاضی کا حال پتلا ہوا۔ دائرہ چلے ستر بلا ٹلے کے محاورے میں تبدیلی ہوئی اور دائرہ چلے بابا بولے پر معاملہ آ گیا۔ عقل داڑھ ہمیشہ بے وقوف ہوتے ہیں یا کم از کم ہمارا تجربہ یہی ہے۔ نہ جانے کب چپکے سے براجمان ہو گئے بتیسی کے جز و بن گئے۔ اب ان کی عقل میں ضرور فتور آ گیا تھا۔ ہماری عقل بھی ٹھکانے لگا دی، اور والدہ محترمہ کا آپریشن، ہماری سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اللہ کی عنایات کے بھی ہم کچھ زیادہ ہی قائل تھے اور ہیں۔ معاملات سدھرے لیکن ہم دوست و احباب سے کچھ دنوں کے لئے کٹ کر رہ گئے۔ بزرگوں دوستوں، شاگردوں وغیرہ کو خط لکھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ جیسے قلم میں طاقت نہ رہی۔ ہماری زبان "علی گڑھ" "قومی آواز" سے خبر اخذ کی تھی کہ:۔ لاہور۔ ۲۳ر جولائی، اردو کے ایک ممتاز ادیب کرنل فقیر وحید الدین کا انتقال گذشتہ اتوار کو کراچی میں ہو گیا۔ مرحوم لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے بزرگ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال سے دیرینہ نیازمندی اور گہری عقیدت کی بنا پر انھوں نے علامہ کی زندگی اور افکار پر" روزگار فقیر" اور اقبال اِن پکچرز" مرتب کر کے شائع کیا۔ انھوں نے حال ہی میں جناب فیض احمد فیض کے تعاون سے اقبال کی تعلیمات پر ایک فلم بھی تیار کی تھی، سرورِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی کتاب محسنِ اعظم بھی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ انھوں نے اپنے نامور ہم عصروں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک ادبی شاہکار انجمن کے نام سے تصنیف کیا۔"

فقیر صاحب سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور نہ انھیں کبھی دیکھا تھا۔ میری اور ان کی دوستی کی ساری کائنات ان کے بس خطوط اور تین کتابیں تھیں، لیکن ایسا محسوس ہوا کہ دوبارہ میرے والد مرحوم اور تایا مرحوم کا وصال ہوا ہے۔ بلا مبالغہ اتنا ہی غم ہوا اب ایسے بزرگ مشکل سے ملیں گے۔ ان کی شفقت و مروت اور محبت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ راقم ہزاروں میل دور رہ کر بھی بے چین ہے اور آنکھیں غم کے موتی رو رہی ہیں مغفرت کے رٹے رٹائے جملے بھی زبان سے نہیں نکل رہے ہیں۔ دل جب روئے تو ہونٹ صرف پھڑک کر رہ جاتے ہیں اور آنکھیں اپنا غم چھپائے دل اور ہونٹ کو بظاہر "دیوانے" کہہ کر رو پڑتی ہیں اور جواب میں ہونٹ مسکراتے ہیں۔ جیسے وہ بڑے باہمت ہوں لیکن دل راز داں ہے وہ کہتا ہے کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے غم کو میں جانتا ہوں۔ ہاں جانتا ہوں . . . . . اور وہ خود رو پڑتا ہے۔

مراسلات

روہیلکھنڈ اخبار کے بارے میں

میں آپ کی توجہ اس غلط فہمی پیدا کرنے والی خبر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں شائع ہوئی ہے کہ روہیلکھنڈ اخبار بند ہوگیا ہے۔ اخبار کی مسلسل کاپیوں کی وصولی سے آپ کو یقین ہوگا کہ بہ صرف زبان کی تبدیلی ہے۔ اخبار کے بند ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تبدیلی اخبار کے ۱۵ر اگست ۶۸ء کے شمارہ پر پولیس ایکشن کی بناء پر ضروری سمجھی گئی عدالت میں مسلسل طویل مقدمات کی وجہ سے ہم کو یہ یقین کرنا پڑا کہ اردو میں سیاسی موضوعات پر اظہار خیال کرنا ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ چنانچہ تبدیلی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے اخبار کی ریبی اشاعت میں صحیح صورت حال کی وضاحت فرمادیں گے

(ریتج بہادر سنہا)

یہ اشعار کس کے ہیں؟

ذیل میں چار مصرعے درج کر رہا ہوں قارئین" ہماری زبان" سے استدعا ہے کہ اگر ان کی نظر میں یہ اشعار ہوں تو "ہماری زبان" کے ذریعہ شاعر کا نام تحریر فرماکر ممنون کرم فرمائیں۔

یاران ہمنشیں و رفیقان دوستدار
سب آشنا ہیں زندگیٔ مستعار کے
جب مر گئے یہ آنکھ تو پھر دست بعد مرگ
آتا ہے پاس کون کسی کے مزار کے

(الحمی)

غالب صدی

یکم ستمبر کے ہماری زبان میں مندرجہ بالا عنوان سے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے موصوف نے سینٹری کے لئے صدی کا لفظ نہایت معقول تجویز کیا ہے پیدائش صدی اور وفات صدی بھی پوری طرح قابل قبول ہیں۔ صدسالہ سالگرہ اور صدسالہ برسی میں یہ بات نہیں پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہ الفاظ سنٹری کے بجائے ANIVERSARY کے لئے موزوں ہیں۔ ان سے صرف سنٹری کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ سینٹری اشخاص کے علاوہ اداروں محکموں، اخباروں اور رسالوں وغیرہ کی بھی ہوتی ہے۔ صدی کا لفظ ہر صورت میں موزوں رہے گا اور جیسا کہ سحر صاحب نے لکھا ہے اس سے ہر قسم کے مرکبات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس لفظ کے چلن کے لئے ضروری ہے کہ غالب کی سو ویں برسی کی تقریبات کے سلسلے میں جو کمیٹیاں قائم ہیں وہ اردو میں اپنا نام غالب صدی کمیٹی یا غالب صدی تقریبات کمیٹی استعمال کریں حسب موقع وفات صدی کا بھی استعمال کیا جائے۔

(عبدالرشید)

میں کچھ نہیں کہتا

۸ر ستمبر ۶۸ء کے ہماری زبان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کا ایک مراسلہ بہ عنوان" کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے" شائع ہوا ہے۔ اس مراسلہ میں چونکہ آں محترم نے یہ ظاہر کیا ہے کہ میں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ صحیفہ (جولائی ۶۸ء لاہور) میں ان کے مضمون کا ایک غلط حوالہ درج کر دیا ہے اس لئے میری طرف سے اس کی وضاحت ضروری ہوجاتی ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ گلزار نسیم کا اصل ماخذ "مثنوی باغ بہار" ہے اور مثنوی کے مصنف ریحان الدین ریحان لکھنوی ہیں اسی کے ساتھ ہماری زبان بابت ۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء اور یکم فروری ۱۹۶۱ء کے حوالے دے کر یہ بھی لکھا تھا کہ مثنوی باغ بہار کے مصنف ریحان الدین لکھنوی کو منشی دیاکرشن ریحان لکھنوی خیال کرنا صریحاً غلط ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے مراسلہ مطبوعہ یکم فروری ۱۹۶۱ء میں مثنوی باغ بہار کے مصنف کو دیاکرشن ریحان ظاہر نہیں کیا بلکہ صحیفہ کے مقالہ نگار نے بے سبب ایک غلطی ان سے منسوب کردی۔

رضوی صاحب میرے بزرگ و محترم ہیں اس لئے میں اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں رضوی صاحب کے جس مراسلے کا حوالہ میں نے دیا ہے اس کی نوعیت اور پس منظر پر مختصراً روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ ہماری زبان کے قارئین خود سمجھ لیں کہ رضوی صاحب نے فی الواقع کیا لکھا ہے اور میں نے کیا سمجھا ہے۔

رضوی صاحب کے مراسلہ مطبوعہ یکم فروری ۱۹۶۱ء (جس کا حوالہ میں نے دیا ہے) کا پس منظر یہ ہے کہ" ہماری زبان میں گلزار نسیم کے ماخذ پر بحث چل رہی تھی اور رضوی صاحب کے مراسلے سے پہلے ڈاکٹر گیان چند صاحب نے گلزار نسیم کے ماخذ کے عنوان سے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں رفعت کی فارسی اور ریحان لکھنوی کی اردو مثنوی باغ بہار کا ذکر کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا تھا کہ رفعت و ریحان کے متعلق انھیں تذکروں سے کوئی معلومات فراہم نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر گیان چند کی مذکورہ بالا تحریر کے پیش نظر سراج دھولپوری صاحب نے ۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء کی ہماری زبان میں "رفعت و ریحان" کے عنوان سے ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں انھوں نے ریحان لکھنوی کے متعلق لکھا۔

" ریحان کا نام دیاکرشن اور لقب منشی تھا رہنے والے
... لکھنؤ کے تھے نواب واجد علی شاہ کے بخشی الملک
راجہ الفت رائے کے یہاں سررشتہ داری کے عہدے

* پر فائز تھے .... منشی دیبی پرشاد نے ریحان کو کالستھ سری واستو بتایا ہے۔ پہلے سخن کے شاگرد تھے (ان بعد لالہ موجی رام) سے مشورہ سخن کرتے تھے ... . وقت انطباع آثار الشعرائے ہنود، ریحان دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ تذکرہ مذکور میں ان کے چالیس پینتالیس اشعار بھی منقول ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارت میں معراج دھولپوری صاحب واضح طور پر دیا کرشن ریحان لکھنوی کو مثنوی باغ بہار کا مصنف سمجھ رہے ہیں ڈاکٹر گیان چند اور معراج دھولپوری کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے "گل بکاولی کا ایک اور قصہ" کے عنوان سے یکم فروری ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں ایک مراسلہ شائع کیا جس میں انھوں نے تین شقوں میں علی الترتیب تحریر فرمایا

(۱) "۱۵ رجنوری ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں جناب معراج دھولپوری صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے فارسی اور اردو کی ان کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن میں گل بکاولی کا قصہ بیان کیا گیا ہے، ان کتابوں کے علاوہ اس پر ایک اور کتاب میرے علم میں ہے، نام اس کتاب کا "گل باغ بہار" ہے اور مصنف اس کے محمد اسد علی نادان حیدرآبادی ہیں۔"

(۲) "منشی دیا کرشن لکھنوی کا قصہ" کا جواب زیر لفظ مراسلے میں آثار الشعرائے ہنود سے نقل کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔ . . .. مذہب ہوتی محمد کو۔ قطعہ کہیں حسب ذیل صورت میں ملا تھا اور اسی صورت میں میں نے اپنی کتاب ہماری شاعری میں نقل کیا ہے۔ . . . .. اور یہی صورت بہتر معلوم ہوتی ہے۔"

(۳) اس مراسلے میں تین جگہ اودھ کے آخری فرماں روا واجد علی شاہ کا نام آیا ہے اور ہر جگہ ان کے نام کے ساتھ نواب کا لفظ لکھا گیا ہے، یہ غلط ہے . واجد علی شاہ، بادشاہ تھے۔"

مذکورہ بالا مراسلے میں رضوی صاحب نے، معراج دھولپوری کے مراسلے کی بعض کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے، بعض غلطیاں درست کی ہیں اور بعض جگہ معراج صاحب کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات پر اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً ریحان لکھنوی کے قطعہ کے سلسلے میں۔ لیکن ریحان کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں معراج دھولپوری کی تائید میں لکھ رہے ہیں اور معراج دھولپوری کی طرح، دیا کرشن ریحان لکھنوی کو مثنوی باغ بہار کا مصنف سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر انھیں دیا کرشن ریحان اور ان کے قطعہ کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچانے کے بجائے معراج دھولپوری کے بیان کی تردید کرنی چاہیے تھی۔ لیکن موصوف نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رضوی صاحب کو مراسلہ لکھتے وقت یہ علم ہوتا کہ مثنوی باغ بہار کے مصنف ریحان لکھنوی اور دیا کرشن ریحان لکھنوی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں تو وہ ہرگز معراج دھولپوری کی غلط اطلاع پر مزید اطلاع کا اضافہ نہ فرماتے۔

رضوی صاحب اپنے مراسلے میں، معراج دھولپوری صاحب کی اس معمولی بات پر گرفت تو کرتے ہیں کہ انھوں نے واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ "نواب" کیوں لکھ دیا لیکن جہاں معراج دھولپوری نے ایک صریح واقعاتی غلطی کی ہے وہاں رضوی صاحب تصحیح کرنے کے بجائے، اس کی غلطی کو مزید طول دیتے ہیں، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ رضوی صاحب کو مراسلہ لکھتے وقت فی الواقع یہ خبر نہیں تھی کہ گلزار نسیم کے ماخذ مثنوی باغ بہار کا اصل مصنف کون ہے۔ ریحان الدین ریحان لکھنوی یا دیا کرشن ریحان لکھنوی۔

مندرجہ بالا تصریح کی روشنی میں ہماری زبان کے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے اپنے مضمون مطبوعہ صحیفہ میں رضوی صاحب کا جو حوالہ دیا ہے وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے اور رضوی صاحب کا احتجاجی مراسلہ مطبوعہ ۸ ستمبر ۶۸ء جس کے پیش لفظ مجھے یہ سطور لکھنی پڑیں کس حد تک درست ہے۔ اس پر بھی اگر رضوی صاحب کو اصرار ہے کہ میں نے غلط حوالہ دیا ہے تو میں ان کے احترام میں خاموش ہوا جاتا ہوں اور کچھ نہیں کہتا۔

(دیوان فتحپوری)

انجمن ترقی اردو راجستھان کے وفد کی ملاقات

جے پور۔ شہر جے پور کے متولی کٹرہ ہائر سکنڈری اسکول میں اردو کے طلبہ کی تعداد چالیس سے زائد ہے۔ جہاں اردو کی تعلیم بحیثیت اختیاری مضمون کو جاری ہے۔ مگر تھرڈ لنگویج کے لحاظ سے صرف سنسکرت ہی جاری ہے۔ اس لئے اردو کے طلبہ بھی تھرڈ لنگویج کی حیثیت سے سنسکرت لینے پر مجبور ہیں، جو ان کے لئے بہت مشکل مضمون ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں نہ پاس ہونا ضروری ہے، نہ اس پرچے کے نمبر شمار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس کی تعلیم کا معیار اور نتیجہ کیا ہوگا۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو راجستھان کا ایک وفد جو حسب ذیل اصحاب پر مشتمل تھا ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول مذکور سے انھوں نے یقین دلایا کہ آئندہ سیشن سے لازمی طور پر اردو کو بھی تھرڈ لنگویج کے لحاظ سے جاری کرانے کی کوشش وقت پر ضرور کی جائے گی۔ انھوں نے موجودہ سیشن میں اساتذہ کی تقرری سے اس لئے معذوری کا اظہار کیا کہ تین ماہ گزر چکے ہیں اور بورڈ کی منظوری کے بغیر درجہ کا اجرا ممکن نہیں ہے اور منظوری آنے میں جتنا وقت لگے گا اس کے بعد کوئی گنجائش تعلیم باقی نہ رہے گی

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس عاملہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس زیر صدارت جناب شیام لال صاحب شرما R.A.S بتاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۸ء شام کو ۵ بجے منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل کارروائی عمل میں آئی۔ (۱) جنرل سکریٹری نے سابقہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی جو منظور کی گئی۔ (۲) باتفاق رائے یہ طے ہوا کہ اردو گھر دہلی کی تعمیر کے سلسلے میں مبلغ دو سو روپیہ ارسال کئے جائیں اور انجمن ترقی اردو ہند کو تحریر کر دیا جائے کہ اس وقت اسلامیہ سکنڈری اسکول جودھپور کی تعمیر کے لئے چندہ فراہم کیا جا رہا ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ اردو گھر دہلی کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ اسکول کے مکمل ہو جانے کے بعد اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ (۳) جنرل سکریٹری نے گذشتہ دنوں سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم جے پور کو بہ امداد انجمن ہذا کی جانب سے مبلغ سو روپیہ ادا کئے تھے اس کی توثیق کی گئی۔ (۴) باتفاق رائے غالب کی صد سالہ برسی کے لئے ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔

(وحید اللہ خاں سکریٹری)

انجمن "اردوئے معلیٰ" کی ادبی نشست

بھوپال۔ سیفیہ کالج کے ایم۔ اے (اردو) کے طلبہ کی انجمن "اردوئے معلیٰ" نے ایک مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ نشست کا آغاز نگراں انجمن، پروفیسر عبد القوی دسنوی صاحب کی تقریر سے ہوا۔ موصوف نے سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا تذکرہ فرمایا۔ ایم اے (اردو) کلاسز کے قیام کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات، ادارہ سیفیہ کالج کی ہمت افزائی اور بالآخر مستحکم بنیادوں پر اس شعبہ کے قیام نیز طلبہ کی غیر معمولی دلچسپی کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر موصوف نے انجمن اردوئے معلیٰ کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ انجمن کی علمی و ادبی نشستوں کے ذریعہ طلبہ کے ذہن کو نکھارنا اور شعور کی راہیں روشن کرنا مقصود ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام منعقد کی جانے والی ادبی نشستوں میں ممتاز دانشوروں، قلمکاروں، مدرسوں اور فنکاروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور وہ مختلف موضوعات پر اظہار خیال فرماتے ہیں موضوعات کے انتخاب میں اس امر کا خصوصاً خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ درسی اعتبار سے بھی طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں۔ بعد ازاں محترم متین الرحمٰن صاحب نے نشست کے مہمان مقرر پروفیسر پرمود بہاری لال یکتا (شعبۂ انگریزی، موتی لال وگیان مہا ودیالیہ بھوپال) کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ اس کے بعد پروفیسر یکتا نے "انگریزی ادب میں رومانی تحریک اور اس کا اردو ادب پر اثر" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ آخر میں نائب صدر انجمن جناب محمد یوسف صاحب نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست میں ایم۔ اے (اردو) کے طلبہ اور اساتذہ نے بھی شرکت فرمائی۔ (متین الرحمٰن)

انجمن فارسی اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج اندور کا جلسہ

اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج کی انجمن فارسی کا افتتاحی جلسہ کالج کی مجلس انتظامیہ کے صدر جناب خورشید حسن خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عتیق حنفی، پروگرام ایگزیکٹو آل انڈیا ریڈیو اندور مہمان خصوصی تھے۔ جلسہ میں عذرا جعفری، نعمان علی معصوم اور محمد طارق نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ مہمان خصوصی جناب عتیق حنفی صاحب نے فارسی زبان کے تاریخی سفر پر عالمانہ بصیرت کے ساتھ پر مغز تقریر فرمائی۔ پروفیسر عادل جعفری صاحب نے شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(سکریٹری)

سیفیہ کالج بھوپال میں آنند نرائن ملا کا بیان

۸ اکتوبر ۶۸ء کو شب میں آنند نرائن ملا سیفیہ کالج (بھوپال) تشریف لائے اور شعبۂ اردو میں تقریباً ۵۴ منٹ تک اردو اور دوسرے موضوعات سے متعلق گفتگو کی۔ جناب عبد القوی دسنوی نے شعبۂ اردو کا تعارف کرایا اور اس کی مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کیں۔ جناب آنند نرائن ملا نے حسب ذیل تحریری تاثرات کا اظہار کیا۔ اس ملک میں مردم شماری کے اعداد و شمار کے اعتبار سے اردو بولنے والوں کی تعداد قریب پونے تین کروڑ افراد کی ہے غالباً بولنے والے اس سے کافی زائد ہیں کیونکہ میرا نام ہندی بولنے والوں میں لکھ دیا گیا تھا اور مجھے وہ اندراج قلم زد کرانا پڑا۔ اتنی تعداد

ہونے کے باوجود وہ ادارے جہاں اردو میں تعلیم دی جاتی ہے انگلیوں پہ گنے جاسکتے ہیں۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ابھی اس ملک میں اردو کے جائز حقوق کس طرح پامال کئے جارہے ہیں۔ شکر ہے کہ سیفیہ کالج ان چند اداروں میں ہے جہاں اردو کی بے لوث خدمت کرنے والے خاموشی کے ساتھ سرگرم کار ہیں۔ آج اردو کے لئے فضا کچھ سازگار معلوم ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر سیفیہ کالج کے ایسے چند اور ادارے اردو کی شمع کو باد مخالف سے محفوظ اور بحال کر لیں گے تو اردو کسی نہ کسی حد تک اپنے جائز حقوق ضرور حاصل کرلے گی میری دعا ہے کہ سیفیہ کالج کی طرح کچھ اور تعلیمی ادارے بھی اردو کی خدمت کرنے کی طرف ایسا قدم اٹھائیں تاکہ یہ محاذ زور پر اور مضبوط ہو اور جلد ہم اردو دوستوں کو کامیابی نصیب ہو۔"

(نامہ نگار)

نظام خطبات کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دعوت

دہلی، سنہ ۱۹۶۹ء کے نظام خطبات دینے کے لئے دہلی یونیورسٹی نے اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دعوت دی ہے۔ رشید صاحب غالب کی شخصیت اور شاعری پر دو لیکچر نظام خطبات کے تحت فروری ۱۹۶۹ء میں دیں گے اس موقع پر دہلی یونیورسٹی میں غالب کا جشن صدسالہ بھی منایا جائے گا۔

(سکریٹری)

دہلی یونیورسٹی میں غالب کی سوویں برسی کی تقریبات کا آغاز

دہلی، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سوسالہ برسی کی تقریبات کا آغاز شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ نے مرزا غالب کی حیات اور ان کے دوست منشی ڈاکٹر محمد حسن کے سہ بابی ڈرامہ "کہرے کا چاند" کی تمثیل خوانی سے کیا۔ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر بی ساین گنگولی وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے کی جلسہ کا آغاز پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو کی تقریر سے ہوا۔

(سکریٹری)

حلقۂ ادب رانچی کی خصوصی نشست

حلقۂ ادب رانچی کی ایک خصوصی نشست اردو کے مشہور و معروف شاعر جناب حسن نعیم کے اعزاز میں مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹر عمران بے صاحب پرنسپل ایچ۔ یونیورسٹی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جناب ابو دو عثمانی صدر حلقۂ ادب نے حسن نعیم صاحب کا حاضرین سے تعارف کرایا اور ان کی ادبی اور شاعرانہ خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ جناب حسن نعیم نے اس موقع پر اپنے مخصوص دھیمے اور پرسوز لہجے میں اپنی کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں جن سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے انھوں نے ضمنًا اپنے ادبی اور شاعرانہ موقف کی بھی وضاحت کی۔ اس نشست میں مقامی شعرا نے بھی شرکت فرمائی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

(مسعود ایم۔ اے سکریٹری)

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یوم سرسید

علی گڑھ ۱۷ راکتوبر ۶۸ء یوم سرسید پر شعبۂ اردو کا ایک خصوصی جلسہ آج جناب فضل الرحمٰن پرو وائس چانسلر کی صدارت میں فیکلٹی آف آرٹس لاونج میں ہوا۔ صدارتی تقریر میں جناب صدر نے سرسید کے علمی، اصلاحی اور قومی کارناموں کا جائزہ لیا موصوف نے کہا کہ سرسید کے بعض نکتہ چیں ان کو بیسویں صدی کے حالات میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ سرسید کو آج کے حالات کے مطابق نہیں پاتے تو ان پر بے سروپا اعتراضات کرتے ہیں۔ دراصل سرسید کو انیسویں صدی کے حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ سرسید نے جس انداز سے ہندوستانیوں کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً اصلاح کا کام شروع کیا اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا، اس کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم ہیں۔ وہ جس سائنسی انداز نظر کو عام کرنا چاہتے تھے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم کو انیسویں صدی ہی کے پس منظر میں ہو سکتا ہے۔

صدر کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر جناب اصغر عباس نے اپنا مقالہ "سرسید کی شخصیت کے چند پہلو گزٹ کے آئینے میں" پڑھا اس مقالہ میں سرسید کی مختلف تحریروں سے ان کی شخصیت کے اہم نقوش کو ابھارا گیا تھا اور خاص طور سے صحافت کے میدان میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا تھا۔

اصغر عباس صاحب کے مقالے کے بعد شعبۂ اردو کے ایک اور ریسرچ اسکالر جناب آفتاب شمسی نے اپنا مقالہ "سرسید کے تعلیمی تصورات تہذیب الاخلاق کی روشنی میں" پڑھا۔ اس مقالے میں آفتاب شمسی صاحب نے سرسید کی اہم تحریروں کے حوالے سے ان کے تعلیمی منصوبے اور مقصد کا تفصیلی جائزہ لیا

آفتاب شمسی کے مقالے کے بعد شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر مسعود حسین خاں نے "سرسید اور اردو ذریعۂ تعلیم" کے موضوع پر تقریر کی تقریر کے ابتدائی حصہ میں موصوف نے ان تاریخی حالات کا جائزہ لیا جس میں سرسید نے اپنے قومی کاموں کا خاص طور سے تعلیمی کاموں کا آغاز کیا پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ اگر ہم سرسید کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے بیشتر تاریخی صداقتوں کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے ایک زمانہ کی رو کا مقابلہ جس پامردی، ہمت اور استقلال سے کیا اس کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سرسید نے اپنے عہد کے مسائل کا بڑا ہی مکمل اور جامع حل تلاش کر لیا تھا۔ لیکن سرسید کی فکر سے ابدی خیالات کا مطالبہ اور آج کے حالات میں ان کی فکر اور ان کے ارشادات پر سو فیصدی عمل خود سرسید کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سرسید کی زندگی کا آغاز ایک مستشرق (ORIENTALIST) کی حیثیت سے ہوا اور ان کا

انجام ایک "یورپین" (EUROPEAN) پر ہوا۔ یعنی شروع میں وہ علوم کی تدریس کے لئے مشرقی زبانوں کو اور خاص طور سے اردو کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کو بدل دیا اور وہ انگریزی کے ذریعہ تعلیم کو ضروری خیال کرنے لگے۔

عہد جہانگیر سے اردو کے ذریعہ فارسی پڑھانے کی مثالیں ملتی ہیں لیکن فارسی ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ اردو، جس میں دکن میں اہم شعراء پیدا ہو چکے تھے، ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال نہیں کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج میں البتہ ایک کوشش ملتی ہے لیکن اس کالج کا مقصد بہت محدود تھا۔ دلی کالج میں پہلی بار اردو کو تمام علوم پڑھانے کے لئے استعمال کیا گیا۔

لارڈ میکالے کے اثر سے ہندوستان میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگی۔ شروع میں سرسید لارڈ میکالے کے خیالات کے خلاف تھے اور ایک ورناکیولر یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں انگلستان کے سفر کے بعد ان کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم آیا اور وہ سرتاسر انگریزی کے ذریعہ تعلیم دینے کے حق میں ہو گئے یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے بیٹے سید محمود، جن کی تعلیم مغربی انداز پر ہوئی تھی، سرسید کے نقطۂ نظر کی اس تبدیلی سے متفق نہ تھے۔ سید محمود کی تعلیمی اسکیم (۱۸۷۳ء) اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے جس میں دو فیکلٹیوں کے قیام پر زور دیا گیا ہے، ایک اردو فیکلٹی اور دوسری انگریزی فیکلٹی۔ کالج میں دونوں فیکلٹیاں شروع کی گئیں لیکن ۱۸۸۰ء تک اردو فیکلٹی میں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہو گئی کہ سرسید کو اس فیکلٹی کو ختم کرنا پڑا۔ فیکلٹی ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے سے سید محمود کو اتفاق نہیں ہے اور وہ اردو فیکلٹی کو جاری رکھنے کے حق میں ہیں لیکن میرے خیال میں اب اس کا جاری رہنا مفید نہ ہوگا۔ یہی نہیں پنجاب یونیورسٹی میں جب اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش شروع ہوئی تو سرسید نے کئی مضامین لکھ کر اس کوشش کی مخالفت کی۔ اور مشرقی طریقہ تعلیم کے نقائص کو واضح کیا سرسید کے نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اس زمانے کے حالات کی پیداوار ہے اور اس کو اسی کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ لیکن یہ بات عام طور سے تسلیم کر لی گئی ہے کہ مادری زبان ہی صحیح ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے اور جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف ایک خصوصی طبقے (ELITE) پر زور نہ رہے بلکہ سارے عوام کی ترقی ہو۔ یہ ترقی صرف مادری زبان کے ذریعہ ممکن ہے مگر چونکہ ہندوستان عبوری دور سے گزر رہا ہے اس لئے ابھی کچھ عرصے تک انگریزی ذریعہ تعلیم رہ سکتی ہے مگر بالآخر مادری زبان کو اس کی جگہ لینی ہے اسی حقیقت کو ذہن میں رکھ کر ہمیں اپنا تعلیمی پروگرام بنانا چاہئے اور لمبی مدت کے لئے پروگرام اور عبوری دور کے لئے پروگرام دونوں کے متعلق واضح ذہن پیدا کرنا چاہئے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی تقریر کے بعد پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ایک مختصر تقریر کی۔ موصوف نے ان اعتراضات پر سخت تنقید کی جو عام طور سے سرسید پر کئے جاتے ہیں۔ شروانی صاحب نے کہا کہ سرسید نے زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح کی جو کوشش کی وہ آج بھی قابل تقلید ہے۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ عثمانیہ ایک طرح سے علی گڑھ کی وارث ہے جو کام علی گڑھ نہ کر سکا وہ جامعہ عثمانیہ نے کیا۔

ہارون خاں شروانی کی تقریر کے بعد خواجہ مسعود علی ذوقی نے سرسید کے ایک مضمون "حکایت نادان خداپرست اور دانا دنیادار" کو اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں پڑھ کر سنایا۔

پروگرام میں پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ "اسلام کے سلسلے میں سرسید کے نقطۂ نظر کی آج کے ہندوستان میں اہمیت" بھی شامل تھا جو وقت کی تنگی کی وجہ سے نہیں پڑھا جا سکا اور بعد میں کسی مناسب موقع پر پڑھا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو شاخ کلکتہ کا جلسہ

کلکتہ انجمن ترقی اردو ہند ضلعی شاخ کلکتہ کی جانب سے پروفیسر کرامت علی صاحب کرامت کے اعزاز میں ایک جلسہ محمد جان ہائر سکنڈری اسکول میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب سالک لکھنوی نے فرمائی۔ پروفیسر کرامت علی نے "نئی شاعری" پر تقریر کی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مصوری کی طرح شاعری نے بھی مختلف ادوار میں مختلف نظریوں کو اپنایا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری پر بین الاقوامی تحریکوں مثلاً اصلیت تاثریت، امیجزم وغیرہ کے اثرات کی نشان دہی کی اور بڑی خوبی سے شاعری کا مطلب اور اس کا ارتقا تاریخی پس منظر کی روشنی میں سمجھایا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ "نئی شاعری" کے مخالف نہیں ہیں۔ اس میں بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے بشرطیکہ شاعر شاعری کے اصل تقاضوں کو پیش نظر رکھے۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد شعراء کرام مہمان خصوصی اور صدر صاحب نے سامعین کو اپنے کلام سے جن میں "نئی شاعری" کے اچھے نمونے بھی شامل تھے محظوظ فرمایا۔

(غلام قادر خاں جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو کلکتہ)

نمائش کلب حیدرآباد میں کل ہند مشاعرہ

حیدرآباد۔ جامعہ عثمانیہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے میں انجمن طیلسانین عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ نمائش کلب میں منعقد ہوا میر مشاعرہ کے فرائض جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اور مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد نے انجام دئے۔ اس محفل شعر میں میر ہاشم، اختر حسن، قاضی سلیم، عزیز قیسی، شہریار، وحید اختر، خلیل الرحمن اعظمی، خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد کے علاوہ علامہ حیرت بدایونی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، سعید شہیدی، انور معظم، حکیم یوسف خاں، صلاح الدین نیر، خلیل، تاج مہجور، [illegible] اور مغنی تبسم نے حصہ لیا۔

(سیاست)

اہل پنجاب، ہریانہ اور اردو گھر — ایک اپیل

پنجابیوں کی زبان اردو نہیں تھی لیکن اکتساب سے وہ اہل زبان بن گئے۔ حالی، آزاد، پیارے لال آشوب، برجموہن دتاتریہ کیفی اور اس کے بعد یگانہ، جگر، اصغر، سیماب، اور ناجور کو ان لوگوں نے بلایا۔ ان کی خدمت اور اردو زبان کی خدمت کی ذریعہ تعلیم اردو ہوئی، عدالتی زبان اردو ہوئی اور لاہور، دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کی طرح اردو کا مرکز بنا۔

برا ہو اس تقسیم ملک کا کہ اب یہی زبان وہاں ختم ہوتی جارہی ہے۔ پھر بھی پنجاب اور ہریانہ میں ابھی لاکھوں آدمی اردو کے شیدائی ہیں۔ ابھی تک ان کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ دلی میں اردو گھر کی تعمیر کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ چنڈی گڑھ، امرتسر، لدھیانہ، جالندھر، انبالہ، پٹیالہ، رہتک، حصار، کرنال، ریواڑی اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صاحب استطاعت بھی ہیں اور صاحب دل بھی۔ وہاں کی صوبائی حکومتیں اگرچہ ہندی پنجابی کی حامی ہیں، اردو کی دشمن نہیں۔ ان کا اور تمام شہریوں کا فرض ہے کہ وہ اس نیک کام میں مالی امداد دیں۔ ایک صوبائی صدر چند دونوں صوبوں میں ہو اور چندہ براہِ راست جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو چیک یا منی آرڈر سے بھیج دیا جائے۔

بہت سے نام میرے ذہن میں ہیں۔ یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو ان سب کو فرداً فرداً لکھوں گا۔

(عرش ملسیانی۔ ماڈل ٹاؤن دہلی)

انجمن ترقی اردو دہلی نے گاندھی جینتی منائی

دہلی: مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ۱۲ر اکتوبر کی شام کو عالی جناب یونس سلیم صاحب کی صدارت میں ایک نشست منعقد ہوئی۔ ہیرالال نلک اور جگن ناتھ آزاد نے گاندھی جی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید الضاری نے "گاندھی جی اور اردو" کے عنوان سے تقریر کی۔ ڈاکٹر سعید الضاری نے فرمایا کہ گاندھی جی نے اردو کو ہندی کی طرح سمجھا۔ حالانکہ عام طور پر اردو والوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ گاندھی جی ہندی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ شمالی ہند کی زبان مشرق کی طرح جنوب میں بھی پہنچ جائے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے دکن بھارتی بنائی۔ تاکہ اردو کو پورے ملک میں سمجھا اور بولا جائے جو زبان وہ بولتے تھے اس کو تقریباً سبھی لوگ سمجھ لیتے تھے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کا خط اس سلسلہ میں پڑھ کر سنایا۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہم گاندھی جی کے عقیدوں سے دن بدن دور ہوتے جارہے ہیں۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ اس ملک کے سب لوگ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال کریں۔ جناب یونس سلیم نے کہا کہ یہ انتہائی بڑا افسوسناک ہے کہ ہماری زبان کے آگے کوئی اور زبان پنپنے نہ پائے اس طریق کار نے ہندوستان بھر میں تعصب کی آندھی چلادی ہے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ گاندھی جی کے جلائے ہوئے امن آشتی کے چراغ کو اس خوفناک آندھی سے بچانے کی کوشش کریں۔ خدا ہم سب کو گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

(جنرل سکریٹری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا

R-N-2/86/56

REGD-NO-L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹

سالانہ قیمت ۵ روپے

فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت

۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۴۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم نومبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر فنڈ

اردو گھر فنڈ کے لیے جو چندہ موصول ہو رہا ہے اس سے ہمیں بڑی تقویت ہوئی ہے۔ درجنوں ایسے اشخاص نے جنھیں ہم جانتے بھی نہ تھے ہماری اپیل پر چندہ بھیجا ہے بہت سے حضرات نے از خود چندہ جمع کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے۔ کئی اسکولوں کے طلبہ نے چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرکے بھیجی ہیں وہ لوگ جو ممتاز اور مشہور ہیں اور جو خدا کے فضل سے بڑی رقمیں دے سکتے ہیں، ابھی نیازمندانہ دیکھ رہے ہیں، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان کو بھی جلد اپنے فرض کا احساس ہوگا۔ ہم پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں چند اشخاص کے بڑے عطیوں کے بجائے بہت سے اشخاص کے چھوٹے چھوٹے چندوں سے زیادہ خوشی ہوگی۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ کم سے کم ایک لاکھ اردو دوستوں کا تعاون اردو گھر کی تعمیر میں ملے یہ ایک لاکھ حضرات اردو کی بقا اور ترقی کے لئے ہمارے پشت پناہ ہوں گے یوں تو ہم حکومت سے اور مالدار حضرات سے بھی اس کارِ خیر میں شرکت کی توقع رکھتے ہیں مگر دراصل ہمارا خطاب عام اردو دوستوں سے ہے کیونکہ ان کی ہمدردی اور تعاون کے سہارے پر ہم بڑی سے بڑی دشواری کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اردو کی ترقی کی راہ میں ہر سنگ گراں کو دور کر سکتے ہیں۔ ہم اردو کے ادیبوں اور شاعروں سے خاص طور سے اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اردو گھر فنڈ میں چندہ دینے کی طرف لوگوں کو مائل کریں۔ مگر ہر کام میں پہل خود کرنا اچھا ہوتا ہے دو چار روپے تو ہر شخص دے سکتا ہے۔ یوں ہی قطرہ قطرہ کرکے دریا ہوتا ہے۔ اردو دوستوں کو اب حکومت یا سرمایہ داروں کی طرف آس لگائے بیٹھے نہیں رہنا چاہئے بلکہ خود جو ہو سکے کرنا چاہئے۔ حکومت اور سرمایہ داروں کی خوبی یا خامی اس معیار پر آئندہ متعین کی جائے گی کہ انھوں نے قومی و تہذیبی کاموں کی از خود کتنی ہمت افزائی کی ہے۔ ابھی تک حکومت نے ہمیں اردو گھر کے لیے کوئی عطیہ نہیں دیا۔ ہم برابر اسے اس کا فرض یاد دلاتے رہیں گے، لیکن اس کی نگاہ لطف کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہرگز نہیں رہیں گے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اردو گھر جلد بن جائے اور اس کے کام اردو دوستوں کی مدد سے اس طرح بڑھیں اور پھلیں پھولیں کہ ہم حکومت سے یہ کہہ سکیں کہ آپ کی امداد کا شکریہ، لیکن ہمیں آپ کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ ریاستی شاخوں نے ابھی تک چندے کی فراہمی کا کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے ابھی تک کچھ افراد ہی اپنے طور پر چندہ کر رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنے فرض کا احساس ہونا چاہئے مرکزی انجمن کی بنیادوں کو مضبوط کرنا، اس کے مالی وسائل کو بڑھانا، اسے اس قابل بنانا کہ وہ تمام ہندوستان میں اردو تحریک کی نگرانی کر سکے اور اردو زبان و ادب کو ترقی کی منزلوں کی طرف لے جا سکے، سبھی اردو دوستوں کا فرض ہے مگر ریاستی شاخوں پر خاص ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ عملی اقدام کا وقت ہے عملی اقدام سے ہی ہم انجمن کو اس قابل بنا سکیں گے کہ وہ اپنے تمام فرائض کو پورا کر سکے۔ اردو دوستوں میں خلوص کی کمی نہیں، ان میں ولولہ بھی ہے، مگر یاروں نے انھیں ہر کام میں دوسروں کی طرف دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اگر وہ اس عادت کو چھوڑ کر اپنے کاموں پر خود توجہ کریں تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔ فی الحال ہمارا سب سے ضروری کام اردو گھر بنانا ہے۔ اس کام کے پیچھے نہ کسی وزیر کی اپیل ہے نہ کسی نیتا کا نام نہ کسی سرمایہ دار کی مہر، نہ کسی افسر کی حمایت یہ اردو دوستوں کا کام ہے جو انجمن کے کارکنوں نے اردو پر اور اردو دوستوں پر اٹل اور غیر متزلزل ایمان رکھنے کی وجہ سے شروع کیا ہے اور انھیں یقین ہے کہ ان کا یہ اعتماد بجا ثابت ہوگا۔ چندے کے حسابات نہایت باقاعدہ رکھے جا رہے ہیں اور ہم سبھی اردو دوستوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اس چندے کی ایک ایک پائی نہایت احتیاط سے اور ذمہ داری کے ساتھ صرف کی جائے گی۔ اردو کے اس تاج محل کی تعمیر میں شرکت کی ہم پھر نہایت فخر و اعتماد سے سب اردو دوستوں اور محبان وطن کو دعوت دیتے ہیں۔ ہم ان تمام اخبار

اور رسالوں کے شکرگزار ہیں جنھوں نے ہماری اپیل شائع کی ہے اور ان سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنے اداریوں کے ذریعہ سے اس اہم کام کی طرف توجہ بھی دلائیں گے۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے صدر کے لئے پروفیسر آل احمد سرور کا انتخاب

علی گڑھ ۲۳ اکتوبر ۶۸ء انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے تنظیمی اجلاس میں پروفیسر آل احمد سرور کو بالاتفاق انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ پروفیسر آل احمد سرور انجمن کے دوسرے صدر ہیں پہلے صدر پروفیسر عبد القادر سروری صدر شعبۂ جموں و کشمیر یونیورسٹی تھے

(نامہ نگار ہماری زبان)

راجستھان کے تعلیمی اداروں میں اردو کی ترقی کی رفتار

۱۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور سے حسب ذیل صاحبان اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ ا۔ محمد علی صاحب زیدی لکچرر شعبۂ اردو راجستھان کالج جے پور۔ ب۔ ابو الفیض عثمانی صاحب لکچرر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج ٹونک۔ ۲۔ اودے پور یونیورسٹی (راجستھان) ثاقب رضوی صاحب لکچرر شعبۂ اردو ایم۔ بی۔ کالج اودے پور اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ ۳۔ نئے تعلیمی سال ۶۹-۱۹۶۸ء سے میرا گرلس کالج اودے پور میں اردو کے لکچرر کی ایک نئی جگہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۴۔ گورنمنٹ کالج ٹونک راجستھان میں پہلی مرتبہ آل راجستھان اردو ڈبیٹ ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو حسب ذیل موضوع پر منعقد کی جا رہی ہے "ادب سیاست سے ہمیشہ دور رہتا ہے" ۵۔ مہارانی گرلز ہائر سکنڈری اسکول جے پور میں اردو سینیر لیڈی ٹیچر کی ایک نئی جگہ کا اضافہ کیا گیا۔ (نامہ نگار)

کلیات شاہ حاتم مرتب ہو گیا

ادبی حلقوں میں اس خبر سے مسرت ہوگی کہ حاتم کا دیوان زادہ مع تمام اردو فارسی نظم و نثر کے ذخیرے کے کلیات حاتم کے عنوان سے اردو کی لائق احترام شخصیت مولانا امتیاز علی عرشی کی حسب ہدایت موصوف کے صاحبزادے اکبر علی خاں عرشی نے ہند و پاک کے ۹ معلومہ نسخوں کی مدد سے مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ شایان اہتمام اشاعت کے ساتھ پیش کرے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ کی اشاعت

یہ خبر ادبی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر جناب شمس الرحمٰن کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "لفظ و معنی" کے نام سے مکتبہ شب خون ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد سے شائع ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ضخامت ۲۴۸ صفحات ہے اور اس کی قیمت ۶ روپے ۵۰ پیسے ہے۔ اس کتاب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصروں کا ایک مجموعہ فاروقی کے تبصرے کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر عبد الستار دلوی کو اعزاز

بمبئی یہ خبر اردو حلقوں میں دلچسپی سے سنی جائے گی کہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اینا جی سماش رود بمبئی ۲ کے سینیر ریسرچ آفیسر ڈاکٹر عبد الستار دلوی کو بمبئی یونیورسٹی نے دوسری ڈاکٹریٹ عطا کی ہے۔ انھیں پہلی ڈاکٹریٹ اسی یونیورسٹی کی طرف سے "محمد آزاد" پر اردو ادب میں ملی تھی اور یہ دوسری ڈاکٹریٹ انھیں ان کے مقالے "بمبئی کی اردو" پر جدید لسانیات پر ملی ہے بمبئی یونیورسٹی سے جدید لسانیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے یہ پہلے طالب علم ہیں انھوں نے اپنا مقالہ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کتری (؟) کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ (نوید کار)

کلیات مصحفی کی اشاعت

مجلس ترقی ادب لاہور نے کلیات مصحفی جلد اول (دیوان اول) مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن استاد شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شائع کی ہے ہندوستان اور پاکستان میں کلیات مصحفی کے جتنے قلمی نسخے دستیاب ہو سکے مرتب نے اس کی مدد سے کلیات مصحفی مرتب کیا ہے۔ اختلاف نسخ حواشی کے طور پر درج کیا گیا ہے نیز نامانوس اور متروک الفاظ کے مطالب بیان کئے ہیں مجلس ترقی ادب مصحفی کے تمام دواوین شائع کر رہی ہے۔ جلد اول اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے مجلس نے اردو کے قدیم سرمایے کو سلیقے سے شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اردو طباعت کی دنیا میں ایک اچھا معیار قائم کیا ہے۔

جاپانی ناول نگار کو نوبل پرائز

اسٹاک ہام۔ جاپان کے ناول نگار یسو ناری کوابانہ کو ۶۸ء کا ادب کا نوبل پرائز دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ موصوف پہلے جاپانی ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے ان کی عمر اس وقت ۶۹ برس ہے۔ (الجمعیۃ)

قمر جلالی کا انتقال

یہ خبر ادبی حلقوں میں غم و اندوہ کے ساتھ سنی جائے گی کہ میر و انیس کے رنگ کلام کی روایت کو برقرار رکھنے والے قادر الکلام شاعر قمر جلالی ۲۴ اکتوبر کو ۹ بجے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ (سیاست)

جاوید نہال

دیوان پروانہ کا ایک نادر خطی نسخہ

اردو ادب کے ستر ویں اور اٹھارویں صدی میں ہندو ادبا و شعرا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، انھوں نے بھی ۱۸ ویں صدی کے شروع سے ہی، مسلم اور عیسائی یورپین ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش اردو کی نوک پلک سنواری۔ ان ہندو ادیبوں اور شاعروں کی فہرست طویل ہے، جو خود اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ گوارا اردو ادب صرف اسلامی ثقافت اور تمدن کا آئینہ دار ہے۔

ہندو ادیبوں اور شاعروں نے اردو کے ننھے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا، پروان چڑھایا، اس پودے کو سرسبز و شاداب درخت کا روپ دیا، ان میں بہت سوں نے شہرت اور ناموری حاصل کی، بہت سے کم مشہور رہے، اور بہت سے تقریباً گمنام ہی دنیا سے اٹھ گئے، مگر ان کی تخلیقات آج بھی زمانہ برد ہونے سے بچی ہیں۔ انہیں تخلیقات میں کنور جسونت سنگھ پروانہ کا دیوان ہے جو ان کی زندگی میں ہی مرتب ہوا تھا، اور آج بھی پروانہ کے دیوان کا ایک نادر نایاب خطی نسخہ کلکتے کے ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

کنور جسونت سنگھ کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا اور لکھنؤ ہی میں ان کے دیوان کا قلمی نسخہ تحریر ہوا تھا، اردو کے تذکروں میں کنور جسونت سنگھ کا حال جستہ جستہ ملتا ہے۔ غفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں کنور جسونت سنگھ پروانہ کا حال اختصار سے لکھا ہے۔

"پروانہ تخلص کنور جسونت سنگھ عرف کاکا جی خلف بینی
بہادر تخلص، شاگرد سرب سنگھ دیوانہ[1]، شعر فارسی بھی کہتے
تھے، ۱۲۲۸ ہجری میں انتقال کیا، نہایت شکیل جوان تھے،
بعض تذکرہ والوں نے جو ان کو میر حسن اور مصحفی کا شاگرد لکھا
ہے، اس پر اعتبار نہیں، دیوان ان کا نظر سے گذرا ہے[1]"

نساخ نے نمونتاً پروانہ کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں:

کیا جانیے ہمدم کہ اسے دیکھ لیا ہم تو — ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا
کہتی ہے عندلیب چمن میں پکار کے — اپنے بھی دن پھریں جو پھریں دن بہار کے

سخن شعرا اور اردو کے دوسرے تذکروں میں پروانہ کے ذکر سے اشارہ پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے کامیاب شاعر تھے۔ اور نام بھی کما چکا تھا

اس بحث سے قطع نظر کہ پروانہ میر حسن کے شاگرد تھے یا مصحفی کے، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پروانہ ایک قادر الکلام شاعر تھے، اور کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی تھی۔ ان کے دیوان خطی نسخے میں غزلوں کے علاوہ رباعی، قطعات، قصیدہ، ترجیع بند اور مخمس بھی ملتے ہیں۔

دیوان پروانہ کا خطی نسخہ جو ہمارے سامنے ہے، چھنن لال لکھنوی کا لکھا ہے۔ اور یہ پروانہ کی زندگی میں ہی نقل مرتب ہوا تھا، جس کی تصدیق نسخہ کے تتمہ سے ہو جاتی ہے:

"تمام شد دیوان پروانہ
سہ شنبہ ہشتم اپریل ۱۸۱۳ء
مطابق دہم ربیع الثانی
۱۲۲۸ ہجری بخط ناقص
چھنن لال کاتب ساکن
لکھنؤ بپیرایہ تمام یافت[2]"

دیوان پروانہ کے خطی نسخہ کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ خالص غزل گو تھے۔ ان کا غم بھی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی غزل کے سانچے میں ڈھل گیا تھا، ایک خالص اور کامیاب غزل گو شاعر کے لئے دل گداختہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پروانہ کے پاس ایسا دل تھا، انھوں نے عیش و نشاط کی رنگین محافل

---

[1] رام بابو سکسینہ نے ہسٹری آف اردو لٹریچر میں تخلص پردانہ لکھا ہے، جو غلط ہے دیکھئے صفحہ انگریزی ایڈیشن۔

[2] دیوان پروانہ اس خطی نسخہ پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے عہدیداروں نے اسے خریدا ہوگا، یا ان پر پروانہ کو صلے میں انعام دیا گیا ہو۔

سعادت نظیر

جامعہ عثمانیہ

جامعہ عثمانیہ ہے علم و فن کا لالہ زار
دعوتِ فکر و نظر ہے اس کی ہر فصلِ بہار
عہدِ عثمانی کی جیتی جاگتی یہ یادگار
منتخب معماروں کے فن کا ہے طرفہ شاہکار
پرکشش ہے دل کشا ہے اور خوش منظر ہے یہ
مشترک ماحول کی تہذیب کا مظہر ہے یہ
اے دکن، تیری زمیں پر جامعہ اک چاند ہے
جس کے آگے آسماں کا چاند گویا ماند ہے
یہ فضائے علم کا اک خوش نما سیارہ ہے
منبعِ اخلاق ہے، کردار کا گہوارہ ہے
دھڑکنیں دل کی چھپی ہیں اس کے ہر سنگ میں
نغمۂ رنگیں جیسے ہو رباب و چنگ میں
یہ وہ بربط ہے جسے کہتے ہیں سازِ آگہی
جاگتا ہے جس کے راگوں سے شعورِ زندگی
جس کے نغموں سے جواں ہوتا ہے احساسِ حیات
صبحِ روشن سے بدل جاتی ہے ہر تاریک رات
یہ جگہ وہ ہے جہاں ہوتا ہے عرفانِ خودی
اور اس دانشکدے میں بڑھتی ہے شانِ خودی
اس فضا کے ذرے ذرے کی یہی آواز ہے
زندگی کی ہر ترقی علم کی غماز ہے

میں زندگی گزاری تھی، اور تو یہ شکن جو ماؤں کی گھنی زلفوں کے سائے میں سانس لی تھی، ان کے خون دجواہیے تھے، یہ سب ہم ان کی غزلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ پروانہ نے بھی رنگین دنیا سے نکل کر اپنے اردگرد پھیلی ہوئی تاریک دنیا کی سیر نہیں کی، انھوں نے بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنی غزلوں میں نہیں سمویا اور نہ ہی غزل کو کوئی نیا اسلوب اور آہنگ عطا کیا۔

دیوان پروانہ کا خطی نسخہ جو بصورت نستعلیق میں تحریر ہوا ہے اس کا ڈیویو نمبر ۲۶ ہے۔ یہ خطی نسخہ حمد خدا، نعت رسول، منقبت علی اور امام مہدی سے شروع ہوتا ہے، امام مہدی کی شان میں منقبت طویل ہے اور اس مطلع سے شروع ہوئی ہے؎

اس قامت رعنا سے صنوبر ہے برابر — روئے عرق افشاں سے گل تر ہے برابر

امام مہدی کی منقبت کے بعد نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کی شان میں کئی طویل قصیدے درج ہیں پہلا قصیدہ شروع ہوتا ہے؎

کس لطف سے بہار کی آمد ہے ایک سال — تختی گلوں کی جواہر کی ہیں مثال
جیسی ہوا ہے خاک نشاپور ہے چمن — ہیں سبزہ زار معدن فیروزہ در خیال

غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے طویل قصائد کے بعد دیوان پروانہ کا خطی نسخہ ردیف وار غزلوں سے شروع ہوتا ہے اس کی پہلی غزل منقول ہے؎

یہ سینہ نہ مخزن ہوگا گر اس بار جاں کا — کمی سے زباں کی نہ کھلے قفل دہاں کا
ہے راستی وہ شے کہ نہیں جس میں مضرت — کب سرو پہ کچھ زور چلا باد خزاں کا
بلبل کو بھی سیر تو ہے جمع چمن ہاں — ہے رنگ دبہار اور اس باغ زماں کا
یہ تاج زر شمع خاموشی کی ہے دولت — جوں گوہر یکدانہ ہے تحفہ زباں کا
پروانہ اے شمع خموشی سے لیا کام — گلشن میں ہے بلبل کو عبث شوق فغاں کا

دیوان پروانہ یہ خطی نسخہ ۱۵۲ اوراق پر مشتمل ہے سب سے آخر میں خاص فرمائش پر لکھی ہوئی پروانہ کی ہجوئیں ہیں۔ دو کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں آخری ہجو درج ہے۔

گو آپ کو سمجھے ہے بہت سا قابل — ہوتا ہے کہاں پردہ ادھورا کامل
ہے مولوی مشہور یہ یوں جیسے کہ نام — لکھے نہ پڑھے کا ہو محمد فاضل

پروانہ کے نام میں انشا اللہ خاں انشا مصحفی اور دوسرے شاعروں کے درمیان شاعرانہ چشمک عروج پر تھی، پروانہ نے بھی اس کا اثر لیا ہوگا اور اگر انھوں نے واقعی مصحفی سے اصلاح لی ہوگی تو یہ ہجوئیں انشا اور مصحفی کے دوسرے حریفوں کے خلاف ہی لکھی ہوں گی اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہوں گے

دیوان پروانہ کے قلمی نسخہ سے ان کی ایک اور غزل اور چند اشعار نمونتاً درج ہیں؎

غزل

داغ دل یوں ہیں اپنے سینے میں — جیسے دینار ہوں دفینے میں
نام تیرا ہی اے عقیق لب — نقش ہے دل کے آبگینے میں
عید کے چاند میں ہلال ابرو — نظر آئے کس مہینے میں
دل میں یوں عکس روئے ساقی ہے — جوں مے سرخ آبگینے میں
ہم نشیں رنج میں کٹی جب عمر — پھر ہے کیا لطف ایسے جینے میں
وہ لب سرخ اور مسی تا ہم — لعل یلم کے ہیں قرینے میں
آگ کو پانی سے کرے پتلا — سرخی اوس رنگ کی پسینے میں

زور پروانہ یہ کہی ہے غزل
اس کو رکھیں گے ہم سفینے میں

پروانہ دل جلا ہے رنج ہجر میں — نہ سیم جاں نہ شمع سحر زر دوں اک میں

پروانہ نے اپنے بیٹے کی لے وقت موت پر شعر کہا ہے، جو تاریخ وفات بھی ہے لیکن اس شعر میں اس کا غم سے جو در دل جول کے آنسو رو رہا ہے؎

غم سے رو رو کے کہے ہے پروانہ
کس نے مرا دیا چراغ گھر کا

۱۲۲۵ ہجری

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تاریخ مصر و عرب قومیت (تلگو کتاب کا اردو ترجمہ)

مصنف ڈاکٹر اے کالیشور راؤ،

ناشر تلگو اردو اکاڈمی آف سائنس اینڈ ہسٹری
حیدرآباد (آندھرا پردیش)

صفحات ۲۹۷

لفظ و معنی

مصنف شمس الرحمٰن فاروقی

ناشر شب خون کتاب گھر ۳۱۳۔ رانی منڈی الہ آباد

قیمت، چھ روپے پچاس پیسے

خواب زار

مصنف حسنی سرور

ملنے کا پتہ: پنجابی پستک بھنڈار۔ دہلی ۶

صفحات: ۸۰ قیمت: ایک روپیہ

شبستاں (مجموعۂ کلام)

مصنف: منیر رشیدی

ملنے کا پتہ۔ پنجابی پستک بھنڈار دہلی ۶

صفحات: ۸۰

قیمت۔ ایک روپیہ

وحید اختر

رفتار

(پہلی قسط)

ادب کی دنیا میں ہمیشہ سے یہ سوال اہم رہا ہے کہ روایت اور تجربے کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ یہ سوال خاص طور پر ایسے دور میں زیادہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے جب ادب میں جدید تقاضوں کے تحت روایت سے انحراف کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ہمارے یہاں روایت کی اہمیت اور اس کے تسلسل کے سوال کو آزادی کے بعد سے خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ ادب کی وہ مقصدی اور اصلاحی روایت جس کا آغاز اردو میں سرسید تحریک اور حالی کی تنقید کے ساتھ ہوا تھا اور جسے ترقی پسند تحریک نے اپنی انتہا تک پہنچا دیا تھا، اچانک ادب کے جدید رجحانات کی یورش میں ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی۔ دوسرے برصغیر کے دونوں ممالک نے اپنی پرانی تہذیبی روایت سے از سرِ نو ناتا جوڑنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جس کے نتیجے کے طور پر وہ تمام مذہبی احیا کی تحریکیں، جنھیں سیاسی لیڈروں نے، حصولِ آزادی کے مقصد میں عوام کو شامل کرنے کے لئے گوارا کیا اور بڑھاوا دیا تھا اس مقصد کی تکمیل کے بعد اپنے خالص مذہبی رنگ میں سامنے آ گئیں۔ آزادی کے بعد مذہبی احیا پرستی، قدامت اور تنگ نظری کو جو فروغ ہوا اور اس کے ساتھ مختلف قسم کے تعصبات اور فرقہ واریت کا زہر سماج میں جس تیزی سے پھیلتا گیا وہ تہذیبی روایت کو غلط طریقے سے سمجھنے اور اس غلط طریقے سے سمجھی ہوئی روایت کو دوبارہ زندہ اور مستحکم کرنے کی کوشش کا فطری نتیجہ تھا۔ تہذیبی روایت کی تلاش کا کام پاکستان میں یوں دشوار تر ہو گیا کہ سیاسی تقسیم کے باوجود پاکستان اسی تہذیبی اکائی کا جز رہا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ میراث ہے۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کا جداگانہ مملکت کی حیثیت سے قیام و استحکام نسبتاً آسان تھا لیکن پاکستانی تہذیب کو برصغیر کی مشترکہ تہذیب سے منقطع کر کے کسی جداگانہ تہذیبی روایت سے اس کا رشتہ جوڑنا زیادہ مشکل تھا چنانچہ تقسیم کے بعد پاکستانی دانشوروں کے لئے پاکستانی کلچر کا مسئلہ اور اس کی روایت کی تلاش کا کام اتنا مشکل ثابت ہوا کہ اب تک وہ ایسی متضاد سمتوں میں تلاش کے عمل میں بھٹکتے رہے اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا۔ ایک رجحان تو وہ ہے، جو پاکستانی کلچر کا سلسلہ ہڑپا اور موہنجوداڑو کی ماقبل آریائی تہذیب اور پھر بدھ مت کے قدیم مراکز سے جوڑتا ہے اور جسے ہندو دیومالا کی علامات اپنے اجتماعی لاشعور کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس رجحان کا اثر جدید پاکستانی ادب اور شاعری پر بھی خاصا گہرا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ہندو روایات اور قدیم ہندوستانی روایات کو نظم و غزل میں جس شدت اور کثرت کے ساتھ جدید پاکستانی شعراء نے برتا ہے ہندوستانی شعراء نے ان سے اپنا رشتہ جوڑنے کی اتنی شدید ضرورت محسوس نہیں کی، اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو تہذیبی تسلسل سے منقطع کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، جو قدیم روایات کی بازیافت کی اتنی شدید ضرورت محسوس ہوتی۔ وہاں سیاسی مصلحتوں نے ہزاروں برس کے تہذیبی تسلسل

امجد علی غزنوی

غزل

سراپا عمل جس کو ہم دیکھتے ہیں
فلک پر انھیں کے قدم دیکھتے ہیں

رہِ عشق میں کیا یہ کم دیکھتے ہیں
ہر اک دن سحر شامِ غم دیکھتے ہیں

جو ذوقِ عمل دل میں ہم دیکھتے ہیں
تو مٹھی میں لوح و قلم دیکھتے ہیں

نگاہوں میں جن کی ہے تصویرِ منزل
وہ کب راہ کے پیچ و خم دیکھتے ہیں

گلوں کے دلوں میں ہے گرد کدورت
نئی بات گلشن میں ہم دیکھتے ہیں

یہ کیا بات ہے جو درِ میکدہ پر
ہم آغوشِ دیر و حرم دیکھتے ہیں

وہیں روک لیتے ہیں ہم اپنی کشتی
جہاں موج دگر داسلم دیکھتے ہیں

نمایاں ہے منزل مگر اپنی منزل
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

مئے عشق پی پی کے سرشار ہیں جو
وہ کم بولتے ہیں وہ کم دیکھتے ہیں

وہ اپنے نہیں ہیں تم اپنے نہ سمجھو
جو غیروں کے نقشِ قدم دیکھتے ہیں

نہ گھبراؤ طوفاں میں گھرنے سے کشتی
چلو چل کے کشتی کو ہم دیکھتے ہیں

جہاں جامِ دل ٹوٹ جاتا ہے امجد
وہیں سیکڑوں جامِ جم دیکھتے ہیں

سے انکار کر کے اپنا رشتہ بالکل جداگانہ روایات سے جوڑنا چاہتا تھا، اس لئے ان شاعروں کو جو تہذیبی روایت کے تسلسل کے رمز آشنا تھے اس قدیم روایت سے اپنا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی جسے سیاسی تقسیم نے غیر فطری طور پر توڑنا چاہا تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا رجحان وہ ہے جو محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد سے قبل کی پوری ہندوستانی روایت سے اپنا رشتہ توڑ کر صرف ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ سے اپنا سلسلہ جوڑتا اور مذہبی عقیدے کی بنیاد پر پاکستانی کلچر کو مشرقِ وسطیٰ کی تہذیبی روایت کا سلسلہ سمجھتا ہے۔ تہذیبی روایت تاریخ کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے سوت کا دھاگا نہیں کہ اسے درمیان سے توڑ کر کسی اور دھاگے سے گرہ لگا کر جوڑ دیا جائے۔ اسی مصنوعی کوشش کا ایک حصہ وہ نظریہ ہے جو ادبی روایت کو اپنے ہندوستانی ماضی سے منقطع کر کے خالص دینی بنیادوں پر قائم دیکھنا چاہتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ ادیبوں نے جن میں حسن عسکری، ممتاز شیریں اور صمد شاہین پیش پیش تھے۔ پاکستانی ادب کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں محمد حسن عسکری کو نظریہ ساز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ تحریک ادب میں زیادہ دور تک نہ چل سکی، لیکن ۱۹۶۵ کی ہند پاک لڑائی نے اس رجحان کو تقویت دی اور بہت سے نئے افسانہ نگار، نقاد اور شاعر تہذیبی علیحدگی پسندی کے ہنگامی طور پر شکار ہو گئے۔ حسن عسکری تو اب ادبی روایت کو خالص دینی روایت ماننے لگے ہیں اور کئی برس سے اس نقطۂ نظر کی تبلیغ کر رہے ہیں لیکن انتظار حسین جیسے حضرات نے نہ صرف اسلامی روایات بلکہ ہندوستانی اساطیر اور داستانوں کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے برتا تھا، یہ بھول گئے کہ وہ جس تہذیبی روایت کی بازیافت چاہتے ہیں اس کا سلسلہ عرب و عجم کی اسلامی روایت سے اتنا نہیں جتنا برصغیر ہند و پاک کی مشترکہ تہذیب سے ہے محرم، عزاداری، ذوالجناح اور بہت سی رسمیں ہندوستانی مسلم تہذیب سے وابستہ ہیں ان کا رشتہ اس مذہبی روایت سے ہے جو ہندوستان میں پروان چڑھی۔ مذہبی روایت کو بھی ان ملکوں کے کلچر سے الگ کرنا مشکل ہے جن کے اثر سے وہ ہر جگہ نئی شکلیں اختیار کرتی ہے۔

محمد حسن عسکری کا ایک مضمون "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" شب خون (۲۹) اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے یہی مضمون کچھ اختصار کے ساتھ اس سے قبل کسی پاکستانی رسالے میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ اس مضمون کا بنیادی خیال یہ ہے کہ شبلی، حالی، اور دوسرے ناقدین نے اردو کی ادبی روایت کو سمجھا ہی نہیں یہ حضرات مغرب سے اس قدر مرعوب ہو گئے کہ انھوں نے اپنی بنیادی روایت کو نظرانداز کر دیا، اور وہ روایت "دینی" ہے جسے عسکری صاحب اردو کی ادبی روایت قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں کئی سخن گسترانہ باتیں آ گئی ہیں، جن کا اجمالی خاکہ یہ ہے:۔

(۱) مغربی دانشور تہذیب کو بجائے خود اور فی نفسہٖ قابل قدر سمجھتے ہیں اور اس سے آگے یا اوپر انھیں کوئی چیز نظر نہیں آتی (آگے یا اوپر کی وہ چیز جسے عسکری صاحب تہذیب سے ماورا اور بنیادی چیز سمجھتے ہیں دینی روایت ہے)

(۲) مغرب میں مرکزی اور بنیادی روایت کا تصور ہی تقریباً مفقود ہے۔ اگر کسی کو مرکزی روایت کا خیال آیا بھی تو وہ معاشرتی روایت کو یہ حیثیت دیتا ہے اور دینی روایت کو معاشرتی روایت کا جزو بتاتا ہے۔ اس معاشرتی روایت کا نام مغربی لوگوں نے کلچر رکھا ہے (یعنی مذہب کلچر سے ماورا ہے اور یہ کہ کلچر مذہب کا جزو ہے، مذہب کلچر کا جز نہیں)

(۳) عسکری صاحب کے نزدیک روایت کا انحصار آسمانی کتاب پر ہونا ضروری ہے۔ اس طرح وہ روایات اور اقدار کی تشکیل میں انسانی تجربے اور عمل کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نقل کو عقل اور تجربے پر فوقیت حاصل ہے۔

(۴) عسکری صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ ادب اور فن کو انسانی جذبے، جبلت یا انفرادی اور اجتماعی لاشعور کا ذریعہ اظہار مانا جائے۔ ان کے نزدیک عمرانیات، نفسیات اور حیاتیات میں ادب کو برقرار رکھنے کا کوئی لازمی جواز نہیں ملتا۔

(۵) عسکری صاحب کو شعر و ادب کی فلسفیانہ توجیہات بھی قبول نہیں اور وہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ معترض ہیں ارسطو اور افلاطون پر اس لئے کہ یونانیوں کے نزدیک سب سے بڑا علم وجود کا علم (ONTOLOGY) ہے۔ اور وہ شیخ مجدد سے الفاظ مستعار لے کر یہ حکم صادر فرماتے ہیں کہ "یونانی فلسفیوں سے زیادہ احمق کوئی اور طبقہ نہیں۔ مابعد الطبیعیات ضلالت ہے"

(۶) اس نکتے کے بعد وہ وجود کے اثبات اور وجوب کو ذاتِ باری کے ضمن میں شیخ مجدد کے حوالے سے ہی زیر بحث لا کر یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ "اسلامی شاعری کا فریضہ ہے کہ اس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی بساط بھر انسان کی مدد کرے۔" اس موقع پر عسکری صاحب یہ بھول جاتے ہیں کہ ذاتِ باری سے بحث کرتے ہوئے وہ مابعد الطبیعیات ہی کی وہ تمام اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں۔ جن کا مذہب سے نہیں بلکہ فلسفے سے واسطہ ہے اور وہ اپنی بات کے لئے "مابعد الطبیعیات کی ضلالت" میں ہی جواز ڈھونڈ رہے ہیں۔

(۷) عسکری صاحب کو اس بات پر بھی اعتراض ہے مغرب میں مذہب کے زوال کے بعد پروٹسٹنٹ لوگوں نے مذہب

کی بنیادی دو چیزوں یعنی عقائد و عبادات کو بھلا کر محض اخلاقی تربیت ہی کو مذہب کی اصل سمجھ لیا۔ ان کے نزدیک DOGMA کو گالی نہیں بلکہ خوبی کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ یہاں وہ ذہنی طور پر علم الکلام کے "ارباب نقل" سے بھی صدیوں پیچھے نظر آتے ہیں۔

عسکری صاحب ان نکات کی مدد سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ مغرب کے انہی غلط نظریوں اور گمراہیوں سے متاثر ہو کر حالی، شبلی اور بعد کے اردو نقادوں نے ادب اور ادبی روایت کو سمجھنے کی کوشش کی اسی لئے وہ گمراہ ہوئے۔ اس سلسلے میں "نقوش" کے شمارہ ۱۰۲ میں "بے تکلف گفتگو" کے زیر عنوان انھوں نے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو پچھلے سو سال سے ادیب سمجھا گیا ہے، انھیں اردو شاعری کی پوری حقیقت خود ہی معلوم نہیں۔ ان خطاکاروں میں سرِ فہرست شبلی اور حالی ہی آتے ہیں۔

ان تمام منطقی مغالطوں کی بنیاد پر عسکری نے جو نتیجے نکالے ہیں وہ خود ادبی مغالطے کی عبرت انگیز مثالیں فراہم کرتے ہیں ان کے نزدیک "مولانا اشرف علی تھانوی کی شرح حافظ اور شرح مثنوی مولانا روم سے شاعری کی پوری تعلیم اخذ کی جا سکتی ہے۔ اور حضرت تھانوی کے مواعظ میں، ملفوظات میں اور دوسری تحریروں میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں جو درحقیقت پوری کتاب ہیں۔ جو لوگ ادبی نقاد سمجھے جاتے ہیں ان کی لمبی چوڑی تحریروں میں اردو شاعری کے متعلق ایسے حقائق ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے۔"

اس طرز بحث کا منطقی نتیجہ وہی ہے جس تک عسکری اپنے مضمون میں پہنچے ہیں کہ ذوق کو اردو کی اصلی ادبی روایت کا غالب کے مقابلے میں زیادہ عرفان تھا۔ لہٰذا ذوق غالب سے بڑے شاعر ہوئے اور مومن، داغ اور امیر مینائی کی فاسقانہ شاعری دراصل "دینی روایت" ہی کی توسیع ہے۔

یہ عسکری صاحب جو آج اردو ادب کو "مشرف بہ اسلام" کرنے پر کمربستہ ہیں، خود فرانسیسی ادب کے بڑے پُرجوش مبلغ رہ چکے ہیں، اور جدید ادب کو فرانسیسی ادب ہی کا فیضان سمجھتے رہے ہیں اب جبکہ وہ فرانسیسی ہی نہیں بلکہ پورے مغربی ادب سے اتنے برگشتہ خاطر ہوئے کہ "موجودہ مغربی ادب سے (انھیں) اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا آدمی کو سڑک کے غل غپاڑے سے ہوتا ہے۔" تب بھی وہ اسلام کی دینی روایت کو ایک فرانسیسی مفکر رینے گوں ہی کے توسط سے سمجھنے پر مصر ہیں۔ انھوں نے بودلیر اور ملارمے کا حلقۂ بیعت توڑ کر رینے گوں کے ہاتھوں پر بیعت کی بھی تو اس ادعا کے ساتھ کہ "بیسویں صدی کے نقشے میں رینے گوں کی دو کتابوں کو ایٹم بم اور آئن اسٹائن کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔" رینے گوں کی کتابوں کو اس حد تک مبالغہ آمیز اہمیت دینا ویسا ہی بے معنی ہے جیسا بجنوری کا یہ قول کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں وید مقدس اور دیوان غالب جس طرح وید مقدس اور دیوان غالب میں کوئی قدر مشترک نہیں اسی طرح آئن اسٹائن اور ایٹم بم کے ساتھ رینے گوں کی تحریروں کا کوئی ربط نہیں لیکن عسکری صاحب توانائی ذہانت مطالعے اور جاندار اسلوب کو سنسنی خیزی ہی کے لئے وقف کرنے کے عادی ہو چکے ہیں انھیں چونکا دینے والی بات کہنا ہے مطلب چاہے کچھ بھی نکلے۔

دین کا پورا احترام کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تقدس مآب شخصیتوں کا دین کے دائرے میں پورا ادب و لحاظ کرنے کے باوجود کوئی باشعور آدمی دینی روایت ہی کو ادبی روایت ماننے میں تامل کرے گا اس لئے کہ اردو ادب و شعر کی بنیادی روایت سیکولر رہی ہے۔ اور یہ حقیقت کہ صوفیا کی ادبی روایت تک نے سیکولر روایت ہی کو مضبوط کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں عبدالمغنی کے ایک مضمون (مطبوعہ نقوش) کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ بھی ادب میں دینی روایات کی پاسداری پر زور دیتے ہیں مگر انھیں بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ اردو کی پوری شاعری تھی کہ اقبال تک کا رویہ دین کے ساتھ مخلصانہ اور ہمدردانہ نہیں۔ عبدالمغنی صاحب کے نقطۂ نظر سے بھی مجھے سخت اختلاف ہے لیکن ان کی بات میں عسکری سے زیادہ صداقت ہے اس لئے کہ وہ دینی روایت کا اتنا شعور ضرور رکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو کی ادبی روایت کو دینی روایت سے مختلف سمجھا۔

میں اگلی صحبت میں عسکری کے پیش کئے ہوئے نکات سے تفصیلی بحث کروں گا۔ فی الوقت اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ مذہب اور ادب کو غلط طریقے سے سمجھنے اور ملا دینے سے جو مغالطے ہوتے ہیں وہ اتنے ہی گمراہ کن ہیں جتنا ادب کو سیاست یا کسی سماجی نظریے کا تابع قرار دینے سے گمراہ کن نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر دینی روایت کی تفسیر و تشریح خود صراط کے پل پر چلنے کے برابر نازک کام ہے اور اس سلسلے میں عسکری صاحب نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور وہ ایمان کی سلامتی کے ساتھ یہ پل پار کرتے نظر نہیں آتے ادبی روایت کو دینی روایت قرار دینے میں یہ خطرہ ہے کہ ادب تو ہاتھ سے جائے گا ہی دین کے ساتھ بھی انصاف نہ ہو سکے گا۔ ادب اور مذہب کے دائرے اسی طرح الگ الگ ہیں جیسے ادب اور سیاست کے دائرے علیحدہ ہیں ادب کو ادب کے حدود میں سمجھا چاہئے۔ اور دین کو دین کے حدود میں۔

-x-x-

ہونے کے باوجود دراصل طبقاتی بلندی کا احساس رکھتے ہیں۔ اردو ذریعہ تعلیم کے امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اب یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ ملک کی ترقی اپنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے خطبہ کے بعد پروفیسر رئیس احمد صدر شعبۂ طبعیات مسلم یونیورسٹی نے اپنے مقالے میں ان مشکلات کی طرف اشارہ کیا جو سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں پیش آسکتے ہیں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ابھی اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا سودمند نہ ہوگا۔ پروفیسر رئیس کے مقالہ کے بعد انجمن کے معتمد ڈاکٹر عبدالودود نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کو ملک کی ایک ضرورت قرار دیتے ہوئے ایک ایسے مرکز کے قیام پر زور دیا جو اردو یونیورسٹی کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ موصوف کے مقالہ کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے موضوع پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا عملاً اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آسکے گا انھوں نے ان دشواریوں کا ذکر کیا جو اردو کو اعلیٰ ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلہ میں پیش آسکتی ہیں محمد احمد رضوی پرنسپل حلیم کالج کانپور نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اب جبکہ دوسری زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جا رہا ہے یہ نہایت ضروری ہے کہ اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا جائے انھوں نے سائنسی علوم کے ترجمہ کے لئے اساتذہ کی ایک کمیٹی بنانے پر زور دیا۔ رضوان حسین لکچرر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی نے اردو ذریعہ تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ مسئلہ کی نوعیت اب یہ ہے کہ اس کام کی شروعات ہو جانی چاہیے اور چند مخصوص اداروں میں اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے جلد سے جلد استعمال کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ترجموں کی پیدائش کا انتظار نہ کرنا چاہیے فرخ جلالی اسسٹنٹ لائبریرین آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ سائنس میں ترجمہ کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا معلومات کا اندوختہ۔ ڈاکٹر تبسم حقی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں سائنسی علوم پڑھائے جاسکیں جامعہ ملیہ کے استاد معین الدین نے اردو اساتذہ کی تربیت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تربیت یافتہ استاد کی اہمیت واضح کی گجرات یونیورسٹی کے نمائندہ وارث حسین علوی نے گجراتی علاقہ میں اردو ذریعہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا مشکل ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کہا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے یا اردو کو اب یہ طے ہوچکا ہے کہ ذریعہ تعلیم اب مادری زبان ہوگی اور جب ہندوستان کی دوسری زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا تو ہمارا موقف کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں جو دشواریاں پیش آئیں گی ان کے لئے مناسب راستے تلاش کرنے ہوں گے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے سے ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انگریزی کو نظر انداز کردیا جائے۔ یا جدید تر علمی تحقیقات اور سائنسی ایجادات سے قطع تعلق کرلیا جائے موصوف نے کہا کہ انگریزی کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے اور اب یہاں کی علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت کا احساس ہوتا جارہا ہے اور جب علاقائی زبانیں ذریعہ تعلیم ہوں گی تو مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس سے ہمارے درمیان انتشار پیدا ہوگا کیونکہ ہماری زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہے اور ہمارا کام سارے ملک میں ہے انھوں نے کہا کہ ان جگہوں پر جہاں اردو علاقائی زبان نہیں ہے وہاں کی علاقائی زبان اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں میں لازمی طور پر پڑھائی جائے اور کافی تعداد میں ایسے اسکول ہوں جس میں علاقائی زبان کے اچھے معیار پر اصرار ہو انھوں نے زبان دخیال کے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکے اور پھر اردو کو پچھلے تجربوں کے اعتبار سے اہمیت حاصل ہے اس لئے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ ہر سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جاسکتا ہے ضرورت صرف اعلیٰ تنظیم کی ہے سرور صاحب کی تقریر کے بعد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے کہا کہ آج کے دور میں جبکہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اساسی اہمیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے عملی اقدام کریں اس سلسلہ میں میری نظر میں جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کی جانب اٹھتی ہیں۔ عبدالغفار صاحب شکیل لکچرر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی نے ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ وکٹوریہ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر رضی الدین احمد نے اردو یونیورسٹی کے قیام میں جو کوتاہی ہو رہی ہے اسے ہماری کمی پر محمول کیا اور کہا کہ اردو یونیورسٹی کا قیام ہمارا بنیادی حق ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی آخر میں صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلہ میں جو سراسیمگی ہے اسے ہمیں خیر باد کہہ دینا چاہیے ضرورت اس کی ہے کہ ہم استقلال و عزم کے ساتھ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کوشاں ہوں

دوسرا اجلاس

کانفرنس کا دوسرا جلسہ ۲۰ / اکتوبر کو چھ بجے شام پروفیسر اختر اورینوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس جلسہ کا موضوع بحث "اردو اساتذہ کے مسائل" تھا پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اردو اساتذہ کے مسائل مرکب در مرکب ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل پر ملک کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے غور ہو کیونکہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوتا ہو اس لئے اردو اساتذہ کے مسائل کو دوسرے مضامین کے اساتذہ کے مسائل سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا انھوں نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو اردو اساتذہ کو پیش آتی رہتی ہیں اور کہا کہ ہمارے سماج میں اساتذہ کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کے وہ مستحق ہیں اس کی وجہ سماج کی اعلیٰ اقدار حیات سے بے بیزاری ہے۔ اردو کے اساتذہ

کے فرائض اس اعتبار سے اور زیادہ ہیں انھیں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا چاہئے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اساتذہ کی انجمن کی جانب سے ایک ایسی کمیٹی کے قیام پر زور دیا جو مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں ہم آہنگی اور رابطہ پیدا کرنے کا کام کرے۔ پروفیسر اختر اورینوی کے خطبہ کے بعد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے معلمین اردو کے مسائل پر ایک مقالہ پڑھا جس میں معلمین کے موجودہ مسائل کا جائزہ لیا گیا تھا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو اساتذہ کے گرتے ہوئے معیار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ زبان و ادب کی تعلیم کو زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اردو کے اساتذہ کو اپنے گرد و پیش کی زندگی سے پوری طرح باخبر رہنا چاہئے۔ ڈاکٹر اعظمی کے مقالے کے بعد مگدھ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں اردو اساتذہ کی ناقدری اور طلبہ کے پست معیار پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد پروفیسر گیان چند جین نے اپنے مقالے میں اردو اساتذہ کے مسائل پر ادبی انداز میں روشنی ڈالی موصوف نے ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کا ذکر کیا جو اردو اساتذہ میں پائی جاتی ہیں۔ رانچی یونیورسٹی کے نمائندہ ابوذر عثمانی نے کہا کہ اردو کے استادوں کو جدید و قدیم ادب پر نگاہ رکھنی چاہئے انھوں نے غیر اردو علاقوں میں اردو استادوں کو جو مسائل پیش آتے ہیں ان کی نشاندہی کی راجستھان یونیورسٹی کے نمائندہ ابو الفیض عثمانی نے کہا کہ اردو اساتذہ کی اس انجمن کو اپنا دائرہ کار یونیورسٹی کے استادوں تک محدود نہ رکھنا چاہئے۔ بلکہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے استادوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ ونکٹیشور یونیورسٹی کے نمائندہ ڈاکٹر رضی الدین احمد نے کہا کہ اردو استادوں کو تحقیق و تنقید و تخلیق سب کا احترام کرنا چاہئے اور افراط و تفریط سے احتراز کرنا چاہئے ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا کہ ادب کی تعلیم کا مقصد زندگی کا عرفان ہونا چاہئے انھوں نے کہا کہ ہم ادب کو تنقیدی اصطلاحات کے ذریعہ سمجھتے ہیں یہ رویہ اگر بدل دیا جائے تو بہتر ہو۔ وارث حسین علوی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو کے استادوں کو اپنا مطالعہ وسیع کرنا چاہئے اسی سے ہم دوسرے علاقوں کے طلبہ کو اردو کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے کہا کہ اردو کے اساتذہ میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اپنی خامیوں کی سمت بھی اشارہ کر سکتے ہیں آج ہماری سوسائٹی میں جو انتشار ہے اسے استاد ہی دور کر سکتا ہے ضرورت اس کی ہے کہ اردو کا استاد اپنے پیشہ سے وفاداری کو اپنا نصب العین بنائے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر اختر اورینوی نے تمام مباحث پر مجموعی تبصرہ کیا اور کہا کہ اردو اساتذہ کو اپنے منصب کو پہچاننا چاہئے اور کسی قسم کے احساس کمتری کے بغیر زبان و ادب کی تعلیم دینا چاہئے اور اعلیٰ تعلیمی معیاروں کا خیال رکھنا چاہئے۔

تیسرا اجلاس

کانفرنس کا تیسرا جلسہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی صدارت میں ۱۲؍ اکتوبر کو ساڑھے نو بجے صبح شروع ہوا۔ جلسہ میں موضوع بحث نصاب کے مسائل تھا۔ سب سے پہلے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا جس میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ان حالات کا جائزہ لیا جو اردو زبان و ادب کو پیش آئے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ یونیورسٹیوں کے اردو طلبہ کے لئے نصاب بنانے کے لئے ایک مرکزی ادارہ کا قیام ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج جبکہ ہمارے زمین و آسمان بدل گئے اردو نصاب کا پرانی ڈگر پر چلنا مناسب نہیں ہے اس لئے نصاب کی تیاری میں ہمیں زندہ روایتوں اور تہذیب کی روشن اقدار کو سامنے رکھنا ہوگا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے خطبہ کے بعد مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے مندوب شمیم احمد نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ نصاب ایسا تیار ہونا چاہئے جس سے طلبہ میں ذوق ادب اور جمالیاتی احساس بیدار ہو۔ پٹنہ یونیورسٹی کی نمائندہ نسرین پروین نے اپنے مقالہ میں کہا کہ پٹنہ میں پری یونیورسٹی کا اردو نصاب بی۔ اے کے نصاب سے مشکل ہے اس طرح کی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسے بورڈ کی تشکیل ہو جو نصاب کی دشواریوں کو ختم کر دے۔ اندور کالج کے استاد ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے مقالے میں کہا کہ قدیم نظام تعلیم میں استاد کے شخصی فیضان سے شاگرد بہت کچھ سیکھتا تھا آج ایسے حالات نہیں رہے موصوف نے یونیورسٹیوں میں یکساں معیار نصاب پر زور دیا اور ایک عربی فارسی لغت کی تیاری کی ضرورت واضح کی۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے بعد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالے کے خاص خاص اجزا پڑھ کر سنائے اس کے بعد پروفیسر عبد العلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے نصاب کے مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل ہماری زبان و ادب کے نصاب کا مسئلہ ہے جب غیر زبانوں کے ادب کا نصاب تیار کیا جائے گا تو اس کی نوعیت علیحدہ ہوگی۔ لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوا اور انگریزی ادب کے نصابی خطوط پر ہماری زبان و ادب کا نصاب تیار کیا گیا انگریزی ادب اور ہمارے ادب کے نصاب کے نہج میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے لیکن ہوا یہ کہ ہم نے اپنے ادب کے نصاب کو مختلف اصناف کی کھتونی بنا دیا۔ اسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم ادب کی تعلیم دیتے ہیں تو ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہم طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کریں۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ابتدائی درجات میں طلبہ کو قواعد و انشا سے واقف کرا دیا جائے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں ادب کی تاریخی ترتیب یا ہر صنف کی نمائندگی پر زور کے بجائے طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہئے اور اسی نقطۂ نظر کو نصاب کی ترتیب و انتخاب میں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ پروفیسر عبد العلیم نے یہ تجویز

پیش کی کہ یونیورسٹیوں میں ملک کے مقتدر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کو مدعو کرنا چاہئے تاکہ وہ کچھ دنوں یونیورسٹیوں میں قیام کریں اور اس طرح طلبہ کے ذوق کی تربیت ہو۔ پروفیسر عبدالعلیم کی تقریر کے بعد گجرات یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر حسین علوی نے کہا کہ نصاب ایسا تیار ہونا چاہئے جس سے طلبہ میں ادبی ذوق کا فروغ ہو راجی یونیورسٹی کے استاد ابوذر عثمانی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے نصاب میں مختلف علاقوں کے ادب کا انتخاب بھی شامل ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر رفیق حسین نے نصاب کی تیاری کے لئے انجمن کی ایک مرکزی کمیٹی کے قیام کو اشد ضروری بتایا راجستھان یونیورسٹی کے نمائندہ محمد علی زیدی نے کہا کہ نصاب کی تیاری میں اس علاقہ کے ادبی کارناموں کا انتخاب بھی شامل ہونا چاہئے۔ ابو الفیض عثمانی نے کہا کہ نصاب میں سائنسی مضامین کی شمولیت بھی ضروری ہے تاکہ طلبہ سائنسی اصطلاحات سے واقف ہو سکیں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات کے استاد قیصر زیدی نے کہا کہ تعلیمی نظام میں استاد کی بنیادی اہمیت ہے استاد کو طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنا چاہئے اس سلسلہ میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں ربط پیدا ہونا چاہئے پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات نے اپنی تقریر میں کہا کہ بی اے کے نصاب سے ایم اے کا نصاب مربوط ہونا چاہئے نصاب میں تاریخی افکار اور مغربی ادبیات کی شمولیت بھی ضروری ہے اور ہمیں معاصر ادب کو نصاب میں شامل کرنے کے سلسلے میں تھوڑا سا رواتی ہونا پڑے گا نیز قدیم دکنی ادب کے انتخاب میں ہمیں محتاط رویہ اختیار کرنا ہوگا اردو ادبیات کے نصاب میں تاریخ ادب ہندی و فارسی بھی شامل کرنا چاہئے انھوں نے کہا کہ قدیم ادب کو ایم اے کے آخری سال میں اور جدید ادب کو ایم۔ اے کے پہلے سال میں شامل کرنا چاہئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ ادبیات کے ایم۔ اے میں لسانیات کا جو پرچہ رکھا جاتا ہے وہ غیر ضروری ہے صرف اردو زبان کے ارتقاء اور اس سے متعلق مختلف نظریات کی تعلیم کافی ہے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کہا کہ نصاب کے سلسلہ میں جو لوگ اپنے خیالات پیش نہ کر سکے وہ ہمیں اپنی تجاویز بھیج دیں تاکہ سب کی درجہ بندی ہو اور اس کے بعد ایک جامع نصاب کی تیاری کی جائے۔

چوتھا اجلاس۔

کانفرنس کا چوتھا اجلاس پروفیسر احتشام حسین کی صدارت میں ۲۱ر اکتوبر کو تین بجے سہ پہر سے شروع ہوا جلسہ میں موضوع بحث تدریس کے مسائل تھا۔ پروفیسر احتشام حسین نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ استاد کے لئے تدریس ایک پیشہ نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ استاد کا نصب العین ہونا چاہئے انھوں نے استاد و شاگرد کے درمیان رابطہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ استاد کا اپنے گرد وپیش کے حالات سے واقف ہونا اپنے مضمون پر قدرت اور ذہنی بیداری بھی ضروری ہے اسے تدریس سے دلچسپی ہونا چاہئے نیز تدریس کو زندگی سے مربوط کرکے جدید نفسیات کی روشنی میں پڑھانا چاہئے تاکہ طلبہ میں ادب کا ذوق پیدا ہو۔ ڈاکٹر منظر عباس استاد مسلم یونیورسٹی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ ادب کی تعلیم کے لئے استنباطی طریقۂ کار زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے اپنے مقالہ میں کہا کہ غیر ملکی طلبہ کو پڑھانے کے لئے ڈائرکٹ میتھڈ زیادہ مفید ہوگا احمد جلیس (حیدرآباد) نے افسانوی ادب کی تدریس کے مسئلہ پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے داستانوں کی ایک فرہنگ کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا معین الدین استاد جامعہ ملیہ نے ثانوی مدارج پر تدریس کے مسائل سے بحث کی پروفیسر آمنہ خاتون نے اپنے مقالہ میں نصاب کے سلسلہ میں ان دشواریوں کا ذکر کیا جو بنگلور کے علاقہ میں پیش آتی ہیں اور ان مشکلات دور کرنے کے حل پیش کئے ڈاکٹر رضی الدین نے اپنے مقالے میں آزادی کے بعد اردو اساتذہ کو جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کا ذکر کیا عبدالغفار شکیل استاد شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی نے اپنے مقالہ میں مدرسی زبان کی حیثیت سے لسانیات کی مدد سے اردو کی تدریس کے مسائل پر روشنی ڈالی پروفیسر احتشام حسین نے اپنی اختتامیہ تقریر میں علمی اور معاشرتی اصطلاحات کی ایک فرہنگ کی ترتیب کی ضرورت کا اظہار کیا انھوں نے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مرحلوں کی تعلیم میں ایک رابطہ کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

پانچواں اجلاس

کانفرنس کا پانچواں اجلاس ۲۲ اکتوبر کو ساڑھے نو بجے صبح ڈاکٹر گیان چند جین کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس جلسہ کا موضوع بحث تحقیق کے مسائل تھا اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر گیان چند جین نے کہا کہ تحقیق کے لئے ایک خاص قسم کے مزاج اور خاص قسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تحقیق کے اصول وضوابط مدون ہونا چاہئیں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مختلف شعبوں کے ماہر اساتذہ تحقیق کے کام کا جائزہ لیں اور پھر ان پہلوؤں پر کام کرائیں جن کی واقعی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے بعد ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے اپنا مقالہ اردو تحقیق سمت ورفتار کے عنوان سے پڑھا جس میں انھوں نے اردو تحقیق کی موجودہ رفتار اور معیار سے بے اطمینانی کا اظہار کیا انھوں نے کہا کہ تحقیق کو زیادہ سے زیادہ وقیع اور کارآمد بنانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ باہمی تعاون اور اشتراک عمل کے اصولوں پر کام ہو۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق کے نام پر صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو رہا ہے اس کی اصلاح کا کام اساتذہ کی انجمن بہتر طور پر کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نعیم الدین (اورنگ آباد) نے یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام

پر مقالہ پڑھا اس اجلاس میں ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر رفیق حسین، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی نے تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالے پیش کئے مقالوں کے بعد بحث کا آغاز ہوا بحث میں حصہ لیتے ہوئے ابو الفیض عثمانی نے کہا کہ مقامی حضرات کو مقامی کتب خانوں اور ان کے مخطوطات کی فہرست شایع کرنا چاہئے۔ مرزا جلال نے تجویز پیش کی کہ بڑے ادیبوں اور شاعروں کی مکمل تصانیف شائع کرنے کی ضرورت ہے میر ذوالفقار نے کہا ہمارے یہاں تحقیق کا کام کم ہوا ہے اس کمی کو دور کرنا ہے انھوں نے اردو کی ایک بڑی لائبریری کی ضرورت کا اظہار کیا۔

پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ اگر کوئی تحقیق کے کام کو اس کی روح کو دیانتداری سمجھتا ہے تو اس کو ہم کم ہم سمجھتا ہوں تحقیق کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہونا چاہئے ہاں تحقیق میں ہمیں معیار پر اصرار کرنا چاہئے انھوں نے فرمایا کہ تحقیق کے سلسلہ میں یونیورسٹیوں میں جدید ترین معیاروں کو ملحوظ رکھنا چاہئے ادب میں اول نمبر کی موجودہ درجہ بندی کو سب کچھ نہ سمجھنا چاہئے اسے نئے سرے سے پرکھنا چاہئے انھوں نے فرمایا کہ تحقیق ہو تنقید ہو یا تعلیم سب کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے کیونکہ جو درجہ جس جگہ ہے وہیں آتا ہے" اپنی اختتامیہ تقریر میں صدر اجلاس پروفیسر گیان چند جین نے اجلاس میں پڑھے گئے مقالات کی جلد اشاعت پر زور دیا۔

چھٹا اجلاس۔

کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۲۲ر اکتوبر کو سہ پہر پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس کا موضوع تنقید کے مسائل تھا۔ سرور صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ آزادی کے بعد اردو تنقید میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے اگرچہ اس میں سخن فہمی کم اور جانبداری زیادہ ہے انھوں نے آزادی کے بعد شایع ہونے والی کتابوں میں سے ان کتابوں کی ایک فہرست بھی پیش کی جو کسی نہ کسی حیثیت سے قابل ذکر ہیں۔ سرور صاحب نے کہا کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں ایک اچھا تنقیدی شعور پیدا کریں انھوں نے فرمایا کہ ادب کے مطالعہ میں حسن کاری کو نمایاں اہمیت دینی چاہئے ادب میں نظریے کی بھی اہمیت ہے لیکن بنیادی چیز ادب کی حسن کاری ہے ادب نہ سائنس ہے اور نہ پروپیگنڈہ۔ انھوں نے ادبی تنقید کی ایک ڈکشنری کی تیاری پر بھی زور دیا سرور صاحب کے مقالہ کے بعد سید احد حسن استاد کالکٹ یونیورسٹی نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں تنقید کے مختلف نقطہ ہائے نظر کا ذکر کیا اور کہا کہ ادب میں نظریے فیصلے کن نہیں ہوتے۔ اس کے بعد وارث حسین علوی (گجرات یونیورسٹی) نے جامعات میں اردو تنقید کے مسائل پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ میں ان تنقیدوں کو رواج نہ دینا چاہئے جو کمتی قسم کی ہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ طلبہ خود تخلیقات کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس طرح تنقیدی شعور پیدا کیا جائے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ تنقید میں تمام نظریوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے کیونکہ بڑے ادب میں جہاں جمالیاتی حسن ضروری ہیں وہیں نظریئے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ آج جبکہ لوگ تشکیک میں مبتلا ہیں انھیں زندگی کے اعلیٰ اقدار کا احساس دلانا ضروری ہے اپنی اختتامیہ تقریر میں سرور صاحب نے کہا کہ ادب میں آمریت کی کوئی جگہ نہیں ہے ہمیں آنکھ بند کرکے کسی کے پیچھے نہیں چلنا چاہئے۔ بلکہ خود اپنے طور پر سوچنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کو سمجھنے کے لئے دوسرے ادبیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بے اطمینانی صحت کی علامت ہے بدلتے ہوئے حالات اور تازہ ترین افکار کا مطالعہ برابر کرتے رہنا چاہئے انھوں نے آفاقی قدروں پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ان قدروں کو اپنے طور پر جذب کرنا چاہئے آخر میں سرور صاحب نے تنقید میں اثبات و انکار دونوں کی ضرورت پر خاص طور سے زور دیا۔

کانفرنس کے مختلف جلسوں کے علاوہ ایک اجلاس ۲۱ر اکتوبر کی شام کو انجمن کے تنظیمی امور کو طے کرنے اور نئے انتخاب کے لئے ہوا۔ جس میں بعض تجاویز پاس کی گئیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کو انجمن کا صدر اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو نائب صدر منتخب کیا گیا صدر اور سکریٹری کو اختیار دیا گیا کہ وہ ایک ایک جوائنٹ سکریٹری کو نامزد کردیں۔ اس جلسہ کی تجویزیں الگ سے شایع ہوں گی۔

۲۲ر اکتوبر کی شام کو چھ بجے فیکلٹی آف آرٹس کے کمرہ نمبر ۶ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں مندوب شعرا کے علاوہ علی گڑھ کے شعراء نے بھی اپنا کلام سنایا۔

۲۱ر اکتوبر کی شام کو ساڑھے پانچ بجے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے مندوبین کو ایک عصرانہ دیا ۲۲ر اکتوبر کی شام پانچ بجے انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے مندوبین کو ایک عصرانہ دیا گیا۔ اس کانفرنس میں جن مندوبین نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد حنیف	مگدھ	ڈاکٹر آمنہ خاتون	منگلور
محمودہ خانم	بنگلور	ڈاکٹر تنویر علوی	دہلی

ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور) — خمیم احمد (مرہٹواڑہ)
ایس اے حسن (بھاگلپور) — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی)
ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی (دہلی) — ڈاکٹر نعیم الدین (آندھرا)
ڈاکٹر عبد الودود (اجین) — وارث حسین علوی (گجرات)
ڈاکٹر شمیم حنفی (اندور) — پروفیسر عبد القادر سروری (جموں و کشمیر)
پروفیسر اختر اورینوی (پٹنہ) — مسز شکیلہ اختر (پٹنہ)
محمد شفیع الدین نیر (جامعہ دہلی) — اختر قادری (بہار)
معین الدین (جامعہ دہلی) — سید تائب رضوی (اودے پور)
شاہ تشکیل احمد (گڑھ) — نصیر الدین الہاشمی (گڑھ)
ڈاکٹر نصیر الحق (دہلی) — عظیم الشان صدیقی (دہلی)
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (دہلی) — پروفیسر سید احتشام حسین (الٰہ آباد)
سش اختر (رانچی) — ڈاکٹر رضی الدین (دکلیشور)
ڈاکٹر مسیح الزماں (الٰہ آباد) — عبد الاحد (عثمانیہ)
ڈاکٹر حکم چند نیر (بنارس) — صدیق الرحمٰن قدوائی (دہلی)
ابوذر عثمانی (رانچی) — شبیر احمد غوری (دہلی)
محمد علی زیدی (راجستھان) — ابو الفیض عثمانی (راجستھان)
ڈاکٹر گیان چند جین (جموں و کشمیر) — ڈاکٹر رفیق حسین (الٰہ آباد)
سید رشید الحسن عثمانیہ (حیدرآباد) — ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ)
ڈاکٹر ملک راج — منظور احمد (گورکھپور) — بلقیس فاطمہ (کشمیر)
مغیث الدین فریدی (دہلی) — احمد جلیس انوار العلوم کالج کلچیلی حیدرآباد
پروفیسر مسعود حسین خاں (علی گڑھ) — پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)
ڈاکٹر معین احسن جذبی (علی گڑھ) — ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (علی گڑھ)
نسیم قریشی (علی گڑھ) — ڈاکٹر قاضی عبد الستار (علی گڑھ)
نادر علی خاں (علی گڑھ) — عتیق احمد صدیقی (علی گڑھ)
اخلاق محمد خاں شہریار (علی گڑھ) — ڈاکٹر اصغر عباس رستوی (علی گڑھ)
ڈاکٹر انصار اللہ نظر (علی گڑھ) — ڈاکٹر نعیم احمد (علی گڑھ)
ڈاکٹر نور الحسن (علی گڑھ) — کوکب قدر سجاد علی مرزا (علی گڑھ)
خواجہ مسعود علی ذوقی (علی گڑھ) — حنیف نقوی (علی گڑھ)
ڈاکٹر ثریا حسین (علی گڑھ) — مس اسرار قریشی (علی گڑھ)
بیگم افتخار صدیقی (علی گڑھ) — ایم۔ اے رضوی (کانپور)
عبد الغفار شکیل۔ (علی گڑھ) — (نامہ نگار ہماری زبان)
شارب ردولوی۔ (دہلی)

مدھیہ پردیش میں انٹر کے مراسلاتی کورس میں اردو کی تعلیم بھی دی جائے گی

بھوپال انجمن ترقی اردو کی مساعی سے ایک اہم کام سرانجام پا گیا یہ خبر یہاں کے ادبی و تعلیمی اردو دوست حلقوں میں خوشی کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ مدھیہ پردیش کے بورڈ آف ہائر سکنڈری ایجوکیشن نے انٹرمیڈیٹ کے مراسلاتی کورس میں اردو کی کوچنگ کو بھی منظور کر لیا ہے ابھی تک انٹر میں اردو بحیثیت ایک مضمون تو شامل تھی لیکن، اس کے مراسلاتی سبق نہیں دئے جاتے تھے اس پر انجمن ترقی اردو نے بورڈ کے ذمہ داروں کو ایک میمورنڈم دیا تھا جس میں اردو میں مراسلاتی کوچنگ شروع کرنے کا مطالبہ کیا تھا اس مطالبہ کو بورڈ نے تسلیم کر لیا ہے اس میمورنڈم پر جناب شاکر علی خاں ایم۔ ایل۔ اے، جناب کے۔ ایس پردھان ایم۔ ایل۔ اے، جناب ممنون حسن خاں، حکیم سید قمر الحسن مدیر اعلیٰ ندیم اور جناب اے آر رشدی مدیر افکار کے دستخط تھے اور اسے پروفیسر حسن مسعود نے پیش کیا تھا صوبائی انجمن کے آفس سکریٹری جناب حسانت صدیقی نے اردو دوستوں کو یہ مژدہ سناتے ہوئے بورڈ کے چیرمین سکریٹری اور مراسلاتی کورس کے رجسٹرار اور میمورنڈم کے دستخط کنندگان کا شکریہ ادا کیا ہے جن کی مشترکہ مساعی سے اردو کو اس کا یہ حق ملا۔ (افکار)

اردو کا قائم رہنا ملک کی سالمیت و یکجہتی کے لئے ضروری

بھوپال، اگر کوئی مجھ کو قائل کر دے کہ اردو کو اس کا حق دینے سے ملک کی سالمیت تحفظ اور ترقی رک جائے گی تو میں اس زبان کی قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا قائم رہنا ملک کی سالمیت اور تحفظ اور ترقی کے لئے ضروری ہے اگر اردو کو مٹا یا گیا تو اس کا مطلب قوم کو مٹانا ہوگا یہ الفاظ انجمن ترقی اردو (ہند) کے نائب صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے شہر کی انجمن کے زیر اہتمام منعقدہ ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہے۔ اردو کے شیدائی کی حیثیت سے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پنڈت ملا نے کہا کہ اگرچہ میں کافی تھکا ہوا ہوں مگر اردو کا موضوع میرے ذہن میں آتے ہی میری تھکاوٹ اور پژمردگی ختم ہو جاتی ہے مجھ میں توانائی پیدا ہو جاتی ہے آپ نے کہا کہ اردو ایک قومی اور ملکی سرمایہ ہے اگر اردو کو نقصان پہنچا تو ملک کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا یہی سبب ہے جو مجھے اردو کا کام کرنے پر اکسا رہا ہے۔ آپ نے دوران تقریر کہا کہ ملک کے حالات بدل رہے ہیں جن سنگھ جو سب سے زیادہ اردو کے مطالبہ کے خلاف ہے اب اس کے اپنے رویہ میں بھی تبدیلی آگئی ہے اب کسی گروہ کے لئے یہ کہنا آسان نہیں رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی ایک بولی ہے۔ اردو اس ملک کی بڑی زبان ہے یوپی کے وزیر تعلیم نے جو جن سنگھی تھے خود کہا کہ اردو ہماری زبان ہے ہم اسے اسٹیٹ زبان کا درجہ دینے کو تیار ہیں لیکن جب تک ملک کے ۲۰ فیصد لوگ اسے نہ بولتے ہوں جب تک اسے یہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر مرکز قاعدوں میں تبدیل کر دے تو ہم اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے سکتے ہیں۔ لہٰذا اب جھگڑا صرف اعداد و شمار کا ہے یو۔ پی میں اردو بولنے والے ۵۰ ، ۲ لاکھ ہیں۔ آپ نے کہا کہ سرکاری اعداد و شمار سے اردو بولنے والے پورے تین کروڑ ہیں۔ اسی طرح اس کا ملکی زبانوں میں پانچواں نمبر ہے۔ آخر میں آپ نے کہا کہ انجمن ترقی اردو کو بدلے ہوئے حالات کے تحت بڑے پیمانے پر ایک جلسہ بلانا چاہئے

اردو کے نام پر جو بھی حقوق ملیں ان کی قانونی حیثیت ہو

لکھنؤ۔ یہاں مرکزی وزیر صنعت جناب فخر الدین علی احمد نے ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد سے ملاقات کے دوران بتایا کہ میں انجمن ترقی اردو کے مطالبات کے حق میں ہوں لیکن بحث یہ ہے کہ اردو کی پوزیشن کو کیسے بہتر بنایا جائے؟ اس کے لئے ریاستی کانگریس کے ذمہ داروں سے بھی میری گفتگو جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ بات چیت نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ جناب احمد نے وضاحت سے بتایا کہ پرائمری کے بچوں کو ان کی مادری زبان سے محروم نہیں کیا جا سکتا جہاں تک دس اور چالیس کے فارمولے کا سوال ہے میں اس پر زور ہی نہیں دیتا بلکہ اگر ایک بچہ بھی اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سہولت فراہم کرے ثانوی درجات کے لئے سہ لسانی فارمولا اس کا بہترین حل ہے لیکن اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ جدید ہندوستانی زبان کے زمرہ سے کلاسیکل زبانوں کو الگ رکھا جائے اور کلاسیکل زبان کے لئے الگ سے انتظام ہو۔ اس کے علاوہ محض اردو گزٹ اور دوسری سہولتیں ہی کافی نہیں ہیں بلکہ اس کا دائرہ بڑھایا جائے ریاستی انجمن کے وفد نے مرکزی وزیر پر زور دیا کہ جب تک اردو کو اس کا دستوری اور آئینی حق نہیں دیا جاتا ہے اردو کی راہیں کشادہ نہ ہوں گی اس لئے اردو کے نام پر جو بھی حقوق ملیں وہ قانون بنا کر دے جائیں جناب فخر الدین علی احمد نے اس مطالبہ سے اپنے کو ہم آہنگ کرتے ہوئے کہا کہ جو بھی نتیجہ برآمد ہوگا وہ اسی کی روشنی میں ہوگا۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کا یہ وفد جناب ستیو ناتھ پرشاد (صدر)، جناب حیات اللہ انصاری ایم۔ پی (خازن) جناب راحت علی خاں (جنرل سکریٹری)، جناب احمد ابراہیم علوی (جوائنٹ سکریٹری) اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی پر مشتمل تھا۔

(قومی آواز)

نانپارہ میں اردو کی درخواستیں قبول کر لی گئیں

اردو گزٹ بھی آنے لگا

نانپارہ (بہرائچ)۔ ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے بعد دفتروں اور مال کی عدالتوں میں اردو زبان میں لکھی ہوئی درخواستیں نہیں قبول کی جا سکتی تھیں لیکن پہلی بار بورڈ آف ریونیو کے واضح احکام کے بعد تحصیل نانپارہ کے عرائض اور وثیقہ نویسوں نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا اردو کے مقامی کہنہ مشق شاعر جناب احسان الحق ثنا وثیقہ نویس اور ان کے ساتھیوں نے تحصیلدار نانپارہ کے اجلاس پر اردو زبان اور فارسی رسم خط میں درخواستیں عدالت پر گزاری ہیں جنھیں بغیر کسی رکاوٹ کے قبول کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ اردو میں دوبارہ دستاویز لکھنے کی اجازت پر غالباً اتر پردیش میں جناب احسان الحق ثنا واحد فرد ہیں جنھوں نے مقامی رجسٹری آفس میں اردو زبان اور فارسی رسم خط میں اردو دستاویز لکھنے کا شرف حاصل کیا تھا اور اس وقت کے سب رجسٹرار جناب ڈانگ نے بخوشی اس کی رجسٹری بھی کر دی تھی تحصیل نانپارہ میں اب "اردو گزٹ" بھی آنے لگا ہے اس کے علاوہ تحصیل کی تینوں اسمبلی حلقۂ انتخاب کی فہرستیں بھی اردو میں شائع ہو رہی ہیں۔ یاد ہوگا کہ جن اضلاع اور تحصیلوں کو مردم شماری کی بنیاد پر اردو بولنے والا علاقہ ریاستی سرکار نے قرار دیا ہے ان میں نانپارہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ ضلع میں اردو بولنے والے کافی تعداد میں مختلف تحصیلوں میں موجود ہیں لیکن نانپارہ تحصیل کو اردو کا علاقہ منوانے میں مقامی انجمن ترقی اردو کو اس کا فخر حاصل ہے کیونکہ دستخطی مہم اور مردم شماری کے موقع پر انجمن ترقی اردو نانپارہ کے کارکنوں نے مستعدی سے اردو زبان درج کرانے کی تحریک کی تھی اور ضلع حکام سے تحریک بھی کی تھی۔

(قومی آواز)

ریاستی انجمن ترقی اردو کی کونسل کے لئے مقبول احمد لاری کی نامزدگی

لکھنؤ۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے بتایا ہے کہ جناب ستیو ناتھ پرشاد صدر ریاستی انجمن نے آل انڈیا میرا اکاڈمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری کو ریاستی کونسل کا ممبر نامزد کیا ہے۔

(قومی آواز)

غالب کے تراجم علاقائی زبانوں میں ہوں گے

لکھنؤ۔ غالب صدسالہ یادگار کمیٹی کی اتر پردیش کی مرکزی کمیٹی کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے صنعت جناب فخر الدین علی احمد نے یہاں کہا کہ غالب کی شخصیت ان کی شاعری اور ان کے فلسفۂ زندگی سے روشناس کرانے کے لئے مرکزی کمیٹی مختلف ریاستوں کی علاقائی زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے شائع کرائے گی اور یادگار کے طور پر غالب تھیٹر کے قیام کے لئے کوشش کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تقریبات سب کے تعاون سے منائی جانا چاہئے انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ لکھنؤ آکر انھیں یہ معلوم ہوا کہ ایک غیر سرکاری غالب کمیٹی کو بعض امور میں اختلاف ہے انھوں نے کہا کہ میں نے دونوں کمیٹیوں کے ممبران سے تبادلۂ خیال کیا ہے اور میں نے مشورہ دیا ہے کہ دونوں کمیٹیوں کے سربراہ کی حیثیت سے ریاستی گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی اس بات کو دیکھیں کہ یہ تقریبات کامیاب ہوں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند نے ایک غالب یادگار ٹکٹ کا بھی اجرا کیا ہے۔ انھوں نے کہا یہ بات افسوسناک ہے کہ اتر پردیش جو غالب کا گھر ہے وہاں

بعض ادارے علاحدہ علاحدہ تقریبات منا رہے ہیں۔ انھوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ مرکزی کمیٹی کو اپنا پروگرام پورا کرنے کے لئے عطیات دیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی یادگار صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ روس، چیکوسلواکیہ، ایران مغربی جرمنی وغیرہ تک میں بھی منائی جارہی ہے اور وہاں سے برابر غالب سے متعلق دستاویزات طلب کی جارہی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ بعض افراد نے مرکزی کمیٹی پر کانگرس کے غلبے کا شبہ ظاہر کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ وزیر اعظم جو اس کمیٹی کی صدر ہیں ان کا کانگریس کی لیڈر کی حیثیت سے نہیں اپنے عہدے کی وجہ سے کمیٹی سے تعلق ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مل کر اس طرح اس یادگار کو منائیں جس سے غالب کی عظمت برقرار رہے۔ تقریب کا آغاز و اختتام غالب کی دو غزلوں سے ہوا۔ تقریب میں جناب شبیہ الحسن نونہروی اور جناب امرت لال ناگر نے غالب کی شاعری پر روشنی ڈالی اور انھیں خراج تحسین پیش کیا اور جناب مقبول احمد لاری نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ یو۔پی کی مرکزی کمیٹی کے وائس چیرمین پنڈت آنند نرائن ملا نے کمیٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی غالب کے اشعار کا سہارا لے کر کارٹون کی ایک نمائش بھی رویندر رالیہ کی گیلری میں منعقد کی گئی۔ (قومی آواز)

غالب کی سویں برسی کے سلسلہ میں کمیٹی کا قیام

غازی پور۔ مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر "جشن غالب" کے انعقاد کے سلسلہ میں یہاں ایک چودہ رکنی کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ کمیٹی کے اراکین نے اتفاق رائے سے جناب ڈاکٹر موتی سنگھ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کو صدر اور حسین عباس عابدی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ جشن غالب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دو کام ہونا چاہئے۔

۱۔ غالب کی حیات اور کارناموں سے متعلق ایک کتاب کی اشاعت۔ ۲۔ جشن غالب کے سلسلے میں تقریبات کا اہتمام اور انتظام۔ (حسین عباس عابدی جنرل سکریٹری)

اکولہ میں جشن غالب

اکولہ میونسپل ٹاؤن ہال کے پرفضا میدان میں جشن غالب کی تقریبات کے سلسلہ میں ایک یادگار طرحی مشاعرہ ہوا۔ پروفیسر شارق نیازی نے صدارت کی پرنسپل انجمن سکنڈری ہائی اسکول جناب محمد حفیظ اللہ خاں صاحب مدیر نے مشاعرہ کا افتتاح کیا۔ غالب کی شخصیت پر بدر صاحب نے سیر حاصل تبصرہ کیا کم و بیش ۲۵ مقامی اور بیرونی شعرا نے "تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا" پر طرحی غزلیں پیش کیں۔

(عبدالصمد جاوید سکریٹری)

اردو گھر فنڈ

چندہ اردو گھر فنڈ ۱۶ راکتوبر تا ۳۱ راکتوبر ۱۹۶۸ء

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	ذریعہ وصول/کیفیت
۱	پروفیسر اسلوب احمد انصاری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱---	نقد	معرفت پروفیسر آل احمد سرور صاحب
۲	جناب مطلوب خاں سیکورٹی گارڈ۔ تھانہ ممبئی	۵-۰	منی آرڈر	خود
۳	طلبائے تھرڈ ایئر، ایم۔ ایم گورنمنٹ ایم۔ ایل ہائر سکنڈری	۱۵-۰۰	بمعرفت	محمد اکرم مانیٹر
۴	جناب بدیع الزماں خاور ڈاکخانہ ڈیولی ضلع رتناگری	۵-۰۰	"	خود
۵	" ایم۔ اے غنی ڈاکخانہ صبتی ضلع پوری	۵-	"	"
۶	" سید حاکم ڈاکخانہ یاقوت پورہ حیدرآباد	۱-۰۰	"	"
۷	" محمد قاسم یاقوت پورہ حیدرآباد	۱-		بمعرفت جناب سید حاکم
۸	" سیٹھ پاڑ چند پودار امرتسر ..	۱۱۱-	چیک	معرفت پریم مالا دت امرتسر
۹	انجمن احمدیہ قادیان "	۱۰-	"	"
۱۰	جناب گوپال کرشن پیر "	۲۵-		"
۱۱	" رتن لال کنڈرا "	۲-	"	"
۱۲	" ڈاکٹر سبھاش کمار "	۱-	"	"
۱۳	جناب پرشوتم لال کنڈرا "	۱-	"	"
۱۴	" کیمتی لال "	۱-	"	"
۱۵	" کے۔ ایل "	۱-	"	"
۱۶	" پریم لال "	۱-	"	"
۱۷	" شیام لال "	۱-	"	"
۱۸	" جگدیش کمار "	۱-	"	"
۱۹	" تلک راج شرما "	۱-	"	"
۲۰	آزاد بک ڈپو "	۱-	"	"
۲۱	نام نامعلوم بعد کو شائع کیا جائے گا	۱-		
	میزان حال	۳۸۹-۰۰		
	" سابق	۶،۴۳۷-۵۰		
	" کل	۶،۸۲۶-۵۰		

تصحیح مع معذرت سابقہ: ۱۵ راکتوبر کی فہرست میں شمار ۲۷ پر کانشی رام منی لال صاحب کی بجائے کانشی رام منلا صاحب شائع ہو گیا ہے موصوف نے ایک سو روپے عنایت کئے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید ضیا دعلی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R. No 2186/57 REGD-No. L922

انجمن ترقی اردو ہند۔ کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی پرچہ ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۔ شمارہ ۴۲۰۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ رنومبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

یونیورسٹیوں کے اردو استادوں کی تیسری کانفرنس

یونی ورسٹیوں کے اردو استادوں کی تیسری کانفرنس ۲۰ اکتوبر سے ۲۲ اکتوبر تک علی گڑھ میں ہوئی اس کی روداد ہماری زبان میں شایع ہو چکی ہے۔ یہ کانفرنس کئی پہلوؤں سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اوّل تو اس میں کشمیر، دہلی، اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا، راجستھان اور میسور کی یونی ورسٹیوں سے خاص تعداد میں سامنے آئے۔ دوسرے اس میں ذریعہ تعلیم، استادوں کے مسائل، تدریس کے مسائل، نصاب کے مسائل، تحقیق کے مسائل اور تنقید کے مسائل پر اچھی تعداد میں مقالے پڑھے گئے اور مقالوں پر بحث بھی ہوئی۔ تیسرے تنظیم کو مضبوط کیا گیا اور اگلی کانفرنس بنگلور یا پھر احمد آباد میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا، چوتھے نصاب کے مسئلے میں سب نمائندوں کے مشورے سے ایک کور کا نصاب بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اردو کی ایک ایسی ڈکشنری تیار کرنے کی تجویز منظور ہوئی جس میں ان تہذیبی، تاریخی اور معاشرتی پہلوؤں کو نمایاں کیا جا سکے جنھیں موجودہ دور میں لوگ بھولتے جا رہے ہیں اس کے ساتھ تنقید میں جو اصطلاحیں برتی جاتی ہیں ان کی ایک ڈکشنری تیار کرنے کا بھی مشورہ دیا گیا۔ مختلف علاقوں میں خاص حالات کی وجہ سے نصاب کے معیار میں جو اختلاف ہے اس کی طرف خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور امید ہے کہ اساتذہ کی یہ کانفرنس اس معاملے میں مناسب سفارشات کرے گی تاکہ اردو ادب کی تعلیم کا معیار بلند اور قابل اطمینان رہے۔

خوشی کی بات ہے کہ یہ ادارہ اب اپنا حلقۂ اثر بڑھا رہا ہے ظاہر ہے کہ اس کے پاس نہ کوئی بڑا سرمایہ ہے نہ کوئی طاقت۔ مگر اس کے پاس اس سے زیادہ اہم ایک مجموعی رائے (CONCENSUS) ہے اور اس سے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ اردو کی تعلیم کے لئے نیا دسے چلنا چاہئے اور سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی منزل پر تعلیم کا پورا انتظام ہونا چاہئے۔ مگر اس کے یہ معنی نہ ہونے چاہئیں کہ جب تک ایسا نہ ہو سکے یونی ورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم کو فروغ نہیں دینا چاہئے۔ آج تقریباً پچاس یونی ورسٹیوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے اردو کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ بیس یونی ورسٹیوں میں اردو کے شعبے ہیں جن میں ایم اے تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ ریسرچ کا معیار پہلے سے بہتر ہو رہا ہے اور بعض قابل قدر کام ہوئے ہیں۔ تنقید میں اب تک جانبداری زیادہ تھی، اب سخن فہمی پیدا ہو رہی ہے اردو کے شعبے اب روز بروز زیادہ زندہ، فعال اور موثر شعبے بنتے جا رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ ہر سال ملتے رہیں، ضروری اعداد و شمار جمع کریں۔ ایک اچھے معیار پر اصرار کریں۔ تدریس کے تقاضوں کو نظر میں رکھیں۔ ادب کا علم ہی نہ دیں، ادب کا ذوق بھی پیدا کریں اور ادب کی قدروں سے زندگی میں روشن خیالی، انسان دوستی اور جمالیاتی حس پیدا کریں۔ مستقبل اب یونی ورسٹی کے استادوں کے ہاتھ میں ہے وہ چاہیں تو اپنی اپنی جگہ فکر و نظر کا ایک گہوارہ قائم کر سکتے ہیں، جس سے ان کا حلقہ ضرور متاثر ہوگا۔ انھیں ادب کے تمام جدید میلانات پر خاص طور سے نظر رکھنی ہوگی، مگر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے کلاسیکل سرمائے سے اچھی طرح واقف نہ ہوں انھیں اپنے پیشے سے عشق پیدا کرنا ہوگا اور ایک دوسرے سے تعاون کر کے اردو زبان و ادب کی ترقی کی مہم میں زیادہ موثر رول ادا کرنا ہوگا۔ اس ایسوسی ایشن کی عمر ابھی تین سال کی ہے مگر اس سے امید ہے کہ وہ یونی ورسٹیوں میں اردو کی شمع بلند رکھ سکے گی اور علمی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکے گی۔ اچھے استاد کو صرف معلومات نہیں دینی چاہئیں اسے تعلیم دینی چاہئے اور طلبہ کی شخصیت کی تعمیر کرنی چاہئے اور ان میں اچھی قدروں کا احساس پیدا کرنا چاہئے۔

مرزا غالب کی دستاویزی فلم حکومت ہند کا فلمز ڈویژن تیار کرے گا

نئی دہلی:- حکومت ہند کا فلمز ڈویژن جیسا کہ توقع ہے اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم بمبئی کے علمبردار کے تعاون سے تیار کرے گا۔ جناب آئی ایس جوہر نے کہا ہے کہ صنعتی ترقی اور کمپنیوں کے معاملات کے مرکزی وزیر جناب فخر الدین علی احمد نے مجھ سے اس قسم کی فلم تیار کرنے کے امکانات کا پتہ لگانے کی فرمائش کی ہے۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا نے بتایا ہے کہ جناب فخر الدین علی احمد لنکا کے دورہ کے بعد اپنے بمبئی کے قیام کے دوران مجوزہ دستاویزی فلم کے انتظامات کی تکمیل کریں گے۔ (ریاست)

آکسفورڈ ڈکشنری میں لفظ اردو کے معنی پر نظر ثانی کرنے کی ہدایت

ڈھاکہ کلیرنڈن پریس آکسفورڈ نے مختصر آکسفورڈ ڈکشنری کے ایڈیٹروں سے کہا ہے کہ وہ لفظ اردو کی تعریف کا مکمل طور پر از سر نو جائزہ لیں تاکہ دوسری بار ضروری ترمیم کی جا سکے مذکورہ پریس کے سکریٹری نے ڈکشنری کے ایڈیٹروں کو یہ ہدایت دی ہے۔ واضح رہے کہ مختصر آکسفورڈ ڈکشنری نے اردو لفظ کے معنی "ہندستانی" بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ زبان مسلمان فاتحوں اور ان کی رعایا کے درمیان میل جول سے پیدا ہوئی (سنگم)

جوش ملیح آبادی کی نقل و حرکت پر پابندی

نئی دہلی - پاکستان کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی گذشتہ سال اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے ہندوستان آئے تھے مگر جب واپس پاکستان گئے تو انھیں ان کے عہدہ سے محروم کر دیا گیا اور ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ (الجمعیۃ)

پنجابی زبان کو پاک رکھنے کی مہم شروع ہوگی

چنڈی گڑھ۔ یہاں دو سو سے زیادہ پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے پنجابی زبان کو "پاک" کرنے کی مہم چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ پنجابی ادیبوں کے پہلے کنونشن میں کیا گیا ہے۔ پنجابی دانشوروں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ پنجابی زبان کو سنسکرت اور ہندی کے تسلط سے بچانے کے لئے ایک عوامی مہم چلائیں گے۔ (قومی آواز)

مہاتما گاندھی کی مکمل تصانیف کی اشاعت

نئی دہلی:- وزارت اطلاعات و نشریات کے پبلیکیشنز ڈویژن نے مہاتما گاندھی کے مجموعۂ تصانیف کے انگریزی ایڈیشن کی ۲۹ویں جلد شائع کر دی ہے۔ اس جلد میں نومبر ۱۹۲۵ء - فروری ۱۹۲۶ء تک کے عرصے کے دوران میں مہاتما گاندھی کی تحریر کردہ تصانیف شامل ہیں۔ جب گاندھی جی نے رضاکارانہ طور پر ایک برس کے لئے سیاست سے سبکدوشی حاصل کر لی تھی۔ ان مجموعے میں مہاتما گاندھی کو ذاتی مشاہدۂ نفس کی کیفیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام اہم مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو اس عرصہ کے دوران میں مہاتما گاندھی کے ذہن کو متاثر کر رہے تھے۔ ان میں ۱۹۱۴ء میں گاندھی اسمتھ معاہدے کی خلاف ورزی میں جنوبی افریقہ میں ڈاکٹر ملن کے بل کی منظوری اور ٹرانسکور میں کچھ سڑکوں پر ہریجنوں کے چلنے پھرنے کی آزادی کی ممانعت کو ختم کرنے کے لئے ویکوم ستیہ گرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس مجموعے میں گاندھی جی کی کتاب بعنوان "جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ" کا پورا متن شامل ہے۔ (الجمعیۃ)

ہندوستان کے ادبا و شعرا کی جماعت پاکستان کا دورہ کرے گی

نئی دہلی - معلوم ہوا ہے کہ جلد ہی ہندوستان سے ادبا و شعرا کی ایک جماعت پاکستان روانہ ہوگی۔ اور وہاں دو ہفتے تک دورہ کرے گی یہ جماعت کنور مہندر سنگھ بیدی کی قیادت میں جائے گی جو ہندوستان کے مشہور اردو شاعر ہیں یہ جماعت صدر ایوب پر زور دے گی کہ وہ دونوں ممالک کے شعرا و ادبا کے آزادانہ آمد و رفت کی اجازت دیں ۶۵ء کے بعد کوئی پاکستانی شاعر مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان نہیں آیا۔ (الجمعیۃ)

رئیس احمد جعفری وفات پا گئے

کراچی: صاحب طرز ادیب، انشا پرداز، ناول نگار اور صحافی رئیس احمد جعفری کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے یہاں انتقال ہو گیا انھوں نے ۶۰ برس عمر پائی رئیس احمد جعفری نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم پائی اس کے بعد وہ روزنامہ "خلافت" بمبئی کے مدیر ہو گئے۔ بعد میں لاہور جا کر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں سیرت محمد علی، بہادر شاہ ظفر اور علی برادران خاصے کی چیز سمجھی جائیں گی۔ (قومی آواز)

ریاست میسور میں اردو گھر فنڈ کی فراہمی

اردو گھر فنڈ کے لئے ریاست میسور کی کمیٹی کے کنوینر جناب محمود ایاز ایڈیٹر "نیا دور" ہوں گے۔ انھیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ میسور کے اردو دوستوں پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کریں اور مرکزی ہدایات کے مطابق ریاست میسور کے اردو دوستوں سے چندہ کریں۔ میسور کے تمام اردو دوستوں سے توقع ہے کہ وہ اس مبارک کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ (پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری)

ک۔ ف۔ پرواز

ادیب بطور صحافی

ادب اور صحافت'، یہ دونوں کام اگرچہ براہِ راست انسانی زندگی سے متعلق ہیں پھر بھی ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے ادب، انسانی کلچر کی نہایت لطیف اصناف میں سے ہے اور اس کا تعلق دائمی انسانی قدروں سے ہے جبکہ صحافت کا دائرہ روزمرہ کی عامیانہ، وقتی یا اتفاقاً اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی خارجی زندگی تک محدود ہے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں JOURNALISM (یعنی صحافت) روزمرہ کی خبروں، سیاسی اور کاروباری حسابات کے رپورٹر کو کہا گیا ہے جبکہ ادب بقول ہڈسن، انسانی زندگی کی انہی سطحوں کی تفسیر و ترجمانی کا نام ہے جو ادیب کے اپنے ذہن میں ابھرتی ہیں

صحافت اپنے ابتدائی مراحل کے دوران آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف کے عین مطابق بھی یعنی خالصتاً ایک OBJECTIV ART (خارجیت کا فن)، مگر جیسے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ارتقائی منزلیں طے کرتے کرتے، صحافت اس تعریف کے دائرے سے کسی قدر باہر نکلتی گئی۔ آج کی صحافت میں موضوعات اور مواد اگرچہ بدستور خارجی اور غیر دائمی ہیں لیکن اس میں جیسے دگر کی بھی آمیزش ہوگئی ہے یعنی روزمرہ کی خبروں، واقعات اور کاروباری حسابات کے بیان کے علاوہ ان پر تبصرہ آرائی بھی شروع ہوگئی ہے۔ اخبارات کے

برہم ناتھ دت

شیدائی وطن

پیشتر اس کے کہ
میری زباں بند ہو جائے
اپنی کہانی میری زبانی سن لے
کہانی سادہ، مختصر اور غیر رومانی ہے
نہ اس میں گل و بلبل ہے، نہ دف و چنگ
نہ مے و مینا، نہ ہجر و وصال، نہ ساقی، نہ ہوش
ایک روکھی پھیکی داستان ہے!
ایک طفلِ مکتب تھا!
اس نے اپنا جزوِ دل اپنے بازار کے چوراہے میں پھینکا
اور اسے غرور اور شان بے نیازی سے نعرۂ حق لگایا
عمر ہا ست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را
وہ قید و بند کی زنجیر دل میں جکڑ دیا گیا
وہ ایک عمیق اور گہرے سکوں میں ڈوب گیا
انا الحق کی یہ صدا
درختوں نے نسیم سحری سے سنی اور سرگوشیوں میں طیور کو سنائی
طیور نے اسے دل کش راگنی میں ڈھال کر
فضاؤں کی وسعتوں، بلندیوں اور پستیوں میں بکھیر دیا
زمانے نے انگڑائی لی، کروٹ بدلی
قلب و فکر کی قوتیں بیدار ہوئیں، عزم مسکرایا
تحریک حرکت کے سوتے جاری ہوئے
ظلم و استبداد کے ایواں ہل گئے
قید و بند کی زنجیریں ٹوٹ گئیں
ارض و سما میں "انقلاب! انقلاب" کے نعرے بلند ہوئے
دنیا زیر و زبر ہوگئی
طرفہ تماشا یہ ہوا کہ پھر
"نہ کوئی بندہ تھا! نہ بندہ نواز
نہ کوئی حاکم تھا! نہ محکوم
نہ کوئی جابر تھا، نہ مجبور"
میرے رفیق میرے دوست میرے یارِ وفادار!
تری کہانی، کتنی پرشکوہ ہے،
کتنی سادہ ہے اور کتنی مختصر!

اداریے اور حالاتِ حاضرہ پر مبصرانہ مضامین اس کی مثال ہیں۔ اس طرح صحافت میں داخلی طرز نگارش کو بھی دخل حاصل ہو گیا ہے جس کے باعث کئی مرتبہ صحافت پر ادب کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ تبصرہ آرائی اور داخلی طرز نگارش کے شامل ہونے کے باوجود صحافت کو ادب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ صحافت کا اصل مدعا آج بھی واقعات کا بیان ہے۔ اس میں تبصرہ آرائی اور داخلی طرزِ نگارش کا جو اضافہ ہوا ہے اس کا CONTENT یعنی مواد اور اس کے موضوعات تو پھر بھی غیر دائمی ہیں اور صرف خارجی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انسان کی داخلی زندگی اور دائمی قدروں کی نمائندگی سے صحافت آج بھی عاری ہے ان کی تھوڑی سی بہت نمائندگی اگر ہے تو اخبارات کے میگزین سیکشن میں ہوتی ہے لیکن وہاں بھی عموماً وقتی دلچسپیوں کے مضامین ہی چھپتے ہیں۔

آج کی صحافت میں ایک اور جدت بھی دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ بیشتر روزناموں اور ہفت روزہ اخبارات میں خبروں کے بیان اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ آرائی کے علاوہ نظمیں، غزلیں، افسانے اور ادبی مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ جدت بھی صحافت کو ادب نہیں بنا سکا۔ اگر کسی حجام کی دوکان میں مانی و بہزاد، وان گوگ یا لیونارڈو ڈاونسی کے جد شاہکار آویزاں ہوں تو اس سے وہ دوکان آرٹ گیلری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔

دنیائے صحافت میں واقع ہونے والی جدید تبدیلیوں کے پیش نظر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ادیب کے لئے صحافی بھی ہونا ممکن ہے اور اگر ہے تو کیا یہ بات اس کے لئے واجب ہے نیز ادب و ادیب کے حق میں کیسی ہے؟ اس بارے میں کل تک یہی نظریہ غالب رہا کہ ایک سچے ادیب کے لئے صحافت میں حصہ لینا اول تو محال ہے اور اگر وہ زبردستی ایسا کرتا ہے تو یہ بات ادب اور ادیب دونوں کے لئے نقصان دہ ہے کیونکہ صحافت میں آنے سے پہلے ادیب کو اپنا نصب العین، اپنا شعار، اپنا مزاج اور طریقۂ کار بدلنے پڑتے ہیں نیز واقعات کا بیان کرتے وقت وہ بارہا اپنی طرز نگارش کے معیار کو عوام کی خوشنودی کی خاطر پست کر بیٹھتا ہے جو ادب اور ادیب دونوں کے حق میں سخت مضر ہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے اس نظریہ میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک ناول نگار ٹامس فلیمنگ نے اپنی کتاب A CRY OF WHITENESS میں نئے نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحافت میں صرف کیا ہوا وقت ادیب کے ایسے حق میں تو مفید ثابت ہو سکتا ہے مگر صحافت کے حق میں مضر۔ ادیب کے ایسے حق میں وہ کس کس لحاظ سے مفید ہے، اس کی وضاحت وہ نیویارک ٹائمز کے جولائی ۱۹۶۸ء کے آخری ہفتے کے تبصرۂ کتب میں یوں کرتا ہے۔

"دورِ حاضر میں افسانوی ادب کی بڑھتی ہوئی غیر مقبولیت کی وجہ سے ادیبوں نے اپنی روزی کی خاطر صحافت کا کام شروع کر دیا ہے جو بھاڑے کی افسانہ نگاری اور ہالی ووڈ اسکرپٹ (HOLLYWOOD SCRIPTS) لکھنے سے اگلا قدم ہے۔ اس کے علاوہ صحافت انھیں اپنے اندر کا جائزہ لینے کے عمل سے مفر (ESCAPE) دلاتی ہے اور اس طرح انھیں اس احساس سے نجات دلاتی ہے کہ انھیں اپنی نشو و نما کے لئے بار بار اپنا ہی خونِ جگر پینا پڑتا ہے جس کا ذخیرہ اس عمل کے ہاتھوں ختم ہو جاتا ہے اور پھر انھیں اپنے انفرادی تجربہ ہی کو گنتی کی حد تک بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ صحافت دنیا کے متعلق ان کے تجربات میں واقع ہونے والی کمی کی تلافی کرتی ہے۔"

صحافت میں ادیب کے داخل ہونے کے مضر اثرات کو (جو صحافت کے حق میں مضر ہیں) فلیمنگ یوں بیان کرتا ہے۔

"ادیبوں کی یہ شخصی قسم کی صحافت کئی خطرات کی حامل ہے کیونکہ اس کی بنیاد ان کے اس کم و بیش مفہوم و متفق نظریہ پر ہے کہ خارجیت کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس طرح ان کی صحافت (PERSONAL COMMENT) یعنی شخصی تبصرہ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے جس کا کام زندگی کے کسی تجربہ کے متعلق کسی فرد واحد کے ذاتی نقطۂ نظر کے اظہار سے زیادہ نہیں۔ یہ مانا کہ خالص خارجیت شاید ایک ناقابلِ حصول مقصد ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے انحراف کی حد اس سے بھی آگے ہو کہ چونکہ دنیا میں ایک بے پناہ اکثریت جھوٹ بولنے والوں کی ہے اس لئے ہمیں ایک دوسرے کو سچ باتیں بتانا ترک کر دینا چاہئے۔"

ہمارے خیال میں صحافت، ایک ادیب کے لئے ناممکن تو ہے ہی نہیں۔ دنیا کی دیگر زبانوں کے علاوہ ہماری اپنی زبان میں بھی اس امر کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں کہ ایک ہی شخص کے لئے بیک وقت ادیب اور صحافی ہونا ممکن ہے۔ مثلاً منشی سجاد حسین، منشی دوارکا پرشاد افق، سر سید احمد خاں، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا وحید الدین سلیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، مولانا نیاز فتحپوری، منشی نوبت رائے نظر، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، سر عبدالقادر، اختر شیرانی، مولانا عبدالمجید سالک، فیض احمد فیض اور میلا رام وفا وغیرہ۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہ سب لوگ صحافی کم اور ادیب زیادہ تھے۔ انھوں نے اپنی توجہ اور اپنا وقت جس قدر ادب کو دیا اس کا بہت کم حصہ صحافت میں لگایا اور دنیا میں ان کے نام صحافت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے ادبی کارناموں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ اسی طرح مغرب میں چارلس ڈکنز، البرٹو موراویا، رڈیارڈ کپلنگ اور ادیبوں کو دنیا بحیثیت ادیب زیادہ جانتی ہے اور بحیثیت صحافی کم۔

جہاں تک ہو سکے ایک سچے ادیب کے لئے صحافت سے گریز کرنا ہی واجب ہے کیونکہ صحافت اور ادب ان دونوں کے مزاج میں نہ صرف ایک وسیع بنیادی اختلاف ہے بلکہ صحافت میں دخل دینے سے ادیب کا مذاق بگڑتا ہے۔ آج صحافت اگرچہ روزمرہ کی خبروں، واقعات اور کاروباری حسابات تک محدود نہیں اور اس میں کسی حد تک داخلی عناصر کی گنجائش بھی نکل آئی ہے پھر بھی یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ادب اور صحافت موضوع و مواد کے بنیادی اعتبار سے نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ دونوں کے مزاج میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ ادب کا موضوع اور مواد زیادہ تر انسان کے اندر کی دلچسپ پر اسرار اور لامحدود دنیا اور اس کی رنگارنگ کیفیات ہیں۔ خارجی دنیا سے متعلقہ ادب بھی کم و بیش انہی داخلی کیفیات کے تابع ہوتا ہے جیسا کہ ادب کے متعلق ہڈسن کی تعریف سے ظاہر ہے اس کے برعکس صحافت کے موضوعات اور اس کا مواد آج کے صحافیوں کی تبصرہ آرائی اور داخلی طرزِ تحریر کے باوجود خارجی دنیا کے عامیانہ سپاٹ اور متلون معاملات ہوتے ہیں جن کی زندگی بہت تھوڑے عرصے کی ہوتی ہے۔ آج جو اداریہ لکھا جائے گا وہ طرز نگارش کے لحاظ سے خواہ پریم چند کے کسی افسانہ سے کم نہ ہو لیکن جونہی گھڑی کی چھوٹی سوئی ڈائل کا ایک چکر ختم کرے گی اس کی وقعت اور دلچسپی آدھی رہ جائے گی صحافت، ارتقا کے خواہ کتنے ہی مراحل طے کرے شیکسپیئر کے ڈراموں یا کیٹس کی نظموں کو نہیں پہنچ سکتی۔ اسی طرح ادب میں خواہ لاکھ ترقی پسند تحریکیں پیدا ہوتی رہیں اس میں صحافت کی سی

(خارجیت) پیدا نہیں ہو سکتی اور اگر کسی ادبی کارنامہ میں زبردستی یہ بات پیدا کی جاتی ہے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ صحافت میں یا تو وہی ادیب کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے اندر بیک وقت دو مختلف شخصیتیں (یعنی ادیب اور صحافی) اس طرح رکھنے کی صلاحیت کا مالک ہو کہ ان میں باہمی تصادم نہ ہونے پائے یا جو کبھی کبھی محض تبدیلیٔ ذائقہ کی غرض سے مختصر وقفوں کے لئے اس میدان میں قدم رکھتا ہو۔

ملیمک نے ادیب کے صحافت اختیار کرنے کے جو تین فائدے بتائے ہیں ان میں سے پہلا تو سو فیصدی قابل تسلیم ہے یعنی صحافت، روزی کمانے میں، ادب کی نسبت کہیں زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے اور تیسرے کا تعلق ہے اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ ملیمک کہتا ہے کہ بھاڑے کی افسانہ نگاری اور ہالی وڈ اسکرپٹ لکھنے کے کام سے صحافت اگلا قدم ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ صحافت خواہ بھاڑے کی افسانہ نگاری اور ہالی وڈ اسکرپٹ سے اچھا درجہ رکھتی ہو چونکہ ان کا حسب نسب جدا جدا ہے اس لئے ارتقا کے کاروان میں صحافت کو ہالی وڈ اسکرپٹ سے اگلا قدم نہیں کہا جاسکتا۔ غالب اور میر کی شاعری اگرچہ بلاشبہ پوپ اور ڈرائیڈن کی شاعری سے بہتر ہے لیکن چونکہ اردو شاعری اور انگریزی شاعری دو مختلف سلسلے ہیں اور ان کی روایات بھی جداگانہ ہیں اس لئے کاروانِ ارتقا میں غالب اور میر کی شاعری کو پوپ اور ڈرائیڈن کی شاعری سے اگلا قدم نہیں کہا جاسکتا۔ اب تیسرے نکتہ کو لیجئے۔ ملیمک کہتا ہے کہ صحافت ادیب کو OWN INTROSPECTION یعنی اپنے اندر کا جائزہ لینے کے عمل سے معزول کراتی ہے لیکن اس بارے میں ہمارا خیال ہے کہ ادیب کے لئے اپنے اندر کی جانب جھانکنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک صحافی کے لئے گرد و پیش کی دنیا کے تازہ ترین واقعات سے آگاہ رہنا۔ مانا کہ اپنے اندر کا جائزہ لینا ایک انتہائی جانکاہ اور صبر آزما عمل ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس سے مایوسی بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ جائزہ صدق دلی اور ثابت قدمی سے لیا جائے تو اس سے وہی فوائد حاصل ہوتے ہیں جو گہرے سمندروں کی تہہ میں غواصی کرنے سے۔ عام لوگوں کو اپنی ذات کی یہ غواصی ڈبو دیتی ہے لیکن جنھیں صحیح معنوں میں صدف کی جستجو ہوتی ہے اور جو اس جستجو میں ثابت قدم رہتے ہیں انھیں وہ بیش بہا اور متنوع صدف ملتے ہیں جن کی آب و تاب کا روئے زمین پر ثانی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس جو ادیب اپنے اندر جھانکنے کی جانکاہ تکلیف سے مفر ڈھونڈھتا ہے وہ اس بدنصیب طالب علم کی طرح ہے جو مدرسہ میں پانچ پانچ گھنٹے پابند ہو کر بیٹھنے کی زحمت سے گھبرا کر مدرسہ سے بھاگ جاتا ہے اور تمام عمر علم سے محروم رہتا ہے۔ خود کے اندر کا جائزہ لینے سے مفر کو ملیمک اس لئے ادیب کے حق میں مفید سمجھتا ہے کہ بقول ملیمک اس جائزہ کے ہاتھوں ادیب اس احساس کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کی نشو و نما اپنے ہی خونِ جگر پر ہوتی ہے جس کا ذخیرہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے اور پھر اسے مجبوراً اپنے انفرادی تجربے کو متلی کی حد تک بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ ملیمک کی یہ بات ایک حد تک قابل قبول ہے کیونکہ آج کا ادیب اکثر اس قسم کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس احساس کا غلبہ یا تو مبتدی ادیبوں پر ہوتا ہے یا جن کے دل کمزور ہیں یا جو سرے سے ادیب ہی نہیں۔ دراصل حق تو یہ ہے کہ ادب اپنی تخلیق کے دوران ادیب سے جس قدر خونِ جگر لیتا ہے اس سے کئی گنا تازہ اور صالح خون ادیب کو اس گہری مسرت، تسکین اور طمانیتِ قلب کی شکل میں دے جاتا ہے جو ادیب کو اپنی تخلیق کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ تخلیق واقعی تخلیق ہو اور ادیب واقعی ادیب ہو۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ تخلیقی چشمہ کئی بار سوکھ بھی جاتا ہے اور کئی بار انتہائی طویل وقفوں تک سوکھا رہتا ہے لیکن اس کی وجہ تخلیقی صلاحیتوں کے خاتمہ پر محمول نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اصل وجہ تو سوائے خدا کے شاید اور کسی کو معلوم نہیں۔ یہاں ہم یہی کہیں گے کہ اگر ایسا ہو جائے تو ادیب کے لئے بہترین چارۂ کار خموشی ہے۔ اپنے انفرادی تجربہ کو بار بار دہرانا یا اس سے تنگ آکر صحافت میں پناہ لینا حماقت ہے۔ یاد رہے کہ اگر ادیب میں تخلیقی صلاحیتیں فطری

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

آفتاب شمسی

غزل

جو شہر میں تجھ سے ہمیں منسوب ملا ہے
تنکوں سے ترے ہاتھ کی مرعوب ملا ہے

اک دوست کا روتا ہوا مکتوب ملا ہے
مجھ کو مرے اشکوں کا صلہ خوب ملا ہے

استعارے کے پردے میں ہیں خوابوں کے جلے جسم
اظہار کا ہم کو نیا اسلوب ملا ہے

جو چھوڑ گیا ہے مجھے ہر صبح اکیلا
سایہ وہی پھر شام کو محبوب ملا ہے

کیا قہر ہے جو حاصلِ دیواں تھا مرا شعر
ابلاغ کے دروازے پہ مصلوب ملا ہے

یہ بات الگ راس نہ آئے ہمیں گرمی
ویسے تو مزاج ہم کو بھی مرطوب ملا ہے

مراسلات

بشیر انور کی نظم کے بارے میں

آپ کی نظم مورخہ ۲۲/ستمبر ۱۹۶۸ء بعنوان "بے بصری" شائع ہوئی ہے۔ اس نظم کے جہاں تک مرکزی خیال کا تعلق ہے وہ خوب صورت اور معنی خیز ہے! لیکن اس کے باوجود میں چند باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز تو آپ یہ جان لیں کہ میں "جدیدیت" کا مخالف نہیں (کیونکہ میں خود بھی ایک عرصہ سے اور اس وقت بھی جدید رجحان کے تحت لکھ رہا ہوں) لیکن "جدیدیت" سے متاثر ہونے والے لوگوں میں بیشتر حضرات کی تعداد ایسی ہے کہ جنھوں نے اسے بطور فیشن اختیار کر رکھا ہے۔

ان باتوں کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنی نظم "بے بصری" پر غور کریں جس کا تجزیہ "اوزان" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے یوں کیا ہے —

(سب سے پہلے: جدیدیت کے رجحان کے تحت چونکہ خیالات کی تیزی اور تندی برسرِ پیکار رہتی ہے اس لئے بحر مکمل برے کرکسی بحر کے اوزان یا ارکان کو استعمال کیا جاتا ہے) اس لئے آپ کی نظم کے یہ مصرعے یا سطور ملاحظہ ہوں۔

"اندھیرے سمندر کی بے نور مخلوق نے" اگر اس کا وزن نکالا جائے تو وزن ہوگا۔ فعولن ۳ بار مع اک فعول کے آپ کی دوسری سطر ٹھیک وزن کے مطابق ہے مگر ابتدا میں ایک سہ حرفی حرف یا رکن غائب ہے جس کی بنا پر وزن مکمل نہیں ہوا تیسری سطر درست ہے۔ چوتھی سطر میں ابتدا میں ہی ایک سہ حرفی لفظ غائب ہے۔ باقی اس کے بعد کے اوزان درست ہیں پانچواں لفظ (سطر بطور مستقل) میں ابتدائی سہ حرفی رکن غائب ہے چھٹی سطر میں، سارا وزن فعلن چار بار مستعمل ہوا ہے! ساتویں سطر یہ بھی بالکل برعکس اوزان میں ہے آٹھویں سطر میں ابتدائی سہ حرفی رکن غائب باقی سطر فعولن کے وزن پر مکمل۔ نویں سطر! فعولن کے وزن پر بالکل درست ہے! دسویں سطر: بالکل درست فعولن کے وزن پر گیارھویں سطر بھی درست بارھویں سطر بھی درست۔ تیرھویں سطر کا ابتدائی رکن سہ حرفی (تعین حرفی) غائب۔ ۱۴ دیں اور ۱۵ ریں سطر فعولن کے وزن پر درست ہے

(ذوالقدر خاطر حافظی)

غالب اور بھوپال

غالب کے بھوپال میں پانچ شاگرد تھے یہاں اپنے شاگردوں کے علاوہ غالب کی دوسرے علم دوست حضرات سے بھی خط و کتابت تھی۔ یہاں نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت عمل میں آئی گئی اور حیثیتوں سے بھی غالب کا کوئی نہ کوئی تعلق اس سرزمین سے ضرور رہا ہے۔ اس تعلق کو بنیاد بنا کر میں ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں اپنے وسائل کے مطابق مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ ساری کوششوں کے باوجود اس سلسلے میں کوئی چیز نظر سے چوک جائے۔

میں اس مراسلہ کے ذریعہ غالب شناسوں، ان پر کام کرنے اور ان پر کئے گئے کام پر نظر رکھنے والے دوسرے اصحاب سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کی نظر سے جو بھی چیز میرے موضوع سے متعلق گزری ہو اس کی مجھے اطلاع دینے کی زحمت گوارہ کریں۔

میں نہ صرف ان کا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں گا بلکہ ان اصحاب کے حوالے سے ان کی دی ہوئی معلومات کا کتاب میں تذکرہ بھی کروں گا۔

(آفاق احمد صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال)

جامعہ ملیہ میں اردو ذریعہ تعلیم نہ رہے گی تو کہاں رہے گی

جلسہ تقسیم اسناد میں رشید احمد صدیقی کا خطبہ

دہلی، ۳۰ر اکتوبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جلسہ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے اردو کے ممتاز صاحب طرز انشاپرداز رشید احمد صدیقی صاحب نے کہا "اردو تاریخ کے سیل نے اماں کی زد پر ہے جو لوگ اس زبان کے بولنے والے ہیں یا اس سے علمی و ادبی دلچسپی رکھتے ہیں جامعہ جیسے ادارے سے ان کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ جامعہ میں اردو ذریعہ تعلیم نہ رہے گی تو کہاں رہے گی اور اردو کا اعلا تنقیدی و تحقیقی کام اس درسگاہ میں نہیں ہوگا تو کہاں ہوگا اس لئے جامعہ میں علوم السنہ، اسلامی تاریخ اور فلسفہ کے ساتھ ایک اعلا اردو تحقیقاتی ادارے کا قیام اور ایم۔ اے کلاسوں کا دوبارہ اجرا ازبس ضروری ہے جامعہ عثمانیہ مرحوم ہو چکی، جامعہ کو جیتے جی مرحوم نہ ہونے دیجئے۔

جامعہ کے اس جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جو امیر جامعہ ہیں کی۔ اور ۲۵۵ طلبہ اور طالبات کو ڈگری اور ڈپلوما ملے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے ایک برس کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی رشید صاحب نے جامعہ کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے لئے حکیم اجمل خاں مرحوم کے ان الفاظ کا حوالہ دیا "ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے چنانچہ اس امر کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا۔ جہاں ہندو طلبہ کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم و تفہم پر منحصر ہے۔"

رشید صاحب نے کہا کہ جامعہ نے ان بنیادی مقاصد کے حصول کے لئے ایک ایسے نصاب تعلیم کی تشکیل کی جو نہ مشرق سے بیزار تھا اور نہ مغرب سے حذر کرتا تھا جس میں دینی اور اخلاقی تعلیم لازمی جزو کے طور پر شامل تھی اور مادری زبان یعنی اردو اصولی طور پر ذریعہ تعلیم بنائی گئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے سیاسی حالات اور رد و بدل کے ساتھ ساتھ جامعہ کے منصب اور مقاصد دونوں میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ اب وطن آزاد تھا اس لئے اس کا ہر ادارہ ایک قومی ادارہ تھا اور اس کے تحفظ و ترقی کی ذمہ داری قومی حکومت پر تھی بدیسی حکومت اور بدیسی نظام تعلیم کے خلاف جامعہ کا جو رول رہا تھا وہ ختم ہو گیا اور ہندوستانی قومیت کے مزاج و معیار کا مسئلہ سامنے آیا۔ آزادی کے بعد کی ابھرتی ہوئی رجعت پسند طاقتیں اس کو جو مخصوص مزاج یا موڑ دینا چاہتی ہیں ہندوستان کی بیشتر اقلیتیں اس کو اپنے لئے سازگار نہیں پاتیں۔ ان اقلیتوں کے سامنے ابھی وہی منزل مقصود ہے جس کی روشنی گاندھی جی نے دکھائی تھی۔ اور جس کے حصول کے لئے پنڈت نہرو آخری وقت تک کوشاں رہے۔ آزادی کے بعد اردو کے موقف میں جو بڑی تبدیلی ہوئی ہے اس کا اثر جامعہ جیسے اداروں پر خاص طور سے پڑا۔ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ جامعہ ملیہ اعلا تعلیم کا ایسا تنہا ادارہ تھی جہاں اردو ذریعہ تعلیم تھی یہاں اعلا معیار کی تالیف و تراجم کا کام کیا جا رہا تھا اور اساتذہ کی ایک نسل تیار کی جا چکی تھی جو مختلف علوم پر اردو میں درس دینے کے اہل تھے یہاں تک کہ یہ کہنے میں پس و پیش نہیں کیا جا سکتا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا جو تجربہ کیا گیا اس میں اردو کو جیسی ہمہ جہتی کامیابی نصیب ہوئی اس کی مثال آج تک ملک کی کوئی دوسری زبان پیش نہ کر سکی۔"

رشید صاحب نے کہا "اس پس منظر میں جامعہ پر اردو اور اردو پر جامعہ کا جو حق ہے اس کو کسی طرح نظر انداز نہ کرنا چاہئے ہندوستان کی غیر مذہبی ریاست میں جو لوگ اردو زبان کے تعلیمی اداروں کے قیام یا ان کی توسیع و ترقی کے مخالف ہیں وہ اس ملک کے ہرگز خیر اندیش نہیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ملک کا خیر اندیش نہ ہونا کسی شہری یا جماعت کا بدترین جرم اور اس کی آخری توہین ہے ملک کی لسانی اور تہذیبی صدرنگی کو یک رنگی میں تبدیل کرنے کی کوشش ملک کے امید افزا مستقبل کے حق میں بڑی بدشگونی ہے جس کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں کوتاہ نظری اور خود مطلبی کی وجہ سے ملک کمزور اور بے اعتبار ہونے لگتا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم سنبھل جائیں اور اپنے ہی دامن کو اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار ہونے سے بچائیں ایسی زبان جو ملک کے شائستہ لوگوں کی مادری ادبی، علمی اور تہذیبی زبان ہو اور اپنے منفرد امتیازات کے سبب سے اندرون و بیرون ملک یگانگت اور یکجہتی کا بڑا موثر و مبارک وسیلہ ہو اسے اس کے حق سے محروم کرنا اس کی خدمت کو نظر انداز کرنا اور اس سے اچھے کاموں میں مدد نہ لینا کیا کہوں کہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے البتہ اپنے اور آپ دونوں کے اس عقیدے کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر مادری زبان قومی زبان ہے اور کسی مادری زبان کو مٹایا نہیں جا سکتا اس لئے کہ ماں ابدی اور لازوال ہے۔"

رشید صاحب نے کہا "جامعہ کی تاریخ وہ ہے کہ اس کے کارکنوں نے کبھی فرقہ پرستی کی سو اصطلاحوں اور تنگ دائروں میں نہیں سوچا نہ عمل کیا۔ انھوں نے کہا کہ جن لوگوں نے جامعہ کو قائم کیا وہ ہندوستان کے مانے ہوئے مشترک اور معتبر ہندو مسلمان لیڈر تھے انھوں نے جامعہ کی منزل اور رسم و راہ کو متعین کیا جس کے مطابق کارواں سرگرم سفر رہا اور اب تک ہے وہ اچھے اور

بڑے لوگ شامل ہیں وہ آج سے اتنے ہی وزرا اور نفوررکھتے جتنے ہندستان کے آرزو اور عزائم سے قریب ان ہی کی سرفروشی سے ہندوستان کو سربلندی حاصل ہوئی اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں خوف نہ کھانا چاہئے کہ آزاد ہندوستان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ان اداروں میں ہے اور اس کے خدمت گزار ایسے لوگوں میں سے ہیں جن پر بھروسہ اور جامعہ جس آزادی اور وفاداری سے اپنے نصب العین کو نگاہ میں رکھتی ہے اس کا احترام کرنا چاہئے۔

حکومتوں کے بدلنے سے اقدار و عقائد نہیں بدلتے بلکہ کام کرنے کے نئے نئے حوصلے اور نئے نئے میدان سامنے آتے ہیں کسی ایسے ادارہ کے کردار اور کریکٹر کو بدلنا صحیح کہ جامعہ اور اس قبیل کے دوسرے علمی، تعلیمی اور تہذیبی ادارے ہیں اچھی اور آزاد حکومت کا نہیں مریض ذہنیت اور کھوٹی نیت کا شیوہ ہے ارباب جامعہ ان عناصر و عوامل کو قوی اور بحال رکھنا چاہتے ہیں جو اس ادارے کی نیک نامی اور فیض رسانی میں معین رہی ہے اور ان رجحانات کے حق میں نہیں ہیں جو اس کے بنیادی اصول و عقیدے میں تحریف و تبدیلی کے درپے ہیں۔ یہ بنیادی اصول و عقائد وہ ہیں جن کو ہمارے محسنوں نے علم و ہنر اور شائستگی کو پھیلانے اور تقویت پہونچانے کے لئے خدا کے گھر میں اس کے نیک بندوں کی موجودگی میں ان کی گواہی کے ساتھ آج سے کم و بیش ۴۸ سال قبل مانا اور مقرر کیا تھا بلاشبہ آج بھی ہم اسی پیمان پر قائم رہنا چاہتے ہیں سیاست و جماعت کے جبر کو جانتا ہوں لیکن علم اور انسانیت پر ان کے غلبہ پانے کو نہیں مانتا ہوں

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی طویل تقریر میں جو ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے جامعہ کی حیثیت رتبہ اور مقاصد اور اردو کے علاوہ نوجوانوں کے مسائل اور دنیا کے حالات کا بھی تذکرہ کیا۔ اور اس سلسلے میں ان کو مفید مشورے دئے انھوں نے اردو شعر و ادب میں جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دونوں کے کارناموں کا تذکرہ کیا اور جدید شعر کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

آخر میں رشید صاحب نے طالب علموں سے کہا "دعا کرتا ہوں کہ آپ جس دنیا میں داخل ہو رہے ہیں وہ آپ کو بگاڑ نہ سکے آپ اسے بنا سکیں آپ کو دیکھ اور پا کر لوگ یہ کہیں کہ مصیبت و بیکسی کی دنیا میں ایک اچھا آدمی موجود ہے اور جب اس دنیا کو خیرباد کہیں تو لوگ اس کا اقرار کریں کہ ایک اچھا آدمی اٹھ گیا۔ (قومی آواز)

بہار کی خبریں

صاحب گنج میں لسانی سروے کمیٹی کی آمد

بیرن پور بنتھال پرگنہ ضلع انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ و عام کا ایک مشترکہ جلسہ صدر مقام صاحب گنج میں زیر صدارت الحاج جناب غلام حسین صاحب ایڈوکیٹ بمقام دارالامان، حبیب پور صاحب گنج منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں جناب فیاض الرحمن ایم اے ڈیپ ال۔ ایڈ، جناب معین انصاری و جناب کمال الدین صدیقی اراکین لسانی سروے کمیٹی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ کونسلر و ممبران حضرات کے علاوہ کافی تعداد میں ہمدردان اردو نے بھی شرکت کی جناب فیاض الرحمن نے ایک مختصر تقریر میں لسانی سروے کمیٹی کی غرض و غایت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اولاً گریرسن نے لسانی سروے کیا تھا لیکن وہ مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے اب ہمیں اپنے طور پر بہار میں لسانی سروے کرنا ہوگا اور تب ہی ہمیں اپنی زبان اردو کے بولنے والوں کا تعداد کا صحیح پتہ چل سکے گا۔ ہمیں ابھی سے ہی لسانی تعلیمی اور تنظیمی میدان میں کود پڑنا ہوگا۔ سارے ہندوستان میں اخبارات و رسائل و جرائد کی اشاعت کو پھیلانا ہوگا اور تب ہماری مانگیں مضبوط ہو سکیں گی۔ جناب معین انصاری نے کہا کہ ہمیں سارے بہار میں ابتدائی سطح سے لے کر تا یونیورسٹی سطح پر تعلیمی اداروں کا جال بچھانا ہوگا اور تب ہم ۱۹۷۰ء میں بہار میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے جناب کمال الدین صدیقی نے کہا کہ ہم نے اب طے کر لیا ہے کہ اپنی پیاری زبان اردو کو مٹنے نہیں دیں گے اس کے لئے سر دھڑ اور جان کی بازی لگانی ہوگی ہر تحریک کوئی قربانی چاہتی ہے جب تک قربانی نہیں دی جائے اردو کا بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ آج ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں کل ہم آگے بڑھ کر اسے لے لیں گے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ سارے بہار میں تنظیمی امور کی طرف توجہ دی جائے اور اردو کی تنظیم کو ایک منظم جماعت کی شکل دی جائے۔ ہم اردو کا حق ادا کرکے ہی دم لیں گے ضلع انجمن کے ایک اہم رکن جناب محمد اعظم نے بھی اپنی تقریر میں جناب کمال الدین صدیقی کی باتوں کی حمایت کی جناب کمال الدین صدیقی نے درج ذیل تجاویز پیش کیں جو متفقہ طور سے منظور ہوئی۔

(۱) بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے بہار میں اردو کے مطالبات منوانے کے لئے جتنے بھی اقدامات کئے ہیں وہ بجا اور ٹھیک تھے سنتھال پرگنہ ضلع انجمن ترقی اردو اپنی مکمل حمایت کا اظہار کرتی ہے۔

(۲) یہ نشست ارکان لسانی سروے کمیٹی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو مکمل طور پر لسانی سروے کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کرنے کا یقین دلاتی ہے۔

(۳) جامعہ اردو علی گڑھ کی جانب سے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات ہر سال ہوا کرتے ہیں جس میں ملک و بیرون ملک کے تقریباً ۱۰ ہزار طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں امتحانات کے مراکز قائم ہیں۔ ملک کی مشہور یونیورسٹیوں اور بورڈوں نے ان امتحانات کو تسلیم کر لیا ہے لیکن اب تک صوبہ بہار کی کسی یونیورسٹی یا بورڈ نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ لہٰذا بہار ریاستی

انجمن ترقی اردو کو متوجہ کیا جائے کہ وہ امتحانات جامعہ اردو علی گڑھ کو صوبہ بہار میں تسلیم کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔ شرکا میں جناب حسن اللہ (اڈوکیٹ) سکریٹری ضلع انجمن ترقی اردو، سراج الاسلام صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ تال جھاری، ابراہیم ہمایوں کوکب، بدر الدین، محمد قاسم، محمد عطاء الدین و دیگر افراد تھے۔ جناب حسن اللہ نے ضلع انجمن کی طرف سے سالانہ سرپرستی کمیٹی کو ۰ ۵ کی رقم سے مالی تعاون کا یقین دلایا۔ آخر میں جناب صدر کی اجازت سے جلسہ برخاست ہوا۔

ہیرن پور میں "یوم سرسید"

ہیرن پور۔ انجمن ترقی اردو ہیرن پور کے زیر اہتمام "یوم سرسید" کی تقریب زیر صدارت جناب میشور پرشاد سنگھ منائی گئی۔ جنرل سکریٹری جناب کمال الدین صدیقی نے سرسید کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں بیسویں صدی کا سب سے اہم ریفارمر قرار دیا۔ جناب رہم دیو پٹیل، ابوالخیر، ابوالقیس، مولوی عنایت اللہ و جناب سد لال کھگتہ نے اپنی تقریروں میں سرسید مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ریلوے ہائی اسکول صاحب گنج کا معاملہ لیت و لعل میں

ہیرن پور۔ ریلوے ہائی اسکول صاحب گنج میں تقریباً ۵ برسوں سے خالی جگہ پر ابھی تک اردو ٹیچر کی بحالی نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ریلوے ملازمین اردو داں عوام کی طرف سے کئی عرضداشتیں ریلوے حکام کو کئی بار روانہ کی گئیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ جناب کمال الدین صدیقی، نائب سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے گذشتہ ساتویں بہار ریاستی اردو کانفرنس میں اس سلسلے میں ایک تجویز بھی منظور کرائی تھی اور جناب رام اوتار شاستری ایم۔ پی نے پارلیمنٹ کے گذشتہ اجلاس میں جناب کمال الدین صدیقی کی گذارش پر مرکزی وزیر ریل سے مراسلت بھی کی تھی اور خاطر خواہ کارروائی کا وعدہ بھی کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی ہے۔ اگلے ماہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں جناب شاستری پھر اس سلسلے میں سوال کریں گے۔ (نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو بنارس کا جلسہ

انجمن ترقی اردو بنارس کے زیر اہتمام اور جناب پروفیسر سید حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کی زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے چوبیسویں اجلاس منعقدہ سنسکرت یونیورسٹی وارانسی میں شرکت کے لئے باہر سے آنے والے اور مقامی معروف شخصیتوں و مندوبین نے شرکت کی۔ جناب صدر جلسہ نے اپنے انتخاب صدارت پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد جناب بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب ایم۔ اے صدر انجمن ہذا نے بنارس میں اردو کا جو کام ہوا ہے اس کو مختصراً بیان کیا۔ جناب صدر کی فرمائش پر جناب ڈاکٹر ہرنام سنگھ شان صاحب نے اردو زبان کی موجودہ حالت اور مستقبل پر بحث کرتے ہوئے اردو کو ہندوستان کی ایک ہمہ گیر زبان اور ہندوستان کی ایک ناقابل انکار وراثت بتایا اور فرمایا کہ اردو جہاں ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے اسی طرح عربی و فارسی کے لئے ایک رابطہ ہے فرمایا کہ اس زبان کو دنیا میں کوئی مٹا نہیں سکتا یہ ایک ورثہ ہے سب زبانوں کی عزت ہے مگر جتنی سلاست، مٹھاس و لطافت اس زبان میں اور عام طور پر اس کے شعروں میں ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہی وہ زبان ہے جس کو ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب بولتے ہیں اس کو بچوں، بوڑھوں نے عورتوں و مردوں نے مل کر ہندوستان کی ایک مجموعی تہذیب کا ایک گلدستہ بنا کر پروان چڑھایا ہے اور یہ زبان سب کی پیاری رہے گی، زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ پنجابی زبان کا اردو زبان سے لازم و ملزوم کا رشتہ ہے جن لوگوں نے اس کے سرسبز و شاداب ہونے کے لئے کوشش کی ہے ان کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ جناب پروفیسر اختر تاری صاحب نے کہا اردو سے ہمدردی کا جذبہ تو سب کے دل میں ہے مگر عملی طور پر ہم کچھ نہیں کرتے مثال کے طور پر اگر ہر اردو کا دلدادہ ایک ایک روپیہ کی اردو کی کتاب خریدے تو اردو کی ترقی و تبلیغ میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے گورنمنٹ یا حکومت پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے صرف جلسہ و جلوس سے کام نہیں چل سکتا بلکہ تعمیری کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر گورینکر صاحب (بمبئی یونیورسٹی) نے فرمایا کہ اردو کی ترقی کے لئے صرف جلسے یا زبانی باتیں یا حکومت سے امید رکھنے سے کام نہ چلے گا بلکہ عملی اقدام کی ضرورت ہے شور مچانے سے زیادہ خاموش عملی سرگرمی کی ضرورت ہے اس کے بعد مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یونیورسٹیوں میں سے ۵ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم ایم۔ اے تک ہے اور کسی کسی میں ریسرچ کا انتظام ہے اور مہاراشٹر کی سرکار گزٹ میں اردو میں خبر شائع ہونے کو دیتی ہے۔ آخر میں جناب سید محمد سلیمان عباس رضوی صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی و صدر انجمن ترقی اردو بنارس نے اپنی طرف سے اور اراکین خصوصی کی طرف سے مہمان خصوصی کا ان کی تشریف آوری اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور یہ فرمایا کہ ہر مذہب والوں کی مجموعی کوشش کے نتیجے میں یہ زبان نکلی ہے یہ سب کا ورثہ ہے محبوب زبان ہے دیگر حضرات نے جو تقریریں کیں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ لگن و عملی طور سے کام کرنا چاہئے عملی جد و جہد سے ترقی ہو سکتی ہے ہم لوگ خود چاہیں گے تو یہ زبان زندہ رہے گی ورنہ نقصان ہوگا۔

(داتا رسول)

سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس

روسی جرنلسٹوں کا وفد دفتر انجمن ترقی اردو دہلی میں

دہلی، روسی جرنلسٹوں کا ایک وفد جو سوویت عورت، رسالہ کے ادارے سے تعلق رکھتا ہے ۲، اکتوبر کی شام کو انجمن ترقی اردو کے دفتر میں حمیدہ سلطان کی دعوت پر آیا۔ وفد کی نمائندہ خاتون نے اور دیگر اراکین نے مبیح اکے نمبر دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک خاتون ترقی اردو کا کام تندہی سے انجام دے رہی ہیں۔ لیکن دلی میں جو اردو کی حسم کھوجی ہے کلاسیکل اردو کتابیں یا معیاری رسائل کے خاص نمبر اردو بازاروں میں بھی نہیں ملتے۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے یہاں سے زیادہ اچھا کام تو ہمارے ہاں اردو میں ہو رہا ہے۔ اردو کے تمام مشاہیر ادبا وشعرا کے مجموعے چھپ رہے ہیں اور بعض اعلیٰ اردو لٹریچر کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ (جنرل سکریٹری)

برطانیہ میں اردو

حیدرآباد: مولانا حافظ الحاج محمد ابراہیم صدیقی اسسٹنٹ آفیسر حکومت برطانیہ نے بتایا کہ برطانوی یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو قائم کیا گیا ہے۔ جہاں طلبہ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر رہے ہیں ہر شعبہ میں اردو کے تجربہ کار مترجم موجود ہیں۔ مولانا ابراہیم صدیقی جو پہلے حیدرآباد کے محکمہ اطلاعات کے اردو سکشن کے انچارج تھے۔ آج کل برطانیہ میں مقیم ہیں انھوں نے بتایا کہ حکومت برطانیہ کی جانب سے ہر اتوار کو ٹیلی ویژن پر اردو میں آدھے گھنٹے کا پروگرام رکھا جاتا ہے۔ اس پروگرام میں ایک اسٹوڈیو اور ایک غیر انگریزی داں کو انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے علاوہ انگریزی، اردو، پنجابی، بنگالی اور گجراتی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ برطانیہ میں اردو صحافت کی ترویج وترقی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابراہیم صدیقی نے بتایا کہ برطانیہ میں صحافت بالکل آزاد ہے۔ حکومت صحافت پر کوئی کنٹرول نہیں کرتی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے تین ہفتہ دار اردو اخبارات ملاپ، ایشیا اور مشرق نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی رسالہ آفاق اور مذہبی رسالہ طارق ان آفسٹ پر شائع ہوتا ہے ملاپ ہفتہ دار میں ہندوستان کی خبریں زیادہ رہتی ہیں۔ ہندوستان ہائی کمیشن سے بھی ایک اردو بلیٹن کا اجرا ہوتا ہے۔ مولانا ابراہیم صدیقی نے برطانیہ میں ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ عوام میں اردو شعر وادب کا ذوق بیدار ہو رہا ہے۔ ہر ماہ محفل شعر ترتیب دی جاتی ہے یوم غالب واقبال اہتمام سے منائے جاتے ہیں۔ (رہنمائے دکن)

برطانیہ کے پولس مینوں کو اردو سے دلچسپی

برمنگھم۔ وارچے کے پولس کے ملازم پنجابی اور اردو میں آس دلچسپی لے رہے ہیں کہ میونسپل کونسل کے ایک ممبر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کے لئے شام کے وقت اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی کلاسیں جاری رہیں گی کچھ پولس مین اب بھی برمنگھم کی شام کی کلاسوں میں یہ دونوں زبانیں سیکھ رہے ہیں تاکہ ان کا غیر ملکیوں سے براہ راست رابطہ قائم ہو سکے۔ (الجمعیۃ)

کینیڈا میں اردو

مونٹریال۔ دوسرے مغربی ممالک کی طرح کینیڈا میں بھی ہندوستان سے دلچسپی لی جا رہی ہے چنانچہ شاستری انڈو کینیڈین انسٹی ٹیوٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو مونٹریال کی میک گل یونیورسٹی میں مضبوطی سے قدم جما رہا ہے۔ یہ ادارہ کینیڈا میں ہندوستانیات کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس وقت چار ادارے (جن میں میک گل البرٹا اور برطانوی کولمبیا کی یونیورسٹیاں اور نیشنل لائبریری شامل ہیں) مل کر اس منصوبہ کو چلا رہی ہیں۔ چنانچہ ان یونیورسٹیوں میں ہندوستانی ادب کے بارے میں ترسیتی کلاسیں جاری کر دی گئی ہیں میک گل یونیورسٹی میں ۱۲ طلبہ ہندی کے انڈر گریجویٹ کورسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں اسلامیات کے کورس بھی جاری ہیں ان کورسوں میں اکثر طلبہ اردو پڑھتے ہیں برطانوی کولمبیا یونیورسٹی میں ۸۰ طلبہ ہندوستانی مضامین کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ (سیاست)

غالب کی سوویں برسی کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو مالیگاؤں کا جلسہ

مالیگاؤں: ترسیتی مرکز میں انجمن ترقی اردو، شاخ مالیگاؤں کی جانب سے ایک میٹنگ جناب پروفیسر حفیظ انصاری صاحب کی صدارت میں ہوئی جس میں بمبئی کے مہمان بیرسٹر سالک انصاری پروفیسر ابراہیم رنگلا، انجم رومانی، شکیب بنارسی اور نورالرحمٰن الوکی کے علاوہ شوکت عزیز، لطیف جعفری اور احمد عثمانی شریک تھے۔ ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تجویزیں زیر بحث رہیں۔

(۱) طلبہ اور نوجوانوں کے لئے جامعہ ملیہ دہلی کے گروپ کا پروگرام منعقد کرنا۔
(۲) ترسیتی مرکز کے پہلے منزلے پر غالب ہال تعمیر کرنا۔
(۳) کالج کے طلبہ کے لئے اسکالرشپ جاری کرنا۔
(۴) مرزا غالب سے متعلق مقامی شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کرنا۔
(۵) سیف مارکیٹ سے مالیگاؤں ہائی اسکول، چندن پوری پولس کچہری اور خانقاہ کی مسجد تک جانے والی سڑک کا نام "غالب روڈ" رکھنا۔
(۶) عید کے تہوار پر ادبی پروگرام ترتیب دینا۔
(۷) غالب یادگار کمیٹی کا قیام عمل میں لانا۔

آخر میں ایک عارضی کمیٹی بنائی گئی۔ جو مقامی ادبی انجمنوں میوزک کلبوں، اسکول اور کالج کی تنظیموں کے ذمہ دار حضرات اور اخبارات کے نمائندوں کے تعاون سے نومبر ۶۸ء میں وسیع پیمانے پر مشورتی میٹنگ طلب کرے گی۔

(شعبان انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو مالیگاؤں)

لکھنؤ اسکول کے شعرا کی یادگار تقریب منائی جانے کا فیصلہ

لکھنؤ۔ انجمن فردوس ادب لکھنؤ کے اراکین کی ایک مخصوص نشست نے لکھنؤ میں ان شعرا کی ایک یادگار تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن سے لکھنؤ اسکول کی ادبی تاریخ وابستہ ہے اور جو شعر و ادب کی دنیا میں مشعل راہ کا کام دے رہی ہیں۔ یہ تقریب لکھنؤ میں غالب کی آمد کے احترام میں منعقد ہوگی اور بتایا جائے گا کہ اس دور میں لکھنؤ کیا تھا۔ تقریب ایک عنوان "لکھنؤ شعر و ادب کے آئینے میں" سے دسمبر ۱۹۶۸ء کے آخری ہفتہ میں منائی جائے گی اس تقریب کے سلسلے میں مشاہیر ادبا سے مندرجہ ذیل عنوانات پر مقالات لکھنے اور شرکت کرنے کے لئے درخواست کی جائے گی "تاریخ تہذیب لکھنؤ"، "لکھنوی تہذیب کے اہم عناصر"، "لکھنوی تہذیب کا دور عروج و زوال"، مصحفی، جرات، انشا، سعادت یار خاں کا دور، ناسخ و آتش کا دور اور اس کے بعد متاخرین کا دور اور اسی سلسلہ میں ایک باب لکھنؤ میں غالب کی آمد اور ان پر لکھنوی تہذیب اور شعر و ادب کے اثرات پر بھی مقالات شامل ہوں گے۔ (قومی آواز)

ہندی ریاستوں کی تمام یونیورسٹیوں میں ۱۹۷۳ء تک ہندی ذریعہ تعلیم ہو جائے

پٹنہ مرکز کے نائب وزیر تعلیم بھگوت جھا آزاد نے ہندی بولنے والی ریاستوں میں یونیورسٹی کے وائس چانسلروں پر زور دیا ہے کہ وہ انجینئرنگ قانون اور انگریزی کلچر سمیت تمام فیکلٹیوں میں ذریعہ تعلیم بدل کر ۱۹۷۳ء تک ہندی رائج کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہندی کی کتابوں کی تیاری میں ارتباط قائم کرنے کے لئے بنائی جانے والی وائس چانسلروں کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی دوسری میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہاں کمیٹی کے ممبروں پر ایسا انتظام کرنے کے لئے کافی زور دیا کہ درسی کتابوں کی کمی کی وجہ سے یہ پروگرام ناکامیاب نہ ہو جائے۔ آزاد نے کہا کہ ہندی بولنے والی تمام ریاستوں میں درسی کتابوں کی تیاری کے لئے با اختیار ادارے قائم کئے گئے ہیں یا قائم کئے جا رہے ہیں۔ بہار اور راجستھان کی حکومتوں کو پانچ پانچ لاکھ روپیہ مرکز سے دیا گیا ہے یوپی اور ہریانہ کی پیش کی ہوئی اسکیمیں زیر غور ہیں اور ان کے بارے میں جلد ہی فیصلہ کیا جائے گا۔ (سیاست)

صفحہ ۵ سے آگے

طور پر موجود ہوں اور یہ آتش مقدس اگر واقعی اس کے دل میں موجود ہو تو اس کا تخلیقی چشمہ ہمیشہ کے لئے کبھی نہیں سوکھ سکتا اس لئے اسے اپنے سابقہ انفرادی تجربہ کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ فلیمنگ نے اس بارے میں جو حد شائستہ ظاہر کئے ہیں وہ صرف ان ادیبوں پر صادق آتے ہیں جو اصل میں ادیب نہیں ہوتے بلکہ کئی طرح کی دنیاوی ضروریات کے تحت مصلحتاً اس میدان میں آ جاتے ہیں۔

میرا صفحہ

میکسی کو میں اولمپک کھیلوں سے قبل طلبہ نے بڑے پیمانے پر ایک مظاہرہ کیا۔ ان کو اپنی حکومت سے کچھ شکایات تھیں پولیس نے ان پر گولی چلائی اور خاصی تعداد میں لوگ مارے گئے بالآخر ہنگامہ پر قابو پالیا گیا کچھ دن اخباروں میں اس بات کا چرچا ہوا۔ پھر لوگ بھول بھال گئے مگر ہندستان میں میکسی کو کے سفیر آکٹیو یوپاز نے جو ایک ممتاز شاعر اور ادیب ہیں ہسپانوی میں ایک نظم لکھی۔ یہ نظم میکسی کو کی حکومت کو ناگوار ہوئی اور بالآخر پاز کو اپنے عہدے سے استعفا دینا پڑا۔ اس نظم کا انگریزی ترجمہ ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ میں شایع ہوا ہے جس سے اخبار اسٹیٹس مین دہلی نے اسے نقل کیا ہے ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لئے اس نظم کا بے تکلف اردو ترجمہ درج ذیل ہے:۔

ایک چھوٹا سا خراج عقیدت

(قربانیوں کے دیوتا اور اس کے پروہت کے حضور میں)

شاید اس صفحہ کی صاف شفاف سطح پر یہ بات لکھنے کے قابل ہو
یہ سب کچھ (جو ہو رہا ہے) نا صاف ہے
یہ ایک قیامت ہے
(پیلا پیلا، کالا کالا،
ہسپانوی میں غم و غصے کا ملغوبہ)
کاغذ کی سطح پر پھیلا ہوا
کیوں؟
شرمندہ عقدہ ہے
جو ایسے پر اتارا جائے
اگر پوری قوم ایسے کو شرمندہ کرنی ہے
تو یہ ایک شیر ہے جو جھکتا ہے
جست لگانے کو
(چنگی کے کارندے خون کے دھبے صاف کر دیتے ہیں)
قربانیوں کے بازار میں
مگر دیکھ لو
وہاں دھبے ہی دھبے ہیں
قبل اس کے کہ کوئی بات کہی جائے
جو اس قابل ہو
کہ اسے صفائی سے تعبیر کیا جا سکے

۱۵ر اکتوبر کو دہلی کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور مصوروں کی طرف سے آکٹیو یوپاز کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا جس میں دوستی چاہ پر نے انکو خراج عقیدت پیش کیا، ابراہیم القاضی نے اس کا ہسپانوی نظم کا انگریزی ترجمہ سنایا اور سردار جعفری نے 'جبر' پر ایک نظم پڑھی۔ پاز نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا "ایک فنکار زندگی کا جشن منانا چاہتا ہے لیکن جب انصاف نہ ہو تو ایک شاعر کو بغاوت کرنا چاہئے اور اس صورت حال پر نکتہ چینی کرنی چاہئے۔ اس نے کہا کہ اس کی نظم ان طلبہ کے ساتھ جن پر ظلم ہوا تنہا یگانگت (LONE SOLIDARITY) کی ایک علامت ہے۔

پاز نے نوجوانوں کی عالمی تحریک سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج تمام نظریے خواہ وہ دائیں بازو کے ہوں، یا بائیں بازو کے، تضاد کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہیگل اور مارکس کے ایجادات (INVENTIONS) کو حقائق نے شکست دے دی ہے۔ آج کے نوجوان اس لئے ناآسودہ ہیں کہ ہم نے کوشش تو ایک جنت بنانے کی کی، مگر دراصل اپنے گرد و پیش ایک جہنم تعمیر کر لیا ہے۔ آج کے نوجوان اس سماج سے مطمئن نہیں ہیں جو ہم نے ان کے لئے بنایا ہے اور وہ کسی نئی چیز کی تلاش میں ہیں ان نوجوانوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کیسا سماج بنانا چاہتے ہیں لیکن ایک بات یقینی ہے۔ ایک نئے سماج کی تلاش میں وہ فلسفیانہ نظریوں (IDEOLOGIES) کی طرف نہیں شاعری کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

پاز نے مزید کہا کہ موجودہ خوشحالی جرمن رومانی شاعروں اور بلیک وغیرہ کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے محنت اور انسانیت کی قدر پر خاص طور سے زور دیا۔

پاز نے جس طرح اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اس کے لئے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس نے نوجوانوں کی بے چینی کے جن اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے ان پر غور بھی ضروری ہے۔ اس کا یہ خیال کہ آج کے نوجوان ایک نئے سماج کی تلاش میں فلسفیانہ نظریوں کے بجائے شاعری کی طرف دیکھ رہے ہیں، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نظریوں کی ادعائیت اور اس کی وجہ سے سب کو پٹری پر چلانے کی عام روش کے خلاف نوجوانوں میں جو جذبہ ہے، اس پر غور کرنا چاہئے شاعری ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ اس ضمیر کو آزاد رکھنا اور ظالم حکومتوں یا نظریاتی کٹھ ملاؤں، یا عطائیوں یا آمروں کے شکنجے سے اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ آج خس و خاشاک بھی بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتے ہیں اس لئے شاعر اور ادیب کا کام اس چنگاری کی حفاظت ہے جو اسے عطا ہوئی ہے تاکہ وہ اپنے احساس، اپنے ضمیر، اپنے تجربے، اپنی فکر کی ترجمانی کر سکے خواہ وہ کسی راستے سے اس منزل تک پہنچا ہو مگر یہ اس کا خود دریافت کیا ہوا راستہ ہو اور اس نے اپنے درد و داغ، سوز و ساز، آرزو اور جستجو سے پایا ہو ؎

خس و خاشاک کی بیدادگری عام ہے آج　　اپنے شعلے کو بچا لے یہ بڑا کام ہے آج

خوشی کی بات ہے کہ دنیا اکٹیو یاز جیسے بظاہر سر پھروں اور دیوانوں بلکہ دراصل صاحب دل اور صاحب نظر اشخاص سے خالی نہیں ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید جیاد علی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

R. No. 2186/57
Regd N L 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۴۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

جواہر لال نہرو کا جنم دن

۱۴ نومبر جواہر لال نہرو کا جنم دن ہے۔ اب ہندوستان میں یہ دن بچوں کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو کو بچوں سے بڑی الفت تھی اس کے پیش نظر ۱۴ نومبر کو بچوں کا دن منانا ہر طرح مناسب و موزوں ہے۔ کسی قوم کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے کیا کرتی ہے۔ ہندوستان میں صدیوں تک بچوں کو یا تو نظر انداز کیا گیا ہے یا انھیں ایک آہنی شکنجے میں رکھا گیا ہے۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ماہرین نفسیات نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ بچے کے ذہن پر جو نقوش پیدائش سے ساڑھے تین سال تک پڑتے ہیں، وہ سب سے اہم ہوتے ہیں اور بعد میں اس بنیاد پر دوسرے اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تربیت کا خاص خیال رکھا جائے، گھروں کے ماحول میں بچوں کو مناسب اہمیت حاصل ہو، نہ تو بے جا لاڈ پیار میں انھیں بگاڑا جائے نہ بے جا سختی کی جائے۔ ان کے ذہن میں کسی کا ڈر نہ بیٹھنے پائے، [illegible] کھیل کود [illegible] ہو، ان کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، انھیں کہانیوں، کھلونوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے زندگی کی شادابی اور رنگینی کا پورا احساس ہو سکے۔ جواہر لال نہرو اسے سمجھتے تھے اور انھوں نے جہاں ملک پر دوسرے احسانات کیے وہاں بچوں کی مناسب دیکھ بھال اور ان کے لئے ہر طرح کی دلچسپیاں پیدا کرنے پر بھی زور دیا۔ اس لئے ان کی یاد تازہ کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ ہم سب بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحت کی طرف توجہ کریں، انھیں زندگی کے معرکے کے لئے تیار کریں اور ان میں سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کا احساس پیدا کریں

مگر جواہر لال نہرو نے اور بھی بہت سے کام کیے تھے جنھیں ۱۴ نومبر کو یاد رکھنا چاہیے۔ انھوں نے ملک میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور سائنس کی تعلیم کو مناسب اہمیت دینے پر زور دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے سائنس دانوں کی بڑی ہمت افزائی کی۔ ملک میں قومی تجربہ گاہوں کا ایک جال پھیلایا۔ سائنس کانگریس کا شاید ہی کوئی اجلاس ایسا رہا ہو جس میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو نہ شریک ہوئے ہوں۔ آج بہت سے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جواہر لال نہرو نے کون کون سی غلطیاں کیں۔ وہ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ ملک میں آج جو خرابیاں ہیں ان کی سب سے زیادہ ذمہ داری جواہر لال نہرو کی غلط پالیسی پر ہے۔ کچھ لوگ انھیں مغل اعظم کہتے ہیں جس نے جو چاہا کیا اور کسی قابل آدمی کو پاس نہ پھٹکنے دیا۔ کچھ لوگ انھیں کمزور بتلاتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حکومت صرف وہی کر سکتا ہے جو سر تا پا آہن ہو اور جس میں ذرا سی لچک یا نرمی نہ ہو۔ کچھ لوگ انھیں ایک ایسا خوابوں کا رسیا کہتے ہیں جو حقائق سے عہدہ برآ ہونا نہ جانتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جواہر لال نہرو فرشتہ نہ تھے بندہ بشر تھے۔ ان میں بہت سی کمزوریاں بھی تھیں مثلاً وہ بہت سے کام ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے اور پھر آدمیوں کو اچھی طرح نہ پہچانتے تھے۔ بہت سے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص کرسی پر ہے اس کے خیالات کیا ہیں اور پھر وہ انھیں خیالات کو اس طرح اختیار کر لیتے ہیں جس طرح لوگ ایک لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ دراصل وہ ان کے خیالات نہیں ہوتے جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کے گرد بھی بہت سے ایسے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ جواہر لال نہرو بڑی مروت کے آدمی تھے اس لئے ان لوگوں کو گوارا کر لیتے تھے مگر ان چھوٹی باتوں کی وجہ سے جواہر لال نہرو کے عظیم کارنامے سے انکار احسان فراموشی اور ناشکرے پن کے مترادف ہوگا۔ جواہر لال نہرو جدید ذہن رکھتے تھے۔ وہ ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے۔ ان کا بڑا دماغ اور بڑا دل تھا۔ وہ ہندوستان کی پوری تاریخ پر نظر رکھتے تھے اور اس کے

کسی حصہ کو غیر ضروری اہمیت دیے اور کسی کو نظر انداز کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ہندوستان کو جاگیردارانہ مزاج سے نکال کر صنعتی دور میں لاکھڑا کرنا چاہتے تھے وہ روشن خیال تھے اور کٹرپن، دقیانوسیت، ضعیف الاعتقادی توہم پرستی، فرسودہ رسوم کی پیروی سے نفرت کرتے تھے۔ وہ عالمی تحریکوں اور مسائل پر نظر رکھتے تھے۔ انھیں سبھی قومی زبانوں سے محبت تھی، وہ شعر و ادب علوم و فنون کی بڑی قدر کرتے تھے، دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ دل سے۔ گاندھی جی نے ہمیں آزادی دلائی۔ جواہر لال نہرو نے اس آزادی کو معنی دئے۔ وہ ہماری قوم کے معمار اعظم ہیں۔ ہم ہندوستانیوں میں مرض یہ ہے کہ ہم ایسے بڑے آدمیوں کو جلد دیوتا مان لیتے ہیں جن سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ پھر کچھ دن بعد اسی دیوتا میں ہزاروں کیڑے ڈالنے لگتے ہیں۔ ہم شخصیت کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے خیالات اس کے عمل، اس کے کردار اور ان سب چیزوں کے اثرات نہیں دیکھتے۔ ہم میں جذباتیت بہت ہے۔ جذبہ اچھی چیز ہے۔ یہ مرد عقل سے زیادہ کارگر اور کارساز ہوتا ہے۔ مگر اس جذبے کی گرمی کے پیچھے ایک فکر کی روشنی بھی ہونی چاہئے جو جذبے کو سمت و رفتار عطا کرے۔ جواہر لال نہرو کے افکار و اقدار آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہو سکتے ہیں ایسے دل و دماغ کے آدمی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ قوم نے پہلے تو انھیں دیوتا بنا دیا اور اب جب ان کی پرسوز شخصیت ہم میں نہیں ہے، تو ان کے ہر کام میں عیب نکالا جا رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے خیالات سے اور ان کے کاموں سے آج بھی ہمیں اپنی منزل کا سراغ مل سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ان کے کاموں میں سے کوئی ایک کام اپنے ذمے لے لے اور اسے اس طرح کرے کہ اس کا حق ادا ہو جائے۔ جمہوریت کا استحکام۔ سیکولرزم کو قومی مزاج بنانا، سوشلزم کو ہندوستانی مزاج کے مطابق آگے بڑھانا، تمام قومی زبانوں کو فروغ دینا، سائنسی مزاج پیدا کرنا ملک کو خود کفیل بنانا، عالمی میلانات پر نظر رکھنا بیرونی معاملات میں صحیح معنی میں غیر جانبداری اور ناوابستگی کی پالیسی پر عمل کرنا۔ ترقی اور بچاؤ کو مربوط کرنا، منصوبہ بندی کر کے معیار زندگی بڑھانا، تعلیم کو بامعنی بنانا، ادبیات اور فنون لطیفہ کو ترقی دینا، نئی نسل کے جذبات و خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، ماضی کا احساس رکھتے ہوئے، اس کو ذہن پر مسلط نہ ہونے دینا، ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھنا، یہ سب کام جواہر لال نہرو نے سکھائے ہیں اور انھیں ہمیں کرنا ہے۔ نہرو کے جنم دن پر نہرو کی شان میں قصیدہ خوانی ضروری نہیں، ان کے کاموں پر نظر رکھنا اور انھیں آگے بڑھانا ضروری ہے ہندوستان اسی راستے پر چل کر ترقی کر سکتا ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

نہرو فیلوشپ

نئی دہلی۔ جواہر لال نہرو کے ۷۹ ویں یوم پیدائش کے موقع پر نہرو میموریل فنڈ کی جانب سے ۳ ممتاز اسکالروں کو فیلوشپ دئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) ڈاکٹر ایس گوپال (۲) جناب جے سوامی ناتھن (۳) ڈاکٹر وی راگھون میموریل فنڈ نے نہرو جی کی تصنیفات و تقاریر کا ایک انتخاب ۲۰ جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کے علاوہ نہرو جی کی ایک سوانح عمری بھی شائع کی جائے گی اس انتخاب کے مولف اور سوانح کے مصنف ڈاکٹر ایس گوپال ہونگے۔

غالب سے متعلق فلم

بمبئی ساون کمار ٹاک اردو کے مشہور شاعر غالب کے بارے میں ایک فلم تیار کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایسٹ مین کلر میں ہوگی مہورت کی رسم ادا کرنے کے لئے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کو دعوت دی جا رہی ہے یہ رسم دہلی میں نومبر کے آخر میں ادا ہوگی فلم کو موہن سہگل ڈائرکٹ کریں گے۔ دسمبر میں باقاعدہ شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔ مدن موہن اس کی موسیقی تیار کریں گے کیفی اعظمی نے اس کا مسودہ لکھا ہے اس میں غالب کی اپنی غزلیں ہوں گی۔ پروڈیوسر ٹاک چار مہینے کے اندر اندر اس فلم کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تاکہ غالب کی صد سالہ تقریبات کے دوران اس کی نمائش ہو سکے۔ ہندی اسکرین کا ایک مشہور ہیرو اس فلم میں غالب کا رول ادا کرے گا۔ (ریاست)

ماہنامہ شاعر کا غالب نمبر

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر غالب کی عظمت کے شایان شان ماہنامہ شاعر غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء میں پیش کر رہا ہے اس کی ضخامت پانچسو سے زیادہ ہوگی اس سلسلے میں مکمل معلومات ماہنامہ شاعر پوسٹ بکس نمبر ۲۵۴۶ بمبئی ۸ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری رہا کر دیئے گئے

لاہور۔ پاکستان کے مشہور صحافی جناب آغا شورش کاشمیری کو سپریم کورٹ کے حکم سے رہا کر دیا گیا۔ فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ آغا صاحب پر ڈفنس آف پاکستانی رولز کا یہ رول لاگو نہیں ہوتا۔ (روشنی)

ہریانہ میں ہندی سرکاری زبان، آرڈننس جاری

چنڈی گڑھ۔ ہریانہ حکومت نے ایک آرڈننس جاری کیا ہے جس کی رو سے ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء سے ہریانہ کی سرکاری زبان دیوناگری رسم خط میں ہندی قرار دی گئی ہے۔ (قومی آواز)

عبدالقوی دسنوی

مولانا ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی

مولانا ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی، مولانا ابو الکلام آزاد کے بڑے بھائی تھے جنھوں نے مولانا آزاد ہی کی طرح کم عمری ہی سے مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا آزاد کی طرح دنیائے ادب میں انھوں نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی تھی لیکن اس میں عمر نے وفا نہ کی۔ جناب مالک رام نے آہ مرحوم سے متعلق بہت تفصیلی مضمون اپنے سہ ماہی رسالہ تحریر دلی جلد ۲ نمبر ۲ میں شائع کیا ہے جس سے آہ مرحوم کی ادبی زندگی سے متعلق اچھی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے آخر میں انھوں نے آہ مرحوم کا وہ کلام بھی شائع کر دیا ہے جو انھیں دوران مطالعہ میں دستیاب ہوا ہے

اس مضمون میں انھوں نے آہ مرحوم کے مضامین کی فہرست بھی شامل کر دی ہے، اس طرح آہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مضمون بہت اہم ہیں لیکن مضامین کی فہرست میں حسب ذیل چیزیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔

تحریر (دوسری قسط) جولائی ۱۹۰۲ء خدنگ نظر

مشہور رومی نصیح	(دوسری قسط)	جنوری ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر
عالم اجسام	(تیسری قسط)	فروری ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر
فلسفہ		مارچ ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر
عالم اجسام	(چوتھی قسط)	اپریل ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر
قدیم مصریوں کے رسوم تجہیز و تکفین		جون ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر
بتوں کی بت پرستی		جولائی ۱۹۰۳ء	خدنگ نظر

"اردو کا دکھڑا اور بنگالہ" اپریل مئی کے بجائے مارچ ۱۹۰۴ء کے لسان الصدق میں شائع ہوا ہے۔

"سادہ لوحی" کے عنوان سے لسان الصدق مئی ۱۹۰۴ء میں ایک مختصر تحریر بھی ہے۔

مالک رام صاحب آہ دہلوی کی ایک تصنیف "الخیام" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نظم کے علاوہ وہ آغاز ہی سے نثر بھی لکھنے لگے تھے چنانچہ "احسن الاخبار" میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین "الخیام" کے عنوان سے لکھا جو بعد کو اسی نام سے کتابی شکل میں مطبع اصحی لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا۔"[1]

اس کتاب کا اشتہار لسان الصدق مارچ ۱۹۰۴ء میں بھی شائع ہوا ہے ملاحظہ کیجئے

الخیام

یعنی

حکیم عمر بن ابراہیم خیام کی مختصر سی سوانح عمری

مرتبہ

مولانا ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی۔ قیمت ۸ر

کاغذ عمدہ، چھپائی صاف خوش نما، نامکمل ہیچ اپنی طرز کا، عمر خیام جس کی فارسی رباعیاں مشہور عالم ہیں اس کے حالات میں یہ رسالہ مفید نوٹوں کا مجموعہ ہے اور پہلا ہے اب تک کوئی رسالہ اردو میں شائع نہیں ہوا تھا، یہ پہلی کوشش ملک کو متوجہ کرنے کے لئے بہت کچھ ہے، ہر تعلیم یافتہ کو ایک مرتبہ اسے ضرور دیکھنا چاہئے۔ ہمارے پاس اس کے کم نسخے ہیں۔ ہر درخواست کی تعمیل بذریعہ وی پی ہو سکتی ہے۔"

(محمد یوسف جعفری نخشا ساجد اسٹریٹ نمبر ۱۶۔ کلکتہ)

[1] تحریر جلد ۲ نمبر ۲ صفحہ ۳

اسرار اکبر آبادی

پھندے

رات نے سحر بن کر
جاگتے خیالوں کے خواب توڑ ڈالے ہیں
نیند ابھی ادھوری ہے
جاگنا ضروری ہے
کھوئی کھوئی سڑکوں پر لو وہ بھیڑ آ پہنچی
گرم ذہنوں میں
حسرتوں کے چھالے ہیں
نوک دار چھالوں سے آگ سی نکلتی ہے
لاشعور جلتا ہے
دکھ رہی ہیں سب آنکھیں
سامنے دھواں سا ہے
خشک خشک ہونٹوں کی پپڑیاں کھنچی ہیں
تیز تیز سانسوں میں
دو جہاں کے پھندے ہیں
انگ انگ بھاری ہے
بھاگ دوڑ جاری ہے
کیا حسین دھوکا ہے
آگہی بھی الجھی ہے رہبری بھی بھٹکی ہے
جسم کے تقاضوں کو
سب کہاں سمجھتے ہیں
روح کی لطافت کو لوگ کیوں مٹاتے ہیں
دونوں ہی حقیقت ہیں
میری کون سنتا ہے

...اختر

رفتار

(دوسری قسط)

کسی بھی قوم یا ملک کی ادبی روایت اس قوم کے تہذیبی ارتقا اور
ت ہی سے متعین ہوتی ہے انسانی ارتقا کی تاریخ تہذیبی ارتقا ہی کی
یخ ہے، صرف حیاتیاتی یا عضویاتی ارتقا کی تاریخ نہیں تہذیب میں
ہیں کے آداب، زبان، رسم
اج اور عام سماجی ادارں
علاوہ مذہب، فنون لطیفہ،
ب اور فلسفہ بھی شامل ہیں تہذیب
ہ صرف معاشرتی روایت نہیں
ایک مخصوص طرز فکر و احساس سے
عبارت ہے۔ اس میں کوئی شک
ں کہ مذہب نے انسان کی تہذیبی
خ میں بڑا اہم رول انجام دیا ہے،
ب کے آغاز میں مذہب انسانوں
ہوں میں متحد کرنے اور جماعتی
س پیدا کرنے میں سب سے
ثر محرک رہا ہے اسی کے ساتھ
ی حقیقت ہے کہ تقریباً تمام
ن لطیفہ کی اختراع اور ترقی
بھی ابتدائی مذہب کو سب سے
ثر محرک کی حیثیت حاصل رہی
، رقص، بت تراشی، مصوری،
سیقی اور شاعری سب ہی ابتدا
، مذہبی جذبات کے اظہار کا وسیلہ
عبادت کا ذریعہ رہی ہیں یونانی
ن لطیفہ ہوں یا ہندوستانی اس
ے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں اس کے
جود قدیم ادب و شعر کے لیے بھی یہ کہنا کہ ان کی بنیادی روایت مذہب
ہ غلط ہوگا، محرک اور بنیادی روایت میں بڑا فرق ہے۔ محرک کبھی
تو اپنا براہ راست اظہار نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی تو تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں
ے گزر کر وہ بالکل ہی اپنی شکل بدل کر ایک ایسے قالب میں اپنا اظہار
تا ہے جس کا اس کی اصل سے بہت کم تعلق رہ جاتا ہے کھجوراہو، اجنتا ایلورا
ر قدیم مندروں میں جنسی عمل کی تصویر کشی سے پیکر تراشی کا ابتدائی مذہبی محرک
ہ رشتہ تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اسی طرح قدیم یونانی تہذیب
سکے مذہبی تصورات عیسائیت کے تصورات سے بنیادی طور پر مختلف تھے

تمام یورپ کی تہذیبی روایات کی بنیاد رہی ہے۔ مغرب میں تہذیبی روایت
کا یہ تسلسل دو ہزار برس سے زاید مدت سے چلا آرہا ہے عیسائیت کے
ساتھ قدیم یونانی اور رومی PAGANISM کا اختلاط نہ صرف تہذیب
کے اور مظاہر بلکہ ادب و شعر میں بھی ظاہر ہوتا رہا ہے، ملٹن کی "جنت
گم شدہ" بنیادی طور پر مذہبی (عیسائی) نظم ہونے کے باوجود PAGANISM
کے عناصر و اثرات سے لبریز ہے چند شاعروں کو چھوڑ کر یورپ کے بیشتر
قابل ذکر شاعروں کا براہ راست عیسائیت کی مذہبی روایت سے رشتہ
جوڑنا مشکل ہے لیکن ان سب کا رشتہ قدیم یونانی اور رومی تہذیب سے
اتنا مستحکم ہے کہ ہم آج بھی مغربی
ادب کو ان تہذیبوں کا خاصا علم
رکھے بغیر پوری طرح سمجھ نہیں سکتے
کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب کے
مزاج کو کسی قوم کی مجموعی تہذیب
روایات کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا
ہے، محض مذہبی روایت کبھی
ادب کی بنیادی روایت نہیں
رہی۔

ہربرٹ ریڈ جیسے مغربی تہذیب
کے زوال اور فنون لطیفہ کی طرف
سے عام بے اعتنائی کا احساس تھا
تہذیبی قدروں کے استحکام و تحفظ
کے لئے ہی فنون لطیفہ کا از سر نو
عرفان عام کرنا چاہتا تھا تہذیبی
قدروں سے بے اعتنائی کا مظاہرہ انسانیت
کے لئے خطرناک ہوتا ہے اسی لئے
باشعور مغربی دانشور تہذیب کو
بچانے اور اس کو قابل قدر سمجھتے
ہیں: حسن عسکری صاحب معترض
ہیں، تہذیبی اقدار کے عرفان کے
بغیر مذہبی روایت کا عرفان بھی
ممکن نہیں۔ آج پوری دنیا میں
انسانی تہذیب اقدار کے جس بحران سے گزر رہی ہے وہ بحیثیت مجموعی
کلچر کی روایات سے ناواقفیت اور ان کا روح کے عدم عرفان
کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص تہذیب کو بحیثیہ قابل قدر نہ سمجھے تو وہ مذہبی
روایت کی روح کو بھی نہیں سمجھ سکتا اور انسانوں کو بربریت کے دور میں
واپس لے جانے کا براہ راست مبلغ یا بالواسطہ آلۂ کار بنتا ہے۔ تمام
فاشسٹ فلسفے تہذیبی اقدار کی نفی ہی سے اپنا آغاز کرتے ہیں اور ایک
مخصوص قسم کی تہذیب کے داعی بننے کے باوجود، تہذیب دشمنی کی راہ
اختیار کرتے ہیں۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، ۱۹۶۵ء کی ہند پاک

رہبر لکھاہی

غزل

اس طرح دل میں اچانک تری یاد آئی ہے
جیسے ظلمت میں کہیں برق سی لہرائی ہے

یوں ترے جلووں کی رفعت ہے مری آنکھوں میں
جیسے اندھوں کے لئے دولتِ بینائی ہے

کروٹیں لیتا ہے اک نشترِ غم سینے میں
یاد ہے آپ کی یا درد کی انگڑائی ہے

اب تو گل ہو چکا امید کا ایک ایک چراغ
اب تو آجاؤ کہ تنہائی ہی تنہائی ہے

میں نے اس خوف سے لب سی لئے شکوہ نہ کیا
اس میں میری ہی نہیں تیری بھی رسوائی ہے

انقلاب آیا ہے دنیائے تمنا میں رہبر
اس نے جب زلفِ حسیں دوش پہ لہرائی ہے

لڑائی کے وقت ہندی کے مشہور ادیب اور شاعر دینکر نے ہندوستانی قوم کی کمزوری کا سراغ اس کی تہذیب ہی میں پایا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہمیں پھر سے طاقتور بننا اور عظمتِ رفتہ حاصل کرنا ہے تو ہمیں بربریت کے دور کی طرف واپس جانا ہوگا۔ دینکر جی کے پاس بھی مذہبی روایت کا ایک مخصوص نظریہ ہے لیکن مذہبی روایت کو تہذیبی اقدار سے جدا کرنے کا نتیجہ تہذیب کی نفی ہی کی شکل میں نکلتا ہے۔ مذہب ہو یا سائنس، سیاست ہو یا معاشی نظریہ محض کسی ایک چیز کو ہی سب کچھ سمجھ لینے کا نتیجہ تہذیب کے حق میں کبھی بھی خیر و برکت نہیں بن سکتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ سیاسی نظاموں پر غیر ضروری زور دینے کا ہی نتیجہ آج کا عالمی تہذیبی بحران ہے۔ وہ لوگ جنھیں انسانی تہذیب اور اس کی روایات عزیز ہیں اس تک طرفہ پن اور جبر کے خلاف اسی لئے نبرد آزما ہیں کہ جب تک انسانی تہذیب کی ان تمام اقدار کا جو ہزارہا سال کے اجتماعی شعور اور تجربے سے ہی اور ڈھلی ہیں، عرفان عام نہ ہوگا، انسان مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑا انسانی اور تہذیب کی موت ہی کو دعوت دیتا رہے گا۔ اس سلسلے میں مذہب کی وہ تمام روایات بھی جو انسانیت اور آفاقیت کی روح میں رچی بسی ہیں ادب و شعر کی اور انسان دوستی کی روایات کے ساتھ تہذیبی خودکشی سے باز رکھنے میں انسان کے کام آسکتی ہیں۔ سائنس کے بزعم خود غلط طرفدار فنونِ لطیفہ اور مذہب کی روایات کی نفی کر کے اور انھیں آج کے دور میں غیر ضروری قرار دے کر تہذیب کے ساتھ دشمنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مذہب، فلسفے اور فنونِ لطیفہ کا زوال کسی بھی حساس، باشعور اور تہذیبی عرفان رکھنے والے انسان دوست کے لئے کسی صورت میں بھی خوشی کا باعث نہیں بن سکتا، مغرب میں اب یہ احساس عام ہو چلا ہے لیکن مشرقی روایت کو مغرب کے توسط سے سمجھنے والے حسن عسکری صاحب مشرقی روایت کو مغرب سے بالکل الگ کرنے کے جوش میں آج یہ کہہ رہے ہیں کہ عمرانیات، نفسیات اور حیاتیات میں ادب کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ تہذیب کی نفی کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ اس نفی کے بعد وہ ادب کا جواز مذہب میں تلاش کرتے ہیں، حالانکہ ہمیشہ سے مذہب فلسفہ، سائنس اور سیاست سب کے دائرہ ہائے کار الگ الگ رہے ہیں۔

ابتدا سے مذہب کے ہوتے ہوئے بھی انسانوں کو اپنے جذبے جبلّت یا انفرادی اور اجتماعی لاشعور کے اظہار کے لئے ایک اور وسیلے کی تلاش رہی ہے اور وہ ہے فنونِ لطیفہ کا وسیلہ۔ افلاطون اور ارسطو سے لے کر آج تک مفکرین فنونِ لطیفہ کو مذہب اور فلسفہ (اور بعد میں سائنس) سے الگ سمجھتے رہے ہیں۔ اس لئے کہ مذہب یا فلسفے یا سائنس سے انسان کی جن مادی یا روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے وہ فنونِ لطیفہ کے ذوق کی تربیت کے بغیر تشنہ رہتی ہیں۔ فلسفہ و سائنس عقل پر پوری طرح تکیہ کرتے اور انسانی احساس اور جذبے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مذہب غیر مرئی قوتوں یا قوت سے انسان کے رشتے کا احساس ہے اور اس کے سامنے انسانی مرضی کو جھکا کر اسی سے استعانت چاہنے کا نام۔ یہ رشتہ انسان اور انسان کے باہمی تعلق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا لیکن یہاں اولیت عبد و معبود کے رشتے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ سائنس اور فلسفے انسان اور کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، مذہب انسان اور علوی قوت میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے لیکن فنونِ لطیفہ کا کام پھر بھی باقی رہ جاتا ہے، انسان اور انسان کے درمیان ہم آہنگی اور خود انسانی فرد کے اپنے داخلی اعمال اور خارجی اظہارات میں ہم آہنگی پیدا کرنا فنونِ لطیفہ اور ادب کا کام ہے۔ کہنے کو تو عسکری صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مذہب کا سچا عرفان ہو تو وہ کام بھی جو سائنس اور فلسفہ ایک طرف اور فنونِ لطیفہ دوسری طرف کرتے ہیں، مذہب ہی سے لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تہذیب کے آغاز سے آج تک فنونِ لطیفہ کا آزادانہ وجود اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر انسان کو فنونِ لطیفہ کو اپنے احساس جذبے، تخیل اور شخصیت کے اظہار کا علیحدہ سے وسیلہ نہ بنانا پڑتا۔ شعر و ادب کو پوری طرح مذہب سے جوڑ دینا فنونِ لطیفہ کی تاریخ اور ان کی روح سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ خود اسلامی دنیا میں وہ شعرا بھی جن کا مقصد مخصوص مذہبی تصورات کو شعر کے ذریعے عام کرنا تھا شعر اور مذہب کی دوئی کو نہ مٹا سکے۔ مثنوی مولانا روم کے بہت سے حصے، گلستاں بوستاں کی بہت سی روایات (جنھیں ڈپٹی نذیر احمد ایسے عالمِ دین کو اپنے بچوں سے چھپانا پڑا) اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ادب مذہب نہیں بلکہ مذہب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

اس سلسلے میں عسکری صاحب کا یہ قول کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ و ملفوظات میں ادب کے متعلق جو اشارے ہیں وہ اردو کی ادبی تنقید کی بڑی بڑی کتابوں سے زیادہ مفید اور صحیح ہیں سوائے مبالغہ آمیز عقیدت کے اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں بعض بہت ہی راسخ العقیدہ اور سچے مسلمانوں سے میری گفتگو ہوئی، مگر کوئی بھی اس بات کو سنجیدگی سے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اور نہ کسی نے یہ اقرار کیا کہ مولانا تھانوی نے بہشتی زیور میں جو اشعار لکھے ہیں، وہ اردو شاعری کے پورے سرمائے پر محض اس لئے بھاری ہیں کہ مولانا تھانوی کو دینی روایات کا عرفان میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، انیسؔ، اقبالؔ وغیرہ سے زیادہ تھا۔ جس طرح ہم سائنس کے نظریات کو مذہبی علما سے سمجھنے کے بجائے سائنسدانوں سے رجوع کرتے ہیں، اسی طرح ادب و شعر کی تفہیم کے لئے بھی ہمیں ادب و شعر کے علما سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ افلاطون اور ارسطو کو یونانی فلسفیوں کے احمق ترین طبقے کا رکن قرار دینے سے نہ تو فلسفہ سمجھ میں آئے گا نہ ادب و شعر۔ اور قرار شاید اس رویے کے ساتھ مذہب کو سمجھنا بھی مشکل ہی ثابت ہوگا۔ افلاطون اور ارسطو کے ادبی نظریات سے اختلاف اور بات ہے، اور ان فلسفیوں کو جن سے علم کی تمام شاخوں (بشمول سائنس و فنونِ لطیفہ) نے فیضان اٹھایا ہے مذہب میں رد کرنا تو جائز ہے لیکن علم کی دنیا میں بدعت۔ یہ بات تو امام غزالی نے بھی نہیں کہی تھی انھوں نے تہافتہ الفلاسفہ میں ان مفکرین کو صرف گمراہ ہی قرار دیا، احمق نہیں کہا۔ گمراہی کی حد تک تو ہر شخص کا اپنا ایک ذہنی معیار ہوتا ہے اور وہ اپنے سے الگ رستے پر چلنے والے کو گمراہ قرار دینے میں حق بجانب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن علم و عقل کے کچھ معروضی

اور عالمگیر معیار ہیں۔ عسکری صاحب کسی بھی معیار کو مانتے ہی ہوں گے اور جب وہ علم و عقل کا کوئی معیار قبول کریں گے اور واقعی افلاطون و ارسطو کا مطالعہ کریں گے تو انھیں ان مفکرین کے عظیم الشان ذہن کا اعتراف ہی کرنا پڑے گا۔ براہ راست افلاطون و ارسطو کا مطالعہ ضروری نہیں، اگر عسکری صاحب اسلامی فلسفے ہی کا مطالعہ کرلیں تو ان پر یہ روشن ہو جائے گا کہ انہی "احمقوں" کے چراغ سے ہم نے بھی اپنے چراغ جلائے ہیں اور یورپ پر ہمارا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ ہم نے یورپ کو ان کے اپنے عظیم ترین ذہنوں کی روشنی اپنے فانوسوں میں محفوظ کر کے سونپی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ دینی روایت کے سلسلے میں عسکری جس تصوف کا بار بار حوالہ دیتے ہیں اس کے نظریات پر بھی افلاطون اور فلاطینوس کا گہرا اثر رہا ہے۔ میرا مقصد افلاطون و ارسطو کی مدافعت نہیں کیونکہ یہ ایسی ہی احمقانہ بات ہوگی جیسے یہ کوئی یہ کہے کہ وہ گرد و غبار کے طوفان سے آفتاب کی روشنی کو بچا رہا ہے۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ یک طرفہ فکر اور ادعائی رویے کے خطروں اور گمراہ کن نتیجوں کی طرف اشارہ کردوں۔ شیخ محمد کو جو مذہبی عظمت و تقدس حاصل ہے، اس کی روشنی میں وہ اگر ایسی بات لکھیں تو سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا کہ انھوں نے کس نقطۂ نظر سے یہ بات کہی ہے، لیکن عسکری صاحب کی زبان پر یہی اور کے حوالے سے بھی یہ بات "چھوٹا منہ بڑی بات" ہی کا مصداق ہوگی۔

عسکری نے بے تکلف گفتگو میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے استادوں نے ابتدا ہی سے انھیں "الٹا سبق" پڑھایا ہے پہلے انھوں نے سرریلزم پڑھا، پھر شکسپیئر۔ چونکہ ان کی ادبی تعمیر کی پہلی اینٹ ہی الٹی رکھی گئی اس لئے ان کے ادبی شعور کی عمارت بھی الٹی ہی کھڑی ہے۔ وہ پہلے سرریلزم پر ایمان لائے فرائڈ کے نظریات کو اپنے اوپر اوڑھ لیا، برسوں اردو ادب کی بے مائگی کا رونا روتے رہے اور اردو کے ادیبوں شاعروں میں فرانسیسی ادب اور جدید مغربی تحریکوں کی پرجوش تبلیغ کرتے رہے۔ اس اثنا میں پاکستان بن گیا رینے گینوں کا نام کہیں سے سن لیا تو ادبی روایت اور دینی روایت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور اب وہ ہمیں باور کرا رہے ہیں کہ ادبی روایت دینی روایت ہے، حالانکہ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر ادب اور دین دونوں میں سے کسی ایک کی نفی لازم آتی ہے۔ حالانکہ دونوں کو الگ اور آزاد ماننے میں ادب بھی محفوظ رہتا ہے اور دین بھی۔ لیکن عسکری صاحب کی نظر اس نکتے پر نہ گئی اب وہ داغ کے اشعار کی عارفانہ شرح کر کے اپنے "عرفان، مذہب" اور "درک ادب" دونوں کی سطحیت کا اشتہار دے رہے ہیں۔

عسکری اردو کے ان ادبی نقادوں میں سے ہیں جو پہلے کوئی کلیہ یا فارمولا بناتے ہیں اور پھر اپنی اس دریافت پر خوش ہو کر اسے ادبی تخلیقات کے سر منڈھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ اسی الٹے سبق کا نتیجہ ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ پہلے اپنے ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اس کے تہذیبی مزاج اور اقدار کو سمجھا جائے اور اس کی روشنی میں کوئی تنقیدی اصول یا ادبی نظریہ بنایا جائے۔ لیکن عسکری کی تنقید کا عمل ہمارے اکثر کلیہ ساز، فارمولا ساز ناقدین کی طرح الٹا ہوتا ہے اور انھیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ ایک نیا فارمولا گڑھنے کی وجہ سے اب جو وہ باتیں کر رہے ہیں وہ ان کے تمام پچھلے بیانات کے ساتھ متناقض ہیں، اور ان کی تردید کرتی ہیں۔ عسکری ایک زمانے میں ادب کی سماجی ذمہ داری سے منکر تھے اس وقت وہ ادب کی مقصدیت کے خلاف تھے (ترقی پسندوں کی ضد میں) لیکن اب وہ ادب کو مذہب کے عرفان کا وسیلہ مان کر ایک نئی قسم کی (جو اپنی روح کے لحاظ سے بہت قدیم اور پامال نظریہ ہے) مقصدیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ادب سے اس وقت بھی انھیں بحث نہ تھی، اب بھی نہیں ہے۔ خطرہ اس بات میں ہے کہ اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایسے نقاد، شاعر اور ادیب ہیں جو عسکری کی ہر بات کو حرف آخر مان لیتے اور ان کے اسلوب ہی کی نہیں، خیالات کی بھی اندھی تقلید کرتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر میکانکی اور سطحی تنقید اسی طرح سے عام ہو رہی ہے جیسے پہلے ترقی پسند نظریات کو میکانکی طور پر برتنے سے وجود میں آئی تھی۔

آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ادب سے قطع نظر، عسکری نے دینی روایت کی جس طرح تفسیر کی ہے وہ کس حد تک قابل قبول ہے اس مسئلے پر علیحدہ سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

مراسلات

غالب اور سرسید

۱۵ر اکتوبر ۶۸ء کے ہماری زبان میں محمد ظہیر وارثی کا مراسلہ بعنوان "غالب اور سرسید" نظر سے گذرا۔ موصوف کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ "ماہ نو" کراچی بابت فروری ۱۹۵۱ء کے مقالہ نگار یا کسی اور صاحب کے اس خیال میں ذرہ برابر بھی صحت نہیں ہے کہ غالب کا اولیں تعارف آثار الصنادید میں ملتا ہے، آثار الصنادید مولفہ ۱۸۴۶ء سے بہت پہلے کئی تذکرہ نگار ان کا تعارف کرا چکے تھے۔

(۱) عیار الشعرا مولفہ خوب چند ذکا
(۲) عمدۂ منتخبہ مولفہ اعظم الدولہ سرور
(۳) گلشن بے خار مولفہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ
(۴) گلدستۂ نازنیناں مولفہ کریم الدین
(۵) گلستان بے خزاں مولفہ قطب الدین باطن
(۶) تذکرہ بہارِ بے خزاں مولفہ احمد حسن سحر

اردو کے ایسے تذکرے ہیں جن میں غالب کا ذکر صراحت سے موجود ہے اور جانے والے جانتے ہیں کہ یہ سب سرسید کی آثار الصنادید سے پہلے لکھے گئے ہیں۔ تلاش کرنے سے اور بھی ایسے تذکرے نکل آئیں گے جن میں غالب کا ذکر آثار الصنادید سے پہلے کیا گیا ہے ایسی صورت میں ماہ نو کے مقالہ نگار کی یہ بات کون مانے گا کہ سرسید احمد خاں، غالب کے پہلے تعارف نگار ہیں غرضکہ صاحب مقالہ کا دعویٰ حقائق کے خلاف ہے اور تاریخ ادب سے ان کی بے خبری کا پتہ دیتا ہے۔ ان دنوں اتفاق سے غالب کے سلسلے میں اسی موضوع پر ایک مضمون زیر قلم ہے اور ان شاء اللہ دسمبر ۶۸ء کے نگار میں شائع ہوگا۔

(فرمان فتح پوری)

ایک ضروری گذارش

ایک عرصے سے مجھے اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ کوئی نوجوان خود کو میرا بیٹا بتا کر پورے ہندوستان میں ادیبوں اور شاعروں کو لوٹتا پھرتا ہے۔ وہ کہیں اپنا نام جاوید اختر اور کہیں اپنا نام سلمان اختر بتاتا ہے۔ یہ دونوں نام میرے بیٹوں کے ہیں جن کا وہ غلط استعمال کر رہا ہے۔ میں ہر خاص و عام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس نوجوان کے فریب میں نہ آئیں بلکہ اسے پولس کے حوالے کر دیں۔

(جاں نثار اختر)

ضروری اعلان:- براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے اور منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھیے

اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہئے۔ وزیر اعظم کی تقریر

بمبئی۔ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے یہاں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ آزادی کے بعد قومی یک جہتی کی کوششوں پر اعتراض کرتے ہیں آپ نے کہا کہ نئے پرانے سماج اور نئے پرانے خیالات کے درمیان اس وقت دنیا بھر میں کشمکش جاری ہے آپ نے کہا کہ مصنفوں اور شاعروں کو لوگوں میں نئے سماج کا احساس پیدا کر دینا چاہئے۔ اردو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ اردو رسم خط ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان ایک رابطہ ہے ہندی اور اردو دونوں ہندوستانی کلچر کی علامت ہیں اردو ایک ہندوستانی زبان ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں پھلی پھولی ہے اور پروان چڑھی ہے ہندی قومی زبان ہے مگر اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہئے آپ نے کہا کہ یہ ایک ثقافت ہے اور رسم خط اس کی دولت ہے۔ (الجمعیۃ)

صدر جمہوریہ ہند کو فروغ اردو کا محضر نامہ

نئی دہلی۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے فروغ اردو کا ایک وفد ملا اور ایک اردو محضر نامہ پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ غالب صد سالہ تقریبات کو عملی طور پر منانے کے لئے اردو کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ کہا گیا ہے کہ گذشتہ ۲۱ برسوں میں کانگریسی اور غیر کانگریسی صوبائی حکومتوں اور مرکزی وزارت داخلہ نے جن تعلیمی سہولتوں کو فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے پھر جس کا اعلان ایوان قانون ساز میں وقتاً فوقتاً ہوا ہے ان پر پوری عمل درآمد کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا جائے ملک کی قومی زبانوں کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کے سلسلے میں ایک ملک گیر لسانی اصول متعین کیا جائے غالب صد سالہ تقریبات کے موقع پر محضر میں دو دوسرے مطالبات کئے ہیں ان میں تقسیم وطن کے بعد سے ہندی اور اردو میں غالب پر شائع ہونے والی کتب کو سرکاری لائبریریوں کے لئے خریدنا ضروری قرار دیئے جانے کے ساتھ ہی ساتھ ان کتب کے مصنفین کو ادبی انعامات دیئے جانے کا بھی مطالبہ ہے۔ صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے وفد کے محضر پر مستقبل قریب میں ضروری کارروائی کا وعدہ فرمایا ہے۔

لکھنؤ کارپوریشن میں اردو میں ایجنڈا مہیا کیا جائے

لکھنؤ۔ آج لکھنؤ کارپوریشن کی بجٹ میٹنگ میں کارروائی کے شروع میں ہی اردو نواز غیر کانگریسی اور چند کانگریسی کارپوریٹران نے یہ مطالبہ کیا کہ انھیں کارپوریشن کی تجاویز ایجنڈا اور دیگر کاغذات اردو میں مہیا کئے جائیں جس کی مثال اس سے پہلے لکھنؤ کارپوریشن میں قائم ہو چکی ہے ایک ممبر نے کہا کہ اس صوبہ اور خصوصیت سے اس شہر کے بچہ بچہ کی زبان پر اردو رچی بسی ہوئی ہے اس کے باوجود کارپوریشن میں اردو نوازوں کو اردو میں کاغذات بہم نہ پہونچانا کس حد تک جائز اور درست ہے۔ (سیاست)

سہ لسانی فارمولا اور اردو داں طلبہ کی مشکلات

حیدرآباد۔ وزیر تعلیم جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے کہا کہ سہ لسانی فارمولے کے نتیجے میں اردو والوں کو درپیش مشکلات سے وہ بخوبی واقف ہیں اور کسی بھی ایسی عملی تجویز کا خیر مقدم کریں گے جس کی وجہ سے طلبہ پر چار زبانوں کے سیکھنے کا بار کم ہو جائے اور اگر اردو والے متفقہ طور پر ہندی سے مستثنیٰ ہو جانا چاہیں تو وہ اس تجویز کو قبول کرلیں گے واضح رہے کہ جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ اسٹوڈینٹس سوسائٹی گورنمنٹ ہائی اسکول ریٹ لانسر کا افتتاح انجام دے رہے تھے، جو اردو میڈیم کا مدرسہ ہے جناب ایم۔ ایم ہاشم ایم۔ ایل۔ اے نے صدارت کی اور ابتدا میں صدر مدرسہ جناب محمد عبدالنعیم نے خیر مقدم کیا اور ڈپٹی ہیڈ ماسٹر جناب کے ایم خاں نے مدرسہ کے مسائل سے وزیر تعلیم کو واقف کرایا۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ اردو کے تعلق سے حکومت آندھرا پردیش کی پالیسی وہی ہے جو قیام آندھرا پردیش کے بعد سے واضح کردی گئی تھی اس میں کسی قسم کی کمی یا تبدیلی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے مدارس میں ناکافی سہولتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سہولتوں کی کمی ہر قسم کے مدارس میں ہے صرف اردو ذریعہ تعلیم ہی کے مدارس میں ایسی بات ہے صحیح نہیں ہے انھوں نے اس بات کا کھلا اعلان کیا کہ ایسی کوئی مثال بتائی جائے کہ صرف اردو ہی کے مدارس میں سہولتوں کی کمی ہے اور دیگر ذریعہ تعلیم کے مدارس ان سے مبرا ہیں۔ (رہنمائے دکن)

اردو کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کرنے کا مشورہ

حیدرآباد۔ چیف جسٹس آف انڈیا جناب ہدایت اللہ نے اردو کے حامیوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اردو کے سرکردہ ادیبوں شاعروں اور داستانوں کی کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کرانے کی کوئی صورت نکالیں تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد انھیں پڑھ سکیں اور انھیں اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اردو کسی بھی ہندوستانی زبان سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے چیف جسٹس آف انڈیا نے آندھرا پردیش میں اردو کی ترویج و اشاعت کی سرگرمیوں پر اظہار مسرت بھی کیا۔ چیف جسٹس آف انڈیا اردو مجلس کے اجلاس میں جناب حبیب الرحمٰن کی خیر مقدمی تقریر کا جواب دے رہے تھے۔ انھوں نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ اردو کو ہر حیثیت سے ایک معیاری زبان بنانے کی کوشش کریں۔ جلسہ کی صدارت جناب آنند نرائن ملا ایم۔ پی نے کی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اپنے حالیہ دورہ امریکہ کے تاثرات پیش کئے صدر جلسہ جناب آنند نرائن ملا نے تقریر میں اردو اور اردو والوں کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ اردو کو دنیا کی زبانوں میں تیسرا اور ہندوستان میں پونے تین کروڑ اردو بولنے والوں کی حیثیت سے پانچواں درجہ حاصل ہے لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اردو والوں کے معقول مطالبات کو بھی یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ کسی علاقہ کی زبان نہیں۔ جناب آنند نرائن ملا نے اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سندھی کو جس کا رسم الخط اردو کے رسم الخط جیسا ہی ہے بڑی خوشی سے قبول کرلیا جاتا ہے لیکن اردو رسم الخط کے بدلنے کے مشورے دے کر ایسے ہی کھوٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مسئلہ دراصل ہندوستان میں سیکولرازم کے تحفظ کا مسئلہ بن گیا ہے ۱۹۶۷ء متحدہ سیاسی ماحول میں تو جن سنگھ کے سوا سبھی سیاسی جماعتیں اسے دوسری زبان کا درجہ دینے پر آمادہ ہیں جن سنگھ کے بعض کرم فرما بھی اتر پردیش میں اردو کو دوسری علاقائی زبان قرار دینے کی تجویز کو چند شرائط کے ساتھ قبول کرلینا چاہتے ہیں اپنی تقریر میں جناب آنند نرائن ملا نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ صرف جوش سے کام نہ لیں بلکہ مستقل مزاجی سے اپنے معقول مطالبات کے لئے جدوجہد جاری رکھیں جناب آنند نرائن ملا صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد مختصر سی محفل شعر بھی منعقد ہوئی جس میں مخدوم، شاذ تمکنت، محترمہ عظمت عبدالقیوم صاحبہ، حکیم یوسف حسین خاں، حیرت بدایونی، صلاح الدین نیر، ہیں رونق رحمانی اور سعید شہیدی نے اپنا تازہ کلام سنایا۔

مدھیہ پردیش کی راجدھانی میں غالب تقریبات

بھوپال۔ یہاں پنڈت آنند نرائن ملا نائب صدر کل ہند غالب تقریبات کمیٹی نے انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا آپ نے کہا کہ "غالب صرف اردو کے شاعر نہیں بلکہ وہ ہندوستان کی ایک عظیم المرتبت لافانی شخصیت ہیں وہ قد آور قومی ہستی ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ ہندوستان نے عالمی ادب میں دو بڑے شاعر اور ادیب پیدا کئے اور وہ ہیں کالی داس، تلسی داس، غالب، ٹیگور اور اقبال۔ یہ ہندوستان کا بہت بڑا کلچرل ہیریٹیج ہے۔

ملا صاحب نے بھوپال اور غالب کے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ ان کا یہاں سے تعلق رہا ہے یہاں ان کے شاگرد تھے یہاں کے لوگوں سے ان کی خط و کتابت تھی۔ یہاں ان پر اہم کام ہوا اس لئے ہم بھوپال کو غالب کی زندگی سے الگ نہیں کرسکتے۔ اس تعلق کے رشتہ سے یہاں غالب کی شایان شان تقریبات منائی جانا چاہئیں۔

حمیدیہ اور گرلز کالج میں گوشۂ غالب

بھوپال یہاں کے حمیدیہ پوسٹ گریجویٹ کالج کی یونین نے طے کیا ہے کہ وہ غالب صد سالہ تقریبات کے موقع پر اپنی لائبریری میں ایک گوشۂ غالب قائم کرے گی جہاں غالب کی اور غالب سے متعلق تصانیف جمع کی جائیں گی۔ اسی کے ساتھ ایک شاندار کل ہند مشاعرہ

بھی منعقد کیا جائے گا جس میں کسی ممتاز غالب شناس سے غالب پر تقریر بھی کرائی جائے گی۔ حمیدیہ کالج کے اولڈ بوائز کی اسوسی ایشن "شب غالب" کا اہتمام کر رہی ہے جس میں غالب کے کلام کو طلبہ اور ریڈیو فنکار ساز و سنگیت کے ساتھ پیش کریں گے۔ لکشمی بائی گرلز کالج میں تین دن تک غالب کا جشن منایا جائے گا۔ وہاں پر گوشۂ غالب کے علاوہ غالب پر کتابوں کی نمائش اور کلچرل پروگرام منعقد کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ صرف غالب کے اشعار پر مشتمل بیت بازی کا بھی مقابلہ ہوگا۔

نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و تدوین

حمیدیہ کالج میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر حامد حسین نے صوبائی صد سالہ تقریبات کمیٹی کی دعوت پر غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو ایڈٹ کرنے کا اہم کام شروع کیا تھا۔ صوبائی کمیٹی اس موقع پر نسخۂ حمیدیہ کا سینٹری ایڈیشن شائع کرے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہر دو اصحاب نے بڑی جانفشانی اور ذمہ داری سے اس اہم کام کو سر انجام دے لیا ہے۔ (نامہ نگار)

ادب میں شکر افشانی اور شکر ریزی نہیں تو وہ ادب نہیں

حلقۂ ارباب ادب بھوپال میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کی تقریر

بھوپال راجدھانی کی معتدد ادبی انجمن "حلقۂ ارباب ادب" نے لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو فارسی کے صدر (ڈاکٹر) نور الحسن ہاشمی کا استقبال کیا۔ آپ نے جدید شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جدت کی تلاش بہت اچھی بات ہے۔ یہ ہمیں نئی راہوں سے روشناس کراتی ہے۔ قدیم شعراء نے بھی یہ تلاش جاری رکھی۔ اس سے انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ لیکن صرف جدت کے خیال سے ایسی باتیں کہی جائیں جن میں کیفیت، لطف، فکر اور معنویت نہ ہو وہ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتیں۔ آپ نے کہا کہ ادب کا معاملہ دوسری چیزوں سے قدرے مختلف ہے یہاں صرف سچی باتیں کرنا ہی کافی نہیں ہے کتنی ہی سچی باتیں کی جائیں اگر ان میں شکر افشانی اور شکر ریزی نہیں ہے تو وہ ادب نہیں بن سکتیں۔ ادب میں حسن بیان ضروری ہے۔ اسی کی وجہ سے ذہن معنویت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کے لئے بڑی تہذیب اور فن کاری دونوں کی ضرورت ہے۔

اس جلسہ کی صدارت حکیم سید قمر الحسن مدیر اعلیٰ روزنامہ ندیم نے کی۔ شروع میں معزز مقرر کا پروفیسر آفاق احمد نے حلقہ کی طرف سے استقبال کیا اور تعارف کرایا۔ (حسن مسعود)

ریلوے ہائی اسکول میں اردو طلبہ کے داخلہ پر پابندی

آسنسول:- جامع مسجد آسنسول میں ایسٹرن ریلوے اسکول کے طلبہ کے والدین سرپرستوں اور شہر کے دیگر اردو دوستوں اور بہی خواہوں کی ایک اہم میٹنگ ہوئی جس میں سرکلر کے ذریعہ اسکول کے پرنسپل کو جو ہدایت دی گئی ہے کہ اسکول کے اردو طلبہ کو ٹرانسفر سرٹیفکٹ دے دیا جائے اور ۱۹۶۹ء کے نئے تعلیمی سال سے داخلہ بند کر دیا جائے۔ نہایت برہمی اور غم و غصہ کا اظہار کیا گیا نیز اس بات پر تمام اردو دوست متفق ہیں کہ اگر سرکلر واپس نہیں لیا گیا اور اسکول میں اردو طلبہ کے داخلہ کی سہولت نہیں دی گئی تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے گا اس سے پہلے بھی پرنسپل کے جانبدارانہ رویہ کی شکایت وزیر ریلوے، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور دیگر ایم۔پی حضرات کی خدمت میں تحریری طور پر کی جا چکی ہے۔ (الجمعیۃ)

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل نو

لکھنؤ:- یہاں مقامی ترقی پسند شعراء اور ادیبوں کا نمائندہ جلسہ جناب سید انوار حسین زیدی کی صدارت میں دفتر مرزا رضا علی خاں ایڈوکیٹ میں منعقد ہوا۔ جلسے نے ایک تجویز کے ذریعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کی از سر نو تشکیل و احیاء کا فیصلہ کیا اور متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ انجمن کے ادبی و مشاورتی جلسے باقاعدگی سے کئے جائیں۔

(باقر رضوی ادیب کنوینر انجمن)

بگول میں لائبریری کا قیام

قصبہ بگول ضلع بیدر میں ایک عرصے سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے چند ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں غور و خوض کے لئے ادب دوست نوجوانوں کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں اردو کی ترویج و اشاعت ایک اردو لائبریری کے قیام اور اردو دانشی نشستوں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ لائبریری کے لئے مالیہ کی فراہمی اور دیگر اہم امور کی بجا آوری کے لئے ایک مجلس انتظامیہ تشکیل دی گئی۔ (معتمد مجلس انتظامیہ)

فیض احمد فیض دہلی میں

دہلی ۱ر نومبر۔ دہلی میں اچانک چپکے چپکے یہ افواہ پھیلی کہ فیض احمد فیض پاکستان سے ایک تقریب میں شرکت کے لئے بمبئی آرہے ہیں۔ لیکن ہر ایک نے اس کو افواہ ہی سمجھا ایسی ہی افواہیں ماضی میں پھیل چکی تھیں اور غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ لیکن جب اچانک فیض کو دہلی میں دیکھا گیا تو سب ہی کو حیرت ہو گئی۔ دہلی میں ڈیفنس کالونی میں ان کے میزبان کے گھر پر جمعہ کی شام کو لوگ جمع ہو گئے فیض ایک کوچ کے ایک کونے میں خاموش بیٹھے تھے اور حیران تھے کہ کیسے اتنے بہت سے لوگوں کو ان کی آمد کی اطلاع اتنی تیزی سے مل گئی۔ وہ بمبئی میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے آخر وقت ان کے دوستوں نے ان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو دن کے لئے دہلی بھی آجائیں فیض کہنے لگے کہ تمام دوستوں سے ملنے کے لئے دو دن کافی نہیں ہوتے اس لئے انھوں نے یہ دو دن خاموشی سے گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن افواہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ۶ برس بعد وہ دہلی میں دوستوں کے درمیان تھے۔ ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ، بدن پہ گہرے رنگ کا سوٹ، اداس آنکھیں فیض احمد فیض بیٹھے تھے اور جانے پہچانے چہرے کمرے میں بھرتے جا رہے تھے کوئی بغل گیر ہو رہا تھا کوئی بوسہ لے رہا تھا جذبات ہی جذبات تھے تقسیم کو یہ بار بار یاد آرہا تھا سیالکوٹ میں ۱۹۱۱ء میں فیض پیدا ہوئے لاہور سے انھوں نے انگریزی اور عربی میں ایم اے کیا۔ امرتسر میں اور پھر ہیلی کالج لاہور میں وہ استاد رہے جو مجمع دہلی میں جمع تھا اس میں ان کے شاگرد بھی تھے دوست بھی اخبار نویس بھی سرکاری ملازمین افسر اور سیاستداں بھی یہ سب ان کو بہت دل سے چاہتے تھے۔ کسی نے ان کی پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری کا تذکرہ چھیڑ دیا وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک اس اخبار کے ایڈیٹر رہے اور کسی نے ۱۹۶۲ء میں ان کے لینن امن انعام حاصل کرنے کا ذکر کر دیا۔ بہرحال محفل کا رنگ پرانی یادوں کی طرف جا رہا تھا ایک خوش گلو نے فیض کی مشہور غزل چھیڑ دی ؎

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں　　جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو　　سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

فیض سے سنانے کی فرمائش ہونے لگی، انھوں نے چند نئی نظمیں سنائیں جو ان کے نئے مجموعہ کلام "لہو کا سراغ" میں شائع ہو رہی ہیں۔ فیض خود اپنے کلام کو بہت ڈرامائی انداز میں نہیں سنا سکتے لیکن ان کے دھیمے، جھجکنے والے انداز میں ایک دلکشی اور خلوص ہے اور ان کو بہت ہی غور سے سنا گیا ان کے اشعار کی موسیقی کی اپنی ایک لے ہے رنگ روایتی ہے اور میر سے اب تک کے تمام اساتذہ کی آواز ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے پھر کسی نے ان کا یہ شعر گنگنانا شروع کر دیا ؎

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے　　تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

بس آواز میں آواز ملتی گئی سب نے مل کر گانا شروع کر دیا اور پوری محفل گاتی رہی گاتی رہی یہاں تک کی سنیچر کی صبح نمودار ہو گئی فیض اپنی کوچ پر پھیل کر بیٹھے تھے آنکھیں نیم وا تھیں اور خود اپنے اشعار یوں سن رہے تھے جیسے کسی اور کے ہوں۔　　(قومی آواز)

پاکستانی ادیبوں اور شاعروں میں اختلاف

کراچی ۱۔ پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں میں زبان، قومیت اور سیاست کے مسائل پر زبردست اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس اختلاف کی ابتدا اس وقت ہوئی جب حال ہی میں کچھ ادیبوں اور شاعروں نے ایک "عوامی ادبی انجمن" بنانے کا اعلان کیا اس کا منشور مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ عوامی ادبی انجمن کی یہ تحریک کچھ پرانے ترقی پسندوں نے شروع کی ہے فیض احمد فیض اس کے رہنما ہیں جن کو روس نے "ادبی خدمات" کے اعتراف میں وہ لینن انعام دیا تھا جو کبھی اسٹالن انعام کہلاتا تھا اور روس خارجہ پالیسی کی نمایاں حمایت کرنے والے غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ عوامی ادبی انجمن نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان ایک قوم نہیں کئی قوموں کا ملک ہے ان سب کو یکساں داخلی خود مختاری ملنی چاہئے اور ان قوموں کی زبانوں مثلاً پنجابی، پشتو، بلوچی اور سندھی کو تعلیم، سرکاری کام کاج اور ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں کا ذریعہ تسلیم کرنا چاہئے عوامی ادبی انجمن نے اردو کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان ایک مشترکہ زبان کا کام دے۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو زبانوں کو پاکستان کی مختلف قومیتوں سے وابستہ کرتے ہوئے عوامی ادبی انجمن کے اس منشور میں کہا گیا ہے کہ ان قوموں کی زبانوں اور تہذیبوں کو کسی ایک قوم کی زبان اور تہذیب کے تسلط سے آزاد ہونا چاہئے۔ عوامی ادبی انجمن کے اس منشور پر کئی ترقی پسند ادیبوں کے دستخط ہیں اور بہت سے ترقی پسند ادیبوں کے نہیں ہیں پاکستان کی انجمن ترقی پسندوں کے سابق جنرل سکریٹری احمد ندیم قاسمی نے اس تحریک سے اپنے اختلاف کا اعلان کیا ہے وہ ۱۹۵۴ء تک ترقی پسند مصنفین کی پاکستانی انجمن کے جنرل سکریٹری رہے ہیں احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے کہ پاکستان ایک قوم ہے اور کئی قوموں کا ملک نہیں ہے۔
(قومی آواز)

پیلی بھیت میں جشن یوم غالب

پیلی بھیت یہاں مقامی رام سروپ پارک میں غالب کی صد برسی کے موقعہ پر ایک کلچرل پروگرام جشن غالب کے نام سے منعقد ہو رہا ہے ۱۹ر نومبر ۶۸ء کو مقامی "بزم ادب" کی طرف سے اسی پروگرام کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جس میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونجات کے شعرا اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں گے۔　　(جمیل الرحمٰن سعیدی کنوینر)

اردو گھر فنڈ

چندہ اردو گھر فنڈ ۱ر نومبر تا ۱۵ر نومبر ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	ذریعہ وصول کیفیت
۱	جناب لالہ کرم چند ہری رام امرتسر	۵۰۰۰۰	چک	معرفت جناب ... امرتسر
۲	انجمن احمدیہ قادیان	۱۰۰۰	"	
۳	جناب اوم پرکاش سونی امرتسر	۱-	"	
۴	دیگر اشخاص جن کے نام بعد میں شائع کئے جائیں گے	۱۱--		
۵	جناب عبداللہ ساجد ضلع رتناگری	۵-	منی آرڈر	معرفت ...
۶	جناب جمال الدین صاحب جمال بمبئی	۵--	منی آرڈر	
۷	جناب عبدالرشید عبدالعزیز داپولی	۵--	منی آرڈر	
۸	آر۔ ڈی۔ اے اولن اینڈ سلک ملز امرتسر	۵	چک	
۹	جناب سی لال رام آسرا امرتسر	۵--	چک	
۱۰	جناب چمن لال ایس گپتا امرتسر	۱--	چک	
۱۱	جناب لتھورا صاحب امرتسر	۵-	چک	
۱۲	جناب کلونت رائے دھیر	۵-	چک	
۱۳	جناب کرشن کمار دت	۲-	چک	
۱۴	جناب سیٹھ پورن چند	۲-	چک	
۱۵	جناب پنڈت دریچند	۱--	چک	
۱۶	جناب رام لال صاحب	۱--	چک	معرفت ... صاحب
۱۷	جناب ایم۔ ایم مصرا	۱-	چک	
۱۸	جناب بخشی رام لہابا ساحر	۲--	چک	
۱۹	جناب لکھن پال	۱-	چک	
۲۰	جناب کندن لال بھنڈاری	۱--	چک	
۲۱	رمیش سیڈ اسٹور	۱۰	چک	
۲۲	ملک سیڈ اسٹور	۲-	چک	
۲۳	اجیت سیڈ اسٹور	۲--	چک	
۲۴	جناب لائلپوریا دی ہٹی	۳-	چک	
۲۵	جناب دھرم پال	۱--	چک	
۲۶	جناب سردار اندر سنگھ	۲--	چک	
۲۷	جناب کرشن سروپ	۲--	چک	
۲۸	جناب جگن ناتھ تلک راج بھاٹیہ	۳-	چک	
۲۹	جناب بابا سنگھ سنگل سین	۱--	چک	
۳۰	جناب بھائی لال سنگھ کندن لال	۲--	چک	
۳۱	جناب کرتار سنگھ دلجیت سنگھ	۲-	چک	معرفت ... امرتسر
۳۲	جناب ملکھ راج ہرنس سنگھ	۲-	چک	
۳۳	جناب است رام شرما	۲--	چک	
۳۴	ڈاکٹر سروپ سنگھ مرہابا	۱-	چک	
۳۵	جناب ل۔ ل۔ مہاجن	۲-	چک	
۳۶	جناب اسماعیل حاجی احمد مقدم	۵-	منی آرڈر	معرفت جناب ... صاحب داپولی
۳۷	جناب محمد شریف حسن درے	۲-	منی آرڈر	
۳۸	جناب علی کھوتو مالونکر	۲-	منی آرڈر	
۳۹	جناب نور محمد اسماعیل راؤتی	۲-	منی آرڈر	
۴۰	جناب عبدالوہاب داؤد سرو	۱--	منی آرڈر	
۴۱	جناب محمد سعید حسن تحویلدار	۱-	منی آرڈر	
۴۲	جناب عباس یوسف چوگلے	۱-	منی آرڈر	
۴۳	جناب فخرالدین محمد نائک	۱-	منی آرڈر	
۴۴	جناب اسماعیل عباس چوگلے	۱-	منی آرڈر	
۴۵	جناب شوکت حسن شمردے	۱-	منی آرڈر	
۴۶	جناب داؤد عمر گولندار	۱--	منی آرڈر	
۴۷	جناب عثمان عبدالعزیز شمردے	۱-	منی آرڈر	
۴۸	جناب محمود داؤد شمردے	۱-	منی آرڈر	
۴۹	جناب رحیم الدین داؤد حقیبہ	۱-	منی آرڈر	
۵۰	جناب ستیر داؤد ٹیلر	۱-	منی آرڈر	
۵۱	جناب عبدالحمید حسن پشوارے	۱--	منی آرڈر	
۵۲	جناب نثار احمد شمس الدین رکار	۱--	منی آرڈر	
۵۳	جناب اصغر حسن سیر	۱-	منی آرڈر	
۵۴	جناب ابراہیم غلام محی الدین مقدم	۱--	منی آرڈر	
۵۵	جناب محمد یوسف حمزہ ہلاردے	۱-	منی آرڈر	
۵۶	جناب محمد ہاشم آدم اسٹے	۱--	منی آرڈر	
۵۷	جناب محمد حسین داؤد منیار	۱-	منی آرڈر	
۵۸	جناب جی۔ ایس۔ سی داس ڈرائنگ مین الٰہ آباد	۱۰۱-	منی آرڈر	دور
۵۹	ڈاکٹر صبیح احمد کمالی گڑھ یونیورسٹی	۵۰--	منی ٹرانسفر	معرفت ...
	میزان حال	۱۰۶۵=۰		
	سابق	۶۸۲۶=۵		
	" کل	۷۸۹۱-۵		

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

R.NO 2186/57 REGD-N L 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۴۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

غالب صدی کے کام

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر غالب صدی منانے کے لئے خاصے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا ہے اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ غالب پر کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔ رسالوں کے خاص نمبروں کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ غالب کی تصانیف کے نئے ایڈیشن نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں غالب کی اردو شاعری اور اردو نثر کے تراجم شائع کرنے کی بھی اسکیمیں ہیں۔ پھر ہر جگہ اس موقع پر مشاعرے ہوں گے۔ غالب پر فلم بھی تیار ہو رہی ہے۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔ ٹکٹ جاری کرنے کی بھی تجویز ہے۔ کچھ ادارے غالب ہال، غالب تھیٹر، غالب میوزیم بنانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ غرض بہت سے کام سوچے گئے ہیں اور امید ہے کہ ان میں سے خاصے پورے بھی ہوں گے۔ ہندوستان سے باہر بھی خاصی تیاریاں ہیں۔ پاکستان کے پروگراموں کا جتنا علم ہوا ہے اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں بھی خاصا جوش و خروش ہے اور خاصی تیاریاں ہیں۔ روس میں ایک کمیٹی بنی ہے جو وہاں کے لکھنے والوں اور اردو کے ممتاز ناقدوں کے مضامین روسی زبان میں شائع کرے گی۔ امریکہ میں چودھری محمد نعیم کی کوشش سے غالب پر انگریزی میں کچھ مضامین شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ انگلستان میں لندن اور آکسفورڈ میں کچھ اردو دوست اپنا خصوصی پروگرام طے کر چکے ہیں۔ ایران والے بھی غالب کے فارسی کلام کا ایک نیا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔

کاش ایسا ہوتا کہ سارے کام مربوط ہوتے اور مرکزی غالب کمیٹی ان کو منظم کرتی اور یہ کوشش ہوتی کہ تکرار نہ ہو اور اس موقع پر کام کی افادیت اور معنویت کو ہی ذہن میں رکھا جائے۔ کاش غالب صدی اس طرح منائی جاتی کہ اس سے غالب کی زبان یعنی اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا، اس کی تعلیم اور چلن میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوتیں۔ کاموں میں تکرار سے بچا جاتا۔ غالب کے ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمے کی باقاعدہ اسکیم ہوتی اور ہر ریاست میں ذمہ دار افراد اس کام کو ہاتھ میں لیتے اور علاقائی زبانوں کے ادیبوں کی مدد اور تعاون سے اس زبان میں غالب کا ترجمہ شائع کرتے۔ اس کے ساتھ غالب کے ہم عصروں پر بھی توجہ ضروری تھی کیونکہ غالب اندھیرے کے چراغ نہیں تھے۔ ایک تاروں بھرے آسمان کا سب سے روشن تارہ تھے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ سب کام ایک ہی تاریخ یعنی ۱۵ر فروری کو ذہن میں رکھ کر نہ کیے جائیں، بلکہ کاموں اور تقریبات کو پورے سال یعنی ۱۹۶۹ء پر پھیلایا جاتا تاکہ غالب صدی کا زیادہ سے زیادہ اثر ہوتا۔ یہ اب بھی ہو سکتا ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح ہر رسالے کا ایسا غالب نمبر بھی زیادہ مفید نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے مضامین جمع کر لئے جائیں۔ خاص خاص پہلوؤں پر غائر نظر ڈالنا چاہیے اور ہر نمبر کی کوئی خصوصیت ہونی چاہیے۔ غالب کو اردو کے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا زیادہ ضروری ہے۔ کھینچ تان کر اسے جنگ آزادی کا مجاہد ثابت کرنا یا ہندوستانی قومیت کا علمبردار ثابت کرنا زیادتی ہوگا۔ غالب کا ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ دور کا جلوہ تھا۔ اس طرح ان کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں اور اپنی شاعری کی وجہ سے آفاقی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کے درد و داغ اور سوز و ساز کے ترجمان ہیں اور یہی ان کی عظمت ہے۔ اس عظمت کو اجاگر کرنا چاہیے اور یہ عظمت بذات خود اپنا حق اپنا مطالبہ اور اپنا مقام رکھتی ہے۔ شمع کی اپنی روشنی کیا کم ہے۔ اسے مختلف رنگوں کے فانوس پہنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح غالب کی یاد میں بہت سی عمارتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے ان کے کلام کو اور عام کرنے اور ہندوستانی زبانوں میں اور انگریزی میں ان کی عظمت کا احساس بڑھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔

باقی صفحہ ۱ سے آگے

داستان یا منظم قصے سب کو پڑھ کر خوف و بیزاری اور کسی نادیدہ قوت سے گریز کرنے احساس پیدا ہوتا ہے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے کے شاعر معاملہ بندی اور شوخ بیانی سے معرا تھے لیکن ان میں ایک آسیب ضرور پوشیدہ تھا جو انھیں کبھی صحراؤں کی طرف کھینچتا تھا کبھی سینہ زنی کراتا تھا اور کبھی بے خواب راتوں میں خروشاں و فریاد کناں رکھتا تھا یہ بات قدیم شاعری کے روایتی عاشقانہ رنگ کو پیش نظر رکھ کر نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ ایسے اشعار کو سامنے رکھ کر جن میں ایک عجیب انفرادی تڑپ اور معنوی گہرائی ملتی ہے نظر رکھنے والے قارئین اسے مندرجہ ذیل اشعار میں آسانی سے پہچان لیں گے

سراج اور نگ آبادی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

شہ بیخودی نے عطا کیا ہے مجھے لباس برہنگی　　نہ جنوں کی پردہ دری رہی نہ خرد کی بخیہ گری رہی

میر

دل پُرخوں کی اک گلابی سے　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے

دل ڈھا جائے ہے سحر سے آہ　　رات گزرے گی کس خرابی سے

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے　　ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

درد

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ظفر

پلٹے کرہاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں　　آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

ادب میں یہ انداز فکر کہاں تک صحیح یا غلط ہو سکتا ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے اس موقع پر صرف اس گہرے رشتے کی نشاندہی مقصود ہے جو ماضی میں صدہا سال تک پھیلا ہوا ہے یہ صحیح ہے کہ مغرب میں بھی یہی رجحان نمودار ہوا ہے اور اس لحاظ سے ہمارے موجودہ ادب میں اس کی مماثلت نظر آتی ہے یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر اردو کے ادیبوں نے مغرب کے ادب پاروں کا براہ راست مطالعہ کر کے یہ اثر قبول کیا ہے لیکن یہ اثر اتنا دیرپا اور گہرا ہرگز نہ ہوتا اگر اس طرز فکر کا رشتہ خود ہمارے ماضی سے نہ ہوتا۔ اپنی ذات میں ڈوبنے اور اسے دریافت کرنے سے زندگی اور موت کے جو حقائق منکشف ہوتے ہیں اور ماورائی کیفیتیں اپنی خاص ترتیب اور ترنم کے ساتھ جس طرح ادیب کے سامنے آتی ہیں اس کا تجربہ مشرقی ادب کا خاصہ رہا ہے اور یہ ہماری سرشت میں داخل ہے بیدل کا یہ شعر اردو کے بیشتر ادیبوں کی نظر سے گزرا ہوگا لیکن کم لوگوں نے اس میں جدید شاعری کے "گلشن ناآفریدہ" کی آہٹ محسوس کی ہوگی ہے

تماشا ست اگر بو ست کشد کہ بسر ردامن درآ　　ز رخچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بچمن درآ

آخر بیدل در دل کو کھول کر کس چمن کی سیر کرانا چاہتا تھا اس کا جواب مشہور مغربی مصنف رلکے RILKE کی زبان سنئے۔

"شاعر میں صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے بچپن کے دنوں کو واپس ہو سکے جو دھندلے ہو چکے ہیں وہ بچپن کی بیماریاں جو عجیب و غریب انداز سے شروع ہو کر گہری ارتقائی تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں وہ ایسے دنوں کی بازیافت کر سکے جو علیحدہ کمروں میں رہ کر خاموشی سے گزر آئے گئے ہیں۔ سفر کی وہ راتیں جو شان و شوکت کے ساتھ دوڑتی ہیں اور ستاروں کے ساتھ اڑتی ہیں تاہم اتنا سب سوچنا کافی نہیں ہے محبت کی بہت سی راتوں کی یادیں ہونی چاہئیں ہر رات دوسری رات سے مختلف عورتوں کی درد زہ کی چیخیں ان کا زچہ خانہ میں ہونا ہلکی بچوڑی ہوئی اور خوابیدہ اس نے مرتے ہوئے آدمی کو بھی دیکھا ہو اور لاش کے ساتھ کمرے میں بیٹھا ہو جس میں پر اسرار آوازیں ہوں اور جس کی کھڑکیاں کھلی ہوں اور صرف یادوں کا ہونا بھی کافی نہیں ہے شاعر میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ جب یہ یادیں زیادہ ہوں تو وہ انھیں بھلا سکے اور اتنا صبر ہو کہ ان یادوں کی واپسی کا انتظار کر سکے جب یہ یادیں ہمارے خون ہماری نظر اور ہمارے اطوار میں اس طرح حل ہو جائیں کہ ان میں اور اپنی ذات میں تمیز نہ کی جا سکے اس وقت ایسا ممکن ہے کہ کسی نایاب لمحہ میں شعر کا پہلا لفظ ان کے درمیان سے ابھر کر علیحدہ ہو[1]"

جن لوگوں نے بیدل کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا ہے انھیں رلکے کے اس بیان میں بیدل کے شعری نظریہ کا واضح عکس نظر آئے گا درحقیقت بیدل کے پچھلی صدی میں گم ہو جانے کی بھی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ وہ ڈرائیڈن پوپ اور رچانس کے نظریات کے مطابق شاعری نہیں کرتا تھا حالی کی پیروی سے اردو تنقید کی ابتدا ہوتی ہے شبلی اگرچہ حالی کی طرح کٹر مغربی نہ تھے تاہم تھے تو اسی حلقہ کے آدمی اور اسی اثر کے تحت انھوں نے بیدل کو شعر العجم سے خارج کر دیا اور یہی ستم کالنا سابا شبلی نے بیدل کے ساتھ وہی کیا جو آگسٹن اسکول کے ڈکٹیٹر جانسن نے مظلوم اور کم سخن شاعر گرے کے ساتھ کیا تھا لیکن گرے کی آواز رجانس اور اس کی پوری تنقیدی حکمت کے بوجھ سے بھی نہ دب سکی اور رومانی تحریک کی شکل میں انگریزی شاعری پر چھا گئی بیدل کی آواز بھی تقریباً دو سو برس زیر زمین سفر کرنے کے بعد اردو شاعری کے نئے لہجہ میں دوبارہ ابھری ہے ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو یہ احساس ہو کہ جدید شاعروں کو بیدل سے کیا واسطہ ان میں ننانوے فیصدی نے اس کے کلام کو پڑھا بھی نہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے شاعری کا تعلق عقل و فہم کی خارجی سطح سے اتر کر انسانی جبلت اور قوم کے اجتماعی لاشعور تک پہنچ جاتا ہے اردو شاعری کا نیا رجحان اسی لاشعور یا تحت الشعور سے متعلق ہے جس کی گرفت میں بیدل تو نسبتاً حال کا شاعر تھا میرا بائی فیض کبیر خسرو اور کالیداس بھی آ سکتے ہیں۔

---

[1] آزاد ترجمہ ENCOUNTER مطبوعہ CREATIVE لندن ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۳۔

سخاوت مرزا

حیدرآباد کا ایک مشاعرہ

رسالہ تاج ماہنامہ، حیدرآباد دکن میں "بزم مشاعرہ" کے نام سے ایک روئداد "روح ادب" شایع ہوا کرتی تھی یہ مشاعرے اکثر میر کاظم علی باغ جد امجد نظر حیدرآبادی کے مکان پر ہوا کرتے تھے جس میں حیدرآباد کے علاوہ اور شمالی ہند کے مشہور شعرا (متوطن حیدرآباد) بھی شریک ہوتے تھے جن میں حکیم آزاد انصاری، برتر غازی پوری، جوش ملیح آبادی، مولانا سلیم پانی پتی، صامس کنتوری، نظم طباطبائی، مرزا بادی رسوا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ روئداد میں زیادہ تر شعرا کے نام اور تخلص ہوتا ہے، اگر ہم یہاں سنہ وفات یا اور کچھ حالات کا مختصر اشارہ کردیں تو غالباً بہتر ہوگا۔ روئدادوں میں حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کے نام آئے ہیں جس کا التزام ہم نے رکھا ہے۔

احمد علی احقر (پدر بزرگوار نظر حیدرآبادی مرحوم) جو پاکستان آگئے تھے اور یہیں انتقال ہوا اخبار جنگ کراچی میں ان کی نعتیہ اور کلام معہ حالات شایع ہوئے ہیں۔ اس لئے محتاج تعارف نہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ادبیات اردو حیدرآباد سے شایع ہوچکا ہے۔ غزل احقر کی غزل کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

پھر مری دنیائے غم آشوب تنہائی ہوئی — پھر احساس تپش تاب شکیبائی ہوئی
پھٹنے کی دیر ہے پھر جوش میں ہے حول دل — دل کہ مژگاں تک ہے موج اشک غم آئی ہوئی
رخ مقصود نظر ہے پھر کوئی گیسو بدوش — مطلع دل پر ہے اک کالی گھٹا چھائی ہوئی
پھر نگاہ دل میں ہے محو تبسم حسن شوخ — برق پھرتی ہے مرے خرمن پہ لہرائی ہوئی
مضطرب ہے پھر کسی کے در پہ سجدوں کے لئے — اک جبین شوق سو سو بار ٹھکرائی ہوئی

حکیم آزاد انصاری ان کا مجموعہ کلام معارف جمیل مطبوعہ ہے اگست دسمبر ۱۹۲۲ء کے مشاعروں کا کلام ہے مدتوں حیدرآباد میں رہے ایک اخبار نامہ نذیر گزٹ نکالتے تھے۔ اس میں ایک مضمون رشوت ستانی پر کسی کا "ملازمت کا سہاگ" کے نام سے اور ایک نظم سفارش، اطہر کی شایع ہوئی تھی۔ نیز امیدواران ملازمت کے انتخاب کا انٹرویو میری نظر سے گزرا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

یہ وہ مقتل ہے جس کو لوگ انٹرویو کہتے ہیں — سفارش کے تبر سے جس کی گردن کاٹی جاتی ہے

غرض آزاد کے غزل کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

حیف اے اظہار حرف شوق کے اقدام حیف — وہ نظر جھپی ہوئی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
اب کہاں وہ سور الفت اب کہاں وہ اس کی ایک — ایک چنگاری تھی ہے اور وہ بھی کجلائی ہوئی
اک نہیں آزاد اپنے دل کی دل میں لے چلے — ورنہ اس سرکار میں دنیا کی شنوائی ہوئی

الم، ڈاکٹر مہدی حسن رضوی، تلمیذ امیر دہلوی (سخنوران دکن) ؎

حسن کی ہے میں ہے ورنہ سمجھتا ہوں رات دن — آسماں پر رہتی ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

برتر، نادر علی غازی پوری، معاصر داغ و امیر کیمی تجلی، وتر کی ملازم جاگیر راجہ رائے رایاں (سخنوران دکن ملاحظہ ہو) ؎

حسن کی روز ازل جب جلوہ فرمائی ہوئی — عشق آئینہ ساخلقت تماشائی ہوئی
شورشیں یکساں تھیں حسن و عشق دونوں کی مگر — آپ کی شہرت ہوئی، عاشق کی رسوائی ہوئی
ہے یہاں برتر خباب بلاغ کے دم کی بہار — یوں شگفتہ ہوگئیں کلیاں مرجھائی ہوئی

باغ، سید کاظم علی تلمیذ داغ دہلوی ؎

یوں مسلط سایۂ مژگاں ہے چشم ناز پر — جیسے میخانے پہ ہو کالی گھٹا چھائی ہوئی
داغ افسردہ ہمارے دل میں یوں اے باغ ہیں — جیسے شاخ گل پہ کچھ کلیاں ہوں مرجھائی ہوئی

حضرت جوش ملیح آبادی، محتاج تعارف نہیں افکار جوش نمبر کراچی ملاحظہ ہو۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ کی اس روئداد میں دو لاجواب غزلیں شامل ہیں، بڑے جوش حلق اور ملنسار، مذہب سنج شخص ہیں۔ بڑے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ مجھ سے ایک دفعہ بیان فرمایا تھا کہ ان کا ننھیالی تعلق اکبرآباد سے تھا الفاظ سازی، محاورہ بندی، حسن ادا، جدت آفرینی کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی دو غزلیں تبرکاً بطور یادگار نقل کی جاتی ہیں ؎

دل میں رفتہ رفتہ ایسی بزم آرائی ہوئی — محفل ہستی میری آنکھوں میں تنہائی ہوئی
اس کے شانے کو ہلایا اس کی زلفیں چوم لیں — کیا صبا پھرتی ہے وقت صبح اترائی ہوئی
وعدۂ دیدار کو دے تازہ قسموں سے فروغ — اس قسم کھانے سے کیا حاصل جو ہو کھائی ہوئی
ایسے دل کو روح پر ترجیح ہو جاتا رہے — وہ طبیعت جاتی پیاری جو ہو آئی ہوئی

سعادت نظیر

حیدرآباد

"حیدرآباد" ہند کا دل ہے — آرزوؤں کی ایک محفل ہے
شہر ہے منچلے جوانوں کا — زندگانی کے پاسبانوں کا
کسی شاعر کے شعر کی تفسیر — کسی عاشق کے خواب کی تعبیر
گل ارض دکن کا کیا کہنا! — محور فکر و فن کا کیا کہنا!
تشنگان کمال آتے ہیں — پیاس اپنی بجھاکے جاتے ہیں
اس کو تہذیب کا جہاں کہئے — علم و عرفاں کا آسماں کہئے
اک مقام تجلیات ہے یہ — یا محبت کی کائنات ہے یہ
اس قدر دیدہ زیب اتنا حسیں — سارے عالم میں ایسا شہر نہیں
کتنی پُر کیف ہے یہاں کی ہوا — شعر و نغمات کی لطیف فضا
گوشہ گوشہ ہے دامن گلچیں — آسماں کی نظر لگے نہ کہیں
ذرہ ذرہ ہے دل کشی میں فرد — جس کے آگے ہیں ماہ و انجم گرد
دیدنی ہیں یہاں کے نقش و نگار — جیسے فنکار کے ہنر کی بہار
حسن رنگیں سے دل ربا شہکار — ذوق تعمیر کے حسیں آثار
کتنی پرکار کتنی سادا ہے!
کیوں نہ ہو یہ ہماری دنیا ہے

حسین بلگرامی سے بھی ان کے تعلقات تھے انگلستان سے نواب صاحب نے ان کے والد کو خط لکھا تو ضامن کے متعلق بھی دریافت کیا کہ "ضامن کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں" تو ضامن ان الفاظ سے بہت متاثر ہوئے (مکتوبات عماد الملک)

باغ، سید کاظم علی تلمیذ داغ دہلوی ؎

جب وہ اٹھ کر چل دیے رخصت شکیبائی ہوئی　　کیا کہوں پھر کیا ہوا جس وقت تنہائی ہوئی
اس لئے میں کر رہا ہوں وعدہ فردا کا ذکر　　یاد آ جائے تمہیں جھوٹی قسم کھائی ہوئی
دل پہ سطوت سایۂ مژگاں سے چشم یار پر　　جیسے مینائے پہ ہو کالی گھٹا چھائی ہوئی
داغ افسردہ ہمارے دل میں یوں ہیں باغ میں　　جیسے شاخ گل پہ کچھ کلیاں ہوں مرجھائی ہوئی

باغ، ابن حیدر علی سرداری صدر امجد اللہ حیدر آبادی مرحوم، باغ ستار احمد مزاج المی اطب ستار یار جنگ کے عزیز تھے، نواب صاحب کے مکان پر بھی اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شعرا میں ایک مزاحیہ شاعر مولوی اسحٰق المتخلص بہ یحییٰ مرزا بیگ تیموری بھی شریک رہا کرتے تھے عجب پر لطف صحبت رہا کرتی تھی یحییٰ نے غزل پڑھی تھی جس کا مقطع یہ تھا ؎

بن جو ل اے ہوا ہے تو کیا غم اے یحییٰ
بست یاری میں تو ہم ہیرے واصل آئے

باغ صاحب نے انجمن معلم الملک کے مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے جس پر داد دی گئی تھی ؎

رکے وہ تو ساکن ہوئیں گردشیں
چلے وہ تو محشر بپا ہو گیا

اسی مشاعرہ میں محمود خاں محمود۔ ایک مطلع سنئے ؎

جوانی کا آنا بلا ہو گیا　　مزاج آپ کا کیا سے کیا ہو گیا

نظم طباطبائی، (حیدر یار جنگ ۱۲۷۰ھ / ۱۳۵۲ھ) محتاج تعارف نہیں ؎

صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی　　مسکرائی ہے سرہانے اجل آئی ہوئی
یہ سے علی بات اور طوفان پر طوفاں اٹھے　　آنکھ ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
گر ہی طبیعت ہی ایسی ہو تو اس کا کیا علاج　　راہ تو سیدھی ہے لیکن چال گترائی ہوئی
کھل گئے کل عقدۂ دل ماکستورہ ہی رہا　　ناخن موج صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی
اک قدم ہے اندرون خانہ اک بیرون در　　سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
بار آئے کیسے کیسے کار ہی سے ہم شل قلم　　مدتوں سجدے کئے برسوں جبیں سائی ہوئی
جتنی باتیں خانقہ میں حضرت زاہد کی ہیں　　ہر اتنی ہی ہونگی سب بناوٹ کی چھائی ہوئی

آپ کا دیوان صوت الشعرا چھپ چکا ہے ایک مضمون "سیدہ سیارے" (مجمع شعرا باکمال) رسالہ مجلۂ عثمانیہ میں نظر سے گزرا تھا

نہال، حکیم میر ضامن علی حیدر آبادی ؎

دل میں یاد غیر ہے بیں چٹکیاں جب بزم میں　　رک گئی ہونٹوں پہ ان کے ہنسی آئی ہوئی

واصفی، عبد الصمد خاں (تلمیذ داغ) ؎

جا بجا حسرت ٹپکتی ہے در و دیوار پر　　کس کی چشم تر کی رو دیں ہیں برسائی ہوئی
کیا قیامت ہے ہمارے دل کو کہے پائمال　　پوچھتے ہیں رو رہے کس کی ٹھکرائی ہوئی
دشت میں نذر کر دیا ہر اک زبان خار کو　　کام کی کیسی ہماری آبلہ پائی ہوئی
دیکھتے جاتے ہیں وہ چھپ چھپ کے میرا حال زار　　آنکھ بھی ان کی جو ڑیلی ہے آنسو بھرائی ہوئی

یٰسین، غلام یٰسین خاں (جمعدار نظم جمعیت، ولادت ۱۳۰۱ھ)

حور جس ارض سبز خود آرائی ہوئی
خود تماشا بن کے آئی خود تماشائی ہوئی
دست نازک امان تیغ قاتل سب سراپا کھینچ
کیا حنا نے خون ناحق رنگ ہے لائی ہوئی
گلشن عالم میں پھولے گر مرا گل مراد
اک کلی کھلے گی بارہ ایک مرجھائی ہوئی

عابد، حکیم سید عابد (متوفی ۱۳۴۹ھ) مہتمم شفاخانہ یونانی ؎

تیکھی تھی محفل میں ان کی آنکھ شرمائی ہوئی
رہ گئی برق نگہ پلکوں میں لہرائی ہوئی

عزیز، عبد القادر احمد ؎

وہ ہمارے پر مرے آئے ہیں پڑھنے فاتحہ
روح صدقے ہو رہی ہے ان پہ اترائی ہوئی

محمود، حاجی محمود خاں ؎

ہوش میں رہتے اگر موسیٰ تو ہوتی کچھ خبر
برق چمکی طور پر یا جلوہ فرمائی ہوئی

مرزا محمد ہادی رسوا ؎

کیا بھلی لگتی ہے زلف یار بل کھائی ہوئی
چاند سے رخسار پر بکھری ہوئی چھائی ہوئی
چاہیے چہرے حسینوں کا ستاروں کے عوض　　اس سے کیا زینت ترکی لے جو چرخ مینائی ہوئی
عرش پر وسعت رہی یا دل میں گنجائش نہ تھی　　جلوہ پردہ طور پر کیوں جلوہ فرمائی ہوئی
کیا بری لگتی ہے ارباب غرض کی روک ٹوک　　جب طبیعت ہو کسی معشوق پر آئی ہوئی
بس بس اے مرزا غزل ہے یہ کہ اک طومار ہے　　رک نہیں سکتی طبیعت تیری گرمائی ہوئی

مرزا رسوا محتاج تعارف نہیں امراؤ جان ادا ان کی مشہور تصنیف ہے اور کراچی میں کئی سال قبل ایک فلم بھی اسی ناول پر بن چکا ہے۔ (رسالہ تاج حیدر آباد دکن جلد ۲ شمارہ ۱۲)

شیو راج بہار

غزل

ہر الم باعث مسرت ہے
کیا غم دوست کی کرامت ہے
جب بھی کوئی ہنسا تو ہم روئے
تیرے غم کی عجیب فطرت ہے
بزم رنداں میں آ کے دیکھ اے شیخ!
زندگی کتنی پر مسرت ہے
نام رہتا ہے تیرا ورد زباں
تیرا غم ہی تری عبادت ہے
تجھکو دیکھا تھا کس لئے میں نے
اب یہ خود سے مجھے شکایت ہے
آہ، کیا جانے وہ بت کافر
بت پرستی بشر کی فطرت ہے
عشوہ و غمزہ ہو کہ ناز بہار،
ان کی اک اک ادا قیامت ہے

جواہر لال نہرو

مہاتما گاندھی کی نظر میں

پنڈت جواہر لال ہر طرح سے قابل ہیں انھوں نے برسوں تک بے مثال قابلیت سے اور عقیدت کے ساتھ کانگرس کے سکریٹری کا کام کیا ہے۔ اپنی بہادری، پختہ ارادے، عقیدت، سادگی، سچائی اور تحمل کی وجہ سے انھوں نے دیش کے نوجوانوں کا من مٹھی میں کر لیا ہے وہ کسانوں اور مزدوروں کے بھی تعلق میں آئے ہیں۔ یورپ کی راست کا جو دقیق مطالعہ انھیں ہے اس سے انھیں اپنے دیش کی سیاست کو سمجھنے اور اس کی تعمیر میں مدد ملے گی۔

خیر، یہ ہے کہ جواہر لال کا اور میرا کیا تعلق ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کانگرس کے سبھاپتی ہوئے تو کیا اور نہ ہوا تو کیا! خیال یا دماغ کے لحاظ سے ہم میں اختلاف بھلے ہی ہو، ہمارے دل تو ایک ہیں دوسرے نوجوانی کے لائق تیزی کے رہتے ہوئے بھی اپنے کڑے ڈسپلن اور عقیدت جیسے اوصاف کی وجہ سے وہ ایک کتاب دست ہیں، جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

. . جہاں ان میں ایک بہادر جنگجو آدمی کی طرح حوصلہ دلیری اور تیزی ہے، وہاں ایک مدبر کی سی سمجھداری اور دور اندیشی بھی ہے ڈسپلن کے وہ پورے بھگت ہیں اور ایسے وقت میں بھی جبکہ ڈسپلن میں رہنا بے عزتی سی معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے اس پر سدھی سے عمل کر کے دکھایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے آس پاس والوں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ انتہا پسند اور گرم دل کے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ حلیم اور حامل تجربہ کار اتنے ہیں کہ کسی بات پر اتنا زور نہیں دینے کہ وہ نامنظور ہو جائے۔ جواہر لال گوہر آب کی طرح شفاف اور پاک ہیں ان کی سچائی سے متعلق تو شک کی گنجائش ہی نہیں۔ وہ ایک نڈر اور بغیر کسی کلنک کے معصوم سردار ہیں۔ قوم ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے

. . . بھارت میں نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن جواہر لال کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے کسی نوجوان کو میں نہیں جانتا اتنا میرے دل میں ان کے لئے پیار ہے یا کہئے کہ موہ ہے لیکن یہ پریم یا موہ ان کی شکتی کے مطابق قائم ہے اور اس لئے میں کہتا ہوں کہ جب تک ان کے ہاتھ میں لگام ہے، ہم اپنی مطلوبہ چیز حاصل کریں تو کتنا اچھا ہو! . . . .

جواہر لال ہند کا جواہر ثابت ہوا ہے۔ ان کی تقریروں میں نہایت اونچے خیال، میٹھی اور شائستہ زبان میں ظاہر ہوئے ہیں کبھی باتوں سے متعلق یہ تقریر ہوئی پھر بھی وہ چھوٹی ہے۔ روح کی چمک ہر ایک جملے سے جھلکتی ہے کبھی لوگوں کے دلوں میں جو ڈر رہتا، تقریر کے بعد وہ سب مٹ گیا۔ جیسی ان کی تقریر تھی ویسا ہی ان کا عمل بھی تھا کانگرس کے دنوں میں انھوں نے اپنا سارا کام آزادی اور مکمل انصاف پسندی سے کیا اور اپنا کام لگن سے کرتے رہنے کی وجہ سے سب کچھ ٹھیک وقت پر بغیر رکاوٹ کے مکمل ہوا۔

ایسے جانباز اور پاک نوجوان کی صدارت میں اگر ہم کچھ نہ کر پائیں گے تو مجھے بڑا تعجب ہوگا۔ لیکن اگر فوج ہی نالائق ہو تو جانباز لیڈر بھی کیا کر سکتا ہے؟ اس لئے ہمیں اپنا نفسیاتی جائزہ لینا چاہئے کیا ہم جواہر لال کی قیادت کے لائق ہیں؟ اگر ہیں تو نتیجے نیک ہی نکلیں گے۔

. . پنڈت نہرو نے اپنے مادر وطن اور اس کے جزئوں میں اپنی زندگی کی سبھی خواہشیں اور ارمان بھینٹ کر دی ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی دوسرے دیش کی امداد سے ملنے والی اپنے دیش کی آزادی کو بھی باعزت آزادی نہیں سمجھا۔

ہمیں الگ کرنے کے لئے صرف تفرقات کافی نہیں ہیں۔ ہم جس لمحہ سے آپس میں مل کر کام کرنے لگے ہیں، تبھی سے ہمارے بیچ میں تفرقہ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں کئی سال سے کہتا رہا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ جواہر لال میرا جانشین ہوگا . وہ کہتا ہے کہ میری زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی کہتا ہے کہ اس کی زبان میرے لئے اجنبی ہے۔ یہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دلوں کی ایکتا میں زبان رکاوٹ نہیں ہوتی۔

اور میں جانتا ہوں کہ جب چلا جاؤں گا، جواہر لال میری ہی زبان میں بات کرے گا۔

آپ کے اصلی بادشاہ جواہر لال ہیں۔ وہ ایسے بادشاہ ہیں جو ہندوستان کو تو اپنی خدمت دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے سبھی دیشوں کے لوگوں سے تعارف حاصل کر لیا ہے

جواہر تو کسی سے بھی دھوکہ کرنے والا نہیں ہے جیسا ان کا نام ہے ویسا ان کا وصف۔

وہ آسانی سے باپ بھائی، مصنف، راہی، دیش بھگت یا بین الاقوامی لیڈر کی صورت میں متصور ہیں، تو بھی قارئین کے سامنے ان مضامین میں سے ان کا جو روپ ابھرے گا وہ اپنے دیش اور اس کی آزادی کے، جس کے پاؤں میں انھوں نے دوسری سبھی خواہشیں بھینٹ کر دی ہیں، عقیدت مند بھگت کا روپ ہوگا یہ سہرا انھیں کے سر سجتا ہے کہ وہ کسی غیر ملک کی امداد کی قیمت پر اپنے دیش کی آزادی حاصل کرنا ستان کے خلاف سمجھیں گے ان کی قومیت میں الاقوامیت جیسی ہے۔

(خبر نامہ اردو شعبہ گاندھی پیدائش صدی سے ماخوذ)

پتہ دیکھئے: اگر آپ کے پتے کے اوپر سرخ نشان ہے تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ ددا اشاعت کے بعد آپ کی میعاد خریداری ختم ہو جائے گی مہربانی فرما کر "ہلال نو" کی سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپے منی آرڈر سے بھیجئے۔

مراسلات

اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس اور مہاراشٹر کے اردو اساتذہ

انجمن اساتذۂ اردو کی تیسری کانفرنس میں شرکت کے لئے مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے جو نمائندے نامزد کئے تھے ان کی تفصیلی فہرست ۲۲ اکتوبر کے "ہماری زبان" میں میری نظر سے گزری تھی۔ اس فہرست میں بمبئی یونیورسٹی کے کسی نمائندے کا نام نہ دیکھ کر مجھے حیرت ضرور ہوئی تھی مگر میں اس خوش فہمی میں تھا کہ بمبئی یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں کے اہم اردو اساتذہ کم ازکم اپنے طور پر تو اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں گے۔ مگر یکم نومبر کے تازہ "ہماری زبان" میں کانفرنس کی مفصل رپورٹ پڑھ کر مجھے ایک طرف خوشی ہوئی ہے تو دوسری طرف اس بات کا انتہائی ملال بھی ہوا ہے کہ کانفرنس کے شرکا میں اردو کے ان معروف اور اہم اساتذہ میں سے کسی کا بھی نام شامل نہیں ہے جو بمبئی سے تعلق رکھتے ہیں ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

کانفرنس کی رپورٹ سے جو صورتِ حال اس وقت میرے سامنے ہے اس کی صرف دو وجوہات میری سمجھ میں آسکی ہیں (۱) یا تو کانفرنس کے منتظمین نے خود ہی بمبئی یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کی شرکت کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے یا پھر (۲) خود بمبئی یونیورسٹی اور اس کے کالجوں کے اردو اساتذہ کو اپنی زبان کے تعلیمی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

بہر حال جہاں تک میری ناقص رائے کا تعلق ہے اگر یہ صحیح ہے کہ مہاراشٹر میں بھی اردو کی تعلیم و تدریس ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ ہمارے مسائل ان یونیورسٹیوں اور ریاستوں کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں جن کے نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، تو نہ صرف بمبئی یونیورسٹی بلکہ پونہ، ناگپور، اور شیواجی یونیورسٹی کے بھی کچھ اردو اساتذہ کو اس میں اپنے طور شرکت کرنی چاہئے تھی۔

(بدیع الزماں خاور)

صد سالہ جشن غالب

حلقۂ ادب (کراچی) غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک باتصویر خاص نمبر ترتیب دے رہا ہے۔ ہند و پاک کے اہل قلم سے مخلصانہ گزارش ہے کہ غالب سے متعلق گرانقدر نگارشات اپنے پاسپورٹ سائز تصویر کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ حلقۂ ادب خاص نمبر کے لئے منتخب تخلیقات پر قلمکاروں کو دلکش معاوضہ بھی پیش کرے گا۔ مضامین بذریعہ رجسٹری ارسال کئے جائیں۔

پتہ۔ اسلم پرویز (معارن) ناظم اعلیٰ حلقہ ادب قبلہ نمبر ۱۰ ...

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

معراج العاشقین کا مصنف

مصنف:۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل   صفحات: ۱۰۸

ملنے کا پتہ:۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل حیرت کدہ سلطان پورہ حیدر آباد دکن

ہندوستان کی مسجدیں۔

مصنف۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

ناشر: پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۸   صفحات: ۸۰

قیمت:۔ دو روپے۔

گار مشاعرہ کے ساتھ حیدرآباد میں جشن غالب تقاریب کا آغاز

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش کے دارالخلافہ حیدرآباد میں اردو
ے منفرد اور صاحب طرز شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی
دسالہ برسی کے سلسلہ میں جشن غالب کی تقاریب کا "مشاعرہ غالب"
ے آغاز ہوا ' سروجنی دیوی ہال رام کوٹ میں منعقدہ اس تاریخی
ر یادگار مشاعرہ میں پاکستان کے ممتاز ترقی پسند انقلابی شاعر
یض احمد فیض نے اپنی نظمیں، غزلیں اور قطعات سنائے۔ اس
شاعرہ کی صدارت وزیر اطلاعات جناب کونڈہ لکشمن باپوجی نے کی
زیر مواصلات و آبرسانی جناب جے وی رنگ راؤ نے جو جشن غالب
دسالہ مالیہ کمیٹی کے صدر بھی ہیں اپنی خیر مقدمی تقریر میں غالب کو
ر دست خراج عقیدت پیش کیا۔ اور کہا کہ مرزا غالب نے اپنی
اعری کے ذریعہ نہ صرف ایک پوری نسل کو متاثر کیا بلکہ موجودہ اور
ر آنے والی نسلوں میں بھی وہ ہمیشہ ایک عظیم المرتبت شاعر کی
یت سے یاد کئے جائیں گے۔ ہندوستان کو اس بات پر فخر ہے
یہ عظیم شاعر اسی ملک میں پیدا ہوا، اور وطن دوستی کی روایت
ائم کی۔ جناب جے وی رنگ راؤ نے کہا کہ اردو شاعری کی
لف کو سنوارنے میں غالب ہی کا زیادہ حصہ رہا ہے۔ انھوں نے
ود غزل کو بام عروج پر پہنچایا۔ اور اس کے لئے فارسی زبان
ی استعمال کیا۔ ان کی شاعری میں ایک عام انسان کا دل دھڑکتا
ہے۔ وزیر مواصلات نے فیض احمد فیض کو آج کے دور کا ایک عظیم شاعر
رار دیتے ہوئے خیر مقدم کیا اور کہا کہ فیض کسی تعارف کے محتاج نہیں
ہ ایک صحافی ایک دانشور اور ایک شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت
ے حامل ہیں یہ بات اہل حیدرآباد کے لئے باعث مسرت ہے کہ فیض آج
ہمارے درمیان ہیں انھوں نے فیض اور صدر مشاعرہ جناب کونڈہ لکشمن
پوجی کی گلپوشی کی جس کے بعد فیض احمد فیض نے صدسالہ جشن غالب
یٹی آندھرا پردیش اور اہل حیدرآباد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھیں
رصہ دراز سے حیدرآباد آنے کی خواہش تھی وہ آج پوری ہوئی ہے
س کے بعد فیض احمد فیض نے یہ قطعہ سنایا ؎

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اس کے بعد فیض نے رباعیاں، غزل، اور نظم سنائی۔ اس
ے بعد ممتاز غزل گو شاعر مجروح سلطانپوری نے اپنی غزل سنائی
س کا مطلع تھا ؎

چمن ہے مقتل نغمہ و ساز کیا کہئے
س ایک سکوت کا عالم جسے نوا کہئے

مخدوم محی الدین نے بھی اپنی دو غزلیں اور دو نظمیں سنائیں
جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ابتدا میں صدسالہ جشن غالب
کمیٹی آندھرا پردیش کی جانب سے مہمانوں کا استقبال کیا اور مشاعرہ
کی کارروائی کے آغاز کا اعلان کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے شہرۂ آفاق
شاعر غالب کی صدسالہ جشن کی تقاریب کا اس مشاعرہ سے آغاز ہو رہا
ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں جشن غالب منایا جائے گا مشاعرہ میں صلاح الدین
نیض الحسن خیال، ماہر کرنولی، طالب رزاقی، خورشید احمد جامی، حکیم
یوسف حسین خاں، ابن احمد تاب، کنول پرشاد کنول، رئیس اختر
وقار خلیل، تاج مہجور، سردار علی مرزا، اوج یعقوبی، جرأت ندیم،
شاد تمکنت، پرنس لیق علی خاں ثاقب، اور دوسرے شعرا نے کلام سنایا۔
خاتون شعرا میں محترمہ عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، اور ثریا جبیں نے اپنا
کلام سنایا۔ مسز رفیعت ساجدہ کے شکریہ پر اس کامیاب محفل کا اختتام
عمل میں آیا۔ (بہ شکریہ اس لاہور کنوینر صدسالہ جشن غالب کمیٹی)

سوویت یونین میں صدسالہ جشن غالب کی تیاریاں

حیدرآباد۔ سوویت یونین میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے
صدسالہ جشن کے تعلق سے جو تیاریاں عمل میں آ رہی ہیں ان کا ایک
خاکہ سوویت یونین میں غالب صدسالہ جشن کمیٹی کے معتمد ڈاکٹر این گلیبوف
نے ایک پیام میں پیش کیا ہے جو صدسالہ جشن غالب کمیٹی آندھرا
پردیش کے صدر جناب [illegible] صاحب کے نام موصول ہوا ہے۔
ڈاکٹر این گلیبوف نے [illegible] جشن صدسالہ غالب کی تقاریب
کے سلسلے میں جو تجاویز [illegible] پیش کی ہے پیام میں بتایا گیا
ہے کہ جہاں تک سوویت یونین میں غالب کے صدسالہ جشن کا تعلق ہے
اس کا پروگرام یہ ہے۔ آئندہ سال فروری میں ماسکو، ازبکستان اور
تاجکستان میں سمپوزیم منعقد کئے جائیں گے۔ سمرقند میں آرٹس فیسٹیول
منعقد ہو گا جس میں وسط ایشیا کی سوویت جمہوریتیں حصہ لیں گی۔ اس
فیسٹول میں ہندوستان اور پاکستان کے اداکار بھی شرکت کریں گے غالب
کی منتخب غزلوں اور کلام کو روسی زبان میں شائع کیا جائے گا علاوہ
روسی غالب پر سوویت ادیبوں نقادوں کے مضامین پر مشتمل ایک
مجموعہ شائع کیا جائے گا۔ اس مجموعہ میں ہندوستانی ادیبوں کو بھی
شامل کیا گیا ہے پیام کے آخر میں [illegible] کی نیک خواہشات بھی کی گئی ہے
(بہ شکریہ اس لاہوتی)

گوالیار میں غالب صدسالہ کمیٹی کا انتخاب

غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی کی مجلس عام کا ایک جلسہ جناب
پی کے سری واستو کی صدارت میں چیمبر آف کامرس گوالیار میں منعقد ہوا۔
جس میں تقریبات کمیٹی کی مجلس عاملہ کے عہدہ داروں اور اراکین
کا انتخاب عمل میں آیا اور اتفاق رائے سے مجلس عاملہ کے عہدہ داروں
کا انتخاب ہوا۔ (رفعت جاوید)

سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کی اپیل

پٹنہ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب بیتاب صدیقی نے حسب ذیل اپیل اردو دوستوں کے نام بغرض اشاعت بھیجی ہے۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ممبر سازی کی مہم شروع ہو چکی ہے ضلعی شاخوں کے عہدیداروں کے پاس رسیدیں بھیجی جا چکی ہیں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا وفد تقریباً تمام اضلاع کے دورے ختم کر چکا ہے بعض اضلاع کی شاخیں ممبر سازی میں بے حد سرگرم ہیں ضرورت ہے کہ اردو کے بہی خواہ اور دردمند حضرات ممبر سازی کی مہم کی کامیابی کے لئے میدان عمل میں کود پڑیں ممبر سازی مہم چلائیں زیادہ سے زیادہ کو ممبر بنائیں۔ گھر گھر اردو کا پیغام پہنچائیں۔ انجمن نے کم سے کم دس لاکھ ابتدائی ممبر سازی کا اعلان کیا ہے اب یہ اردو دوستوں کے حوصلہ اور جوش و سرگرمی پر منحصر ہے کہ وہ اس نشانے کو عبور کر کے تیس چار لاکھ تک ممبر سازی کی تعداد پہنچائیں اور اس مہم کی کامیابی کے ذریعہ انجمن کی طاقت اور اس کا وقار بڑھائیں تاکہ انجمن تعمیری پروگرام اور تحفظ اردو کی جد و جہد کو منزل تک پہنچا سکے۔ آخر میں بہار کے عام دردمندان اردو اور خصوصاً انجمن کی شاخوں کے ذمہ داروں سے اپیل ہے کہ وہ دوسرے کو چھوڑ کر یاد رکھ کر ممبر سازی کی مہم کو آگے بڑھانے کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں اور اپنی سرگرمی عمل سے ثابت کر دیں کہ اردو کا مفاد ہر حال انھیں عزیز ہے۔ (نامہ نگار)

کانگرس پورے اردو کلچر کو بھی اپنائے

لکھنؤ۔ اردو ہمارے صوبے کی ہی زبان ہے اور اس کا کسی خاص مذہب اور ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے اردو بولنے والے ہمارے صوبے میں بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں ان تک کانگرس کے پیغام کو ان کی زبان ہی میں پہنچانا بہت ضروری ہو گیا ہے مذکورہ بالا الفاظ یوپی کانگرس کے صدر پنڈت کملا پتی ترپاٹھی نے گزشتہ شب یوپی کانگرس کے ہفتہ وار ہندی ترجمان "نیا بھارت" کے اردو ایڈیشن کے رسم اجراء کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔ اردو ایڈیشن کی رسم اجراء کی شاندار تقریب پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ کے موقعہ پر یوپی کانگرس کمیٹی کے دفتر ۱۹ قیصر باغ میں ہوئی۔ صدر یوپی کانگرس نے یوپی میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ "ہمارے اردو ایڈیشن کا اجراء اس قدر تاخیر سے جو ہو رہا ہے تو بے شک یہ ہماری بھول تھی لیکن یہ بھول صرف مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ہوتی رہی" انھوں نے کہا کہ اردو ایسی زبان ہے جس کی اہمیت کو ہمارے ایسے لوگ ہمیشہ تسلیم کرتے رہے ہیں ہم اردو کو ہندی کا ہی ایک اسلوب سمجھتے ہیں اور دونوں کو ایک زبان سمجھتے ہوئے بنیادی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ یوپی کانگرس کے جنرل سکریٹری اور "نیا بھارت" کے مدیر اعلیٰ جناب ایچ۔ این بہوگنا نے اس سے قبل مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مدیر جناب آغا زیدی نے جو "تماشرین" ہے "نیا بھارت" اردو ایڈیشن سے تعاون کی اپیل کی۔ راجیہ سبھا کے کانگریسی ممبر اور روزنامہ قومی آواز کے مدیر حیات اللہ انصاری نے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اردو نیا بھارت کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ۴۰ برس سے کانگرس کا خادم ہوں لیکن میرا خواب صرف اس اخبار کے نکلنے سے پورا نہیں ہوا اس وقت پورا ہوگا جب کانگرس اس پورے کلچر کی حفاظت اور اس سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرے گی جس کو اردو کا کلچر کہتے ہیں۔ اگر کانگرس نے یہ کام کیا تو میں اپنی اس زندگی کو جو کانگرس کی خدمت میں گزاری کامران سمجھوں گا" آخر میں نیا بھارت کے ذمہ دار جناب منسی دھر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کا اختتام بزم مشاعرہ پر ہوا جس میں شہر کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا (قومی آواز)

ضلع بلڈانہ مہاراشٹر میں اردو کالج کی ضرورت

بلڈانہ ضلع میں اردو کے ۸ ہائی اسکول ہیں درجہ میں ۲۵ ہائی اسکول ہیں مگر کالج نہ ہونے کی وجہ سے اردو داں طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔ ضلع انجمن ترقی اردو ہند ملکاپور کی کوششوں سے گزشتہ دو سال کے عرصہ میں ۴ ہائی اسکول۔ مڈل اسکول ۱۱ پرائمری اسکولوں کا اجراء عمل میں آ چکا ہے۔ فی الحال بلڈانہ ضلع میں ۱۴۳ اردو پرائمری مدارس ہیں ۷ ہائی اسکول ہیں ۲ ہائی اسکول سال رواں سے جاری ہوئے ہیں۔ ان تمام اردو مدارس میں ۱۲۶۴۲ طلبہ زیر تعلیم تھے ۶۷-۱۹۶۶ء میں بلڈانہ ضلع کی آبادی ۱۱ لاکھ کی ہے جس میں اردو آبادی ایک لاکھ ۳۵ ہزار ہے۔ ودربھ میں ۱۱ لاکھ اردو آبادی ہے لہذا یہاں کالج کی سخت ضرورت ہے جس پر تقریباً ۳ لاکھ روپیہ درکار ہے۔ (حمید اشرف خاں)

وزیر تعلیم راجستھان کو انجمن شاخ راجستھان کا میمورنڈم

انجمن ترقی اردو راجستھان نے وزیر تعلیم راجستھان کی خدمت میں دو میمورنڈم بھیجے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے ایک میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ انجمن ترقی اردو راجستھان یہ بات شدت سے محسوس کر رہی ہے کہ محکمہ تعلیم راجستھان کے افسران گورنمنٹ کی پالیسیوں کو بروئے کار لانے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس رویہ کی بنا پر اردو بولنے والے لوگوں کو دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس شکایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک سرکولر کے ذریعہ یہ واضح کر دیا تھا کہ جس کلاس میں دس طلبہ یا کسی اسکول میں ۴۰ طلبہ ہوں جو اپنی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو انھیں اردو پڑھنے کی سہولت ملے گی اس طرح کے سرکولر ایڈیشنل ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے صوبہ کے سارے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں بھیجے چنانچہ اس سرکولر پر گورنمنٹ پرائمری اسکول محلہ مہاوتان توپخانہ حضوری جے پور میں بھی عمل درآمد ہوا چنانچہ اس اسکول میں گزشتہ سیشن تک اردو کی تعلیم

ہوری تھی لیکن اس سال وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے بغیر کسی حکم کے وہاں اردو کی تعلیم کو ختم کر دیا حالانکہ ابھی وہاں معلومہ تعداد سے زیادہ اردو طلبہ موجود ہیں چنانچہ ہم اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اردو کو دوبارہ اسکول میں رائج کیا جائے۔ انجمن کی طرف سے ایک میمورنڈم وزیر تعلیم راجستھان کو بھیجا گیا ہے جس میں ان کی توجہ راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ راجستھان ساہتیہ اکیڈیمی ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جسے راجستھان گورنمنٹ سے اردو ہندی اور سنسکرت کی ترقی کے لئے امداد بھی ملتی ہے اس کے باوجود راجستھان اکیڈیمی کا رویہ اردو کی طرف اطمینان بخش نہیں ہے۔

(نامہ نگار)

لکھنؤ یونی ورسٹی تقریب غالب منائے گی

لکھنؤ: اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی نے پروگرام کے مطابق "غالب ہفتہ" کی تقریبات کا آغاز یونی ورسٹی ہال میں "غالب تصویری نمائش" سے کیا اس تقریب کی صدارت شعبۂ فارسی و اردو کے ریڈر ڈاکٹر سید رغیب حسین نے اور نمائش کا افتتاح لکھنؤ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم سی لال نے کیا۔ مختلف نامور مصوروں کی بنائی ہوئی رنگ رنگی تصویریں یونین ہال میں سلیقے سے سجائی گئی تھیں تصاویر کے نیچے لکھے ہوئے غالب کے اشعار ان تصویروں کی معنویت میں اضافہ کر رہے تھے۔ تقریب کا آغاز غالب کی ایک غزل سے ہوا جسے یونی ورسٹی کے ایک طالب علم سلمان عباسی نے پڑھ کر سنایا اس کے بعد سوسائٹی کے صدر سید ضیاء الحسن نے اپنی تقریر کے ذریعہ غالب کو خراج عقیدت پیش کیا صدر کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے استاد جناب شبیہہ الحسن صاحب نے آرٹ اور ادب کے موضوع پر تقریر کرتے غالب کے پورے کلام کو ایک آرٹ اور ایک سنجیدہ ادبی پیغام بتلایا۔ اس کے بعد سوسائٹی کے سکریٹری سید مصباح الاسلام نے سوسائٹی کی رپورٹ پیش کی اور کابینہ کے دوسرے ممبران کا تعارف مہمان خصوصی جناب وائس چانسلر صاحب سے کرایا۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر ایم بی لال صاحب وائس چانسلر یونی ورسٹی آف لکھنؤ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں تقریر کے ذریعہ غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ سب لوگوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں بھی یونی ورسٹی کی طرف سے بہت جلد غالب کی صدسالہ تقریبات منائی جائیں گی جس کے انتظامات شروع ہو چکے ہیں۔ ان تقریبات میں سے ایک مشاعرہ اور کوی سمیلن بھی ہوگا" (قومی آواز)

نیپال میں غالب کی صدسالہ یاد میں مشاعرہ کا فیصلہ

لکھنؤ: جناب مقبول احمد لاری کی گولڈن جوبلی اور جناب رشی کیش شاہ ممبر راشٹریہ پنچایت نیپال و سابق وزیر خارجہ نیپال کے اعزازی تقاریب میں جناب عارف نیپالی صدر بزم ادب نیپال گنج نے شرکت کی انھوں نے اپنی نئی تصنیف نیپال کے اردو شاعر جل کے منتشر مطبوعہ ادب پاروں کے مجموعہ "گلشن صدرنگ" کے بارے میں یہاں لکھنؤ کے اہل قلم حضرات سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کے صدسالہ برسی کے سلسلے میں نیپال گنج میں بھی ایک مشاعرہ کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے ابتدائی انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ (سیاست)

لکھنؤ کارپوریشن میں اردو کے مسئلہ پر واک آوٹ

لکھنؤ: مقامی شہری کارپوریشن کے اجلاس میں ملتوی شدہ بجٹ پر غور و خوض کے دوران جلسہ کی کارروائی کے آغاز میں ایک ممبر نے میئر سے دریافت کیا کہ آپ نے اردو زبان میں ایجنڈا اور ایوان کی کارروائی کی اشاعت کے بارے میں جو وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک کیوں پورا نہیں ہوا اس پر میئر نے جو جواب دیا اسے ناکافی اور غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے مذکورہ ممبر نے احتجاجاً واک آوٹ کر دیا بعد میں ایک اور ممبر کے سوال پر میئر نے بتایا کہ میں اردو میں ایجنڈا اور ایوان کی کارروائی کی اشاعت کے مسئلہ پر بشرط فرصت غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (سیاست)

بمبئی میں جشن کرشن چندر

بمبئی: یہاں اردو کے ترقی پسند اہل قلم کرشن چندر کا جشن منایا گیا اس موقع پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جشن کرشن چندر کمیٹی کی جانب سے چاندی کی ایک تختی کرشن چندر کو پیش کی۔ زمانۂ جدید کے فن کار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی نے انھیں ماڈرن مرزا غالب (غالب ثانی) بتایا اردو، ہندی، مراٹھی، تامل، پنجابی، تلگو، گجراتی، کنڑی، سندھی اور بنگالی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کی طرف سے علامتی تحفے کرشن چندر کو پیش کئے گئے۔

(سیاست)

ڈاکٹر وارث کرمانی

رفتار

ترقی پسند تحریک کے بعد جو یا رجحان اردو ادب میں آیا ہے اسے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں اور عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ حضرات اسے مغربی ادب کی نقالی پر محمول کرتے ہیں کچھ لوگ ترقی پسند تحریک کا حریف بنا کر اسے پیش کرتے ہیں اور اسے اتنی دور تک کھینچتے ہیں کہ بات ادب سے سیاست تک پہنچ جاتی ہے یعنی ان کو باقاعدہ ر وا کھاڑے نظر آتے ہیں جن کی پشت پر دنیا کی دو بڑی طاقتیں بہت پراسرار اور درپردہ انداز سے کر رہی ہیں ضعیف العمر طبقہ اس رجحان کو نوجوانوں کی آوارگی یا کجروی سے تعبیر کرتا ہے اصول پرست اور گھر گرہست قسم کے لوگ اسے ذہنی بیماری یا آوارگی سمجھتے ہیں اور اردو ادب کی مکمل شفایابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ہمارے ادب کے ایک ارتقائی عمل اور اس کی قدرتی تبدیلی کو جو تاریخی اعتبار سے بالکل نارمل ہے ایسی بھانت بھانت کی تعبیریں کیوں مل رہی ہیں اور وہ کیا مخصوص عوامل ہیں جنھوں نے ہمیں خود اپنے ادب پاروں کو ان کے اصل رنگ و آہنگ میں دیکھنے اور پہچاننے سے باز رکھا ہے بظاہر تو اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جدید شاعری کے نام سے جو چیزیں چھپتی ہیں ان میں خاصی تعداد ایسی ہوتی ہے جو بدنام کرنے والی ہے اس پر آئندہ قسط[۲] میں تفصیل سے لکھا جائے گا لیکن ایک دوسری اور زیادہ تشویشناک وجہ یہ ہے کہ خود جدید شاعری کے بعض علمبردار اس خاص قسم کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اپنی تاویلیں اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ بحث معترضین کے حسب منشا ہوتی ہے یعنی یہ لوگ ایسی لڑائی لڑنے میں جس میں نہ صرف جگہ اور وقت کا تعین مخالف سمت سے ہوتا ہے بلکہ دلائل یا طریقۂ جنگ بھی معترضین کے انتخاب کا ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی طرف سے مغرب کی تقلید کا الزام لگایا گیا تو یہ نقاد چراغ پا ہو کر مشرق کے ادب کو برا کہنے لگتے ہیں اگر کسی نے جدید شاعری کو مہمل کہا تو جواباً یہ قدیم شاعری کے تمام سرمائے کو مبالغہ، کذب، افترا اور لغو قرار دینا ضروری سمجھتے ہیں اس پر دستاویز علما اور بھی مسرور و محظوظ ہوتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کے خلاف اسے تحریری ثبوت میں پیش کرتے ہیں اس بحث و تکرار سے نقصان شعر و ادب کا ہوتا جس کی صحیح صورت گرد و غبار میں چھپ جاتی ہے جدید نقادوں کو اس معاملہ میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم موجودہ ادبی رجحان کو خارجی یا اجنبی مان کر اسے اپنی سرزمین اور اپنے ماضی سے علیحدہ نہیں سمجھتے اگر ایسا ہوتا تو اردو ادب کے بعض مقتدر نقاد جو اس تبدیلی سے پہلے ہمارے ادب کی سربراہی کر چکے ہیں آج نئے رجحان کے ساتھ نہ ہوتے اور اس کا خیر مقدم نہ کرتے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ادب کو ایک سلسلہ ماننے پر مجبور ہیں جو نہ صرف حال سے ماضی تک پھیلا ہوا ہے بلکہ اپنے اندر ایک زبردست اشتراک بھی رکھتا ہے جس کی بنا پر سلسلہ کی کڑیاں بکھرنے نہیں پاتیں ہاں وقت اور حالات سے متاثر ہو کر تازہ شکل و شمائل سے آراستہ ہوتی رہتی ہیں فارسی کا یہ شعر جو یہ ادب کی طرف بھی اشارے سے خالی نہیں۔

من اند از قدرت را می شناسم — بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

جدید شاعری پر جس قسم کے اعتراضات عام طور سے ہوتے رہتے ہیں ان کے کچھ نمونے اوپر لکھے جا چکے ہیں ان میں پہلا اعتراض مغرب کی تقلید کا ہے۔ ایسے معترضین کو یہ سمجھانا ضروری ہے (اس لئے کہ ہمیں ان کے خلوص پر شبہ نہیں) کہ جدید شاعری مغرب کی نقالی نہیں بلکہ اس تقلید سے آزاد اور دست بردار ہونے کی علامت ہے غالب کی فارسی مثنوی[۱] "صاحبان انگلستان را نگر" سرسید کی نثری تحریریں اور حالی کے ادبی نظریات سے 'پیروی مغرب' کی ابتدا ہوتی ہے جس نے بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے تک پہنچتے پہنچتے شعر و ادب کو سماجی و سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنا دیا۔ جدید شاعری نے مفاد عامہ کے اس مجلسی انداز کو ترک کرکے (جو اٹھارھویں صدی کی گھٹیا انگریزی شاعری کی تقلید میں تھا) اپنی ہی سرزمین کے عالمگیری عہد کی طرف مراجعت کی ہے اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے میں اپنے ایک دوسرے مضمون 'جدید شعری تنقید'[۲] میں کر چکا ہوں اس مضمون میں عالمگیری عہد کے عظیم شاعر بیدل کو موجودہ شعری رجحانات کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے جس نے اچھے شعر کی تعریف 'شعر خوب معنی ندارد' کے الفاظ میں کی تھی۔ بیدل کا کلام تمام تر کشف و الہام کی کیفیتوں سے بھرا ہوا ہے ہندوستان سے باہر روس اور خراسان میں اس عظیم المرتبت شاعر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ہمارا تو یہ حال ہے کہ اگر غالب درمیان میں نہ ہوتے تو شاید ہمیں اس نام ہی کا علم نہ ہوتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کلام بیدل میں تامل و تفکر، خودنگری و خود فراموشی اور ذات و صفات کی وہ تمام حیرت انگیزیاں پائی جاتی ہیں جن کی ایک جھلک آج کی جدید شاعری میں نظر آتی ہے یہ اشعار دیکھئے

چناں کشتۂ حسرت کیستم من — کہ چوں آتش از سوختن زیستم من
نہ شادم نہ محزوں نہ خاکم نہ گردوں — نہ لفظم نہ مضمون چہ معنیستم من
اگر فانیم چیست ایں شور ہستی — وگر باقیم از چہ فانیستم من
بنازاے تخیل ببال اے توہم — کہ ہستی گماں دارم و نیستم من

میگویم و حیرانم می پویم و گریانم — حرفی کہ نمی فہمم راہی کہ نمیدانم

بیدل کے آس پاس اور بعد میں آنے والے اردو شاعروں میں بھی عام طور سے یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ اس زمانے کی غزل ہو یا نثری

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

[۱] غالب نے یہ مثنوی سرسید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی تھی جو کلیات فارسی میں "تقریظ آئین اکبری" کے عنوان سے شامل ہے۔

[۲] یہ مضمون شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی میں جدیدیت پر سیمینار کے موقع پر پڑھا گیا تھا اب سیمینار کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ رہا ہے۔

تبصرہ

محمد انصار اللہ نظر

وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت

مصنف۔ سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تلمیذ غالب
مرتب۔ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی
ملنے کا پتہ۔ کتاب منزل۔ سبزی باغ پٹنہ ۴

اردو میں صوفیائے کرام کے جو چند تذکرے لکھے گئے انھیں میں سے ایک وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت بھی ہے جس میں حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور ان کے سلسلے کے نامی خلفا کے حالات درج ہیں اس کے مصنف سید شاہ فرزند علی صوفی منیری تھے جو خود بھی اسی سلسلے سے وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تذکرہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا پھر ۱۳۱۳ھ اور ۱۳۳۴ھ میں شائع ہوا اور ۱۹۶۱ء میں چاٹگام سے چھپ کر شائع ہو چکا تھا اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب نے اسے چوتھی مرتبہ مرتب کر کے شائع کیا۔ دیباچہ میں لکھا ہے۔

> "میں نے اس کا خاص دھیان رکھا ہے کہ مطبوعہ اور قلمی نسخے جو دستیاب ہو سکیں ان سب کو سامنے رکھ کر ایک صحیح ترین متن تیار کیا جائے جو موجودہ اصول تحقیق کے مطابق بھی ہو اور صحیح ترین بھی اس سلسلے میں میں نے تمام مطبوعہ نسخوں اور غیر مطبوعہ نسخے سے استفادہ کیا ہے"

سرورق پر بھی "بہ تصحیح و تحشیہ" لکھا ہوا ہے لیکن حیرت ہے کہ کتاب میں کہیں بھی اختلاف نسخ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا یہ بات کہ ان نسخوں میں کہیں کوئی فرق نہیں تھا اس لئے قابل یقین نہیں کہ خود فاضل مرتب نے یہ فرمایا ہے کہ وہ "بہترین متن" شایع کر رہے ہیں متن کے ان اختلافی مقامات کی مرتب کے معیار کے مطابق "بہترین" سمجھتے، اگر نشاندہی کر دی جاتی تو شاید قارئین کو کچھ زیادہ فائدہ ہوتا۔ اقتباس بالا کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ اس میں "صحیح ترین" کی تکرار اور صحیح ترین کے ساتھ "ایک" کی تخصیص (صحیح ترین تو لازماً ایک ہی ہوگا) کھٹکتی ہے کتاب کے حواشی میں زبان و بیان کی اس نوعیت کی خامیاں کئی جگہ نظر آتی ہیں مثلاً

- "اس کا دو قلمی نسخہ کتب خانہ ... ملحیہ متوحہ پٹنہ میں ہے" (ص ۲۹)
- "مزارات ... آپ کے افراد اہل خاندان کے معلوم ہوتے ہیں" (ص ۴۱)
- "تبلیغ اسلام کے لیے بادہ پیمائی کی" (ص ۲۹)

بعض الفاظ کا املا بھی محل نظر ہے مثلاً "استادوں کو" "ستادن" (ص ۴) اور "یحییٰ کو" "یحیی" (فہرست مضامین اور دوسرے تمام مقامات پر) لکھا ہے اسی طرح متن و حواشی میں بعض جگہوں پر فاضل مرتب سے سہو ہوا ہے مثلاً "در زبان سلطنت پادشاہ" (حاشیہ ص ۲۴ سطر ۱۱) "در زمان" چاہئے۔ "حسب آنفرمودہ شیخ" (حاشیہ ص ۲۴ سطر ۱۳) یہ "حسب الفرمودہ" ہے۔

متن کی کتابت کے سلسلے میں "املا کی وہی روش برقرار رکھی ہے جو اس زمانے میں رائج تھی ... تاکہ اصل میں کسی قسم کی تحریف کا الزام مرتب پر نہ آئے" احتیاط کی یہ صورت اچھی ہے لیکن آج جو املا مروج ہے آج کے قاری کے لئے وہ بہ نسبت زیادہ مفید تر بھی ہے قدیم املا سے قاری کو دقت بھی ہو سکتی ہے اور شبہ بھی مثلاً

"بار سلطنت اوس کی دوش پر رکھا" (ص ۱)

آج کے قاری کے لئے "اوس کی" کو "اس کے" پڑھنا دقت طلب ضرور ہے۔ عہد مصنف کے املا کی توضیح ہی مقصود تھی تو اس کا ذکر دیباچہ میں کر دینا کافی تھا۔

واقعات کے زمانہ و تاریخ کے اندراج میں بھی بعض مقامات پر فرق آ گیا ہے مثلاً صفحہ ۲۹ (سطر ۱۸) پر شیخ اسد جو میوتی کی بابت لکھا ہے "آپ کا وصال ۷۰۰ھ میں ۲۶ صفر المظفر کو ہوا" پھر اسی صفحہ (کی سطر ۲) پر شیخ ارشدی کے حوالے سے ہے کہ "حضرت شیخ سیوتی ... المتوفی ۷۰۲ صفر" یہ چند فروگذاشتیں ہیں جو اگر نہ ہوتیں تو اچھا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس تذکرے کے حواشی لکھنے میں فاضل مرتب نے وہ محنت اور کاوش کی ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔ انہوں نے ماخذ تک رسائی حاصل کی اور ان سب سے استفادہ کے بعد اپنے مقصد کا مواد فراہم کر لیا جیسا مشکل کام ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے اس نوعیت کا کام خود بھی کیا ہو اس تذکرے کی ترتیب کا کام اس لحاظ سے بھی مشکل تھا کہ صوفیا کے تذکرے کم ملتے ہیں اور جو ملتے ہیں ان میں زیادہ تر ان کی کرامتوں کا بیان ہوتا ہے واقعات اور کلام کی باتیں کم ملتی ہیں ... سے اچھا شعر کہا ہے

ان کو بے پردہ تو علم پر ناز آتے ہیں مرید — بہ اعتقاد لائیں خدا جانے جو ہو پیر کے

ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب مبارکباد کے قابل ہیں کہ انھوں نے اس تذکرے کے حواشی لکھنے میں مبالغہ آرائی اور بے جا عقیدت مندی سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی ہے اور واقعات کے بیان میں علمی طرز استدلال اپنایا ہے۔ اور اس طرح یہ تذکرہ علم و ادب کے طالب علموں کے لئے ایک مفید اور کارآمد کتاب ہو گیا ہے ضرورت ہے کہ صوفیا اور اولیا کے دوسرے تذکرے اور ان سے متعلق دوسری تصانیف بھی علمی انداز سے مرتب کر کے پیش کی جائیں۔ ان بزرگوں کے تذکرے میں ہمیں اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ سب انسان تھے اور ان کی بزرگی کا راز بھی یہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی صاحب نے صوفی منیری کی تمام نثری تصانیف کو نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے خدا انھیں ان کے مقصد میں کامیاب کرے۔

[illegible] نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپا یا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

L. NO. 2186/57 REGD. N L. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۴۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم دسمبر ۱۹۶۸ء

آل احمد سرور

اپٹن سنکلیر

۲۶ نومبر کو مشہور امریکن ناولسٹ اپٹن سنکلیر کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر نوّے سال تھی۔ اپٹن سنکلیر کی اسّی سے اوپر کتابیں شایع ہوئیں ۱۹۴۳ء میں اس کی کتاب ’اژدہے کے دانت‘ پر اسے پلٹزر پرائز ملا تھا۔ اس کی تصانیف پچاس زبانوں میں شائع ہوئی تھیں۔ باپ کی شراب نوشی کی وجہ سے اسے شراب سے ساری عمر نفرت رہی۔ پندرہ برس کی عمر سے اس نے رسالوں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا بیسویں صدی کے شروع سے اس نے سنجیدہ ناول لکھنے شروع کئے، مگر شروع میں ان ناولوں کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور چھبیس سال کی عمر تک اسے فاقے بھی کرنے پڑے۔ اس کی شہرت کا آغاز ’جنگل‘ سے ہوتا ہے۔ جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی اور فوراً مقبول ہوئی۔ میٹروپولیس (METROPOLIS) میں اس نے سرمایہ دارانہ سماج کی قلعی کھولی اس نے مذہب کے ٹھیکے داروں پر ایک اور ناول میں طنز کی اور ایک دوسرے ناول میں صحافت کی دنیا کے سربستہ رازوں کو فاش کیا۔ اب اس کی آمدنی بڑھنے لگی اور کچھ حریفوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ وہ انصاف سے لگن کو تساہل۔ ارموٹروں میں ڈھالتا ہے، حالانکہ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ یوجرسی میں ایک سوشلسٹ کالونی بنانے میں صرف کر رہا تھا۔ ’جنگل‘ کے بعد اس کی اہم کتاب ’تیل‘ ہے جو ۱۹۲۷ء میں شایع ہوئی۔ اس میں تیل کے اجارے داروں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بوسٹن میں اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگائی گئی کیونکہ اس میں وہاں کے ارباب اقتدار کو عریانی نظر آئی حالانکہ یہ حصہ نغمۂ داؤد سے لیا گیا تھا۔ اپٹن سنکلیر سوشلسٹ تھا مگر وہ کہتا تھا کہ اسے سوشلسٹ مسیحی مذہب کے مطالعہ نے بنایا۔ ’جنگل‘ اور ’تیل‘ کے علاوہ اس کی ناولوں کا وہ سلسلہ اہم اور قابل ذکر ہے جس کا آغاز ”اژدہے کے دانت“ سے ہوتا ہے اور ”صدر کے ایجنٹ“ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں اوّل تو دو جنگوں کے درمیان کے یورپ کی رہنی اور سماجی زندگی کی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہیں، دوسرے جرمنی میں نازی تحریک کے آغاز اور ہٹلر کے عروج اور اس کی بربریت کی بڑی جانکدستی سے مصوّری کی گئی ہے۔ اپٹن سنکلیر ناولوں کے لئے پہلے تاریخ، اخباروں اور دوسرے ذرائع سے خام مواد جمع کرتا تھا پھر اس مواد کی مدد سے جہاں وہ ظلم اور جبر، اقتدار اور عوام کے مفاد سے بے نیازی دیکھتا تھا، اس پر گہرا وار کرتا تھا۔ امریکہ کے چوٹی کے ناول نگاروں میں نہیں ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ امریکہ کا ایک ممتاز اور قابل قدر ناول نگار ہے اور اس نے اپنی تصانیف کے ذریعہ سے انسانیت کی روح کو بیدار کرنے اور سرمایہ داری اجارہ داری اور فاشزم کے خلاف لوگوں کو صف آرا کرنے میں قابل قدر کام کیا ہے صدر کے ایجنٹ، لینی بڈ کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ لینی بڈ کا باپ سرمایہ داروں کے لئے فوجی سامان اور ہوائی جہاز تیار کرتا ہے، لینی صدر روزویلٹ کا خفیہ ایجنٹ ہے جو اسے ہٹلر کی چالوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے وہ پرانے مصوّروں کے شاہکار جمع کرتا اور انہیں دگنی قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ وہ فن کا عاشق ہے سیاست کی دنیا کا کھلاڑی ہے۔ مگر اس کے مجاہدانہ عزم پر پیار ضرور آ[illegible] اپٹن سنکلیر بیسوی صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے سماجی دستاویز کے اسکول کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادب اب ”سماجی دستاویز“ کے تصور سے آگے بڑھ چکا ہے، مگر اس اسکول کی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں اور اس اسکول کے نمائندوں میں اپٹن سنکلیر کا نام برابر احترام سے لیا جائے گا۔

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ا[illegible] گھر کے لئے چندہ چند مہینے ہوئے شروع ہوا تھا [illegible]

جو رقم جمع ہوئی ہے وہ بظاہر زیادہ نہیں ہے۔ نو ہزار کے قریب ہوگی مگر ابھی سے ایک بات واضح ہو گئی ہے۔ اردو دوستوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بغیر کسی وزیر کی تائید، کسی افسر کی مدد یا کسی نیتا کے اشارے کے، چندہ جمع ہو رہا ہے۔ لوگ خود سامنے آرہے ہیں۔ خود چندہ دے رہے ہیں اور دوسروں سے چندہ کر رہے ہیں۔ ان چند مہینوں میں چند کرم فرماؤں نے خاص طور پر مدد کی۔ اُن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ نے ایک ہزار روپے کا عطیہ ایک خط کے جواب میں بھیج دیا۔

(۲) جناب فضل الرحمن پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے پانچ سو روپے خود دئے اور پانچ سو اپنے احباب سے چندہ کرکے، مجلس عام کے ممبر کا ایک ہزار کا کوٹہ چند روز میں پورا کر دیا۔

(۳) جناب برہم ناتھ دت قاصر نے خود ہی چندہ کرنے کے لیے پیرانہ سالی کے باوجود آمادگی ظاہر کی اور اب تک دو ہزار سے اوپر رقم بھجوا چکے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔

(۴) پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے خود آکر سو روپے دئے اور پانچ سو روپے اپنے رفیقوں سے چندہ کرکے بھجوایا۔

(۵) ڈاکٹر صبیح احمد کمالی نے گیا سے پانچ سو روپے بھجوایا۔

(۶) جناب بدیع الزماں خاور نے گرد و نواح کا دورہ کرکے چھوٹی چھوٹی رقموں کا چندہ بہت سے لوگوں سے وصول کیا۔

جب ہم نے اردو گھر کے لئے چندہ شروع کیا تو ہمارے بہت سے احباب خندہ زن تھے۔ جب گاندھی جی نے ڈنڈی کا سفر شروع کیا تھا تو اس وقت بھی زیادہ تر لوگ ہنس رہے تھے۔ ہمارے ڈنڈی کے سفر کا بھی یہ آغاز ہے۔ وہ لوگ خاموش بیٹھے ہیں جو حکومت کی نظر دیکھتے ہیں یا سیاست کی کروٹیں یا افسروں کی جنبش ابرو لیکن جو لوگ "اردو گھر" کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور اس کے لئے چندے کی مہم کو اپنا کام، وہ خود بخود مدد کر رہے ہیں۔ یونہی قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے۔ اس وقت جو خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں ان سے ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے ؎

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

۱۹۶۸ء کے سوویت دیس نہرو انعامات کا اعلان

نئی دہلی: چار ممتاز ہندوستانی ادیبوں ورنداون لال ورما، بین چندر گھوش، سردار موہن سنگھ اور سبھوراجہ کٹی مانی کو ۱۹۶۸ء کا سوویت دیس نہرو انعام ملا ہے۔ ان چاروں ادیبوں کو دس ہزار روپیہ کا ادبی انعام دیا گیا ہے۔ انھیں پندرہ دن کے لئے سوویت یونین کی سیر کرائی جائے گی۔ جن دوسرے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے ان میں صحافت اور ترجمہ کے لئے چار انعام سات زائد ادبی انعام، صحافت اور ترجمہ کے لئے نو زائد انعام اور بچوں کی مصوری کے لئے پانچ انعامات شامل ہیں۔ انعام یافتگان میں اردو کی ممتاز افسانہ نگار خاتون قرۃ العین حیدر بھی شامل ہیں۔ سوویت دیس نہرو انعامات ہر سال ملک کے ممتاز ادیبوں اور مشہور اخبار نویسوں کو امن اور سوویت ہند دوستی کے لئے ان کی خدمات کے صلہ میں دئے جاتے ہیں۔ (سوویت یونین)

بنارس یونی ورسٹی میں اردو کے لئے ایک وظیفہ

بنارس: بنارس ہندو یونی ورسٹی میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں ڈاکٹر حکم چند نیر استاذ شعبۂ اردو کی خدمات کے اعتراف میں لکھنؤ کے ممتاز رئیس اور ادب دوست جناب مقبول احمد لاری صاحب نے اپنی زندگی کی پچاسویں سالگرہ کے جشن زریں کے موقع پر بنارس ہندو یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے لئے مبلغ پچاس روپے ماہوار کا ایک مستقل وظیفہ کا اعلان کیا۔ لاری صاحب نے اس کے لئے مبلغ تیرہ ہزار روپے کے سکے جیالی مطابق دس ہزار روپیہ سکہ ہندوستانی بنارس ہندو یونی ورسٹی کو پیش کئے جس سے یونی ورسٹی ایم۔ اے اردو میں داخلہ لینے والے کسی ایک مستحق طالب علم کو پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ دیا کرے گی۔ (نامہ نگار)

"بابا لوگ" اور "صفر" کی اشاعت

گیا۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ موریہ پبلیکیشنز بیراگی گیا، غیاث احمد گدی کے افسانوں کا مجموعہ "بابا لوگ" اور کلام حیدری کی کہانیوں کا مجموعہ "صفر" شائع کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات موریہ پبلیکیشنز بیراگی گیا سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ہندوستانی ادبیات عالیہ کی ڈکشنری ساہتیہ اکیڈمی نے تیار کرلی

نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی نے ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کے ادب کی ایک ڈکشنری مرتب کی ہے۔ ممتاز ماہر علم الہند اور لسانیات ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر آر کے داس گپتا (دہلی یونی ورسٹی میں جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبے) نے مل کر یہ ڈکشنری تیار کی ہے۔ اس ڈکشنری میں ادبیات عالیہ کی تفصیلات اہم ہندوستانی مصنفین کے ادبی کارناموں نثر، شاعری، ناول اور ڈرامہ کے بارے میں معلومات اکٹھا کی گئی ہیں۔ انگریزی ادب پر "آکسفورڈ کمپین" ڈکشنری کے طرز پر یہ لغت تیار کی گئی ہے۔ (آدرش)

گورکھپور یونی ورسٹی نے جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل کو تسلیم کرلیا

علی گڑھ: یہ خبر انتہائی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ گورکھپور یونیورسٹی نے جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل کو تسلیم کرلیا ہے۔ ادیب کامل پاس شدہ امیدوار اگر کسی تسلیم شدہ یونی ورسٹی سے صرف انگریزی میں بی اے بھی پاس کر چکا ہو تو وہ گورکھپور یونی ورسٹی کے ایم۔ اے سال اول اردو میں داخلہ کا مجاز ہوگا۔ (الجمعیۃ)

دیویندر پرشاد سکسینہ

مرزا غالبؔ کی اصلاحیں

منشی حبیب الدین سوزاںؔ سہارنپوری کے کلام پر

ساری دنیا میں مرزا غالبؔ کی سوویں برسی فروری ۱۹۶۹ء میں منائی جا رہی ہے۔ غالبؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ غالبیات کے ماہروں کی غالبؔ کی حیات اور شاعری پر سوویں برسی کے موقع پر بہت سی کتابیں شایع ہوں گی اور ملک ان کتابوں کی قدر کرے گا۔ غالبؔ جس زبان کے شاعر تھے آج اس زبان کی شاعری کے فن سے زیادہ تر لوگ ناواقف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ غالبؔ نے اپنے شاگردوں کے کلام پر ہزاروں اصلاحیں کی ہونگی لیکن آج تک غالبیات کے کسی ماہر نے غالبؔ کی اصلاحوں پر کوئی کتاب نہیں لکھی حالانکہ یہ کتاب اردو کے شاعروں، ادیبوں اور اردو سے ذوق رکھنے والے لوگوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی۔ غالبؔ کی اصلاحیں ان کے شاگردوں کے کلام پر پرانے گلدستوں اور رسالوں میں آسانی کے ساتھ مل سکتی ہیں لیکن غالبیات کے ماہروں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔ سوزاںؔ سہارنپوری کے کلام پر غالبؔ کی اصلاحیں دینے سے پہلے تلامذہ غالبؔ میں سے ان کے حالات زندگی پیش کرتا ہوں جس سے اہل ذوق و ادب کو سوزاںؔ سہارنپوری کے سلسلے میں معلومات ہو جائے۔ مالک رام صاحب تلامذہ غالبؔ میں صفحہ ۱۵۴ پر سوزاں سہارنپوری کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"ان کے والد کا نام خواجہ معین الدین انصاری تھا سلسلۂ نسب مشہور صحابی ابو ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم بہت معقول تھی تعلیم ختم کرنے کے بعد سہارنپور سے دہلی آ گئے عاشق تن آدمی تھے۔ یہاں دہلی میں کوٹھوں کی سیر کرنے لگے شاعری کا شوق پہلے سے تھا اس رنڈیشی نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ غالبؔ کی اصلاح نے رہی سہی بھی پوری کر دی نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے چنانچہ قیام دہلی کے دوران ہی اخبار الاخیار کے اڈیٹر بھی ہو گئے تھے بہت سی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑیں جن میں سے تاریخ عجیب در حالات حکمائے یونان تریاق مسموم تاثیر القلوب گنج شائگاں (قافیہ) قابل ذکر ہیں استاد کے عاشق تھے جب تک غالبؔ زندہ رہے انھوں نے دہلی چھوڑ کر کہیں جانے کا نام تک نہیں لیا ان کی وفات کے بعد یہاں سے دل اچاٹ ہو گیا

عطا کاکوی

سرسیدؔ کی یاد

(سرسیدؔ مرحوم کی اسّیویں برسی کے موقع پر انجمن اسلامیہ پٹنہ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں یہ نظم پڑھی گئی)

جوق در جوق یہ سب لوگ کہاں آئے ہیں
یاد ہم کس کی منانے کو یہاں آئے ہیں

محسن قوم کا سننے کو بیاں، آئے ہیں
لئے کچھ ہم بھی یہاں آہ و فغاں آئے ہیں

درد دل کہہ لے عطاؔ جمع ہیں احباب یہاں
پھر یہ جلسہ کہاں، یہ موقع گفتار کہاں

کارنامہ ابھی زندہ ہے ترا سرسیدؔ
ہو سکا کس سے وہ جو تو نے کیا سرسیدؔ

عزم و ہمت سے ہوا تو جو ہوا سرسیدؔ
تیرا ثانی نہیں کوئی بخدا سرسیدؔ

شبلیؔ و حالیؔ ترے جام سے سرشار ہوئے
محسن الملک ترے یار، مددگار ہوئے

تجھکو دھن تھی کہ سنور جائے پریشاں گیسو
آئینہ لے کے چلا ہاتھ میں اپنے ہر سو

قوم کے غم میں بہت تو نے بہائے آنسو
نخل تعلیم کو سیراب کیا دے کے لہو

شکر صد شکر کہ وہ نخل ثمر بار ہوا
کل جو دشمن تھا ترا آج وہ غمخوار ہوا

کتنے اٹکاتے رہے راہ میں تیری روڑا
کارواں ساتھ چلا تو نے جدھر منہ موڑا

عزم اور جہد مسلسل کا ڑکا کب گھوڑا
سر پر نیعان جفا پیشہ کا تو نے توڑا

کہیں ممکن ہے کہ دریا کی روانی رک جائے
سرد ہو جائے لہو جوش جوانی رک جائے

تو تھا گو پیر کہن سال جواں تھی ہمت
تیر تھا عزم ترا اور کماں تھی ہمت

خار و خس کے لئے اک سیل رواں تھی ہمت
روکتا تجھکو کوئی اتنی کہاں تھی ہمت

گالیاں تو نے سنیں کفر کا تمغہ پایا
نہ ہوا کوئی تحمل کا ترے ہم پایا

بھول کر یاد تری آئی مگر آئی تو
نکہت زلف علی گڑھ کی صبا لائی تو

سطح احساس سے آج اپنے ہٹی کائی تو
دل نے اس یاد سے گرمیٔ نفس پائی تو

اب نہ بھولیں گے تجھے عہد وفا کرتے ہیں
ماتم اس بھولنے پر ہم بہ خدا کرتے ہیں

تو ہے محسن ترے احسان بھلاؤں کیسے
دل میں جذبات ابھرتے ہیں دباؤں کیسے

غم کا افسانہ ہے طومار، سناؤں کیسے
اپنا دکھ درد جو ہے اس کو دکھاؤں کیسے

خاک تیری بہ خدا بوئے وفا دیتی ہے
ایک اک اینٹ علی گڑھ کی دعا دیتی ہے

تو نہیں آج تو کیا زندہ ہے ہر کام ترا
بزم رنداں ہے وہی دور ہے جام ترا

ذکر رہتا ہے لبوں پر سحر و شام ترا
کیا بگاڑے بھلا گردش ایام ترا

کی ہوئی خدمت مخلوق ہی کام آتی ہے
در و دیوار سے آواز سلام آتی ہے

نفس گرم سے ترے ہمیں جینا آیا
دامن علم و عمل چاک تھا سینا آیا

کھو دیا تھا جسے پھر ہاتھ قرینا آیا
اور گرداب سے ساحل پہ سفینا آیا

کیوں کریں بخت کا ہم اپنے شکایت بیجا
ناخدا تجھکو بنا کر جو خدا نے بھیجا

یہ جو ہے نخل" خزاں اس پہ نہ آنے پائے
ہم اسے سینچیں لہو سے کہ نہ مرجھا جائے

یہ پھلے پھولے ثمر اس کا ہر انساں کھائے
اور سرسیدؔ مرحوم کا وہ گن گائے

یہ چمن اپنا ہے، گل اپنا ہے، غنچہ اپنا
یہ برا ہے تو ہے اپنا، جو ہے اچھا اپنا

اور واپس سہارنپور چلے گئے چنانچہ لکھتے ہیں ؎

"غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے
دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا"

اگرچہ معاش کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا اور تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی لیکن عجیب قانع طبیعت پائی تھی کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے اور ہنستے کھیلتے زندگی کے دن گزار دئے ۶۵ برس کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں جاں بحق ہوئے؟

رسالہ "شاعرہ" فرخ آباد ماہ نومبر ۱۹۳۰ء میں اساتذہ کی اصلاحیں حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون سے سوزاں سہارنپوری کے کلام پر غالب کی اصلاحیں حضرت صفدر مرزا پوری کے تبصرہ کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

سوزاں

میں اس چمن میں صورت پر یدہ ہوں — وحشت یہ ہے کہ سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں

اصلاح

اس دامگہ میں طائر از کف پریدہ ہوں — وحشت یہ ہے کہ سایہ سے اپنے رمیدہ ہوں

پہلے مصرعہ کی ترمیم سے مطلع میں کس قدر ترقی پیدا ہوگئی "دامگہ" اور "از کف پریدہ" یہ دونوں ترشے ہوئے ٹکڑے خود بتاتے ہیں کہ ہم غالب کی قلم معجز رقم سے نکلے ہیں۔

سوزاں

راحت کبھی تو مجھ کو بھی اے آسمان دوں — کیا رنج ہی کے واسطے میں آفریدہ ہوں

اصلاح

راحت کبھی تو مجھ کو اے آفریدگار — کیا رنج ہی کے واسطے میں آفریدہ ہوں

پہلے مصرعہ میں بجائے "آسمان دوں" کے "آفریدگار" بناکر شعر میں جان ڈال دی چونکہ مصرعہ ثانی میں "آفریدہ" ہے اس لئے اسی کی مناسبت سے مصرعہ اولیٰ میں "آفریدگار" بناکر مضمون مصرعہ ثانی قوی کردیا۔

استاذی حضرت امیر مینائی نے بھی یہ قافیہ خوب فرمایا ہے۔

پیدا کئے کی شرم الٰہی ضرور ہے — تو آفریدگار ہے میں آفریدہ ہوں

سوزاں

جو دل میں ہے وہ کہہ نہیں سکتا کسی طرح — چپ ہوں اگرچہ لذت حلوا چشیدہ ہوں

اصلاح

جو دل میں ہے کہا نہیں جاتا زبان سے — میں شل گنگ لذت حلوا چشیدہ ہوں

دونوں مصرعوں میں تصرف اس حسن سے کیا گیا کہ شعر میں روانی و سلاست کے علاوہ لطف زبان پیدا ہوگیا "کہا نہیں جاتا زبان سے" اس ٹکڑے کی کیا بات ہے اور دوسرے مصرعہ میں "شل گنگ" کی کیا تعریف ہو بیساختہ یہی مصرعہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

سوزاں

معاذ اللہ ہے کتنا لئیم اے آسماں تو بھی — تجھے انداز بخشش کا نہ آیا ہے نہ آئے گا

اصلاح

[illegible] اے فلک تو بھی — تجھے انداز بخشش کا نہ آیا ہے نہ آئے گا

"لئیم اے آسماں تو بھی" کے بجائے "بخش اے فلک تو بھی" بناکر شعر میں کتنی معنوی خوبیاں پیدا کردیں۔ آسماں کو اس موقع پر لئیم کہنا نامناسب تھا کیونکہ لئیم تو اسے کہتے ہیں جو کسی کو نہ دے اب بجائے اس کے "غلط بخش" کے معنی خیز ٹکڑے کو غور سے ملاحظہ فرمائیے یعنی فلک دیتا تو ہے مگر ایسا غلط بخش ہے کہ جو مستحق ہیں وہ اس کی بخشش سے محروم ہیں

سوزاں

جس طرح رخ اہل جہاں سوئے خدا ہے — اس طرح سے ہے سوئے خدا سوئے محمد

اصلاح

جس طرح رخ اہل خدا سوئے خدا ہے — اس طرح سے ہے روئے خدا سوئے محمد

بجائے "اہل جہاں" کے "اہل خدا" بنایا اہل جہاں میں تو ساری دنیا آگئی اہل خدا سے صرف وہی برگزیدہ اصحاب جو مقربان بارگاہ کبریا ہیں ان سے مراد لی گئی ہے صرف ایک لفظ کی ترمیم سے شعر نور کے سانچے میں ڈھل گیا سبحان اللہ۔

سوزاں

کیا مجھے نفع ان آنکھوں سے کہ واہیں لیکن — نظر آتی نہیں اس نور نظر کی صورت

اصلاح

کیا مجھے نفع ان آنکھوں سے کہ ہاں باہمہ قرب — نظر آتی نہیں اس نور نظر کی صورت

"واہیں لیکن" کے بجائے "باہمہ قرب" بنانے سے جو حسن شعر میں پیدا ہوگیا وہ ظاہر ہے یعنی یہ کہ باہمہ آں قربت کہ اس نور نظر کی صورت نظر نہیں آتی اللہ اللہ کیا نازک خیالی ہے۔

(ایک قطعہ کا درمیانی شعر ہے) اس اصلاح سے شعر میں صفائی پیدا ہوگئی۔

سوزاں

سوز غم دل میں آتشیں چہرہ — کشتہ ہوں وضع شمع محفل کا

اصلاح

دل پر سوز روئے جان افروز — کشتہ ہوں وضع شمع محفل کا

مصرعہ ثانی اسی مصرعہ کا محتاج تھا "روئے جان افروز" اسی ٹکڑے کی بلاغت کا کیا کہنا

سوزاں

خجل نہ کفر ہو اسلام سے مرے کیونکر — صنم پرست ہوں ایسا کہ برہمن کیا ہے

اصلاح

خدا پرست مجھے لوگ کہتے ہیں اور میں — صنم پرست ہوں ایسا کہ برہمن کیا ہے

مصرعہ ثانی میں "صنم پرست" تھا اس لئے پہلے مصرعہ میں استاد نے "خدا پرست" بنایا اب دونوں مصرعوں میں دونوں ٹکڑے برابر کے ہوگئے اور شعر میں فصاحت پیدا ہوگئی اصلاح کے یہی معنی ہیں کہ ہم دونوں مصرعے دست و گریباں ہوجائیں۔

سوزاں

اے عشق ترے صدقے یہ تاثیر ہے تیری
مڑ مڑ کے یوں وہ میری طرف دیکھتا چلے

(باقی صفحہ ۹۸)

وحید اختر

رفتار

(تیسری قسط)

عسکری نے دین کے تین پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے عقائد، عبادات اور اخلاق۔

ان کے نزدیک عقیدہ (DOGMA) کی بنیاد آسمانی یا مقدس کتاب ہے یا اس کے مفسروں کا قول۔ عقیدے کو دوسرے ارکان پر تقدم حاصل ہے۔ ان کے خیال میں عقیدے کو DOGMA اور عبادات کو رسم کہہ کر نظر انداز کرنا، اور صرف اخلاقی تعلیم کو دین کی اصل سمجھنا وہ گمراہی ہے جو پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں سے سرزد ہوئی۔ اس غلطی کے نتیجے کے طور پر پروٹسٹنٹ مذہب کے پاس دو چیزیں رہ گئیں اخلاقیات اور جذبہ۔

جہاں تک عقیدے کو بنیادی اہمیت دینے کا مسئلہ ہے مذہب میں اس اصول سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دوسرے پہلوؤں میں افراط۔ تفریط بحث کا موضوع بن سکتی ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے ماننے والے بھی عقیدے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو مذہب کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی۔ مغرب میں مذہبی تصور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ سائنسی دریافتوں اور انکشافات کے قلب میں تھے سائنس نے مذہب کے جس پہلو پر براہ راست حملہ کیا وہ اعتقادات ہی تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی تنگ نظری، علم دشمنی، اور احتساب نے اس حملے کی خود ہی دعوت دی تھی۔ اس کے دو ہی نتائج نکل سکتے تھے۔ یا تو یہ کہ مذہب سائنس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا، یا پھر یہ کہ وہ باعزت طریقے سے سائنس کے ساتھ صلح کر کے اپنے علاقے میں محفوظ ہو جاتا۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے دوسرا راستہ اختیار کیا، اس کا ایک سبب تو سیاسی تھا، کلیسا اور ریاست کے جھگڑے میں ریاست کو بھی یہی راہ محفوظ نظر آئی کہ کلیسا کو دنیوی اور عملی معاملات سے الگ کر دیا جائے

دوسرا سبب یہ تھا کہ مذہبی مصلحین نے یہ محسوس کیا کہ مذہب کے دائرے کو سائنس، فلسفہ اور سیاست کے حدود کے اندر توسیع دینے سے نقصان مذہب ہی کو پہونچے گا، قرون وسطیٰ کے متکلمانہ فلسفہ نے جس طرح مذہب اور عقل کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے کی کوشش کی تھی وہ ناکام ہو چکی تھی۔ اور یہ احساس ہو چلا تھا کہ اعتقادات کو عقلی دلائل سے سہارا نہیں دیا جا سکتا مذہب کی بقا عقیدے کو براہ راست جذبے کی بنیاد پر اپیل کرنے ہی میں مضمر ہے۔ علم کلام کی ساری بحثیں اور عقلی موشگافیاں نہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں نہ دوسرے معتقدات کو منوانے میں، کانٹ نے جو خود مذہبی آدمی تھا، وجود خداوندی کے تمام کلاسیکی دلائل کو رد کر کے خدا کے وجود کو اخلاقی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کانٹ کی دلیل مذہب کے اخلاقی پہلو کو اولیت دینے کی پہلی باضابطہ کوشش تھی جس نے بعد کے ادوار میں مذہبی فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ خدا نامعلوم نا قابل علم UNKNOWN UNKNOWABLE ہے، ذات باری کے عرفان میں عقل کی ناکامی، نارسائی اور بے حضوری کا اعتراف علم کلام کی تمام عقلی موشگافیوں کے بے ثمر اور بے حاصل ہونے کے احساس کے ساتھ پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں کرکے گار (KIERKEGAARD) نے رسمی عبادات کے مرکز کلیسا پر حملہ کیا وہ گہرے طور پر مذہبی تھا، اور سمجھتا تھا کہ مذہب کو اداروں کا پابند بنانے سے مذہب کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک بھی عقیدے کی اپیل ہی مذہب کے لئے کافی ہے کیونکہ مذہب خدا اور انسان کے درمیان براہ راست جذباتی تعلق کا نام ہے۔ اسی تعلق کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے انسان بے خدا رہ جاتا اور اپنے کو کائنات میں تنہا محسوس کرتا ہے۔ بعد کی عیسائی دینیات نے طامس اکویناس کی تعلیمات پر بھی اسی لیے زور دیا کہ اس کے یہاں مذہب عقل کا معاملہ نہیں بلکہ پورے انسانی وجود کا خدا سے معاملہ ہے۔ موجودہ یہودی اور عیسائی عالمانِ دین نے دینیات کو صرف مذہب کے رسمی پہلوؤں ہی سے آزاد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بعض بنیادی معتقدات کو بھی غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا۔ اس وقت مذہبی مفکرین کا بڑا گروہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر جو بھی طرز فکر

فرحت کیفی

غزل

وہ تھی میرے درد کی بپتا یا تیرے دل کی آواز
تنہائی کے دشت میں کوئی جانی پہچانی آواز

ہولے دستک دی ہے صبا نے یا نکہت نے دی آواز
وہ تو تھی اپنے بھیترا اپنے ہی باطن کی آواز

ذہن کے پس منظر میں پنہاں دھندلائی سی اک تصویر
دل کے ویرانوں میں لرزاں کھوئی کھوئی سی آواز

کتنی صدیاں وقت کے گہرے سناٹے سے گذری ہیں
نظروں نے بھی چاپ سنی کانوں سے ٹکرائی آواز

صحرا صحرا وادی وادی عالم عالم بھٹک گئے
سات خلاؤں کے اوپر انساں کی جب ابھری آواز

جب بھی غزل کی بات چلی ہے یاروں نے چپکے سے کہا
گویا تا ملناڈ میں اردو کی ہے فرحت کی آواز

کا حامل ہے۔ اس طرزِ فکر میں مذہب کو عقل کا نہیں بلکہ پورے انسانی وجود کا معاملہ سمجھا جاتا ہے اور انسانی وجود اپنی تکمیل یا تنہائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے سے "ماورا" سے رشتہ جوڑنے کا متمنی نظر آتا ہے یہ "ماورا" جو انسانی وجود میں شامل ہو کر اس کی تکمیل کرتا ہے، خدا ہے۔ مذہبی فکر کے اس پورے سفر ارتقا میں عقل کا راستہ، جو سائنس اور فلسفے کا راستہ ہے ترک کرنے پر ہی زور دیا گیا ہے۔ عقیدے کو بنیادی اہمیت دینے کے بعد پھر دو ہی چیزیں رہ جاتی ہیں، عبادات اور اخلاق۔ عبادات کا تعلق بھی عقیدے سے ہی ہے، اس لئے اخلاقیات یا معاملات ہی رہ جاتے ہیں جن کی معاشرتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کرکے گار نے وجود کی تین سطحوں میں اخلاقی تجربے کو جمالیاتی تجربے اور مذہبی تجربے کا درمیانی زینہ قرار دیا ہے۔ اعلیٰ ترین مذہبی تجربے کی سطح پر اخلاقی اصول بھی "پابندِ رسوم" معلوم ہوتے ہیں اس لئے "ترکِ رسوم" کا کیش خود بخود اختیار کرنا پڑتا ہے یہ ایک طرح سے ہماری متصوفانہ فکر سے بہت قریب کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کرکے گار یا ہمارے صوفیا نے اخلاقی تعلیم کی اہمیت سے انکار کیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی تجربے کی سطح تک اخلاقی تربیت ہی لے جا سکتی ہے اور اس سطح پر پہونچنے کے بعد اخلاقی اصول و قواعد کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن یہ درجہ حسن عسکری یا وحید اختر ایسے بندوں کو نصیب نہیں لہٰذا انہیں تو اخلاقی پہلو ہی کو لے کر چلنا ہوگا۔

عسکری کو اس بات سے انکار ہے کہ مذہب کا مقصد اخلاقی تربیت ہے یا انسانی جذبے کی تسکین۔ ان کے نزدیک مذہب کا مقصد معرفتِ خداوندی ہے۔ لیکن معرفتِ حق کے لئے بھی اخلاقی تربیت یا بالفاظِ دیگر "معرفتِ نفس" ضروری ہے۔ حضرت علی کا یہ قول تو عسکری صاحب کی نظر سے گذرا ہی ہوگا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ عسکری نے اصلاحِ نفس اور اصلاحِ باطن میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس بات کی تشریح نہیں کی کہ نفس اور باطن کو دو الگ الگ حقیقتیں مان کر وہ ان دونوں سے کیا مراد لیتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "اسلام میں ایمان یا معرفت انسانی جذبے کی کسی کیفیت کا نام نہیں بلکہ ایمان اور معرفت عقلِ کل یا عقلِ معاد کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں عقل کا مقام قلب بتایا گیا ہے خود قرآن شریف میں قلب کے ساتھ لفظ یعقلون آیا ہے۔" اس کے آگے وہ رقمطراز ہیں کہ "تصوف کی اصطلاح میں جذبے سے مراد انسانی جذبہ نہیں بلکہ خدا کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی معاملہ ہے اس لئے ایمان بھی انسانی جذبے کی ہی کسی کیفیت کا نام ہوگا۔ معرفت یا ایمان کی ضرورت اسی لئے ہے کہ انسان اپنی تکمیل کرے۔ اس تکمیل کے لئے اصلاحِ نفس ضروری ہے۔ اور اصلاحِ نفس اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ قلب کو عقل کا مقام قرار دیا جائے یا جذبے کا اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا نفس، باطن، قلب یہ تمام اصطلاحات اتنی اہم نہیں جتنی مذہبی تعلیم کی روح یا مقصد ہمارے رسولؐ کا یہ کہنا کہ میری بعثت کا مقصد ہی مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق)۔ اس کی نفی متصوفانہ اصطلاحات کو نئے نئے معنی پہنا کر بھی نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عسکری اصلاحِ نفس سے مراد اخلاق کی اصلاح لیتے ہیں اور اصلاحِ باطن صوفیا کی اصطلاح میں ذاتِ حق کے تصور کو اپنے قلب میں قائم کرنے کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں میرے اس خیال کی تائید مجددؒ صاحب کے اس مکتوب کے حوالے سے ہوتی ہے جسے عسکری نے نقل کیا ہے "حضرت مجددؒ صاحب جلد سوم کے مکتوب نمبر ۵۶ میں تصریح فرماتے ہیں کہ جو چیز درکار ہے وہ اصلاحِ قلب ہے اور یونانی فلسفیوں نے جو صفائی حاصل کی ہے وہ محض نفس کی صفائی ہے جو گمراہی کو زیادہ کرتی ہے۔" یہ تو درست ہے کہ یونانی فلسفیوں کے پاس مذہب یا خدا کا وہ تصور نہ تھا جو اسلام نے پیش کیا اسی لئے ان کے یہاں محض اخلاقی تعلیم ہی پر زور ہے۔ لیکن اصلاحِ نفس گمراہی کو کس طرح زیادہ کرتی ہے، یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا۔ ابتدائی زمانوں کے مسلمان مفکرین نے یونانی فلاسفہ (بطورِ خاص افلاطون) کو موحد مان کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ محض "اصلاحِ نفس" پر زور بھی کبھی "خدا رسی" کے تصور کے قریب تر پہونچا دیتا ہے۔ مسلمان صوفیا اس نکتے سے واقف تھے اسی لئے وہ سلوک کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب (وقد افلح من زکٰھا وقد خاب من دسّٰھا) مانتے اور اسی کو روحِ تصوف سمجھتے رہے۔ نفس قلب اور باطن کا علم تو خدا ہی کو ہے، انسان تو انسانی معاملات میں ہی انسان کے اخلاق و اعمال کو جانچ اور پرکھ سکتا ہے۔ جو شخص انسانی معاملات میں ایماندار نہ ہو وہ کتنا ہی "صاحبِ ایمان" ہو خدا کے ساتھ بھی ایماندار نہیں ہو سکتا اسی طرح تصوف کی اصطلاح میں جذبہ بھی محض "خدا کے بندے کو اپنی طرف کھینچنے" ہی کا نام نہیں بلکہ معاملاتِ مذہب میں خلوص جذبہ کی ضرورت پر دلالت کرتا ہے۔ اس جذبے کے بغیر (جس کی انتہا رضا، تسلیم اور پھر عشق ہے جو فنا فی الحق یا بقا بالحق پر منتج ہوتا ہے) ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ صوفی شعرا نے انہی باتوں کو شاعری میں پیش کیا اور وہ شعرا بھی جو خود صاحبِ حال صوفی نہ تھے، اس روایت کی پابندی کرتے رہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہبی شاعری کو اخلاقی شاعری سمجھا اور بنا لیا گیا زاہد، عابد، شیخ کا ایمان جذبے سے عاری ہونے ہی کی وجہ سے صوفیا اور شعرا کا ہدفِ طنز بنا رہا، محتسب قاضی اور فقیہ بھی محض ظاہر پر زور دینے اور جذبے کو نظر انداز کرنے ہی کی وجہ سے مورد الزام ٹھہرے۔ یہ روایت تصوف کے اثر سے فارسی اور اردو شاعری میں جاری و ساری رہی ہے۔

عسکری کے نزدیک شبلی اور حالی کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مذہب کو اخلاقی تربیت کا اور اخلاقی تربیت کو شاعری کا مقصد قرار دیا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مغرب کی اندھی تقلید کا نتیجہ تھا حالی ایسے راسخ العقیدہ مخلص مسلمان "مد و جزرِ اسلام" کے مصنف اور شبلی ایسے دردمند مسلمان "سیرت النبیؐ"، "الکلام"، "علم الکلام"، "شعر العجم" اور "سوانح مولانا روم" کے مصنف کے لئے یہ کہنا کہ یہ لوگ دینی روایت یا فارسی اور اردو شاعری کی روایت سے ناواقف تھے اور مغرب سے مرعوب

ہو کر ان خیالات کو ادب اور ادبی تنقید کی بنیاد بنا بیٹھے ان حضرات کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان بزرگوں نے شاعری کا مقصد اخلاق کی تربیت یا جذبے کی تسکین کو قرار دے کر شاعری کی مشرقی روایت کی تردید نہیں بلکہ توثیق اور پھر توسیع کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے پیش نظر متصوفانہ اصطلاحات کا وہ غلط تصور نہ تھا جو عسکری کے سامنے ہے، اور وہ مغربی علوم و ادب سے سطحی طور پر واقف ہونے کے باوجود ان سے "نشاۃ الثانیہ" کا کام لینے کی اہلیت رکھتے تھے جبکہ عسکری صاحب زندگی بھر مغربی ادیبوں کا نام لینے اور ان کا مطالعہ کرنے کے باوجود اب تک خود اپنا تنقیدی نظریہ نہ بنا سکے، اصول تنقید میں کوئی اضافہ کرنا تو بڑی بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شبلی اور حالی ہی نہیں آزاد اور سرسید کا بھی مغربی ادب و علوم کا مطالعہ بالواسطہ اور سطحی تھا اسی لئے ان حضرات سے بعض ایسی غلطیاں ہوئیں جن کا اتنے برس گزرنے کے بعد بھی پوری طرح تدارک نہ ہو سکا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادب کی مقصدیت کا جو تصور ان بزرگوں کے پاس تھا وہ عسکری کی محدود اور تنگ نظر مقصدیت سے کہیں زیادہ وسیع اور مفید تھا آج جبکہ عسکری یہ کہتے ہیں کہ شاعری کو اخلاقی اصلاح کا آلۂ کار بنانے سے شعری ذوق غارت ہو گیا تو مجھے ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے لیکن ان سے ہمدردی ہوتی ہے جب وہ اس سے بھی آگے جا کر اخلاقی مقصد کی نفی کر کے شاعری کو "معرفت دین" کا وسیلہ ماننے اور منوانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ ایک مقصدیت کا انکار اور دوسری مقصدیت پر اصرار ایسی بوالعجبی ہے جس کا کوئی عقلی جواز پیش کرنا مشکل ہے۔ ادب نے جہاں مذہبی مقصد کی تکمیل کی ہے وہیں اخلاقی مقصد کی تکمیل کا بھی آلۂ کار رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ادب اخلاقی مقصد کا آلۂ کار بن کر ہی مذہبی مقصد کو پورا کرتا رہا ہے۔ میں ادب کی مقصدیت کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا لیکن مقصدیت کی شرح کرنے والوں میں مجھے آج بھی سرسید، حالی، شبلی، اور آزاد اس مقصدیت سے آگے نظر آتے ہیں جس کا تصور عسکری پیش کر رہے ہیں اور انیسویں صدی میں ہونے کے باوجود یہ حضرات بیسویں صدی کے عسکری سے زیادہ روشن خیال، آزاد نظر اور وسیع المشرب دکھائی دیتے ہیں۔

سرسید اور شبلی نے مذہب کے سلسلے میں جو کوششیں کیں وہ دراصل مغرب میں نمو پائے ہوئے مذہبی اور سائنسی خیالات سے ہم آہنگ تھیں۔ شبلی نے نئے مغربی علوم کا مقابلہ کرنے کے لئے دین کو علم کلام کے عقلی ہتھیار سے پھر لیس کرنے کی کوشش کی انھیں اس بات کی آگاہی نہ تھی کہ مذہب کی لڑائی اب عقل کے ان ہتھیاروں سے نہ جیتی گئی ہے نہ لڑی جا سکتی۔ نئے طرز فکر سے وہ آگاہ نہ تھے سرسید نے عقلیت کا وہی راستہ اختیار کیا جو بڑی حد تک معتزلہ کا تھا۔ انھوں نے سائنس اور مذہب کی تطبیق کی لاحاصل کوشش کی اس لئے کہ سائنس اور مذہب کے دائرے ایک دوسرے سے اتنے الگ ہیں کہ اس تطبیق کے بغیر بھی مذہب اپنے دائرے میں رہ کر بدلتے ہوئے حالات کا اجتہاد کی روشنی میں ساتھ دے سکتا تھا۔ یہ بحث تفصیل چاہتی ہے لیکن یہ تفصیل اس جگہ بے موقع اور غیر ضروری ہوگی۔ طریق کار کی غلطی کے باوجود سرسید نے اجتہاد سے کام لیا اور روایت کی ان معنوں میں پابندی نہیں کی جن معنوں میں عسکری روایت کو استعمال کرتے ہیں سرسید کی مذہبی فکر نہ سہی ان کے اجتہاد کی روح ہماری دینی روایت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ سرسید نے مذہب اور ادب کو ملانے کی کوشش نہ کی، حالی اور آزاد اور شبلی نے ادب میں اجتہاد سے کام لیا اپنی کوتاہیوں کے باوجود ان حضرات نے فارسی اور اردو شاعری کی روایت کی توسیع کی ہے اس لئے انھیں اپنی روایت سے ناآشنا اور مغرب کی فکر سے مرعوب قرار دینا غلط ہوگا۔ عسکری تو روایتی شاعری کو خوبی سمجھتے ہیں لیکن ان ناقدین نے صحیح طور پر اسے پامال، فرسودہ، از کار رفتہ اور بے وقت کی راگنی سمجھ کر اس سے بغاوت کی۔

عسکری شاعری کو جس مضبوطی کے ساتھ دینی روایت سے جوڑنا چاہتے ہیں ویسا حالی اور شبلی نے نہ کیا اور ایسا نہ کرنا ہی ادب اور شاعری کے حق میں بھی بہتر ہوا اور خود مذہب کے لئے بھی کیونکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے ہماری شاعری میں اسلامی تصورات اور تصوف کے گہرے اثرات تو موجود ہیں مگر اس کی بنیادی روایت انسان دوستی کی سیکولر روایت رہی ہے۔

میں آخر میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دینی روایت کا سراغ لگانے کے لئے عسکری کا ماخذ بظاہر تصوف معلوم ہوتا ہے، اس سلسلے میں وہ یہ بھول گئے کہ طریقت اور شریعت کا جھگڑا آنا پرانا ہے کہ آج بھی خالص ارباب شریعت کسی متصوفانہ تفسیر کو دین کی اصل روایت نہ مانیں گے خواہ وہ مجددؒ صاحب ایسے صوفی ہی کی تفسیر دین کیوں نہ ہو۔ ایک اور بات یہ بھی اہم ہے کہ تمام صوفیا میں عسکری نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کا انتخاب کیا جنھوں نے تصوف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا نظریۂ تصوف عام طور پر مقبول اور مروج نظریۂ تصوف سے مختلف ہے۔ مجددؒ صاحب اپنے مزاج کے لحاظ سے ارباب طریقت کے مقابلے میں ارباب شریعت سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں وہ وسیع المشربی اور صلح کل رویہ نہیں ملتا جس نے ایک بزرگ صوفی سے کہلوایا تھا کہ "صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" وحدت الوجودی صوفیا کی روایت تو ہماری شاعری میں ایک طاقتور عنصر رہی ہے لیکن وحدت الشہودی روایت خود نقشبندی شعرا جیسے مرزا مظہر جانجاناں اور درد کے یہاں بھی برگ و بار نہ لا سکی۔ عسکری نے شیخ مجدد کے حوالوں سے جو دینی روایت کی

مراسلات

حکومت مہاراشٹر اور اردو

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جب سے گجرات نے ایک الگ صوبے کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اردو مہاراشٹر کی دوسری بڑی زبان ہے۔ جہاں تک اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کا سوال ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مہاراشٹر میں ایسے بے شمار ابتدائی اور ثانوی مدارس ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور جن کو حکومت کی باقاعدہ امداد و اعانت، یا سرپرستی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نہ صرف اعلیٰ سطح پر اردو پڑھائی جاتی ہے بلکہ اردو میں تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ اس بات سے ہر اس شخص کو جسے اردو کے مسائل سے دلچسپی ہے، مسرت ہونی چاہئے اور اس کے لئے حکومتِ مہاراشٹر ہر طرح سے قابل مبارکباد ہے۔ البتہ تصویر کا ایک رُخ ایسا بھی ہے جس کی طرف ریاستی حکومت کے ذمہ دار افراد کو متوجہ کرنے کی ضرورت میں شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

تعلیمی اور تحقیقی سطح پر اردو سے رواداری اور منصفانہ سلوک کے باوجود اردو کا کوئی رسالہ حکومت مہاراشٹر کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے شائع نہیں ہو رہا ہے اور نہ بعض دوسرے صوبوں کی طرح مہاراشٹر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کو ان کی کتابوں پر ریاستی اعزاز و انعام سے نوازا جاتا ہے۔ اگر ان دو باتوں کے سلسلے میں حکومت مہاراشٹر مراٹھی کے ساتھ ساتھ اردو کی طرف بھی توجہ دے تو اس کا یہ اقدام یقیناً مستحسن ہوگا۔

(بدیع الزماں خاور)

اردو رسائل کے مدیروں سے اپیل

اردو کے اکثر رسائل جن میں مضامین شائع ہوتے ہیں مضمون نگار کا پتہ نہیں دیا جاتا۔ محض نام پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مضمون نگار کہاں رہتا ہے اور کس ادارے سے وابستہ ہے یہ کمی بعض اوقات بڑی پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص براہ راست کسی ادیب سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے تو وہ نہیں معلوم کر سکتا۔ اگر وہ اس کا پتہ رسالے کے دفتر سے منگواتا ہے تو وہ لوگ جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس صورت میں ایک اسکالر کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے اس لئے اردو رسائل کے مدیروں سے درخواست ہے کہ وہ مضمون نگار کا پورا پتہ ضرور دیں تاکہ علمی تحقیق میں یہ کام ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

(امام مرتضیٰ نقوی)

باقی صفحہ ۴ سے آگے

اصلاح

قربان تیرے اے اثرِ جذب اشتیاق مڑ مڑ کے یوں وہ میری طرف دیکھتا چلے

عشق کی تاثیر کے مقابلے میں اثر جذب اشتیاق کا کرشمہ دیکھئے وہ اصلاح دی کہ تعریف کو الفاظ نہیں ملتے۔

سوزاں

حج سے بہتر طواف ہے دل کا طوف کعبہ کیا کرے کوئی

اصلاح

حج اکبر زیارت دل ہے طوف کعبہ کیا کرے کوئی

اے سبحان اللہ اتنا بلند مصرع لگا دیا کہ شعر فلک ہفتم پر پہونچ گیا پہلے مصرع میں طواف اور دوسرے میں طوف کا فرق کو ناگوار سا تھا مگر استاد نے بجائے حج سے کے "حج اکبر" بنا دیا اور بجائے طواف کے زیارت بنا کر شعر کو بلند سے بلند تر کر دیا۔

سوزاں

وہ بے فائدہ درپے شست دشو ہیں یہ دھبا نہیں عاشقوں کا لہو ہے

اصلاح

رہے بے فائدہ درپے شست دشو ہیں یہ آخر وفا پیشگاں کا لہو ہے

"وفا پیشگاں" یہ ترکیب خاص غالب ہی مرحوم کا حصہ ہے اس اصلاح سے شعر میں جو دم تھا لطف آ گیا

باقی صفحہ ۷ سے آگے

اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جبکہ توحید محمدی کے شارح خواجہ میر درد (جو خود نقش بندی تھے) وجودی اور شہودی دونوں طریقوں کی اصطلاحات کو غیر قرآنی اور غیر محمدی سمجھ کر رد کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ اصطلاحات تصوف میں غیر اسلامی فلسفوں سے آئی ہیں جن سے عسکری صاحب بھاگنا چاہتے ہیں اس لئے بھی انھیں لازم تھا کہ وہ ان اصطلاحات سے گریز کرتے۔ ان اصطلاحات کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر عسکری نہ تو دینی روایت کی تشریح کر سکے اور نہ مغربی علوم و تنقید ادب کے اصولوں کی خامیوں ہی کو روشن کر سکے۔ اس طرح اس کوشش کا "ثواب" تو شاید انھیں پہنچ جائے مگر شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں وہ بری طرح ناکام رہے۔ رہا امیر مینائی، داغ اور ذوق کے کلام کی عارفانہ شرح کا کام تو عسکری صاحب یہ کرتے رہیں لیکن محض اس لئے کہ یہ شاعری ان کی تعریف کی رو سے "روایتی" ہے اردو کے بڑے شاعروں جیسے میر، سودا، غالب اور اقبال کی شاعری سے فروتر ہی رہے گی۔ اس فیصلہ کے لئے نہ تو علم دین کی ضرورت ہے نہ مغربی علوم اور تنقیدی افکار کو سمجھنے کی صرف ذوق سلیم شرط ہے وما علینا الا البلاغ۔

جن سنگھ یوپی میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کی مخالف

لکھنؤ:۔ کل ہند جن سنگھ کے سکریٹری جناب ناناجی دیش مکھ نے یہاں ایک پریس کانفرنس میں بھارتیہ جن سنگھ کا ۱۵ صفحات پر مشتمل ایک مینی فیسٹو پیش کیا جس میں جن سنگھ نے ہندی کو قومی زبان بتاتے ہوئے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کی مخالفت کی ہے۔ مینی فیسٹو میں کہا گیا ہے کہ اردو کو وہ تمام سہولتیں ضرور دی جائیں گی جو اس کی ترقی کے لئے ضروری ہیں لیکن اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ (قومی آواز)

اردو میڈیم میں سوالوں کے جوابات دینے کی آسانیاں

بھوپال:۔ پتہ چلا ہے کہ جونیر کالج کے طلبہ اردو میڈیم میں بھی سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں لیکن پرچے صرف انگریزی اور ہندی میں آئیں گے۔ جو طلبہ اردو میڈیم میں کورس کی تیاری کریں گے ان کو صرف ہندی اور انگریزی میں پرچے ملنے سے دشواریاں پیش آئے گی اس سے پہلے ہائر سکنڈری بورڈ میں طلبہ کو ہندی، انگریزی کے علاوہ مراٹھی اور اردو میں بھی پرچے دئے جاتے ہیں اور ان زبانوں کے میڈیم میں سوالوں کے جوابات دینے کی بھی آسانیاں تھیں لیکن بورڈ نے اپنی روایات کے خلاف پرچے صرف ہندی اور انگریزی میں دینا طے کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جونیر کالج کے طلبہ اس جانب بورڈ کو توجہ دلا رہے ہیں۔ (انکار)

مزدوروں کی تعلیمی اسکیم کے لئے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے

بمبئی:۔ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت مہاراشٹر نے فیصلہ کیا ہے کہ مزدوروں کی تعلیمی اسکیم ۶۹-۱۹۶۸ء سال کے دوران جاری رکھی جائے۔ یہ تعلیم بمبئی لیبر انسٹی ٹیوٹ کے زیر تحت شروع کی جائے گی۔ جس کی مدت تعلیم تین ماہ ہوگی۔ تعلیمی اسکیم میں ذریعہ تعلیم ہندی اور مراٹھی زبان ہوگی اس خبر کے ذریعہ اسکیم سے متعلق اردو داں مزدوروں میں مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہم حکومت مہاراشٹر کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ بمبئی شہر میں فیکٹری مزدوروں کی ایک کثیر تعداد کی مادری زبان اردو ہے اور وہ دیگر زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ اس مجبوری کی وجہ سے یہ غریب مزدور حکومت کی تعلیمی اسکیم کی سہولت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر ہندی اور مراٹھی کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کا بھی انتظام کیا جا سکے تو یہ حکومت مہاراشٹر کا ایک مستحسن اقدام ہوگا۔

جمعیتہ علماء صوبہ دہلی کے جلسے میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ

[illegible] کے اجلاس عام میں [illegible]

پڑھ کر سنائی گئیں۔ اس کے بعد حکیم شریف خاں صاحب نے اردو یونیورسٹی اور دلی میں اردو سے متعلق تجاویز کی تائید کی حکیم صاحب نے کہا کہ جس طرح ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کے لئے یونیورسٹیاں قائم ہیں اسی طرح کی ایک اردو کے لئے بھی یونیورسٹی ہونا چاہئے۔ آپ نے کہا کہ اردو دلی کی زبان ہے اس لئے اس کا تقاضہ ہے کہ دلی میں اردو یونیورسٹی بھی قائم کی جائے اور اردو کو دلّی کی ثانوی زبان بھی تسلیم کیا جائے۔ (الجمعیتہ)

صد سالہ جشن غالب کمیٹی پنجاب کا پروگرام

چنڈی گڑھ (بمبر) غالب کے صد سالہ جشن کی تقاریب منانے کے لئے یہاں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ یوم غالب کی تقاریب کے سلسلہ میں۔ (الف) چنڈی گڑھ میں ایک اردو کنونشن منعقد کیا جائے جس میں شرکت کے لئے پنجاب، ہریانہ، ہماچل اور دہلی کے اردو دوستوں کو خاص طور پر دعوت دی جائے۔ (ب) ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ (ج) غالب کے شایان شان ایک یادگار کتاب شائع کی جائے مشاعرہ کی صدارت کے لئے فلمی فنکار دلیپ کمار سے درخواست کی گئی ہے ان کی جانب سے منظوری ملتے ہی مشاعرہ کے انعقاد کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ 'صد سالہ جشن غالب کمیٹی' کے کنوینر جناب سورج تنویر منتخب ہوئے ہیں۔ کمیٹی کے بانی اراکین میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۱) سردار دل جنگ سنگھ جوہر، (۲) سردار بھاگ سنگھ، (۳) جناب سری رام عرش، (۴) جناب کشمیری لال ذاکر، (۵) جناب رتی پٹیالوی، (۶) جناب بی۔ ایس کنول، (۷) جناب شو دیال سحاب (۸) پروفیسر کلدیپ ملہوترہ، (۹) پروفیسر گوردیال سنگھ بھاٹیہ، (۱۰) جناب دیویندر دویارتھی، (۱۱) گیانی ہری سنگھ، (۱۲) پروفیسر ستیہ پال آنند۔ یہ کمیٹی چنڈی گڑھ کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں میں وہاں وہاں کی مقامی اردو انجمنوں کے ساتھ تعاون کرکے 'یوم غالب' کی تقاریب کا بھی اہتمام کرے گی۔ جملہ خط و کتابت اور معلومات کے لئے کمیٹی کے صدر دفتر سے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع کیا جائے۔ (صد سالہ جشن غالب کمیٹی فلیٹ نمبر ۳۳۴۹ سیکٹر ۲۱ ڈی چنڈی گڑھ)

انجمن ترقی اردو کاشی کی جانب سے "غالب صدی" منانے کا فیصلہ

کاشی، دفتر ماہنامہ خیال میں کاشی کے حامیانِ اردو کا ایک جلسہ زیرِ صدارت جناب ظہیر وارثی صاحب منعقد ہوا۔ فیض انصاری صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) ددریبہ نے انجمن کی اڈھاک کمیٹی کی تجویز پیش کی اور "غالب صدی" منانے کی طرف توجہ دلائی مشاورت کے بعد حسب ذیل حضرات کے نام اڈھاک کمیٹی کے لئے پیش ہوئے جو بالاتفاق رائے منظور کئے گئے۔ بعد ازاں تجویز پیش ہوئی کہ فروری میں غالب صدی منانے کی تیاری کی جائے اور دسمبر کے فوراً بعد مستقل انجمن تشکیل دی جائے اراکین اڈھاک کمیٹی کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ صدر۔ جناب مولانا ظہیر وارثی صاحب سکریٹری جناب صدیق احتر انصاری صاحب۔ ممبران۔ جناب انیس آغائی جناب ہاشم رحمانی، جناب عبد الرشید، جناب محمد حسن، مطہر رب جناب صفر علی پہلوان، جناب انیس قیصی، جناب محمد اسماعیل حسینی، جناب عبد المجید۔ (نامہ نگار)

غالب اور ان کے عہد کے نقوش کی نمائش

دہلی، ۱۶ فروری سے ۲۲ فروری تک دگیان بھون نئی دہلی میں غالب اور ان کے عہد پر ایک نمائش ہوگی۔ اس میں کوئی چار سو فوٹوگراف ہوں گے جو تیار ہو رہے ہیں ان کے علاوہ غالب کے ہاتھ کی تحریریں، غالب کی تصانیف کے وہ اڈیشن جو ان کی زندگی میں شائع ہوئے، شاگردوں، احباب اور ہمعصروں کی تصاویر، شاگردوں کے دواوین غالب کے عہد کی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں مثلاً جیسے۔ پاجامے، صلفے، کرسیاں، میزیں، حقّے، پاندان، قلم دان، صندوق، چینی اور تانبے کے برتن، مسند تکئے، عورتوں کے لباس وغیرہ سبھی چیزیں نمائش میں رکھی جائیں گی پبلک سے گذارش ہے کہ اگر کسی کے پاس اس فہرست میں سے کوئی چیز ہو تو کنوینر نمائش کمیٹی، مرکزی غالب صدسالہ یادگار کمیٹی، ۶ راجندر پرساد روڈ نئی دہلی کو اس کی بابت مطلع فرمائیں (شمیم زیدی کنوینر)

انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا جلسہ

علی گڑھ:- انجمن اردوئے معلیٰ کا جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں ہوا۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں غالب کی شخصیت اور فن پر ہماری یونیورسٹی کے طلبہ نے مقالے پڑھے۔ بشیر بدر صاحب نے اپنا مقالہ غالب کا استفہامیہ ذہن پڑھا۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ غالب کے ذہن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زندگی پر استفہامیہ طور پر نظر ڈالتے ہیں اسی کے نتیجہ میں غالب کے یہاں نئے حقائق کا ادراک ملتا ہے۔ بشیر بدر کے مقالہ کے بعد مرزا خلیل احمد بیگ نے "غالب کی سہل پسندی" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ انھوں نے مقالہ میں بتایا کہ غالب کے ہاں خاصی بڑی تعداد آسان اور عام فہم اشعار کی ہے اس بنا پر ہم غالب کو مشکل پسند شاعر نہیں کہہ سکتے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کے مقالہ کے بعد جناب اعجاز اختر نے ایک مختصر مضمون غالب اور بیگم غالب پڑھا جس میں غالب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ غالب کی شوخی تحریر نے لوگوں کی اس مفروضہ کی طرف رہنمائی کی کہ غالب کی عائلی زندگی ناخوشگوار تھی حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ غالب کی ازدواجی زندگی نارمل تھی۔ ان مقالات کے بعد جناب خواجہ مسعود علی ذوقی، قاضی عبد الستار صاحب اور نعیم احمد صاحب نے مقالات پر اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے طالب علموں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان پر اپنی رائے دی ہے اور اپنے طور پر سوچا ہے دراصل انجمن اردوئے معلیٰ کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ

طلبہ میں غور و فکر اور لکھنے کا سلیقہ پیدا ہو۔ انھوں نے غالب کے ذہن و ماحول کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک ہی ماحول میں ہر طرح کے ذہن ہوتے ہیں غالب کا ذہن ایسا تھا جو ہر واقعہ اور ہر مسئلہ پر سوالیہ نشان قائم کرتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ تنقیدی مضامین اور انشائیہ میں فرق ہے تنقیدی نثر میں شاعری نہ ہونا چاہئے بلکہ تنقید کی زبان ایسی ہونی چاہئے کہ بات واضح ہو جائے لیکن اس کا مجموعی تاثر ادبی رہنا چاہئے۔ غالب اور سہل پسندی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجموعی طور پر ہم غالب کو سہل پسند نہیں کہہ سکتے۔ غالب کے یہاں جو سہل پسندی ہے وہ فن پر پختگی کی علامت ہے مضمون غالب اور بیگم غالب پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسرور صاحب نے فرمایا کہ غالب کی ازدواجی زندگی پر جامع رائے اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان کے خطوط کا ان کی نفسیات کے پس منظر میں مطالعہ ہو نیز اس زمانے کے حالات معاشرے کے آداب و معیار شرافت کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ آخر میں مسرور صاحب نے اس قسم کے جلسوں کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی نشستیں برابر اور بھی ہونی چاہئیں۔　　(نامہ نگار)

شعبۂ اردو سیفیہ کالج کا جلسہ

بھوپال: شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے زیر اہتمام اردو کے طلبہ نے غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں پہلا ادبی پروگرام پیش کیا جس کا موضوع تھا "غالب صدی کیوں؟ اور کیسے" جلسہ کی صدارت اردو کے مشہور و بزرگ شاعر نیز مدھیہ پردیش غالب صد سالہ تقریبات کے صدر جناب علامہ محوی صدیقی نے کی۔ پروگرام کی ابتدا میں جناب حیدر عباس رضوی لکچرر شعبۂ اردو نے جناب صدر کا مختصر تعارف کرایا۔ صدر شعبۂ اردو جناب عبدالقوی دسنوی نے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ طلبہ میں جناب صبیح اختر، جلال الدین قریشی، عاقل محمد، سید زاہد حسین زیدی عبدالرشید قریشی، اور انور حسین عباسی نے تقریریں کیں۔ مجموعی طور پر غالب کی عظمت کے اعتراف میں ان کی ادبی خدمات کا تجزیہ کیا گیا اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے جو تجاویز سامنے آئیں ان میں غالب کی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کوشش کرنا بھی شامل تھا۔ آخر میں دلشاد حسن سکریٹری مجلس اردو نے جناب صدر، مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔　　(نامہ نگار)

دہلی یونیورسٹی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کا جلسہ

دہلی:۔ دہلی یونیورسٹی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک اجتماع بروز جمعہ مورخہ ۸ نومبر ۱۹۶۸ء زیر صدارت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر نگیندر پروفیسر و صدر شعبۂ ہندی دہلی یونیورسٹی نے ادبی تحقیق کی اہمیت اور معنویت پر ایک خطبہ دیا۔ پروفیسر نگیندر نے دوران خطاب فرمایا کہ تحقیق اور تنقید کے درمیان

بہت گہرا رشتہ ہے تحقیق نئے حقایق کی تلاش ہے اور نئے حقایق سے عام طور پر دو قسم کی حقیقتیں مراد ہوتی ہیں ایک وہ جو کسی زمانہ میں عام طور پر معلوم و معروف تھیں لیکن زمان و مکان کی تبدیلی نے انھیں غیر معروف بنا دیا۔ دوسرے وہ حقایق ہیں جن کی تشریح و توجیح انھیں نئی معنویت بخشتی ہے تحقیق کو یہ دونوں کام سرانجام دینے ہوتے ہیں یعنی نئے حقایق کی دریافت اور معروف حقایق کی نئی تشریح و توجیح۔ لیکن تحقیق میں معنویت صرف تنقیدی شعور کی مدد ہی سے ہو سکتی ہے حقایق بذاتہ بے جان ہوتے ہیں لیکن ان مردہ حقایق کو زندہ تابناک اور متحرک خیالات میں تبدیل کرنے کا عمل تنقیدی شعور کے ذریعہ ہی ممکن ہے تحقیق اور تنقید کے باہمی رشتہ پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ تحقیق کا غیر شخصی ہونا ضروری ہے جبکہ تنقید میں شخصی اور داخلی عنصر کی بڑی اہمیت ہے۔

(سکریٹری ظہیر الحسن شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی)

مارشس میں اردو ادیب کا استقبال

پورٹ لوئس حال میں جزیرہ مارشس کی راجدھانی پورٹ لوئس کی میونسپلٹی کی جانب سے جناب روشن خاں کی صدارت میں جناب اطہر پرویز کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اطہر پرویز کولمبو پلان کے تحت حکومت ہند کی طرف سے مارشس آئے ہوئے ہیں اور یہاں اردو کی تعلیم و ترقی کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ جناب صدر نے پورٹ لوئس کی جانب سے اطہر پرویز کا استقبال کیا اور حکومت ہند کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے موصوف کو بھیج کر جزیرے میں اردو کی ترویج و اشاعت کا انتظام کیا انھوں نے فرمایا کہ جزیرے کے لوگ اردو سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس زبان کے فروغ میں اطہر پرویز کا ساتھ دیں گے پرویز صاحب جتنے خلوص اور محنت سے اس کام کو کر رہے ہیں ہم امید کرتے ہیں کہ اس کے نتائج امید افزا ہوں گے اس کے بعد جناب صدر نے پرویز صاحب سے درخواست کی کہ وہ اردو زبان و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالیں اطہر پرویز صاحب نے اپنی تقریر میں ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا ایک مختصر جائزہ لیا اور اردو نظم و نثر کے ارتقا کا خاکہ پیش کیا اور بتایا کہ کس طرح یہ زبان مختلف فرقوں کے درمیان ایک رابطہ کا ذریعہ بنی ہے اس وقت ہندوستان میں اردو میں علمی، ادبی، مذہبی، دینی، نفسیاتی اور فلمی غرض ہر موضوع پر رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں اپنی تقریر میں موصوف نے اردو ادب کی مختلف اصناف کا جائزہ لیا آپ نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ اردو کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سب کی زبان ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے ادیبوں میں مختلف مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ جناب صدر نے شہریوں کی طرف سے اطہر پرویز صاحب کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ اردو زبان مارشس میں [illegible]

R. NO. 2186/57

REGD. N.L. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

تاریخ اجرائے اشاعت ۱-۸-۱۵-۲۲

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

جلد ۲۷ - شمارہ ۴۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

غالب اکیڈمی

حکیم عبدالحمید صاحب کو اگر آدمی کے کوئے جن کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ عام لوگ باتیں زیادہ کرتے ہیں، کام کم، وہ کام زیادہ کرتے ہیں اور باتیں بالکل نہیں کرتے۔ انھوں نے طب یونانی کے فروغ کے لئے عموماً اور علمی وتہذیبی کاموں کے لئے خصوصاً جو کچھ کیا ہے وہ سب پر روشن ہے۔ حکیم صاحب نہ حالات کا ماتم کرتے ہیں، نہ مشکلات سے بددل ہوتے ہیں۔ وہ برابر ایسے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے عزم وہمت اور خلوص وخدمت کا تازہ ترین نمونہ غالب اکیڈمی ہے، جو حال ہی میں وجود میں آئی ہے۔ حکیم صاحب نے کئی سال پہلے غالب کے مزار کے قریب زمین کے دو قطعے خرید لئے تھے۔ آج ان قطعوں کی قیمت ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی ان میں سے ایک قطعہ پر غالب اکیڈمی کی عمارت کا افتتاح ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء کو ہونے والا ہے۔ اس کی تعمیر پر دو لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ اس میں تین منزلیں اور ایک تہ خانہ ہوگا جس میں غالب لائبریری غالب میوزیم اور ایک ہال ہوگا۔ غالب اکیڈمی کو چلانے کے لئے اڑتیس ہزار سالانہ کے خرچ کا اندازہ کیا گیا ہے جس میں سے چوبیس ہزار سالانہ اکیڈمی کے برابر ایک دوسری عمارت کے کرائے سے ملنے کی توقع ہے اور باقی چودہ ہزار اکیڈمی کی مطبوعات سے۔ دونوں عمارتوں کی تعمیر اور ساز وسامان پر پانچ لاکھ اسّی ہزار کے خرچ کا اندازہ ہے۔ غالب اکیڈمی فروری میں تین کتابیں شایع کرے گی۔ ان میں ایک غالب ببلوگرافی ہوگی جو انگریزی میں ہوگی۔ دوسری ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب، غالب اور آہنگ غالب، اردو میں اور تیسری غالب کی منتخب غزلیں ہندی میں۔ اس کے علاوہ غالب پر کچھ مشہور مصوّر کی تصویریں غالباً کسی البم کی صورت میں شایع کی جائیں گی۔ اکیڈمی انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ بھی شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس میں غالب، ان کی تصانیف اور ان کے عہد کے متعلق مضامین شایع ہوا کریں گے۔ اکیڈمی کی لائبریری میں غالب اور ان کے عہد پر تمام کتابیں جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان تمام نادر نسخوں کے مائیکرو فلم حاصل کئے جائیں گے جو مشرق ومغرب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ غالب میوزیم میں غالب کی ذاتی استعمال کی چیزیں اور ان کے عہد کے تمام آثار جمع کئے جائیں گے اور اس کے ساتھ اس زمانے کی معاشرت کے نمونے۔ وصلیاں، ٹکٹ، اخبار، داستانیں، فرنیچر، تصاویر، ملبوسات اور دوسری چیزیں یکجا کی جائیں گی۔ ہال میں اکیڈمی کے جلسے ہوا کریں گے اکیڈمی کا بروشر (کتابچہ) نہایت دیدہ زیب ہے اور اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اکیڈمی کے سامنے کام کا ایک شاندار منصوبہ ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ضروری اقدامات کرسکتی ہے۔ اکیڈمی کے سرپرست وہ ہوں گے جو پانچ ہزار روپیہ دیں گے، لائف ممبروں کے لئے پانچ سو روپیہ کا عطیہ مقرر کیا گیا ہے۔ تحریک ممبروں کے لئے سو روپیہ سالانہ اور عام ممبروں کے لئے بیس روپیہ سالانہ۔ اس کے علاوہ اعزازی ممبر صدر یا مجلس عاملہ بنا سکتی ہے۔ وہ ادارے جو اکیڈمی کے مقاصد سے اتفاق رکھتے ہیں ممبر شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں غالب اکیڈمی ہمدرد بلڈنگس دہلی ۶ سے رجوع کیا جاسکتا ہے

ہمیں یقین ہے کہ اردو کے ہمدرد اور علم وادب کے سرپرست غالب اکیڈمی کے قیام کا پرجوش خیر مقدم کریں گے اور دامے، درمے، سخنے، قدمے اس کی مدد کریں گے۔ اس اکیڈمی کی اٹھان ایسی ہے کہ اس سے ہم بجا طور پر بہت سی توقعات وابستہ کرسکتے ہیں۔

غالب کی فارسی تحریروں کی ایران میں اشاعت

نئی دہلی:۔ معلوم ہوا ہے کہ غالب صدی کی اشاعتی سرگرمیوں میں حکومت ایران بھی حصہ لے رہی ہے۔ ایرانی حکومت نے مرزا غالب کی فارسی نثر اور نظم کی ایک کلیات شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے غالب صدی جشن کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری فخرالدین علی احمد کے نام شاہ ایران محمد رضا پہلوی نے ایک تحریر میں بتایا ہے کہ فروری میں جب جشن غالب کا خاص جلسہ ہوگا تو اس میں ایران سے ایک خاص نمائندہ شریک ہونے کے لئے دہلی بھیجا جائے گا۔　　(قومی آواز)

غالب صدی کی تقریبات کے لیے حکومت پنجاب نے دس ہزار روپیہ دیا

چنڈی گڑھ:۔ حکومت پنجاب نے غالب کی صد سالہ برسی منانے کے لئے غالب صدی متعلق کل ہند کمیٹی کو دس ہزار روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔　　(سیاست)

ہندوستانی ضرب الامثال کی لغت

لکھنؤ:۔ عنقریب نیشنل بک ٹرسٹ ہندوستانی ضرب الامثال کی ایک لغت تیار کرے گا۔ اس کا عنوان "ہندوستانی کہاوت کوش" ہوگا۔ اس لغت کو مشہور ہندی ادیب جناب کرشنا نند گپتا مرتب کریں گے۔ ہندوستانی ضرب الامثال کے بارے میں پہلی کتاب تقریباً دو سو سال قبل ماہر لسانیات جناب ایس ڈبلیو فیلن نے تیار کی تھی۔ مگر ایک طویل مدت سے یہ کتاب نہیں چھپی۔ اور ناپید ہو چکی ہے۔　　(قومی آواز)

فارسی شاعری کا منتخب مجموعہ ازبکستان اکیڈمی مرتب کر رہی ہے

تاشقند:۔ ازبکستان کی سائنس اکیڈمی سترھویں صدی کی فارسی شاعری کا ایک منتخب مجموعہ مرتب کر رہی ہے اس کتاب میں دو سو شعراء کا کلام ہوگا جن میں ناظم ہروانی، صائب تبریزی، غنی کشمیری، سلیم شفائی اور حکیم شامل ہیں۔ متن فارسی میں ہوگا اور تشریحات روسی میں۔ سترھویں صدی کا مشرقی ادب ہندوستانی فکر سے بہت زیادہ متاثر تھا ازبک ادب کے بانی علی شیر نوائی (۱۴۴۱ء - ۱۵۰۱ء) کا فلسفۂ وجودیت اس فکر کا سرچشمہ ہے۔ اس عظیم شاعر اور انسان دوست کے افکار وسط ایشیا، ہندوستان، ایران، افغانستان، اور دوسرے مشرقی ملکوں میں بہت دور دور تک پھیل گئے تھے اور انھوں نے سترھویں صدی کے شعراء کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔　　(قومی آواز)

دہلی میں غالب اردو آپرا کی تیاریاں

دہلی:۔ جین بک ایجنسی دلی کی جانب سے مرزا غالب کی زندگی، شاعری اور ان کے تاریخی دور پر ایک اسٹیج آپرا مرتب کیا جارہا ہے اس اہم ترین تہذیبی فریضہ کی تکمیل میں مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار نیاز حیدر شب و روز مصروف ہیں اس قسم کے تخلیقی اسٹیج آپرا کے لئے نیاز حیدر سارے ملک میں مشہور ہیں اس میں دہلی کے ماہر اور نامور اداکار حصہ لے رہے ہیں جو فروری کے اواخر میں پیش کیا جائے گا۔ جناب میر مشتاق احمد کی نگرانی اور رہنمائی میں بڑی خوش اسلوبی سے تکمیل کے مراحل طے کئے جا رہے ہیں، قدیم شہر دہلی کے تمام ادب نواز حلقے اس بے نظیر اقدام میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔　　(الجمعیۃ)

غالب صدی کے موقع پر مضمون نگاری کا مقابلہ

لکھنؤ۔ غالب کی شاعری اور مکتوبات میں عورت کا تصور یہ ہے ان موضوعات میں سے ایک جو کالج طلبہ کے کل ہند مضمون نویسی کے مقابلے کے لئے مقرر ہوئے ہیں مقابلے کے دیگر موضوعات میں غالب کے ذریعہ قومی یکجہتی، ہندوستانی ادب پر غالب کی شاعری کے اثرات، غالب اپنے معاصروں کی نظر میں اور "غالب اردو کے بجائے فارسی شاعری میں عظیم ہیں" شامل ہیں مقابلوں کا اہتمام یو۔پی میں غالب کی جشن صد سالہ کمیٹی نے کیا ہے لکھنؤ یا بنارس کے ایک جلسے میں سب سے اچھے مضامین پر لڑکوں کو تین اور لڑکیوں کو تین انعامات دئے جائیں گے لڑکوں اور لڑکیوں کو سب سے عمدہ مضمون پر ایک ایک گولڈ میڈل دیا جائے گا۔ غالب کا جشن صد سالہ فروری میں ہندوستان بھر میں اور بیرونی ممالک میں منایا جارہا ہے۔　　(الجمعیۃ)

ڈاکٹر محمد نظام الدین کی وفات

حیدرآباد، ۲۹ نومبر کو یہاں نامور صاحب علم و قلم ڈاکٹر محمد نظام الدین کی ۸۰ سال کی عمر میں وفات ہوگئی انھوں نے ایک عرصہ تک صدر شعبۂ فارسی کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دئے تھے اور وفات کے وقت تک تھا۔ بنی تحقیق لسانیہ دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ڈائرکٹر رہے علمی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے انھیں اعزاز سے بھی سرفراز کیا تھا۔　　(سیاست)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

تناسب اور رشتے کا سامنا کر رہی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے تاثرات میں غرق ہے۔

غزل کے اس نئے جلال و جمال کے سامنے جب کوئی اصلاحی یا تعمیری موضوعات کے نہ ہونے کی شکایت کرتا ہے تو اس کی ہوشمندی اور بیدار مغزی کا تو ثبوت مل جاتا ہے البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شکایت کرنے والا ادیبوں کے قبیلے کا آدمی نہیں بلکہ دنیا داروں یا تاجروں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو مفید اور کارآمد باتوں کے حصار میں رہ کر اپنی زندگی کو سنوارنے اور اپنے دل و دماغ کو جتنی بھی قلیل مدت کے لئے ہو سکے ہر قیمت پر رکھنے پر مصر ہے اور اس سے ماورا کسی ربط و تعلق پر آمادہ نہیں۔

عبدالقوی دسنوی

حمد باری

غالب کے ایک شاگرد عبدالسمیع رامپوری بیدل کی تصنیف

مولوی عبدالسمیع رامپوری بیدل کے بارے میں جناب مالک رام "تلامذۂ غالب" میں تحریر کرتے ہیں:۔

"فارسی اور عربی کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں کسب علم کے لئے دہلی آئے اور مفتی صدر الدین خاں سے عربی پڑھی اسی ایام میں شعر گوئی کا شوق ہوا تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اوائل میں طبیعت غزل کی طرف زیادہ مائل رہی بعد میں رسمی شاعری کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ مذہبی علوم و مسائل پر محدود کر دی ایک نعتیہ دیوان اور ایک مختصر رسالہ "نور ایماں" کے نام سے موجود ہے" (ص۵۰)

ان تصانیف کے علاوہ ایک تیسری تصنیف "حمد باری" بھی ہے جو خالق باری، قادر نامہ غالب قادر نامہ فردغی، عجائب نامہ وغیرہ کی طرز پر لکھی گئی ہے بضخامت ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے سرورق ملاحظہ کیجئے:

دریں زمان فیض عنوان دادان فرحی تواماں نسخۂ معتبر کہ لاجواب در علم لغات در کمی حجم و بسیاری فواید ماثل و دل مسمی بہ

حمد باری

از تصنیف جناب مولوی محمد عبدالسمیع صاحب متوطن

مطبوعہ رام پور ضلع سہارنپور در مطبع رنگین واقع میرٹھ لباس حسن انطباع پوشید۔

دوسرے صفحہ پر التماس مؤلف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب شیخ الٰہی بخش کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم کے فرزند وحید الدین نے جب فارسی زبان کی تعلیم شروع کی اور خالق باری پڑھنے لگے تو بعض الفاظ بجائی اور سنسکرت کے اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے دوسرے مدرسوں کے طالب علموں کا بھی یہی حال تھا چنانچہ انھوں نے یہ منظوم رسالہ تحریر کیا اس کی تالیف کے سلسلے میں برہان قاطع، غیاث اللغات نفائس اللغات پیش نظر ہے۔ مخزن و بحر الجواہر و سراج اللغات و کشف اللغات سے بھی تحقیق کر کے بعض الفاظ لکھے گئے ہیں۔ کتاب حمد سے شروع ہوتی ہے۔ پوری کتاب اٹھارہ فصل میں منقسم ہے یہاں ہر فصل کے ساتھ پہلا شعر درج ہے۔

فصل در بیان آسمان و متعلقات آن
آسماں ہے چرخ گردوں اور فلک
تارا اختر ہے فرشتہ ہے ملک

فصل در بیان سال و ماہ وغیرہ
جان غرہ چاند رات اے با صفا
سلخ پچھلا روز ہے ہر ماہ کا

فصل در بیان زمیں و انچہ در آنست از معادن و بحار و اماکن۔
ہے زمیں ارض اور پتھر ہے حجر
ہے کلوخ اے یار ڈھیلا اور مدر

فصل در بیان اثاث البیت یعنی اسباب ضروری خانہ۔
پونجی سرمایہ ہے اور اسباب رخت
بوریا چاٹو حصیر اور تنگ تخت

فصل در بیان داعضای انسان
روح جی ہے جسم تن کا نام ہے
ہے زباں جیب اور تالو کام ہے

فصل در بیان انچہ از جسم انسان تعلق دارد
ہے ڈکار آروغ تے موہنہ کا اچھال
تھوک کو کہئے بزاق اور ریق رال

فصل در بیان اہل قرابت۔
پیر بوڑھا اور برنا ہے جوان
ہے رجل مرد اور زن عورت کو جان

فصل در بیان اہل پیشہ
ہے سپاہی لشکری منشی دبیر
شاہ سلطان اس کا پیشتیبان وزیر

فصل در بیان اہل عیوب

حال للی

ترجمہ: رسم ماتقدست

نابینا دیوتا

کیوپڈ اور کم پاسی نے تاش پر
بوسوں کی شرط لگائی کیوپڈ کو دینے پڑے!
اس نے اپنے تیر کمان، اور تیر دان
اپنی ماں کے راج ہنس، کبوتر، فاختہ
بھی داؤ پر لگا دئے اور ہار گیا پھر اس نے
اپنے ہونٹوں کی سرخی، اپنے رخساروں کی رعنائی
اپنے ابرو کی زیبائی، اور اپنا چاہ زنخ بھی
ایک ایک کر کے باری پر لگا دئے
ہر بار جیت کم پاسی کی ہی ہوئی
آخر اس نے اپنی آنکھوں کا داؤ لگایا
مات کھائی اور اپنی آنکھیں گنوا کر بساط سے اٹھ آیا

اے کیوپڈ، عشق کے ناقابل تسخیر دیوتا!
اس نے تیری یہ گت بنا دی
میں کس باغ کی مولی ہوں، میرا حشر معلوم!

٭ یہ کتاب مولانا محوی صدیقی صاحب کے ذاتی کتب خانہ سے ملی ہے۔

لنگ داعرج لنگڑا اور لنجا ہے شل کور واعمیٰ اندھا اور گنجا ہے کل

فصل دربیان حبوب و اشیاء خوردنی۔

خطہ اور گندم ہے گیہوں العزیز ہے چنا حمص نخود اے باتمیز

فصل دربیان مصالح طعام

ہیں جو چیزیں بہر اصلاح طعام ہے مصالح اور توابل ان کا نام

فصل دربیان کشت و باغ و اچھے درانست

مزرعہ اور کشت کھیتی اے عزیز روضہ اور بستاں ہے باغ اے باتمیز

فصل دربیان آلات جنگ و آلات اہل حرفہ

رمح نیزہ بھال کو جانو ستان سہم تیر قوس کو جانو کمان

فصل دربیان جانوراں

دام جنگل کا پرندہ جان لو پھر سبع اور دو درندہ مان لو

فصل دربیان اجزا اجسام حیوانات تعلق دراد

پوٹا جانو حوصلہ ہے منقار لول رقبہ جونکا ہے ٹ کو پنجال لول

فصل دربیان بعض آلات بازی طفلاں

بازی ولہو ولعب ہے کھیلنا احلکند رکیا ہی . وہ بوجھبھا

فصل دربیان متفرقات

حجرہ ہے اور قلمدان ایک چیز مدرسہ مکتب دبستاں ایک چیز

تتمہ دربیان اعمال وکیفیت اشتقاق

وقت جو موجود ہے وہ حال ہے گر رہا ماضی آتا استقبال ہے

"خاتمۃ الطبع" کی تحت مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

" بعد حمد رب العالمین ولعنت سید المرسلین کردریں

ایام فرخی التیام کتاب لاجواب در علم لغات درکمی حجم

وبسیاری فوائد مسمی بہ حمد باری از تصنیفات صدر آرای

شرح متین رونق افزای حق دلیقیں یکہ تاز میدان

علم وعمل مقبول بارگاہ عزوجل علامہ علوم جمیع مولوی

محمد عبد السمیع صاحب متوطن قصبہ رامپور ضلع سہارنپور

کہ شرف تلمیذ جناب نواب اسد اللہ خان غالب

حاصل فرمودند و دیگر فنون از علمای دہلی تحصیل

آوردند لا یزال سحاب فیضہ مدرارا و بحر افتادہ

زخارا در مطبع رنگیں میرٹھ رونق نگار پذیرفت

کسی بلا اجازت قصد طبع نفرمایند ورنہ بجائے نفع

نقصان حاصل خواہند کرد"

مناظر عاشق ہرگانوی

اخبار و رسائل میں غالب

میری ذاتی لائبریری میں جتنے بھی اخبار و رسائل ہیں ان میں سے غالب سے متعلق خبریں، مراسلے، مضامین اور اداریوں کا اشاریہ یہاں دیا جارہا ہے۔ م، ع، ہ

از "ہماری زبان" علی گڑھ

(ہماری زبان کے جنوری ۱۹۶۷ء سے لے کر جولائی ۱۹۶۸ء تک کے شمارے کا اشاریہ اسلام الدین قریشی صاحب نے پیش کر دیا ہے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے)

۱۔ ۱۹۶۹ء کے جشن غالب کے لئے ایک تجویز۔ ادارہ۔ یکم جون ۶۲ء

۲۔ مرزا غالب کے تقل ساعت کی تاریخ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ یکم جولائی ۶۲

۳۔ بزم غالب (منعقدہ) تیش میسوری۔ ۲۲ر جولائی ۶۲

۴۔ غالب کے ثقل سماعت کی تاریخ۔ امتیاز علی عرشی۔ ۲۲ر جولائی ۶۲

۵۔ غالب سنٹری۔ ادارہ۔ یکم اگست ۶۲

۶۔ غالب۔ گرد مں (لتامیلیں) مصنف شوکت سبزواری ۸ اگست ۶۲

۷۔ مرزا ان علی خاں رعنا (تلمیذ غالب)۔ نادم سیتاپوری ۲۲ر اکتوبر ۶۲

۸۔ غالب کی نادر تحریریں (تبصرہ از خلیل الرحمٰن اعظمی) مرتب خلیق انجم۔ ۲۲ر اکتوبر ۶۲

۹۔ دلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجوزہ عمارت کا نام (مراسلہ از ۔ ۔ ۔) ۔ غالب محل یا غالب بھون یکم نومبر ۶۲

۱۰۔ تہہ سے شعر سر رنگینی بعد میں خواہد شدن (مراسلہ از اقبال کرشن)۔ یکم ۔ ۔ ۶۲

۱۱۔ مرزا ان علی خاں لطام تلمیذ غالب۔ (مراسلہ از مالک رام) ۸ر نومبر ۶۲

۱۲۔ مرزا ان علی خاں لطام تلمیذ غالب۔ (مراسلہ از نادم سیتاپوری) ۸ر نومبر ۶۲

۱۳۔ جدید ہم عصر۔ عابد رضا بیدار۔ ۱۵ر نومبر ۶۲

۱۴۔ تماشائے اہل سیر (تبصرہ از خلیل الرحمٰن اعظمی)۔ مصنف سید رشید الحسن۔ ۱۵ر نومبر ۶۲

۱۵۔ اردو محل (مراسلہ از ناظم سیوانی سہسرامی) انجمن ترقی اردو ہند کی مجوزہ عمارت کا نام "غالب محل" یا "غالب بھون" ۸ر دسمبر ۶۲

۱۶۔ غالب سنٹری کے لئے ادبی کام۔ اداریہ۔ ۱۵ر دسمبر ۶۲

۱۷۔ میں اردو ادب کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ رضا تیوموا۔ غالب کی شاعری اور ان کے خطوط کے بارے میں تاجکستان کے پوسٹ

باقی کالم ۱ میں

(باقی ہے آگے) گریجویٹ طلبہ پڑلا نوا اور عفاروف تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں

۱۸۔ غالب کے ایک شاگرد۔ مراد علی بیمار کی دو غزلیں نجیبی سرور یکم فروری ۶۳

۱۹۔ اعلیٰ مجلس نئی دلی (مراسلہ از جندن)۔ جگن ناتھ آزاد نے یہ انکشاف کیا کہ اردو ادب کے مشہور محقق جناب مالک رام جو آج کل چیمیں میں غالب کے فارسی کلام کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں ۔ ۵ر فروری ۶۳ء

(باقی آئندہ)

امام مرتضیٰ نقوی

اردو کی کتابوں میں اشاریہ کی ضرورت

اشاریہ جس کو انگریزی میں انڈکسنگ کہتے ہیں ایک ایسا طریقۂ کار ہے جو کتاب کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ اور وہ کتاب کے اندر ان افراد۔ ملکوں اور شہروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو کتاب کے اندر دیئے گئے ہیں جن جن صفحات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے ان صفحات کے نمبر کا حوالہ دیا جاتا ہے اس کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہوتی ہے تاکہ پڑھنے والے کو زیادہ دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ فوراً اپنے مقصد کو پہونچ جائے۔

علم و ادب کی ترویج و ترقی کے اس دور میں جبکہ ہر شخص کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے یہ چیز شدت سے محسوس کی گئی کہ کونسا ایسا طریقہ ہو جو ایک محقق کے لئے قلیل وقت میں اس کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

اس ضرورت نے انڈکسنگ یا اشاریہ کو جنم دیا، موجودہ دور میں ہزاروں اور لاکھوں انسان تحقیق کے کام میں مصروف ہیں اور ہر شخص کا میدان علیحدہ ہے اسی تعداد میں کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں ہر کتاب اپنا ایک موضوع رکھتی ہے۔ اور اسی موضوع سے متعلق اس میں بحث ملتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے حوالے بھی اس میں آتے ہیں جن کا ذکر کرنا مصنف کے لئے ناگزیر ہے۔ اور وہ حوالے بعض اوقات اس محقق کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جس کا اس کتاب کے اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں، ایک محقق کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کتب خانوں میں جاکر ان کتابوں کو تلاش کرے جو ذرا بھی اس کے موضوع سے متعلق ہیں یا ہو سکتی ہیں، مگر بغیر اشاریہ کے یہ چیز ناممکن ہے۔ کیونکہ محقق کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس سے متعلق معلومات کس جگہ مل سکتی ہیں۔ یا تو وہ پوری کتاب پڑھے یا پھر اسے چھوڑ دے جو اس کے لئے ایک نقصان عظیم ہو سکتا ہے۔ بہت سی اہم باتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے حوالوں میں مل جاتی ہیں جن کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ابو الکلام آزاد پر ریسرچ کر رہا ہے اور اس کا موضوع محض سیاسی پہلو ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام کتابیں دیکھے جو اس دور کی تاریخ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بغیر اس کے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس دور کی تاریخ پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان سب کا پڑھنا اس کے لئے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اگر وہ ہر کتاب کے اشاریہ میں ابو الکلام آزاد دیکھے تو اسے کم وقت میں بہت کچھ مل جائے گا۔

انگریزی کی کتابوں میں عام طور پر ہم کو اشاریہ ملتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر برخلاف اس کے اردو کی کتابوں میں یہ کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ اردو ادب اپنی نشر و اشاعت کے معاملے میں بہت پیچھے ہے۔ صرف کتاب کا چھپ جانا ہی کافی نہیں اس کے ساتھ اور بہت سی لوازمات ایسی ہوتی ہیں جن کی طرف توجہ نہ مصنف دیتے ہیں اور نہ ناشر پرانی کتابوں میں تو اس قسم کے عیب ہم کو عام طور پر ملتے ہیں اب بھی جبکہ نشر و اشاعت کا کام بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو کتاب میں نہیں دی جاتیں۔ مثلاً سن اشاعت یا قیمت وغیرہ اردو میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن میں اشاریہ کی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑا نقص ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو کا دامن بھی وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ ہر فن اور موضوع پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ایک تاریخ کے محقق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ انگریزی کی ہی کتابوں میں اپنے لئے مواد تلاش کرے بلکہ اردو میں بھی اس کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ مگر چونکہ اردو کی کتابوں

سید جابر علی جابر

غزل

ذوق ارتقا جابر آپ اپنا منتہا ہے
گرمیٔ تمنا ہی حاصلِ تمنا ہے

لاکھ انقلاب آئیں یا خیال و خواب آئیں
موج پر حباب آئیں وہ نظر میں بستا ہے

ایک خوابِ ہستی کی گو ہوں لاکھ تعبیریں
منتشر ہوں تصویریں دل مگر سمجھتا ہے

ایک آرزو دل میں ایک جستجو دل میں
شوق میرا سایہ ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے

ابر و آسماں جیسے میرے دل کی باتیں ہیں
میرے شوق کا عالم میرے غم کا نقشا ہے

موجِ زندگی قائم موجِ زندگی دائم
عافیت کے ساحل پر اور ایک رستا ہے

کو اس [illegible] کا نا ہوگا جو ایک اسکالر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ یہ ہر مصنف کا فرض ہے کہ جہاں وہ اپنی کتاب کی تصنیف میں اتنی محنت کرے وہاں آخر میں ایک اشاریہ بھی تیار کرے جس سے اس کی کتاب کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگا اور اس کی افادیت بھی بڑھے گی۔ اگرچہ یہ بہت معمولی بات ہے اور لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں میں سہل پسندی کا رجحان اتنا عام ہوگیا ہے کہ وہ کتاب کا مسودہ تیار کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، اور ان چیزوں پر محنت کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ اچھی کتاب وہی سمجھی جاتی ہے جس میں ان تمام باتوں کا التزام کیا گیا ہو۔ ادب ہو یا تاریخ۔ فلسفہ ہو یا مذہب۔ اشاریہ ہر کتاب کے لئے ضروری ہے۔ بغیر اس کے کتاب کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اپنی کتاب کے آخر میں کتابیات دیتے ہیں۔ کتابیات اگرچہ بہت اچھی چیز ہے مگر اس کے ساتھ ہی اشاریہ بھی کم اہم نہیں، آج کل بڑی بڑی ضخیم کتابیں شایع ہو رہی ہیں مگر اس ضخامت سے کوئی فائدہ نہیں جب تک ان کے پڑھنے والوں کے لئے اس میں سہولت فراہم نہ کی جائے۔ ایک محقق کے لئے یہ کام بڑا دشوار ہے کہ وہ اس کی ورق گردانی کئے جائے۔ اور باوجود تلاش بسیار کے اس کے کام کی کوئی چیز اس کو نہ ملے۔

اس لئے ان تمام دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اچھے مصنف کا فرض ہے کہ وہ جہاں کتاب لکھنے میں اتنی محنت کرے وہاں اپنی کتاب کے آخر میں چند صفحوں کا اشاریہ بھی شامل کرے جس سے اس کی کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو تاکہ اردو کی کتابیں بھی دوسری زبانوں کے ہم پلہ کہلاسکیں۔

غالب صدی تقریبات کے لئے مرکزی غالب کمیٹی کا پروگرام

اسد اللہ خاں غالب ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال ہوا۔ وہ اس سے پہلے دنیا کے زندہ جاوید شاعروں کی صف اوّل میں اپنی جگہ محفوظ کرچکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنی زندگی میں اسے کوئی خاص ہر دلعزیزی اور شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، لوگوں نے اس کا صحیح مرتبہ پہچانا۔ پھر اسے ہر دلعزیزی بھی حاصل ہوئی اور شہرت بھی اور دونوں بجد وافر آج یہ حالت ہے کہ وہی غالب جو مقروض اور مفلس مرا تھا اس کے دیوان کے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے کے مکلّف نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ مصنفوں نے اس سے متعلق بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں مقالے لکھے ہیں اس کی غزلیں فلموں اور گراموفون ریکارڈ میں محفوظ کی گئی ہیں اور آئے دن ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر گائی جاتی ہیں، اصحاب دل اور شعرا اور سیاست داں غرض ہر طبقے کے لوگ اس کے اشعار پڑھتے ہیں۔ اس کی کتابوں کے خطی نسخے ہزاروں میں بکتے ہیں اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی ذاتی چیز کی کسی مشق بہا خزانے سے کم قدر نہیں کی جاتی۔

آئندہ سال فروری میں غالب کی وفات کو سو سال پورے ہوجائیں گے جن علاقوں میں اردو، ہندی کا چلن ہے وہ وہاں کی زبان اور تہذیب کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ لہٰذا یہ ان سب کا فرض کہ وہ اس موقع پر اپنا خراجِ عقیدت پورے جوش و خروش سے اس کی بارگاہ میں پیش کریں۔

آل انڈیا غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کے سامنے اس موقع کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام ہے۔

(۱) غالب کی تمام تصنیفات (اور بعض متعلقہ کتابوں) کا ایک مصدقہ ایڈیشن حسن اہتمام سے شائع کرنا۔

(۲) حکومت ہند کی وزارت معلومات عامہ (انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ) کے تعاون سے غالب کی زندگی سے متعلق سیاہ و سپید رنگوں میں ایک مختصر معلوماتی فلم بنانا۔

(۳) نئی دہلی میں تین دن کے لئے ایک بین الاقوامی سیمینار کا قیام۔ اس میں شرکت کے لئے ہندوستان اور دوسرے ممالک کے ۸۰ اصحاب علم کو دعوت دی جارہی ہے۔

(۴) دلی اور بمبئی میں ایک نمائش کا انعقاد۔

(اس نمائش میں غالب کی تصویریں، خطوط، تصنیفات کے قلمی نسخے، مطبوعات کی طبع اوّل اس کے عہد کے نفائس و نوادر، روزمرہ کی استعمال کی چیزیں اور تقریباً ۰م تصویریں دکھائی جائیں گی۔

(۵) ڈیڑھ سو نمائندہ تصویروں کے پانچ سٹ تیار کئے جائیں گے جو ہندوستانی اور بیرونی ممالک میں نمائش

کی شکل میں استعمال ہوں گے۔

(۶) ملک کے بعض ممتاز مصوروں سے درخواست کی جائے گی کہ وہ غالب کی تصویر تیار کریں یا اس کے بعض شعروں کو تصویر کے قالب میں ڈھالیں۔ بحد امکان انھیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

(۷) پوسٹ کارڈ سائز کی تصویروں کا ایک سٹ جس میں غالب کی اپنی تصویریں اور اس سے متعلق دلچسپ مواد ہوگا۔

(۸) غالب کی لال قلعے کی تصویر کی اس کے اصلی رنگوں میں عام اشاعت۔

(۹) غالب میموریل کی تعمیر

(اس میں کتب خانہ اور عجائب گھر (میوزیم) اور ہال ہوں گے، یہاں بیٹھ کر اصحاب علم حضرات غالب اور اس کے عہد سے متعلق تحقیق و تصنیف کا کام کر سکیں گے۔

دلی ایڈمنسٹریشن نے اس میموریل کے لئے ماتا سندری مارگ پر تقریباً سوا ایکڑ زمین کا ٹکڑا عطا کیا ہے۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین نے گذشتہ فروری میں رکھا تھا۔ بعض ماہرین اس عمارت کا نقشہ بنا رہے ہیں ایک خاص کمیٹی ان میں سے بہترین نقشے کا انتخاب کرے گی، عمارت اسی کے مطابق تعمیر ہوگی)

(۱۰) دلی وہ شہر ہے جہاں غالب کی زندگی کا بیشتر زمانہ بسر ہوا وہ یہیں جوان ہوا، شاعر کی حیثیت سے اس نے یہیں شہرت پائی، مرنے کے بعد وہ یہیں کی خاک میں دفن ہوا اس لئے یہاں ہفتے بھر کی تقریبات کا پروگرام بنایا گیا ہے متعدد اداروں نے اس میں ہمارا ہاتھ بٹانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۵ فروری: غالب کے مزار کی گلپوشی، فاتحہ خوانی، غزل سرائی۔

۱۶ فروری صبح: راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین تقریبات کا آغاز اور ڈاکیومنٹری فلم کا افتتاح فرمائیں گے۔

کتھک کیندر کی طرف سے پہلے نمائش کا افتتاح اور خاص ڈاک ٹکٹ کا اجرا وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی فرمائیں گی۔

۱۷ فروری: بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح، نیا تھیٹر کی طرف سے ڈراما۔

۱۸ فروری: بین الاقوامی سیمینار کا دوسرا دن، نیا تھیٹر کی طرف سے ڈراما (دوسری مرتبہ)

۱۹ فروری: بین الاقوامی سیمینار کا تیسرا دن، تمثیلی مشاعرہ (لال قلعے میں)

۲۰ فروری: غالب کی زندگی سے متعلق اوپیرا دلی آرٹ تھیٹر کی طرف سے غالب کی غزلیات سنگیت ناٹک اکاڈمی

کی طرف سے۔

۲۱ فروری: غالب کی زندگی سے متعلق اوپیرا (دوسری مرتبہ) مشاعرہ لال قلعے میں۔ شری رام فاونڈیشن کی طرف سے۔

ہندوستان کے کئی شہروں اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی مقامی کمیٹیاں بن چکی ہیں جو اس تقریب کو بڑے پیمانے پر منانے کی تیاری کر رہی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ غالب کی بعض کتابیں ان کی نگرانی میں چھاپی جائیں وہ اس موقع پر مشاعرے، سیمینار، ڈرامے، نمائشوں وغیرہ کا انتظام بھی کر رہی ہیں۔

کمیٹی تمام ادب العالیہ کے دلدادگان سے پرزور اپیل کرتی ہے کہ وہ غالب کی سو سالہ برسی کی تقریبات کی کامیابی اور اسے اس کے شایان شان منانے میں ہماری مدد کریں اور غالب میموریل کی تعمیر کے کام میں اپنا پورا تعاون دیں، تاکہ یہ تحقیق و تصنیف کا مرکز بن سکے، جہاں اصحاب قلم غالب کی زندگی اور اس کے فکر و فن کے جائزے اور اس کے حقیقی مقام کے تعین سے متعلق کام کر سکیں۔

عطیات بھیجنے کا پتہ:۔ خازن، آل انڈیا غالب سنٹنری کمیٹی ۹ ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی-۱

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رنگ زار

مرتبہ: ریحانی، ریورنڈ ہنین

ملنے کا پتہ: ادارہ زندگی کا نور۔ پوسٹ بکس ۱۵۹ عابد روڈ حیدرآباد اے۔پی۔ صفحات: ۱۰۰

ظفرنامہ

مصنفہ: سردار گوردیا سنگھ بھولا

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی

صفحات:۔ ۱۱۲، قیمت:۔ تین روپے

نوائے ازل:۔

مرتبہ:۔ ریحانی، ریورنڈ ہنین

ملنے کا پتہ: مسیحی ادارہ زندگی کا نور پوسٹ بکس ۱۵۹ حیدرآباد (اے۔پی)

صفحات:۔ ۴۰، قیمت:۔ پچاس پیسے

ادب اور تنقید

مصنف:۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ناشر:۔ سنگم پبلشرز ۲ بنواگماٹ روڈ۔ الہ آباد ۳

صفحات:۔ ۲۴۴، قیمت:۔ آٹھ روپے

مراسلات

فارسی میں ڈی لٹ

تہران یونی ورسٹی ایران میں غیر ملکی طلبہ کو ایک کورس پڑھایا جاتا ہے جس میں داخلے کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

و۔ یہ کورس صرف غیر ملکی طلبہ کے لئے ہوگا۔

ب۔ ہر غیر ملکی خواہ وہ فارسی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اس کورس میں داخلہ لے سکتا ہے۔

ج۔ پہلے سال میں اوستا کی زبان اور پہلوی پڑھائی جائے گی اور دوسرے سال میں فارسی ادب کی تاریخ پڑھائی جائے گی اور طلبہ کو ایک مقالہ لکھنا پڑے گا۔

د۔ ایک سال پڑھنے والوں کو سرٹیفکٹ دیا جائے گا اور دو سال پڑھنے والوں کو "دکتر" ادبیات فارسی (خارجی) کی سند دی جائے گی۔

جیسا کہ داخلے کی شرائط اور کورس اور سند کے الفاظ سے ظاہر ہے یہ کوئی تحقیقی ڈگری نہیں۔ دوسرے سال کی مقالے کی نوعیت اس مقالے کی سی ہے جو ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کے ایک یا دو پرچوں کے بجائے لکھا جاتا ہے لیکن ایران سے دو سال کا کورس کر کے آنے والے کچھ اساتذہ اسے ڈی لٹ (یعنی تحقیق کی اعلیٰ ترین ڈگری) بتاتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی پہلی تحقیقی ڈگری یعنی پی۔ایچ۔ڈی کے برابر بھی نہیں۔ کیا کوئی "دانائے راز" اس پر مزید روشنی ڈال سکتا ہے۔

(ڈاکٹر شاہپور پارکھر ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ بمبئی)

استفسار

قارئین ہماری زبان سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب ہماری زبان کے ذریعہ دیں۔

(۱) "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" اس محاورہ کا صحیح محل استعمال کیا ہے؟

(۲) "درانا" اور "درانہ" میں سے کون سا صحیح ہے؟

(۳) کیا کسی محاورہ کو عبارت کے سیاق و سباق پر نہیں پرکھا جا سکتا؟

(۴) "در اندن" کیا فارسی زبان کا کوئی مصدر ہے اور کس لغت میں درج ہے؟

(۵) "اگر کار دش می زدند" کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟

(۶) اردو فارسی کی مستند ڈکشنریاں کون کون سی ہیں؟

(مرتضیٰ علی)

کوکن والوں کے نام

(ایک اپیل)

ہم اردو کے پرستار ہیں۔ ہم اردو پر ناز کرتے ہیں۔ ہم اپنی اس پیاری زبان کی ہمیشہ خدمت کرتے آئے ہیں۔ ہماری سرزمین نے اس زبان کے بے شمار شاعر، ادیب، صحافی اور اساتذہ پیدا کئے ہیں۔ ہم نے اپنے خطے میں اردو کے متعدد تعلیمی ادارے کھولے ہیں اور انھیں کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ ہم اردو لکھتے ہیں، اردو پڑھتے ہیں، اردو بولتے ہیں، اردو سے ہمارا یہ تعلق ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہماری ذرا سی غفلت اور کوتاہی سے ہماری اس اردو پرستی پر حرف آسکتا ہے۔ ہم میں سے تقریباً ہر فرد جانتا ہے کہ دلی میں "اردو گھر" بن رہا ہے جس کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے اور جس کی تعمیر کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اگر ہم ایمانداری کے ساتھ اپنا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس "اردو گھر" کے سلسلے میں اپنے فرض کو کہاں تک سمجھا اور پورا کیا ہے۔ اگر ہم نے اب تک اپنی عظیم زبان کے نام پر بننے والی عمارت کے لئے ایک اینٹ کی قیمت بھی نہیں بھیجی ہے تو یہ ہماری کوتاہی ہے۔

بہرحال اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کرنے کے لئے آگے بڑھیں تاکہ بعد میں ہمیں اپنے آپ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے "اردو گھر" کو ہماری کسی ایسی قربانی کی ضرورت نہیں ہے جو ہمیں بار محسوس ہو ہم میں سے ہر فرد کا صرف ایک روپیہ بھی ہمیں "اردو گھر" کے معماروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ آیئے ہم اسی وقت اپنا فرض پورا کردیں۔ ہم "اردو گھر" کے لئے اپنا چندہ اور اپنا عطیہ انفرادی یا اجتماعی طور پر منی آرڈر کے ذریعہ براہ راست جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ (یو۔پی) کے نام بھیج سکتے ہیں۔

میری دلی تمنا ہے کہ "اردو گھر" کی سب سے زیادہ اینٹوں پر ہمارے کوکن والوں کے نام لکھے جائیں کیا آپ یہ نہیں چاہتے؟

بدیع الزماں خاور

ردو اور علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد بڑھ گئی

دہلی: ہندی کا دائرہ اثر کم ہو رہا ہے یہ اطلاع دہلی میں
قتصادی ترقی کے ادارہ کے پروفیسر اشیش بوس نے دی مردم
ماری کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے
پچھلے دنوں ایک سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ
۱۹۰ء میں مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والوں کی
ریڑ تیس فیصدی تھی ۱۹۶۱ء میں یہ تعداد کم ہو کر ۵ء۲۰ فیصدی
ہ گئی۔ بہار جو کہ ٹیکنیکل اعتبار سے ہندی کہلاتا ہے سب سے بڑا
ہتا ہوا یہاں دس سال کے عرصہ میں ہندی بولنے والوں کی
داد ۸۱ فیصدی سے گھٹ کر ۴ء۴۴ فیصدی رہ گئی۔ یہ بات
ی اہم ہے کہ اتر پردیش کے شہری علاقوں میں ۱۹۵۱ء میں
است لاکھ سے زائد افراد نے اپنی مادری زبان ہندوستانی
ائی۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں کسی ایک نے بھی اپنی زبان ہندوستانی نہیں لکھوائی
ریاست میں اس سال کے عرصہ میں ہندی بولنے والوں کی تعداد
ں ۳ء۲ فی صدی اضافہ ہوا ہے لیکن اردو بولنے والوں کی تعداد میں
۸ فیصدی اضافہ ہوا۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد میں کمی کی ایک
ی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۱ء میں زبان کے معاملے میں رجحان کرتا ہیں کا تھا۔
س کی مثال بہار میں سب سے اچھی ملتی ہے کہ جہاں ۱۹۵۱ء میں بھوج
ری بولنے والوں کی تعداد محض ۲ء۹ تھی لیکن ۱۹۶۱ء میں
تعداد بڑھ کر ۸۴۲۲۲ء۷ ہو گئی۔ اسی طرح کا اضافہ مگدھی
ر میتھلی زبانوں کے معاملہ میں ہوا۔ پروفیسر بوس نے لکھا ہے کہ ہندی
بان کو سب سے بڑا خطرہ مقامی بولیوں سے ہے انھوں نے لکھا
ہ کہ ۱۹۶۱ء میں جو رجحان رہا اگر وہ جاری رہا تو مستقبل میں
ہندی کے امکانات محدود ہو جائیں گے۔ (الجمعیۃ)

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا اجتماع

حیدرآباد: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی ضلاعی شاخوں کے صدور
معتمدین اور دوسرے کارکنوں و ہمدردان اردو کا سالانہ اجتماع
اس سال ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۶۸ء کو حیدرآباد میں بلایا گیا ہے
پہلے روز یعنی ۲۸ دسمبر کو انجمن کی شاخوں کے صدور، نائب صدور
اور معتمدین کا خصوصی اجلاس ہوگا جس میں زیادہ تر انجمن کے تنظیمی
مسائل پر غور کیا جائے گا اور دوسرے دن یعنی ۲۹ دسمبر کے اجلاس
میں شاخوں کے عہدہ داروں کے علاوہ شہر حیدرآباد اور
اضلاع سے آنے والے ہمدردان و کارکنان اردو بھی شرکت
کریں گے اور آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل پر سوچ بچار
کیا جائے گا۔ یہ اجتماع خاص اہمیت کا حامل ہوگا کیونکہ ایک
تو حکومت آندھرا پردیش نے اگلے تعلیمی سال سے کالجوں میں
انگریزی کی جگہ تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس سے اردو
بولنے والے طلبہ کا متاثر ہونا لازمی ہے دوسرے یہ کہ آندھرا پردیش
اسمبلی نے سہ لسانی فارمولا کے بارے میں جو قرارداد منظور کی ہے
اس کی وجہ سے اردو بولنے والے طلبہ پر چار زبانوں کا بوجھ پڑ
جاتا ہے یا پھر تلگو زبان سیکھنے سے محروم ہو جاتے ہیں جو ان کے لئے
سراسر نامناسب بلکہ ضرر رساں ہے تیسرے اردو کے بارے میں
حکومت کی معلنہ پالیسی پر عمل نہ ہونے کے باعث کئی اور مسائل جوں
کے توں قائم ہیں مثلاً اردو جماعتوں کا قیام، اساتذہ کی فراہمی نصابی
کتب کی تیاری اور دستیابی نیز ضلع پریشد اور پنچائت سمیتوں کے
تحت چلنے والے مدارس میں اردو کی متوازی جماعتوں کے لئے

جگہ کی فراہمی اور عطیہ کا لزوم، نظم ونسق کے مختلف شعبوں اور عدالتوں میں اردو کی حیثیت کا تعین وغیرہ۔ انجمن ترقی اردو نے ان تمام مسائل کے متعلق حکومت کی پالیسی کی وضاحت چاہی تھی اور اس تعلق سے ایک یادداشت بھی چیف منسٹر کو پیش کی گئی تھی چیف منسٹر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انجمن کے مشورے سے اس بارے میں مناسب اقدام کریں گے تاکہ اردو کو اس کا جائز مقام مل سکے لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور حکومت باوجود یاددہانیوں کے خاموش ہے اس اجتماع میں ان تمام مسائل پر غور کیا جاکر مناسب لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا تاکہ اس کی روشنی میں کوئی موثر قدم اٹھایا جاسکے۔ میں انجمن کی شاخوں کے عہدے داروں اور اردو کے دوسرے ہمدردوں اور کارکنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اجتماع میں شریک ہوکر ہماری ہمت بڑھائیں اور اردو کی بقا وتحفظ کے لئے جو جدوجہد جاری ہے اسے تقویت پہنچائیں۔

(سرنیو اس لاہوٹی)

بلکہ اپنے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے ریلوے کے ریاستی وزیر جناب پریمل گھوش سے اس بارے میں باتیں کی ہیں اور مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اصولی طور سے انھوں نے اردو کے مطالبے کو مان لیا ہے۔ صدر انجمن جناب سید بدر الدجیٰ صاحب ایم۔ پی نے بھی اس سلسلے میں وزیر ریلوے سے گفتگو کی ہے اور ان سے بھی وزیر موصوف نے ہمدردانہ کارروائی کا وعدہ کیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہے انجمن اس سلسلے میں کوشش کر رہی ہے اور آئندہ بھی کوشش کرتی رہے گی لیکن ضرورت اس کی ہے کہ اردو کے دوسرے ادارے بھی اپنے طور پر دباؤ ڈالیں کیونکہ جمہوری حکومت میں عوام کی آواز میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ انجمن نے اپنی شاخ آسنسول کو یہ ہدایت بھی کردی ہے کہ نئے سال میں مزید داخلے کے لئے اسکول میں درخواستیں دی جائیں اور موجودہ طلبہ کو ٹرانسفر سرٹیفکٹ لینے نہ دیا جائے تمام اردو دوستوں کو اس جانب توجہ دینی چاہئے۔

انجمن ترقی اردو بنگال کا میمورنڈم

کلکتہ ۱۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ ایسٹرن ریلوے ہائر سکنڈری ملٹی پرپز اسکول آسنسول سے اردو کو ختم کرنے کے لئے جو منظم کوششیں ہو رہی ہیں انجمن ترقی اردو ہند مغربی بنگال روز اول ہی سے اس کا جائزہ لے رہی ہے اور مسلسل اس کے خلاف آواز بلند کر رہی ہے۔ ریلوے حکام کی طرف سے جب مذکورہ بالا اسکول کے پرنسپل کے پاس اسکول سے اردو کے اخراج کا باضابطہ حکم نامہ آگیا اور انجمن کو اس کی اطلاع موصول ہوئی تو فوراً ایسٹرن ریلوے کے چیف پرسنل آفیسر کو ایک میمورنڈم بھیجا گیا کہ اس اسکول میں مدت دراز سے اردو کی تعلیم تھی اس کو ختم کرنا نہ صرف عوام کے جمہوری حقوق کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے بلکہ قومی یکجہتی اور بنگلہ اور اردو کی دیرینہ وابستگی کے لئے نقصان کا باعث بھی ہے۔ اس کی نقلیں وزیر اعظم ہند، وزیر ریلوے گورنر مغربی بنگال، چیرمین ریلوے بورڈ، جنرل منیجر ایسٹرن ریلوے، جناب ہمایوں کبیر ایم۔ پی، شری اشوک سین ایم۔ پی، جناب ہیرن مکھرجی ایم پی، جناب اندرجیت گپتا ایم۔ پی اور جناب سید بدر الدجیٰ ایم۔ پی کو بھی بھیجی گئیں پرسنل آفیسر سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ انجمن کے ایک وفد کو ملاقات کا موقع دیا جائے تاکہ ساری باتیں تفصیل سے پیش کی جاسکیں چیف پرسنل آفیسر کا جواب آگیا ہے انھوں نے اس مسئلہ پر مناسب توجہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمایوں کبیر صاحب ایم پی

میدک ضلع پریشد کی اردو دشمنی

جوگی پیٹھ۔ ضلع پریشد ضلع میدک حکومت کی اردو پالیسی کے خلاف کام کر رہا ہے۔ جوگی پیٹھ میں اردو جماعتوں کو نقصان پہنچانے کے لئے ضلع پریشد کی طرف سے اردو داں مدرسین کا تبادلہ کر کے تلگو داں ٹیچر کو بھیجا جارہا ہے۔ اس خصوص میں جناب محمد سردار جمیل معتمد انجمن ترقی اردو شاخ جوگی پیٹھ نے ناظم ونائب ناظم تعلیمات ضلع میدک، معتمد ضلع پریشد اور ضلع کلکٹر کو یادداشت روانہ کرتے ہوئے ضلع پریشد کی تنگ نظری کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ فوراً اس بدنظمی کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں یا حکومت انتظامات خود اپنے ہاتھ میں لے لے طلبہ اور اولیائے طلبہ میں ضلع پریشد کے ان کاموں کی بناء پر تشویش پھیلی ہوئی ہے۔

(رہنمائے دکن)

ڈاکٹر وارث کرمانی

رفتار

نوٹ:۔ پہلی قسط کے لئے ہماری زبان ۲۲ر نومبر میں رفتار کا کالم دیکھئے۔

(۲)

جدید شاعری کے خلاف جو تعصب پیدا ہو گیا ہے اس کی ذمہ داری کسی حد تک اس نسل کے غیر معیاری (؟) رسالے موادر ہے اور اگرچہ اس کے معترضین بنیادی نظریات میں صحیح نہیں ہیں پھر بھی جزوی اور خارجی سطح پر ان کے اعتراضات بالکل حق بجانب ہوتے ہیں جس کی مدافعت اگر کسی خاص ادبی گروہ میں تو اتفاق ہو سکتا ہے لیکن عام پڑھے لکھے لوگ اس مدافعت کو قبول نہیں کر پاتے۔ بدہیئت کثیف اور بھونڈے قسم کے اشعار کی کتنی ہی مدافعت اور وکالت کیوں نہ کی جائے انھیں اچھے ادب میں جگہ نہیں مل سکتی بلکہ اس سے کم سن لکھنے والوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ چونکہ ان میں معیاری اور کلاسیکی ادب کے مطالعہ کی کمی ہوتی ہے اور وہ شاعری کے عظیم اور لازوال عناصر سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے رسالوں میں چھپنے والے ادب کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں اور ہرزہ سرائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عنفوان شباب یا یوں بھی یہ تھوڑی بہت اپج ہوتی ہے جس کے اثر سے شعروں میں ایک بانکپن پیدا ہو جاتی ہے اس کے زعم میں آکر یہ نوآموز شاعر مستند استادوں اور نقادوں پر پھبتیاں کسے لگتے ہیں۔ ایسے اشعار پر اعتراض کسی بھی حلقہ سے ہو قابل تسلیم ہے اس سے جدید شاعری کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں اس لئے کہ ہر زمانے میں اچھے شاعر کم ہوا کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ اپنی زندگی میں مر جانے والے شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جدید رجحان میں بھی باقی رہنے والے شاعر صرف دس بیس فیصدی ہوں گے باقی خس و خاشاک کی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان کی صفائی ہو جائے تو اس پر ماتم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک تشویش ناک گتھی یہ ہے کہ جدید طرز کے اچھے لکھنے والوں کے یہاں اعلیٰ درجے کی نظموں اور غزلوں کے دوش بدوش نہایت اسفل و مہمل چیزیں نظر آتی ہیں مثال کے لئے ظفر اقبال کی غزلیں دیکھی جا سکتی ہیں جو ماہ نومبر کے شبخون میں آئی ہیں کچھ شعر نمونے کے طور پر یہاں دئے جاتے ہیں ؂

رنگت ہی بدل گئی بدن کی
جب سانپ نے پہلی بار ڈستا

چکی رہتی ہے چھیڑئیے تو
آتی نہیں اس کو غصہ غصہ

ڈھیلے ہیں پڑے ہوئے میاں تو
بیگم کا ابھی دہی ہے کھٹا

پانی اتنا ملا کے اس نے
لسی کا بنا دیا ہے لتا

شعر کے نام سے یہ ہذیان جس شخص کے قلم سے برآمد ہوا ہے اسی نے اردو غزل کو ایسے درخشاں اشعار بھی دئے ہیں۔

سحر ہوئی تو بہت دور تک دکھائی دیا
غروب ہوتی ہوئی رات کا کنارہ مجھے

یہ سفر وہ ہے کہ اتنا بھی غنیمت ہے اگر
اپنے ہمراہ یہی خاک رواں رہ جائے

آجکل اس کی طرح ہم بھی ہیں خالی خالی
ایک دو دن اسے کہیو کہ یہاں رہ جائے

یہ بھی اک مرحلہ سخت ہے اے صاحب طرز
کہ بیاں کی جگہ انداز بیاں رہ جائے

ابھی تو جانے کہاں ہے کہ ٹوٹتا ہے بدن
خمار آمد گل کی خبر میں آتا ہے

میں اس کا چور ہوں اور اس سے چھپتا پھرتا ہوں
خبر نہ تھی کہ مزا اس کے ڈر میں آتا ہے

ظفر اقبال جہاں گہرے سوچ سے چونک کر RELAXATION کے موڈ میں شعر کہتے ہیں ان میں بھی تراشیدہ ہیرے کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے۔

بے سمت کی اڑان ہے شوخی شباب کی
اس چھت پہ آج تو یہ کبوتر اتار دے

میں اتنا بد معاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ سوئٹر اتار دے

دن رات یوں نہ خوف کا گٹھڑ اٹھائے پھر
یہ بوجھ اپنے سر سے جھٹک کر اتار دے

شاید اسی کی آب سے روشن ہو رنگ دل
یہ تیغ میرے سینے کے اندر اتار دے

یہ بات ظرف کی نہیں ہے اور اسے ظرف
چاہے تو اس کنوئیں میں سمندر اتار دے

لوگوں کے ساتھ میری لڑائی ہے آجکل
بہتر ہے مجھ کو شہر کے باہر اتار دے

تو خود تو سات پردوں میں مستور ہے ظفر
ملبوس تیرے آگے وہ کیونکر اتار دے

ہمیں معلوم ہے بعض ثقہ حضرات کو یہ غزل پسند نہ آئے گی خاص طور سے سوئٹر اور ملبوس اتارنے والی بات پر تو وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے لیکن ہم ان کے اطمینان قلب کے لئے مصلح اعظم حضرت سعدی کے یہ مماثل اشعار درج کئے دے رہے ہیں۔

بیار خلاف وعدہ کردی
آخر بغلط بگو وفا کن

برخیز و در سرائے بربند
بنشیں و قبائے بستہ واکن

اس غزل کی دوسری ناگوار ہونے والی بات "اس کا طرز بیان ہے جو شعریت اور کلاسیکیت کو اپنے سر سے جھٹک کر" اتارنا چاہتا ہے اور عظیم موضوعات کی نفی کرتا ہوا بے تکلف گفتگو کا رنگ قائم کرتا ہے یہ تجربہ خطرناک ضرور ہوتا ہے کیونکہ اس میں اشعار کے بے کیف اور کرکرے ہو جانے کا احتمال رہتا ہے لیکن ظفر اقبال نے اپنی ذہانت سے اس تجربہ میں بھی چمک پیدا کر دی ہے بلکہ شروع کے دو شعروں کے بعد اس ہلکے پھلکے بے تکلف طرز بیان میں بصیرت کی ایک مدھم روشنی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ غزل میں اس بے تغزلی کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ نیا شاعر بعض اوقات صدیوں کے طویل شعری ضبط و نظم کو عمداً بلکہ انتقاماً توڑنا چاہتا ہے اس لئے اس کا الٹا رخ اختیار کرتا ہے۔ آخر غالب نے بھی تو کہا تھا۔

سخن کوتہ مرا خود دل بہ تقوی مائل است اما
زننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا

بعض اوقات غم و غصہ کی کیفیت یا احساس کی شدت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ شاعر کی کوشش کے باوجود ضبط و نظم میں نہیں آ پاتی اور فن کا خوشگوار توازن جاتا رہتا ہے جو کلاسیکی ادب کے ساختہ پرداختہ کانوں پر بار ہوتا ہے۔ یہاں پھر جدید رجحان پر اعتراض کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جدید شاعری کی جھنجھلاہٹ یا کلبیت پچھلی شاعری کا رد عمل ہے۔ تخلیقی عمل اور رد عمل میں فرق ہوتا ہے۔ اول الذکر کے برعکس رد عمل میں شور و احتجاج و انتشار کی کیفیت لازمی ہے جس

طرح ردِ عمل کا شکستگی میں بتدریج بدل جانا لازمی ہے اسی طرح یہ ہیجان و اضطراب بھی آہستہ آہستہ گہرے اور سنجیدہ تاثرات میں تحلیل ہو جائے گا اور نئی شاعری بھی ہماری روایت کا ایک حصہ بن جائے گی۔ ابھی یہ شاعری اگر روایت سے منحرف معلوم ہوتی ہے تو یہ تازگیٔ فکر اور اجتہاد کی علامت ہے اسی لئے ہم اسے ماضی کی بازیافت کے مترادف تو کہہ سکتے ہیں ماضی کی طرف بازگشت نہیں کہہ سکتے۔ ماضی یعنی اٹھارھویں صدی کے شاعروں سے گہری وابستگی کے باوجود موجودہ رجحان کیوں جدید یا جدید تر کہلانے کا مستحق ہے اس کا جواز نئی شاعری کی صرف ایک صنف غزل کو سامنے رکھنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اردو غزل اپنے آغاز سے بیسویں صدی کے نصف تک معمولی رد و بدل کے علاوہ کسی خاص تغیر کی حامل نہیں معلوم ہوتی۔ فکری اعتبار سے غالب کی غزل ذرا بدلی ہوئی ضرور ہے لیکن جو لوگ مغل دور کی فارسی شاعری سے واقف ہیں انہیں اس تبدیلی کا بھی زیادہ احساس نہیں ہوتا کیونکہ غالب کی غزل کا اصل سرچشمہ وہی ہے۔ اسی کے تعلق کی بنا پر اردو کے مقبول عام طرز میں غزل کہنے والوں پر وہ اپنی برتری جتایا کرتے تھے۔ اگرچہ غالب کے معاصروں نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا بلکہ آج بھی بہت سے معتبر ادیب اور نقاد جیسے نیاز فتحپوری اور اثر لکھنوی (مرحومین) مومن اور میر کو غزل کا صحیح نمائندہ سمجھتے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ غالب عام شاعروں کے صراطِ مستقیم سے بار بار ہٹ جاتے تھے اور غزل کے ساتھ بیجا دست اندازی یا AD-VENTURE کرتے تھے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب کو جو عظمت و فوقیت آج ملی ہے وہ اسی بے راہ روی کی وجہ سے ہے۔ تاہم غالب بھی غزل کے مزاج میں بنیادی تغیر نہ پیدا کر سکے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی قوت سے الفاظ اور پیرایۂ بیاں کو توڑا مروڑا تو بہت لیکن روایتی ڈکشن کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکے۔ شاعری میں اساسی تغیر کے لئے طرزِ فکر کے ساتھ وسائلِ اظہار یعنی استعارات اور علایم و رموز میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو غالب کے عہد میں ممکن نہ تھی۔ اس میں غالب کا کوئی قصور نہیں۔ غالب کے بعد آنے والے غزل گو اجتہادی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے پرانی روش پر چلتے رہے۔ چند سال پہلے حسرت، فانی اور ان کے بعض ہمعصروں نے غزل کے سرمائے میں اچھا اضافہ کیا لیکن یہ لوگ بھی غزل کو نیا موڑ نہ دے سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متاخرین کے اس آخری گروہ کی غزل بھی متقدمین کے پہلے گروہ کی غزل سے بنیادی طور سے مختلف نہیں۔ اس سے فراق مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے یہاں جدید غزل کی واضح پیش گوئی ملتی ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم آج کی غزل کو دیکھتے ہیں تو اس کی ماہیت یکسر بدلی نظر آتی ہے اور اس کے طرزِ احساس اور اندازِ بیان دونوں میں ایسا ذائقہ ملتا ہے جو دو ڈھائی سو برس کی غزل کی تاریخ میں کہیں موجود نہیں۔ قارئین اس کی تصدیق نیچے دئے ہوئے شعروں سے کر سکتے ہیں جو سرسری طور سے چن لئے گئے ہیں اور بہت سے اچھے شاعر اس انتخاب میں [illegible]

فراق

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

احمد ندیم قاسمی

ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا | ابھی ابھی تو ہم ایک دوسرے سے بچھڑے تھے
شب خموش کو تنہائی نے زباں دے دی | پہاڑ گونجتے تھے دشت سنسناتے تھے

ناصر کاظمی

کون اس راہ سے گزرتا ہے | دل یوں ہی انتظار کرتا ہے
دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے | دل تجھے دیکھ دیکھ ڈرتا ہے
دھیاں کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر | کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اداس ہے ناصر | شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

احمد فراز

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں | جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی | یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

شہزاد احمد

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا | میں نے پوچھا کون ہے اس نے کہا کوئی نہیں

شاذ تمکنت

ریزہ ریزہ ہوا جاتا ہے مرا سنگِ وجود | یوں صدا دے پسِ پردۂ انفاس مجھے

حامد عزیز مدنی

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لو اٹھی | روح تغیرِ حال آگ سے والہ دے گئی
نالۂ آہوئے تتار زخم سود کا شکار | دشت میں زندگی کی راہ کیسی نشاں دے گئی

منیر نیازی

وہ چمک برق کا دشت در و دیوار پہ | سارے منظر ایک پل اس کے اجالوں میں رہے

شکیب جلالی

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو | وہ دور ایک جزیرہ دکھائی دیتا ہے
وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے | کس گھڑی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار گرے

اس بدلے ہوئے لب و لہجہ کے علاوہ جدید غزل کی ایک دوسری خصوصیت اس کا پھیلاؤ ہے جس کے اندر مابعد الطبعیاتی تصورات اور لطیف و مبہم واردات سے لے کر بالکل واقعاتی اور بظاہر غیر شاعرانہ مضامین آپس میں متصادم ہو کر ایک دوسرے کی نمائش اور اثر انگیزی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اس کی تیسری خصوصیت انسان کی باطنی حیات سے مخاطبت ہے اس تخاطب میں کوئی ایسی آواز بھی پوشیدہ ہے جو مادی حقایق اور ان کے ریاضیاتی نظام کے اس پار سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس کی آہٹ لینے کی کوشش کبھی کبھی غالب بھی کرتے تھے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب | ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ غزل انسان کے بنائے ہوئے تمام فلسفوں کی خوش فہمیوں سے آگے نکل کر ایک بے کراں اور مطلق خلا سے [illegible] انسان کو دوچار [illegible]

[illegible] میں چھپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

19 DEC 1968

R.No. 2186/57

REGD. N-L 9

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ ہائے اشاعت

۱ - ۸ - ۱۵ - ۲۲

فون نمبر ۲۹...

قیمت ۵ روپے

فی کاپی ۱۵ پیسے

۲۷، شمارہ ۴۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ / دسمبر ۱۹۶۸ء

یہ

انسانی حقوق کا احترام

س دسمبر ۱۹۴۸ء کو انجمن اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے
یک چارٹر منظور کیا۔ گویا اسے منظور ہوئے بیس سال ہو چکے
س چارٹر میں انسان کے بنیادی حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے
ح طور پر کہا گیا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کا حق سبھی کو ہے
ا کے لئے سبھی کو برابر کے مواقع ملنے چاہئیں اسی طرح یہ
گیا تھا کہ ایک سے کام کے لئے ایک سی تنخواہ ہونی چاہئے
کے لئے اپنی مرضی سے اپنا رفیق حیات طے کرنے کا اختیار
لیا گیا تھا۔ ابتدائی منزل پر مفت اور جبری تعلیم اسکی بحث
رگی، سائنسی ترقیوں کے نتائج میں شرکت، معلومات اور
بغیر جبر و احتساب کے فراہم کرنے اور حاصل کرنے کا
م کے امتیاز کو ختم کرنے اور جنس نسل، رنگ، زبان
، سماجی معیار یا قومی معیار پر کسی کے ساتھ برتاؤ میں فرق
کی ضرورت، تہذیبی سرمائے سے سب کے مستفید ہونے
یت، بالغوں کو جو اب تک کسی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ گئے
ر دینے کے فوائد ان سب باتوں کے متعلق کھلے الفاظ میں
ن کو توجہ دلائی گئی تھی۔ سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ اگر کسی
انسانی حقوق پر حملہ ہوتا ہے تو سب کے انسانی حقوق کو
ا ہو جاتا ہے۔

وال یہ ہے کہ جب قریب قریب ساری ریاستیں اور حکومتیں
ر کو منظور کر چکی ہیں تو اب تک اس کی دفعات پر ہر ملک میں
ح عمل کیوں نہیں کیا گیا۔ ہمارے دستور میں اس چارٹر کی
بدھے اور ہم برابر یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہم ان ساری
دفعات پر عمل کریں گے۔ مگر ہمارے عمل کی رفتار بہت سست ہے
ابھی تک ہمارے یہاں، مذہب، زبان، سماجی معیار یا جنس کی
وجہ سے امتیاز ختم نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک اپنے تہذیبی سرمائے کو
ترقی دینے میں اقلیتوں کو دشواریاں محسوس ہوتی ہیں ابھی تک بعض
زبانوں کی ترقی میں رکاوٹیں ہیں، ابھی تک ہمارے یہاں مفت اور
جبری ابتدائی تعلیم، ان تمام بچوں کو نہیں دی جاتی جن کا یہ بنیادی
حق ہے ابھی تک بالغوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ اس
لئے سب سے پہلے ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنے ملک میں ہر قسم کا امتیاز
ختم کریں، ہر زبان کو ترقی کا موقع دیں، نہ کسی کو خوف ہو نہ محتاجی
اور ہر شخص سماجی زندگی میں اپنا حق حاصل کر سکے۔ خیر گھر سے شروع
ہونا چاہئے۔ جب ہم اپنے ملک میں انسانی حقوق کا احترام پوری
طرح کر سکیں گے اس وقت ہمیں حق ہوگا کہ دوسرے ملکوں سے
بھی کچھ کہہ سکیں۔

بنیادی انسانی حقوق کا احترام نہ صرف ہمارے دستور
کے مطابق ہے یہ انسانیت اور تہذیب کا بھی تقاضہ ہے۔ اس
معاملے میں ذرا سا تساہل بھی خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ
احترام کرنا حکومتوں کا ہی کام نہیں، افراد کو بھی اپنے طرز عمل
میں اسے اپنانا چاہئے۔ آج دنیا کی بیشتر مشکلات اس وجہ
سے ہیں کہ لوگ اپنے مفاد کے نشے میں انسانیت کا احترام بھول
گئے ہیں یہ سبق یاد رہے تو ہم دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں اندیشہ ہے
کہ مفاد پرستی، تنگ نظری، تعصب، تشدد، ہلاکت کے نئے نئے
طریقے اسے جہنم نہ بنا دیں۔

اقوام متحدہ میں غالب صدی تقریبات منانے کا فیصلہ

لکھنؤ۔ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب کے کے شاہ
نے یہاں کہا کہ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی عظمت اقوام متحدہ

کے عالمی ادارے نے بھی تسلیم کر لی ہے۔ جشن غالب کا افتتاح کرتے ہوئے جناب کے کے شاہ نے کہا کہ اقوام متحدہ نے بھی غالب صدی تقریب منانے کا فیصلہ کیا ہے اس تقریب میں اقوام متحدہ کے سارے ملک حصہ لیں گے جشن غالب کا اہتمام" ادارہ فروغ اردو (ہند) نے یہاں کیا تھا۔ (ریاست)

غالب کے اشعار پر مبنی کلینڈر زیر اشاعت

لکھنؤ:۔ دلی کی ایک کلینڈر ساز کمپنی نے اس سال ایک غالب کلینڈر تیار کیا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ۶ اشعار کی بنیاد پر بنائی جانے والی تصویروں پر مشتمل ہے۔ غالب کے ان ۶ اشعار کی تصاویر بمبئی کے ایک ممتاز مصور جناب رام کمار نے بنائی ہیں جو اگرچہ عبد الرحمان چغتائی کی بنائی ہوئی تصویروں کے اسلوب سے مختلف ہیں لیکن ان پر مغل اثرات ظاہر ہیں۔ (قومی آواز)

الہ آباد میں مرزا غالب مارگ

الہ آباد:۔ مرزا غالب کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں الہ آباد میں ایک سڑک کا نام مرزا غالب مارگ رکھا گیا ہے۔ الہ آباد میں ایک کل ہند مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا جا رہا ہے۔ (ناظم)

عادل منصوری کی گجراتی کتاب پر انعام

احمد آباد۔ عادل منصوری کے گجراتی شعری مجموعہ "پگ رو" کو گجراتی ساہتیہ پریشد نے ۶۸-۶۷-۱۹۶۶ء کی بہترین شعری تخلیق کے ذیل میں ۵۰/- روپے کا "ترہی کانا کا لیلکر انعام" دیا ہے۔ (نامہ نگار)

سہ ماہی مجلہ صحیفہ کا غالب نمبر

مجلس ترقی ادب لاہور کا تحقیقی سہ ماہی مجلہ صحیفہ جو اب ڈاکٹر وحید قریشی اور کلب علی خاں فائق کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے عنقریب غالب نمبر پیش کرے گا اس نمبر میں پاک و ہند کے محقق اور نقاد اپنے گراں قدر مقالے پیش کر رہے ہیں۔ مزید تفصیلات مجلس ترقی ادب ۲۔ کلب روڈ لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مہر چند کوثر کا شعری مجموعہ زیر اشاعت

چنڈی گڑھ۔ اردو دوستوں کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ پنجاب کے مشہور غزل گو شاعر جناب مہر چند کوثر کا شعری مجموعہ "صبوحی" کے نام سے بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے اسے انجمن ترقی اردو (ہند) بٹالہ اور پنجاب اردو اکیڈمی چنڈی گڑھ کے زیر اہتمام شائع کیا جا رہا ہے۔ (نامہ نگار)

بچوں میں قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے کتابیں چھاپی جائیں گی

لکھنؤ:۔ نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چھاپی جائیں گی جن کا موضوع قومی یکجہتی ہوگا۔ ٹرسٹ کے سکریٹری جناب کرتار سنگھ دگل نے نمائندہ ہائمین سے اس سلسلے میں بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اس منصوبہ کا نام "نہرو لائبریری کے لئے بچوں کی کتابیں" ہے ابتدا میں اس مقصد سے ایک سو کتابیں چھاپی جائیں گی۔ اس کے بعد ان کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جائے گی۔ یہ کتابیں ساری ہندوستانی زبانوں میں چھاپی جائیں گی۔ اور ان کی قیمت یکساں ہوگی ابتدا میں ہر کتاب کی ایک لاکھ جلدیں چھاپی جائیں گی۔ (ریاست)

علی سردار جعفری کو نہرو فیلوشپ

نئی دہلی:۔ جواہر لال نہرو یادگار فنڈ کی طرف سے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر پی لال اور ممتاز اردو شاعر علی سردار جعفری کو فیلوشپ دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔

پروفیسر لال کو اپنشد کو انگریزی میں منتقل کرنے سے متعلق ان کے پروجیکٹ کے لئے اور علی سردار جعفری کو "سرمایہ سخن" کے سلسلے میں فیلوشپ دی گئی ہے۔ اس سے قبل نہرو یادگار فنڈ کی طرف سے پنڈت نہرو کی جینتی کے موقع پر گذشتہ ماہ کچھ فیلوشپ دئے جانے کا اعلان کیا جا چکا ہے۔

(قومی آواز)

مرزا عبد القادر بیدل پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری

پونہ:۔ واڈیا کالج پونہ کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر امانت صاحب کو ان کے مقالے "مرزا عبد القادر بیدل۔ ان کی حیات اور شاعری مسعود عرفان کی روشنی میں" پر پونہ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ (منظور الحسن منظور)

شورش کشمیری کی رہائی کی خبر غلط ہے

شاہدہ شورش لاہور سے اطلاع دیتی ہیں کہ ہماری زبان کی پندرہ نومبر کی اشاعت میں جناب شورش کشمیری کی رہائی کی جو خبر شائع ہوئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ بدستور جیل میں ہیں۔ سپریم کورٹ پاکستان نے صرف اس نکتے کا فیصلہ کیا ہے کہ ہائی کورٹ ان کا مقدمہ سن سکتا ہے۔

("ہماری زبان" میں شورش کشمیری کی رہائی کی خبر اخبار "روشنی" کے حوالے سے چھپی تھی۔ ادارہ)

تسکین قریشی

جگر مرادآبادی (حیات اور شاعری)

(ایک سرسری جائزہ)

ڈاکٹر محمد اسلام کا یہ طویل و عریض تحقیقی مقالہ جس پر ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے بڑے کتابی سائز میں ۴۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے کاغذ سفید معمولی، کتابت و طباعت کہیں ناقص اور کہیں کہیں بہت ناقص ہے مگر ان ظاہری خرابیوں کے باوجود کتاب کی بہت سی معنوی خوبیاں بڑی حد تک نمایاں ہیں

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں جگر مرادآبادی کے عہد اور ادبی پس منظر کو خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے ابواب میں جگر کی زندگی شخصیت اور کردار کے تمام خصوصی پہلوؤں پر بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور بقیہ صفحات میں جگر کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر محمد اسلام نے جہاں تک "ریسرچ" کا تعلق ہے، نہایت تن دہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے وہ جگر مرحوم کے مخصوص احباب و معاصرین سے خود جا کر ملے ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے بہت صعوبات سفر بھی برداشت کی ہیں اور زر کثیر صرف کیا ہے۔ وہ گونڈہ، مرادآباد، آگرہ وغیرہ کے علاوہ پاکستان بھی گئے ہر جگہ جگر صاحب کے خاص خاص احباب و معاصرین سے مل کر انھوں نے ضروری معلومات حاصل کیں اور ایک بہت بڑا ذخیرۂ معلومات فراہم کر لیا اور اس سے استفادہ کیا گیا چہ وہ زیر تنقید مقالہ لکھنے سے پہلے کئی اور کتابیں مثلاً جگر مخلصین اور معاصرین کی نظر میں، نگارشات جگر، خطوط جگر وغیرہ بھی شائع کر چکے ہیں

لیکن ریسرچ کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں کہ تمام رطب و یابس اور مستند و غیر مستند روایات کو فراہم کر کے یکجا کر دیا جائے۔

جگر صاحب اپنے دور کے بہترین غزل گو شاعر تھے، ان کی شخصیت بھی بہت دلکش تھی اور ان کو برصغیر ہند و پاکستان میں قابل رشک "قبول عام" حاصل تھا۔ مگر جہاں ان کے معاصرین میں احباب مخلصین کا دائرہ بہت وسیع تھا وہاں حاسدوں اور منافقوں کی تعداد بھی کم نہ تھی اس لئے ایسی شخصیت کے حالات قلم بند کرنے میں بہت احتیاط برتنی چاہئے تھی اور ہر قسم کی روایات قبول کرنے سے پہلے "راوی" سے جگر مرحوم کے باہمی تعلقات کی تحقیق لازمی تھی۔ اخباروں اور رسالوں کے اقتباسات نقل کرنے میں بھی یہی اصول پیش نظر رکھنا چاہئے تھا جو میرے علم میں جگر صاحب کے چند ایسے نام نہاد مخلصین ہیں جن کے متعلق ان کے خیالات اچھے نہ تھے مگر محمد اسلام صاحب نے ان میں سے بعض حضرات کی روایتوں کو "آیت و حدیث" سمجھ کر بلا تحقیق و تصدیق اپنے مقالے میں لکھ دیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب ایک "کھتونی" سی ہو گئی ہے ان کو روایت سے قطع نظر، درایت و تصحیح تحقیق و تصدیق کے معیار کو بھی ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔ اس لحاظ سے میری رائے میں مصنف کے اس مقالہ کو وہ درجۂ استناد حاصل نہیں جس کا دعویٰ انھوں نے اس کتاب کے شروع میں ظاہر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"راقم الحروف نے اپنے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ وہ غیر جانبدار رہے اور جگر کی حیات اور شاعری کے سلسلہ میں جو بات حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو اس کی تصدیق کرے ناقص یا غلط باتوں کی تردید کرے۔"

مگر وہ اپنے اس معیار پر بہت کم قائم رہ سکے ہیں۔ جگر صاحب کے اسلاف و سلسلۂ نسب وغیرہ کے بارے میں البتہ ان کی تحقیق درجۂ استناد رکھتی ہے۔ مگر اس میں بھی ایک جگہ ابہام پایا جاتا ہے انھوں نے صفحہ ۵ پر فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔

"ان کے دادا مولوی محمد سمیع فرخ سیر بادشاہ کو حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور جب وہ مرادآباد چلے آئے تو یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے بعد مولوی محمد قاسم تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا۔"

مگر اس نوٹ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مولوی محمد قاسم کون بزرگ تھے اور جگر مرحوم سے ان کا کیا رشتہ تھا۔ شجرہ نسب میں مولوی محمد سمیع سے پہلے مولوی محمد قاسم کا نام ملنا چاہئے مگر جو شجرۂ نسب صفحہ ۱۵ پر نقل کیا گیا ہے اس میں یہ نام نہیں ملتا۔ جگر صاحب کے دادا کا نام نور محمد تھا اور ان کے دادا شیخ محمد سمیع تھے۔ مگر کہیں محمد قاسم کا نام نہیں ہے۔ محمد اسلام صاحب کو اس کے متعلق ضروری تحقیق و تصحیح کرنی چاہئے تھی یا پھر خود انھوں نے یہ نام

سلام مچھلی شہری

ایک خیال (بنگلور میں)

سرنگا پٹم سے صدا آ رہی ہے
کوئی ہے، جو خاموش تربت بھی دیکھے
کوئی ہے، جو یار یہ عظمت بھی دیکھے؟

سرنگا پٹم سے صدا آ رہی ہے
گل وقت کی، کون خوشبو بنے گا
نئے دور کا کون ٹیپو بنے گا؟
جواب اس کا دیتا ہے ہر نوجواں کو
سجاتا ہے، اس "مشترک گلستاں" کو

غلط لکھ دیا ہے۔

روایات کو بلا تحقیق و تصدیق نقل کرنے کے سلسلہ میں ایک واقعہ مثالاً لکھتا ہوں جو اس کتاب کے صفحہ ۱۸۴ پر درج ہے۔

"علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں جگر بھی شریک تھے۔ مشاعرہ میں کسی لڑکے نے جگر سے متعلق ایک ہتک آمیز نظم پڑھی۔ جگر خاموشی سے اس کی نظم سنتے رہے، اس کے ختم ہونے پر انھوں نے اس کے جواب میں فی البدیہہ شعر کہہ کر پڑھ دیا۔

دیکھوں ادھر منہ موڑ نا گھگو ہے یا کٹھ پھوڑ،
ہاں دم نہ اس کی چھوڑ نا اڑ جائے گا پر دار ہے"

مگر کیا عقل سلیم اس کو تسلیم کر سکتی ہے کہ جگر جیسے ہر دلعزیز اور نغز گو شاعر کے خلاف کوئی لڑکا ہتک آمیز نظم بر سر مشاعرہ پڑھتا رہے اور حاضرین مشاعرہ چپ چاپ سنتے رہیں اور پھر ایسا رکیک و مبتذل شعر جگر جیسا پاکیزہ ذوق شاعر فی البدیہہ کہہ کر جواباً مشاعرہ میں پڑھ کر سنائے۔ ایسے شعر کو جگر سے منسوب کرنا ہی ان کی بہت بڑی توہین ہے جس کا پہلا مصرع خصوصاً لفظ "دیکھوں" نہ صرف رکیکانہ بلکہ بے محل اور بے جوڑ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد اسلام صاحب نے اس روایت کو قبول کرنے سے پہلے اس کی تصدیق و تحقیق کیوں ضروری نہیں سمجھی اور صرف ایک راوی کی روایت ہی کو کیوں قابل اعتماد سمجھا آخر اس مشاعرہ میں اور حضرات بھی تو شریک ہوئے ہوں گے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ناقابل اعتبار روایت کو کیوں اس قدر اہمیت دی گئی۔ اس قسم کی بے سروپا روایات کی کچھ اور مثالیں بھی اس کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

دوسری کوتاہی ڈاکٹر محمد اسلام سے یہ ہوئی کہ انھوں نے تحقیق حالات میں محض اپنی یادداشت یا حافظہ پر ہی اعتماد کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راوی کے اصل الفاظ و مطالب ہی بدل گئے اصولاً ان کو ہر راوی کی روایات کو قلمبند کرنے کے بعد پھر ان کی تصحیح و تصدیق کرا لینی چاہئے تھی۔ مگر انھوں نے کسی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں سمجھی چنانچہ جب ان کی کتاب "جگر مخلصین و معاصرین کی نظر میں" شائع ہوئی تو پاکستان اور کئی اور مقامات سے میرے چند مخلصین نے مجھے شکایتہً لکھا کہ اسلام صاحب نے ان کے بیان کردہ واقعات کو بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور تصرف بیجا سے کام لیا ہے۔

اس سلسلے میں کئی مہینے ہوئے محترمی حضرت میکش اکبرآبادی کا ایک مضمون "شاعر" بمبئی میں شائع ہوا تھا جس کا ضروری اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"..... ایسے اور بھی واقعات ہیں جگر صاحب کا ایک واقعہ جو میرے قلم سے "تحریک" دہلی کے جگر نمبر میں شائع ہو چکا ہے وہ بھی اس مجموعے میں بہت ہی غلط اور قبیح الفاظ کے ساتھ مجھ سے منسوب کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ جگر صاحب کسی طوائف کے کوٹھے پر جا رہے تھے۔ جگر صاحب کو میں نے کبھی کسی طوائف کے یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اسی طرح فانی اور ناسخ کا واقعہ تاج محل کا واقعہ کا واقعہ کس کس کی تردید و تصحیح کی جائے۔"

سو میرے حوالے سے بھی ڈاکٹر محمد اسلام نے اپنے اس مقالے میں کئی غلط بیانیاں کی ہیں۔ ان کو ذرا تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں

(۱) جگر صاحب سے میرے تعلقات کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی جب وہ شراب سے تائب ہو چکے تھے میں اس کا ذکر "مکاتیب جگر" کے دیباچہ میں بھی ص ۱۱ پر تصریحاً کر چکا ہوں اور میرے اور جگر صاحب کے احباب و مخلصین بھی اس بات سے خوب واقف ہیں۔ مصنف کی تحقیق کے مطابق جگر صاحب نے ۱۹۴۹ء میں شراب نوشی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دی تھی بہرحال اس کے بعد ہی میرے تعلقات جگر صاحب سے ہوئے اور مسلسل ۲-۲۲ سال ان کی وفات تک قائم رہے اس لئے میں پوری دیانت و صداقت کے ساتھ لکھتا ہوں کہ میری موجودگی میں انھوں نے کبھی شراب نہیں پی اور نہ میں نے ان کو کبھی شراب کے نشہ میں مست و سرشار دیکھا۔

اب ذرا ڈاکٹر محمد اسلام کے "تحقیقی مقالہ" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"ایک ملاقات میں تسکین قریشی صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ جگر صاحب نے شراب ترک کی اور نماز پڑھنے خشوع و خضوع کے ساتھ شروع کی جہاں جاتے جانماز ساتھ ہوتی تھی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ کراچی یا کسی اور مقام پر ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے تو واپسی میں تسکین صاحب نے ان کو دیکھا کہ جانماز وغیرہ کچھ نہیں ہے اور نماز پڑھنے کے بجائے شراب کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔" ص ۹۷

دراصل یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے جب پاکستان قائم ہونے کے بعد جگر صاحب پہلی بار کراچی گئے تھے وہاں جانے سے کچھ عرصہ پہلے ان پر دینداری کا کچھ اتنا غلبہ تھا کہ وہ "سگریٹ" تک ترک کر چکے تھے مگر جب وہ چند ماہ بعد کراچی سے واپس آئے تو ان کی وہ دینداری ختم ہو چکی تھی اور وہ اسی تسلسل و تواتر کے ساتھ سگریٹ پینے لگے تھے جس کے وہ پہلے عادی تھے۔

اب ڈاکٹر محمد اسلام کا یہ "قلمی کارنامہ" ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے سگریٹ کو شراب بنا کر مجھے جگر صاحب کی شراب نوشی کا عینی شاہد بنا دیا یہ محض غلط بیانی ہی نہیں بلکہ مجھ پر اور خود جگر صاحب پر سخت الزام اور سراسر بہتان و اختراع ہے۔ (باقی آئندہ)

ہماری زبان
کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ صاف لکھے ہوں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

رفتار

"یک طرفہ شعر کہنا شاعر کی محدود استعداد کی اور یک طرفہ تفسیر پیش کرنا تنقید نگار کی تہی مائگی اور کوتاہ بینی کی دلیل ہے"

بظاہر سیدھا سادا مگر بباطن یہ معنی خیز فقرہ اسلوب احمد انصاری کا ہے جن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب اور تنقید" کے نام سے حال ہی میں سنگم پبلشرز الٰہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اسلوب صاحب اردو ادب اور تنقید کی دنیا میں نو وارد ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے ان کا ایک طویل مقالہ اقبال کا ذہنی "ارتقاء" رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا اور سنجیدہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً ادبی مسائل پر ان کے تنقیدی مضامین موقر جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسلوب صاحب کے ان مضامین کو خواص کے حلقے میں ہمیشہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا مگر اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے "عوامی" اور "جمہوری" علاقوں میں ان کی شہرت زیادہ نہیں پہنچی کم رہی اس کا سبب غالباً ان کی علمی متانت و سنجیدگی، بے لوث دیانت داری اور وہ متوازن تنقیدی رویہ ہے جو گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ہمارے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور رہا ہے۔ اسلوب صاحب انگریزی ادبیات کے معلم ہیں اور آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ مغربی ادب سے متعلق ان کی آگاہی اور بصیرت کا اندازہ "ولیم بلیک" پر ان کی انگریزی کتاب سے کیا جا سکتا ہے جس کی تعریف انگریزی ادب کے سخت گیر نقاد ایف آر لیوس تک نے کی ہے مگر اسلوب صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مشرقی ادبیات بالخصوص فارسی اور اردو ادب سے بھی بہت گہرا شغف رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنی زبان کے ادب اور اس کے سرچشموں کے مزاج داں ہیں یہی وجہ ہے کہ مغربی ادب اور تنقید کے مطالعے کا اثر قبول کرنے میں ان کے یہاں وہ افراط و تفریط نہیں ملتی جس کی وجہ سے کلیم الدین احمد اور بعض دوسرے نقادوں کی تنقیدیں یک سرے پن کا شکار ہو گئیں۔ اسلوب صاحب نے تنقید کے مختلف مکاتیب فکر کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے حسب توفیق فائدہ بھی اٹھایا ہے مگر ان مکاتیب فکر کے منفی اثرات سے انھوں نے بڑی حد تک اجتناب برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس متوازن تنقیدی رویے میں یقیناً ان کی افتاد طبع کو ہی زیادہ دخل ہے مگر اس میں تھوڑا بہت فیضان ان کے استاد خواجہ منظور حسین کی تربیت کا بھی ہے جو اپنے مطالعے کی گہرائی، بالغ نظری اور خوش مذاقی کے لئے مشہور ہیں۔

ہمارے یہاں مغرب کے اثر سے نفسیاتی، جمالیاتی، ہیئتی، تاثراتی، تاریخی، اور تقابلی تنقید کا بھی ایک حد تک چرچا رہا۔ اس قسم کی تنقید ان اسلوب صاحب کے نزدیک ادب کی تفہیم میں تھوڑی بہت معاون ہوا کرتی ہیں لیکن محدود اور یک طرفہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات گمراہ کن بھی ثابت ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ مقبولیت پچھلے دور میں ترقی پسند تنقید کو حاصل ہوئی۔ ترقی پسند نقادوں کو دعویٰ ہے کہ ان کی تنقید سب سے زیادہ سائنٹفک ہے۔ اسلوب صاحب نے مارکس کے ادبی تصورات اور اس کی تعبیرات سے خود بھی خاصا استفادہ کیا ہے مگر جس شکل میں یہ سماجی تنقید اردو نقادوں کے یہاں رائج ہے اس سے وہ بڑی حد تک غیر مطمئن ہیں۔ اس نوع کے نقادوں کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ یہ ادب کو محض تاریخی دستاویز سمجھ کر پڑھتے ہیں اور ہر ادیب کی تخلیقات کو اس زمانے کے سماجی و سیاسی حالات کے چوکھٹے میں میکانکی طور پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب کی اپنی فنی و جمالیاتی اقدار اور اس کے معیار کو نظر انداز کرنے اور ادیب کے انفرادی نفس کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے سبب ان کی تنقیدیں محض یکطرفہ اور اوپری قسم کی تشریح بن کر رہ جاتی ہیں ایسی تحریروں کو ادبی تنقید کے بجائے سماجی تعبیر یا تشریح کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا یہ تنقید اہمی کے مسلّم ادیبوں اور شاعروں کے سلسلے میں تو نسبتاً بے ضرر ہوتی ہے کیونکہ یہ نقاد ان کے ادبی مرتبے اور حیثیت کو ایک طور پر تسلیم کر کے ان کی تخلیقات کو سماجی و سیاسی حالات سے مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہم عصر ادب کے سلسلے میں یہ اکثر اوقات گمراہ کن ہوتی ہے کیونکہ ادبی اقدار و معیار کی صحیح پرکھ اور پہچان نہ ہونے کی وجہ سے یہ نقاد ادیب اور غیر ادیب

مرزا سعید الظفر چغتائی

غزل

یادوں کے ستارے ڈوب چکے، روشن تھا ابھی تک داغ جگر
یہ چاند بھی یارب! ڈوب چلا، ہوگی کہ نہ ہوگی آج سحر؟

جس کی خاطر تنکے چنتے ملے کر ڈالے سب کو وہ دگر
اے عمر گریزاں کے طائر، اک رات نشیمن میں تو ٹھہر!

انساں کے لئے کیا کم تھے مگر ہر روز کے غم کل کی یادیں
افسوس کہ اس کی دنیا میں فکر فردا کا بھی ہے گزر!

غم میرے لئے غم تیرے لئے، افراد غمیں، اقوام حزیں
اے اپنے غم کے متوالے، انسان کے غم پر ڈال نظر

شاعر اور متشاعر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے ہیں اور اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ ہر درجے کے ادیب و شاعر کا سماجی مطالعہ ایک ہی انداز سے کرتے ہیں۔ اس قسم کی سکہ بند سماجی تنقید نے ہمارے ادب میں ناولوں اور ادنیٰ درجے کے ہنگامی اور صحافتی ادیبوں کو جو اہمیت دی اور اس کے نتیجے میں جس نوع کے سطحی ادب کو فروغ ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اسلوب صاحب اس نوع کی تنقید کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جو لوگ جھوٹی ترقی پسندی کے مدعی ہیں اور غیر ہضم شدہ خیالات کا پرچار کرنے میں ضد، تعصب اور کوتاہ بینی کو جائز سمجھتے ہیں وہ نادانستہ طور پر تنقید کی دنیا میں بھی اس مطلقیت اور ادعائیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جسے مارکس نے مذہب، اخلاق اور فلسفے کی دنیا میں بنیادی طور پر ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس ترقی پسندی کی تہہ میں دو مفروضے کارفرما ہیں۔ اوّل یہ کہ ادب اور آرٹ کی پرکھ کے لئے ایسے قواعد وضوابط اور اٹل اصول موجود ہیں جن کی مدد سے کسی ادبی کارنامے پر آخری اور قطعی حکم لگایا جا سکتا ہے دوسرے یہ کہ ترقی پسند نقاد ان اصولوں کو فنی کارنامے پر منطبق کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے جس کا ارتکاب ہم تواتر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ علمی تلاش و تحقیق کا عمل ہماری قوت ممیزہ کو تیز ضرور کر دیتا ہے مگر ہمیں وہ سرخوشی نہیں دے سکتا جو وجدانی شاعرانہ تجربہ کا نچوڑ ہے۔ خارجی حالات کا مطالعہ ناگزیر ہے مگر یہ کوئی ایسا نسخہ نہیں جس کے استعمال سے فوراً کوئی نتیجہ برآمد ہو جائے علمی تفتیش کے طریقے کو بارآور بنانے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کا اطلاق فنکار کے ادراک پر اور نقاد کے ادراک کے وسیلے سے کیا جائے"

(ص ۲۸)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"جب ہم ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی قسم کے خارجی موثرات کی پیداوار ہونے کے باوجود کیٹس، شیلے اور بائرن کی شخصیتیں اتنی مختلف، متنوع اور متضاد کیوں تھیں۔ غالب، مومن اور ذوق کی شاعری کا لہجہ معاصرین ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنا الگ اور جدا کیوں تھا؟ حسرت، فانی، اصغر اور جگر کی غزل گوئی کا رنگ ایک ہی عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ اتنا منفرد کیوں ہے؟ یہ سب بظاہر اس امر کی دلیل ہیں کہ ہم ادبی تنقید کے لئے کوئی سیدھا اور براہ راست قاعدہ مقرر نہیں کر سکتے جس کی روشنی میں ہم ہر شاعر اور ادیب پر اس کے مزاج کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر کوئی آخری حکم لگا سکیں۔ ادب اور تنقید کی تعمیر و تخلیق میں شخصی عناصر کی کارفرمائی کو سماجی قوتوں سے زیادہ دخل ہوتا ہے اسی لئے شاید کالرج نے کہا تھا کہ ہر ادیب کی جمالیات ایک مخصوص وضع کی ہوتی ہے۔"

(ص ۲۸-۲۹)

اسلوب صاحب کے تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے یہ اقتباس بھی قابل غور ہے۔

"ہم کسی فنی کارنامے کی نوعی کیفیتوں سے اس وقت تک پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک ہم اس کی تخلیق کے مادی اور خارجی اسباب کو سمجھنے کے ساتھ ہی فنکار کے شعور میں داخل ہو کر اس کے ایک ایک راز کو آشکارا کرنے کی کوشش نہ کریں اس لیے غالباً یہ کہنا قرین قیاس ہو گا کہ تخلیقی اور طبعزاد تنقید اپنے آخری تجزیے میں موضوعی (SUBJECTIVE) ہوتی ہے افلاطون نے غالباً طنز اور تحقیر کے طور پر کہا تھا کہ شاعر دیوانگی کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اگر تخلیقی قوت کو ہم ایک طرح کے جنون کا مرادف قرار دیں تو یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ کامیاب اور معیاری نقاد کو اپنی تمام فرزانگی کے باوجود اس ازلی اور عنصری دیوانگی میں تھوڑا بہت حصہ ضرور بٹانا چاہئے تاکہ وہ ادب کا صحیح نبض شناس بن سکے اور تمدنی علوم کا ماہر ہونے اور ادبی تنقید میں ان کے نتائج سے فائدہ اٹھانے کے باوجود خالص شخصی اور ایک حد تک مبہم اور پر اسرار اور ناقابل فہم عناصر کی موجودگی اور ان کے اثرات کو تسلیم کرنا چاہئے۔"

(ص ۲۹)

اسلوب صاحب کے تنقیدی مضامین میں جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تنقید کے اثر سے جس قسم کے ہنگامی اور صحافتی ادب کو ہمارے یہاں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اس کے خطرات کا انھیں پورا اندازہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب کا مقصد عمل کی طرف ترغیب دلانا یا اس پر اکسانا ہے۔ یہ قطعی صحیح نہیں۔ افادیت کا یہ مفہوم ادب کو صحافت کے قریب لے آتا ہے اور اس طرح ادب سیاسی اور مذہبی حلقوں اور گروہوں کے ہاتھ میں ایک موثر آلۂ کار بن جاتا ہے۔ مگر افادیت کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہو سکتا ہے یعنی غیر محسوس طور پر ہمارے ادراک کی تربیت اور نقطۂ نظر میں تازگی، عمومیت اور لچک پیدا کرنا

جس کے نتیجے میں ہم زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور اسے اپنے دائرہ عمل میں رہ کر بدلنے کے بھی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ ایسی نظمیں، ناول اور ڈرامے بھی موجود ہیں جن میں براہ راست عمل کے لئے آمادہ کیا گیا ہو یا مقبول اور ہنگامی موضوعات کو کام میں لاکر خیالات کو ایک خاص سمت میں موڑنے کا جتن کیا گیا ہو لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ادب دیرپا تاثیر اور دلکشی سے محروم ہوتا ہے دنیا کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو لیجئے مثلاً ہومر، سافیکلیس، شیکسپیئر، کالیداس، گوئٹے، غالب اور اقبال ان سب کے یہاں موضوعات، ادبی روایات اور زبان و بیان کے سانچے کتنے مختلف ہیں اور کتنے متضاد ذہنی اور روحانی محرکات اور سرچشموں سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کی تاثیر کا راز صرف عمل پر اکسانا یا کسی مخصوص اور محدود نظریہ یا پروگرام کے نفاذ میں ہوتا تو آج ان کے ادبی کارنامے قطعی بے جان ہوتے لیکن دراصل ان کی بقا کا راز مختلف ذہنی اور جذباتی ردعمل اور اقدار ہائے فکر کے استوار کرنے میں ہے جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہیں۔ اس بات کو ایک اور طرح بھی کہا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ ہر فنی کارنامہ تاریخی اور عصری بھی ہوتا ہے اور آفاقی بھی۔ تاریخی اس لیے کہ وہ حال کی حقیقتوں پر تعمیر کیا جاتا ہے اور آفاقی اس لئے کہ وہ ادراک کی جس طور پر تربیت اور توسیع کرتا ہے وہ لازمی طور پر تاریخی تقاضوں کا پابند نہیں ہوتا۔ تاریخ کا وہ خاص نقطہ جس پر اس کی تعمیر عمل میں لائی گئی ہے اس کے تمام امکانات اور مفاہیم کو بحد کمال استعمال کر کے ختم نہیں کر دیتا اسی لیے عالمی ادب کے بیشتر حصے زندہ رہتے ہیں۔"

(ص ۶۸ - ۶۹)

سکہ بند ترقی پسند نقاد عام طور پر ایسی تحریروں کو زیادہ سراہتے ہیں جن میں صحافتی انداز کی وضاحت و صراحت یا ایک طرح کا کھلا ڈھلا پن ہو اور اس کے مقابلے میں رمزیت و ایمائیت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جوش، مجاز، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور کرشن چندر کی تعریف و توصیف میں نہ صرف یہ کہ یہ لوگ بے حد مبالغے سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے صریحی فنی اسقام، جذباتیت، اعصاب زدگی اور سطحیت سے چشم پوشی برتتے ہیں، دوسری طرف فراق، فیض، اور بیدی جیسے فنکاروں کے اعتراف میں بے حد بخل سے کام لیا جاتا رہا ہے کیونکہ موخرالذکر ادیب رمز و ایمائی انداز استعمال کرتے ہیں اور جذباتیت اور اعصاب زدگی کے بجائے ان کے یہاں گہرائی، پیچیدگی اور ایمائیت کے عناصر زیادہ ہیں۔ فیض اور فراق کو رجعت پسند ثابت کرنے میں سردار جعفری نے ایک زمانے میں پورا زور قلم صرف کر دیا تھا۔ فیض کی نظم "صبح آزادی" پر جعفری کی تنقید اور فراق پر ان کا مضمون "یہ ترقی پسندی نہیں ہے" ادبی حلقوں میں زیر بحث رہ چکا ہے۔ اسلوب صاحب اس تنقیدی رویے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"سردار جعفری نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں کہا ہے کہ جو لوگ بات کو ڈھکے چھپے اشاروں میں کہنے پر زور دیتے ہیں وہ پایاں کار ہیئت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہیئت پرستی رجعت پرستی کے مترادف ہے۔ یہاں ایک مغالطۂ ذہنی پوشیدہ ہے۔ یہ کہنا کہ غزل ہماری موجودہ پیچیدہ اور متنوع تہذیب کی تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہے بڑی تنگ نظری ہے اور فن کی دنیا میں تجربے اور ارتقا کی اہمیت کے انکار کی وجہ سے ادبی جمود کی طرف لے جاتی ہے لیکن دوسری طرف یہ دعویٰ بھی کہ رمز و کنائے کے ذریعے حقیقت کی ترجمانی کرنا رجعت پرستی ہے خود فن کے لوازم سے غفلت پر دلالت کرتا ہے۔"

(ص ۲۰۷)

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا اسلوب صاحب کے تنقیدی مضامین سے ان کی غیر معمولی فنی بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی توازن اور ادبی دیانت داری کا پتہ چلتا ہے فراق کے کلام کا مطالعہ انھوں نے بہت تفصیل سے کیا ہے اور ان کے فن کے تمام گوشوں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر ان کے معائب اور اسقام سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ اسی طرح بیدی پر اسلوب صاحب کا مضمون ایک مثالی تنقیدی مضمون کہا جا سکتا ہے۔ بیدی کا مطالعہ اب تک کسی نقاد نے اس گہرائی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ ترقی پسند نقادوں میں سے کسی نے ان پر کوئی مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ کرشن چندر کی مدح سرائی میں یہ لوگ کبھی نہیں تھکتے۔ اسلوب صاحب نے ایک جگہ بیدی اور کرشن چندر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بیدی کے یہاں تخیل کی کمی نہیں ہے مگر ان کے یہاں تخیل کا کیمیاوی عمل سطحی رنگینی اور ظاہری چمک دمک کی صورت میں نمایاں نہیں ہوتا بلکہ واقعات کی ایک نئی تنظیم اور صورت گری میں۔ وہ اپنے کرداروں کے تجزیے میں اس قدر بے تعلق رہتے ہیں کہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں ان کے یہاں سستی جذباتیت کا فقدان ہے اور اس اعتبار سے وہ کرشن چندر کی ضد ہیں۔"

(ص ۲۱۳)

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مراسلات

"غالب صدی"

غالب صدی کے سلسلے میں جو تقریبات منعقد ہوتی ہیں ان کی رپورٹیں "غالب صدی" کے بجائے "صد سالہ جشن غالب" "غالب کی صد سالہ یاد" اور "غالب کی صد سالہ برسی" جیسے مختلف عنوانوں سے پیش کی جا رہی ہیں حالانکہ جو بات "غالب صدی" میں ہے وہ دوسرے ناموں میں نہیں ہے لفظ "غالب صدی" بڑے وسیع معانیم رکھتا ہے اور یہی لفظ سب سے زیادہ مناسب بھی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف اس سلسلے میں منعقد ہونے والے تمام پروگراموں کی رپورٹیں "غالب صدی" کے عنوان سے پیش کی جاتی رہیں بلکہ ان پروگراموں سے متعلقہ کمیٹی کا نام بھی "غالب صدی پروگرام کمیٹی" رکھا جائے۔ اس طرح لفظ "غالب صدی" جو بے حد اہم ہے یادگار بن جائے گا اور تاریخی اہمیت حاصل کرلے گا۔

(بدیع الزماں خاور)

جامعہ اردو کے امتحانات کے نتائج کے بارے میں

گذشتہ کئی برسوں سے جامعہ اردو کے امتحانات کا ایک سنیٹر گوالیار میں بھی قائم کیا گیا ہے جس میں ہر سال ۲۵۔۳۰ طلبہ شرکت کرتے ہیں۔ تمام طلبہ و ان کے والدین کی یہ شکایت ہے کہ جب ان امتحانات کا نتیجہ نکلتا ہے تو کافی وقت بعد معلوم ہوتا ہے لہٰذا کوئی ایسا پرچہ جو گوالیار اور دیگر مقامات پر پہنچتا ہے اس میں یہ نتیجہ شائع کیا جائے جس سے لوگوں کی یہ شکایت دور ہو سکے۔

(رؤف جاوید گوالیار)

مناظر عاشق ہرگانوی

اخبار و رسائل میں غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۲۰۔ غالب کی یاد میں۔ اداریہ ۱۵ر فروری ۶۳ء

۲۱۔ مراد علی ہوشیار (سیار) تلمیذ غالب۔ سید فضل المتین ۲۲ر فروری ۶۳ء

۲۲۔ دلی میں یوم غالب ۲۲ر فروری ۶۳ء

۲۳۔ مارس میں یوم غالب ۲۲ر فروری ۶۳ء

۲۴۔ مرزا قتیل کی طرف ایک نظر (مراسلہ از سید مسعود حسن رضوی ادیب مرزا قتیل اور غالب کی چشمک ۲۲ر فروری ۶۳ء

۲۵۔ یوم غالب (سکریٹری) انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے زیر اہتمام یکم ر مارچ ۶۳ء

۲۶۔ سیر میں۔ آل احمد سرور۔ غالب کے اشعار سے تفاول یکم اپریل ۶۳ء

۲۷۔ غالب کی ایک اصلی تحریر۔ نصیر الدین ہاشمی۔ مستی حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کا جو قلمی خط جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے کتب خانہ کے ایک فارسی مخطوطہ "حقائق و حقائق" میں درج ہے ۲۲ر اپریل ۶۳ء

۲۸۔ مولانا قمر الدین احمد قمر بدایونی۔ دبیر مدر پرشاد سکسینہ بدایونی۔ مضمون میں غالب کے ایک شاگرد عزیز الدین عزیز و صادق کا بھی ذکر ہے۔ ۲۲ر اپریل ۶۳ء

۲۹۔ سیر میں۔ آل احمد سرور۔ یکم ر اپریل ۶۳ء کے شمارے میں غالب کے اشعار سے جو تفاول پیش کی گئی تھی اس میں ایک مصرعہ حالی کا درج ہو گیا تھا۔ اس کی نشاندہی۔ یکم رمئی ۶۳ء

۳۰۔ یہ اشعار کس کے ہیں؟ (مراسلہ از مدد حسین رضوی) آخری مصرعہ یہ ہے ؎ غالب تمہاری عقل کے قرباں جائیے۔ یکم رمئی ۶۳ء

۳۱۔ جان غالب۔ غالب پر لکھے گئے نادم سیتاپوری کے تحقیقی مضامین کے مجموعہ کی کراچی میں اشاعت کا اعلان۔ یکم رمئی ۶۳ء

۳۲۔ مکتوب تاشقند۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ اس مکتوب میں اس کی بھی اطلاع دی گئی ہے کہ رفیق محمد جالف جمش بیرزی ازبکی زبان میں غالب کے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ۲۲ر مئی ۶۳ء

۳۳۔ فرزند علی اخگر عظیم آبادی۔ تلمیذ غالب۔ محمد تبیر الحق دسنوی ۲۲ر مئی ۶۳ء

۳۴۔ سیر میں۔ آل احمد سرور۔ آموں کی فصل شروع ہونے پر غالب کی یاد اور غالب کا ذکر۔ ۲۲ر جون ۶۳ء

۳۵۔ کچھ ذوق کے متعلق۔ محمد انصار اللہ نظر۔ نیا دور میں شائع شدہ ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی کے ایک مضمون "اردو کا ایک نادر الوداعی سپاسنامہ" پر بحث ہے۔ اس سپاسنامہ کی بنیاد غالب پر ہے۔ ۱۵ر جولائی ۶۳ء

۳۶۔ "تمام غالب" ایک نئے انداز میں۔ مارس۔ ۲۲ر جولائی ۶۳ء

۳۷۔ آگرہ میں غالب کی یادگاریں محفوظ ہیں۔ ۲۲ر جولائی ۶۳ء

۳۸۔ شاگرد غالب۔ طالب اکبرآبادی (مراسلہ از سید فضل المتین) ۸ر اکتوبر ۶۳ء

(باقی کالم ایک پر)

باقی کالم ۲ سے آگے۔

۳۹۔ راجپوتانہ گزٹ (مراسلہ از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مرزا علی تلمیذ غالب پر تحقیق۔ ۲۲ر اکتوبر ۶۳ء

۴۰۔ روس میں ادبی سیاحت۔ قمر رئیس۔ آل احمد سرور کے نام خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ تاشقند میں پولاتوف صاحب نے غالب کے خطوط پر اور غفاروف صاحب نے غالب کی فارسی شاعری پر کینڈیڈیٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ۱۵ر نومبر ۶۳ء

۴۱۔ "نگار کا سالنامہ" (تبصرہ از ملک اسماعیل حسن)۔ اس تبصرہ میں غالب کا ذکر بھی ہے۔ یکم ر دسمبر ۶۳ء

۴۲۔ المنطق فی الشعر یا غالب کی منطق۔ مصطفٰے علی گڑھ۔ ۲۲ر دسمبر ۶۳ء

۴۳۔ غالب اور ثلاثۂ غسالہ: تعقل، تعشق اور تصوف۔ مصطفٰے علی گڑھ۔ ۲۲ر جنوری ۶۴ء

۴۴۔ غالب پرستوں کو یاد دہانی۔ اداریہ۔ ۱۵ر فروری ۶۴ء

(باقی آئندہ)

انجمن ترقی اردو گجرات کا غالب صدی پروگرام

احمد آباد (گجرات) اور یہاں کے قصبات وغیرہ میں غالب کی یادگار اور اردو گھر کے متعلق انجمن ترقی اردو کے فیصلہ کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ صوبائی انجمن ترقی اردو نے ہر دو کاموں کے لئے ایک عظیم الشان پروگرام تیار کر لیا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

(۱) مجلس عاملہ ریاستی شاخ نے طے کیا ہے کہ مقامی ضرورت اور غیر زبان والوں کی تشنگی کے لئے ایک مجلہ "یادگار غالب" نمبر بزبان گجراتی شائع کیا جائے اور اس میں نامور و باکمال مضامین ہندی، گجراتی، سندھی وغیرہ کے ادیبوں کے ہوں تاکہ غالب کی شخصیت کے متعلق دوسری زبانوں کے ادیبوں کا اندازِ فکر کیا ہے سب کو معلوم ہو سکے۔ ایک ایڈیٹوریل بورڈ مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ان مضامین کی تدوین و اشاعت کا ذمہ دار ہوگا۔ (۱) ڈاکٹر سی۔ آر۔ نائک (۲) پروفیسر احمد حسین قریشی (۳) پروفیسر سیار محمد شیخ (۴) پروفیسر وارث حسین علوی (۵) پروفیسر محی الدین بمبئی والا اور رسول ایم شیخ

(۲) "اردو گھر فنڈ" کی فراہمی کے سلسلے میں ریاستی شاخ کے مختلف وفود مختلف علاقوں کا دورہ کریں گے ان لوگوں میں شہر کے کارکردہ اور انجمن کے معتمد علیہ لوگوں کی ایک کمیٹی مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ہوئی۔ (۱) عبد الرحمن تبسم بارکیوری۔ سیار احمد شیخ احمد حسین قریشی، ڈاکٹر فاروقی، وارث علوی، عبد الستار قریشی بیرسٹر ایٹ لا، محمد اسمٰعیل خالدی، فخر الدین ندوی اور رحمت اللہ مرچنٹ۔

(۳) علاوہ ازیں فارسی و اردو کے مستحق اور اہل طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے کمیٹی نے یہ طے کیا ہے کہ گجرات سے متعلقہ یونیورسٹیوں اور بورڈ میں جو طلبہ ایس۔ ایس۔ سی (میٹرک) بی۔ اے اور ایم۔ اے میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کریں گے ان کو انعامی تمغات دئے جائیں گے یہ ہر دو کام رمضان المبارک کے ختم ہوتے ہی شروع کر دئے جائیں گے اور وفود انجمن برائے فراہمی چندہ اپنے اپنے مستقر روانہ ہو جائیں گے۔

(سید جمال الدین قادری معتمد اعزازی ریاستی شاخ گجرات احمد آباد)

انجمن ترقی اردو راجستھان کا غالب صدی پروگرام

جے پور۔ غالب کی صد سالہ تقریب کے سلسلہ میں انجمن ہذا نظم و نثر پر مشتمل مضمون غالب نامی ایک صحیفہ شائع کرے گی۔ جس میں راجستھان کے ہر اس ادیب و شاعر کی تخلیق شامل ہوگی جو اپنا مقالہ یا کلام مندرجہ بالا پتہ پر ایسے وقت سے روانہ کر دے کہ ۳۱ دسمبر ۶۸ء تک جنرل سکریٹری کو وصول ہو جائے۔ مقالہ کے لئے کوئی عنوان نہیں ہے۔ ہر ادیب کوئی بھی عنوان جو غالب سے متعلق ہو تجویز کر سکتا ہے۔ البتہ وہ فلسکیپ سائز کی سو سطر سے زائد نہ ہو اور ورق کے ایک صفحہ پر صاف صاف تحریر ہو۔ صفحات چاہے جتنے ہوں مگر سطریں سو سے زیادہ نہ ہوں۔ شعراء کے لئے غالب کے دس مصرعے بطور طرح ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ان میں سے کسی ایک مصرع پر طبع آزمائی فرما کر اپنے پانچ بہترین شعر کی غزل ۳۱ تاریخ تک اسی پتہ پر بھیج دیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ غالب کے متعلق صرف ایک رباعی یا دو شعری قطعہ یا کم از کم صرف ایک ہی شعر کسی بھی زمین میں ضرور بھیجیں۔ جو ان کی غزل سے پہلے درج ہوگا جس جس طرح میں غزلیں وصول ہوں گی اس زمین کی غالب کی غزلیں بھی شامل اشاعت ہوں گی۔ ادبا و شعراء صاحبان اپنا مختصر تعارف بھی ساتھ ہی عطا فرمائیں جو شائع کیا جائے گا۔ یہ دعوت نامہ راجستھان کے ہر ادیب و شاعر کے نام ہے۔ جہاں تک ہوگا یہ کوشش تمام نام بنام ارسال ہوگا پھر بھی ہر ادیب و شاعر سے درخواست ہے کہ وہ اپنے معاصرین تک یہ درخواست انجمن ہذا کی جانب سے پہنچانے کی تکلیف فرمائیں پھر اگر کسی صاحب کی خدمت میں یہ عریضہ نہ پہنچ سکے اور کسی اور ذریعہ سے ان کے علم میں آ جائے تو ازراہ ادب نوازی اپنے کو مخاطب و مدعو سمجھتے ہوئے درخواست ہذا قبول فرمائیں۔

مصرعہائے طرح

(۱) جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا۔
(۲) یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
(۳) نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا　(۴) کوئی امید بر نہیں آتی
(۵) کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
(۶) ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
(۷) ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
(۸) نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
(۹) تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
(۱۰) خوش ہوں کہ مری بات سمجھنی محال ہے

(جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان)

سیفیہ کالج میں غالب صدسالہ برسی تقریبات کا دوسرا ادبی پروگرام

بھوپال۔ ڈاکٹر قمر رئیس ریڈر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کی بھوپال میں آمد ۲۵ نومبر ۶۸ کو اردو سے متعلق کے زیر اہتمام ایک ادبی پروگرام منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر قمر رئیس نے غالب صدی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جناب عبدالقوی دسنوی کے مختصر تعارف کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس نے تقریر کی۔ انھوں نے ہندوستان میں غالب صدسالہ تقریبات کے سلسلے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے تعاون سے منائے جانے والے پروگراموں کا سرسری جائزہ لیا۔ مختلف اداروں اور انفرادی کوششوں کا ذکر کیا۔ غالب پر لکھے جانے والے مضامین کے سلسلے میں تکرار کی جانب اشارہ کیا اور پروگراموں کے سطحی اور نمائشی ہونے سے زیادہ ادبی اور علمی ہونے پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غالب کی صدسالہ برسی در اصل ایک تلافی ہے ان تمام گناہوں کی جو گذشتہ اکیس سال تک غالب کی زبان سے لاپرواہی کی صورت میں سرزد ہوئے ہیں۔ لیکن اس برسی کے بعد اردو زبان کے متعلق پھر وہی رویہ اختیار کیا جائے گا جس سے اردو زبان دوچار رہی ہے غالب کی بہترین خدمت یہ ہو سکتی ہے کہ غالب کے نام پر ہی حکومت سے اردو زبان کے لئے کچھ رعائتیں اور حقوق حاصل کئے جائیں ورنہ اگر غالب کی زبان زندہ نہ رہ سکی تو غالب کس طرح زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی تقریر کے اختتام پر جناب مطلوب حسین صدر مجلس اردو نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا اور جناب متین الرحمٰن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔ (حیدر عباس رضوی)

پٹنہ یونی ورسٹی میں جشن غالب کا اہتمام

پٹنہ۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی نے بڑے پیمانے پر جشن غالب کے سلسلہ کی صدسالہ تقریبات منانے کا فیصلہ کیا ہے گذشتہ ہفتہ ابتدائی تیاریوں کے سلسلہ میں ایک غالب صدسالہ جشن کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ جس کے صدر ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب، نائب صدر ڈاکٹر صدر الدین فضا صاحب، سکریٹری قمر اعظم ہاشمی اور اراکین ڈاکٹر ممتاز احمد و ڈاکٹر یوسف خورشیدی صاحبان ہیں۔ جشن غالب کا پہلا اجلاس ۱۳ نومبر ۶۸ کو زیر صدارت پروفیسر سید حسن صدر شعبۂ فارسی یونی ورسٹی مذکور منعقد ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر نرملیشور پرشاد صدر شعبۂ عمرانیات نے کیا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبۂ اردو نے اس اجلاس میں جشن غالب کے پروگرام کے ابتدائی خاکے کی وضاحت فرمائی۔ جشن غالب کے ضمن میں مختلف جلسے ہر پندرہویں روز فروری کے اوائل تک ہوتے رہیں گے۔ ان جلسوں میں مقالہ، مذاکرہ، مباحثہ، فیچر، ڈراما اور غالب کی غزلیں پیش کی جاتی رہیں گی جن کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، فروری میں ایک بڑے مشاعرہ اور سیمینار کا انعقاد پروگرام کے مطابق ہوگا غالب صدسالہ جشن کمیٹی کی طرف سے غالب کا منتخب کلام میتھلی زبان میں شائع کیا جائے گا اور اس کے علاوہ بھی غالب پر ایک مبسوط یادگاری کتاب بھی شائع ہوگی اس کے لئے ضروری اور ابتدائی اقدامات شروع کر دئے گئے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کے درمیان مقالہ نگاری اور نظم نگاری کے غالب انعامی مقابلہ کا اعلان کیا جا چکا ہے کمیٹی نے یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کے طلبہ و طالبات کے مابین غالب کے شعروں میں بیت بازی کے مقابلے کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ یونی ورسٹی میں مرزا غالب فلم کی خصوصی نمائش بھی ہوگی۔ (سکریٹری)

آدرش ڈگری کالج میں جشن غالب کے لیے سوسائٹی کا قیام

بھوپال۔ آدرش ڈگری کالج کے اساتذہ اور طلبہ کی جانب سے ایک نشست کا انعقاد کیا گیا۔ نشست کی صدارت معاشیات کے پروفیسر صاحب علی عباس امید صاحب نے کی اس نشست میں غالب کی صدسالہ یادگار منانے کے لئے کالج میں ایک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس سلسلے میں کالج میں ہونے والے پروگراموں پر غور کیا گیا۔ (انیس احمد)

سنبھل میں غالب کی یاد میں مشاعرہ

سنبھل۔ اردو ایسوسی ایشن ہند انٹر کالج کے زیر اہتمام جشن صدسالہ غالب کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کالج کے میدان میں منعقد ہوا مشاعرہ کی صدارت ضلع مجسٹریٹ صاحب نے فرمائی مشاعرہ میں مقامی ممتاز شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء نے شرکت فرمائی۔

(وقار رومانی)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی ریسرچ ایسوسی ایشن کا جلسہ

علی گڑھ۔ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی ریسرچ ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ ۲۰ ردسمبر کو فیکلٹی آف آرٹس لاونج میں ساڑھے چار بجے شام کو منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی الہ آباد یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر احتشام حسین مہمان خصوصی تھے۔ جلسہ میں ذکاء الدین شایاں ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو نے اپنا مقالہ "کلاسیکی اردو غزل میں ہندوستانی معاشرت کی زندہ علامات" پڑھا۔

شایاں صاحب نے اس مفروضہ کو غلط بتاتے ہوئے کہ کلاسیکی اردو غزل میں فارسی شاعری کی فرسودہ روایات صرف گل و بلبل اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کا ذکر ہے اپنے مقالہ میں کہا کہ کلاسیکی غزل کے بغور مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے علامتی دائرے میں اس عہد کی سماجی زندگی کا مکمل عکس ہے۔ صنعت ایہام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے بتایا کہ ایہام نے لفظ کی لغویت اور سطریت کو ختم کر کے اسے علامتی پیکر بنا دیا اور اسے اس قابل کر دیا کہ وہ معانی کی بہت سی تہوں کا بوجھ اٹھا سکے۔ ضمنی طور پر جدید غزل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نئی غزل میں سامنے کی چلتی پھرتی زندگی اور اشیاء کو نظم کرنے کا جو رواج عام ہو رہا ہے یہ ماضی کی کلاسیکی غزل ہی کی کڑی ہے جو [illegible] ٹوٹ گئی تھی اب پھر جوڑی جا رہی ہے۔

مقالے پر احتشام [illegible] ڈاکٹر خلیل [illegible] اعظمی جناب مسعود علی ذوقی پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نعیم احمد نے مقالہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا آخر میں پروفیسر احتشام حسین نے کہا کہ علامت کا مسئلہ ہماری شاعری میں خاصا الجھا ہوا ہے کلاسیکی غزل میں تشبیہات اور استعارات کو بھی ہم علامت کی ابتدائی شکل [illegible] سکتے ہیں کیونکہ علامت دراصل استعارے کی ایک الجھی ہوئی اور مبہم شکل ہے انھوں نے کہا کہ آجکل جو علامت نگاری ہے اس میں لفظ کے معنی دوسرے راستے سے [illegible] کر رہے ہیں قدما نے ایسا نہیں کیا تھا۔

باقی صفحہ ۶ سے آگے

بیدی پر لکھتے ہوئے اسلوب صاحب نے ان کی یکطرفہ تحسین نہیں کی ہے بلکہ ان کی بعض خامیوں کی طرف واضح اشارے کئے ہیں خاص طور پر "گرہن" کی بعض کہانیوں کو فنی اعتبار سے کمزور بتایا ہے اور ان کی زبان کی خامیوں پر بھی کھل کر تنقید کی ہے۔

مجاز کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلوب صاحب نے ترقی پسند نقادوں کے برخلاف مجاز کے کلام کی سطحیت اور بعض دوسرے عیوب کی طرف صاف صاف اشارے کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں اعلیٰ اور کامیاب شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ ان نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے جو صرف ایک بے معنی تخریب پر منتج ہوتا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجاز نے بڑی تنقیدی نگاہ سے قبول کیا ہے"

(ص ۲۱۲ - ۲۱۴)

ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی اور تاثیر [illegible] کے تنقیدی مطالعوں میں بھی یہی بات ملتی ہے۔ اسلوب [illegible] کے تنقیدی مضامین کی ایک اہم خصوصیت ان [illegible] اور سلجھا ہوا انداز بیان ہے۔ وہ اپنی نثر میں غیر ضروری رانش اور التاثر دانہ نیتروں سے کام نہیں لیتے۔ ہمارے [illegible] عام طور پر نقادیں بھی نوک جھونک کے متلاشی رہتے ہیں اور شاعرانہ طرز بیان پر سر دھنے کے ہم اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس طرح کے مضامین ہمیں ایک حد تک خشکی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسلوب صاحب کے بعض ایسے مضامین جو اصولی اور نظریاتی ہیں کہیں کہیں ضرورت [illegible] بوجھل ہو گئے ہیں مگر جو مضامین عملی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں وہاں ان کی نثر رواں اور صاف شفاف ہے۔

"ادب اور تنقید" سے ہمارے تنقیدی ادب میں ایک معیاری اور بلند پایہ کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اسلوب صاحب جیسے سلجھے ہوئے نقادوں کی بدولت ہمارے ادب میں خوش مذاقی منصفانہ انداز نظر اور تخلیقی معیار پر اصرار کی روایت آگے بڑھے گی۔

R. No. 2186/57 REGD. N. L. 922

جلد ۲۷ - شمارہ ۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

طلبا کی برہمی اور ہمارا فریضہ

افسوس ہے کہ طلبہ میں آج جو بے چینی ہے اس کے اسباب پر غور کم ہوتا ہے، اس کی مذمت کر کے لوگ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں کوئی بھی سنجیدہ آدمی طلبہ کے تشدد کی تائید نہیں کر سکتا اور وہ اگر ہنگامے کریں یا توڑ پھوڑ کی کارروائی کریں یا قومی دولت برباد کریں تو لازم ہے کہ ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے، مگر ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ ان کے اندر سماج کے خلاف، اپنے بزرگوں کے خلاف، ارباب اقتدار کے خلاف اس قدر غصہ اور برہمی کیوں ہے؟ طلبہ ہمارے سماج کا سب سے حساس طبقہ ہیں۔ سماج کی خرابیوں پر بڑے کڑھتے ہیں یا تقریریں کرتے ہیں یا کتابیں لکھتے ہیں یا اپنے زمانے کی قدروں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نوجوانوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان کی برہمی، بیزاری اور بے راہ روی کی وجہ کیا ہے۔ دراصل ہم نے آزادی کی جد و جہد جن آدرشوں کو سامنے رکھ کی تھی انھیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے سبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آزادی کی ذمہ داری کم بلکہ بہت کم لوگ پوری کرتے ہیں۔ ہم نام جمہوریت، سیکولرزم، تہذیب اور انسانیت، مساوات اور سماجی انصاف کا لیتے ہیں، مگر ہمارے عمل سے ان قدروں کی تائید کم ہی ہوتی ہے۔ ہم نے سوشلزم کو منزل مقصود قرار دیا ہے مگر ہم منافع خوروں، اجارہ داروں، بڑے سرمایہ داروں کو برابر چھوٹ دیتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ نفع خوروں کو شاہراہ عام پر سزا دینی چاہئے، مگر کیا ہم نفع خوری کو روک سکے ہیں۔ ہمارے منصوبے کاغذ پر زیادہ ہوتے ہیں، عمل میں کم آئے ہیں۔ ہماری تعلیم بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہے۔ ہمارے انجینئر بیکار پھر رہے ہیں۔ ہمارے گریجویٹوں کو کلرکی نہیں ملتی۔ زیادہ تر لوگ اپنے مفاد کی یا اپنے کنبے اور برادری کے مفاد کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ملک کے مفاد کا بہت کم لوگوں کو خیال ہے۔ ہم میں قومی حمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور دوسرے ملکوں سے بھیک مانگنے میں ہمیں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے استاد اپنی ترقی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ہمارے کلرک بقول جے پرکاش نرائن پورے پیسے آدھا کام، کی سوچتے ہیں، ہماری سیاسی پارٹیوں کو صرف اقتدار حاصل کرنے کی ہوس ہے۔ قحط، سیلاب، بے روزگاری، بھی قومی مسئلے نہیں سیاسی پارٹیوں کی چالوں کے مسالے بن جاتے ہیں۔ وزیر جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں۔ مجالس قانون ساز کے ممبروں کا کوئی اصول نہیں۔ آج اس پارٹی میں ہیں کل دوسری میں اور اگر پہلی پارٹی میں پھر ترقی کے امکانات دیکھے تو پھر اس میں واپس۔ ہمارے دفتروں میں کام کم ہوتا ہے، باتیں زیادہ۔ ہماری ریلیں، ہمارے ڈاک گھر سب سستی اور کاہلی کے شکار ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان اور جرمنی جیسے ملک تباہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے محنت اور لگن سے پھر خوشحالی حاصل کر لی ہم اپنے تعلیمی اداروں میں جن قدروں کا پرچار کرتے ہیں، ان کو عملی دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا۔ آج ہمارے ملک میں کسی طرح کامیابی، دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا، چالبازی۔ دوسرے کا حق مار کر روپیہ بٹورنا عام ہے۔ مغرب سے ہم نے اس کے تمدن کی خرابیاں لے لیں، اس کی علم و حکمت کی لگن، خدمت خلق کا جذبہ اور سماجی شعور نہیں لیا۔ پرانی تہذیب کی انسان دوستی اور رواداری کو ہم بھول گئے، اس کے فرسودہ رسم و رواج اور اس کی توہم پرستی کو یاد رکھا۔ آزادی کے بعد دنیا کو ہم سے کتنی امیدیں تھیں اور خود ہم نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے لیکن آج ان

امیدوں اور خوابوں کا کیا حال ہے۔ کیا عام لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ معقول بات کوئی نہیں سنتا اور جب تک کوئی ہنگامہ نہ کیا جائے، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے وہ ادیب اور شاعر، وہ دانش ور اور سائنس داں کہاں ہیں جنھیں قوم کا ضمیر کہا جاتا تھا۔ وہ (ESTABLISHMENT) یا اقتدار کا جز کیوں ہوتے جارہے ہیں۔ کسی کے ذاتی مفاد پر آنچ آئے تو وہ آسمان سر پر اٹھالیتا ہے، مگر قومی مفاد کا خون ہوتے ہوئے سب دیکھتے ہیں اور ہرگز احتجاج بھی نہیں کرتے۔ ان حالات میں یہ نئی نسل جسے اپنے بزرگوں سے جنت کے بجائے جہنم ملا، برہم ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ مسئلہ اب سیاسی پارٹیوں کی اکھیڑ پچھاڑ کا نہیں رہا۔ انتظامی کارروائیوں سے اسے حل نہیں کیا جاسکتا۔ پولیس کے ڈنڈوں کے ذریعہ سے طلبہ کے غصے کا علاج نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ طلبہ سے قریبی رابطہ قائم کیا جائے، ان کی نفسیات کو سمجھا جائے، ان کے لئے روزگار مہیا کیا جائے، ملک کو سرمایہ داروں اور چالاک سیاست دانوں کی لوٹ مار سے بچایا جائے، ہر ذمہ دار آدمی پہلے اپنے فرض کو بجالائے پھر دوسروں سے اس کے کام کے متعلق پرسش کرے۔ طلبہ میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے، مگر ان کو ہنگاموں اور تشدد سے روکا جائے۔ طلبہ کو راہ راست پر استاد لاسکتے ہیں کیونکہ بال ہٹ اور راج ہٹ دونوں کو وہ سمجھتے ہیں۔ مگر استادوں کو اس کام کے لئے اپنے خول سے نکلنا ہوگا۔ انھیں ایک طرف اپنے فرائض منصبی پر پوری توجہ کرنی ہوگی، دوسری طرف اچھے کردار سے طلبہ کو اپنی طرف مائل کرنا ہوگا، تیسری طرف انھیں افسروں اور سیاست دانوں سے یہ منوانا ہوگا کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی روشنی میں محنت اور خدمت کی راہ اختیار کریں۔ ذاتی منفعت اور فرعونیت کی روش خدا کے لئے ترک کردیں ورنہ ملک کا خدا حافظ ہے۔

سیاست داں اور افسر ابتک اس آگ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں اور اپنی بانسری بجارہے ہیں۔ استادوں کو ہمت کرکے طلبہ کے دل ہاتھ میں لینا چاہئیں اور حکومت اور سماج کو راہ راست پر لانا چاہئے۔

انڈیا آفس لائبریری کا معاملہ ٹریبونل کے سپرد

لاہور:۔ ریڈیو پاکستان نے بتایا ہے کہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری کا معاملہ فیصلے کے لیے ایک ٹریبونل کے سپرد کیا جارہا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں اردو، ہندی، فارسی، عربی، سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی ہزاروں نایاب کتابیں، تاریخی کاغذ، تصویریں اور نقشے محفوظ ہیں۔ ہندوستان پاکستان اور برطانیہ کے درمیان اس کے مستقبل پر اختلاف ہے۔ برطانیہ اس کو لندن ہی میں رہنے دینے پر اصرار کررہا ہے اور پاکستان اس کی تقسیم چاہتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ نے اس کا معاملہ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تین ممبر ہوں گے۔ (قومی آواز)

احمد آباد سے اردو ماہنامہ کا اجراء

احمد آباد اردو داں طبقہ میں عموماً اور اہل ذوق حضرات میں خصوصاً یہ یہ خبر نہایت ہی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ریاست گجرات سے "ندائے گجرات" جنوری ۱۹۶۹ء سے شائع ہورہا ہے۔ ریاست گجرات میں یہ پہلا اردو ماہنامہ ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر خط وکتابت کریں۔

نثار احمد انصاری ایم۔اے
ایڈیٹر ندائے گجرات مرزا پور موڈکس واڑ احمد آباد

غالب پر روسی زبان میں مقالہ

ماسکو انیسویں صدی کے صاحب طرز اردو، فارسی شاعر ونثر نگار مرزا اسد اللہ خاں غالب کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کرنے پر اردو ادیب ظ انصاری کو ایشیائی علوم کے روسی انسٹی ٹیوٹ نے ماسٹر آف آرٹس (ایم۔اے) کا علمی اعزاز بخشا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستانی شاعر مرزا غالب پر یہ پہلا بنیادی کام ہے جو روسی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ (ریاست)

مولانا مقتدا خاں شروانی انتقال فرماگئے

علی گڑھ:۔ ایم۔ اے کالج کے طالب علم جناب مولانا مقتدا خاں شروانی ۹۱ سال اور ۶ ماہ کی عمر میں ڈھائی ماہ علیل رہ کر انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

مرحوم کے جنازہ میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، یونیورسٹی اور شہر کے ممتاز حضرات شریک تھے مقتدا خاں شروانی سرسید مرحوم کے ایم۔ اے۔ کالج کے طالب علم تھے اور تمام زندگی مسلم یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

ہندوستان کے مشہور اخبار رئیسہ اخبار میں بھی انھوں نے عرصہ تک کام کیا۔ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے اور متعدد علمی، ادبی کتابوں کے مصنف تھے زندگی کے آخری سولہ سال ادارہ تعلیم اردو کی خدمت میں صرف کئے وہ اپنی ذات سے ایک تاریخ اور ایک عہد تھے۔

(الجمعیۃ)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز

غالب جیتے جی جس قدر دانی اور عزت افزائی کے مستحق تھے وہ انھیں نہ ملی بلکہ وہ اپنی بڑھی ہوئی انفرادیت اور جدت پسندی کی بدولت اپنے عہد میں اجنبی ہی رہے۔ لیکن زمانے کی اس بے اعتنائی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھیں اپنی ذات وصفات کا ایسا عرفان حاصل تھا کہ وہ خارجی حالات کے سامنے کبھی سرانداز نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے کمالِ فن کے بارے میں کامل اعتماد ویقین کے ساتھ اعلان کرتے رہے کہ آج نہ سہی کل سہی میرا کلام بہر حال شہرت پائے گا۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

ان کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ صحیح نکلی ان کی وفات کے بعد ان کی شہرت وعزت روز بروز بڑھتی گئی۔ مولانا حالی کی "یادگار غالب" اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی "محاسنِ کلامِ غالب" کے بعد تو ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ساری اردو دنیا ان کے فکر وفن پر ٹوٹ پڑی چنانچہ گذشتہ پچاس سال میں جس دلچسپی وانہماک کے ساتھ غالب کی زندگی اور کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے اور جس تفصیل وتحقیق کے ساتھ ان کے فکر وفن کے بارے میں لکھا گیا ہے کسی دوسرے اردو شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا لطف یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے چنانچہ یہ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ہی کا نتیجہ تو ہے کہ نہ صرف پاک وہند بلکہ پاک وہند کے باہر بھی عوامی اور سرکاری یا نیم سرکاری دونوں سطحوں پر ان کی صد سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور کچھ اس انداز سے کہ یہ برسی نہ صرف اپنی نوعیت کی پہلی عظیم وہمہ گیر ادبی تقریب ہوگی بلکہ ہماری ادبی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ کی حیثیت رکھے گی۔

اس سلسلے میں اب تک جو متوقع پروگرام سامنے آئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس تقریب کا اہم مقصد غالب کی یاد کو از سرِ نو تازہ کرنا۔ ان کی شخصیت اور فن کو دنیا سے روشناس کرانا، ان کی زندگی اور کلام کو مزید صحت وصفائی کے ساتھ شائع کرنا، ان کی زندگی اور کلام کے بارے میں تازہ مواد جمع کر کے کتابی صورت میں لانا، پرانے مواد کو ایک مفصل ومکمل ببلوگرافی کی شکل دینا۔ ان کی زندگی اور فن کے بارے میں تحقیقی مطالعہ کی سہولتیں فراہم کرنا اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے ذریعے غالب کے شایانِ شان ایک علمی وادبی یادگار قائم کرنا ہے۔

اس قسم کی یادگار قائم کرنے کا خیال پہلے کس کے ذہن میں آیا اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس قسم کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں غالب کے نام پر ادبی انجمن کے نام رکھنے، غالب اکیڈمی قائم کرنے اور غالب کے نام سے ادبی پرچوں کی بعض اشاعتوں کو مخصوص کرنے کا سلسلہ انفرادی سطح پر ایک عرصے سے قائم رہا اجتماعی سطح پر اس قسم کی یادگار قائم کرنے کا سوال تو یہ خیال بھی نیا نہیں، بہت پرانا ہے چنانچہ آج ہم اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں، بروئے کار لانے کی تجویزیں غالب کی وفات کے فوراً بعد سامنے آنے لگی تھیں۔ اس قسم کی ایک تجویز جسے یادگارِ غالب کے سلسلے کی اولین تجویز کہنا چاہیے غالب کی وفات کے دوسرے مہینے ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔

یہ تجویز غالب ہی کے ایک شاگرد مردان علی خاں رعنا کی ہے مولانا غلام رسول مہر نے رعنا کے نام غالب کے دو خطوط درج کئے ہیں[1] لیکن حالات زندگی پر وہ روشنی نہیں ڈال سکے لکھتے ہیں کہ

"ان کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ مہاراجہ کپورتھلہ کے مقربین میں سے تھے اور کلکتہ کا سفر بھی کیا تھا نساخ

[1] خطوط غالب حصہ دوم ص۱۲۱ مطبوعہ کتاب منزل لاہور طبع اول

امجد غزنوی

غزل

کچھ عجیب بدلا سا رنگ میکدہ پایا
ہم بادہ نوشوں کو آج غمزدہ پایا

بجلیوں کو گلشن سے دور کر کے گلشن میں
لوٹ کر جب آئے ہم آشیاں جلا پایا

آج ان کی محفل میں ہم نے میرِ محفل کا
سر جھکا جھکا دیکھا دل بجھا بجھا پایا

پھونک کر قفس اپنا شاخِ گل پہ جا بیٹھے
ہر طرف سے جب ہم نے مژدہ نجات پایا

آج اس اندھیرے میں کس نے دستگیری کی
اپنے زیرِ پا ہم نے ان کا نقش پا پایا

موسمِ بہاراں میں اپنے ہی گلستاں میں
جس جگہ قدم رکھا لاکھ کربلا پایا

سر پہ لے کے ساحل کو دوڑتی رہیں موجیں
جب سفینہ والوں میں عزم وحوصلہ پایا

راستی کی راہوں میں مدتوں سے امجد کو
صحبتِ شامِ باطل سے جنگ آزما پایا

نے اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھا ہے کہ "راقم نے ان کو کلکتہ میں دیکھا ہے۔ اور غنچہ راگ ان کا نظر سے گزرا۔ ممکن ہے کہ غنچہ راگ رعنا کی کوئی کتاب ہو"لہ

مالک رام نے البتہ ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ

"بروز دوشنبہ ۲ر جون ۱۸۸۹ء (۱۱ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ) کو سری نگر میں ہیضہ میں وفات پائی۔ علم دوست آدمی تھے شروع میں مضطر تخلص کیا۔ بعد میں بدل کر رعنا کر لیا۔ جب نواب کا خطاب ملا تو نظام لکھنے لگے۔ چنانچہ ایک رباعی میں یہ سب کا ذکر ہے۔

سخنوروں میں مضطر تھا نام رعنا تھا شباب شاعری کا ہنگام
زیر نگیں جو کشور نظم نواب نواب صاحب اور تخلص ہے نظام

صاحب تصنیف تھے علم جفر میں جفر جامع اور جفر کبیر کے علاوہ ایک ضخیم کتاب شاہ ایران کے نام پر ظلّ ناصری (۱۲۸۱ھ) تالیف کی تاریخ میں ایک مبسوط تاریخ البلاد (۱۲۷۷ھ) لکھی علم موسیقی پر بھی دو کتابیں یادگار ہیں نغمۂ عسم اور غنچہ راگ (۱۲۹۰ھ) ریاست جودھپور کی تاریخ، تواریخ مارواڑ (۱۸۶۹ء) کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں مسمریزم کے مضمون پر لکھیں سیر غایت (۱۲۸۳ھ) اور علم نظر (۱۲۸۹ھ) اردو میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب ٹاڈ راجستھان کا اردو ترجمہ بھی ان ہی کی توجہ سے چھپا۔ ان کے اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ اسی مطبع (مطبع نول کشور لکھنؤ) سے کلیات نظام کے نام سے دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپا۔ غالب کے بعد دبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر مرحوم سے اصلاح لی"ٹہ

مرداں علی خاں رعنا کی اصل تجویز اودھ کے اخبار کی جس اشاعت میں تھی، اس تک ہماری دسترس نہ ہو سکی لیکن گارساں دتاسی نے اسے اپنی زبان میں منتقل کر کے اپنی تاریخ ادب ہندوستانی میں محفوظ کر لیا اور اسی کا اردو ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اور ذیل میں نقل ہو رہا ہے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی شعرا میں غالب مرحوم خاتم الشعرا تھے اور ان کے بعد حقیقی شاعری کا وہ رنگ باقی نہ رہا۔ ایک ایسے استاد کے لئے جس نے اپنی ذہانت سے ہندوستان پر جادو کا اثر دکھایا ہو ضروری ہے کہ ایک ایسی یادگار قائم کی جائے جو ان کے شایان شان ہو۔ اس کام میں جو لوگ ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ ان کے تلامذہ میں ہیں۔ اس لئے میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ فرمانبردار شاگردوں کی طرح صمیم قلب سے اس خیال کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں میری ناچیز رائے میں دہلی کے مخصوص حضرات کو ایک انجمن کی تشکیل کرنی چاہئے یہ انجمن اس تجویز کو غور و فکر کے بعد منظور کرے اور تخمینہ پیش کرے کہ اس یادگار کے قائم کرنے میں کیا خرچ آئے گا۔ پھر اس رقم کو پورا کرنے کے لئے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن میرے خیال میں یہ یادگار خالص ادبی یعنی ایک کتاب کی صورت میں ہو تو بہتر ہے جس کے پہلے حصے میں ان تاریخی واقعات کو اردو فارسی میں مرتب کیا جائے جن کا ان کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور جو دوسروں کے لئے دلچسپی کا سبب ہیں دوسرے حصے میں ان قطعوں اور مضامین کو جمع کر دیا جائے جو ان کے شاگردوں نے لکھے ہیں اس کے بعد ان قطعات تاریخ اور مرثیوں کو مرتب کیا جائے جو ان کے شاگردوں نے ان کی وفات پر لکھے ہیں اس کتاب میں ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہونا چاہئے لیکن یہ تمام نثری اور منظوم تحریریں صرف غالب کے شاگردوں کی ہونی چاہئیں اس کتاب کو دو حصوں اردو اور فارسی پر مشتمل ہونا چاہئے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ارادت مند مرحوم کے متعلق کوئی چیز بھیجتا ہے تو اسے بھی کتاب کے خاتمے میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس کتاب میں غالب کی تصویر کے ساتھ ان کے شاگردوں کی مکمل فہرست ہونا بھی ضروری ہے ہر شاگرد اور چندہ دینے والے کو اس کتاب کا ایک نسخہ ملنا چاہئے پھر جو کتابیں بچیں فروخت کر دی جائیں۔

اگر میری اس تجویز پر عمل کیا گیا تو غالب کے شاگرد اپنے لائق استاد کو کھلے دل سے خراج عقیدت پیش کرنے کا حق ادا کریں گے اور یہ اہم ادبی یادگار غالب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی

اگر یہ انجمن میری تجویز کے علاوہ اس شاعر کی یادگار قائم کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے تو وہ اور بہتر ہو گی"لہ

محمد مرداں علی خاں رعنا شاگرد غالب"

اس تجویز میں جن ادبی کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک کام تلامذہ غالب کے نام سے جناب مالک رام صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے لیکن اس تجویز کے بعض پہلو ہنوز توجہ طلب ہیں۔ غالب کے سلسلے میں مختلف شعرا و ادبا خصوصاً ان کے احباب و تلامذہ کی نثری تحریروں، قطعات وفات اور مرثیوں کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا کام ابھی تک باقی ہے۔ یہ کام نہایت ضروری ہے۔ اس کے ذریعے غالب کی زندگی اور فن کے سلسلے کی بہت سی اہم باتوں اور گم شدہ کڑیوں کے سامنے آنے کا امکان ہے امید ہے کہ غالب کے محققین اور پرستار ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر اس اہم کام کی طرف بھی توجہ دیں گے اور جس کام کی تجویز آج سے پورے سو سال پہلے کی گئی تھی۔ اسے تکمیل کو پہنچائیں گے۔

لہ غالب حصہ دوم ص۲۲۲ مطبوعہ کتاب منزل لاہور طبع اول

ٹہ غالب ص۱۸۱ تا ۱۸۲ مرتبہ مالک رام مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر طبع اول

تسکین زیدی

جگر مرادآبادی (حیات اور شاعری)

(ایک سرسری جائزہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۲) اس کتاب کے ص۱۵۱ پر ایک اور غلط بیانی میرے حوالے سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ایک دفعہ میرٹھ کے ایک مشاعرے میں جب وہ اپنی غزل پڑھ چکے تو ایک منسٹر صاحب نے جو اس وقت وزیر اطلاعات تھے ان سے غزل سنانے کی فرمائش کی لیکن انھیں نے (جگر نے) ان کے کہنے پر غزل نہیں سنائی۔"

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ وہ منسٹر صاحب اس مشاعرے کے صدر تھے اور وہ کسی وجہ سے جلد جانا چاہتے تھے۔ بانیان مشاعرہ نے ان کی خوشنودی خاطر کے لیے جگر صاحب سے اس وقت غزل پڑھنے کی فرمائش کی جب شاعرہ ابتدائی دور میں تھا۔ اس لئے جگر صاحب نے غزل پڑھنے سے انکار کر دیا تھا بہر حال یہ سب غلط ہے کہ جب وہ اپنی غزل پڑھ چکے تو ان سے فرمائش کی گئی اور یہ بھی غلط ہے کہ وزیر موصوف نے خود فرمائش کی تھی۔

(۳) یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ ایک دفعہ نواب صاحب رامپور کے مشاعرے میں جگر صاحب غزل پڑھ کر چل دئے تو نواب صاحب نے خود ہی کہا کہ جگر صاحب ہاتھ تو ملا لیجیے تب جگر صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا" (ص۱۵۵)

(۴) محمد اسلام صاحب نے اس مقالے میں ص۱۵۱ پر میرے حوالے سے لکھا ہے۔

"..... جب جگر کو ساہتیہ اکاڈمی سے پانچ ہزار روپیوں کا انعام ملا تو انھوں نے دہلی اپنے ایک دیرینہ دوست کی لڑکی کی شادی کے لیے کئی سونے کے زیورات اور بیش قیمت کپڑے خریدے اور شادی میں ان کو بطور تحفہ پیش کئے" (کیا)۔"

اول تو یہی غلط ہے کہ اس زمانے میں جگر صاحب کے ان دیرینہ دوست کی لڑکی کی شادی ہوئی تھی اور بہ تحفہ اس میں پیش کیا گیا تھا پھر کئی سونے کے زیورات اور بیش قیمت کپڑے" یہ سب اضافہ ہے جگر صاحب صرف ایک بیش قیمت ریور (غالبًا رست بند) دہلی سے خرید کر لائے تھے جس کو تحفتہً پیش کیا تھا خود میں نے وہ ریور دیکھا تھا۔ تقریب شادی تو اس واقعہ سے ایک یا دو سال بعد عمل میں آئی تھی۔

یہ تو وہ غلط بیانیاں ہیں جو میرے نام سے منسوب کی گئی ہیں جگر صاحب کے دوسرے احباب و معاصرین کے حوالے سے جو بیانات اس کتاب میں دئے گئے ہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کہاں تک صداقت بیانی سے کام لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلام نے اس قسم کے تصرفات بجا صرف روایات و حالات کے سلسلے میں ہی نہیں کیے ہیں بلکہ ان کی مثالیں ان کے اس محاکمہ میں بھی ملتی ہیں جو انھوں نے جگر مرحوم کی شاعری پر کیا ہے مثلاً ص۲۰۹ پر "آتش گل میں محبوب کا تصور" کے زیر عنوان جتنے اشعار انھوں نے نقل کئے ہیں وہ تقریبًا سب کے سب "شعلۂ طور" سے ماخوذ ہیں۔ اگر تقابل مقصود تھا تو اس کا حوالہ دینا چاہیے تھا پھر اگر اس کو "سہو قلم" پر محمول کر لیا جائے تو اس کی کیا تاویل کی جائے کہ ص۲۱۲ پر "عشق کا اعلیٰ تصور" کے تحت جو اشعار "آتش گل" کے حوالے سے اسلام صاحب نے نقل کئے ہیں ان میں یہ دو اشعار بھی ملتے ہیں۔

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی	وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
میں رہین درد بھی ہو گیا اور چل بھی چکا جگر	غم یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتۂ غم یار ہوں

زرتبس کمار شاد

والد کے نام

شفیق بابا کبھی میں نے یہ نہیں دیکھا	ہوئی ہو تجھ کو گوارا مری پریشانی
ہمیشہ مجھ کو نظر آئی تیری آنکھوں میں	سفر نواز تری مہربان تابانی

مگر ہے تیرے سبب آج رحم کے قابل
مری تڈھال طبیعت، مرا بجھا ہوا دل

عجیب حال ہے دن رات جستجو تیری	کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جا بجا مجھ کو
ہر ایک راہ سے مانوس ہوں مگر پھر بھی	سجھائی دیتا نہیں کوئی راستہ مجھ کو

کہاں سے چل کے پہنچا کہاں ہوں کیا معلوم
"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"

مجھے نہیں ہیں آثار ترے تجسس میں	گلی گلی جو یہاں حال زار پھرتا ہوں
تمام شہر کو حیرت ہے میری وحشت پر	تمام شہر میں دیوانہ وار پھرتا ہوں

تری تلاش نے دیوانہ کر دیا ہے مجھے
خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے مجھے

جو دیکھتا ہوں کہیں کچھ نظر نہیں آتا	جو سوچتا ہوں خیالوں کی آنکھ بند آتی ہے
گزر رہی ہے پریشان زندگی ایسے	کوئی کٹی ہوئی جیسے پتنگ ہوتی ہے

مرا وجود بھی اب میری دسترس میں نہیں
وہ بے بسی ہے کہ میں خود بھی اپنے بس میں نہیں

میں کھو نہ جاؤں کہیں یاس کے اندھیروں میں	بہت شدید ہوا جا رہا ہے غم میرا
مرے شعور کی رگ رگ سے خون جاری ہے	میں کیا کروں گھٹا جا رہا ہے دم میرا

میں تھک چکا ہوں نہیں تاب انتظار مجھے
جہاں کہیں ہے خدا کے لئے پکار مجھے

اور یہ دونوں شعر شعلۂ طور سے ماخوذ ہیں۔ آتش گل کے حوالے سے "محبوب کا تصور" اور "عشق کا اعلیٰ تصور" کے زیر عنوان شعلۂ طور کے اشعار کو مثالاً نقل کرنا غلط بیانی نہیں تو کیا ہے۔ قارئین کو یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ اشعار شعلۂ طور سے ماخوذ ہیں۔ یہی سمجھا جائے گا کہ آتش گل ہی سے نقل کئے گئے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان اس طویل عنوان کے تحت مصنف نے جگر صاحب کے ایک خط کا اقتباس درج کیا ہے جو انھوں نے ۱۹۴۹ء میں (یعنی تقسیم ہند کے بعد) مجھے گونڈہ سے بھیجا تھا پھر ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے . . . کہ انھیں واقعات وحادثات سے متاثر ہو کر جگر کا حساس دل بالکل بجھ گیا اور وہ کہنے لگے" (ص۲۹۵)

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں　　خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں
وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے　　مجبوریاں ہیں ساتھ دئے جا رہا ہوں میں

اس سلسلے میں حسب ذیل اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں

مرا نالہ ہوش ربا ہو گیا　مرا نغمہ دل فزا ہو گیا　　کہ زیر بہ عیول تو میرے زبان بہ تو دعا ہیں
معاذ اللہ اس کی واردات غم معاذ اللہ　　چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے
قیامت کیا یہ اے حسن دو عالم ہوتی جاتی ہے　　کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

اس غزل کے دو اور شعر لکھنے کے بعد

حسن صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے　　اف کہ انساں ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

اس غزل کے بھی کئی اور اشعار نقل کئے ہیں پھر آتش گل کے متعدد اشعار محمد اسلام صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے درج کئے ہیں کہ ان سب شعروں میں "تقسیم ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان" پایا جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار ان غزلوں سے ماخوذ ہیں جو تقسیم ہند سے سالہا سال پہلے جگر صاحب نے کہی تھیں اس کے لئے یہ ہیں سنہ ۱۹۴۶ء میں آتش گل کا پہلا مسودہ مرتب کیا تھا تو جگر صاحب کی متعدد بیاضوں سے یہ غزلیں نقل کر کے ترتیب وار لکھا کر دی تھیں اس مسودہ کے کچھ اوراق اور یہ بیاضیں اب بھی کو ... معہ ملبہ دلی میں محفوظ ہیں۔ آتش گل کا پہلا اڈیشن تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) سے دو سال بعد شائع ہوا تھا۔ غالباً اس لئے ڈاکٹر محمد اسلام ... نے یہ سب غزلیں تقسیم ہند کے بعد کہی تھیں یقیناً آتش گل میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو تقسیم ہند کے بعد کہی گئی تھیں اسی لئے صرف انہیں غزلوں کے اشعار اس عنوان کے تحت لکھے جا سکتے تھے۔ اس کو غلط بیانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جگر صاحب کو قومی اور ملکی ابتری کا دلی احساس نہ تھا صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مصنف نے کس قدر "تصرف بیجا" سے کام لیا ہے۔

کلام جگر پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں مصنف نے ان کا بھی جائزہ لیا ہے بعض بعض اعتراضات کو صحیح تسلیم کیا ہے اور بعض بعض کی تردید بھی کی ہے اور "نقادوں کی لغزشیں" بھی بتائی ہیں (ص۲۶۳ تا ص۲۹۵) لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود بھی کلام جگر پر چند در چند اعتراضات کئے ہیں ان کو پڑھئے اور مصنف کی "زبان دانی" اور "ذوق شعری" کی داد دیجئے۔

صرف چند اعتراضات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)　لے چلا ہوں میں بھی نذر حسن جاناں کو جگر
ساتھ دل کے ایک ساز آرزو ٹوٹا ہوا　(ص۲۹۷)

محمد اسلام صاحب کو دوسرے مصرع میں "ساز آرزو" پر اعتراض ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"یہ ترکیب غلط ہے کیونکہ آرزو کا کوئی ساز نہیں ہوتا جو ٹوٹ جائے" اس سے قطع نظر کہ انھوں نے ساز کی معنویت اور جامعیت پر غور نہیں کیا ساز دل، ساز تمنا وغیرہ وغیرہ تراکیب کے جواز میں دوسرے اساتذہ کے اشعار بھی سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۲) اس ہو جاک ... یہ غم ہے مگر دل کی طرح　　اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے
دل و جگر کہاں کیمیت ہے تری فرقت میں　　کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے
(ص۲۹۸)

محمد اسلام صاحب کو "ہوئی جاتی ہے" پر اعتراض ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ہوئی" کی جائے یائے مجہول یعنی "ہوئے" کا استعمال ہونا چاہئے تھا گویا ان کے نزدیک دونوں آخری مصرعے اگر یوں ہوتے تو زبان ومحاورہ کے لحاظ سے ان کو صحیح کیا جا سکتا ہے

۱۔ اک خلش سی مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے
۲۔ کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

شاید ان کو معلوم نہیں کہ فعل اردو زبان میں فاعل کے تابع ہوتا ہے اگر فاعل مذکر ہے تو فعل بھی مذکر آئے گا۔ اور اگر فاعل مونث ہے تو فعل کو مونث ہی لکھا جائے گا۔ ان دونوں مصرعوں میں خلش اور خبر دونوں مونث ہیں اس لئے دونوں جگہ ہوئی کا استعمال ہوا ہے "ہوئے" کسی طرح صحیح نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔

(۳)　خیر اس کو نظر آئی تیر اس کو نظر آیا
آئینہ میں خود عکس آئینہ نظر آیا　ص۲۹۵

اعتراض ہے کہ "تیر" یہاں مذکر ہے جگر صاحب نے مونث غلط استعمال کیا ہے:

یہ مصرع ہی محمد اسلام صاحب نے غلط نقل کیا ہے آتش گل کے دونوں اڈیشنوں میں یہ مصرع یوں چھپا ہے

خیر اس کو نظر آیا شر اس کو نظر آیا

بہرحال یہ مصرع اور اعتراض دونوں غلط در غلط ہیں

(۴) اعتراض ہے کہ جگر صاحب نے "چشم جام بہ جام" اور "شوق نام بہ نام" کی بھی غلط ترکیب استعمال کی ہے (ص۲۹۵) اور بعض اور فارسی ترکیبیں بھی بھدی اور غلط استعمال کی ہیں مثلاً خطرۂ التفات جوشش عشق تارۂ اقبال وغیرہ (ص۲۹۵) مگر مصنف نے کوئی توجیہہ پیش نہیں کی کہ وہ ان کو کیوں

غلط سمجھتے ہیں اس لئے یہ اعتراضات کوئی وقعت نہیں رکھتے باقی دوسرے اعتراضات بھی اسی قسم کے "پوچ" اور بادر ہوا ہیں اور زیادہ تر خود مصنف کے ذوقِ شعری کے آئینہ دار ہیں یہ سب اعتراضات غالباً اس لئے کئے گئے ہیں کہ ڈاکٹر محمد اسلام کو اپنی زبان دانی کا اظہار مقصود تھا اور وہ ان کو اپنے مقالے کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

یہ ضخیم کتاب نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی مگر ابتک اس پر کوئی تفصیلی تنقید یا تبصرہ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال میں نے اپنے مضمون میں یہ "فرض کفایہ" ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس تفصیل و تطویل کے باوجود میرا مضمون بھی محض ایک سرسری جائزہ ہے اگرچہ اس میں کتاب کے چند خاص خاص نقائص بیان کئے گئے ہیں مگر اس کو تنقیص محض "نہ تصور کیا جائے کیونکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ صداقت و دیانت پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کتاب کے بہت سے محاسن سے ہرگز انکار نہیں۔

پچھلے دور کے شعرائے کرام کی صف میں جگر کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ اس کے پیش نظر ان کی ہر دلعزیز شخصیت اور شاعری حقیقتاً اسی کی مستحق تھی کہ اس پر خاطر خواہ ریسرچ کی جائے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر محمد اسلام بھی داد و ستائش کے مستحق ہیں اور ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جگر صاحب سے متعلق اتنی کثیر معلومات کا ذخیرہ فراہم کر لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی لکھنا پڑتا ہے کہ ان کے مقالے میں وہ "محققانہ" شان نہیں پائی جاتی جو ایک بالغ نظر ریسرچ اسکالر کا طرۂ امتیاز ہے۔

ملک کے مشہور و ممتاز ادیب و نقاد پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اس کتاب کو بہت سراہا ہے۔ مجھے موصوف کے اس خیال سے تو اتفاق نہیں کہ یہ مقالہ "مستند اور معیاری ہے لیکن موصوف کی اس رائے کی میں لفظاً بہ لفظ تائید کرتا ہوں کہ

"ابتک اس موضوع پر اتنا مفید مواد کہیں
اور یکجا نہ ملے گا جگر پر آئندہ کام کرنے والوں
کو اس ذخیرۂ معلومات سے بہت فائدہ
پہنچے گا اور ان کے تحقیقی کاموں میں سہولت
پیدا ہوگی۔ . . ."

> **"ہماری زبان"**
> کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں
> کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔ (ادارہ)

مراسلات

سر سیّد کی یاد کا ایک بند

یکم دسمبر ۱۹۶۸ء کے "ہماری زبان" میں عطا کاکوی کی ایک نظم "سر سیّد کی یاد" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس کا ساتواں بند صیغۂ واحد متکلم میں کہا گیا ہے ہر چند کہ فنی اعتبار سے اس بند میں کوئی سقم نہیں ہے مگر نظم کے مزاج کے پیش نظر اگر یہ (ساتواں) بند صیغۂ جمع متکلم میں ہو اور اس کے مصرعوں میں مندرجۂ ذیل تبدیلی کو گوارا کر لیا جائے تو میرے خیال سے نظم کا مجموعی تاثر اور بڑھ جائے گا۔

تو ہے محسن ترے احسان بھلائیں کیسے — دل میں جذبات ابھرتے ہیں دبائیں کیسے
غم کا افسانہ ہے / غم کے افسانے ہیں طومار سنائیں کیسے — اپنے دکھ درد جو ہیں اس کو دکھائیں کیسے

خاک تیری بخدا، بوئے وفا دیتی ہے
ایک اک اینٹ علی گڑھ کی دعا دیتی ہے

(بدیع الزماں خاور)

غالب کی ایک غزل

دو سال ہوئے کہ کسی رسالے میں میں نے غالب کی غزل جس کا مطلع

ہر جستجو عبث جو تری جستجو نہ ہو

پڑھی تھی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ انھوں نے یہ غزل دہلی یا لاہور میں کسی قوال سے سنی تھی اور قوال نے وثوق سے کہا تھا کہ یہ نایاب غزل غالب ہی کی ہے۔ کسی صاحب کو اس غزل کے بارے میں معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔ (ابن غوری دکنی)

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

افکارِ میر

مرتب:۔ ایم۔ حبیب خاں،

صفحات:۔ ۲۲۴، قیمت:۔ نو روپے

ملنے کا پتہ:۔ انڈین بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔

آزادی کے پیش رو (اردو)

شائع کردہ:۔ پبلی کیشنز ڈویژن۔ دہلی

صفحات:۔ ۱۰۳

اردو اور بنگال

مصنف:۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ

ملنے کا پتہ:۔ نور محمد اینڈ سنس ۲۰ رسا روڈ ساؤتھ ٹالی گنج۔ کلکتہ ۳۳

صفحات:۔ ۳۰۸

قیمت:۔ دس روپے

عاشق ہرگانوی

اخبار و رسائل میں غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۴۵۔ غالب کا مجسمہ ۔ ہندوستان کے ایک نوجوان فنکار تارید (طاہر ایم سعید) نے تیار کیا ہے اور جس کی نقاب کشائی رام پور میں کی جا رہی ہے۔ یکم مارچ ۶۴ء

۴۶۔ یوم غالب دلی۔ انجمن ترقی اردو صوبہ دلی کے زیر اہتمام ۔ ۸ مارچ ۶۴ء

۴۷۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں یوم غالب ۔ ۸ مارچ ۶۴ء

۴۸۔ اردو کی کمیاب مطبوعات (کانپور کے ذخیرے سے) محمد انصار اللہ نظر ۔ ۱۲؎ کلیات ہوش نیاز احمد خاں بریلوی شاگرد اسیر۔ اس میں قطعات تاریخ درج ہیں۔ دو قطعہ غالب سے متعلق بھی ہیں (۱) قطعہ تاریخ انطباع دستنوئے مصنفہ مرزا اسد اللہ خاں غالب ؎

شد مطبوع دستنوئے غالب   بہر کس چوں چمن محبوب دل شد
چو گل مطبوع طبع ہوش گردید   از ین روسال او مرغوب دل شد

(۲) قطعہ تاریخ وفات جناب نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی ؎

اسد اللہ خاں غالب جب   سوئے دار البقا ہوئے راہی
کہا ہاتف نے ہوش اب ہوئے وہ   اسد بیشۂ سخن سپہی ۱۲۸۵ھ

۲۶؎ عطر مجموعہ از تصنیف غلام حسین قدر شاگرد مرزا غالب

۲۷؎ فروغ خورشید مصنفہ بی بی خورشید جان طوائف متخلص بہ جشن اس پر قطعہ تاریخ مولوی غلام بسم اللہ متخلص بہ بسمل شاگرد حضرت غالب دہلوی وغیرہ بھی درج ہے۔ ۱۵ مارچ ۶۴ء

۴۹۔ میاں تشنہ ۔ نور الحسن ہاشمی ۔ غالب کے معاصر منشی محمد علی تشنہ پر تحقیق ہے۔ جس میں یہ بھی گمان ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ شعر ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کا نہیں بلکہ تشنہ کا ہے ۔ ۱۵ اپریل ۶۴ء

۵۰۔ فاش و خاش پر غالب کی تقریظ (مراسلہ از عبد الوہاب تسنیم بارہ وکی) ۔ ۱۵ اپریل ۶۴ء

۵۱۔ انجمن کے جلسے ۔ جلسے کے فیصلے میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انجمن کی طرف سے کچھ کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بھی بنایا گیا ۔ علی گڑھ ۔ ۲۲ اپریل ۶۴ء

۵۲۔ غالب کی صد سالہ برسی ۔ وارانسی ۔ ۲۲ اپریل ۶۴ء

۵۳۔ غالب (نظم) ۔ احمد کمیں ۔ ۲۲ اپریل ۶۴ء

۵۴۔ سالانہ اجلاس انجمن ترقی اردو صوبہ دہلی (غالب یادگار کمیٹی کی تجویز) ۔ ۸ مئی ۶۴ء

۵۵۔ سیر بین ۔ آل احمد سرور ۔ غالب کے اشعار سے لطف بیان پیدا کیا گیا ہے ۔ ۱۵ مئی ۶۴ء

۵۶۔ فاش و خاش پر غالب کی تقریظ ۔ (مراسلہ از نصیر الدین ہاشمی) ۱۵ اپریل ۶۴ء کے مراسلے کا جواب ۔ ۱۵ مئی ۶۴ء

۵۷۔ غالب کی نایاب تصویر (بحوالہ آبشار کلکتہ) ۔ ۲۲ مئی ۶۴ء

۵۸۔ ایک عاشق کا کارنامہ ۔ اداریہ ۔ ایک منطاس چادل پیدا کرنے والے عطاء اللہ دُرّانی نے اپنی وصیت میں اپنے دس لاکھ ڈالر کے سرمائے کا آدھا حصہ مرزا اسد اللہ خاں غالب اور میر تقی میر کے کلام کے انگریزی ترجمے اور ان کے متعلق کتابوں کے لئے وقف کیا ہے غالب سے تو واقعی عشق تھا۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو جب وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ایک گراں قدر عطیہ دیا تھا کہ دیوان غالب کے انگریزی میں ترجمے کے لئے سید حسن چیئر اور منشی نول کشور کے کارنامے کو اجاگر کرنے کے لئے فیلوشپ قائم کی جائے ۔ یکم جولائی ۶۴ء

۵۹۔ سیر بین ۔ آل احمد سرور ۔ گرمی، آندھی اور آم کے ذکر میں غالب کا حوالہ ۔ یکم جولائی ۶۴ء

۶۰۔ تلامذہ غالب میں ذکر اخگر (مراسلہ از محمد بشیر الحق دسنوی) یکم اگست ۶۴ء

۶۱۔ غالب پر روسی کتاب (بحوالہ قومی آواز لکھنؤ) یکم ستمبر ۶۴ء

۶۲۔ مرزا غالب کی کرسی کراچی میں (بحوالہ انکار کراچی) ۲۲ ستمبر ۶۴ء

۶۳۔ اگلے سال یا پچھلے سال (مراسلہ از) غالب کے اشعار سے مثال ۔ ۲۲ ستمبر ۶۴ء

۶۴۔ کاتب کی کرشمہ سازی (مراسلہ از ایس نور الحسن انور ادیب) ۔ غالب کے اس شعر ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

کی صحت سے متعلق اپنے شک کا اظہار ۔ ۸ نومبر ۶۴ء

۶۵۔ مشکلات غالب (مراسلہ از نیاز) ۔ غالب کے اس شعر پر ؎

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

نیاز فتح پوری کے مفہوم کی تردید ۔ ۸ نومبر ۶۴ء

۶۶۔ مرزا غالب کا یوم پیدائش ۔ سکریٹری غالب اکیڈمی بنارس ۔ ۱۵ نومبر ۶۴ء

(باقی آئندہ)

اترپردیش میں لسانی اقلیتوں کے تحفظ کی کمیٹی کا تقرر

لکھنو۔ حکومت اترپردیش نے لسانی اقلیتوں کی جائز شکایتیں دور کرنے اور ان کے تحفظ سے متعلق جو مختلف اقدامات کئے گئے ہیں ان پر یقینی طور پر عمل درآمد کے مقصد کے پیش نظر ۶ ممبروں پر مشتمل ایک نگراں کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ اس کمیٹی کے چیرمین گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی ہیں۔ کمیٹی کے دوسرے ممبران جناب آنند نرائن ملا ایم۔ پی، پروفیسر آل احمد سرور، جناب حیات اللہ انصاری ایم ایل اے، سکریٹری محکمہ تعلیم۔ قومی یکجہتی اور محکمہ اطلاعات کے سکریٹری اور لسانی اقلیتوں کے افسر (کمیٹی کے سکریٹری) ہیں۔ ریاست میں اردو بولنے والوں کو تعلیم اور نظم و نسق میں ہر طرح کے ضروری تحفظ اور سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ احکام بھی جاری کئے گئے ہیں کہ اردو بولنے والوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے اور اردو بحیثیت مضمون پڑھنے کے سلسلے میں جو کچھ سہولتیں دی گئیں ہیں وہ بدستور جاری رہیں گی۔ اس کے علاوہ لسانی اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں جو سہولتیں دی گئی ہیں ان پر مکمل طور پر عمل درآمد ہوگا۔ حکم میں کہا گیا ہے کہ یہ سہولتیں کم نہیں کی جائیں گی۔ حکومت کو وقتاً فوقتاً اردو اداروں اور تنظیموں سے ایسی شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ اس سلسلہ میں سرکاری احکام پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے اور اس طرح اردو بولنے والوں کے لئے بہت زیادہ دقت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی تمام شکایتوں کی جانچ کی جاتی ہے اور انھیں دور کرنے کے لئے مناسب اقدامات کئے جاتے ہیں اس سلسلہ میں زیادہ توجہ دینے کے لئے اردو کمیٹی کی جگہ یہ نئی کمیٹی قائم کی گئی ہے

(قومی آواز)

تمام ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد کرایا جائے گا

نئی دہلی:۔ وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین نے راجیہ سبھا کو بتایا کہ مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم نے جو مجلس قائمہ مقرر کی ہے ۶ر اور ۷ر جنوری کو حیدرآباد میں اس کا انتظام کرنے کے لئے ہوگا کہ تمام ریاستیں سہ لسانی فارمولا پر عمل درآمد کریں وزیر تعلیم نے جو جناب ایس کے ڈیشمپانڈے کو جواب دے رہے تھے، یہ بھی کہا کہ تمام ریاستی حکومتیں اس وقت مرکزی حکومت سے مشورہ کرتے ہوئے تعلیم پر اپنا چوتھا پنج سالہ منصوبہ مرتب کر رہی ہیں۔ ریاستیں اپنے منصوبوں میں مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کی قرارداد پر عمل درآمد کا انتظام کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے وزیر ریاست برائے تعلیم پروفیسر شیر سنگھ نے کہا تھا کہ مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم نے اپنے گذشتہ جلسہ میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی تھی کہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا پروگرام جس میں سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد شامل ہے چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے کم سے کم پروگراموں میں سے ہونا چاہئے۔ جناب ڈیشمپانڈے کے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا شمالی ریاستیں سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد کر رہی ہیں، پروفیسر شیر سنگھ نے کہا کہ شمالی ریاستیں اپنے اسکولوں میں دوسری زبانیں سکھانے کی امکانی کوشش کر رہی ہیں۔ بہت سی ریاستوں میں اس سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد ہو چکا ہے کچھ ریاستوں کو ترغیب بھی دی جا رہی ہے کہ وہ اس پر موثر طور پر عمل درآمد کریں۔ جناب بھوپیش گپتا نے شکوہ کیا کہ آسنسول میں جو مغربی بنگال میں واقع ہے کچھ اسکولوں میں اردو پڑھانا ختم کیا جا رہا ہے۔ جو طالب علم اردو پڑھنا چاہتے ہیں ان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اردو پڑھنے کے

نئے کوئی دوسرا اسکول تلاش کریں۔ کیا وزیر صاحب اس کے اقدامات کریں گے کہ اردو کی پڑھائی بند نہ ہو۔ ڈاکٹر ترگنا سین نے کہا کہ وہ واقف نہیں ہیں کہ آسنسول میں ایسا ہو رہا ہے۔ ریاستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کریں کہ پرائمری درجات میں بچوں کو ان کی مادری زبان میں پڑھایا جائے۔ "میں ریاستی حکومت سے کہوں گا کہ وہ اس پر عمل درآمد کرائے۔ ڈاکٹر سین نے جناب رنجن ورما کو بتایا کہ صرف ایک ریاست ایسی ہے جس نے اب تک سہ لسانی فارمولا نہیں مانا ہے۔ اس ریاست کی ودھان سبھا نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں دو لسانی فارمولا مانا گیا ہے۔ ہم اس ریاست پر بھی زور دے رہے ہیں کہ وہ سہ لسانی فارمولا قبول کرے۔ دوسری تمام ریاستوں نے سہ لسانی فارمولا قبول کر لیا ہے اور اس پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

(قومی آواز)

انجمن ترقی اردو بنگال کا غالب صدی پروگرام

کلکتہ:- جناب ایم۔ اے مجید اعزازی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں جو نہ صرف سارے ملک بلکہ کئی دوسرے ملکوں میں بھی منائی جائے گی حسب ذیل اعلان جاری کیا ہے۔ ریاست مغربی بنگال خصوصاً اس کا بین الاقوامی شہر کلکتہ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کا ہر دور میں ایک اہم مرکز رہا ہے اور ہے گیسوئے اردو کی شانہ کشی میں شہر کلکتہ کی خدمات اہل علم سے پوشیدہ نہیں اردو میں نثری ادب کی ترویج برصغیر ہند میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہی ہوئی آج بھی یہاں اردو شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ریاستی انجمن ترقی اردو مغربی بنگال پچھلے چند برسوں سے اپنے وسائل کی حد تک ریاست میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے ہمیشہ کوشش کرتی رہی ہے۔ دنیا کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کو کلکتہ سے خصوصی تعلق رہا ہے اور اس عظیم شہر کو ان کی میزبانی کا بھی شرف حاصل ہے۔ کلکتہ نے غالب کے قلب و جگر پر ایک گہرا نقش چھوڑا تھا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی وفات کے سو سال پورے ہو رہے ہیں اور اس اہم موقع کو یادگار کے طور پر منانے کی تیاری نہ صرف ہندوستان میں جہاں غالب پیدا ہوئے تھے بلکہ سارے عالم میں ہو رہی ہے۔ انجمن ترقی اردو (مغربی بنگال) نے بھی اپنے روایتی انداز میں اس تقریب کو مؤثر اور شاندار پیمانے پر منانے کے لئے شہر کی متعدد ہستیوں نامور ادیبوں، شاعروں اور سرگرم کارکنوں پر مشتمل غالب صد سالہ برسی کمیٹی کی تشکیل کی ہے اس کمیٹی نے اس اہم موقع کے لئے ایک پروگرام بنایا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ غالب کے منتخب اردو کلام کا بنگلہ ترجمہ غالب کے افکار سے متعلق اردو مضامین کا مجموعہ دونوں تصانیف کے سلسلے میں کافی کام ہو چکا ہے۔

اردو پورے ملک میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے

انبالہ:- صدر آل انڈیا ہریجن لیگ جناب بھگت امین چند نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اردو زبان کے خلاف فرقہ پرست شور مچا رہے ہیں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ہندوستان کے بھولے بھالے عوام کو فرقہ پرستی کے جال میں پھنسا کر ایک عظیم قومی گناہ کر رہے ہیں اور ملک میں فرقہ پرستی کو پھیلا رہے ہیں انھوں نے کہا کہ اردو زبان لشکر کی زبان ہے یعنی مختلف مذہبوں کی مشترکہ فوج کی زبان ہے نہ الفاظ اردو کی ہر لغت میں مل جائیں گے اس انمول خزانے کو فرقہ پرست دبا دینا چاہتے ہیں انھوں نے کہا کہ وہ حکومت ہند سے مطالبہ کریں گے کہ اردو زبان کو فرقہ پرستوں سے بچایا جائے انھوں نے کہا کہ آزادی کے ۲۱ سال بعد بھی ملک بھر میں دوسری زبانوں کے شاعروں سے اردو زبان کے شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی شاعری سب سے اچھی شاعری ہے اور ہندوستان بھر میں جتنے اخبارات جن جن زبانوں میں چھپتے ہیں ان میں اردو کے اخبارات اور رسالوں کی اشاعت سب سے زیادہ ہے جیسا کہ حکومت کی چھپنے والی رپورٹ بھی ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں پروان چڑھی لکھنؤ نے اسے ادب دیا۔ پنجاب، سندھ، اور سرحد میں یہ پھلی پھولی۔ انھوں نے کہا کہ اگر دیکھا جائے تو اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی پڑھی اور لکھی جاتی ہے اور اردو کشمیر سے آسام تک اور راس کماری سے فرنٹیر تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ (قومی آواز)

کل ہند پیمانہ پر مشاعرہ اس غرض سے سارے ہندوستان کے نامور اور مشاہیر شعرائے کرام کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ غالب اور ان کی زبان اردو پر مقالے مباحثے اور تقاریر۔ اس غرض سے اردو اور دیگر زبانوں کے مقامی اور غیر مقامی ارباب علم کو دعوت دی جا رہی ہے۔ غالب کی تصانیف اور غالب سے متعلق تصانیف اور مخطوطات کی نمائش۔ اس غرض سے مختلف لائبریریوں، کتب خانوں اور ذاتی کتب خانوں سے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین کے مشاعرہ کا انعقاد اس کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ غالب کے کلام کو ماہر اور ممتاز موسیقاروں کے ذریعہ پیش کرنا۔ غالب سے متعلق اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کے درمیان مضمون نویسی کے انعامی مقابلے کا انعقاد۔ مذکورہ طلبہ کے درمیان تقریری مقابلے کا انعقاد اسکول کے طلبہ کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ۔ چھوٹے بچوں کے درمیان غالب کے کلام کی نغمہ سرائی کا انعامی مقابلہ۔ اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات اسکول، کالج اور یونیورسٹی کو بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے اردو کے طالب علم کو یادگار غالب وظیفہ دینا۔ ایک معیاری یادگار مجلہ کی ترتیب و اشاعت اس یادگار مجلہ میں غالب سے متعلق مضامین نظم و نثر اور یادگار تصاویر شامل ہوں گی۔ کسی مشہور شاہراہ کا نام غالب کے نام پر رکھوانا۔ ایلیٹ ہوسٹل کا نام غالب کے نام پر رکھوانا کلکتہ مدرسہ میں اور ممکن ہو تو غالب کی قیام گاہ کلکتہ پر تختی نصب کروانا۔ کلکتہ کارپوریشن نے راستے کا نام بدلنے کی تجویز کو عملی طور پر منظور کر لیا ہے دیگر کوششیں جاری ہیں۔

مرکزی جلسہ گاہ سے متصل غالب میلے کا انعقاد۔ مندرجہ بالا پروگرام کو کامیابی کے ساتھ منانے اور یادگار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں پوری ریاست کے اردو دوستوں کا عملی تعاون حاصل ہو۔

(م ب)

پٹنہ یونیورسٹی میں جشن غالب کا دوسرا جلسہ

پٹنہ۔ پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی غالب صدی جشن کمیٹی کے زیر اہتمام جشن غالب کا دوسرا جلسہ زیر صدارت پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی منعقد ہوا۔ شعبۂ اردو کے طلبہ نے غالب کی ایک غزل سطر کورس پیش کی ڈاکٹر ظفر اوگانوی کا لکھا ہوا اسکرپٹ پیش کیا۔ نظم و غزل اور پیروڈی بھی پڑھی گئی۔ ان متفرق پروگراموں میں فصیح ارمان، امانت حسین، اشرف علی، فضل رب فردوسی، سید سلمان لمحی، یادگار حسین صاحبان اور محترمہ طیبہ سخن نے حصہ لیا۔ جناب قمر اعظم ہاشمی نے اپنا مقالہ "لذت سنگ کی حکایت" پڑھا۔ پروفیسر سید حسن نے غالب کی زمین میں کہی گئی اپنی غزل سنائی۔ علامہ جمیل مظہری نے غالب کے دس منتخب مصرعے سنائے۔ آخر میں صاحب صدر پروفیسر عطا کاکوی نے غالب پر ایک نظم سنائی۔ جناب قمر اعظم ہاشمی نے شرکاء جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔ (سکریٹری)

مدار گیٹ جونیر کالج اجین میں "غالب ہال" کا افتتاح

اجین۔ یہاں غالب صد سالہ جشن کی تقریبات کا آغاز مقامی مدار گیٹ جونیر کالج میں "غالب ہال" کی افتتاحی تقریب سے ہوا۔ افتتاح کی رسم مادھو کالج اجین میں اردو کے استاد جناب اطہر راہی کے ہاتھوں انجام پائی اس موقع پر مادھو کالج میں اردو کے استاد جناب آفاق حسین صدیقی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اسی سلسلے میں، رات کو نو بجے غالب ہال میں اجین کے بزرگ شاعر جناب عطا الہی صدیقی صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں اجین کے شعراء نے حصہ لیا۔ اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں کالج کے طلبہ جناب عبد الحمید، جناب عبد العزیز اول، جناب عبد العزیز دوم، جناب عبد الحمید، جناب تکمیل الرحمن، جناب رضا علی، جناب محمد عابد، جناب رشید احمد نے نمایاں حصہ لیا (نامہ نگار)

اردو میں وہابی ادب

دہلی۔ دہلی یونیورسٹی اردو ریسرچ ایسوسی ایشن شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ۲۸ نومبر سنہ ۱۹۶۸ء کو ٹیگور ہال ٹیوٹوریل بلڈنگ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو نے "اردو میں وہابی ادب" کے عنوان پر اپنا مقالہ پڑھا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مقالہ کی ابتدا وہابی ادب کے پس منظر اور وہابی ادب کے بنیادی تصورات کے تذکرے سے کی۔ انھوں نے وہابی تحریک کے خط و خال اس کے ادب اور اس کے معاصرین کی تحریروں کے آئینہ میں دیکھنے کے بعد فرمایا کہ یہ تحریک ہندی مسلمانوں میں ایسی غلط رسوم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی جو اسلام کے بنیادی تصورات کے مخالف تھیں مثلاً غیر کو خدا کے ساتھ شریک وجود ٹھہرایا یا تمام معبودوں کو عین اللہ سمجھنا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ وہابی تحریک ہندوستان کے کسی مذہبی فرقہ کی مخالف نہیں تھی۔ بعد کو شہنشاہی مصلحتوں نے بہت سے مخطوطات اور معاصر تحریروں میں ترمیم و الحاق کے ذریعہ ان کی انگریز دشمنی کو فرقہ وارانہ مخالفت کا رنگ دے دیا۔ ادبی نقطۂ نظر سے وہابی علما کی یہ کوشش بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے آسان اور سادہ نثر کی ترویج میں حصہ لیا۔ اور اپنے خیالات کو سیدھی سادھی اردو میں دیہی عوام تک پہنچانے کی عظیم الشان کوشش کی چنانچہ اردو نثر کے ارتقائی جو داستان فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، غالب کے خطوط اور سرسید کی ادبی تحریروں تک پھیلی ہوئی ہے وہابی تحریک اس کی ایک اہم تاریخی کڑی ہے۔ آخر میں پروفیسر مجیب نے اس عالمانہ مقالہ پر جو بیشتر قلمی مواد کی مدد سے تیار کیا گیا تھا خوشی کا اظہار فرمایا اور ڈاکٹر محمد حسن نے صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا۔ (سید ظہیر الحسن سکریٹری)

اردو زبان نے کشمیریوں کو متحد کر رکھا ہے

بمبئی ۱۔ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق نے زبان کے معاملہ میں بعض لوگوں کی شدت پسندی کی مذمت کی اور کہا کہ اس سے ملک کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ وہ انجمن اسلامیہ کی طرف سے دئے گئے ایک استقبالیہ میں تقریر کر رہے تھے انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے محبت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی علاقائی زبانوں اور مادری زبان کو نظر انداز نہ کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اردو زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس نے کشمیریوں کو متحد کر دیا جو مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ (الجمعیۃ)

اردو میں انسانی حقوق کا چارٹر تقسیم نہ کرنے پر پارلیمنٹ میں ہنگامہ

نئی دہلی ۱۔ پارلیمنٹ میں اس وقت سخت ہنگامہ ہوا جب اسپیکر جناب سنجیوا ریڈی نے انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا چارٹر پڑھ کر ایوان میں سنایا اور اعلان کیا کہ یہ چارٹر ہندوستانی زبانوں میں بھی ممبران کو دیا گیا ہے۔ اس پر مولانا اسحاق سنبھلی نے سخت احتجاج کیا اور کہا کہ چارٹر کا ترجمہ اردو میں کیوں نہیں مہیا کیا گیا جناب فرنانڈیز سنیکت سوشلسٹ نے مراٹھی میں نہ ہونے کی شکایت کی۔ پھر دونوں ممبروں نے کھڑے ہو کر احتجاج کرنا شروع کر دیا جس سے ایوان کی کارروائی رک گئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ساری دنیا میں انسانی حقوق کا دن منایا جا رہا ہے۔

مولانا نے کہا کہ اردو جیسی عظیم زبان میں چارٹر چھپا نہ کرنا اردو داں انسانوں کے حقوق کی پامالی ہے انھوں نے موافق و مخالف آوازوں کے شور میں اعلان کیا کہ اس مسئلے کو طے کئے بغیر ایوان کی کارروائی آگے نہ چل سکے گی بالآخر وزیر امور پارلیمان جناب رام سبھاگ سنگھ نے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ چارٹر کا ترجمہ اردو اور مراٹھی میں بھی مہیا کیا جائے گا تب ایوان میں خاموشی ہوئی اور کارروائی آگے چل سکی۔ (الجمعیۃ)

حلقہ ارباب فکر کی نشست

دہلی ۱۔ ملک کے ممتاز شاعر و ادیب جناب سید علی جواد زیدی کے اعزاز میں حلقہ ارباب فکر کی ایک مخصوص نشست منعقد ہوئی جس میں جناب شمیم کرہانی، جناب مشیر جھنجھانوی، پروفیسر شہاب جعفری، جناب محمود سعیدی، جناب درشن سنگھ دگل، جناب کمار پاشی، جناب حامد دہلوی، جناب ست نام سنگھ خمار، جناب رفعت کاکوروی، پروفیسر جاوید وششٹ وغیرہ نے شرکت کی۔

شعر میں جدیدیت سے متعلق کچھ گفتگو ہوئی پھر حضرات شعراء نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے شعراء کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

رکھنا ہے تو پھولوں کو تو رکھ لے نگاہوں میں
خوشبو تو مسافر ہے کھو جائے گی راہوں میں
شمیم کرہانی

جب بھی کوئی تاریخ صنم خانہ لکھے گا
اس کو مری شوریدہ سری یاد رہے گی
مشیر جھنجھانوی

چلئے صبحوں کی منزل بیدار کی طرف
اک قافلہ گیا ہے ابھی دار کی طرف
شہاب جعفری

ابھی کچھ آئینے اس خاکداں میں رقص میں
اڑتی ہے اگرچہ یہاں گرد ماہ و سال بہت
محمود سعیدی

سود کا دور ہے نقصان ہے زندگی میری
حریف گردش دوراں ہے زندگی میری
درشن سنگھ دگل

آیا لبِ ست پھول بھی شعلوں میں ڈھل گئے
میں چومنے لگا تو مرے ہونٹ جل گئے
کمار پاشی

جناب علی جواد زیدی نے آخر میں کئی نظمیں اور تازہ غزلیں سا کر سامعین کو مسرور کیا مرزا غالب کی زمین میں جو غزل سنائی اس کے دو اشعار نذر قارئین ہیں۔

کتنے دل ٹوٹتے ہیں دنیا کو خبر ہونے تک
کتنے سر پھوٹتے ہیں دیوار میں در ہونے تک

جب تجلّی سے دے گا زمانہ تو نہ امید نہ یاس
شاخ کو خوف ہے بے برگ و ثمر ہونے تک

(حسین اختر مراد)

پبلشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا